جلد اول

آداب فہم قرآن

سید جواد نقوی

مرکز تحقیقات اسلامی بعثت

بسم الله الرحمن الرحيم

آدابِ فہمِ قرآن

(جلداول)

نام کتاب: آدابِ فہمِ قرآن

مؤلف: حجۃ الاسلام والمسلمین سید جواد نقوی

ترتیب: مرکز تحقیقاتِ اسلامی بعثت

ناشر: متاب پبلیکیشنز

اشاعت اول: جمادی الاول ۱۴۳۳ھ (مئی 2012 عیسوی)

تعداد: ۲۰۰۰

جملہ حقوق متاب پبلیکیشنز کے لئے محفوظ ہیں

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آداب فہم قرآن آج لباس طباعت میں ملبوس پیروان قرآن کریم کی خدمت میں حاضر ہے، اس کا ماجرا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے طالب علم کی حیثیت سے بارگاہِ کتابِ الٰہی میں حاضری کی توفیق تو نصیب ہوئی لیکن یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ نگاہیں تو کلامِ الٰہی کے نورانی الفاظ کی زیارت سے منور ہیں، سماعتیں خوش الحان قاریوں کی آواز سے لطف اندوز، زبانیں تلاوتِ کلامِ وحی سے معطر، حافظے آیات قرآن سے مملو اور محفلیں ذکر کتابِ خدا سے مزیّن جبکہ دل نورِ کلامِ الٰہی سے خالی ہیں۔

اس محرومیت اور خلاء پر بے تابی و بے چینی نے اسباب محرومیت تلاش کرنے کی جستجو ایجاد کی۔ اس کے نتیجے میں ایک کھلی، آشکارا اور بیّن حقیقت سامنے آئی کہ قرآن کریم کی کتابت میں خوشخطی کا نہایت اعلیٰ اہتمام کیا جاتا ہے یعنی آیاتِ الٰہیہ کو لکھنے کے مرحلے میں تمام آدابِ کتابت بروئے کار لائے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں حسین و زیبا رسم الخط سے مزین نسخے معرضِ طباعت میں آئے ہیں اور آج دُنیا بھر میں ہنری شاہکار مانے جاتے ہیں۔ ایسے ہی تلاوت کے مرحلے میں خوش لحن قاری تجوید و قرأت کے تمام آداب کے ساتھ جب آیات کلامِ خدا پڑھتے ہیں تو سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ علم تجوید و قرأت ان آداب کا مجموعہ ہے جو قرآنی آیات کی تلاوت کو نہایت حسین بنا دیتے ہیں اور سماعتوں کو کلامِ الٰہی کی طرف جذب کر لیتے ہیں۔

لیکن جب قرآنِ کریم کو سمجھنے کا مرحلہ آتا ہے تو وہ لطف و سرور جو دلوں میں حاصل ہونا چاہیے محسوس نہیں ہوتا جبکہ آیاتِ الٰہی دلوں کے لئے اُتری ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سمجھنے کے بھی آداب ہیں جنہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے جبکہ آدابِ فہم قرآن کلام کو سمجھنے کے لئے دلوں کو کہیں زیادہ آمادہ تر کر دیتے ہیں بہ نسبت پڑھنے اور لکھنے کے آداب کے۔

چنانچہ قم المقدسہ میں ایک ماہ رمضان المبارک میں بعض طلاب کرام کے لئے اس بحث کا

آغاز ہوا،محور کے طور پر صدر المتالہین ؒ کی کتاب مفاتیح الغیب کو انتخاب کیا گیا اور اس طرح آدابِ فہم قرآن کی پیدائش ہوگئی، کافی عرصہ تک اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا تا اینکہ کچھ قرآن دوست ادب پسندوں نے اس کی تحریر کا فریضہ نبھادیا۔

دیگر بیسیوں عناوین کی طرح یہ موضوع بھی کمپیوٹر کے حافظے اور متاب کی بے نظمی میں خاموش زندگی بسر کررہا تھا کہ جناب سید وصال حیدر نقوی صاحب کے علم میں آگیا، پھر کیا تھا کہ سیّد صاحب نے فوراً اس کی طباعت کا اصرار شروع کردیا۔ ہماری تمام تر ٹال مٹول کے باوجود انہوں نے تمام مراحل سے سرخروئی سے چھاپ ہی دیا۔ اس بابت جس ہستی نے ناقابل توصیف عرق ریزی کی، دن رات کی محنت، شوق، جذبہ اور نہایت ادب کے ساتھ آداب فہم قرآن کو قرآن دوستوں تک پہنچایا وہ عزیز القدر جناب دانش صاحب ہیں۔ وصال صاحب کے اہتمام اور دانش صاحب کی محنت نے یہ اُمید پیدا کردی ہے بلکہ اسے یقینی بنادیا ہے کہ انشاء اللہ سستی، غفلت، ٹال مٹول، لاپروائی جیسے غبار کے نیچے دبے ہوئے سینکڑوں موضوعات اب طباعت کے لباس میں ملبوس ہوکر قارئین کرام تک پہنچتے رہیں گے۔

غلطیاں انسانی کام کا لازمہ ہیں، مشاہدے کی صورت میں عفو و درگزر کے ساتھ مطلع فرمائیں۔ شکریہ

خداوند متعال سے ان عزیزوں اور ہر اس عزیز کے لئے توفیقاتِ فراوان کے متمنی ہیں جس نے آداب فہم قرآن کے طباعتی سفر میں کوئی قدم اُٹھایا ہے۔

احقر العباد

سید جواد نقوی

جامعہ العروۃ الوثقیٰ۔ لاہور

04/05/2012

فہرست

تمہید:

(حصّہ اوّل)

۱) قرآن ذریعۂ شناختِ رمضان 19

۲) قرآن کتابِ ہدایت 21

۳) نزولِ قرآن کا ہدف ومقصد 22

۴) ہدایت سے کیا مراد ہے؟ 24

۵) قرآن منشورِ حیاتِ بشر 25

۶) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بارگاہِ خدا میں شکوہ 26

۷) بعنوانِ منشور قرآن کے احیاء کی ضرورت 29

۸) قرآن کسی خاص طبقے کیلئے نازل نہیں ہوا 30

۹) قرآنی تقویٰ کیا ہے؟ 35

۱۰) نزول کا مطلب 36

۱۱) ہدایت کے دو پہلو 42

۱۲) علم کی تعریف 43

۱۳) بعض اوقات حقیقت خود تنزل کرتی ہے 48

۱۴) کشف کرنے اور انکشاف ہونے میں فرق 48

۱۵) کتابِ مکنون کا معنیٰ 51

۱۶) لَا یَمَسُّہُ سے مراد 54

۱۷)نزولِ قرآن کی ضرورت 55
۱۸)لوگوں کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا طرزِ گفتگو 58
۱۹)قرآن فہمی کیلئے آمادگی کی ضرورت 60

تمھید 67

(حصۂ دوم)

۱)دلوں کے لحاظ سے قرآن کے مخاطبین کی اقسام 68
☆اولوا الالباب 68
☆مہر شدہ سخت دل رکھنے والے 69
☆مریض القلوب 71
۲)خدا نے قرآن کو آسان بنایا ہے 73
۳)فہم کی آمادگی کیلئے مشق کی ضرورت 76
۴)تدبر و تفقہ سے خالی قرأت و عبادت 78
۵)ثواب مقصدِ قرآن نہیں 83
۶)قرآن میں تدبر نہ کرنے کی مذمت 87
۷)قرآن میں تعقل کی ضرورت 89
۸)اکثریت فہم کیلئے آمادہ نہیں 92
۹)قرآن میں تدبر کی تاکید 94
۱۰)ماہِ رمضان قرآن فہمی کا مہینہ 97

۱۱)قرآن فہمی کیلئے آداب کی ضرورت 99

فصلِ تعارفِ ادب 105

۱)ادب کی تعریف بلحاظِ لغت 106
☆قرآن دسترخوانِ خدا ہے 108
۲)ادب کے لغوی معنیٰ کے دیگر موارد 113
۳)معنیٰ ادب بزبان علامہ طباطبائیؒ 117
۴)دیگر اہلِ لغت کے نزدیک ادب کا معنیٰ 123
۵)امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک افضل ادب 125
۶)اخلاق اور آداب میں فرق 131
۷)آداب، مقاصد کیلئے نشانِ راہ 135
☆علم حاصل کرنے کے مذموم مقاصد 137
۸)آداب اور اخلاق میں ربط 142
۹)آداب کی تعریف اور آدابِ فہمِ قرآن میں ارتباط 144

فصلِ اھمیتِ ادب 148

۱)بے ادبانہ اعمال کا نتیجہ 149
۲)روایاتِ امیر المومنین علیہ السلام کی روشنی میں ادب کی اہمیت 150
☆ادب، سونے چاندی سے زیادہ اہم 151

☆صاحبانِ عقل کیلئے ادب کی اہمیت 151
☆ذہانت وفطانت، ادب کی رہینِ منت 152
☆مناجاتِ شعبانیہ میں نورِ بصیرت کیلئے دعا 154
☆آداب، حجابوں کو چیرنے میں مددگار 155
۳)مولانا روم کی نظر میں ادب کی اہمیت 158
☆بے ادب لطفِ خدا سے محروم 159
☆بے ادب کی وجہ سے دنیا آگ کی لپیٹ میں 160
☆بے ادب، پوری قوم کی محرومیت کا سبب 163
☆بے ادب، راہ زن و نامرد 173
☆شیطان بے ادبی کی وجہ سے شیطان بنا 177
۴)مولانا روم کے اشعار امیر المومنین علیہ السلام کے فرامین کی شرح 179

فصلِ ادبِ اوّل 184

﴿درکِ عظمتِ قرآن﴾

۱)تعارفِ مفاتیح الغیب 185
۲)درکِ عظمتِ کلام 187
۳)قرآن ذومراتب حقیقت 194
۴)قرآن، ایک محجوب حقیقت 200
۵)قرآن رات میں نازل ہونے کی وجہ 210

۶)احترام بمناسبت عظمتِ مقام 213

۷)اللہ اپنے کلام میں متجلی ہے 217

۸)معرفت اور اجارے کی نماز میں فرق 219

۹)اللہ کو پانا ہے 225

۱۰)قرآن حبلِ خدا ہے 227

۱۱)مستور قرآن لطفِ خدا ہے 229

۱۲)قرآن کی حکمت اور عبارت کا تعلق 235

۱۳)قرآن، نورِ حکمت 240

۱۴)قرآن، مشروبِ حیات 244

فصلِ ادبِ دوم 250

طہارتِ قلب

(حصہ اوّل)

۱)طہارتِ قلب کی ضرورت 251

۲)قلب سے مراد 252

۳)قلب کو قلب کیوں کہتے ہیں؟ 255

۴)قرآن کے مطابق قلب کی مختلف حالتیں اور اقسام 255

۵)حقیقی دل اور اعزازی دل 262

۶)خود فراموشی، خدا فراموشی کا نتیجہ 264

۷) قرآن کو کرتب کیلئے استعمال نہ کریں 266
۸) قرآن کے مطابق دل کے امور کی اقسام 269
۹) قرآن ظرفِ نورانی پر اترتا ہے 271
۱۰) طہارتِ ظاہری وطہارتِ باطنی 275
۱۱) طہارت کے درجے 278

فصل ادبِ دوم 289

طہارتِ قلب

(حصّہ دوم)

۱) دل مانندِ ظرف ہے 291
۲) دل کی ظرفیت کا کم اور زیادہ ہونا 292
۳) دل کی ظرفیت بڑھانے کیلئے تطہیر کی ضرورت 295
۴) مبلغین پہلے اپنے مُخ طب تیار کریں 301
۵) انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ تبلیغ 302
۶) قرآن ہر دل میں داخل نہیں ہوتا 304
۷) خدا کو جمیل اور بلند مرتبہ لوگ پسند ہیں 306
۸) پاک دل مورد نگاہِ خدا 309
۹) تطہیرِ قلب اعضاء وجوارح سے ظاہر ہوتی ہے 311
۱۰) اللہ کو پاکیزہ لوگ پسند ہیں 313

۱۱) قرآن کے مطابق دل کی بیماریاں 316
1) غِلظت 316
2) غرور وتکبر 317
3) گناہ 320
4) غفلت 321
5) ضعف 324
6) مختوم دل 324
7) مطبوع دل 325
8) غیر متفقہ دل 328
9) زیغ شدہ دل 328
10) اندھے دل 329
11) بیزار دل 330
12) مقفل دل 331
13) قسی دل 332
14) مغلوف دل 333
15) پردوں سے ڈھکے ہوئے قلوب 333
16) غل رکھنے والے دل 334
17) مُشرّب دل 335
18) نفاق رکھنے والے دل 335
19) غیظ والے دل 336

20) شک والے دل	336
21) لہوی دل	337
22) زنگ والے دل	337

فصلِ ادبِ دوم 345

طہارتِ قلب

(حصہ سوم)

۱) قرآن پر ناپاک دل کا اثر	346
۲) قرأتِ قرآن سے پہلے استعاذہ	347
۳) فہم پر تسلط کیلئے شیطان کے دروازے	348
۴) شیاطین بلحاظِ امور مختلف ہیں	353
۵) دین کا مُخاطَب عقل ہے	355
۶) اکثریت کی عقل مغلوب ہے	356
۷) خیالِ شیطان زدہ کا کام!	357
۸) وہم کا کام!	364
۹) حقیقت کو سمجھنے کے منابع	366
۱۰) قرآن میں انسان کی تقابلی اقسام اور روابط	366
۱۱) غلط خیالات اور ان کا علاج!	380

فصلِ اَدبِ سِوُم 386

﴿حضورِ قلب﴾

(حصّہ اول)

۱) حضورِ قلب کا معنیٰ 387

۲) حضورِ قلب کے میادین 391

۳) حضور کیلئے قرآنی تعبیرات 395

۴) حضورِ قلب کی دشواری، ایک المیہ 398

۵) دلِ وحشی کی تربیت 400

۶) حضورِ قلب زبردستی پیدا نہیں ہوسکتا 402

۷) اُنس کیلئے مسانخت کی ضرورت 403

۸) سنخیت کے بغیر اُنس ناممکن ہے 409

۹) قرآن وعبادت کے ساتھ مسانخت 415

۱۰) گریہ، اُنس کی علامت 421

۱۱) اُنس، حضورِ قلب کی طرف پہلا قدم 422

فصلِ ادبِ سِوُم 426

﴿حضورِ قلب﴾

(حصّہ دوم)

۱) تعلقات، حضورِ قلب کی راہ میں رکاوٹ 428

۲) تعلق یافتہ دل مشغول دل ہے	431
۳) مشغول دل حضورِ قلب میں مانع	433
۴) تعلقات کو کاٹنا ضروری ہے	434
۵) انقطاع کے معانی	436
۶) عرفان کی حقیقت	438
۷) دعا و مناجات میں انقطاعِ تعلقات کی ترغیب	446
۸) لہو ولعب کے معانی	448
۹) قرآن کے مطابق کونسی چیزیں الھا ہیں؟	458
۱۰) لہو والھا کے دیگر مصادیق	465
☆ لعب میں مشغول دل	465
☆ کھانے پینے میں مشغول دل	467
☆ لذتوں میں مشغول دل	468
☆ آرزوؤں میں مشغول دل	470
۱۱) دنیا کسے کہتے ہیں؟	476
۱۲) دنیا کی کشش، حربۂ شیطان	479
۱۳) قرآن کے مطابق رجال کون ہیں؟	485
۱۴) قرآن پڑھتے ہوئے حدیثِ نفس کی ممانعت	492
۱۵) قرآن، باعثِ سرور	494
۱۶) قرآن، باعثِ تفرج	496

فصلِ ادبِ چہارم 503

﴿تدبر در قرآن﴾

(حصّہ اوّل)

۱)تدبر کا معنٰی	504
۲)تدبر اور حضورِ قلب دو علیحدہ مرحلے	509
☆محو اور صحو کا فرق	510
۳)قرآن کے ظاہر میں مشغولیت تدبر میں مانع	513
۴)قرآن میں تکرار نہیں	515
۵)قرآن میں تدبر کی تاکید	520
۶)روایات میں تدبر کی تاکید	522
۷)تدبر کیلئے متدبر بننا شرط ہے	525
۸)متدبر انسان ہر چیز میں تدبر کرتا ہے	526
۹)جہاں بینی اور جہاں بانی میں فرق	528
۱۰)عالم اور عامی میں فرق	529
۱۱)ہم اہلِ تدبر کیوں نہیں ہیں؟	532
۱۲)اللہ کی نشانیوں سے اجنبی نہ بنیں	535
۱۳)قرآن کا اجنبیوں کیلئے پیغام	536

فصلِ ادبِ چہارم 543

﴿تدبر در قرآن﴾

(حصہ دوم)

۱) عالمِ خلقت کے مطالعے کی ضرورت 544
۲) قیمتی چیزیں پردوں میں مخفی 549
۳) اہلِ تدبر جنت کے حقدار 553
۴) تدبر، ترقی کا پیش خیمہ 554
۵) علماءِ دین کون ہیں؟ 555
۶) اولوا الالباب کون ہیں؟ 556
۷) اہلِ لُبّ ہی خدا کو پا سکتے ہیں 562
۸) تدبر کی مشق کے مراحل 566
۹) سوال پیدا ہوتا ہے 569
۱۰) سات ملین سوالوں کی تیاری 571
۱۱) قرآن اہلِ تدبر کا راہنما 574
۱۲) متدبر بنے بغیر قرآن سمجھ نہیں آ سکتا 576
۱۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآن میں غور و فکر کرنا 581

فصلِ ادبِ پنجم 586

﴿استنباط﴾

(حصہ اول)

١)مطالعہ قرآن کے لحاظ سے لوگوں کی اقسام 587

٢)استنباط کا معنیٰ 590

☆راویوں کے طبقے 594

☆پیغامِ دین کو اَفْقَہ تک پہنچانے کی حکمت 596

٣)میڈیا کے اہلِ استنباط 599

٤)ادارتی اہلِ استنباط 601

٥)سیاسی اہلِ استنباط 603

٦)اقتصادی اہلِ استنباط 606

٧)طبی اہلِ استنباط 607

٨)دینی اہلِ استنباط 607

٩)چیزوں کو اہل تک پہنچائیں 610

١٠)قرآن کے اہلِ استنباط 616

١١)احادیث کے اہلِ استنباط 621

فصل ادبِ پنجم 626

﴿استنباط﴾

(حصّہ دوم)

۱)الفاظ، معانی اور حقائق کا آپس میں ارتباط 628
۲)استنباط کی ضرورت 629
۳)استنباط کے رائج ثمرات 634
۴)قرآن سے علماء کا محدود استنباط 635
۵)قرآن، معدنِ معارف 637
۶)استنباط کیلئے حسِ جستجو چاہیے 640
۷)استنباطِ تقلیدی 642
۸)لقمہ خورِ غرب نہ بنیں 644
۹)قرآن واہلبیتؑ باعثِ ثروت 651
۱۰)قرآن بصورتِ معدن ہونے کی حکمت 654
۱۱)علوم کو قرآن سے استنباط کرنے کی ضرورت 655
۱۲)اشارۂ قرآن 658
۱۳)اشارۃ الموضوع 661
۱۴)اشارۃ الفتنہ 666
۱۵)اشارۃ الارض 669
۱۶)ٹیکنالوجی وایجادات، ثمراتِ اشارہ 670

۱۷)اثارۃ العقل، انبیاء علیہم السلام کا مقصدِ بعثت 670

۱۸)اثارۃ الناس 674

۱۹)اثارۃ القرآن کی ضرورت 678

۲۰)قرآنی موضوعات کے احیاء کیلئے مہارت کی ضرورت 681

۲۱)اثارۂ قرآن نہ کرنے کا نقصان 685

۲۲)قرآن گفتگو کرتا ہے 687

فصلِ ادبِ پنجم 691

استنباط

(حصّہ سوم)

۱)قرآنی موضوعات کا اثارہ، نظم وترتیب کے ساتھ 693

۲)توحید، قرآن کا بنیادی موضوع 694

۳)معرفتِ خدا ایک حد تک مقدور ہے 697

۴)اسماء اللہ، معرفتِ خدا کا پہلا باب 700

☆ آیات کے آخر میں اسماء اللہ کی حکمت 703

☆ دعائے جوشن، خزانۂ اسماء اللہ 705

۵)افعالِ الٰہی، معرفتِ خدا کا دوسرا باب 707

☆فعلِ الٰہی سے مراد 707

۶)افعالِ الٰہی کے دو چہرے 709

۷) بابصیرت انسان کی دید 712

۸) کتابِ تکوینیِ خدا کی تفسیر کی ضرورت 714

۹) فعل سے فاعل کا استنباط 715

۱۰) کوئی شے خدا کے مقابلے میں نہیں 717

۱۱) اشیاء کی حقیقی دید کی ضرورت 721

۱۲) فیضِ اقدس اور فیضِ مقدس 727

۱۳) باطل الوجود اور باطل الذات کا مطلب 729

فہرستیں 737

تمہید:

(حصّہ اوّل)

١)قرآن ذریعۂ شناختِ رمضان

٢) قرآن کتابِ ہدایت

٣)نزولِ قرآن کا ہدف و مقصد

٤) ہدایت سے کیا مراد ہے؟

٥)قرآن منشورِ حیاتِ بشر

٦)رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بارگاہِ خدا میں شکوہ

٧)بعنوانِ منشور قرآن کے احیاء کی ضرورت

٨)قرآن کسی خاص طبقے کیلئے نازل نہیں ہوا

٩)قرآنی تقویٰ کیا ہے؟

١٠)نزول کا مطلب

١١)ہدایت کے دو پہلو

١٢)علم کی تعریف

١٣)بعض اوقات حقیقت خود تنزل کرتی ہے

١٤)کشف کرنے اور انکشاف ہونے میں فرق

۱۵)کتابِ مکنون کا معنی

۱۶)لَّا یَمَسُّهٗٓ سے مراد

۱۷)نزولِ قرآن کی ضرورت

۱۸)لوگوں کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا طرزِ گفتگو

۱۹)قرآن فہمی کیلئے آمادگی کی ضرورت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْآنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدَاکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ O (۱)

ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے کہ جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے، جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل کے امتیاز کی واضح نشانیاں موجود ہیں لہٰذا جو شخص اس مہینے میں حاضر رہے اس کا فرض ہے کہ روزہ رکھے اور جو مریض یا مسافر ہو وہ اتنے ہی دن دوسرے زمانے میں رکھے، خدا تمہارے بارے میں آسانی چاہتا ہے زحمت نہیں چاہتا اور اتنے ہی دن کا حکم اس لئے ہے کہ تم عدد پورے کر دو اور اللہ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی کبریائی کا اقرار کرو اور شاید تم اس طرح اس کے شکر گزار بندے بن جاؤ۔

۱) قرآن ذریعۂ شناختِ رمضان

خداوند تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید کو ماہِ مبارک رمضان میں قلبِ نورانیٔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بشریت کی ہدایت کیلئے نازل کیا ہے۔ قرآن میں پوری بشریت کی دنیوی و اخروی فلاح و

نجات کیلئے راہنمائی موجود ہے لہٰذا اس الٰہی پیغام کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ کتاب ''آدابِ فہمِ قرآن'' کے عنوان سے محترم قارئین کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں ایک ہی مہینے کا نام لیا ہے اور وہ ماہِ مبارک رمضان ہے۔ ماہِ رمضان کا تعارف خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کے ذریعے سے کروایا ہے نہ کہ صیام کے ذریعے سے، صیام آدابِ ماہِ مبارک رمضان میں سے ہے۔ سورۂ مبارکہ بقرہ کی آیہ ۱۸۵ میں خداوند تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ......

ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے کہ جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے، جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل کے امتیاز کی واضح نشانیاں موجود ہیں......

اس آیۂ مبارکہ میں خداوندِ متعال نے پہلے ماہِ رمضان کی طرف متوجہ کیا ہے اور ماہِ رمضان کا تعارف قرآن کے ذریعے سے کروایا ہے یعنی قرآن ذریعۂ شناختِ رمضان ہے، قرآن باعثِ عظمتِ رمضان ہے، رمضان کی فضیلت کے اعتراف میں اسے سید الشھور کہا گیا ہے اور اسے معصومین علیہم السلام کی زبانِ مبارک سے شھر اللہ تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ خدا کا مہینہ ہے اور سید الشھور یعنی تمام مہینوں کا سردار ہے، اسے ربیعِ قلوبِ مومنین بھی قرار دیا گیا ہے، یہ بہار اور فصلِ بہار ہے۔ ماہِ مبارک رمضان کی یہ ساری عظمت اور فضیلت قرآن کی وجہ سے ہے چونکہ اس میں قرآن نازل ہوا ہے۔

۲) قرآن کتابِ ہدایت

قرآن مجید کا تعارف بھی خود قرآن نے اسی آیہ میں کروایا ہے کہ قرآن کیا چیز ہے؟

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ......

قرآن ہدایت ہے یعنی ماہِ رمضان میں نازل ہونے والا یہ کلامِ الٰہی انسان کے لئے ہدایت ہے اور بینات یعنی اس کے اندر روشن دلائل ہیں، ساتھ ہی یہ فرقان بھی ہے، فرقان یعنی ہدایت وگمراہی اور حق و باطل کے درمیان تمیز اور فرق ڈالنے والی شے کہ جو صفات و اسمائے قرآن میں سے ہے، ماہِ رمضان میں روزہ آدابِ رمضان میں سے ہے اسی آیہ کے ذیل میں ہے کہ

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ......

اگر کسی کو مشاہدۂ رمضان اور شہودِ رمضان کی توفیق نصیب ہو یعنی اتنی زندگی اور حیات ہو کہ اس کی عمر میں ماہِ رمضان آئے اور وہ مشاہدۂ رمضان کرے، پس وہ اس ماہ میں روزہ بھی رکھے، پھر اس کے بعد روزے کے آداب اور احکام ذکر کیے گئے ہیں۔ بطورِ خلاصہ کہہ سکتے ہیں کہ ماہِ رمضان ماہِ نزولِ قرآن ہے لیکن یہ تعبیر سنتے ہی ذہن میں یہ مطلب منعکس ہوتا ہے کہ تاریخ میں چونکہ عموماً مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں اور اس جیسی مشابہ مضمون کی دیگر آیات کے ضمن میں جو ابحاث کی ہیں وہ فقط اسی نقطے پر مرکوز ہیں کہ ماہِ رمضان میں قرآن ایک دفعہ قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور پھر اس کے بعد رسمی تفصیلی بحثیں ہیں کہ ایک طرف سے قرآن لیلۃ القدر میں نازل ہوا اور ایک طرف سے تیئس سالوں میں نازل ہوا، ایک طرف سے قرآن کا دعویٰ ہے کہ لیلۃ

قرآن کتابِ ہدایت

مبارکہ میں نازل ہوا ہے، ایک طرف سے شہرِ رمضان میں نازل ہوا، اتنی زیادہ نزول کی آیات کو آپس میں کیسے طواف ہو یا ان کے درمیان کیسے سازگاری ایجاد کی جائے؟ بیشتر مفسرین کا وقت اور توانائی ان آیات کو آپس میں باہم جمع کرنے میں صرف ہوا ہے اور بحث کا یہی ایک پہلو غالب رہا ہے کہ جس کے نتیجے میں انہی آیات کے ذیل میں دوسری ابحاث کہ جو اس سے زیادہ اہم تر ہیں وہ نمایاں نہیں ہو پائیں۔

۳)نزولِ قرآن کا ہدف و مقصد

قرآنِ مجید قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہوا لیکن قرآن کا صرف یہی ایک تنہا نزول نہیں ہے بلکہ یہ فقط قرآن کا ایک نزول ہے اور اس کے علاوہ بھی نزولاتِ قرآن ہیں۔ ہم سادہ سی تعبیر یا عبارت میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن لوحِ محفوظ میں تھا پھر وہاں سے قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہوا اور اب اسے قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ سے قلوبِ مومنین تک نازل ہونا ہے چونکہ قرآن نہ لوحِ محفوظ کے لئے تھا اور نہ ہی اس کا مقامِ اصلی قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ ہے، نزول کا ہدف و مقصد قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ نہیں ہے چونکہ نبی اکرم ﷺ کے لئے خود قرآن نے ایسے الفاظ اور تعبیرات استعمال کی ہیں کہ ذاتِ پیغمبر اکرم ﷺ کے لئے قرآن کے نزول کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کی اس نزول نا یافتہ قرآن تک بھی دسترس تھی۔ یہ قرآن ہی کی تعبیر ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ مقام لدن سے قرآن کی تلقی کرتے ہیں

نزولِ قرآن کا ہدف و مقصد

لہٰذا خداوندِ متعال نے فرمایا ہے کہ

اِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ o فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ o لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ o (۲)

یہ بڑا محترم قرآن ہے۔ جسے ایک پوشیدہ کتاب میں رکھا گیا ہے۔ اسے پاک و پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے۔

کامل مصداقِ مطہرین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور غیر نزول یافتہ قرآن کہ جو کتابِ مکنون کی شکل میں ہے اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول سے پہلے مس کر سکتے ہیں، نزول کا اصلی مقصد یہ تھا کہ قرآن انسانوں کے لئے ہدایت ہو، جس طرح ماہِ رمضان کی تعریف قرآن کے ذریعے سے ہوئی ہے اسی طرح قرآن کی تعریف ہدایت کے ذریعے سے ہوئی ہے، تعریف یعنی شناخت کہ قرآن ہدایت ہے۔ مختصر جملے میں قرآن نے اپنی تعریف یا اپنی شناخت خود کروائی ہے کہ یہ کتابِ ہدایت ہے،

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ o (۳)

یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ صاحبانِ تقویٰ کے لئے مجسم ہدایت ہے۔

اور اس آیہ میں فرمایا کہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ......

پس یہ کتابِ ہدایت ہے اور ہدایت بھی ناس کے لئے ہے یعنی مُخاطَبِ قرآن ناس ہیں اور وہ بھی عام اور سارے انسان ہیں، اس کیلئے کوئی مخصوص طبقہ نہیں ہے یعنی یہ کتاب تمام انسانوں

کے لئے ہدایت ہے۔

٤) ھدایت سے کیا مراد ھے؟

ہدایت یعنی وہ ذریعہ کہ جس کے نتیجے میں انسان نقص سے کمال تک پہنچتا ہے اور خسارے سے فلاح تک پہنچتا ہے،

وَالْعَصْرِ ٥ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ٥(۴)

قسم ہے عصر کی۔ بیشک انسان خسارے میں ہے۔

اور جب انسان ایسے گھاٹے سے فلاح تک پہنچے گا تو بسببِ قرآن وطفیلِ قرآن پہنچے گا،

وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ٥(۵)

اور یہی لوگ فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں۔

یعنی جو انسان اسفل السافلین اور خسرانِ مبین میں ہے تو اسے اس پستی اور خسارے سے نکال کر اپنے مقصدِ حیات تک پہنچانا ہدایتِ انسان ہے اور یہی کام قرآن کرتا ہے۔ قرآن انسان کو انہی مراحل سے گزار کے نقطۂ عوج وعروج پر پہنچاتا ہے۔ قرآن کے دیگر فرضی وضمنی عناوین بھی ہیں لیکن اصلی عنوانِ قرآن کتابِ ہدایت ہے۔ اگر اس کو مطلب کو اور زیادہ سادہ کرکے بیان کریں تاکہ یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں آئے کہ کتابِ ہدایت سے کیا مراد ہے تو کہیں گے کہ قرآن انسان کی حیات کا منشور ہے۔

٥)قرآن منشورِ حیاتِ بشر

اگر ہم ھُدًی لِّلنَّاس کی عام تعبیر کریں یا اس کیلئے آزاد متبادل لفظ استعمال کریں تو کہیں گے کہ یہ منشورِ حیاتِ بشر ہے کہ جو خدا نے تدوین کیا ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ کے توسط سے عام بشریت کو پہنچایا ہے اور ابلاغ کیا ہے۔ منشور سے مراد ضابطے، قاعدے، قوانین، حدود، دستورات، آگاہی، معرفت، علم، تحریکات اور محرکات ہیں، ایک منشور میں یہی چیزیں ہوتی ہیں اور یہی چیزیں انسان کی زندگی کو تشکیل دیتی ہیں، قرآن ان سب کا مجموعہ ہے اور حیاتِ بشر کے لئے کامل ترین منشور ہے۔

منشورِ حیات کو حیات کے اندر ہونا چاہئے، منشورِ حیات کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی اس کے مطابق بسر ہو، منشور کسی علمی مجموعے، تاریخی مجموعے یا سائنسی مجموعے کو نہیں کہتے ہیں، منشور سے ہم سب آشنا ہیں، اہلِ اسلام بھی آشنا ہیں اور غیرِ اہلِ اسلام بھی آشنا ہیں، جس طرح سے ہر ملک کیلئے، ہر قوم کیلئے اور ہر حزب و جماعت کیلئے ایک منشور ہوتا ہے کہ جو وہ لوگ خود تدوین کرتے ہیں اور اس کے اندر اپنے اہداف مشخص کرتے ہیں، اپنے مقاصد متعین کرتے ہیں، ان مقاصد تک پہنچنے کے لئے مختلف طریقوں کی نشاندہی کرتے ہیں، ان طریقوں کے اندر موانع کی نشاندہی کرتے ہیں، ان موانع سے بچنے کیلئے تدابیر سوچی جاتی ہیں، انسانی ضروریات کی نشاندہی کی جاتی ہے، ان ضروریات کو فراہم کرنے کے لئے چارہ اندیشی کی جاتی ہے، انسان کو درپیش خطرات کی نشاندہی کی جاتی ہے اور ان خطرات سے نمٹنے کے لئے راہِ حل تلاش کیا جاتا ہے، منشور انہی چیزوں کا نام ہے

اور اگر کسی منشور کے اندر یہ ساری چیزیں موجود نہ ہوں، پیش گوئیاں اور پیش بینیاں موجود نہ ہوں تو اس کو منشور نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ ایک وِرد کہلا سکتا ہے، ایک علمی مجموعہ و تاریخی دستاویز کہلا سکتا ہے یا اس کو کوئی اور نام دے سکتے ہیں لیکن اسے منشور کی حیثیت ہرگز نہیں ملتی ہے۔

آج انسانی کوششوں کے نتیجے میں بہت ساری علمی کتابیں موجود ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی منشور کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ بہت ساری کتابیں ہیں کہ جو نصابوں میں، دینی مدارس میں، کالجز (Colleges) اور یونیورسٹیز (Universities) میں پڑھائی جاتی ہیں، اس کے علاوہ لائبریریز (Libraries) بھی کتابوں سے بھری ہوئی ہیں لیکن ان کتابوں میں سے کسی کو بھی منشور نہیں کہا جاتا، ان کتابوں میں سے کچھ حوالوں کی کتابیں ہیں، انسائیکلوپیڈیاز (Encyclopedias) ہیں، علمی مجموعے ہیں، سائنسی و معلوماتی ذخیرے ہیں اور انسان معلومات کے حصول کے لئے ان کی طرف رجوع کرتا ہے، اس کے علاوہ بھی ہر شعبے کے اندر انسانوں کی کاوش کا نتیجہ موجود ہے لیکن انہیں منشور نہیں کہا جا سکتا، قرآن منشورِ الٰہی اور کتابِ حیاتِ بشر ہے لہٰذا تمام انسان اس کے مطابق زندگی بسر کریں۔

٦) رسولِ اکرم ﷺ کا بارگاہِ خدا میں شکوہ

قرآن میں مذکور ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ قیامت میں بروزِ حشر بارگاہِ خداوند تبارک و تعالیٰ میں ایک شکوہ کریں گے اور وہ مہجوریتِ قرآن کے بارے میں ہوگا،

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا○(۶)

اور رسول کہیں گے: اے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

یعنی اے پروردگار میری قوم نے، میری امت نے اس قرآن کو متروک رکھا۔ متروک رکھنے کے معانی یہ نہیں ہیں کہ قرآن پڑھا نہ جائے، متروک رکھنے کے معانی یہ بھی نہیں ہیں کہ قرآن پر تحقیقات نہ ہوں بلکہ متروک رکھنے کے معانی یہ ہیں کہ منشور کو منشور ہی نہ بنایا جائے، باقی سارے کام اس کے اندر انجام دیئے جائیں لیکن اسے منشور کی حیثیت حاصل نہ ہو تو اس وقت تک یہ متروک ومہجور ہے۔

کثرتِ قرأت، کثرتِ تلاوت، کثرتِ طباعت، کثرتِ حفظ اور کثرتِ ذکر کے باوجود قیامت میں رسول اللہ ﷺ شکوہ کریں گے کہ قرآن مہجور ہے، رسول ﷺ یہ شکوہ کریں گے کہ اے میرے پروردگار! اے میرے رب!

اِنَّ قَوْمِي.....

میری قوم نے......

یعنی نہ کہ غیر مسلموں نے، نہ کہ مسیحیت نے، نہ کہ یہودیت نے، نہ کہ ہندوؤں نے اس قرآن کو مہجور رکھا یا فلاں قوم قرآن نہیں پڑھتی تھی اور قرآن کی طرف نہیں آتی تھی بلکہ میری قوم نے قرآن کو مہجور رکھا۔ اس قوم میں کثرت سے حفاظ موجود ہیں، اس میں کثرت سے مفسرین موجود ہیں، قرآن کی مختلف طباعتیں موجود ہیں بلکہ ابھی بھی ریکارڈ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ چھپنے والی

کتاب قرآن ہے، دنیا میں سب سے زیادہ بکنے ولی کتاب بھی قرآن ہے لیکن پھر بھی پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم شکوہ کریں گے کہ میری قوم نے اس کتاب کو مہجور رکھا ہے، مہجور یعنی متروک رکھا ہے، معطل رکھا ہے، کیوں معطل رکھا ہے؟ کیونکہ پڑھنے سے اس کی مہجوریت مرتفع نہیں ہوتی ہے، تلاوت سے اس کی مہجوریت مرتفع نہیں ہوتی ہے، ختم قرآن سے اس کی مہجوریت مرتفع نہیں ہوتی ہے، حفظ کرنے سے اس کی مہجوریت مرتفع نہیں ہوتی ہے اور زیادہ نسخوں کی صورت میں چھاپنے سے اس کی مہجوریت مرتفع نہیں ہوتی ہے بلکہ تدبر کرنے سے، تعقل کرنے سے اور پھر غور وفکر کرکے اس کو اپنی زندگی کا عملی منشور بنانے سے قرآن کی مہجوریت مرتفع ہوتی ہے۔

عام سی مثال سے اس نکتے کو سمجھا جاسکتا ہے مثلاً کسی ملک کا آئین اس کے لاء کالجز (Law colleges) میں اور یونیورسٹیز (Universities) میں تدریس کیا جائے اور اس آئین کے مطابق لوگ پڑھ کر وکیل (Lawyer) بنیں، لیجسلیٹر (Legislator) بنیں، اٹارنی (Attorney) بنیں، بیرسٹر (Barrister) بنیں، ایڈووکیٹ (Advocate) بنیں، ججز (Judges) بنیں، اس پر ایل ایل بی (LLB) ہو رہا ہو، ایل ایل ایم (LLM) ہو رہا ہو اور ماہرین قانون بن رہے ہوں لیکن یہ قانون اسی ملک کے اندر معطل ہو، جس طرح عموماً ہوتا بھی ہے کہ مستبد حکمران اور آمر لوگ آتے ہیں اور سب سے پہلا کام یہی کرتے ہیں کہ آئین کو معطل کر دیتے ہیں، اگر کسی ملک میں آئین معطل ہو جائے لیکن اس آئین پہ تعلیم ہو رہی ہو، اس آئین پہ ڈگریاں مل رہی ہوں، اس آئین کے حافظ بن رہے ہوں، اس آئین

کے متخصص بن رہے ہوں تو اس قانون کو پھر بھی نافذ قانون نہیں بلکہ معطل قانون ہی کہیں گے۔

قرآن مہجور ہے یعنی معطل ہے، منشورِ قرآن بحیثیتِ منشور معطل ہے، اگرچہ اس کے متخصص پیدا ہو رہے ہیں، قاری پیدا ہو رہے ہیں، ماہرین پیدا ہو رہے ہیں، اس کے حافظ موجود ہیں، اس کو چھاپنے والے موجود ہیں، اس کو وِرد کرنے والے موجود ہیں اور اس سے متعلق فراواں فرعی اور ثانوی سرگرمیاں موجود ہیں لیکن قرآن بعنوانِ آئین، بعنوانِ منشور معطل ہے لہٰذا بارگاہِ خداوند تبارک و تعالیٰ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر شکوہ کریں گے کہ میری قوم نے اس آئین کو، میرے اور آپ کے منشور کو معطل رکھا ہے تو یہ کاملاً صادقانہ شکوہ ہوگا اور کسی کے پاس اس کا دفاع موجود نہیں ہوگا، حتیٰ جو اہلِ قرآن ہیں، جو قاریٔ قرآن ہیں، جو حافظِ قرآن ہیں، جو مفسرینِ قرآن ہیں، جو مؤلفینِ موضوعاتِ قرآن ہیں اور جو محققینِ موضوعاتِ قرآن ہیں ان کے پاس بھی کوئی جواب نہ ہوگا۔ آئین نافذ نہ ہو تو یہ معطل آئین کہلاتا ہے لہٰذا جب ملک کا آئین معطل ہو جائے اور اس آئین پر علمی تحقیقات ہو رہی ہوں تو یہ اس آئین کے ساتھ ظلم ہے۔

۷) بعنوانِ منشور قرآن کے احیاء کی ضرورت

قرآن کو پوری تاریخ میں اور آج بھی بعنوانِ منشور اپنا وہ مقام نہیں مل سکا کہ جو ہونا چاہیے تھا لہٰذا بعنوانِ منشور قرآن کے احیاء کی ضرورت ہے نہ کہ صرف کتابِ مقدس کے طور پر، کتابِ محترم کے طور پر، کتابِ استخارہ کے طور پر اور کتابِ ثواب کے طور پر کیونکہ آج قرآن کا ہر عنوان موجود ہے

لیکن یہ کتاب بعنوانِ منشور مہجور ہے۔ اسکے اندر تدبر کریں، فکر کریں کہ قرآن بعنوانِ منشور کیوں نہیں اپنایا گیا ہے؟ ہم نے اسے غیر اسلامی زندگی کے اندر ایک مقدس چیز کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ یہ تبرک کے طور پر، برکت کے طور پر، گھروں میں، مسجدوں میں، سینوں میں، لائبریریوں میں یا اداروں میں موجود ہے لیکن جس چیز کی زینت ہے وہاں غیر موجود ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اس سے کوئی برکت اور خیر حاصل ہو جائے لیکن زندگی کی زینت اور زندگی کے منشور کے طور پر اسے نہیں اپنایا گیا۔

اس کے بہت سارے اسباب ہیں لیکن ان میں سے ایک بڑا سبب قرآن کی صحیح شناخت ومعرفت کا نہ ہونا ہے کہ قرآن کس چیز کی کتاب ہے؟ اور ظاہر ہے کہ جس مجموعے کی صحیح شناخت موجود نہ ہو اور اس شناخت کے اندر یہ متعین نہ ہو کہ قرآن ایک منشور ہے تو اس لاعلمی کی بنا پر اور قرآن کی معرفت کے فقدان کی بنا پر یہ منشور مہجور و متروک ہے اور اس پر کسی کو خود بخود یہ آگاہی کم نصیب ہوتی ہے یا جب تک تعلیم کا حصہ نہ بنے تو لوگوں میں اس شعور کا فقدان بدستور قائم رہتا ہے، آج ہم محسوس کرتے ہیں اور لمس کرتے ہیں کہ قرآن مہجور و متروک ہے۔

قرآن کسی خاص طبقے کیلئے نازل نہیں ہوا

۸) قرآن کسی خاص طبقے کیلئے نازل نہیں ہوا

قرآن تمام انسانوں کے لئے حتیٰ عام انسانوں کے لئے بھی منشور ہے چونکہ مخاطَبِ قرآن ناس ہیں، قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے لیکن ہدایت ناس کے لئے ہے،

هُدًى لِّلنَّاسِ......

یہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے......

یہ ناس کی زندگی کا منشور ہے، ناس یعنی عام لوگ، ناس قرآن کی تعبیر ہے، ناس کے مقابلے میں بھی قرآن کی تعبیرات ہیں مثلاً ملاء ہے، ملاء یعنی لوگوں میں سے ایک ایسا طبقہ کہ جو اپنے آپ کو ایک الگ تشخص کے تحت جدا کرتا ہے، اس کے اندر ایک بزرگی پیدا ہوتی ہے اور وہ اموال و املاک کا مالک بن جاتا ہے، اپنے آپ کو مقتدر سمجھتا ہے اور عام لوگوں سے اپنے آپ کو ممتاز اور جدا سمجھتا ہے، قرآن نے اس طبقے کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ملاء ہے، جب بھی انبیاءؑ ناس کیلئے پیغام خدا لے کر آئیں ہیں تو ناس اور پیغامِ خدا کے درمیان یہ طبقہ ملاء حائل رہا ہے، ہر نبی علیہ السلام کے زمانے میں اور خود قرآن کے ساتھ بھی یہ اتفاق رونما ہوا ہے، تعبیراتِ قرآن فراواں ہیں کہ

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ اِنَّا لَنَرَاکَ فِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ o (۷)

تو قوم کے رؤسا نے جواب دیا کہ ہم تم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهِ اِنَّا لَنَرَاکَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ o (۸)

قوم میں کفر اختیار کرنے والے رؤسا نے کہا کہ ہم تم کو حماقت میں مبتلا دیکھ رہے ہیں اور ہمارے خیال میں تم جھوٹوں میں سے ہو۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهِ قَالُوْا اِنَّا بِمَا اُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُوْنَ o (۹)

تو ان کی قوم کے بڑے لوگوں نے کمزور بنا دیئے جانے والے لوگوں میں سے جو ایمان لائے تھے ان سے کہنا شروع کیا کہ کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ صالح خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں، انہوں نے کہا کہ بیشک ہمیں ان کے پیغام کا ایمان اور ایقان حاصل ہے۔

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخَاسِرُوْنَ ○(۱۰)

تو ان کی قوم کے کفار نے کہا کہ اگر تم لوگ شعیب کا اتباع کرلوگے تو تمہارا اشمار خسارے والوں میں ہو جائے گا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا......(۱۱)

ان کی قوم کے مستکبرین نے کہا کہ اے شعیب ہم تم کو اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے یا تم بھی پلٹ کر ہمارے مذہب پر آ جاؤ......

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيْمٌ ○(۱۲)

فرعون کی قوم کے رؤسا نے کہا کہ یہ تو سمجھدار جادوگر ہے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرَاكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِيْنَ ○(۱۳)

تو ان کی قوم کے بڑے لوگ جنہوں نے کفر اختیار کر لیا تھا کہا کہ ہم تو تم کو اپنا ہی جیسا ایک انسان سمجھ رہے ہیں اور تمہارے اتباع کرنے والوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے پست طبقہ کے سادہ لوح افراد ہیں، ہم تم میں اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں دیکھتے ہیں بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً......(۱۴)

ان کی قوم کے کافر رؤساء نے کہا کہ یہ نوح تمہارے ہی جیسے انسان ہیں جو تم پر برتری حاصل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ خدا چاہتا تو ملائکہ کو بھی نازل کر سکتا تھا......

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ٥ (۱۵)

تو ان کی قوم کے رؤساء نے جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا اور آخرت کی ملاقات کا انکار کر دیا تھا اور ہم نے انہیں زندگانی دنیا میں عیش و عشرت کا سامان دے دیا تھا وہ کہنے لگے یہ تو تمہارا ہی جیسا ایک بشر ہے جو تم کھاتے ہو وہی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہی پیتا بھی ہے۔

دیگر آیات میں بھی طبقۂ ملاء کا ذکر موجود ہے لیکن قرآن نہ تو ملاء کے لئے نازل ہوا ہے اور نہ کسی اور طبقے کے لئے نازل ہوا ہے بلکہ مُخاطَبِ مستقیم قرآن ناس ہیں۔ اگر چہ سورہ بقرہ کے اوائل میں

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۝ (١٦)

ہے اور یہاں پر

هُدًى لِّلنَّاسِ .... (١٧)

ہے، کہیں فرمایا کہ

وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۝ (١٨)

اور یہ مسلمین کیلئے ہدایت اور بشارت ہے۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ۝ (١٩)

یہ صاحبانِ ایمان کے لئے ہدایت اور بشارت ہے۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ۝ (٢٠)

جو ان نیک کردار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

لیکن ان میں کوئی تعارض وتضاد نہیں ہے بلکہ یہ قرآنی آیات کے اندر ایک بہت خوبصورت ہم آہنگی ہے کہ آیا سب کے لئے ہے لیکن ساتھ ہی قرآن نے یہ نکتہ بھی تفہیم کر دیا کہ اگرچہ قرآن سب کے لئے ہے لیکن اس سے ہدایت لینے کی ایک شرط ہے اور وہ تقویٰ ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۳۸ میں صریحاً ارشاد فرمایا کہ

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ۝

یہ عام انسانوں کیلئے ایک بیانِ حقائق ہے اور صاحبانِ تقویٰ کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے۔

قرآن کریم میں خدا نے متقین سے جنت کا وعدہ کیا ہے اور اگر کوئی شخص قرآن مجید کا ایک دورہ صرف اسی عنوان سے کرے کہ متقین کیلئے خدا نے کیا کیا ارشاد فرمایا ہے تو اس پر عیاں ہو جائے گا کہ بہترین انجام صرف متقین کیلئے ہے۔ متقین سے متعلق چند آیت درج ذیل ہیں۔

قُلْ أَذٰلِکَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَّمَصِيْرًا٥(٢١)

کہہ دیجئے کیا یہ بہتر ہے یا دائمی جنت جس کا اہلِ تقویٰ سے وعدہ کیا گیا ہے، جو ان کیلئے جزا اور ٹھکانا ہے۔

تِلْکَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا٥(٢٢)

یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم متقین کو بنائیں گے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ٥(٢٣)

اور نیک انجام تو اہلِ تقویٰ کیلئے ہے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا٥(٢٤)

تقویٰ والوں کیلئے یقیناً کامیابی ہے۔

۹) قرآنی تقویٰ کیا ہے؟

ضمناً قرآن نے ہمیں تقویٰ کی تعریف بھی بتا دی ہے، تقویٰ حالت کا نام نہیں ہے عموماً

اخلاقیات میں تقویٰ کی بحث ایک ملکۂ نفسانی کے طور پر کی جاتی ہے، قرآنی تقویٰ ملکۂ نفسانی نہیں ہے بلکہ قرآنی تقویٰ ایک استعداد ہے کہ جو قرآن سے ہدایت پزیری اور ہدایت لینے کی صلاحیت و قابلیت کا نام ہے۔ انسان اپنے اندر جب یہ قابلیت پیدا کرے، قرآن کا مُخاطَب واقع ہو جائے اور قرآن سے ہدایت لینا شروع کر دے تو وہ انسان متقی انسان کہلاتا ہے۔ پس اس بات کو درک کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن لوحِ محفوظ سے قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ پر آیا ہے اور قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ سے عامۃ الناس تک پہنچا ہے، یہی نزولِ دُوُم قرآن ہے۔

۱۰)نزول کا مطلب

نزول کا معنیٰ وہی ہے جو عام طور پر ہمارے ذہنوں میں آتا ہے لیکن کچھ خصوصیات کے ساتھ اس کا معنیٰ ہمیں معلوم ہونا چاہئے۔ نزول در مقابلِ تعالی ہے، تعالی یعنی نیچے سے اوپر جانا، کسی چیز کا بلندی کی طرف جانا، ادنیٰ مقام سے اعلیٰ مقام کی طرف جانے کو تعالی کہتے ہیں اور اعلیٰ مقام سے، بالا مقام سے نیچے آنے کو تنزل کہتے ہیں، اس لئے اگر کوئی نیچے کھڑا ہو اور عرب زبان لوگ اس کو اوپر کی طرف بلائیں تو تَعَالَوْا کہتے ہیں، تعال یعنی اوپر آؤ اور اگر کوئی اوپر کھڑا ہوا ہو اور اسے نیچے بلانا ہو تو اس کو نَزِّلْ کہتے ہیں یعنی نیچے کی طرف آؤ، بلند مقام سے کسی شے کے نچلے مقام پر آنے کو نزول کہتے ہیں۔ یہ مادی چیزوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور غیر مادی چیزوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، یہ بغیر کسی مجازیت کے حقیقت کے طور پر استعمال ہوتا ہے چونکہ مادی چیزیں بھی کسی

نزول کا مطلب

مکانِ بلند پر ہوتی ہیں، جسمانی چیزیں عموماً ذی مکان ہیں، مادی جسمانی چیزوں کا کوئی نہ کوئی مکان ہوتا ہے لیکن غیر مادی چیزوں کا کوئی مکان نہیں ہوتا وہ غیر مکانی چیزیں ہوتی ہیں، مادی چیزوں کے نزول سے ہم آشنا ہیں کہ جیسے قرآن نے بھی یہ لفظ مادی امور کے لئے استعمال کیا ہے مثلاً مادی امور کے بارے میں بارش کا نزول ہے، اس کا واضح ترین نمونہ یہ ہے کہ انسان بادلوں سے پانی اترتا ہوا دیکھتا ہے چونکہ مکان کے لحاظ سے بادل انسان کی نسبت بلندی پر ہیں اور انہی بادلوں سے بارش کے قطرات زمین کی طرف اترتے ہیں لیکن زمین چونکہ نیچے ہے، اس کا مکان سفل یعنی پستی ہے اس وجہ سے اس کو نزولِ باران یا نزولِ ماء کہتے ہیں اور قرآن نے بھی اس کو نزولِ ماء کے عنوان سے استعمال کیا ہے،

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ......(۲۵)

یعنی اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے......

یا اس طرح کی مشابہ تعبیرات کے ساتھ لفظِ نزول استعمال ہوا ہے۔ ہمارا زیادہ تر تعلق چونکہ مادی اور جسمانی امور سے ہی ہے، اردگرد کی دنیا اور جس دنیا سے ہمارا تعلق اور سروکار ہے حتیٰ ہماری ضرورتیں، ہمارے روابط اور ہم خود بھی اسی جسمانی و مادی دنیا سے مرتبط ہیں، اس وجہ سے فوراً ہمارے ذہن میں نزولِ جسمانی ہی آتا ہے یعنی نزول کیلئے کہتے ہیں کہ ایک جسمانی چیز اوپر رکھی ہوئی تھی اور کسی نیچے کے مقام پر اتر آئی۔ یہ نزول فقط مادی چیزوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جس طرح مکانِ عالی ہے اسی طرح مقامِ عالی بھی ہوتا ہے یعنی مرتبہ و درجہ، اگر کسی شے کا درجہ عالی ہو، بلند ہو اور

نزول کا مطلب

اس بلند درجے سے اگر وہ نچلے درجے پر آجائے تو اس کو بھی نزول کہتے ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی کی عام مثالوں میں بھی غیر مادی نزول موجود ہے۔

نزول کا مطلب

اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شخص کو ایک مقام اور درجہ دیا جاتا ہے، ایک پوسٹ (post) دی جاتی ہے مگر بسا اوقات بعد میں اسی کی نااہلی یا ناقص کارکردگی کی وجہ سے وہ درجہ اس سے لے لیا جاتا ہے، بڑا درجہ لے کر اسے ایک چھوٹے درجے پر فائز کردیا جاتا ہے تو یہ اس شخص نے نزول کیا ہے یعنی یہ انسان ایک بالا درجے پر فائز تھا اور وہاں سے اس کو ہٹا کر ایک نچلے درجے پر فائز کردیا گیا ہے لہٰذا اس انسان نے نزول کیا ہے لیکن اس نزول کے معانی یہ نہیں ہیں کہ پہلے کسی فوقانی طبقے پہ تھا اور اب کسی نچلے فلور (Floor) پر آ گیا ہے یعنی کسی بلڈنگ کے اندر اوپر کی اسٹوری سے یہ نیچے آ گیا ہے، نہیں، جہاں تھا اور جس کمرے میں تھا وہیں پر ہے لیکن صرف اس کا مرتبہ نیچے آ گیا ہے، فرض کریں کہ پہلے اگر یہ صدر تھا تو اب نائب صدر ہو گیا ہے، پہلے اگر کسی ادارے کا رئیس کل تھا تو اب رئیس جز بن گیا ہے، اس کا وہ مقام نہیں رہا جو پہلے تھا لہٰذا اس نے رتبے اور درجے کے لحاظ سے تنزلِ معنوی کیا ہے۔ اس کو دیگر قسم کے مشابہ امور میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، علمی مسائل کے اندر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان ایک بڑے اعلیٰ علمی مرتبے پر فائز ہوتا ہے اور کبھی اس سے تنزل بھی کر جاتا ہے، کبھی ارتقاء و ترقی کرتا ہے، پہلے چھوٹے علمی مرتبے پر فائز ہوتا ہے اور وہاں سے ترقی کرتے کرتے اعلیٰ علمی مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔

مثلاً فرض کرلیں کہ ایک مجتہد ہے اور اعلیٰ علمی مرتبے پر فائز ہے لیکن کسی بیماری یا عارضے کی

وجہ سے، بڑھاپے یا صدمے کی وجہ سے یا کسی بھی سبب کی وجہ سے ممکن ہے کہ ملکۂ اجتہاد اس کے اندر ختم ہو جائے لہٰذا یہی شخص جو پہلے ایک اعلیٰ علمی درجے پر فائز تھا اب ایک معمولی انسان کی طرح ہے، جس طرح سے عموماً انسان بعض حادثات کے اندر اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے اسی طرح سے بسا اوقات یہ ملکۂ اجتہاد اور اجتہادی صلاحیتیں بھی کھو بیٹھتا ہے اور معمولی انسان کی طرح ایک مقلد انسان بن جاتا ہے، پس اس نے علمی مرتبے سے تنزل کیا ہے۔ بعض اوقات مقامِ تعلیم میں یہی تعبیر استعمال ہوتی ہے یعنی کسی دوسرے کو علم منتقل کرنے کیلئے یا کسی دوسرے کو سمجھانے کے موقع پر بھی یہ لفظِ نزول استعمال ہوتا ہے، مثلاً ایک انسان صاحبِ علم وفضل ہے اور عالمانہ گفتگو کرتا ہے لیکن عوام کے سامنے بے بس و مجبور ہے، ایسے بعض نمونے موجود ہیں، بعض علماء عالمانہ گفتگو کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کے سامنے کہ جو عالم نہیں ہیں، خوانخواہ ان کی عالمانہ گفتگو، اصطلاحی گفتگو، خاص علمی اصطلاحات کے اندر لپٹی ہوئی گفتگو اس عوام کے پلے نہیں پڑتی ہے، یہاں پر یا تو یہ عوام اتنا اوپر آئیں، اپنے آپ کو علمی درجے پر اتنا اوپر لے کر آئیں کہ ذہنی طور پر کہ اس عالم کے ہم سطح ہو جائیں کہ عالم وہی عالمانہ گفتگو کرے لیکن یہ غیر عالم اب اس کی عالمانہ گفتگو کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں، یہاں عُلُوِیَّت پیدا ہوئی ہے یعنی ایک نیچے کا انسان اوپر آیا ہے لیکن ایسا اتفاق کم رونما ہوتا ہے کہ مثلاً ایک عالم عوام میں جا کر عالمانہ گفتگو کرے تو عوام کہے کہ یہ ہماری سطح کے برابر نہیں ہے، وہ عالمانہ سطح پر ہے اور ہم عوامانہ سطح پر ہیں اور اس کی گفتگو ہمارے پلے نہیں پڑ رہی ہے لہٰذا ہم کوشش کر کے اپنے آپ کو اس کے ہم مرتبہ لے جائیں گے یا کم از کم اپنا علمی درجہ اتنا بڑھا لیں گے کہ اس کی گفتگو ہمیں

سمجھ میں آنا شروع ہو جائے۔

کبھی کبھی عوام میں سے اکا دکا افراد کوشش کرتے ہیں، مثلاً ان کو زبان نہیں آتی ہے تو زبان سیکھ لیتے ہیں، اگر کوئی خاص علم اس گفتگو کو سمجھنے کے لئے ضروری ہو تو وہ علم بھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن اکثریت ایسی ضرورت محسوس نہیں کرتی ہے اور اگر کچھ عرصہ اور دیکھے کہ گفتگو سمجھ میں نہیں آرہی تو گریز بھی کرتی ہے یعنی لوگ اصلاً چھوڑ دیتے ہیں اور اس گفتگو کو اپنی ضرورت ہی نہیں سمجھتے ہیں چونکہ سمجھ میں نہیں آرہی ہوتی ہے، ایسی صورت میں اس عالم کو یا اس فاضل کو اپنے علمی مقام سے عوامی سطح پر آنا پڑتا ہے یعنی اس نے گفتگو کے اندر بات وہی کرنی ہے لیکن عالمانہ لب ولہجہ چھوڑ کر، اصطلاحی گفتگو چھوڑ کر اب وہ ایک دوسری زبان اپناتا ہے، سادہ وسلیس زبان اپناتا ہے، آسان تر تعبیرات اور الفاظ چنتا ہے اور فنی وعلمی اصطلاحات کو چھوڑ کر معمول کی گفتگو کرتا ہے تاکہ ان لوگوں کو سمجھ میں آجائے لہٰذا یہاں تنزل ہوا ہے، تعالی نہیں ہوئی، لوگ اوپر نہیں آئے بلکہ اس عالم کو نیچے آنا پڑا، عالم مقام کے لحاظ سے نیچے نہیں آیا ہے چونکہ اس کا علمی درجہ محفوظ ہے بلکہ ابھی صرف اس کی گفتگو نے، اس کی تعبیروں نے، اس کے بیانات نے تنزل کیا ہے، نزول کیا ہے یعنی درجۂ بالا کی گفتگو اس درجے سے نیچے آئی ہے اور عوام کی سطح کی گفتگو میں تبدیل ہوئی ہے البتہ اب عوام کی جو بھی زبان ہو۔

نزول کا مطلب

ہم یہ اتفاق بھی دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایک عالم و فاضل گفتگو کر رہا ہوتا ہے اور کوئی اس کو تذکر دیتا ہے یا اس کو متوجہ کر رہا ہوتا ہے کہ ہمارے پلے نہیں پڑ رہی ہے لہٰذا وہ اپنا اندازِ اصطلاحی و علمی چھوڑ کر دوسری زبان میں لوگوں کو سمجھاتا ہے لہٰذا اس کو بھی تنزل کہتے ہیں لیکن یہ تنزل جسمانی نہیں

ہے، اس کے معانی یہ نہیں ہیں کہ پہلے وہ منبر پر بیٹھ کر بات کر رہا تھا اور اب منبر کے نیچے آ کر بات کر رہا ہے یا پہلے کسی بالا طبقے پہ بیٹھا ہوا تھا، کسی بلند منزل پہ تھا اور اب وہاں سے اتر کے زمین پر آ کر گفتگو کر رہا ہے، ممکن ہے کہ عالمانہ گفتگو نیچے زمین پر بیٹھ کر کر رہا ہوں یا منبر پر بیٹھ کر کر رہا ہو لیکن عالمانہ گفتگو ہمیشہ سطحِ عوام سے بالاتر ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں بھی نزولِ قرآن جسمانی نہیں ہے چونکہ حقیقتِ قرآن جسمانی نہیں ہے، قرآن ہدایت ہے، صنفِ قرآن ہدایت ہے، قرآنی جملے، قرآنی زبان، قرآنی مفاہیم، قرآنی لب ولہجہ یہ سب ہدایت کے اصناف میں سے ہیں، ہمیں راحمِ منطق نے یہ قضایہ نہیں سکھائے چونکہ ان کا کسی ہدایتی منشور سے سروکار نہیں تھا، علمِ منطق کہ جو رائج ہے اور جنہوں نے ہمیں قضایہ کی بحث سکھائی ہے وہ سارے علمی مسائل فلسفے یا کلام کے لئے ہیں یا اسی قسم کے علوم کے لئے منطق تدوین ہوئی ہے لہٰذا اس میں ایسے قضایہ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ جو ہمیں مخصوصاً قضایہ ہدایتی کی پہچان کروائیں کہ ہدایتی قضایہ کیسے ہوتے ہیں؟ ہدایتی جملے کیسے ہوتے ہیں؟ اور ان کے اجزائے اصلی کیا ہوتے ہیں؟ پس سنخِ تعبیراتِ قرآن ہدایت ہے۔

نزول کا مطلب

سادہ و آسان ترین جملے میں اگر معنیٰ کریں تو نزولِ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ غیر دسترس اور رسائی سے باہر چیز کا دسترس میں آ جانا، رسائی میں آ جانا۔ ظاہری بات ہے کہ رسائی اور دسترس سے مراد ہاتھ میں آنا نہیں ہے، یہ جسمانی دسترس نہیں ہے، جس کو ہم کہتے ہیں کہ یہ کوئی جسمانی اپروچ (Approach) نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فہم ہے، یعنی یہ انسان کی شناخت کی کمند میں آ جائے،

انسان کی شناخت کی دسترس میں آجائے، انسان کی معرفت اور علمی رسائی اس حقیقت تک ہوجائے لیکن یہ کیسے حاصل ہوگی؟ یہ فاصلہ کیسے کم ہو؟ یہ کام اس حقیقت نے خود کر دیا، یعنی ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو نازل کیا ہے، نزول یعنی دسترس میں قرار دیا ہے، دسترس میں قرار دینا یعنی علمی دسترس میں قرار دیا ہے، معرفت کی دسترس اور فہم کی دسترس میں قرار دیا ہے چونکہ یہ فہم انسان سے بالاتر تھا۔

۱۱)ہدایت کے دو پہلو

ہدایت جسمانی چیز نہیں ہوسکتی ہے بلکہ خوانخواہ غیر جسمانی چیز ہوتی ہے۔ چونکہ ہدایت کے اندر دو پہلو ہیں، اس کے اندر ایک معرفت ہے اور دوسرا اس معرفت کے ذریعے سے انسان کو تحریک دینا ہے، انسان کو اکسانا ہے کہ کسی فعل پر یا کسی کام پر حرکت کرے، ہدایت کے یہ دو کام ہیں، فقط حرکت دینا ہدایت نہیں ہے اور فقط معرفت بھی ہدایت نہیں ہے، وہ معرفت جس کے نتیجے میں انسان کے اندر حرکت پیدا ہو، ارتقاء پیدا ہو تو اس کو ہدایت کہیں گے یعنی ایسی معرفت کہ جو انسان کو ایک ادنیٰ نقطے سے کسی اعلیٰ اور بلند نقطے کی طرف منتقل کرے، لامحالہ ایسی چیز جسمانی نہیں ہوسکتی ہے چونکہ معرفت جسمانی و مادی نہیں ہے بلکہ غیر مادی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت تک پہنچنے کے دو طریقے ہیں۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان حقیقتوں تک پہنچے لیکن حقیقتیں تو اپنے خاص عالم میں ہیں اور ہر

حقیقت کا اپنا ایک مقام ہے، چونکہ اس عالم میں پوری کائنات حقائق سے ترتیب یافتہ ہے اور کائنات کے سب کے سب موجودات حقائق ہیں، ہدایت حقائق میں سے ہے، علم حقائق میں سے ہے، یہ ساری حقیقتیں ہیں اور حقائق تک رسائی دو طریقوں سے ممکن ہے، ایک یہ ہے کہ حقائق اپنے مقام پر ہی رہیں اور انسان ان حقائق کی طرف سفر کرے، اس صورت میں انسان تکامل کرتا ہے یعنی انسان بڑا ہوتا ہے، انسان ترقی وارتقاء کرتا ہے چونکہ انسان کا مقام حقائق سے نیچے تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو اتنی ترقی دی اور خود کو اتنا اوپر لایا کہ حقائق اس کو سمجھ میں آنا شروع ہو گئے، اس نے حقائق کو دیکھنا شروع کر دیا، حقائق کو سمجھنا شروع کر دیا اور حقائق کو اپنانا شروع کر دیا۔

۱۲)علم کی تعریف

چونکہ اس گفتگو کا متن ہم نے صدرالمتالہینؒ کی کتاب مفاتیح الغیب سے اختیار کیا ہے کہ جو قرآنی حقائق کے بارے میں ہے اور اس کا ایک باب آدابِ فہمِ قرآن کے نام سے ہے، اس میں صدرالمتالہینؒ نے یہ مطلب دوسرے حکماء سے زیادہ واضح تر بیان کیا ہے، چونکہ ہم نے علم کے بارے میں تعلیمی دنیا میں بھی اسی طرح سنا ہوا ہے اور علم کی تعریف بھی ایسے ہی کی گئی ہے کہ جس کی وجہ سے یہ مطلب ہمارے ذہنوں میں پکا بیٹھا ہوا ہے کہ علم انسان تک آتا ہے، علم کی تعریف بھی یوں کرتے ہیں کہ

اَلعِلمُ هُوَ حُصُولُ صُورَةِ الشَّيْءِ عِندَ العَقلِ ...(۲۶)

کسی چیز کی صورت کا عقل میں آجانا علم کہلاتا ہے......

اِنَّ الْعِلْمَ هُوَ الصُّوْرَةُ الْحَاصِلَةُ مِنَ الشَّیْءِ عِنْدَ الْعَقْلِ......(۲۷)

بتحقیق علم سے مراد عقل میں کسی چیز سے حاصل ہونے والی صورت ہے۔

اَلْعِلْمُ هُوَ : حُضُوْرُ صُوْرَةِ الشَّیْءِ عِنْدَ الْعَقْلِ......(۲۸)

علم کسی شے کی صورت کا عقل میں حاضر ہونا ہے۔

ان کا مطلب یہ ہے کہ صورتِ شے حاصل ہوتی ہے، عقل کے پاس علم آتا ہے یعنی حقیقت اپنی جگہ پر ہے، انسان اپنے گھر میں ہے اور وہاں سے صورتِ علمی اٹھ کر انسان کے ذہن میں منتقل ہوتی ہے، صدر المتالھینؒ فرماتے ہیں کہ یہ اشتباہ ہے، علم کبھی بھی انسان کی طرف نہیں آتا ہے بلکہ انسان علم کی طرف جاتا ہے اور حقیقت کی طرف جاتا ہے، اسی لئے علم کے ذریعے سے انسان کو تکامل حاصل ہوتا ہے ورنہ اگر انسان اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور علم اس کے پاس بار بار آتا جاتا رہے تو انسان تو وہیں رہے گا لیکن علم ترقی کرتا جائے گا، چونکہ ترقی وہ کرتا ہے کہ جس میں حرکت ہوتی ہے لہٰذا انسان علم کی طرف جاتا ہے نہ کہ علم انسان کے پاس آتا ہے۔

بعض بزرگ حکماء نے اپنے علمی فرزندوں کے لئے، غیر صلبی اولاد کے لئے وصایا لکھیں ہیں مثلاً امام خمینیؒ نے اپنے معنوی پیروکاروں کے لئے لکھا اور اولاد کیلئے وصیت نامہ لکھا ہے یعنی جو بھی اسلامِ ناب کو قبول کرنے والا ہے، قرآن اور اسلامِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبول کرنے والا ہے ان سب کے لئے یہ وصیت نامہ ہے، اسی طرح ان حکماء نے اپنی علمی اولاد کے لئے کہ جو ان کے علم سے اور

ان کی کتب سے استفادہ کرتے ہیں وصیت نامہ لکھا کہ علم اور چیز ہے اور عبارتیں واصطلاحیں اور چیز ہیں، کہیں ان کو آپس میں مخلوط نہ کر بیٹھنا۔

پس علم کی تعریف بھی الگ ہے یعنی اَلْعِلْمُ نُوْرٌ، علم نور ہے لیکن اصطلاحی نور نہیں ہے، عبارتی نور نہیں ہے، حکماء نے بھی علم کو نور کہا ہے اور اتفاق سے ائمہ ھدیٰ علیہم السلام سے بھی یہی تعریف منقول ہے، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی علم کی یہی تعریف بیان فرمائی ہے کہ

اَلْعِلْمُ نُوْرٌ......(۲۹)

علم نور ہے......

دنیا میں ایسے لوگ فراواں ہیں کہ جن کے پاس معلومات کے کثیر ذخیرے اور قوی حافظے ہیں، بہت سارے لوگوں کو خدا نے یہ صلاحیتیں دی ہوئی ہیں، دنیا میں ایک ریکارڈ بک ہے کہ جس کے اندر دنیا کے بڑے بڑے بے نظیر اور بے مثل قسم کے کارنامے یا اعمال درج کئے جاتے ہیں اور یہ ہر سال چھپتے ہیں، یہ کتاب گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز (Guinness Book of World Records) کے نام سے ہے یعنی جو بھی ایسا کام کرے کہ جو دوسرے عام لوگ نہ کر سکتے ہوں اسے اسی کے نام سے اس کتاب میں درج کر دیا جاتا ہے، اگر مطالعہ کرنا ہے تو اس کو پڑھیں، بعض زبانوں میں ترجمہ بھی ہوتی ہے، بڑی دلچسپ اور پڑھنے کی کتاب ہے، اس پر عمل نہیں کرنا لیکن معلومات کے لئے پڑھنا ہے، کبھی اس میں نام لکھوانے کی کوشش مت کرنا، اس میں ایک ریکارڈ جو ہر سال قائم ہوتا ہے مثلاً ایسے افراد کے ریکارڈز کہ جن کو ٹیلیفون نمبرز زیادہ سے زیادہ یاد ہوں، یہ آدمی

ایک پوری ڈائرکٹری (Directory) ہوتا ہے، مثلاً ایک انسان ایسا ہے کہ جس کو نوے ہزار ٹیلیفون نمبرز یاد ہیں اور وہ بھی پورے انکے مشخصات کے ساتھ، مثلاً اسے یہ بھی پتہ ہے کہ یہ نمبر کس انسان کا ہے، یہ نمبر کس شہر کا ہے، عورت کا ہے یا مرد کا ہے، بچے کا ہے یا جوان کا ہے، ادارے کا ہے یا گھر کا ہے، ان ساری خصوصیات کے ساتھ اس کو نوے ہزار نمبرز ازبر ہیں اور ہمیں نو نمبر بھی یاد نہیں ہوتے ہیں اور کبھی اپنا نمبر بھی بھول جاتے ہیں لیکن اس انسان کو نوے ہزار نمبرز پوری خصوصیات، پوری ڈیٹیل (Detail) کے ساتھ یاد ہیں، ہم اس سے متاثر تو بہت ہوتے ہیں لیکن آیا ہم اس کو علم کہیں گے کہ نوے ہزار ٹیلیفون نمبرز کسی نے رٹ لئے ہوں؟ یا اسی بک میں ہے کہ ایک بچے کو تمام ممالک کے دارالخلافے ازبر ہیں، مثلاً پانچ سال کا بچہ ہے، ہمیں تو یہ بھی نہیں پتہ ہے کہ دنیا میں کتنے ملک ہیں؟ بظاہر اس کی توقع نہیں ہے یعنی اس بات کا شائبہ تک نہیں ہے، کیوں کسی کو شعور نہیں ہے؟ اس لئے کہ سروکار نہیں ہے لیکن اگر کسی کو معلوم ہو کہ دنیا میں اس وقت کتنے ملک ہیں؟ البتہ یہ معلومات ہونی چاہئیں، اپ ڈیٹ (Update) رہنے کے لئے کم از کم اتنا پتہ ہو کہ جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں کتنے ممالک ہیں لیکن بعض لوگوں کو ان ممالک کی خصوصیات بھی پتہ ہیں مثلاً اتنے ملک ہیں، ہر ملک کا یہ دارالخلافہ ہے، اس کا رقبہ یہ ہے، اس کے پڑوسی یہ ہیں، اس کے اندر معدنیات یہ ہیں، یہ ساری خصوصیات ازبر ہیں، کیا یہ علم ہے؟ یہ علم نہیں ہے۔

اسی طرح ایک انسان کو مثلاً پوری پوری کتابیں حفظ ہوں، اس نے رٹا ہوا ہو تو یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے اس نے نوے ہزار ٹیلیفون نمبرز یاد کئے ہوں، یہ علم نہیں ہے، یہ ایک مہارت ہے اور اچھی

مہارت ہے، اس پہ اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے اور حوصلہ افزائی بھی یہ کہ تالیاں بجادو، یہ مہارت اس سے زیادہ کی حقدار نہیں ہے لیکن یہ علم نہیں ہے بلکہ علم نور ہے۔

لہٰذا اگر انسان یہ کام کرے تو بہترین کام ہے یعنی بہت ہی مطلوب حالت ہے، جس کو عام زبان میں بڑی آئیڈیل (Ideal) صورت کہتے ہیں کہ انسان اٹھے اور حقیقت کی طرف سفر کرے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں انسان کو اپنے آپ کو حقیقت کی سطح تک بلند کرنا پڑے گا، ارتقاء و ترقی انسان کے لئے ضروری ہے، انسان کے اندر خوانخواہ تکامل آئے گا اور ایسے ہی ہوتا ہے مثلاً پہلے بچے تھے تو نہیں سمجھتے تھے، حقائق ہم سے بڑے تھے لیکن اس بچپنے سے جب ہم نے بلوغ میں نے قدم رکھا تو آج بہت ساری چیزیں ہمیں سمجھ میں آنا شروع ہوگئی ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ارتقاء کیا ہے اور ہمارے اندر تکامل آیا ہے ورنہ اگر ہم بچے ہی رہتے اور یہ ساری چیزیں ہم تک آ پہنچتیں تو چیزیں ترقی کر جاتیں اور ہم وہیں رہتے۔ صنعتی دنیا یہی کام کر رہی ہے، صنعتی دنیا میں انسان نے کوئی ترقی نہیں کی ہے، لوگ یہ جملے بھی کہتے ہیں کہ انسان اتنی ترقی کر گیا ہے، مغرب نے ترقی کی ہے اور مشرق کو غلط فہمی ہوگئی ہے، مغربی انسان اتنی ترقی کر گیا ہے، حالانکہ انسان نے تو ترقی نہیں کی ہے بلکہ انسان کے وسائل نے ترقی کی ہے، گاڑیاں ترقی کر کے کہاں سے کہاں جا پہنچی ہیں، ٹیلیفون لائنیں ترقی کر کے کہاں سے کہاں جا پہنچی ہیں، مواصلاتی نظام ترقی کر کے کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے لیکن انسان تو وہیں ہے۔ وسائل انسان کی طرف آرہے ہیں نہ کہ انسان کہیں جا رہا ہے۔ جو حرکت کرتا ہے وہ ترقی کرتا ہے لیکن جو بیٹھا ہوا ہے وہ ترقی نہیں کر سکتا ہے۔

۱۳)بعض اوقات حقیقت خود تنزل کرتی ہے

پس ایک صورت یہ ہے کہ حقیقت انسان تک پہنچے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان حقیقت تک پہنچے، اس صورت میں انسان ترقی کرتا ہے لیکن بعض حقیقتیں ایسی ہیں کہ انسان پہلے قدم میں اتنی ترقی نہیں کرسکتا ہے کہ ان حقائق تک پہنچے، وہاں پر دوسرا انظام یا دوسرا عمل شروع ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حقیقت انسان تک پہنچائی جاتی ہے نہ کہ انسان حقیقت تک پہنچتا ہے، یہ دو مطلب اگر ہمیں سمجھ میں آجائیں تو بہت سارے راز سمجھ میں آجائیں گے اور ہم بہت ساری چیزوں کو سمجھنے کے قابل بھی ہو سکتے ہیں۔ کچھ حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں کہ پہلے قدم پر انسان اتنی ترقی نہیں کرسکتا ہے مثلاً خالی ہاتھ اتنی ترقی کرے کہ ان حقائق سے جا متصل ہو، ان حقائق کے بارے میں بھی انسان کیلئے معرفت ضروری ہے بالآخر انسان کو وہ حقائق بھی سمجھنا چاہئیں، ان حقائق سے واسطہ بھی ہے اور وہ حقائق انسان کی زندگی سے مربوط ہیں۔ یہاں پر ظاہر ہے کہ انسان جب حقیقت تک پہنچے تو خود ترقی کرتا ہے لیکن جب حقیقت انسان کی طرف آئے تو حقیقت تنزل کرتی ہے، حقیقت کو انسان کی سطح پر آنا پڑتا ہے۔

بعض اوقات حقیقت خود تنزل کرتی ہے

۱٤)کشف کرنے اور انکشاف ہونے میں فرق

اس مطلب کو ذرا اور سادہ وآسان کر کے بیان کرتے ہیں کہ واضح طور پر سمجھ میں آجائے۔

دو لفظ ہم اپنی عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں، ایک کشف اور ایک انکشاف، عام اردو میں ہم یہ لفظ استعمال کرتے ہیں کہ میں نے یہ حقیقت کشف کی، اس حقیقت کا مجھ پر انکشاف ہوا۔ ان

دونوں جملوں میں بہت فرق ہے کہ یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی اور یہ حقیقت میں نے کشف کی، میں اگر وضاحت نہ بھی کروں تو بھی سننے والے کو صاف فرق محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ کیا کہنا چاہتا ہوں، یہ حقیقت میں نے کشف کی یعنی حقیقت جہاں تھی وہیں رہی لیکن میں اس کی طرف گیا اور میں نے اسے کشف کرلیا۔ کشف کرنا یعنی اس کی راہ میں جو حجاب تھے، اس کی راہ میں جو پردے تھے اور رکاوٹیں تھیں وہ ساری میں نے دور کیں، پردے ہٹا کر میں اس حقیقت تک اور اس راز تک پہنچ گیا۔ بہت ساری چیزیں انسان نے کشف کی ہیں، یہ حقائق تھے کہ جو خدا نے بنائے ہوئے تھے اور صدیوں سے انسان ان حقائق کو نیچے دبا کر اوپر بیٹھا ہوا تھا، اوپر زندگی بسر کر رہا تھا اور دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔

یہ تیل زمین کے نیچے تھا اور عرب اوپر اونٹ دوڑاتے تھے، تیل نیچے موجود تھا لیکن وہ اس تک نہیں پہنچ سکے، بعد میں کچھ تعلیم یافتہ لوگ آئے اور انہوں نے زمین کھود کر پردے ہٹائے، ریت ہٹائی یعنی پہلے جہالت کا پردہ ہٹایا پھر زمین کا پردہ ہٹایا، اس زمین کے اندر گھسے اور تیل کشف کرلیا، اس کو کہتے ہیں کہ یہ کشف کیا ہے۔ اسی طرح انسان نے مادی دنیا کے اندر بہت ساری چیزیں کشف کی ہیں مثلاً بہت سارے سیارے، ستارے اور کہکشائیں ایسی موجود ہیں کہ جو آج انسان نے کشف کی ہیں، یہ پہلے بھی موجود تھیں لیکن اندھیروں میں اور کئی ہزار ملین سال دور تھیں لیکن انسان نے دقیق آلات واوزار بنائے اور ان کی مدد سے انہیں کشف کرلیا۔ انسان نے حقیقتیں کشف کی ہیں، ایجاد نہیں کی ہیں، وہ پہلے سے موجود تھیں لیکن پنہاں تھیں اور ان کے اوپر پردے تھے، طبعی پردے،

عالمِ طبیعت کے پردے، جسمانیت و مادیت کے پردے تھے اور انسان نے کوشش کر کے ان کو کشف کیا۔

لیکن کچھ حقیقتیں خود اپنے آپ کو انسان پر پیش کرتی ہیں، یہ کونسی حقیقتیں ہیں کہ جو انسان کے کشف کے انتظار میں نہیں ہیں؟ یہ وہ حقیقتیں ہیں کہ جو انسان کے لئے ضروری ہیں، جن کے بغیر انسان کی زندگی بسر نہیں ہوتی ہے اور اگر انسان ان سے محروم رہے تو ہلاکت میں پڑ جائے گا اور اگر اتنا انتظار کرے کہ خود انسان ان تک پہنچے تو پھر انسان کو ان حقائق تک پہنچنے کے لئے طویل عمر لگے گی یا شاید اصلاً پہنچ ہی نہ سکے، ایسی حقیقتوں کو خود منکشف ہونا پڑتا ہے، خود حقیقت کو انسان کی طرف آنا پڑتا ہے، حقیقت اپنے رخ سے خود حجاب ہٹاتی ہے، خود بر سرِ انسان اور نظرِ انسان کے سامنے آتی ہے تاکہ انسان کے سامنے آکر اپنی آرائش کرے اور انسان اس کی طرف توجہ کریں، اس کی طرف جذب ہوں اور اس سے استفادہ کریں، مثلاً سورج انسان نے کشف نہیں کیا ہے، کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ سورج فلاں کا کشف ہے، یہ کسی سائنسدان، کسی عالم نے کشف نہیں کیا بلکہ سورج خود انسان پر منکشف ہوا ہے یعنی خود حقیقت انسان پر منکشف ہوئی ہے، انسان کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اگر انسان حقیقت کو کشف کرے تو یہ ارتقائے انسان ہے لیکن اگر انسانی زحمت کے بغیر خود حقیقت انسان پر منکشف ہو تو یہ نزولِ حقیقت ہے اور اسی کو نزول کہتے ہیں۔

کشف کرنے اور انکشاف ہونے میں فرق

۱۰)کتابِ مکنون کا معنیٰ

قرآن مجید نے خود اپنا تعارف سورۂ مبارکہ واقعہ میں آیت ۷۷ اور ۷۸ میں اس طرح کروایا ہے کہ

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌO

یہ بڑا محترم قرآن ہے۔

فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍO

جسے ایک پوشیدہ کتاب میں رکھا گیا ہے۔

یہ کتاب مکنون میں ہے، مکنون پردے کی جمع ہے، مکنون یعنی پردے میں محجوب چیز، پردے کے پیچھے چھپی ہوئی پنہاں چیز، یہ کتابِ مکنون ہے یعنی پنہاں چیز ہے، سادہ تعبیر میں کتابِ مکنون سے مراد یہ ہے کہ یہ معمولی انسان کی دسترس سے باہر ہے، جیسے بہت سارے حقائق زمین کے نیچے تھے اور سابقہ نسلوں کی دسترس سے باہر تھے لیکن اِس نسل نے ان تک رسائی کی ہے، اسی طریقے سے یہ قرآن حقیقت ہے،

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌOفِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍO

یہ بڑا محترم قرآن ہے۔ جسے ایک پوشیدہ کتاب میں رکھا گیا ہے۔

قرآن مکنون میں ہے یعنی پردوں اور حجابوں کے پیچھے ہے، اس حالت میں یہ کتاب مکنون ہے یعنی دسترس سے باہر کتاب ہے،

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝(۳۰)

اسے پاک و پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے۔

یہ کتاب ہر ایک کی دسترس سے باہر ہے مگر ان لوگوں کی دسترس سے باہر نہیں ہے کہ جن کی تطہیر کی گئی ہے، جنہیں پاک کیا گیا ہے، مطہرون یعنی پاک ہستیاں، پاک ذاتیں، پاک نفوس اور پاک موجودات، پس نزول کے بغیر قرآن ایک حقیقت ہے، ایک حقیقتِ پنہاں، حقیقتِ مکنون اور پردوں کے نیچے اس حقیقت تک کسی کی رسائی نہیں ہے،

لَا يَمَسُّهٗٓ......

اس تک کسی کی رسائی نہیں ہے،

اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

مگر پاکیزہ موجودات کی ہے، شناختہ شدہ موجودات میں ایک ملائکہ ہیں کہ جو پاکیزہ ہیں اور ان کے اندر ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ جو انہیں قرآن کی حقیقت تک پہنچنے سے روکے البتہ شاید سب ملائکہ بھی نہ ہوں بلکہ ملائکہ مقربین ہوں کہ جن کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، مسلم حقیقت ہے کہ ملائکہ مقربین وہ پاکیزہ موجودات ہیں اور ان کی رسائی وہاں تک ہے اور پھر قرآن نے مطہرون کا ایک طبقہ متعارف کرایا ہے، سورۂ مبارکہ احزاب آیہ ۳۳ میں ہے کہ

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝

بس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہلبیتؑ کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ

رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

یعنی کچھ انسان، کچھ نفوس کہ جو اہلبیت علیہم السلام کے عنوان میں آتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ خدا نے ان کو پاکیزہ کیا ہے، خدا نے ان کی تطہیر کی ہے کہ جو معلوم ہیں کہ یہ مطہرین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خاندانِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، انشاء اللہ فصلِ ادبِ دوم میں تطہیر کا اور اسی مضمون کا معنیٰ بیشتر ہو جائے گا کہ قرآن کے لئے جس تطہیر کی ضرورت ہے اس سے کیا مراد ہے؟ یہاں اتنا جان لینا ضروری ہے کہ قرآن نے اپنا تعارف خود کروایا ہے کہ یہ حقیقتِ مکنون تھی اور سوائے مطہرون کے قابلِ دسترس نہیں تھی۔ مطہرون ملائکہ ہیں یا اہلبیت علیہم السلام ہیں لیکن ادھر سے قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ ناس کے لئے ہدایت ہے،

هُدًى لِّلنَّاسِ.....

پھر کہتا ہے کہ یہ ناس کی دسترس سے باہر ہے،

لَّا يَمَسُّهُ......

کوئی مس نہیں کرسکتا ہے، پس یہ کتاب ہدایت ہے لیکن جس طبقے کے لئے ہدایت ہے اس کی دسترس سے باہر ہے کیونکہ یہ مطہرون میں سے نہیں ہے، ہم جیسے لوگ مطہرون میں سے نہیں ہیں یعنی قرآن ایک مکنون، عالی اور بلند حقیقت ہے لیکن جس طبقے کے لئے ہدایت ہے وہ نیچے اور پستی میں ہے، اب یہ طبقہ اس انتظار میں رہے کہ اپنے آپ کو اس حقیقت تک پہنچائے یعنی یا فرشتہ بنے یا مثلاً اہلبیت علیہم السلام کی طرح پاکیزہ ہو جائے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے، پس کیا کیا جائے؟ جب انسان ترقی

کر کے اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا ہے تو لامحالہ اس حقیقت کو انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے یعنی انسان کتابِ مکنون کو کشف نہیں کرے بلکہ کتابِ مکنون اپنے آپ کو انسان کے سامنے منکشف کرے، نمایاں کرے اور کھل کے انسان کے سامنے آجائے اور نزول کا معنیٰ بھی یہی ہے۔

١٦) لَّا يَمَسُّهٗۤ سے مراد

خدا نے قرآن کا یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ

اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌۙ‏o فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍۙ o لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَؕ‏o

یہ بڑا محترم قرآن ہے۔ جسے ایک پوشیدہ کتاب میں رکھا گیا ہے۔اسے پاک و پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے۔

قرآن کا وضو کے بغیر مسِ ظاہری بھی نہیں کرنا چاہئے، یہ حکمِ شرعی ہے، نہی کی گئی ہے کہ اگر آپ کا بدن خبث و حدث سے پاک نہیں ہے تو آپ الفاظِ قرآن کو مس نہ کریں لیکن سورۂ واقعہ میں جو فرمایا گیا ہے کہ

لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَؕ‏o

اس لَّا يَمَسُّهٗۤ سے مراد کتاب کو ہاتھ سے چھونا نہیں ہے بلکہ فہم ہے یعنی فہمِ ناپاک قرآن کو مس نہیں کر سکتا ہے، یہ بھی ایک محاورے کی زبان ہے کہ اگر بات دشوار ہو تو کہتے ہیں کہ آپ کی بات کو ذہن نے چھوا بھی نہیں ہے یا اس مطلب نے چھوا بھی نہیں ہے یعنی یہ مطلب ذہن کی گرفت سے

باہر ہے، سمجھ جانا ذہن کو چھونا ہے، مس کرنا ہے، مسِ ذہنی، مسِ عقلی، مسِ علمی، مسِ فہم، نہ کہ مسِ جسمانی ہے یعنی انسانِ پاکیزہ ہی اس کو سمجھ سکتا تھا اور غیر پاکیزہ انسان اس کے تعقل سے اور اس کے فہم سے قاصر تھا لیکن خداوند تبارک وتعالیٰ نے ایک بہت بڑا لطف کہ جو انسانیت اور بشریت پر کیا وہ یہ ہے کہ قرآن یعنی اس حقیقتِ مکنون کو نازل کیا، منکشف کیا اور انسان کی سطح پر لے آیا، چونکہ انسانی فہم کے کچھ اپنے لوازمات ہیں، انسانی فہم کے لوازمات یہ ہیں کہ ایک چیز پہلے فہم کی شکل میں ہو، مفہومی صورت اختیار کرے اور وہ مفاہیم بھی لفظی قالب میں، لفظی شکل میں انسان کے سامنے آئیں، جب تک کوئی حقیقت لباسِ مفہوم نہیں پہنتی تو وہ حقیقت ہی ہے اور انسانی رسائی سے باہر ہے یعنی جب تک وہ مفہوم لفظی لباس نہیں پہنتا، لباسِ الفاظ نہیں پہنتا ہے تو اس وقت تک انسان کی فہم سے باہر ہے لہٰذا قرآن کا نزول ہوا یعنی وہ حقیقتِ مکنونہ مفہوم بنی اور اس نے معانی کی شکل اختیار کی اور یہ معانی قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ پر اترے البتہ یہ اتارنے کے لئے بیچ میں ایک وسیلہ چاہئے تھا، اس سے حقیقتِ وحی کی طرف ایک ضمنی اشارہ ہوتا ہے، اس موضوع کی طرف ابھی ہم نہیں جاتے لیکن انسان ضمناً متوجہ ہوتا ہے کہ حقیقتِ وحی کیا ہے؟

۱۷)نزولِ قرآن کی ضرورت

وحی ڈاک پہنچانا نہیں ہے کہ خداوند عالم نے پیغام دیا کہ یہ انسانوں تک لے جائیں، گویا خود خدا کی معاذ اللہ انسانوں تک رسائی نہیں تھی، اسی آیۂ شھر رمضان کے ذیل میں ہے کہ

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا

لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ......(۳۱)

اور اے پیغمبر! اگر میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں ان سے قریب

ہوں۔ پکارنے والے کی آواز سنتا ہوں جب بھی پکارتا ہے لہٰذا مجھ سے طلب قبولیت کریں اور مجھ ہی پر

ایمان واعتماد رکھیں......

لہٰذا پہلے ذکر کیا کہ ہم نے قرآن نازل کیا ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتَابِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتَابِ

الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ......(۳۲)

اے ایمان والو! اللہ، رسول اور وہ کتاب جو رسول پر نازل ہوئی ہے اور وہ کتاب جو اس سے پہلے

نازل ہو چکی ہے سب پر ایمان لے آؤ......

نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ

وَالْاِنْجِیْلَ o(۳۳)

اس نے آپ پر وہ برحق کتاب نازل کی ہے جو تمام کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور

توریت وانجیل بھی نازل کی ہے۔

اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتَابَ... ..(۳۴)

بیشک میرا مالک ومختار وہ خدا ہے جس نے کتاب نازل کی ہے......

نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ......(۳۵)

کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے......

نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ .....(۳۶)

جس پر قرآن نازل ہوا ہے......

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ......(۳۷)

بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا ہے......

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ......(۳۸)

اے رسولؐ کہہ دیجئے کہ جو شخص بھی جبریلؑ کا دشمن ہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جبریلؑ نے آپ کے دل پر حکم خدا سے قرآن نازل کیا ہے......

خدا نے قرآن کو قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا ہے اور جبرئیلؑ کے ذریعے سے نازل کیا، بیچ میں واسطے کیوں پڑے ہیں؟ اس وجہ سے کہ ان کے بغیر نزول ممکن ہی نہیں تھا، عام آدمی کی سطح تک حقیقت کا نزول یعنی حقیقت کا منکشف ہونا اس کے علاوہ ممکن ہی نہیں تھا لہٰذا نزول کے لئے بیچ میں واسطہ ضروری تھا، یہ وسائل نزولِ قرآن تھے، جس طرح بعد میں یہی وسائلِ ارتقائے انسان بنیں گے پس نزولِ قرآن ہوا یعنی قرآن انسان کی فہم کی سطح تک آگیا ہے۔ اب اگر انسان اس کو سمجھنا چاہے تو سمجھ سکتا ہے لیکن اس نزول کے بہت سارے لوازمات ہیں، اس کے لئے قلب چاہئے، ذریعہ چاہئے، واسطہ چاہئے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ساتھ ایک چیز جو قرآن مجید نے اس

کیلئے متعارف کروائی ہے وہ یہ ہے کہ نزول کیلئے زمانِ مناسب چاہئے، یہ قرآن ایک زمانِ مناسب میں قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے کہ جسے شہر رمضان یا لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔

پس رمضان ماہِ نزولِ قرآن ہے یعنی ماہِ فہمِ قرآن ہے، رمضان میں قرآن سمجھ میں آتا ہے، یہ زمان ضروری ہے، یہ زمان فہمِ قرآن کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور اس ماہ میں انسان کے اندر فہمِ قرآن کے لئے جو آمادگی پیدا ہوتی ہے وہ ہر زمانے سے بیشتر ہے بلکہ باقی تمام زمانوں کے لئے یہ ضروری ہے، چونکہ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ نورانی پر لیلۃ القدر میں نازل ہوا اور پھر تدریجاً جو آیات نازل ہوئیں وہ خارج از رمضان بھی نازل ہوئی ہیں، قرآن تیئس سالوں میں نازل ہوا ہے لیکن وہ تیئس سالہ نزول رمضانی نزول کا نتیجہ ہے یعنی تیئس سالہ نزولِ تدریجی و تفصیلی اس رمضانی نزول کا رہینِ منت ہے۔ یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عام انسان کے لئے بھی ہے چونکہ اب قرآن کو قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نازل ہونا ہے اور قلبِ مومن تک آنا ہے، یہ بھی قرآن کا ایک اور تنزل ہے چونکہ قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تو مومن کی بھی رسائی نہیں ہے۔

۱۸)لوگوں کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا طرزِ گفتگو

امام صادق علیہ السلام کی حدیث کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی اپنی کُنہ عقل کے ساتھ لوگوں سے خطاب نہیں کیا،

مَا كَلَّمَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الْعِبَادَ بِكُنْهِ عَقْلِهِ قَطُّ.(۳۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ بیان فرمایا وہ بس لوگوں کی عقلوں کی صلاحیت کے مطابق فرمایا ہے۔

یعنی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حقیقتِ عقل، اپنی عقل کی گہرائی کے ساتھ کبھی بھی انسانوں سے گفتگو نہیں کی ہے چونکہ اس عقل کی گہرائی سے گفتگو ہو تو انسانوں کے پلے نہیں پڑتی بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

إِنَّا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ أُمِرْنَا أَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلَىٰ قَدْرِ عُقُولِهِمْ......(۴۰)

بے شک! ہم گروہ انبیاء اس بات پر معمور ہیں کہ ہم لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں......

یعنی انبیاء علیہم السلام لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق مطالب کو تنزل دیتے ہیں، لوگوں کو چاہئے کہ ہماری ذہنی سطح پر آجائیں لیکن یہ لوگوں کے لئے دشوار ہے پس ہم مطالب کو آسان کرتے ہیں اور لوگوں کے لئے قابلِ فہم بنا دیتے ہیں لہٰذا قرآن کا نزولِ عمومی اور نزولِ خصوصی ہے، پہلے یہ لوحِ محفوظ سے یا کتابِ مکنون سے قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آیا اور اب قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قلوبِ مومنین تک بھی انہی دو مرحلوں میں آئے گا، ممکن ہے ایک انسان کو قرآن پوری عمر میں جا کر سمجھ آجائے، ممکن ہے چند سال لگ جائیں مثلاً قرآن سمجھتے ہوئے یا قرآن کو اپنی زندگی کا منشور بناتے ہوئے تیئیس سال لگ جائیں کہ خوانخواہ یہ کام تدریجاً ہوگا لیکن اس کے لئے نزولِ رمضانی و نزولِ لیلۃ القدر مقدمہ بنے گا، اگر یہ نزول نہیں ہوا تو وہ تدریجی بھی نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے

ماہِ رمضان ماہِ فہمِ قرآن ہے۔

۱۹)قرآن فہمی کیلئے آمادگی کی ضرورت

خداوند عالم نے قرآن میں فرمایا ہے کہ

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّھۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ......(۴۱)

پس خدا جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے......

پھر سورہ انشراح میں فرمایا کہ ہم نے قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ کو آمادہ کیا،

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ٥(۴۲)

کیا ہم نے تیرے لئے تیرے سینے کو کشادہ نہیں کر دیا۔

یعنی ہم نے صدرِ پیغمبر اکرم ﷺ، سینہ پیغمبر ﷺ وقلبِ پیغمبر ﷺ کو قرآن کے نزول کے لئے آمادہ کیا اور پیغمبر اکرم ﷺ سے بھی فرمایا کہ آپؐ اپنے آپ کو آمادہ کریں،

وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَھَجَّدۡ......(۴۳)

اے نبی ﷺ آپؐ اپنے آپ کو آمادہ کریں، رات کی فرصت سے فائدہ اٹھائیں، کیوں؟

اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ٥ اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیۡلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّاَقۡوَمُ قِیۡلًا٥(۴۴)

ہم عنقریب تمہارے اوپر ایک سنگین حکم نازل کرنے والے ہیں۔ بیشک رات کا اٹھنا نفس کی پامالی کے لئے بہترین ذریعہ اور ذکر کا بہترین وقت ہے۔

چونکہ بہت ہی گراں چیز آپؐ کے قلبِ نورانی پہ اترنے والی ہے لہٰذا اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں چنانچہ خود پیغمبر ﷺ نے بھی اپنے آپ کو آمادہ کیا اور ذاتِ خدا نے بھی آپؐ کو آمادہ کیا، جب قلبِ نورانی پیغمبر ﷺ آمادہ ہو گیا تو یہ حقیقتِ مکنون اس قلبِ نورانی پہ نازل ہو گئی، اب قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ سے مومن کے قلب پہ یعنی میرے اور آپ کے قلب پہ یہ قرآن تب اترے گا جب ہم بھی اپنے قلوب کو آمادہ کریں گے، ہم جب تک اپنی فہم کو آمادہ نہیں کریں گے اس وقت تک قرآن تو رہے گا، قرآن کو پڑھیں گے بھی، حافظ بھی بنیں گے اور سب کچھ کریں گے لیکن قرآن نازل نہیں ہوگا، یہ نزول کئے بغیر ہمارے اروگرد رہے گا اور مہجور و متروک رہے گا لہٰذا مہجوریت سے نکالنے کے لئے فہم کو آمادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ امور انجام دینے کی ضرورت ہے کہ جن کے ذریعے سے اس قولِ ثقیل کو قبول کرنے کے لئے انسانی فہم آمادہ ہوتی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں عام مومنین کو بھی یہی خطاب ہے کہ اے ایمان والوں، یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا......

وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَهَجَّدْ......

آپ بھی رات کی فرصت سے فائدہ اٹھاؤ،

اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا○

یہ رات کی فرصت آپ کے لئے بہت مناسب ہے، اس فرصت سے اپنے دلوں کو تیار کرو، اپنی فہم کو تیار کرو، کیوں؟ کیونکہ ہم آپ کے دلوں میں بھی وہ قولِ ثقیل نازل کرنے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب فہم آمادہ نہیں ہوگی تو یہ قولِ ثقیل کے قابل نہیں ہوگی، غیر آمادہ فہم کے لئے دشوار امور اور

آسان امور یکساں ہیں چونکہ آمادہ نہیں ہے، دشواری اور آسانی میں فرق ان لوگوں کے لئے یا ان ذہنوں کے لئے ہے کہ جو سمجھنے کے لئے آمادہ ہوں، جن چیزوں سے ہماری فہم آمادہ ہوگی تا کہ قرآن ہماری حد تک، ہماری سطح تک اور ہمارے اندر اتر آئے تو اس کیلئے کچھ اصول وقوانین ہیں اور انہی کا نام ''آدابِ فہمِ قرآن'' ہے، ان آداب کے ساتھ ہم اپنی فہم کو آمادہ کر سکتے ہیں کہ یہ نزول مرحلۂ دیگر طے کرے اور ان اوراق سے، ان سطروں سے ہمارے دلوں میں اتر آئے یا قلبِ نورانی پیغمبر اکرم ﷺ سے ہمارے دلوں میں اتر آئے، ہمارے لئے تو یہ لفظی قرآن بھی کتابِ مکنون ہے نہ یہ کہ ہمارے لئے یہ کتاب تنزل یافتہ ہے، ہمیں تو یہ بھی پلے نہیں پڑا اور ابھی اس کی فہم بھی ہمیں حاصل نہیں ہوئی پس بنا براین کہ

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ○

اسے پاک وپاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے۔

لہٰذا اس تطہیر کی ہمیں بھی ضرورت ہے، بعض قرآن شناس لوگوں نے زحمت کی ہے اور واقعاً تطہیرِ قلب کے مراحل کو طے کر کے فہمِ قرآن کیلئے خود کو آمادہ کیا ہے۔ انشاء اللہ اس فصل کے حصۂ دوم میں فہمِ قرآن کیلئے تدبر کی ضرورت کو مزید اجاگر کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۸۵)

(۲)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ ۷۹، ۷۸، ۷۷)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲)

(۴)......(سورۂ مبارکہ عصر، آیہ ۲، ۱)

(۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۵)

(۶)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ ۳۰)

(۷)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۶۰)

(۸)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۶۶)

(۹)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۷۵)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۹۰)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۸۸)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۰۹)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ ھود، آیہ ۲۷)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ مومنون، آیہ ۲۴)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ مومنون، آیہ ۳۳)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۸۵)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۱۰۲)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ نمل، آیہ۲)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ لقمان، آیہ۳)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ۱۵)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ مریم، آیہ۶۳)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۲۸)(سورۂ مبارکہ قصص، آیہ۸۳)

(۲۴)......(سورۂ مبارکہ نبأ، آیہ۳۱)

(۲۵)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ۹۹)(سورۂ مبارکہ رعد، آیہ۱۷)(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۱۰)

(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۶۵)(سورۂ مبارکہ حج، آیہ۶۳)(سورۂ مبارکہ فاطر، آیہ۲۷)(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ۲۱)

(۲۶)......(المنطق - مظفرؒ، صفحه۱۴)

(۲۷)......(مفاهیم قرآن جلد السادس)

(۲۸)......(کتاب مبانی نقد متن الحدیث)

(۲۹)......(امثال القرآن)(انسان وقرآن، الجزء۲، صفحه۱۲)

(بحار الانوار، الجزء۱، صفحه۲۲۵)(مصباح الشریعة المنسوب للصادقؑ، الجزء۱، صفحه۵)

(۳۰)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ۷۹)

(۳۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۸۶)

(۳۲)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۱۳۶)

(۳۳)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۳)

(۳۴)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۹۶)

(۳۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۷۶)

(۳۶)......(سورۂ مبارکہ حجر، آیہ ۶)

(۳۷)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ ۱)

(۳۸)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۹۷)

(۳۹)......(التفسير الأصفى - الفيض الكاشانیؒ، الجزء ۱، صفحه ۱۴) (تسنيم تفسير قرآن كريم - آية الله جوادى آملى مدظله) (الكافى - الكلينیؒ، الجزء ۱، صفحه ۲۸) (شرح أصول كافى - مولى محمد صالح المازندرانى، الجزء ۲، صفحه ۱۷) (بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولى الشيخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۱، صفحه ۸۵) (سنن النبیؐ - السيد الطباطبائیؒ، الجزء ۱، صفحه ۱۲۱)

(۴۰)...... (الكافى - الكلينیؒ، الجزء ۱، صفحه ۲۸) (بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولى الشيخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۱، صفحه ۸۵) (التفسير الأصفى، الجزء ۱، صفحه ۱۴) (تفسير الميزان، بحث روائى، الجزء ۶، صفحه ۱۶۴) (سنن النبیؐ - السيد الطباطبائیؒ، الجزء ۱، صفحه ۱۲۱) (تفسير مجمع البيان، باب المعنٰى، الجزء ۲، صفحه ۱۸۸)

(۴۱)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۱۲۵)

(۴۲)......(سورۂ مبارکہ شرح، آیہ ۱)

(۴۳)......(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ ۷۹)

(۴۴)... ..(سورۂ مبارکہ مزمل، آیہ ۶، ۵)

تمهيد

(حصۂ دوم)

۱)دلوں کے لحاظ سے قرآن کے مخاطَبین کی اقسام

☆اولوا الالباب

☆مهر شده سخت دل رکھنے والے

☆مریض القلوب

۲)خدا نے قرآن کو آسان بنایا ھے

۳)فھم کی آمادگی کیلئے مشق کی ضرورت

٤)تدبر و تفقه سے خالی قرأت و عبادت

٥)ثواب مقصدِ قرآن نهیں

٦)قرآن میں تدبر نه کرنے کی مذمت

۷)قرآن میں تعقل کی ضرورت

۸)اکثریت فهم کیلئے آماده نهیں

۹)قرآن میں‌تدبر کی تاکید

۱۰)ماهِ رمضان قرآن فهمی کا مهینه

۱۱) قرآن فهمی کیلئے آداب کی ضرورت

قرآن مجید نے خود ہی اپنے مخاطبین کو چند قسموں میں تقسیم کیا ہے۔قرآن مخاطِب تو سب کیلئے ہے،ھدی للناس ہے لیکن بعض مخاطبینِ قرآن ایسے ہیں کہ جن کے اندر فہم آمادہ ہے،ان کے اندر ہدایت قبول کرنے اور ہدایت حاصل کرنے کی شرائط موجود ہیں یعنی انہوں نے اپنے اندر یہ شرائط پیدا کی ہیں۔

۱)دلوں کے لحاظ سے قرآن کے مخاطَبین کی اقسام

☆اولوا الالباب

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے کہ جو اولی الالباب ہیں۔

الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ أُولٰئِکَ الَّذِيْنَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ وَأُولٰئِکَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ٥(١)

جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں،یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔

یہ لوگ خدا کی آیات اور نشانیوں سے ہدایت لینے کے قابلیت رکھتے ہیں لہٰذا آیاتِ تدوینیٔ خدا اور آیاتِ تکوینیٔ خدا کن لوگوں کیلئے ہدایت کا سرچشمہ بن سکتی ہیں؟

لِأُولِی الْأَلْبَابِ......(٢)

اولی الالباب کیلئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ فلاح پانے کیلئے انہیں بھی تقویٰ اختیار کرنا ہوگا۔

دلوں کے لحاظ سے قرآن کے مخاطَبین کی اقسام

فَاتَّقُوا اللّٰهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥ (٣)

اے صاحبانِ عقل اللہ سے ڈرتے رہو شاید کہ تم اس طرح کامیاب ہو جاؤ۔

☆مہر شدہ سخت دل رکھنے والے

قرآن مجید نے دوسرا گروہ ان لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ جن کے اندر یہ فہم اور استعداد و صلاحیت مر چکی ہے، سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور یہ ذرہ برابر قرآن سے استفادہ نہیں کر پائیں گے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو بھی منع کیا ہے اور روکا ہے یعنی دوسرے لفظوں میں ارشاد کیا ہے کہ آپ اپنی توانائیاں اور اپنا وقت ان پر ضائع نہ کریں،

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ٥ خَتَمَ اللّٰهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ٥ (٤)

ان کے لئے سب برابر ہے، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر گویا مہر لگا دی ہے کہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں، ان کے واسطے آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

اس لئے کہ ان کے دل بند ہو چکے ہیں، انہیں سمجھانا اور نہ سمجھانا برابر ہے، ان کے سامنے قرآن پیش کرنا اور نہ پیش کرنا برابر ہے یعنی جیسا نتیجہ نہ سمجھانے کا ہے تو سمجھانے کا نتیجہ بھی وہی ہے، نہ سمجھانے کے نتیجے میں انہیں کوئی ہدایت نہیں ملے گی لیکن سمجھانے کے نتیجے میں بھی انہیں کوئی ہدایت

حاصل نہیں ہوگی چونکہ ان کے دل بند ہو چکے ہیں، ان کے دلوں نے حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے۔قرآن نے ان کے لئے مختلف صفات ذکر کی ہیں، مثلاً ان کے لئے قفل ذکر کیا گیا ہے،

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ٥(۵)

تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی تدبر نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں میں قفل پڑے ہوئے ہیں۔

یعنی انسان کی دو ہی حالتیں ہیں تیسری کوئی حالت نہیں ہے، بصورتِ قضیۂ مانعۃ الخلو، منطقی اصطلاح میں بصورتِ مانعۃ الخلو یہ ہے کہ غیر ہدایت یافتہ انسانوں نے یا تو قرآن میں تدبر نہیں کیا ہے یا پھر ان کے دلوں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں۔

ان کیلئے بعض اوقات قساوت کو بھی ذکر کیا ہے کہ

قُلُوبُهُمْ قَاسِيَةً ......(۶)

وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ......(۷)

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم......(۸)

فَقَسَتْ قُلُوبُهُم......(۹)

فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥(۱۰)

پھر ان سختیوں کے بعد انہوں نے کیوں فریاد نہیں کی، بات یہ ہے کہ ان کے دل سخت ہو گئے

☆ مردہ و سخت دل رکھنے والے

ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے آراستہ کر دیا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ......(۱۱)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت......

یہ دل یا فہم کی مختلف حالتیں ہیں کہ جو انسان کے اندر بن جاتی ہیں اور انسان ہدایتِ قرآن سے محروم رہتا ہے۔

☆مریض القلوب

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ جو بین بین ہیں یعنی جو فہمِ قرآن کے لئے نہ صد در صد آمادہ ہیں اور نہ ہی ابھی اس انتہائی نوبت تک پہنچ چکے ہیں کہ شاید ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہو بلکہ درمیانی حالت میں ہیں، ان کو کہا گیا ہے کہ یہ مریض القلوب ہیں، ان کے دلوں کے اندر مرض ہے،

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ......(۱۲)

ان کے دل بیمار ہیں، اگر یہ چاہیں تو علاج بھی ہو سکتا ہے اور اگر چاہیں تو یہ دل اس انجام تک بھی پہنچ سکتا ہے کہ یہی بیماری ان کے دل کی ہلاکت اور دل کی موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اسی تقسیم کے حوالے سے قرآن مجید نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب ایک آیتِ قرآن نازل ہوتی ہے تو جن کے دلوں میں ایمان ہے یعنی جن کے دل آمادہ ہیں، جن کی فہم آمادہ ہے، ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے یعنی ان کے لئے نزولِ آیہ قرآن باعثِ تقویتِ ایمان ہے اور جن کے دل آمادہ

نہیں ہیں، جن کے دلوں میں زیغ ہے، جن کے دلوں میں زنگ ہے، جن کے دلوں میں ضعف و کمزوری وکجی ہے تو یہی آیہ جب نازل ہوتی ہے تو ان کی گمراہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آیہ کے اندر تو گمراہی موجود نہیں ہے، آیہ نور ہے لیکن یہ نور جب ایک ایسے ظرف کے اندر اترتا ہے کہ جو تیار نہیں ہے اور آلودہ ظرف ہے تو یہ قانون ہے کہ اگر ہم آلودہ چیز کے اندر پاک چیز بھی ڈالیں تو وہ چیز بھی یعنی مظروف بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔

ایسا نہیں ہوتا ہے کہ ہم پاک شے کسی ناپاک برتن میں ڈالیں تو وہ برتن بھی پاک ہو جائے بلکہ عموماً وہ شے ناپاک ہو جاتی ہے، مثلاً اگر آپ ایک مٹیالے برتن کے اندر صاف وشفاف پانی ڈالیں تو مٹی نہیں دھلے گی بلکہ پانی مٹیالہ ہو جائے گا یا اگر آپ ایک نجس برتن کے اندر دودھ ڈالیں تو برتن پاک نہیں ہوگا بلکہ دودھ نجس ہو جائے گا۔ یہی تمثیل انسان کے فہم کیلئے بھی ہے کہ اگر انسان کی فہم آلودہ ہو اور اس دل کے اندر قرآن کا نور اتر بھی جائے تو وہ نورِ قرآن کو آلودہ کر دیتا ہے نہ یہ کہ قرآن اس کے دل کو پاک کر دے گا۔

ظرف ومظروف کا یہ قانون کہ جو عام طور پر طبعی اور مادی عالم کے لئے ہے یہی قانون فہم کیلئے بھی ہے یعنی ظرف ومظروفِ معنوی کے لئے بھی یہی قانون ہے، اس بنا پر کچھ چیزیں ضروری ہیں تاکہ جس طرح بحثِ تفسیری میں یہ مطلب بیان ہوا ہے کہ اگر انسان کا دل سخت ہو جائے اور خدا نخواستہ انسان قساوتِ قلبی کا شکار ہو جائے تو کس طرح سے دل کو نرم کریں؟ کس طرح سے دل میں خشوع پیدا ہو؟ یعنی اگر غیر آمادہ فہم ہو تو اس فہم کو انسان کس طرح آمادہ کرے؟ تاکہ اس کے کچھ پلے

مرض القلوب

پڑنا شروع ہو جائے، اس فہم سے کچھ سمجھ میں آنا شروع ہو جائے، قرآن کا نور اس کے دل کے اندر اترنا شروع ہو جائے اور اس کا وجود قرآن سے منور ہو جائے لہٰذا اجمالی طور پر کہیں گے کہ جو چیزیں دل کے اندر خشوع پیدا کرتی ہیں اور قرآن کیلئے فہم کو تیار کرتی ہیں انہی چیزوں کا نام آدابِ فہمِ قرآن ہے۔

۲) خدا نے قرآن کو آسان بنایا ھے

قرآن نے سورہ مبارکہ قمر میں متعدد مواقع پر اس نکتے کو بیان فرمایا ہے کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ٥ (۱۳)

اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے، تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

یعنی قرآن میں پہلے اسرار تھے، اس کے اندر دشواری تھی لیکن خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسانیت اور بشریت پر لطف کیا، جہاں بہت سارے الطاف انسان کے شاملِ حال ہوئے ہیں ان میں سے ایک نزولِ قرآن یا سہولتِ قرآن ہے۔ اللہ فرما رہا ہے کہ ہم نے قرآن کو سہل بنایا ہے، یسرنا القرآن یعنی قابلِ فہم بنایا ہے، چونکہ دوسری طرف سے خود قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ

هُدًى لِلنَّاسِ ..... (۱۴)

یہ تمام بشریت کے لئے ہدایت ہے اور ظاہر ہے کہ فقط قرآن فقط ایک نسل کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کے لئے ہے، نزولِ قرآن سے لے کر قیامت تک کتابِ خاتم ہونے کے لحاظ

سے و کتابِ مہیمن ہونے کے لحاظ سے یہ ہر نسل کے لئے اور ہر عصر کے لئے ہدایت ہے، کوئی خاص طبقہ قرآن کا مخاطب نہیں ہے، اس کتاب کی بشریت کے لئے ہدایت ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ یہ عام بشر کے لئے قابلِ فہم بھی ہو، اگر قرآن فقط اہلِ عربی کے لئے قابلِ فہم ہو اور غیر عربی کے لئے قابلِ فہم نہ ہو تو یہ غرضِ ہدایت کے ساتھ سازگار نہیں ہے، یعنی یہ ھدی للناس شمار نہیں ہوتی بلکہ یہ ھدی للعرب ہے، اگر قرآن فقط علماء کے لئے قابلِ فہم ہو اور غیر علماء کے لئے قابلِ فہم نہ ہو تو یہ پھر بھی ھدی للناس نہیں ہے بلکہ ھدی للعلماء ہے چونکہ ناس عامۃ الناس کو کہتے ہیں اور عامۃ الناس میں ظاہر ہے کہ وہ تخصص موجود نہیں ہوتا ہے کہ جو عربی دان طبقے میں ہے یا اہلِ علم میں ہے، اس لئے قرآن مجید کو خداوند تبارک وتعالیٰ نے آسان کیا اور چند آیات میں اس کو تکرار کیا ہے۔

قرآن کو مہجوریت سے نکالنے کے لئے خداوندِ متعال نے انسانوں پر یہ لطف کیا ہے کہ قرآن کو ہمارے لئے آسان کر دیا ہے لیکن بعض لوگ کوشش میں ہیں کہ برعکس کام کریں، خدا نے جتنی کوشش کی البتہ خدا کے کاموں کے لئے کوشش تو نہیں کہہ سکتے ہیں یعنی خدا نے ہم پر یہ لطف کیا، یہ عنایت ورحمت کی کہ ہم پر قرآن کو آسان بنا کر پیش کیا، اب کچھ لوگ مشغول ہیں کہ قرآن کو دوبارہ مشکل بنائیں، اتنا مشکل بنائیں کہ پھر فرشتوں ہی کی سمجھ میں آئے۔ خدا کہہ رہا ہے کہ ہم نے آسان کیا ہے لیکن لوگ اس کے جواب میں اسے اتنا مشکل بنانے میں مشغول ہیں کہ پھر یہ کسی کو سمجھ میں نہ آئے اور اس کو کتابِ مکنون سے بھی بالاتر کسی جگہ پر پہنچا دیں۔

دوسرے لفظوں میں یسرنا القرآن نزول کی تفسیر ہے، جب کہا کہ

اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ......(۱۵)

ہم نے قرآن نازل کیا ہے، کیا مطلب کہ نازل کیا ہے؟ یعنی نہ کہ یہ آسمان پہ تھا اور اس کو اب زمین پر لے آئے ہیں یا کسی فلک پہ تھا اور اس کو اب کسی دوسرے فلک پہ منتقل کیا ہے یا کسی مکانِ بلند پہ تھا اور اس کو ہم نے اب مکانِ ادنیٰ میں منتقل کیا ہے، نزولِ جسمانی نہیں ہوا ہے بلکہ نزول کا معنیٰ یہ ہے کہ پہلے یہ انسان کی دسترس سے باہر تھا لیکن اب ہم نے اسے انسان کی دسترس میں قرار دیا ہے،

اِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ٥ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ٥ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ٥(۱۶)

یہ بڑا محترم قرآن ہے۔ جسے ایک پوشیدہ کتاب میں رکھا گیا ہے۔اسے پاک و پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے۔

یہ دسترسِ انسان سے باہر تھا، پھر فرمایا کہ

تَنْزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِينَ٥(۱۷)

یعنی خدا نے اس کو نازل کیا، کس طرح سے نازل کیا؟

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ......

یہ تنزیل کی تشریح ہے یا نزول کی وضاحت ہے کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے یعنی قابلِ فہم بنا دیا ہے، چونکہ پہلے یہ کتابِ مکنون تھی، یہ غیر مفہومی حقیقت تھی اور یہ قرآن غیر لفظی تھا لیکن ہم نے اسے انسان کی فہم کی سطح تک پہنچا دیا ہے یعنی ان حقائق کو ہم نے مفہوم کا جامع پہنایا ہے اور

ان مفاہیم کو بھی الفاظ کی شکل دی ہے، پس قرآن کو خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس قابل بنادیا ہے کہ انسان کے لئے قابلِ فہم ہو جائے لیکن دوسری طرف سے انسان کی فہم کو بھی آمادگی کی ضرورت ہے۔

۳)فہم کی آمادگی کیلئے مشق کی ضرورت

اگر چہ فہمِ انسان میں پیدائشی طور پر نہ صرف قرآن بلکہ بہت سارے غیر قرآنی معارف کو بھی درک کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے یعنی قابلیتِ بالفعل نہیں ہوتی ہے لیکن خدانے انسان کے اندر ایسی طاقت یا قوت رکھی ہوتی ہے کہ اگر انسان چاہے تو اس کی تکمیل کر کے ایسے مقام تک پہنچ سکتا ہے کہ وہ ان معالم، ان مطالب اور ان معارف کو درک کر سکے، ہر فہم ہر قسم کے مطلب کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتی بلکہ اس فہم کو جسمانی صلاحیتوں کی طرح آمادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

مثلاً انسان کے بدن میں جسمانی صلاحیتیں فراواں ہیں لیکن سارے اجسام ہر کام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے ہیں مخصوصاً اگر ہم ایسے جسمانی کاموں پر نظر رکھیں کہ جن کو کرنے کیلئے لوگ معمول سے ہٹ کر اور مشق کر کے اپنے بدن کو تیار کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد محیر العقول کام سرانجام دیتے ہیں مثلاً اگر جمپ لگانا ہے، بغیر سہارے رسی پر چلنا ہے یا کوئی بھاری وزن اٹھانا ہے تو اسی معمولی جسم کے ساتھ انسان یہ امور انجام نہیں دے سکتا ہے لیکن اسی جسم کو جب آمادہ کیا جائے، مشق کراوائی جائے، ریاضت کروائی جائے اور تیار کروایا جائے تو یہی جسم وہ کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نفسِ انسان اور روحِ انسان بھی ہے، جسمانی صلاحیتوں کی طرح روحانی

طاقتیں اور صلاحیتیں بھی انسان کے اندر ہیں، ان کے اندر بھی کبھی آمادگی موجود نہیں ہوتی ہے لیکن اگر انہیں آمادہ کیا جائے، تیار کیا جائے تو اس آمادگی کے بعد انسان انہی کاموں کو کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ جن کیلئے پہلے تیار اور آمادہ نہیں تھا۔ ایسے کام بہت سارے ہیں کہ جن کے لئے ہمیں کہا گیا ہے کہ اپنے آپ کو آمادہ کرو، تیار کرو، اگر آپ بغیر آمادگی کے اس مرحلے میں پہنچ گئے تو ضرر اور نقصان ہے، مثلاً عرصۂ غیبتِ کبریٰ میں اور انتظار کے زمانے میں فریضۂ انتظار یہ ہے کہ اپنے آپ کو آمادہ کرو، انتظار یعنی تیاری کا زمانہ، آمادگی کا زمانہ، اگر بغیر آمادگی کے ظہور ہو جائے، غیر آمادہ قوم کے اندر، غیر آمادہ امت کے اندر ظہور ہو جائے کہ جیسے سابقہ امتوں میں ایسا اتفاق رونما ہوا ہے مثلاً بنی اسرائیل کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا عظیم رہبر آیا درحالیکہ بنی اسرائیل اس کے لئے آمادہ اور تیار نہیں تھے، غیر آمادہ قوم میں اگر ایک نبی اور معصوم بھی آ جائے تو کام آگے نہیں بڑھتا ہے، اسی طرح امیر المومنین علیہ السلام نے جب اقتدارِ حکومت سنبھالا تو اس وقت قوم آمادہ نہیں تھی، اس رہبر کی رہبری کے لئے امت تیار نہیں تھی یا ایسے اور بہت سارے دیگر تاریخی واقعات ہیں کہ جیسے کوفہ ایک شہرۂ عالم مثال ہے کہ کوفہ کے لوگوں نے اپنے امام کو بلایا، رہبر کو بلایا لیکن آمادہ نہیں تھے، آمادگی کے بغیر طلب کر لیا، آمادگی کے بغیر اس کی طرف دعوت نامہ ارسال کر دیا۔

غیر آمادہ لوگوں کو اگر کوئی چیز میسر آ بھی جائے تو اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں اور وہ چیز یقیناً ان کے ہاتھ سے زائل و ضائع ہو جاتی ہے بلکہ ممکن ہے کہ غیر آمادہ طبقہ زیادہ نقصان کرے۔ اسی طرح قرآن مجید کے لئے ہے، اگرچہ قرآن کے نزول کے لئے اُس طرف سے جتنی سہولت و آسانی

ممکن تھی وہ انجام دی گئی ہے یعنی قرآن کو مرتبہٴ مکنونہ سے، مقام لدن سے، مقام علیم وحکیم سے اور لوحِ محفوظ سے نازل کیا گیا ہے، یہ تعبیریں خود قرآن کی ہیں کہ قرآن پہلے یہاں تھا یا بالا مرتبہٴ قرآن یہ تھا اور وہاں سے اسے نازل کیا گیا ہے، پھر ارشاد ہوا کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ......

ہم نے قرآن کو آسان، سادہ اور عام فہم بنایا ہے یعنی قرآن کو آسان کیا گیا ہے لیکن دوسری طرف سے فہم انسان کو بھی ان مطالب کو درک کرنے کے لئے آمادہ ہونا چاہئے، جیسا کہ قرآن مجید نے اول مقصد بھی یہی ذکر کیا ہے کہ قرآن کو فہم کی ضرورت ہے یعنی انسان قرآن کو سمجھے، صرف قرآن کا موجود ہونا کافی نہیں ہے یا کوئی بھی کام کہ جو انسان قرآن کے حوالے سے انجام دیتا ہے اگر ان کے اندر فہم کا عنصر شامل نہ ہو تو وہ چنداں مفید نہیں ہیں۔

٤) تدبر و تفقه سے خالی قرأت و عبادت

انسان تلاوت و قرأت قرآن کرتا ہے لیکن اگر انسان کے اندر فہم و تدبّر نہ ہو تو اس کی فضیلت کی نفی کی گئی ہے اور بعض اوقات سرے سے اس کی افادیت کی نفی کر دی گئی ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ حدیث امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ

اَلَا لَا خَيْرَ فِيْ قِرَاءَةٍ لَا تَدَبُّرَ فِيْهَا......(١٨)

آگاہ رہو! جس قرأت میں تدبر نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

یعنی ایسی قرآن خوانی کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ جس کے اندر تدبر موجود نہ ہو، یہ احادیث معصومین علیہم السلام سے منقول ہیں اور متعدد مضامین کے ساتھ ہیں، فرمایا کہ اس قرأت اور قرآن خوانی کے اندر کوئی خیر نہیں ہے یعنی کوئی کمال نہیں ہے، بے شک وقت صرف کرنا ہے، ٹائم پاس ہوگا، وہ سرگرمی ہے اور ممکن ہے اس کے بہت سارے فائدے بھی حاصل ہو جائیں لیکن خیر کوئی بھی نہیں ہے، ہم کتنے قرآن ختم کر کے پھر یہ سمجھتے ہیں کہ اتنی خیر ہے کہ ہم سے بھی زیادہ ہے اور مردے کو بھی بھیجتے ہیں کہ یہ سارا خیر اس مردے کو مل جائے کہ جو اس کے اندر ہے، قرآن خوانی میں عموماً مدرسے کے طالبِ علموں کو قرآن پڑھنے کے لئے لے آتے ہیں اور ویسے گنیز بک (Guinness Book) کے مطابق عالمی ریکارڈ تو سات منٹ میں سپارہ پڑھنا ہے لیکن یہ جو ختمِ قرآن میں پڑھتے ہیں یہ تین منٹ سے بھی کم میں سپارہ پڑھتے ہیں بلکہ پڑھتے نہیں ہیں صرف ورق گردانی کرتے ہیں، پھر اس کے بعد بڑے خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ یہ جو قرآن خوانی ہوئی ہے اس کا ثواب مُردے یا مرحوم کو پہنچے لیکن جو حرکتیں انہوں نے قرآن پڑھتے ہوئے کی ہیں، یہ سب کچھ جو انہوں نے کیا ہے اگر یہ مردے تک پہنچ جائے تو وہ تو تڑپ جائے گا، یہ تو حکمتِ خدا ہے کہ اس تک یہ سب کچھ نہیں پہنچتا ہے۔

آپ نے ایصالِ ثواب کرنا ہے تو ایک سورۂ فاتحہ کیلئے کسی کو بلاؤ کہ جو آپ کے لئے اس کی تفسیر کرے، آپ سے تدبر کروائے اور دوسروں کو بھی متوجہ کرے، مردہ بھی اس سے بہرہ مند ہو اور زندہ بھی چونکہ جو چیز زندوں کے کام نہیں آسکتی ہے وہ مردے کے کس کام آئے گی؟ قرآن زندوں

کے لئے نازل ہوا ہے، نہ کہ مُردوں کے لئے، لہٰذا اس قرآن خوانی سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا کہ جس میں تدبر نہ ہو یعنی خیر سے خالی تلاوتیں، خیر سے خالی قرأتیں، خیر سے خالی شبینے، خیر سے خالی قرآن خوانیاں اور خیر سے خالی ختمِ قرآن۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ سات دن سے پہلے قرآن ختم نہ کرو، کیوں؟ اس لئے کہ خود قرآن نے کہا ہے کہ

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ (۱۹)

اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر باقاعدہ پڑھو۔

قرآن کے اندر تدبر کرو، ظاہر ہے کہ اس کیلئے فرصت کی ضرورت ہوتی ہے جیسے کہ قاریوں نے قرآن پڑھنے کے آداب لکھے ہیں کہ جو تلاوتِ قرآن سے متعلق ہیں اور وہ آداب الفاظ کے ذریعے سے ہیں کہ مثلاً یہاں وقفہ ہے، یہاں پر وقفہ لازم ہے، یہاں سکتہ ہے، یہاں سانس ٹوٹنی چاہئے، یہاں سانس جوڑنی چاہئے، ان میں ساری توجہ سانس کی طرف ہوتی ہے، بعد میں موانعِ فہم بھی تحریر میں لائیں گے، ان موانعِ فہم میں سے ایک یہی چیز ہے یعنی مخرج اور یہ امور کہ جن کے لئے ابھی قرآن میں زیادہ حساسیت پیدا ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ جب انسان سانس کے چکر میں پڑا ہوا ہو کہ کہاں روکوں؟ کہاں چھوڑوں؟ تو معنی کی طرف تو توجہ نہیں جاتی ہے، جتنی بھی سانس ہے وہ جہاں رکتی ہے روک دو، اصل وقفہ کہاں کرو؟ معنی پر وقفہ کرو، کچھ معانی ایسے ہیں کہ جہاں رک جاؤ، وقف یعنی ٹھہر جاؤ، یہ مقام گزرنے کا نہیں ہے، یہاں تامل، تعقل، تدبر اور غور وفکر کرو، اس طرح سے

فرفر پڑھ جانا مطلوب نہیں ہے۔یقیناًاس طرح ثواب بھی کم ہے یا کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح فرفر پڑھنے کا بہت محدود ثواب ہے، قرآن کو تدبر کے ساتھ پڑھو تو ثواب بھی بیشتر ہے اور اس کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ

لَا خَیرَ فِی عِبادَۃٍ لا فِقْهَ فِیهَا.....(۲۰)

اس عبادت کا کوئی فائدہ نہیں جس میں تفقہ نہ ہو۔

فقہ بھی فہم کے معانی میں ہے اور یہ قرآنِ مجید کی اصطلاح ہے، روایتِ دیگر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے ہے کہ

آیاتُ الْقُرْآنِ خَزائِنُ الْعِلْمِ......(۲۱)

قرآن کی آیتیں خزانوں کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی ہر آیتِ قرآن اپنی جگہ خزانہ ہے، اسی مضمون کو دیگر الفاظ سے بھی ذکر کیا گیا ہے مثلاً

اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهراً وَ بَطْنًا وَ لِبَطْنِهِ بَطْنًا اِلٰی سَبْعَةِ اَبْطُنٍ...(۲۲)

بیشک قرآن کیلئے ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر باطن کیلئے باطن ہے، یہاں تک کہ سات باطن ہیں۔

اسی طرح فرمایا گیا ہے کہ ستر باطن ہیں،

اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهراً وَ بَطْنًا وَ لِبَطْنِهِ بَطْنًا اِلٰی سَبْعَةِ اَبْطُنٍ اَوْ اِلٰی سَبْعِیْنَ

تدبر و تفقہ سے خالی قرأت و عبادت

بَطْنًا......(۲۳)

بیشک قرآن کیلئے ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر باطن کیلئے باطن ہے، یہاں تک کہ سات باطن ہیں یا ستر باطن ہیں......

قرآن کی ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے ماورا ایک اور حقیقت ہے اور اس حقیقت کے ماورا ایک حقیقتِ دیگر ہے، اب یہ انسان کی توفیق ہے کہ ان درجات یا ان حقیقتوں تک اپنے آپ کو کیسے پہنچا سکتا ہے، آیاتِ قرآن علم کے خزانے ہیں لیکن یہ خزانہ بند ہے،

آیَاتُ الْقُرْآنِ خَزَائِنُ الْعِلْمِ فَکُلَّمَا فُتِحَتْ خَزَانَةٌ فَیَنْبَغِی لَکَ أَنْ تَنْظُرَ فِیهَا......

قرآن کی آیات علم کے خزانے ہیں پس جب خزانے کی جگہ کھل جائے تو سزاوار یہ ہے کہ تم ان پر نظر کرو۔

یعنی انسان جب تلاوت کر رہا ہوتا ہے تو یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک صندوق ہو کہ جس کے اندر قیمتی جواہر و قیمتی موتی موجود ہوں لیکن وہ صندوق بند ہو اور انسان کے پاس اس کی چابی نہ ہو لہٰذا اس صندق کا اس انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہے یا قرآن ایک معدن کی طرح ہے کہ اس معدن کے اندر بہت قیمتی دھاتیں موجود ہیں لیکن اس معدن کے نیچے جانے کے لئے انسان کے پاس کوئی راستہ موجود نہیں ہے تو انسان کیلئے ایسی معدن کا یا اس سے سروکار رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے،

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ

تَدَبَّرُوْا آيَاتِ الْقُرآنِ وَ اعْتَبِرُوْا بِهِ فَإِنَّهُ أَبْلَغُ الْعِبَرِ......(۲۴)

قرآن مجید کی آیات میں تدبّر کرو اور ان کے ذریعے عبرت لے لو بے شک یہ سب سے زیادہ عبرت والی ہیں۔

۵)ثواب مقصدِ قرآن نہیں

آغازِ کتاب میں یہ بتانا ضروری ہے کہ بعض کام قرآن مجید کی طرف رغبت بڑھانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں، ہمیں ان کاموں میں رغبت اور مقصدِ قرآن میں فرق معلوم ہونا چاہئے، دائماً ہم کسی حال میں بھی اس سے غفلت نہ برتیں از جملہ ثواب ہے کہ آپ آیاتِ قرآن پڑھیں، آپ ختمِ قرآن کریں، آپ حفظِ قرآن کریں اور قرآن کے حوالے سے جتنے اعمال ہیں وہ انجام دیں کہ جن کے بارے میں فضیلت ذکر کی گئی ہے اور ثواب ذکر کیا گیا ہے لیکن ثواب مقصدِ قرآن نہیں ہے۔قرآن کی طرف لانے کے لئے ثواب ایک رغبت ہے، اس کو متعدد دفعہ مومنین کے سامنے اور عوام کے سامنے ذکر کیا ہے، چونکہ اس میں سبھی گرفتار ہیں، خواص بھی اور عوام بھی، سب ہی اس کی حدود کی برہمی کا شکار ہوئے ہیں، امور اپنے اپنے مقام پر نہیں ہیں بلکہ درہم برہم ہو گئے ہیں، ان کی حدود آپس میں مکس (Mix) ہوگئی ہیں اور ان میں ملاوٹ ہوئی ہے۔

کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اصل مقصود ہیں اور انسان کو اس مقصود کی طرف لانے کے لئے کچھ رغبتیں ایجاد کی جاتی ہیں، رغبتیں بھی ان لوگوں کے لئے ایجاد کی جاتی ہیں کہ جن کو معرفت نہ ہو چونکہ

ثواب مقصدِ قرآن نہیں

انسان قرآن کی طرف یا حقائق کی طرف دو محرکات کے تحت آتا ہے، اول یہ کہ انسان بالغ ہے، کمال یافتہ انسان ہے اور معرفت اس کے لئے کافی ہے۔ علم و معرفت انسان کو اس حقیقت تک لے آتی ہے اور غیر از معرفت کوئی محرکِ دیگر انسان کو نہیں چاہئے۔ دوسرا محرک رغبت ہے یعنی بعض انسان ایسے ہیں کہ نہ ان کے پاس معرفت ہے یا معرفت ہے لیکن کافی نہیں ہے اسی لئے ایسی رکاوٹوں میں اور موانع میں مبتلا ہوتے ہیں کہ فقط حقیقت کا جان لینا اور کشف ہو جانا ان کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ ان کے اندر اس سے زیادہ جاذبہ، کشش اور رغبت موجود ہو تا کہ یہ اس حقیقت تک پہنچ جائیں مثلاً بڑے اور بالغ انسان خود علم حاصل کرنے جاتے ہیں، کلاسوں میں، مدرسوں میں اور درسوں میں جاتے ہیں، خود کتابیں پڑھتے ہیں اور انہیں رغبت دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے لیکن چھوٹے بچوں کو والدین جب اسکول بھیجتے ہیں تو انہیں کلاسوں میں اور مدرسوں میں ہزار رغبتوں کے ساتھ بھیجتے ہیں، کبھی انہیں کوئی کپڑے خرید کر دیتے ہیں، کبھی انہیں جوتے خرید کر دیتے ہیں، کبھی انہیں کھانا خرید کر دیتے ہیں اور کبھی انہیں کھلونا خرید کر دیتے ہیں، یہ ثواب ہیں۔

اگر ہم ثواب کو تمثیل کے ساتھ پیش کریں تو کہیں گے کہ ثواب رغبت کے طور پر ہے یعنی نابالغ انسان جو معرفت نہیں رکھتا ہے جیسے بچہ ہے کہ اسے علم کی معرفت نہیں ہے، اسکول کی معرفت نہیں ہے، کتاب کی معرفت نہیں ہے کہ اس معرفت کے ساتھ اسکول جائے بلکہ وہ رغبتوں کی وجہ سے اسکول جاتا ہے، اگر یہ رغبتیں بیچ میں سے ہٹا دی جائیں تو یہ ایک دن بھی جانے کے لئے حاضر نہیں ہوگا۔ اسی طرح جو بالغ انسان ہیں جیسے امیر المومنین علیہ السلام بالغ انسان ہیں ان کا یہ فرمانا ہے کہ

مَا عَبَدْتُکَ خَوْفًا مِنْ نَارِکَ وَلَا طَمَعًا فِیْ جَنَّتِکَ وَلٰکِنْ وَجَدْتُکَ أَهْلًا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُکَ...... (۲۵)

میں نے تیرے جہنم کے خوف سے اور جنت کی لالچ میں تیری عبادت نہیں کی لیکن تجھے عبادت کا اہل پایا تو تیری عبادت کی......

کیونکہ میں عبدِ الٰہی ہوں، میں خدا کی نعمتوں کا بندہ نہیں ہوں یعنی رغبتیں اور نعمتیں مجھے خدا کی طرف لے کر نہیں آئی ہیں، خدا نے مجھے نعمتوں کی طرف متوجہ کیا ہے نہ کہ نعمتوں نے مجھے خدا کی طرف متوجہ کیا ہے لہٰذا فرمایا کہ اگر جنت اور جہنم نہ بھی ہو تو بھی علیؑ کی عبادت میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں پڑے گا چونکہ علی علیہ السلام بالغ انسان ہیں اور عبادتِ خدا کے لئے معرفتِ خدا کافی ہے۔

لیکن ہم نابالغ بچوں کی طرح ہیں، روزہ تب رکھتے ہیں کہ جب روزے کے فراواں فضائل بیان کیے جائیں، فضائل سے مراد مادی اور معنوی رغبتیں ہیں، جنت کی نعمتیں اور دنیا کی نعمتیں جب بتائی جائیں تو روزے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں مثلاً روزہ رکھنے سے جسم میں خون کنٹرول ہوتا ہے، شوگر کنٹرول ہوتی ہے اور جسم میں یہ اچھے اثرات پڑتے ہیں تو پھر ہم روزہ رکھتے ہیں یا مثلاً جب یہ کہا جائے کہ روزہ رکھو تو بہشت میں یہ نعمتیں ملیں گی تو پھر روزہ رکھتے ہیں لیکن اگر ہمیں یہ کہا جائے کہ روزہ رکھو یا نہ رکھو ہمیں جنت میں تو جانا ہی جانا ہے تو پھر کوئی بھی روزہ نہیں رکھے گا چونکہ ہمارا روزہ رغبت کے لئے ہے، اس مقصود کے لئے روزہ نہیں ہے، یہ ہمارے عدمِ بلوغ کی علامت ہے لہٰذا کثرت سے قرآن کی تلاوت اور قرآن کی آیات کے بارے میں ثواب ذکر کیا گیا ہے تاکہ لوگ

رغبت کریں۔

ہم ثواب کے متوالے اور دلدادہ ہیں اور قرآن کے ذریعے سے ثواب کمانا چاہتے ہیں، خدا کو ثواب کے ذریعے سے قرآن تک پہنچانا مقصود تھا نہ کہ قرآن کے ذریعے سے ثواب تک پہنچانا یعنی ثواب مقصدِ قرآن نہیں ہے بلکہ ثواب کا مقصد قرآن ہے۔ اس لئے ثواب رکھا گیا ہے کہ انسان رغبت پیدا کرے اور قرآن کی طرف آئے لہٰذا قرآن کو دیکھنے کا بھی ثواب ہے کہ مثلاً جو کسی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا ہے تو اس کا بھی ثواب ہے کہ وہ آ کر دیکھے یعنی قرآن کسی انسان کو لاتعلق نہیں رکھنا چاہتا ہے، ذاتِ خدا نے کسی انسان کو قرآن سے لاتعلق نہیں رہنے دیا لہٰذا کوئی بہانہ نہ کرے کہ مجھے قرآن پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اگر آپ کو پڑھنا نہیں آتا ہے تو آپ سنیں، اگر کوئی کہتا ہے کہ میں سن بھی نہیں سکتا ہوں تو آپ دیکھیں یعنی لاتعلقی کے لئے خدا نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ بالآخران رغبتوں کی وجہ سے جب انسان قرآن کی طرف آتا ہے یا کسی بھی وجہ سے آجاتا ہے تو وہ حقیقت انسان پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔

اکثر مومنین کو اسی مطلب کو سمجھانے کے لئے یہ مثال بھی دی ہے کہ بچوں کی عمر میں ایک ضدی زمانہ آتا ہے۔ جب بچہ ڈھائی تین سال کا ہوتا ہے تو اس کی ضد کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے، اس کے اندر ایک فکرِ استقلال آجاتی ہے کہ وہ اپنا ہر کام خود کرنا چاہتا ہے اور امر و نہی برداشت نہیں کر سکتا ہے، آپ نے اور ہم سب نے یہ زمانہ گزارا ہوا ہے، اگر اپنا یاد نہیں ہے تو دوسروں کو دیکھ کر معلوم ہوگا کہ ہم بھی بچپن میں ایسے ہی تھے، مثلاً ایک چیز کہ جس میں ضد کرتا ہے وہ یہ ہے کہ کھانا نہیں کھاتا ہے

یا دودھ نہیں پیتا ہے اور ماں کو معلوم ہے کہ اگر دودھ نہیں پیئے گا تو یہ کمزور ہو جائے گا، مریض ہو جائے گا بااینکہ دودھ میں اس کی حیات ہے، دودھ میں اس کی بقاء ہے لیکن یہ ضد کرتا ہے اور دودھ کی طرف نہیں آتا ہے، ماں اس کو کھلونے کا وعدہ دیتی ہے کہ تم دودھ پیو اور میں تمہیں کھلونا دوں گی اور وہ کھلونے کی وجہ سے دودھ پیتا ہے، اسی لمحے اگر اس بچے سے پوچھیں کہ دودھ کیوں پیتے ہو؟ تو وہ کہے گا کہ کھلونے کی خاطر پیتا ہوں، ماں سے پوچھیں کہ ایسا کیوں کر رہی ہو؟ کھلونا کیوں دے رہی ہو؟ تو وہ کہے گی کہ دودھ کی خاطر، یعنی بچے کی نظر میں کھلونا ہدف ہے اور دودھ پینا ذریعہ ہے لیکن ماں کے نزدیک کھلونا ذریعہ، کشش اور رغبت ہے اور دودھ پلانا مقصد ہے۔

ہم قرآن کی طرف ثواب کی خاطر آئے ہیں لیکن خدا نے اس لئے ثواب رکھا ہے کہ ہم قرآن کی طرف آئیں، اور قرآن کا اصل ہدف یہ ہے کہ اس کو سمجھیں اور اسے اپنی زندگی کا منشور قرار دیں۔

۶) قرآن میں تدبر نہ کرنے کی مذمت

قرآن کی آیات خزانہ ہیں اور ان خزانوں کو فہم و تعقل و تدبر کی ضرورت ہے، آیاتِ کریمہ میں اس نکتے کو ذکر کیا گیا ہے کہ آیاتِ قرآن کو فہم کی ضرورت ہے یعنی انسان قرآن کو سمجھے، فقط قرآن کا ہونا یا پڑھ لینا، فہم سے خالی تلاوت، فہم سے خالی عبادت یا فہم سے خالی قرأت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سورہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام گرامی پر موسوم ہے ان لوگوں کی مذمت کی گئی

ہے کہ جو قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں، فہم نہیں کرتے ہیں اور غور و فکر نہیں کرتے ہیں۔ سورہ مبارک محمدؐ کی آیہ (۲۳) اور (۲۴) میں ہے کہ

أُولٰئِکَ الَّذِینَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمٰى أَبْصَارَهُمْ○

یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور ان کے کانوں کو بہرا کر دیا ہے اور ان کی آنکھوں کو اندھا بنا دیا ہے۔

یعنی پہلے ان لوگوں کا ذکر کر کے، ان کے اعمال کا تذکرہ کر کے پھر فرمایا کہ ان پر خدا کی لعنت ہے اور لعنتِ خدا یہ ہے کہ یہ محروم ہیں۔ قرآن میں لعن در مقابلہ رحمت ہے، رحمت یعنی خدا نے اپنی نعمتیں ان کو عطا کی ہوئی ہیں اور لعنت یعنی اپنی نعمتیں ان سے روکی ہوئی ہیں، انہیں محروم رکھا ہوا ہے، اس محرومی کی ایک علامت یا اس کا ایک مصداق یہ ہے کہ

فَأَصَمَّهُمْ...

خدا نے ان کو بہرا قرار دیا ہے، یہ آواز سنتے ہیں لیکن اس آواز کے نتیجے میں جو پیغام ہے اسے نہیں سمجھتے ہیں مثلاً آوازِ قرآن سنتے ہیں، آیات کی آواز ان کے کانوں میں پڑتی ہے لیکن پیغامِ قرآن ان کے اندر منتقل نہیں ہوتا ہے،

وَأَعْمٰى أَبْصَارَهُمْ○

اور خدا نے ان کی آنکھیں اندھی قرار دی ہیں، پھر آیہ ۲۴ میں فرمایا کہ

أَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلٰى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا○

تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی تدبر نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں میں قفل پڑے ہوئے ہیں۔

روایت میں آیا ہے کہ

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۲۶)

بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے۔

غور کیجئے کہ قرآن ان پر لعنت کر رہا ہے حالانکہ یہ قاریٔ قرآن ہیں۔ ایک اور روایت قرآن ہی کے حوالے سے ہے کہ جہنم میں سخت ترین عذاب ان لوگوں کو ملے گا کہ جو حاملِ قرآن ہیں یعنی جن کو قرآن حفظ ہے یا قرآن پڑھتے ہیں لیکن قرآن میں غور و فکر و تدبر اور عمل نہیں کرتے ہیں، چونکہ فہم مقدمۂ عمل ہے، جیسے عرض ہوا تھا کہ قرآن منشورِ حیاتِ انسان ہے یعنی حیات کا عملی منشور ہے اور اس پر عمل ہونا چاہئے، عمل کا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن میں فہم ہو، فہم بھی مقصدِ اصلی نہیں ہے کہ اگر ہم نے قرآن کو سمجھ لیا تو حق ادا کر دیا، فہم کے بعد اس منشور کو اپنی زندگی میں عملی بھی کرنا ہے، پس فہم ایک مقدمہ ہے۔

۷)قرآن میں تعقل کی ضرورت

سورۂ زخرف میں بھی قرآن کے نزول کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو عربی الفاظ کے قالب میں کیوں ڈھالا ہے؟

سورۂ مبارکہ زخرف کی ابتداء میں آیہ سوم میں ہے کہ

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

بیشک ہم نے اسے عربی قرآن قرار دیا ہے تا کہ تم سمجھ سکو۔

یعنی ہم نے اس کو لفظی قالب و لفظی شکل دی ہے اور وہ بھی عربی لفظی شکل دی ہے اور بعض آیات میں ہے کہ ہم نے عربی مبین کی شکل دی ہے،

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ○ (۲۷)

اس کے علاوہ سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۱۰۳ میں بھی عربی مبین کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن یہ سب کس لئے کیا ہے؟

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

تا کہ قرآن میں تعقل کرو، تدبر کرو اور تفکر کرو۔

سورۂ مبارکہ فصلت میں کہ جس کو حم سجدہ بھی کہتے ہیں، اس کے بھی آغاز میں آیہ سوئم میں ہے کہ

كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○

اس کتاب کی آیتیں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن ہے اس قوم کے لئے جو سمجھنے والی ہو۔

ان تعبیروں کے اندر لطافتیں ہیں، صرف تنزیل ہے نہیں کہا، بعض جگہ پر ہے کہ

تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ○ (۲۸)

یہ خدائے حکیم وحمید کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَo(۲۹)

یہ عالمین کے رب کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِo(۳۰)

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِo(۳۱)

تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِo(۳۲)

لیکن سورۂ مبارکہ زخرف کی آیہ ۲ میں خصوصیت کے ساتھ رحمٰن ورحیم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo

یہ خدائے رحمان ورحیم کی تنزیل ہے۔

یعنی ان صفات، اسماء اور معانی کی تنزیل ہمراہ با رحمتِ رحمانیہ ورحیمیہ ہے۔ یہ تنزیل ہم نے کی ہے یعنی یہ بھی انسان کے اوپر خدا کی ایک رحمت ہے۔ قرآن خود ایک مصداقِ رحمت ہے اور تنزیل رحمتِ دُوُمِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے یعنی قرآن کو آسان کرنا، قابلِ فہم بنانا بھی ایک لطفِ دیگرِ خدا ہے کہ جو انسان کے لئے مقرر ہوا ہے، سورۂ فصلت کی آیہ سوئم میں ہے کہ

فُصِّلَتْ آيَاتُهُ......

اس کی آیات کو ہم نے الگ الگ کر کے، جدا جدا کر کے، ایک ایک کر کے نازل کیا ہے۔

یہ رحمت کا ایک نمونہ ومصداق ہے اور قرآن عربی بنایا ہے یعنی اس کو عربی الفاظ کا قالب دیا ہے اور

اس کی آیات کو ہم نے الگ الگ اور جدا جدا کیا ہے تا کہ تمہیں آسانی ہو،

یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ......

اسے نزول کی تفسیر کہہ لیں یعنی یسرنا القرآن نزولِ قرآن کی تفسیر ہے اور یہ آیت

فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا......

یہ یسرنا کی تفسیر ہے یعنی ہم نے قرآن کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ ہر آیت الگ الگ، ہر مطلب جدا جدا اور ہر چیز مفصل کر کے پیش کی ہے، اس کو آپ کے لئے بہت واضح، روشن، زبانِ مبین اور تبیان کی صورت میں بیان کیا ہے تا کہ آپ کو سمجھنے میں مشکل نہ ہو لیکن

بَشِيرًا وَنَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ٥(۳۳)

یہ قرآن بشارت دینے والا اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والا بنا کر نازل کیا گیا ہے لیکن اکثریت نے اس سے اعراض کیا ہے اور وہ کچھ سنتے ہی نہیں ہیں۔

۸) اکثریت فہم کیلئے آمادہ نہیں

قرآن کو تو خداوند تبارک وتعالیٰ نے آمادہ کیا ہے، آسان اور قابلِ فہم بنایا ہے لیکن اِدھر سے مخاطبینِ قرآن کا کام یہ ہے کہ اپنی فہم کو بھی قرآن کے لئے آمادہ کریں، بعض لوگوں نے یہ کام کیا یا نہیں کیا؟

فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ......

اکثر نے نہیں کیا، کیونکہ قرآن کو سمجھنے کے لئے آمادہ نہیں تھے،

فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ○

سنتے نہیں تھے،

وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ ○ (۴۴)

اور کہتے ہیں ہمارے دل جن باتوں کی تم دعوت دے رہے ہو ان کی طرف سے پردہ میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بہرا پن ہے اور ہمارے تمہارے درمیان پردہ حائل ہے لہٰذا تم اپنا کام کرو اور ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔

ان کا یہ کہنا تھا کہ ہم آمادہ نہیں ہیں، جس چیز کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اس چیز میں اور ہمارے درمیان پردے ہیں،

وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ ..

اکنہ یا اکنان پردے کو کہتے ہیں، مکنون پردے میں چھپی ہوئی محجوب چیز کو کہتے ہیں یعنی جس چیز کی طرف آپ اور قرآن ہمیں بلا رہے ہیں اس کے لئے ہمارا دل آمادہ نہیں ہے، تیار نہیں ہے، ان دلوں کے اندر اور اوپر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان وقر اور حجاب ہیں۔ پس خدا نے تو قرآن کو آسان بنایا ہے لیکن اکثریت فہمِ قرآن کیلئے آمادہ نہیں ہے۔

۹)قرآن میں تدبر کی تاکید

سورہ ص میں آیہ ۲۹ میں ہے کہ

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ ......

ہم نے یہ کتاب آپؐ کی طرف نازل کی ہے، یہ کتاب مبارک ہے، مبارک یعنی اس کے اندر برکات ہیں، اس کتاب کے اندر وہ برکات ہیں کہ جو آپ کی زندگی کے لیے ضروری ہیں، برکات یعنی خیر کے ذخیرے، کثیر ذخیروں کو برکات کہتے ہیں، ہم عموماً برکت کا لفظ بہت استعمال کرتے ہیں مثلاً خدا برکت دے، اس میں برکت نہیں ہے، اس میں برکت ہے، گھر میں برکت ہے، مال میں برکت ہے، زندگی میں برکت ہے لیکن متوجہ بہت کم ہوتے ہیں کہ برکت سے مراد کیا ہے؟ اگر کوئی ہم سے پوچھ بیٹھے کہ برکت کس کو کہتے ہیں تو زبان گُنگ ہو جاتی ہے، برکت یعنی خیرِ کثیر، جس کے اندر فراواں خیر ہو، انسان کی زندگی کی ضرورت جس کے اندر فراواں ہو، وافر مقدار میں ہو اور وُفُور کے ساتھ موجود ہو تو اس کو برکت کہتے ہیں لیکن اسی آیہ میں آگے فرمایا کہ

لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ .....

ضرورت اس کی ہے کہ تم اس قرآن میں تدبر کرو، ہمارا کام نازل کرنا تھا، آسان کرنا تھا، قابلِ فہم بنانا تھا لہٰذا بنا دیا لیکن قابلِ فہم چیز کو سمجھنے کے لئے کوئی فہم بھی تو آمادہ ہو، تمہارا کام اس کے اندر تدبر کرنا ہے، پھر فرمایا کہ

وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ٥

اور ہم نے اس کو نازل کیا ہے تاکہ اولی الالباب متذکر ہوں، صاحبانِ لُبّ یعنی صاحبانِ عقل، اولی الالباب یعنی جو صاحبانِ عقل ہیں، نہ یہ کہ ان کا ایسی نوع سے تعلق ہے کہ جس نوع میں شانیتِ عقل موجود ہے، عموماً ہم اپنے آپ کو عاقل اس وجہ سے سمجھتے ہیں کہ ہمارا ایسی نوع سے تعلق ہے کہ جس کی صلاحیت یہ ہے کہ اس کے بعض افراد میں عقل موجود ہے یعنی ملکہ بلحاظِ نوع کرتے ہیں، ہم اگر فردی لحاظ سے دیکھیں تو اولی الالباب کم ہیں، یہاں فردی لحاظ سے اولی الالباب مراد ہیں نہ کہ نوعی لحاظ سے، یعنی حیوانوں کی بعض انواع ہیں لیکن وہ نوعِ اولی الالباب میں سے نہیں ہیں، صاحبِ لب اور صاحبِ عقل نہیں ہیں، انسان تنہا نوع ہے کہ جس کے اندر عقل موجود ہے لیکن انسانوں میں بھی آیا سب میں عقل موجود ہے؟ یہ فرد فرد کے لحاظ سے دیکھا جائے گا، خدا نے فرمایا کہ ان میں سے بعض لوگ اولی الالباب ہیں یعنی جو فہم رکھتے ہیں اور اہلِ لُبّ ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کو قرآن سمجھ میں آئے گا، یہ قرآن میں غور کریں گے، فکر کریں گے اور نتائج لیں گے۔

سورۂ مبارکہ یوسفؑ میں آیہ دوم اور سوم میں خود قرآن بتا رہا ہے کہ جس چیز کو ابھی پڑھنے جا رہے ہو، جس کی تلاوت کرنے جا رہے ہو یہ ہے کیا؟

اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ۝

ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے کہ شاید تم لوگوں کو عقل آجائے۔

اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ ......

اس کتابِ مبین کو ہم نے نازل کیا ہے، نزول سے پہلے بھی یہ کتاب مبین تھی لیکن تمہاری

دسترس سے باہر تھی، سورۂ مبارکہ واقعہ کی آیات ۸۰-۷۷ میں فرمایا کہ

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ۝ فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۝

پھر فرمایا کہ اس کو ہم نے نازل کیا یعنی قابلِ فہم بنایا۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝

اسی طرح سورۂ مبارکہ یوسفؑ آیہ دوم میں فرمایا کہ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝

ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے کہ شاید تم لوگوں کو عقل آجائے پھر آیہ سوم میں ارشاد فرمایا کہ

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ۝

یعنی اس میں ہم آپ کیلئے فراواں چیزیں پیش کریں گے، قصص بیان کریں گے، مطالب ذکر کریں گے کہ جو آپ کو پہلے معلوم نہیں تھے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے کہ قرآن جو تعلیمات لے کر آیا ہے تو آیا یہ پہلے سے انسان کو معلوم تھیں یا پہلے یہ آسمانی کتب میں آئیں؟ آیا عقل یہاں تک تنہا پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟ اس آیت میں وہ موضوع بھی موجود ہے اور اسی موضوع پر سورۂ مبارکہ نساء کی آیہ ۸۲ میں ہے کہ

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا

كَثِيْرًا٥

یعنی آیا یہ لوگ کہ جو قرآن سے دور ہیں یا قرآن کے بارے میں تشویش کا شکار ہیں یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں؟ اگر قرآن میں غور کیا ہوتا تو انہیں بخوبی معلوم ہو جاتا کہ یہ کلامِ خدا ہے کیونکہ اس کے اندر ذرّہ برابر بھی اختلاف موجود نہیں ہے اور یہ حقیقت تدبر سے واضح و روشن ہوتی ہے کہ آیا قرآن میں کوئی اختلاف موجود ہے یا نہیں ہے،

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ......

کیوں تدبر نہیں کرتے ہیں، یہ ایک قسم کی توبیخ و سرزنش ہے کہ تدبر کیوں نہیں کرتے؟

اس ساری گفتگو کا خلاصہ و محاصل یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنے کی ضرورت ہے، یہ منشورِ حیات تدبر و تفکر کا محتاج ہے اور تدبر کی دعوت خود قرآن نے دی ہے اور تدبر نہ کرنے کی مذمت کی ہے۔ قرآن فہم کا محتاج ہے لیکن اس فہم کے لئے آمادگی چاہئے، ہم آمادہ فہم کے مالک نہیں ہیں، جیسے بہت سارے کاموں کے لئے ہمارا جسم آمادہ نہیں ہے لیکن اگر اس کو آمادہ کریں تو یہ آمادہ ہو جائے گا۔ تھوڑی سی زحمت دیں، تھوڑی سی مشقت دیں، اس کو تھوڑی سی مشق کروائیں تو یہ آمادہ ہو جائے گا۔

۱۰)ماہِ رمضان قرآن فہمی کا مہینہ

ہماری قوتِ فہم، قوتِ عاقلہ اور قوتِ تدبر کہ جو خدا نے عطا کی ہے وہ آمادہ نہیں ہے اور وہ بھی ہماری وجہ سے آمادہ نہیں ہے کہ اس کو ہم نے مشغول کیا ہوا ہے، اس کے مشغلے کثیر ہیں، لہو و لعب

فراواں ہیں، سرگرمیاں ہیں، غفلت ہے اور بہت ساری چیزیں ہیں کہ جو خود قرآن نے ہی ذکر کی ہیں اور بعض فہم کے لحاظ سے تو قرآن نے کہا ہے کہ

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُم ......(۳۵)

بعض تو قساوت کا شکار ہیں، بعض فہم یعنی دل، ان کے اندر قساوت ہے، سختی ہے اور ان کے اندر شدت آگئی ہے، وہ بھی اس طرح سے کہ اب کوئی چیز ان پر اثر نہیں کرتی ہے بلکہ

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُم مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ فَهِیَ کَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ......

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت......

بعض فہم قرآن کے ادراک سے اور قرآن کے سمجھنے سے اتنے قاصر ہیں کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ قرآن نے پتھر کے تین مرتبے ذکر کیے ہیں کہ پتھر میں گنجائش ہے، پتھر میں پانی نکلتا ہے، پتھر میں نہر جاری کی جا سکتی ہے، پتھر میں چشمہ پھوٹتا ہے اور پتھر خشیتِ خدا سے گر جاتا ہے لیکن ھُبوط کرتا ہے لیکن دل اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ اس پر کلامِ خدا بھی اثر نہیں کرتا ہے یعنی وہ فطری فہم انسان کی فطرت سے ہٹ کر اور منحرف ہو کر کسی اور نقطے تک پہنچ جاتا ہے کہ جس کو قرآن نے شقاوت اور قساوت سے تعبیر کیا ہے، اس فہم کو قساوت سے نکال کر قرآن کے لئے آمادہ کریں اور اس کے لئے بہترین موقع ماہِ رمضان ہے کیونکہ قرآن ماہِ رمضان میں نازل ہوا ہے اور نزولِ فہمِ قرآن کے معنیٰ میں ہے لہٰذا فرمایا کہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ......(۳۶)

یعنی ماہِ رمضان قرآن فہمی کا مہینہ ہے، دلوں کو نرم کرنے کے لئے یہ زمانہ انتہائی مناسب ہے، ماہِ رمضان میں قساوتِ قلبی کچھ درجہ خود ہی کم ہو جاتی ہے اور اگر انسان ساتھ میں کچھ کوشش بھی کرے تو مکمل طور پر قساوت کا خاتمہ کر کے خشوع بھی پیدا کر سکتا ہے اور انسان کے دل میں نرمی پیدا ہو سکتی ہے کہ جس کے بعد انسان کو قرآن سمجھ میں آنا شروع ہو جاتا ہے، اس دل کو آمادہ کرنے کے لئے کچھ امور کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، بقول شیخ سعدی

سعدی حجاب نیست تو آیینہ پاک دار

زنگار خوردہ چون بنماید جمالِ دوست......(۳۷)

یعنی اے سعدی پردہ نہیں ہے، محرومیت نہیں ہے بلکہ تیرا آئینہ صاف نہیں ہے اور اس کو زنگ لگا ہوا ہے، جمالِ دوست موجود ہے جبکہ دوسرے آئینوں میں متجلی اور منعکس ہو رہا ہے لیکن تیرے آئینے میں کیوں منعکس نہیں ہوا ہے؟ تیرے سامنے بھی وہ جمال ہے لیکن تیرے اندر اس کا انعکاس نہیں ہے چونکہ تیرے آئینے پہ زنگ چڑھا ہوا ہے، اب گلے اور شکوے نہ کر بلکہ اپنے آئینے کو صاف کر اور متمیز کر۔

۱۱) قرآن فہمی کیلئے آداب کی ضرورت

بعض بزرگ علماء نے قرآن کے آداب کے عنوان سے ان امور کو ذکر کیا ہے مثلاً آدابِ تلاوتِ قرآن ہیں، آدابِ سماعتِ قرآن ہیں۔ کچھ آداب خود قرآن نے ذکر کیے ہیں،

فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِo(۳۸)

لہٰذا جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطانِ رجیم کے مقابلے کے لئے اللہ سے پناہ طلب کریں۔

فَاِذَا قَرَأْنَاہُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَہُo(۳۹)

پھر جب ہم پڑھوادیں تو آپ اس کی تلاوت کو دہرائیں۔

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلاًo(۴۰)

اور قرآن کو باقاعدہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَo(۴۱)

اور جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو خاموش ہوکر غور سے سنو کہ شاید تم پر رحمت نازل ہو جائے۔

یعنی جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو توجہ سے سنو، ساکت ہوجاؤ اور اس کے مقابلے میں اظہارِ نظر نہ کرو، یہ آدابِ فہمِ قرآن میں سے ہے۔ پہلے ہمیں جاننا ہوگا کہ ادب کسے کہتے ہیں؟ جیسے اشارہ کیا تھا کہ برکت ایک مفہوم ہے کہ جسے کثرت سے استعمال کرتے ہیں لیکن ہم اس کے بیان اور وضاحت سے بسا اوقات عاجز و قاصر ہوتے ہیں، شاید اس وجہ سے کہ بہت واضح مفاہیم ہوتے ہیں، جس طرح بہت مبہم مفاہیم کی وضاحت نہیں ہوسکتی ہے اسی طرح بہت واضح مفاہیم کی وضاحت بھی نہیں ہوسکتی ہے، برکت ہی کی طرح کا ایک مفہوم ادب بھی ہے، ابھی ہماری بحث آدابِ فہم قرآن

میں ہے، فہم یعنی سمجھنا، پیغامِ قرآن کو دریافت کرنا، حقیقتِ قرآن تک پہنچنا کہ جو مقصودِ قرآن ہے، لبِ قرآن ہے لہٰذا اپنی قوتِ فہم کی مدد سے اس تک پہنچنے کو فہمِ قرآن کہتے ہیں یعنی تعقل و تدبر فہمِ قرآن ہے لیکن پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ادب کس کو کہتے ہیں، انشاء اللہ فصلِ تعارفِ ادب میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۱۸)

(۲)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۱۹۰)(سورۂ مبارکہ ص، آیہ ۴۳)(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۲۱)

(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ ۵۴)

(۳)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۱۰۰)

(۴)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۷، ۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ ۲۴)

(۶)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۱۳)

(۷)......(سورۂ مبارکہ حج، آیہ ۵۳)

(۸)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۲۲)

(۹)......(سورۂ مبارکہ حدید، آیہ ۱۶)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۴۳)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۷۴)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۰)(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ ۴۹)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۵۲)

(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ ۱۲۵)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ ۶۰، ۱۲)(سورۂ مبارکہ حج، آیہ ۵۳)

(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ ۲۹، ۲۰)(سورۂ مبارکہ مدثر، آیہ ۳۱)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ قمر، آیہ ۴۰، ۳۲، ۲۲، ۱۷)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۸۵)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ قدر، آیہ ا)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ ۷۹، ۷۸، ۷۷)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ ۸۰)(سورۂ مبارکہ حاقۃ، آیہ ۴۳)

(۱۸)......(التفسیر و المفسرون)

(۱۹) .... (سورۂ مبارکہ مزمل، آیہ ۴)

(۲۰)....(تنبیہ الغافلین وارشاد الجاهلین عما یقع لهم من الخطأ حال تلاوتهم لکتاب اللّٰہ المبین، باب تنبیهات، الجزء ا، صفحه ۱۱۹)

(۲۱)......(کیف نقرأ القرآن)

(۲۲)....(تفسیر المیزان - العلامة الطباطبائیؒ، مقدمة و بحثِ روائی الجزء ۳، صفحه ۴۰)(شرح خطبه البیان امام علیؑ بن ابی طالبؑ)

(باطن و تأویل قرآن)

(۲۳)......(تفسیر المیزان-علامه طباطبائیؒ)

(۲۴)......(غرر الحکم و درر الکلم، الجزء ا، صفحه ۵۷)

(میزان الحکمة - الریشهری، الجزء ۸، صفحه ۲۰۷)

(۲۵)......(مستدرک نهج البلاغه)(البیان فی تفسیر القرآن، الجزء ا، صفحه ۳۲۴)(التفسیر الصافی -الفیض الکاشانی، الجزء ۴، صفحه ۳۶۵)

(شرح اصول کافی - مولی محمد صالح المازندرانی، الجزء ۲، صفحه ۱)

(مستمسک العروة-السید محسن الحکیمؒ، الجزء ۲، صفحه ۲۶۳)

(بحار الانوار-علامہ مجلسیؒ ،الجزء۶۷ ،صفحہ ۲۳۴)

(۲۶)......(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی،

الجزء۱۱، صفحہ ۳۶۵)

(۲۷)......(سورۂ مبارکہ شعراء، آیہ۱۹۵)

(۲۸)......(سورۂ مبارکہ فصلت، آیہ۴۲)

(۲۹)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ۸۰)(سورۂ مبارکہ حاقۃ، آیہ۴۳)

(۳۰)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ۱)(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ۲)(سورۂ مبارکہ احقاف، آیہ۲)

(۳۱)......(سورۂ مبارکہ یٰس، آیہ۵)

(۳۲)......(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ۲)

(۳۳)......(سورۂ مبارکہ فصلت، آیہ۲)

(۳۴)......(سورۂ مبارکہ فصلت، آیہ۵)

(۳۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۴۷)

(۳۶)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۸۵)

(۳۷)......(کلیات سعدی، بر اساس نسخہ محمد علی فروغی، صفحہ۴۴۹)

(۳۸)......(سورہ مبارکہ نحل، آیہ۹۸)

(۳۹)......(سورہ مبارکہ القیامہ، آیہ۱۸)

(۴۰)......(سورۂ مبارکہ مزمل، آیہ۴)

(۴۱)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۲۰۴)

فصلِ تعارفِ ادب

۱)ادب کی تعریف بلحاظِ لغت

☆قرآن دسترخوانِ خدا ھے

۲)ادب کے لغوی معنیٰ کے دیگر موارد

۳)معنیؑ ادب بزبان علامه طباطبائیؒ

٤)دیگر اھلِ لغت کے نزدیك ادب کا معنیٰ

٥)امیر المومنین حضرت علیؑ کے نزدیك افضل ادب

٦)اخلاق اور آداب میں فرق

۷)آداب، مقاصد کیلئے نشانِ راہ

☆علم حاصل کرنے کے مذموم مقاصد

۸)آداب اور اخلاق میں ربط

۹)آداب کی تعریف اور آدابِ فھمِ قرآن میں ارتباط

اجمالی طور پر وہ اوصاف جن کی مدد سے قرآن سے استفادہ کیلئے فہم کو آمادہ کیا جاسکتا ہے آدابِ فہم قرآن کہلاتے ہیں لیکن دقیق معانی ادب معلوم کرنے کے لئے اس موضوع پر ہم بحث کررہے ہیں یعنی ''آدابِ فہم قرآن''، لہٰذا ادب کے معانی کی شناخت کی ضرورت ہے۔

۱)ادب کی تعریف بلحاظِ لغت

اگر ہمیں کسی جگہ ادب کی تشریح کرنی پڑ جائے تو ادب کی تشریح ادب سے ہی کریں گے کہ ادب، ادب کو کہتے ہیں، عموماً ہم واضح مفاہیم یا مبہم مفاہیم کی تشریح ایسے ہی کرتے ہیں مثلاً آپ اپنے آپ سے سوال کریں کہ ادب کس کو کہتے ہیں؟ شاید بعض کی توجہ بھی پہلی دفعہ ہوگی کہ ادب کی تفسیر کی بھی ضرورت ہے، پہلے سمجھتے تھے کہ ادب واضح مفہوم ہے چونکہ ادب عربی لفظ ہے لہٰذا دوسری زبانوں میں اس کے متبادل الفاظ موجود ہیں لیکن پہلے ہم ادب کو سمجھ لیں پھر اگر کوئی متبادل لفظ ہو تو اس کو بھی استعمال کرسکتے ہیں۔

پہلے ادب کا لغوی معنیٰ بیان کرتے ہیں نہ کہ استعمالی معنیٰ، بسا اوقات ادب کے استعمالی معانی ہوتے ہیں یعنی یہ لفظ بہت سارے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور ایک لغوی معنیٰ ہوتا ہے کہ جس کو طلبہ اپنی اصطلاح میں موضوعہ کہتے ہیں یعنی لغت نے اس کو وضع و مقرر کیا ہے، ادب لغت میں بمعنیٰ جمع کرنا، اکٹھا کرنا ہے، کسی بھی چیز کے جمع کرنے کو ادب کہتے ہیں، چونکہ عرب مہمان نواز تھے،

پتہ نہیں ابھی ہیں یا نہیں ہیں، اب تو نہیں ہیں لیکن کسی زمانے میں مہمان نواز تھے، ان میں بڑی مثبت صفات تھیں چونکہ قبائلی لوگ تھے، یہ خصوصیات عربوں کی نہیں تھیں، ان خصوصیات کو ہم عربی خصوصیات نہیں کہہ سکتے ہیں بلکہ جہاں بھی قبائلی زندگی ہو وہاں کچھ چیزیں مشترک ہوتی ہیں، کچھ اقدار، کچھ ویلیوز (Values) ہوتی ہیں۔ ان قبائلی اقدار میں سے ایک مہمان نوازی ہے، قبائلی جہاں بھی ہوں مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اکثر جب یہ لوگ اکٹھے ہوتے تھے تو کھانے پہ اکٹھے ہوتے تھے، کبھی قبائلی مہمان نوازی کی وجہ سے مختلف مناسبتوں سے اپنے گھر میں مہمان بلاتے تھے اور ان میں دستر خوان بچھاتے تھے اور دستر خوان پر اجتماع ہوتا تھا۔

ابھی بھی پاکستان میں جو قبائل ہیں وہ کسی بھی خوشگوار اور ناگوار واقعے پر مل بیٹھتے ہیں لیکن مل کر بیٹھنے کے لئے جو جگہ ہوتی ہے وہ دستر خوان ہوتا ہے۔ ہم نے لفظِ جرگہ سنا ہوا ہے، افغانستان میں آئے دن لوگ جرگہ بلاتے ہیں، جرگہ یعنی وہی اجتماع، قبائلی بزرگوں کا اجتماع کہ جو کسی بھی وجہ سے مل بیٹھیں لیکن کھانا ضرور ہونا چاہئے، کھانا نہیں ہے تو اجتماع موضوعیت نہیں رکھتا ہے، اگر اس نے کھانا آمادہ نہیں کیا ہوا تو ممکن ہے کہ میزبان کو کھا جائیں، اس کے اندر کھانا ضروری ہے لہٰذا ان کا اجتماع کسی بھی وجہ سے ہو یعنی مقصدِ اجتماع کوئی بھی ہو لیکن اجتماع کھانے پر تھا، اس لئے عرب ادب کا لفظ استعمال کرتے تھے، ادب یعنی کھانے پر لوگوں کو اکٹھا کرنا، بلانا، اجتماع کرنا، دعوت کرنا اور بہت ساروں کو بلانا، ایک دو کی دعوت کرنے کو ادب نہیں کہتے تھے بلکہ سب لوگوں کو اپنے دستر خوان پر بلانا، جمع کرنا، اکٹھا کرنا ادب تھا، پھر جو موضوع اور ایجنڈا (Agenda) ہے وہ الگ ہے اور ادب

ادب کی تعریف بلحاظ لغت

سے باہر ہے، ادب یہ ہے کہ دسترخوان پر آ کر بیٹھ جائیں، اسی وجہ سے دسترخوان کو مادبہ کہتے ہیں، بعض نے ماُدبہ بھی کہا ہے، بعض نے احتیاطاً تینوں حرکتیں اس کے اوپر ڈال دی ہیں، جیسے بھی پڑھو شاید یہ جائز الوجوہ ہو، مادِبہ بھی پڑھتے ہیں، ماُدبہ بھی اور مادَبہ بھی۔ ادب یعنی اجتماع، اکٹھا ہونا اور مادبہ یعنی جائے ادب، جہاں پر اکٹھے ہوئے ہوں۔

☆قرآن دسترخوانِ خدا ہے

قرآن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بھی مروی ہے کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ مَاْدُبَۃُ اللّٰہِ......(۱)

یعنی بے شک یہ قرآن دسترخوانِ خدا ہے، چونکہ ماہِ صیام کو کہتے ہیں کہ یہ ماہِ رمضان ضیافۃ اللہ ہے، صوم ضیافۃ اللہ ہے، روایت میں بھی ہے کہ یہ خدا کی مہمانی ہے اور میزبان ذاتِ خدا ہے۔ ہر میزبان ایک دسترخوان پر بلاتا ہے، دسترخوان بچھاتا ہے لیکن خدائے غنی، خدائے رازق، خدائے کریم یعنی کریم ترین ذات کے مہمان کو کہا گیا ہے کہ تم نے کھانا کچھ بھی نہیں ہے۔ عجب دعوت ہے کہ دعوت کر کے کہا کہ نہ کھانا ہے، نہ پینا ہے اور تم ہمارے مہمان ہو، اس طرح سے اگر انسان کسی کو مہمان کرے اور کہے کہ آپ ہمارے مہمان ہیں لیکن نہ کچھ کھانا ہے اور نہ کچھ پینا ہے، یہاں یہ نکتہ عرض کرتا چلوں کہ خدا نے اسی لئے اپنی ضیافت میں کھانا پینا ممنوع قرار دیا ہے چونکہ بہترین کریم میزبان اور لئیم میزبان میں فرق ہے، لئیم یعنی خسیس، کنجوس اور بخیل، جو مہمانی پر اکثر نہیں بلاتا ہے

قرآن دسترخوانِ خدا ہے

لیکن جب پھنس جاتا ہے یا ناخواستہ کوئی اس کے ہاں چلا جاتا ہے یا یہ کبھی مروت اور رکھ رکھاؤ میں پھنس جاتا ہے، یعنی فرومایہ انسان اور گھٹیا آدمی ہوتا ہے، اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مثلاً اگر پھنس کر کہیں گھر میں مہمان بلا بھی لیا ہے تو یہ دیکھتا ہے کہ کہیں مجلس ہو رہی ہو تو پہلے اسے وہاں لے جائے، زیارت کے بہانے جمکران لے جائے، اِدھر اُدھر لے جائے اور کچھ کھلا پلا کر پھر گھر میں لائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خسیس ہے، بخیل ہے، اپنا کھانا بچانے کے لئے کہیں اور سے پیٹ بھروا کر پھر گھر میں لے کر آنا چاہتا ہے یا مثلاً وہ چیزیں کہ جو بھوک کو مار دیتی ہیں کہ عموماً چائے پینے سے بھوک مر جاتی ہے لہٰذا پہلے ان کو چائے پلا دیتا ہے تا کہ یہ زیادہ کھانا نہ کھا سکیں۔

جیسے کہتے ہیں کہ ایک مولانا کی دوستی کسی آدمی کے ساتھ تھی تو مولانا روز تکلف میں کہہ دیتے تھے کہ ہمارے ہاں آؤ، ایک دن وہ آ گیا، کھانا ان کے ہاں نہیں تھا لہٰذا ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کو کھانا تھا تو مولانا صاحب نے کہا کہ آپ بسم اللہ پڑھ کر شروع کریں کہ شیطان بیچ میں شامل نہ ہو چونکہ نہ پڑھیں تو شیطان بھی ساتھ کھاتا ہے، انہوں نے کھانے کا ادب یہ بیان کیا کہ بسم اللہ سے شروع کریں اور ساتھ وجہ بھی بیان کی کہ بسم اللہ پڑھیں تا کہ شیطان ہمارے ساتھ شامل نہ ہو، کھانا ویسے بھی تھوڑا تھا، بہر کیف ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں نے کھایا، وہ آدمی بھوکا رہ گیا، بعد میں اس نے مولانا کی دعوت کی اور زیادہ آدمیوں کا کھانا پکایا، دو آدمیوں کے لئے دس آدمیوں کا کھانا پکایا اور کہا کہ مولانا آپ بھی کھائیں، آپ کا شیطان بھی کھائے، سارے مل کر کھائیں، کھانا زیادہ ہے۔

لہٰذا خسیس آدمی اگر کسی کی کھانے پر دعوت کرلے تو پہلے کوشش کرتا ہے کہ اس کی بھوک مرجائے لیکن سخی آدمی، کریم آدمی اگر کسی کی دعوت کرے تو پہلے اس کو کھلاتا نہیں ہے تاکہ اس کی بھوک چمکے، کھانا زیادہ اور لذیذ بناتا ہے اور اُدھر سے مہمان کو بھی تیار کرتا ہے یعنی ایک طرف سے کھانا تیار کرتا ہے اور ایک طرف مہمان کو بھی تیار کرتا ہے، مہمان جتنا بھوکا ہو اتنا بہترین مہمان ہے اور کھانا جتنا اچھا اور لذیذ ہو اتنا بہترین کھانا ہے، بہترین میزبان اور بہترین مہمان۔ عموماً الا بلا کھانے سے انسان کی بھوک مرجاتی ہے، ریڑھیوں سے لے کر کھائیں، دکانوں سے لے کر کھائیں، چھابڑی والے سے لے کر کھائیں یا دست فروشوں سے لے کر کھائیں تو بھوک مرجاتی ہے پھر جب اصلی غذا کھانے کا وقت آتا ہے تو بھوک نہیں ہوتی ہے۔

مثلاً ایران میں زائرین آتے ہیں اور ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں، یہاں رواج ہے کہ پہلے پیش غذا پیش کرتے ہیں کہ جس کو کھانا کھانے سے پہلے دیا جاتا ہے مثلاً سوپ دیتے ہیں یا سلاد دیتے ہیں، یہ ایران میں رسم ہے، ہمارے زائرین یہ سمجھتے ہیں کہ یہی غذا ہے لہٰذا اسی سے پیٹ بھر لیتے ہیں اور جب اصلی غذا آتی ہے تو ان کے یہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی ہے لہٰذا وہ چھوڑ دیتے ہیں یا آدھی کھاتے ہیں اور آدھی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ جو پہلے ان کو دیا تھا وہ بھوک چمکانے کیلئے تھا لیکن اسی کو کہتے ہیں کہ وہ الا بلا تھا، وہ ہماری نظر میں الابلا تھا لیکن ان کے لئے اپیٹائزر (Appetizer) ہے۔ کہتے ہیں کہ الا بلا کھلا کے پیٹ بھر دیا اور جب اصلی غذا کا وقت آیا تو بھوک ہی ختم تھی۔ اسی طرح قرآن مادبہ خُدا ہے، دسترخوانِ خدا ہے اور خدا نے اس کے اندر انسان کی

خوراک وغذا آمادہ کی ہے کہ جو ہدایت ہے لیکن ہدایت کے لئے انسان کے اندر بھوک ہو، کیوں کہا ہے کہ روزہ رکھوالا بلا نہ کھاؤ؟ چونکہ ان چیزوں کو کھانے سے انسان کی بھوک مر جاتی ہے، کھا کھا کر اونگھ جاتے ہیں، اسی لئے کہا کہ نہ کھاؤ، جب قرآن پڑھو تو کھا کے مت آؤ تا کہ آپ کو اونگھ نہ آئے، الا بلا کھاؤ گے تو آپ کی بھوک مٹ جائے گی اور آپ کی فہم کام نہیں کرے گی۔ نہج البلاغہ اور غرر میں امیر المومنین علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ

لَا تَجْتَمِعُ الْفِطْنَةُ وَ الْبِطْنَةُ......(۲)

ذہانت اور شکم پُری ایک ساتھ جمع نہیں ہوتیں۔

بطانت بطن یعنی پیٹ سے ہے، شکم پرست آدمی کبھی بھی ذہین نہیں ہو سکتا ہے، جو دبا کر کھائے، چار ٹائم کا ایک ٹائم کھائے، چونکہ اس کو ہمیشہ نیند، اونگھ اور سستی آئے گی، قرآن مادبہٗ خدا ہے، دسترخوانِ خدا ہے، یہ ادب گاہِ خدا ہے اور تمام مہمانوں کو خدا نے قرآن پر جمع کیا ہے۔ سورۂ مبارکہ بقرہ کی آیہ ۱۸۵ میں فرمایا کہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ......

ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے کہ جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے......

پس یہ قرآن مادبہٗ خدا ہے اور ماہِ رمضان میں ہم دسترخوان خدا میں ہوتے ہیں اور چونکہ میزبان بہت کریم ہے اور سخی ہے، لئیم نہیں ہے کہ جو کہتا ہے کہ الا بلا کھا کر آنا، جب قرآن پڑھنے آؤ تو الا بلا کھا کر آنا یعنی اونگھتے رہنا، اِدھر سے قرآن پڑھنا اور اُدھر سے اونگھتے رہنا لیکن یہ میزبان چونکہ

سخی ہے لہٰذا کہا کہ الا بلا نہیں کھانا بلکہ روزہ رکھنا، کوئی چیز نہ کھاؤ تا کہ قرآن تمہاری سمجھ میں آئے، بطانت نے تمہاری فطانت ختم کردی ہے، شکم پری نے تمہاری ذہانت کو ختم کردیا ہے اور فہم کو ناقص کر دیا ہے۔ لہٰذا ادب جمع کرنے کے معنیٰ میں ہے، چونکہ وہ دستر خوان پہ جمع ہوتے تھے لہٰذا دستر خوان کو مادبہ کہتے تھے، اس لئے روایتِ نبوی ﷺ ہے کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ مَادُبَةُ اللّٰهِ......

بے شک یہ قرآن دستر خوانِ خدا ہے۔ ماہِ رمضان میں ہمیں دستر خوانِ خدا میں مدعو کیا جاتا ہیں، کتنا عظیم اور کریم میزبان ہے اور اب یہاں مہمان کو آمادہ ہو کر جانا ہے لیکن کس طرح سے؟ ادب سے، لیکن ادب تو جمع کرنے کے معنیٰ میں ہے، آدابِ فہم قرآن سے اس کا کیا تناسب ہے یا یہ ادب تو بہت ساری چیزوں کی صفت ہے مثلاً آدابِ اخلاق، آدابِ معاشرت، آدابِ ملّی و قومی، آدابِ زندگی، آدابِ دوستی، آدابِ جہاد، آدابِ نماز و ملحقات، آدابِ شریعہ، آدابِ ماہ، آدابِ مہمانی، آدابِ زیارت، آدابِ مجلس، آدابِ نفوس، آدابِ کلام، آدابِ دعا، آدابِ لباس، آدابِ سفر، آدابِ تبلیغ اور اسی طرح لفظِ ادب بہت سارے متعلقات کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، لفظِ ادب کا استعمالی معنیٰ کہ جو رائج ہے اور جو معنیٰ ہمیں اس بحث میں مقصود ہے یعنی آدابِ فہم قرآن میں تو اس لغوی معنی اور اس میں کیا ارتباط ہے؟ انشاءاللہ اس کی وضاحت کی جائے گی لیکن ابھی ادب کے لغوی معنیٰ کے دیگر موارد پر توجہ کو مرکوز کرتے ہیں۔

۲)ادب کے لغوی معنیٰ کے دیگر موارد

ادب کا لغویٰ معنیٰ اسی مناسبت سے دیگر معانی کے اندر بھی استعمال ہوا ہے یعنی یہ معنیَ لغوی کے ساتھ ایک طرح کا تناسب رکھتا ہے یعنی اسی اجتماع کا معنیٰ دیگر موارد میں بھی موجود ہے اور ان میں سے لغوی معنی کے ساتھ جس معنی کی مناسبت بنتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر اچھی صفات کو جمع کرنا لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ صفات مثبت ہوں منفی نہ ہوں لہٰذا مثبت صفات کو اپنے اندر جمع کرنا بھی ادب کہلاتا ہے، جس طرح مہمان نواز انسان اپنی سخاوت کی وجہ سے لوگوں کو اپنے دسترخوان پر اکھٹا کرے تو یہ ادب ہے، اسی طرح انسان اچھی صفات کو اپنے نفس کے اندر جمع کرے تو یہ بھی ادب ہے، البتہ اس کی قید ہے یعنی ہر قسم کی صفات کو جمع کرنا ادب نہیں کہلاتا ہے بلکہ اچھی اور مثبت صفات کا جمع کرنا ادب کہلاتا ہے یعنی اچھے خصائل جمع کرنا۔

اب معنیٰ ادب اصطلاح کی طرف زیادہ نزدیک تر ہوا ہے چونکہ جس معنیٰ سے ابھی ہمیں آدابِ فہمِ قرآن میں سروکار ہے وہ آداب کا اصطلاحی معنیٰ ہے لیکن لغوی معنیٰ سے متاثر ہے اور اسی معنیٰ لغوی کی طرف ناظر ہے، انسان کے اندر اچھی صفات کو جمع کرنے کی چند خصوصیات اور چند قیود بھی ہمراہ ہیں، اول یہ کہ وہ صفات ایسی ہوں کہ جن کے اندر صفتِ حسن یا احسان موجود ہو، حسن کے معانی موزونیت کے ہیں، حسن کا معنیٰ زیبائی بھی کرتے ہیں اور اسی وجہ سے کرتے ہیں چونکہ اس کے اندر موزونیت اور تناسب ہوتا ہے، انسان اسی وجہ سے کسی موزوں چیز کو دیکھے تو ذہن انسان یا حسِ انسان کو لذت محسوس ہوتی ہے، جن چیزوں کے اندر توازن ہو، جن امور کے اندر توازن ہو تو

اس توازن کی صفت کو ہی حُسن کہتے ہیں۔

ان صفات کا حسین ہونا ضروری ہے یعنی وہ موصوف کے لئے موزوں صفات ہوں اور دُوم یہ ہے کہ یہی صفات کہ جن کے اجتماع کو ادب کہتے ہیں اس شے کی غرض کے حصول کے لئے مؤثر بھی ہوں یعنی فقط باعثِ زینت نہ ہوں چونکہ ایک موزونیت ایسی ہے کہ جس میں شے کے اندر حسن آ جاتا ہے لیکن فقط زینت کی حد تک یعنی جس جس سے انسان اس شے کو دیکھتا ہے فقط وہ حس لذت محسوس کرتی ہے کہ عموماً زیبائی اور آرائشِ ظاہری اسی حد تک ہوتی ہے اور حسن اس سے زیادہ مؤثر نہیں ہوتا ہے یا موزونیت مؤثر نہیں ہوتی ہے کہ فقط دیکھتے ہوئے انسان کی آنکھ کو اچھی لگے، انسان کے دل کو اچھی لگے، انسان کے ذہن کو پسند آئے، اس کے اندر ملائمت اور سازگاری موجود ہو لیکن بعض اوقات یہی موزونیت سبب بنتی ہے کہ اس شے کی غرض اور غایت بھی انہی صفات کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے یا اس کا حصول آسان ہو جاتا ہے، اگر اس شے کے اندر یہ صفات نہ ہوں تو شے کی غرض سرے سے حاصل ہی نہیں ہوتی۔

ادب کے لغوی معنی کی مجموعی مراد

پس اچھی صفات کا جمع کرنا ادب ہے لیکن وہ اچھی صفات کہ جن کے اندر حسن ہو اور باعثِ حسنِ موصوف بنیں، وہ صفات فقط صفات نہ ہوں، یعنی نہ منفی ہوں اور نہ ہی حسن سے خالی ہوں بلکہ وہ صفات باعثِ زینتِ موصوف بنیں اور ادب کے اندر دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہم ان صفات کے جمع کرنے کو ادب کہیں گے کہ جن کے ذریعے سے موصوف اپنی غرض و غایت تک پہنچ جائیں یا ان اوصاف کی مدد سے موصوف کے اندر موجود غرض حاصل ہو سکے پس اصطلاح میں ادب

ان صفات کے اجتماع کو کہیں گے۔ آداب اسی کی جمع ہے یعنی ان صفات کا مجموعہ کہ جو موصوف کے اندر حسن و زیبائی و زینت کا باعث بھی بنیں اور اس کے اندر موجود غرض کے حصول کا باعث بھی بنیں۔

کئی چیزوں کے لئے ادب صفت واقع ہوتا ہے یعنی موصوفِ ادب بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں کہ ان میں سے رائج ترین الفاظ ہیں مثلاً الفاظ کی ابحاث کو، قواعدِ لفظیہ کو ادبیات کہتے ہیں، وہ علوم کہ جو الفاظ سے بحث کرتے ہیں مثلاً نحو کہ جس میں الفاظ کے اعراب و بناء سے بحث کی جاتی ہے یا صرف جس میں اوزانِ الفاظ سے بحث کی جاتی ہے اور اسی طرح معانی و بیان و بدیع کہ جس میں عبارت یا کلام کے حسن و زیبائی سے بحث کی جاتی ہے لہٰذا ایسے قاعدوں اور ضابطوں کے مجموعۂ علوم کو ادبیات کہا جاتا ہے۔

ادبیات یعنی آدابِ الفاظ۔ وہ علوم جو متعلق بہ ادبِ الفاظ ہیں، ان کو آداب کیوں کہا جاتا ہے؟ اسی وصف کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ان قواعد کے ذریعے سے الفاظ کے اندر یہ دو چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اول یہ کہ اگر یہ قواعد لحاظ نہ کئے جائیں اور یہ ضابطے ملحوظِ خاطر نہ رکھیں جائیں تو پڑھنے اور لکھنے کے دوران ایک تو الفاظ میں حسن اور زینت پیدا نہیں ہوتی ہے، اگر الفاظ کے اندر یہ قواعد اور ضابطے ہٹا کر کوئی گفتگو کرے تو اس کے کلام میں حسن پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ سننے والے پر ایسا کلام بہت گراں اور شاق گزرتا ہے اور دوم یہ کہ الفاظ کے اندر ایک غرض ہے، انسان کسی غرض کے لئے الفاظ بولتا ہے، لکھتا ہے یا حتیٰ بحث کرتا ہے، معانی کے لئے الفاظ کی غرض یہ ہے کہ انسان اپنی مراد کسی

ادب کے لغوی معنیٰ اور دیگر موارد

دوسرے تک پہنچائے اور معنیٰ تفہیم کرے، اس کو ہم اصطلاح میں غرضِ الفاظ کہتے ہیں۔

الفاظ عبث نہیں ہیں، انسان جب بھی کوئی لفظ استعمال کرتا ہے تو غرضِ اصلی یہ ہوتی ہے کہ میرے ضمیر اور ذہن کے اندر جو معنیٰ موجود ہے یا جو مطلب میں دوسرے تک منتقل کرنا چاہتا ہوں وہ ان الفاظ کے ذریعے سے اس تک پہنچاؤں، پس یہ غرضِ الفاظ ہے لیکن یہ غرض بھی ان قواعد کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، اگر یہ قواعد ہٹ جائیں اور فقط الفاظ ہوں تو تنہا الفاظ اپنی غرض پہنچانے میں ناکام ہیں، کوئی انسان ان الفاظ سے غرض نہیں سمجھے گا یا برعکس سمجھے گا مثلاً بولنے والا کچھ اور کہنا چاہے گا اور سننے والا کچھ اور سن رہا ہوگا لہٰذا غرض پوری نہیں ہوگی، پس الفاظ کے ذریعے سے غرض بھی حاصل ہونی چاہئے، نتیجہ یہ ہوا کہ الفاظ کو ان دو چیزوں کے لئے قواعد کی ضرورت ہے۔

الفاظ موصوف ہیں اور صفات، قاعدے وضابطے ان کے اوصاف ہیں، ان اوصاف سے متصف ہو کر الفاظ میں اول یہ کہ زینت پیدا ہوتی ہے، عبارت کے لحاظ سے حسن پیدا ہوتا ہے اور اس کے اندر جمالِ لفظی آتا ہے اور دوم یہ کہ الفاظ اپنے معانی بخوبی ادا کرتے ہیں کیونکہ الفاظ کی غرض ان قواعد کی مدد سے حاصل ہوتی ہے، اس وجہ سے ان قواعد کے مجموعے کو اصطلاح میں ادب کہا جاتا ہے یا علمِ ادب اور ادبیات کہا جاتا ہے۔ یہ تو الفاظ کی صفت ہے لیکن اس سے پہلے کہ آداب قواعدِ لفظیہ کے لئے استعمال ہوں یعنی ان کو ہم ادبیات کہیں چونکہ از جملہ الفاظ افعالِ انسان ہیں، یہ خود انسان کے آداب ہیں، ایسے اوصاف اور ایسے کمالات کہ جن کی وجہ سے یہ دو چیزیں حاصل ہوں، ایک یہ کہ انسان کے اندر حسن، زیبائی اور جمال پیدا ہو اور دوسرا یہ کہ انسان کو ان ضابطوں کے ذریعے سے

غرض حاصل ہو یعنی انسان ان اوصاف کی مدد سے اپنے مقصدِ خلقت تک پہنچ سکتا ہو، لہٰذا ان اوصاف کو انسان کے آداب کہا جاتا ہے۔

۳) معنیٔ ادب بزبان علامہ طباطبائیؒ

مرحوم علامہ طباطبائیؒ نے معانیٔ ادب کو زیادہ خوبصورتی سے بیان کیا ہے، تفسیرِ شریف المیزان میں ادب مع اللہ کے ذیل میں بحثِ ادب بھی بہت خوبصورتی سے انجام دی ہے یعنی انسان کے خدا کے ساتھ آداب۔ بارگاہِ خدا میں انسانی آداب کیا ہیں؟ ان آداب کے ذیل میں پہلے ادب کا معنیٰ کیا ہے، اسی کتابِ شریف المیزان سے عبارات ملاحظہ کرتے ہیں کہ انہوں نے ادب کا کیا معنیٰ کیا ہے؟ جلدِ ششم میں صفحہ ۲۵۶ میں کلام فی معنی الادب کے نام سے ایک بحثِ مفصل ہے، جس طرح المیزان کا اُسلوب ہے کہ پہلے مختلف آیات کے ذیل میں تفسیری بحث ہوتی ہے اور پھر اس آیہ کا جو مرکزی مفہوم ہوتا ہے، جس پیغام کو آیہ پہنچا رہی ہوتی ہے اس کو الگ سے محلِ بحث قرار دیتے ہیں یا اس پر بحثِ فلسفی، بحثِ اجتماعی، بحثِ روائی یا ادبی بحث ہوتی ہے۔ سورۂ مائدہ کی بعض آیات کے ذیل میں انہوں نے ایک پوری فصل کلام فی معنی الادب کے نام سے لکھی ہے، گویا یہ ادب پہ پوری ایک مختصر سی کتاب ہے، اس میں فرماتے ہیں کہ

نبحث فيه عن الأدب الذى أدب الله به أنبيائه ورسله (عليهم السلام) فى عدة فصول......(۳)

ہم چند آداب سے بحث کریں گے، وہ آداب کہ جن آداب سے خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مؤدب فرمایا ہے یعنی آدابِ انبیاءؑ یا آدابِ الٰہی کہ جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے لئے مقرر کیئے ہیں، اس کے ذیل میں چند فصلیں ہیں، پہلی فصل خود معنیٰ ادب میں ہے کہ ادب کہتے کس کو ہیں؟ فرماتے ہیں کہ

الأدب علی ما یتحصل من معناه هو الهیئة الحسنة التی ینبغی أن یقع علیه الفعل المشروع اما فی الدین أو عند العقلاء فی مجتمعهم کآداب الدعاء وآداب ملاقاة الاصدقاء وان شئت قلت ظرافة الفعل......

یعنی ادب اس حالتِ زیبا، حالتِ حسنہ اور ہیئتِ حسنہ سے عبارت ہے کہ جو انسان کے فعل کے اوپر طاری ہوتی ہے۔ انسان جب بھی کوئی فعل انجام دیتا ہے تو وہ فعل متصف ہوتا ہے یعنی اس کے گوناگوں حالات ہیں، اس کی مختلف ہیئتیں اور شکلیں ہیں، ان مختلف شکلوں میں سے جو شکل فعل کی زیبا شکل ہو، حسین شکل ہو، خوبصورت اور موزوں شکل ہو کہ طبیعتاً جس فعل کو جیسا انجام پانا چاہیے اسی ہیئت کے مطابق اگر فعل انجام پائے تو اس کو اصطلاح میں یعنی اس ہیئتِ حسنۂ فعل کو، اسی صفتِ حسنہ کو یا ہیئتِ جمیلہ کو کہ جو فعل کے اوپر طاری ہوتی ہے ادب کہتے ہیں۔

البتہ ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ اس کی شرائط ہیں، ایک یہ کہ ادب ان صفات کو کہتے ہیں جو جائز فعل کی صفات ہوں، وہ فعل مشروع ہو، فعل مشروع ہونا یعنی جائز ہو، ناجائز فعل نہ ہو مثلاً ظلم کے آداب، چوری کے آداب، جھوٹ کے آداب، نا، ان امور کے لئے ادب کا لفظ استعمال کرنا غلط ہے،

لہٰذا ایسے استعمال کرنا سرے سے غلط ہے حتیٰ مجازاً بھی استعمال نہیں کر سکتے ہیں مثلاً کوئی انسان جھوٹ بولے چونکہ جھوٹ بھی فعلِ انسان ہے اور کہے کہ یہ جھوٹ بولنے کے آداب ہیں، نہیں، چونکہ جھوٹ نامشروع فعل ہے، یہ نامشروع یعنی ناجائز فعل کیوں ہے؟ اس وجہ سے کہ کسی فعل کو جواز دو منابع سے حاصل ہوتا ہے یا تو شریعتِ مقدسہ یعنی وحی کے ذریعے سے کسی فعل کا جواز پیدا ہوتا ہے یا عقل کے ذریعے سے جواز پیدا ہوتا ہے، مثلاً ہم سے جتنے بھی اعمال اور افعال سرزد ہوتے ہیں تو یہ دیکھنے کیلئے کہ آیا یہ جائز افعال ہیں یا ناجائز افعال ہیں ہمیں دو منابع سے استفتاع کی ضرورت ہے، پوچھنے کی ضرورت ہے، ایک شریعت سے کہ میرا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز ہے اور ایک عقل سے۔

جن افعال کو عقل کہے کہ ناجائز ہیں تو شریعت بھی ان افعال کو ناجائز کہتی ہے اور جن افعال کو شریعت کہتی ہے کہ ناجائز ہیں تو وہ عقل کے نزدیک بھی ناجائز ہیں، منتہیٰ بسا اوقات یہ ناجائز ہونا، کسی فعل کا غیر مشروع ہونا ہم روایت کے ذریعے سے سمجھتے ہیں اور بسا اوقات کسی دلیلِ عقلی کی مدد سے کشف کرتے ہیں، پس پہلے یہ طے ہونا چاہئے کہ وہ فعل جو انسان انجام دیتا ہے یا جو انسان سے سرزد ہو رہا ہے وہ جائز ہے یا ناجائز ہے یعنی اس کے حلال ہونے، مباح ہونے یا جائز ہونے کا فتویٰ عقل و شریعت نے دیا ہے یا نہیں دیا ہے، جن افعال کو عقل و شریعت نے کہا ہے کہ یہ جائز ہیں تو پھر ان کے بارے میں بحث ہوتی ہے کہ ان افعال و اعمال کے آداب ہیں لیکن جن کو پہلے قدم پر ہی عقل و شریعت کہہ دے کہ یہ ناجائز فعل ہیں تو ان کے بارے میں بحثِ آداب وہیں ختم ہوجاتی ہے یعنی ان کے بارے میں اب مزید بحث نہیں کر سکتے ہیں کہ ان کے آداب کیا ہیں، جیسے اشارہ کیا کہ ظلم

ہے، ستم ہے، جھوٹ ہے، سرکشی ہے، غیبت ہے مثلاً غیبت کرنے کے آداب، نا، غیبت کرنے کے کوئی آداب نہیں ہیں، آداب اچھے فعل کے ہوتے ہیں یا جائز فعل کے اور دوسرا یہ ہے کہ یہ فعل اختیاری ہو۔

مرحوم علامہؒ فرماتے ہیں کہ آداب ان افعالِ انسان کے ہیں کہ اول انسان کا فعل عقل اور شریعت کے ذریعے سے جائز فعل ہو اور دوم یہ کہ یہ اختیاری فعل ہو کہ بعض اوقات غیر اختیاری افعال انسان سے سرزد ہوتے ہیں اور ان کے اندر انسان کا اپنا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، یعنی انسان کے ارادے، علم اور اختیار کے تحت وہ افعال صادر نہیں ہوتے ہیں بلکہ غیر اختیاری ہیں مثلاً جیسے انسان کی نبض چلتی ہے، انسان کا دل دھڑکتا ہے، انسان کے معدے میں غذا ہضم ہوتی ہے تو یہ فعل انسان کے ہی ہیں اور یہ انسان کے جسمانی افعال ہیں یا انسان کے روحانی افعال ہیں لیکن انسان کے ارادے کو ان میں کوئی شمولیت حاصل نہیں ہے، انسان ارادہ کریں یا نہ کریں یہ افعال انسان سے سرزد ہوتے ہیں، ادب ان افعال کی صفت کہلاتا ہے کہ جو اختیار اور ارادہ انسان سے صادر ہوں یعنی انسان چاہے تو ان کو انجام دے اور نہ چاہے تو انجام نہ دے، ارادی ہونے کے معانی یہی ہیں کہ اگر انسان چاہے۔

اِنْ شَاءَ فَعَلَ وَ اِنْ لَمْ يَشَاءُ لَمْ يَفْعَلْ......(۴)

اگر چاہے تو انجام دے اور اگر نہ چاہے تو انجام نہ دے......

ان افعال کی ضمام خود انسان کے اختیار میں ہو، ان افعال کی انجام دہی پر اور ان کے ترک

کرنے پر اور نہ ہی فعل پر وہ مجبور نہ ہو، مثلاً جس طرح سے جسمانی رشد ونشو نما ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کا جسم بڑھنا شروع ہو جاتا ہے تو یہ غیر اختیاری فعل ہے، نہ انسان اس کو روک سکتا ہے، نہ انسان اس کو ترک کر سکتا ہے اور نہ ہی انسان اپنے اختیار سے اس کو انجام دے سکتا ہے، اسی طرح سے بہت ساری چیزیں انسان کے جسم اور روح میں موجود ہیں، اختیاری فعل اس کو کہیں گے کہ مثلاً جو انسان دیکھتا ہے لیکن اگر چاہے تو نہ دیکھے، انسان کھاتا ہے لیکن اگر ارادہ کرے تو نہ کھائے، انسان بولتا ہے لیکن اگر ارادہ کرے تو نہ بولے، یعنی جس فعل کا انجام دینا اور ترک کرنا دونوں مقدورِ انسان ہوں، چاہے تو انجام دے اور چاہے تو انجام نہ دے، پس پہلا یہ ہے کہ جائز فعل ہو دوسرا یہ ہے کہ یہ انسان کا اختیاری فعل ہو، غیر اختیاری نہ ہو۔ ان افعال کے لئے کچھ قواعد وضوابط ہیں اور ان قواعد وضوابط کی خصوصیات پہلے بیان کی ہیں کہ ان میں وہ دو خصوصیتیں ہوں تو پھر ان افعال کی صفات کو آداب کہتے ہیں۔

انسان یہ افعال کچھ صفات اور کچھ ضابطوں کے تحت انجام دیتا ہے، ان افعال کے انجام دینے کے کچھ قاعدے ہیں اور ان قاعدوں کے اندر دو خصوصیتیں ہوں، پس دو خصوصیتیں فعل کے اندر ہیں اور دو خصوصیتیں صفت کے اندر ہیں۔ صفات کے اندر یہ خصوصیات ہوں کہ اول باعثِ حُسن وزینت و جمالِ فعل ہوں، ان صفات کے آنے سے فعلِ انسان زیبا ہو جائے، دوم یہ ہے کہ ان صفات کی وجہ سے فعل اپنی غرض وغایت تک پہنچ سکتا ہو، اس فعل کے اندر جو مقصود وغایت ہے یعنی جس کیلئے انسان یہ فعل انجام دیتا ہے تو وہ مقصود وغایت ان صفات کے ذریعے سے حاصل ہو، اگر یہ

صفات نہ ہوں تو فعل کی غرض حاصل نہیں ہوتی ہے اور جن صفات سے فعل کی غرض حاصل نہیں ہوتی ہو تو وہ صفات ادب کے زمرے میں نہیں آتیں، پس مرحوم علامہؒ نے ادب کا معنیٰ یہ کیا کہ ادب حالتِ زیبا سے، حالتِ حسنہ وموزونہ یعنی موزوں حالت سے عبارت ہے۔ چونکہ ہمارے ذہنوں میں مصادیق بیٹھے ہوئے ہیں لہٰذا جب حُسن کہتے ہیں، تو ذہن میں کوئی پھول آجاتا ہے، کوئی سینری (Scenery) آجاتی ہے، حسن کا مفہوم موزوں چیز ہے، جس کے وجود کے اندر تناسب ہو، جس کے اجزاء واعضاء کے اندر تناسب وموزونیت موجود ہو تو اس کو حسن کہتے ہیں۔

بعض اوقات چیزیں موزوں نہیں ہوتی ہیں بلکہ غیر موزوں ہوتی ہیں مثلاً ایک کلام غیر موزوں ہے یا ایک انسان کہ جس کے اعضاء غیر موزوں ہیں، اس کے ہاتھ، پاؤں غیر موزوں ہیں یا تو حد سے چھوٹے ہیں یا حد سے بڑے ہیں تو یہ غیر موزوں انسان ہے، چہرے کے خد وخال بسا اوقات موزوں ہیں اور بسا اوقات ناموزوں ہیں، اگر موزوں ہوں تو یہ باعثِ حسن ہیں لیکن اگر ناموزوں ہوں تو ان کی وجہ سے حسن پیدا نہیں ہوتا۔

پس حسن اس حالتِ زیبا اور حالتِ حسنہ کو کہتے ہیں کہ جو انسان کے فعل پر طاری ہوتی ہے اور یہ حالتِ حسن وحالتِ حسنہ کچھ صفات اور قواعد وضوابط کے ذریعے سے طاری ہوتی ہیں۔ فعل کے اندر دو صفتیں موصوف کی ہیں اور دو خصوصیتیں صفات کی ہیں لہٰذا ان صفات کو ادب کہیں گے کہ جن کے اندر دو خصوصیات پائی جاتی ہوں، اول یہ کہ باعثِ زینتِ فعل ہوں، دوم باعثِ حصولِ غرضِ فعل ہوں اور دو صفتیں موصوف کے اندر یعنی فعل کے اندر ہوں، اول یہ جائز فعل ہو، ناجائز فعل نہ ہو

اور دوم یہ انسان کا اختیاری فعل ہو۔ان خصوصیات کے ساتھ اگر انسان سے ایک فعل سرزد ہوتا ہے اور اس فعل کے اوپر یہ صفات طاری ہوں تو نتیجے میں فعل ایک حالتِ حسنہ وحالتِ موزوں پیدا کر لیتا ہے اسی کو ادب کہتے ہیں۔ پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ فعل انسان کا مؤدبانہ فعل ہے یا یہ فاعل انسان مؤدب انسان ہے۔

٤)دیگر اہلِ لغت کے نزدیک ادب کا معنٰی

بعض بزرگانِ لغت نے یہ کہا ہے کہ آداب ان صفاتِ فعلِ انسان کو کہا جاتا ہے کہ جن کے اوپر انسانوں کا، عقلاء کا اجتماع، اجماع اور اتفاق ہو یعنی جن صفات کے زیبا ہونے اور حسین ہونے پر سب کا اتفاق ہو، سب کہیں کہ یہ اچھی صفات ہیں کیونکہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو سب کے سب عقلاء انسان کے لئے صفاتِ موزوں کہتے ہیں یعنی معنیٰ لغوی تو وہی ہے، بنیادی اور اصلِ معنیٰ وہی ہے کہ اجتماع اور جمع کرنا، امور کا اکٹھا کرنا ادب کہلاتا ہے، اس معنیٰ کے لحاظ سے مقصود یہ تھا کہ انسان کے اندر یا انسانی فعل کے اندر ان صفات کو اکٹھا کرنا کہ جن صفات کے نتیجے میں فعل کے اندر حسن و موزونیت پیدا ہو۔ یہ وہی چیزیں ہیں کہ جن کو طلاب منطق میں بھی پڑھتے ہیں، اس اصطلاح سے طلابِ علوم آشنا ہیں شاید غیر طلاب کے لئے اتنی معروف اصطلاح نہ ہو کہ جسے ہم منطقی اصطلاح میں آرائے محمودہ کہتے ہیں، منطقی اصطلاح میں آرائے محمودہ ان اوصاف یا امور کو کہا جاتا ہے کہ جن کے حسین ہونے پر عقلاء کا اتفاق ہو۔

دیگر اہلِ لغت کے نزدیک ادب کا معنی۔

مثلاً عدالت انہی امور میں سے ہے، عدالت ایک اچھی چیز ہے، اگر معاذ اللہ شریعت نہ بھی کہے یا خدانخواستہ شریعت میں حکمِ عدالت کے بارے میں کوئی حکم نہ ہوتا تو عدالت کے حسن کے لئے عقل کافی ہوتی، عقل خود کہتی ہے کہ عدالت خوب ہے، زیبا ہے اور تمام عقلائے عالم عدالت کو پسند کرتے ہیں پس اس وجہ سے عدالت پر اتفاق ہے، لہٰذا عدالت کی صفت آداب میں سے ہو جائے گی، پس ان ماہرین لغت کے بقول آداب ان صفات کو کہتے ہیں کہ جن کے خوب ہونے پر اور اچھا ہونے پر یا جن صفات کے حسنہ ہونے پر اتفاقِ عقلاء ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور نتیجتاً مصداق ایک ہی ہو جاتا ہے یعنی وہ صفات کہ جن کے اکٹھا ہونے سے انسان کا فعل حسین ہوتا ہو یا جن صفات کے حسن پر عقلاء کا اتفاق ہو، دونوں لازم وملزوم ہیں، چونکہ وہ صفات کہ جن کی وجہ سے انسان کا فعل حسن سے متصف ہوتا ہے، جمال وزیبائی سے متصف ہوتا ہے تو ان ساری صفات پر عقلائے عالم کا اتفاق بھی ہے یا عقلاء جن صفات کے اچھا ہونے پر اتفاق رکھتے ہیں تو یہ وہی امور ہیں کہ اگر انسان کے فعل میں آجائیں تو فعل کو حسین وزیبا بنا دیتے ہیں، انسان کے عمل کی زینت بن جاتے ہیں۔

پس یہ دونوں باتیں الگ الگ نہیں ہیں، ہم اس کو تضاد نہیں کہیں گے کہ یہ ادب کا معنی کچھ اور کرتے ہیں اور وہ ادب کا معنی کچھ اور کرتے ہیں مثلاً فرض کرلیں کہ بولنا، گفتگو کرنا یہ فعلِ انسان ہے، عقلاء اتفاق رکھتے ہیں کہ اگر بلاغت اور فصاحت کے ساتھ گفتگو ہو تو یہ کلام کے لئے بہترین اور اچھی صفت ہے، بلاغت اور فصاحت کے حسن پر عقلائے عالم کا اتفاق ہے، اول یہ کہ کلام کے اندر

حسن اور زیبائی پیدا کر دیتی ہے، فعل کو مزین کر دیتی ہے اور گفتگو زیبا ہو جاتی ہے اور دوم یہ کہ فصاحت اور بلاغت سے مقصودِ کلام آسانی سے ادا ہوتا ہے، اس کی غرض حاصل ہو جاتی ہے لہٰذا دونوں قول لازم وملزوم ہیں، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں فرق ہے۔

۵) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک افضل ادب

بعض اہل لغت نے ادب کیلئے ایک اور معنیٰ استعمالی بھی ذکر کیا ہے اور یہ معنیٰ بھی روایات سے ماخوذ ہے، یہ روایت کئی جگہ نقل ہوئی ہے از جملہ کتابِ شریف غرر میں، غرر الحکم امیر المومنین علیہ السلام کے کلماتِ اختصار کا مجموعہ ہے، مرحوم آمدیؒ نے اس کو جمع کیا ہے، ایک مجموعہ جنابِ سید رضیؒ نے جمع کیا ہے۔ کلامِ امیر المومنین علیہ السلام کے کئی مجموعے ہیں، غرر الحکم ہے، نہج البلاغہ ہے اور ایک مستدرکِ نہج البلاغہ ہے کہ وہ جناب آغائے محمودی نے جمع کی ہے۔ مستدرکِ نہج البلاغہ یعنی تمام کلماتِ امیر المومنین علیہ السلام، خطبات، دعائیں، مناجات اور جو کچھ امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے وہ سارا انہوں نے ایک جگہ پر اکٹھا کیا ہے بنامِ مستدرکِ نہج البلاغہ، اس کا نام نہج السعادہ ہے۔ غرر میں بھی یہ روایت موجود ہے، اگرچہ بعض ماہرین لغت نے ادب کا یہ معنیٰ ذکر کیا ہے لیکن روایت موجود ہے، ہم دونوں طرف سے استناد دے سکتے ہیں، لغت کی طرف بھی اور روایت کی طرف بھی، امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ

اَفْضَلُ الْاَدَبِ اَنْ يَّقِفَ الْاِنْسَانُ عِنْدَ حَدِّهٖ وَلَا يَتَعَدّٰى قَدْرَهٗ ۔۔۔(۵)

افضل ادب یہ ہے کہ انسان اس کی حد میں رہے اور اس سے آگے نہیں بڑھے......

یعنی انسان کے لئے جو مقدار معین کی گئی ہے، جو حدود معین کی گئی ہیں ان حدود سے باہر قدم نہ رکھے، یہ انسان کا بہترین ادب ہے۔ ہر شے کی اپنی ایک حد مقرر ہے، انسان کی ایک حد ہے، انسان کے کام کی ایک حد ہے، ہر شے اور دنیا میں جو بھی موجود ہے اس کی ایک حد ہے، بغیر حد کے فقط ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے، ذات خدا لامحدود ہے، خدا کی کوئی حد نہیں ہے لیکن غیر از خدا ہر چیز کی اپنی ایک حد ہے، اسی حد کے اندر اس شے کے رہنے کو ادب کہتے ہیں۔ اگر ہم دوسرے جہان میں نہ جائیں کہ ہمارا ذہن مُشَوّش نہ ہو جائے اور صرف معنیٰ ادب میں انسان اور انسان کے فعل ہی کے اوپر بحث کو مرکوز رکھیں کہ مثلاً انسان کی حدود ہیں، یہ حدود بھی شریعت نے مقرر کی ہیں، یہ حدود قانونی ہیں یا تکوینی ہیں۔

انسان کے لئے دو قسم کی حدود متعین کی گئی ہیں، بعض تکوینی حدود ہیں کہ جو خلقت میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے مقرر کر دی ہیں، تکوینی حدود یہ ہیں کہ انسان اس خاص ہیئت اور اس خاص شکل میں ہو، اتنے اعضاء ہوں مثلاً اس طرح کی اس کی قامت ہو، اس طرح کا انسان کا پیکر ہو، یہ حدودِ تکوینیٔ انسان ہیں، جیسے مرد ہے تو اس کے جسم میں یہ خصوصیات ہوں، عورت ہے تو اس کے جسم میں یہ خصوصیات ہوں، ظاہر کی یہ خصوصیات ہوں، باطن کی یہ خصوصیات ہوں، یہ حدودِ تکوینیٔ انسان ہیں، اس کے علاوہ کچھ حدودِ قانونیٔ انسان ہیں یعنی انسان کے لئے خلقت کی حدود کے علاوہ کچھ حدودِ قانونی بھی رکھی گئی ہیں، چونکہ انسان موجودِ بااختیار اور آزاد موجود ہے، صاحبِ علم وفراست

ہے، خدا نے اس کو یہ نعمتیں دی ہیں، خوانخواہ اس کے لئے قانون ہیں، شریعت ہے اور قانون کے اندر بھی اس کے لئے حدود مقرر ہیں کہ ان حدود سے آگے اس کا حق نہیں بنتا ہے اور اسے ان حدود سے باہر نہیں جانا چاہئے لہٰذا انہی حدود کے اندر رہنا اور خود کو ان حدود کے اندر رکھنا ادب کہلاتا ہے، مثلاً انسان اپنی حدود کے اندر رہے، انسان حدودِ تشریعی اور حدودِ قانونی کے اندر رہے، حدودِ اخلاقی کے اندر رہے اور حدودِ فقہی کے اندر رہے تو یہ انسان کا ادب ہے، اسی طرح سے فعلِ انسان بھی ہے، جس طرح خود انسان کی حدود ہیں اسی طرح انسان کے فعل کی بھی حدود ہیں مثلاً آپ بولیں، لیکن کتنا بولیں؟ اس کے لئے ایک حد ہے، آپ بے حد نہیں بول سکتے ہیں، لامحدود نہیں بول سکتے ہیں یعنی دونوں لحاظ سے لامحدود مثلاً آپ بولتے رہیں اور کسی کا خیال نہ رکھیں، جس موضوع پہ مرضی ہو بولتے رہیں، آپ یہ خیال بھی نہ کریں کہ یہ گالی ہے، یہ تہمت ہے، یہ بہتان ہے، یہ غیبت ہے، یہ ناسزا ہے، یہ نازیبا الفاظ ہیں اور جو منہ میں آئے کہتے جائیں۔

ایسی گفتگو کرنا انسان کا حق نہیں ہے، گفتگوئے انسان محدود ہے یعنی متعین ہے اور اس بولنے کے کچھ قاعدے اور ضابطے ہیں، انہی قاعدوں وضابطوں کے اندر آپ کو بولنا ہے، انہی قاعدوں اور ضابطوں کا خیال رکھنا یعنی اپنے کلام کو حدود کے اندر رکھنا ادبِ کلام ہے، آپ عبارت استعمال کریں لیکن اس عبارت کے کچھ ضابطے ہیں، کچھ حدود ہیں اور گفتگو ان حدود کے اندر رکھنا عبارت کا ادب ہے لہٰذا ادبیات کو اس معنیٰ میں بھی ادبیات کہتے ہیں کہ الفاظ کے کچھ ضابطے اور کچھ قاعدے ہیں اور یہ ہر زبان کے اندر ہیں، اگر آپ گفتگو کر رہے ہیں اور اس گفتگو کو ان ضابطوں کے

اندر رکھیں اور حدود کے اندر رکھیں تو آپ ادیبانہ گفتگو کر رہے ہیں یعنی آپ مؤدب ہیں اور آپ کے الفاظ آداب سے متصف ہیں۔ حدود وہی ہیں کہ جو شریعت نے یا عقلاء نے مقرر کی ہیں یا یوں کہیں کہ تکوین اور تشریع میں مقرر ہیں، مثلاً آواز حد سے تجاوز کرنے پر قرآن نے مذمت کی ہے،

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ٥(٦)

اور اپنی آواز کو دھیما رکھنا کہ سب سے بدتر آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے۔

یہ جانوروں کی آوازوں کو نہیں کہا گیا ہے بلکہ انسان کو کہا گیا ہے کہ بدترین آواز جو انسان نکالتا ہے وہ آواز ہے کہ جو گدھے کی شبیہ ہے، یعنی اس طرح سے چیخ و پکار نہ کرو، خواہ منبر کے نیچے ہو یا منبر کے اوپر ہو، اس طرح سے نہ ہو کہ یہ کلام حدود سے خارج ہو جائے، بالآخر بولنے کی حد ہے مثلاً آواز اتنی دھیمی بھی نہ رکھو کہ حد سے باہر ہو جائے کہ سرگوشی شروع کر دو اور کسی کے کان تک آواز ہی نہ جائے اور اتنی کرخت آواز میں بھی نہ چلاؤ، اتنی چیخ پکار کہ پیٹ کا زور، انتڑیوں کا زور اور معدے کا زور بھی لگا دو، ظاہر ہے کہ سارے اعضاء خدا نے اپنے اپنے کام کے لئے بنائے ہیں، معدے کا کام غذا ہضم کرنا ہے، انتڑیوں کا کام اس کو اور جگہ منتقل کرنا ہے، اعصاب کو خدا نے قوت دی ہے لیکن انسان بیٹھ کر اعصاب کی قوت بھی اکٹھی کرے، انتڑیوں کی بھی، معدے کی بھی اور سارا زور لگا کر گفتگو کرے تو پھر اس صورت میں باقی کام رہ جائیں گے، اس کی حد ہے یعنی صوت کے لحاظ سے بھی حد ہے کہ نہ حد سے نیچے بولو نہ اوپر۔

اسی طرح دیکھنے اور نگاہ کرنے کے بھی آداب ہیں، بعض نگاہیں ایسی ہیں کہ جو انسان کو

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک افضل ادب

ناگوار گزرتی ہیں مثلاً گھور کر دیکھنا، جبکہ بعض نگاہیں ایسی ہیں کہ جو اس کو پسند آتی ہیں، مثلاً شفقت بھری نگاہوں سے دیکھنا، چونکہ نگاہیں پڑھی جاسکتی ہیں، جب انسان گھورتا ہے تو یہ بھی ایک نگاہ ہے لیکن حد سے متجاوز ہے، ایسے نگاہ نہیں کرنی چاہئے تھی کہ انسان ڈر جائے، سہم جائے اور خوفزدہ ہو جائے، نگاہ کی حد ہونی چاہئے اسی طرح سننے کی بھی حد ہے پس کسی بھی شے کی حد ہے، وہ حد تکوینی ہو یا قانونی کسی شے کو اسی حد کے اندر رکھنا اس شے کا ادب ہے، اب شمار کریں تو بے شمار افعال انسان ہیں لیکن جتنے بھی افعال ہیں ان سارے اعمال اور افعال کی حدود مقرر کی گئی ہیں، انسان اگر انہی حدود کے اندر افعال بجالائے تو یہ آدابِ فعلِ انسان ہیں، آیا یہ ادب کا تیسرا معنیٰ ہے؟ بسا اوقات انسان سمجھتا ہے کہ ادب کہ یہ مختلف معانی کئے گئے ہیں، نہیں، یہ بھی وہی معانی ہیں فقط عبارت تبدیل ہے۔

عبارتنا شتی وحسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر.....(۷)

یعنی عبارتیں مختلف ہیں لیکن معنیٰ ایک ہے۔ ہم اس کو مختلف تعبیروں سے بیان کر رہے ہیں، ہماری یہ عبارتیں، الفاظ اور جملے مختلف ہیں لیکن حقیقت ایک ہی ہے کہ جس کو ادا کیا جا رہا ہے، پہلے جو دو معانی ذکر کئے گئے ہیں یہ اسی کی بازگشت ہے، محلِ مطلب ایک ہی ہے۔ جیسے کہا تھا کہ دو خصوصیات موصوف کے اندر ہوں اور دو خصوصیات صفات کے اندر ہوں تو اس وقت اس کو ہم ادب کہیں گے، یعنی صفات وہ ہوں کہ جو فعل کے اندر یا موصوف کے اندر حسن پیدا کریں اور دوم یہ

صفات وہ ہوں کہ جن کے ذریعے موصوف کی غرض وغایت کو مقصود حاصل ہوتا ہو اور فعل کی خصوصیات یہ ہوں کہ خود وہ فعلِ موصوف جائز بھی ہو اور اختیاری بھی ہو، یہ مرحوم علامہؒ نے ادب کے ذیل میں بیان فرمایا ہے، بعض نے کہا کہ نہیں آداب ان صفات کو کہتے ہیں کہ جن پر اتفاقِ عقلاء ہو، ان کے حسن پر اور ان کے نیک اور اچھا ہونے پر اتفاقِ عقلاء ہو تو اس کو ادب کہتے ہیں، دونوں ایک ہی مطلب ہیں، جیسے بیان کیا تھا کہ لازم وملزوم ہیں۔

تیسرا معنیٰ ادب اس شے کو اپنی حدود میں رکھنا ہے، چونکہ شے کے اندر حسن اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی حدود کے اندر رہے، حدود کے اندر رہنے سے دونوں مقصد حاصل ہوتے ہیں، اس کے اندر زینت اور زیبائی بھی پیدا ہوتی ہے، حد سے بڑھ جائے تو زینت اور موزونیت ختم ہو جاتی ہے اور دوم یہ ہے کہ اگر حدود سے باہر آجائے تو اس کی غرض حاصل نہیں ہوتی ہے، مثلاً فرض کرلیں کہ آپ گفتگو کرنا چاہتے ہیں لیکن اتنے آرام سے اور دھیمی آواز میں بولے کہ دوسرے تک آواز نہیں پہنچی تو غرضِ کلام حاصل نہیں ہوئی یا اتنا زور سے بولے کہ دوسرا کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ کیا کہہ رہے ہیں، انسان بسا اوقات چیخ رہا ہوتا ہے تو اسے کہتے ہیں کہ آرام سے بولو تا کہ کچھ سمجھ میں آجائے کہ آپ کیا کہہ رہے ہو، آپ اگر اپنے ٹی وی (TV) کی آواز اونچی کر دیں، فل والیم (Full volume) کر دیں تو کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ کیا کہہ رہا ہے، اس کو ایک حد میں رکھیں، نہ آواز بہت دھیمی ہو اور نہ بہت اونچی ہو تا کہ آپ کو سمجھ میں آئے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ غرض انہی حدود کے اندر رہنے سے غرض حاصل ہوتی ہے۔

پس بنا براین کسی شے یا موصوف کے اندر حدود ہی باعثِ ایجادِ جمال وزیبائی ہیں اور انہی حدود کے اندر رہنے سے شے یا موصوف کی غرض پوری ہوتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ شے یا وہ فعلِ انسان اختیاری ہو اور دوم یہ کہ وہ فعل جائز اور مشروع فعل ہو، عقل و شریعت نے اس کی اجازت دی ہو تو اس کیلئے لفظ ادب استعمال کیا جاتا ہے۔

٦) اخلاق اور آداب میں فرق

ادب کے بارے میں روایات بھی فراواں ہیں اور بزرگان نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا ہے، مرحوم علامہ طباطبائیؒ نے اسی ادب کے ذیل میں چند اور خصوصیات بھی ذکر کی ہیں اور بہتر ہے کہ یہ ہمیں آغازِ بحث میں معلوم ہو جائیں تا کہ اثنائے بحث میں کسی مشکل کا شکار نہ ہوں، مرحوم علامہ طباطبائیؒ کے مطابق ایک خصوصیت یہ ہے کہ آداب اخلاق نہیں ہیں بلکہ اخلاق اور آداب میں فرق ہے۔ عام طور پر سنی سنائی باتوں یا مجمل اور مبہم ہونے کی وجہ سے ذہنوں میں یہی بات موجود ہے، جیسے برکت کے لئے کہا کہ مجمل اور مبہم مفہوم ہے یا ادب ایک مجمل اور مبہم مفہوم ہے۔ ہم ان مفاہیم کے اندر کمتر تحلیلی بحث کرتے ہیں اسی لئے بسا اوقات اخلاق کو آداب سمجھتے ہیں اور اسے استعمال بھی کرتے ہیں، لکھ بھی دیتے ہیں اور بیان بھی کر دیتے ہیں، نہیں، بلکہ آداب اور اخلاق میں فرق ہے۔

اخلاق، خُلق کی جمع ہے، خُلق سے مراد مَلَکات، راسخ عادتیں، انسان کے نفس اور وجود

کے اندر اچھی راسخ عادتیں ہیں اور تعریفِ ملکات بھی یہ کرتے ہیں کہ انسان کے اندر ایسی راسخ عادتیں کہ جن کی مدد سے انسان سے کوئی فعل اور عمل سہولت کے ساتھ انجام پاتا ہے انہیں اخلاق کہا جاتا ہے اور صدر المتألہین ؒ نے اخلاق کے ذیل میں جو بعض مطالب بیان کئے ہیں وہ بہت ہی عرشی و نورانی ہیں ان میں ایک مطلب خَلق وخُلق کے درمیان فرق ہے۔ انسان دو ہی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ خَلق ہے اور خُلق ہے، خَلق یعنی ہمارے اندر جو کچھ خدا نے بنایا ہے وہ خَلق ہے اور خدا کی بنائی ہوئی اس تصویر کے اندر جو کچھ ہم بناتے ہیں وہ خُلق ہے، ایک پلاٹ (Plot) ہے، ایک بیک گراؤنڈ (Background) ہے کہ جو خدا نے ہمیں بنا کر دیا ہے یہ خَلق ہے اور پھر ہمیں کہا کہ یہ لو قلم اور خود جو مرضی ہے اس کے اندر بناؤ لہٰذا اس کے اندر جو کچھ ہم بنا رہے ہیں یہ ہمارا خُلق ہے، یہ ہمارا اخلاق ہے، پس اخلاق انسان کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ اپنے وجود کے اندر، عادتیں، ملکات اور راسخ چیزیں اور ایسے ملکات کہ جن کے ذریعے سے انسان سے فعل بہت آسانی سے انجام پاتا ہے۔

عادتیں غلط اور صحیح دونوں طرح کی ہوتی ہیں اور دونوں ملکات کہلاتے ہیں لہٰذا اخلاق میں بھی بعض اچھی اور بعض بری عادتیں ہیں، مثلاً بعض لوگوں کے لئے جھوٹ بولنا بہت آسان ہے، اتنا ہی آسان ہے کہ جتنا دوسروں کے لئے سچ بولنا آسان ہے، بعض کے لئے سچ بولنا بہت آسان ہے، اگرچہ خطر وضرر ہو، کیوں؟ اس لئے کہ اِن کے اندر صداقت وسچائی مَلکہ ہے اور اُن کے اندر کذب و جھوٹ مَلکہ بن گیا ہے، جھوٹ بولنا اس کی عادت ہے یا جیسے امانت اور خیانت ہے، ایک شخص کیلئے

اخلاق اور آداب میں فرق

امانت رکھنا بہت آسان ہے، امانت کو راز رکھتا ہے، دوسروں کی امانتیں سنبھالتا ہے اور ادا کرتا ہے، کتنی ہی بڑی امانتیں ہوں لیکن ان کو محفوظ بھی رکھتا ہے اور ادا بھی کرتا ہے، کسی کا راز نہیں اگلتا اور ایک انسان ہے کہ جس کے اندر خیانت ملکہ بن گئی ہے یعنی اس کے نزدیک خیانت کرنا بہت آسان ہے، سب کی باتیں سب کو بتائے گا اور اگر اس کو کوئی چیز سونپ دیں تو یا وہ سرے سے ادا ہی نہیں کرے گا یا چیز کو نقصان پہنچا کر ادا کرے گا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اپنے صحابہ کو، اپنی سپاہ کو یہ فرمایا کہ جس کی وجہ سے ہمارے بعض خطباء کہتے ہیں کہ یہ قسمتِ امیر المومنین علیہ السلام ہے یا فارسی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ مولاؑ کا شانس یعنی قسمت ہے کہ ایسے لوگ میسر آئے ہیں کہ جن کے بارے میں خود امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر میں تمہیں امانت کے طور پر ایک سفالین یعنی مٹی کا پیالہ بھی دوں تو وہ بھی تم مجھے خیانت کر کے لوٹاؤ گے یعنی اس کا بھی کنڈا توڑ کر واپس دو گے، یہی مٹی کا بے قیمت پیالہ بھی تم خیانت کر کے لوٹاؤ گے، کیوں؟ آخر اس میں خیانت کی کیا وجہ ہے؟ اس کنڈے سے کیا تمہیں ملے گا؟ وہ ٹوٹ جانے سے کنڈا بھی بے کار ہو جاتا ہے اور پیالہ بھی بے کار ہو جاتا ہے لیکن جس کی عادت خیانت کرنے کی ہو وہ یہ تو نہیں دیکھتا ہے کہ اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا، خیانت اس کی عادت ہے، کسی کے مال میں انگلی مارنا اس کی عادت ہے لہٰذا خیانت کرتا ہے، یہ اس انسان کی عادت بن گئی ہے لہٰذا ملکات اچھے بھی ہیں اور برے بھی ہیں اور یہ اخلاقِ انسان ہیں، اخلاق صفاتِ راسخۂ نفس کو کہتے ہیں یعنی نفس کے اندر راسخ صفتیں و خصلتیں، نفس کے اندر اتری ہوئی غیر قابلِ زوال صفات، لہٰذا غیر

قابلِ زوال صفات کو کہ جو انسان کے اندر موجود ہیں ان کو ملکات کہتے ہیں اور یہ اخلاقِ انسان ہیں۔

آداب کن چیزوں کو کہتے ہیں؟ فرماتے ہیں کہ آداب اخلاق نہیں ہیں، آداب اوصافِ فعلِ انسان ہیں نہ کہ اوصافِ نفسِ انسان ہیں۔ آداب صفاتِ فعل و عملِ انسان ہیں لیکن صفاتِ راسخہ در نفس کو آداب نہیں کہتے ہیں بلکہ وہ خُلقیاتِ انسان ہیں۔ انسان جب کوئی عمل کرتا ہے یا کوئی فعل انجام دیتا ہے مثلاً لکھتا ہے تو لکھنے کے آداب ہیں لیکن لکھائی فعلِ انسان ہے، لکھائی فعلِ نفسِ انسان و فعلِ ذاتِ انسان ہے، ذات کی صفات کو آداب نہیں کہیں گے بلکہ خُلقیات کہیں گے لیکن جب یہ انسان ایک فعل انجام دیتا ہے مثلاً لکھتا ہے اور اس لکھائی کے اندر اوصاف ہوں، وہی اوصاف کہ جن کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے یعنی جن کی وجہ سے اس فعل کے اندر حسن و زینت بھی ہو اور اس کی غرض بھی حاصل ہوتی ہو تو اس لکھائی کے فعل کی صفات کو آداب کہیں گے۔

اب آدابِ لکھائی یہ نہیں ہیں کہ مثلاً وہ قرآن کہ جو بہت چھوٹا لکھا جاتا ہیں، مائکرو (Micro) قرآن کہ جو ایک ملی میٹر اور دو ملی میٹر کے طول و عرض میں لکھا ہوتا ہے اور بقول آغائے قرائتی کے کہ اس قرآن کو تو جن بھی نہیں پڑھ سکتا ہے، یہ کس لئے لکھتے ہیں؟ اس کی غرض کیا ہے؟ یہ ادب نہیں ہے یا ایک اور قرآن کہ ابھی خود ایران میں ہی لکھا گیا ہے کہ کہتے ہیں بیس ٹن کا قرآن ہے، جس کا ورق الٹنے کے لئے بھی دس دس بندے جائیں گے کہ اس کا ایک ورق الٹ دیں، یہ کس لئے لکھا ہے؟ یہ تو کوئی دیو ہو کہ جس کے لئے لکھا گیا ہو، یہ آداب کے خلاف لکھنا ہے۔ اگر قرآن لکھنا ہے تو اس طرح لکھیں کہ اس کے اندر دو کام ہوں ایک باعثِ زینت ہو یعنی خطِ قرآن

باعثِ زینت و زیبائی قرآن ہو اور دوم یہ کہ مقصودِ قرآن حاصل ہو رہا ہو، یہ بیس ٹن کا میکرو (Macro) قرآن اور ایک ملی میٹر کے مائکرو (Micro) قرآن میں زینت کہاں ہے؟ اور دوسرا یہ کہ ان کا مقصد و غرض کیا ہے؟ آیا اس سے قرآن کا مقصد حاصل ہوتا ہے؟

اسی طرح انسان کوئی اور فعل انجام دیتا ہے مثلاً بسا اوقات ایسا خط لکھتا ہیں کہ جو پڑھا نہیں جا سکتا ہے، اس کے اندر زینت تو ہے لیکن مقصود حاصل نہیں ہوتا ہے اور اگر مقصود حاصل نہیں ہوتا ہے تو یہ غیر ادیبانہ کام کیا ہے، غیر مؤدب کام کیا ہے، یہ آداب کے بغیر اور آداب سے خالی لکھائی ہے۔ پس بہت واضح طور پر مرحوم علامہؒ فرماتے ہیں کہ آداب اور اخلاق میں فرق ہے، اخلاق صفاتِ راسخہ نفس کو کہتے ہیں اور آداب صفاتِ جمیلہ فعلِ انسان کو کہتے ہیں۔

۷) آداب، مقاصد کیلئے نشانِ راہ

مرحوم علامہ طباطبائیؒ نے ایک نکتۂ دیگر بیان فرمایا ہے کہ آداب چونکہ صفاتِ جمیلہ فعلِ انسان کو کہتے ہیں اور وہ صفات کہ جن کو ہم آداب کہتے ہیں ان کی دو خصوصیتیں ذکر فرمائی ہیں، یہ حفظ کریں اور ان مطالب کو ذہن میں رکھیں، موصوف یعنی فعل کی دو خصوصیتیں ہیں یعنی انسان کا فعل شریعت و وحی اور عقل کے ذریعے سے جائز فعل ہو اور دوم یہ کہ یہ اختیاری فعل ہو اسی طرح ان صفات کی بھی دو خصوصیتیں ہیں، ایک یہ کہ باعثِ زینتِ موصوف ہوں اور دوسری یہ کہ باعثِ حصولِ غرضِ موصوف ہوں یعنی موصوف کی غرض ان سے حاصل ہوتی ہو، لکھائی موصوف ہے اور اس لکھائی کے

اندر وہ خصوصیتیں کہ جن کی وجہ سے لکھائی میں حسن وزیبائی پیدا ہوتی ہو اور وہ خصوصیتیں کہ جن سے لکھائی کی غرض حاصل ہوتی ہو تو یہ خصوصیات وصفات آداب کہلائیں گی اور چونکہ آداب غرض کے حصول میں دخیل ہیں کہ ان کے بغیر غرض حاصل نہیں ہوسکتی لہٰذا اس وجہ سے فرماتے ہیں کہ ہم آداب کے ذریعے سے اغراض کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔ آدابِ انسان دلیل بر اغراضِ انسان ہیں یا آدابِ فعلِ انسان دلیل بر اغراضِ فعلِ انسان ہیں۔

اسی طرح مختلف معاشروں، قوموں اور طبقات کے اندر آداب موجود ہیں، یہ آداب بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کے پیش نظر کیا اغراض ہیں، یہ کیا چاہتے ہیں؟ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ انہی آداب سے بخوبی پتہ چل جاتا ہے اور پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً اگر آپ دیکھیں کہ کسی شخص نے جو عمل کیا ہے تو وہ کس ادب کے تحت کیا ہے، وہیں سے انسان سمجھ جاتا ہے کہ وہ شخص کیا کرنا چاہتا ہے؟ کہاں پہنچنا چاہتا ہے؟ اور اس کا مقصود کیا تھا؟ آداب بتائیں گے کہ آیا اس کی غرض مادی ہے، نفسانی ہے یا اس کی غرض الٰہی ومعنوی ہے، مثلاً فرض کرلیں کہ طالبِ علم مشغولِ تحصیل ہیں، یونیورسٹیوں میں، کالجوں میں، دینی مدرسوں میں اور حوزوں میں بھی مشغولِ تعلیم وتحصیل ہیں۔ یہ تحصیل بھی ایک فعل ہے، تحصیل یعنی علم حاصل کرنا، یہ بھی ایک عمل ہے اور اس عمل کے بھی آداب ہیں، آداب یعنی قاعدے، ضابطے اور صفات، انہی صفات سے اندازہ ہوگا کہ اس انسان کی علم حاصل کرنے کی غرض کیا ہے۔ اس کے جو آداب زمانۂ طالبِ علمی میں ہیں یا طالبِ علمانہ آداب ہیں وہی بتائیں گے اور نشاندہی کریں گے کہ یہ کس مقصد کے لئے علم حاصل کر رہا ہے؟ اور کہاں جانا چاہتا

ہے؟ آیا اس سے شخصیت بنانا چاہتا ہے؟ عزت و شہرت چاہتا ہے؟ یا مال کمانا چاہتا ہے؟

☆علم حاصل کرنے کے مذموم مقاصد

روایات میں تحصیلِ علم کے بہت سارے مقاصد ذکر کیے گئے ہیں اور ان کی شدید مذمت بھی کی گئی ہے، اتفاقاً وہ مذموم مقاصد بیشترین مقاصد ہیں کہ جو اس وقت حصول علم کیلئے نظر آتے ہیں۔ رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثِ مبارکہ ہے کہ

لَا تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتَمَارُوْا بِهِ السُّفَهَاءَ، وَتُجَادِلُوْا بِهِ الْعُلَمَاءَ، وَلِتَصْرِفُوْا وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْكُمْ......(۸)

یعنی علم اسلئے حاصل نہ کرو کہ احمقوں کے ساتھ جھگڑا (بحث) کرو اور علماء کے ساتھ مباحثہ (جدال) کرو اور لوگوں کا رخ اپنی طرف کرو......

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِاَرْبَعٍ دَخَلَ النَّارَ : لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ، اَوْ يُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ، اَوْلِيُصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ، اَوْ يَاخُذَ بِهِ مِنَ الْاُمَرَاءِ.(۹)

جو علم کو چار مقاصد کیلئے طلب کرتا ہے وہ جہنم میں جائے گا، علماء پر فخر و مباحات کرنے کیلئے یا احمقوں کے ساتھ جھگڑا (بحث) کرنے کیلئے یا لوگوں کا رخ اپنی طرف کرنے کیلئے یا حاکموں سے پیسہ لینے کیلئے......

اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیثِ مبارکہ ہے کہ

☆علم حاصل کرنے کے مذموم مقاصد

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ، أَوْ يُمارِيَ بِهِ السُّفهاءَ أَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ اِلَيْهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ......(۱۰)

یعنی جو علم حاصل کرتا ہے تا کہ علماء پر فخر و مباحات کرے یا احمقوں کے ساتھ جھگڑا (بحث) کرے یا یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے تو ایسا آدمی اپنے ٹھکانے کو جہنم میں معین کرلے......

مولائے متقین حضرت علیؑ فرمارہے ہیں کہ

خُذُوا مِنَ الْعِلْمِ مَا بَدَأَ لَكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تَطْلُبُوْهُ لِخَصَالٍ اَرْبَعٍ: لِتَبَاهُوْا بِهِ الْعُلَمَاءَ،اَوْتُمَارُوْا بِهِ السُّفَهَاءَ،اَوْ تَرَاؤُوْا بِهِ فِي الْمَجَالِسِ،اَوْ تَصْرِفُوْا وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْكُمْ......(۱۱)

یعنی علم میں سے جس کو چاہتے ہو حاصل کرو لیکن علم کو چار مقاصد کیلئے حاصل کرنے سے بچو: علماء پر فخر و مباحات کرنے کیلئے یا احمقوں کے ساتھ جھگڑا (بحث) کرنے کیلئے یا اس کے ذریعے اجتماعات میں ریا کرنے کیلئے یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کیلئے......

لِتَمَارُوْا بِهِ السُّفَهَاءَ،

یعنی احمقوں کے ساتھ الجھنے کے لئے، بحث برائے بحث کیلئے، مثلاً میں اس لئے پڑھوں تا کہ کسی محفل میں پیچھے نہ رہ جاؤں تو یہ غرض مذموم ہے یا

لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ،

علم حاصل کرنے کے مذموم مقاصد

یعنی علم اس لئے حاصل کرتا ہے تاکہ علماء پر فخر کرے، اترائے کہ میں اتنا بڑا علامہ ہوں، میں اتنا زیادہ جانتا ہوں، میں بہت بڑی شخصیتِ علمی ہوں، یہ مذموم غرض ہے یا

يَأْخُذَ بِهِ مِنَ الْأُمَرَاءِ.

یعنی علم اس لئے حاصل کرے تاکہ اس کو ذریعۂ معیشت قرار دے، یہ بھی مذموم غرض ہے،

اورغرض چہارم کہ جس کی مذمت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

لِيُصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ،

کوئی شخص علم اس لئے حاصل کرتا ہے تاکہ اس علم کی مدد سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچے، مبذول کرائے تو یہ بھی قابلِ مذمت غرض ہے اوران مقاصد کے لئے علم نہیں ہونا چاہئے اور اس وقت یہی تین چار اغراض نمونہ اور رائج ترین اغراض ہیں مثلاً سارے علمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں دیکھیں کہ لوگ علم کیوں حاصل کرتے ہیں؟ کیوں مشغولِ علم ہیں؟ اوران کی غرض کیا ہے؟ تو ان کی اغراض ان چیزوں کے ارداگرد گھومتی نظر آئیں گی۔علامہ اقبالؒ نے شاہین کو ایک ماڈل کے طور پر انسان کے لئے ذکر کیا ہے کہ انسان کو شاہین ہونا چاہئے، بعض نے کلامِ اقبال پر نقد کیا ہے، فکر اقبالؒ پر نہ کہ خود اقبالؒ پر۔نقد یہ کیا ہے کہ آپ نے شاہین کے طور پر اچھا نمونہ (Model) نہیں دیا ہے۔درست ہے کہ اس کی پرواز بلند ہے،

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا...... (۱۲)

کہیں فرمایا کہ

علم حاصل کرنے کے مذموم مقاصد

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں......(۱۳)

کہیں لب کشا ہیں کہ

جوانوں کو مری آہِ سحر دے

پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے......(۱۴)

آپ نے شاہین کے عنوان سے اور بھی بہت کچھ کہا ہے یعنی ایک سادہ سا نمونہ لے کر نوجوانوں کو اور اپنے مخاطبین کو بیداری کی طرف متوجہ کیا ہے، چونکہ ایک جہت مقصود ہوتی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ جس نے فکرِ اقبالؒ پر تنقید کی ہے وہ کتنی درست ہے؟ اور تنقید اپنی جگہ زیبا بھی ہے، تنقید انہوں نے یہ کی ہے کہ شاہین بہت بلند پرواز ہے اور پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرتا ہے، شکاری ہے، جھپٹتا ہے، پلٹتا ہے اور لپکتا ہے، یہ سب کرتا ہے لیکن در عینِ حال اتنی بلند پرواز کر کے بھی اس کی نگاہیں زمین پر ہوتی ہیں اور وہ بھی چوہے پر، بہت اونچی اڑان اڑتا ہے، تند و تیز ہواؤں اور تندیٔ بادِ مخالف سے نہیں ڈرتا، اسکی نگاہیں بھی فوق العادہ نگاہیں ہیں کہ اتنی بلندی سے نیچے چھوٹا سا چوہا دیکھ لیتا ہے اور اس پر آ کر جھپٹتا ہے۔ یہ نمونہ اس لئے درست نہیں ہے کہ اگر کوئی شاہین بن بھی جائے، پرواز کرے اور اتنا پڑھ لکھ کر شاہین بنے کہ ملکوت میں چلا جائے، چونکہ بعض پڑھ کر ایسے پرواز کرتے ہیں کہ دنیا میں ہی نہیں ہوتے ہیں، اصلاً ملکوت میں ہوتے ہیں لیکن اس ملکوت پر پہنچ کر بھی نگاہ کس پہ لگی ہوئی ہے؟ زمین کے اوپر موجود چوہے پر لگی ہوئی ہے۔

حافظ شیرازی کے بقول

علامہ سید جواد نقوی

واعظان کاین جلوه در محراب و منبر میکنند

چون بخلوت میروند آن کارِ دیگر میکنند...... (۱۵)

منبر پر بیٹھ کر ملکوت کی باتیں اور فلاں کی باتیں لیکن نگاہ کس پہ لگی ہوئی ہے؟ ان ساری باتوں کے معاوضے پر کہ جس کے متعلق امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ کوڑھی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سور کی انتڑیاں ہیں یعنی دنیا، نگاہ دنیا پہ لگی ہوئی ہے، علمی طور پر انسان آسمانِ علم بن جائے لیکن نگاہ زمین پر لگی ہوئی ہو یعنی مقام پر، پوسٹ (Post) پر، شہرت پر یا معاوضے پر۔

لِیُصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَیْهِ،

تا کہ لوگ میری طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کریں، میری تقلید زیادہ ہو، میری تقریر میں زیادہ لوگ ہوں، میرے شاگرد زیادہ ہوں، میری کتابیں زیادہ ہوں، میری کیسٹیں زیادہ ہوں، میرے سی ڈیز زیادہ ہوں، میرے فوٹو زیادہ ہوں، یہ کیا ہے؟ یہ شاہین کیا دیکھ رہا ہے؟ چوہا دیکھ رہا ہے، بہت بلند جا کر بھی نیچے بہت پست چیز پہ نگاہ رکھی ہوئی ہے، تنقید زیبا ہے لیکن دفاع کیا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کی مراد شاہین کا یہ پہلو نہیں ہے یعنی شاہین چوہا کھانے کی وجہ سے شاہین نہیں ہے، اس میں صرف پرواز ہی ان کے مدنظر ہے، باقی پرواز سے دیکھنا کس کو ہے، پرواز سے نیچے نہیں دیکھنا ہے یعنی اقبال کا شاہین چوہے تلاش نہیں کرتا ہے بلکہ وہ فرشتے شکار کرتا ہے۔ واقعاً ایسا لکھا ہے کہ تو فرشتے شکار کر تیرا شکار بڑا ہے،

تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں...... (۱۶)

علم حاصل کرنے کے مذموم مقاصد

اور کہیں فرمارہے ہیں

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا......(۱۷)

یعنی پروازِ اقبالؒ وہ نہیں ہے کہ تجھے واپس آنا ہے، تو ایک دفعہ اڑا تو بس اڑا۔ پس تنقید کرنے والے کی جہت مختلف ہے بلکہ خود اقبالؒ کے بقول

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے

سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا......(۱۸)

غرض یہ ہے کہ یہ وہ اغراض ہیں جن کی پرزور مذمت کی گئی ہے کہ ان کے لئے علم حاصل نہ کرو، علامہ طباطبائیؒ کے مطابق آداب سے ان اغراض کا پتہ چل جاتا ہے، آداب یعنی وہ ضوابط و قواعد کہ جن کے تحت انسان علم حاصل کررہا ہے، اسی سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی غرض کیا ہے، اس کی تحصیلِ علم کی صفات سے اور تحصیلِ علم کے انداز سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شخص کدھر جارہا ہے؟ اس کی غرض کیا ہے؟ اور اس سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟ پس مرحوم علاّمہؒ فرماتے ہیں کہ بینِ آداب واخلاق فرق ہے، دوم یہ کہ آداب سے انسان کے اعمال کے اندر اغراض کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ کس غرض کے لئے یہ سب کچھ انجام دیا جارہا ہے۔

۸)آداب اور اخلاق میں ربط

علامہ طباطبائیؒ نقطۂ سوم یہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ بینِ آداب اور اخلاق فرق ہے لیکن

اخلاق ہی آداب کی پیدائش کا ذریعہ ہیں، اخلاق سے ہی آداب پیدا ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں آداب فرزندِ اخلاق اور اولادِ اخلاق ہیں۔ اگر انسان کے اندر اخلاق نہ ہوں یعنی صفاتِ فاضلۂ حسنہ نفس کے اندر موجود نہ ہوں تو صفاتِ حسنہ کے بغیر اس کے فعل کے اندر کبھی بھی ادب پیدا نہیں ہوتا ہے کہ جو فعل کو مزین کرے اور انسان کے فعل کو خوبصورت بنا دے مثلاً نماز ایک فعلِ انسان ہے اور اس کیلئے آدابِ نماز ہیں یعنی جو نماز میں حسن و زیبائی پیدا کرتے ہیں اور نماز کی غرض میں مدد دیتے ہیں لیکن اگر انسان کے اندر عبودیت کا ملکہ ہو تو اس صورت میں انسان عابدانہ نماز ادا کرتا ہے اور انسان کی نماز کے اندر حُسن و زیبائی پیدا ہوتی ہے ورنہ یہ نماز بدترین طریقے سے بھی پڑھی جا سکتی ہے اور پڑھی جاتی ہے، پس اگرچہ آداب و اخلاق الگ الگ ہیں لیکن رشتہ بہت گہرا اور عمیق ہے۔

خلاصتاً یہ کہیں گے کہ آداب سے مراد وہ خصائل اور صفات ہیں کہ جو کسی شے کے لئے بعنوانِ صفت طاری ہوتی ہیں اور اس کے اندر حسن و زینت ایجاد کرتی ہیں اور دوم یہ صفات اس شے کی غرض و غایت کے حصول کا ذریعہ بنتی ہیں، اس شے کو کہیں پہنچنے میں جو مقصود تھا یہ اس کی امید ہوتی ہیں اور اس شے کے لئے خصوصیت یہ ہے کہ اول تو وہ شے جائز امور میں سے ہو، مشروع ہو، جیسے کہ مرحوم علاّمہ طباطبائیؒ نے ادب کی تعریف میں بیان فرمایا ہے یعنی شریعت، وحی اور عقل کی طرف سے جائز اور مشروع ہو۔ نامشروع کام کا ادب نہیں ہوتا ہے، ناجائز کاموں میں آداب نہیں ہوتے ہیں بلکہ آداب ہمیشہ جائز کام کے لئے ہوتے ہیں اور دوم یہ ہے کہ وہ انسان کا اختیاری فعل ہو۔ بعض بزرگان نے کہا کہ آداب ان صفات کو کہتے ہیں کہ جن پر اتفاقِ عقلاء ہو، ان کے حسن پر اور

ان کے نیک اور اچھا ہونے پر اتفاقِ عقلاء ہو تو اس کو ادب کہتے ہیں، دونوں ایک ہی مطلب ہیں اور یہ لازم وملزوم ہیں۔ تیسرا معنیٰ ادب اس شے کو اپنی حدود میں رکھنا ہے۔

مرحوم علامہؒ نے اخلاق اور آداب میں فرق بیان فرمایا ہے کہ اخلاق ان صفات کو کہتے ہیں کہ جو نفسِ انسان میں ہیں اور آداب ان صفات کو کہتے ہیں کہ جو فعلِ انسان کیلئے ہوں۔ جس طرح سے انسان کیلئے اخلاقِ حسنہ ہیں اسی طرح سے افعال کے لئے ہیں آدابِ حسنہ بھی ہیں نیز ہم آداب کے ذریعے سے اغراض کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔ آداب نتیجہ اخلاق ہیں اس اعتبار سے کہ انسان کے نفس میں جو خُلقیات اور مَلَکات پیدا ہوتے ہیں تو انہی خلقیات اور ملکات کے ذریعے انسان سے فعل سرزد ہوتا ہے اور وہ فعل بھی آداب سے متصف ہوتا ہے لہذا فعل نتیجہ ملکہ وخُلق ہے اور صفاتِ فعل بھی انہی ملکات کا نتیجہ ہیں۔

۹) آداب کی تعریف اور آدابِ فہمِ قرآن میں ارتباط

ادب کی تعریف کی رو سے آداب ان اوصاف کے مجموعے کو کہتے ہیں کہ جو باعثِ زینتِ فعلِ انسان ہوں اور باعثِ حصولِ غرضِ فعلِ انسان ہوں، اس تعریف کی روشنی میں آدابِ فہمِ قرآن سے مراد وہ امور اور وہ صفات ہیں کہ جو باعثِ زینتِ فہمِ قرآن ہوں، باعثِ زینتِ درکِ مطالب و معانیٔ قرآن ہو، جو فہم ودرکِ انسان کے اندر حُسن وموزونیت ایجاد کریں اور دوسری طرف سے اس فہم کو یعنی فہمِ قرآن کو مقصدِ قرآنی واغراض وغایاتِ قرآنی تک پہنچانے میں مؤثر ہوں یعنی باعثِ

حصولِ غرضِ فہمِ قرآن ہوں۔ یہ اشارہ پہلے گزرا تھا کہ قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے اور غیر از کتابِ ہدایت نہیں ہے، باقی استعمالاتِ قرآن غیر مجاز ہیں، برخلافِ ہدایت یا ہدایت سے ہٹ کر جو بھی مصارفِ قرآن ہیں کہ جو ہدایت کے منافی ہیں وہ غرضِ قرآن کے مخالف ہیں اور ہدایت فہم کی محتاج ہے، جب تک انسان سمجھتا نہ ہو، درک نہ کرتا ہو اور تفکر و تدبر نہ کرے تو اس کتابِ ہدایت سے ہدایت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اور فہم یا تدبر اس وقت قرآن سے ہدایت لے سکتا ہے کہ جب فہم آمادہ ہو، فہم تیز ہو اور اس کے سامنے رکاوٹیں نہ ہوں، فہم کے اندر بالفعل آمادگی اس صورت میں آتی ہے کہ جب فہم چند صفات سے متصف ہو یا چند آداب سے مؤدب ومتأدب ہو، اُس وقت فہم اس قابل ہو جاتا ہے کہ انسان قرآن سے کچھ نہ کچھ استفادہ کرے۔ آداب کی مزید اہمیت فصلِ اہمیتِ ادب میں بیان کی جائے گی۔

حوالہ جات

(۱)۔ ..(وسائل الشیعة، باب وجوب تعلم القرآن، الجزء٦، صفحه١٦٨)
(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل، الجزء۴، صفحه ۳۳۲)
(بحار الأنوار-علامه مجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحه ۱۹)(تفسیر الامام العسکریؑ)
(۲)......(غرر الحکم و درر الکلم، الجزء ١، صفحه ۲۴۵)
(۳)......(تفسیر المیزان، باب بحث روائی، الجزء ٦، صفحه ۱۴۱)
(سنن النبی (ص)- السید الطباطبائیؒ، الجزء ۱، صفحه ۳۳)
(۴)......(بررسی تطبیقی مفهوم و آثار اضطرار در حقوق مدنی، الجزء ۴، صفحه ۲)
(۵)......(میزان الحکمة - الریشهری، باب الادب، الجزء ۱، صفحه ۵۷)
(عیون الحکم والمواعظ - علی بن محمد اللیثی الواسطی، الجزء ۱، صفحه ۱۰۶)
(٦)......(سورۂ مبارکہ لقمان، آیہ۱۹)
(۷)......(حقائق الاصول، الجزء ۱، صفحه ۱۰۴) (زهر الأکم فی الأمثال والحکم، الجزء ۳، صفحه ۱۸)(البحر المدید فی تفسیر القرآن المجید، الجزء۴، صفحه ۲۹۴) (دراسات فی علم الاصول، الجزء ۲۲، صفحه ۸)
(۸)...... (بحار الانوار-علامه مجلسیؒ، الجزء ۲، صفحه ۳۸، حدیث ۲۰)
(۹)...... (بحار الانوار-علامه مجلسیؒ، الجزء ۲، صفحه ۳۸، حدیث ۲۱)
(۱۰)......(الکافی-الکلینیؒ، الجزء ۱، صفحه ۴۷)

(۱۱)......(بحار الانوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۳۱، حدیث ۱۹)

(۱۲)......(بالِ جبریلؒ، کلام ۴۰، صفحہ ۶۱)

(۱۳)......(بالِ جبریلؒ، عنوان: ایک نوجوان کے نام، صفحہ ۱۲۰)

(۱۴)......(بالِ جبریلؒ، رباعیات، صفحہ ۸۶)

(۱۵)......(دیوان حافظ شیرازی، از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی، غزل ۱۹۹، صفحہ ۱۵۶)

(۱۶)......(بالِ جبریلؒ، کلام ۴۰، صفحہ ۶۱)

(۱۷)......(ضربِ کلیم، عنوان: اسرارِ پیدا، صفحہ ۲۷)

(۱۸)......(بالِ جبریلؒ، کلام ۸، صفحہ ۳۲)

فصلِ اھمیتِ ادب

۱)بے ادبانہ اعمال کا نتیجہ

۲)روایاتِ امیر المومنین علیہ السلام کی روشنی میں ادب کی اھمیت

☆ادب،سونے چاندی سے زیادہ اھم

☆صاحبانِ عقل کیلئے ادب کی اھمیت

☆ذھانت و فطانت، ادب کی رھینِ منت

☆مناجاتِ شعبانیہ میں نورِ بصیرت کیلئے دعا

☆آداب،حجابوں کو چیرنے میں مددگار

۳)مولانا روم کی نظر میں ادب کی اھمیت

☆بے ادب لطفِ خدا سے محروم

☆بے ادب کی وجہ سے دنیا آگ کی لپیٹ میں

☆بے ادب، پوری قوم کی محرومیت کا سبب

☆بے ادب، راہ زن و نامرد

☆شیطان بے ادبی کی وجہ سے شیطان بنا

٤)مولانا روم کے اشعار امیرالمومنین علیہ السلام کے فرامین کی شرح

چونکہ ہم اس بحث کو آدابِ فہمِ قرآن کے عنوان سے کر رہے ہیں لہٰذا ہمارے پیشِ نظر ایک خاص ادب ہے ورنہ آداب کی بحث وسیع ہے، خود یہ موضوعِ آداب مستقل ہے یعنی ادب، متعلقاتِ ادب و موصوفاتِ ادب وغیرہ۔

۱) بے ادبانہ اعمال کا نتیجہ

انسان کے تمام افعال کے لئے ادب ضروری ہے، چھوٹا فعل ہو یا بڑا فعل ہو، انفرادی عمل ہو یا اجتماعی عمل ہو، انسان کے اپنے متعلق ہو یا غیر کے متعلق ہو، چونکہ اعمال آداب کے سائے میں ہی اپنے نتائج تک پہنچتے ہیں لہٰذا ہم اکثر جو عمل کرتے ہیں، کوششیں و زحمتیں کرتے ہیں تو وہ نتیجہ بخش نہیں ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ فقط عمل انجام دیتے ہیں لیکن اس عمل کے آداب کا خیال نہیں رکھتے، آداب کے تحت اس عمل کو نہیں بجالاتے ہیں لہٰذا اثر بھی نہیں ہوتا ہے۔

مثلاً تبلیغ کرتے ہیں لیکن نتیجہ نہیں نکلتا ہے چونکہ آدابِ تبلیغ رعایت نہیں کرتے ہیں، دعا مانگتے ہیں لیکن قبول نہیں ہوتی، استجابت نہیں ہوتی ہے چونکہ آدابِ دعا کا خیال نہیں رکھتے ہیں، بے ادبانہ و غیر مؤدبانہ دعا کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں لیکن پھر بھی برائیوں سے باز نہیں آتے چونکہ آدابِ نماز کی رعایت نہیں کرتے ہیں اور بغیر ادب کے جو عمل انجام دیا جائے تو ظاہری بات ہے کہ مقصود و غرضِ عمل آداب کے گردہ میں ہے اور آداب ہی کسی عمل کا نتیجہ عطا کرتے ہیں، پس بنا براین ممکن نہیں ہے کہ آداب کو چھوڑ کر ہم کوئی عمل انجام دیں اور وہ عمل کسی نتیجے تک پہنچ پائے، اس لئے ادب خود ایک مستقل موضوع ہے۔ انسان کو تمام اعمال میں اور تمام حالات میں ادب کے ساتھ رہنا

چاہئے مثلاً ہم احکامِ عبادت جانتے ہیں لیکن آدابِ عبادت انجام نہیں دیتے ہیں، عبادتیں بلا ادب اور غیر مؤدبانہ ہیں، احکام کے لحاظ سے بالکل درست ہیں، فقہی لحاظ سے بالکل درست ہیں لیکن آداب کے لحاظ سے بے ادبانہ عبادتیں ہیں، بعض بزرگان کے بقول لوگ اپنے گناہوں پہ توبہ کرتے ہیں لیکن ہمیں اپنی عبادتوں پر خدا سے معذرت و معافی مانگنی چاہئے چونکہ بے ادبانہ عبادتیں ہیں اور عبادتوں کے اندر فراواں بے ادبی کرتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں لیکن ادبِ روزہ نہیں ہوتا ہے، ذکر کرتے ہیں لیکن ادبِ ذکر نہیں ہوتا ہے، خدا کو پکارتے ہیں لیکن اس کے اندر ادبِ دعا ملحوظ نہیں ہوتا ہے، اسی طرح ہر چیز کے آداب ہیں لیکن اس کتاب میں ہماری بحث فقط آدابِ فہمِ قرآن کے بارے میں ہے۔

۲)روایاتِ امیر المومنین علیہ السلام کی روشنی میں ادب کی اہمیت

آداب کی اہمیت لئے فراواں روایات ذکر کی گئی ہیں، مخصوصاً امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ادب کے بارے میں زیادہ روایات مروی ہیں کہ انسان کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز ادب ہے۔

☆ادب، سونے چاندی سے زیادہ اہم

ایک روایت میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

اِنَّـكُـمْ اِلٰـى اِكْتِسَـابِ الْاَدَبِ اَحْوَجُ مِـنْـكُـمْ اِلٰى اِكْتِسَـابِ الْـفِـضَّةِ وَالذَّهَبِ......(۱)

تم ادب سیکھنے کے زیادہ محتاج ہو اس بات سے کہ تم چاندی اور سونا کماؤ.....

یعنی سونے اور چاندی کی طرف حاجت اور نیاز مندی سے کہیں زیادہ آپ کی ضرورت ادب ہے۔ انہی دنیوی ذخائر کہ جن کی طلب کیلئے انسان روز و شب تگ و دو کر رہا ہے لیکن ان سے کہیں زیادہ انسان کو ادب کی ضرورت ہے۔

☆صاحبانِ عقل کیلئے ادب کی اہمیت

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام سے ہی ایک اور روایت مروی ہے کہ جس کے اندر تشبیہ کے ذریعے سے انسان کی ضرورت بتائی گئی ہے کہ انسان کو ادب کی کتنی ضرورت ہے؟ فرماتے ہیں کہ

اِنَّ بِـذَوِی الْـعُـقُـوْلِ مِـنَ الْـحَـاجَةِ اِلٰى الْأَدَبِ كَمَا يَظْمَأُ الزَّرْعُ اِلٰى الْمَطَرِ ......(۲)

بے شک صاحبانِ عقل ادب (سیکھنے) کے ایسے محتاج ہیں جس طرح سے کھیتی (زراعت) بارش کی محتاج ہوتی ہے۔

کھیت میں فصل اگائی جاتی ہے یا بیج بویا جاتا ہے لیکن اگر اسے دوگنا ثمرہ دینا ہے تو پانی اور بارش کی بغیر ناممکن ہے۔اسی طرح انسان کے اندر آداب کے بغیر ناممکن ہے کہ وہ اپنے مقاصد تک جا پہنچے اور بغیر ادب کے ثمرہ حاصل ہو۔

☆ذہانت و فطانت، ادب کی رہینِ منت

فہم کیلئے بھی ادب مؤثر ہے، بغیر ادب کے اگر انسان کسی چیز کو سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ فہم بھی نتیجہ بخش نہیں ہے۔امیر المومنین علیہ السلام سے ہی ایک اور روایت منقول ہے اور یہ بھی کتابِ غرر سے ہے کہ

بِالْأَدَبِ تَشْحَذُ الْفِطَنُ......(۳)

ادب کے ذریعے ذہانت کو تیز کرو......

فطانت فہم کے معنیٰ میں ہے، ادب کے ذریعے انسان کی فہم بڑھتی ہے، فہم کو بھی نتیجے تک ادب ہی پہنچاتا ہے، وَاِلّا فہم ابتر اور بے ثمر ہے۔اگر انسان سالہا سال بھی کسی چیز کو سمجھنے میں مشغول رہے لیکن ادبِ فہم کو ملحوظ نہ رکھے تو اس کا یہ فہم انسان کو کسی نتیجے تک نہیں پہنچاتا ہے، اگر کوئی انسان بغیر ادب کے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے تو فہم بے ثمر ہے، آدابِ قرآن بھی مختلف ہیں مثلاً قرأتِ قرآن کے آداب ہیں، تلاوتِ قرآن کے آداب ہیں، حملِ قرآن کے آداب ہیں، یہ سارے آداب ہیں لیکن ان سب میں ایک فہمِ قرآن ہے، اکثریت فہم کے کسی مرحلے تک آنے کی کوشش ہی نہیں کرتی

ہے بلکہ خود کو فہم سے بے نیاز سمجھتی ہے۔

کثرت سے قرآن پڑھا جاتا ہے لیکن تاثیر قرآن نہیں ہے اس لئے کہ ان کے اندر ادب موجود نہیں ہے۔ادب کی تعریف کی روشنی میں ہر چیز کی غرض ادب کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے، اگر ادب نہ ہو تو وہ فعل انجام پا جاتا ہے لیکن نتیجہ نہیں نکلتا ہے اسی طرح فہم کا عمل سرزد ہو جاتا ہے لیکن اس فہم کا نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔ادب فہم کے اوپر اثر چھوڑتا ہے، امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ادب فہم کو تیز کر دیتا ہے، تشحیذِ فہم کرتا ہے، تشحیذ یعنی جس طرح چاقو یا چھری کی دھار کو تیز کیا جاتا ہے تاکہ خوب کاٹے اسی طرح ذہن انسان بھی کند ہو جاتا ہے، جس طرح کسی بچے کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو یا چھری دے دیں تو وہ اس کی دھار کو لکڑی پر، پتھر پر مار کر اور اِدھر اُدھر مار کر کند کر دیتا ہے، پھر اس چاقو یا چھری سے کہ جو کند ہو جاتی ہے کوئی چیز نہیں کٹتی ہے حتیٰ انسان اس سے فروٹ (Fruit) تک نہیں کاٹ سکتا ہے، اسی طرح ہم نے اپنی ذہنیت اور ذہانت کو بھی پتھروں پہ مار مار کے کند کر دیا ہے، ذہانت کو ہم نے مفادات میں، خواہشات میں، اغراض میں اور ہوئی و ہوس میں استعمال کیا ہے، ہوئی و ہوس ایک ایسا پتھر ہے کہ تیز ترین ذہن بھی اسکے اوپر استعمال ہو تو وہ بھی کند ہو جاتا ہے، ذہن کی دھار کند ہو جاتی ہے، فہم کی دھار کند ہو جاتی ہے لہٰذا اس کو تشحیذ کی ضرورت ہے یعنی دوبارہ ذہن کو تیز کرنے کی ضرورت ہے اور تیز ذہن وہ ہے کہ جو مطالب کو سمجھتا ہے، چونکہ ذہانت کا مطلب یہ ہے کہ جو پردے حقائق پہ پڑے ہوئے ہیں ذہانت ان پردوں کو چیر کے ان کے اندر اترے۔

☆مناجاتِ شعبانیہ میں نورِ بصیرت کیلئے دعا

امیر المومنین علیہ السلام مناجاتِ شعبانیہ میں بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں فرماتے ہیں کہ

وَاَنِرْ اَبْصارَ قُلُوبِنَا بِضِیَاءِ نَظَرِهَا اِلَیْکَ......

یعنی میری آنکھوں کو یا میری نورِ بصیرت کو اس طرح سے نورانی فرما کہ

حَتّٰی تَخْرِقَ اَبْصارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ فَتَصِلَ اِلٰی مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ......

بصیرت اتنی تیز ہو جائے کہ نورانی پردوں کو بھی چیر دے، نورانی پردوں کو چیر کے ان پردوں کے ماوراچھپے ہوئے حقائق کو دیکھ لے۔ یہ ذہانت اور فطانت تیز ہو تو پردے چیرتی ہے۔ یہ پردے سخت پردے ہیں کہ جو حقیقتوں کے اوپر پڑے ہوئے ہیں، کچھ انسان کے اپنے ڈالے ہوئے پردے ہیں اور کچھ حقائق بھی پردوں کے اندر لپٹے ہوئے ہیں، حقائق کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ اور ہے، الفاظ کا ایک پردہ ہے، معانی کا ایک پردہ، مصادیق کا ایک پردہ ہے، پھر افکار کا پردہ ہے، نظریات کا پردہ ہے، خرافات کا پردہ ہے، بدعتوں کا پردہ ہے اسی طرح ہزاروں پردے حقیقت کے اوپر پڑے ہوتے ہیں لہٰذا بہت تیز دھار والی فہم چاہیے کہ جو ان پردوں کو چیر کر اس حقیقت تک پہنچ جائے اور اس لُب تک پہنچ جائے۔

قرآن نے انہی کو اولی الالباب کہا ہے یعنی ایسے تیز ذہن کے مالک لوگ کہ جو لُب تک جا پہنچتے ہیں۔ لُب سے مراد مغز ہے یعنی جو اس مغز تک جا پہنچتے ہیں، اخروٹ یا بادام کے اندر موجود مغز کو لُب کہتے ہیں، لُب یا مغز کے اوپر چھلکے ہوتے ہیں، ان پردوں کے اندر مغز لپٹا ہوا ہے، لُب لپٹا ہوا

ہے اور کچھ لوگ اہلِ لُبّ ہیں یعنی اتنی تیز ذہانت کے مالک ہیں کہ حقائق کہ جو پردوں میں لپٹے ہوئے ہیں، چھپے ہوئے ہیں وہ لوگ ان تک پہنچ جاتے ہیں، اکثر حقائق واضح وآشکار نہیں ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ پردوں کے پیچھے پنہاں ہوتے ہیں اوران کو سمجھنے کے لئے تیز ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عموماً ہم اپنی ذہانت کو کند کئے بیٹھے ہوتے ہیں، ہم نے ذہن کو غیر ضروری چیزوں پر استعمال کرکر کے کند کر دیا ہے، خواہشات اور مفادات کے لئے ذہن استعمال ہوتا ہے، ہویٰ وہوس کے لئے ذہانت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ کند ذہنیت ہے، کند ذہن انسان اسی کو کہتے ہیں کہ جو پردے ہٹا کر حقیقتوں تک نہ پہنچ سکے۔ مثلاً ایک سادہ سی عبارت ہے لیکن اس عبارت کے معنیٰ تک بھی نہ پہنچ سکے یعنی الفاظ کی حقیقت کو چیر کر معنیٰ کی حد تک نہیں پہنچ سکتا ہے تو یہ ایک کند ذہن انسان ہے، کند یعنی تیز کی ضد، جس طرح کندی درمقابلِ تندی یا تیزی ہے۔ ایک تند دھار ہوتی ہے اور ایک کند دھار ہوتی ہے، عموماً ہم کہتے بھی ہیں کہ کند ذہن انسان ہے، اسی طرح کند ذہن کے مقابلے میں تیز ذہن انسان ہوتا ہے کہ جس کے ذہن کی دھار یعنی فہم کی دھار کند نہیں ہوئی ہے۔ فہم کی یہ تیز دھار آداب کی مرہونِ منت ہے۔

☆آداب، حجابوں کو چیرنے میں مددگار

آداب کا فائدہ یہی ہے، اگر انسان آدابِ فہم کی رعایت کریں تو ذہانت بڑھ جاتی ہے اور تندی اور تیزی آجاتی ہے اور انسان ان پردوں کو چیر کے، عبور کر کے حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ کسی

ادیبؑ کے بقول خداوند تبارک سے ایسا نورِ بصر چاہئے کہ

دیدہ ای باید سبب سوراخ کن

تا حُجُب را بر کَنَد از بیخ و بُن......(۴)

یعنی خدا سے مجھے اس دید و بصیرت کی طلب و ضرورت ہے، کہ جو پردے چیرنے والی دید ہو، جو حجابوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے اور جس سے انسان حجابوں کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو دیکھ لے۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جو خدا نے اپنے اہل کے لئے رکھی ہوئی ہیں مثلاً اخروٹ کا مغز باہر نہیں بنایا بلکہ اسے مضبوط ہڈی کے اندر رکھا گیا، اوپر چھلکا پھر اس چھلکے کے اندر کھوپڑی، پھر کھوپڑی کے اندر مغز، امرود کی طرح یا سیب کی طرح اخروٹ کا غذائی مادہ بھی باہر ہو سکتا تھا لیکن پھر اس کو کوئی بھی کھا جاتا، بلبل کھا جاتی، کوے کھا جاتے، چڑیا اور دیگر پرندے کھا جاتے اور مغز انسان تک پہنچتا ہی نہیں اور اگر پہنچتا بھی تو داغ والا پہنچتا، اس لئے اس کو سنبھال کے رکھا گیا ہے کہ صرف اہل ہی اس تک پہنچے۔ جو چیزیں قیمتی ہوتی ہیں ان کو ہمیشہ پردوں میں رکھا جاتا ہے تاکہ نااہل سے محفوظ رہیں اور اہل ہی ان تک پہنچے، اہل لوگ ان تک پہنچ جاتے ہیں، ان پردوں کو عبور کر کے ان کی حقیقتوں کے پس منظر میں اتر جاتے ہیں۔

کچھ لوگ ظاہر بین ہوتے ہیں یعنی جو چھلکوں پہ اکتفا کر لیتے ہیں، ان کے لئے یہی کافی ہیں مثلاً ان کو لُبّ کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، اہلِ لُبّ کے مقابلے میں اہلِ قِشر ہیں، لُبّ یعنی مغز اور اس کے مقابلے میں قِشر یعنی چھلکا، قرآن نے کہا کہ اولی الالباب لہٰذا ان کے مقابلے میں اولی

☆ آداب، حجابوں کو چیرنے میں مددگار

الاقشار ہیں یعنی چھلکے کھانے والے، دین میں بھی چھلکے کھانے والے موجود ہیں کہ جو فقط ظواہر پہ اکتفا کر لیتے ہیں اور حقائق تک نہیں پہنچتے ہیں حتیٰ یہ قرآن میں بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ روایت میں بھی ہے کہ کتابِ خدا چار چیزوں پر مشتمل ہے: عبارت پر، اشارت پر، لطیف نکات پر اور حقائق پر،

فَالْعِبَارَۃُ لِلْعَوَامِ وَالْاِشَارَۃُ لِلْخَوَاصِ وَاللَّطَائِفُ لِلْاَوْلِيَاءِ وَ الْحَقَائِقُ لِلْاَنْبِيَاءِ.....(۵)

عوام کیلئے عبارت ہے، خواص کیلئے اشارت ہے، (اس میں) اولیاء کیلئے لطیف نکات ہیں اور انبیاء کیلئے حقائق ہیں......

قرآن کے اندر بعض لوگ فقط عبارت تک اکتفا کر لیتے ہیں کہ مبتدا و خبر معلوم ہوگئی تو پس قرآن ان کے لئے حل ہوگیا اور یہ ان کی دنیا و آخرت کے لئے کافی ہے لیکن کچھ ایسے ہیں کہ قرآن کی مبتدا و خبر سے آگے بڑھتے ہیں، ان کے لئے خدا نے اس کے اندر لُب رکھا ہوا ہے، یہ اولی الالباب ہیں لیکن یہ اہلِ لُب و اہلِ خرد بعض اوقات کند ذہن ہو جاتے ہیں، ممکن ہے کہ ریاضی (Mathematics) انہیں خوب سمجھ میں آتی ہو، جغرافیہ (Geography) خوب سمجھ میں آتا ہو، تاریخ (History) بھی اچھی سمجھتے ہوں لیکن قرآن نہ سمجھتے ہوں، بعض ایسے ہیں کہ جو فزکس (Physics)، کیمسٹری (Chemistry)، اکنامکس (Economics) اور پیتھالوجی (Pathology) کو بہترین سمجھتے ہیں، بزنس (Business) کی تمام باریکیوں کو سمجھ جاتے ہیں لیکن قرآن نہیں سمجھتے ہیں، یہ کند ذہن لوگ ہیں، یہ خود کو تیز ذہن نہ کہیں، اس لئے کہ انہوں نے ذہن

☆ آداب، حجابوں کو فہم سے نہیں مددگار

کی دھاران چیزوں پہ مار مار کے کند کردی ہے لہٰذا جب قرآن پڑھتے ہیں تو انہیں یہ چیزیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ان کے کند ذہنوں کو تیز کرنے کی ضرورت ہے لیکن تیز کس سے ہوتے ہیں؟ ادب سے تیز ہوتے ہیں۔

بِالْأَدَبِ تَشْحَذُ الْفِطَنُ......

ادب کے ذریعے ذہانت کو تیز کرو......

فطانت اور ذہانت ادب کے ذریعے سے تیز ہوتی ہے اور انسان کو خدا سے یہی دعا مانگنی چاہیے، جیسا کہ ملا رومی نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہی ادب مانگا، جس طرح بیان کیا ہے کہ خود دعا کے بھی آداب ہیں، آدابِ دعا میں سے ایک یہ ہے کہ آپ خدا سے مفاتیح یعنی چابیاں مانگیں، خزانوں کی چابیاں مانگیں چونکہ خدا کے پاس خزانے ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ......(۶)

اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں......

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ......(۷)

اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں......

۳)مولانا روم کی نظر میں ادب کی اہمیت

اب مولانا روم کے کلام میں دیکھیں کہ ادب کیا چیز ہوتی ہے؟ اور خدا سے ادب مانگنے کا کیا

نتیجہ نکلتا ہے؟ آغازِ مثنوی میں یہ دعائے مولانا روم موجود ہے، البتہ یہ دعائے انبیاء علیہم السلام ہے، جس طرح ذکر کیا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے ادب بھی نہایت ادب سے مانگا تھا، امیر المومنین علیہ السلام کے اندر نہایتِ اوجِ ادب تھا، انشاء اللہ اثنائے بحث میں بعض کی طرف اشارہ ہوگا۔

☆بے ادب لطفِ خدا سے محروم

جس طرح ادب کے اثرات ہیں اسی طرح بے ادبی کے بھی اثرات ہیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ

از خدا جوییم توفیقِ ادب... (۸)

یعنی خدا سے دعا میں توفیقِ ادب طلب کریں۔ ماہِ رمضان دعا کا مہینہ ہے از جملہ اس ماہ کے اندر ایک عمل بھی بہت بافضیلت ہے لہٰذا اس سے غافل نہیں ہونا چاہئے لیکن کس طرح اور کس چیز کی دعا مانگیں؟ ادیبانہ ومؤدبانہ دعا مانگیں، ادب کے حصول کی دعا مانگیں، ابھی ہم ادیب اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو الفاظِ ادبیات پڑھا ہوا ہو یعنی اس کو الفاظ کا ادب معلوم ہو، آداب لفظی سے مہم تر آدابِ انسانی اور آدابِ فعل انسانی ہیں، ادیبِ انسانی ادیبِ لفظی سے بہتر ہے، پہلے انسان خود ادیب بنے پھر آدابِ الفاظ سے آشنا ہو، ادیبِ لفظی یعنی جو الفاظ کے آداب کی رعایت کرتا ہے لیکن اپنے آداب کی رعایت نہیں کرتا، ممکن ہے انسان اپنی زندگی میں بے ادب ہو لیکن قواعدِ لفظیہ سے آشنا ہو۔ پس خدا سے جو دعا مانگنی ہے وہ ادب کی توفیق ہے، لیکن توفیقِ ادب کیوں مانگے؟ اسلئے کہ

بی ادب محروم شد از لطفِ رب

بے ادب محروم ہے، چونکہ اغراض ادب کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں، جس چیز کا یہ ادب ہے یا صفت ہے ان امور کی اغراض وغایات آداب کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں، بے ادب خواہ نہ خواہ ان اغراض سے محروم ہے مثلاً اگر ہم آدابِ لفظیہ کو ہی دیکھ لیں کہ الفاظ کے معانی ہیں، الفاظ کی اغراض ہیں، الفاظ کے اندر مرادیں ہیں، جو ادب سے آشنا ہے اور باادب ہے وہ الفاظ کے معانی سمجھتا ہے لیکن جس کو آدابِ لفظیہ کا علم نہیں وہ اغراضِ لفظیہ سے بھی آشنا نہیں ہے بلکہ محروم ہے، پس بے ادبی کا پہلا اثر محرومیت ہے۔

پس لطفِ پروردگار آداب کے ساتھ ہے لہذا جہاں آداب ہیں وہیں پر لطفِ پروردگار شاملِ حال ہوتا ہے اور بے ادب انسان محروم ہیں۔

☆بے ادب کی وجہ سے دنیا آگ کی لپیٹ میں

بی ادب تنہا نہ خود را داشت بد

بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

بے ادب انسان اتنے مضر ہیں کہ یہ نہ فقط خود لطفِ خداوندِ تعالیٰ سے محروم رہتے ہیں بلکہ پوری دنیا میں جو آگ لگی ہوئی ہے یہ بھی بے ادبوں کی وجہ سے ہے، اگر یہ بے ادب نہ ہوں تو دنیا آسودہ ہو۔ اس وقت زمین پر بے ادب ترین انسان بش ہے اور اس کا عملہ بھی گستاخ ہے، اس کی وجہ

سے پوری دنیا آگ میں جل رہی ہے اور پھر چھوٹے چھوٹے بش جو مختلف جگہوں پر موجود ہیں، یہ گستاخ اور بے ادب چھوٹے شیطان اپنی اپنی قلمرو کے اندر موجود ہیں کہ جن کی وجہ سے پوری دنیا آگ اور بے ادبی کے شعلوں میں جل رہی ہے۔ واقعاً دین کے اندر بھی جتنی مشکلات اور جھگڑے ہیں یہ سب بے ادبوں کی وجہ سے ہیں، ساری آفات گستاخوں کی وجہ سے ہیں، ان کے اندر ادبِ انسانی نہیں ہے، ادبِ دینی نہیں ہے، ادبِ الٰہی نہیں ہے، ادبِ معاشرتی نہیں ہے، ادبِ فردی نہیں ہے، ادبِ علمی نہیں ہے، ادبِ عملی نہیں ہے۔ مثلاً جس طرح سے ایک حیوان ہوتا ہے اسی طرح سے بے ادب انسان ہے لیکن مقامِ انسانی سے گر کے بے ادبِ محض بن گیا ہے بلکہ جانور سے بھی پست ہو گیا ہے۔ مولانا روم نے ایک قرآنی مثال منتخب کی ہے کہ بے ادبی انسان کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ ایک بے ادب پوری قوم اور ملک کو تباہ و ویران کر سکتا ہے۔

مایدہ از آسمان در می رسید

من و سلویٰ قرآنی مثال ہے،

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ٥(٩)

اور ہم نے تمہارے سروں پر ابر کا سایہ کیا، تم پر من و سلویٰ نازل کیا کہ پاکیزہ رزق اطمینان سے کھاؤ، ان لوگوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔

وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ○(۱۰)

اور ان پر من وسلویٰ جیسی نعمت نازل کی کہ ہمارے دیئے ہوئے پاکیزہ رزق کو کھاؤ اور ان لوگوں نے مخالفت کر کے ہمارے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ یہ اپنے ہی نفس پر ظلم کر رہے تھے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى○(۱۱)

اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دلائی ہے اور طور کی داہنی طرف سے توریت دینے کا وعدہ کیا ہے اور من وسلویٰ بھی نازل کیا ہے۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ یاد کرو کہ ہم نے تم پر من وسلویٰ نازل کیا ہے یعنی تیار کھانا اور وہ بھی بہترین کھانا، یہ پوری قوم کو نصیب ہوتا تھا، مائدہ یعنی دسترخوانِ غذا،

مایدہ از آسمان در می رسید

بی صداع و بی فروخت و بی خرید

یہ غذا انہیں بغیر کسی کوشش وزحمت کے اور بغیر خرید وفروخت کے ملتی تھی، نہ ہی پیسے دینے پڑتے تھے اور نہ ہی خریدنی پڑتی تھی۔ من وسلویٰ ایسی غذا تھی کہ یہ لوگ رات کو سو کر جب صبح اٹھتے تھے تو یہ خوراک ان کیلئے آمادہ ہوتی تھی، جیسے بعض نے ذکر کیا ہے کہ درختوں پر من وسلویٰ آویزاں و مہیا ہوتا تھا اور آمادہ مل جاتا تھا، مثلاً ہم صبح اٹھیں تو ناشتہ میں درخت کے اوپر حلوا پوری رکھی ہوئی ہو،

علم و ادب کی بے مثال کتابوں کا مرکز ☆

مکھن رکھا ہوا ہو یا ایرانی کے لئے پنیر چونکہ ان کے لئے تو مکھن سے زیادہ اچھی چیز پنیر ہے اور اس کے ساتھ بالائی ہو یا جیسا جس کا ذوق ہے مثلاً ہر ایک اپنے ذائقے کے مطابق کھائے، انڈا فرائی تیار اور آمادہ ہو، چائے بنی ہوئی ہو اور یہ سب غذا آپ کو درخت کے اوپر لٹکی ہوئی مل جائے، یہ من وسلویٰ ہے، طلبہ کو جو ملتا ہے یہی ملتا ہے، خود تو کوئی زحمت نہیں کرتے ہیں، صبح اٹھتے ہیں تو ہر چیز آگے تیار رکھی ہوتی ہے لیکن خیال رہے یہ من وسلویٰ بند ہو جاتا ہے۔ یہ خوب صورت داستان ہے، ان کو نہ زحمت تھی، نہ رنج تھا، نہ پیسہ لگتا تھا، نہ خرید وفروخت تھی، نہ دکان پہ جانا تھا، کچھ بھی نہیں کرنا تھا بلکہ ان کو گھر میں بیٹھے بیٹھے پکا پکایا کھانا ملتا تھا۔

☆بے ادب، پوری قوم کی محرومیت کا سبب

درمیانِ قومِ موسیٰ چند کس

بے ادب گفتند کو سیر و عدس

یہ ایک لحاظ سے شخصی تجربہ بھی ہے یعنی بے ادب کی وجہ سے سب محروم ہو جاتے ہیں، یہ مثال طلبہ کے لئے عبرت آمیز ہے، استادِ بزرگوار کہ خدا انہیں اپنی حفظ وامان میں رکھے اور سلامتی دے، حضرت آیت اللہ حسن زادہ آملی دام ظلہ العالی، آپ اہلِ علم کیلئے خوب شناختہ شدہ شخصیت ہیں، توفیق نصیب تھی کہ ان کے پاس مدتِ مدید تک تلمذ کی اور ان کے پاس فلسفہ اور دوسرے موضوعات پر دروس پڑھتے رہے لیکن نہایتاً ایک بے ادب کی وجہ سے وہ سارے دروس تعطل کا شکار ہو گئے، صرف

ایک بے ادب انسان کی وجہ سے، ایک ایسا بے ادب درس کے اندر حاضر ہوا اور اس نے بس ایک سوالِ بے ادبانہ کیا، اس کی وجہ سے پورا حوزہ اس اُستادِ ارجمند کے فیوضات سے محروم ہوگیا، درس معطل ہوگئے، خصوصی وعمومی سب معطل کردیئے گئے باوجود اینکہ پہلے خود مقید تھے، ان کے درسوں میں عام آدمی کو جانے کی اجازت نہیں تھی جیسے بعض حوزے کے خصوصی دروس ہوتے ہیں کہ جس میں منتخب لوگوں کو لیا جاتا ہے، اسی وجہ سے لیا جاتا ہے کہ اس کے اندر مؤدب لوگ آئیں لیکن اس ماحول میں بھی بعض اوقات لبادہ اوڑھ کر بے ادب گھس جاتے ہیں یعنی اس کی بے ادبی کا خمیازہ پورا حوزہ بھگت رہا ہے کہ ہمیں ابھی تک ان دروس کی معطل ہونے کا افسوس ہے، ایک بے ادب انسان کی وجہ سے وہ سارا سلسلہ تعطل کا شکار ہوگیا۔

یہ پہلے بھی ہوا ہے یعنی بے ادبوں کی وجہ سے بہت سارے بزرگوار استاد کہ جن میں ہر ایک اپنی جگہ ایک عظیم شخصیت تھی لیکن ان بے ادبوں کے ہاتھوں وہ حوزوں سے چلے گئے، جن میں مرحوم حکیم الٰہی قم، مترجم قرآن، جنہوں نے فارسی میں قرآن کا بہترین ترجمہ کیا ہے، یہ استادِ حوزۂ علمیہ قم تھے، آیت اللہ تھے، بعض لوگوں نے ان کے ساتھ بے ادبی کی لہٰذا یہاں سے تہران چلے گئے اور وہاں جا کر دانش گاہ میں پڑھانا شروع کر دیا، اسی طرح سے ایسی اور بہت ساری مثالیں موجود ہیں کہ جن کے ساتھ نہایت بے ادبی کی گئی اور اس بے ادبی کی وجہ سے وہ منتقل ہو کر چلے گئے، بسا اوقات ایک بے ادب پوری قوم کو محروم کر دیتا ہے، یہی مطلب مولانا مثنوی میں بیان فرما رہے ہیں،

در میانِ قومِ موسیٰؑ چند کس

بے ادب گفتند کو سیر و عدس

موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں چند کس یعنی چند افراد بے ادب تھے، ان کے اوپر مائدہ یعنی آسمانی من وسلویٰ اترتا تھا لیکن ان بے ادبوں نے کہا کہ ہمیں من وسلویٰ اچھا نہیں لگتا بلکہ ہمارے لئے سیر وعدس آنے چاہئیں، سیر یعنی لہسن اور عدس یعنی دال ہونی چاہئے۔ اس کے بارے میں آیہ قرآن ہے کہ

وَاِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ .... (۱۲)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی قسم کے طعام پر ہر گز صبر نہیں کر سکتے.....

اصلاً تعبیر دیکھیں کہ کتنی گستاخانہ ہے،

يَا مُوسٰى......

ان کو پتہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام رسولِ خدا ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے بھی دیکھ چکے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کے ذریعے انہوں نے نجات بھی پائی تھی لیکن کبھی بھی بنی اسرائیل نے انہیں یا رسول اللہ نہیں کہا ہے، قرآن میں سب سے زیادہ تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے اور بہت ساری جگہوں پر بنی اسرائیل کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مُخَاطَب قرار دیئے گئے ہیں اور قرآن نے وہ آیات بیان کی ہیں لیکن کسی ایک جگہ پر بھی قرآن نے ان کی زبان سے یا نبی، یا رسولِ خدا، یا رسول اللہ یا اس طرح کی تعبیر ذکر نہیں کی کہ بلکہ جہاں بھی بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکارا

☆ بے ادب، پوری قوم کی محرومیت کا سبب

ہے تو کہا یا موسیٰ علیہ السلام، ان کی تعبیر بے ادبانہ و گستاخانہ ہے۔

درحالیکہ مسلمانوں کے اندر یہ ادب تھا باا ینکہ یہ ان کو اُمّی کہتے تھے، کچھ لوگ مسلمانوں کے اندر بھی تھے کہ جو بے ادب تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے باہر آ کر اونچی آواز سے جیسے ایک دوسرے کو بلاتے تھے آواز دیتے تھے کہ یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن نے ان کی سرزنش و مذمت کی اور کہا کہ یہ بلانے کا بے ادبانہ طریقہ ہے، اس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ بلاؤ، اس طرح نہ بلاؤ کہ جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو بلکہ ادب سے بلاؤ، کہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یا حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اے ہادیٔ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، لہٰذا اُس کے بعد مسلمانوں کی جتنی تعبیریں ہیں وہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

اسی طرح ائمہ علیہم السلام کو کتنے ادب سے پکارتے تھے، کہتے تھے یا ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، معاصرینِ ائمہؑ حتیٰ مخالفینِ ائمہؑ بھی جب ائمہ علیہم السلام کو بلاتے تھے تو ادب سے بلاتے تھے اور کہتے تھے یا ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اے فرزندِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یہ کتنی خوبصورت تعبیریں ہیں لیکن وہ لوگ یا موسیٰ کہتے تھے، یہ بے ادب تھے، گستاخ تھے اور اس سے بے ادب تر بات یہ ہے کہ خدا سے کہو کہ ہم ایک کھانا پسند نہیں کرتے ہیں، ہم اکتا گئے ہیں، انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ زمین سے جو چیزیں اُگتی ہیں وہ ہمارا خدا پیدا کرے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یَا مُوسٰی......

یا موسیٰ کہنا پہلی بے ادبی ہے،

☆ بے ادب پوری قوم کی محرومیت کا سبب

لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ......

یہ خود دوسری بے ادبی ہے کہ ہم ایک کھانا نہیں کھا سکتے ہیں،

فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ......

انہوں نے یہ نہیں کہا کہ فَادْعُ لَنَا رَبَّنَا یعنی ہمارے پروردگار سے کہو بلکہ کہا کہ رَبَّكَ یعنی جا کر اپنے خدا سے کہو کہ ہم سے یہ کھانا نہیں کھایا جاتا ہے،

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا......

ہمارے لئے زمین سے اُگنے والی چیزیں فراہم کرے جیسے ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز......

یعنی ہمیں وہ چیزیں چاہئیں جو زمین سے اُگتی ہیں، ان کے اندر تنوع ہو، فقط لذت کے لئے، جیسے بعض روزہ رکھتے ہیں صرف پکوڑوں اور سموسوں کے لئے چونکہ لذیذ چیزیں ہوتی ہیں، افطار لذیذ چیزوں سے ہوتی ہے، روزہ رکھتے ہیں چونکہ افطار میں بہت لذت آتی ہے، وہ بھی یہی چاہتے تھے، اسی طرح کے چٹخارے لینے کے لئے اور فقط لذت اٹھانے کے لئے یہ چیزیں منگواتے تھے، یہ نہایت بے ادبی ہے، یعنی قومِ موسیٰ علیہ السلام میں چند بے وقوف اور بے ادب لوگ تھے، انہوں نے کہا کہ یہ سبزیاں وغیرہ کہاں ہیں؟

منقطع شدن نان و خوان آسمان

☆ بے ادب، پوری قوم کی محرومیت کا سبب

مانند رنجِ زرع و بیل و داسمان

اس گستاخی کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ تمثیل ہے، بے ادبی کا اثر بتا رہے ہیں، میں نے اس لئے وہ نمونہ پہلے بیان کیا تھا کہ بے ادب بسا اوقات پورے حوزے کو محروم کر دیتا ہے، ایک بے ادب پورے حوزے کو بے ادب کرتا ہے۔ یہاں ایک اور نمونہ ہے، یہ تمثیلی واقعہ ہے، یہ بے ادبی خدا کو اچھی نہیں لگی اور وہ آسمانی کھانا، دسترخوانِ من وسلویٰ ختم ہو گیا،

اب پیچھے کیا رہ گیا؟ اب کھیتی، پھاوڑا، زحمت، رنج اور کوششیں رہ گئیں یعنی بے ادبی کی وجہ سے آمادہ کھانا ختم ہو گیا اور اب اس کے بعد یہ چیزیں انہیں خود کاشت کرنی تھیں، یہ ساری زحمت بے ادبوں کی وجہ سے ہوئی اور وہ رحمت چلی گئی، چالیس سال تک بنی اسرائیل سرگرداں گھومتے رہے، جسے تیہ کا زمانہ کہتے ہیں، چالیس سال تک بنی اسرائیل حیران و سرگرداں تھے کہ نہ کوئی رہبر، نہ کوئی راہنما، نہ کوئی سرپرست، نہ کوئی راہ دکھانے والا بلکہ یہاں تک موجود ہے کہ ان کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ یہ اپنے ہی گرد گھومتے رہتے تھے، دن کی گرمی میں ٹیلوں کی پناہ لیتے تھے، نہ کھانے کے لئے کچھ تھا، نہ پینے کے لئے کچھ تھا اور پھر رات کو سفر کرتے تھے، سفر بھی ستاروں کو دیکھ کر کرتے تھے اور ان کے ساتھ جو اتفاق رونما ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ رات بھر چلتے رہتے تھے اور جب صبح ہوتی تھی تو یہ سمجھتے تھے کہ ہم صحرا سے باہر جا چکے ہیں لیکن جب دیکھتے تھے تو وہیں ہوتے تھے کہ جہاں سے رات کو چلے تھے، یہ اپنے گرد چالیس سال تک گھومتے رہے ہیں، یہ کس وجہ سے ہوا؟ یہ سب کچھ بے ادبی کی وجہ سے ہوا، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان بے ادبوں نے گستاخی کی،

باز عیسیٰؑ چون شفاعت کرد حق
خوان و دستاد و غنیمت بر طبق

پھر خدا نے ایک لطفِ دیگر کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا، حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام نے شفاعت کی اور کہا کہ اے پروردگار! مائدۂ آسمانی ان کے اوپر نازل فرما، خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کی خاطر چونکہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت باادب نبی ہیں لہٰذا خدا نے ایک ادیب نبی کی وجہ سے پوری امت پر پھر سے اپنی نعمتیں اور برکتیں نازل کرنا شروع کر دیں،

باز گستاخان ادب بگذاشتند
چون گدایان زلہا برداشتند

پھر بعض گستاخوں نے دوبارہ ادب ترک کر دیا، بے ادب ہر جگہ ہیں، جس طرح ایک حوزوی بے ادب کو آپ نے سنا، حضرت استاد سے جب بعض لوگوں نے کہا کہ ایک بے ادب نے اگر بے ادبی کی ہے تو آپ اس بے ادب کو چھوڑ کر باقیوں کو دروس دیتے رہیں تو انہوں نے کہا کہ کیا دلیل ہے کہ کل ایک اور بے ادب پیدا نہیں ہوگا؟ بے ادب کی نسل تو منقطع نہیں ہوئی ہے، بے ادب سے بے ادب ہی پیدا ہوتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ یہ گدا بن گئے، بے ادب اور گستاخ گداؤں کی طرح انہوں نے جو حرکتیں شروع کیں وہ یہ تھیں کہ غذا کھاتے تھے اور کھانے کے بعد جو غذا بچ جاتی تھی وہ بچی کچی غذا ان بے ادبوں نے چرانا شروع کر دی،

لا بہ کردہ عیسیٰ ایشانرا کہ این

دایمست و کم نگردد از زمین

عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ بچی ہوئی غذا کیوں چراتے ہو؟ مثلاً چند آدمی کھاتے تھے اور باقی دیگ اٹھا کر لے جاتے تھے، اپنی کل کے لئے حریص تھے، جیسے بعض ہوتے ہیں کہ کھانا ہو تو زیادہ لے لیتے ہیں اور فرج (Fridge) میں لے جا کر رکھ دیتے ہیں اور وہ فرج میں ہی سوکھتا رہتا ہے چونکہ اگلے ٹائم پھر پک جاتا ہے، یہ حرص کی وجہ سے لے جاتے ہیں اور جا کر ضائع کر دیتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ یہ غذا تو ختم ہونے والی نہیں ہے، یہ تو آپ کو ہر وقت ملے گی، بالآخر تم خدائے کریم، خدائے رازق کے مہمان ہو اور خدا نے تمہیں یہ لطف ہمیشہ کے لئے دیا ہے،

بدگمانی کردن و حرص آورے

کفر باشد پیشِ خوانِ مہترے

جس کے دستر خوان پر تم بیٹھے ہوئے ہو وہ ایسا میزبان ہے کہ جو کریم، سخی، صاحبِ جود ہے، جس کے خزانے نہ ختم ہونے والے ہیں اور جس کی جود نہ ختم ہونے والی ہے، اس کے دستر خوان پر جب بخیل بیٹھتا ہے تو گستاخانہ کام کرتا ہے، اتنا کھاتا نہیں ہے کہ جتنا اپنے ساتھ باندھتا ہے، چراتا ہے، یہ توہین ہے، یہ بدگمانی ہے، حرص کے ساتھ بیٹھنا کفر ہے، خدا کے دستر خوان پر بیٹھ کر بھی بدگمانی کہ اگلے وقت کون دے گا؟ یہ واقعاً کفر ہے، جس خدا نے ابھی دیا ہے وہ دوسرے وقت کا کھانا بھی دے گا۔

زآن گدا رویان نادیدہ زآز
آن در رحمت بر ایشان شد فراز

یہ گدائے نادیدہ یعنی جن کی آنکھیں بھوکی تھیں، نادیدہ ان لوگوں اور گداؤں کو کہتے ہیں کہ جن کی آنکھ بھوکی ہوتی ہے، ان کا پیٹ بھر جاتا ہے لیکن آنکھ نہیں بھرتی ہے، فرماتے ہیں کہ ان لالچی نادیدہ گداؤں پر درِ رحمت کھل گیا،

ابر برنا آید پی منع زکات
وز زنا افتد وبا اندر جہات

اب انہوں نے کلام سے کلام نکالا ہے، کلام یجر الکلام، مطلب سے مطلب، یہ مولانا کی خصوصیت ہے کہ جولانیٔ ذہنی بہت زیادہ ہے البتہ مربوط مطلب ہے لیکن ہم اس کی تشریح سے دور ہو جائیں گے،

ہر چہ بر تو آید از ظلمات و غم
آن ز بی باکی و گستاخیست ہم

یہ جتنے مصائب ہیں بے ادبی کی وجہ سے ہیں۔ آج ہم اس صدی میں بیٹھ کر طاغوتی اور استکباری طاقتوں کے مظالم پوری دنیا میں مشاہدہ کر رہے ہیں، مولانا روم نے آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے یہ مطالب ذکر کئے ہیں۔ جن مشکلات، مصائب، سختیوں، غم، رنج واندوہ اور ظلمات کا آپ کو سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ کہاں سے ہوتا ہے؟ اس کا سبب کیا ہے؟ اور اس کی وجہ کیا ہے؟ فرماتے ہیں

کہ یہ بے ادبوں کی وجہ سے ہے، یہ گستاخوں کی وجہ سے ہے، جیسے امام خمینیؒ نے فرمایا تھا کہ

تمام بد بختی هائی مسلمین از دست آمریکه است

طے کرلیں کہ اگر ایک جوانِ مُسلم بے روزگار ہے تو وہ امریکہ کی وجہ سے ہے، اگر ایک اَن پڑھ ہے تو وہ امریکہ کی وجہ سے ہے، اگر کسی کا علاج نہیں ہو رہا ہے تو یہ امریکہ کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے لیکن یہ لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ کون کس طرح سے محصور ہے۔ یہ گستاخوں اور بے ادبوں کی وجہ سے ہے۔ جتنی مشکلات اور مصائب تیرے اوپر ٹوٹتے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی ذمہ دار ضرور ہے؟ اور وہ بے ادب اور گستاخ لوگ ہیں۔

بعض اوقات لطفِ پروردگار آمادہ ہوتا ہے کہ جیسے پہلے کسی مناسبت سے دعا کی بحث میں عرض کیا تھا کہ دعا خدا کی رحمت کے تار کو چھیڑنا ہے، بحرِ جودِ خدا کہ جو آرام وسکون میں ہوتا ہے لیکن ایک بندہ اپنی مناجات کے ذریعے، اپنے چند جملوں کے ذریعے اس بحر میں تلاطم پیدا کر دیتا ہے، یعنی بحرِ جودِ خدا احساسات کی مانند ہے، جیسے ہمارے احساسات ابھی سکون میں ہیں لیکن اگر کوئی آدمی اُٹھ کر احساساتی باتیں کرنا شروع کر دے تو ان احساسات میں ایک دم تلاطم آ جائے گا، ان احساسات کے اندر عشق جاری ہوگا، آنسو جاری ہوں گے۔ احساسات بھی مانندِ تار ہیں، جس طرح نغموں میں ساز اور سازوں کے اوپر تاریں ہیں اور ان تاروں کو چھیڑنے سے نغمہ نکلتا ہے، وہ تار سکون میں ہیں، وہ نغمہ یا وہ ساز وسوز سکون میں ہے، اس کو چھیڑنے والا کوئی نہیں ہے، بس ذرا سا کوئی چھیڑ دے، علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کیلئے......(۱۴)

جو دِخدا تشبیہ و تمثیل ہے، جو دو بخشش خدا شاملِ حال ہونے کیلئے بے تاب ہے لیکن کوئی چھیڑتا نہیں ہے لہذا کوئی آکر اس کو چھیڑ دے۔ دعا اس بحرِ جودِ خدا کو چھیڑنا ہے، اس میں تلاطم و موج ایجاد کرنا ہے اور ایک باادب شخص مناجات کے ذریعے، ایک دعا کے ذریعے اور ایک ذکر کے ذریعے رحمتِ خدا کا رخ کسی قوم کی طرف موڑ دیتا ہے لیکن ایک بے ادب اور گستاخ اس رحمت کا رخ اس قوم سے موڑ کر محروم کر دیتا ہے۔

☆بے ادب، راہ زن و نامرد

ھر کہ بی باکی کند در راہِ دوست
رہ زنِ مردان شد و نامرد اوست

جو بھی دوست کی راہ میں، خدا کی راہ میں بے ادب ہو گیا اور بے باک یعنی گستاخ ہو گیا تو ایسا شخص راہزن اور نامرد ہے چونکہ سب سے زیادہ بے ادبی بارگاہِ خدا میں انجام پاتی ہے، وہ انسان جو الفاظ کے ادیب ہیں، جو دوسروں کے سامنے آداب کا خیال رکھتے ہیں لیکن خدا کے سامنے آداب

کا خیال نہیں رکھتے ہیں، مرحوم علامہ طباطبائیؒ نے ادب کے بارے میں بہت خوبصورت اور زیبا وعظ کیا ہے کہ بارگاہِ خدا میں ادیب ترین انسان روئے زمین پر انبیاء علیہم السلام اور معصومین علیہم السلام تھے کہ جو بارگاہِ خدا میں آداب کو ملحوظِ خاطر رکھتے تھے اور اسی لئے کسی چیز سے بھی محروم نہیں تھے چونکہ باادب تھے، شیطان بے ادب تھا لہٰذا لطفِ رب سے محروم رہ گیا۔

یہ ایک غلط محاورہ ہے کہ عموماً اہل علم میں زیادہ مُدْخَلْ ہے، شاید آپ نے سنا ہوگا کہ

بَيْنَ الْأَحْبَابِ تَسْقَطُ الْآدَابُ......(۱۴)

دوست احباب کے درمیان آداب ختم ہو جاتے ہیں......

اس کی مثال لاہوری دوستی ہے، لاہوری دوستی معلوم نہیں کہ آپ نے دیکھی یا سنی ہوئی ہے یا نہیں؟ لاہوریوں سے معذرت کے ساتھ کہ لاہور میں اپنائیت کی دلیل یہ ہے کہ گالی دے کر بات کرتے ہیں۔ جس کو گالی دے سمجھو بہت قریبی دوست ہے اور جتنی گندی گالی دے، غلیظ تر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں انسیت اور زیادہ ہے، اگر گالی نہ دے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں، ہمیں دوست نہیں سمجھتے ہیں، ہمیں اپنا بھائی نہیں سمجھتے ہیں، اس میں معیار گالی ہے کہ یہ لاہوری دوستی صرف لاہور میں نہیں ہے بلکہ ہر جگہ ہے، اہلِ علم میں یہ مشہور ہے کہ

بَيْنَ الْأَحْبَابِ تَسْقَطُ الْآدَابُ......

یعنی دوستوں کے درمیان آداب نہیں ہوتے ہیں، نہیں، بلکہ اتفاقاً جتنی دوستی عمیق تر ہو اتنا ہی ادب بیشتر ہوتا ہے، انسان دوست کے ساتھ ہی سب سے زیادہ باادب رہتا ہے، ممکن ہے اجنبی

اور بیگانے کے ساتھ آداب نہ ہوں لیکن جس کے ساتھ ضرورت ہے، جس کے ساتھ زیادہ دوستی ہونی چاہئے لہٰذا وہاں ادب ہے اور سب سے بہترین دوست اصطلاحِ عرفانی میں خداوند تبارک وتعالیٰ ہے، عرفان میں جہاں بھی دوست مراد ہو وہاں پہ ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ مراد ہے، جیسے امام خمینیؒ کے کلام میں ہے کہ

من بخال لبت ای دوست گرفتار شدم

چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم...... (۱۵)

پاکستان میں کسی سے پوچھا کہ یہ کیسا شعر ہے تو کہا کہ یہ طالب علمی سے پہلے کی بات ہے یعنی اس وقت طالب علم نہیں تھے حالانکہ اتفاقاً آخرِ عمر کی غزل ہے، امامؒ کی رحلت سے پہلے جو آخری سال تھا اس سال کی ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثِ ثقلین، خطبہ شعبانیہ اور خطبہ غدیر یہ سب آخری سال کی باتیں ہیں، اسی طرح یہ امام خمینیؒ کے آخری سال کی غزل ہے، چشمِ بیمار اصطلاحِ عرفانی ہے، جس طرح ادبیات کی اصطلاح مثلاً فاعل ہے، یہ اصطلاحِ ادبیات ہے، مبتدا و خبر ہے، اس پر تو کوئی اعتراض نہیں کرسکتا ہے کہ آپ اس کو مبتدا کیوں کہتے ہیں؟ آپ اس کو خبر کیوں کہتے ہیں؟ خبر تو وہ ہوتی ہے کہ جو ٹی وی میں نشر ہوتی ہے، اس کو آپ خبر کیوں کہتے ہیں؟ کوئی آپ کے ساتھ الجھ سکتا ہے، آپ جب کہتے ہیں کہ یہ مبتدا ہے اور یہ خبر ہے تو ایک اناڑی آدمی کہ جس نے فقط ٹی وی پہ خبریں سنی ہیں وہ کہے گا کہ یہ کیا کہتے ہو، یہ خبر ہے یا وہ خبر ہے جو بی بی سی اور سی این این دیتا ہے، یہ جو آپ کہہ رہے ہو کہ یہ لفظ خبر ہے تو یہ کہاں کی خبر ہے؟ آپ اس کے ساتھ نہیں الجھیں، یہ

ایک اصطلاح ہے، اس کا حق بنتا ہے کہ جو یہ کہے، دوست یعنی خدا کی ذات۔ اہل اللہ اور مقربینِ خدا، خداوندِ تبارک وتعالیٰ کو حضرتِ دوست تعبیر کرتے ہیں۔

مولانا روم فرمارہے ہیں کہ یہ مردوں کا راہزن ہے، یہ بے ادب مانندِ ڈاکو ہے، یہ نامرد انسان ہے، نامرد سے مراد عورتیں نہیں ہیں، قرآن نے بھی کہا ہے کہ نامرد موجود ہیں،

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا٥(١٦)

مومنین میں ایسے بھی مردِ میدان ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے وعدے کو سچ کر دکھایا ہے ان میں بعض اپنا وقت پورا کر چکے ہیں اور بعض اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور ان لوگوں نے اپنی بات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔

اس آیہ کا لب ولہجہ اور لحن دیکھیں،

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ ......

یہ نہیں ہے کہ مومنین میں سے کچھ رجال ہیں اور کچھ نساء ہیں یعنی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ رِجَالٌ، بلکہ مومنین آیا ہے مومنات نہیں ہے، مِنَ الْمُؤْمِنِين، مومنین خود صیغۂ مذکر ہے۔ لوگوں میں سے کچھ مومنین ہیں اور کچھ غیر مومنین ہیں لیکن مومنین میں سے بھی کچھ رجال ہیں یعنی مرد ہیں کہ جن کے اندر مردانگی ہے، اس رجال کے مقابل میں کیا ہے؟ وہ نہج البلاغہ میں ہے کہ

يَا أَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا رِجَالَ... (١٧)

اے مردوں سے شباہت رکھنے والوں جو کہ مرد نہیں ہو......

یعنی اس مردانگی کے مقابلے میں یہ جملہ ہے کہ اے مردوں جیسی شکل والے نامردوں۔

☆شیطان بے ادبی کی وجہ سے شیطان بنا

مولانا روم فرماتے ہیں کہ

از ادب پر نور گشتست این فلک

وز ادب معصوم و پاک آمد مَلک

فلک میں جو نورانیت ہے وہ ادب کے ذریعے سے ہے، دنیا ادب کی وجہ سے روشن ہے۔ستارے کتنے باادب ہیں کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو چھپ جاتے ہیں، یہ ایک شاعرانہ تمثیل ہے، سائنسی تحقیق نہیں ہے، بسا اوقات ہم جو دیکھتے ہیں اسے بیان کررہے ہوتے ہیں نہ کہ اسے کہ جو واقعا ہے۔ہم ظاہراً یہ دیکھتے ہیں کہ جب سورج نکلتا ہے تو ستارے ہوتے ہیں لیکن دکھائی نہیں دیتے، یہ سورج کے سامنے ان کا ادب ہے لیکن یہاں بے ادب کون ہے؟ بے ادب ستارہ و سیارہ بھی نہیں ہے، ایک شمع، لیمپ و بلب بھی نہیں ہے، مثلاً جگنو ہے کہ جس کی دم میں الیکٹرک کرنٹ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے نکلتا رہتا ہے، وہ بھی اس کے اضطراب کی وجہ سے نکلتا ہے، مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جگنو روشنی کا ذریعہ ہے، چونکہ دم بھی تو مشکلات پیدا کرتی ہے، مولانا روم کا ہی ایک شعر ہے کہ

ہر کہ او بی سر بجنبد دُم بود

جنبش چون جنبش کژدم بود ......(۱۸)

یعنی جو بھی سر کے بغیر گھومتا ہے تو سمجھو وہ بچھو ہے، بچھو ایک دم ہے چونکہ بچھو کا سارا ناز اس کی دم پر ہے، دم میں اس کی ڈنک ہے، یہ کژدم ہے۔ اگر فلک روشن ہے تو ادب کی وجہ سے روشن ہے اور ادب کی وجہ سے اس کے اندر نورانیت آئی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ فرشتہ کیوں معصوم ہے؟ چونکہ با ادب ہے۔ شیطان کیوں رجیم ہے؟ چونکہ بے ادب ہے، شیطان مردود اور بے ادب کو خدا نے بارگاہ سے نکال دیا ہے لیکن فرشتے کو پاک کر دیا اور معصوم بنایا، انبیاء علیہم السلام بھی معصوم ہیں اور یہ ادب کا نتیجہ ہے،

بُد ز گستاخی کسوفِ آفتاب

شد عزازیلی زجرأت ردِّ باب

بے ادبی کی وجہ سے سورج کو کُسوف یعنی گرہن ہے چونکہ زمین اور سورج کے بیچ میں آنا بے ادبی ہے۔ بسا اوقات ہوتا ہے کہ ہم ان چیزوں کا خیال نہیں رکھتے ہیں، مثلاً پشت نہ کرنا، پشت نہیں کریں البتہ اگر درس یا مجلس ہو تو اور بات ہوتی ہے، ادبِ مجلس الگ ہے، ادبِ درس الگ ہے، ادبِ نشست الگ ہے لیکن اگر ایک عام مجلس و محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں تو کسی کی طرف پشت نہ کریں، ایران میں اس چیز کو بہت معیوب سمجھتے ہیں کہ آپ کسی سے بات کر رہے ہیں اور دوسرے کی طرف پشت کر کے بیٹھے ہوئے ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں یہ نہایتِ ادب ہے کہ پیٹھ کر کے کسی کی طرف نہ بیٹھیں، لہٰذا اگر چاند، سورج اور زمین کے درمیان آگیا ہے تو اس لئے کُسوف ہوا ہے کہ

☆ شیطان بے ادبی کی وجہ سے شیطان بنا

یہ سورج کیلئے بے ادبی ہے، بے ادبی کی وجہ سے اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا ہے۔

اسی طرح شیطان کا کتنا بڑا مقام تھا؟ جن ہوتے ہوئے یہ ملائکہ کی صف میں موجود تھا لیکن بے ادبی کی وجہ سے ردِ باب ہوا، دھتکار دیا گیا اور بارگاہِ خدا سے نکال دیا گیا، شیطان کا اصلی نام عزازیل ہے، ابلیس نہیں ہے، ابلیس صفت ہے اور شیطنت بھی صفت ہے یہ اس کے نام نہیں بلکہ عہدے ہیں، اس کا نام عزازیل ہے، ابلیس اس لئے کہتے ہیں کہ وہ تلبیس اور التباس کی وجہ سے شک میں ڈالتا ہے، درہم برہم کر دیتا ہے، حق و باطل ملا دیتا ہے، وہ لباسِ حق کو لباسِ باطل اور لباسِ باطل کو لباسِ حق پہناتا ہے اور اسی کام کو التباس کہتے ہیں، تلبیس یعنی کسی اور چیز کو کوئی اور لباس پہنا دینا، عورت کو مرد کا لباس اور مرد کو عورت کا لباس پہنا دینا، تلبیسِ ابلیس لباس پہنانا اور الٹے لباس پہنانا ہے۔ شیطنت بھی اس کا فعل ہے یا اس کی صفت ہے لیکن اس کا اصل نام عزازیل ہے۔ بے ادبی کی وجہ سے یہ راندۂ درگاہ کر دیا گیا،

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ......(۱۹)

یعنی ارشاد ہوا کہ تو یہاں سے نکل جا، تو مردود ہے۔

٤) مولانا روم کے اشعار امیر المومنین علیہ السلام کے فرامین کی شرح

غرضیکہ مثنوی کے یہ اشعار امیر المومنین علیہ السلام کی ان روایات کی شرح ہیں،

اِنَّكُمْ اِلٰى اِكْتِسَابِ الْاَدَبِ اَحْوَجُ مِنْكُمْ اِلٰى اِكْتِسَابِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ......

تم ادب سیکھنے کے زیادہ محتاج ہو اس بات سے کہ تم چاندی اور سونا کماؤ......

اِنَّ بِذَوِی الْعُقُوْلِ مِنَ الْحَاجَةِ اِلَى الْاَدَبِ كَمَا يَظْمَأُ الزَّرْعُ اِلَى الْمَطَرِ......

بے شک صاحبانِ عقل ادب (سیکھنے) کے ایسے محتاج ہیں جس طرح سے کھیتی (زراعت) بارش کی محتاج ہوتی ہے۔

ادب کے بغیر انسان محروم ہے، مثنوی کی یہ پوری نظم جو آپ کی خدمت میں ذکر کی گئی یہ وہی چیز ہے۔

بِالْاَدَبِ تَشْحَذُ الْفِطَنُ......

ادب کے ذریعے ذہانت کو تیز کرو......

پس ادب کے ذریعے سے فہم تیز ہوتی ہیں لہٰذا ادب فہمِ قرآن ایک خصوصی فہم ہے اور عام فہم سے ذراہٹ کر ہے، ویسے تو فہم کلی ہے لیکن اس فہم کلی میں ایک خاص فہم فہمِ قرآن ہے، اول اس فہم کی بھی حدود و قیود ہیں اور اس فہم کے بھی آداب ہیں، اگر وہ آداب ہوں تو یہ فہم تیز ہو جاتی ہے، یہ قرآن کو سمجھنے کے لئے تیز ہوتی ہے اور اسی انسان کو قرآن نے متقی کہا ہے یعنی جو قرآن کو سمجھنے کے لئے آمادہ ہے، جس نے اپنے آپ کو آمادہ کیا ہے، فہم پیدائشی طور پر آمادہ نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ آمادگی اپنے اندر لانا پڑتی ہے۔

اب ہمیں تھوڑا اندازہ ہوگیا کہ آداب کیا ہوتے ہیں اور ان کی کیا اہمیت ہے لہٰذا آئندہ

فصلوں میں جب آدابِ فہمِ قرآن کی بحث کریں گے تو اندازہ رہے گا کہ آداب سے کونسی چیزیں مراد ہیں یا دقیقاً کس چیز سے بحث کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے اندر یہ آمادگی آئے گی کہ ہم ان آداب میں وارد ہوں کہ جو بطورِ رسمی صدر المتألہینؒ نے اپنی کتاب مفاتیح الغیب میں نقل کیے ہیں۔

حوالہ جات

(۱)......(عيون الحكم والمواعظ - على بن محمد الليثى الواسطى،الجزء ۱،صفحه ۱۵۰)

(۲)......(ميزان الحكمة - الريشهرى، باب الادب، الجزء ۱، صفحه ۵۳)

(غرر الحكم ودرر الكلم)

(۳)......(غرر الحكم و درر الكلم، الجزء ۱، صفحه ۱۶۳)(ميزان الحكمة-

الريشهرى، باب الادب، الجزء ۱، صفحه ۵۶)

(۴)......(مثنوى معنوى،به تصحيح :رينولد ا.نيكلسون،دفتر پنجم،صفحه۷۸۹)

(۵)......(التفسير الصافى -الفيض كاشانى،الجزء ۱،صفحه ۳۲)(تسنيم تفسير

قرآن كريم-آيت اللّٰه جودى آملى،الجزء ۲،صفحه ۲۴)(سيرة الامام جعفر

صادقؑ،الجزء ۱،صفحه ۲)(تفسير جوامع الجامع- الشيخ ابى على الفضل بن

الحسن الطبرسیؒ،الجزء ۱،صفحه ۴) (ميزان الحكمة-الريشهرى،الجزء۸،صفحه ۲۱۴)

(۶)......(سورۂ مبارکہ حجر،آیہ۲۱)

(۷)......(سورۂ مبارکہ انعام،آیہ۵۹)

(۸)......(مثنوى معنوى،به تصحيح :رينولد ا.نيكلسون، دفتر اول،صفحه۸)

(۹)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۵۷)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ اعراف،آیہ۱۶۰)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ طہ،آیہ۸۰)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۶۱)

(۱۳)......(کلیاتِ اقبال، بانگِ درا، حصہ سوم، عنوان: شکوہ، صفحہ ۱۶۹)

(۱۴)......(أسطورة العبوسة، الجزء ۳، صفحه ۱۱)

(۱۵)......(دیوانِ امام خمینیؒ، عنوان: چشم بیمار، صفحه ۱۴۲)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ ۲۳)

(۱۷)......(نهج السعادة، الجزء ۲، صفحه ۲۶۲)(میزان الحکمة - الریشهری، باب الناس، الجزء ۱۰، صفحه ۵۳۷)

(۱۸)......(مثنوی معنوی، به تصحیح: رینولد ا.نیکلسون، دفتر چهارم، صفحه ۲۱۳)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ حجر، آیہ ۳۴)(سورۂ مبارکہ ص، آیہ ۷۷)

فصلِ ادبِ اوّل

﴿درکِ عظمتِ قرآن﴾

١)تعارفِ مفاتیح الغیب

٢)درکِ عظمتِ کلام

٣)قرآن ذو مراتب حقیقت

٤)قرآن،ایک محجوب حقیقت

٥)قرآن رات میں نازل ہونے کی وجہ

٦)احترام بمناسبت عظمتِ مقام

٧)اللّٰہ اپنے کلام میں متجلی ہے

٨)معرفت اوراجارے کی نمازمیں فرق

٩)اللّٰہ کو پانا ہے

١٠)قرآن حبلِ خدا ہے

١١)مستور قرآن لطفِ خدا ہے

١٢)قرآن کی حکمت اور عبارت کا تعلق

١٣)قرآن، نورِ حکمت

١٤)قرآن، مشروبِ حیات

۱)تعارفِ مفاتیح الغیب

صدرالمتألھینؒ کی کتاب کانام ''مفاتیح الغیب'' ہے یعنی غیبی،اوجھل وپنہاں خزانوں کی چابیاں، مفاتیح الغیب یعنی اللہ کے خزانوں کی کنجیاں، یہی چابیاں آداب ہیں اوران آداب ہی کے ذریعے سے انسان الٰہی خزانوں تک پہنچتا ہے لہٰذا اہلِ خردوفہم چابی مانگ لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ خزانے کے اندران کی رسائی ہوجاتی ہے،خزانوں سے جتنی ضرورت ہے، جتنی بھوک وپیاس ہے اس حدتک حاصل کرسکتے ہیں۔خدا سے ادب مانگنا یعنی چابی لے لینا۔مفاتیح الغیب میں سے ایک مفتاح یعنی ایک چابی وکنجی ادب ہے کہ انسان مؤدب ہو، غیر مؤدب انسان گستاخ انسان ہے۔

''مفاتیح الغیب'' قرآنی علوم کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی ہے۔صدرالمتألھینؒ کو عام لوگ بنامِ ملاّ صدرا پہچانتے ہیں، یہ حکیم الٰہی اور فیلسوفِ ربانی یعنی ذوالفنون ہیں، فلسفے میں شہرت ہے لیکن ان کی کتابِ تفسیر بھی ہے، دیگرعلومِ قرآن کی کتابیں بھی ہیں، حدیث کی کتاب بھی ہے اور مختلف علوم میں کتابیں لکھی ہیں۔اس کتابِ مفاتیح الغیب میں بحثِ ''آدابِ فہمِ قرآن'' موجود ہے،البتہ انہوں نے اصل بحث غزالی سے اخذ کی ہے کہ جومعروف بہ ابوحامد غزالی ہیں،ان کی ایک معروف کتاب بنامِ احیاء العلوم ہے،اس کے اندرانہوں نے بحثِ قرآن کے ذیل میں آدابِ قرآن ذکر کیے ہیں، کچھ تصرف کے ساتھ مرحوم صدرالمتألھینؒ نے اس بحث کو احیاء العلوم سے اقتباس و تلخیص کیا ہے اور نئے سرے سے تحریر بھی کیا ہے، بعض مطالب اس کے ترک کیے ہیں کہ جوموزوں

نہیں تھے یا یہ کہ نظروں میں مناسب نہیں تھے اوراس کے اندر بعض مطالب اپنی طرف سے اضافہ کیئے ہیں، اس کتاب سے ہو بہو نقل نہیں کیا ہے۔

صدر المتألھینؒ نے عبارتوں کے اندر بہت ہی عمدہ لطائف بیان کیئے ہیں۔ وہ عبارتیں بہت زیبا ہیں اور خود نفسِ عبارت بہت جالب ہوتی ہے اوراس کے اندر ایک دنیائے معرفت موجود ہوتی ہے، ہم انشاء اللہ اجمالاً بعض عبارتیں تحریر کریں گے تاکہ ہمیں ان تعبیروں کی لطافت کا احساس ہو جائے اور یہ عبارتیں سب کے لئے حل بھی ہوں۔

صدر المتألھینؒ فرماتے ہیں کہ اس فصل میں ہم قرآن کے اندر غور وفکر کرنے والوں کے آداب ذکر کریں گے، لیکن جنہیں فقط حفظ کرنا ہے، جنہیں فقط ختم قرآن کرنا ہے، جنہیں فقط دہرانا ہے، تلاوت کرنا ہے، ان کے آداب الگ ہیں، وہ بھی اسی کتاب میں ذکر کیئے گئے ہیں لیکن یہ فصل مخصوصاً ان لوگوں کے لیئے ہے کہ جنہیں قرآن میں تدبر، غور اور فکر کرنا ہے، اب ایک ایک کر کے ان آداب میں وارد ہوتے ہیں کہ جو مرحوم صدر المتألھینؒ نے کتابِ شریفِ مفاتیح الغیب میں ذکر فرمائے ہیں، کتابِ مفاتیح الغیب کے صفحہ نمبر (۵۸) پر **الفاتحة الثانية** کے نام سے ایک باب ہے، فاتحہ اس کیلیئے عنوانِ فصل ہے چونکہ ہم اس کتاب کا ایک باب پڑھ رہے ہیں لہٰذا اس کے متعلق بحث نہیں کرتے ہیں کہ فاتحہ ثانیہ کیا ہے؟ فقط اپنے موضوع پہ توجہ مرکوز رکھتے ہیں چونکہ کتاب کا پہلا اور بعد والا حصہ ابھی ہماری غرض میں نہیں ہے، آپؒ اس میں فرماتے ہیں کہ

☆**فی الاشارة الی آداب الناظرين فی علم القرآن......**

شیعہ شناسی

فاتحہ دوم یا فصلِ دوم کتاب ان آداب کے متعلق ہے کہ جو قرآن کے اندر غور وفکر کرتے ہیں کچھ لوگ فقط قرأتِ قرآن کرتے ہیں، کچھ فقط تلاوتِ قرآن کرتے ہیں، کچھ صرف سماعتِ قرآن کرتے ہیں، کچھ قرآن پر محض نگاہ کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ غور وفکر کرتے ہیں، یہاں نظر بمعنی فکر ہے اور فکر کے بھی آداب ہونے چاہئیں تاکہ درست فکر کریں اور اس فکر کا درست نتیجہ بھی نکلے۔

☆**المتدبرين في آيات الله تعالىٰ......**

ہم ان کے آداب ذکر کرتے ہیں کہ جو لوگ آیاتِ خدا میں اہلِ تدبر ہیں، اہلِ غور وفکر ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن نے انسان کو دعوتِ تدبر دی ہے، جو لوگ عالمِ خلقت میں بھی اور آیاتِ قرآن مجید میں بھی یعنی آیاتِ عینیہ خداوند تبارک وتعالیٰ میں اور آیاتِ تدوینیہ خداوند تبارک وتعالیٰ میں تدبر کرتے ہیں۔

☆**وهي عشرة:.....**

اور وہ دس ادب ہیں، یہاں پر ذکر فرماتے ہیں کہ بعض ترتیبِ احیاء العلوم سے مختلف ہیں کہ اثنائے بحث میں اشارہ ہوگا۔

درکِ عظمتِ کلام

۲) درکِ عظمتِ کلام

☆**الاول: فهم عظمة الكلام......**

فہمِ قرآن اور درکِ معانی ومقصودِ قرآن کیلئے پہلا ادب درکِ عظمتِ قرآن ہے، جو شخص

قرآن کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اس کے لیئے ضروری ہے کہ عظمتِ کلام کو درک کرے، البتہ اس سے پہلے آدابِ دیگر بھی موجود ہیں کہ جو ہم نے تحریر نہیں کیئے ہیں، آپ خود مفاتیح الغیب سے پڑھ کر سکتے ہیں، ان میں سے بعض قرأتِ قرآن کے آداب ہیں، بعض سماعتِ قرآن کے آداب ہیں اور بعض تلاوتِ قرآن کے آداب ہیں چونکہ ہماری بحث تدبرِ قرآن میں ہے لہٰذا اس فصل کے متن کو بحث کے لیئے منتخب کیا ہے۔ پس اس پہلے ادب کے مطابق اس کلام کا وصفِ عظمت یعنی مقام ومنزلت اور علو و درجۂ عالی اسے معلوم ہونا چاہئے کہ میں کس بارگاہ میں ہوں؟ یہ نہ کہے کہ یہ بھی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے کہ یہ رکھ کر وہ اٹھالی اور وہ رکھ کر یہ اٹھالی کہ جس طرح ہم عموماً کرتے ہیں، ایک کتاب رکھ کر دوسری اٹھالیتے ہیں، وہ رکھ کر تیسری اٹھالیتے ہیں پھر اسے رکھ کر قرآن پڑھنا شروع کردیتے ہیں، نہیں، اس طرح سے نہ ہو، پہلے معلوم ہو کہ کس بارگاہ میں ہوں؟ کس کے کلام کی بارگاہ میں ہوں؟

قرآن کلامِ الٰہی ہے لہٰذا پہلے انسان اس کلامِ الٰہی کی عظمت کو درک کرے اور پھر قرآن میں فکر اور تدبر کرے، اس کے بعد انسان کو قرآن مجید سے کچھ حاصل ہوگا۔ اگر انسان عظمتِ کلامِ الٰہی کو سمجھے بغیر، تصدیق کیئے بغیر، یقین پر پہنچے اور ایمان لائے بغیر قرآن کے اندر وارد ہو جائے تو اس کے اندر گشت تو کرے گا لیکن حاصل کچھ نہیں ہوگا چاہے وہ کثرت سے تلاوت و قرأتِ قرآن کرے۔ اگر انسان کے اندر حالتِ قرأتِ قرآن میں اور حالتِ فہمِ قرآن میں احساسِ عظمتِ کلام نہ ہو یعنی علم نہ ہو یا عظمتِ کلامِ الٰہی کی طرف توجہ نہ ہو تو انسان کو مقصودِ قرآن حاصل نہیں ہوگا اور چونکہ

قرآن کلامِ خداوندِ تبارک وتعالیٰ ہے لہٰذا عظمتِ کلام رہینِ عظمتِ متکلم ہے یعنی جتنی عظمت متکلم کے اندر موجود ہوگی اتنی ہی عظمت کلام کے اندر موجود ہوگی۔ دوسری کتابوں میں بھی ایسے ہی ہے، فرض کریں کہ آپ کو ایک نامعلوم مؤلف کی کتاب ملی اور آپ کو پتہ نہیں ہے کہ اس کا مؤلف کون ہے؟ آپ اس کا مطالعہ کرنا شروع کردیتے ہیں، اول سے آخر تک کتاب کو سمجھتے ہیں اور جب آپ کو اسی کتاب کا مؤلف معلوم ہوجائے اور وہ مؤلف بھی بہت گرانقدر انسان ہو، بہت ہی عظیم شخصیت کا مالک ہو مثلاً وہ عربی تحریر ہے اور ہم نے اس کو لے کر پڑھا اور اس سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خطبہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ہے لہٰذا اب ہم دوبارہ پڑھتے ہیں اور اب ہمیں یہ کتاب کچھ اور طرح سے سمجھ میں آتی ہے، فرق صرف یہ پڑا ہے کہ پہلے عبارت ہمارے سامنے تھی لیکن اس عبارت کی عظمت کا احساس نہیں تھا اور عظمت کا احساس اس وجہ سے نہیں تھا کہ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کس کی کتاب ہے؟ یہ کس کا کلام ہے؟ یہ کس کا جملہ ہے؟

عظمتِ کلام رہینِ عظمتِ متکلم ہے، یہ نکتہ نہ صرفِ فہم قرآن میں مؤثر ہے بلکہ عبادتِ انسان میں بھی مؤثر ہے اور اگر خدانخواستہ انسان کا دل قساوت کا شکار ہوجائے، سخت ہوجائے تو اس دل کو نرم کیسے کیا جائے؟ یہ اہم نکتہ ہے چونکہ دل کو قسی وسخت کرنے والی بہت ساری چیزیں ہیں، نرم کرنے والی چیز کونسی ہے؟ خشوعِ قلب کے لئے بھی یہ نکتہ مہم ہے اور حضور در عبادت میں بھی، غالباً ہم عبادت میں غیر حاضر رہتے ہیں، غیر حاضر عبادتیں کرتے ہیں چاہے نماز میں ہوں یا روزے میں ہوں چونکہ روزہ بھی ایک عبادتِ خدا ہے، اس روزہ میں انسان کو کاملاً بارگاہِ خدا میں ہونا چاہئے، نیتِ

روزہ سے افطار تک، روزہ یعنی حضور در بارگاہِ خدا، قطعِ تعلق ماسوا اللہ، یہ ہے روزۂ انسان یعنی روحِ روزہ ہو نہ کہ فقط حکمِ فقہی پر روزہ رکھیں، روحِ روزہ یعنی جس کی وجہ سے انسان پر روزے کا اثر پڑتا ہے اور روزے کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ تقویٰ وہ چیز ہے کہ انسان بارگاہِ خدا میں ہو نہ کہ صرف منہ بند کیا ہوا ہو، امیر المومنین علیہ السلام کا فرمانا ہے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جن کو روزے سے فقط فاقہ نصیب ہوتا ہے، جو فقط بھوک کاٹتے ہیں باقی روزہ نہیں ہوتا ہے، فاقہ اور روزہ میں فرق ہے، فاقہ نہ کھانے کو کہتے ہیں لیکن صیام غیر از فاقہ ہے۔

صیام بارگاہِ خدا میں حضوری کا نام ہے، عبادتوں کی ساری روح حضور ہے، بارگاہِ خدا میں حضورِ بندگانہ، حضورِ عبودانہ اور حضورِ عبیدانہ روحِ عباداتِ انسان ہے، نماز میں بھی یہی ہے، نماز میں ہماری توجہ کیوں نہیں ہوتی ہے؟ کیوں حضورِ قلب نہیں ہوتا؟ کیوں خضوع وخشوع نہیں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ ہم عبادت کو ایک رسم کے طور پر، ایک عبادت کے طور پر اور ایک عادت کے طور پر بجالاتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کہ جس کی بارگاہ میں ہم حاضر ہیں اس کی عظمت کی طرف توجہ نہیں ہوتی ہے، اس لحظے ہم عظمتِ خدا کو درک نہیں کر رہے ہوتے ہیں، ہمارا ذہن و دل اس عظمت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب تک انسان کو ذاتِ خدا، کبرائی خدا، بزرگیٔ خدا، قدرتِ خدا اور قہاریتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کا اندازہ نہ ہو تو اسے معلوم نہیں ہوگا کہ میں کس کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور اگر انسان احساس کرلے تو یہ معرفت خود انسان کو مؤدب بنادیتی ہے۔

اگر ناشناختہ طور پر ہم کسی بزرگ شخصیت کے سامنے کھڑے ہوں کہ جسے نہیں جانتے ہیں کہ یہ کون ہیں؟ سفر میں اس کے ہمراہ ہوں، حضر میں اس کے ہمراہ ہوں لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کون ہیں؟ فرض کریں کہ آپ کے اپنے ہی مرجع تقلید ہوں اور اپنے اس عالمانہ لباس میں نہ ہوں، اگر عبا، قبا اور عمامہ کے بغیر کسی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہوں تو ہم انہیں نہیں پہچانیں گے چونکہ ہم نے انہیں جب بھی دیکھا ہے عبا، قبا اور عمامے میں دیکھا ہے لہٰذا ہم ان کے ساتھ جو رویہ اور سلوک اختیار کریں گے وہ معمولی سا ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ گستاخانہ ہو یا انہیں نظر انداز کریں گے، ان سے چشم پوشی کریں گے، ان کی طرف توجہ نہیں کریں گے اور اگر کوئی ہمیں متوجہ کردے کہ یہ کون ہیں؟ یہ وہ شخصیت ہیں کہ جس کے آپ مقلد ہیں، یہ وہ شخصیت ہیں کہ جس کے آپ پیروکار ہیں تو ناگہاں انسان اپنے آپ کو سمیٹ لیتا ہے یعنی فوری طور پر اور غیر ارادی طور پر سمٹ جاتا ہے، انسان کے عمل اور سلوک کے اوپر آگاہی اور معرفت کا اتنا اثر پڑتا ہے، توجہ نہ ہو تو انسان کا سلوک الگ طرح کا ہوتا ہے مگر توجہ ہوتے ہی انسان فوراً سمٹ جاتا ہے، اپنے آپ کو مؤدب بنا دیتا ہے، دوزانوں ہو جاتا ہے، پہلے چھپا رہا تھا، اب بولتا نہیں ہے، پہلے کسی انداز میں تھا اور سبک حرکتیں کرتا تھا لیکن اب بالکل سنگین ہوگیا ہے چونکہ اس بارگاہ کی طرف توجہ آئی ہے اور اس محضر کی طرف متوجہ ہوا ہے۔

پس یہ پہلا قدم اور پہلا ادب ہے کہ اسے اندازہ ہو کہ کس کی بارگاہ میں ہوں؟ کس کلام کی بارگاہ میں ہوں؟ کس حقیقت کی بارگاہ میں ہوں؟ عربیت سے اور الفاظ سے دھوکہ نہ کھا جائے کہ یہ فقط جملے ہیں اور میں مبتدا و خبر کی بارگاہ میں ہوں بلکہ انسان یہ نسبت درک کرے کہ میں کلامِ خدا اور

نورِ خدا کی بارگاہ میں ہوں، امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن ایک حقیقتِ زندہ ہے۔ یہ جامد، ساکت اور بے شعور عبارت نہیں ہے، قرآن ایک باشعور زندہ ہے،

ذٰلِکَ الْقُرْآنُ فَاسْتَنْطِقُوْهُ......(۱)

یعنی قرآن سے بات کرو، قرآن سے گفتگو کرو، فَاسْتَنْطِقُوْهُ یعنی اس کو گفتگو پر اُکساؤ، جب سوال کرو گے تو وہ جواب دے گا، بسا اوقات انسان بڑی جرأت کرتا ہے خصوصاً ہم مسلمان قرآن کا جو حشر کرتے ہیں یہ عظمتِ قرآن کا احساس نہ ہونے کا نتیجہ ہے، ہر بات پر استخارہ نکالتے ہیں، ہر بات پر قرآن دیکھنا کہ یہ خوب ہے، یہ بد ہے، یہ میانہ ہے، ہمیں یہ نہیں پتہ کہ کس کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہے ہیں؟ یہ کیا چیز ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے؟ کلامِ خدا کے ساتھ ہم کیا سلوک کر رہے ہیں؟ آیاتِ خدا کے ساتھ کیا رویہ اختیار کر رہے ہیں؟ ہمیں عظمت کا ادراک نہیں ہے اس لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ یہ کیا حقیقت ہے تو اس کے ساتھ ہمارا رویہ اور سلوک دوسری طرح کا ہوتا۔

اس مطلب کی وضاحت کیلئے اہلبیت علیہم السلام کے کئی واقعات ہیں کہ جو ہم سب نے سنے ہوئے ہیں کہ حضرت امام سجاد علیہ السلام کئی دفعہ حج پر گئے، ایک گمنام شخص کے طور پر گئے یعنی ایسے کاروان میں شامل ہو گئے کہ جو کہیں اور سے آیا تھا مثلاً شام یا دوسرے علاقوں سے، ان لوگوں نے امام علیہ السلام کا نام تو سنا ہوا تھا لیکن شخصاً اور چہرے سے نہیں جانتے تھے، راستے میں کاروان کے سارے لوگوں کے ساتھ جو رویہ و سلوک ہوتا ہے وہی ان کے ساتھ بھی کرتے تھے مثلاً کہیں کام کرواتے تھے، راستے میں

درکِ عظمتِ کلام

عام لوگوں کے ساتھ جو اندازِ تخاطب ہوتا ہے اسی طرح امام علیہ السلام سے مخاطب ہوتے تھے اور امام علیہ السلام بھی اسی لئے شامل ہوئے تھے کہ ان کے ساتھ کام کرتے رہیں، جہاں کچھ اٹھانا ہوتا تو اٹھاتے، کچھ پکانا ہوتا تو پکاتے، ان کو کھانا دیتے، کسی کی خدمت کرنا ہوتی تو کرتے، کسی جگہ جا کر ایسا اتفاق رونما ہوا کہ امام علیہ السلام کا کوئی آشنا مل گیا، اس نے ادب سے امام علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضری دی تو اسے دیکھ کر اہلِ کاروان متعجب ہوئے کہ یہ کون شخصیت ہے کہ جس کے سامنے یہ احترام اور اس طرح کا خشوع و خضوع انجام دے رہا ہے؟ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ امام زین العابدین علیہ السلام ہیں۔

آپ توجہ کریں کہ کئی دن پیدل سفر تھا، لوگ کئی دن تک امام علیہ السلام کے ساتھ رہے لیکن حجاب تھا، یہ نہیں معلوم تھا کہ کون شخصیت ہے لہٰذا جب نہیں معلوم تھا تو سلوک بھی الگ تھا، غیر محترمانہ سلوک تھا اور جوں ہی امام علیہ السلام کا اور امامت کی عظمت کا ادراک ہوا تو ناگہاں رویہ بدل گیا، اسی طرح اگر ہمیں عظمتِ قرآن کا اندازہ ہو جائے تو ناگہاں قرآن کے بارے میں آج سے ہی ہمارا رویہ تبدیل ہو جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اسے طرح کی عربی عبارت ہے کہ جس طرح سے دوسری عربی ہے، اس میں اخلاقی تذکرات ہیں، واقعات ہیں، اچھی اور بہترین کتاب ہے اور اس کے اندر کوئی ایسی غلط بات نہیں ہے، اگر بچوں کو پڑھائی جائے تو بچے خراب نہیں ہوں گے، بوڑھوں کو پڑھائیں گے کہ جب وہ چلے جائیں گے، حقیقتاً ہمیں عظمتِ قرآن کا ادراک نہیں ہے۔

۳)قرآن ذو مراتب حقیقت

صدر المتألھین ؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں جس مرحلہٗ قرآن سے سروکار ہے وہ مرحلہ تنزل یافتہ ہے، قرآن نازل ہوا ہے یعنی بصورتِ الفاظ، بصورتِ عبارات ہماری سطح تک اترا ہے اور ہمیں اسی مرتبے سے سروکار ہے، ہم اسی سے مانوس ہیں اور جب بھی ایسی حقیقت کہ جس کے کئی مرتبے ہوں، ذو مراتب حقیقت ہو یعنی اسی حقیقت کا ایک مرتبہ یہ ہے کہ اس کا ایک مرتبہ بالا ہے، عالی مرتبہ ہے اور ایک مرتبہ تنزیل یافتہ ہے۔

بہت سارے حقائق ایسے ہیں کہ جن کے کئی مراتب ہیں، ذو مراتب امور ہیں، ان ذو مراتب امور میں اگر ہمیں سب سے ادنیٰ مرتبے سے انس ہو اور اس سے بالاتر مراتب سے آگاہی نہ ہو اور ہم یہ سمجھتے ہوں کہ اس شے کی تمام حقیقت یہی ادنیٰ مرتبہ ہے، یہی مرتبہ کہ جس سے ہمیں سروکار ہے، مثلاً قرآن مجید لوحِ محفوظ میں ہے، قرآن مجید لوحِ محفوظ سے بھی پہلے صقعِ ربوبی میں ہے، صقعِ ربوبی یعنی ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ، جس کو مرتبہ الوہیت کہتے ہیں، یہ پہلا مرتبہٗ قرآن ہے یعنی مرتبہٗ ذات، وہاں سے قرآن نے تنزل پیدا کیا، ذات سے مرتبہٗ لوحِ محفوظ میں آیا، لوحِ محفوظ علمِ الٰہی کا ایک مرتبہ ہے، یہ دوسرا مرتبہٗ قرآن ہے، مرتبہٗ دیگرِ قرآن بصورتِ کتابِ مکنون ہے، ایک اور مرتبہٗ قرآن یہ ہے کہ اس کلامِ الٰہی نے وحی کی شکل اختیار کی اور پھر قرآن مرتبہٗ حضرتِ جبرئیل علیہ السلام میں آیا، مرتبہٗ دیگرِ قرآن وہ ہے کہ جو قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترا اور پھر ایک اور مرتبہٗ قرآن یہی ہے کہ جو آج ہمارے پاس ہے، عبارتوں کی شکل میں، الفاظ کی شکل میں اور ایک

کاغذ کے اوپر لکھی ہوئی تعبیر کی شکل میں ہے، یہ مرتبۂ عربی یا مرتبۂ لفظی قرآن ہے۔اتنے سارے مراتب قرآن ہیں۔لیکن قرآن کی حقیقت ایک ہے نہ کہ کئی قرآن ہیں، قرآن ایک ہی ہے لیکن اس کے کئی مراتب ہیں۔

اس مطلب کو سادہ سی مثال کے ساتھ واضح کرتے ہیں تاکہ ایک حقیقت کو ذومراتب کرنے کی حقیقت معلوم ہوجائے، فرض کریں کہ آپ کے ذہن میں ایک مطلب ہے اور یہی مطلب کہ جو آپ کے ذہن میں ہے اس کو آپ نے کمپیوٹر (Computer) پر لکھ بھی لیا ہے لہٰذا اب یہ مطلب کمپیوٹر پر بھی آگیا ہے، آپ کے ذہن میں بھی یہی بات ہے اور آپ کے ذہن میں ہوتے ہوئے کمپیوٹر پر یہی بات ہے، وہ بھی یہی بات ہے اور یہ بھی وہی بات ہے، دو چیزیں نہیں ہیں، حقیقت ایک ہے لیکن جگہیں دو ہیں یعنی ایک اس کا کمپیوٹر پر لفظی وجود ہے اور ایک اس کا آپ کے ذہن میں تصوری و علمی وجود ہے، جب آپ کمپیوٹر میں لکھتے ہیں تو آپ کے ذہن میں بات پھر بھی وہی رہتی ہے، یوں تو نہیں ہے کہ کمپیوٹر میں لکھنے سے ذہن میں حذف ہوگئی ہے یا فقط کمپیوٹر میں ہے، پس ایک ہی حقیقت دو مرتبوں میں ہے، اگر اسی حقیقت کو کسی اور جگہ پھیلائیں مثلاً اس کا پرنٹ (Print) بھی نکال لیں تو وہی حقیقت کسی اور مقام پر بھی منتقل ہوجائے گی، کسی اور مرتبے میں بھی موجود ہوگی۔

پس قرآن ایک حقیقتِ ذومراتب ہے، قرآن کے درجات ہیں، ہمارا سروکار اس کے سب سے آخری تنزل یافتہ درجے سے ہے یعنی عبارتی قرآن، عربی قرآن اور الفاظ والے قرآن سے

قرآن ذومراتب حقیقت

ہمارا تعلق ہے اور ہم یہ سمجھے کہ قرآن بس یہی ہے، چونکہ بالا مراتب سے ہمارا کوئی سروکار نہیں تھا اس لئے قرآن کو اس کے اندر منحصر سمجھتے ہیں کہ بس یہ عبارتیں ہی قرآن ہے۔ عربی عبارتیں قرآن کے علاوہ اور جگہ بھی فراواں موجود ہیں مثلاً احادیث بھی عربی عبارتیں ہیں، عربی اشعار بھی عربی عبارتیں ہیں، عربی دعائیں بھی عربی عبارتیں ہیں، عام بول چال بھی عربی عبارتیں ہیں، اگر عربی عبارتوں کو یکجا لکھ لیں تو کیا ساری عباراتِ عربی قرآن بن جائیں گی؟ یہ پہلا حجاب بنتا ہے یا باعث بنتا ہے کہ انسان یہ درک نہ کر سکے کہ اس کلام کی عظمت کیا ہے؟ چونکہ سب سے آخری تنزل یافتہ مرتبے سے ہمارا سروکار ہے، اس نازل شدہ مرتبے سے سروکار رہنا باعث بنتا ہے کہ ہم اس کی عظمت بھول جاتے ہیں کہ یہ کتنی عظیم حقیقت ہے کہ جو میرے سامنے بصورتِ کتاب موجود ہے۔

اس مطلب کو مزید واضح کرتے ہیں اور یہ مطلب حضرت استاد محمد تقی جعفریؒ نے نقل کیا ہے کہ جو کچھ عرصہ پہلے فوت ہوئے، ان کی کتاب شرحِ نہج البلاغہ اور شرحِ مثنوی بہت معروف ہے، یہ شناختہ شدہ اور بہت معروف شخصیت ہیں، آپؒ حکیم وفیلسوف تھے، یہ جب نجف میں پڑھتے تھے، آپؒ اپنے استاد کے بارے میں فرماتے تھے کہ جن کا نام طالقانیؒ تھا اور وہ دن میں کئی درس پڑھایا کرتے تھے۔ استاد جعفریؒ مرحوم فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے ہم ان کے پاس درس پڑھتے تھے اور وہ ہمیں اسفار یعنی فلسفے کی سب سے عالی کتاب کہ جو انہی صدر المتالھینؒ کی فلسفۂ حکمتِ مطالعہ کی سب سے بڑی اور عالی کتاب ہے پڑھاتے تھے پھر اس کے بعد کفایہ پڑھاتے تھے پھر اس کے بعد مختلف سطوحۂ عالیہ کے دروس پڑھاتے تھے اور آخری درس کے قریب صمدیہ پڑھاتے تھے، صمدیہ

ادبیات کی کتاب ہے، یعنی کلاسیں بدلتی رہتی تھی نہ کہ ان اسفار والوں کو صمدیہ پڑھاتے تھے یعنی پہلے فُضلا آتے تھے کہ جو اسفار پڑھتے تھے اور پھر وہ چلے جاتے تھے، اس کے بعد دوسرے آتے تھے تو ان کو کفایہ پڑھاتے تھے، اس کے بعد دوسرے طلاب آتے تھے تو یہ انہیں کتابِ مکاسب پڑھاتے تھے، اسی طرح ان کی آخری کلاس کتابِ صمدیہ پر تھی کہ جو ادبیات میں ابتدائی کتاب ہے، یہ کتاب پہلی یا دوسری نوبت میں پڑھی جاتی ہے۔

اب توجہ کریں کہ ایک ایسے بزرگوار کہ جو اسفار بھی اسی تسلط کے ساتھ پڑھاتے تھے کہ جس تسلط کے ساتھ صمدیہ پڑھاتے تھے یعنی ان کیلئے فرق نہیں تھا کہ صمدیہ پڑھانا آسان تھا اور اسفار پڑھانا دشوار تھا یعنی ایک جیسا تسلط تھا بلکہ کیا خبر کہ اسفار زیادہ بہتر طریقے سے پڑھاتے تھے، جیسے ہوتا ہے کہ عموماً زائرین دلچسپی لیتے ہیں اور بسا اوقات طلبہ کے قریب آکر بیٹھ جاتے ہیں، درس ہو رہا ہوتا ہے تو بیٹھ کر دیکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا پڑھ رہے ہیں؟ اگر چند زائرین آئیں اور انہیں صمدیہ پڑھاتے ہوئے دیکھیں اور پھر اس کے بعد چلے جائیں تو ان کے ذہنوں میں کیا آئے گا؟ یہی کہ یہ ادبیات کا بہت ہی ابتدائی اور معمولی استاد ہے چونکہ انہوں نے دوسری کلاسیں لیتے ہوئے تو نہیں دیکھا، فقط یہی دیکھا کہ یہ صمدیہ پڑھاتے ہیں لہٰذا جس نے فقط یہی دیکھا تو ان کے نزدیک ان کا فضل و علم روشن نہیں ہے اور وہ یہی سمجھیں گے کہ یہ ادبیات کا ایک ابتدائی استاد ہے چونکہ ادبیات کی بڑی کتابیں دوسرے فاضل تر افراد پڑھاتے ہیں اور یہ بہت ہی ابتدائی کتاب پڑھاتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک اس شخصیت کا تصور کیا پیدا ہوا؟ آیا کوئی عظمتِ علمی ذہن میں آتی ہے کہ جس شخصیت

کوصمدیہ پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے یا اس سے بھی چھوٹی کتاب الامثلہ پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے۔

اگران لوگوں کے سامنے آپ سے پوچھا جائے کہ اس حوزے میں سب سے بہترین استاد کون ہے؟ اور آپ کہیں کہ فلاں ہے اور انہوں نے دیکھا ہوا تھا کہ یہ تو صمدیہ یا امثلہ یعنی ادبیات کی پہلی کتاب پڑھا رہے ہوتے ہیں تو وہ لوگ کہ جو دینی مدارس کے بارے میں سرے سے آشنا نہیں ہیں وہ ہنسیں گے، مثلاً فرض کرلیں کہ کوئی پروفیسر (Professor) ہے جو یونیورسٹی میں بھی پڑھا رہا ہے، ڈائرکٹریٹ (Directorate) کی کلاس کو بھی پڑھاتا ہے مثلاً فلسفہ کا درس دیتا ہے پھر دوسروں کو فزکس، کیمسٹری، الجبرا پڑھاتا ہے اور پھر بہت اعلیٰ سطح کی کلاسوں کو بھی پڑھاتا ہے لیکن یہی پرفیسر بعد میں کسی فارغ وقت میں کسی چھوٹے سے بچے کو اردو کی پہلی کتاب بھی پڑھاتا ہے، اب کسی نے اس کو فقط اردو کی پہلی کتاب یا انگریزی کی اے بی سی پڑھاتے ہوئے دیکھا ہو اور وہ آپ سے پوچھے کہ ہمیں ایک اچھا استاد، اچھا پروفیسر، اچھا سکالر معرفی کریں اور بتائیں کہ کون ہے؟ اگر آپ اس کا نام لیں گے تو وہ ہنسے گا کہ یہ کیسے ہے؟ یہ تو اے بی سی پڑھاتا ہے، میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ کوئی اچھا فاضل، کوئی بزرگوار آدمی معرفی کریں اور آپ نے مجھے ایک ایسا بندہ دکھایا جو اے بی سی پڑھاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس نے یہی کلاس دیکھی ہے دوسری کلاسیں نہیں دیکھی ہیں لیکن جس نے اس کو پی ایچ ڈی کی کلاس کو فلسفہ پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے تو اس کے لئے اس شخصیت کی عظمت کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، کوئی تعجب خیز اور حیرت کی بات نہیں ہے۔

جس انسان نے اس کا وہ مرتبۂ بالا دیکھا ہوا ہے تو اس کے لئے درک کرنا آسان ہے لیکن

جس نے اسے فقط اے بی سی پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے اور الف ب پ پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے تو اس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اس کی عظمت کو درک کر سکے، چونکہ اس نے وہ مراحل اور وہ مراتبِ بالاتر مشاہدہ نہیں کیے ہیں، اگر کہا جائے کہ بہترین استادوں میں سے یہ ایک استاد ہے تو جنہیں نہیں معلوم یا جنہوں نے پہلی کتاب پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے وہ ہنسیں گے، کہیں گے اس میں کیا رکھا ہے، ہم تو ان کے پاس جاتے ہیں اور دیکھا ہے کہ اے بی سی پڑھا رہے ہوتے ہیں، یہ تو میں بھی پڑھا سکتا ہوں، اسی کو قرآن سمجھنے کے لئے مثال قرار دیں۔

قرآن مجید ایک حقیقتِ ذو مراتب ہے یعنی جس کا ایک مرتبہ صقعِ ربوبی، ایک مرتبہ لوحِ محفوظ اور ایک مرتبۂ لفظی ہے اور درمیان میں کئی اور مراتب بھی ہیں، قرآن کے کئی درجے ہیں، ان میں سے ہمارا سروکار فقط عربی اور لفظی قرآن سے ہے، لفظی قرآن کو دیکھ کر عظمتِ کلام کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ یہ کونسا کلام ہے جو میرے سامنے ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس لئے انسان متاثر بھی نہیں ہوتا ہے۔ جب ذکر کیا جاتا ہے کہ فلاں قرآن پڑھتا تھا تو یوں اثر ہوتا تھا تو انسان حیران ہوتا ہے کہ مجھ پر کیوں نہیں ہوتا ہے؟ میں نے بارہا قرآن دیکھا اور سنا ہے، مجھ پر کیوں ایسا اثر کیوں نہیں ہوتا؟

ایک حدیث کے مطابق حقیقتِ توحید کو سمجھنے کے لئے آئینہ کافی ہے۔ یہی آئینہ جو ہم روز مرہ دیکھتے ہیں، یہ حدیث کسی درس میں ذکر کی تو ایک بزرگوار درس میں شریک تھے، درس کے بعد وہ گئے اور انہوں نے آئینہ دیکھا پھر دوسرے روز واپس آئے اور کہا کہ کل آپ نے بحث میں یہ کہا تھا

کہ حقیقتِ توحید کو سمجھنے کے لئے آئینہ کافی ہے لیکن میں تو صبح تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا مجھے تو کوئی حقیقت سمجھ میں نہیں آئی، صرف اپنی داڑھی ہی نظر آئی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد حقیقتِ آئینہ ہے، انسان کس طرح آئینہ دیکھے؟ اور آئینے سے کیا مراد ہے؟ فوراً جا کر گھر میں جو آئینہ ہے وہ بھی جو واش روم میں ہے، عموماً آئینہ واش روم میں لٹکا ہوتا ہے، وہاں جا کر دیکھا تو ایک انسان کو کیا سمجھ میں آئے گا؟ کیا حقیقت سمجھ آئے گی؟ اسی طرح عظمتِ قرآن کو درک کرنے کے لئے ایک عام انسان جب عربی الفاظ دیکھتا ہے تو اس کی عظمت کو نہیں سمجھ سکتا۔ اکثر کو تو عربی آتی بھی نہیں ہے، اکثر مسلمان عربی سے بے بہرہ ہیں لہٰذا ایک عام آدمی یہی کہے گا کہ اس کے اندر عظمت کہاں ہے؟ ایک عربی شعر میں اور اس عربی عبارت میں کیا فرق ہے؟ ایک عربی حدیث میں اور عربی آیت میں کیا فرق ہے؟ کونسی چیز اس کو دوسری عربی عبارتوں سے ممتاز کرتی ہے؟ یہاں اس نکتے کی طرف توجہ کریں کہ یہ عربی قرآن لطفِ خدا ہے، جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا تھا کہ

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ......(۲)

ہم نے قرآن آسان کیا ہے، ہم نے اس کو آپ کے لئے قابلِ فہم بنایا ہے، ان مراتبِ بالا سے اس کو آپ کی دسترس میں قرار دیا ہے۔

٤) قرآن، ایک محجوب حقیقت

انسان جب تک کسی شے کے مقام و منزلت کو نہ سمجھتا ہو اور اس کی طرف متوجہ نہ ہو تو اس

شے کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا ہے اور اس سے فائدہ بھی نہیں لے سکتا ہے حتیٰ اس حقیقت کے مقابلے میں مناسب عمل بھی انجام نہیں دے سکتا ہے۔قرآن مجید کی مہجوریت کا ایک بڑا سبب یہی نکتہ ہے یعنی عظمتِ قرآن و عظمتِ کلامِ خدا ہمارے لئے روشن اور واضح نہیں ہے، چونکہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو عربی الفاظ اور عبارتوں کی شکل میں اپنے لطف وعنایتِ خاص کے ذریعے سے انسان کی سطحِ فہم تک اسکی ہدایت کے لئے نازل کیا ہے،اس تنزل یافتہ قرآن سے ہمارا سروکار ہے اور یہی باعث بنا ہے کہ اس تنزل کی بنا پر عظمتِ قرآن انسان سے مخفی و پنہاں رہ جائے،اس لئے کہ نزول کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو فراواں حجابوں میں لپیٹا ہے یعنی جس طرح نورِ شدید ہو،نورِ قوی ہو اور اس نورِ قوی کو عام انسان کی معمولی آنکھ کے لئے نازل کیا جائے یعنی قابلِ رویت بنایا جائے ،دیکھنے کے قابل بنایا جائے تو اس نور کو کئی پردوں کے اندر چھپانا پڑتا ہے۔

انسان اس حقیقت کی طرف متوجہ رہے کہ یہ کلامِ الٰہی جو اس وقت میرے سامنے ہے اس کے ماوراء اس کی حقیقت موجود ہے،قرآن مجید کو اس مرتبے پر اتارنے کے لئے،لفظی لباس پہنانے کے لئے،اس کے اوپر کئی حجاب ڈالنے پڑے تب جا کر قرآن نازل ہوا یعنی نازل ہونے سے مراد اب اترنا نہیں ہے،نازل ہونے سے مراد قابلِ فہم ہونا ہے،بہت سارے حجاب اس کے اوپر ڈالے گئے تب جا کر قرآن ہمارے لئے قابلِ فہم ہوا،ظاہر ہے کہ ایک حقیقتِ نورانی،ایک حقیقتِ عظیمہ پر جب حجاب ڈالے جائیں تو خوانخواہ کچھ چیز پنہاں ہوتی ہے،اس کی کچھ نورانیت چھپتی ہے،حجاب کا کام یہی ہے۔

مثلاً سورج جو منبعِ نور ہے اور نور بھی نورِ شدید ہے، اگر اس پر ہم نگاہ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے ہیں، تجربہ کر لیں، سورج پر نگاہ نہیں کر سکتے ہیں مگر یہ کہ بادلوں کے پیچھے ہو، آگے حجاب ہو اور مدھم سی روشنی بادلوں سے چھٹ چھٹ کے نکل رہی ہو اور ہم اس شعاع کی مدد سے اندازہ لگائیں، جیسا کہ عموماً غروب کے وقت افقِ غربی میں بادل ہوتے ہیں اور ان بادلوں کے پیچھے سورج کی سرخ رنگ کی ٹکیا ہوتی ہے تو پھر ہم اس شعاع کی مدد سے اس کو دیکھنے پر قادر ہیں، سورج کے سامنے اگر اتنے حجاب نہ ڈالے جائیں تو انسان نگاہ نہیں کر سکتا ہے، شدتِ نورانیت کی وجہ سے انسان ایک لحظے کے لئے بھی سورج پر نگاہ نہیں کر سکتا ہے لیکن سورج کو اگر قابلِ نگاہ بنایا جائے یعنی قابلِ دید بنا دیا جائے تا کہ ہم اپنی آنکھوں سے سورج کو دیکھ سکیں تو یا اس کو گرہن لگے کہ گرہن لگنا بھی ایک حجاب و پردہ ہے، سورج گرہن یعنی سورج اور زمین کے بیچ میں چاند آ جاتا ہے اور اس پردے کی وجہ سے سورج بجھ جاتا ہے، جیسے چاند گرہن میں سورج اور چاند کے درمیان زمین حائل ہو جاتی ہے، یہ پردہ آتا ہے۔

عموماً چاند گرہن کو بھی کہتے ہیں کہ اگر دیکھنا ہو تو ایکسرے (X-Ray) کے فوٹو سے چاند کو دیکھیں یعنی تاریک اور سیاہ پردہ لے کر اس کے پیچھے سے دیکھیں یا کالی عینک لگائیں، یہ ایک تجرباتی چیز ہے کہ انسانی آنکھ کی رسائی اور حدِ دید بہت کم اور کمزور ہے یعنی اس کے اندر فقط اتنی طاقت موجود ہے کہ ایک معین حد تک نور کو دیکھ سکتی ہے، اس سے آگے اگر نور بڑھ جائے تو آنکھوں کے لئے اور دید کے لئے نقصان دہ ہے، اسی طرح نورِ حقیقی بھی ہے، نورِ قرآن بھی ہے، نورِ الٰہی بھی ہے کہ قرآن کلامِ

خدا ہے، ذاتِ خدا نور ہے اور کلامِ خدا بھی نور ہے، یہ نور انسان کی فہم کی حد تک لانے کے لئے اسے نازل کرنا پڑا اور نزول کے لئے یہ اہتمام کیا گیا کہ اس کو بہت سارے حجابوں کے اندر لپیٹا گیا ہے، پھر ان پردوں کے اندر چھپا ہوا نور انسان کی حد تک آیا ہے تا کہ انسان کے لئے مضر نہ ہو اور انسان اس نورانیت کو برداشت وتحمل کر سکے۔

مثالِ دیگر یہ ہے کہ آپ نے لوگوں کو ویلڈنگ (Welding) کرتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ ایک شیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں جو بالکل سیاہ ہوتا ہے، اگر وہ شیشہ اٹھا کر دیکھیں، بعض لوگوں نے دیکھا بھی ہوگا، کچھ لوگوں کا تجربہ ہوگا کہ اس سے کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے، مطلقاً تاریک ہے، چونکہ جب مشین کے ذریعے سے برقی رو دوڑتی ہے تو شدید قسم کا نور پیدا ہوتا ہے، حرارت کی وجہ سے وہ نور اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس سے آنکھیں اندھی ہو سکتی ہیں اس لئے وہ کور (Cover) اور تاریک شیشہ رکھتے ہیں کہ اس تاریک شیشے سے ایک ہلکی مدہم سی روشنی ہمیں اس کے اس طرف نظر آتی ہے کہ جہاں پر جوڑ لگ رہا ہے، جہاں ویلڈنگ ہو رہی ہے یعنی نورِ شدید جہاں پر موجود ہو تو اس کو دیکھنے کیلئے، قابلِ دید بنانے کے لئے سامنے پردہ ڈالا جاتا ہے یا تو اس نور پر پردہ ڈالا جاتا ہے یا آنکھ کے سامنے پردہ حائل کیا جاتا ہے جیسے عینک ہے تا کہ ہم اس نورِ شدید کو دیکھ سکیں۔

اس لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کو بہت سارے پردوں میں لپیٹا ہے، ایک پردے میں لپیٹا تو دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام کے علاوہ کسی کو سمجھ میں نہیں آتا ہے، ایک پردے میں لپیٹا تو دیکھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی کو سمجھ میں نہیں آتا ہے، مزید پردوں میں لپیٹا تو دیکھا کہ

قرآن، ایک گوہرِ حقیقت

اولیاءِ خدا علیہم السلام کے علاوہ کسی کو سمجھ میں نہیں آتا ہے، معمولی لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتا ہے، اسی طرح پردوں پہ پردے ڈالتا رہا تا اینکہ اس کے اوپر آخری پردہ حجابِ الفاظ اور حجابِ عبارت کا ڈال دیا۔ اس عالمِ طبیعت میں، اس عالمِ مادہ میں قرآن کو اتار کر اس کے اوپر یہ پردہ طاری کیا گیا ہے، اب ہم اس پردے کے پیچھے سے قرآن کو دیکھیں نہ کہ پردے کو دیکھیں، سورج کو جب دیکھنا ہو تو ہم نگاہ پر پردے ڈالتے ہیں اس لئے کہ پردے کے پیچھے جو نورِ شدید موجود ہے وہ ہمارے لئے مضر ہے، ہماری آنکھیں اس نور کو تحمل نہیں کر سکتی ہیں، اسی طرح ہماری روح ہے، ہمارے قلوب اور نفوس ہیں کہ جو ہماری آنکھ سے کہیں زیادہ ضعیف تر اور نازک تر ہیں، یہ نور ان کو ایک لحظے میں جلا کر راکھ کر سکتا ہے۔

قرآن ہی میں ذکر ہے کہ خداوند تبارک تعالیٰ نے جب طور پر تجلی کی تو نہ پہاڑ تحمل کر سکا، نہ موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہی تحمل کر سکے اور نہ ہی موسیٰ علیہ السلام سے وہ نورِ عیاں تحمل ہو سکا، پہاڑ دکا دکا ہوا، موسیٰؑ مدہوش ہوئے اور معمولی لوگ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ تھے وہ اصلاً اس دنیا سے ہی گزر گئے، حالانکہ وہ نور بھی کاملاً بغیر حجاب کے نہیں تھا بلکہ بہت سارے حجابوں میں تھا لیکن یہی حجاب کہ جس میں کلامِ خدا پوشیدہ ہے وہ ان حجابوں میں نہیں تھا بلکہ ان سے تھوڑا واضح تر تھا، اس نور کی تجلی بیشتر تھی لہٰذا تحمل نہیں ہو سکا، لیکن انسان کے دل پر یا انسان کے فہم کے لئے یہ نور قابلِ تحمل اس وجہ سے ہے کہ بہت سارے پردوں میں ہے اور پردے جو سہولت کے لئے اور یسر کے لئے، آسانی کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام کے لئے ایجاد کئے ہیں یہی باعث بنے ہیں کہ عظمت ان پردوں

کے پیچھے پنہاں ومخفی رہ جائے تاکہ انسان کلام کی طرف رجوع کر سکے لیکن ہم عظمت کلام کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ حقیقتاً آنکھ کے سامنے پردے ہیں، فہم کے سامنے حجاب ہیں اور پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی فہم عظمت کو درک نہیں کرسکتی ہے، ظاہر ہے کہ جب مقام ومنزلت وعظمت کو درک نہ کرے اوراس کی حقیقت تک نہ پہنچے تو ممکن نہیں ہے کہ انسان قرآن سے اس طرح سے استفادہ کرسکے کہ جس طرح حقِ استفادہ ہے، جس طرح بارگاہِ قرآن میں حقِ حضور ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ لوگوں نے تقاضا کیا کہ

يَا مُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً..... (۳)

یعنی اے موسیٰ ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو اعلانیہ نہ دیکھ لیں......

ہم خدا کو جہرتاً اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ مشکل ہے، اس میں دو مشکلیں ہیں، ایک یہ ہے کہ خدا کی ذات وجودِ حسی نہیں ہے کہ آپ آنکھ سے دیکھ سکیں اوراس سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تمہارے آنکھ وہ نہیں ہیں کہ جو خدا کو دیکھ سکے، خدا آنکھ سے دیکھنے والی حقیقت نہیں ہے اور تمہاری آنکھ بھی خدا بین آنکھ نہیں ہے۔ تم یہ درخت دیکھو، ستارے دیکھو، کھانے دیکھو، چارہ دیکھو، سبزہ دیکھو، باغ اور بہار دیکھو یہ چیزیں تم دیکھ سکتے ہو، خدا بین آنکھ اور آنکھ ہے وہ تمہارے اندر موجود نہیں ہے۔ مولانا روم کا یہ شعر روزے ہی کی بھوک پر تطبیق ہوسکتا ہے نا کہ انسان کے دو منہ ہیں، ایک منہ یہی ہے کہ جس سے ہم بولتے ہیں، کھاتے ہیں، پکوڑے اور سموسے کھاتے ہیں اور جب تک یہ منہ کھلا رہتا ہے تو ایک اور منہ بھی ہے وہ اس وقت بند رہتا ہے،

این دہان بستی دہانی باز شد

کاو خورندۂ لقمہ ہائی راز شد...... (۴)

یہ منہ بند کردو تا کہ وہ دوسرا منہ کھلے، جب تک یہ منہ کھلا ہوا ہے وہ منہ نہیں کھلتا ہے، اسی طرح سے یہ آنکھ بند کرو کہ انسان کی ایک اور آنکھ کھلے یعنی چشمِ خدا، یہ آنکھ کہ جس سے ہم سب کچھ دیکھ سکتے ہیں اس سے تو خدا نہیں دکھتا ہے بلکہ وہ ایک دوسری آنکھ ہے، جیسے امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ فرمایا کہ مجھے اپنی طرح سمجھتے ہو؟ کہ تم نے سنا سنایا خدا دیکھا ہے، یعنی سنتے ہو کہ خدا ہے، سنا ہوا ہے،

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِیْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا...... (۵)

پروردگار ہم نے اس منادی کو سنا جو ایمان کی آواز لگا رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آو تو ہم ایمان لے آئے......

بلکہ مولائے متقیان علیہ السلام نے فرمایا کہ

لَمْ أَكُنْ أَعْبُدُ رَبًّا لَمْ أَرَهُ...... (۶)

میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی ہے جسے میں نے دیکھا نہ ہو......

مَا كُنْتُ لِأَعْبُدَ رَبًّا لَمْ أَرَهُ...... (۷)

یعنی میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا کہ جسے دیکھا نہ ہو، خدا کو دیکھا ہے لیکن اس ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا، حقیقتاً انسان کی دوسری آنکھ بھی ہے لیکن وہ عضو کے بغیر دیکھتی ہے اور اس کو

بصیرت کہتے ہیں، ان لوگوں نے تقاضا کیا کہ

لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً......

ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو اعلانیہ نہ دیکھ لیں......

خداوند نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ یہ تقاضا پورا نہیں ہوسکتا ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ایک ہی ماجرے میں یہ اتفاق رونما ہوا ہے، بعض نے ذکر کیا ہے کہ یہ دو الگ الگ ماجرے ہیں، ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ یہ اتفاق الگ الگ رونما ہوا یا ایک ہی واقعے میں یہ دونوں ماجرے ہوئے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداوند سے تقاضا کیا کہ اے پروردگار مجھے مہلت دے تاکہ میں تجھے دیکھ سکوں تو خداوند نے فرمایا کہ

لَنْ تَرَانِیْ......(۸)

تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے ہو......

پھر دوسری دفعہ جب ان لوگوں نے تقاضا کیا کہ

أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً......(۹)

ہمیں اللہ کو علی الاعلان دکھلا دیجئے......

اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ تقاضا بارگاہِ خدا تک پہنچایا تو خدا نے فرمایا کہ آپ پہاڑ پر نگاہ کرو، اس پر خدا کی تجلی ہوگی، اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر باقی رہا تو آپ بھی خدا کو دیکھ سکو گے اور اگر یہ پہاڑ باقی نہ رہا تو آپ کے لئے خدا کو دیکھنا ناممکن ہے، مقصود یہ بتانا تھا کہ جب تجلیٔ خدا ہوگی، جلوۂ خدا

ہوگا، ظہورِ خدا ہوگا اور نورِ خدا تمہارے سامنے آئے گا تو تمہارے وجود کے اندر اتنی استعداد نہیں ہے کہ اس نور کو تحمل و برداشت کر سکو، پہاڑ کو دیکھو کہ یہ استعداد پہاڑ میں بھی نہیں ہے، باوجود اس پر شکوہ عظمت واستقامت کے بھی پہاڑ کے اندر یہ صلاحیت وطاقت نہیں ہے کہ جلوۂ خدا کو تحمل کر سکے اور پھر قرآن نے بھی فرمایا کہ اگر یہ قرآن ہم پہاڑ پر نازل کرتے،

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ......
(۱۰)

ہم اگر اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ پہاڑ خوفِ خدا سے لرزاں اور ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہے......

اور یہی اتفاق رونما ہوا کہ جب خداوند تبارک وتعالیٰ نے تجلی ڈالی،

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا......(۱۱)

اس کے بعد جب پہاڑ پر پروردگار کی تجلی ہوئی تو پہاڑ چور چور ہوگیا......

تحمل نہیں کر سکا، البتہ موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے بہتر نکلے،

وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا......

اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے......

کیونکہ موسیٰ علیہ السلام دکا دکا نہیں ہوئے، موسیٰ علیہ السلام ریزہ ریزہ نہیں ہوئے لیکن مدہوش ہوگئے، یعنی اتنی نورانیت موسیٰ علیہ السلام میں بھی نہیں تھی، لیکن پہاڑ میں تو سرے سے نہیں تھی، پہاڑ بالکل ریزہ

قرآن ایک گوہرِ حقیقت

ریزہ ہوگیا چونکہ موسیٰ علیہ السلام ایک تو انسان ہیں اور پھر انسان کامل ہیں، پہاڑ انسان نہیں ہے چہ جائیکہ انسانِ کامل ہو۔ لہٰذا اگر اس نور کو دیکھنا ہی ہے اور اس نور تک پہنچنا ہی ہے تو آپ ان حجابوں سے متاثر ہو کر یہ نہ کہو کہ وہ تمام حقیقت یہی ہے کہ جو حجابوں میں لپٹی ہوئی ہے، جس طرح سے ایکسرے فوٹو کے ذریعے سے آپ سورج دیکھ رہے ہیں اور اس فوٹو کے پیچھے ایک مدہم سی روشنی، ایک مدہم سی روشن سرخ رنگ کی ٹکیا نظر آتی ہے تو یہ نہ سمجھنا کہ تمام حقیقتِ سورج یہی ہے۔ بیچ میں پردہ ہے اور اس پردے نے تمہاری آنکھ کو سلامت رکھا ہوا ہے یعنی یہ حجاب تمہاری آنکھ کی سلامتی کا ضامن ہے، اگر یہ حجاب ہٹ جائے اور وہ نور تمہاری آنکھ میں آپڑے تو،

جَعَلَهُ دَكًّا......

نظر ختم ہو جائے گی، آنکھ ریزہ ریزہ ہو جائے گی، پس خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام کو یعنی اپنے نور کو کئی پردوں میں لپیٹا، کلامِ خدا نورِ خدا ہے، اس حقیقت کو ان پردوں میں لپیٹ کر ہم تک پہنچایا اور اسی وجہ سے ہم اس کو تحمل کر سکتے ہیں لیکن یہ پردے باعث نہ بنیں کہ ہم فقط اس کو عربی عبارت سمجھیں کہ یہ عربی جملے ہیں اور عربی جملوں کے عنوان سے اس کی مبتدا و خبر تلاش کریں، اس کے مثلاً تمیز و حال تلاش کریں اور اس کا فاعل و قضایا ادوات گننے بیٹھ جائیں یعنی اس میں کتنی دفعہ الف استعمال ہوا ہے، کتنی دفعہ ب استعمال ہوا، کتنی دفعہ ش استعمال ہوا، کتنی بار ج استعمال ہوا۔ اگر ہم فقط قرآن کی ضمیروں اور الفاظ کی حد تک رہے تو گویا ہم فقط حجاب میں ہیں، یہ حجاب اس لئے تھا تا کہ تمہارے نفوس چندھیا نہ جائیں، دکاً دکاً نہ ہو جائیں اور اگر حقیقتِ قرآن روشن تجلی کرتی کہ جس طرح

پہاڑ پر تجلی ہوئی تھی تو پہاڑ کی طرح تمہارے نفوس بھی اپنی جگہ پر باقی نہیں رہتے۔

٥) قرآن رات میں نازل ہونے کی وجہ

اس حقیقت کو قرآن نے مختلف اشاروں سے بیان کیا ہے مثلاً

اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝ (۱۲)

ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔

یا

اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ...... (۱۳)

ہم نے اس قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے......

ہم نے اس قرآن کو رمضان میں نازل کیا اور رمضان میں بھی لیلۃ القدر میں نازل کیا، لیل میں کیوں نازل کیا؟ نہار میں کیوں نازل نہیں کیا؟ دن کا وقت تو بہتر ہے، آیا اس وجہ سے دن میں نازل نہیں کیا کہ دن میں رش ہوتا ہے، لوگ آجا رہے ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ جبرئیل علیہ السلام معاذ اللہ خطا کر جائے کہ قرآن کس کو دوں؟ جیسے عموماً وہ ذاکرین پڑھتے ہیں کہ وحی لے کر آئے اور آ کر کہا کہ یہ کس کو دوں؟ یہ تو سارے محمدؐ ہیں۔ یہ اس لئے نہیں تھا کہ رات کو ساری پبلک (Public) سوئی ہوئی ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنہا جاگ رہے ہیں تا کہ رات کو اشتباہ نہ ہو جائے یا اس وجہ سے کہ کوئی چھین نہ لے مثلاً ابولہب اور ابوجہل حضرتِ جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر ان سے قرآن کو چھین نہ لیں اور یہ کہیں کہ یہ تو

ہم پر اترا ہے، رات کو اترنا خفیہ ہونے کی وجہ سے یا اس وجہ سے نہیں تھا۔ یہ رات وہ رات نہیں ہے کہ

جو سورج غروب ہونے کے نتیجے میں ہوتی ہے، یہ لیلۃ المبارکہ جو

خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ (۱۴)

ہے۔ لیلۃ سے مراد پردہ یعنی حجاب ہے، یہ دن کو نہیں اتر سکتا تھا، دن کو تو

جَعَلَهُ دَكًّا......

پھر اس کو تحمل کون کرتا؟ ہم دن کو بھی اتار سکتے تھے، دن کو اتارنا یعنی بغیر پردے کے اتارنا، روشنی میں اتارنا یعنی بغیر حجاب کے اتارنا، لہٰذا ہم نے اس قرآن کو رات میں اتارا ہے یعنی پردے کے اندر لپیٹ کر اتارا ہے، چونکہ آپ اسے رات کو ہی تحمل کر سکتے ہو، دن کو تحمل نہیں کر سکتے۔

مولانا روم نے مثنوی میں بہت خوبصورت واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے مویشی پالے ہوئے تھے، گائے، بھینس، بھیڑ، بکریاں وغیرہ، ایک دفعہ رات کی تاریکی میں اس کو اپنے ریوڑ کے اندر کوئی ہلچل محسوس ہوئی گویا کسی حیوان کی رسی کھل گئی ہے اور وہ آزاد ہو گیا ہے، یہ نیند میں اٹھا اور دیکھا کہ ایک جانور پھر رہا ہے، اس نے اس کے گلے میں دوبارہ رسی باندھ کر پھر درخت سے باندھ دیا اور پھر اسکی پیٹھ پر اس نے ہاتھ پھیرا اور اسے اپنی زبان میں حدیثِ نفس کے طور پر کہا کہ یہ رات ہے اور اس طرح سے تیرا آزاد ہونا مناسب نہیں ہے، بہر کیف اسے باندھ کے جب جانے لگا تو معلوم ہوا کہ وہ بھوکا شیر تھا کہ جو جانور کھانے آیا تھا، رات کی تاریکی میں یہ شیر کے اوپر ہاتھ پھیر رہا تھا، اس کو گائے کا بچہ سمجھ رہا تھا، یہ اپنے ساتھ حدیثِ نفس کر رہا ہے یعنی اپنے دل میں اپنے آپ

سے مخاطب تھا کہ تو میرا بہت ہی قیمتی جانور ہے، تیرا رات کو اس طرح کھل جانا مناسب نہیں ہے، یہاں درندے ہیں، بھیڑیئے ہیں اور تو کسی کا شکار ہو سکتا ہے، تجھے یہاں سے دور نہیں ہونا چاہئے اور شیر اپنے ساتھ ہم کلام ہے اور کہتا ہے کہ تو رات کا شکر یہ ادا کر کہ جو میرے قریب کھڑا ہے اور میرے اوپر ہاتھ پھیر رہا ہے، اگر دن ہوتا اور تو میرے قریب آتا اور میری پشت پہ ہاتھ لگاتا تو پھر میں دیکھتا کہ تو کتنا بڑا امرد ہے؟ یعنی تو رات کا شکر گزار ہو کہ اس رات کے پردے نے تجھے شیر جیسی حقیقت کے قریب کر دیا ہے اور شیر کے اوپر ہاتھ پھیرنے کے قابل بنا دیا، تجھے اتنا شجاع اور دلیر بنا دیا ہے، یہ سب کچھ رات کی وجہ سے ہوا ہے، اگر دن ہوتا تو شیر کے نام سے تیرے اندر وحشت و دہشت طاری ہوتی، تیری روح نکل جاتی چونکہ شیر کے اندر بھی ایک عظمت ہے، انسان کے اوپر شیر کی ایک دہشت ہے، اگر چہ وہ درندگی اور جان کے خوف سے ہے۔

انسان رات کا شکر گزار ہو کہ رات ہمارے لئے بہت ساری عظمتیں معتدل کر دیتی ہے، راتوں نے ہمارے لئے بہت سارے امور سہل کر دیئے ہیں۔ از جملہ یہ نورِ قرآن رات میں نازل ہوا ہے یعنی پردے میں نازل ہوا ہے، اس وجہ سے ہم اس کو ہاتھ بھی لگاتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں، وَالاَّ اگر دن ہوتا اور یہ قرآن ہوتا، طور ہوتا اور موسیٰ علیہ السلام ہوتا اور فقط ایک آیت بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ تجلی کرتی یعنی اگر یہ بسم اللہ رات کے پردے میں لپٹی ہوئی نہ ہوتی تو بسم اللہ سے طور بھی جل جاتا، موسیٰ علیہ السلام بھی بے ہوش ہوتے اور موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہی بھی جل جاتے، مسجد بھی جل جاتی، قاری بھی جل جاتا اور سننے والے بھی جل جاتے، پس انسان اس حقیقت کو دیکھے کہ میں کس کی بارگاہ میں

قرآن رات میں نازل ہونے کی وجہ

ہوں؟ کس کے کلام کے حضور میں ہوں؟ کس کے محضر میں ہوں؟ یعنی انسان اس کی عظمت کی طرف متوجہ ہو، جب اس ذہنیت کے ساتھ قرآن کی خدمت میں جائے تو فہمِ قرآن کے قابل ہوسکتا ہے۔

٦)احترام بمناسبت عظمتِ مقام

ہم اگر اپنے روزمرہ امور میں، معاملات میں اور آمدورفت میں غور وفکر اور دقت کریں کہ جن مقامات کی عظمت کا ہمیں احساس ہوتا ہے وہاں ہم کسی اور طرح سے حاضر ہوتے ہیں اور جن مقامات میں وہ عظمت نہ ہو یا عظمت ہو لیکن ہمیں علم نہ ہو تو وہاں پر ہماری آمدورفت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔

مثلاً ہم دکان پر بھی جاتے ہیں لیکن وہاں پر کوئی آداب نہیں بجالاتے لیکن جب حرم میں جاتے ہیں تو وہاں ایک اور انداز سے داخل ہوتے ہیں، ایک اور انداز سے حرکت کرتے ہیں مثلاً وہاں وضو کر کے جاتے ہیں، باطہارت جاتے ہیں، توجہ کے ساتھ جاتے ہیں، وہاں سُبک حرکات انجام نہیں دیتے ہیں، کیوں انجام نہیں دیتے ہیں؟ حالانکہ حرم بھی ایک مکان ہے، زمین ہے اور دکان بھی ایک مکان ہے اور زمین ہے، اس وجہ سے کہ حرم کے اندر، مسجد کے اندر یا کعبہ کے اندر جب ہم داخل ہوتے ہیں تو ہمیں اس مقام کی عظمت کا علم ہوتا ہے لہٰذا متوجہ ہوتے ہیں کہ یہ ایک مقامِ عظیم ہے اگرچہ یہ بھی اینٹیں اور پتھر ہیں، کعبہ بھی پتھر ہے، مسجد بھی اینٹیں اور پتھر ہیں لیکن یہ اینٹیں اور پتھر حجاب ہیں اور ان حجابوں کے پیچھے ایک عظمت موجود ہے، ان پتھروں کے پس منظر میں ایک حقیقت

کارفرما ہے، درحقیقت وہ عظمت انسان پر اثرانداز ہوتی ہے لہٰذا انسان خضوع وخشوع کرتا ہے، ان عظیم مقامات پر پتھروں کے لئے خضوع وخشوع نہیں کرتا ہے چونکہ پتھروں کے اندر کوئی عظمت نہیں ہے، پتھر حجاب ہیں۔ان حجابوں کے پیچھے ایک عظمت کارفرما ہے لہٰذا جسے علم وآگاہی نہ ہو، جو مسلمان ومومن نہ ہو، اس کے لئے یہ فقط تعمیرات کا نمونہ ہیں لہٰذا وہ خضوع نہیں کرتا ہے، وہاں اس کے اندر تعظیم کی حالت ایجاد نہیں ہوتی ہے، اس مقام کی تکریم نہیں کرتا ہے، وہ وہاں ایسے ہی داخل ہوتا ہے کہ جیسے ایک دکان میں داخل ہوتے ہیں یا جیسے آثارِ قدیمہ کی کسی خاص عمارت داخل ہوتے ہیں اور فقط معمار کی نگاہ کرتا ہے۔

مثلاً حرم کے اندر جائیں تو ٹائلیں اور یہی خوبصورت نقش ونگار انسان کو متاثر نہیں کرتے ہیں، عظمتِ حرم ان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ خالی بھی ہو، سادہ بھی ہو تو اس کے باوجود بھی عظمت ہے جیسے کعبہ ہے، سادہ ترین حرم خانۂ کعبہ ہے، کوئی زینت نہیں ہے، بالکل معمولی پتھروں سے بنا ہوا ہے لیکن انسان جتنا خضوع کعبہ کے سامنے کرتا ہے اتنا خضوع ان ٹائلوں کے سامنے نہیں کرتا ہے، اتنا خضوع اس نقش ونگار کے سامنے نہیں کرتا ہے چونکہ ان پتھروں کے پیچھے جو حقیقت کارفرما ہے عظمت درحقیقت اس کے اندر ہے اور انسان متوجہ ہے کہ یہ کعبہ کیا ہے؟ کس چیز کی علامت ونشانی ہے؟ یا جیسے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرم میں جاتا ہے، کربلا جاتا ہے یا دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کی بارگاہ میں مشرف ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میں جن کے سامنے خضوع کر رہا ہوں وہ یہ ضریح نہیں ہے یا چاندی، سونا، لکڑی اور پتھر نہیں ہیں بلکہ درحقیقت یہ ایک ولیٔ خدا کا، ایک خلیفۂ خدا کا، ایک انسانِ

اجتماعی اقدار کا مرکز

احترام مکان بسبب عظمتِ مقام

کامل کا اور ایک معصوم کا مدفن ہے اور عظمت اس وجود کے اندر اور اس نام کے اندر ہے کہ جس کے نام سے یہ سب کچھ منسوب ہے لہٰذا انسان کے دل میں ایک حالتِ دیگر طاری ہو جاتی ہے۔

پس ہم اپنے معمولات میں غور کریں تو بخوبی ہم اس حالت کو محسوس کرتے ہیں کہ جہاں پر ہمیں مکان کی عظمت کا علم ہو تو وہاں پر ہماری حالت کچھ اور ہوتی ہے لیکن جس مکان میں جائیں اور اس مکان کی عظمت کا علم نہ ہو یا اس میں عظمت ہی نہ ہو تو وہاں ہماری حالت کچھ اور ہوتی ہے، خیابان میں ہم بالکل معمول کے مطابق آتے ہیں، ہم اچھی اچھی خوبصورت جگہوں پر بھی جاتے ہیں لیکن وہ احساس جو دل میں حرم کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ ہرگز بڑے بڑے شاندار محلوں میں پیدا نہیں ہوتا ہے، ممکن ہے کہ بہت بڑی باشکوہ عالیشان عمارتیں ہوں، مثلاً آپ تاج محل میں جائیں، تاج محل دنیا میں بنا ہوا ایک شاہکار ہے اور انسانی ہاتھ کا بنا ہوا ہے لیکن انسان کے دل میں وہ احترام و خضوع پیدا نہیں ہوتا ہے کہ جو کعبہ میں ہوتا ہے۔

کعبہ اور تاج محل کو اگر فنِ تعمیر کے لحاظ سے دیکھیں تو قابلِ قیاس نہیں ہیں، تاج محل شاہکار ہے اور کعبہ سادہ سی ایک بلڈنگ ہے لیکن انسان کے اندر جتنا خضوع کعبہ میں پیدا ہوتا ہے وہ تاج محل میں پیدا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اصلاً سرے سے تاج محل میں پیدا ہی نہیں ہوتا، کیوں پیدا نہیں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ تاج محل فقط ایک عمارت ہے، اس کے پیچھے کوئی عظمت کارفرما نہیں ہے، اگر ہے بھی تو بقول ایک ادیب اور اردو شاعر کے کہ ایک شہوت کارفرما ہے، ایک سلطان کی ثروت کارفرما ہے، مثلاً ایک دولت مند کی دولت کارفرما ہے لہٰذا اس کے پیچھے عظمت نہیں ہے درحالیکہ کعبہ کے پیچھے

عظمت متجلی ہے کہ جو انسان کو معلوم ہے لہٰذا اس وجہ سے انسان کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے اور بدل جاتی ہے۔

یہی حال قرآن کا بھی ہے، قرآن اگرچہ عربی عبارت ہے، دیگر عربی عبارتوں کی طرح یہ بھی ایک عبارت ہے لیکن اگر انسان کو معلوم ہو کہ اس عبارت کے پیچھے کیا عظمت کارفرما ہے یا یہ عبارت ایک حجاب ہے اور ہماری سہولت کے لئے بنائی گئی ہے تا کہ ہم نورِ قرآن کو تحمل کر سکیں، نورِ قرآن کو برداشت کر سکیں ورنہ اگر یہ عبارت نہ ہوتی، یہ الفاظ نہ ہوتے تو جس طرح سے تجلیٔ خدا نے طور کو جلا دیا تھا اور جس طرح تجلیٔ خدا نے اس کو دکا دکّا کر دیا تھا، اسی طرح سے یہ بھی تجلیٔ خدا ہے لیکن حجابوں میں ہے ورنہ خود قرآن مجید کے بقول اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ خشیتِ الٰہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتا، چونکہ قرآن کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ یہ کلامِ خدا ہے لیکن اس نے نزول کیا ہے، تنزل کیا ہے اور ان حجابوں کے اندر چھپا کر ہم تک پہنچایا گیا ہے، یہ حجاب باعث بنے کہ ہم اس کی عظمت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اس کو فقط ایک لفظی عبارت سمجھ کر گزر جاتے ہیں یا حفظ بھی کر لیں، پڑھ بھی لیں تو بہت سادگی سے گزر جاتے ہیں اور وہ حیثیت و کیفیت طاری نہیں ہوتی ہے۔

روایت میں ہے کہ جب حضرت امام رضا علیہ السلام کو جب خراسان لایا گیا، مدینہ سے طوس لایا گیا تو راستے میں امام علیہ السلام نے کثرت سے جو عمل انجام دیا وہ تلاوتِ قرآن تھی، کثرت سے یہ کام کیا حالانکہ دوسری عبادتیں بھی امام علیہ السلام نے انجام دیں، راستے میں گفتگو بھی کی، احادیث بھی بیان

فرمائیں اور کئی تاریخی واقعات اس سفر کے اندر رونما ہوئے لیکن کثرت سے اس سفر کے دوران جو عمل اس مہمل میں بیٹھے ہوئے، اس سواری پر امام علیہ السلام نے انجام دیا وہ تلاوتِ قرآن تھی اور وہ بھی کس طرح کی تلاوتِ قرآن؟ کئی مقامات پر نقل کیا گیا ہے کہ ان مقامات میں امام علیہ السلام کی تلاوتِ قرآن کے وقت کیا کیفیت تھی؟ جس طرح سے ایک انسان بہت عظیم بارگاہ کے اندر موجود ہو اور حضرت علیہ السلام کے وجود پر کپکپی طاری تھی، لرزہ طاری تھا اور بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں گریہ وبکا طاری تھا اور ہر آیت کے پڑھنے سے حضرت علیہ السلام کے چہرے کے اثرات اور آثار بدل جاتے تھے یعنی اسی آیت کے مضمون کے مطابق تاثیر حاصل ہوتی تھی، قرآن پڑھتے ہوئے امام علیہ السلام کی یہ حالت کیوں تھی؟ درحالیکہ ہم بھی یہ قرآن پڑھتے ہیں لیکن ہم پر یہ حالت طاری نہیں ہوتی، اس لئے کہ امام علیہ السلام کو توجہ تھی کہ میں کس کے کلام کی بارگاہ میں ہوں یعنی کس بارگاہ میں ہوں، قرآن کلامِ خدا ہے، کلامِ خدا فعلِ خدا ہے، فعلِ خدا صفاتِ خدا سے متجلی ہوا ہے۔

۷) اللہ اپنے کلام میں متجلی ھے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ خود قرآن میں متجلی ہیں، عظمت قرآن عظمتِ متکلم سے ہے،

لَقَدْ تَجَلّٰی اللّٰہُ لِخَلْقِهٖ بِكَلَامِهٖ......(۱۵)

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے خدا نے تجلی کی اسی طرح خدا نے مخلوق کے لئے

قرآن میں تجلی کی ہے لیکن کس طرح سے تجلی کی ہے؟ فرمایا کہ

وَلٰكِنَّهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ......

لیکن عوام یا عام انسان اس تجلی کو درک نہیں کر پاتے،

وَاللّٰهِ لَقَدْ تَجَلّٰى اللّٰهُ لِخَلْقِهٖ فِىْ كَلَامِهٖ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ......(۱۶)

بے شک اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں اپنی مخلوق کے لئے ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ دیکھتے نہیں ہیں ......یعنی ان کے اندر بصیرت نہیں ہے کہ اس تجلی کو دیکھ سکیں یا امیر المومنین علیہ السلام سے نہج البلاغہ میں خطبہ ۱۴۷ میں یہ موجود ہے کہ

فَتَجَلّٰى لَهُمْ سُبْحَانَهٗ فِىْ كِتَابِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّكُوْنُوْا رَاَوْهُ......(۱۷)

ان کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ظاہر ہوتا ہے، اس کے بغیر کہ وہ اسے ظاہری آنکھوں سے دیکھیں......

لیکن دیکھ سکتے ہیں جیسے نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام کے کلام سے بھی استفادہ ہوتا ہے کہ خدا کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن نہ کہ بصر سے بلکہ بصیرتِ ایمانی سے دیکھا جا سکتا ہے، یہ امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں صراحت سے بیان فرمایا کہ

لَمْ اَكُنْ اَعْبُدُ رَبًّا لَمْ اَرَهٗ......(۱۸)

میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی ہے جسے میں نے دیکھا نہ ہو......

پس ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ قابلِ رویت ہے، خدا کی ذات قابلِ وجدان ہے، انسان

کو خدا نے قوتیں عطا کی ہیں، انسان فہم اور درک و بصارت کی قوتوں سے خدا کو پا سکتا ہے، درک کر سکتا ہے لیکن کلامِ خدا میں، فعلِ خدا میں خدا کی ذات متجلی ہے۔ اسی طرح دوسری عبادتیں بھی ہیں اگر انسان بارگاہِ خدا کی عظمت کی طرف متوجہ ہو تو اس کا انداز بدل جاتا ہے، روایت میں معصومین علیہم السلام کی نمازیں منقول ہیں کہ مختلف ائمہؑ کی نماز میں کیا حالت ہوتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں معلوم تھا کہ ہم کس کی بارگاہ میں ہیں، عظمتِ خدا کی طرف توجہ تھی چونکہ انسان کے اندر درکِ عظمتِ خدا کے بعد خشوع پیدا ہوتا ہے، جب انسان عظمت کا احساس کرتا ہے تو تب اس کے بعد جھکتا ہے، انسان کے اندر یہ فطری عمل ہے کہ ہر کمال کے سامنے خضوع کرتا ہے، یہ انسان کے بس میں نہیں ہے، کیسا بھی انسان ہو اگر کسی جگہ کمال نظر آئے تو انسان اس کے سامنے ناخواستہ جھک جاتا ہے۔ چاہے وہ کمال عالمِ مادہ اور طبیعت میں نظر آئے، عالمِ معنیٰ میں نظر آئے، انسانی دنیا میں نظر آئے، طبعی دنیا میں نظر آئے، جہاں بھی نظر آئے، انسان کی زبان سے کمال کی نسبت سے بے ساختہ تکریم و ثنا ادا ہوتی ہے۔

۸) معرفت اور اجارے کی نماز میں فرق

جب انسان عظمتِ خدا کے سامنے واقع ہوتا ہے تو وہاں پر اس کی زبان سے بے ساختہ حمد و ثنا، کلماتِ تعریف اور کلماتِ عبیدانہ جاری ہوتے ہیں، اسی کو نماز کہتے ہیں۔ نمازِ حقیقی وہی ہے کہ جو انسان کی معرفت کا نتیجہ ہو نہ کہ انسان کی عادت کا نتیجہ ہو، چونکہ کہا گیا ہے کہ یہ کام کرنے سے انسان

جنت جاتا ہے لہٰذا یہ کام کر کے آرزو معاوضے میں پنہاں ہوتی ہے مثلاً اُجرت پہ نماز پڑھنا۔

فقہ میں ایک بحث اجارے کی نماز کے متعلق ہے۔ اگر ایک شخص اپنی زندگی میں نمازیں نہیں پڑھتا تھا اور وہ مر گیا تو اسکے ورثاء اس کے مادی اور معنوی حقوق ادا کریں، ان حقوق میں سے یہ ہے کہ اس کے واجبات ادا کریں، اس کی ترک شدہ یا قضا شدہ نمازیں ادا کروائیں اور یہ ہوتا بھی ہے عموماً اہل علم کو یا متدیّنین کو مُردوں کی نمازوں کے لئے اجیر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک مولانا کو کسی مُردے کی نمازیں اجارے پہ دی گئیں، مردے کے وارث کے ساتھ قرارداد باندھی گئی لیکن انہوں نے آکر قرارداد کو پھاڑ کر پھینک دیا، جو شخص ضامن بنا تھا اس نے کہا کہ یہ تو آپ کی ذمہ داری ہے، آپ کو پڑھنا چاہیئے تو انہوں نے کہا کہ اتنا ہی نیک ہوتا تو پڑھ کر مرتا، میرے لئے کیوں چھوڑ کر گیا ہے کہ میں آؤں اور پیسوں کے لئے اس کی نمازیں پڑھوں؟ غرض یہ ہے کہ اجارے کی نمازیں رائج چیز ہے، اس سے کیا ملے گا؟ اجیر کو کیا ملے گا؟ اور جس کی نمازیں ہیں اس کو کیا ملے گا؟ اجارے کی نمازیں کو خدا ہی جانتا ہے چونکہ بعض تو شک بھی کرتے ہیں اور اس کے اجزاء میں تردید بھی کرتے ہیں کہ آیا اجارے کی نمازیں درست بھی ہیں یا نہیں ہیں؟ البتہ فتویٰ کہ حد تک مشہور یہ ہے کہ پڑھ سکتے ہیں یعنی حق ادا ہو جاتا ہے لیکن یہ تو قیامت میں جا کر پتہ چلے گا اور مشخص ہو جائے گا کہ اجارے کی نمازوں کا مستاجر کو کیا ملا؟ اور اس مُردے کو کیا ملا؟ اب مردے کو کچھ ملے یا نہ ملے بہر کیف اس بچارے کو تو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ بعض کام آبدار ہوتے ہیں اور بعض کام نا ندار ہوتے ہیں یعنی بعض کام ایسے

معرفت اور اجارے کی نماز میں فرق

ہیں کہ جن میں پانی ہوتا ہے اور بعض میں نان ہوتا ہے اور یہ شاہ عباس کے زمانے سے کہاوت بھی بنی ہے، صفوی بادشاہ کو وزیروں نے مشورہ دیا کہ ملک کی آبادی کے لئے نہریں کھدوائی جائیں، ایران میں چونکہ نہری نظام نہیں ہے لہٰذا دریا بھی کم ہیں بارانی پانی کے لئے وہاں کنویں کھودے گئے تھے، جن کو قناتیں یا کاریز کہتے ہیں یعنی زیرِ زمین نہریں بنانا، مختلف علاقوں میں نہریں کھودنا شروع کردی گئیں، کسی صحرا کے اندر مزدور لگائے ہوئے تھے، انہوں نے نہر کھودنا شروع کی، کھودتے گئے اور دوسو، تین سو میٹر نیچے چلے گئے لیکن کوئی پانی نہیں تھا، رطوبت بھی نہیں تھی، وزیر دورے پہ گیا تو مزدوروں نے اسے کہا کہ آپ خواہ مخواہ یہاں پیسہ ضائع کر رہے ہیں، یہاں سے کوئی پانی نہیں نکلے گا تو وزیر نے انہیں جواب دیا کہ ہمارے لئے پانی نہیں نکلے گا لیکن آپ کے لئے روٹی تو نکل رہی ہے، آپ کو کیا تکلیف ہے، آپ کھودتے رہو یعنی اس کنویں سے پانی نہیں نکلے گا لیکن روٹی تو نکل رہی ہے۔ لہٰذا اجارے کی نمازوں سے پانی نہیں نکلے گا لیکن روٹی تو نکل جائے گی، مردے کو کچھ ملے یا نہ ملے اس کو تو کچھ مل رہا ہے۔

اجارے کی نمازیں یعنی معاوضہ لے کر جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں، حقیقتِ نماز ہونی چاہئے یعنی جو نماز انسان معرفت سے پڑھتا ہے، عارفانہ نمازیں نہ کہ اجارے کی نمازیں، حقیقت میں ہم اپنی نمازیں بھی اجارے کی ہی پڑھتے ہیں چونکہ اجارے کی نمازیں معاوضے والی نمازوں کو کہتے ہیں، اجارے کی نمازوں میں انسان کیسے نماز پڑھتا ہے؟ اسی لئے ضمانت لیتے ہیں کہ یہ صحیح پڑھے گا یا نہیں؟ شرائط رکھتے ہیں کہ کن کن آداب و مستحبات کے ساتھ پڑھے گا چونکہ اپنی تو نہیں ہیں بلکہ کسی کی

معرفت اور اجارے کی نماز میں فرق

ہیں، میں نے تو کسی طرح پیسہ حلال کرنا ہے۔ اپنی نمازیں بھی جب انسان اجارے پہ پڑھے، حور کے لئے پڑھے، جنت کے لئے پڑھے، دودھ کے لئے اور شہد کے لئے پڑھے تو یہ بھی اجارے کی نمازیں ہیں، یہ نمازیں بھی انسان اسی طرح پڑھتا ہے کہ جیسے کرائے کے کام کرتا ہے، اس میں فٹیگ (Fatigue) نہیں ہوتی ہے؟ فٹیگ اس کو کہتے ہیں کہ کسی اور کا کام میری گردن پہ آپڑے، اجارے کی نمازوں میں تو رقت طاری نہیں ہوتی ہے، اجارے کی نمازوں میں تو انسان کے اندر خوفِ خدا پیدا نہیں ہوتا ہے، اجارے کی نمازوں میں خشوع وخضوع کہاں ہوتا ہے؟ اجارے کی نمازوں میں تو ساری نظر اجرت پہ ہوتی ہے یعنی فی رکعت اتنے روپے بنتے ہیں، اس کا میٹر چل رہا ہوتا ہے کہ فی رکعت کے لحاظ سے کتنے روپے بن گئے، اس کا ٹائم ہوتا ہے کہ ایک منٹ میں اس نے ایک دن کی نماز پڑھنی ہے یا ایک وقت کی نماز کو ختم کرنا ہے، جیسے لیلۃ القدر آتی ہے تو لوگ قضائے عمری پڑھتے ہیں اور ایک گھنٹے میں سو رکعت نمازیں ختم کرنی ہوتی ہیں، اس وقت کوئی ایسا میٹر (Meter) گاڑی کا بھی نہیں ہوتا ہے جتنا پیش نماز کا ہوتا ہے۔

یہ نماز کے ساتھ تمسخر ہوتا ہے، اجارے کی نمازوں میں قطعاً خضوع پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ معرفت کی نمازوں میں خضوع پیدا ہوتا ہے، جب انسان عارفانہ طور پر نماز پڑھتا ہے تو اس نماز میں انسان کے اندر خضوع وخشوع پیدا ہوتا ہے، دل نرم ہوتا ہے اور حالتِ خوف پیدا ہوتی ہے، جب انسان کو پتہ ہو کہ میں اپنے معبود، اپنے مولا، اپنے مالک کی بارگاہ میں ہوں، میں اس کی بارگاہ میں ہوں کہ جس کے اوصاف آپ دعائے سحر میں پڑھتے ہیں، دعائے سحر سراپا نور ہے، ماہِ رمضان میں

دعائے سحر کے لئے فرصت ہے، جمالِ خدا، جلالِ خدا، کمالِ خدا یعنی وہ نورانیت، وہ عظمت جو دعائے شریف سحر میں بیان کی گئی ہے، امام خمینیؒ کی اپنی سب سے پہلی کتاب بھی شرحِ دعائے سحر ہے، اس دعا سے انسان کو اندازہ ہوتا ہے کہ میں کس کی بارگاہ میں ہوں؟ خود ہی خود انسان کے اندر یہ احساسِ عبودیت پیدا ہوتا ہے یعنی یہ طریقۂ عبودیت درباریوں سے سیکھیں۔

درباری آج کل تو نہیں ہیں، یہ نمونے آج کل دیکھنے کو نہیں ملتے ہیں لیکن سلاطین و پادشاہوں نے درباری رکھے ہوتے تھے، ثنا خوان، شاعر، علماء اور ہر طبقہ۔ درباری اخلاق مخصوص اخلاق ہوتا ہے، یہ شاہوں کے سامنے جب حاضر ہوتے تھے تو حاضر ہونے سے پہلے جس لباس میں سوئے ہوئے تھے اسی لباس میں اٹھ کر دربار میں نہیں آتے تھے، ایک خلعتِ مخصوص ان کو دربار کے لئے ملی ہوتی تھی کہ جب بھی شہنشاہ کے سامنے حاضر ہونا ہو تو یہ خلعت پہن کر جائیں، پھر یہ دیکھتے تھے کہ شہنشاہ کو خوشبو کونسی پسند ہے؟ وہی خوشبو لگا کر شہنشاہ کے سامنے جاتے تھے تا کہ اس کی توجہ ہماری طرف ہو، پھر یہ دیکھتے تھے کہ شہنشاہ کو کونسے کلمات پسند ہیں، انہی کلمات کے ساتھ انہی القابات کے ساتھ شاہ کو یاد کرتے تھے، اظہارِ عقیدت کرتے تھے اور شاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے تھے، غرض کہ ہر وہ کام کرتے تھے جو شاہ کو پسند ہے، وہ کام نہیں کرتے تھے جو خود انہیں پسند ہو چونکہ اگر اپنی پسند کے کام دربار میں کریں تو دربار سے خارج کر دیئے جاتے تھے، نکال دیئے جاتے تھے، یہ درباری لوگ ہیں، مفاداتِ دنیوی کے لئے مخلوق کے سامنے یہ حرکتیں انجام دیتے تھے کہ جو شایانِ شانِ مخلوق نہیں ہیں یعنی انسان کسی مخلوق کے لئے یہ کام نہ کرے، درحقیقت تمام وہ کام

جو خدا کی بارگاہ میں ان کو کرنے چاہئیں یہ جا کر شہنشاہ کی بارگاہ میں کرتے ہیں۔

انسان جب بارگاہِ خدا میں جائے تو اس طرح نہ جائے کہ جس لباس میں سوتا ہے اسی لباس میں اٹھ کر چلا جائے، بسا اوقات احکامِ فقہ پڑھاتے ہوئے حضرات توجہ نہیں دلاتے تھے کہ ان احکام کی حقیقت و فلسفہ و حکمت کیا ہے؟ یہ کس کے لئے ہیں؟ حد سے حد احکام کی حدود بتا دیتے ہیں مثلاً بسا اوقات بتا دیتے ہیں کہ مرد کے لئے تو کافی ہے کہ مثلاً اس کی شرم گاہ چھپی ہوئی ہو باقی بدن بے شک عریاں ہو تو نماز پڑھ سکتا ہے اور پڑھتے ہیں، کئی جگہ لوگ انڈر ویئر میں نماز پڑھتے ہیں، کیوں؟ مولانا نے کہا ہے کہ مرد کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ حیا کہاں ہے؟ ادب کہاں ہیں؟ کیا فقط حکمِ فقہ نماز کے لئے کافی ہے؟ یہ فقہ فقہِ اصغر ہے، یہ شریعت کے احکام فقہِ اصغر ہیں، نماز کیلئے فقہِ اوسط بھی چاہیئے اور فقہِ اکبر بھی چاہیئے، فقہِ اصغر یہ ہے کہ یہ لباس کافی ہے یا نہیں ہے، یہ غصبی نہ ہو، یہ حلال ہو، یہ فقہِ اصغر ہے لیکن فقہِ اوسط کہتی ہے کہ آپ کے ساتھ حیا بھی ہو اور فقہِ اکبر کہتی ہے کہ ساتھ میں معرفت بھی ہو، احترام بھی ساتھ ہو اور آپ کے اندر خضوع و خشوع بھی ہو۔

نماز کے بارے میں چند کتابیں لے کر پڑھیں تو پھر جا کر نماز کا باب تکمیل ہوتا ہے، احکامِ نماز، آدابِ نماز اور اسرارِ نماز۔ امام خمینیؒ نے تینوں کتابیں تالیف کی ہیں، تحریر الوسیلہ میں احکامِ نماز ہیں، دوسری کتاب میں آداب الصلوۃ ہیں، تیسری کتاب میں اسرار الصلوٰۃ ہیں، پھر جا کر انسان نماز کے قابل ہوتا ہے، فقط تحریر الوسیلہ پڑھ کر حق نماز ادا نہیں ہوتا ہے، وہ اجارے کی نماز ہو جاتی ہے لیکن عارفانہ نماز اور ہوتی ہے، ایسی نماز کہ جس میں نمازی کو لذت بھی محسوس ہو، جس میں نمازی کو لطف

معرفت اور اجارے کی نماز میں فرق

بھی محسوس ہو پس کس طرح سے بارگاہِ مولا میں جائیں؟ وہ خلعت پہن کر جاؤ جو مولا کو پسند ہے، اس انداز سے جاؤ جو انداز مولا کو پسند ہے، اس طریقے سے جاؤ جو طریقہ مولا کو پسند ہے، ہر وہ طریقہ استعمال کرو جو مولا کو پسند ہے، اگر انسان عظمتِ الٰہی کی طرف متوجہ ہو تو انسان کی یہ نماز معراج بن جاتی ہے، قرآن بھی بارگاہِ خدا ہے، چونکہ کلامِ خدا ہے، ہم اس دھوکے میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ عربی عبارت ہے، ادبیات میں لکھی ہوئی ایک ادبی عبارت ہے یا یہاں ہمارا عربی سے سروکار ہے، یہ ایک حجاب ہے۔

۹) اللہ کو پانا ہے

ہمیں قرآن کی عظمت کا احساس اس لئے نہیں ہے چونکہ متکلم کی عظمت کا ادراک نہیں ہے یعنی خود ذاتِ خدا کی عظمت کا ادراک نہیں ہے، جب خداوند تبارک وتعالیٰ کا تصور آتا ہے تو ہمارے ذہن میں کیا چیز آتی ہے؟ ہمارے ذہن میں کیا حاصل ہوتا ہے؟ بنامِ خدا کیا حقیقت آتی ہے؟ آنکھوں کے سامنے، ذہن کے سامنے اور دل میں کیا تصور واحساس پیدا ہوتا ہے؟ جب لفظِ خدا سنتے ہیں تو یعنی چہ؟ یا تو بالکل ایک مُبہم اور مدہم سا خاکہ یعنی ذہن میں کچھ بھی نہیں آتا ہے، صرف نام آتا ہے اور کچھ بھی حقیقت ذہن میں نہیں ہے، ہم نے خدا کو ثابت کیا ہے، دلیلوں سے خدا کو ثابت کیا ہے، ہم نے خدا کو پڑھا ہے، ہم نے خدا کو سمجھا ہے، درحالیکہ معصوم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ نہ خدا سمجھنے کی چیز ہے، نہ پڑھنے کی چیز ہے، نہ کہنے کی چیز ہے بلکہ خدا پانے کی چیز ہے، خدا کو پائیں۔ جو خدا کو پاتا

ہے وہ عظمت کو درک کر سکتا ہے، جس نے پایا نہیں ہے اور فقط سنا ہوا اور پڑھا ہوا ہے تو اسے کیا معلوم کہ کس حقیقت سے میرا سروکار ہے؟ قرآن نے بھی ہمیں اسی طرف متوجہ کیا ہے کہ آپ خدا کو اثبات نہ کرو، ہم دلیلیں دے کر کیا کرتے ہیں؟ خدا کو ثابت کرتے ہیں حالانکہ خدا کو پانا ہے۔ اس مطلب کی مزید وضاحت انشاء اللہ فصلِ ادبِ ہشتم کے حصہ اول میں کی جائے گی۔

ابھی اجمالی طور پر یہ بات ذہن میں رکھیں کہ حقیقت اس وقت پائی جاتی ہے کہ جب انسان اس حقیقت کی طرف جاتا ہے، اس حقیقت کی قربت اور جوار میں جاتا ہے۔ ہم خدا کو پائیں، اپنے دائیں بائیں دیکھیں، سب سے پہلے اپنے اندر پائیں، خدا نے فرمایا ہے کہ اگر مجھے پانا ہے تو میں کہاں ہوں؟

اَنَا عِندَ الْمُنْکَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ......(۱۹)

میں ٹوٹے دل والوں کے پاس ہوں۔ میں تمہارے دلوں کے اندر ہوں،

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِo(۲۰)

اور ہم اس سے رگِ گردن سے زیادہ قریب ہیں۔

اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ......(۲۱)

اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے......

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَo(۲۲)

اور ہم تمہاری نسبت مرنے والے سے قریب ہیں مگر تم دیکھ نہیں سکتے ہو۔

خدا فرماتا ہے کہ میں تمہارے دلوں میں ہوں۔ خدا تمہارے اندر ہے، اپنے اندر ہی خدا کو پا سکتے ہو، اگر اندر نہیں پا سکتے ہو تو خدا کو آفاق میں پاؤ لیکن اللہ کو پانا ہے، اس وقت انسان کو عظمت کا ادراک ہوتا ہے، البتہ ہمیشہ اپنی حد تک پاؤ، نہ اس حد تک کہ جتنی عظمت ہے کیونکہ کسی غیرِ خدا کے لئے ممکن نہیں ہے کہ عظمتِ خدا کو اس طرح سے پائے کہ جیسا اس کا حق ہے بلکہ انسان اپنی ظرفیت، اپنی طاقت اور اپنی توانائی کی حد تک خدا کی عظمت کو پا سکتا ہے، عظمتِ کلامِ خدا بھی ایسے ہی ہے یعنی اپنی طاقت اور توانائی کی حد تک انسان عظمتِ کلامِ خدا کو درک کر سکتا ہے نہ کہ اتنی جتنی عظمتِ کلام ہے، یہ ممکن نہیں ہے، انسان کو خضوع اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب کلامِ خدا کے سامنے اس کی عظمت کا ادراک ہو۔

۱۰) قرآن حبلِ خدا ھے

صدر المتالہینؒ فرماتے ہیں کہ جو اہلِ تفکر و اہلِ تامل و تدبر ہیں وہ اس فصل میں نگاہ کریں، یہ بھی مفید ہے، درکِ عظمتِ خداوند تبارک و تعالیٰ کے لئے انسان کو جو چیز چاہئے وہ یہ ہے کہ

☆ فلینظر المتامل فی فضل اللّٰہ و رحمتہ، کیف لطف بخلقہ فی ایصال کلامہ الی افہامہم و اذواقہم؟......

پہلا نکتہ انہیں یہ غور کرنا چاہئے کہ انسانوں کے اوپر خداوند تبارک و تعالیٰ نے کتنا عظیم لطف فرمایا ہے کہ اپنا کلام جو عالی ترین الطافِ الٰہیہ میں سے ہے اسے کس لطیف اور نفیس طریقے سے

انسانوں کے ذہن اور فہم کی حد تک پہنچایا ہے؟

☆ و کیف جزبھم اللّٰہ بحبل القرآن العظیم فی طی اصوات و حروف ھی من صفات البشر......

ایک عظیم معجزہ واتفاق رونما ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ کلامِ خدا جو مادی وجسمانی نہیں ہے، جو لفظ ومفہوم نہیں ہے اس کو خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کی حبل کی صورت میں، اصوات اور حروف کی شکل، میں کہ جو بشری چیزیں ہیں، بشری امور ہیں یعنی بشری حالاتِ انسانی کی صورت میں انسان کے لئے پیش کیا ہے، قرآن کے بارے میں روایات میں بھی ہے کہ یہ حبلِ خدا ہے، جیسے پہلے بیان کیا تھا کہ یہ ذو مراتب ہے، قرآن کے درجات ہیں، ایک درجہ بالا ہے کہ جسے اہلِ علم واہلِ معرفت صقعِ ربوبی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں یعنی بارگاہِ خدا، ذاتِ خدا میں قرآن کا ایک مرتبہ ہے اور ایک مرتبہ ابھی ہمارے سامنے عربی زبان میں موجود ہے اور اس کے درمیان قرآن کے مراتب فراواں ہیں، ہر ایک اپنی توفیق کی حد تک ان مراتب سے سروکار رکھتا ہے۔

قرآن کے بارے میں ایک تعبیر استعمال ہوئی ہے کہ قرآن حبل ہے، یہ حبل اللہ ہے، حبل یعنی رسی اور وہ بھی حبلِ نجاتِ انسان ہے کہ جس کے ذریعے انسان کو ہلاکت سے بچانا ہے، ایسی رسی کہ جس سے نجات دی جاتی ہو، رسی میں دو سرے ہوتے ہیں، ایک سرا بچانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ایک سرا ہلاک ہونے والے کے پاس ہوتا ہے یعنی ایک سرے کو وہ تھامتا ہے کہ جو معرضِ ہلاکت میں ہے اور دوسرے سرے کو نجات دینے والا تھامتا ہے، وَالّا اگر وہ رسی ساری کی ساری نیچے

قرآن حبلِ خدا ہے

پھینک دی جائے تو ایسی رسی تو نجات نہیں دے سکتی ہے۔ کنویں میں اگر کوئی گرا ہوا انسان ہو اور کہے کہ رسی پھینکو ہے اور آپ رسی کا بنڈل بنا کر نیچے پھینک دیں، بعض سادہ لوح اسی طرح پھینکتے ہیں، اگر مدد مانگیں تو وہ اسی طرح پھینکتے ہیں، اس رسی کا وہ کیا کریں؟ رسی پھینکنے کے معانی یہ ہیں کہ اس کا ایک سرا اپنے پاس رکھو اور ایک سرا درخت کے ساتھ باندھ دو یا خود پکڑو تو وہ رسی انسان کو نجات دیتی ہے۔

خدا نے بھی اپنی حبل انسان کو آویزاں کی ہے، پھینکی نہیں ہے کہ ساری رسی جمع کر کے، رول بنا کر انسان کی طرف پھینک دی ہو کہ یہ لو یہ میری رسی ہے، ایسی رسی کا ہم کیا کریں؟ ہمیں وہ رسی چاہیے کہ جس کا ایک سرا خود خدا کے ہاتھ میں ہو اور ایک سرا انسان کے پاس ہوتا کہ جب ہم اس رسی سے تمسک کریں تو وہ ہمیں اپنی طرف کھینچ لے، یہ حبلِ خدا ہے، پس قرآن کا ابھی ایک سرا ہمارے ہاتھ میں ہے، عربی سرا ہمارے ہاتھ میں ہے اور غیر عربی سرا خدا کے ہاتھ میں ہے، جب ہم اس سرے سے تمسک کریں گے تو یہ سرا ہمیں اُس سرے تک پہنچائے گا اور انسان کے لیے باعثِ حصولِ تقربِ خدا بنے گا۔

١١)مستور قرآن لطفِ خدا ھے

☆ ولولا انه استتر كنه جمال كلامه بكسوة الحروف والالفاظ، لما ثبت لسماع كلامه عرش و لافرش......

اگر خدا نے پوشیدہ کر کے، مستور کر کے، حجابوں کے اندر، پردوں کے اندر چھپا کے اور پنہاں کر کے اپنا کلام نہ اتارا ہوتا تو نہ عرش کے اندر صلاحیتِ تحمل تھی اور نہ فرش کے اندر یعنی نہ زمین، نہ آسمان، نہ کوئی پست مخلوق اور نہ کوئی عالی مخلوق، نہ طور اور نہ موسیٰ علیہ السلام، اس کو کوئی تحمل نہ کرسکتا۔ اگر یہ کلامِ خدا مستور نہ ہوتا، پردوں کے اندر چھپا ہوا نہ ہوتا، عبارتوں کے اندر لپٹا ہوا نہ ہوتا تو قابلِ تحمل نہیں تھا،

☆ و لتلاشی......

تلاشی مصدر ہے لاشی سے، یہ تلاش سے نہیں بلکہ لاشی سے ہے، نیست ہوجانے کے معنیٰ میں ہے، تلاشی یعنی لاشی ہوجانا، نابود ہوجانا،

☆ **و لتلاشی ما بینهما من سبحات نوره و عظمة برهانه......**

نورِ خدا وکلامِ خدا کے اندر اس کی روشنی اور درخشندگی بہت شدید ہے کہ جیسے سورج کی روشنی اور درخشندگی اتنی شدید ہے کہ اگر اسے چھپا کر، مستور کر کے نہ دیکھا جائے تو انسان نگاہ نہیں کرسکتا ہے، آنکھ نابود ہوجائے گی، لاشی ہوجائے گی، نیست ہوجائے گی، انسان کی بینائی نابود ہوجائے گی، اسی طرح سے اگر خداوند نے اپنا کلام ان پردوں کے اندر پنہاں نہ کیا ہوتا، مستور نہ کیا ہوتا، تو شدتِ نورانیت اور درخشندگی کے نتیجے میں ہر شے لاشی ہوجاتی۔ پھر آپ سورۂ مبارکہ شوریٰ کی آیہ (۱۹) کے مفہوم کے لحاظ سے فرماتے ہیں کہ

☆ **فاللّٰہ لطیف بعبادہ......**

مستورِ قرآن لطفِ خدا ہے

پس خدا کتنا کریم ہے؟ کتنا لطیف ہے؟ لطفِ خدا شاملِ حالِ عباد ہے، سورج کے نور کو خدا نے کتنے پردوں کے پیچھے ابھی بھی چھپایا ہوا ہے، زمین کے اردگرد کتنی ایسی نامرئی چیزیں ہیں کہ جن سے چھٹ کر سورج کا نور زمین کی طرف آتا ہے اور وہ نور جو چھن کے اور چھٹ کے آتا ہے وہ بھی ہم سے برداشت نہیں ہوسکتا ہے، ورنہ اگر یہ سارے فلٹرز (Filters) ہٹادیئے جائیں، ایک فلٹر یعنی ایک حجاب سے تو ہم سب آشنا ہیں، ماحولیات والوں نے سب کو آشنا کیا ہے اور وہ اوزون تہہ (O-Zone layer) کے نام سے ہے، اوزون ایک فلٹر ہے جو سورج کی شعاعوں کو چھانتا ہے اور اس میں چھننے کے بعد شعاع کا جو مفید حصہ ہے وہ زمین کی طرف آتا ہے، مضر حصے کو وہ وہاں پر روک لیتا ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے زمین کو محفوظ رکھنے کے لئے زمین کے اردگرد تہہ بنا دی ہے تاکہ سورج کا نور اس سے گزر کرآئے ورنہ ہر شے لاشئی ہوجاتی یعنی یہی اوزون ہے کہ جس کی وجہ سے سبزہ اُگتا ہے، بارش ہوتی ہے، موسم معتدل ہوتا ہے، سب کچھ ہوتا ہے اور اگر یہ نہ ہوتا تو گرمی ہی گرمی ہوتی اور کرۂ ارض گلوبل وارمنگ (Global warming) کی وجہ سے اتنا گرم ہوتا کہ اس کے اوپر رہنا ممکن ہی نہیں ہوتا، ابھی انسان نے اس کو تھوڑا متاثر کیا ہے، خود انسان نے خلقتِ خدا کے اندر مداخلت کی ہے تبھی اس کا نتیجہ بھی بھگت رہا ہے لہٰذا ماحولیات کے خراب آثار پیدا ہورہے ہیں اور اس طرح کی فراواں چیزیں ہیں جو زمین کو محفوظ رکھنے کے لئے ہیں کہ جو حجاب ہیں، سورج کا نور ان حجابوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے، اس کے باوجود آنکھ سے دیکھا نہیں جاتا ہے، اسی طرح سے نورِ الٰہی ہے یعنی کلامِ خدا اگر پردوں کے اندر چھپا ہوا نہ ہوتا تو انسان کا وجود چندھیا جاتا، انسان

کا وجود لاشئی ونیست ہوجاتا، پس

☆حیث انزل علیھم نور کلامہ فی لیالی الاکوان الطبیعیة و حجب الصفات البشریة......

خداوند نے لیالی یعنی راتوں میں یہ کام کیا ہے، لیالی جمع لیلہ ہے، کن راتوں میں؟ فراواں راتوں میں یہ کام ہوا ہے، عالمِ مادہ خود ایک رات ہے، عالمِ طبیعت خود ایک رات ہے چونکہ یہ حجاب ہے، پھر لفظ ایک اور رات ہے، خداوند نے لیلہ میں نازل نہیں کیا بلکہ لیالی میں قرآن کو نازل کیا ہے، کئی پردوں میں لپیٹا ہے، ایک لیلہ میں تو اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ اس نور کو مدّھم کر سکے، اس نور کو متعدل وملائم بنا سکے، اسے انسان کی فہم کے لئے عالمِ مادہ میں نازل کیا، الفاظ کی صورت میں نازل کیا، مفاہیم کی صورت میں نازل کیا، یہ سب لیالی ہیں یعنی ان لیالی سے انسان کے لئے اس کی نورانیت تھوڑی معتدل ہوئی۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنا یہ کلام انسانی صفات کے حجابوں کے اندر نازل کیا ہے،

☆ ولولا ان ثبت اللہ موسی سلام اللہ علی نبینا و علیہ، لما اطاق سماع کلامہ............

اگر خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو خود نہ بچایا ہوتا، ثبات عطا نہ کیا ہوتا تو وہ ہستی موسیٰ علیہ السلام بھی لاشئی ہوجاتی، یعنی جس طرح

فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا......

یعنی اگر خدا نے نہ بچایا ہوتا تو جس طرح سے وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوا موسیٰ علیہ السلام بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے، موسیٰ علیہ السلام پردوں کے بغیر تجلیٔ الٰہی کو سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، یہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے ممکن نہیں تھا،

☆ **كما لم يطق الجبل مبادى تجليه.....**

موسیٰ علیہ السلام نے تو پوری کتاب برداشت کر لی لیکن جبل نے آغاز میں ایک جھلک بھی برداشت نہیں کی،

☆ **حيث سار دكاً دكاً......**

کہ وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا،

☆ **ثم العجب ان هذا الكلام مع نزوله......**

ایک طرف سے یہ دیکھیں کہ ابھی جس کلام سے ہمیں سروکار ہے وہ بہت سارے پردوں کے اندر لپٹا ہوا ہے، بہت سارے حجابوں میں مستور ہے، کلامِ نازل یعنی کلامِ مستور، ستر ہے اور ستر کے اوپر ستر ہے اور اس کلام سے ہمیں سروکار ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ یہ کلام باوجود اس کے کہ اتنا نازل ہوا اور اتنا اسے پردوں میں پنہاں کیا گیا تاکہ انسان سمجھ سکے،

☆ **فى طى هذه الحجب الجسمانية، واحتجابه بسواد هذه الارقام الظلمانية......**

ان جسمانی پردوں کے پیچھے اور ان ظلمانی یعنی تاریک اور سیاہ پردوں کے پیچھے، چونکہ جب

مستور قرآن لطفِ خدا ہے

کی دو قسمیں ہیں نورانی اور ظلمانی جیسے سورج کے سامنے دو حجاب ہیں، دیواریں اور خود نورانیتِ خورشید، ہم دیوار کے پیچھے سے بھی سورج کو نہیں دیکھ سکتے ہیں اور سورج کی نورانیت کی وجہ سے بھی سورج کو نہیں دیکھ سکتے ہیں، دونوں حجاب ہیں لیکن ایک حجاب نورانی ہے اور ایک ظلمانی ہے، اگر یہ حجبِ جسمانی وسیاہی نہ ہوتے تو ان تاریک پردوں کے باوجود،

☆ **لم يمنع عن مشاهدة انوار الحكمة......**

اس نزول کے باوجود پھر بھی انوارِ حکمت پوشیدہ نہیں ہیں بلکہ ان پردوں کے پیچھے سے حکمت پھر بھی نمایاں ہے، حکمت پھر بھی متجلی ہے، حکمت پھر بھی انسان کے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے،

☆ **ولمعات جمال الاحدية......**

اور خداوند تبارک وتعالیٰ کے جمال کی شعاعیں پھر بھی ان پردوں کے پیچھے سے قرآن کے اندر عیاں ہیں،

☆ **بل تنورت الحروف والاصوات بنور المتكلم......**

بلکہ انسان اگر غور سے دیکھے تو یہ پردے بھی اس نور سے نورانی ہو گئے ہیں، یہ پردے، یہ تاریکیاں، یہ راتیں کہ جن کے اندر یہ نور لپیٹ کر نازل کیا گیا ہے، اس نور کی نورانیت سے یہ حجاب بھی نورانی ہو گئے ہیں، یہ حروف بھی نورانی ہیں، یہ صوت بھی نورانی ہے،

☆ **و تشرفت الكتابة والارقام بشرفه......**

اور وہ مقام و منزلت و شرف کہ جو متکلم کا تھا، جو اس ذات کا تھا اس کی وجہ سے عبارت میں بھی وہی نور آگیا ہے اور کتابت میں بھی وہی نور آگیا ہے۔

۱۲)قرآن کی حکمت اور عبارت کا تعلق

☆ فکان الصوت للحکمة جسدا ومسکنا......

فکان کے معنی میں بھی پڑھ سکتے ہیں لیکن فکان صار کے معنیٰ میں پڑھیں گے یعنی

فصارت الصوت للحکمة جسدا ومسکنا......

حکمت اصل نورِ خدا ہے اور عبارت و کتابتِ قرآن اس کے لئے پیکر، جسم اور مسکن بن گئی ہے، یہ مطلب بتانے کے لئے کہ قرآن کی حکمت اور عبارت کا آپس میں تعلق روح اور جسد کا ہے یہ ایک خوبصورت تمثیل و تشبیہ ہے۔ یہ حقیقت ہمیں تمام عبادات کے متعلق ذہن میں رکھنی چاہئے، جیسے روزہ ہے چونکہ ماہِ رمضان میں روزہ مقدم ہو جاتا ہے اور نماز ثانوی ہو جاتی ہے، حج کے دنوں میں نماز کے بجائے حج مقدم ہو جاتا ہے، یعنی اپنے تئیں موسمی عبادتیں سمجھ کر، نا، نمازِ علیٰ ایّ حال یعنی ہر صورت میں مقدم ہے، نماز ماہِ رمضان میں بھی روزے پر مقدم ہے، جو مقام نماز کا ہے وہ روزے کا نہیں ہے باوجود اس تمام تر عظمت کے کہ جو روزے کو حاصل ہے لیکن ساری عباداتوں میں ہر عبادت کیلئے یہ حکم ہے کہ عبادت کا ایک جسد ہے، جسم ہے اور روح ہے، قرآن کا جسد ہے اور روح ہے یعنی انسان کا جسد ہے اور روح ہے، اس کائنات کا ایک جسد ہے اور ایک روح ہے، بعض روایات میں

ہے کہ یہ کل عالم جسد ہے اور امام حجتِ خدا، انسانِ کامل اس کی روح ہے، امام بمنزلہ روحِ عالم ہے، جس طرح انسان کے لئے روح ہے، اس جسم کے اندر روح ہے اور روح اساس و بنیاد ہے، جسم کی حیات روح کی وجہ سے ہے، اگر روح نہ ہو تو جسم مردہ ہے، بیکار ہے اسی طرح عبادتوں کے اندر اگر جسم ہو مثلاً روزے میں بھوکا رہنا، یعنی فاقہ جسمِ روزہ ہے اور روحِ روزہ حقیقتِ دیگر ہے۔

اسی طرح عباراتِ قرآن جسمِ قرآن ہے اور حکمت روحِ قرآن ہے، احکامِ عبادات جسمِ عبادات ہیں، طہارت، وضو، پاک لباس، قبلہ رو ہونا، تکبیرۃ الاحرام، فاتحہ، عربی پڑھنا جسمِ عبادت ہے اور اس عبادت کے اندر ایک روح موجود ہے کہ جس کی وجہ سے اس کی حیات ہے، جو اجارے میں صرف جسم پڑھتے ہیں روح نہیں پڑھتی ہے۔ چونکہ جنت کا آسرا آ گیا ہے کہ اسی جسم سے جنت مل جاتی ہے، ہمیں بھی جنت جانا ہے، خدا تک تو نہیں جانا ہے، اس وجہ سے روح کی عبادت کو ضرورت نہیں سمجھتے ہیں، نا، زندہ عبادت اور حیاتِ عبادت روح کی وجہ سے ہے۔ قرآن میں حکمت روح ہے اور باقی یہ ظواہر الفاظ، صوت، یہ سب اس کا جسد ہے،

☆ و نور الحکمة للصوت نفساً و روحاً......

قرآن کی عبارتیں، الفاظ جسم ہیں اور قرآن کے اندر ان کی روح حکمت ہے،

☆ فکما ان اجساد البشر تکرم بکرامة الروح......

جس طرح سے انسانی جسم کی کرامت، انسانی جسم کا احترام اس کی روح کی وجہ سے ہے، ورنہ اگر روح نہ ہو تو اس کا کوئی احترام نہیں ہے، حتیٰ مرنے کے بعد بھی جو اس کا احترام کرتے ہیں وہ

قرآن کی حکمت اور عبارت کا تعلق

بھی روح کی وجہ سے کرتے ہیں کہ کل تک اس میں روح تھی ورنہ روح ختم ہوتے ہی وہ غیر محترم ہوگیا، جماد بن گیا، جب تک ایک جسم جمادی ہے وہ جسم غیر محترم ہے، جب تک روح کے ساتھ ہے تو جسم کی قیمت ہے، جب اس کا تعلق روح سے ہٹ گیا، ختم ہوگیا تو یہ بے قیمت ہے، لیکن پھر بھی کیوں احترام ہے؟ پھر اس کے بارے میں اتنے احکام کیوں ہیں؟ یہ اس وجہ سے ہیں کہ کل تک اس کا تعلق روح سے تھا یعنی سابقہ کسی چیز کا احترام ہے۔

جیسے طالب علموں کی اصطلاح ہے کہ جو مدرسوں کے مختلف علوم میں پڑھتے ہیں کہ وصف بلحاظِ متعلقِ موصوف یعنی یہ صفت موصوف کی اپنی نہیں ہے، یہ موصوف کے کسی پڑوسی کی صفت ہے، پڑوس میں ہونے کی وجہ سے ہم یہ صفت موصوف کی طرف نسبت دے رہے ہیں، عموماً ہم بہت ساری چیزوں کا احترام اسی وجہ سے کرتے ہیں، ان کا احترام نہیں ہے کہ جن کے پاس یہ چیزیں ہیں بلکہ کسی اور کی وجہ سے احترام کرتے ہیں مثلاً آپ ایک مہمان کا احترام کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں؟ چونکہ اس کا میزبان محترم ہے، چونکہ یہ ان کا مہمان ہے اس وجہ سے میں اس کا احترام کرتا ہوں یا آپ فلاں آدمی کا احترام کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ وہ میرے دوست کا دوست ہے، جاننے والا ہے، اس کے علاقے سے ہے، اس وجہ سے اس کا احترام کرتا ہوں۔

ایک استادِ بزرگوار اکثر یہ مثال دیا کرتے تھے کہ جیسے یہ نالائق آقازادے ہیں یعنی علماء کی اولاد، ان کا احترام لوگ بہت کرتے ہیں، بیٹے عموماً نالائق ہوتے ہیں، وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ان کی سب سے بڑی نالائقی یہ ہے کہ یہ باپ کی کتابیں اٹھا کر بیچ دیتے ہیں، یہ فٹپاتھوں

(Footpaths) پہ جو بڑی قیمتی کتابیں بکھری ہوتی ہیں انہیں یہی آقا زادے اٹھا کر بیچ دیتے ہیں، ان کا لوگ بہت احترام کرتے ہیں کہ یہ فلاں آقا کا بیٹا ہے، یہ احترام کس کا ہے؟ یہ آقا کا احترام ہے، آقا کی وجہ سے ہے، یہ احترام حقیقت میں اس آقا زادے کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آقا سے ہے لہٰذا ان کی وجہ سے ہم اس کا احترام کرتے ہیں، اس کو ہم مجازی احترام کہتے ہیں، یہ حقیقی احترام نہیں ہے، البتہ اس زمانے میں آقا کا احترام آقا زادے کی وجہ سے کرتے ہیں چونکہ سارے اختیارات آقا زادے کے پاس ہوتے ہیں اس وجہ سے آقا کی اہمیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

غرض اگر جسم محترم ہیں تو روح کی وجہ سے محترم ہیں، اسی لئے کہا گیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی جسمِ مومن کا احترام کرو یا حتیٰ جسمِ انسان کا احترام کرو، اس کا کیوں احترام کرو؟ چونکہ کل تک روحِ انسانی اس کے ساتھ تھی، روح جسم کے پڑوس میں ہے، اس پڑوسی کا احترام ہے کہ جو اس کو حاصل ہو گیا ہے نہ کہ اس کا اپنا احترام ہے، اسی طرح قرآن کی عربی عبارت کا احترام کرو، اس میں کرامت ہے واقعاً اس کو تقدس حاصل ہے، یہ عربی الفاظ کا، عربی کتابت کا، عربی حروف کا تقدس کہاں سے ہوا؟ اس حکمت کی وجہ سے کہ جو ان کی روح ہے اور ان الفاظ کے اندر پنہاں ہے۔

☆ **فكذلك اصوات الكلام تكرم و تشرف بشرف الحكمة التى فيها......**

اسی طرح اس حکمت کی وجہ سے اس کلام کی کرامت اور شرف بھی ہے،

☆ **اولا ترى انه رفيع المنزلة نافذالحكم فى القلوب والبواطن......**

قرآن کی حکمت اور عبارت کا تعلق

کیانہیں دیکھتے ہو کہ قرآن کس قدر دلوں کے اندر اثر کرتا ہے، دلوں کے اندر عربی عبارت تو اثر نہیں کرتی ہے بلکہ وہ حکمت ہے کہ جو دلوں کے اندر اثر کرتی ہے، الفاظ صرف الفاظ ہیں، الفاظ علم نہیں ہیں لیکن انڈیا و پاکستان میں الفاظ علم ہیں، انگریزی زبان نہیں ہے بلکہ علم ہے، عربی بھی ایسے ہی ہے چونکہ وہ انگلش پڑھ کر عالم ہو جاتے ہیں اور یہ عربی پڑھ کر عالم ہو جاتے ہیں، ادبیات ختم کی اور حجۃ الاسلام ہوگئے، اسلام ابھی شروع نہیں کیا ہے، صرف ابھی سیوطی ختم کی ہے اور حجۃ الاسلام ہوگیا یعنی جیسے دینی مدرسوں میں عربی علم ہے اسی طرح دنیوی مدرسوں میں انگریزی علم ہے، جو انگریزی جانتا ہے وہ بہت بڑا علامہ بن جاتا ہے لیکن انگریزوں کے ہاں انگریزی علم نہیں ہے بلکہ وہ اس کو زبان ہی سمجھتے ہیں۔

پوری دنیا میں انگریزی زبان ہے، عربی بھی زبان ہے لیکن پاکستان اور ہندوستان کے مدارس میں عربی اور انگریزی دونوں علم ہیں۔ حالانکہ یہ صرف زبانیں ہیں، الفاظ ہیں، الفاظ کی حد تک ہیں، ان الفاظ کا تقدس اور ان الفاظ کی کرامت ان کے اندر موجود حکمت کی وجہ سے ہے چونکہ ان الفاظ کے اندر حکمت ہے یا یہ الفاظ حکمت پر دلالت کرتے ہیں یا ان الفاظ کے پردوں کے پیچھے حکمت موجود ہے لہٰذا اس حکمت کے نور نے الفاظ کو مقدس بنا دیا ہے ورنہ الفاظ کا تقدس اپنا نہیں ہے۔

۱۲)قرآن، نورِ حکمت

☆ فکیف علی الابدان و الظواھر؟......

یعنی جس طرح سے اس کا اثر دلوں کے اندر ہوتا ہے اسی طرح سے ابدان اور ظواہر پر بھی ہوتا ہے۔

☆ حیث لا طاقة للباطل ان یقوم بین یدی شعاع الحکمة......

حکمت کے نور کے سامنے ظلمت ٹک نہیں سکتی ہے، جس طرح سے سورج کی شعاع کے سامنے ظلمت ٹک نہیں سکتی ہے۔ بشرطیکہ حکمت ہو، نورِ حکمت ہو، باطل ظلمت ہے، جب نورِ حکمت تجلی کرتا ہے، شمسِ حکمت طلوع ہوتا ہے تو شبِ ظلمت ختم ہوجاتی ہے، جس طرح سے یہ شمس صبح طلوع ہوگا تو ساری تاریکی ختم ہوجائے گی، کس کی وجہ سے؟ شمس کی وجہ سے، اس کی شعاعِ نورانی کی وجہ سے یہ ساری تاریکی بھاگ جائے گی، ختم اور نابود ہوجائے گی۔ زمانے میں، انسانوں کے ذہنوں میں، اعتقادات میں اور انسانی معاشرے کے اندر باطل کیوں موجود ہے؟ اس لئے کہ شمسِ حکمتِ قرآن طلوع نہیں ہوا ہے، وہ ابھی بھی پردوں کے پیچھے، الفاظ کے بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے، ابھی افق سے طلوع نہیں ہوا ہے، افق سے کہاں طلوع ہوگا؟ کسی عالم کے دل پر، کسی مومن کے دل پر طلوع ہوگا، اگر یہ دل آمادہ ہو اور اس کے اندر شمسِ حکمتِ قرآن طلوع ہو تو اس دل سے باطل اور ظلمت ختم ہوجائے گی یعنی ممکن نہیں ہے اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارے ہاں سورج طلوع ہوگیا ہے لیکن ابھی رات ختم نہیں ہوئی ہے، لوگ اسے دیوانہ کہیں گے کہ بھلا یہ کہاں ہوسکتا ہے کہ سورج طلوع ہوگیا

ہو لیکن ابھی رات ختم نہیں ہوئی ہو؟ اور رات کی جرأت کہاں ہے کہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد باقی رہے؟

اگر کسی کے دل میں قرآن کا نور طلوع ہو جائے اور پھر اس کے دل کے اندر باطل آجائے، نجاست، پلیدی اور رجس آجائے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی کہے کہ میں قرآن پڑھ کر ابھی بھی مشکل میں ہوں، باطل پھر بھی ذہن میں آتا ہے، وسوسہ پھر بھی ذہن میں آتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ابھی طلوع نہیں ہوا ہے، ابھی خواب دیکھ رہے ہو، جس طرح روزے میں کھانے کا خواب آتا ہے۔ روزے کی حالت میں آدمی سوئے تو خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کھا رہا ہے مگر کھا کر پھر بھی بھوکا ہی ہے، اسی طرح بعض اوقات انسان خواب دیکھتا ہے کہ میرے اندر نورِ حکمت طلوع ہو گیا ہے، یہ خواب ہے اگر نورِ حکمت طلوع ہوتا تو انسان کے اندر باطل موجود نہ ہوتا،

☆ **کما لا یستطیع الظلمة ان یقوم قدام شعاع الشمس، و کما لا طاقة لضعفاء الابصار ان ینفذوا بابصارھم ضوء عین الشمس......**

جس طرح سے کمزور آنکھوں والوں کی طاقت نہیں ہے کہ وہ آنکھ بھر کر سورج کو دیکھ سکیں، سورج کے اوپر نظر جما سکیں،

☆ **ولکن ینالون به علی قدر ما یجییء به ابصارھم......**

دیکھتے ہیں مگر سورج کی طرف مستقیم نگاہ نہیں کرتے ہیں، ڈائریکٹ (Direct) نگاہ نہیں کرتے ہیں،

☆ ویتسببون به الی حوایجهم، ویهتدون الی معایشهم......

سورج کی پھیلی ہوئی روشنی میں اپنی حوائج اور ضروریات پوری کر لیتے ہیں، اسی طرح سے ہم سورج کو دیکھے بغیر کھیتوں میں سورج کی روشنی کے اثر سے جو فصل پکتی ہے اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں، جو پھل پکتے ہیں اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور سورج کی روشنی سے ہمیں جو جو فائدے حاصل کر سکتے ہیں وہ کر لیتے ہیں لیکن سورج کی روشنی کی طرف نگاہ نہیں کرتے ہیں، اسی طرح جو ضعفاء و کمزور لوگ ہیں وہ قرآن کی روشنی میں اپنی معاش پوری کر لیتے ہیں، جس طرح سورج کی روشنی میں فقط معیشت کے چکر میں ہیں لیکن سورج کے نور کی طرف نگاہ نہیں کرتے ہیں، اسی طرح بعض لوگ قرآن کی نورانیت کے سائے میں فقط اپنی معیشت کے حصول کے چکر میں ہیں لیکن قرآن کے نور کی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں،

☆ فکذلک لاطاقة لضعفاء العقول و البصائر......

اسی طرح جن کی بصیرت اور عقل ضعیف ہے ان کے اندر بھی طاقت نہیں ہے،

☆ ان ینفذوا ببصائرهم نورعین الحکمة القرآنیة......

وہ بھی حکمتِ قرآنیہ کو تحمل نہیں کر سکتے ہیں،

☆ ولکن ینالون منه علی قدر ما یستدلون به علی صحة الاعتقاد الذی به حیوة العباد یوم المعاد......

فقط اس حد تک کہ قرآن کی ایک آیت لے کر اپنے عقیدے پر استدلال کر لیتے ہیں، کسی

قرآن نورِ حکمت

مطلب سے اپنا مسلکِ دینی حل کر لیتے، اپنا مدعا ثابت کر لیتے ہیں،

☆ **و یهتدون به الی مصالح دینهم و دنیاهم......**

اس حد تک قرآن سے تمسک کرتے ہیں،

☆ **و احکام اولاهم و اخراهم......**

کبھی کوئی (Case) کیس بن جائے تو کسی آیتِ قرآنی کا سہارا لے لیتے ہیں، کبھی جھگڑا ہو تو کسی آیت کی پناہ میں چلے جاتے ہیں، کبھی کوئی مفاد پھنس جائے تو آیتِ قرآن کے ذریعے سے اپنا مفادِ دنیوی یا دینی حاصل کر لیتے ہیں لیکن بارگاہِ قرآن میں حاضر نہیں ہوتے ہیں، ضرورت کے وقت کوئی ایک آیت پکڑ کر اس سے اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں،

☆ **فالقرآن کالملک المحجوب......**

قرآن اس بادشاہ کی طرح ہے کہ جو پردوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا ہے،

☆ **الغائب وجهه......**

جس کا چہرہ نظر نہیں آتا ہے،

☆ **والظاهر امره و حکمه......**

لیکن اسکے فرامین ساری مملکت میں چل رہے ہوتے ہیں، لوگ اس کے فرامین سے اپنی ضرورتیں پوری کر رہے ہوتے ہیں لیکن اس بادشاہ و شہنشاہ کی ضرورت انسانوں کو نہیں ہوتی ہے،

☆ **وقد یهتدی الیه وبه من یقف علی سره......**

لیکن جس کو سلطان کی حقیقت پتہ چل جائے وہ پھر اس کے فرمان کے ذریعے سے اس کی حقیقت تک پہنچتا ہے، خود اس تک رسائی پیدا کرتا ہے،

☆ فهو مفتاح خزائن الملک والملکوت......

اس کے فرامین اور اس کی ہدایات چابیاں بن جاتی ہیں، خود صاحبِ حکم کی طرف جانے کے لئے اس کی آیات دروازے بن جاتی ہیں۔

۱۴) قرآن، مشروبِ حیات

☆ وشراب الحیوة الذی من شرب منه لم یمت ابداً......

قرآن کے اندر وہ مشروب ہے کہ انسان کو ایک گھونٹ مل جائے تو کبھی بھی موت نہیں آئے گی، یہ آیات اس مشروب کے لئے، اس شراب کے لئے درحقیقت مفاتیح بن جاتی ہیں، زیادہ پریشان نہ ہوں شراب اصطلاحِ قرآن ہے، آیتِ قرآن ہے کہ

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ......(۲۳)

اور انہیں ان کا پروردگار پاکیزہ شراب سے سیراب کرے گا۔

پہلے بھی مثال دی تھی کہ ایک بے ادب کی وجہ سے سارے درس معطل ہو گئے تھے، اسی بے ادب ہی کی ایک گفتگو یہ بھی تھی کہ اس نے کہا کہ آپ لوگ یہ کیا جملے استعمال کرتے ہو؟ مثلاً شراب، مے اور میخانہ وفلاں وفلاں، یہ کیوں اپنی کتابوں میں لکھتے ہو اور اپنی باتوں میں کہتے ہو؟ استاد نے

جواب دیا کہ یہ قرآن میں ہے، شراب کا تذکرہ قرآن میں ہے، کہا کہ قرآن میں کہاں ہے؟ تو انہوں نے آیت پڑھ کر سنائی،

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا......

تو اس نے کہا کہ آپ کی گستاخی کی حد یہ ہوگئی ہے کہ قرآن میں بھی آیتیں جال کر کے ڈالتے ہو؟ یعنی اس انسان نے عمر بھر میں قرآن ہی نہیں پڑھا تھا، اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ آیتِ قرآن ہے۔

☆ **ودواء اسقام الجهالات......**

قرآن دوا ہے، شفاء ہے،

☆ **وشفا امراض ذمائم الصفات التی من سقی منه شربة لم يسقم اصلا......**

اور اگر انسان اس دوا کا ایک گھونٹ پی لے تو عمر بھر بلکہ ابد تک کبھی بیمار نہیں ہوگا، بشرطیکہ اجارہ چھوڑ دے، اس نورِ حکمت تک پہنچے، پردوں کے پیچھے سے قرآن کی حقیقت تک پہنچے، روایت میں بھی ہے کہ اگر انسان ایک آیتِ قرآن کو درک کرلے تو نجات یافتہ ہے، چونکہ وہ ایک آیتِ قرآن درحقیقت کلِ قرآن کے ساتھ مربوط ہے، قرآنی آیات کٹے ہوئے جزیرے نہیں ہیں بلکہ معرفت اور ہدایت کا ایک مربوط مجموعہ ہے، ایک آیت انسان کو پورے نظام سے وابستہ کر دیتی ہے، جس طرح ایک نبی سے رابطہ کل انبیاء علیہم السلام سے رابطہ ہے۔

نامِ احمدؐ نامِ جملہ انبیاست

چون کہ صد آمد نود ہم پیش ماست......(۲۴)

آپ ایک احمد ﷺ کو قبول کرلو، احمد ﷺ پر ایمان لے آؤ تو گویا سارے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لے آئے۔

پس فقط ایک آیتِ قرآن انسان کو کلِ قرآن سے مربوط کر دیتی ہے بشرطیکہ انسان اس کو درک کرے، اس کی عظمت کو درک کرے، اس کے نور کو سمجھے کہ میں کس کی بارگاہ میں موجود ہوں۔ لہذا یہ ادب قرآن فہمی میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے اور اگر انسان اس ادب پر عمل کرلے تو انسان کیلئے معرفت کا دوسرا در خود کھل جاتا ہے۔ ادبِ دوم انشاءاللہ اگلی فصل میں درج کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)......(الانسان الکامل فی نهج البلاغة،الجزء ۲،صفحه ۱)(بهج الصباغة فی شرح نهج البلاغة)(پیام امام امیرالمؤمنینؑ)(ترجمه نهج البلاغه - انصاریان) (قرآن در نهج البلاغـه)(قرآن در آیینـه نهج البلاغه) (مهدیؑ منتظر در نهج البلاغه)(شرح نهج البلاغة- ابن ابی الحدید)

(۲)......(سورۂ مبارکہ قمر، آیہ ۴۰،۳۲،۲۲،۱۷)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۵۵)

(۴)......(مثنوی معنوی،به تصحیح :رینولد ا.نیکلسون،دفتر سوم،صفحه ۱۰۵)

(۵)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۱۹۳)

(۶)......(ارشاد القلوب،الجزء ۲،صفحه ۲)(متشابه القرآن،الجزء ۱، صفحه ۱۱۶)(مختصر بصائر الدرجات- الحسن بن سليمان الحلی، الجزء ۱،صفحه ۱۶۷)(مستدرک سفينة البحار - العلامة آية الله الشيخ علی النمازی،الجزء ۳،صفحه ۴۴۰)

(۷)...... (أهل البيت فی تفاسير أهل السنة)

(۸)...... (سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۴۳)

(۹)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۱۵۳)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ حشر، آیہ ۲۱)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۴۳)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ قدر، آیہ ۱)

(۱۳).... .(سورۂ مبارکہ دخان، آیہ ۳)

(۱۴) . .(سورۂ مبارکہ قدر، آیہ ۳)

(۱۵)... ..(فی رحاب القرآن)(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل -الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیزازی مدظلہ، الجزء۸، صفحہ۳۲۴)(النظام القرآنی) (التفسیر و المفسرون)(فی رحاب القرآن)(التفسیر الصافی - الفیض الکاشانیؒ، الجزء ۱، صفحہ۷۷)(بحار الأنوار، الجزء۸۹، صفحہ۱۰۷)(مستدرک سفینة البحار، الجزء۲، صفحہ ۸۳)

(۱۶)......(التحفة السنیة)

(۱۷). ....(الکافی - الکلینیؒ، الجزء۸، صفحہ۳۲۷)(میزان الحکمة- الریشھری، الجزء۸، صفحہ۱۸۶)(الوجیز فی أصول العقائدوأحکام التقلید والبلوغ، الجزء ۱، صفحہ ۲۱)

(۱۸)......(ارشاد القلوب، الجزء۳۶، صفحہ ۲)(متشابہ القرآن، الجزء ۱، صفحہ ۱۱۶) (مختصر بصائر الدرجات - الحسن بن سلیمان الحلیؒ، الجزء ۱، صفحہ۱۲۷) (مستدرک سفینة البحار -آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازی، الجزء۳، صفحہ ۳۴۰)

(۱۹).. .(اثنا عشر رسالة - المحقق الداماؒد، الجزء۸، صفحہ ۱۱)(اسرارِ نماز) (روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی- شھاب الدین محمود بن عبد اللّٰہ الحسینی الألوسی، المتوفی: ۱۲۷۰ ھ، الجزء ۱، صفحہ ۲۱۴)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ ق، آیہ۱۶)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۲۴)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ۸۵)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ انسان، آیہ۲۱)

(۲۴)......(مثنوی معنوی، بہ تصحیح :رینولد ا.نیکلسون، دفتر اول، صفحہ۵۳)

فصلِ ادبِ دوم

﴿طہارتِ قلب﴾

(حصّہ اوّل)

۱)طہارتِ قلب کی ضرورت

۲)قلب سے مراد

۳)قلب کو قلب کیوں کہتے ہیں؟

٤)قرآن کے مطابق قلب کی مختلف حالتیں اور اقسام

٥)حقیقی دل اور اعزازی دل

٦)خود فراموشی،خدا فراموشی کا نتیجہ

۷)قرآن کو کرتب کیلئے استعمال نہ کریں

۸)قرآن کے مطابق دل کے امور کی اقسام

۹)قرآن ظرفِ نورانی پر اترتا ہے

۱۰)طہارتِ ظاہری و طہارتِ باطنی

۱۱)طہارت کے درجے

۱) طہارتِ قلب کی ضرورت

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ دُوم طہارتِ قلب ہے چونکہ ظرفِ نزولِ قرآن دل ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو قلبِ نورانی پیغمبرِ اکرم ﷺ پر نازل کیا ہے اور نزول سے مراد فہمِ قرآن ہے، نزولِ قرآن بر قلب بھی فہم سے ہی مناسبت رکھتا ہے۔ قرآن مسلسل حالتِ نزول میں ہے، قرآن کا ایک نزولِ مسلسل و مستمر ہے یعنی ہر وہ شخص کہ جس تک قرآن پہنچ رہا ہے یہ در حقیقت نزولِ قرآن ہے، قرآن کا لوحِ محفوظ سے قلبِ نورانی پیغمبر ﷺ پر آنا بھی نزول ہے اور یہ بھی اسی مطلب پر ایک دلیل ہے کہ نزول سے مراد قابلِ فہم بنانا ہے، خداوند تعالیٰ نے قرآن کو نازل قرار دیا ہے یعنی عام معمولی انسانوں کے لئے قابلِ فہم قرار دیا ہے، ان کی سطحِ ذہنی اور سطحِ فہم تک قرآن کو نازل کیا ہے، اس نور کو مختلف حجابوں میں مستور کر کے انسان کی دسترس میں قرار دیا ہے اور محلِ نزول کاغذ نہیں ہے، جلد نہیں ہے اور کوئی صفحہ نہیں ہے بلکہ خود قلبِ انسان ہے۔

قلب پر نازل ہونے کے معانی بھی یہی ہیں کہ نزول کا تعلق فہم سے ہے، یہ نزول بر فہم ہے اور قرآن کا قلبِ پیغمبر اکرم ﷺ سے قلوبِ مومنین تک آنا اور دسترسِ انسان میں آنا بھی نزول ہے یعنی یہ بھی فہمِ قرآن ہے لیکن جب تک یہ دل تیار نہ ہو، آمادہ نہ ہو اور قرآن سے اس کی مناسبت نہ بن جائے تو ہرگز قرآن دل میں نہیں اترتا ہے چونکہ قرآن نور ہے اور نور فقط ظرفِ نورانی میں اترتا ہے، پس محلِ نزولِ قرآن قلبِ انسان ہے لہٰذا پہلے انسان اپنے دل کی تطہیر کریں، تزکیہ کریں اور پھر اس کے بعد اس کو نزولِ قرآن کے لئے آمادہ کریں، شہرِ رمضان محلِ ظرفِ نزولِ قرآن ہے، ظرف زمانی

طہارتِ قلب کی ضرورت

ہے اور خداوند تبارک وتعالیٰ نے ماہِ رمضان میں صیام واجب قرار دیا اور صوم کی حکمت تقویٰ رکھی ہے یعنی تزکیۂ دل رکھی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ٥(١)

اے صاحبانِ ایمان تمہارے اوپر روزے اسی طرح لکھ دیئے گئے ہیں جس طرح تمہارے پہلے والوں پر لکھے گئے تھے شاید تم اسی طرح متقی بن جاؤ۔

یعنی روزے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ تمہارا دل متقی ہو جائے، پاک وصاف ہو جائے اور جب یہ دل پاک ہوگا تو اس کے اندر قرآن نازل ہوگا پس روزہ درحقیقت انسان کے دل کو قرآن کی فہم کے لئے آمادہ کرتا ہے اور تطہیرِ قلب کا کام کرتا ہے۔

٢) قلب سے مراد

قلب مرکزِ فہمِ انسان ہے۔ دل سے مراد یہ دل نہیں ہے کہ جو انسان کے سینے میں دھڑکتا ہے، قلبِ مافی الصدر سے مراد بھی کہ جسے قرآن نے استعمال کیا ہے وہ دل نہیں ہے، اس کا کام فقط خون پہنچانا ہے، یہ ایک جسمانی چیز ہے اور اس کا عمل بھی جسمانی ہے اگرچہ اس کا قلبِ حقیقی سے تعلق ہے چونکہ انسان روح ہے اور روح وجسم کا آپس میں ناتا اور رابطہ ہے، جیسے آنکھ کھلتی ہے تو روح دیکھنے کے قابل ہوتی ہے یا زبان چلتی ہے تو روح بولتی ہے، انسان کا جسم تو نہیں بولتا ہے بلکہ نفسِ

قلب سے مراد

انسان تکلم کرتا ہے، روحِ انسان متکلمِ حقیقی ہے لیکن اگر زبان نہ چلے تو روح تکلم نہیں کرتی ہے یا تکلمِ روح ظاہر نہیں ہوتا ہے، اسی طرح آواز کان میں پڑے تو روح سنتی ہے، حقیقتاً سامنے روحِ انسان ہے، نفسِ انسان ہے، اسی طرح فہم بھی روح کا کام ہے، نفس کا کام ہے اور قلب اسی مرکزِ فہم کو کہتے ہیں۔

کبھی قرآن کا مطالعہ موضوعِ قلب کے عنوان سے کریں، سات دن میں قرآن کا ایک دورہ کریں، موضوع کے لحاظ سے دیکھیں کہ قلب کا تذکرہ قرآن نے کہاں کہاں کیا ہے؟ اور کس مناسبت سے ہے؟ پورا قرآن اول سے آخر تک پڑھیں البتہ سہولت بھی موجود ہے، معجم دیکھ کر جن آیات میں قلب کا تذکرہ ہے اس کو تلاش کر سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ دل کا تذکرہ دل کے نام سے ہی ہو، قلب کا تذکرہ قلب کے عنوان سے ہی ہو، ممکن ہے مادہ قلب استعمال نہیں ہوا ہو بلکہ کسی اور صدر کے ذریعے سے مثلاً فہم کے ذریعے سے، تعقل کے ذریعے سے اور بہت سارے عناوین سے قرآن نے قلب کا ذکر کیا ہو، معجم سے بھی کام لے سکتے ہیں لیکن بہتر ہے کہ اول سے یعنی بسم اللہ سے لے کر والناس تک ایک دفعہ دیکھیں کہ دل اور دل کے مترادف، ہم معنیٰ اور قریب المعنیٰ الفاظ قرآن نے کس لئے استعمال کیے ہیں؟ پھر ہمیں بخوبی اندازہ ہوگا کہ دل کیا چیز ہے؟ دل سے متعلق قرآنی اصطلاحات واستعمالات کا محصول وماحصل یہ ہے کہ دل مرکزِ فہم انسان ہے۔

صدرالمتالھینؒ نے ایک شعر نقل کیا ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیشہ جگہوں کے نام، مقامات کے نام ان چیزوں کی وجہ سے پڑتے ہیں کہ جو چیزیں ان کے اندر موجود ہیں، مثلاً جہاں پر

جانور باندھے جائیں اس کو کیا کہیں گے؟ باڑہ، طویلہ یعنی جہاں ریوڑ باندھا جائے اور جہاں گاڑیاں کھڑی کی جائیں اس کو گیرج (Garage) کہیں گے، جہاں پر غلہ انبار کیا جائے اس کو گودام (Godown) یا اسٹور (Store) کہیں گے اور وہیں سے غلے کی بوریاں اٹھا کر گھوڑے باندھیں تو اس کو کیا کہیں گے؟ اصطبل، جہاں صنعتی اشیاء رکھی جاتی ہیں اسے ویئر ہاؤس (Warehouse) کہیں گے یعنی جگہ کا نام چیز کی وجہ سے ہے کہ جو اس کے اندر پڑی ہوئی ہے، ظرف کا نام مظروف کی وجہ سے ہے، مثلاً آپ نے ایک شیڈ (Shed) بنایا کہ جو خالی شیڈ ہے، اس کو کچھ بھی نہیں کہیں گے، نہ گودام کہیں گے اور نہ ہی اصطبل کہیں گے، پہلے انتظار کریں گے کہ اس میں کچھ رکھا جائے تا کہ پتہ چلے کہ یہ کیا ہے؟ اگر آپ نے اس میں گاڑیاں کھڑی کرنی شروع کر دیں تو اسی کو گیرج کہیں گے، اگر آپ نے اسی میں گھوڑے باندھ دیئے اسی کو اصطبل کہیں گے، اگر آپ نے اسی میں بوریاں رکھی ہیں تو اس کو گودام کہیں گے، اگر ان اشیاء کی وجہ سے نام پڑتا ہے تو پھر دل کس کو کہتے ہیں؟ دل اس کو کہتے ہیں کہ جس میں یادِ خدا ہو۔ امام صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ

اَلْقَلْبُ حَرَمُ اللهِ......(۲)

دل اللہ کا حرم ہے......

قلب اسی کو کہتے ہیں کہ جس میں یادِ خدا ہو، جس میں یادِ خدا نہ ہو تو اس کو دل نہیں کہتے ہیں صدر المتالہین فرماتے ہیں کہ بعض نے اس کو دل غلط کہا ہے، پہلے ان کے اندر جا کر دیکھو کہ کیا ہے؟ مثلاً جہاں حبِ مال ہو، صبح و شام مال کی فکر میں ہو تو اس کو آپ کیا کہیں گے؟ اس کو دل تو نہیں کہہ سکتے

ہو بلکہ اس کو بینک کہیں گے، بعض ایسے ہیں کہ جن کو غلوں سے زیادہ رغبت ہے، غذاؤں سے زیادہ رغبت ہے تو یہ تو گودام ہے دل نہیں ہے، بعض ایسے ہیں کہ جن کو گاڑیوں کی محبت ہے تو یہ تو گیرج ہے دل نہیں ہے لہٰذا اکثر دل کہ جن کو ہم دل کہتے ہیں اگر ان کا دروازہ کھول کر دیکھیں تو یا گودام ہوں گے یا اصطبل ہوں گے اور اصطبل و گودام میں خدا نہیں ہے اور نہ پاکی و تطہیر ہے۔

۳)قلب کو قلب کیوں کہتے ہیں؟

قلب کو قلب کیوں کہتے ہیں؟

دل کو دل کس وجہ سے کہتے ہیں؟ قلب کو قلب کس وجہ سے کہتے ہیں؟ تقلب کی وجہ سے اسے قلب کہتے ہیں یعنی دائماً ایک حال سے دوسرے حال میں بدلتا رہتا ہے اور چونکہ یہ دل بھی کہ جو سینے میں ہے، جو پمپ کا کام کرتا ہے یہ بھی دائماً حالت بدلتا رہتا ہے، ایک حال سے دوسرے حال میں جاتا رہتا ہے اس وجہ سے اس کو بھی دل کہتے ہیں، قلبِ حقیقیِ انسان بھی اسی طرح سے ہے، دائماً ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

٤)قرآن کے مطابق قلب کی مختلف حالتیں اور اقسام

قرآن مجید نے بطورِ مفصل قلبِ انسان کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے مختلف حالات اور اقسام ذکر کی ہیں۔ مثبت حالات، منفی حالات اور مناسب و نامناسب حالات دونوں ذکر کئے ہیں، ذیل میں ان کی فہرست درج کی جارہی ہے۔

۱)**قلبِ غلیظ:**(سورۂ آلِ عمران ۳، آیہ ۱۵۹)

۲)**قلبِ سلیم:**(سورۂ شعراء ۲۶، آیہ ۸۹)(سورۂ صافات ۳۷، آیہ ۸۴)

۳)**قلبِ متکبر و جبار:**(سورۂ غافر ۴۰، آیہ ۳۵)

۴)**قلبِ منیب:**(سورۂ ق ۵۰، آیہ ۳۳)

۵)**قلبِ اثیم:**(سورۂ بقرہ ۲، آیہ ۲۸۳)

۶)**قلبِ مطمئن:**(سورۂ نحل ۱۶، آیہ ۱۰۶)(سورۂ بقرہ ۲، آیہ ۲۶۰)(سورۂ رعد ۱۳، آیہ ۲۸)

(سورۂ انفال ۸، آیہ ۱۰)

۷)**قلبِ غافل:**(سورۂ کہف ۱۸، آیہ ۲۸)

۸)**قلبِ مریض:**(سورۂ احزاب ۳۳، آیہ ۶۰ & ۳۲، ۱۲)(سورۂ بقرہ ۲، آیہ ۱۰ & ۷)

(سورۂ مائدہ ۵، آیہ ۵۲)(سورۂ انفال ۸، آیہ ۴۹)(سورۂ توبہ ۹، آیہ ۱۲۵)

(سورہ نور ۲۴، آیہ ۵۰)(سورۂ محمدؐ ۴۷، آیہ ۲۹ & ۲۰)(سورۂ مدثر ۷۴، آیہ ۳۱)

۹)**قلبِ مختوم:**(سورۂ جاثیہ ۴۵، آیہ ۲۳)(سورۂ انعام ۶، آیہ ۴۶)

۱۰)**قلبِ واحد:**(سورۂ احزاب ۳۳، آیہ ۴)

۱۱)**قلبِ مرعوب:**(سورۂ آلِ عمران ۳، آیہ ۱۵۱)(سورۂ انفال ۸، آیہ ۱۲)

(سورۂ احزاب ۳۳، آیہ ۲۶) (سورۂ حشر ۵۹، آیہ ۲)

۱۲) قلبِ مطبوع: (سورۂ اعراف ۷، آیہ ۱۰۱) (سورۂ یونس ۱۰، آیہ ۷۴)

(سورۂ روم ۳۰، آیہ ۵۹) (سورۂ اعراف ۷، آیہ ۱۰۰) (سورۂ توبہ ۹، آیہ ۹۳&۸۷) (سورۂ نحل ۱۶، آیہ ۱۰۸) (سورۂ محمد ۴۷، آیہ ۱۶)

(سورۂ منافقون ۶۳، آیہ ۳)

۱۳) قلبِ نافہم: (سورۂ اعراف ۷، آیہ ۱۷۹)

۱۴) قلبِ مزیغ: (سورۂ توبہ ۹، آیہ ۱۱۷) (سورۂ آلِ عمران ۳، آیہ ۸)

(سورۂ صف ۶۱، آیہ ۵)

۱۵) قلبِ متقی: (سورۂ حج ۲۲، آیہ ۳۲)

۱۶) قلبِ عاقل: (سورۂ حج ۲۲، آیہ ۴۶)

۱۷) قلبِ اعمیٰ: (سورۂ حج ۲۲، آیہ ۴۶)

۱۸) قلبِ متقلب: (سورۂ نور ۲۴، آیہ ۳۷)

۱۹) قلبِ مشمئز: (سورۂ زمر ۳۹، آیہ ۴۵)

۲۰) قلوب در حناجر: (سورۂ احزاب ۳۳، آیہ ۱۰) (سورۂ غافر ۴۰، آیہ ۱۸)

۲۱) قلبِ مقفل: (سورۂ محمدؐ ۴۷، آیہ ۲۴)

۲۲)قلب با سکینه: (سورۂ فتح ۴۸، آیہ ۱۸&۴)

۲۳)قلبِ رؤوف، قلبِ رحیم، قلبِ راهب: (سورۂ حدید ۵۷، آیہ ۲۷)

۲٤)قلبِ واجف: (سورۂ نازعات ۷۹، آیہ ۸)

۲۵)قلبِ صایغ: (سورۂ تحریم ۶۶، آیہ ۴) (سورۂ انعام ۶، آیہ ۱۱۴)

۲٦)قلبِ قاسیه: (سورۂ بقرہ ۲، آیہ ۷۴) (سورۂ مائدہ ۵، آیہ ۱۳) (سورۂ حج ۲۲، آیہ ۵۳) (سورۂ زمر ۳۹، آیہ ۲۲) (سورۂ حدید ۵۷، آیہ ۱۶)

۲۷)قلبِ مألوف: (سورۂ آلِ عمران ۳، آیہ ۱۰۳) (سورۂ انفال ۸، آیہ ۶۳) (سورۂ توبہ ۹، آیہ ۶۰)

۲۹)قلبِ عامد: (سورۂ احزاب ۳۳، آیہ ۵)

۳۰)قلبِ مطهر: (سورۂ احزاب ۳۳، آیہ ۵۳)

۳۱)قلبِ معلوم: (سورۂ احزاب ۳۳، آیہ ۵۱)

۳۲)قلبِ مزیّن: (سورۂ فتح ۴۸، آیہ ۱۲) (سورۂ حجرات ۴۹، آیہ ۷)

۳۳)قلبِ مغلوف: (سورۂ بقرہ ۲، آیہ ۸۸) (سورۂ نساء ۴، آیہ ۱۵۵)

۳٤)قلبِ بے ایمان: (سورۂ حجرات ۴۹، آیہ ۱۴)

۳۵)قلبِ مکنون (محجوب): (سورۂ فصلت ۴۱، آیہ ۵)

(سورۂ انعام ۶، آیہ ۲۵)

(سورۂ اسراء ۱۷، آیہ ۴۶)

(سورۂ کھف ۱۸، آیہ ۵۷)

۳۶)قلب با غِل: (سورۂ حشر ۵۹، آیہ ۱۰)

۳۷)قلبِ مشرّب: (سورۂ بقرہ ۲، آیہ ۹۳)

۳۸)قلوبِ متشابه: (سورۂ بقرہ ۲، آیہ ۱۱۸)

۳۹)قلب با حسرت: (سورۂ آلِ عمران ۳، آیہ ۱۵۶)

٤٠)قلبِ منافق: (سورۂ آلِ عمران ۳، آیہ ۱۶۷) (سورۂ مائدہ ۵، آیہ ۴۱)

(سورۂ توبہ ۹، آیہ ۷۷) (سورۂ ھود ۱۱، آیہ ۴۸)

٤١)قلبِ مطهر و نجس: (سورۂ مائدہ ۵، آیہ ۴۱)

٤٢)قلبِ واجل: (سورۂ انفال ۸، آیہ ۲) (سورۂ حج ۲۲، آیہ ۳۵)

(سورۂ مومنون ۲۳، آیہ ۶۰)

٤٣)قلبِ آبی (مائع): (سورۂ توبہ ۹، آیہ ۸)

٤٤)قلب با غیظ: (سورۂ توبہ ۹، آیہ ۱۵)

٤٥)**قلبِ مرتاب:**(سورۂ توبہ۹، آیہ۱۱۰&۴۵)(سورۂ نور۲۴، آیہ۵۰)

٤٦)**قلبِ منصرف:**(سورۂ توبہ۹، آیہ۱۲۷)

٤٧)**قلبِ مشدّد:**(سورۂ یونس۱۰، آیہ۸۸)

٤٨)**قلبِ منکر:**(سورۂ نحل۱۶، آیہ۲۲)

٤٩)**قلبِ مربوط:**(سورۂ کہف ۱۸، آیہ۱۴)

٥٠)**قلبِ لاهی:**(سورۂ انبیاء۲۱، آیہ۳)

٥١)**قلبِ محبت:**(سورۂ حج ۲۲، آیہ۵۴)

٥٢)**قلبِ غامر:**(سورۂ مؤمنون۲۳، آیہ۶۳)

٥٣)**قلبِ مفزع:**(سورۂ سبا۳۴، آیہ۲۳)

٥٤)**قلبِ لین:**(سورۂ زمر۳۹، آیہ۲۳)

٥٥)**قلبِ متعصب:**(سورۂ فتح۴۸، آیہ۲۶)

٥٦)**قلبِ ممتحن:**(سورۂ حجرات۴۹، آیہ۳)

٥٧)**قلبِ خاشع:**(سورۂ حدید۵۷، آیہ۱۶)

۵۸)قلبِ مؤمن: (سورۂ مجادلہ ۵۸، آیہ ۲۲)

۵۹)قلوبِ متفرقہ: (سورۂ حشر ۵۹، آیہ ۱۴)

۶۰)قلبِ مرین: (سورۂ مطففین ۸۳، آیہ ۱۴)

الغرض یہ قلب کبھی اپنی بہترین حالت پر ہوتا ہے، بہترین قلب یعنی ایسا قلب جو پاک وصاف ہو، باطہارت ہو اور نامناسب قلب یعنی جس کی حالت مناسب نہ ہو، جو بیمار دل ہو۔ انشاء اللہ اس فصل کے حصہ دوم میں دل کی کچھ بیماریوں کی طرف مختصراً اشارہ کیا جائے گا۔

یہاں یہ نکتہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ آدابِ قرآن کی اس بحث کو پڑھ لینے سے انسان مؤدب بہ آداب نہیں ہو جاتا ہے۔ یہاں صرف آداب کی نشاندہی ہو رہی ہے یعنی شناخت و آگاہی پیدا کر رہے ہیں لیکن یہ آداب ایجاد کرنے کی اور ان کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے، ان میں سے ہر ادب تک پہنچنے کے لئے انسان کو محنت و زحمت اور عملی کوشش کی ضرورت ہے اور اس کوشش کے بغیر انسان کسی ایک ادب سے بھی متصف نہیں ہو سکتا ہے مثلاً فہمِ عظمتِ قرآن میں صرف اشارہ دینا اور توجہ دلانا مقصود تھا کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے عظمتِ کلامِ الٰہی کی طرف توجہ ضروری ہے نہ یہ کہ اب جبکہ ہم نے یہاں پر پڑھ لیا ہے کہ آدابِ فہمِ قرآن میں سے ایک توجہ درِ عظمتِ قرآن ہے تو پس ایک ادب ہمارے اندر پیدا ہو گیا ہے، نہیں بلکہ ایک ادب کی طرف ہماری توجہ ہوئی ہے، ابھی اس ادب تک پہنچنا اور اس سے متأدب ہونا باقی ہے، اس ادب سے اپنی فہم کو متصف کرنا ہنوز باقی ہے۔ اسی طرح ادبِ دوم طہارتِ قلب ہے یعنی دلِ انسان پاک ہو، انسان اپنے دل کو پاک کرے۔ ناپاک

دل کبھی بھی قرآن نہیں سمجھ سکتا ہے، ابھی اشارہ ہوگا کہ دل کی تطہیر سے کیا مراد ہے، پس ان آداب کو پڑھ لینے کے بعد اور توجہ ہو جانے کے بعد پھر عملاً کوشش کریں کہ یہ آداب ہمارے اندر پیدا ہو جائیں، ان آداب سے ہمارا نفس، ہمارا دل اور ہمارا وجود متصف و مزین ہو جائے، یہ صفات عملی طور پر ہمارے عمل کے اندر اور ہماری فہم کے اندر رونما ہو جائیں۔

۵) حقیقی دل اور اعزازی دل

چونکہ قرآن دل پہ نازل ہوا ہے پس دل کا تعلق فہم سے ہے اور دل سے مراد بھی روح کا دل، نفس کا دل ہے کہ جو حقیقی دلِ انسان ہے۔ سینے کے اندر موجود دل کو مجازاً، اعزازی طور پر دل کہتے ہیں جیسے ہم اعزازی طور پر کسی کو بہت سارے عناوین دے دیتے ہیں درحالیکہ حقیقتاً وہ اس مصداق کے اور اس عنوان کے قابل نہیں ہوتا ہے، اعزازی طور پر یعنی عزت بخشی کے لئے، عزت افزائی کے لئے کوئی نہ کوئی لقب دے دیتے ہیں، مثلاً علمی ڈگریاں ہیں کہ اعزازی طور پر حکمرانوں کو یا کسی ایسی شخصیت کو کہ جس نے کوئی کارنامہ کیا ہے اسے دے دیتے، جیسے چھوٹے چھوٹے بچوں کو قرآن سنانے پر ڈاکٹریٹ (Doctorate) کی ڈگری دے دیتے ہیں، یہ اعزازی ڈگریاں ہیں نہ کہ وہ واقعاً ڈاکٹر ہو گیا ہے یا پی ایچ ڈی کر لی ہے، یہ عزت افزائی کے لئے ہے چونکہ اس نے قرآن سیکھا ہے، پڑھا ہے اور لوگوں کو محظوظ کرتا ہے۔

یہ اعزاز دینا دین میں بھی ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے بھی بعض کو اعزازی ڈگریاں دی

ہیں جیسے اعزازی شہداء ہیں، شہیدِ حقیقی وہ ہے جو معرکۂ حق و باطل میں قتل ہو جائے یعنی میدان میں، مقتل میں خود جائے اور اپنی موت کو اور شہادت کو خود چنے و انتخاب کرے یعنی جو زندگی پر موت کو ترجیح دے اور موت کو اپنے لئے انتخاب کرے تو یہ شہیدِ حقیقی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا......(۳)

اور خبردار راہِ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرنا......

وہ جو چل کے جاتا ہے، موت اور حیات میں موت کو اپنے لئے منتخب کرتا ہے وہ حقیقی شہید ہے لیکن کچھ ایسے لوگ ہیں کہ جو اچھے اعمال انجام دیتے ہیں، جن کے اندر اچھی اچھی صفات موجود ہیں اور جن کے اندر بہت ساری خوبیاں ہیں تو ان کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور ان کو بھی یہ عزت دی گئی ہے کہ انہیں بھی شہداء کا درجہ دیا گیا ہے کہ اگر کوئی انسان یہ کام کرتے ہوئے مر جائے تو وہ بھی شہید ہے حتیٰ

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مالِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ......(۴)

جو اپنے مال سے دفاع میں مارا جائے وہ شہید ہے......

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ أَهْلِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ......(۵)

جو اپنے اہل خانہ کو بچاتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے......

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ......(۶)

جو اپنے خون (جان) کو بچاتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے......

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَظْلَمَتِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ......(۷)

جو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے......

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِيَالِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ......(۸)

جو اپنے عیال کو بچاتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے......

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ نَفْسِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ......(۹)

جو اپنے نفس کو بچاتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے......

اسی طرح وارد ہوا ہے کہ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِرْضِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، یعنی اگر کوئی اپنی عزت کو بچاتے ہوئے مارا جائے تو وہ شہید ہے۔ حتیٰ اگر انسان اپنے حق کا دفاع کرتا ہے اور مرنا بھی نہیں چاہتا ہے لیکن کسی نے مار دیا تو وہ بھی شہید ہے، یہ اعزاز ہے جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے دیا ہے۔ اسی طرح ایک دلِ حقیقی ہے یعنی جو انسان کی روح کا دل ہے، نفس کا دل ہے، دلِ غیر جسمانی ہے لیکن عزت واعزاز کے لئے جو دل بدن میں خون پہنچاتا ہے یہ بھی بدن اور جسم کے اندر ایک اہمیت رکھتا ہے اور حیاتِ بدن اس کی رہینِ منت ہے اس وجہ سے اس کو بھی دل کہتے ہیں۔

٦) خود فراموشی، خدا فراموشی کا نتیجہ

اگر ہم مختصر یا آسان لفظوں میں دل کی معرفت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو یہ وہ چیزیں ہے کہ جو ہمارے اندر ہیں لیکن ہم ان کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتے ہیں، انسان خود اپنی شناخت نہیں رکھتا ہے۔

انسان، انسان کے لئے منکشف نہیں ہے، اس لئے یہ چیزیں معلوم نہیں ہوتیں کہ روح کیا ہے؟ بااینکہ خود روح ہے، یہی جو سوال اٹھا رہی ہے کہ روح کیا ہے؟ یہ خود روح ہے، یہ سوال کہ نفس کیا ہے؟ یہ خود نفس ہے۔ نفس، نفس کی طرف متوجہ نہیں ہے، قرآن نے بھی فرمایا ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ٥(١٠)

اور خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کے نفس کو بھی بھلا دیا اور وہ سب واقعی فاسق و بدکار ہیں۔

یعنی خدا کو نہ بھولنا ورنہ خود کو بھی بھول جاؤ گے، یہ خود فراموشی ہے کہ انسان سوال کرے کہ نفس کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ یعنی یہ پوچھے کہ میں کیا ہوں، دوسرے لفظوں میں بازار میں جا کر کسی کو روک کر پوچھیں کہ آغا میں کون ہوں؟ تو وہ انسان تعجب کرے گا کہ یہ کیا سوال ہے؟ میرے بارے میں تو پوچھ سکتے ہو کہ آپ کون ہو؟ لیکن خود اپنے بارے میں پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں؟ جب ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ روح کیا ہے؟ جب ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ نفس کیا ہے؟ تو دوسرے لفظوں میں ہم یہ پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ میں کیا ہوں؟ دوسروں کو کیا معلوم کہ میں کیا ہوں؟ خود مجھ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کیا ہوں، مجھے یہ حق ہے کہ میں یہ پوچھوں کہ زمین کیا ہے؟ آسمان کیا ہے؟ پانی کیا ہے؟ آگ کیا ہے؟ یہ چیزیں تو پوچھ سکتا ہوں چونکہ میرے علاوہ ہیں، مجھ سے باہر ہیں لیکن میں خود اپنے آپ سے اتنا دور ہوں، اتنا حقیقت ناشناس ہوں، اتنا غافل ہوں کہ حتیٰ اپنی پہچان بھی نہیں رکھتا ہوں، یہ سوال کہ میں کیا ہوں؟ دوسرے لفظوں میں یہی پوچھنا ہے، اور یہ مشکل سب کے ساتھ نسیان

کی وجہ سے ہے، اس نکتے کے بارے میں نہی کی گئی ہے، متنبہ، ہوشیار اور خبر دار کیا گیا ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ......

اور خبر دار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کے نفس کو بھی بھلا دیا......

یہ خدا فراموشی کا نتیجہ ہے، خدا سے دوری کا نتیجہ ہے کہ انسان خود سے بھی دور ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ سوال کرتا ہے کہ دل کیا ہے؟ کوئی باہر کی چیز تو نہیں ہے، اپنے علاوہ کسی کے بارے میں تو سوال نہیں کر رہے ہیں، خود اپنی ہی ایک حقیقت پوچھ رہے ہیں کہ دل کیا ہے؟ ذہن کیا ہے؟ عقل کیا ہے؟ خیال کیا ہے؟ حس کیا ہے؟ یہ ساری چیزیں یعنی میں خود ہوں اور اپنے بارے میں ہی سوال کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں؟ میں اپنے لئے ناشناختہ ہوں، یہ خدا فراموشی اور خدا سے دوری کا نتیجہ ہے کہ خود اپنی حقیقت بھی معلوم نہیں ہے۔ معرفتِ دل، معرفتِ قلب بہت ضروری ہے چونکہ سارا دارومدار اس پر ہے اور اسی سے لاتعلقی اور دوری ہے۔

۷) قرآن کو کرتب کیلئے استعمال نہ کریں

اسلام کی تعلیمات کے مطابق مطالعۂ قرآن تدبر کے ساتھ کرنا چاہئے، روایات میں بھی ہے کہ کم از کم سات دن میں قرآن کا ایک دورہ ہونا چاہئے، اس سے متعلق چند روایات بھی ہیں، ایک روایت خود ذاتِ گرامی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص نے آکر پوچھا

کہ میں کتنے دنوں میں قرآن کا پورا دورہ کروں؟ جسے ابھی ہم ختمِ قرآن کہتے ہیں، حضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایک مہینے میں، کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ کم مدت میں ختم کرسکتا ہوں، حضرت ﷺ نے فرمایا تین ہفتوں میں پھر اس نے مثلاً کہا کہ اس سے بھی زیادہ جلدی پڑھ سکتا ہوں، پھر آخر میں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایک ہفتے میں، سات دن سے کم نہیں، سات دن سے کم قرآن جو پڑھا جائے گا وہ مطلوب نہیں ہے۔ جیسے سات منٹ میں سپارہ پڑھنا، فرمایا کہ نہیں، چونکہ قرآن سمجھنے کے لئے ہے، قرآن کرتب دکھانے کے لئے تو نہیں ہے، ابھی جو حشر قرآن کا ہو رہا ہے وہ شاید کسی اور زمانے میں نہیں تھا، کسی زمانے میں شیعوں کا رجحان قرآن پڑھنے کی طرف کم تھا لیکن اب جب کہ پڑھنا شروع کیا ہے تو الٹا پڑھنا شروع کیا ہے، قرآن کے آداب میں سے ہے کہ قرآن کو درست پڑھے، فہم کے ساتھ پڑھے، تدبر کے ساتھ پڑھے۔ قرآن کرتب دکھانے کے لئے تو نہیں ہے، ابھی آہستہ آہستہ جو حالت بنتی جارہی ہے وہ معاذ اللہ ایک طرح سے استخفاءِ قرآن ہے، یہ قرآن کا تمسخر ہے کہ اپنا بچہ متعارف کروانا ہے تو اس کو قرآن سکھا کر، قرآنی کرتب سکھا کر معرکے میں لے آئیں اور لوگوں کو جمع کر کے کچھ ایسی حرکتیں کریں۔ لوگ قرآن سے خوش نہیں ہوتے ہیں بلکہ بچے سے خوش ہوتے ہیں کہ یہ عجیب بچہ ہے، یہ عموماً ہوتا ہے کہ جب چھوٹا بچہ ہو تو لوگ زیادہ محظوظ ہوتے ہیں، ایک دن ٹی وی میں ایک بچے کے بارے میں بتا رہے تھے کہ اس کو پوری دنیا کی فٹبال ٹیموں کے نام معلوم تھے، کھلاڑیوں کے نام بھی معلوم تھے، دو تین سال کا چھوٹا سا بچہ تھا، بچوں سے ایسی چیزیں دیکھ کر انسان واقعاً محظوظ ہوتا ہے، لوگ قرآن سے نہیں بلکہ بچوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ قرآن تدبر و فہم

قرآن کو کرتب کیلئے استعمال نہ کریں

کیلئے ہے اور منشورِ حیات ہے،

قرآن کو تربیت کیلئے استعمال کریں

محرم کے تبلیغی سفر میں ایک جگہ جانا ہوا تو وہاں انہوں نے چاہا کہ اولاد کی تربیت کے بارے میں کچھ گفتگو ہو، بچوں کا ہر جگہ یہ ایک مسئلہ ہے، بہت ساری باتیں ہوئیں لیکن ان میں سے ایک بات یہ ہوئی کہ بچوں کی تربیت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ بچوں کے اندر موجود صلاحیتیں کہ جو خدا نے دی ہیں ان کو ابھارنا۔ سرکس (Circus) کا جانور بنانا تربیت نہیں ہوتی ہے۔ اس وقت جو غلط کام بنامِ تربیت ہو رہا ہے وہ یہی ہے، جانور کو سرکس کے لئے کرتب سکھائے جاتے ہیں اور پھر لا کر لوگوں کو متاثر کیا جاتا ہے مثلاً ہاتھی کیا کیا کام کرتا ہے، متاثر کرتا ہے اور تالیاں بجتی ہیں اس کو تربیت نہیں کہتے ہیں، یہ آفتِ تربیت ہے اور انحرافِ راہِ تربیت ہے، سرکس کا حیوان نہ بنائیں، مثلاً انہوں نے گھوڑے کو کیا کیا کرتب سکھائے ہوتے ہیں حتیٰ درندے یا شیر کو انہوں نے کیا سکھایا ہوتا ہے؟ گول دائرے میں آگ جل رہی ہوتی ہے اور وہاں سے شیر چھلانگ لگاتا ہے، اس شیر کو شرم بھی نہیں آتی ہے، اس کو یہ بھی احساس نہیں ہے کہ میں شیر ہوں، مجھے خدا نے ان کاموں کے لئے پیدا نہیں کیا ہے، بلی بھی یہ کام نہیں کرتی ہے کہ جو شیر سرکس کے مظاہرے میں جا کر کرتا ہے لیکن وہ اس لئے کرتا ہے کیونکہ اس کے اوپر مربیوں نے یہ کام کیا ہے، مربی بچوں کو سرکس کا حیوان نہ بنائیں کہ چند کرتب سکھائیں اور پھر اس کے بعد معرکہ لگائیں اور لوگ آ کر اسی طرح تالیاں بجائیں کہ جس طرح سرکس کے اس منظر میں خوش ہوتے ہیں، محظوظ ہوتے ہیں اور محظوظ ہو کر واپس چلے جاتے ہیں، بچہ بھی اپنے آپ کو پھر اسی طرح سمجھتا ہے۔

یہ تربیت نہیں ہے کہ جس طرح گنیز بک میں درج ہے کہ مونچھوں کے مقابلے میں ایک آدمی نے سونے کا تمغہ جیتا، اس کا نام اس کتاب میں لکھ دیا گیا ہے کہ یہ سب سے بڑا مونچھ باز آدمی ہے، اس نے مونچھ کی پرورش کی ہے، اسی طرح داڑھی کے مقابلے ہوتے ہیں، اب ان کے اپنے معیار ہوتے ہیں کہ کس طرح کی داڑھی پہلے نمبر پر آئے گی، بعض داڑھی کا تمغہ جیت لیتے ہیں، اس طرح کے مختلف مقابلے ہوتے ہیں مثلاً کھانے کا بھی مقابلہ ہوتا ہے کہ ایک انسان اپنے وزن کے برابر کھانا کھالے۔ خدا نے انسان کے اندر بے پناہ صلاحیتیں رکھی ہیں، تربیت کا مطلب ان صلاحیتوں کو ابھارنا ہے، پہلے پہچانو کہ تمہارے بچے کے اندر خدا نے کیا کیا رکھا ہے؟ پھر اس کی ان صلاحیتوں کو پروان چڑھاؤ، اس کو انسان بناؤ نہ کہ لوگوں کو محظوظ کرنے کا ایک ذریعہ۔

۸) قرآن کے مطابق دل کے امور کی اقسام

خدا نے انسان کے وجود کے اندر جو قوت سمجھنے کے لئے دی ہے اس کو دل کہتے ہیں، دوم یہ مرکزِ احساساتِ انسان ہے کہ جہاں پر انسانی احساسات متمکن ہیں، چونکہ فہم کے ساتھ ساتھ انسان کے کچھ احساسات بھی ہیں یعنی رجحانات وعواطف، جیسے محبت ہے، نفرت ہے، تمایل ہے، یہ احساسات ہیں فہم نہیں ہیں، یہاں انسان کے اندر شہوت ابھرتی ہے، جیسے ہمیں کوئی چیز اچھی لگتی ہے یا کسی چیز کی طرف جی کر رہا ہوتا ہے تو کہتے ہیں مثلاً اس وقت جی کرتا ہے کہ سو جاؤں، یہ جی کرنا یعنی وہیں دل میں ہے یعنی ایک احساس انسان کے منبعِ دل سے اٹھا ہے اور کسی شے کی طرف اٹھا ہے،

چونکہ دل کے اندر رغبتیں موجود ہیں اور سوم یہ مرکزِ تحرکات ہے، انسان کے اندر تحریکات پیدا ہوتی ہیں یعنی انسان کو حرکات، افعال اور اعمال پر اکسانے والی قوت بھی دل ہے، ہمارے اندر جب کوئی بھی ایسا جوش پیدا ہوتا ہے، ولولہ پیدا ہوتا ہے، کچھ کرنے کو جی کرتا ہے تو یہ بھی دل ہی ہے اور بسا اوقات کہتے ہیں کہ کچھ کرنے کو جی نہیں کرتا ہے، مثلاً جی نہیں کرتا ہے کہ اٹھوں، جی نہیں کرتا ہے کہ پڑھوں، جی نہیں کرتا ہے کہ سنوں یعنی تحریک کے قابل نہیں ہے، دل مر گیا ہے، تحریک کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ زندہ دل ہو، چست ہو، جب دل سست ہو جاتا ہے تو سست دل نہ خود کچھ کرتا ہے اور نہ کچھ کرنے کے لئے کسی کو اکساتا ہے۔ یہ تین چیزیں قرآن نے دل سے منسوب کی ہیں، فہم دل کا کام ہے، احساسات دل کا کام ہے اور اس کے بعد تحریکات یا اکسانا بھی دل کا کام ہے اور قرآن چونکہ فہم سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا محل نزولِ قرآن دل ہے، جسم کے کسی اور حصے پر یعنی اس عالم میں بھی قرآن کسی اور چیز پر نازل نہیں ہوا ہے، قرآن صفحوں پر، جلدوں پر یا زبانوں پر نازل نہیں ہوا ہے بلکہ قرآن دل پر نازل ہوا ہے، دل کا کام سمجھنا ہے، دل پر نزول ہی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن فہم کے لئے آیا ہے، تدبر اور تعقل کے لئے آیا ہے، البتہ جب تک یہ محلِ نزولِ قرآن آمادہ نہ ہو، تیار نہ ہو تو اس کے اندر قرآن نہیں اترتا ہے، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے،

خلوتِ دل نیست جایِ صحبتِ اضداد

دیو چو بیرون رود فرشتہ در آید...... (۱۱)

دیو کنایہ ہے، شعری زبان میں اور ادیبوں کی زبان میں ناپاک چیز، غلط چیز، منحوس چیز اور

قرآن کے مطابق دل کے امور کی اقسام

مضر چیز کو دیو کہتے ہیں، اسے تلفظ فارسی میں دِیوْ کہتے ہیں چونکہ اصل لفظ فارسی کا ہے لیکن اردو میں اس کو دیُو کہتے ہیں، اصل دِیوْ ہے کہ جو درست ہے یعنی ہمارے وجود سے یہ دیو نکلے تو فرشتہ داخل ہوگا، دِیو یعنی بھوت، جب تک انسان کے اندر بھوت بیٹھا ہوا ہو تو وہاں فرشتہ داخل نہیں ہوتا، پہلے انسان کا دل پاک وصاف ہو، انسان کے تکامل کے لئے، فہم کے لئے بھی، عمل کے لئے بھی، تربیت کے لئے بھی اور تعلیم وتادیب کے لئے تطہیرِ قلب اساسی ترین ادب ہے۔

۹)قرآن ظرفِ نورانی پر اترتا ھے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ

اَلْعِلْمُ نُوْرٌ یَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِیْ قَلْبِ مَنْ یَّشَاءُ... ...(۱۲)

علم نور ہے اللہ جس کے دل میں چاہتا ہے اسے ڈال دیتا ہے......

قرآن نے بھی علم کو نور کہا ہے، ظاہر ہے کہ نور جس محل کے اندر جائے گا وہ محل بھی نورانی ہونا چاہئے لہٰذا عبارتیں از بر کر کے یا اصطلاحیں رٹ کے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں عالم ہوگیا ہوں، اس کو عالم نہیں کہتے ہیں بلکہ علم نور ہے اور نور نورانی ظرف کے اندر آتا ہے، اگر دل نورانی نہ ہو، وجود نورانی نہ ہو تو یہ نور اس کے اندر جاتا ہی نہیں ہے اور اگر بالفرض چلا جائے تو یہ نور خود بھی ظلمت میں بدل جاتا ہے، طہارت اور نجاست کا قانون یہ ہے کہ جب بھی طہارت ونجاست کو آپس میں ملائیں تو جو پاک چیز ہے وہ بھی نجس ہوجاتی ہے، ایک ناپاک اور پاک کو ملائیں تو مجموعہ ناپاکی ہے، ایک اچھے دوست

اور ایک غلط دوست کی دوستی کا نتیجہ غلط ہے چونکہ ان دونوں میں سے ایک غلط ہے، اہلِ منطق کہتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ ادنیٰ مقدمے کے تابع ہوتا ہے، جو گھٹیا مقدمہ ہو نتیجہ ہمیشہ اس کا ہوتا ہے اعلیٰ کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔

اگر ایک متدین اور ایک غیر متدین آدمی مل کر ایک کام کریں تو اس کا مجموعہ عدمِ تدین ہے، اس کا نتیجہ کبھی بھی دین داری نہیں نکلے گا، ایک فاسق اور ایک مومن آپس میں مل جائیں تو اس کا مجموعہ یا نتیجہ فسق ہے، عملی اور علمی طور پر بھی یہی ہے یعنی علمی نتیجے بھی گھٹیا عضو و جزو کے تحت ہوتے ہیں اور عملی نتیجے بھی گھٹیا عضو و جزو کے تحت ہوتے ہیں۔

اگر پوری جماعت پاک ہو لیکن اس میں چند افراد ناپاک ہوں تو یہ پوری جماعت ناپاک ہو جاتی ہے۔ اگر علم نور ہے تو نور کا محل بھی نورانی ہونا چاہئے، ہدایتِ قرآن بھی نور ہے اور یہ نور اس دل میں جائے گا کہ جو دل پاک ہو، نورانی ہو، البتہ ہر چیز کی پاکی اور طہارت الگ الگ ہے، اگر دل پاک نہ ہو تو علم کبھی بھی اس دل میں نہیں اترتا ہے۔ الفاظ آجاتے ہیں، اصطلاحیں آجاتی ہیں لیکن نورانیت نہیں آتی ہے۔

قرآن بھی نور ہے لیکن اس وقت کمپیوٹر کی مدد سے ایک کام یہ ہو رہا ہے کہ قرآن میں کتنے الف ہیں مثلاً بعض لوگوں کو معلوم ہے کہ قرآن میں کتنے الف ہیں، کتنے ب ہیں، کتنے نقطے ہیں، کتنے زیر و زبر ہیں، یہ علم نہیں ہے بلکہ ذہنی مہارتیں ہیں، یہ گنیز بک کے لئے ٹھیک ہیں لیکن ہدایت کے لئے مفید نہیں ہیں، ہدایت کے لئے آپ کسی روایت میں نہیں پڑھیں گے کہ قرآن میں

قرآن ظرفِ نورانی پر اترتا ہے

اتنے الف استعمال ہوئے ہیں، اتنے ن استعمال ہوئے ہیں اور اتنے د استعمال ہوئے ہیں، اگر یہ علم ہوتا اور ضروری ہوتا تو یقیناً ائمہ ہدیٰ علیہم السلام بیان فرما دیتے یا اشارہ کر دیتے کہ خبردار یہ خیال رکھنا کہ آپ کو قرآن میں استعمال ہونے والے الف کی تعداد معلوم ہونی چاہئے، یہ علم نہیں ہے، یہ ہدایت نہیں ہے بلکہ انحراف ہے، یہ قرآن کے نام پر قرآن سے دوری ہے، انہی کاموں سے قرآن مہجور رہ جاتا ہے، قرآن دل پر نازل ہوا ہے اور دل کو آمادہ کرنے کی ضرورت ہے لہٰذا خداوند تبارک وتعالیٰ نے بھی یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ أَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ (۱۴)

پس خدا جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار گزار بنا دیتا ہے جیسے آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو، وہ اسی طرح بے ایمانوں پر ان کی کثافت کو مسلّط کر دیتا ہے۔

ہم ہدایت دینے سے پہلے ظرفِ ہدایت کو درست کرتے ہیں، پہلے شرحِ صدر دیتے ہیں پھر اس کے اندر ہدایت دیتے ہیں، اسی لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن نازل کرنے سے پہلے سینہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آمادہ کیا گیا، سینے سے مراد جسمانی سینہ نہیں ہے، صدر سے مراد وجود کا صدر ہے، روح کا صدر ہے، نفس کا صدر ہے، اس کو خداوند نے تیار کیا،

أَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ٥ (١۴)

کہ کیا ہم نے آپ کا ظرف آمادہ نہیں کیا؟ اور اسی سے ساری مشکلیں حل ہوئیں،

وَوَضَعْنَا عَنکَ وِزْرَکَ٥ (١۵)

ہم نے وزرک ختم کر دیا ہے لہٰذا قولِ ثقیل آیا اور آسانی سے تحمل ہوگیا، جس کو زمین اور آسمان برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ قلبِ نورانیٔ پیغمبر اکرم ﷺ نے برداشت کرلیا، کیوں؟ اس لئے کہ قلب پاک تھا، دل مطہر تھا، یہ وزرک کیسے ختم ہوگیا؟ پیغمبر اکرم ﷺ کو فرمایا گیا کہ آپ اس فرصتِ شب سے استفادہ کریں،

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ...... (١۶)

رات کے عالم سے فائدہ اٹھائیں، کیوں فائدہ اٹھائیں؟ چونکہ عنقریب

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا٥ (١٧)

ایک بہت گراں چیز، ثقیل چیز کہ جس کو پہاڑ برداشت نہیں کر سکتا ہے، طور برداشت نہیں کر سکتا ہے، وہ آپؐ کے قلب پر نازل کرنے والے ہیں لہٰذا اپنے قلب کو آمادہ کریں۔ پاک دل پر قرآن اترتا بھی ہے اور پھر سمجھ بھی آتا ہے۔ عام مومن کے لئے، عام انسان کے لئے قانون یہ ہے کہ پہلے دل کو آمادہ اور پاک کرے۔

۱۰)طہارتِ ظاہری و طہارتِ باطنی

چونکہ قرآن کو اپنے دل میں اتارنے اور حاملِ قرآن بننے کیلئے طہارتِ قلب ضروری ہے لہٰذا طہارت بہت اہم موضوع ہے، طہارتِ ظاہری پر تو کم و بیش توجہ ہوتی ہے، کم از کم متدینین کی اس طرف توجہ ہے لیکن یہ سمبولک طہارت (Symbolic cleanliness) ہے یعنی یہ علامتی طہارت ہے، یہ ایک حقیقی طہارت کے لئے علامت ہے، بہت سارے کام ہم سے علامتی کروائے جاتے ہیں، علامتی کام ان کو کہتے ہیں کہ جنہیں انسان سے انجام دلوایا جاتا ہے تاکہ بعد میں انسان کوئی حقیقی کام کر سکے، علامتی کام سمجھنے کے لئے ہوتے ہیں مثلاً جنگی مشقیں دیکھیں کہ جو ایک فوج خود کرتی ہے، فوج دو حصوں میں بٹ جاتی ہے، ایک حصہ دشمن بن جاتا ہے اور ایک حصہ ملک کا حامی بن جاتا ہے، فوج کا ایک حصہ حملہ کرتا ہے اور دوسرا حصہ دفاع کرتا ہے اور جنگی مشقوں میں حقیقی اسلحہ استعمال نہیں کرتے ہیں، اس میں جو گولیاں چلتی ہیں یا توپ اور ٹینک کے گولے استعمال ہوتے ہیں وہ بھی اصلی نہیں ہوتے بلکہ صرف آواز اور دھواں ہوتا ہے، ان کے اندر کوئی بارود موجود نہیں ہوتا جو جا کر نقصان کرے، اس لئے کہ علامتی جنگ ہے، کیا فائدہ ہے علامتی جنگ کروانے کا کہ جب گولی صحیح نہیں ہے اور اس کا مقصود مارنا بھی نہیں ہے؟ یہ علامتی جنگ ایک حقیقی جنگ کا مقدمہ ہے، چونکہ ایک حقیقی جنگ ہے اور حقیقی جنگ کے لئے تیاری علامتی جنگ سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ کل کسی حقیقی دشمن سے واسطہ پڑے گا، آج علامتی دشمن ہے تو کل سامنے حقیقی دشمن ہوگا۔

حاجیوں کو مکہ بلایا جاتا ہے اور علامتی سیمنٹ کے ستونوں کو سنگ باران کروایا جاتا ہے، ہم

طہارتِ ظاہری و طہارتِ باطنی

یہ سمجھتے ہیں کہ یہی ہمارا اول و آخر فریضہ تھا، علامتی گولی کو کہ جس کے اندر مرمی نہ ہو، بارود نہ ہو بلکہ فقط آواز ہو تو اس کو کیا کہتے ہیں؟ خول، کھوکھلی، کھوکھا اور فارسی میں اس کو پوچ یعنی خالی کہتے ہیں، اگر آپ ایک سیمنٹ کے پتھر کو جا کر کنکریاں مارتے ہیں تو یہ خالی گولی ہے، کھوکھلا فائر ہے، یہ آپ سے کیوں کروایا گیا تھا؟ یہ کنکریاں کیوں پھنکوائی گئیں تھیں؟ بڑا شیطان، چھوٹا شیطان اور درمیانہ شیطان، شیطانوں کو لائن میں کھڑے کر کے تین ستون کہ جواب تین دیواریں بن گئی ہیں ان کو کیوں سنگسار کروایا گیا تھا؟ تا کہ ان کو مار کر ہم جنت میں چلے جائیں؟ عجب بات ہے، ایسی کھوکھلی گولیوں سے آپ جنت چلے جائیں گے؟ پوچ فائر کر کے بہشت چلے جائیں گے؟ پھر تو وہ جنت بھی کھوکھلی ہوگی، جیسا فائر کیا ہے ویسی ہی جنت بھی ہوگی۔

یہ کھوکھلی گولی اس لئے چلوائی گئی ہے، یہ کنکری اس لئے پھنکوائی گئی ہے، یہ علامتی حملہ اس لئے کروایا گیا ہے تا کہ کل جو آپ کا ایک حقیقی دشمن ہے، بڑا شیطان ہے، درمیانہ شیطان ہے اور چھوٹا شیطان ہے اس حقیقی شیطان پر اصلی گولی چلانی ہے، وہاں تو کھوکھلی گولی کام نہیں کرے گی، جنت حقیقی ہے، جنت کی نعمتیں حقیقی ہیں اور یہ حقیقی نعمتیں کھوکھلی گولیوں سے حاصل نہیں ہوتی ہیں بلکہ یہ حقیقی گولیوں سے حاصل ہوتی ہیں، پوچ کام سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے، پوچ فارسی میں اس چیز کے لئے کہتے ہیں کہ جو اندر سے خالی ہو لیکن اس کا ظاہر بہت اچھا ہو۔

بعض کام ہم سے علامتی کروائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک علامتی کام طہارت ہے، ہم علاماتی عبادتیں انجام دے کر یہی سمجھتے ہیں کہ پاک ہوگئے ہیں حالانکہ ابھی تو آپ نے علامتی

طہارت کی ہے، مثلاً بعض جگہ کچھ لوگ بچوں سے یہ کام کراتے ہیں، معلوم نہیں کہ کس غرض سے کراتے ہیں؟ شاید اچھی نیت سے کراتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو طہارت سکھاتے ہیں، چونکہ ہماری فقہ اور توضیح المسائل اس طرح سے لکھی گئی ہے کہ سب سے پہلا باب طہارت ہے اور طہارت کا آغاز بھی نجاست سے ہوتا ہے، پہلے طہارت کا تذکرہ نہیں کرتے ہیں، پہلے نجاسات کا تذکرہ کرتے ہیں اور بعد میں طہارات ہیں لیکن ہم نے نجاسات کا نام بھی طہارات رکھا ہوا ہے، مثلاً بچوں کو نجاسات سکھا رہے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم طہارت پڑھ رہے ہو، حالانکہ نجاست پڑھا رہے ہیں۔ مثلاً وضو، تیمّم اور غسل ایک طہارت ہے، بچوں کے لئے تو غسل نہیں ہے، بچوں کو وضو سمجھ میں آتا ہے، تیمّم سمجھ میں آتا ہے لیکن غسل انہیں سمجھ میں نہیں آتا ہے چونکہ غسل اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ جب موجباتِ غسل سمجھ میں آتے ہیں، آپ دو ڈھائی سال کے بچے کو بیٹھ کر غسلِ واجب سمجھا رہے ہیں، اس کو کیا پتہ کہ آپ کیا سکھا رہے ہیں لہٰذا وہ آپ پر شک کرنے لگتا ہے چونکہ وہ اس میں مبتلا ہی نہیں ہے، اس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ موجباتِ غسل یعنی چہ؟ آپ اس بچے سے غسل کروائیں لیکن حقیقی غسل نہیں کرانا ہے، آپ اس سے علامتی غسل کروائیں، اسے بتائیں کہ پہلے نیت کرو، پھر سر دھوؤ، پھر دایاں حصہ دھوؤ اور پھر بایاں حصہ دھوؤ، وہ پریشان رہتا ہے کہ یہ علامتی غسل کیا ہے؟ اس کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ اصلی کام نہیں ہے، اصلی کام کوئی اور ہے کہ جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

ظاہرِ عبادت کے لئے بدنی طہارات علامتی ہیں۔ علامتی سے کیا مراد ہے؟ یعنی یہ طہارات

علامت ہیں کہ ہمیں کچھ حقیقی طہارات بھی انجام دینی ہیں، میں کیوں بار بار اصرار کر رہا ہوں کہ یہ علامتی طہارات ہیں، اس لئے کہ وضو اور غسل میں تو پانی استعمال کرتے ہیں لیکن تیمّم میں مٹی استعمال ہوتی ہے، اسی لئے عوام الناس عموماً نماز چھوڑ دیتے ہیں، تیمّم نہیں کرتے ہیں، ان کی غیرتِ دینی برداشت نہیں کرتی ہے کہ یہ کیسی طہارت ہے کہ منہ پہ مٹی مل کر نماز پڑھو، ابھی ساری نجاست تو موجود ہے، وہ تیمّم نہیں کرتے ہیں اور نماز چھوڑ دیتے ہیں، پانی ملے گا، نہائیں گے اور پھر اس کے بعد نماز ادا کریں گے چونکہ اس نکتے کی طرف متوجہ نہیں ہیں کہ خداوند نے پانی کو بھی طہور بنایا ہے اور مٹی کو بھی طہور بنایا ہے، جس طرح پانی استعمال کرنا ایک حقیقی طہارت کے لئے علامت ہے اسی طرح مٹی استعمال کرنا بھی ایک حقیقی طہارت کے لئے اشارہ ہے اور حقیقی طہارت جو انسان کے وجود سے مربوط ہے اس کا تعلق انسان کے دل سے ہے۔

طہارت کے درجے

١١) طہارت کے درجے

بعض بزرگان نے طہارت کے مراتب ذکر کئے ہیں، بعض نے مختصر، مجمل اور بعض نے ذرا تفصیل کے ساتھ ذکر کئے ہیں چونکہ یہ بہت اہم موضوع ہے لہٰذا اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ جب آداب سے متصف ہونے کا عمل شروع کریں تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کرنا کیا ہے۔ بعض نے طہارت کے چار درجے بیان کئے ہیں، بعض بزرگان نے کہا کہ ایک طہارتِ ظاہری ہے لیکن ہم کس چیز کی وجہ سے طہارت کریں؟ خبث سے اور حدث سے، یہ سب طہاراتِ ظاہریہ ہیں، حدث اس

نجاست کو کہتے ہیں کہ جو انسان کے وجود سے قائم ہے، بدن سے قائم ہے اور جو غسل اور وضو سے دور ہوتی ہے اور خبث یعنی بیرونی نجاست، جب باہر سے کوئی آلودہ چیز انسان کو لگ جائے تو اس کو خبث کہتے ہیں، حدث ایک حالتِ ناپاکی ہے، اس میں فزیکلی (Physically) کچھ نہیں ہوتا ہے، مثلاً انسان جب سوتا ہے تو فزیکلی تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے، کوئی آلودگی پیدا نہیں ہوئی ہے لیکن وہ سو گیا ہے یعنی سونے سے نفس کے اندر حالتِ غیر طہارتی حاصل ہوگئی ہے، خبث یہ ہے کہ اس حالت کے ساتھ ساتھ فزیکلی بھی کوئی چیز موجود ہوتی ہے کہ جو انسان کے جسم کے ساتھ لگ جاتی ہے کہ جس کو ختم کرنا پڑتا ہے، ان کے لئے طہارتِ ظاہری ہے۔

اس کے بعد طہارتِ اعضاء و جوارح ہے، خدا نے ہمیں مختلف اعضاء و جوارح دیئے ہیں، مثلاً آنکھ، ناک، کان، ہاتھ اور پاؤں ہے انہیں نجاسات سے پاک کرنا ہے، اعضاء و جوارح کو کس سے پاک رکھیں؟ گناہ سے، معصیت سے، جرم سے، آنکھ سے جرم نہ کریں، زبان سے جرم نہ کریں، کان سے جرم نہ کریں، ہاتھ سے جرم نہ کریں بلکہ ان کو پاک رکھیں اور تیسرا مرتبۂ طہارت، طہارتِ دل ہے، طہارتِ دل کے لئے کس سے دل کو پاک کریں؟ اخلاق سیۂ سے، بدعتوں سے، غلط عادتوں سے، صفاتِ رذیلہ و صفاتِ قبیحہ سے، پست اور گھٹیا صفات سے اپنے دل کو پاک کریں، یہ دل کی نجاسات ہیں اور چوتھا مرتبہ طہارتِ سر ہے، طہارتِ سر کس چیز سے کریں؟ طہارتِ سر یہ ہے کہ انسان غیرِ خدا سے پاک ہو جائے یعنی فقط خدا سے ربط ہو۔ پہلے حدث سے پاک ہوا، پھر خبث سے پاک ہوا، پھر گناہ سے پاک ہوا، پھر اس کے بعد اخلاقِ قبیحہ سے پاک ہوا اور اب غیر خدا سے پاک

ہو گیا، بعض نے اسی ترتیب سے طہارات کو ذکر کیا ہے۔

بعض بزرگان نے انہی چار مرتبوں کو، درجات کو ذرا مزید تفصیل کے ساتھ چودہ مرتبوں میں ذکر کیا ہے، البتہ ان چودہ سے بھی بڑھ کر زیادہ ہو سکتے ہیں، مراتبِ طہارت میں سے سے پہلا طہارتِ لباسِ انسان ہے، جو انسان سے الگ ایک چیز ہے لیکن یہ لباس بھی جزو ماحولِ انسان ہے، ماحولیات کا حصہ ہے، طہارتِ ماحول طہارتِ لباس ہے، دوم طہارتِ بدن ہے کہ جو ہی حدث اور خبث سے ہے، سوم طہارتِ اعضاء ہے اور چہارم طہارتِ حواس ہے، اعضاء اور چیز ہیں اور حواس اور چیز ہیں مثلاً آنکھ عضو ہے بصارت حس ہے، کان عضو ہے سماعت حس ہے، ناک عضو ہے شامہ حس ہے، ہاتھ عضو ہے لامسہ حس ہے۔ ہمارے انہی اعضاء کے اندر خداوند تبارک وتعالیٰ نے کچھ قوتیں رکھی ہوئی ہیں، کچھ صلاحیتیں رکھی ہوئی ہیں ان کا نام حواس ہے، عضو فقط یہ کام کرتے ہے کہ اس حس کو اٹھائے ہوئے ہیں، عضو اس حس کا ظرف بنا ہوا ہے، خود ناک کچھ نہیں سونگھتی ہے ورنہ مردے کو کچھ بھی سنگھائیں وہ نہیں سونگھتا ہے، کافور سنگھائیں یا جو کچھ بھی سنگھائیں کچھ نہیں سونگھتا، مُردے کے اندر حس ختم ہو گئی ہے، انسان کی پانچ حسِ ظاہر یہ بیان کی گئی ہیں،

وہ پانچ حسیں سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ ہیں لہٰذا اتنی ہی طہارت کی اقسام بھی بن جائیں گی، اعضاء میں پھر مختلف اعضاء کی تطہیر ہے کہ یہ اقسامِ طہارت مختلف لفظوں کے ساتھ روایات میں بھی ذکر ہوئی ہیں، مثلاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ

اِنَّ اَفْوَاهَكُمْ طُرُقُ الْقُرْآنِ فَطَيِّبُوْهَا بِالسِّوَاكِ...... (۱۸)

بے شک تمہارے منہ قرآن کے راستے ہیں، ان کو مسواک کے ذریعے معطر کرو......

امیر المومنین علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ

اِنَّ اَفْوَاهَكُمْ طُرُقُ الْقُرْآنِ فَطَهِّرُوْهَا بِالسِّوَاكِ .....(۱۹)

بے شک تمہارے منہ قرآن کے راستے ہیں، ان کو مسواک کے ذریعے پاک (مطہر) کرو......

قرآن کا طرق یعنی وہ راستہ کہ جہاں سے قرآن کا گزر ہوتا ہے، اس راستے کو پاک و صاف رکھو، کسی نے پوچھا کہ طریقِ قرآن کیا ہیں؟ فرمایا کہ تمہارے منہ ہیں، ان کو پاک رکھو، کسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ کس چیز سے پاک کریں؟ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مسواک سے پاک رکھو، البتہ یہ طہارتِ ظاہر کا حصہ ہے، بعض روایات میں ہے کہ اپنی زبان کو پاک رکھو، زبان عضو ہے، زبان کو کس چیز سے پاک رکھو؟ ہر وہ چیز جو آلودگیٔ زبان کا باعث بنتی ہے اس سے پاک رکھو یعنی اس کو جھوٹ سے، تہمت سے، بہتان سے، غیبت سے، چغلی سے اور لغویات سے پاک رکھو، بے ہودہ بات سے اس کو پاک رکھو، گناہ سے اس کو پاک رکھو، بہتان سے اس کو پاک رکھو، یہ سب زبان کی آلودگیاں ہیں۔

کیا انسان اتنی آلودہ زبان سے قرآن پڑھے؟ قرآن نور ہے اور انسان جس عضو سے تلفظ کر رہا ہے وہ پاک نہیں ہے اور وہ نور کو آلودہ عضو کے ذریعے سے دہرا رہا ہے لہذا انسان پہلے عضو پاک کرے، یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ منہ پاک کرو۔ مسواک کرو کہ

اس حد تک بھی آلودگی نہ ہو، ظاہر ہے کہ انسان کے منہ میں نجاست تو نہیں ہوتی ہے، مسواک طہارت ازنجاست نہیں ہے، منہ ناپاک تو نہیں ہوتا ہے کہ مسواک کرنے سے پاک ہوجاتا ہے، طہارتِ فقہی شرعی کے لحاظ سے منہ پاک ہوتا ہے لیکن پھر بھی نجاست ہے، پھر بھی اس کو پاک کرو، کیوں؟ کیونکہ یہ بدبو جو منہ سے آتی ہے یہ بھی ناپاکی ہے۔ بسا اوقات ہوتا ہے کہ انسان نامناسب کھانے کھاتا ہے تو معدے کی خرابی کی وجہ سے منہ سے بو آنا شروع ہوجاتی ہے، انسان رمضان میں زیادہ مبتلا ہوتا ہے چونکہ معدے کی بو منہ میں آجاتی ہے، اگر معدہ چلتا رہے اور اس میں کچھ نہ کچھ پانی و مائعات وغیرہ پڑتے رہیں تو وہ بو اندر ہی رہتی ہے لیکن جب معدہ خالی ہوتا ہے، دن بھر کچھ بھی نہیں ڈالتے ہیں تو آہستہ آہستہ وہ بدبو باہر آجاتی ہے، اس لئے مسواک کرو کہ یہ ناپاکی ہے یعنی اس حد تک فرمارہے ہیں کہ دہن اور منہ جو طریق قرآن ہے، راہِ قرآن ہے اس کو پاک کرو، ناپاک منہ سے قرآن نہ پڑھو۔

نماز کے متعلقات اور آدابِ نماز میں سے ایک یہ ہے کہ ہر نماز کے لئے مسواک کریں، مسواک کیوں کریں؟ چونکہ اسی منہ سے ہم نے خدا کے ساتھ ہم کلام ہونا ہے، یہ علامتی چیزیں ہیں تاکہ ہمیں متوجہ کریں کہ اس کے پیچھے ایک حقیقی طہارت بھی ہے، انسان کا دہنِ دیگر بھی ہے وہ بھی پاک ہونا چاہئے اور وہ دل ہے لہٰذا آپ اس کو بھی پاک کریں، آنکھ کو پاک کریں کہ جس آنکھ سے قرآن پر نگاہ کرنی ہے، بعض بزرگان نے لکھا بھی ہے کہ آنکھ سے انسان کتنے جرم و گناہ کرتا ہے، اسی طرح زبان کی طہارت کا خیال رکھیں کیونکہ انسان اسی زبان سے بے پناہ گناہ انجام دیتا ہے۔

اسی طرح صوم میں حواس کا بھی روزہ ہے، جس طرح طہارت کے درجات ہیں اسی طرح

روزے کے بھی درجات ہیں۔روزہ میں حواس کا بھی روزہ ہو،اعضاء کا بھی روزہ ہو اور پورے وجودِ انسان کا روزہ ہو، فقط منہ بند کر لینا فاقہ ہے، انسان کے پورے مجموعے کا روزہ ہونا چاہیے، خیال پاک ہو، لیکن وضو کر کے بھی انسان کا خیال پاک نہیں ہوتا ہے، خیال سے مراد قوتِ تخیل ہے۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا ہمارا خیال پاک ہے یا نہیں ہے اس کیلئے ایک پیمانہ خواب ہے، اب کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود ہی انسان توجہ کرے کہ رات کو کیا خواب دیکھتا ہے؟ یہیں سے پتہ چل جائے گا کہ خیال پاک ہے یا ناپاک ہے چونکہ یہ رات کی ساری کاروائی خیال کی ہوتی ہے۔ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری روح کہیں سیر سپاٹے کے لئے نکل گئی ہے یا باہر سے کچھ چیزیں ہم سے ملنے آئی ہیں، نہیں، کچھ بھی نہیں ہے، نہ باہر سے کوئی آیا ہے اور نہ آپ باہر گئے ہیں، یہیں لحاف کے نیچے سب کاروائی ہو رہی ہے اور وہ بھی سب قوتِ خیال میں ہے، یہ سارے مناظر خیالی ہیں یعنی خیال کے نام سے ایک نقاش ہے، مصور ہے کہ جو تصویریں بنا بنا کے، فلمیں بنا بنا کے آپ کو دکھا رہا، چونکہ آپ کے حواس تو بند ہیں، حواس کی چھٹی ہے اور باقی سارے حصوں کی بھی تعطیل ہے، اس کو موقع مل گیا ہے کہ اب آپ کو اپنی ساری کاروائی بتائے اور وہ اپنے آپ کچھ نہیں بناتا ہے بلکہ وہ وہی بناتا ہے جو ہم نے ذخیرہ کیا ہوتا ہے، وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ آپ نے کیا کیا ذخیرہ کیا ہوا ہے؟ اسی کی تصویر بنا کر دکھاتا ہے مثلاً ہماری آرزوئیں، ہماری توقعات، ہماری امیدیں، ہماری خواہشات انہی کی تصویریں بنا بنا کر ہمیں دکھاتا رہتا ہے کہ آپ یہ چاہتے ہو، یہ آرزوئیں آپ کی ہیں، یہ خواہشات آپ کی ہیں، یہ ناپاک خیالات آپ کے ہیں۔

پھر اسی خیال سے صبح اٹھ کر پوچھتے ہیں کہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ لیکن اولِ شب کے خواب خیال کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ معدے کے ہوتے ہیں، جب انسان دبا کے کھاتا ہے، پیٹ بھر کر کھاتا ہے تو معدے کے اندر جا کر غذا تبخیر ہوتی ہے، معدے کے اندر حرارت ہے، غذا کو ہضم کرنے کے لئے حرارت کی ضرورت ہے، معدہ بھٹی کی طرح ہے، اس غذا کے اندر موجود رطوبت بخارات میں تبدیل ہوتی ہے، تبخیر ہوتی ہے، جس طرح پانی کے اوپر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو اس سے تبخیر کا عمل ہوتا ہے، جیسے چولہے پر دیگچہ چڑھا ہوتا ہے تو اس سے بخارات اٹھ رہے ہوتے ہیں اسی طرح سے معدے سے بھی بخارات اٹھ رہے ہوتے ہیں اور یہ بخارات سیدھے مغز میں چڑھ جاتے ہیں لہٰذا انسان عجیب وغریب قسم کے خواب دیکھتا ہے۔ اولِ شب میں سوتے ہی جو فلم شروع ہوتی ہے وہ ساری معدے کی کاروائی ہے اگر انسان اول شب میں خواب دیکھ کر اُٹھے اور اٹھ کر پوچھے کہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ کم کھایا کرو، کھانے میں اور سونے میں تھوڑا وقفہ کرو، لیکن دوسری من گھڑت تصویریں تخیل بناتا ہے اس کی تعبیر کیا ہے؟

اس کی تعبیر یہ ہے کہ خیال کو پاک کرو، اپنے خیال کی تطہیر کرو۔ یعنی طہارتِ ذہن، طہارتِ عقل، طہارتِ قلب، طہارتِ نفس، طہارتِ روح، طہارتِ حقیقتِ انسان، طہارتِ سر جو پہلے مرتبے میں بھی ذکر ہوا ہے وطہارتِ مخصوصِ انسانی، یہ فہرست بعض اہل معرفت نے ذکر کی ہے، از جملہ جنابِ ابن فناری نے ذکر کی ہے یہ بزرگان اہل معرفت میں سے ہیں یعنی عرفاء میں سے ہیں، چار درجاتِ طہارت کہ جو آپ کی خدمت میں پہلے ذکر کیے ہیں وہ جنابِ غزالی سے ہیں،

انہوں نے طہارت کے چار مرتبے ذکر کئے ہیں اور ابن فناری نے انہی چار مرتبوں کی تفصیل کی ہے اور عرض کیا تھا کہ چودہ مرتبے ہیں، ان چودہ کی بھی مزید تفصیل ہے، جس طرح سے کہا تھا کہ طہارتِ حواس کی مزید پانچ حصوں کے لحاظ سے تقسیم کر کے پھر ہر حصے کے لئے طہارت کے درجات ذکر کر سکتے ہیں، حاصلِ مطلب یہ ہے کہ فہمِ قرآن کے لئے ادبِ دوم تطہیر قلب ہے، لیکن پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ طہارت کہتے کس کو ہیں؟ اور دل کو کیسے پاک کریں؟ اصلاً دل کس چیز سے آلودہ ہے کہ اس کو پاک کریں؟ کجی سے دل کیا مراد ہے؟ تب ہمیں اس کی طہارت سمجھ میں آئے گی۔

انشاء اللہ اس فصل کے حصۂ دوم میں درج کیا جائے گا کہ دل کی ظرفیت کس وجہ سے ختم ہو جاتی ہے اور دل کو کون کون سی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں کہ جن سے قلب کو پاک کرنا ہے۔

طہارت کے درجے

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۸۳)

(۲)......(الانسان الکامل فی نہج البلاغة، الجزء ۱، صفحہ ۲)(فضائل و سیرہ چھاردہ معصوم (ع) در آثار استاد علامہ حسن زادہ آملی مدظلہ، الجزء ۱۳، صفحہ ۱)

(۳)......(سورۂ آلِ عمران، آیہ ۱۶۹)

(۴)......(من لا یحضرہ الفقیہ - للشیخ الجلیل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویہ القمیؒ، الجزء ۴، صفحہ ۹۵)(میزان الحکمة - الریشھری، الجزء ۵، صفحہ ۱۲۱)(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی مدظلہ، الجزء ۱۶، صفحہ ۳۳۰)(تفسیر نور الثقلین)(أحکام القرآن - القاضی محمد بن عبد اللّٰہ أبو بکر بن العربی المعافری الاشبیلی المالکی، الجزء ۱، صفحہ ۳۰۶)

(۵)......(أحکام القرآن - أحمد بن علی أبو بکر الرازی الجصاص الحنفی، الجزء ۲، صفحہ ۵۰۳)

(۶)......(أحکام القرآن - أحمد بن علی أبو بکر الرازی الجصاص الحنفی، الجزء ۲، صفحہ ۵۰۳)

(۷)......(الکافی - الکلینیؒ، الجزء ۴، صفحہ ۷۹)(تھذیب الاحکام فی شرح المقنعة للشیخ المفید رضوان اللّٰہ علیہ - الشیخ الطوسیؒ، الجزء ۶، صفحہ ۱۶۷)(وسائل الشیعة - الفقیہ المُحَدِّث الشیخ مُحَمّد بن الحسن الحُر

العاملیؒ،الجزء۱۵،صفحہ۱۲۱)

(۸)......(تھذیب الاحکام فی شرح المقنعة للشیخ المفید رضوان اللّٰہ علیہ- الشیخ الطوسیؒ،الجزء۶،صفحہ۱۵۷)(وسائل الشیعة- الفقیه المُحَدّثِ الشیخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ،الجزء۱۵،صفحہ۱۲۰)

(۹)......(احکام القرآن،الجزء۴،صفحہ ۴۵)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ حشر،آیہ۱۹)

(۱۱)......(دیوان حافظ شیرازی،از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی،غزل۲۳۲،صفحہ۱۸۲)

(۱۲)......(امثال القرآن)(انسان و قرآن،الجزء۲،صفحہ۱۲)(بحار الأنوار،الجزء۱،صفحہ۲۲۵)(مصباح الشریعة المنسوب للصادقؑ، الجزء۱،صفحہ۵)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ انعام،آیہ۱۲۵)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ شرح،آیہ۱)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ شرح،آیہ۲)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ اسراء،آیہ۷۹)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ مزمل،آیہ۵)

(۱۸)......(النظریة الاجتماعیة فی القرآن الکریم،الجزء۷،صفحہ۱۲۵)(قرآن در آیینہ احکام)(مَصَاعِدُ النَّظَرِ للاشرَافِ عَلَی مَقَاصِدِ السُّوَرِ،الجزء۱،۲۴۷)

(أعلام الدين فی صفات المؤمنين)(بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشيخ محمد باقر المجلسیؒ،الجزء۷۷،صفحه ۳۴۴)
(ميزان الحكمة - الريشهری،الجزء۸،صفحه۲۰۵)

(۱۹).. (من لا يحضره الفقيه - للشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسين بن بابويه القمیؒ،الجزء ۱ ،صفحه ۵۳)(الحدائق الناضرة- المحقق البحرانیؒ،الجزء۸،صفحه۱۰۸)(تذكرة الفقهاء، الجزء ۱ ،صفحه۲۰۲)(وسائل الشيعة- الفقيه المُحَدِّث الشيخ مُحمّد بن الحسن الحُر العاملیؒ،الجزء۲ ،صفحه۲۳)(اثنا عشر رسالة - المحقق الداماد،الجزء۲ ،صفحه۹۷)(ذخيرة المعاد- المحقق السبزواریؒ، الجزء ۱ ،صفحه۱۷۴)كتاب الطهارة - الشيخ الأنصاریؒ، الجزء۲ ،صفحه۴۱۳)(مشارق الشموس - المحقق الخوانساریؒ، الجزء ۱ ،صفحه۴۲۱)(منتهی المطلب - العلامة الحلیؒ،الجزء ۱ ،صفحه۳۶۴)

فصلِ ادبِ دوم

﴿طہارتِ قلب﴾

(حصّہ دوم)

۱)دل مانندِ ظرف ہے

۲)دل کی ظرفیت کا کم اورزیادہ ہونا

۳)دل کی ظرفیت بڑھانے کیلئے تطہیر کی ضرورت

٤)مبلغین پہلے اپنے مُخَاطَبْ تیار کریں

٥)انبیاءؑ کا طریقۂ تبلیغ

٦)قرآن ہر دل میں داخل نہیں ہوتا

۷)خدا کو جمیل اور بلند مرتبہ لوگ پسند ہیں

۸)پاك دل موردِ نگاہِ خدا

۹)تطہیرِ قلب اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتی ہے

۱۰)اللّٰہ کو پاکیزہ لوگ پسند ہیں

۱۱)قرآن کے مطابق دل کی بیماریاں

- 1) غِلْظَتْ
- 2)غرور و تکبر
- 3)گناہ

- 4)غفلت
- 5)ضعف
- 6)مختوم دل
- 7)مطبوع دل
- 8) غیر متفقه دل
- 9)زیغ شده دل
- 10)اندھے دل
- 11)بیزار دل
- 12)مقفل دل
- 13)قسی دل
- 14)مغلوف دل
- 15)پردوں سے ڈھکے ہوئے قلوب
- 16)غل رکھنے والے دل
- 17)مُشَرَّب دل
- 18)نفاق رکھنے والے دل
- 19)غیظ والے دل
- 20)شك والے دل
- 21)لھوی دل
- 22)زنگ آلود قلوب

۱)دل مانندِ ظرف ہے

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے دل کو ظرف قرار دیا ہے، نہج البلاغہ کے حصہ سوم میں کلماتِ قصار کے اندر حکمت نمبر ۱۴۷ میں وَصَایا ہیں جو امیر المومنین علیہ السلام نے کمیل ابن زیاد نخعی کو کہ جو شاگردِ معروف اور مشہور صحابیٔ امیر المومنین علیہ السلام ہیں بیان فرمائیں اور کمیل نے اس کا شانِ نزول بھی اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے ایک شب میرا ہاتھ سے پکڑا اور نخلستان میں لے گئے اور وہاں خلوت میں جا کر حضرت علیہ السلام نے مجھے نصیحتیں بیان فرمانا شروع کیں اور آغاز ان جملوں سے کیا کہ

يَا كُمَيْلُ بْنِ زِيَادٍ، اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ أَوْعِيَةٌ، فَخَيْرُهَا أَوْعَاهَا......(۱)

اے کمیل ابن زیاد! بے شک یہ دل ظروف ہیں پس ان میں بہترین ظرف وہ ہے جو زیادہ وسعت رکھتا ہو......

اوعیہ، وعا کی جمع ہے وعا ظرف کو کہتے ہیں، بہترین ظرف وہ ہے کہ جس کی ظرفیت سب سے زیادہ ہو، پھر اس کے بعد حضرت علیہ السلام نے کمیل کو مختلف تعلیمات دیں اور وَصَایا ذکر کیں اور ان سے فرمایا کہ

اَلنَّاسُ ثَلَاثَةٌ: فَعَالِمٌ رَبَّانِيٌّ، وَمُتَعَلِّمٌ عَلَى سَبِيلِ نَجَاةٍ، وَهَمَجٌ رَعَاعٌ ... (۲)

لوگ تین قسم کے ہیں: ایک عالم ربانی اور دوسرے نجات کے راستے پر چلنے والا طالب علم اور تیسرے رذیل لوگ......

۲) دل کی ظرفیت کا کم اور زیادہ ہونا

پس دلِ انسان درحقیقت ظرف ہے اور بہترین دل وہ ہے کہ جس کی ظرفیت سب سے زیادہ ہو، دل کی ظرفیت کبھی کم بھی ہوجاتی ہے اور بڑھ بھی جاتی ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے ہر انسان کو دل عطا کیا ہے اور ظرفیتِ دل کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن خود اپنے اعمال کے ذریعے سے بعض انسان اس ظرفیت کو بڑھا لیتے ہیں اور بعض اس ظرفیت میں کمی کردیتے ہیں، اگر دل کی تطہیر ساتھ ساتھ ہوتی رہے چونکہ دل کے مختلف امراض ہیں مثلاً دل کے اوپر میل چڑھ جاتا ہے، کدورت آجاتی ہے، بہت سارے پردے آجاتے ہیں اور دل کے اوپر بہت ساری چیزوں کی تہہ بیٹھ جاتی ہے، اگر اس تہہ کو صاف نہ کیا جائے اور یہ جمتی رہے تو دل کی ظرفیت میں کمی آجاتی ہے۔

اس مطلب کو ہم بہت سادہ سی مثال سے سمجھ سکتے ہیں، روزمرہ کے برتن جو گھر میں استعمال ہوتے ہیں اگر انہیں دھویا نہ جائے مثلاً وہ دیگچہ یا پتیلا کہ جس کے اندر کھانا پکتا ہے اسے ہر کھانے کے بعد دھویا جاتا ہے، اگر نہ دھوئیں تو اس کے اوپر ایک تہہ جم جاتی ہے، اگر اسی میں اور پکائیں اور دوسری نوبت میں بھی نہ دھوئیں تو اس کے اوپر ایک اور تہہ جم جاتی ہے، اسی طرح کرتے کرتے اس کے اندر تہہ بہ تہہ میل جم جاتا ہے اور جوں جوں اس کے اندر یہ تہہ بڑھتی جاتی ہے اس کی ظرفیت بھی کم ہوتی جاتی ہے، اگر پہلے اس کے اندر آپ دو کلو جنس پکا سکتے تھے تو اب ڈیڑھ کلو پکا سکتے ہیں، اگر پہلے ڈیڑھ کلو پکتا تھا تو اب ایک کلو پکے گا، اگر آپ اسے نہ دھوئیں اور اس کی تطہیر نہ کریں تو خوانخواہ اس کی ظرفیت میں کمی آجاتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی ظرفیت بالکل بھر جاتی ہے۔

ایک اور سادہ تر مثال یہ ہے کہ آپ نے بعض علاقوں میں شاید دیکھا بھی ہو یا کم از کم سنا ضرور ہوگا کہ دریاؤں کے رخ پہ، دھارے پہ بسا اوقات ڈیم (Dam) بنائے جاتے ہیں، کسی علاقے کی ضرورت کے تحت کھیتی باڑی کے لئے پانی جمع کیا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ بند دریا کے سامنے باندھا گیا ہے لہٰذا جب دریا کا پانی آتا ہے تو اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کے لے آتا ہے، ریت بہا کر لاتا ہے، مٹی بہا کر لاتا ہے، ٹوٹے ہوئے پتھر بہا کر لاتا ہے، مرے ہوئے جانور بہا کر لاتا ہے، کوڑا اور کچرہ بھی بارش کے پانی کے ساتھ بہہ کر اسی ڈیم کے اندر آ جاتا ہے اور تدریجاً اس کو بھرتا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ڈیم کہ جس کے اندر ایک بہت بڑی ظرفیت تھی وہ ایک دن بھر جاتا ہے، ریت سے بھر جاتا ہے، غلاظت سے بھر جاتا ہے، مٹی سے بھر جاتا ہے اور کچرے سے بھر جاتا ہے نتیجتاً پانی کی مقدار اس میں کم ہو جاتی ہے حالانکہ پہلے ایک مقدارِ عظیم اسی کے اندر ذخیرہ ہو جاتی تھی لیکن چونکہ اس کی ظرفیت بھر گئی ہے لہٰذا پانی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

دل کی ظرفیت کا کم اور زیادہ ہونا

یہ تجرباتی باتیں ہیں، ہم اپنی روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں میں اس کو تجربہ کر سکتے ہیں کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو روز آلودہ ہوتی ہیں، مثلاً جب ہم کھلی ہوا میں آتے ہیں تو اس میں آلودگی زیادہ ہے، دھوئیں کی آلودگی ہے، مٹی کی آلودگی ہے اور انواع واقسام کی آلودگیاں فضا کے اندر موجود ہیں، گرمی سے انسان کو پسینہ آتا ہے تو بدن آلودہ ہو جاتا ہے، یہ بدن روز آلودہ ہوتا ہے اور ہر روز اس کو دھونے کی ضرورت ہے، ہر وہ چیز جو روز آلودہ ہوتی ہے، روز گندی ہوتی ہے، اس کو روزانہ دھونے کی ضرورت ہے، اگر آلودگی روزانہ ہو اور طہارت سالانہ ہو تو اس صورت میں انسان خود نتیجہ دیکھ لے

گا، لہٰذا آلودگیاں ظرفیت کو بھر دیتی ہیں نتیجتاً اس کے اندر وہ متعلقہ چیز کہ جس کا یہ ظرف تھا اب اس کے اندر نہیں سما سکتی یا کم از کم اس کی ظرفیت کم ہو جاتی ہے۔

دل کی ظرفیت کا کم اور زیادہ ہونا

یہی حال دل کا بھی ہے، دل اگرچہ جسم نہیں ہے، انسان کا دل فہم کا مرکز ہے، انسان کی عقل ہے یعنی چونکہ یہ سارے امور دل کے متعلقات میں سے ہیں، سمجھنا، احساس کرنا اور تحرک پیدا کرنا اور دل روزمرہ آلودگیوں، نجاستوں اور غلاظتوں کے معرض میں ہے کہ جیسے ہمارا جسم معرضِ آلودگی میں ہے لہٰذا دل بھی روز آلودہ ہوتا ہے، نگاہیں کرنے سے آلودہ ہوتا ہے، سننے سے آلودہ ہوتا ہے اور بولنے سے آلودہ ہوتا ہے، سوچنے سے آلودہ ہوتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو بھی لایعنی بات کریں یعنی جو منہ میں آئے کہتے جائیں، بے ربط بات کہتے جائیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، زیادہ سے زیادہ سننے والا بور ہوتا ہے، نہیں، بلکہ سننے والے سے زیادہ انسان کے خود اپنے اندر مشکل کھڑی ہو جاتی ہے، لغو باتیں کرنے سے، لغویات سننے سے، لغویات دیکھنے سے اور لغویات سوچنے سے انسان کے دل پر اثر پڑتا ہے، یہ دل کی آلودگی کے دریچے ہیں، مسلسل دل آلودہ ہو رہا ہے، نظروں سے، سماعت سے، زبان سے اور مختلف حواس کے ذریعے سے آلودہ ہو رہا ہے۔

یہ دل روز آلودہ ہوتا ہے لہٰذا اس کو روز پاک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کو روز تطہیر کی ضرورت ہے تاکہ آمادہ رہے، بعض لوگ آلودگیوں سے دل کو بچا لیتے ہیں اور دل کی یہ خوبی ہے کہ اگر اس کے اندر میل کچیل آئے تو اس کی ظرفیت بھر جاتی ہے لیکن اگر اس کے اندر نورانیت آئے، نور

آئے، حکمت آئے اور معرفت آئے تو اسکی ظرفیت بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔

انسان کے دل کو عام بول چال کی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ فلکسبل (Flexible) ہے یعنی اس کی گنجائش بڑھتی ہے، آپ یوں سمجھ لیں کہ ایک ربڑ کی طرح ہے کہ اگر اس کے اندر آلودگی ڈالتے جائیں تو ظرفیت بھر جاتی ہے لیکن اگر اس کے اندر کوئی وزنی چیز ڈالیں تو اس کی ظرفیت بڑھ جاتی ہے، اگر پہلے ایک کلو کے قابل تھا تو اس ایک کلو کے ڈالنے سے دو کلو ظرفیت بڑھ گئی ہے، دو کلو ڈالا تو چار کلو ظرفیت بڑھ جاتی ہے، علم سے ظرفیت بھرتی نہیں ہے بلکہ بڑھتی ہے لیکن آلودگی سے ظرفیت بھر جاتی ہے۔

۳) دل کی ظرفیت بڑھانے کیلئے تطہیر کی ضرورت

بعض لوگ تطہیرِ دل میں مشغول رہتے ہیں اور اپنے دل کو آلودہ نہیں ہونے دیتے ہیں لہٰذا ان کے دل کی ظرفیت بڑھ جاتی ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جن کے دل تدریجاً بند ہو جاتے ہیں، قرآن نے بھی پیغمبر اکرم ﷺ سے فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جنہوں نے اپنے دل کی ظرفیت کو بھر دیا ہے اور اب ان کے اندر مزید گنجائش نہیں ہے،

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ٥ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ٥ (۳)

ان کے لئے سب برابر ہے، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں

دل کی ظرفیت بڑھانے کیلئے تطہیر کی ضرورت

ہیں۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر گویا مہر لگادی ہے کہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں، ان کے واسطے آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

دل کی ظرفیت بڑھانے کیلئے تطہیر کی ضرورت

یعنی ان کے دل بھر چکے ہیں، ان کے دل کی ظرفیت ختم ہو چکی ہے، ان کو بتانا یا نہ بتانا برابر ہے، ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے، ان کو موعظہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہے، یعنی جیسے کوئی بھری ہوئی چیز ہو مثلاً پتھر ہے کہ جو پُر ہے اور اندر جگہ نہیں ہے، خلا نہیں ہے، جوف نہیں ہے، اس طرح سے کبھی دل بھی بھر جاتا ہے اور پتھر کی طرح ہو جاتا ہے،

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ......(۴)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر......

جس طرح پتھر کے اندر سرے سے ایک قطرے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے تو اسی طرح دل کے اندر بھی گنجائش نہیں ہوتی ہے بلکہ ختم ہو جاتی ہے اور قساوت آجاتی ہے۔ پس اگر دل محلِ نزولِ قرآن ہے تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دل جس طرح محلِ نور ہے اسی طرح معرضِ آلودگی، معرضِ نجاست اور معرضِ خطر میں بھی موجود ہے، اس دل کو زنگ لگ جاتا ہے، روایات میں خود لفظِ زنگ استعمال ہوا ہے کہ جس طرح سے لوہے کو زنگ لگتا ہے اس طرح سے دل کو بھی زنگ لگ جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زنگ خوردہ دل اپنے اندر نور نہیں سما سکتا، نور اس کے اندر نہیں جا سکتا ہے۔

تطہیرِ قلب سے متعلق معصومین علیہم السلام سے فراواں روایات منقول ہیں، غرر الحکم جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے کلمات کا مجموعہ ہے اس میں حضرت علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

طَهِّرُوا قُلُوبَكُمْ ......

اپنے دلوں کو پاک کرو، اپنے دلوں کی تطہیر کرو، کس چیز سے تطہیر کرو؟

مِنْ دَرَنِ السَّيِّئَاتِ......

گناہوں کی ناپاکی سے، درن میل کو کہتے ہیں، گناہوں کے میل سے اپنے دلوں کو پاک کرو، کیا نتیجہ ہوگا؟

تُضَاعَفُ لَكُمُ الْحَسَنَاتُ......

تمہیں کئی گنا حسنات حاصل ہوں گے،

اس طرح امیرامومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ

طَهِّرُوا قُلُوبَكُمْ مِنَ الْحَسَدِ فَإِنَّهُ مُكْمِدٌ مُضْنِي......(۵)

یعنی اپنے قلوب کو حسد سے پاک کرو بیشک یہ دل کی تنگی، افسردگی اور لا علاج بیماری کا سبب ہے......

ایک اور حدیثِ مبارک میں ہے کہ

طَهِّرُوا قُلُوبَكُمْ مِنَ الْحِقْدِ، فَإِنَّهُ دَاءٌ مُوبِيءٌ......(۶)

یعنی اپنے قلوب کو کینہ سے پاک کرو بیشک یہ وبا کی بیماری کی طرح ہے۔

گناہوں کی آلودگیاں ظرفِ دل کو تنگ کر دیتی ہیں لہٰذا جب انسان بارگاہِ خدا میں اپنا چھوٹا ظرف لے کر جاتا ہے تو وہ جلدی بھر جاتا ہے، جیسے سورۂ مبارکہ رعد میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے

فرمایا کہ اگر محروم ہو تو اس محرومی کا گلہ خدا سے نہ کرو، خدا نے تو تمہیں کم نہیں دیا ہے بلکہ تم نے خود کم لیا ہے، اگر معلم یکساں طور پر سب شاگردوں کے لئے ایک درس بیان کرتا ہے اور یہ کسی کو سمجھ میں آتا ہے اور کسی کو سمجھ میں نہیں آتا ہے، کوئی سنتا ہے اور کوئی نہیں سنتا ہے تو بعد میں اٹھ کر گلہ نہ کرے کہ مجھے کم سمجھایا اس کو زیادہ سمجھایا ہے، سمجھایا تو یکساں ہے لیکن کسی نے کم سمجھا ہے اور کسی نے زیادہ سمجھا ہے، زیادہ کون سمجھا ہے؟ جس کا ذہن آمادہ تھا، جس کی فہم آمادہ تھی، کم کون سمجھا؟ جس کے اندر غفلت تھی، جو آمادہ نہیں تھا، خداوند کا فرمانا ہے کہ

دل کی ظرفیت بڑھانے کیلئے تطہیر کی ضرورت

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا...... (٧)

اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیوں میں بقدرِ ظرف بہنے لگا......

خداوند نے آسمان سے یکساں پانی اتارا ہے لیکن ندیاں، نالے، وادیاں اپنی اپنی مقدار میں بہنے کے لئے ہیں یعنی ان کے اندر جتنی گنجائش تھی اتنا ہی پانی ان کے اندر بہا ہے، اس سے زیادہ نہیں بہہ سکتا ہے، یہ بات خداوند کے قانون کے خلاف ہے کہ ظرفیت سے زیادہ کسی جگہ کچھ ڈال دے چونکہ خود ظرف نابود ہو جائے گا۔ یہ وادیاں، یہ ندیاں رحمتِ خدا کو لینے کے لئے چھوٹی بڑی کیوں ہیں؟ یہ چھوٹی بڑی خدا نے نہیں بنائی ہیں، یہ چھوٹی بڑی ہم نے کر لی ہیں، خدا نے ایک جیسے دل دیئے تھے، لیکن بعض لوگوں نے ان دلوں کی ظرفیت کو بڑھا لیا،

جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے......

جو دوائے دل بیچتے تھے ان کا کاروبار چمک گیا لیکن جو دوائے شہوات بیچتے تھے ان کا دل

بند ہو گیا،

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ......

بعض ایسے تھے کہ جن کی توجہ اپنے دل پر تھی اور انہوں نے اپنے دل کی ظرفیت خوب بڑھالی لہٰذا اب جب رحمتِ خدا اترتی ہے تو ان کے دلوں میں ایک سمندر کی طرح پانی بہہ نکلتا ہے لیکن بعض ایسے ہیں کہ جن کے دل میں ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکتا ہے کیونکہ انسان کا دل جب اتنا سخت ہو جاتا ہے تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ٥

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت کہ پتھروں میں سے تو بعض سے نہریں بھی جاری ہو جاتی ہیں اور بعض شگافتہ ہو جاتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض خوفِ خدا سے گر پڑتے ہیں لیکن اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

کچھ پتھر ایسے بھی ہیں کہ جن سے پانی پھوٹتا ہے لیکن کچھ دل ایسے ہیں کہ ان سے ایک قطرہ بھی نہیں ٹپک سکتا، ان کے اندر ایک قطرہ تک نہیں اتر سکتا ہے، کچھ دل ایسے ہیں کہ جن سے پانی نکلتا ہے، چشمے پھوٹتے ہیں لیکن علم و حکمت کے بارے میں ایک رطوبت تک ان کے دلوں میں اثر نہیں کرتی ہے، پس یہ وہ انسان ہیں کہ جنہوں نے خود اپنے دل کو میل سے پاک نہیں کیا ہے چونکہ دل و

دل کی ظرفیت بڑھانے کیلئے تطہیر کی ضرورت

نفس روز معرضِ آلودگی میں ہے، روز کا کام روز کرنا چاہئے، ایسا تو نہیں ہے کہ پسینہ ہمیں روز آئے اور نہائیں ہم مہینے کے بعد، چھ مہینے کے بعد یا سال کے بعد۔

بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کا گینز بک کے اندر ریکارڈ ہے کہ چھ سال کے بعد ایک دفعہ نہایا ہے اور وہ بھی کسی نے زبردستی نہلا دیا ہے، بعض کو تو صرف مردہ شو نہلائے گا یعنی اس لئے نہیں نہاتے ہیں کہ وہ پیسے جو اس کو دیں گے وہ مفت میں نہ کھائے بالآخر اس کو بھی زحمت کرنی پڑے، ایسا نہ کریں بلکہ روز نہائیں اور روز جسم پاک کریں، جس طرح جسم کے بارے صفائی کا خیال کرتے ہیں اسی طرح دل کی صفائی کا بھی خیال کریں، دل زیادہ معرض خطر ہے، جسم کو آپ نے کپڑوں میں لپیٹا ہوا ہے لہٰذا پھر بھی آلودگیوں سے بچ جاتا ہے لیکن دل عریاں ہے، دل کے دروازے سب پر کھلے ہوئے ہیں، اس کے دریچے ہر چیز پر کھلے ہوئے ہیں، آلودگی ہر طرف سے دل کے اندر آرہی ہے خصوصاً اس زمانے میں ٹی وی دیکھو تو آلودگی دل میں آرہی ہے، ٹیلیفون سنو تو آلودگی دل میں آرہی ہے، آنکھ کھول کر بازار میں جاؤ تو آلودگی دل میں آرہی ہے، کسی کی بات سنو تو آلودگی دل میں آرہی ہے۔

دل کا ظرف بڑھانے کیلئے تطہیر کی ضرورت

آپ یہ دیکھیں کہ چوبیس گھنٹوں میں کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جو ہم سے حکمت کی باتیں کرتے ہیں اور کتنے ہیں جو ہم سے لغویات تبادلہ کرتے ہیں یعنی جس کو ہم تبادلۂ افکار کہتے ہیں حقیقتاً ان کا نام تبادلۂ لغویات ہے، ایک لغو بات میں کرتا ہوں، ایک لغو بات وہ کرتا ہے اور اس طرح لغویات کا تبادلہ ہو رہا ہوتا ہے، میں اس کا دل آلودہ کر رہا ہوں اور وہ میرا دل آلودہ کر رہا ہے البتہ جب میں بات کرتا ہوں تو میری بات سے اس کا دل بھی آلودہ ہوتا ہے اور میرا اپنا دل بھی آلودہ ہوتا

ہے، یہ نہیں ہے کہ فقط اس کا دل آلودہ ہوتا ہے بلکہ ہر دو کا دل آلودہ ہوتا ہے، پس اس دل کو روز تطہیر کی ضرورت ہے، درنِ سیئات یعنی ان گناہوں کے میل سے دل کو پاک کرو۔

٤) مبلغین پہلے اپنے مُخَاطَبْ تیار کریں

قرآن کا بھی دستور ہے کہ لوگ پہلے اپنے دل کی تطہیر کریں اور انبیاء علیہم السلام کو بھی خداوند تبارک وتعالیٰ نے جہاں خطاب پر مامور کیا ہے تو وہاں مُخَاطَبْ تیار کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ یہ کام مبلغین کو سیرتِ انبیاء علیہم السلام سے سیکھنا چاہیے، ہم فقط اس بات پر مامور نہیں ہیں کہ جو بات اپنے ذہن میں ہے وہ دوسروں تک منتقل کرنا ہے، مبلغ کا فقط یہ فریضہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ دیکھے کہ جس ذہن میں منتقل کرنا ہے وہ ذہن اس بات کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں ہے؟ اور ممکن ہے کہ تیار نہ ہو، جیسے کہ نہیں ہوتا ہے چونکہ لوگوں کے دل روزمرہ کی زندگی میں مشغول رہتے ہیں، دنیا کے اندر مشغول رہتے ہیں، روزمرہ کے معاملات میں مشغول رہتے ہیں، اپنی پریشانیوں میں، اپنے غم وحزن میں اور کاروبارِ دنیا میں مشغول رہتے ہیں لہٰذا یہ دل کہ جس کے اوپر آلودگیاں بھی ہوں، جو گناہ بھی کرتا ہو، جس میں غفلت بھی ہو، جو پریشان بھی ہو اور جو مشکلات میں بھی گرفتار ہو تو آپ کا کام فقط یہ نہیں ہے کہ آپ نے اس کو فقط قرآن کی آیت سنا کر آجانی ہے اور اس طرح اپنا فریضہ انجام دے دینا ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ......(٨)

اور ہماری ذمہ داری صرف واضح طور پر پیغام پہنچا دینا ہے۔

مبلغین پہلے اپنے مُخَاطَبْ تیار کریں

بلکہ آپ کا فریضہ یہ ہے کہ پہلے اس دل کو تیار کریں، اگر انسان دو سوم وقت، دو تہائی وقت دل تیار کرنے میں لگائے اور پھر ایک تہائی وقت میں اصلی بات بتائے تو اس نے وقت ضائع نہیں کیا ہے بلکہ اپنی بات درست طریقے سے منتقل کی ہے۔

۵) انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ تبلیغ

قرآن نے فریضۂ انبیاءؑ اور تبلیغِ انبیاءؑ کا طریقہ ذکر کیا ہے،

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ.....(۹)

اس خدا نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا ہے جو انہی میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے اور ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے......

جب تک انبیاءؑ تزکیہ نہ کریں، لوگوں کے دلوں کی تطہیر نہ کریں تو دل موعظہ کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ دل تو پہلے سے ہی آمادہ نہیں ہیں کیونکہ دلوں میں پہلے سے ہی بہت کچھ بیٹھا ہوا ہے، دلوں میں مال بیٹھا ہوا ہے، دلوں میں ثروت بیٹھی ہوئی ہے، دلوں میں غیر خدا بیٹھا ہوا ہے، دلوں میں مشکلات بیٹھی ہوئی ہیں، دل رنج واندوہ سے بھرے ہوئے ہیں، ان دلوں کے اندر تو جگہ نہیں ہے کہ جو کچھ آپ بتانا چاہتے ہیں وہ ان کے دل میں سما سکے۔ پس پہلے ان دلوں کا تزکیہ کریں، جب تطہیر ہو جائے تو

وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.....(۱۰)

اورانہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے......

اب یہ دل کتاب وحکمت کے لئے تیار ہوگیا ہے ورنہ انسان فقط لوگوں کو جا کر کتاب و حکمت بتانا شروع کردے اور کہے کہ دل تیار کرنا ہمارا کام نہیں ہے تو یہ کام عبث ہوگا۔فریضۂ انبیاءؑ بھی ہے کہ پہلے تطہیرِ قلوب کریں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمان ہے کہ

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ......(۱۱)

پیغمبر آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لے لیجئے کہ اس کے ذریعے یہ پاک و پاکیزہ ہوجائیں......

یعنی آپ ان کے اموال سے صدقہ لے کر ان لوگوں کی تطہیر کریں، ان کے اموال میں سے ایک حصہ لیں تا کہ ان لوگوں کی تطہیر ہو، اگر تُطَهِّرُهَا یا تُطَهِّرُهُ ہوتا تو معنی یہ ہوتا کہ مال کی تطہیر کرو، خذ من اموالهم صدقةً تطهرها یعنی ان کے اموال سے صدقہ لے کر ان کے مال کو پاک کریں لیکن قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ان کے مال سے صدقہ لو تا کہ آپ ان کو پاک کرو، اس لئے کہ ان کے دلوں کے اندر محبتِ مال ہے، یہ مال ان سے لیں تا کہ ان کا دل پاک ہو، یہ مال راہِ خدا میں انفاق کریں تا کہ ان کا دل پاک ہو، پس پہلے ان کا تزکیہ کریں تا کہ دل آمادہ ہوں۔

٦)قرآن ہر دل میں داخل نہیں ہوتا

نورِ قرآن اترنے کے لئے دل کو تیاری کی ضرورت ہے، ہمارے گھر اگر کوئی محترم مہمان آرہا ہو تو ہم اس کے لئے گھر کو تیار کرتے ہیں کیونکہ بے نظم ہوتا ہے، فرض کریں کہ آپ ہاسٹل (Hostel) میں رہتے ہیں کہ جہاں عموماً بے نظمی ہوتی ہے، جہاں انسان رہتا ہے، پڑھتا ہے، کھاتا ہے، اٹھتا ہے، بیٹھتا ہے تو وہاں بے نظمی موجود رہتی ہے اور طلاب کے ہاں تو خصوصاً بے نظمی ہی ہے کہ ہمارا نظم ہی بے نظمی میں ہے، ہمارا ڈسپلن (Discipline) یہ ہے کہ ڈسپلن نہ ہو، کوئی چیز جگہ پہ موجود نہ ہو، کتاب دیگچی میں پڑی ہوئی ہو، جراب فرج (Fridge) میں پڑے ہوئے ہوں اور ڈھونڈتے وقت ہر چیز ہر جگہ ڈھونڈی جائے، نظم ہونا چاہئے اور ہر چیز اپنی خاص جگہ پر موجود ہونی چاہئے۔ اگر کمرہ بے نظم ہے، صفائی نہیں ہے اور آپ نے ایک محترم مہمان کو اپنے گھر میں بلالیا ہے تو پہلے گھر کی صفائی کرتے ہیں، اس کو منظم کرتے ہیں تاکہ یہ محترم مہمان آپ کے گھر میں آجائے۔

بعض مہمان ایسے ہیں کہ اگر ان کے لئے ظرف آمادہ نہ ہو تو وہ مہمان اس گھر میں داخل نہیں ہوتے ہیں جیسے ملائکہ ہیں، روایات میں ہے کہ جس گھر میں کتے پالے ہوئے ہوں وہاں ملائکہ داخل نہیں ہوتے ہیں، ایسے مومنین بھی ہیں، کتے باز مومنین جنہوں نے کتے پالے ہوئے ہیں اور جس گھر میں کتا ہو وہاں ملائکہ داخل نہیں ہوتے ہیں، جس گھر میں گالی دی جاتی ہو وہاں ملائکہ داخل نہیں ہوتے ہیں، جس گھر میں تہمتیں ہوں وہاں ملائکہ داخل نہیں ہوتے ہیں۔ کتے سے مراد ضروری نہیں ہے کہ چار ٹانگوں والے کتے ہوں چونکہ قرآن نے دو طرح کے گدھوں کا ذکر کیا ہے اور دو طرح

کے کتوں کا ذکر کیا ہے، دو ٹانگوں والے اور چار ٹانگوں والے،

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ......(۱۲)

ان لوگوں کی مثال جن پر توریت کا بار رکھا گیا اور وہ اسے اٹھا نہ سکے اس گدھے کی مثال ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو......

یہ دو ٹانگوں والے ہیں، ایک چار ٹانگ کا گدھا ہے جو سامان اٹھاتا ہے، ایک دو ٹانگوں والا گدھا ہے کہ جو کتابِ آسمانی پڑھنا نہیں جانتا ہے، قرآن پڑھنا نہیں جانتا ہے یا پڑھنا تو جانتا ہے لیکن حقِ قرآن ادا نہیں کرتا ہے، اس کو اپنی زندگی کا منشور نہیں بناتا ہے، قرآن کی زبان میں یہ انسان نہیں ہے۔

بعض انسانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ o (۱۳)

اور اگر ہم چاہتے تو اسے انہیں آیتوں کے سبب بلند کر دیتے لیکن وہ خود زمین کی طرف جھک گیا اور اس نے خواہشات کی پیروی اختیار کر لی تو اب اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالے رہے اور چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے......

قرآن ہر دل میں داخل نہیں ہوتا

بعض انسان ایسے ہیں کہ ان کو چھیڑو تو بھی گالی دیتے ہیں اور نہ چھیڑو تو بھی گالی دیتے ہیں۔ آپ ان سے کوئی سروکار رکھیں یا نہ رکھیں وہ ہر وقت آپ کے پیچھے بول رہے ہیں، یہ کون ہیں؟ یہ وہ ہیں کہ ان کے اوپر پتھر اٹھاؤ تو بھی بھونکتے ہیں اور نہ اٹھاؤ تو بھی بھونکتے ہیں،

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ......

انکی مثال کتے جیسی ہے، جس گھر میں ایسے لوگ ہوں وہاں ملائکہ داخل نہیں ہوتے ہیں، ملائکہ وہ مہمان ہیں کہ جن کے لئے گھر کو تیار کرنا پڑتا ہے، آمادہ کرنا پڑتا ہے، پس قرآن نور ہے اور نور ہر دل میں داخل نہیں ہوتا ہے۔

۷) خدا کو جمیل اور بلند مرتبہ لوگ پسند ھیں

ذاتِ خدا جمیل ہے،

اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ...... (۱۴)

بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے......

دعائے سحر میں ہم پڑھتے ہیں کہ

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ جَمَالِکَ بِاَجْمَلِهٖ وَ كُلُّ جَمَالِکَ جَمِیْلٌ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِجَمَالِکَ کُلِّهٖ......

اے اللہ میں سوال کرتا ہوں تجھ سے تیرے جمال میں سے جو بہت زیبا ہے اور تیرا سارا

جمال زیبا ہے، اے معبود میں تجھ سے تیرے تمام جمال کے ذریعے سوال کرتا ہوں......

یعنی ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ جمالِ محض ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات بلند اور عالی ہے،

دعائے سحر ہی میں مذکور ہے کہ

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ عُلُوِّکَ بِاَعْلَاہُ وَ کُلُّ عُلُوِّکَ عَالٍ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِعُلُوِّکَ کُلِّہٖ......

اے اللہ میں تجھ سے تیری بلند تر بلندی کے ذریعے سوال کرتا ہوں اور تیری ہر بلندی بلند تر ہے، اے معبود میں تجھ سے تیری تمام تر بلندی کے ذریعے سوال کرتا ہوں......

حدیثِ مبارک میں آیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ مَعَالِیَ الْاُمُوْرِ......(۱۵)

خدا کو بلند لوگ اچھے لگتے ہیں، بلند ہمت لوگ اچھے لگتے ہیں، بلند مرتبہ لوگ اچھے لگتے ہیں، بلند درجہ لوگ اچھے لگتے ہیں، بلند مقام لوگ اچھے لگتے ہیں، پست اور گھٹیا چیز خدا کو اچھی نہیں لگتی ہے۔

وَیَکْرَہُ سَفَاسِفَھَا....

یعنی خدا کو اسفل اور پست چیزیں اچھی نہیں لگتی ہیں،

اسی طرح حدیث میں ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ مَعَالِیَ الأخلَاقِ......(۱۶)

خدا کو جمیل اور بلند مرتبہ لوگ پسند ہیں

بیشک اللہ کو بلند اخلاق پسند ہیں......

چونکہ وہ خود بلند ہے لہٰذا اس کو بلندیاں اچھی لگتی ہیں یعنی ایسے بلند ہمت انسان، بلند اخلاق انسان، بلند مرتبہ و بلند مقام انسان خدا کو اچھے لگتے ہیں کہ جن کے درجات بہت بلند ہیں، مجاہدین خدا کو اچھے لگتے ہیں، خاموش اور ساکت بیٹھی ہوئی مخلوق خدا کو پسند نہیں ہے چونکہ مجاہد بلند مرتبہ اور بلند ہمت انسان ہیں۔

اسی طرح خدا کی ذات خود پاک ہے، نور ہے لہٰذا نگاہِ خدا بھی محلِ نورانی پہ جاتی ہے، ہمیں بھی کہا گیا ہے کہ آپ ہر جگہ نہ دیکھو، ہر چہرہ نہ دیکھو، ہر منظر نہ دیکھو، ہر روزن میں نہ جھانکو بلکہ دیکھنے کے لئے انتخاب کرو اور ایسی چیزیں دیکھو کہ جس سے تمہارے دلوں کی اندر نورانیت پیدا ہو، کدورت اور میل کچیل پیدا نہ ہو۔

لہٰذا اپنے دل کو پاک رکھو چونکہ اس میں قرآن اترتا ہے، قرآن فقط عربی نہیں ہے، قرآن کلامِ خدا ہے، نورِ خدا ہے لیکن کیوں نہیں اترتا ہے؟ حفظ بھی کر لیتے ہیں لیکن نورِ خدا نہیں اترتا ہے، قرأت بھی کرتے ہیں لیکن نورِ خدا نہیں اترتا ہے، پڑھ بھی لیتے ہیں لیکن نورِ خدا نہیں اترتا ہے، کیوں نہیں اترتا ہے؟ چونکہ دل آمادہ نہیں ہیں، تلفظ سے تو دل آمادہ نہیں ہوتا ہے، اگر دل پاک ہو جائے تو یہ آمادہ ہو سکتا ہے۔

خدا کو میل کچیل اور بلند مرتبہ لوگ پسند ہیں

۸)پاک دل موردِ نگاہِ خدا

مولائے متقین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

قُلُوبُ الْعِبَادِ الطَّاهِرَةُ مَوَاضِعُ نَظَرِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ......(۱۷)

بندوں کے پاکیزہ دل خدا کی نظر (رحمت) کے مقامات ہیں......

یعنی مومنین کے پاک دل، عبادِ خدا کے پاک دل محلِ نگاہِ خدا ہیں،

فَمَنْ طَهَّرَ قَلْبَهُ نَظَرَ اِلَيْهِ......

پس جس نے اپنے دل کو پاک کیا خدا اس کی طرف دیکھے گا......

قیامت میں ایک سخت سزا ہے کہ جسے جہنمِ حرمان کہتے ہیں اور ایک عالی ترین جنت ہے کہ

لَاجَنَّةَ فَوْقَهَا......(۱۸)

اس کے بعد کوئی جنت نہیں ہے،

وہ جنتِ لقاء ہے کہ جو مخصوص بندگانِ خدا و عباد اللہ کے لئے ہے، یہ عباد النعم کے لئے نہیں ہے، نعمتوں کے بندوں کے لئے نعمتوں کی جنتیں ہیں، جنہوں نے نعمتوں کے لئے خدا کی عبادت کی ہے ان کے لئے وہ جنت ہے کہ جو نعمتوں سے بھری ہوئی ہے لیکن جو فقط خدا کے لئے ہیں تو ایسا نہیں ہے کہ خدا ان کو درختوں کے سپرد کر دیگا کہ آپ بہت اچھے آدمی ہو لہٰذا درختوں کے چھاؤں میں بیٹھ جاؤ نہیں، درختوں کی چھاؤں تو ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔

ہمیں سایۂ خدا چاہئے، سایۂ لطفِ خدا چاہئے، سایۂ فیضِ خدا چاہئے، ہمیں اس سائے کی ضرورت ہے، ان کے لئے جنتِ مخصوص ہے اور اس کو جنتِ لقاء کہتے ہیں، یہ جنتِ لقاء میں جائیں گے اور اسی طرح سخت ترین جہنم کونسی ہے؟ سخت ترین جہنم، جہنمِ حرمان ہے، جس کیلئے امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اصلاً برداشت نہیں ہوسکتی ہے، دعائے کمیلؒ میں فرمایا کہ

يَا اِلٰهِي صَبَرْتُ عَلٰى حَرِّ نَارِكَ فَكَيْفَ اَصْبِرُ عَنِ النَّظَرِ اِلٰى كَرَامَتِكَ......

اے خدا جہنم کی آگ کے شعلے پہ صبر ہوسکتا ہے لیکن تیری نگاہ نہ ہو، تو مجھے نہ دیکھے، یہ کیسے برداشت ہوسکتا ہے؟ یہ برداشت نہیں ہوسکتا اور خداوند نے قرآن میں فرمایا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥(١٩)

اور نہ خدا ان سے بات کرے گا اور نہ روزِ قیامت ان کی طرف نظر کرے گا اور نہ انہیں گناہوں کی آلودگی سے پاک بنائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

خدا کا ان سے بات نہ کرنا اور ان پر نظر نہ کرنا کنایہ ہے یعنی ان پر خدا کی توجہ نہیں ہوگی، یہ جہنمِ حرمان میں ہوں گے، جہنمِ حرمان سب سے بڑی جہنم ہے، پس انسان پر نگاہِ خدا بالاترین لطف ہے، جس کے اوپر نگاہِ خدا پڑے تو وہ منتخبِ خدا ہے، وہی برگزیدۂ خدا ہے کہ جس نے اپنے دل کو تیار

کیا ہوا ہے۔ ابھی لوگ امامِ زمانہ علیہ السلام کے پیچھے گھومتے ہیں کہ امامِ زمانہ علیہ السلام کہیں مل جائیں اور امامِ زمانہ علیہ السلام انہی لوگوں کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ جو امام علیہ السلام کے پیچھے گھومتے ہیں لیکن اگر کوئی دل آمادہ ہو تو امام علیہ السلام خود اس کی طرف آتے ہیں، چونکہ جب دل آمادہ ہو، پاک ہو تو خدا نگاہ کرتا ہے لہٰذا اولیائے خداؑ بھی وہیں نگاہ کرتے ہیں کہ جہاں خدا کی نگاہ ہے، اللہ کی نگاہ قلوبِ مطہرہ کے اوپر ہے،

لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۞ (۴۰)

پاکیزہ لوگوں کے علاوہ قرآن کو کوئی مس نہیں کرسکتا ہے یعنی سمجھ نہیں سکتا ہے اور قرآن کو دل نے مس کرنا ہے پس جب تک دل پاکیزہ نہیں ہو تو قرآن کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔

۹)تطہیرِ قلب اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتی ہے

فہمِ قرآن تطہیرِ قلب پر موقوف ہے، دل کو پاک رکھیں لیکن اس طرح سے نہیں کہ جس طرح عام آلودہ لوگ عملِ صالح ترک کر کے کہتے ہیں کہ بس دل پاک ہونا چاہئے، نہیں، ان کے دل ناپاک ہیں اسی لئے تو عملِ صالح سرزد نہیں ہوتا ہے، بالآخر انسان کے اعضاء و جوارح سے تطہیرِ دل و طہارتِ قلب نمایاں ہو جاتی ہے۔ جیسے کہا تھا کہ دل تین چیزوں کا مرکز ہے، فہم کا مرکز ہے، احساسات کا مرکز ہے اور تحریکات کا مرکز ہے۔ اعضاء و جوارح میں جو حرکت پیدا ہوتی ہے یہ دل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، زمامِ اعضاء دل کے پاس ہے، دل ان کا امام ہے، دل ضمام دار ہے، اعضاء و

تطہیرِ قلب اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتی ہے

جوارح کا فرماں روا و حکمران دل ہے، حکومت دل کی ہے، پس اعضاء و جوارح سے جو سرزد ہوتا ہے وہ دل نے کروایا ہے، آنکھ نے جہاں دیکھا ہے تو دل نے کہا ہے کہ اسے دیکھو اور کان نے جو سنا ہے تو دل نے کہا ہے کہ اس کو سنو، دل مائل ہوتا ہے پھر اعضاء و جوارح حرکت میں آتے ہیں، دل اگر پاک ہو تو ان سے نور ٹپکتا ہے، فارسی میں ایک ضرب المثل ہے کہ

از کوزہ انچہ تراود کہ در اُوست

کوزے سے وہی چیز ٹپکتی ہے کہ جو اس کے اندر موجود ہو، اگر کوزے کے اندر پاک چیز ہے تو پاک چیز باہر ٹپکے گی، اگر ناپاک چیز ہے تو ناپاکی باہر ٹپکے گی، اسی طرح اعضاء و جوارح دل کے اندر موجود چیزوں کے ٹپکنے کا ایک ذریعہ ہیں یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے؟ فانوس کے اندر جیسا نور ہوتا ہے ویسا ہی شیشے سے باہر آتا ہے، اگر اندر نورِ سفید ہو تو نورِ سفید باہر آتا ہے، نورِ زرد ہو تو نورِ زرد باہر آتا ہے، انسان کے دل میں اگر سیاہی ہو تو اعضاء و جوارح سے سیاہی ٹپکتی ہے یعنی گناہ، اگر دل کے اندر تطہیر ہو، پاکی ہو، طہارت ہو تو اعضاء و جوارح سے طہارت ٹپکتی ہے، کن لوگوں کی زبان سے نور ٹپکتا ہے؟ جن کے دل میں نور ہے یعنی انسان بولتا ہے تو جملوں سے نور ٹپکتا ہے، کن لوگوں کی نگاہوں سے نور نکلتا ہے؟ جن کے دل میں نور ہے، آپ نے دیکھا ہوگا، بعض ایسی بارگاہیں ہیں، بارگاہوں سے مراد مزارات نہیں ہیں، بارگاہ سے مراد محضر ہے یعنی بعض شخصیات، بعض بزرگان کہ جیسے مسلم و غیر مسلم نے، شیعہ و غیر شیعہ نے، سب نے متفقاً کہا ہے کہ امام خمینیؒ سے مل کر ہم نے ان کی نورانیت حس کی ہے یعنی امامؒ کی نگاہوں کی نورانیت اس نے لمس کی

قلب، اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتا ہے

ہے، محسوس کی ہے کہ اس شخص کے اندر نورانیت موجود ہے۔

ائمہ اطہار علیہم السلام میں ایسا ہی تھا، اصحاب آتے تھے اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے پاس آکر بیٹھتے تھے تو اس نورانیت کو محسوس کرتے تھے مثلاً امام صادق علیہ السلام کے پاس ایک شخص آکر بیٹھا اور کہا کہ تعجب ہے جب ہم آپ کے سامنے ہوتے ہیں تو ہماری حالت کچھ اور ہوتی ہے اور جب آپ کی بارگاہ سے اٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں تو ہماری حالت کچھ اور ہوتی ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ یوں ہی ہونا چاہئے، اگر یوں نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہاں آپ ایک خلیفۂ خدا کی بارگاہ میں ہیں جو بنورِ وجہہ اللہ دیکھتا ہے، جو نورِ خدا سے دیکھتا ہے اور اس کی نورانی نگاہیں تمہارے اوپر پڑتی ہیں، جب یہاں سے باہر جاتے ہو تو تم پر آلودہ لوگوں کی نگاہیں پڑتی ہیں، پھر کس طرح سے تمہاری روحوں کے اندر وہ نشاط پیدا ہو جو امام علیہ السلام کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ پس اعضاء و جوارح سے وہی چیز سامنے آتی ہے کہ جو دل کے اندر موجود ہو۔

۱۰)اللہ کو پاکیزہ لوگ پسند ہیں

خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی یہی بیان فرمایا کہ

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ٥(۲۱)

تحقیق خدا توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

خدا کو پاک لوگ پسند ہیں، توبہ بھی طہارت وتطہیر ہے، خدا کو پاکیزہ لوگ پسند ہیں، چونکہ وہ

خود پاک ہے۔ عام طور پر اردو زبان یا پنجابی زبان لوگ خداوند تبارک وتعالیٰ کو جن اسماء سے یاد کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ پاک کہتے ہیں۔ ایسا عربی میں کم ہوتا ہے، فارسی میں نہیں ہوتا ہے لیکن دیکھا ہے کہ اردو زبان لوگ یا اردو سے متعلقہ زبانوں مثلاً پنجابی زبان والے اکثر جب خدا کو یاد کرتے ہیں تو اللہ پاک کہتے ہیں اور بہت خوبصورت طریقے سے کہتے ہیں، خدا واقعاً پاک ہے اور پاک کو پاک چیزیں پسند ہیں لہٰذا ان دلوں کی تطہیر کریں، قرآن مجید نے دلوں کے لئے کچھ آلودگیاں ذکر کی ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ فقط یہ کہا ہے کہ پاک کرو لیکن یہ نہ بتایا ہو کہ کن چیزوں سے دل کو پاک کرنا ہے، اول یہ کہ انسان اگر خود دل میں جا کر دیکھے تو اسے معلوم ہے کہ دل کے اندر کیا موجود ہے؟ انسان خود اپنے دل سے آگاہ ہے،

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌۙ (۲۲)

بلکہ انسان خود بھی اپنے نفس کے حالات سے خوب باخبر ہے۔

لہٰذا پہلے ان غلاظتوں سے دل پاک ہو ورنہ ہم پر موعظہ، وعظ، کلامِ خدا اور نصیحتیں اثر نہیں کریں گی، علامہ اقبالؒ نے بالِ جبریل کے آغاز میں بھرتری ہری کا ایک شعر نقل کیا ہے کہ

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ہیرا سخت ترین دھات ہے اور پھول کی پتی نازک ترین موجود ہے کہ جس کو گرم ہوا لگے تو مرجھا جاتی ہے، پژمردہ ہوجاتی ہے لیکن یہی پھول کی پتی ہیرے کا جگر کاٹ سکتی ہے یعنی سخت ترین

اللہ کو پاکیزہ لوگ پسند ہیں

دھات کو یہ پھول کی پتی کاٹ سکتی ہے لیکن نادان انسان، جاہل انسان، احمق انسان کہ جس کا دل ناپاک ہو اس کے اوپر کلامِ نرم و نازک بے اثر ہے، کلامِ خدا بے اثر ہے، کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے اثر ہے، یہ حقیقت ہے، خداوند نے فرمایا ہے کہ

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○

ان کے لئے سب برابر ہے، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ جو معجزہ کا اثر رکھتی ہے لیکن خدا نے کہا کہ اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے آپ کو ان کے ساتھ نہ تھکائیں۔

بعض کے بارے میں فرمایا کہ

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ○ (۲۳)

ان کے لئے سب برابر ہے چاہے آپ استغفار کریں یا نہ کریں خدا انہیں بخشنے والا نہیں ہے کہ یقیناً اللہ بدکار قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔

خدا انہیں کیوں معاف نہیں کرے گا؟ اس لئے کہ ان کی ظرفیت بھر چکی ہے، ناپاکی ان کے وجود کا حصہ بن چکی ہے، اب نہ کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اثر کرے گا اور نہ کلامِ خدا اثر کرتا ہے چونکہ دل ناپاک ہیں اور آمادہ نہیں ہیں۔

۱۱) قرآن کے مطابق دل کی بیماریاں

قرآن نے دل کی ان بیماریوں کا ذکر کیا ہے کہ جن چیزوں سے دل کو پاک کرنا ہے تا کہ ہمارا ذہن قرآن کو مس کر سکے اور قرآن ہمارے ذہنوں میں نازل ہو سکے، ہمارے دلوں کے اندر جو چیزیں رکاوٹ بن کے بیٹھی ہوئی ہیں ان بیماریوں کے ہر عنوان کے پیچھے ایک سے زیادہ آیات موجود ہیں یعنی ایک سے بیشتر آیات کے اندر ان بیماریوں کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے چند بیماریوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

1) غِلْظَتْ

امراض دل میں ایک بیماری غِلْظَتْ ہے، اس میں دل غلیظ ہو جاتا ہے، عرفِ عام میں یعنی عام بول چال میں غلیظ گندی چیز کو کہتے ہیں لیکن ادبی زبان میں یا لغت کے لحاظ سے اسے غلظت کہتے ہیں یعنی جو شفاف نہ ہو، جیسے شیشہ صاف ہوتا ہے، کسی چیز کے اندر شفافیت نہ ہو تو کہتے ہیں کہ وہ غلیظ چیز ہے یعنی جس سے نگاہ عبور نہ کرے، جس سے نور نہ گزرے اس کو غلیظ کہتے ہیں مثلاً دیوار ہے کہ اس سے نور باہر نہیں جاتا ہے اور نہ اندر آتا ہے لہٰذا یہ غلیظ ہے لیکن شیشہ کہ جیسے عینک ہے، عینک کا شیشہ غلیظ نہیں ہے بلکہ لطیف ہے کیونکہ اس سے نور گزرتا ہے۔ جس سے نور گزرتا ہو اسے لطیف کہیں گے اور جس سے نور رک جاتا ہے اس کو غلیظ کہتے ہیں، قرآن نور ہے اور یہ غلیظ دلوں میں نہیں اترتا ہے، کیوں نہیں اترتا ہے؟ چونکہ دل غلیظ ہیں، ان کے اندر غلظت ہے، شفافیت نہیں ہے۔ قرآن نے غلظت کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ٥(۲۴)

پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور غلیظ القلب ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے لہٰذا اب انہیں معاف کردو۔ ان کے لئے استغفار کرواور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرواور جب ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

غرور و تکبر

2)غرور و تکبر

ایک بیماریٔ دیگر کہ جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے وہ غرور اور تکبر ہے، بعض ایسے دل ہیں کہ جن کے اندر غرور ہے۔قرآن میں متکبر قلب کیلئے خدا کا فرمان ہے کہ

الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ وَعِندَ الَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ٥(۲۵)

جولوگ آیاتِ الٰہی میں بحث کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے کوئی دلیل آئے وہ اللہ اور صاحبانِ ایمان کے نزدیک سخت نفرت کے حقدار ہیں اور اللہ اس طرح ہر مغرور اور سرکش انسان کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

تکبر سے مراد اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنا ہے یعنی احساسِ کبرائی، اپنے اندر کبریائی کا احساس کرنا بھی دل کی بیماری ہے اور شیطان اسی بیماری سے گرا ہے، اس نے کہا کہ

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ○ (۲۶)

تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے خاک سے بنایا ہے۔

لہٰذا

أَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ...... (۲۷)

میں اس سے بہتر ہوں،

یہ تکبر تھا یعنی بزرگ بینی، اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، جنوں میں سے ایک شیطان ہوا ہے لیکن انسانوں میں سے دیکھیں کہ کتنے ہیں؟ کہ جو اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر اور بالاتر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ أَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ، اور خدانخواستہ کہیں ہم خود نہ ہوں کہ یہ کہیں کہ دوسروں سے بہتر ہیں یعنی سب گناہ کر کے بھی دوسروں سے بہتر ہیں، متکبر دل میں قرآن اثر نہیں کرتا ہے اور نہ ہی اترتا ہے، ممکن ہے کہ عبادتوں کی وجہ سے تکبر آجائے، اچھے انسانوں میں بھی تکبر ہوتا ہے اور اتفاقاً زیادہ خطرے اچھے انسانوں کو درپیش ہیں، بعض گناہ گار ہیں کہ ان کے پاس گناہ کے باوجود تکبر ہے اور بعض تواضع کے ساتھ گناہ کرتے ہیں، بعض بیماریاں مذہبی لوگوں کی ہیں یعنی جو صرف مذہبی لوگوں کو لگتی ہیں باقی لوگوں کو نہیں لگتی ہیں، جیسے بعض بیماریاں ہیں کہ جو مخصوص زنانہ بیماریاں ہیں جو فقط عورتوں کو ہوتی ہیں مردوں کو نہیں ہوتی ہیں اسی طرح بعض بیماریاں مذہبیوں کی بیماریاں ہیں، بسا

اوقات آدمی عبادت کرتا ہے اور اسی عبادت پہ تکبر کرتا ہے۔

مولانا روم نے مثنوی میں ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ایک عبادت گزار انسان کہ جس کی نماز شب کبھی ترک نہیں ہوئی تھی، ایک رات تھکا ہوا تھا تو نماز کے لئے نہیں اٹھا، شیطان نے آ کر اس کو اٹھایا کہ اٹھو صبح ہونے والی ہے اور نمازِ شب پڑھو، اس نے شیطان کو دیکھا تو پہچان لیا اور تعجب بھی کیا کہ شیطان مجھے نمازِ شب کے لئے اٹھا رہا ہے؟ سوال اٹھا، اس نے کہا کہ تو شیطان ہے اور مجھے نماز کے لئے اٹھا رہا ہے! شیطان نے کہا کہ تم انسان بھی عجیب ہو، تمہارے ساتھ نیکی کرو تو بھی برا کہتے ہو اور برائی کرو تو بھی برا کہتے ہو، نماز کے لئے اٹھایا ہے کوئی برا کام تو نہیں کیا ہے، لیکن یہ خوب ہے کہ شیطان نیکی کرے تو اس میں بھی شک کرو، امریکا اگر کوئی بھلائی بھی کرے تو اس میں شک کرو، یورپ اگر کوئی نیکی کرے تو بھی اس میں شک کرو، یہ شیطان ہے، یہ آپ نے نیکی کیوں کی؟ اس شخص نے کہا کہ نماز کو رہنے دو، پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کیوں اٹھایا؟ تم تو شیطان ہو، بہر کیف پہلے تو شیطان نے ٹرخانا چاہا لیکن اس کے اصرار پر آخر کار اس نے بتا دیا، کہا کہ میں نے تجھے اس لئے اٹھایا ہے کہ تیری نمازِ شب کبھی ترک نہیں ہوئی تھی اور اس وجہ سے تو غرور میں مبتلا تھا، تو دوسروں سے اپنے آپ کو بہتر سمجھتا تھا، تو اس سلسلے میں میرا بھائی تھا، میں بھی اس سلسلے اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتا ہوں، صرف اس وجہ سے اُٹھایا کہ تو نمازِ شب روز پڑھتا ہے، تو کہتا تھا کہ

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ......

اور آج تیری یہ نماز چھوٹ رہی تھی کہ جس کی وجہ سے آج تیرا تکبر ٹوٹ رہا تھا اور میں نہیں

غرور و تکبر

چاہتا تھا کہ تو تکبر سے باہر آئے اس لئے تجھے اٹھایا تا کہ تو متکبر ہی رہے۔

بعض اوقات انسان ایک اچھا کام کر کے غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہی چیز قرآن سمجھنے میں مانع بن جاتی ہے، بعض ایسے ہیں کہ ان کے اندر یہی تکبر ہے کہ ہم کیوں پڑھیں؟ ہم کیوں مطالعہ کریں؟ ہم کیوں وہاں جائیں؟ ہم کیوں سنیں؟ ہم کیوں بیٹھیں؟ ہم کیوں مباحثہ کریں؟ یہ مغرور ہیں، آخر میں یہی محروم رہ جاتے ہیں۔

3) گناہ

دل کی ایک بیماری گناہ ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۝(۲۸)

اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہیں مل رہا ہے تو کوئی رہن رکھ دو اور ایک کو دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار ہے اس کو چاہئے کہ امانت کو واپس کر دے اور خدا سے ڈرتا رہے، اور خبر دار گواہی کو چھپانا نہیں کہ جو ایسا کرے گا اس کا دل گنہگار ہوگا اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

گناہ کی اپنی متعدد انواع واقسام ہیں گناہ سے مراد فقط چند معروف گناہ یا جو گناہانِ کبیرہ

میں لکھے ہوئے ہیں وہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے گناہ ہیں، جس طرح اطاعت کا میدان بہت وسیع ہے اسی طرح انسان گناہ بھی کئی گنا کرتا ہے، گناہوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہے، بعض سب کچھ کر کے پھر گناہانِ کبیرہ میں دیکھتے ہیں کہ اس میں سے تو کوئی عنوان اس پر فٹ (Fit) نہیں ہوتا ہے؟ پھر خوش ہوجاتے ہیں کہ ان میں سے کسی میں درج نہیں ہے اور ہم نے کوئی گناہ نہیں کی ہے، چونکہ اس نے ایسا حیلہ استعمال کیا ہے کہ یہ عنوان اس کے اوپر فٹ آ ہی نہیں سکتا، نہیں، گناہ لامحدود ہیں اور یہ دل کے دریچے کو بند کردیتے ہیں۔ گناہ دل کو سیاہ کردیتے ہیں، یہ سرطان کی طرح ہیں، جس طرح سرطان انسان کے خلیوں کو سیاہ کردیتا ہے، جلا دیتا ہے، اسی طرح گناہ دل کا سرطان ہے، فہم کا سرطان ہے، گناہ گار کبھی بھی علم حاصل نہیں کرسکتا ہے البتہ ٹیلیفون نمبر یاد کرسکتا ہے، ٹیلیفون ڈائریکٹری بن سکتا ہے، ممکن ہے کہ نوے ہزار ٹیلیفون نمبرز اس کو یاد ہوں، بہت سارے الفاظ اس کو یاد ہوں، پوری پوری عبارتیں اس نے رٹی ہوئی ہوں لیکن اس کو تو علم نہیں کہتے ہیں اور نہ ہی اس کے اندر کبھی علم آئے گا۔

4) غفلت

غفلت ایک بہت بڑا حجاب ہے، قرآن میں ہے کہ

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا

وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًاo(۲۹)

اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ صبر پر آمادہ کرو جو صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اسی کی مرضی کے طلب گار ہیں اور خبردار تمہاری نگاہیں ان کی طرف سے پھر نہ جائیں کہ زندگانی دنیا کی زینت کے طلب گار بن جاؤ اور ہرگز اس کی اطاعت نہ کرنا جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کا پیروکار ہے اور اس کا کام سراسر زیادتی کرنا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَo أُولٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَo(۳۰)

اس لئے کہ ان لوگوں نے زندگانی دنیا کو آخرت پر مقدم کیا ہے اور اللہ ظالم قوموں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور آنکھ، کان پر کفر کی چھاپ لگا دی گئی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقتاً حقائق سے غافل ہیں۔

غفلت دل کی مخصوص بیماری ہے، عموماً ہم اس دل کو کہ جو پمپ (Pump) ہے روز جا کر چیک کراتے ہیں، کہتے ہیں کہ دل کی پرابلم (Problem) ہے، بعض لوگوں کے ساتھ دل کا پرابلم ہے، یہ اشرافی بیماریوں میں سے ہے، جس کو ہو وہ سمجھے کہ بڑے اعلیٰ طبقے کا ہے چونکہ غریب کو کھانسی ہوتی ہے، زکام ہوتا ہے اور ہاضمہ خراب ہوتا ہے۔

امیروں کی بیماریاں کیا ہیں؟ ان کو برین ہیمرج (Brain Hemorrhage) ہوتا ہے، ان کو ہارٹ اٹیک (Heart Attack) ہوتا ہے، ان کے دل کا والو (Valve) بند ہو جاتا ہے، البتہ آج غریب بھی زور لگوا کر یہ کام کروا لیتے ہیں اور ایسی بیماریاں ان کو بھی ہو جاتی ہیں لیکن یہ اشرافی بیماریاں سمجھی جاتی ہیں، بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ہارٹ پرابلم (Heart problem) ہے، ہمارے دل کا مسئلہ ہے اور دل سے ان کی مراد پمپ ہے۔ واقعاً آپ کو دل کا مسئلہ ہے لیکن پمپ والے دل کا نہیں ہے بلکہ روح کا دل خراب ہے، آپ نے اس کا معائنہ نہیں کرایا ہے، اس کے اندر دیکھو کہ کیا کچھ ہے؟ اس کے سارے والو بند ہیں، اس کی ساری رگیں بند ہیں، یہ دل سیاہ ہے، سرطان زدہ ہے، اگر اس کا معائنہ کرواؤ تو پتہ چلے گا کہ دل میں کیا ہے؟ ہم یہ پمپ تو چیک کرواتے ہیں اور اس میں بہت مشکلات نکلتی ہیں لیکن جو روح کا دل ہے، نفس کا دل ہے، اس کا ڈر کے مارے کسی سے معائنہ نہیں کراتے ہیں ورنہ ہزاروں بیماریاں اس کے اندر لگی ہوئی ہیں، اسی میں سے ایک غفلت ہے، یہ بہت بڑی بیماری ہے اور اکثر لوگ اسی غفلت سے غافل ہیں، اس کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے جیسے موت کی طرف ہماری اصلاً توجہ نہیں ہے، حساب و کتاب و قیامت و خدا پر اصلاً توجہ نہیں ہے، یہی غفلت ہے، غفلت اسی کو کہتے ہیں کہ جانتے ہیں لیکن متوجہ نہیں ہیں، لوگ نہ اس کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔

5) ضعف

مرض بیماری کا عنوان ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝ (۳۱)

ان کے دلوں میں بیماری ہے اور خدا نے نفاق کی بنا پر اسے اور بھی بڑھا دیا ہے، اب اس جھوٹ کے نتیجے میں انہیں دردناک عذاب ملے گا۔

مرض ضعف کو کہتے ہیں، دلِ بیمار یعنی ضعیف دل، کمزور دل بھی فہم میں مانع ہے، اس کے ذریعے بھی انسان قرآن سمجھنے سے اور نور کے آنے سے محروم ہو جاتا ہے۔

6) مختوم دل

مختوم دل بھی اسی مہمور دل کو کہتے ہیں یعنی جس کی ظرفیت پر ہوگئی ہے اور اس کے اوپر مہر لگ گئی ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ......

خدا نے ان کے قلوب پر مہر لگا دی ہے......

مختوم دل اس دل کو کہتے ہیں جو بند کر کے سیل (Seal) بھی کر دیا جائے، کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو بھر جاتی ہیں مثلاً فائل بھر جاتی ہے تو پھر اس کو سیل کر دیتے ہیں کہ اب اس میں

مزید گنجائش نہیں ہے۔

اسی طرح مال گاڑی میں سامان بھرتے ہیں اور جب بوگی (Bogie) بھر جاتی ہے اور اس میں مزید گنجائش نہیں رہتی ہے تو پھر اس کو سیل کر دیتے ہیں اور اس میں کوئی مزید سامان ڈالنا چاہے تو کیا کہتے ہیں؟ یہ بھری ہوئی ہے اس میں اب کچھ نہیں ڈالا جا سکتا ہے، انہی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

سَوَاءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ o خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ......

ان کے لئے سب برابر ہے، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ خدا نے ان کے دلوں پر گویا مہر لگا دی ہے......

یعنی اے نبی ﷺ ان کے دل سیل (Seal) کر دیئے گئے ہیں، اب ان میں موعظہ اور تذکر کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ ختم ہو چکے ہیں۔

مطبوع دل

7) مطبوع دل

مطبوع بھی مہور کو کہتے ہیں یعنی مہر شدہ، مختوم اور مطبوع دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، طبع مہر لگانے کو ہی کہتے ہیں۔ اس کیلئے متعدد آیات موجود ہیں مثلاً

اِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○ (۳۲)

الزام ان لوگوں پر ہے جو غنی اور مالدار ہو کر بھی اجازت طلب کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پسماندہ لوگوں میں شامل ہو جائیں اور خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور اب کچھ جاننے والے نہیں ہیں۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ○ (۳۳)

یہ اس لئے ہے کہ یہ پہلے ایمان لائے پھر کافر ہو گئے تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی تو اب کچھ نہیں سمجھ رہے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰى اِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا أُولٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَائَهُمْ ○ (۳۴)

اور ان میں سے کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو آپ کی باتیں بظاہر غور سے سنتے ہیں، اس کے بعد جب آپ کے پاس سے باہر نکلتے ہیں تو جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان سے کہتے ہیں کہ انہوں نے ابھی کیا کہا تھا؟ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور انہوں نے اپنی خواہشات کا اتباع کر لیا ہے۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ○ (۳۵)

بیشک اسی طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو علم رکھنے والے نہیں ہیں۔

مطبوعات ولایت

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَo(۳۶)

اس کے بعد ہم نے مختلف رسول ان کی قوموں کی طرف بھیجے اور وہ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ لوگ پہلے کے انکار کرنے کی بنا پر ان کی تصدیق نہ کر سکے اور ہم اسی طرح ظالموں کے دل پر مہر لگا دیتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَo(۳۷)

یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور آنکھ کان پر کفر کی چھاپ لگا دی گئی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقتاً حقائق سے غافل ہیں۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَo(۳۸)

یہ وہ بستیاں ہیں جن کی خبریں ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں کہ ہمارے پیغمبران کے پاس معجزات لے کر آئے مگر پہلے سے تکذیب کرنے کی بنا پر ایمان نہ لا سکے، ہم اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیا کرتے ہیں۔

مطبوع دل

8) غیر متفقہ دل

غیر متفقہ دل یعنی جس دل میں تفقہ نہ ہو، جس میں فہم نہ ہو، یہ خود ایک بیماری ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا......(۳۹)

اور یقیناً ہم نے انسان و جنات کی ایک کثیر تعداد کو گویا جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں......

دلِ نافہم سارے کام کرتا ہے لیکن اس سے تفقہ کا کام نہیں ہو سکتا ہے۔

غیر متفقہ دل

9) زیغ شدہ دل

قرآن نے دل کی ایک بیماری زیغ ذکر کی ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ......(۴۰)

اس نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جس میں سے کچھ آیتیں محکم اور واضح ہیں جو اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں، اب جن کے دلوں میں زیغ ہے وہ انہی متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں......

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا......(۴۱)

یعنی پروردگار اب ہمارے دلوں میں زیغ پیدا نہ ہونے پائے......

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌo(۴۲)

بیشک خدا نے پیغمبرؐ اور ان مہاجرین وانصار پر رحم کیا ہے جنہوں نے تنگی کے وقت میں پیغمبرؐ کا ساتھ دیا ہے جب کہ ایک جماعت کے دلوں میں زیغ پیدا ہو رہی تھی پھر خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا کہ وہ ان پر بڑا ترس کھانے والا اور مہربانی کرنے والا ہے۔

زیغ یعنی کھوٹ، ملاوٹ۔ یہ دل اصل حالت پہ باقی نہیں ہیں، ان میں زیغ آ گئی ہے، کھوٹ آ گئی ہے، ایسی چیزیں جن کے اندر کھوٹ آ جاتی ہے تو پھر اس کے بعد یہ ناکارہ ہیں، اسی طرح ایک فیصد بھی کھوٹ آ جائے تو یہ دل بھی ناکارہ ہو جاتے ہیں، دل خالص ہونا چاہیے۔

امراضِ دل

10) اندھے دل

بعض لوگوں کیلئے قرآن نے فرمایا ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ دل اندھے ہیں کہ جو سینوں کے اندر ہیں۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِo(۴۳)

درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

یہ دل کے اندھے ہیں یعنی جن میں بصیرت نہیں ہوتی ہے، جن میں شعور نہیں ہوتا ہے، جو حُسن وحُب کو نہیں پہچان سکتے ہیں، جن کو احساس نہیں ہوتا ہے۔ واقعاً دنیا دل کی اندھی ہے، ان کو عراق میں ظلم نظر نہیں آتا ہے، فلسطین میں ظلم نظر نہیں آتا ہے، کشمیر میں ظلم نظر نہیں آتا ہے، اگر بچے جتنا شعور بھی ہو تو انسان کو یہ ساری چیزیں محسوس ہوتی ہیں اور دل پہ اثر ہوتا ہے لیکن یہ دل کے اندھے ہیں۔

بیزار دل

11) بیزار دل

ایک بیماری بیزاری ہے یعنی اکتاہٹ ونفرت، انسان کو اچھی چیزوں سے بیزاری ہو جاتی ہے اور اتفاقاً یہ قرآن نے ذکر کی ہے کہ بعض ایسے ناکارہ دل ہیں کہ

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ (۴۴)

اور جب ان کے سامنے خدائے یکتا کا ذکر آتا ہے تو جن کا ایمان آخرت پر نہیں ہے ان کے دل بیزار ہو جاتے ہیں اور جب اس کے علاوہ کسی اور کا ذکر آتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں۔

یعنی بعض توحید سے بیزار ہیں، شرک اس طرح ان کے دلوں میں رچ بس گیا ہے کہ یہ توحید سے بیزار ہو چکے ہیں۔ ان کے دل مشمئز ہیں یعنی بیزار ہیں، تذکرۂ توحید سے ان کو بہت

بوریت ہوتی ہے، تذکرۂ خدا سے ان کو بوریت ہوتی ہے۔ کتنا بیمار دل ہے کہ جس کو خدا کے نام سے بوریت ہوتی ہو درحالیکہ

اَلْقَلْبُ حَرَمُ اللّٰهِ ......(۴۵)

دل اللہ کا حرم ہے......

اور آج اس دل کی حالت یہ ہے کہ اگر تنہا خدا کا نام لیں اور ساتھ میں غیر اللہ کا نام نہ لیں تو یہ برداشت نہیں کرتا ہے، اس کے ماتھے پہ بل پڑ جاتے ہیں اور منہ لٹک جاتا ہے۔

مقفل دل

12) مقفل دل

دل کی ایک حالت یہ ذکر کی گئی ہے کہ دل پہ تالا پڑا ہوا ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ أَقْفَالُهَا٥(۴۶)

تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی غور نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں میں قفل پڑے ہوئے ہیں۔

جیسے دروازے کو تالا لگا دیں تو کمرا بند ہو جاتا ہے اور اب نہ کوئی اس میں آ سکتا ہے اور نہ جا سکتا ہے، مقفل دل یعنی اب کوئی بات اس کے اندر نہیں جا سکتی۔

13) قسی دل

بعض قاسیۃ القلوب یعنی سخت دل والے ہیں، پتھر کی طرح سخت دل کہ جن پر کوئی چیز اثر نہیں کرتی ہے، جو دل متاثر نہیں ہوتا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ......(۴۷)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت......

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ۝(۴۸)

افسوس ان لوگوں کے حال پر جن کے دل ذکر خدا کے لئے سخت ہو گئے ہیں تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً......(۴۹)

پھر ان کی عہد شکنی کی بنا پر ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت بنا دیا......

أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ۝(۵۰)

کیا وہ شخص جس کے دل کو خدا نے اسلام کے لئے کشادہ کر دیا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے نورانیت کا حامل ہے گمراہوں جیسا ہو سکتا ہے؟ افسوس ان لوگوں کے حال پر جن کے دل ذکر خدا کے لئے سخت ہو گئے ہیں تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

قاسیہ اس دل کو کہتے ہیں کہ جو متاثر نہیں ہوتا ہے، نہ کہ متاثر کر نہیں سکتا ہے۔

قسی دل

14) مغلوف دل

مغلوف دل یعنی غلاف میں لپٹے ہوئے دل۔ بعض دل ایسے ہیں کہ جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ٥(۵۱)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف پڑے ہوئے ہیں، ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا بیشک ان کے کفر کی بنا پر ان پر خدا کی مار ہے اور یہ بہت کم ایمان لائیں گے۔

15) پردوں سے ڈھکے ہوئے قلوب

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا......(۵۲)

اور ان میں سے بعض لوگ کان لگا کر آپ کی بات سنتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، یہ سمجھ نہیں سکتے ہیں اور ان کے کانوں میں بھی بہرا پن ہے، یہ اگر تمام نشانیوں کو دیکھ لیں تو بھی ایمان نہ لائیں گے......

وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا٥(۵۳)

اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں کہ کچھ سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں کو بہرہ

بنادیتے ہیں اور جب تم قرآن میں اپنے پروردگار کا تنہا ذکر کرتے ہو تو یہ الٹے پاؤں متنفر ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔

اکنہ پردوں کو کہتے ہیں یعنی حجابوں میں، پردوں میں لپٹے ہوئے، چھپے ہوئے دل، جن کے آگے رکاوٹیں اور موانع ہیں۔

16) غل رکھنے والے دل

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ ○ (۵۴)

اور ہم نے ان کے سینوں سے ہر طرح کی کدورت نکال لی ہے اور وہ بھائیوں کی طرح آمنے سامنے تخت پر بیٹھے ہوں گے......

وَالَّذِیْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ○ (۵۵)

اور جو لوگ ان کے بعد آئے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ خدایا ہمیں معاف کردے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جنہوں نے ایمان میں ہم پر سبقت کی ہے اور ہمارے دلوں میں صاحبانِ ایمان کے لئے کسی طرح کا کینہ نہ قرار دینا کہ تو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

غل یعنی کینہ، ایسے دل جو کینے، کدورت و نفرت سے بھرے ہوئے ہیں۔

17) مُشَرَّب دل

وَأُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ......(۵۶)

اوران کے دلوں میں گوسالہ کی محبت گھول کر پلادی گئی ہے......

مُشَرَّب دل یعنی وہ دل کہ جن کے اندر گناہ اور شرک رچ بس گیا ہے۔اشراب یعنی ان کے رگ وپے کے اندراس کوڈال دیا گیا ہے،باطل کی محبت ان کے اندر رچ بس گئی ہے۔

18) نفاق رکھنے والے دل

منافقت دل کی ایک مخصوص بیماری ہے،ہارٹ پرابلم ہے۔

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ○(۵۷)

توان کے بخل نے ان کے دلوں میں نفاق راسخ کردیا ہے اس دن تک کے لئے جب یہ خدا سے ملاقات کریں گے اس لئے کہ انہوں نے خدا سے کئے ہوئے وعدے کی مخالفت کی ہے اور جھوٹ بولے ہیں۔

وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَوِ ادْفَعُوْا قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ○(۵۸)

اور منافقین کو بھی دیکھنا چاہتا تھا، ان منافقین سے کہا گیا کہ آؤ راہِ خدا میں جہاد کرو یا اپنے نفس سے دفاع کرو تو انہوں نے کہا کہ ہم کو معلوم ہوتا کہ واقعی جنگ ہوگی تو تمہارے ساتھ ضرور آتے، یہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تر ہیں اور زبان سے وہ کہتے ہیں جو دل میں نہیں ہوتا اور اللہ ان کے پوشیدہ امور سے باخبر ہے۔

غیظ والے دل

◄ 19)غیظ والے دل

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ٥(٥٩)

اور ان کے دلوں کا غصہ دور کر دے گا اور اللہ جس کی توبہ کو چاہتا ہے قبول کر لیتا ہے کہ وہ صاحبِ علم بھی ہے اور صاحبِ حکمت بھی ہے۔

غیظ یعنی ایسے دل جو ہمیشہ غیظ وغضب کی حالت میں ہیں۔

◄ 20)شک والے دل

ریب وشک بہت بڑی بیماری ہے، فہم کے لئے یہ سبھی مانع ہیں لیکن یہ بیماریٔ دل فہم میں تھوڑا سا اور زیادہ مانع ہے یعنی ریب اور شک قرآن فہمی میں ایک بہت بڑی دل کی بیماری ہے اور اس سے دل کی تطہیر کرنی ہے، مطہر دل یعنی جس دل میں ریب وشک نہیں ہوتا ہے۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِيْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّا اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

حَكِيمٌ ٥(٦٠)

اور ہمیشہ ان کی بنائی ہوئی عمارت کی بنیاد ان کے دلوں میں شک کا باعث بنی رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور انہیں موت آجائے کہ اللہ خوب جاننے والا اور صاحبِ حکمت ہے۔

21) لہوی دل

لہوی یعنی سرگرم دل، بعض دل ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی میں لگے ہوئے ہیں، الجھے ہوئے ہیں، مشغول ہیں، یہ دل لہوی ہیں۔

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ......(٦١)

ان کے دل بالکل مشغول ہو گئے ہیں......

لہوی دل

22) زنگ آلود قلوب

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ٥(٦٢)

ہرگز نہیں! بلکہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں۔

ران یعنی میل، زنگ۔ یہ بھی دل کی بیماری ہے، دل پر میل اور زنگ چڑھ جاتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی کئی بیماریاں ہیں جو اس فصل کے حصۂ اول میں فہرست وار درج کی گئی ہیں، اس کے علاوہ روایات کے اندر بھی دل کی مزید بیماریاں بیان ہوئی ہیں۔ دل کے گناہ فقط انہی

پر منحصر نہیں ہیں بلکہ اس سے بیشتر بھی عناوین ہیں کہ جو دل کے لئے قرآن نے ذکر کئے ہے کہ ان بیماریوں اور آلودگیوں میں دل مبتلا ہیں۔ اگر دل ان سب میں یا ان میں سے کسی ایک میں بھی مبتلا ہو اور اس دل کے سامنے آپ قرآن پڑھیں تو

سَوَاءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَأَنذَرۡتَهُمۡ أَمۡ لَمۡ تُنذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ ۝

ان کیلئے سب برابر ہے، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

پس قرآن کیلئے پہلا فریضہ یہ ہے کہ دل کو آمادہ کریں یعنی ان بیماریوں سے دل کو پاک کریں، تطہیر قلب کریں۔ پہلے اپنا یہ ہارٹ پرابلم درست کریں اور ہر ایک کیلئے طریقہ ہے، عرض کیا تھا کہ انہیں پڑھ لینے سے علاج نہیں ہو رہا ہے بلکہ توجہ ہو رہی ہے لیکن بعد میں عملاً پاک کرنا ہے، ایک ایک کر کے ان سارے مسائل کو دل سے باہر نکالنا ہے اور جب دل پاک ہوگا تو پھر دیکھیں گے کہ خود ہی خود قرآن اترنا شروع ہوگیا ہے۔ انشاءاللہ خداوند سب کو توفیق دے کہ ہم قلبی بیماریوں سے نجات پائیں۔

حوالہ جات

(۱)... (شرح نہج البلاغة المقتطف من بحار)(جلوہ تاریخ در شرح نہج البلاغہ) (مناقب أمير المؤمنين (ع) - محمد بن سليمان الكوفی،الجزء۲،صفحہ۷۷)(سیمای کارگزاران علی ابن ابی طالب (ع)، الجزء۱۷،صفحہ۱۳)

(۲)... (الانسان الكامل فی نہج البلاغة)(شرح نہج البلاغة المقتطف من بحار)(جلوہ تاریخ در شرح نہج البلاغہ) (مناقب أمير المؤمنين (ع) - محمد بن سليمان الكوفی،الجزء۲،صفحہ۷۷)(سیمای کارگزاران علی ابن ابی طالب (ع)،الجزء۱۷،صفحہ۱۳)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷،۶)

(۴)... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷۴)

(۵)..... (عيون الحكم والمواعظ- على بن محمد الليثی الواسطی، الجزء۱،صفحہ۲۲۳)(غرر الحكم و درر الكلم،الجزء۱،صفحہ۲۰۷) (ميزان الحكمة - الريشہری،الجزء۶،صفحہ۱۶) (من وصايا العترة (عليهم السلام)،الجزء۴،صفحہ۳)

(۶)... (غرر الحكم و درر الكلم،الجزء۱،صفحہ۲۰۶)(ميزان الحكمة- الريشہری،الجزء۲،صفحہ۳۰۸)

(۷)... (سورۂ مبارکہ رعد، آیہ۱۷)

(۸)......(سورۂ مبارکہ یس، آیہ۱۷)

(۹)......(سورۂ مبارکہ جمعہ، آیہ۲)

(۱۰)..... (سورۂ مبارکہ جمعہ، آیہ۲)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ۱۰۳)

(۱۲)... .(سورۂ مبارکہ جمعہ، آیہ۵)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۷۶)

(۱۴) . .(الكافى - الكلينىؒ، الجزء۲، صفحه ۴۲۷)(التفسير الصافى - الفيض الكاشانىؒ، الجزء۲، صفحه۲۲۴)(الامثل فى تفسير كتابِ اللّٰهِ المُنزَل - الشَيخ نَاصِر مَكارم الشِيرازى مدظله، الجزء۵، صفحه۲۴)(تفسير الميزان - العلامة الطباطبائىؒ، الجزء۸، صفحه ۴۷)(تفسير مجمع البيان - امين الاسلام أبى على الفضل بن الحسن الطبرسىؒ، الجزء۴، صفحه۲۱۸)(تفسير نمونه - جمعى از فضلا)(منهاج البراعة فى شرح نهج البلاغة - الخوئىؒ)(مستدرك الوسائل ومستنبط المسائل - الحاج ميرزا حسين النورى الطبرسىؒ، الجزء۱۲، صفحه۳۳)(وسائل الشيعة - الفقيه المُحدّثِ الشيخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملىؒ الجزء۵، صفحه۳۵)(ميزان الحكمة - الريشهرى، الجزء۸، صفحه۳۷۳)(شرح نهج البلاغة - ابن ابى الحديد، الجزء۱، صفحه ۳۲۰۷)(شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن أبى الحديد، أبو حامد، عز الدين، المتوفى : ۶۵۶ ھ، الجزء۱۱، صفحه۱۹۴)

(۱۵)......(وسائل الشيعة- الفقيه المُحدّثِ الشيخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العامليّ، الجزء ۱۷، صفحه ۷۳)(الفصول المهمة فى أصول الأئمة - الحر العامليّ) (بحار الأنوار- العلم العلامة الحجة فخر الامة المولى الشيخ محمد باقر المجلسيّ، الجزء ۷۴، صفحه ۳۲۳)(عوالى اللآلى- ابن ابى جمهور احسائى، الجزء ۱، صفحه ۲۸)

(۱۶)......(مسند فاطمة بنت الحسين عليهما السلام)(ميزان الحكمة- الريشهرى، الجزء ۳، صفحه ۱۰۶)

(۱۷)......(غرر الحكم ودرر الكلم)(هداية العلم فى تنظيم غرر الحكم للامام على بن أبى طالبٌ)(فضائل و سيره چهارده معصوم (ع) در آثار استاد علامه حسن زاده آملى مدظله)

(۱۸)......(الفوائد الرضويه، الجزء ۲، صفحه ۱۱۴)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۷۷)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ ۷۹)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۲۲)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ قیامۃ، آیہ ۱۴)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ منافقون، آیہ ۶)

(۲۴)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۱۵۹)

(۲۵)......(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ ۳۵)

(۲۶)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۲)(سورۂ مبارکہ ص، آیہ ۷۶)

(۲۷)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۲)(سورۂ مبارکہ ص، آیہ ۷۶)

(۲۸)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۸۳)

(۲۹)......(سورۂ مبارکہ کھف، آیہ ۲۸)

(۳۰)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۱۰۸، ۱۰۷)

(۳۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۰)

(۳۲)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ ۹۳)

(۳۳)......(سورۂ مبارکہ منافقون، آیہ ۳)

(۳۴)......(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ ۱۶)

(۳۵)......(سورۂ مبارکہ روم، آیہ ۵۹)

(۳۶)......(سورۂ مبارکہ یونس، آیہ ۷۴)

(۳۷)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۱۰۸)

(۳۸)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۰۱)

(۳۹)......(سورۂ مبارکہ اعراف ۱۷۹)

(۴۰)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۷)

(۴۱)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۸)

(۴۲)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ ۱۱۷)

(۴۳)......(سورۂ مبارکہ حج، آیہ ۴۶)

(۴۴)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۴۵)

(۴۵)......(الانسان الکامل فی نہج البلاغۃ، الجزء ۱، صفحہ ۲)(فضائل و سیرہ چہاردہ معصوم (ع) در آثار استاد علامہ حسن زادہ آملی مدظلہ، الجزء ۱۳، صفحہ ۱)

(۴۶)......(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ ۲۴)

(۴۷)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۷۴)

(۴۸)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۲۲)

(۴۹)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۱۳)

(۵۰)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۲۲)

(۵۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۸۸)

(۵۲)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۲۵)

(۵۳)......(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ ۴۶)

(۵۴)......(سورۂ مبارکہ حجر، آیہ ۴۷)

(۵۵)......(سورۂ مبارکہ حشر، آیہ ۱۰)

(۵۶)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۹۳)

(۵۷)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ ۷۷)

(۵۸)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۱۶۷)

(۵۹)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ ۱۵)

(۶۰)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ ۱۱۰)

(۶۱)......(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ ۳)

(۶۲)......(سورۂ مبارکہ مطففین، آیہ ۱۴)

فصلِ ادبِ دوم

طہارتِ قلب

(حصّہ سوم)

١)قرآن پرناپاك دل كا اثر

٢)قرأتِ قرآن سے پہلے استعاذہ

٣)فہم پر تسلط كيلئے شيطان كے دروازے

٤)شياطين بلحاظِ امور مختلف ہيں

٥)دين كا مُخَاطَبُ عقل ہے

٦)اكثريت كی عقل مغلوب ہے

٧)خيالِ شيطان زدہ كا كام!

٨)وہم كا كام!

٩)حقيقت كو سمجھنے كے منابع

١٠)قرآن ميں انسان كی تقابلی اقسام اور روابط

١١)غلط خيالات اوران كاعلاج!

۱)قرآن پرناپاک دل کا اثر

تطہیرِ قلب کے بغیر قرآنی معارف انسان کے دل میں نہ صرف یہ کہ سما نہیں سکتے بلکہ ایسا دل قرآن فہمی کیلئے مضر اثرات کا حامل ہے، قرآن نور ہے اور نور کی خاصیت یہ ہے کہ نور فقط محلِ نورانی میں سما سکتا ہے لہٰذا بغیر تطہیر قلب کے ممکن ہے کہ انسان کی زبان سے قرآن میں الفاظِ عرب ادا ہو جائیں لیکن دل میں ہرگز نورِ قرآن نہیں اترتا اور بالفرض محال کہ اگر قلبِ آلودہ میں قرآن اترے بھی تو وہ قرآن کو بھی آلودہ کر دیتا ہے، دل کی آلودگی قرآن کے اوپر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن میں بھی تحریف کرتا ہے، جیسا کہ قرآن نے ذکر کیا ہے کہ پہلی قوموں نے آسمانی کتب کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے،

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ......(۱)

یہودیوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو کلماتِ الٰہیہ کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں......

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ......(۲)

پھر ان کی عہد شکنی کی بنا پر ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت بنا دیا، وہ ہمارے کلمات کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں......

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ......(۳)

یہ کلمات کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں......

قرآن پر ناپاک دل کا اثر

پہلے سمجھتے تھے،

أَفَتَطْمَعُوْنَ أَنْ يُؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ○ (۴)

مسلمانو! کیا تمہیں امید ہے کہ یہ یہودی تمہاری طرح ایمان لے آئیں گے جبکہ ان کے اسلاف کا ایک گروہ کلامِ خدا کو سن کر تحریف کر دیتا تھا حالانکہ سب سمجھتے بھی تھے اور جانتے بھی تھے۔

وہ سمجھنے کے بعد اس کے اندر تحریف کرتے تھے، معانی کو اپنے محل سے ہٹا کر مفہوم بیان کرتے تھے، اگر خدانخواستہ قلب ناپاک ہو تو ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ انسان قرآن کو اپنے محل اور موعظہ سے ہٹا کر معنیٰ کرے گا اس لئے ضروری ہے کہ یہ دل پاک ہو۔

۲) قرأتِ قرآن سے پہلے استعاذہ

قرآن نے قرأتِ قرآن اور فہمِ قرآن کے لئے ایک ادب بہت ہی صریح اور واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ○ (۵)

لہٰذا جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطانِ رجیم کے مقابلے کے لئے اللہ سے پناہ طلب کریں۔

یہ آدابِ قرآن میں سے ہے کہ پہلے انسان استعاذہ کرے یعنی شرِ شیطان سے اللہ کی پناہ

لے چونکہ اسی موقعے پر یعنی فہمِ قرآن، قرأتِ قرآن اور تلاوتِ قرآن کے دوران شیطان کے حملے کا خطرہ ہے، یہی وقتِ وارداتِ شیطان ہے، جب انسان قرآن سے دور ہو، کسی سرگرمی میں ہو، لہو و لعب میں ہو یا کسی بھی حالت میں ہو تو اس وقت اتنا شدید خطرہ نہیں ہے کہ جتنا شیطان کے حملے کا خطرہ انسان کو قرآن کی تلاوت، قرأت اور تفسیر و فہم کے معاملے میں درپیش ہے، اسی لئے خود قرآن نے سورۂ مبارکہ نحل میں اس خطر کا اعلان کر کے فرمایا ہے کہ اس خطرے سے بچنے کیلئے آپ کو خدا کی بارگاہ میں پناہ لینی ہے یعنی یہ خود ایک ادبِ مستقل ہے کہ انسان فہمِ قرآن کے مرحلے میں پناہِ خدا میں جائے لیکن شیطان اس مرحلے میں دخالت کرتا ہے اور شیطان کی دخالت بھی قوتِ فہم کے اندر ہے، اگر انسان عمل کے مرحلے میں ہو تو شیطان ان قویٰ کے اندر آ کر تصرف کرتا ہے کہ جن کے ذریعے سے عمل سرزد ہوتا ہے اور اگر انسان فہم کے مرحلے میں ہو یا کسی چیز کو سمجھنے کے درپے ہو تو انسان کی سمجھ میں آ کر تصرف کرتا ہے اور اثر انداز ہوتا ہے۔

فہم پر تسلط کیلئے شیطان کے دروازے

۳)فہم پر تسلط کیلئے شیطان کے دروازے

عمل کے وقت شیطان کے لئے دو دروازے ہیں کہ جن سے آ کر وہ انسان کی عقل پر اثر انداز ہوتا ہے اور فہم کے وقت بھی دو دروازے شیطان کے لئے کھلے رہتے ہیں کہ جن کی وجہ سے شیطان انسان کی فہم اور سمجھ میں دخالت کرتا ہے۔ عمل کے وقت جب انسان ارادہ کرتا ہے خصوصاً جب انسان عملِ صالح کا ارادہ کرتا ہے، ہمت کرتا ہے تو اسی مرحلے میں شیطان کا خطرہ ہے اور

شیطان کی دخالت اور ورود کے دو سبب یا دو دروازے ہیں، ایک انسان کے اندر وہ قوت کہ جس کا نام جاذبہ ہے یا قوتِ شہوت و اشتہا اور دوسری انسان کی قوتِ غضبیہ یا قوتِ دافعہ ہے، شیطان ان دو دروازوں پر پہلے قبضہ جمالیتا ہے۔

جس طرح کسی ملک میں اگر کوُ دتا ہو، بغاوت ہو اور خصوصاً فوجی بغاوت ہو کہ جو آئے دن ہوتی رہتی ہے اور اب پاکستانیوں کے لئے فوجی بغاوت کوئی نئی چیز نہیں ہے، جرنیلوں کو اقتدار کا اس قدر نشہ ہے کہ ان سے چند سال مسلسل بغیر قدرت کے اور بغیر اقتدار کے رہا نہیں جاتا ہے لہٰذا ہر چند گاہ وہ یہ اقدام کرتے ہیں، سب سے پہلے جا کر یہ کودتا چی قوتیں چند مراکز پر قبضہ کرتی ہیں اور اگر ان پر قبضہ ہو گیا تو پھر آپ سمجھیں کہ پورے ملک پر قبضہ ہے لیکن اگر ان پر قبضہ نہیں ہوا تو پھر یہ توقع نہ رکھیں کہ یہ کودتا یا بغاوت کامیاب ہو گی، مثلاً جب فوجی یا کودتا چی قوتیں اقتدار پر قبضہ کرتی ہیں تو پہلے قبرستان پر قبضہ نہیں کرتی ہیں بلکہ قبرستان پر آخر تک قبضہ نہیں کرتی ہیں، چونکہ مردے قبضے میں آ بھی گئے تو کوئی فائدہ نہیں ہے، قبرستان آزاد رہتے ہیں اور ان کی طرف رجوع نہیں کرتے ہیں، اب اس قبرستان میں ممکن ہے کہ افقی مردے ہوں یا عمودی مردے ہوں لیکن فرق نہیں پڑتا ہے، افقی مردے جو لیٹے ہوئے ہوتے ہیں اور عمودی مردے جو کھڑے ہوتے ہیں اور چل پھر رہے ہوتے ہیں لیکن ہوتے مردہ ہیں لہٰذا ان کے اوپر کوئی قبضہ نہیں کرتا ہے، جہاں ان کو مزاحمت کا خطرہ ہو پہلے وہاں قبضہ ہوتا ہے، مثلاً سب سے پہلے وہ عسکری اقتدار کے مراکز پر قبضہ کرتے ہیں اور اس کے بعد جہاں سے تبلیغ نشر ہوتی ہیں جیسے ریڈیو اور ٹی وی پر قبضہ کرتے ہیں، پارلیمنٹ پر قبضہ کرتے ہیں یا جیسا اس

ملک کے اندر نظام ہو، اگر صدارتی نظام ہو تو ایوانِ صدر پر قبضہ کرتے ہیں اور اگر پارلیمانی نظام ہو تو اس میں وزیر اعظم ہاؤس پر قبضہ کرتے ہیں، یہ چند جگہیں ہیں کہ جن پر پہلے مرحلے میں ہی قبضہ ضروری ہوتا ہے، اگر ان پر قبضہ نہ کرسکیں تو پھر اقتدار حاصل نہیں ہوتا ہے۔

شیطان بھی اسی طرح کرتا ہے، کُودتا چیوں نے یہ کام شیطان ہی سے سیکھا ہے کہ پہلا حملہ کن مراکز پہ کیا جائے، اگر وہ مراکز اس کے قبضے میں آجائیں تو پھر اس کے بعد پوری سلطنتِ انسان، پورا وجودِ انسان، روحِ انسان، بدنِ انسان، فکرِ انسان، عملِ انسان، ہر چیز شیطان کے اختیار میں آجاتی ہے اور وہ مہم ترین چیزیں دو ہیں، البتہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شیطان اصل اقتدارِ دلِ انسان پر حاصل کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ انسان کا مرکزِ اقتدار دل ہے لیکن دل تک پہنچنے کے لئے دروازے ہیں کہ جن سے شیطان داخل ہوتا ہے۔ اگر عملی مرحلے میں شیطان کودتا کرنا چاہے تو ان دو قوتوں کی مدد سے یا ان دو دروازوں کی مدد سے داخل ہوتا ہے، شہوت اور غضب سے یا جاذبہ اور دافعہ سے۔ اگر شیطان انسان کی عقل پر، فہم پر یعنی دل کے عملی شعبے پر قبضہ کرنا چاہے تو عمل کے مرحلے میں انسان پر واردات کرتا ہے تاکہ دل صحیح اعمال کا دستور نہ دے بلکہ کج اور غلط دستور دے، جو شیطان چاہتا ہے ویسا حکم دے۔

جب شیطان دل کے علمی شعبے پر قبضہ کرنا چاہے یعنی دل کا وہ شعبہ کہ جس کے ذریعے سے دل کچھ سمجھتا ہے، دل کچھ سمجھاتا ہے، دل کچھ حاصل کرتا ہے، دل کے اوپر کچھ الہامات ہوتے ہیں، دل کے اوپر کچھ نورانیت آتی ہے تو اس مرحلے میں شیطان اس شعبے میں قبضہ کرنا چاہتا ہے کہ دل

درست نہ سمجھے، مرحلۂ فہم میں وہ چاہتا ہے کہ انسان اس طرح سے سمجھے کہ جس طرح سے شیطان کہہ رہا ہے یعنی اس چیز کو درست نہ سمجھے، اس مرحلے میں انسان کی دو قوتیں انسانی فہم کے، انسانی دل کے دائیں بائیں موجود ہیں، ان میں سے ایک انسانی وَہم ہے اور ایک خیال ہے، ان دو قوتوں، ان دو دروازوں سے شیطان داخل ہوتا ہے۔

عام اردو بول چال میں وہم باطل اور غیر مستند چیز کو بھی کہتے ہیں یعنی اگر انسان غیر حقیقی چیزوں کو حقیقی سمجھنا شروع کر دے تو کہتے ہیں کہ یہ توہمات ہیں، یہ آپ کا وہم ہے۔ خیالی چیزوں میں، من گھڑت چیزوں میں بھی وہم استعمال ہوتا ہے اور انسان کے اندر وہم ایک قوت بھی ہے کہ جو درک کرنے کی قوت ہے اور یہ قوتِ واہمہ کہلاتی ہے۔ اسی طرح سے انسان کے اندر ایک قوتِ خیال ہے اور دونوں الگ الگ سمجھنے کی ہی قوتیں ہیں، دونوں کا تعلق ادراکات سے ہے۔

دو قوتوں نے عقلِ علمی کو گھیرا ہوتا ہے اور دو نے عقلِ عملی کو گھیرا ہوتا ہے، قوتِ شہوت اور غضب نے عقلِ عملی کا محاصرہ کیا ہوا ہے اور وہم و خیال نے عقلِ علمی کا محاصرہ کیا ہوا ہے، جب بھی انسان عقل کی مدد سے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ دونوں اس کے اندر دخالت کرتے ہیں اور جب بھی انسان کوئی عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہاں غضب اور شہوت اس کے اندر دخالت کرتے ہیں۔

اگر یہ قوتیں عقل کے فرمان کے تحت ہوں یعنی وہم و خیال پر عقل کی حکومت ہو اور یہ عقل کا عملہ ہوں تو بہت بہتر ہے کیونکہ یہی مطلوبہ حالت ہے کہ ان دونوں کو عقل کے عملے کے طور پر کام کرنا

ہے یعنی فرمان عقل کا ہواور اس کو نافذ خیال کریں، فرمان عقل کا ہو اور اس پر عمل وہم کریں۔ انسان کی قوتِ خیال وقوتِ واہمہ اگر تحتِ تسخیرِ عقل اور تحتِ فرمانِ عقل ہوں تو یہ دونوں باعثِ الہام، باعثِ علم اور باعثِ نورانیت ہیں لیکن بہت کم اتفاق ہوتا ہے کہ یہ دونوں قوتیں تحتِ تسخیرِ عقل اور تحتِ فرمانِ عقل ہوں، غالباً ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ برعکس ہوتا ہے کہ یہ دونوں قوتیں شیطان کے غلبے کے تحت ہوتی ہیں اور پھر شیطان اس عملے کے ذریعے سے حاکم پر قبضہ کر لیتا ہے جیسے عرض کیا کہ عیناً یہ ایک کودتا کی طرح ہے، عیناً ایک فوجی بغاوت کی طرح ہے کہ ایک جرنیل اپنے ملک کے صدر یا وزیراعظم کے ماتحت ہوتا ہے لیکن بغاوت کر کے اسی کو اپنے لئے تسخیر کر لیتا ہے، اسی کو اپنا اسیر بنالیتا ہے، اسی طرح سے خیال اور وہم دونوں اس جرنیل کی طرح ہیں کہ جن کو عقل کا عملہ ہونا چاہئے تھا، عقل حاکمِ اصلی مملکتِ انسان ہے، ان دونوں کو تحتِ فرمانِ عقل ہونا چاہئے تھا کہ یہ بطورِ عملہ کام کرتے، فرمان عقل کا ہوتا اور یہ اس کو نافذ کرتے جاتے لیکن جب شیطان ان کے اندر آجاتا ہے اور ان کو تسخیر کر لیتا ہے تو پھر انہی کی مدد سے عقل کو اسیر بنالیتا ہے اور مناجات میں یہی مراد ہے، ائمہ اطہار علیہم السلام سے منقول مناجات میں ہے کہ

عَقْلی مَغْلُوبٌ وَ هَوائی غالِبٌ......(۶)

یاالٰہی! عقل مغلوب ہے اور خواہش اس کے اوپر غالب آگئی ہے، عملی طور پر خواہش غالب آگئی ہے یعنی قوتِ شہوانیہ یا قوتِ غضبیہ عقل پر غالب آگئی ہیں یا علمی طور پر خواہش غالب آگئی ہے یعنی قوتِ واہمہ اور قوتِ خیالیہ عقل پر غالب آگئی ہیں، جیسے روایت میں منقول ہے کہ

كَمْ مِنْ عَقْلٍ أَسِيرٍ تَحْتَ هَوَى أَمِيرٍ......(۷)

یعنی کتنی خواہشات فرماں روا اور حاکم ہیں اور عقل اسیر ہے، عقل اپنے عملے کے ہاتھوں اسیر ہے چونکہ قوتِ شہویہ اور قوتِ غضبیہ عقل کا عملہ ہے اور ان کو عقل کے فرمان پر کام کرنا ہے لیکن شیطان ان ہی دروازوں سے داخل ہوتا ہے، اس کے لئے شہوت وغضب دو عملی دروازے ہیں اور وہم وخیال دو علمی دروازے ہیں۔

٤)شیاطین بلحاظِ امور مختلف ہیں

مطالعے کی دعا میں بھی یہی ہے کہ انسان مطالعہ کرے تو پہلے شیطانِ رجیم سے خداوند تبارک وتعالیٰ کی پناہ مانگے، البتہ وہ شیطان جو انسان سے دوسرے کام کرواتا ہے وہ مطالعے میں مزاحم نہیں ہوتا ہے، مطالعے کا شیطان الگ ہے، عمل کا شیطان الگ ہے، کھانے کا شیطان الگ ہے، بازار کا شیطان الگ ہے، شیطان کا پورا لشکر ہے، قرآن نے بھی جمع کی صورت میں لفظِ شیاطین استعمال کیا ہے، شیاطینِ جن وانس مختلف ہیں، شیاطین نے ہر شعبہ تقسیم کیا ہوا ہے، جو شیاطین عملی مرحلے کے ہیں وہ الگ ہیں، جو شیاطین مختلف اعمال کے اوپر مامور ہیں وہ الگ ہیں، شیاطین کا ایک گروہ ہمیشہ مامور ہے کہ مطالعہ کے وقت جب بھی انسان کچھ پڑھنا چاہتا ہے تو وہی آکر مزاحم انسان ہوتے ہیں اور اگر انسان ان سے آزاد ہو تو صحیح مطالعہ کرسکتا ہے، منڈی کے اندر جو شیاطین انسان کو گھیر لیتے ہیں ان سے انسان مطالعے کے وقت آزاد ہو بھی جائے تو بھی مطالعہ صحیح نہیں ہوتا ہے اس

شیاطین بلحاظِ امور مختلف ہیں

کی وجہ یہ ہے کہ جو شیاطین مطالعے کے وقت مزاحمِ انسان ہیں ان سے بھی آزاد ہونا چاہئے، انسان کے وہم اور خیال پر شیاطینِ جن کا قبضہ ہے اور انسان ان شیاطین سے مطالعے کے وقت آزاد ہو، خصوصاً جب قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور پڑھتا ہے،

پس تطہیرِ قلب میں سے ایک اہم ترین شعبہ یہ ہے کہ انسان قوتِ فہم کو شیطان سے آزاد کرا لے،

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۝

لہٰذا جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطانِ رجیم کے مقابلے کے لئے اللہ سے پناہ طلب کریں۔

البتہ فاستعذ بھی فقط زبان سے کہنا کہ اَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، یہ کافی نہیں ہے بلکہ یہ تو فقط اعلان ہے کہ میں نے شیطان کے شر سے خدا کی پناہ لی ہے۔ استعاذہ عملی چیز ہے۔ انسان کا وہ استعاذہ کہ جب انسان باقاعدہ پناہِ خدا میں چلا جاتا ہے اور شیطان سے محفوظ ہو جاتا ہے استعاذۂ عملی ہے، جب انسان اعوذ باللہ عملی انجام دیتا ہے تو پھر حالتِ شیطان اور دسترسِ شیطان سے محفوظ ہو جاتا ہے، وہم اور خیال انسان کی عقل میں یعنی فہم میں دخالت کرتے ہیں۔ اگر مجموعی طور پر دیکھیں تو خیال اور وہم کے ذریعے، شیطان کے ذریعے یا شیطان کی دخالت کے ذریعے عقل اسیر نظر آتی ہے۔ سوچنا عقل کا کام ہے لہٰذا جب بھی انسان کسی موضوع پر سوچتا ہے تو یہ عملہ غالب ہے، یعنی وہم اور خیال کی حکومت ہے۔

۵)دین کا مُخَاطَبْ عقل ھے

عقل اگر خواہشات، خیالات وتوہمات کی اسیر نہ ہو اور اسے آزادی سے کسی چیز کو سمجھنے کا موقع ملے تو یہ حقیقت کو سمجھتی ہے، عقل کی خصوصیت ہے کہ یہ ہمیشہ حقیقت تک پہنچتی ہے۔ اسی لئے عقل کے بارے میں قرآن میں بھی فراواں موارد ہیں کہ جہاں پر تعقل اور عقل کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور روایات میں بھی بالخصوص اصولِ کافی میں مرحومِ کلینیؒ نے پہلی کتاب ہی عقل وجہل تدوین کی ہے اور اس کے اندر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے فراواں روایات نقل کی ہیں کہ جن میں عقل کی اہمیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ عقل کیا چیز ہے؟ یعنی ان روایات کے اندر دارومدار عقل ہے، چونکہ سب حقیقت اسی کو سمجھنی ہے، دین کے مُخَاطَبْ احساسات وجذبات نہیں ہیں بلکہ دین کا مُخَاطَبْ عقل ہے اور نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد بھی انسان کے اندر عقلی دفینوں کو ابھارنا ہے، حدیث میں آیا ہے کہ

وَأَنَّ الْأَنْبِيَاءَ إِنَّمَا جَاؤُوْا لِيُثِيْرُوْا دَفَائِنَ الْعُقُوْلِ فِي النَّاسِ .....(۸)

بے شک انبیاءؑ اس لئے آئے تا کہ وہ لوگوں میں عقلوں کے خزانوں کو ابھاریں......

ایک اور حدیثِ مبارکہ میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ

لِيُثِيْرُوْا فِيْهِمْ دَفَائِنَ عُقُوْلِهِمْ......(۹)

(انبیاءؑ اسلئے تشریف لائے) تا کہ وہ ان کی عقول کے پوشیدہ خزانوں کو ان میں ابھاریں......

یعنی خدا نے انبیاء علیہم السلام اس لئے مبعوث کیے ہیں تا کہ انسان کی عقل کو ابھاریں، عقل کو اجاگر کریں، عقل کی پرورش وتربیت کریں چونکہ پیغامِ خدا وانبیاء علیہم السلام بھی عقل کو سمجھ میں آتا ہے، عقل مخاطبِ اصلیِ انبیاء علیہم السلام وکتبِ آسمانی ہے، عقل دل کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے، اب یہ ایک الگ موضوع ہے کہ عقل ودل میں کوئی فرق ہے یا نہیں ہے، یہاں پر آپ اسی بات پر ایمان رکھیں کہ عقل دل ہی کے ایک شعبے کا نام ہے کہ جس کے ذریعے دل کسی چیز کو سمجھتا ہے، تفہم کرتا ہے، فہم کرتا ہے، عقل یعنی شعبہ فہمِ دل، جیسے عرض کیا تھا کہ ا س دل کے چند کام ہیں، اس کے اندر احساسات، تحرکات اور فہم ہے، فہم کا کام جس شعبے سے انجام پاتا ہے اسی کو عقل کہتے ہیں۔ یہ عقل اگر آزاد ہو، اس کے اوپر کوئی امیر نہ ہو، کوئی فرماں روائے داخلی و بیرونی نہ ہو، اس کے اندر شیطان نہ ہو تو اس کا کام فقط حقیقت کو درک کرنا ہے اور یہ حقیقت تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے خدا نے فرمایا کہ یہ رسولِ باطنی ہے۔ خدا نے دو رسول مبعوث کیے ہیں، ایک رسولِ ظاہری اور دوم رسولِ باطنی اور فرمایا کہ رسولِ باطنی عقل ہے لیکن عقلِ آزاد ہو نہ کہ عقلِ اسیر، عقلِ پرورش یافتہ ہو نہ کہ عقل کی جگہ وہم آبیٹھے۔

٦) اکثریت کی عقل مغلوب ہے

اکثر لوگ مرحلہ تعقل تک نہیں پہنچے ہیں، اکثریت کے اندر عقل بیدار اور آزاد نہیں ہے بلکہ عقل کے بجائے تخیل اور توہم ہے، اکثریت تخیل کی زندگی بسر کر رہی ہے، اکثر انسانوں کے اندر یہی مشکل ہے جیسے قرآن نے بھی فرمایا ہے کہ

أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ٥(١٠)

أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ......(١١)

أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ٥(١٢)

بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا٥(١٣)

یہ اکثریت کی مشکل ہے، اکثریت مشکل کا شکار ہے اور یہ بھی خداوند نے فرمایا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ٥(١٤)

وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ٥(١٥)

یعنی خدا خیال پردازوں سے محبت نہیں کرتا ہے، خیال باف لوگ خدا کو پسند نہیں ہیں یعنی جن کی عقل ان کے خیال کی اسیر ہو اور تخیل کی حکومت ہو۔ عقل کا کام حقیقت کو دریافت کرنا ہے، پیغامِ اصلی کو دریافت کرنا، درک کرنا اور سمجھنا ہے چاہے وہ حقیقتِ علمی ہو یا حقیقتِ عینی ہو یعنی موجودات وحقائقِ عالم میں سے ہو۔

۷)خیالِ شیطان زدہ کا کام!

خیال اگر عقل کے تحت ہو، فرمانِ عقل کو قبول کرتا ہو، فرمان بار و فرمان بردارِ عقل ہو تو پھر جو کچھ عقل کہے قوتِ خیال وہی انجام دیتی ہے لیکن اگر یہ خیال جاسوس بن جائے اور عقل کا یہ دروازہ ورودِ شیطان بن جائے، یہاں تک کہ خیال کے ذریعے سے شیطان کا قبضہ عقلِ انسان پر ہو جائے تو

اس صورت میں خیال ہر وہ کام کرتا ہے کہ جو شیطان انسان کو کہتا ہے۔ خیالِ شیطان زدہ کیا ہے؟ یعنی یہ مختال انسان کیا کرتا ہے؟ جب بھی انسان کسی حقیقت کی فہم کے درپے ہوتا ہے تو خیال بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اس حقیقت کی جھوٹی تصویر بنا کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے کہ یہ ہے وہ چیز، جیسے بعض اوقات لوگ مذاق میں، مستی میں ایک دوسرے کے ساتھ ٹھٹھہ مذاق کرتے ہیں، بالآخر خوشحال لوگ بھی دنیا میں ہیں، سارے تو بغیر اقامے کے نہیں ہیں، کچھ لوگ خوشحال بھی ہیں، ہنستے بھی ہیں، مسکراتے بھی ہیں، کبھی ایک دوسرے کے ساتھ ٹھٹھہ مذاق بھی کرتے ہیں اور یہ نمکِ زندگی ہے تھوڑا بہت ہونا چاہئے۔

فرض کرلیں کہ ایک شخص شادی کرنا چاہتا ہے، اس کو بتائیں کوئی اور لڑکی اور کروائیں کسی اور سے، یعنی کوئی بڑھیا ہو کہ جس کے ساتھ شادی کروا رہے ہیں لیکن اس کو کسی جوان کی تصویر دکھائیں تو وہ دھوکے میں آجاتا ہے خصوصاً ہمارے یہاں رواج بھی یہی ہے کہ نکاح کے بعد بھی لڑکا لڑکی کو دیکھ نہیں سکتا ہے، نکاح ہو جائے تو پھر بھی محرم ایک دوسرے کے لئے محرم نہیں ہوتے ہیں چونکہ ابھی جنتری نے اجازت نہیں دی ہے، جنتری کے نزدیک ابھی بھی یہ نامحرم ہیں، فرض کرلیں کہ اس کا کسی بڑھیا کے ساتھ رشتہ طے ہو گیا لیکن اس کو پھانسنے کے لئے جو تصویر دکھائی تھی وہ کسی جوان کی تھی، خیال یہی کام کرتا ہے یعنی اصل چیز کہ انسان جس کی فہم کے درپے ہوتا ہے وہ عقل کو ادھر جانے نہیں دیتا ہے بلکہ ایک جھوٹی تصویر بنا کر اس کے سامنے حقیقت کی شکل میں بنا کر رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے تیری حقیقت، تو جس کو سمجھنے کے درپے ہے وہ یہ ہے اور انسان یعنی عقلِ اسیر اسی کو

خیالِ شیطان زدہ کا کام!

اے وہ ذات کہ جس کے غضب پر اس کی رحمت مقدم ہے......

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ بِالرَّحْمَةِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَکَ......(۷)

اے اللہ میں تجھ سے تیری رحمت کے واسطے سوال کرتا ہوں جو تیرے غضب پر سبقت رکھتی ہے......

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی رَحْمَتِهِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَهُ......(۸)

اللہ کی تعریف ہے اس رحمت پر جو اس کے غضب پر مقدم ہے......

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ......(۹)

وہ ذات پاک ہے کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے......

سَبَقَتْ رَحْمَتُکَ غَضَبَکَ......(۱۰)

اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے......

وَأَنْتَ الَّذِیْ تَسْعٰی رَحْمَتُهُ أَمَامَ غَضَبِهِ......(۱۱)

تو وہ ہے جس کی رحمت اس کے غضب سے آگے چلتی ہے......

یعنی خدا جب انسان کے اوپر غضبناک بھی ہوتا ہے تو رحمت کے لفافے میں لپیٹ کر غضب نازل کرتا ہے، جن انسانوں پر خدا نے غضب کرنا ہے تو پہلے غضب کو رحمت میں لپیٹتا ہے ورنہ غضبِ محض سے تو یہ نابود ہو جائے، نیست ہو جائے۔ غضبِ محض سے یہ دنیا، یہ مخلوق خدا تباہ و برباد ہو جائے۔ خالق کبھی بھی رحمت کے بغیر غضب نہیں کرتا ہے۔

اگر ہر عضو کو زبان مل جائے کہ جس طرح قیامت میں ہر چیز کو زبان مل جائے گی، انسان کے اعضاء کو زبان مل جائے گی یعنی آنکھیں بات کریں گی، کان بات کریں گے، جلد بات کرے گی، اعضاء و جوارح، ہاتھ، پاؤں بات کریں گے اور انسان تعجب کرے گا کہ تم نے میرے ساتھ خیانت کی ہے، تم تو میرے اعضاء ہو، تو وہ یہ کہیں گے کہ چونکہ تو نے اس وقت ہمارے ذریعے خیانت کی تھی کیونکہ ہمیں خدا نے تیرے ساتھ عضو کے طور پر منسلک کیا تھا، رابطہ جوڑا تھا، تو یہ اس لئے تو نہیں تھا کہ تو ہمارے ذریعے سے گناہ کرے، ہاتھ کہے گا کہ خدا نے جو مجھے تیرا عضو بنایا تو عضو بنانے کا مقصد یہ تو نہیں تھا کہ تو اس کے ذریعے سے گناہ کرے اور حدِ خدا توڑ دے لہٰذا ہاتھ کو زبان مل جائے گی اور انسان جس چیز کا اقرار نہیں کر رہا تھا وہ ہاتھ کہہ دے گا، جلد کہہ دے گی اور آنکھ کہہ دے گی۔

اسی طرح خیال کو بھی زبان مل جائے گی اور ضرور ملے گی، اگر خیال کو زبان مل جائے اور ہر خیال اپنی بنائی ہوئی تصویر پیش کرے کہ خدا کو کیسا سمجھے تھے؟ آپ کے ذہن میں خدا کی کیا تصویر ہے؟ یہ زبان نہیں بتائے گی تو خیال بتا دے گا، ابھی انسان شرم سے نہیں بتاتا ہے کہ کہیں غلط نہ ہو اور دوسرے اس پر ہنسیں لیکن ہر ایک کے ذہن میں بنی ہوئی ایک تصویر موجود ہے، وہ بھی خیال کی بنی ہوئی تصویر ہے اور خیال بھی خیالِ اسیر، خیالِ شیطان زدہ، اس نے تصویر بنا کر ہمارے سامنے رکھی ہوئی ہے یا مثلاً خیال نے زمان کا ایک خاکہ ذہن میں بنایا ہوا ہے، زمانہ ایک حقیقت ہے لیکن خیال نے زمان کی ایک تصویر بنائی ہوئی ہے مثلاً ہفتہ زمانے کی ایک خاص حد ہے، ایک مقرر درجہ اور ایک پیریڈ (Period) ہے، ہر ایک نے ہفتے کی ایک تصویر ذہن میں بنائی ہوئی ہے، بعض نے ہفتے کو

خیالِ شیطان زدہ کا کام!

سیڑھیوں کی شکل میں ذہن میں بنایا ہوا ہے، بعض کے ذہن میں ہفتہ گول دائرے کی شکل میں ہے، بعض کے نزدیک ہفتہ ممکن ہے کچھ اور ہو کہ جس طرح کے رجحانات ہیں، غرض ہر ایک نے زمانے کی ایک خیالی تصویر بنا کر رکھی ہوئی ہے۔

خیال اور بھی بہت کچھ کرتا ہے اس سے واضح تر ایک مثال دیں تا کہ واقعاً ہمیں پتہ ہو جائے کہ ہم خیالِ شیطان زدہ کے اسیر ہیں اور اسی اسیر عقل کے ذریعے قرآن سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، آیا اس خیالِ شیطان زدہ کے ساتھ قرآن سمجھ میں آتا ہے؟ خیال ہمارے لئے قرآن کو کیا بنا کر پیش کرتا ہے؟ مثلاً جب بارش برستی ہے تو یہ منظر ہم سب دیکھتے ہیں، قرآن مجید نے بھی بہت سارے حقائق بارش کے برسنے سے اور پانی کے نزول سے بیان کئے ہیں، یہ سب کو معلوم ہے کہ بارش قطرے کی شکل میں ہوتی ہے، بارش کا قطرہ اوپر سے نیچے آتا ہے لیکن ہمیں یہ بارش کس طرح سے نظر آتی ہے؟ ایک خط کی صورت میں، ایک لائن (Line) کی صورت میں نظر آتی ہے درحالیکہ وہ لائن نہیں ہوتی ہے بلکہ قطرہ ہوتا ہے، پوری دھار نہیں ہوتی ہے، جس طرح مثلاً آپ حمام میں جاتے ہیں تو اس میں شاور سے دھار اترتی ہے، بارش اس طرح کی دھار نہیں ہوتی ہے بلکہ قطرہ ہوتا ہے، یہ قطرہ نہایت سرعت و تیزی کے ساتھ اوپر سے نیچے آتا ہے لیکن ہمیں یہ کیا نظر آتا ہے؟ دھار اور خط کی صورت میں نظر آتا ہے، ایک سادہ سی حقیقت ہم کچھ اور دیکھ رہے ہیں، آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، حقیقت کچھ ہے اور ہمیں کچھ اور نظر آ رہی ہے، اب تلاش کرو کہ یہ کیوں ہے؟ آیا بارش کے قطرے کے اندر کوئی مشکل ہے کہ جس کی وجہ سے ہمیں قطرہ خط اور دھار کی صورت میں نظر آ رہا ہے،

خیالِ شیطان زدہ کا کام!

مشکل کہاں ہے؟ آنکھ میں کوئی قصور ہے؟ نہیں، آنکھ بھی بالکل صحیح ہے، 6/6 ہے، کوئی چیز غلط نہیں دیکھتی ہے، پھر کیوں ہمیں قطرہ دھار نظر آرہا ہے؟ اصل مشکل تلاش کرو کہ خرابی کہاں ہے؟ خرابی ساری خیال کی طرف سے ہے چونکہ جب آپ نے آنکھ سے دیکھا تو آپ کو یہاں بارش کا قطرہ نظر آیا، آپ اسے مسلسل دیکھ رہے ہیں اور قطرے بھی مسلسل نیچے آرہے ہیں لیکن آپ کا خیال یہ کام کررہا ہے کہ اس نے یہاں پر قطرے کی ایک تصویر سوچی اور اس کو دوسرے نیچے آنے والے قطروں سے متصل کردیا۔

آنکھ کیمرہ ہے کہ جو ہر قطرے کے فوٹو بنا بنا کر خیال کے سپرد کررہی ہے اور خیال ان تصویروں کو آپس میں جوڑ رہا ہے، آنکھ نے قطروں کی جتنی تصویریں لے کر خیال کو دی ہیں تو خیال نے ان چھوٹی چھوٹی تصویروں کو جوڑ کر ایک خط بنا دیا لہٰذا آنکھ نے قطرہ دیکھا ہے اور خیال نے خط دیکھا ہے، پس اب ہمیں جو نظر آتا ہے وہ خط نظر آتا ہے، کیوں؟ کیونکہ ہم خیال کے ذریعے سے دیکھ رہے ہیں نہ کہ عقل کے ذریعے سے اور نہ ہی آنکھ کے ذریعے سے یعنی ہماری آنکھ خیال کے اختیار میں ہے، جو کچھ آنکھ نے دیکھا وہ خیال کو سونپ دیا اور خیال نے مجموعی تصویریں بنا کر ہمیں خط کے طور پر دکھا دیا درحالیکہ حقیقت خط نہیں ہے، یہ عام سی روزمرہ کی مثال ہے، کوئی انسان نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں جب بارش دیکھتا ہوں تو قطرہ ہی دیکھتا ہوں مجھے خط نظر نہیں آتا ہے یعنی میرا خیال دخالت نہیں کرتا ہے، کرتا ہے، خیال زندہ ہے اور دوسری مثال جو پہلے بھی دی تھی کہ رات کو جو خواب دیکھتے ہیں یہ سب خیال کی کارستانیاں ہیں، جتنے بھی خواب دیکھتے ہیں اولِ شب سے لے کر آخرِ شب تک

خیال، شیطان زدہ کا کام!

یہ خیال کی بازگشت ہے، خیال ایک نقاش کے طور پر بیٹھا ہوا ہے اور آپ کو تصویریں بنا بنا کر دکھارہا ہے، پوری پوری فلم بنا کر دکھارہا ہے، یہ سب خیال ہیں، آپ کی آرزوئیں، تمنائیں، افکار، رجحانات اور تمایلات ہیں، آپ کے اندر جو خلا ہے، جو عقدے ہیں ان کی تصویریں اور فلمیں بنا کر دکھارہا ہے، مثلاً انسان کی محرومیتوں کی تصویر تک بنا دیتا ہے۔

یہ خیال بہت قادر و قہار قسم کا مصور ہے کہ عام مصور خیال کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے، یہ ان چیزوں کی تصویر بھی بنالیتا ہے کہ جو دوسرے تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں مثلاً محرومیت کی تصویر بنا کر پیش کرتا ہے، ایک محروم انسان باقاعدہ خواب دیکھتا ہے اور اپنی محرومیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، خیال اس کی محرومیت کی تصویریں بناتا ہے، احساسِ حقارت میں مبتلا انسان الگ قسم کے خواب دیکھتا ہے، احساسِ برتری میں مبتلا انسان ایک اور قسم کے خواب دیکھتا ہے، نفسیاتی بیمار کو الگ خواب نظر آتے ہیں، ایک شہوت ران انسان کو کچھ اور قسم کے خواب نظر آتے ہیں، حبِ مال اور حبِ ریاست والے کو کچھ اور خواب نظر آتے ہیں، ہر انسان مختلف خواب دیکھتا ہے یعنی تخیل ہمارے اندر موجود جتنی بھی چیزیں ہیں ان کو پڑھ کر اور پھر ان کی تصویریں بنا کر ہمیں دکھارہا ہے، یعنی نیند کے عالم میں خیال کی حاکمیت ہے اور اگر خیال عقل کے تحت ہو، عملۂ عقل ہو، فرمانبردارِ عقل ہو تو پھر اس صورت میں خواب کے اندر بھی خیال وہی بنا کر دکھائے گا کہ جو عقل نے دریافت کیا ہے، عقل نے جو حقائق دریافت کیے ہیں اور اسی کو رؤیائے صادقہ کہتے ہیں یعنی وہ خیال کہ جو عقل کے فرمان کے تحت ہے اور عقل جو کچھ اس کو کہے اس کی تصویر بنا کر انسان کو دکھاتا ہے لیکن جو خیال شہوات کے تحت ہے،

خیالِ شیطان زدہ کا کام!

شیطان کے تحت ہے، غضب کے تحت ہے وہ تو حقیقی تصویر بنا کر نہیں دکھاتا ہے۔

۸) وہم کا کام!

پس فہمِ قرآن کے وقت انسان کو بہت بڑا خطرہ یہ درپیش ہے کہ فہم میں یہ دو چیزیں دخالت کریں گی، وہم اور خیال، وہم بھی سمجھنے کے مرحلے میں بہت دخالت کرتا ہے، شے ہوتی کچھ ہے اور انسان کو دکھاتا کچھ اور ہے، اس کا نمونہ یہ ہے کہ جب ایک انسان حالتِ احتضار میں ہوتا ہے تو عزیز رشتہ دار یا کوئی شخص جو اس کے پائیں بیٹھا ہوتا ہے عموماً قرآن پڑھ رہا ہوتا ہے، اس کے لئے سورہ یاسین پڑھ رہا ہوتا ہے لیکن جوں ہی وہ مرتا ہے، روح و بدن ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہیں، وداع کر جاتے ہیں، میت ہو جائے تو پھر اس جسمِ بے جان سے ڈرنا شروع کر دیتا ہے، جب جسمِ با جان تھا تو اس سے نہیں ڈرتا تھا بلکہ اس سے محبت، پیار اور ہمدردی کر رہا تھا لیکن جوں ہی روح نے بدن کو ترک کیا تو اب یہ جسمِ خالی سے ڈرتا ہے، اس کو کون ڈراتا ہے؟ عقل تو نہیں ڈراتی ہے، عقل تو کہتی ہے کہ خطرہ تھا تو پہلے تھا اب بالکل خطرہ نہیں ہے چونکہ مر چکا ہے، ختم ہو چکا ہے، جسمِ بے جان ہے لیکن وہم کہتا ہے کہ نہیں بہت زیادہ خطرناک ہو گیا ہے، یہ بہت خطرناک چیزوں سے بھی زیادہ خطرناک تر ہے، یہ درندوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے، یہ انسان کو کون بتا رہا ہے؟ وہم بتا رہا ہے۔ جو انسان میت کے ساتھ ایک بند کمرے میں رہ سکتا ہے اور معمول کے مطابق رہتا ہے تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ یہ وہم زدہ نہیں ہے، وہم کا اس کے اوپر اثر کم ہے لیکن وہاں پر جو نہیں ٹکتا ہے تو یقین جان لیں

کہ اس کے اوپر وہم کا غلبہ ہے یعنی حقائق کو جب سمجھنے آتا ہے تو عقل پیچھے ہو جاتی ہے اور وہم آگے ہو جاتا ہے، یہ قوتِ واہمہ کی حقیقت ہے۔

اگر یہ دونوں قوتیں مغلوب ہوں تو انسان کے مرحلۂ فہم میں مانع ہیں۔ جب یہ شیطان کے قبضے میں ہوں تو یہ شیاطین ہیں اور آپ نے خدا سے پناہ مانگنی ہے یعنی وہم اور خیال سے آزاد ہو کر، دل کو آزاد کر کے اور خدا کے ساتھ متصل ہو کے استعاذہ کرنا ہے۔ اس لئے پہلا ادب فہمِ عظمتِ قرآن تھا، جب فہمِ عظمتِ قرآن ہو جائے، انسان کا دل جب قرآن سے، صاحبِ قرآن و متکلمِ قرآن سے متصل ہو جائے یعنی خدا سے مربوط ہو جائے تو پھر اس کے بعد وہم اور خیال سے آزاد ہو کر فہمِ قرآن کے مرحلے میں آسانی سے قرآن کو سمجھ سکتا ہے اور پیغامِ قرآن دریافت کر سکتا ہے، نہ یہ کہ پیغامِ قرآن خیال بنا کر پیش کریں، اکثر یوں ہوتا ہے کہ انسان ایک آیتِ قرآن پڑھتا ہے اور خیال اس آیت کو ایک تجسم، نمونہ اور ایک ماڈل (Model) عطا کرتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ یہ آیت یہ کہہ رہی ہے یعنی جو تو نے سوچا ہوا تھا، جو تیرا رجحان، تمایل اور خواہش ہے یہ آیہ وہی بات بیان کر رہی ہے اور انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آیہ میری ہم فکر ہے، یہ بالکل وہی چیز بتا رہی ہے کہ جو میں مدت سے میں سوچ رہا تھا، یہ کون بتاتا ہے؟ یہ مرحلہ فہمِ قرآن کے اندر خیال اور وہم کی دخالت ہے۔ دل کو پاک کریں اس لئے کہ یہ قانونِ خداوند تبارک و تعالیٰ اور عام قانونِ عقلی بھی ہے۔

۹)حقیقت کو سمجھنے کے منابع

ہمارے پاس کسی حقیقت کو سمجھنے کے دو ہی منابع ہیں ایک عقل ہے اور دوسری وحی ہے، بعض جگہ مشترکات بھی ہیں یعنی دونوں ایک چیز کو درک کرتے ہیں، اس محدود میدان میں وحی اور عقل دونوں ہمیں حقائق سمجھاتے ہیں لیکن وحی کا میدان بہت ہی وسیع تر از عقل ہے اور عقل تابعِ وحی ہے، عقل فرمان بردارِ وحی ہے، چونکہ وحی کی ضرورت کے بارے میں خود عقل کہتی ہے کہ وحی ہونی چاہئے، خدا کی طرف سے کوئی ہدایت کا نظام ہونا چاہئے، عقل خود نہیں کہتی ہے کہ حقائق کو سمجھنے کے لئے میں کافی ہوں۔ جس طرح ہماری آنکھ دور تک دیکھتی ہے اور ایک حد تک جا کر پھر ہمیں کچھ نظر نہیں آتا ہے، وہاں سے آگے ہم دیکھنے پر قادر نہیں ہیں لیکن آنکھ یہ نہیں کہتی ہے کہ وہاں سے آگے کچھ بھی نہیں ہے بلکہ آنکھ یہ کہتی ہے کہ وہاں سے آگے بہت کچھ ہے لیکن مجھے یہیں تک نظر آتا ہے، افق تک نظر آتا ہے، اسی طرح عقل بھی ایک حد تک دیکھتی ہے، عقل کا بھی افق ہے اور وہاں تک عقل نگاہ کرتی ہے، اس کے بعد عاجز آجاتی ہے اور کہتی ہے مجھے اب یہاں سے آگے نظر نہیں آتا ہے، یہاں سے آگے کسی اور منبع کا سہارا لو اور وہ وحی کا منبع ہے، علمِ الٰہی کا منبع ہے، یہ قانون قلمروئے عقل کا بھی ہے اور وحی کا بھی ہے۔

۱۰)قرآن میں انسان کی تقابلی اقسام اور روابط

قرآن نے سورۂ مبارکہ نور میں آیہ (26) میں روابطِ انسانی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ

انسان مختلف ہیں، قرآن نے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، طیب انسان اور خبیث انسان۔ البتہ بہت ساری آیات میں انسانوں کی کئی اقسام بیان کی ہیں مثلاً عالم، جاہل، مجاہد، غیر مجاہد، بزدل، شجاع، یہ تقسیماتِ قرآن ہیں کہ جن کو ہم احتیاطاً کبھی بھی بیان نہیں کرتے ہیں تا کہ اس میں کہیں ہماری حقیقت واضح نہ ہو جائے، مجاہد اور غیر مجاہد کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ سب ایک ہیں، سب اللہ کے بندے ہیں، اسی طرح اہل سنت ایک نظریہ صحابہ کے بارے میں پیش کرتے ہیں کہ صحابہ سب آسمان کے ستارے ہیں، حتیٰ چھوٹا بڑا ستارہ بھی نہ کہو، وہ کہتے ہیں کہ سب ستارے ہیں جس کے پیچھے چلو وہی نورانی ہے۔ یہ قرآنی اصل ہے کہ ایسے نہیں ہو سکتا ہے۔ انسانوں کے اندر اچھے لوگ، برے لوگ اور ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اسی طرح سے یہ علماء کم و بیش سب کے اندر ہیں۔ ہم یہ نہ کہیں کہ سب علماء آسمان کے ستارے ہیں کہ جو بھی ایک دفعہ عالم ہو جاتا ہے وہ ایک دم ستارہ ہو جاتا ہے، نہیں بلکہ علماء میں بھی اچھے برے ہیں، قرآن نے ذکر کیا ہے، خدا کا خوف رکھنے والے بھی ہیں اور خدا کا خوف نہ رکھنے والے بھی ہیں، روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ علماء دو قسم کے ہیں، علماءِ باعمل اور علماءِ بے عمل، غیر عامل علماء بھی ہیں، یہ تقسیمات ہیں کہ جو قرآن نے ذکر کی ہیں کہ مجاہد ہیں، غیر مجاہد ہیں، فی سبیل اللہ جہاد کرنے والے ہیں اور کچھ سبیلِ خدا سے ہٹنے والے ہیں، اس طرح کی تقسیمات فراواں ہیں، قرآن کو انہی موضوعات کے تحت پڑھا کریں مثلاً قرآن نے انسان کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟ قرآن نے انسان کے کتنے طبقے بنائے ہیں؟ قرآن نے کن کن گروہوں میں انسانوں کو تقسیم کیا ہے؟ مثلاً مومن اور غیر مومن ہیں پھر کہا کہ

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُوْنَ٥(١٦)

کیا وہ شخص جو صاحبِ ایمان ہے اس کے مثل ہو جائے گا جو فاسق ہے ہرگز نہیں دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ٥(١٧)

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے کہ جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لایا اور جس نے راہِ خدا میں جہاد کیا؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوُوْنَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ٥ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّهْهُ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ٥(١٨)

اللہ ایک غلام کی مثال بیان کرتا ہے جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کسی چیز پر قادر نہیں اور دوسرا (وہ شخص) جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق دے رکھا ہے پس وہ اس رزق میں سے

پوشیدہ وعلانیہ طور پر خرچ کرتا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ثنائے کامل اللہ کیلئے ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور اللہ دو مردوں کی مثال دیتا ہے، ان میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر بھی قادر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے، وہ اسے جہاں بھی بھیجے کوئی بھلائی نہیں لاتا، کیا یہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود صراطِ مستقیم پر قائم ہے؟

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْأَعْمٰى وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ٥(١٩)

دونوں فریقوں (کافروں اور مومنوں) کی مثال ایسی ہے جیسے (ایک طرف) اندھا اور بہرا ہو اور (دوسری طرف) دیکھنے والا اور سننے والا ہو، کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم نصیحت نہیں لیتے؟

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ٥(٢٠)

اللہ ایک شخص (غلام) کی مثال بیان کرتا ہے جس (کی ملکیت) میں کئی بدخو (مالکان) شریک ہیں اور ایک (دوسرا) مرد (غلام) ہے جس کا صرف ایک ہی آقا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ الحمدللہ، بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى

الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًاo (۲۱)

بغیر کسی معذوری کے گھر میں بیٹھنے والے مومنین اور راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے والے یکساں نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ زیادہ رکھا ہے اور اللہ نے ہر ایک سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں اجرِ عظیم عطا کیا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَo (۲۲)

کہہ دیجیے: کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُo (۲۳)

کیا جو شخص اللہ کی خوشنودی کا تابع ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب میں گرفتار ہو اور جس کا ٹھکانہ جہنم ہو؟ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَo (۲۴)

کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا اور اسے روشنی بخشی جس کی بدولت وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پھنسا ہوا ہو اور اس سے نکل نہ

سکتا ہو؟ یوں کافروں کیلئے ان کے کرتوت خوشنما بنادیئے گئے ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَّمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○(۲۵)

اور دو سمندر برابر نہیں ہوتے: ایک شیرین، پیاس بجھانے والا پینے میں خوشگوار اور دوسرا کھارا کڑوا اور ہر ایک سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو اور زیورات نکال کر پہنتے ہو اور تم اس میں کشتیوں کو دیکھتے ہو جو پانی کو چیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور شاید تم شکر گزار بن جاؤ۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّوْرُ ......(۲۶)

کہہ دیجئے: کیا بینا اور نابینا برابر ہو سکتے ہیں؟ اور کیا ظلمت و نور برابر ہو سکتے ہیں؟

أَفَمَنْ يَّعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمٰى إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ○(۲۷)

کیا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ برحق ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نابینا ہے؟ نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ○ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّوْرُ○ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ○ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ .....(۲۸)

اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ اندھیرا اور اجالا۔ اور نہ چھاؤں اور دھوپ۔ اور نہ ہی زندے اور مردے یکساں ہو سکتے ہیں......

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا يَّحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوْ رَحْمَةَ رَبِّهٖ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ۝(۲۹)

(مشرک بہتر ہے) یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدے اور قیام کی حالت میں عبادت کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت سے اُمید لگائے رکھتا ہے۔ کہہ دیجئے: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے یکساں ہو سکتے ہیں؟ بے شک نصیحت تو صرف عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

أَفَمَنْ وَّعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنَاهُ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ۝(۳۰)

کیا وہ شخص جسے ہم نے بہترین وعدہ دیا ہے اور وہ اس وعدے کو پانے والا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف دنیاوی زندگی کا سامان فراہم کر دیا ہے؟ پھر وہ قیامت کے دن پیش کیا جائے گا۔

وَمَا يَسْتَوِى الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيْءُ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ۝(۳۱)

اور نابینا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے نیز نہ ہی ایماندار اور عملِ صالح بجالانے والے اور بدکار۔

تم لوگ بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا......(۳۲)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے جب کہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ کے لئے ہے؟ تم میں سے جنہوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور قتال کیا وہ (دوسروں کے) برابر نہیں ہو سکتے، ان کا درجہ بہت بڑا ہے ان لوگوں سے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور مقاتلہ کیا......

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُم ۝ مَّثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ۝(۳۳)

کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل پر ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کیلئے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور جنہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہو؟۔ جس جنت کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے اسکی مثال یوں ہے کہ اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو (کبھی) بدبودار

نہ ہوگا اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جن کا ذائقہ نہیں بدلے گا اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کیلئے لذت بخش ہوں گی اور خالص شہد کی نہریں (بھی) ہیں اور اس میں ان کیلئے ہر قسم کے میوے ہیں، کیا یہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور جنہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو کاٹ کر رکھ دے گا؟

لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ

ہ(۲۰)

اہلِ جہنم اور اہلِ جنت برابر نہیں ہو سکتے، اہلِ جنت ہی کامیاب ہیں۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ہ(۳۵)

(اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ دیجئے: پاک اور ناپاک برابر نہیں ہو سکتے خواہ ناپاک کی فراوانی تمہیں بھلی لگے، پس اے صاحبانِ عقل اللہ کی نافرمانی سے بچو شاید تمہیں نجات مل جائے۔

اس طرح سے فراواں تقسیمات ہیں، ان میں سے یہ ایک تقسیم خبیث و طیب کے بارے میں ہے، انسان یا خبیث ہے یا طیب ہے، طیب یعنی پاک، خوب، پاکیزہ اور خبیث یعنی گندے، خَبث اسی سے ہے کہ جو حدث و خبث فقہ میں پڑھتے ہیں، خبث یعنی گندگی، غلاظت، خبیث لوگ یعنی گندے، ناپسندیدہ اور ناگوار لوگ کہ جن سے گھن آتی ہے، گندے لوگوں سے مراد وہ نہیں ہیں کہ جن کے اوپر مٹی پڑی ہوئی ہو، چہ بسا کہ چہروں پہ، بالوں پہ مٹی پڑی ہوتی ہے اور بہت ہی پاکیزہ لوگ

ہوتے ہیں اور وہ جو پورے پیرس کا پرفیوم اپنے اوپر اسپرے (Spray) کر لیتے ہیں ہوسکتا ہے کہ انتہائی کثیف وخبیث لوگ ہوں۔ قرآن کے طیب وخبیث نہ کہ جو حمام سے نکل کر آئے وہ طیب ہے اور جو محنت مزدوری کر رہا ہے اور جس کے ہاتھ مٹیالے ہیں وہ گندہ انسان ہو۔ قرآن نے ان کو خبیث نہیں کہا ہے یعنی طیب اور خبیث کے اندر جسم دخیل نہیں ہیں بلکہ دل ہیں، قرآن نے روح کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے، باطن کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے، دل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے، قرآن نے دل دیکھا کہ بعض خبیث ہیں اور بعض طیب ہیں، پھر یہ گروہ تقسیم کر کے ان کے درمیان روابط بیان کئے ہیں کہ روابط کیسے ہونے چاہئیں اور کیسے ہیں؟ عملاً بھی ایسا ہی ہے، فرمایا کہ

اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولٰئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ٥(٢٦)

خبیث چیزیں خبیث لوگوں کے لئے ہیں اور خبیث افراد خبیث باتوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ باتیں پاکیزہ لوگوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ افراد پاکیزہ باتوں کے لئے ہیں یہ پاکیزہ لوگ خبیث لوگوں کے اتہامات سے پاک وپاکیزہ ہیں اور ان کے لئے مغفرت اور باعزّت رزق ہے۔

یہ انسانی روابط ہیں، اب ممکن ہے زن وشوہر ہو یا اگر ازدواجی رشتے کی مناسبت سے یہ قاعدہ بیان ہوا ہے تو اس کے معانی یہ نہیں ہیں کہ فقط شادی کے لئے یہ قاعدہ ہے، یہ ضابطہ ازدواج ہے، نا، یہ رضائیت روابطِ انسانی ہے اور نہ فقط انسانی بلکہ یہ ضابطۂ روابطِ وجودی ہے، پورے عالمِ ہستی میں ایسے روابط ہیں، کلِ تکوین میں ایسے روابط ہیں کہ طیب کا رابطہ طیب سے ہوگا اور خبیث کا رابطہ

خبیث سے ہوگا، مکھی اتنے گندگی کے ڈھیر کی طرف مائل ہے، مشتاق اور عاشق ہے، کیوں؟

اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ......

اور شہد کی مکھی پھول کی عاشق ہے، کیوں؟

وَالطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبَاتِ......

طبیعتِ فطرتِ انسان خبائث سے متنفر ہے، فطرت جب فطرت اللہ ہو یعنی جس طرح سے خدا نے اس فطرت کو خلق کیا ہے اگر اسی طرح سے یہ فطرت ہو تو اس کے اندر خبائث کی طرف کوئی رجحان نہیں ہے لیکن آہستہ آہستہ جب انسان خود اس فطرت کو گناہوں سے آلودہ کرتا ہے، جیسے پچھلے باب میں ایک فہرست ذکر کی تھی کہ جن آلودگیوں سے دل آلودہ ہو جاتا ہے، دل کی پالوشن (Pollution) کہ جن کی وجہ سے بہت ساروں کو ہارٹ پروبلم (Heart problem) ہے لیکن انہیں معلوم نہیں ہے۔ کینہ ہے، حسد ہے، نفرت ہے، یہ ساری چیزیں دل کو آلودہ کر دیتی ہیں، یہ دل کو، فطرت کو آلودہ کر دیتی ہیں اور جب فطرت آلودہ ہو جائے تو آلودہ فطرت آلودگیوں کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے یعنی دل اگر خدانخواستہ خبیث ہو جائے تو پھر اس کے اندر رجحاناتِ خبیث پیدا ہوتے ہیں یعنی دلِ ناپاک ناپاکیوں کی طرف زیادہ جاتا ہے اور پاک دل پاکیزہ چیزوں کی طرف رجحان رکھتا ہے، قرآن کلامِ خدا ہے لہٰذا طیبات میں سے ہے، قرآن کی صفت بھی یہی ذکر کی گئی ہے، اسے قرآن پاک بھی کہتے ہیں،

وَالطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ......

یعنی دل پاک ہوگا تو پاک چیز دل کے اندر آئے گی چونکہ پاک کا رابطہ پاک سے ہے اور ناپاک کا ناپاک کے ساتھ رابطہ ہے، بعض لوگوں کے اندر گناہ کا رجحان شدید ہے، ان کے لئے گناہ سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے جیسا کہ بعض کے اندر اطاعت کی طرف رجحانِ شدید ہے، ذکرِ خدا کی طرف اور قرآن کی طرف رجحانِ شدید ہے، ان کو قرآن سے دور رکھنا، عبادت سے دور رکھنا بہت مشکل ہے، جس طرح قرآن نے فرمایا کہ بعض ایسے ہیں کہ جن پر عبادتیں بہت گراں گزرتی ہیں،

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ٥ (۳۷)

نماز بہت مشکل کام ہے مگر ان لوگوں کے لئے نہیں جو خشوع وخضوع والے ہیں۔

جن کے دل نرم نہیں ہیں، جن کے دل پاک نہیں ہیں، جن کے دل میں خشوع نہیں ہے ان کے لئے عبادتیں بہت ناگوار ہیں، روزہ بہت ناگوار ہے، نماز بہت ناگوار ہے لیکن بعض کے لئے عبادت میں سرور ہے، رجحانِ شدید ہے، اہل سنت کی کتابوں میں بھی یہ جملہ موجود ہے کہ جب اذان کا وقت قریب ہوتا تو پیغمبر اکرمؐ حضرت بلالؓ کو یہ امر فرماتے تھے کہ

اَرِحْنَا يَا بِلَالُ......(۳۸)

اے بلالؓ ہمیں سکون پہنچا دیجئے......

یعنی میں اس وقت تنگی اور دشواری میں ہوں، اس دشواری کو آسان کر، میرے لئے اذان دے تاکہ فریضۂ نماز اقامہ کروں، اے بلالؓ مجھے راحت دے، عبادت کے اندر، بارگاہِ خدا میں حضور کے اندر جو زمانی فاصلہ تھا وہ کم ہوتا جا رہا ہے کہ جلدی اذان دے، یہ رجحانِ شدید ہے، اسی

طرح قرآن پاک ہے اور پاک چیز کے ساتھ اس کا رابطہ ہے، اس لئے یہ پاک چیز اول تو ناپاک دل میں آتی نہیں ہے چونکہ قرآن نے یہ ضابطۂ عمومی ذکر کیا ہے،

وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ......

قرآن کبھی بھی خبیث دل میں کہ جو میلا دھوا اور جس کے اندر آلودگی ہوں، وہ آلودگیاں کہ جو قرآن میں بھی بیان ہوئی ہیں اور بہت ساری آلودگیاں اور بھی ہیں، ان آلودگیوں کی ایک فہرستِ طولانی بنتی ہے کہ جو دل کو آلودہ کرتی ہیں، اگر دل ان سے پاک نہ ہو تو ہرگز قرآن دل میں نہیں اترتا ہے، دل کو نورانی نہیں کرتا ہے البتہ آیتیں حفظ ہو جاتی ہیں اور قرآن کی مبتدا و خبریں معلوم ہو جاتی ہیں، چہ بسا انسان قرآن کے اوپر بہت ساری تحقیقات بھی کر لیتا ہے لیکن قرآن سے دل نورانی نہیں ہوتا ہے، قرآن منشورِ حیات اور منشورِ زندگی نہیں بنتا ہے، نورانیتِ قرآن پاکیزہ دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب قرآن پڑھتے تھے تو بعض بیزار ہوتے تھے اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے اور بعض ایسے ہوتے تھے کہ جیسے سورۂ جن میں ان جنوں کا واقعہ ہے کہ انہوں نے قرآن سنا اور جا کر اپنی قوم کو بتایا کہ عجب قرآن ہے، عرض کیا تھا کہ ابھی جو قرآنی کرتب زیادہ عام ہو گئے ہیں، قرآنی کرتب سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے اوپر جو کرتب انجام دیئے جاتے ہیں، یہ کرتب اگر دکھائیں تو لوگ کس کی تعریف کرتے ہیں؟ عجب بچہ ہے لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن پڑھتے تھے تو لوگ یہ نہیں کہتے تھے کہ عجب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے بلکہ کہتے تھے کہ عجب قرآن ہے۔

اگر واقعاً قرآن پیش کریں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟ عجب قرآن ہے لیکن اگر لوگ کہیں کہ عجب خطیب ہے، عجب ذاکر ہے، عجب مولوی ہے، عجب بچہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پیش نہیں ہو رہا ہے بلکہ کرتب پیش ہو رہا ہے یعنی قرآن کے لبادے میں انسان اپنے آپ کو متعارف کروا رہا ہے۔ قرآن اس طرح سے پیش کرو کہ پاک فطرت عاشقِ قرآن ہو جائے اور کہے کہ یہ عجب قرآن ہے، وہ دلدادۂ قرآن ہو جائے اور پھر قرآن سے نہ ہٹ سکے۔

بعض مشرکین نے کچھ جاسوسوں کو بھیجا کہ جاؤ رسول اللہ ﷺ کو چپکے سے سنو یعنی کیڑے نکالنے کے لئے، جیسے مجلس میں بسا اوقات ہوتا ہے کہ کچھ لوگ آتے ہیں تاکہ سن کے پھر وہاں سے کچھ چیزیں نکال کر بعد میں کمزور نکتے عام کریں گے، پروپیگنڈہ (Propaganda) کریں گے کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تقریر میں کہیں کمزور اور مبہم نکتہ نکل جاتا ہے، اس طرح سے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آتے تھے کہ دیکھیں رسول اللہ ﷺ سے کوئی ایسی بات نکل جائے کہ جس کو ہم معاشرے میں جا کر عام کریں کہ آج انہوں نے یہ کہا ہے، یہ مشرکین ان جاسوسوں کو بھیجتے تھے کہ جا کر سن کر آؤ لیکن وہ جاسوس اُن جتنے آلودہ نہیں تھے کہ جو انہیں بھیجتے تھے، بھیجتے کون تھے؟ ابولہب و ابوجہل و ابوسفیان اور جن لوگوں کو بھیجتے تھے وہ ان جتنے آلودہ نہیں تھے اور ان پر اثر ہوتا تھا، پھر یہ انتظار ہی کرتے رہ جاتے تھے، کہتے تھے کہ واپس کب آئیں گے لیکن وہ واپس نہیں آتے تھے کیونکہ اس قدر جاذبۂ قرآن میں جذب ہو جاتے تھے کہ ان کے لئے اٹھنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ بھیجنے والے کہتے تھے کہ یہ جادو ہے لیکن یہ کہتے تھے کہ نہیں جادو نہیں ہے، جادو اس طرح سے اثر نہیں کرتا ہے،

شعر اس طرح سے اثر نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا پہلے دل پاک ہو، اس لئے تطہیرِ قلب صرف قرآن ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ عبادتوں کے لئے بھی ہے، عام زندگی کے لئے بھی ہے اور ملائکہ کے الہامات کے لئے بھی ہے۔

۱۱) غلط خیالات اور ان کا علاج!

اگر دل پاک نہ ہو تو پھر وساوسِ شیطان کے لئے آمادہ ہوتا ہے، بعض اوقات لوگ ایک المیہ اکثر ذکر کرتے ہیں اور یہ مشکل سب کے ساتھ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں خود ہی خود کچھ ایسے تخیلات، تصورات، وسوسے اور خیالات دوڑتے رہتے ہیں کہ جو ہم خود نہیں سوچتے ہیں، ہم نہیں چاہتے ہیں، پسند بھی نہیں کرتے ہیں لیکن پھر بھی یہ خیالات آتے رہتے ہیں، بعض حساس نہیں ہیں لیکن یہ المیہ سب کے ساتھ ہے۔ لوگ پوچھتے بھی ہیں کہ ہمیں غلط قسم کے خیالات آتے ہیں، بے ہودہ خیالات آتے ہیں، یہ اختیاری بھی نہیں ہیں اور ہم بھی نہیں چاہتے ہیں لیکن ان کا ہم کیا کریں؟ یہ خیالات کیوں آتے ہیں؟ پاک خیالات کیوں نہیں آتے ہیں؟ درست ہے یہ خود ہی آتے ہیں لیکن خود کہاں آتے ہیں؟ جیسے مکھیاں خود آتی ہیں لیکن آتی کہاں پر ہیں؟ مکھیاں تو ہم کھینچ کر نہیں لاتے ہیں، مکھیوں کو دعوت نامہ تو نہیں دیتے ہیں کہ ساری ہمارے گھر آ جاؤ بلکہ مکھی بلانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے گھر کو گندہ کر دو پھر مکھیاں آپ کے گھر میں خود ہی آ جائیں گی اور پھر آغا سے فقہی مسئلہ پوچھو کہ آغا یہ مکھیاں خود آتی ہیں، آیا اس کے ذمہ دار ہم ہیں یا نہیں ہیں؟ کیا وہ یہ کہیں گے کہ نہیں یہ خود آتی

ہیں آپ ذمہ دار نہیں ہو، اگر آتی ہیں تو آنے دو، نہیں بلکہ کہیں گے کہ گھر گندہ رکھا ہوا ہے لہٰذا اس وجہ سے یہ مکھیاں آتی ہیں، گھر کو پاک رکھو تا کہ مکھیاں نہ آئیں، ملائکہ آئیں شیاطین نہ آئیں۔ گھر میں کچرا پھیلا کر ساری کھڑکیاں دروازے آپ نے کھولے ہوئے ہیں اور ہر ایک کے لئے کھولے ہوئے ہیں، مکھیوں کے لئے بھی، مچھروں کے لئے بھی اور پھر پوچھتے ہیں کہ ہمارے کمرے میں مکھیاں بہت آتی ہیں کیا کریں؟

دروازے کے آگے کوئی فلٹر (Filter) لگائیں، کوئی نیٹ (Net) یا جالی لگا دیں تاکہ ہوا آئے لیکن مکھی نہ آئے، لوگوں نے گھروں میں لگائی بھی ہوتی ہیں، یہی کام آپ بھی کریں، ذہن کے آگے جالی لگائیں کہ اچھے خیالات آئیں برے نہ آئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت نامہ تیار کیا ہوا ہے، دسترخوان شیطان کے لئے تیار ہے، جیسا خیال لے کر میرے دل میں آئے اس کو آنے دیتے ہیں یعنی شیطانی وسوسوں کے لئے ذہن کو آزاد چھوڑ دینا، ہم ان خیالات کو دور کر سکتے ہیں کہ کیوں غلط خیالات آتے ہیں؟ صحیح خیالات کیوں نہیں آتے ہیں؟ جیسی مناسبت ہو ویسے ہی تخیلات ہوتے ہیں، جیسا ظرف ہو، جیسا دل ہو ویسے ہی خیالات و تصورات ہوتے ہیں۔

شیاطین کن دلوں میں وسوسہ کرتے ہیں؟ ہمارے ذہن میں ملائکہ کی آمد و رفت کیوں نہیں ہے؟ اس لئے کہ ہمارے دل آلودہ ہیں اور آلودہ دل میں ملائکہ کا نہیں بلکہ شیاطین کا بسیرا ہوتا ہے، شیاطین کی آمد و رفت رہتی ہے۔ یہ ناپاک خیالات اور خبیث القائات انہی شیاطین کی وجہ سے آتے ہیں کہ جو آلودہ مملکتِ دل میں ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں، بعض دلوں میں ملائکہ اترتے ہیں اور بعض میں

شیاطین اترتے ہیں،

وَاِنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى اَوْلِيَائِهِمْ...... (۳۹)

اور شیاطین تو اپنے دوستوں کی طرف خفیہ اشارے کرتے ہی رہتے ہیں۔

شیطان اپنے دوستوں کو وحی کرتے ہیں، الہام کرتے ہیں، ان کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات ڈالتے ہیں، شکوک وشبہات ڈالتے ہیں، ان کے دلوں میں بری نیتیں ڈالتے ہیں، ان کے دلوں میں غلط ارادے ڈالتے ہیں، ان کے دلوں میں خطرات ووساوس ڈالتے ہیں لہٰذا یہ احاطہ شدہ ذہن ودل، شیطان کے اختیار میں آیا ہوا دل قرآن کو نہیں سمجھ سکتا ہے، اس لئے اپنے دل کو ان غلاظتوں اور کثافتوں سے پاک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ قرآن ہمارے دلوں میں داخل ہو سکے اور فہمِ قرآن کی راہ ہموار ہو جائے۔ انشاء اللہ اگلی فصل میں ادبِ سوم تحریر کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۴۶)

(۲)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۱۳)

(۳)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۴۱)

(۴)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷۵)

(۵)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۹۸)

(۶)......(صحیفة الامام علیؑ)

(۷)......(غرر الحکم ودرر الکلم)(گفتگو در محضر امیرالمومنین علیؑ)
(منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغة - الخوئیؒ)(امام علیؑ فرهنگ
عمومی و همبستگی اجتماعی، الجزء۸، صفحه۵)(قبسات من نهج البلاغة)
(فی ظلال نهج البلاغة)

(۸)......(مبانی نقد متن الحدیث)

(۹)......(شرح نهج البلاغه - جعفری)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ۳۷)(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۳۱)(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۳۴)
(سورۂ مبارکہ یونس، آیہ۵۵)(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۷۵)(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۱۰۱)
(سورۂ مبارکہ نمل، آیہ۶۱)(سورۂ مبارکہ قصص، آیہ۱۳)(سورۂ مبارکہ قصص، آیہ۵۷)
(سورۂ مبارکہ لقمان، آیہ۲۵)(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ۲۹)(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ۴۹)
(سورۂ مبارکہ دخان، آیہ۳۹)(سورۂ مبارکہ طور، آیہ۴۷)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ ۲۴)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ عنکبوت، آیہ ۶۳)(سورۂ مبارکہ حجرات، آیہ ۴)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ فتح، آیہ ۱۵)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ لقمان، آیہ ۱۸)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ حدید، آیہ ۲۳)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ سجدہ، آیہ ۱۸)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ ۱۹)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۷۶،۷۵)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ ھود، آیہ ۲۴)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۲۹)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۹۵)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۵۰)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۱۶۲)

(۲۴)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۱۲۲)

(۲۵)......(سورۂ مبارکہ فاطر، آیہ ۱۲)

(۲۶)......(سورۂ مبارکہ رعد، آیہ ۱۶)

(۲۷)......(سورۂ مبارکہ رعد، آیہ ۱۹)

(۲۸)......(سورۂ مبارکہ فاطر، آیہ ۲۲،۲۱،۲۰،۱۹)

(۲۹)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۹)

(۳۰)......(سورۂ مبارکہ قصص، آیہ ۶۱)

(۳۱) ....(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ ۵۸)

(۳۲)... ..(سورۂ مبارکہ حدید، آیہ ۱۰)

(۳۳)......(سورۂ مبارکہ محمد ﷺ، آیہ ۱۵،۱۴)

(۳۴)......(سورۂ مبارکہ حشر، آیہ ۲۰)

(۳۵)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۱۰۰)

(۳۶)..... .(سورۂ مبارکہ نور، آیہ ۲۶)

(۳۷).. ..(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۴۵)

(۳۸)..... (تسنیم تفسیر قرآن کریم -آیة اللّٰه جوادی آملی مدظله) (التفسير الصافي - الفيض الكاشانيؒ، الجزء ۱، صفحى ۱۳۴)(روح المعانى فى تفسير القرآن العظيم والسبع المثانى، المعروف تصسير الألوسي- شهاب الدين محمود بن عبد اللّٰه الحسينى الألوسى)(پرتوى از اسرار نماز) (بحار الأنوار -علامه مجلسيؒ، الجزء ۸۰، صفحه ۱۶)(سنن النبى ﷺ- السيد الطباطبائیؒ، الجزء ۱، صفحه ۲۳۵)

(۳۹). . .(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۱۲۱)

فصلِ اَدبِ سِوُمْ

﴿حضورِ قلب﴾

(حصّہ اول)

١)حضورِ قلب کا معنیٰ

٢)حضورِ قلب کے میادین

٣)حضور کیلئے قرآنی تعبیرات

٤)حضورِ قلب کی دشواری،ایک المیہ

٥)دلِ وحشی کی تربیت

٦)حضورِ قلب زبردستی پیدا نہیں ہوسکتا

٧)انس کیلئے مسانخت کی ضرورت

٨)سنخیت کے بغیر اُنس نا ممکن ہے

٩)قرآن وعبادت کے ساتھ مسانَخت

١٠)گریہ،انس کی علامت

١١)اُنس، حضورِ قلب کی طرف پہلا قدم

بحثِ آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ سوّم حضورِ قلب ہے، صدر المتألّھین فرماتے ہیں کہ

☆الثالث: حضور القلب......

فہمِ قرآن کے لئے ادبِ سوّم حضورِ دل ہے، ورنہ جسم تو حاضر رہتا ہے لیکن قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے، جب انسان خدمتِ قرآن میں سمجھنے کے لئے حاضر ہو تو جس طرح اس کا جسمانی طور پر حضور ہے ایسے ہی دل بھی حاضر ہو۔

۱) حضورِ قلب کا معنیٰ

حضور سے مراد لغت میں، اصطلاح میں اور خصوصاً اس بحث کے اندر بمعنیٰ موجودیت ہے یعنی موجود ہونا، اس لئے اہلِ نظر اور اہلِ فلسفہ حضور، حصول اور وجود کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان تینوں کا ایک ہی معنیٰ ہے، یہ کلماتِ مترادف ہیں، آپ کسی شے کے بارے میں کہیں کہ یہ موجود ہے، حاضر ہے یا حاصل ہے تو ان سب کو افعالِ وجودی یا مفاہیمِ وجودی تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضورِ قلب یعنی قرآن کے سامنے دل کا موجود ہونا۔ فہم کے لئے حضورِ جسمانی کافی نہیں ہے۔ جس چیز کا فہم سے تعلق ہے وہاں پر حضورِ ذہن، حضورِ فہم یا حضورِ قلب کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جہاں پر کوئی عمل کا میدان ہوتا ہے وہاں پر انسان کو حضورِ جسمانی بھی چاہئے۔

بعض اوقات کسی شے کی موجودیت کو کسی دوسری شے کے لحاظ سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے اور بعض اوقات خود اس شے کو دیکھا جاتا ہے کہ موجود ہے یا نہیں ہے۔ فلسفی بحثوں میں عموماً یہی دیکھا جاتا ہے کہ آیا یہ شے مثلاً روح موجود ہے یا نہیں ہے؟ فرشتہ موجود ہے یا نہیں ہے؟ خدا موجود ہے یا

نہیں ہے؟اس کو فلسفی زبان میں موجودیتِ نفسی کہا جاتا ہے، یعنی ایک شے کی بذاتِ خود و بجائے خود موجودیت کی بحث کی جاتی ہے کہ آیا اس کی موجودیت ہے یا نہیں ہے؟ اس موجودیت کے مقابلے میں معدومیت ہے کہ شے موجود ہے یا معدوم ہے، بعض چیزیں موجود ہیں اور بعض معدوم ہیں مثلاً فرشتہ موجود ہے، چڑیل معدوم ہے، جن موجود ہے، دِیُو یا دِیُو معدوم ہے، روح موجود ہے لیکن سیمرغ معدوم ہے، یہ چیزیں موجود نہیں ہیں۔

لیکن بعض اوقات ہم موجودیت کو بجائے خود و بذاتِ خود اس شے کیلئے نہیں دیکھتے ہیں کہ یہ موجود ہے یا معدوم ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ شے کسی دوسری شے کے لئے موجود ہے یا نہیں ہے، یہ شے کسی اور کے سامنے موجود ہے یا نہیں ہے چونکہ موجودیت کا ایک روپ یا ایک شکل یہ ہے کہ بعض امور بعض دوسرے امور کے سامنے موجود ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ اپنے تئیں موجود ہوں لیکن کسی دوسرے کے سامنے موجود نہ ہوں جیسے بہت ساری چیزیں اس وقت عالم میں موجود ہیں لیکن ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں اور بہت ساری چیزیں دنیا میں ہیں اور ہم ان کے سامنے موجود نہیں ہیں۔

حضورِ قلب کا معنی۔

مثلاً ہم اپنے گھر میں موجود ہیں لیکن کعبہ میں موجود نہیں ہیں، اس وقت ہم کربلا میں موجود نہیں ہیں اور مشہد میں بارگاہِ ملکوتی حضرت امام رضا علیہ السلام میں نہیں ہیں بلکہ وہاں سے غیر حاضر ہیں لیکن اس وقت اگر کوئی بارگاہِ حضرت معصومہ علیہا السلام میں موجود ہو تو کہتے ہیں کہ یہاں حضور ہے، یہاں یہ شخص حاضر ہے یعنی حرمِ معصومہ علیہا السلام میں موجود ہے، اس کی موجودیت حرم کیلئے ہے لہٰذا ہم موجود بھی

ہیں اور غیر حاضر بھی ہیں، حاضر وہاں ہیں کہ جہاں موجود ہیں اور غیر حاضر وہاں ہیں کہ جہاں موجود نہیں ہیں۔ اپنے تئیں اگر کوئی گھر میں، خیابان میں اور دکان پہ ہو، سویا ہوا ہو یا جاگ رہا ہو تو بھی موجود ہے لیکن یہ موجودیت بعض اوقات کسی دوسری شے کے لحاظ سے دیکھی جاتی ہے کہ جب ایک شے کسی دوسری شے کے لئے، کسی دوسرے مقام کے لئے موجود ہو تو اس کو حضور کہتے ہیں۔ جیسے اگر کوئی چیز ہمارے سامنے موجود ہو تو اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ حاضر ہے، یہ ہمارے لئے حاضر ہے لیکن ہمارے سامنے حاضر نہ ہو تو اسے تعبیر کریں گے کہ یہ غائب ہے، پس حضور کے مقابلے میں کبھی عدم استعمال ہوتا ہے اور کبھی غائب استعمال ہوتا ہے۔

اگر کسی شے کی موجودیتِ نفسی کو ملحوظ رکھیں تو اس کی مقابلے میں عدم ہے کہ یہ شے یا موجود ہے یا موجود نہیں ہے اور اگر اس کی موجودیتِ نسبی کو ملحوظ رکھیں یعنی کسی چیز کی موجودیت کسی دوسری شے کے مقابلے میں ہو تو غیبت استعمال ہوتا ہے یعنی یہ شے ہمارے سامنے موجود نہیں ہے پس غائب ہے، جیسے اس وقت امامِ عصر حضرت حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف غیبت میں ہیں، غائب ہیں، غائب ہونے سے مراد کیا ہے؟ غائب ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ سرے سے عالمِ ہستی میں نہیں ہیں یعنی موجود نہیں ہیں جیسے اہل سنت کا نظریہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ مہدیؑ موعود عالمِ ہستی، معرضِ ہستی اور مُنصۂ ہستی میں موجود نہیں ہیں، ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں، بعد میں پیدا ہوں گے چونکہ یہ وعدہ خدا ہے کہ میں ایک منجی بشریت پیدا کروں گا، نجات دہندہ، مصلح پیدا کروں گا، مجدد پیدا کروں گا، ان کے اعتقاد کے مطابق وہ موعود ہیں یعنی اللہ کا وعدہ ہے کہ ایک انسان بعد میں وجود میں آئے گا

لیکن امامیہ کے اعتقاد کے مطابق وہ مہدی علیہ السلام موجود ہیں۔ بعض اوقات شیعہ بھی اپنی کتابوں میں تقلیداً لکھتے ہیں کہ مہدیؑ موعود، حکومتِ مہدیؑ موعود، وہ موعود نہیں ہیں بلکہ موجود ہیں، جب موجود ہیں تو پھر کیوں کہتے ہیں کہ غائب ہیں؟ غائب اس وجہ سے ہیں کہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں، غیبت کے معانی یہ ہیں کہ حاضر نہیں ہیں یعنی ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں، موجودیت تو ہے لیکن ہماری نظروں کے سامنے موجود نہیں ہیں اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ امام غائب ہیں۔

پس موجودیت کا معنیٰ حضور ہے لیکن کسی شے کی وہ موجودیت کہ جو کسی کے سامنے ہو تو اس کو محضر کہتے ہیں یعنی جائے حضور، کسی کے سامنے موجود ہونا یا کسی کی بارگاہ میں موجود ہونا محضر کہلاتا ہے، عموماً یہ لفظ فارسی اور عربی میں زیادہ استعمال ہوتا ہے، لفظِ محضر اردو میں کم استعمال ہوتا ہے، محضر یعنی جائے حضور کہ جہاں پر کسی کے سامنے موجود ہوا جائے، جیسے بادشاہوں کے دربار میں موجودیت کی جگہ تھی، اگر کسی کو شاہ کے سامنے موجود ہونا ہوتا تھا تو وہ دربار میں سامنے آکر کھڑا ہوتا تھا، وہ بادشاہ کے کمرے میں، اس کے بیڈ روم میں نہیں جاتا تھا، اسے محضر نہیں کہتے تھے، محضر یعنی دربار میں وہ جگہ کہ جو انہوں نے مشخص کی ہوئی تھی کہ اگر کسی کو ملاقات کے لئے آنا ہے تو یہاں پر آئے، یہ اس کا محضر ہے، یہ جائے حضور ہے۔ اس طرح یہ سارا عالم، ساری کائنات، سارا جہان محضرِ خدا ہے، محضرِ خدا یعنی اگر کسی کو خدا کے سامنے موجود ہونا ہے تو اس عالمِ ہستی میں موجود ہونا ہے، یہ سب بارگاہِ خدا ہے، اللہ کے سامنے حاضر ہونا یعنی اس عالمِ ہستی میں موجود ہونا۔ پس فہمِ قرآن کیلئے حضورِ قلب بنیادی ترین آداب میں سے ہے کہ جس کے بغیر قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

حضورِ قلب کا معنیٰ

۲) حضورِ قلب کے میادین

تین میدان اس بحث کے لئے نہایت اہم ہیں، فہمِ قرآن مطالعہ اور عبادت۔ یہ مطلب فقط فہمِ قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جمیعِ عبادات کے لئے بھی ضروری ہے کہ انسان بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں حاضر ہو اور حضورِ قلبی رکھتا ہو۔ فہمِ قرآن وعبادت کے علاوہ تیسرا میدان طلّابِ علوم سے مربوط ہے حتیٰ طلبِ علمِ دینی ہو یا طلبِ علومِ رائج۔ جب درس پڑھتے ہیں، مطالعہ کرتے ہیں اور کتاب کھولتے ہیں تو اس کے لئے بھی حضورِ ذہن اور حضورِ قلب ضروری ہے۔ حضورِ ذہن و حضورِ دل کے بغیر مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، ان تینوں میادین کے لئے فقط جسمانی حضور کافی نہیں ہے۔

لہٰذا انسان عمر بھر قرآن سے سروکار رکھتا ہے اور قرآن پڑھتا رہتا ہے لیکن چونکہ یہی ادب مُراعات نہیں ہوتا یعنی حضورِ دل نہیں ہوتا تو نتیجتاً عمر بھر کی زحمتیں اکارت چلی جاتی ہیں یا مُدّتِ مَدِید تک انسان کسی درس میں شریک رہتا ہے، کسی بحث میں شریک رہتا ہے اور کسی علمی مرکز میں سرگرم رہتا ہے لیکن اسکے باوجود انسان کو کم تر حاصل ہوتا ہے یا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، وجہ یہ ہوتی ہے کہ حضورِ ذہن و حضورِ قلب نہیں تھا اور اسی طرح عبادات کے اندر انسان عمر بھر خدا کی بارگاہ میں جسمانی طور پر حاضر ہوتا ہے لیکن ان عبادتوں کا اثر ظاہر نہیں ہوتا ہے، عبادتوں کا ثمرہ انسان کے وجود میں ظاہر نہیں ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ ان عبادتوں کے اندر حضور نہیں تھا، انسان غائب اور غیر حاضر تھا۔ یہ تینوں میدان ایسے ہیں کہ اگر انسان ان میں غیر حاضر ہو، خصوصاً انسان کا دل، ذہن اور عقل و فہم تو

کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

بعض جگہیں ایسی ہیں کہ جہاں جسمانی حضور کی وجہ سے اثر وثمرہ حاصل ہو جاتا ہے لیکن جہاں پر قلبی و ذہنی حضور چاہئے مثلاً عبادتوں میں، قرآن کے سامنے، کتاب و درس اور مدرسہ میں تو جب تک انسان وہاں قلباً و ذہناً حاضر نہ ہو تو جسمانی حضور سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے۔ انسان حوزے میں جسمانی طور پر بیس سال رہے یا تیس سال رہے، نصف صدی رہے یا چہ بسا ایک صدی رہے، جسمانی حضور انسان کو کچھ ثمرہ عطا نہیں کرتا ہے۔

پس ان تین میدانوں کے لئے یہ بحث اہمیت رکھتی ہے اور عموماً انہی تین میادین سے تعلق رکھنے والے افراد اس پر پریشان بھی رہتے ہیں یا شکوہ ہوتا ہے کہ مطالعے کے وقت، عبادت کے اندر اور قرآن پڑھتے ہوئے حضورِ ذہن نہیں ہوتا ہے، بعض لوگ اس میں مکمل طور پر مبتلا ہیں اور بعض کے کم وبیش درجات ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ ذہنی طور پر تھوڑی سی دیر کے لئے حاضر ہوتے ہوں مثلاً پانچ منٹ کے لئے اور پھر اس کے بعد غیر حاضر ہو جاتے ہوں، کچھ لوگ ممکن ہے کہ دس منٹ کے لئے حاضر ہوں اور دس منٹ کے بعد غیر حاضر، بعض ایسے ہیں جو تکبیرۃ الاحرام میں حاضر ہوتے ہیں اور پھر نماز کے آخر تک غیر حاضر رہتے ہیں، انہیں معلوم نہیں ہوتا ہے کہ نماز میں ہیں یا کہیں اور ہیں۔ یہی تین چیزیں ہیں کہ اگر انسان ان میں غیر حاضر رہے اور محروم رہے تو یہ محرومیت انسان کو ہر قسم کی نعمتوں سے محروم کر سکتی ہے، ہر کمال سے محروم کر سکتی ہے چونکہ اگر انسان کو کچھ حاصل ہونا ہے تو انہی تین میدانوں سے حاصل ہونا ہے یا بحثِ علمی سے یا قرآن کے سامنے یا خدا کی بارگاہ میں

عبادت سے اور اگر ان تین بارگاہوں میں انسان غیر حاضر رہتا ہے تو باقی ہر جگہ حاضر بھی رہے تو بھی انسان کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

جب انسان قرآن پڑھتا ہے، بارگاہِ قرآن میں، قرآن کے محضر میں اور قرآن کی خدمت میں جاتا ہے یعنی موجودیتِ انسان برائے قرآن تو اس کو حضور برائے قرآن کہتے ہیں۔ ویسے تو قرآن ہمارے گھروں میں موجود ہے لیکن نہ ہم اس کے سامنے موجود ہیں اور نہ وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہ غلاف میں لپٹا ہوا غائب اور ہم اپنی زندگیوں میں لپٹے ہوئے اور اپنی خواہشات و شہوات میں لپٹے ہوئے غائب، ہم اس سے غائب اور وہ ہم سے غائب، اسی کو کہتے ہیں مہجور یعنی متروک اور اپنے حال پہ چھوڑا ہوا۔

جب انسان اور قرآن ایک دوسرے کے لئے موجود ہوں تو اس کو حضور کہیں گے، حتیٰ اگر انسان قرآن کھول کر بیٹھ جائے اور اس پہ نگاہ کرتا رہے تو بھی یہ قرآن کے لئے حضور نہیں ہے۔ ہمارا حضور چونکہ قرآن کے لئے نہیں ہے لہٰذا قرآن کی بارگاہ میں ہماری موجودیت نہیں ہے، جس شے کے لئے ہماری موجودیت ہوگی تو ہمارا حضور بھی اسی کے لئے ہے۔ بعض اوقات ہم جسمانی طور پہ موجود ہوتے ہیں، ہمارے کئی وجود اور کئی ہستیاں ہیں، ایک جسمانی ہستی ہے یعنی جسمانی وجود ہے، جسمانی طور پر موجود ہوتے ہوئے ممکن ہے کہ ذہنی طور پر موجود نہ ہوں اور یہ ہوتا ہے کہ انسان ذہنی طور پر غائب ہوتا ہے، ذہن موجود نہیں ہوتا ہے چونکہ جسم تو جگہ کا، مکان کا پابند ہے لہٰذا جسم ہٹ نہیں سکتا ہے اور یہاں سے کسی اور سمت نہیں جا سکتا ہے۔

جسم حدود کا، مشخصات کا اور ان ساری چیزوں کا پابند ہے کہ جو دائیں بائیں اس کو گھیرے ہوئے ہیں لیکن ذہن پابند نہیں ہے، وہ نہ جسم کا پابند ہے اور نہ کسی اور مکان و زمان کا پابند ہے لہٰذا کبھی ہمارا ذہن غیر حاضر ہو جاتا ہے اور کبھی موجود ہوتا ہے۔ بقول سعدی

ہرگز وجود حاضر غایب شنیدہ ای؟

من درمیان جمع و دلم جای دیگرست...... (۱)

یعنی کبھی دیکھا ہے کہ غائب و حاضر دونوں جمع ہوں؟ کبھی ایسا منظر دیکھا ہے کہ انسان حاضر بھی ہو اور غائب بھی ہو؟

کہا کہ ہاں ایسے ہو سکتا ہے کہ میں کسی اور جگہ پر ہوں اور میرا دل کسی اور جگہ ہے، اسی کو کہتے ہیں جمع بین حاضر و غائب یعنی یہ موجود بھی ہے اور موجود نہیں بھی ہے، حاضر بھی ہے اور غائب بھی ہے، جسمانی طور پر ادھر ہے اور دلی، قلبی و ذہنی طور پر کسی اور جگہ پر ہے۔

بعض اوقات انسان کتاب کھولتا ہے تو اس کتاب کیلئے جسمانی حضور ہوتا ہے یعنی الفاظِ کتاب، صفحۂ کتاب، کاغذِ کتاب اور جسمِ انسان ایک دوسرے کے لئے حاضر ہیں لیکن مضمونِ کتاب، علمِ کتاب، مفادِ کتاب اور روحِ انسان ایک دوسرے سے غائب ہیں، کتاب کے معانی کے لئے، مدلولات کے لئے، مفاہیم کے لئے روحِ انسان حاضر نہیں ہے بلکہ غائب ہے۔ بعض اوقات انسان مطالعہ کے دوران پورا صفحہ پڑھ جاتا ہے لیکن ایک بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ اس میں کیا لکھا ہوا تھا چونکہ اس کو غائب ہو کر پڑھا ہے، جسمانی طور پر حاضر ہو کر اور ذہنی طور پر غیر حاضر ہو کر

پڑھا ہے اور غیر حاضر انسان کو تو علم حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ حاضر انسان کو علم ملتا ہے۔

۳)حضور کیلئے قرآنی تعبیرات

عبادات میں بھی حاضر انسان کو ہی کچھ نصیب ہوتا ہے چونکہ خدا کی ذات تو حاضر ہے، حاضر خدا کے سامنے حاضر انسان چاہئے یعنی بذاتِ خود ذاتِ خدا ہمارے لئے موجود ہے کہ جس طرح سے تعبیرات ہیں مثلاً ربی، ربنا، ان تعبیرات کو قرآن میں پڑھیں کہ کتنی خوبصورت، جاذب اور حسین وزیبا ہیں، انسان جب ان کو پڑھتا ہے تو وجد میں آتا ہے مثلاً

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ٥(٢)

پروردگار جب تو نے ہمیں ہدایت دے دی ہے تو اب ہمارے دلوں میں کجی پیدا نہ ہونے پائے اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما کہ تو بہترین عطا کرنے والا ہے۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ٥(٣)

پروردگار ہمیں دنیا میں بھی نیکی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہم کو عذابِ جہنم سے محفوظ فرما۔

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ٥(٤)

خدایا ہمیں بے پناہ صبر عطا فرما اور ہمارے قدموں کو ثبات دے اور ہمیں کافروں کے مقابلے میں نصرت عطا فرما۔

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ○(۵)

خدایا ہم پر صبر کی بارش فرما اور ہمیں دنیا سے مسلمان اٹھانا۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ○(۶)

پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور تمام مومنین کو اس دن بخش دینا جس دن حساب قائم ہوگا۔

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ○(۷)

پروردگار ہم نے اس منادی کو سنا جو ایمان کی آواز لگا رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے، پروردگار اب ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری برائیوں کی پردہ پوشی فرما اور ہمیں نیک بندوں کے ساتھ محشور فرما۔

یہ بہت زیبا تعبیریں ہیں، ربنا کی تعبیریں کب استعمال ہوتی ہیں اور کون کہتا ہے؟ یعنی جہاں پر رب انسان کے لئے، مربوب کے لئے حاضر ہے اور مربوب رب کے لئے حاضر ہے یعنی حاضر انسان خدا کی بارگاہ میں یہ تعبیریں ادا کرنے کے حقدار ہیں لیکن جہاں غائب ہوں تو کیا کہتے ہیں،

ادْعُ لَنَا رَبَّکَ...... (۸)

یہ ربنا نہیں کہتے ہیں چونکہ یہ رب کے لئے حاضر نہیں ہیں اور رب ان کے لئے حاضر نہیں ہے لہٰذا یہ کہتے ہیں کہ

یَا مُوسَی ادْعُ لَنَا رَبَّکَ...... (۹)

اے موسیٰ اپنے رب سے دعا کرو......

اور جب حضور اور بھی زیادہ بڑھ ہو جائے تو ربی کہتے ہیں،

قَالَ اِبْرَاهِيمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ...... (۱۰)

ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا خدا جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے......

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ٥ (۱۱)

اللہ میرا اور تمہارا دونوں کا رب ہے لہٰذا اس کی عبادت کرو کہ یہی صراطِ مستقیم ہے۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ هُوَ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَکُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّیْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ٥ (۱۲)

اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا اور انہوں نے کہا کہ اے قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے اور اس میں آباد کیا ہے، اب اس سے استغفار کرو اور اسکی طرف متوجہ ہو جاؤ کہ میرا پروردگار قریب تر اور دعاؤں کا

قبول کرنے والا ہے۔

قَالَ سَوۡفَ أَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّيٓ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلۡغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ۝ (۱۳)

انہوں نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے حق میں استغفار کروں گا کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

ربی یعنی یہ شخص خدا کے لئے حاضر ہے اور خدا اس شخص کے لئے حاضر ہے، ان تعبیروں کے اندر وہ لطافت اور حُسن موجود ہے کہ اگر توجہ وحضور ہو تو انسان کو ان تعبیروں اور کلموں پہ وجد آتا ہے۔ بعد میں ایک اور ادب ذکر کریں گے کہ اگر مؤدب ومہذب انسان قرآن کی بارگاہ میں حاضر ہو تو وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

٤)حضورِ قلب کی دشواری،ایک المیہ

اگر غیر مہذب انسان قرآن کی بارگاہ میں حاضر ہو تو بے ادبی زیادہ کرتا ہے کہ جیسے مسجد یا حرم میں بچے دوڑ رہے ہوتے ہیں، بچوں کو تو آداب نہیں آتے ہیں، یہ مسجد میں اچھل کود کر رہے ہوتے ہیں، جو مقدس چیزیں مومنین نے رکھی ہوتی ہیں ان کو پھلانگ رہے ہوتے ہیں اور ان مقدسات کا ان کو کوئی احساس نہیں ہوتا ہے، یہ ساری چیزیں بے ادبی اور گستاخیاں ہیں، اسی طرح انسانِ غیرِ مؤدب جب قرآن کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو چونکہ یہ بے ادب و گستاخ ہے لہٰذا قرآن کے لئے حضور موجود نہیں ہے، جب قرآن کے سامنے حضورِ قلب ہو تو اس وقت قرآن بھی ظہور کرتا

ہے، اس وقت قرآن بھی حاضر ہو جاتا ہے ورنہ جب انسان غیر حاضر ہو تو پھر قرآن بھی موجود نہیں ہوتا ہے اور دلِ انسان کے لئے یہ صرف صفحہ و کاغذ ہے۔

یہ تینوں میدان نظر میں رکھیں، اگرچہ ہمیں ہر ایک کو الگ الگ بیان کرنے کی ضرورت تھی لیکن یہاں ایک جامع چیز بیان ہوگی اس کو آپ تینوں کے اوپر خود تطبیق کرلیں چونکہ ہمارا محور اس وقت قرآن ہے ورنہ آپ اس کو عبادات، مطالعات اور اپنے درس و بحث کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں خصوصاً اہلِ علم اور طلّابِ علوم کے لئے یہ بحث بہت ضروری ہے، مطالعہ باحضور یعنی آدابِ مطالعہ میں سے ایک یہ ہے کہ انسان ذہنی و قلبی حضور کے ساتھ مطالعہ کرے یعنی موجود رہے اور علم کی بارگاہ میں غیر حاضر نہ رہے، یہ نہ ہو کہ جسمانی طور پر ہم اس کتاب کے سامنے ہوں لیکن ہمارا ذہن غیر حاضر رہے۔

بعض اوقات لوگ پوچھنے آتے ہیں کہ آغا یہ بتائیں کہ عبادت میں ہمارا دل حاضر نہیں ہوتا ہے۔ جس سے پوچھ رہے ہیں اس کی بھی یہی مشکل ہے، یہ سب کی مشکل ہے، ہمارے استادِ بزرگوار حضرت آیت اللہ طاہر شمسؒ، خدا ان پر رحمت کرے اپنے استادِ گرامی سے کہ جو شہید مفتحؒ کے اور مرحوم طاہر شمسؒ کے استاد تھے، ان سے نقل فرماتے تھے اور پوری علامتوں کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، یہ دونوں ان بزرگوار کے پاس درسِ خصوصی پڑھتے تھے، حرمِ حضرت معصومہؑ کے ایک صحن میں ایک قبر ابھری ہوئی ہے کہ جو جنابِ قطب راوندیؒ کی قبر ہے، اس قبر کے پاس وہ عصر کے وقت آکر بیٹھ جاتے تھے اور نمازِ مغرب تک درس و بحث یہیں پہ پڑھاتے تھے اور لوگوں کے سوالات کا جواب بھی

دیتے تھے، ایک دن ایک زائر آیا اور اس نے حاضر ہو کر سلام کیا پھر پوچھا کہ میری مشکل یہ ہے کہ میں جب نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو حاضر نہیں رہتا ہوں، نہ ذہنی طور پر، نہ قلبی طور پر، مجھے نماز کے اندر حضور حاصل نہیں ہوتا ہے، بتائیں کہ میں کیا کروں تا کہ نماز کے اندر حاضر رہوں اور حضورِ قلب کے ساتھ نماز پڑھوں؟ یہ سوال سننا تھا کہ بزرگوار مرحوم خوانساریؒ نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا، وہ شخص سمجھا کہ میں نے شاید کوئی ناگوار بات کی ہے اور ایک عالمِ دین کا دل دکھایا ہے، وہ معذرت کرنے لگا کہ مجھے معلوم نہیں تھا شاید مجھ سے کوئی بے ادبی ہوگئی ہے، انہوں نے جواب دیا کہ نہیں، یہ مشکل جو تو نے پوچھی ہے اس سے تو نے میرے درد اور میرے زخم کو تازہ کر دیا ہے، یہ میری بھی مشکل ہے، میں خود اس جستجو میں ہوں کہ کوئی ایسا نسخہ، کوئی ایسا طریقہ مل جائے تا کہ میں بھی دو رکعت حضورِ دل و حضورِ ذہن کے ساتھ پڑھ سکوں۔

۵) دلِ وحشی کی تربیت

اگر عمر بھر کوئی انسان ایک دفعہ دو رکعت نماز حضورِ قلب کے ساتھ پڑھے تو یہ دو رکعت نماز انسان کے لئے کافی ہے، ہم غیر حاضر عبادتیں تو فراواں کرتے ہیں لیکن کاش ہم دو رکعت حضور کی پڑھ لیں، ایک کتاب حضورِ دل سے پڑھ لیں کہ جہاں پر دل حاضر ہو، بھاگے نہیں، فرار نہ کرے، اِدھر اُدھر نہ جائے یعنی بارگاہِ خدا میں حاضر رہے۔ نماز محضرِ خدا ہے، بارگاہِ خدا ہے اور یہ قلب بارگاہِ خدا میں حاضر رہے، جب انسان نماز شروع کرتا ہے تو تکبیرۃ الاحرام کہہ کر رفع یدین کرتا ہے یعنی

اپنے حضور کا اعلان کرتا ہے کہ اے خدا میں آ گیا ہوں، میں حاضر ہوں لیکن پھر نا گہاں غائب ہو جاتا ہے، اسی شریر بچے کی طرح کہ جس کو پکڑ کر کھڑا کرتے ہیں اور ذرا سی نظریں ادھر ہوں تو وہ فوراً بھاگ جاتا ہے، نفسِ انسان اسی طرح سے ہے، روایت میں ہے کہ

قُلُوْبُ الرِّجَالِ وَحْشِيَّةٌ..... (۱۴)

لوگوں کے دل وحشی ہوتے ہیں .....

وحشی ایک جگہ ٹکتا نہیں ہے، مثلاً ایک پرندہ وحشی ہے اور ایک پرندہ اہلی ہے یعنی پالتو کہ جو انسان کے ساتھ مانوس ہے، اگر انسان پالتو پرندے کو آزاد بھی چھوڑ دے تو اس کے اردگرد ہی رہتا ہے، اگر اس کو اڑائے تو بھی وہ واپس آجاتا ہے لیکن وحشی کو آپ جب تک کسی پنجرے میں بند نہ کریں تو وہ ٹکتا نہیں ہے بلکہ بھاگ جاتا ہے اور پنجرے میں بھی کوشش کرتا رہتا ہے کہ کہیں سے اس کو فرار کا سراغ مل جائے تاکہ فرار کر جائے۔

دل وحشی کی تربیت

ان وحشیوں کو انسان کس طرح سے پابند کریں؟ کس طرح سے نماز، مطالعے اور قرآن کے اندر حاضر رکھیں۔ اس کیلئے قرآن نے ایک بہت ہی خوبصورت مطلب ذکر کیا ہے کہ اگر انسان اس کی طرف توجہ کریں تو یہ مشکل کام یعنی حضورِ دل بہت آسان کام ہو جاتا ہے یعنی یہ وحشی اگر رام ہو جائے، اگر مانوس ہو جائے تو حضورِ قلب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ عموماً وحشی پرندوں کو پکڑ کر انہیں مانوس کیا جاتا ہے، کچھ عرصہ ان کے پر کاٹ دیئے جاتے ہیں اور پر کاٹنے کے بعد پھر ان کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آیا جاتا ہے اور جب وہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ مہربان اور ہمدرد آدمی ہے تو پھر اس

کے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں، الفت کی وجہ سے اس کے ساتھ انس پیدا ہوتا ہے، جہاں انس ہو وہاں پر دل حاضر ہوتا ہے اور جہاں پہ انس والفت نہ ہو تو وہاں ممکن نہیں ہے کہ کسی چیز کو حاضر کر سکیں۔

٦)حضورِ قلب زبردستی پیدا نہیں ہوسکتا

دل کو زور و زبردستی سے حاضر نہیں رکھا جا سکتا ہے، ممکن ہے کہ کسی انسان کی جسمانی موجودیت کو تحمیلاً، زور و فشار اور دباؤ کے ذریعے سے کسی جگہ باندھ کے، جکڑ کے حاضر رکھا جائے جیسے عدالتوں میں لوگوں کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ کر حاضر کیا جاتا ہے، عدالتوں میں جسمانی طور پر فزیکلی (Physically) حضور ممکن ہے یا مسجدوں کے اندر انسان جسمانی طور پر پہنچ جاتا ہے، حضورِ دل نہیں بھی مانتا ہے لیکن جسمانی طور پر انسان مسجد میں پہنچ جاتا ہے، کعبہ میں پہنچ جاتا ہے یا درس کے اندر جسمانی طور پر حاضر و موجود ہوتا ہے، انسان کا جسم دباؤ پذیر ہے، دباؤ اور زور کے تحت اس کو کسی بھی جگہ حاضر کرنا چاہیں تو حاضر ہو جاتا ہے لیکن ذہن اور دل کیلئے ممکن نہیں ہے کہ اسے دباؤ، فشار اور زور ازوری کے ساتھ کسی جگہ پر حاضر کیا جائے، ان پر کسی کا زور نہیں چلتا ہے۔

آپ کسی کو جتنی بھی سزائیں دیں کہ وہ ذہنی طور پر حاضر ہو جائے تو بھی ذہنی حضور نہیں ہوگا، جسمانی طور پر وہ حاضر ہو جائے گا چونکہ خود اس کے اپنے بس میں نہیں ہے کہ یہ ذہنی طور پر حاضر ہو، ذہن وقلب بھی انسان کے اپنے ارادے کے تابع نہیں ہے۔ بسا اوقات ہوتا ہے کہ امتحان کی راتوں میں وہ لوگ جو سال بھر نہیں پڑھتے اور شبِ امتحان پڑھتے ہیں تو پھر پوری کوشش کرتے ہیں کہ ذہن

حضورِ قلب زبردستی پیدا نہیں ہوسکتا

حاضر ہواور ہم حاضر دماغی کے ساتھ پڑھیں لیکن وہ جتنی کوشش کرتے ہیں کہ دماغ حاضر رہے تو بھی ذہن حاضر نہیں ہوتا ہے چونکہ اس کو غیر حاضری کی عادت ہو چکی ہے اور اصلاً کتاب کے سامنے حاضر ہونا نہیں چاہتا ہے، یہ اس پر دباؤ ڈالتا ہے لیکن پھر بھی ذہن حاضر نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ زور کا کام نہیں ہے، اگر ذہن ودل کو حاضر رکھنا ہے تو اس کے لئے اسبابِ حضور مہیا کریں۔ ایسی چیز کہ جس پر زور نہیں چلتا، جو ہمارے اختیار میں نہیں ہے اور ہماری قدرت سے باہر ہے لیکن ہم نے اس کو حاضر بھی رکھنا ہے تو اس پر دباؤ نہ ڈالیں بلکہ اس کے لئے اسبابِ حضور فراہم کریں، جہاں پر اس کے اسبابِ حضور ہوں گے وہ شے وہیں پر موجود ہوگی، انسان کا دل، ذہن اور فکر ان چیزوں میں سے ہیں کہ ان کیلئے اسبابِ حضور مہیا کریں تو یہ وہیں حاضر ہو جائیں گی۔

۷) انس کیلئے مسانخت کی ضرورت

اسبابِ حضور میں دو چیزیں اہم ہیں، ایک یہ کہ دل وہاں حاضر ہوتا ہے کہ جہاں انس ہو، جس نقطے سے یہ دل مانوس ہو، جس جگہ سے، جس شخصیت سے، جس محل سے، جس مکان سے، جس شے سے بھی مانوس ہو تو یہ وہاں حاضر ہے لیکن جہاں سے بیزار ہو وہاں حاضر نہیں ہو سکتا ہے، ہم اس کیلئے ہزار جتن کریں لیکن دل حاضر نہیں ہوگا، پس انس کا سبب فراہم کریں اور قرآن، عبادت ومطالعہ کے ساتھ انس پیدا کریں، انس کس طرح سے حاصل ہو؟ انس بھی دباؤ والی چیز نہیں ہے کہ اس کو سزا دیں کہ آپ کسی کے ساتھ انس پیدا کرو، نا، انس غیر اختیاری چیز ہے، جب اس کے اسباب مہیا

انس کیلئے مسانخت کی ضرورت

ہوں گے تو ان اسباب کے تحت انس پیدا ہو جائے گا اور انس پیدا کرنے کے لئے مسانخت و مناسبت کی ضرورت ہے یعنی دل کو ان چیزوں سے انس حاصل ہوتا ہے کہ جو دل سے مناسبت رکھتی ہوں، اگر دل آلودہ ہے تو وہ آلودہ چیزوں کہ جن سے دل کی مناسبت ہے ان سے مانوس ہو جاتا ہے، اگر دل پاک ہے تو اس کو پاک چیزوں کے ساتھ انس ہوگا،

اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ ......(۱۵)

انس کیلئے مسانخت کی ضرورت

یعنی پاک دل پاک چیزوں سے مانوس ہیں اور خبیث دل خبیث چیزوں کے ساتھ مانوس ہیں اور جتنے بھی انسان مانوس ہیں اور جن جن چیزوں سے مانوس ہیں تو وہ مناسبت کی وجہ سے مانوس ہیں، کسی کو کھیلنے سے انس ہے، کسی کو کھانے سے انس ہے، کسی کو ہنسنے سے انس ہے، کسی کو پڑھنے سے انس ہے، یہ انس خود ہی خود حاصل نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کے اسباب اور پسِ منظر ہیں، ان اسباب نے ان دلوں کو مانوس کیا ہے، پس مناسبت پہلے پیدا ہو، بعض اوقات کسی شے کے ساتھ ہماری مناسبت ہوتی ہے اور بعض اوقات مناسبت ایجاد کرنی پڑتی ہے، اگر کسی پاک چیز کے ساتھ انس پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دل آلودہ ہے تو پہلے طہارتِ قلب کی ضرورت ہے، دل کو پاک کریں تا کہ پاک چیزوں سے مانوس ہو جائیں، دل جب پاک ہوگا تو پاک چیزوں سے خود ہی انس پیدا ہو جائے گا لیکن دل ناپاک ہوا تو ظاہر ہے کہ یہ ناپاکیوں سے مانوس ہوگا۔

مسانخت یعنی کوئی ایسی چیز جو مناسبت رکھتی ہو، کوئی ایسی چیز جو اس کے اور ہمارے اندر

مشترک ہو، وہ چیز میرے اندر بھی ہو اور وہ اس کے اندر بھی ہو، جب تک یہ رگ نہ ملتی ہو تو انس پیدا نہیں ہوتا ہے، جسمانی طور پر بھی ہم وہاں موجود ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے سامنے موجود ہوتے ہیں کہ جن کے ساتھ ہمارا انس ہے مثلاً اگر مسلمان ہے تو وہ مسجد میں موجود ہوتا ہے، اگر ایک ہندو ہو تو وہ مندر میں موجود ہوتا ہے، اگر مسیحی ہو تو کلیسا کے اندر موجود ہوتا ہے چونکہ انہی عبادت گاہوں کے ساتھ ان کا انس ہے، جہاں انس نہ ہو وہاں انسان نہیں جاتا ہے حتیٰ اگر کوئی ممانعت نہ بھی ہو، دروازے کھلے ہوئے ہوں لیکن انسان چونکہ یہاں مانوس نہیں ہے اس وجہ سے غیر مانوس مقام پر انسان کا بیٹھنا بھی نہیں ہے۔ ایسی مجالس جہاں پر انسان کا کوئی انیس نہ ہو، انسان کے ساتھ کوئی دوسرا انسان مانوس نہ ہو تو اجنبیت وحشت محسوس کرتا ہے ایسی مجلس و محفل میں انسان بیٹھنا بھی ترک کر دیتا ہے یا ایسے مکان اور مقام کو ترک کر دیتا ہے کہ جہاں انسان کے ساتھ کوئی انس رکھنے والا آدمی موجود نہ ہو۔ پس یہ انس ہے کہ جو انسان کو قریب کرتا ہے اور الفت کا باعث بنتا ہے اس کیلئے مسانخت اشد ضروری ہے، انسان کو ہر چیز کے ساتھ انس اور الفت و قربت نہیں ہوتی ہے کہ جب تک کسی چیز کے ساتھ مسانخت نہ ہو، مسانخت یعنی کوئی ایسی مشترک صفت جو انسان میں اور اس شے کے اندر موجود ہو کہ جو دونوں کو ملائے، اس مسانخت اور سنخیت کی وجہ سے ان میں انس پیدا ہوتا ہے یعنی ان دونوں کے درمیان باعث انس وہی مشترک چیز بنتی ہے۔

اگر دو دوست ایک دوسرے مانوس ہیں تو لامحالہ انکے اندر کوئی ایسی مشترک صفت ضرور موجود ہے کہ جس نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مانوس کیا ہوا ہے، اگر کسی شہر، محلے یا علاقے کے

ساتھ ہمارا انس ہے تو یقیناً ہمارا اس مقام کے ساتھ کوئی اشتراک ہے کہ جس نے ہمیں اس جگہ کے ساتھ مانوس کیا ہوا ہے، اسی طرح جب تک انسان کا قرآن و عبادت کے ساتھ انس پیدا نہ ہو تب تک حضور ممکن نہیں ہے اور انس کے لئے مسانخت شرط ہے یعنی انسان اور قرآن کے درمیان کوئی نہ کوئی صفت مشترک ہو، جو نکتہ قرآن میں ہو وہی چیز انسان کے اندر ہو، جو سبب اور جو شے عبادت کے اندر ہو وہی انسان کے اندر بھی ہو، اس وقت انسان اس چیز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ عموماً اگر ہم انسانوں کے روابط کو دیکھیں تو آپس میں طبعی طور پر انس کی وجہ سے قربتیں ہیں، انسانوں کے گروہ بنے ہوئے ہیں، ٹولیاں بنی ہوئی ہیں، آپس میں جو تعلقات ہیں یہ سب انس کی وجہ سے ہیں، اہل بَطالت، اہل بَطالت کے ساتھ مانوس ہیں، اہل عبادت، اہل عبادت کے ساتھ مانوس ہیں، اہل فکر، اہل فکر کے ساتھ مانوس ہیں اور اہلِ لہو، اہل لہو کے ساتھ مانوس ہیں، جس طرح کا انسان ہے اسی طرح کی اس کی محفلِ انس بھی ہے۔

انس کیلئے مسانخت کی ضرورت

وحشی چیزیں کہ جن کو ہمارے ساتھ الفت نہیں ہے تو یہ الفت کیسے پیدا کریں؟ انس کیسے پیدا کریں؟ یعنی ہم اس وحشی کو کیسے مانوس کریں؟ اس کیلئے مسانخت شرط ہے۔ بعض اوقات مانوس کرنے اور الفت کے لئے سزا دی جاتی ہے مثلاً پہلی کلاس کے بچے کہ جو گھر کے ماحول اور ماں کی آغوش سے آشنا ہوتے ہیں خصوصاً جو لاڈلے ہوتے ہیں، جنہیں فارسی زبان کی اصطلاح میں لوس کہا جاتا ہے، لوس بچے یعنی لاڈلے بچے، بے ادب، گستاخ اور غیر تربیت یافتہ بچے، ایسا بچہ جب اسکول میں جاتا ہے اور اسکول سے مانوس نہیں ہوتا ہے تو یہ ٹکتا نہیں ہے، اگر اسے اسکول میں چھوڑیں تو یہ

ماں کے پیچھے بھاگتا ہے، استاد ماں سے کہتا ہے کہ آپ چھوڑ کر چلی جائیں میں اس کو قابو کر لیتا ہوں اور جوں ہی ماں باہر نکلتی ہے تو یہ بچے کے سامنے ڈنڈا لے کر آجاتا ہے کہ چپ کر کے یہاں ٹک کر بیٹھ جاؤ ورنہ سزا دوں گا، وہ بے چارہ خوف سے بیٹھ جاتا ہے اور استاد یہ سمجھتا ہے کہ یہ مدرسے کے ساتھ مانوس ہو گیا ہے، ڈنڈے کے ساتھ کبھی کوئی مانوس نہیں ہوتا ہے، ڈنڈے سے، مار پیٹ سے الفت پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ وحشی، وحشی تر ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ایک جنگلی پرندے کو لے کر آئیں اور اسے روز ماریں تو وہ مزید وحشی تر ہو جائے گا حتیٰ پالتو کو روز ماریں تو وہ بھی وحشی ہو جائے گا چہ جا ئیکہ آپ جنگلی کو سزا دیں، انس کے لئے مسانخت شرط ہے جیسے کہتے ہیں کہ

الجنس یمیل الجنس،

یا

کبوتر با کبوتر باز با باز

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

آپ نے کبھی کبوتر کو باز کے ساتھ اڑتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا اور باز کو کبوتروں کے ساتھ اڑتے ہوئے بھی نہیں دیکھا ہے بلکہ باز کبوتر کا شکار کرتا ہے اور ان کے اندر دوستی نہیں ہوتی ہے، دوستی کیوں نہیں ہوتی ہے؟ چونکہ مسانخت نہیں ہے، مناسبت نہیں ہے۔

مولانا روم کی داستانیں ان مطالب کو آسان کر کے پیش کرنے کیلئے بہت ہی خوبصورت داستانیں ہیں، بعض فرضی ہیں یعنی اصلاً رونما نہیں ہوئی ہیں بلکہ فرض کی گئی ہیں، داستان ہوتی ہی

انس کیلئے مسانخت کی ضرورت

پیمانہ ہے، اس پیمانے کے ساتھ مطلب کو بہت آسانی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے، یہ ایک ہنر وفن ہے، مولانا روم نے اس مطلب کی وضاحت کیلئے ایک واقعہ نقل کیا ہے، انہوں نے کہا کہ کوا اور بگلا دونوں آپس میں دوست ہو گئے اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے، فرض بھی دیکھئے کوا اور بگلا کہ ہر لحاظ سے ان کی آپس میں کوئی رگ نہیں ملتی ہے، رنگ کے لحاظ سے دیکھیں تو کوا سیاہ رنگ کا ہے، بگلا سفید رنگ کا ہے اور عادتوں کے لحاظ سے دیکھیں تو کوا خشکی کا جانور ہے، بگلا پانی کا جانور ہے خوراک کے لحاظ سے دیکھیں تو بگلا مچھلیاں کھاتا ہے اور کوا چیزیں چرا کر کھاتا ہے، کوا اور کام کرتا ہے، بگلا اور کام کرتا ہے اور اس طرح دونوں میں بہت فرق ہے، قد کاٹھ کا بھی فرق ہے، عادتوں کا بھی فرق ہے، سنخ ونوع بھی الگ الگ ہے، ظاہر وشکل وخدوخال بھی الگ الگ ہیں لیکن بگلا اور کوا دونوں آپس میں دوست تھے اور بڑی صمیمی دوستی تھی، سارے پرندوں میں اور سارے جانوروں میں بگلے اور کوے کی دوستی مشہور ومعروف ہو گئی تھی۔

انس کیلئے ساتھی کی ضرورت

جیسے ہوتا ہے کہ کبھی کوئی مولانا کسی ایسے چیٹر (Cheater) کے ساتھ دوست ہو جاتا ہے اور جب پوچھو کہ دوستی کیوں ہے؟ تو کہتے ہیں کہ میں اس کو ہدایت کرنے کے لئے اس کے قریب ہوا ہوں، نہیں بلکہ دونوں کی کوئی رگ آپس میں ملتی ضرور ہے، بالآخر دونوں کی کوئی عادت ملتی ہے اس وجہ سے یہ دونوں دوست بنے ہیں ورنہ کیا مناسبت ہے؟ یہ کوے اور بگلے میں آپس میں کیا مناسبت ہے؟ بہرکیف ایک حکیم دانا کو بتایا گیا کہ اس طرح ایک عجیب اتفاق ہمارے یہاں رونما ہوا ہے کہ بگلا کوے کا دوست ہے تو اس نے کہا کہ یہ دوستی دیکھنے کی ہے، مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ

دیکھیں کونسی رگ ان کی ملتی ہے؟ بہر کیف چند دن اس حکیم نے آ کر دونوں کو زیر نظر رکھا، زیر نظر رکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک چیز دونوں کے درمیان ملتی ہے، مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں لنگڑے ہیں، دونوں کی ایک ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے، اس لنگڑے پن میں دونوں میں اشتراک ہے اس وجہ سے دونوں دوست ہیں۔

کوئی رگ ملتی ہے جبھی سیاہ وسفید اور خوب وبد آپس میں ملتے ہیں، انس پیدا ہوتا ہے تو اور ایک دوسرے کے ساتھی بن جاتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ الفت اور میل ملاپ ہو جاتا ہے، کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ ان کے اندر مسانخت ومناسبت ہے، اب ممکن ہے کہ وہ ظاہری ہو یا کوئی پنہائی مناسبت ہو۔

سنخیت کے بغیر انس نا ممکن ہے

۸)سنخیت کے بغیر اُنس نا ممکن ہے

جب تک مسانخت وسنخیت نہ ہو تو انس والفت پیدا نہیں ہوتے ہیں، سنخیت سے مراد ایسی چیز ہے کہ جو دونوں کے درمیان مشترک ہو، جو دونوں میں پائی جاتی ہو۔ بظاہر دونوں میں فرق ہوگا، ایک عالم ہے اور ایک جاہل ہے، ایک نمازی ہے اور ایک بے نمازی ہے اور دونوں کی دوستی ہے تو ضرور ان کی کوئی نہ کوئی رگ آپس میں ملتی ہے، ان دونوں کے اندر کوئی اشتراک ہے، بظاہر یہ تمثیل کوے اور بگلے کی ہے لیکن یہ کوا بھی انسان ہے اور بگلا بھی انسان ہے، یہ دونوں تمثیل ہیں یعنی خوب و بد انسان، بعض انسان جو بظاہر بہت اچھے ہیں لیکن ان کے تعلقات غلط لوگوں سے ہیں اور بعض

بڑے غلط لوگ ہیں لیکن اچھے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں، ظاہر ان کا غلط ہے لیکن اچھے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں تو ضرور، کوئی نہ کوئی رگ ملتی ہے، ان کی کوئی نہ کوئی صفت مشترک ہے، یہ چیزیں انس پیدا کرتی ہیں۔

جب تک مسانخت نہ ہو تو انس والفت پیدا نہیں ہوتے اور جب تک انس والفت پیدا نہ ہوں تو اس وقت تک حضور نہیں ہوتا ہے، ہم کن لوگوں کے لئے حاضر ہوتے ہیں؟ کن کے سامنے حاضر ہوتے ہیں؟ جن سے مانوس ہیں، جن کے ساتھ مانوس نہیں ہیں، الفت نہیں ہے تو وہاں زیادہ تر حاضر و موجود بھی نہیں رہتے ہیں۔ قرآن کے ساتھ، عبادت کے ساتھ اور کتاب کے ساتھ جب تک انس نہ ہو تو انسان حاضر نہیں ہوتا ہے۔ جب تک انس نہ ہو تو انسان حضورِ ذہن کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا ہے، قرآن نہیں پڑھ سکتا ہے، عبادت نہیں کر سکتا ہے اور مطالعہ نہیں کر سکتا ہے۔ اگر میں چاہتا ہوں کہ ان کے لئے حاضر رہوں تو مجھے اپنے اندر کوئی ایسی چیز پیدا کرنی پڑے گی کہ جو ان کے اندر ہے، اسی طرح اچھے آدمی کو اپنے اندر کوئی بری صفت پیدا کرنی پڑے گی تا کہ غلط لوگوں سے مانوس ہو جائے، چوروں اور ٹھگوں سے مانوس ہو جائے یا پھر غلط آدمی کو کوئی ایسی صفت اپنے اندر پیدا کرنی پڑے گی تا کہ اچھے لوگوں سے مانوس ہو جائے۔

نماز کے لئے انس چاہئے، قرآن کے ساتھ انس چاہئے لیکن ابھی جو انس با قرآن کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں تو ان میں اُنس با قرآن کم ہوتا ہے اور انس با قاری زیادہ ہوتا ہے، وہاں قاری کے ساتھ انس ہوتا ہے نہ کہ قرآن کے ساتھ اس لئے کہ وہاں جھوم رہے ہوتے ہیں لیکن

گھر میں آکر ایسے نہیں ہوتے ہیں، اگر قرآن کے ساتھ انس ہوتا تو پھر قرآن فقط اس محفل میں تو نہیں ہے بلکہ قرآن تو چوبیس گھنٹے گھر میں ہے۔ اگر انسان قرآن کے ساتھ مانوس ہے تو قاری ہو یا نہ ہو انسان صبح وشام قرآن کے ساتھ مانوس رہے، قرآن کو قاریوں کے ساتھ مانوس ہونے کا ذریعہ قرار دے عموماً قاری کے ساتھ تو انسان کا انس بڑھ جاتا ہے لیکن قرآن کے ساتھ نہیں بڑھتا ہے۔

بہت سارے لوگ ایسے ہیں کہ جو قاریوں کو پسند کرتے ہیں لیکن خود قرآن پڑھنا نہیں آتا ہے کیونکہ یہ قرآن سے مانوس نہیں ہیں۔ یہ قرآن سے اجنبی ہیں لیکن کسی قاری سے مانوس ہیں، علم سے اجنبی ہیں لیکن عالم سے دوستی ہے، عبادت سے اجنبی ہیں لیکن عبادت گزار سے دوستی ہے، عموماً ایسا ہوتا ہے کہ مولانا کے دوست نماز نہیں پڑھتے ہیں، وقتِ نماز مسجد کے باہر کھڑے رہتے ہیں کہ جب مولانا نماز پڑھ کر باہر آتے ہیں تو پھر انہیں گاڑی میں بٹھا کر لے جاتے ہیں، معلوم ہوا کہ مولانا کے دوست ہیں لیکن نماز کے دوست نہیں ہیں، مسجد کے دوست نہیں ہیں، مجلس کے دوست نہیں ہیں، عزاداری کے دوست نہیں ہیں، ان کا انس کس چیز کے ساتھ ہے؟ کسی شخصیت کے ساتھ ہے، اگر فلاں نوحہ خوان آئے تو اس کے ساتھ مانوس ہیں لیکن نوحے کے ساتھ مانوس نہیں ہیں، نوحہ یعنی سوگ۔ سوگ کے ساتھ مانوس نہیں ہیں بلکہ شخص کے ساتھ مانوس ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ انس پیدا ہو جاتا ہے لیکن قرآن کی بارگاہ میں جاتے ہوئے کئی رکاوٹیں اور موانع سامنے آجاتے ہیں، جب تک ہم قرآن سے مانوس نہیں ہوتے اس وقت تک حضور ممکن نہیں ہے۔ غیر مانوس کبھی بھی ایک دوسرے کے لئے حاضر نہیں ہوتے ہیں۔

کیونکہ بغیر انس ناممکن ہے

ابن ملجم نے جب امیر المومنین علیہ السلام کے ہاتھ پر آ کر بیعت کی تو امیر المومنین علیہ السلام نے تعجب کیا، کہا کہ تو نے بیعت کی ہے؟ اس کو بہت برا لگا، اس نے توہین محسوس کی کہ میں نے سب کے سامنے بیعت کی اور انہوں نے لوگوں کے سامنے میری بیعت میں شک کیا ہے، پھر دوبارہ لوٹا اور لوگوں کو متوجہ کر کے کہا کہ دیکھئے میں بیعت کر رہا ہوں، جب دوبارہ بیعت کر کے ہٹا تو حضرت علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ تو نے بیعت کی ہے؟ پھر اس کو امیر المومنین علیہ السلام کی یہ بات مزید گراں گزری، ناگواری کے ساتھ اس نے تیسری دفعہ بیعت کی تو پھر امیر المومنین علیہ السلام نے یہی فرمایا، لوگوں نے پوچھا کہ آخر اس شخص کے بارے میں آپ خصوصیت کے ساتھ تعجب کر رہے ہیں درحالیکہ باقی کسی کے بارے میں آپ نے ایسے اظہار نہیں فرمایا! حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اس کی روح میری روح سے مانوس نہیں ہے اور میری روح اس کی روح سے مانوس نہیں ہے۔ بااینکہ امیر المومنین علیہ السلام اسے پہچانتے تھے اور وہ امیر المومنین علیہ السلام کو پہچانتا تھا لیکن روح ہی مانوس نہیں تھی، کوئی سنخیت آپس میں نہیں تھی لہذا ایسا نہیں ہے کہ ہر علیؑ علیؑ کرنے والے سے علی علیہ السلام کی روح بھی مانوس ہو، ابن ملجم لعین نے علیؑ علیؑ کیا اور بیعت بھی کی لیکن حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ میری روح اس سے مانوس نہیں ہے۔

بیعت کے بغیر انس نہیں ہے

روحِ انسان اپنے مولا علیہ السلام کے ساتھ مانوس ہو، اہلبیت علیہم السلام کے ساتھ مانوس ہو۔ اہلبیت علیہم السلام کے ساتھ انس پیدا کریں۔ انس کیسے پیدا ہوگا؟ جب مسانخت ہوگی، یعنی کوئی ایسی چیز جو ان میں بھی ہے اور ہم میں بھی آ گئی تو انس پیدا ہو جائے گا۔ قرآن کے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو اگر ہمارے اندر

بھی آجائے تو ہمارا اور قرآن کا ساتھ بن جائے گا، انس بن جائے، ہم رفیق اور ساتھی بن جائیں گے یعنی اس صورت میں نہ ہم قرآن کے بغیر رہ سکتے ہیں اور نہ قرآن ہمارے بغیر رہ سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حدیث ثقلین میں کہا ہے کہ اہلبیت علیہم السلام قرآن سے دور نہیں ہوں گے اور قرآن اہلبیت علیہم السلام سے دور نہیں ہوگا، یہ کیوں کہا ہے؟ اس لئے بیان فرمایا ہے کہ ان دونوں کے درمیان سنخیت ہے، ان دونوں کے درمیان مسانخت انس ہے لہٰذا اہلبیت علیہم السلام قرآن کے بغیر اور قرآن اہلبیت علیہم السلام کے بغیر نہیں ہوگا، جو صفت قرآن کی ہے وہ اہلبیتؑ کی بھی ہے اور جو اہلبیتؑ کی ہے وہ قرآن میں بھی ہے، اس سنخیت نے ان کو انیس بنا دیا ہے اور ایک دوسرے سے مانوس کر دیا ہے لہٰذا جو بھی قرآن کی طرف آئے یا اہلبیت علیہم السلام کی طرف آئے تو ان کے ساتھ سنخیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

نماز کے ساتھ جب ہمارا انس نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ دل حاضر نہیں رہے گا بلکہ فرار کرے گا اور کتنے ہی ایسے نمازی ہیں کہ جن کا نماز کے ساتھ انس نہیں ہے لیکن کیوں پڑھتے ہیں؟ چونکہ سزا ملتی ہے، ڈنڈے پڑتے ہیں، جیسے بچہ ڈنڈے کے زور پر مجبوراً ماسٹر کے قابو میں رہتا ہے، پہلے زمانے میں ٹیچر کو ماسٹر کہتے تھے اور دیہات والے تاکید کے ساتھ ماشٹر جی کہتے تھے چونکہ ماشٹر جی نے ڈنڈا رکھا ہوتا تھا اور ڈنڈے کے ذریعے سے بچے کو اسکول میں روک کر رکھا ہوا تھا لیکن بچے کی روح اسکول سے مانوس نہیں تھی۔ جہنم وہ ڈنڈا ہے کہ اس ڈنڈے نے ہمیں مسجد میں روک کر رکھا ہوا ہے، یہ ڈنڈا اگر آج اٹھا لیا جائے تو پھر کیسا سجدہ اور کونسی نماز؟ یہ جنت کی لالچ اگر ہم سے لے لی جائے تو کیسی نماز اور کیسا سجدہ؟

بغیر سنخیت کے انس ناممکن ہے

ایک لطیفہ ہے کہ مولانا نے کسی بے نمازی کو تبلیغ کی اور کہا کہ جا کر نماز پڑھو، اس نے شکوہ کیا کہ نماز آپ فارغ لوگوں کا کام ہے، آپ کو فرصت ہے، ہماری محرومیاں ہیں، فقر ہے، غربت ہے، پریشانیاں ہیں تو نماز کیسے پڑھیں؟ ہمارا ذہن آسودہ نہیں ہے، مولانا نے کہا کہ تم نماز پڑھو میں تمہیں کٹّا دوں گا، کٹّا پنجابی میں بھینس کے نابالغ بچے کو کہتے ہیں، اس کو اچھی تجویز نظر آئی، اس نے کہا کہ کتنے دن پڑھوں تو دوگے؟ انہوں نے کہا کہ چالیس دن تک اگر پیہم نمازیں پڑھو تو میں چالیسویں دن تمہیں انعام دوں گا، ثواب کی خاطر جو نماز پڑھتے ہیں، کہا کہ میں تمہیں یہ ثواب دوں گا، اس کو بھی یقین تھا کہ مولانا وعدہ خلافی نہیں کرتے ہیں، اس نے پڑھنا شروع کر دیں، چالیسویں دن مولانا کے پاس گیا اور جا کر دروازہ کھٹکھٹایا آخری نماز بھی شاید عشاء کی تھی، وہ پڑھ کر رات کو مولانا کے پاس گیا تو پوچھا کیوں آئے ہو؟ کہا کہ کٹا لینے آیا ہوں، کونسا کٹا؟ مولانا بھول گئے تھے کہ اس قسم کی کوئی بات انہوں نے کی تھی، بہر کیف اس نے یاد دلایا کہ آپ نے مجھے کہا تھا کہ چالیس دن تک نمازیں پڑھو تو اس کے بعد میں تمہیں کٹا دوں گا، میری چالیس دن کی نمازیں پوری ہوگئی ہیں، انہیں یاد آگیا اور کہا کہ وہ تو میں نے صرف اس لئے کہا تھا کہ چالیس دن پڑھو گے تو تمہیں عادت ہو جائے گی چونکہ چالیس دن آدمی جو کام کرتا ہے اس کو عادت پڑ جاتی ہے اور پھر اس کے بعد خود پڑھتے رہو گے لہٰذا میرے پاس نہ بھینس ہے نہ کٹا ہے، کچھ بھی نہیں ہے، اس نے کہا کٹا نہیں ہے؟ انہوں نے کہا نہیں ہے، کہا کہ کٹا نہیں ہے تو سن لو کہ ہم نے بھی ساری بغیر وضو کے پڑھی ہیں۔

نماز کے ساتھ انس پیدا کریں

نماز کے ساتھ انس پیدا کریں، اگر تبلیغِ نماز بھی کرتے ہیں تو کٹے کا وعدہ نہ کریں، بچے اور

خصوصاً جوان نماز کے ساتھ انس پیدا کریں اور اتفاقاً نماز اور بچوں میں آپس میں بڑی مسانخت ہے، بچے پاک ہیں، ان کی فطرت پاک ہے لہٰذا جلدی آجاتے ہیں اور انس پیدا ہو جاتا ہے، انس کی زبان سیکھیں، انبیاء علیہم السلام تبلیغ کرتے تھے تو اسی طریقے سے کرتے تھے، معارفِ دینی کے ساتھ انس بڑھاتے تھے، کتابِ خدا کے ساتھ لوگوں کا انس بڑھاتے تھے، ڈنڈا لے کر یا کتا لے کر کسی کو نمازی نہیں بناتے تھے، قرآن کے ساتھ بھی انس پیدا کریں، ابھی اگر آپ یہ کہیں کہ قرآن حفظ کریں تو پھر اقامہ ملے گا تو لوگ فوراً قرآن حفظ کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس سے تو قرآن کے ساتھ انس نہیں بڑھتا ہے، یہاں تو قرآن اقامہ لینے کے لئے ایک خط ہو گیا ہے اور آخری دن قرآن کا وہی ہوتا ہے کہ جس دن اقامہ ملتا ہے پھر اس کے بعد صرف دو تین سورتیں یاد آتی ہے کہ جو نماز میں پڑھتے ہیں۔

۹)قرآن و عبادت کے ساتھ مسانخت

آپ قرآن کے ساتھ انس والفت پیدا کریں، مہم انس ہے، الفت اور انس کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے؟ سنخیت و مسانخت کی، مسانخت کس چیز کا نام تھا؟ یعنی مشترک صفات، وہ صفت جو قرآن کی ہے، وہ صفت جو نماز کی ہے وہ ہمارے اندر بھی پیدا ہو جائے، پھر ہمارا نماز کے ساتھ انس پیدا ہو جائے گا، قرآن کے ساتھ مسانخت یہ ہے کہ قرآن نور ہے، قرآن نے خود اپنا تعارف نور کے طور پر کروایا ہے، خداوند نے فرمایا کہ ہم نے نور نازل کیا ہے۔ چند آیات درج ذیل ہیں،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَائَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا٥(١٦)

اے انسانو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان آچکا ہے اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور بھی نازل کردیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍO (۱۷)

اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) کی وحی کی ہے، آپ کو نہیں معلوم تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کن چیزوں کا نام ہے لیکن ہم نے اسے ایک نور قرار دیا ہے جس کے ذریعے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اسے ہدایت دے دیتے ہیں اور بیشک آپ لوگوں کو سیدھے راستے کی ہدایت کررہے ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَائَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَائَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَّكِتَابٌ مُّبِينٌO (۱۸)

اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے جو ان میں سے بہت سی باتوں کی وضاحت کررہا ہے جن کو تم کتابِ خدا میں سے چھپارہے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کرتا ہے، تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔

حتیٰ تورات اور انجیل کو بھی اللہ نے نور کہا ہے،

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَّنُورٌ۔۔۔۔(۱۹)

ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت اور نور تھا......

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْکِتَابَ الَّذِیْ جَاءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّهُدًی لِّلنَّاسِ ...(۲۰)

ان سے پوچھیں: پھر وہ کتاب جو موسیٰؑ لے کر آئے تھے کس نے نازل کی جو لوگوں کیلئے نور اور ہدایت تھی......

امام زین العابدین علیہ السلام نے بھی صحیفۂ کاملہ کی دعاءِ ختم القرآن میں یہی تعلیم دی ہے کہ قرآن نور ہے،

اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ أَعَنْتَنِی عَلٰی خَتْمِ کِتَابِکَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَهٗ نُوْراً......

بارالٰہا! تو نے اپنی کتاب کے ختم کرنے پر میری مدد فرمائی، وہ کتاب جسے تو نے نور بنا کر اتارا......

پس قرآن و انسان اور عبادت و انسان میں اس انس کا نقطۂ اشترک نورانیت ہے، قرآن نور ہے لہٰذا انسان کا دل بھی جب نورانی ہو جائے تو ان دونوں میں انس پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اگر دلِ انسان سیاہ ہو، تیرہ و تاریک ہو تو نور کے ساتھ انس نہیں ہوتا ہے، ظلمانی انسان یعنی جس کا دل ظلمانی، تاریک اور سیاہ ہو تو وہ کبھی بھی قرآن سے مانوس نہیں ہوتا ہے، وہ محافلِ لہو لعب و اہلِ بطالت کے ساتھ مانوس ہوتا ہے، یہ نور اس وقت دلوں کے ساتھ مانوس ہو گا کہ جب دل بھی نورانی ہو، پس صفتِ مشترک کہ جس سے قرآن اور انسان میں آپس میں انس بڑھ جاتا ہے وہ نورانیت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے تمہاری دنیا سے چند چیزیں پسند ہیں، خوشبو پسند ہے

اور کہا کہ

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ......(۲۱)

اللہ تعالیٰ نے نماز میں میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دی ہے......

رسول اللہ ﷺ کو نماز سے کس قدر عشق ہے کہ اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دے رہے ہیں، حقیقت میں نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، آنکھوں کی ٹھنڈک محاورہ و کنایہ ہے، یعنی جس چیز سے سرور ملتا ہے، خوشی حاصل ہوتی ہے اور جب بے انتہا خوشی ہو تو اس خوشی کے نتیجے میں انسان کے آنسو نکل آتے ہیں، معمول سے زیادہ خوشی اور سرور ہو تو انسان کی آنکھ میں خوشی کے آنسو آجاتے ہیں، جیسا کہ اگر غم حد سے زیادہ بڑھ جائے تو بھی انسان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ویسے تو چھوٹے چھوٹے غم صبح و شام رہتے ہیں کہ آج روٹی کم ملی، آج چھٹی نہیں ملی، یہ چھوٹے غم ہیں ان پر آنسو نہیں نکلتا ہے لیکن اگر غم حد سے بڑھ جائے مثلاً اگر پتہ چلے کہ کوئی عزیز فوت ہو گیا ہے، عزیز بھی ایسا نہ ہو کہ فقط دعائیں کر رہے ہوں اور جس سے فقط جان چھوٹے، نا، جس سے واقعاً محبت ہو، الفت ہو اگر ایسا عزیز چلا جائے تو انسان پر غم آجاتا ہے، غم جب مُستولی ہو جاتا ہے، مسلط ہو جاتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں، جب گال پر آنسو ٹپکتا ہے تو با قاعدہ محسوس ہوتا ہے کہ غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں، کبھی محسوس کیا ہے یا نہیں کیا؟ تجربہ کریں، جب روئیں تو با قاعدہ احساس کریں اور اس کا ٹمپریچر دیکھیں کہ آیا گرم ہے یا نہیں ہے، غم کے آنسوؤں کی تپش با قاعدہ محسوس ہوتی ہے کہ جیسے گرم پانی کا قطرہ ٹپک پڑا ہو، عموماً اگر کسی مریض کے اوپر رو رہے ہیں

قرآن و عبادت کے ساتھ مسافت

اور آپ کے آنسو اس مریض پر ٹپکیں تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ آنسو گرم ہیں یعنی آپ غم سے رو رہے ہیں لیکن اللہ کا نظام دیکھیں کہ وہی ایک چشمہ ہے لیکن جب خوشی ہوتی ہے اور خوشی و سرور کی وجہ سے انسان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتا ہے تو وہ بہت ٹھنڈا ہوتا ہے، اس وجہ سے آنکھوں کی ٹھنڈک خوشی اور سرور سے کنایہ ہے، نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یعنی نماز مجھے سرور پہنچاتی ہے، نماز سے مجھے لطف آتا ہے اور نماز سے میں لذت حاصل کرتا ہوں۔

قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ......

اولاد کے لئے بھی یہ کلمہ کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، قرۃ العین یعنی ذریت یا اولاد، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں بھی ہے کہ ہماری ذریت کو ہمارے لئے قرۃ العین قرار دے یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دے یعنی ایسی اولاد کہ جس کو دیکھ کر انسان کو سرور اور خوشی محسوس ہو نہ کہ جس اولاد کو دیکھ کر غم کے آنسو نکل آئیں، اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اگر نیک اور صالح اولاد ہو تو سرور اور خوشی کو قرۃ العین کہتے ہیں۔

کسی چیز کے ساتھ جب انس والفت بڑھتی ہے تو انسان اس سے سرور و لذت محسوس کرتا ہے، قرآن میں یا نماز میں کونسی صفت ہے کہ جو ہمارے اندر بھی ہونی چاہئے تا کہ ہمیں نماز میں لذت محسوس ہو، قرآن میں لذت محسوس ہو؟ وہ حضور ہے، اس وقت انسان نماز اور قرآن کے لئے اسے طرح بے تاب ہوتا ہے کہ جس طرح کسی مانوس چیز سے دور ہو کر اس سے ملنے کیلئے بے تاب ہوتا ہے۔ آلودہ اور لہوی دل کے لئے قرآن اور نماز بوجھ ہیں۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ٥ (٢٢)

نماز بہت مشکل کام ہے مگران لوگوں کے لئے نہیں جو خشوع وخضوع والے ہیں۔

نماز بعض لوگوں کے اوپر بوجھ ہے، نماز کا وقت آئے یا نماز کا نام آئے تو ان پر وحشت طاری ہوجاتی ہے اور رمضان آئے تو پھر تو حالت دیکھنے کی ہوتی ہے، عموماً ماہِ رمضان میں مائیں بچوں کو بتاتی ہیں کہ آج بزرگوں سے بچو کہ ان کا روزہ ہے یعنی روزے کی حالت میں وہ بہت وحشی ہوجاتے ہیں، بہت خطرناک ہوجاتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ بوجھ ہے، روزہ اس انسان کے اوپر بڑا بوجھ ہے۔ امام سید الساجدین علیہ السلام رمضان کا استقبال اس طرح سے کرتے تھے کہ جس طرح سے دلہن کا استقبال کیا جاتا ہے اور رمضان کے جانے پر اس طرح سے روتے تھے کہ جس طرح جنازہ گھر سے نکل رہا ہوتا ہے، کیوں؟ کیونکہ روحِ امام علیہ السلام روزے کے ساتھ مانوس تھی، امام علیہ السلام میں اور روزے میں اُنس تھا، امام علیہ السلام میں اور عبادت میں اُنس تھا۔

سید الشہداء علیہ السلام نے شبِ عاشور کی جو مہلت لی تو حضرت ابوالفضل علیہ السلام کو یہ فرمایا کہ انہیں جا کر کہو کہ آج شب ہمیں مہلت دیں، اس شب میں ہم کیا کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا کہ عبادتِ خدا کرنا چاہتے ہیں، چونکہ ہم اہلبیت علیہم السلام عبادت کے ساتھ مانوس ہیں، ہمیں عبادت کے ساتھ خاص لگاؤ ہے، ہمیں بارگاہِ خدا میں جانے سے اُنس ہے، اہلبیت علیہم السلام کا فرد فرد اس طرح سے تھا، یہ اُنس کیسے پیدا ہوا؟ چونکہ جو خصلت اور جو صفت عبادت کے اندر تھی وہی ان کے اندر بھی موجود تھی اس لئے ان کو اُنس تھا، نورانیت صفتِ مشترک تھی اور نور نور کی طرف جاتا ہے۔ کبوتر کبوتر کے ساتھ اور باز باز کے

ساتھ جاتا ہے، ہم جنس ہم جنس کے ساتھ پرواز کرتا ہے، جہاں بھی دو دوستیاں ہیں وہاں پر ان کے اندر کوئی نہ کوئی انس و مسانخت موجود ہے، پس پہلے ہم قرآن کے ساتھ اپنا انس بڑھائیں، قرآن کے ساتھ اپنی دوستی بڑھائیں، لیکن کس طرح؟ وہ پہلا ادب جو گزرا تھا اور تطہیرِ قلب سے، طہارتِ قلب سے قرآن کے ساتھ انس بڑھتا ہے چونکہ جب دل پاک ہو جائے تو قرآن بھی پاک ہے، دل نورانی ہو جائے تو قرآن بھی نورانی ہے، نور نور کے ساتھ مسانخت رکھتا ہے اور پاک چیز پاک چیز کے ساتھ مانوس ہے۔ اہلبیت علیہم السلام قرآن کے ساتھ مانوس ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، قرآن اور عبادتِ خدا اہلبیت علیہم السلام کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے چونکہ مسانخت ہے اور آپس میں انس ہے۔

گریہ، انس کی علامت

۱۰) گریہ، انس کی علامت

امام رضا علیہ السلام کو جب مدینہ سے خراسان لایا گیا تو راستے بھر میں امام علیہ السلام مسلسل بغیر وقفے کے قرآن پڑھتے رہے اور اس طرح سے قرآن پڑھتے رہے کہ امام علیہ السلام کے آنسو خشک نہیں ہوئے، چونکہ قرآن انسان پر اثر کرتا ہے، انسان کی روح کے اوپر اثر کرتا ہے، بعض مسیحیوں کے بارے میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن پڑھتے تھے اور یہ مسیحی آ کر قرآن سنتے تھے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں، ایک اثر یہ ہے یعنی علامت ہے کہ آیا قرآن کے ساتھ انس ہے یا نہیں ہے؟ تو یہ دیکھیں ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے انسان گریہ کرتا ہے یا نہیں، ابھی تو زبردستی گریہ کروایا جاتا ہے، جب تک مصائبِ کربلا نہ پڑھیں تو ہم روتے نہیں ہیں، دعا کے بیچ میں بھی وقفہ کر کے

مصائب پڑھے جاتے ہیں تا کہ روئیں نا کہ دعا سے روئیں۔ خدا کی بارگاہ میں روئیں وہ ایک گریہ ہے، کربل کے لیے اور مقدس گریہ ہے اور بہت ہی عظیم ہے، اس کے برابر کوئی گریہ نہیں ہے لیکن عبادتوں کے اندر گریہ عبادت کی وجہ سے ہو نہ یہ کہ وہاں عبادت روک کر پھر بیچ میں جیسے شہید مطہریؒ نے نقل کیا ہے کہ بعض حتیٰ مصائب میں بھی نہیں روتے ہیں اور ان کے لئے مصائب روک کر پھر اور کام کرتے ہیں تا کہ روئیں، بعض اوقات دعا روک کر مصائب پڑھتے ہیں تا کہ روئیں لیکن بعض ایسے سخت ہو جاتے ہیں کہ مصائب پر بھی نہیں روتے ہیں، ایک ذاکر نے مصائب کو روک کر لوگوں کو پتھر مارنا شروع کیا، پوچھا گیا کہ کیوں؟ تو کہا کہ رلانے کے لئے تا کہ یہ روئیں، ہر قیمت پر تو نہیں رلانا ہے کہ صرف مصائب پر روئیں، آپ سوگِ اہلبیت علیہم السلام بیان کریں اور یہ روئیں، آپ دعا پڑھیں اور یہ روئیں، آپ قرآن پڑھیں اور یہ روئیں لیکن پہلے مسانخت ہو اور قرآن کے ساتھ انس ہو۔

۱۱) اُنس، حضورِ قلب کی طرف پہلا قدم

پس حضورِ قلب کیلئے پہلا قدم انس بڑھانا ہے اور یہ تطہیر کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے، اگر دل نورانی ہو جائے تو حضورِ قلب کی طرف ایک قدم بڑھ گیا لیکن ایک قدم ابھی رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ یہ دل قرآن اور نماز سے مانوس ہو جائے، اگرچہ دلِ وحشی ہے لیکن یہ وحشی کسی اور نے رام کر لیا ہے، یہ دل کسی اور کا رام شدہ ہے، اگر انسان اس کو خدا کے لئے، عبادت کے لئے اور قرآن کے لئے رام کرتا تو یہ وحشی آج قرآن کے ساتھ مانوس ہوتا لیکن اس سے

پہلے کہ ہمیں خبر ہوتی کہ ہم اس کو قرآن کے ساتھ اور عبادت کے ساتھ مانوس کریں یہ پہلے ہی کسی اور سے مانوس ہو چکا ہے، یہ کسی اور کا ہم نشین ہو چکا ہے، کوئی اور اس کے اندر آ چکا ہے، دل کو اس نے اپنا نشیمن بنا لیا ہے، جب تک وہ نہیں نکلے گا اور اس سے نجات نہیں ملتی تو انس با قرآن پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس حضور کے لئے پہلا قدم یا پہلا رکن انس ہے، انس کیسے پیدا ہوگا؟ مسانخت سے، مسانخت طہارت سے حاصل ہوتی ہے اور قرآن کے ساتھ انس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر قرآن کی صفت پیدا کرے اور وہ نورانیت ہے اور نورانیت اس ادب سے حاصل ہوتی ہے کہ جسے تطہیرِ قلب کہا گیا ہے کہ جو فصلِ ادبِ دوم میں پڑھ آئے ہیں لیکن حضور کا دوسرا رکن ہنوز رہتا ہے کہ جو اس فصل کے حصہ دوم میں درج کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)......(کلیات سعدی، بر اساس نسخہ محمد علی فروغی، صفحہ ۴۳۴)

(۲)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۸)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۰۱)

(۴)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۵۰)

(۵)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۲۶)

(۶)......(سورۂ مبارکہ ابراہیمؑ، آیہ ۴۱)

(۷)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۱۹۳)

(۸)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۶۸، ۶۹، ۷۰)(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۳۴)

(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ ۴۹)

(۹)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۳۴)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۵۸)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۵۱)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ ھود، آیہ ۶۱)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ ۹۸)

(۱۴)......(منہاج البراعة - الراوندی)(نہج البلاغہ موضوعی)

(ھدایة العلم فی تنظیم غرر الحکم للامام علیؑ بن أبی طالبؑ)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ نور، آیہ ۲۶)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۱۷۴)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ شوریٰ، آیہ ۵۲)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۱۵)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۴۴)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۹۱)

(۲۱)..... (التفسير الأصفى - الفيض الكاشانیؒ، الجزء ۱، صفحه ۴۵) (تسنيم تفسير قرآن كريم - آية الله جوادى آملى مدظله) (التفسير الصافى - الفيض الكاشانیؒ، الجزء ۱، صفحه ۱۳۴) (شرح أصول الكافى - مولى محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء ۱۲، صفحه ۴۰۳) (بحار الأنوار - علامه مجلسیؒ، الجزء ۷۹، صفحه ۱۹۳) (مجموعة ورام - ورام بن ابى فراس، الجزء ۱، صفحه ۷۹)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۴۵)

فصلِ ادبِ سوُمْ

﴿حضورِ قلب﴾

(حصّہ دوم)

١)تعلقات،حضورِ قلب کی راہ میں رکاوٹ

٢)تعلق یافتہ دل مشغول دل ھے

٣)مشغول دل حضورِ قلب میں مانع

٤)تعلقات کو کاٹنا ضروری ھے

٥)انقطاع کے معانی

٦)عرفان کی حقیقت

٧)دعاو مناجات میں انقطاعِ تعلقات کی ترغیب

٨)لھو و لعب کے معانی

٩)قرآن کے مطابق کونسی چیزیں الھا ھیں؟

١٠)لھو و الھا کے دیگر مصادیق

☆لعب میں مشغول دل

☆کھانے پینے میں مشغول دل

☆لذتوں میں مشغول دل

☆آرزوؤں میں مشغول دل

۱۱)دنیا کسے کہتے ہیں؟

۱۲)دنیا کی کشش،حربۂ شیطان

۱۳)قرآن کے مطابق رجال کون ہیں؟

۱٤)قرآن پڑھتے ہوئے حدیثِ نفس کی ممانعت

۱۵)قرآن،باعثِ سرور

۱٦)قرآن،باعثِ تفرج

١) تعلقات، حضورِ قلب کی راہ میں رکاوٹ

قلباً و ذہناً موجود ہونے کے دو رکن ہیں، ایک رکن کی طرف اس فصل کے حصۂ اول میں اشارہ کیا تھا کہ جب تک انسان کا کسی چیز کے ساتھ انس پیدا نہ ہو تو وہاں انسان موجود نہیں ہوتا ہے۔ دوسرا رکن یہ ہے کہ دل کے مشغلوں سے دل کو فارغ کیا جائے، جن چیزوں نے دل پہ قبضہ جمایا ہوا ہے اور جن چیزوں نے دل کو مشغول کیا ہوا ہے ان سے چھٹکارا پایا جائے چونکہ دل جب ایک طرف مشغول ہو جاتا ہے تو دوسری چیز کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے، پھر ایک ہی وقت میں اُدھر بھی مشغول رہے اور اِدھر بھی مشغول رہے تو یہ ممکن نہیں ہے لہٰذا دل کے وہ مشغلے ختم کرنے پڑیں گے اور جب تک وہ ختم نہیں ہوں گے تو حضورِ ذہن بھی نہیں ہوگا۔

اگر ہم دل کو پاک بھی کر لیں تو پھر بھی کچھ تعلقات ایسے ہیں کہ جن کی زنجیروں میں دل جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ البتہ یہ بھی آلودگیوں کا ہی ایک حصہ ہے، ایک لحاظ سے اسی رکنِ اول سے ہی رکنِ دوم پیدا ہوتا ہے، آلودگیوں میں سے ایک آلودگی یہ ہے کہ دل تعلقات کا مرکز ہے، جس طرح دل فہم کا مرکز ہے، احساسات کا مرکز ہے تو اسی طرح سے ہمارا دل تعلقات کا بھی مرکز ہے، تعلق شروع ہی دل سے ہوتا ہے اور بعد میں جسمانی تعلق پیدا ہوتا ہے، آغاز دل سے ہوتا ہے مثلاً آنکھیں اس وقت کسی چیز سے تعلق پیدا کرتی ہیں کہ جب پہلے دل کا تعلق ہو، جس چیز کو دل چاہتا ہے کہ دیکھے تو اسی کو آنکھ دیکھتی ہے، جس چیز کو دل چاہتا ہے کہ سنے تو کان اسی چیز کو سنتے ہیں یعنی سماعت و بصارت کا تعلق درحقیقت دل کے رہینِ منت ہے، دل جہاں پر تعلق پیدا کرے گا تو اعضاء و جوارح

تعلقات، حضورِ قلب کی راہ میں رکاوٹ

بھی دل کے پیچھے ہیں، دل جدھر جائے گا انسان اسی طرف جاتا ہے۔ یہ تعلقات ہیں کہ جو انسان کے حضور کے اندر رکاوٹ بنتے ہیں مثلاً ہم نماز میں دل کو حاضر رکھنا چاہتے ہیں لیکن دل تو وہاں ہے کہ جہاں اس کا تعلق ہے، تعلقات اور مشغولیاتِ دل اتنی زیادہ ہیں کہ جب ہم اس کو نماز میں حاضر کرنا چاہتے ہیں تو ہزاروں تعلق چھوڑے نہیں جاتے ہیں اس لئے کہ وہ ان سے مربوط ہے، پس دوسری چیز تعلقات سے انقطاع ہے کہ جیسے آپ مناجاتِ شعبانیہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں کہ

اِلٰهِیْ هَبْ لِیْ کَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ وَاَنِرْ اَبْصارَ قُلُوْبِنَا بِضِیَاءِ نَظَرِهَا اِلَیْکَ، حَتّٰی تَخْرِقَ اَبْصارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ فَتَصِلَ اِلٰی مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ......

میرے خدا مجھے اس طرح کمالِ انقطاع کی توفیق عطا فرما کہ تیری بارگاہ کا ہو جاؤں اور ہمارے دلوں کی آنکھیں جب تیری طرف نظر کریں تو انہیں نورانی بنا دے تاکہ یہ دیدہ ہائے دل حجاباتِ نور کو پار کر کے تیری عظمت وبزرگی کے مرکز سے جا ملیں......

یعنی ہمارے دلوں کو، ہمارے دلوں کی آنکھ کو، دل کی بصیرت کو منور فرما اور دل کو اس طرح سے انقطاع عطا فرما کہ ہر چیز سے مجھے لاتعلق کر کے فقط اپنی ذات سے متعلق قرار دے۔

بعض لوگ حقیقتاً پاک ونورانی انسان ہیں لیکن پھر بھی انہیں توفیق نہیں ہوتی ہے کہ قرآن کے سامنے حاضر ہوں، اسکی وجہ یہ ہے کہ زنجیر بھی ساتھ بندھی ہوئی ہے، ان کے اور قرآن کے درمیان انس ہونے کے باوجود غیر حاضر ہیں، یہ انسان بارگاہِ قرآن یا عبادت سے غائب ہے،

ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ جس طرح خدا نے اس کو اہلِ تعقل پیدا کیا ہے اسی طرح سے یہ اہلِ تعلق بھی ہے، اس کے مختلف چیزوں سے تعلقات ہیں یعنی رابطے ہیں، مختلف اشیاء کے ساتھ، مختلف موجودات کے ساتھ، مختلف امور کے ساتھ انسان کے تعلقات ہیں اور تعلق کا مرکز بھی اتفاقاً دل ہی ہے، تعلقات بھی قلبی ہی ہیں، جس طرح سے تعقل دل کا کام ہے اسی طرح تعلق بھی دل کا کام ہے یعنی ساری چیزیں ہمارے دل کے ساتھ رابطے میں ہیں اور ہمارے دل اور ان کے درمیان علاقہ و تعلق موجود ہے، دل کے ساتھ ان چیزوں کی گرہ لگی ہوئی ہے، تعلقات تعقلات کی راہ میں مانع ہیں۔

فہم کی راہ میں ایک بہت بڑا مانع یہی تعلقاتِ قلبیہ ہیں، انسان دل سے دیکھے کہ کتنی چیزوں کے ساتھ دل کا تعلق ہے اور جیسے کہا جاتا ہے اور روایت میں بھی یہ مطلب ہے کہ ہر چیز کی ایک آفت ہے،

لِكُلِّ شَيْءٍ آفَةٌ وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ......(۱)

ہر چیز کی ایک بلا، بیماری اور آفت ہے لیکن علم کے لئے فراواں آفات ہیں۔ بعض اچھے کاموں کے لئے برے کام آفات ہوتے ہیں لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کیلئے اچھے کام بھی آفت ہیں مثلاً اگر ایک انسان باسی اور خراب کھانا کھائے تو اس کے لئے آفت یہ ہے کہ بیمار ہوگا لیکن بعض مزاج ایسے ہیں کہ اگر وہ صحیح اور تازہ کھانا بھی کھائیں گے تو بیمار ہو جائیں گے اس لئے کہ ان کا مزاج ایسا ہے۔ تعلقات آفتِ علم ہیں۔ انسان اپنے دل میں دیکھے کہ کتنی چیزوں کے ساتھ اس

کا تعلق ہے۔ ہر وہ شے جس کی حب ہمارے دل میں ہے تو یہ اس شے کے درمیان ایک تعلق ہے۔

۲)تعلق یافتہ دل مشغول دل ہے

دل تعلقات کو ترک نہیں کرتا ہے اور انسان ایک محدود ہستی کا مالک ہے، قوت کے لحاظ سے، عمل کے لحاظ سے، تاثیر کے لحاظ سے، تاثر کے لحاظ سے بھی ایک محدود ہستی کا مالک ہے لیکن خداوند تبارک وتعالیٰ کی ہستی میں چونکہ حد نہیں ہے اس وجہ سے اسمائے الٰہیہ وصفاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں سے ہے کہ

لَا يَشْغَلُهُ شَأْنٌ عَنْ شَأْنٍ......(۲)

کوئی شے یا کام اسے دوسرے کام سے باز نہیں رکھتا .....

یعنی خدا کی صفت یہ ہے کہ اگر خدا کی ذات ایک چیز میں مشغول ہو تو دوسری طرف بھی توجہ رہتی ہے یعنی یہ شے خدا کی توجہ اپنی طرف لگا کر کسی دوسری شے سے توجہ نہیں ہٹا سکتی ہے لیکن انسان ایسے نہیں ہیں، انسان ایسا ہے کہ جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دوسری چیز سے غافل ہو جاتا ہے یعنی يَشْغَلُهُ شَأْنٌ عَنْ شَأْنٍ یعنی اگر ایک آدمی بات کر رہا ہے اور دوسرا بھی بات کر رہا ہو تو ہم دونوں کی بات ایک ہی وقت میں نہیں سن سکتے ہیں، ایک کو کہتے ہیں کہ آپ ذرا چپ رہیں تاکہ میں اس کی بات سن سکوں، اگر دونوں خاموش نہ رہیں اور مسلسل بولتے رہیں تو ہم دونوں کی نہیں سن پائیں گے، کیوں؟ کیونکہ ایک کی بات نے دوسرے کی بات سننے سے روکا ہوا ہے۔

یہ انسان کی مشکل ہے کہ دل خالی اور فارغ نہیں ہے بلکہ مشغول و مصروف ہے، جیسے بعض انسان مشغول ہیں تو وہ دوسروں کو کہتے ہیں کہ تم فارغ ہو اور میں مصروف و مشغول آدمی ہوں، البتہ بے کار آدمی اکثر بہت مشغول ہوتے ہیں کہ جن کا کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں خصوصاً یورپی ممالک میں کہ وہاں کی زندگی بہت مصروف ہے لیکن اسی زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کی کوئی جاب (Job) وغیرہ نہیں ہے، انہیں کونسل (Council) کی طرف سے شہریہ ملتا ہے، یہاں مراجع کی طرف سے ملتا ہے اور برطانیہ میں ملکۂ برطانیہ کی طرف سے ملتا ہے، ہفتے کو سب عمامہ پہن کر صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور کونسل سے جا کر شہریہ لے کر آتے ہیں، بظاہر چونکہ ان کا کوئی کام نہیں ہے اور جاب نہیں ہے، انسان سمجھتا ہے کہ ان کے پاس بہت ٹائم ہوگا لیکن انسان جب ان سے بات کرے تو ان کے پاس ٹیلیفون کرنے کے لئے بھی فرصت نہیں ہوتی ہے، یہ کہتے ہیں کہ ہم سب سے زیادہ مشغول ہیں۔ یعنی اگر ذاتِ خدا ایک فعل میں مشغول ہو یا ایک مخلوق کی طرف متوجہ ہو تو یہ توجہ خدا کو دوسری شے سے غافل نہیں کرتی ہے، ایک ہی آن میں ذاتِ خدا کی توجہ تمام عالمِ ہستی، تمام موجودات اور لامتناہی امور کی طرف ہے۔

یوں نہیں ہے کہ اگر خداوند تبارک وتعالیٰ کے علم میں ایک چیز آئی ہے تو دوسری چیز سے غفلت پیدا ہو جائے یا خدا نے ایک مطلب کا ارادہ کیا ہے تو دوسری چیز کا ارادہ نہ کر سکے، چونکہ ہستی خدا لامحدود ہے لیکن انسان کی ہستی محدود ہے اور نہ صرف کمیت کے لحاظ سے یعنی طول وعرض وعمر کے لحاظ سے محدود ہے بلکہ افعال کے لحاظ سے، فکر کے لحاظ سے، تاثیر کے لحاظ سے اور تاثر کے لحاظ سے

بھی محدود ہے، اگر انسان کچھ سمجھنا چاہے تو بھی محدودیت ہے اور اگر انسان کچھ لینا یا دینا چاہے تو بھی محدودیت ہے، انسان کے لئے ایک حد مقرر ہے اور اس محدودیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان جب ایک کام میں مشغول ہوتا ہے تو اسی آن دوسرے کام سے غافل ہو جاتا ہے اور یہ شے اس کے دوسرے کام میں خود مانع ورکاوٹ بن جاتی ہے۔

۳)مشغول دل حضورِ قلب میں مانع

ہماری توجہ بھی محدود ہے یعنی ایک آن میں فقط ایک طرف متوجہ رہ سکتی ہے، جب ہم ایک چیز ایک سمت میں دیکھ رہے ہوتے ہیں تو اسی آن ہم دوسری طرف نہیں دیکھ سکتے ہیں، ایک ہی وقت میں ہم متعدد جہات میں نگاہ نہیں کر سکتے ہیں چونکہ ایک شے کے اندر ہماری یہ مشغولیت دوسری شے سے روک دیتی ہے۔ تعلقات شغلِ انسان ہیں، مشغولیتِ انسان ہیں، تعلق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک چیز کا ہمارے دل کے ساتھ فقط ایک رشتہ ہے مثلاً اگر کسی زمین سے ہمارا تعلق ہے یعنی اس زمین کے ساتھ ہماری مشغولیت ہے تو اس زمین کے تعلق کی حد تک ہم اس میں مشغول ہیں، اگر ایک فرد کے ساتھ ہمارا تعلق ہے تو اس تعلق کی حد تک ہماری مشغولیتِ قلبی موجود ہے، اگر ایک کتاب کے ساتھ ہمارا تعلق ہے تو اس کتاب کے تعلق کی حد تک ہم کتاب کے اندر مشغول ہیں یعنی جتنا تعلق گہرا ہوگا اتنی ہی مشغولیت بیشتر ہوگی اور اگر ایک انسان گونا گوں تعقات میں گرفتار ہے اور اس کا قلب فراواں تعلقات میں اسیر ہے تو یہ انسان قلبی طور پر مشغول انسان ہے اور یہ مشغولیت اس کو دوسرے

کام سے روک دیتی ہے۔

جب ہم قرآن پڑھنے یا کوئی اور عبادت کرنے کیلئے اپنے جسمانی اعضاء کے ساتھ آتے ہیں تو تعلقاتِ قلبی بھی ہمارے ہمراہ آتے ہیں مثلاً جب ہم بارگاہِ خدا میں کھڑے ہوتے ہیں تو تمام تعلقات سمیت کھڑے ہوجاتے ہیں اور اس آن میں توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا دل بھی حاضر رہے اور خدا کی طرف متوجہ رہے۔ اس کیلئے سادہ مثال یہ ہے کہ آپ کوئی سرگوشی سننا چاہتے ہیں اور اس سرگوشی کو سنتے ہوئے آپ نے ٹی وی بھی آن کیا ہوا ہے، ریڈیو بھی آن کیا ہوا ہے، کیسٹ بھی چلائی ہوئی ہے اور چاروں طرف سے کوئی نہ کوئی آواز کان میں پڑ رہی ہے اور وہ بھی فل والیم (Full volume) میں تو ایسی حالت میں آپ سرگوشی نہیں سن سکتے ہیں کیونکہ آپ کی توجہ اس شخص کی گفتگو کی طرف نہیں ہے کہ جو آپ سے محوِ کلام ہے، اس لئے کہ چاروں طرف سے آپ کے کان میں آوازیں پڑ رہی ہیں یعنی آپ کے کان مشغول ہیں، ہم اس وقت کسی کی بات کی طرف توجہ کر سکتے ہیں کہ جب ہماری دوسری سماعی مشغولیات ختم ہو جائیں۔

٤) تعلقات کو کاٹنا ضروری ھے

انسان کیلئے تعلقات سب سے بڑی آفت ہیں، تعلقات انسان کو تعقل نہیں کرنے دیتے ہیں، جب تک ان تعلقات سے انقطاع حاصل نہ ہو جائے یہ انسان کو بارگاہِ خدا میں حاضر نہیں ہونے دیتے ہیں اور تعلقات ترک کرنا بہت سخت کام ہے یعنی تعلقات ختم کر کے تعلقات ختم کرنا نہ کہ

لاتعلقی ایجاد کرنا، بسا اوقات دوستی بھی تعلق ہے اور دشمنی بھی تعلق ہے اور یہ دونوں مشغولیتیں ہیں، بعض اوقات انسان کسی چیز سے دلچسپی لیتا ہے اور بسا اوقات کسی چیز سے انسان کو الرجی (Allergy) ہوتی ہے یعنی یہ الرجی بھی ایک نوعِ تعلق ہے، انسان کی حساسیت بھی ایک نوعِ تعلق ہے۔

یہ تعلقات ایک ایک کر کے انسان کو توڑنے اور کاٹنے پڑتے ہیں، تعلق توڑنا سب سے مشکل کام ہے مثلاً جس طرح سے ہمارے دانت ہیں کہ جو جبڑے کے اندر پیوست و راسخ ہیں، اگر ایک صحیح اور ٹھیک دانت حتیٰ بیمار و مریض دانت بھی ہو تو بھی اس کو اکھاڑنا بہت دشوار ہے اور اگر ظالم دانت ہو تو اس کو اکھاڑنے کے ساتھ جان بھی باہر آتی ہے۔ تعلقات اسی طرح سے ہیں، تعلقات ہمارے وجود کے اندر دانت کی طرح راسخ ہیں، تعلقات نے اپنی جڑیں ہماری روح اور نفس کے اندر تک پھیلائی ہوئی ہیں، جب ہم اسے کھینچتے ہیں اور تعلق کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو پورے وجود میں درد محسوس ہوتا ہے اور انسان کی آہیں نکلتی ہیں، درد اتنے ہی شدید ہیں کہ جتنے تعلقات شدید ہیں، یہ تعلقات پہلے سے دردمند انسان کو اور دردمند کر دیتے ہیں، ان تعلقات سے انسان جب تک لاتعلق نہیں ہوتا ہے یا جب تک ان تعلقات کو منقطع نہیں کرتا ہے تب تک انسان حضور کا تصور نہیں کر سکتا ہے، حضور انسان کے لئے ایک فرضی چیز ہے کہ کس طرح سے حاضر ہوں؟ کہاں حاضر ہوں؟ اور کس کے سامنے حاضر ہوں؟ درحالیکہ انسان تعلقات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

بعض اوقات ہم مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں اور ہمارے حواس بھی ہر طرف ہوتے ہیں

تعلقات کو کاٹنا ضروری ہے

مثلاً ٹی وی بھی آن ہے اور ساتھ کتاب بھی کھلی ہوئی ہے اور گھر میں ہیں تو بچہ بھی ہے کہ جو سویا ہوا ہے یا کھا رہا ہے تو اس کی طرف بھی توجہ ہے، ساتھ میں کوئی مہمان بھی آنا ہے تو دروازے کی طرف بھی ہماری توجہ ہے، کسی کا ٹیلیفون بھی آنا ہے تو اس کی طرف بھی منتظر ہیں اور دیر بھی ہو رہی ہے تو بار بار گھڑی بھی دیکھنی ہے، آپ کا ذہن ہزاروں طرف لگا ہوا ہے اور پھر آپ مطالعہ بھی کر رہے ہیں، اس مطالعے سے انسان کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے چونکہ ذہن یہاں پر حاضر نہیں ہے، ذہن کبھی اِس طرف ہے تو کبھی اس طرف ہے، جس طرح سے جسمانی طور پر ایک آدمی دوڑ کر کبھی یہاں جا رہا ہو، کبھی وہاں جا رہا ہو تو وہ یکجا ہو کر بیٹھ نہیں سکتا ہے اسی طرح سے ذہن بھی حاضر نہیں ہے لہٰذا یہ مشغولیت بھی ایک تعلق ہے اور ان سارے تعلقات کو توڑنا نہایت ضروری ہے۔

۵) انقطاع کے معانی

انقطاع کے معانی یہ نہیں ہیں کہ ہم کسی غار یا جنگل میں چلے جائیں یا آبادی کو چھوڑ دیں، زندگی چھوڑ دیں، معیشت چھوڑ دیں، کھانا پینا چھوڑ دیں، بچے اور خاندان کو ترک کر کے کسی خانقاہ میں جا کر عبادتِ خدا میں مشغول ہو جائیں، یہ انقطاع نہیں ہے بلکہ یہ تو انحراف ہے، انقطاع الی اللہ یعنی اپنے دل کا تعلق غیرِ خدا سے ختم کرو، نہ کہ جسمانی طور پر ان چیزوں سے بھاگ کر غار میں جا بیٹھو اور غار میں بھی دل انہی ساری چیزوں کے اندر مشغول ہو۔ انقطاعِ قلبی ہو یعنی جسمانی طور پر ادھر ہی رہو، لوگوں کے درمیان رہو، گلی کوچے میں رہو لہٰذا یہ رہبانیت، خانقاہیت اسلام میں کہیں

بھی نہیں ہے۔

خصوصاً انبیائے کرام علیہم السلام اور ائمہ اطہار علیہم السلام میں سے کوئی بھی غار میں نہیں بیٹھا، کسی نے بھی چلے نہیں کاٹے، کسی نے بھی جا کر وہ کام نہیں کئے کہ جو آج تصوف و عرفان کے نام سے اور صوفی گری کے نام سے معروف ہیں، ہنر اور مردانگی یہ ہے کہ انہی لوگوں کے اندر بیٹھ کر اپنے دل کو فقط خدا کی طرف متوجہ کرو، ورنہ اگر کوئی خود کو کالی کوٹھڑی میں بند کر لے کہ جہاں نہ اس کو دھوپ لگے، نہ نور لگے، نہ آکسیجن پہنچے اور اس کی کسی تک رسائی نہ ہو، کوئی آ نہ سکے، جا نہ سکے تو یہ گویا فرشتہ ہے، ایسا فرشتہ بننا بہت آسان ہے لیکن انسان بننا بہت مشکل ہے چونکہ فرشتہ بننے کے معانی یہ ہیں کہ انسان آبادی چھوڑ دے، معاشرہ چھوڑ دے، ذمہ داریاں چھوڑ دے، فرائض چھوڑ دے اور کسی غار میں جا بیٹھے، نہ کوئی آئے نہ جائے۔ پھر انسان کون ہے؟ انسان یہ ہے کہ انہی انسانوں کے اندر رہ کر سارے تعلقات چھوڑ دے، نہ کہ غار میں بیٹھ کر سب کچھ چھوڑ دے، لہٰذا انقطاع کے معانی یہ ہیں کہ آپ جسمانی طور پر لوگوں کے ساتھ ہوں لیکن آپ کا قلب فقط خدا کی طرف متوجہ ہو، دل کے ساتھ خدا کا تعلق ہو۔ غیر قلبی تعلقات سب کے ساتھ ہوں لیکن دل کسی کو بھی نہ سونپو، دل کسی کے اختیار میں نہ قرار دو۔

ادبیات کو دین داروں نے چھوڑ دیا یعنی جو دینی ادبیات تھیں وہ بے دینوں نے لے لیں اور انہیں استعمال کیا، جیسے دل سپردگی، دل دادگی، دل بردگی، دلبر، یہ سب دینی ادبیات اور معارفِ دینی کے الفاظ ہیں کہ جو اہل دین نے ترک کر دیئے اور شہوت رانوں نے ان کو استعمال کرنا شروع

کر دیا، محبت و عشق معارفِ دینی ہیں لیکن دین داروں نے ان کو ترک کر دیا اور کسی اور چیز کے پیچھے پڑ گئے اور بے دینوں نے، شہوت رانوں نے اپنی دنیا میں لا کر ان کو رسوا کیا کہ دلبر یعنی جو انسان کا دل لے جائے، جو کسی کو اپنا دل دے دے۔ ایک ہی چیز ہے کہ جس کے ساتھ انسان کا دل لگتا ہے، دل فقط بارگاہِ خدا کے ساتھ مسانخت و مناسبت رکھتا ہے، امام صادق علیہ السلام کے مطابق دل کی سنخیت فقط یہ ہے کہ

اَلْقَلْبُ حَرَمُ اللّٰهِ فَلَا تُسْكِنْ حَرَمِ اللّٰهِ غَيْرَ اللّٰهِ......(۳)

دل اللہ کا حرم ہے پس خدا کے حرم میں غیرِ خدا کو جگہ نہ دو......

اِنَّ قَلْبَ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ......(۴)

بے شک مومن کا دل خداوندِ عالم کا عرش ہے......

لہٰذا اس عرشِ خدا پر خدا ہو، حکمرانی، حکومت و فرمانروائی خدا کی ہو یعنی انسان کا دلبر فقط خدا ہو، خدا انسان کا دل لے جائے، دل سپردگی فقط خدا کو ہو، انسان اپنا دل خدا کو سپرد کر دے اور جب ایک دفعہ انسان کا دل خدا کی طرف چلا جائے تو جسمانی طور پر جہاں بھی ہو اس سے فرق نہیں پڑتا ہے۔

۶) عرفان کی حقیقت

اس مطلب کی وضاحت کیلئے یہ ماجرا نقل کیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ یہ فرضی داستان ہو کہ جیسے بظاہر لگتا ہے کہ دو بھائیوں کی ان کے والد نے اچھی تربیت کی اور جب والد کا انتقال ہوا تو

دونوں نے دین داری کی راہ اپنائی، ایک جو بہت ہی زیادہ متدین تھا اس نے زندگی اور معیشت ترک کی اور جنگل کا راستہ لیا اور خانقاہ میں جا کر ریاضت وعبادت و چلے وغیرہ میں مشغول ہو گیا اور دوسرے نے شہر کے وسط میں چوک پر کپڑے کی دکان خرید لی اور اپنے کاروبار میں مشغول ہو گیا اور وہ جو جنگل میں جا بسا تھا اس نے ریاضتیں کیں اور چلے کاٹے۔

چونکہ ریاضتیں کرنے اور چلے کاٹنے سے کچھ طاقتیں اور قوتیں انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں، خواہ جسمانی ہوں یا روحانی، جن کا ایمان اور خدا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے یعنی کوئی ہندو چلے کاٹے تو بھی اس کے اندر کچھ صلاحیتیں آجاتی ہیں، جیسے اگر ایک ہندو ویٹ لفٹنگ (Weightlifting) کرے تو اس میں طاقت آجاتی ہے، ایک مسلمان کرے تو وہ بھی ویٹ لفٹر بن جاتا ہے، باڈی بلڈرز مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی ہیں۔ جو بھی اپنا جسم بنانا چاہے تو بنا لیتا ہے، اس کے اندر طاقت آجاتی ہے، جو بھی کرکٹ کی پریکٹس (Practice) کرے تو اس کے اندر کرکٹ کی ایک صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے چاہے وہ ہندو ہو، مسلم ہو، انگریز ہو یا اصلاً سرے سے کسی دین کا پیروکار نہ ہو، اسی طرح سے چلے کاٹنے سے بھی کچھ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں چاہے انسان مشرک ہو، ملحد ہو، منافق ہو، کافر ہو، ہندو ہو، بت پرست ہو، خدا پرست ہو یا کچھ بھی نہ ہو، چلے کاٹنے سے کچھ نہ کچھ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں، اگر آپ بھوکے رہیں تو اس بھوک کی وجہ سے آپ کا جسم کمزور ہوتا جائے گا لیکن آپ کی بعض روحانی طاقتیں بیدار ہوتی جائیں گی، یہ عام انسانی وجود اور انسانی نظام کا حصہ ہے، اس کا معنویت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بارہا کہا ہے کہ عرفان دیواریں دوڑانے کا نام نہیں ہے، پانی پہ چلنے کا نام نہیں ہے، یہ جو عموماً عرفان کے نام سے چیزیں نقل کی جاتی ہیں کہ باطن بتانا، اندرونی حالات بتانا، غیب گوئیاں کرنا، پیشین گوئیاں کرنا اور چھپی ہوئی چیزیں ڈھونڈ کر، تلاش کر کے دے دینا عرفان نہیں ہے، کرتب دکھانا عرفان نہیں ہے، عرفان معرفت سے ہے یعنی قربِ خدا، معرفتِ خدا، انسان کا تعلق خدا کے ساتھ ہو۔ کوئی بھی ریاضت کرے، چلے کاٹے تو اس کے اندر یہ صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

میڈیا میں بھی دکھایا گیا تھا کہ ہالینڈ کا ایک مرتاض کئی گھنٹے فضا میں وائٹ ہاؤس کے سامنے ایک چھڑی پر معلق رہا یعنی ایک ہاتھ میں ایک عصاء ہے اور اس کے نیچے کچھ بھی نہیں ہے اور چارزانوں بیٹھا ہوا ہے اور زمین سے تقریباً ایک سے ڈیڑھ میٹر بلند ہے اور کئی گھنٹے فضا میں اسی طرح سے ایک چھڑی کے سہارے وائٹ ہاؤس کے سامنے معلق رہا، جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ کام کیوں کیا؟ اس نے کہا تا کہ لوگ میری طرف توجہ کریں اور ساری دنیا نے توجہ کی چونکہ پھر میڈیا والے پہنچ گئے اور انہوں نے ساری دنیا میں عجوبہ دکھایا کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے؟ آپ توجہ کریں کہ یہ کرتب دکھا رہا ہے، لیکن کس لئے؟ تا کہ لوگ میری طرف توجہ کریں، یہ کرتب دکھانا کوئی عرفان نہیں ہے، اگر یہ عرفان ہے تو پھر وہ سب سے بڑا عارف ہے جو کئی گھنٹے چھڑی کے سہارے بیٹھا ہوا ہے، چھڑی کے اوپر نہیں بلکہ چھڑی صرف ہاتھ کے پہلو میں ہے اور اس کا اپنا وزن چھڑی کے اوپر نہیں ہے، وہ بغیر کسی سہارے کے کئی گھنٹوں تک فضا میں معلق رہا کہ جیسے کوئی آرام سے کسی تخت یا صوفے پر بیٹھا ہوتا ہے۔ پس کرتب دکھانا عرفان نہیں ہے، یہ کرتب ساری دنیا نے دیکھا لیکن وہ عارف نہیں تھا، یہ

انسان کی جسمانی وروحانی طاقتیں ہیں کہ جو بعض ریاضتوں سے، مشقوں سے زندہ ہو جاتی ہیں لہٰذا اس کو عرفان نہیں کہتے ہیں۔

بہر حال واقعے کے مطابق ان دو بھائیوں میں سے ایک نے جنگل کے اندر سو چلے کاٹے تو اس کے اندر کچھ صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور اس نے جانوروں کو تسخیر کر لیا، جب جانور اس کے سامنے مسخر ہو گئے تو اس کو خیال آیا کہ میرا بھائی دنیادار ہے، میں اس دنیادار بھائی کی اصلاح کے لئے جاؤں لیکن بھائی کو مرعوب کرنے کیلئے اور اثر انداز ہونے کے لئے کہ وہ میری روحانی طاقت کا قائل ہو جائے اس نے گھوڑے کے بجائے شیر کو اپنی سواری بنایا اور کوڑے کی جگہ ہاتھ میں سانپ پکڑا، جب شیر دوڑاتا ہوا شہر میں آیا تو لوگ جانور دیکھ کر، درندے دیکھ کر بھاگ گئے، اسے فرضی قصہ کہہ لیں لیکن مہم اس داستان کے اندر وہ گوہر ہے کہ جو منتقل کرنا ہے، مولانا روم کے بقول قصہ پیمانہ ہوتا ہے، پیمانے کے اندر جو چیز ہوتی ہے وہ اہم ہوتی ہے، پیمانے کو نہیں دیکھیں بلکہ اس ظرف کے اندر موجود چیز کو دیکھیں،

ای برادر قصّه چون پیمانه ای ست
معنی اندروی مثال دانه ای ست
دانۂ معنی بگیرد مرد عقل
ننگرد پیمانه را گر گشت نقل ......(۵)

قصہ پیمانہ ہوتا ہے آپ پیمانے کو چھوڑیں، یہ زنانہ عادت ہے کہ انسان پیمانے پہ زیادہ توجہ

کرے، عورتیں جب کسی کے گھر میں مہمان جاتی ہیں اور وہاں انہیں چائے پیش کی جاتی ہے تو ان کی توجہ چائے سے زیادہ پیالی پہ ہوتی ہے، یہ کونسا ماڈل ہے؟ پرانا ہے یا نیا ہے؟ قیمت کیا ہے؟ سستی ہے یا مہنگی ہے؟ اس کا ڈیزائن (Design) کیسا ہے؟ ان کی ساری توجہ کپ پہ ہوتی ہے۔ یہ زنانہ عادتیں ترک کریں، پیمانے پہ توجہ نہ کریں بلکہ مردانگی یہی ہے کہ پیمانے کے اندر جو کچھ ہے اس کی طرف توجہ کریں، یہ جب شہر میں شیر کو دوڑاتے ہوئے آیا تو لوگ ڈر کے مارے بھاگے اور اس نے بھائی کے پاس آکر دیکھا کہ وہ کاروبار میں مشغول ہے، لوگ کپڑے خرید رہے ہیں، آرہے ہیں اور جارہے ہیں، اس نے اس کو دعوت دی کہ تم دنیا میں مشغول ہو، دنیا کو چھوڑو اور خدا کی طرف آؤ، دیکھو میں راہِ خدا میں گیا، عبادتِ خدا کرتا رہا، چلے کاٹتا رہا اور ریاضتیں کرتا رہا کہ جس کے نتیجے میں مجھے خدا کی طرف سے یہ لطف حاصل ہوا ہے کہ میں اب شیر پہ سواری لیتا ہوں، سانپ کو کوڑا بناتا ہوں، درندے اور جانور میرے سامنے مسخر ہیں۔

بہرکیف بھائی نے نہ کوئی تعجب کیا اور نہ اس کی ہاں میں ہاں ملائی، اس نے کہا کہ آپ مہمان ہو، آپ بیٹھو میں آپ کے لئے چائے لے کر آؤں بالآخر کوئی پذیرائی کروں کہ ایک عرصے بعد بھائی سے ملاقات ہوئی ہے۔ جہاں وہ بیٹھتا تھا وہاں پر اس نے صوفی، عبادت گزار اور چلے کاٹنے والے بھائی کو بٹھایا اور خود تھوڑی دیر کے لئے باہر چلا گیا، ظاہر ہے کہ کپڑے کی دکان تھی، اس میں ہر آدمی آتا ہے اور بیشتر کپڑا عورتیں خریدتی ہیں، اب خدا امتحان لیتا ہے، جوں ہی وہ اس کو بٹھا کر گیا تو ایک عورت آئی اور عورت بہت حسین وزیبا تھی، اس سے کپڑا خریدنے کے لئے کہا، اتنی مدت

جنگل میں رہا تھا، ساری عمر تو بھیڑیئے، بندر، سانپ، شیر اور جانور دیکھتا رہا تھا، کافی عرصے بعد اس نے انسان دیکھے تھے اور وہ بھی عورت اور خوبصورت وزیبا عورت دیکھی لہٰذا اس کو دیکھتے ہی اس کے بدن میں ایک تاثیر ہوئی، احساس پیدا ہوا، اس کے بدن میں ایک کپکپی طاری ہوئی اور جھرجھری ایجاد ہوئی کہ جس کی وجہ سے اوپر جو پینے کیلئے پانی کی مشک رکھی ہوئی تھی وہ گرگئی اور یہ بھیک گیا، بھائی واپس آیا تو دیکھا کہ ساری دکان بھی بھیگی ہوئی ہے اور یہ شخص بھی پانی میں تر ہے، پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ کہا ماجرا یہ ہے کہ تم خود تو دنیا میں غرق ہو مجھے بھی تم نے دنیا میں پھنسا دیا، اس نے ماجرا بیان کردیا کہ یہ تو گناہ ومعصیت کی دکان ہے، جب تم چلے گئے تو یہاں پر عورت آئی اور اس کی وجہ سے میرے بدن میں ایسا احساس پیدا ہوا، مجھے جھٹکا لگا اور اوپر سے مشک گرگئی لہٰذا میں بھیگ گیا، پھر اس بھائی نے اُس کو بتایا کہ انقطاع کس کو کہتے ہیں؟ کہا کہ چالیس سال سے تم غاروں میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہاں جسمانی طور پر تو منقطع ہو گئے تھے لیکن قلبی طور پر منقطع نہیں ہوئے تھے، میں چالیس سال سے اس دکان میں بیٹھا ہوں اور چالیس سال سے یہ مشک اوپر لٹکی ہوئی ہے اور چالیس سال سے عورتیں کپڑا خرید رہی ہیں لیکن کبھی میرے بدن میں ایسی جھرجھری طاری نہیں ہوئی، کیوں؟ اسلئے کہ جسمانی طور پر میرا جسم دکان میں ہے لیکن میرا دل ان عورتوں میں گرفتار نہیں ہے، میرا دل ان کپڑوں میں گرفتار نہیں ہے، تم جنگل میں بیٹھ کر جسمانی طور پر اپنی قوتیں بڑھا کر آئے ہو لیکن انقطاع حاصل نہیں ہوا۔

انقطاع یعنی دل کے تعلقات توڑ دو، قلبی تعلقات توڑ دو، ان تعلقات کے اندر دل اسیر

ہے اور بری طرح جکڑا ہوا ہے، چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً انگوٹھی بھی ایک تعلق ہے، اگر گم ہو جائے تو بھوک بھی نہیں لگتی ہے اور نیند بھی نہیں آتی ہے، اگر اس شخص سے کہیں کہ ایک اور انگوٹھی لے لو تو کہتا ہے کہ نہیں، وہ انگوٹھی ایک خاص انگوٹھی تھی، یہ تعلق ہے، جب یہ زاہد و عارف انگوٹھی اور تسبیح کے تعلق میں گرفتار ہیں کہ جس کی نہ کوئی معنوی قیمت ہے، نہ کوئی مالی و مادی قیمت ہے تو وہ بے چارہ تو کسی قیمتی چیز کا اسیر ہے کہ جو دنیا کی زرق برق اور طمطراق کے اندر گرفتار ہے۔

اس کی وضاحت کیلئے علامہ نراقیؒ کا واقعہ بھی نقل کرتے ہیں۔ ملا احمد نراقیؒ کے پاس ایک درویش گیا چونکہ کہتے ہیں کہ ملاّ احمد نراقیؒ ذوریاستین تھے، معنوی طور پر ایک مرجعِ مسلّم، حکیم، فیلسوف اور عارف اور دوسری طرف سے دنیوی طور پر بھی صاحبِ املاک اور حکومت کے ہاں بھی ان کو عزت و شان و شکوہ حاصل تھا، ایک درویش کو اچھا نہیں لگا کہ ایک عالم اس طرح سے دنیا میں غرق ہو، ان کو ہدایت کرنے کے لئے گیا اور کہا کہ یہ جو تم دنیا میں غرق ہو یہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے، بہر کیف پہلے تو انہوں نے ٹالا کہ تم اپنی راہ لو،

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۝(٦)

تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

لیکن اس نے اصرار کیا کہ آج مجھے اس عالم و مجتہد کو دنیا کے بن سے، دنیا کی اسارت سے نکالنا ہے، بہر کیف جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے کہا کہ بتاؤ کیا کرنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ سب کچھ چھوڑ دو اور کربلا و نجف جا کر زندگی بسر کرتے ہیں، درویشی کی زندگی بسر کرتے ہیں،

مقاماتِ مقدسہ میں جا کر رہتے ہیں، مرحوم نراقیؒ نے کہا کہ خوب، اب سب کچھ چھوڑ دیا۔ انہوں نے چھوڑا کیا؟ یعنی وہ املاک، باغات اور کروڑوں کی جائیداد، اس زمانے میں آج سے دو تین سو سال پہلے اور آج کے لحاظ سے وہ جائیداد تقریباً بلینز (Billions) کے حساب سے بنتی ہے، پھر ایک سواری لیکر درویش سے کہا کہ چلیں اور چلتے ہوئے اپنے نوکر سے کہا کہ اس کا کشکول چھپا دے۔ درویشوں کا ایک ظرف کشکول کے نام سے ہوتا ہے، وہی ان کا اوڑھنا بچھونا اور سب کچھ ہوتا ہے، سارا متاعِ زندگی وہی ہوتا ہے، راستے میں ایک جگہ پر پہنچے اور وہاں جب نماز کا وقت ہوا تو درویش کو کشکول یاد آیا، اس نے کہا کہ میں تو آپ کے ہاں کشکول بھول آیا ہوں، انہوں نے کہا کہ کشکول ہے تو مسئلہ نہیں ہے اور خرید لیں گے، اول تو اتنا ضروری نہیں ہے لیکن اگر ضروری بھی ہے تو راستے میں دوسرا لے لیں گے، اس نے کہا نہیں میرا وہ کشکول ضروری ہے، انہوں نے جتنا اصرار کیا لیکن وہ نہیں مانا، اس نے کہا کہ جب تک کشکول نہیں ہوگا تو میں نماز بھی نہیں پڑھوں گا چونکہ میں نے تو وضو بھی اسی میں کرنا ہے، بالآخر واپس آگئے اور اپنے خادم سے کہا کہ اس کو کشکول واپس کر دو اور پھر اس کو متوجہ کیا کہ اب بتاؤ دنیا میں غرق کون ہے؟ میں تو خدا کی خاطر یہ کروڑوں کی جائیداد و املاک اور سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن تم ایک کشکول چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

ضروری نہیں ہے کہ جس انسان کے پاس مالِ فراواں ہو تو اس کو دنیا دار انسان کہیں گے، چہ بسا فقیر کا پیسوں کے ساتھ زیادہ تعلق ہو۔ یہ تعلقات ایک طرح سے حب ہیں کہ جو جہاں طلب اور خود خواہ انسان ہے وہ ان تعلقاتِ فراواں، آرزوئے فراواں اور خواہشاتِ فراواں کی زنجیروں

میں جکڑا ہوا ہے، یہ سب کے سب تعلقات ہیں، یہاں بھی پہنچنا ہے وہاں بھی پہنچنا ہے، یہ بھی کرنا ہے وہ بھی کرنا ہے اور پھر نماز کا وقت آئے تو نماز میں بھی جانا ہے اور نماز میں بھی خدا سے یہی تعلقات مانگنے ہیں، پھر کہتا ہے کہ دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے، اگر یہ دل خدا کی طرف متوجہ ہو جائے تو تعجب کرنا چاہئے کہ یہ دل جو تعلقات میں اسیر ہے یہ خدا کی طرف کیسے متوجہ ہو گیا؟

۷) دعا و مناجات میں انقطاعِ تعلقات کی ترغیب

ائمہ اطہار علیہم السلام کی دعاؤں میں انقطاعِ تعلقات کیلئے خاص ترغیب دی گئی ہے، مناجاتِ شعبانیہ میں بھی یہ ادب سکھایا گیا ہے کہ کس طرح خدا کی طرف حضورِ دل ہو؟ قرآن پڑھتے ہوئے ہم خدا کی طرف کیسے متوجہ ہوں یا نماز میں ہماری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہو؟ مناجاتِ شعبانیہ بہت ہی عظیم الشان دعا ہے، ان مناجات کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ تمام معصومین علیہم السلام کی مناجات ہیں یعنی ہر معصوم نے یہ مناجات خدا کی بارگاہ میں پیش کی ہیں اور ان کے ذریعے سے خدا کو خطاب کیا ہے، باقی جو دعائیں ہیں وہ کسی ایک معصومؑ سے منقول ہیں، کوئی دوسرے معصومؑ سے اور کوئی دعا تیسرے معصومؑ سے منقول ہے لیکن یہ جمیع معصومین علیہم السلام کی مشترک دعا ہے یعنی معصومین علیہم السلام کا، اولیائے خدا علیہم السلام کا یہ نصاب مناجاتِ شعبانیہ کے نام سے معروف ہے، یہ صرف شعبان میں ہی نہیں بلکہ اور دوسرے اوقات میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔

چونکہ مفاتیح میں جو آداب لکھے ہیں یا اِدھر اُدھر اوقات کی جو قید لگائی گئی ہے تو ہم سمجھتے ہیں

کہ ان اوقات سے باہر اگر پڑھا تو ایسے ہی ہے کہ جیسے مقررہ ٹائم سے ہٹ کر کوئی گولی کھالی تو نقصان دے گی، جب بھی انسان کا دل آمادہ ہو تو دعا پڑھ سکتا ہے، دعا کے لئے، قرآن کے لئے اور عبادت کے لئے آمادگیٔ قلبی ضروری ہے، جب دل حاضر اور آمادہ ہو تو انسان عبادت کرے، قرآن پڑھے، مناجات کرے اور دعائیں پڑھے لیکن دل ہر وقت تو آمادہ نہیں ہوتا ہے، دل کے اور عقل کے لئے یہ احوال ذکر کئے گئے ہیں، جیسے عقل کے لئے ہے کہ عقل کے لئے اِدبار اور اقبال ہے تو اور اسی طرح دل کے لئے بھی ہے۔ نہج البلاغہ میں مولا علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ

اِنَّ لِلقُلُوبِ اِقبَالًا وَ اِدبَاراً......(۷)

اقبال یعنی کبھی قلب کچھ سننے کے لئے آمادہ ہوتا ہے اور کبھی بالکل بیزار ہوتا ہے، ادبار یعنی حاضر نہیں ہے، ہمیشہ دل کی حالت یکساں نہیں ہے۔ عموماً فرصت کے لحات میں انسان کا دل آمادہ ہوتا ہے لیکن جب انسان کا دل آمادہ ہو، اقبال ہو اور اس وقت انسان لہو ولعب میں مشغول ہو جائے اور جب دل تھک جائے، بیزار ہو جائے اور ادبار ہو تو اس وقت اس کو قانع کر کے قرآن کے بارگاہ میں یا عبادت کیلئے بارگاہِ خدا میں لے آئے تو دلِ با ادبار ان چیزوں کو تحمل نہیں کر سکتا ہے لہٰذا اس پر عبادتیں شاق وگراں گزرتی ہیں، جب دل کے اندر اقبال ہو یعنی آمادگی ہو اور چاہتا ہو کہ مجھے یہ چیز اس وقت چاہئے، اسے قانع نہ کرنا پڑے بلکہ وہ خود ہمیں مائل کرے، اکسائے اور اٹھائے کہ اٹھو عبادت کی طرف جاؤ، اسی وقت خواہ نصفِ شب ہو یا نصفِ روز ہو، جو بھی وقت ہو، گاہ وبے گاہ جب بھی دیکھو کہ دل آمادہ ہے تو وہ لحہ دعا اور مناجات کے لئے مناسب ہے، ان مناجات کے اندر خداوند

تبارک وتعالیٰ سے یہ نقطۂ اساسی طلب کیا جاتا ہے کہ

اِلٰهِیْ هَبْ لِیْ کَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ......(۸)

میرے خدا مجھے اس طرح کمالِ انقطاع کی توفیق عطا فرما کہ تیری بارگاہ کا ہو جاؤں......

وَیا قُرَّةَ عَیْنِ مَنْ لاذَ بِکَ وَانْقَطَعَ اِلَیْکَ......(۹)

اے اس کے نورِ چشم جو تیری پناہ میں آتا ہے اور سب سے کٹ کر تیری طرف آتا ہے......

وَلا تَشْغَلْنَا عَنْکَ بِغَیْرِکَ......(۱۰)

اور مجھے اپنی ذات سے روگرداں کر کے غیر میں مصروف نہ کر......

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَخْلَصْتُ بِانْقِطَاعِی اِلَیْکَ وَاَقْبَلْتُ بِکُلِّی عَلَیْکَ......(۱۱)

خدایا میں اپنے انقطاع میں مخلص ہوں اور اپنے پورے وجود کے ساتھ تیری طرف آیا ہوں......

انقطاع یعنی میرا تعلق ہر چیز سے توڑ دے، چونکہ میں اہلِ تعلق ہوں، تعلقات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں اور ہر چیز کے ساتھ میرا تعلق ہے۔

۸)لھو و لعب کے معانی

وہ چیز جو انسان کو تعلقات میں مشغول کر دیتی ہیں اس کو قرآن نے الھا کہا ہے، الھا یالھو، الھا مشغولیت کو کہتے ہیں۔لہو ولعب انسان کو لایعنی کاموں اور تعلقات میں مشغول کر دیتے ہیں۔

بے فائدہ کام اور ایسے کام کہ جن کے اندر عقلائی غرض موجود نہ ہو ان کو لعب کہتے ہیں، لہو ان چیزوں کو کہتے ہیں کہ جو انسان کو مشغول کر لیں یعنی انسان کی توجہ اصلی کاموں سے ہٹا کر اپنی طرف لگا دیں۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی مشغولیت ہماری توجہ اصلی کام سے ہٹا دے اور ہمیں اپنی طرف مشغول کر لے تو اسی کو لہو کہتے ہیں۔ لہو مخصوص چیزیں نہیں ہوتی ہیں مثلاً بعض نے لہو کا معنیٰ کھیل کیا ہے، نا، کھیل لہو نہیں ہے، یہ معنیٰ کرنا اشتباہ ہے۔

لہو کو سمجھنے کیلئے فرض کریں کہ کوئی زیارت کے لئے آیا ہے اور اس کا مقصدِ اصلی زیارت کرنا ہے لیکن یہ ایک راستے سے گزرے گا، لوگوں کے درمیان سے گزرے گا، بازار سے گزرے گا، بالآخر انسانی معاشرے سے ہی اس کے تعلقات ہیں کہ جہاں سے گزر کر اس کو زیارت کیلئے جانا ہے لہٰذا راستے میں بہت ساری چیزیں اس کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں اور یہ انسان بھی اگر ایسا ہو کہ اپنا اصلی کام چھوڑ کر ان چیزوں میں مشغول ہو جائے تو یہ لہو ہے مثلاً وہ یہاں پر چاول کے سیمپل (Sample) ڈھونڈنا شروع کر دے تو یہ لہو ہے اور لوگ ایسا کرتے بھی ہیں کہ آئے اور دیکھا یہاں بڑی بڑی مارکیٹز (Markets) ہیں اور لوگ چاول بہت کھاتے ہیں اور ہمارے یہاں چاول زیادہ ہوتے ہیں، چاول پیدا وہاں ہوتے ہیں لیکن کھائے یہاں جاتے ہیں، یہ لہو ہے، آپ کس لئے آئے تھے؟ آپ زیارت کے لئے آئے تھے، اصلی کام زیارت تھا لیکن تجارت نے اسکی توجہ زیارت سے ہٹا دی ہے لہٰذا یہ تجارت لہو ہے چونکہ مقصدِ اصلی زیارت تھا۔ یہ کام جو ہماری توجہ اصلی کام سے ہٹاتا ہے ممکن ہے کہ بہت اچھا کام ہو مثلاً بازار میں ہمارا اصلی مقصد کتاب خریدنا تھا لیکن بازار میں ہمیں کوئی

لہو و لعب کے معانی

دوست مل گیا، ہم اس دوست کے ساتھ باتیں کرنے میں اس طرح سے مشغول ہو گئے کہ ابھی اصلی کام بھول گئے اور وہ وقت ہم سے ضائع ہو گیا تو یہ دوست کے ساتھ باتیں کرنا لہو ہے، ہر وہ چیز جو انسان کو اصلی مقصود سے دور کر دے لہو ہے۔

سب سے برے تعلق کو قرآن نے الھا اور لہْو کہا ہے۔ جیسے طلابِ حوزۂ علمیہ کا اصلی کام تحصیلِ علوم ہے لہٰذا ہر وہ کام کہ جوان کی توجہ کو تحصیلِ علم سے ہٹا کر کسی اور سمت لگا دے وہ لہو ہے، ضروری نہیں ہے کہ برے کام کو ہی لہو کام کو کہتے ہیں یعنی سٹہ، جوا اور قمار کو لہو کہتے ہیں کہ جو حرام ہیں، لہو کے لئے حرام ہونا ضروری نہیں ہے، جس کام کے لئے خدا نے ہمیں خلق کیا ہے تو جو چیز اس سے ہماری توجہ ہٹا کر کسی اور سمت و جہت میں لگا دے وہی لہو ہے۔

اسی طرح فرض کر لیں کہ کوئی زیارت کے لئے آیا ہے اور اس کا مقصود فقط زیارت ہے لیکن وہ زیارت چھوڑ کر پڑھنا شروع کر دے تو اس کے لئے یہ پڑھنا لہو ہے یعنی اس قید کے ساتھ کہ جب مقصد زیارت کرنا ہو اور زیارت چھوڑ کر وہ پڑھنا شروع کر دے کیونکہ پڑھنے نے اس کی توجہ زیارت سے ہٹا دی ہے مثلاً ایک شخص حرم میں جاتا ہے اور حرم میں اس کا مقصد بارگاہِ معصوم علیہ السلام میں یا ولیٔ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے لیکن اندر جاتا ہے تو وہاں شیشے لگے ہوئے ہیں، سونا لگا ہوا ہے، فانوس لٹکے ہوئے ہیں، قالین بچھے ہوئے ہیں، خوبصورت ٹائلیں لگی ہوئی ہیں اور معماری کے بڑے شاندار نمونے ہیں اور یہ جا کر ان کے اندر غرق ہو جاتا ہے اور اس کی ذرا توجہ نہیں ہوتی ہے کہ میں کس طرف آیا تھا تو یہ لہو ہے چونکہ ان چیزوں نے اس کی توجہ اصلی کام سے ہٹا دی ہے۔

بعض اوقات انسان ایسے مستحب کاموں میں لگ جاتا ہے کہ جو اصلی کام سے توجہ ہٹا دیتے ہیں، مستحباتِ فراواں ہیں، مفاتیح پڑھ کر دیکھیں کہ مستحبات چوبیس گھنٹوں سے زیادہ ہیں یعنی چوبیس گھنٹے اگر ایک ثانیہ شمار کریں تو مستحبات پھر بھی زیادہ ہو جاتے ہیں اور گھنٹے کم ہو جاتے ہیں، پھر یہ مطلب بھی سنا ہوا ہے کہ کسی شخص نے دین کی تبلیغ کی اور غیر مسلمان کو مسلمان کر دیا اور ظاہر ہے کہ جب انسان نیا نیا مسلمان ہوتا ہے تو جذبہ اور شوق و ولولہ بھی زیادہ ہوتا ہے، یہ اسے مسجد میں لے گیا اور کہا کہ میں صبح آؤں گا، میں تمہارے اسلام کا آغاز نمازِ فجر سے کروں گا، نمازِ فجر سے اس کا آغاز ہوا پھر فجر جب تمام ہوئی اور اس نے گھر جانا چاہا تو اس نے کہا کہ نہیں اب مستحباتِ فجر پڑھنے ہیں، مستحبات فجر سے فارغ ہوا تو پھر چاشت کا وقت ہوا، اس نے کتاب کھولی اور کہا کہ اب مستحباتِ وقتِ چاشت ہیں ان میں مشغول رہو، وہ چاشت کے مستحبات سے فارغ ہوا تو ظہر قریب تھی، اس نے کہا کہ اب تو زوال کے مستحبات ہیں، زوال کے بعد پھر فرائضِ زوال شروع ہوئے پھر اسکے بعد تعقیباتِ نمازِ ظہر و عصر اور کرتے کرتے اس بیچارے سے مغرب وعشاء و مستحبات بھی ادا کروا ڈالے، آخر میں جب دن بھر کا بھوکا مسجد میں بیٹھا ہوا مستحبات انجام دے رہا تھا تو عشاء کے بعد اس نے کہا کہ جانے دو کھانا کھائیں گے، اس نے کہا کہ نمازِ شب کا وقت ہوا چاہتا ہے، نمازِ شب پڑھ کر جائیں گے، بہر کیف اس نے جب چوبیس گھنٹے اس کو تمام دین مستحبات سمیت کروا دیا تو اس نے کہا کہ یہ دین آپ لوگوں کے لئے بہتر ہے، میرا کام زیادہ ہے، زندگی ہے، بچے ہیں، کاروبار ہے، میرے لئے وہ پہلا دین بہتر ہے چنانچہ وہ دوبارہ غیر مسلم ہو گیا۔

بیدار عصب کے موانع

ہر چیز کیلیے ایک وقت اور حد ہے، انسان کے لئے مستحبات فراواں ہیں لیکن پہلے انسان یہ شناخت کرے کہ مجھے اصلی کام کیا کرنا ہے، بسا اوقات یہی مستحبات اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں جیسے امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ بعض اوقات مستحبات فرائض کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں، جب مستحبات فرائض کی راہ میں مانع بن جائیں تو آپ فرائض پہ توجہ دو نہ کہ مستحبات پر توجہ دو۔ یہ مستحبات جب فرائض کی راہ میں مانع بن جاتے ہیں تو مستحب بھی نہیں رہتے ہیں کیونکہ ان کا حکم بدل جاتا ہے، پہلے اصلی اور بنیادی کام کرو، اس اصلی کام کے بعد اگر وقت بچتا ہے تو پھر مستحب کام بھی کرو، اب ہم دیکھیں کہ ہمارے بہت سارے کام ایسے ہیں کہ چہ بسا مستحب کام ہوں لیکن ہمیں اصلی کام سے روک دیتے ہیں۔

استادِ بزرگوار حضرت آیت اللہ احمدیؒ کہ چند سال پہلے ان کی رحلت ہوگئی ہے، یہ بزرگوار ماہِ رمضان میں شاہراہِ بازار کے قریب رات کو درسِ اخلاق دیا کرتے تھے، رمضان میں اور طلبہ بھی ان کے درس میں شرکت کرتے تھے لیکن وہ طلبہ کو درس سے اٹھا دیتے تھے کہ جاؤ جا کر مطالعہ کرو، آرام کرو، صبح تم نے درس میں جانا ہے، یہ درسِ اخلاق تو میں عوام کے لئے دے رہا ہوں کہ جو اہلِ علم نہیں ہیں، ان بے چاروں کے پاس دین سمجھنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، یہ دروس تمہارے لئے نہیں ہیں بلکہ تم تو ہو ہی طلابِ دین اور تمہارا کام ہی دین پڑھنا ہے لہٰذا ساری رات بیٹھ کر جب درس سنتے رہو گے، ساری رات یہاں اعمال کرتے رہو گے تو صبح اٹھ کر تم کلاس میں کیسے جاؤ گے؟ جبکہ تمہارا اصلی کام درس پڑھنا ہے۔

اب انسان اصلی کام کو تلاش کرے کہ ہم پیدا کس لئے ہوئے ہیں؟ ہمیں خدا نے اس دنیا میں کس لئے بھیجا ہے؟ پھر لہو کی دنیا اور لہو کی فہرست خود ہی مشخص ہو جاتی ہے کہ کون کونسے امور لہو ہیں؟ پھر اپنے آپ کو دیکھیں کہ میں کس میں غرق ہوں؟ آیا لہو میں غرق ہوں یا عبادت میں غرق ہوں، تحصیلِ علم میں مصروف ہوں یا کسی اور کام میں مشغول ہوں، جیسے اشارہ کیا تھا کہ ہمارا اصلی کام قربِ خدا ہے، لقاءِ پروردگار ہے کہ جس کا دوسرا نام تکامل، ارتقاء اور ترقی ہے یعنی نقص سے کمال کی طرف آنا ہے، قربِ خدا خیالی نہیں بلکہ حقیقی چیز ہے کہ ہم نقص سے کمال کی طرف آئیں، ہمارے نقائص ایک ایک کر کے کمالات میں تبدیل ہونا شروع ہو جائیں یہ اصلی کام ہے۔ اس خلقت کا، اس مخلوق کا یا اس زمین کے اندر عالمِ خلقت میں انسان کا اصلی کام یہی قربِ خداوند تبارک وتعالیٰ حاصل کرنا ہے۔ جو چیز ہمیں اس تکامل میں مدد دیتی ہے وہ اصلی کام ہے اور جو اس میں کوئی مدد نہیں دیتی ہے، رکاوٹ بنتی ہے یا ہمیں اپنی طرف مشغول کیے ہوئے ہے اور اس سے تکامل حاصل نہیں ہوتا ہے وہ لہو ہے اور یہی قابلِ مذمت دنیا ہے۔

اسی طرح فرض کریں کہ ایک تاجر کہیں تجارت کی غرض سے آیا ہے لیکن اس نے آکر دیکھا کہ یہاں پر اور بھی بہت سی سرگرمیاں ہیں اور وہ اپنی تجارت کو بھول کر کسی اور کام میں مشغول ہو جائے مثلاً یہاں پر کسی جگہ قوالی ہو رہی تھی اور وہ قوالی سننے بیٹھ گیا تو یہ قوالی سننا اس کے لئے لہو ہے یا اس نے دیکھا کہ یہاں سے ایک وفد کسی اچھی شخصیت سے ملاقات کے لئے جا رہا ہے اور یہ تجارت چھوڑ کر ملاقات کرنے چلا جائے تو یہ ملاقات اس کے لئے لہو ہے، کیوں؟ کیونکہ اصلی کام

سے جو کام توجہ ہٹادے اس کو لہو کہتے ہیں۔

اگر کوئی طالبِ علم حوزۂ علمیہ میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے آیا ہوا ہے لیکن یہاں پر زائرین کو کرایہ خانے کرائے پر لے کر دیتا ہے تو یہ لہو ہے، کیوں؟ کیونکہ اس کی مشغولیت نے اس کی توجہ اصلی کام سے ہٹالی، یہاں پر تجارت شروع کر دیتا ہے، یہاں پر روابط بڑھانا شروع کر دیتا ہے، یہ لہو ہے، لہو صرف بُرے کام کو نہیں کہتے ہیں بلکہ اگر بذاتاً اچھا کام بھی ہو لیکن اصلی کام سے ہٹا رہا ہو تو یہ لہو ہے۔

فرض کریں کہ آپ کسی کے پاس پیغام پہنچانے کے لئے گئے ہیں لیکن راستے میں آپ کو کسی نے کہا کہ برائے مہربانی سامان اٹھائیں اور میرے گھر تک پہنچا دیں تو یہ بہت اچھا کام ہے لیکن آپ کو اصلی کام سے روک رہا ہے لہٰذا لہو ہے کیونکہ یہ آپ کی بے جا مشغولیت ہے۔اگر وہ برا کام ہے تو اس کے اندر دو بدیاں موجود ہیں، ایک یہ ہے کہ بُرا ہے، حرام ہے اور دوسرا لہو ہے اور اگر اچھا کام ہے تو اس کے اندر ایک برائی ہے اور وہ یہ کہ یہ لہو ہے کیونکہ اس نے مجھے مشغول کر لیا، عموماً ایسا ہوتا ہے کہ آپ بچے کو دکان پر بھیجتے ہیں لیکن بالفرض راستے میں کسی گاڑی پنکچر (Puncture) لگایا جا رہا ہے اور وہ وہیں پر تماشا دیکھنے کیلئے کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ حرام کام نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ کام لہو ہے یعنی وہاں پر اس کی مشغولیت لہو ہے۔

اب ہم دیکھیں کہ ہماری زندگیوں میں کتنا لہو ہے؟ لیکن یہ اس وقت چلے گا کہ جب یہ پتہ چلے کہ آیا کوئی اصلی کام بھی ہے یا نہیں؟ یا یہ سارے کام اصلی ہیں؟ انسان کا صرف ایک کام اصلی

لہو و لعب کے معانی

ہے، وہ کونسا کام ہے؟ وہ قربِ خدا ہے کہ جس کام کے لئے خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے یعنی مقصدِ خلقت پر عمل۔ خدا نے ہمیں ادھورا و ناقص پیدا کیا ہے، اسفل سافلین میں پیدا کیا ہے، اس نقص سے ہمیں کمال تک پہنچنا ہے، تکامل و رشد و ارتقاء ہمارا اصلی کام ہے۔ اب ہمیں بخوبی لہو کی تعریف معلوم ہوگئی ہے کہ لہو کونسی چیزیں ہیں، ہر وہ مشغولیت جو انسان کو تکامل سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کرلے یعنی ہر وہ کام کہ جس سے ہماری رشد نہ ہوتی ہو، ہمارا ارتقاء نہ ہوتا ہو، ہمارا تکامل نہ ہوتا ہو کہ جس کے باعث ہم قربِ خدا کی طرف نہ جائیں تو یہ سارے کام لہو ہیں، خواہ وہ مطالعہ کرنا ہو، پڑھنا ہو، پڑھانا ہو، جو بھی ہو اگر اس کے ذریعے سے ارتقاء نہیں ہو رہا ہے تو یہ لہو ہے اور اگر ساری زندگی انہی کاموں میں گزر جائے، بڑے اچھے اچھے کام کریں لیکن ارتقاء والے کام نہیں کریں تو ساری زندگی لہو میں بسر کی ہے، تجارت و تعلیم بھی لہو ہو جاتی ہے کہ اگر وہ انسان کو ارتقاء نہ دے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ خداوندی میں اس علم سے پناہ مانگی ہے،

أَعُوذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَایَنْفَعُ...... (۱۲)

(اے خدا!) میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو بے فائدہ ہو.....

یعنی وہ علم جو نفع نہیں دیتا ہے، ارتقاء نہیں دیتا ہے اس علم سے میں تیری بارگاہ میں پناہ مانگتا ہوں، وہی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جس کو حکم ہے کہ کہیں

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا○ (۱۳)

اور (آپؐ) کہہ دیا کریں: پروردگارا! میرے علم میں اضافہ فرما۔

یعنی اے نبی ﷺ اپنے خدا سے اپنے علم کی افضونی کی دعا مانگیں لیکن اسی نبی ﷺ نے علم سے پناہ بھی مانگی لیکن کونسے علم سے؟ جو مجھے رُشد وارتقاء عطا نہ کرلے، جولہو ہے، اسی لئے قرآن نے دلوں کے حالات واقسام میں سے ایک قسم مشغول دل بتائی ہے،

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ......(۱۴)

قلوبِ مشغول، شاغل دل، مصروف دل یعنی جن کی اپنے اصلی کام کی طرف سرے سے توجہ ہی نہیں ہے کہ ہم پیدا کیوں ہوئے ہیں؟ چونکہ یہ مطالب عام غیر طلبہ بھی پڑھ رہے ہیں اور انہی کے لئے میں ہر مجلس ومحفل میں کہ جہاں مناسبت ہوتی ہے ہمیشہ یہ عرض کرتا ہوں کہ ہر آدمی اپنے آپ سے ایک سوال کرے کہ جو کچھ میں آج ہوں، جو کچھ میں کر رہا ہوں آیا اسی کے لئے پیدا ہوا تھا؟ بالآخر ہم میں سے کوئی کچھ نہ کچھ کر رہا ہے، کوئی پڑھ رہا ہے، کوئی پڑھا رہا ہے، کوئی کما رہا ہے، کوئی کھیتی باڑی کر رہا ہے، کوئی ملازمت کر رہا ہے، کوئی تجارت کر رہا ہے بالآخر انسان کسی نہ کسی کام میں مشغول ہے یعنی جس میں زندگی کا اکثر حصہ صرف ہو جاتا ہے، وہ یہ سوچے، گمان کرے، اپنے آپ سے سوال کرے اور اس سوال کا جواب تلاش کرے کہ آیا میں اسی کے لئے پیدا ہوا تھا؟ کیا میرا مقصدِ خلقت یہی ہے؟ کیا خدا نے مجھے اس کام کے لئے پیدا کیا تھا؟ پہلے اپنا اصلی کام تلاش کرے کہ ہمارا اصلی کام کیا ہے؟ اس دنیا میں اصلی کام وہی ہے کہ جس کا لُبّ لباب قربِ خدا ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ٥ (۱۵)

اے انسان! تو مشقت اٹھا کر یقیناً اپنے رب کی طرف جانے والا ہے پھر اس سے ملنے

والا ہے۔

یہی انسان کا اصلی کام ہے یعنی اتنے کمالات اور رشد وارتقاء حاصل کرے کہ لقاء اللہ پہ فائز ہو جائے۔ اس سے ہٹ کر ہر کام لہو ہے، مشغولیت وتعلقات انسان کے تعقلات میں مانع ہیں۔ دل ان چیزوں کے کنٹرول اور چنگل میں ہے، دل پر ان چیزوں کی کمند ہے اور جب دل ان چیزوں کا اسیر ہو تو دلِ لہوی خدا سے کیا لو لگائے؟

اکثر ہمارے بڑے اچھے کام بھی لہو ہوتے ہیں، فرض کریں کہ ایک شخص خدمتِ خلق میں لگا ہوا ہے، ویلفیئر (Welfare) میں لگا ہوا ہے، مطالعے میں لگا ہوا ہے اور سیاست میں لگا ہوا ہے تو آپ دیکھیں کہ آیا واقعاً اس سے آپ کو ارتقاء وتکامل حاصل ہو رہا ہے یا اس سے بندگانِ خدا کو ارتقاء نصیب ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہوتا ہے تو یہ لہو ہے، یہ پڑھنا بھی لہو ہے اور یہ پڑھانا بھی لہو ہے مثلاً ایک انسان اگر قرآن پڑھتا اور پڑھاتا ہے لیکن لوگوں کو محض محظوظ کرنے کے لئے کرتا ہے تو یہ لہو ہے، یہ محفلِ قرآن بھی لہو ہو جاتی ہے کہ اگر انسان اس سے ارتقاء پیدا نہ کریں، اگر انسان اس سے رشد حاصل نہ کریں، اگر انسان قرآنی ہدایت پر ایک قدم آگے نہ بڑھائیں تو یہ محفل لہو ہے، یہ درس لہو ہے، یہ گفتگو لہو ہے، یہ سارا مشغلہ لہو ہے اور اس میں انسان کی اکثر عمر تلف ہو جاتی ہے۔ ایسی چیز جو اس کو ایک قدم آگے نہیں بڑھاتی ہے اور ایک قدم بھی ارتقاء نہیں دیتی ہے وہ لہو ہے۔ لہٰذا ایسے لہوی دل رکھنے والے انسانوں کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ

مَنِ اسْتَوٰى يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ...... (١٦)

جس کے دو دن ایک جیسے گزرے جائیں وہ مغبون انسان ہے یعنی نقصان اور خسارے میں ہے، بعض نسخوں میں ہے کہ

مَنْ كَانَ آخِرُ يَوْمِهِ شَرَّهُمَا فَهُوَ مَلْعُوْنٌ......(۱۷)

یعنی جس کے دن کا اختتام بدترین ہو پس وہ ملعون ہے......

وہ انسان ملعون ہے، محروم ہے کہ جس کے دو دن ایک جیسے گزر جائیں، یہی لہوی انسان ہے۔ قرآن مجید نے ہماری توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی ہے کہ حضورِ دل کیسے پیدا ہوتا ہے؟ پہلے تم دل کو تو آزاد کراؤ پھر حضورِ قلب حاصل ہوگا، یہ ادب انسان کو اس وقت حاصل ہوگا کہ پہلے انسِ قرآن کے ساتھ حاضر ہو اور دوم یہ کہ دل کے تعلقات اور مشغولیات کم ہو جائیں یا ختم ہو جائیں، دل آزاد ہو جائے، دل فقط خدا کے لئے ہو، حرمِ خدا فقط خدا کے لئے ہو، عرشِ خدا فقط خدا کے لئے ہو، انسان اس عرش سے جنوں کو اور شیاطین کو نکالے چونکہ ابھی اس عرش پر شیاطین کا قبضہ ہے۔

۹) قرآن کے مطابق کونسی چیزیں الٰہا ہیں؟

قرآن کریم کی فراواں آیات میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کونسی چیزیں الٰہا ہیں؟ کونسی چیزیں دل کو مشغول کرتی ہیں؟ اس سلسلے میں چند آیات ملاحظہ کرتے ہیں پھر مفاتیح الغیب کا متن دیکھتے ہیں، ان میں سے ایک سورۂ مبارکہ تکاثر میں ہے کہ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ (۱۸)

تمہیں باہمی مقابلۂ کثرتِ مال واولاد نے غافل بنادیا۔

کثرت طلبی نے تمہیں مشغول کیا ہوا ہے، یہ تمہارا لہو ہے، کثرت طلبی یعنی ضرورت سے بڑھ کر، ہر وہ چیز کہ جس کی قلیل مقدار سے ہماری ضرورت پوری ہو جائے لیکن ہم اس ضرورت سے مازاد کو بھی طلب کر رہے ہیں تو یہ تکاثر ہے، فرض کریں کہ ہمیں کوئی چیز ایک کلو چاہئے لیکن ہم ایک من خریدیں تو یہ تکاثر ہے، ایک کلو سے آپ کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے لیکن ایک من خریدنا تکاثر ہے، اگر آپ کی ضرورت ایک سو روپے سے پوری ہوتی ہے تو ہزار روپیہ تکاثر ہے، اس وقت انسان ضرورتوں میں نہیں ہے بلکہ تکاثر میں مشغول ہے۔

ہر سال اعلان ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس اعلان سے زشت، برا اور گندا اعلان شاید اور کوئی نہ ہو، وہ اعلان یہ ہوتا ہے کہ اس سال دنیا کے ملینرز (Millionaires) کون ہیں؟ پہلے تو ملینرز ہوتے تھے ابھی بلینرز (Billionaires) کا اعلان ہوتا ہے، پوری دنیا میں ہر سال ایک فہرست کا اعلان ہوتا ہے کہ اس وقت مثلاً سو بڑے بلینرز کون کونسے ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں کہ جو تکاثر میں مشغول ہیں، جتنی پلیدگی اس اعلان کے اندر ہے کہ ان لوگوں کو آپ دنیا کے سامنے آئیڈیل (Ideal) بنا کر پیش کرتے ہو جو تکاثر میں مشغول ہیں یعنی یہ وہ جونکیں ہیں کہ جنہوں نے تمام انسانیت وبشریت کا اپنے وزن سے کہیں زیادہ خون چوس لیا ہے۔ بعض نے اتنا پیسہ جمع کیا ہوا ہے کہ اگر ان کی سو نسلیں بھی بغیر کمائی کے فقط کھاتی رہیں تو ختم نہیں ہوگا لیکن پھر بھی اس تکاثر میں

مشغول ہیں۔ جس کو سو کی ضرورت ہے وہ ہزار کما رہا ہے، جس کو ہزار کی ضرورت ہے وہ لاکھ کما رہا ہے اور جس کو لاکھ کی ضرورت ہے وہ کروڑ کما رہا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس کی ضرورت سو ہے اس کو ایک روپیہ بھی میسر نہیں ہے،

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ○

تمہیں باہمی مقابلۂ کثرتِ مال و اولاد نے غافل بنا دیا۔

ہر چیز میں تکاثر ہے، میری کتابیں اس سے زیادہ ہوں یہ تکاثر ہے یعنی اتنی رکھو کہ جتنی آپ کی ضرورت ہے۔ ہمارے گروہ میں، ہماری حزب میں لوگ زیادہ ہوں، اتنے لوگ رکھو کہ جتنی ضرورت ہیں، اتنا مال کماؤ کہ جتنی آپ کی ضرورت ہے، اتنے وسائل فراہم کرو کہ جتنی آپ کی ضرورت ہے لیکن ضرورت سے زیادہ تکاثر ہے اور تکاثر لہو ہے، قرآن نے فرمایا کہ تکاثر لہو ہے، پھر اسی سورہ کی آیہ ۲ میں فرمایا کہ

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○

یہاں تک کہ تم نے قبروں سے ملاقات کرلی۔

اسکا ایک معنیٰ یہ کیا گیا ہے کہ اسی کثرت طلبی میں مشغول رہتے رہتے حتیٰ نوبت قبر تک آگئی اور مر گئے۔ ایک معنیٰ یہ بھی کیا گیا ہے کہ چونکہ عرب زیادہ نسب پر فخر و ناز کرتے تھے کہ ہمارے قبیلے میں اتنے لوگ ہیں، ہمارے سردار وہ ہیں اور یہ جاہلیت کا عنصر تقریباً اس وقت بھی ساری دنیا میں موجود ہے، مسلمانوں کے اندر بھی موجود ہے، جو گندا سیاست دان بڑا معروف ڈکیت ہوتا ہے وہ کہتا

قرآن کے مطابق کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی گئی

ہے کہ یہ ہمارے خاندان سے ہے، ہمیں سن کر شرمندگی ہوتی ہے اور انہیں کہہ کر بھی نہیں ہوتی ہے، عموماً برے سیاستدان کہ جن کے نام میڈیا کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم فلاں خاندان سے ہیں، یہی عربوں کے اندر تھا، فلاں شاعر ہمارے خاندان سے ہے، فلاں سردار خاندان سے ہے، اس طرح سے آپس میں بیٹھ کر راتوں کو گپ لگاتے تھے اور تکاثر ذکر کرتے تھے کہ یہ بھی ہمارا ہے، وہ بھی ہمارا ہے، جس طرح ابھی مدرسوں کے طلبہ بیٹھ کر تکاثر ذکر کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے مدرسے کا ہے، یہ بھی ہمارے مدرسے کا ہے۔ جب زندہ ختم ہو جاتے ہیں تو مردوں پہ آ جاتے ہیں کہ فلاں مُردہ بھی ہمارے خاندان سے ہے۔

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝

تمہیں باہمی مقابلۂ کثرتِ مال و اولاد نے غافل بنا دیا۔ یہاں تک کہ تم نے قبروں سے ملاقات کر لی۔

یعنی زندوں کو گن گن کے جب ختم ہو جاتے ہیں تو قبریں گننا شروع کر دیتے ہیں، پس ساری زندگیاں اس کے اندر تلف ہو جاتی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ خدا سے توجہ ہٹ جاتی ہے یعنی اصلی کام سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ جب انسان کثرت طلبی شروع کر دیتا ہے تو اصلی کام بھول جاتا ہے، سورۂ منافقون میں مومنین کو اسی نکتے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خیال رکھنا مبادی اس ہلاکت میں نہ پڑ جانا، لہو والھا میں نہ پڑنا۔

سورہ منافقون کی آیہ ۹ میں ہے کہ

قرآن کے مطابق کون کون سی چیزیں الھا ہیں؟

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ......

ایمان والوں خبردار تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں یادِ خدا سے غافل نہ کردے......

لَا تُلْهِكُمْ......

یعنی مشغول نہ کردیں کہ اولاد میں اتنا مشغول ہو جاؤ، بعض اسی طرح سے غرق در اولاد ہیں کہ پہلے خدا خدا کرتے تھے کہ بیٹا دے اور اب بیٹے میں یا اولاد میں اس قدر مشغول ہیں کہ خدا یاد نہیں آتا ہے، پہلے جب بچہ تھا تو اس طرح سے اس میں مشغول تھے، جب بڑا ہوا تو ایک اور طرح سے اس میں مشغول ہو گئے، جب جوان ہوا تو ایک اور طرح سے مشغول ہو گئے، ساری عمر اولاد میں مشغول ہیں،

لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ......

یہ پیسہ، یہ بینک بیلنس (Bank balance)، یہ کارخانے، یہ فیکٹریاں، یہ اٹا ہوا جمع شدہ مال اور یہ سب کچھ تمہارے لئے الھا اور لہو نہ بنیں کہ تم خدا کو بھول جاؤ، اسی آیہ میں ایمان لانے والوں سے فرمایا کہ کون خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ o

ایمان والوں خبردار تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں یادِ خدا سے غافل نہ کردے کہ جو ایسا کرے گا وہ یقیناً خسارے والوں میں شمار ہوگا۔

قرآن کے مطابق کونسی چیزیں الھا ہیں؟

وہ انسان خسارے میں ہے کہ جو اولاد اور مال میں غرق ہے اور پھنس گیا ہے، آپ توجہ کریں کہ الھا انسان کے ساتھ کیا کرتا ہے، سورۂ جمعہ میں مومنین کو عبادت کا حکم ہے کہ خدا کی طرف آئیں لیکن آخر کس طرح انسان کا دل بارگاہِ خدا میں حاضر ہو، آیت ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں ہے کہ

يَـا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o وَاِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ o

ایمان والو! جب تمہیں جمعے کے دن نماز کے لئے پکارا جائے تو ذکرِ خدا کی طرف دوڑ پڑو اور کاروبار بند کردو کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جاننے والے ہو۔ پھر جب نماز قائم ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور فضلِ خدا کو تلاش کرو اور خدا کو بہت یاد کرو کہ شاید اسی طرح تمہیں نجات حاصل ہو جائے۔ اور اے پیغمبر یہ لوگ جب تجارت یا لہو ولعب کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو تنہا کھڑا چھوڑ دیتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجئے کہ خدا کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کھیل اور تجارت سے بہرحال بہتر ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

یعنی مشغلے ترک کردو اور جمعے کے دن بارگاہِ خدا میں حاضر ہو جاؤ، لیکن یہی لوگ جو نمازِ جمعہ میں موجود ہوتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت یا اقتداء میں جمعہ ہوتا تھا کہ جیسے ابھی ہوتا ہے

قرآن کے مطابق کونسی چیز دل کو الھا ہیں؟

کہ نمازِ جمعہ کے باہر جمعہ بازار لگتا ہے، جہاں یہ چھابڑی فروش آکر کھڑے ہوتے ہیں اور آوازیں لگا رہے ہوتے ہیں، اسی طرح مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آکر یہ اپنی بساط بچاتے تھے اور مختلف علاقوں سے آتے تھے، کوئی کھجور بیچ رہا ہے، کوئی پیاز بیچ رہا ہے اور بولیاں لگاتے تھے مثلاً سستا ہو گیا، ختم ہونے والا ہے، دوڑ کر آؤ، جلدی آؤ، بعض ایسے تھے کہ جو نماز کی نیت میں ہوتے تھے لیکن پہلی رکعت میں وہیں سے جمعہ چھوڑ کر کھجوریں خریدنا شروع کر دیتے تھے،

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا......

تجارت یا کوئی مصروفیت و مشغولیت باہر دیکھتے تھے کہ باہر کوئی شور و غل کر رہا ہے تو یہ جمعہ چھوڑ کر باہر چلے جاتے تھے،

انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا......

اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جمعے میں تنہا چھوڑ دیتے تھے،

بعض ایسے ہیں جو جمعے میں گاڑی باہر کھڑی کر کے آتے ہیں اور اس میں مثلاً جس کو فارسی میں دُزدگیر کہتے ہیں یعنی سائرن (Siren) بھی لگا کر آتے ہیں، بعد میں کوئی بلی کسی بھی گاڑی سے ٹکرائے اور سائرن بجنا شروع ہو تو جمعے میں سب کے دل دھڑکنا شروع ہو جاتے ہیں، اب اُدھر سے وہ سورۂ جمعہ بھی پڑھنی ضروری ہے اور ادھر سے کوئی توجہ بھی نہیں ہے، ساری توجہ یہ ہے کہ گاڑی کو ہی نہ لے جائیں چونکہ سائرن بج رہا ہے، معلوم نہیں کہ کس کی گاڑی کا سائرن بج رہا ہے، ساری توجہ گاڑی پر ہے پھر کہتا ہے کہ نمازِ جمعہ میں حضورِ قلب نہیں ہوتا ہے، حضورِ قلب کیسے ہو؟ جب دل گاڑیوں کے

اندر مشغول ہے، جب دل اس شور و غوغا کی طرف مشغول ہے۔

موبائل آن (On) کر کے جیب میں ڈالا ہوا ہے، نمازِ جمعہ ہو رہی ہے اور اُدھر سے اس کو وائبریشن (Vibration) پہ لگایا ہوا ہے اور بعض کو تو یہ بھی یاد نہیں رہتا ہے کہ نماز میں اس کو سائلنٹ (Silent) کر دیں یا موبائل ہی آف کر دیں، نہیں بلکہ ضروری کال آنی ہے، تجارتی کال آنی ہے، گھر سے کال آنی ہے اور وہ منتظر ہے، نماز میں بھی ٹیلیفون کا منتظر ہے کہ کب گھنٹی بجتی ہے لہذا کس طرح سے حضورِ دل ہو؟ یہ دلِ لہوی، یہ دلِ مشغول، یہ دلِ مرتبط، یہ دلِ متعلق کہ جس کا ہر چیز سے تعلق ہے یہ کس طرح سے حاضر ہو؟ یہ تو نماز سے بھاگتا ہے، اس کو ہم کس طرح قائم رکھیں؟ جب تک یہ لہو ختم نہ ہو، یہ تعلقات ختم نہ ہوں تو ممکن نہیں ہے۔

۱۰) لھو و الھا کے دیگر مصادیق

☆لعب میں مشغول دل

جیسے پہلے اشارہ ہوا تھا کہ قرآن نے فراواں آیات میں دلوں کی مثبت اور منفی حالتیں ذکر کی ہیں، ان میں سے ایک حالت سورہ مبارکہ انبیاء میں ذکر کی ہے،

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ o

اِقۡتَـرَبَ لِـلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ o مَـا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ o لَاهِيَةً قُلُوۡبُهُمۡ وَاَسَرُّوا النَّجۡوَى الَّذِيۡنَ

ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَo (۱۹)

لوگوں کے لئے حساب کا وقت آپہنچا ہے اور وہ ابھی غفلت ہی میں پڑے ہوئے ہیں اور کنارہ کشی کئے جا رہے ہیں۔ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نئی یاددہانی نہیں آتی ہے مگر یہ کہ کان لگا کر سن لیتے ہیں اور پھر کھیل تماشے میں لگ جاتے ہیں۔ ان کے دل بالکل مشغول ہوگئے ہیں اور یہ ظالم اسی طرح آپس میں راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے ہیں کہ یہ بھی تو تمہارے ہی طرح کے ایک انسان ہیں، کیا تم دیدہ و دانستہ ان کے جادو کے چکر میں آرہے ہو۔

یعنی جب قیامت آئے گی تو کچھ غفلت میں ہوں گے اور جو ذکر بھی خدا کی طرف سے اترتا ہے یہ اس کو سنتے ہیں، اس کو ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ لعب میں مشغول ہوتے ہیں،

وَهُمْ يَلْعَبُوْنَo

یہ کھیل کود میں مشغول ہوتے ہیں،

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ......

ان کے دل لہوی ہیں، لہوی یعنی دلِ مشغول، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم مصروف ہیں، ہم بہت مشغول اور بزی (Busy) ہیں، جب ان سے کہو کہ مسجد میں کیوں نہیں آتے ہو؟ کہتے ہیں کہ کام تھا، عموماً یہی جواب ہوتا ہے، روزہ کیوں نہیں رکھا؟ کہتے ہیں کہ کام تھا، انسان کے یہ کام اتنے زیادہ ہیں کہ اسے ایک لحظے کے لئے بھی فرصت نہیں ہے کہ خدا کی طرف آئے اور یادِ خدا کرے۔ یہ قلوبِ لہوی ہیں یعنی سرگرمیوں میں یا معمولاتِ زندگی میں مشغول ہیں یا اپنے لئے

☆ لہوی یعنی مشغول دل

انہوں نے الگ سے سرگرمیاں بنالی ہیں۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ۝

اور یہ ظالم اسی طرح آپس میں راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے ہیں کہ یہ بھی تو تمہارے ہی طرح کے ایک انسان ہیں کیا تم دیدہ ودانستہ ان کے جادو کے چکر میں آ رہے ہو۔

ان لوگوں پہ انبیاءؑ کا، انبیاءؑ کے کلام کا، ادیان کا اور موعظہ وتبلیغ کا اثر کیوں نہیں ہوتا ہے؟ چونکہ ان میں اکثریت کے دل لہوی ہیں، اکثر لوگوں کے دل غرق ہیں، اسی تجارت کے اندر، مال کے اندر، تکاثر کے اندر، جہاں طلبی کے اندر، خودخواہی کے اندر اور خودغرضی کے اندر مشغول ہیں، یہ دل کس طرح سے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں؟ کس طرح سے یہ دل حضور کے ساتھ قرآن پڑھیں؟ دل مرکزِ نزولِ قرآن و مرکزِ فہمِ قرآن ہیں، قلبِ لہوی تو ہرگز قرآن فہمی کے قابل نہیں ہے، یہ سب سے بڑا مانع اور رکاوٹ ہے۔

☆کھانے پینے میں مشغول دل

☆کھانے پینے میں مشغول دل

دل قرآن پڑھتے ہوئے کیوں حاضر نہیں ہوتے ہیں؟ نماز میں اور مطالعے کے اندر حضورِ قلب کیوں نہیں ہے؟ سورہ حجر میں فرمایا کہ

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۝ ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ

الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ٥ (٢٠)

ایک دن آنے والا ہے جب کفار بھی یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہم بھی مسلمان ہوتے۔انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کھائیں، پئیں اور مزے اڑائیں اور امیدیں انہیں غفلت میں ڈالے رہیں عنقریب انہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

بعض اوقات ان کافروں کو یہ گمان گزرتا ہے کہ اے کاش یہ بھی مسلمان ہوتے، جب مسلمانوں کے پاس کوئی نعمت دیکھتے ہیں یا مسلمانوں کی مثبت حالت کو دیکھتے ہیں تو بھی بسا اوقات ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اے کاش ہم بھی مسلمان ہوتے، جس طرح یہی دنیا دار لوگ جب کبھی کسی ایک دینی شخصیت، کسی اچھے انسان کو دیکھتے ہیں تو کبھی کبھار ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اے کاش ہم بھی ایسے ہوتے، ہم بھی متدین ہوتے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خداوند نے فرمایا کہ آپ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں، اور یہ لوگ کیا کریں؟

يَأْكُلُوْا......

کھاتے پیتے رہیں، ان کو چرنے دو، یہ چرنے کے لئے آئے ہیں۔

☆لذتوں میں مشغول دل

سورۂ حجر کی اسی آیہ میں مزید فرمایا کہ

وَيَتَمَتَّعُوْا ....

ان کو لذتیں اٹھانے دو، ان کا مقصد زندگی میں فقط لذتیں اٹھانا ہے،

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

بعض کا فلسفہ زندگی لذت ہے، بہت قدیم زمانے میں ایک گریک (Greek) حکیم نے یہ تفسیر کی تھی کہ انسان کی زندگی کا اصلی فلسفہ وحکمتِ انسان لذت ہے کہ جس کو آج بھی اپکوریانزم (Epicureanism) کہتے ہیں، اپکورس نے زندگی کی لذت کو مقصدِ خلقتِ انسان قرار دیا تھا، اس کے بعد پھر بعض دوسرے مغربی آئے اور انہوں نے بھی اسی نظریے کو اپنے اپنے انداز سے پیش کیا کہ زندگی کا مقصد فقط لذت حاصل کرنا ہے، قرآن نے بہت پہلے ان سے کہہ دیا تھا کہ ان مغربیوں میں بعض ہیں کہ جن کی اپنی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ لذت محسوس کریں۔

انسان کی فراواں خواہشات وشہوات ہیں اور اگر خواہشات وشہوات کو کوئی بھڑکا دے اور اُبھار دے تو ان میں ایک ہیجان آجاتا ہے، جیسے مخصوصاً مغربی کلچر ایسا بھڑکیلا ہے کہ اس کلچر اور تہذیب کا ہدف فقط شہوات ہیں، یہ شہوانی تہذیب ہے، اسی لئے علامہ اقبالؒ نے مغربی تہذیب کا نام شہوانی تہذیب تجویز کیا ہے، بعض بزرگوں کے بقول ان کی آدھی انڈسٹری (Industry) شہوات بھڑکانے کا سامان پیدا کرتی ہے اور آدھی انڈسٹری بھڑکی ہوئی شہوات کی تسکین کا سامان پیدا کرتی ہیں، میڈیا (Media)، انٹرنیٹ (Internet) مختلف چیزیں اور در و دیوار انسان کے اندر سوئی ہوئی خواہشات، مری ہوئی خواہشات اور شہوات کو ابھارنے میں مشغول ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے کے انسانوں کے اندر خواہشات کا ایک طوفان مچا ہوا ہوتا ہے حتیٰ اس وقت دیکھیں کہ

☆ لذتوں میں مشغول دل

چھوٹے چھوٹے بچوں، نابالغ بچوں کے اندر وہ خواہشات پیدا ہوتی ہیں کہ جو کسی زمانے میں بہت بالغ لوگوں کے اندر بھی پیدا نہیں ہوتی تھیں، یہ تہذیب اور ماحول کی وجہ سے ہوا ہے اور اس کے پیچھے اپیکورس کا وہی نظریہ کارفرما ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں، یہ کیا کریں؟ یہ چرتے رہیں، کھاتے پیتے رہیں اور لذت اٹھاتے رہیں۔

☆آرزوؤں میں مشغول دل

اسی آیہ کے اگلے حصے میں فرمایا کہ

وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ......

اور ان کو اپنی آرزوئیں مشغول رکھیں، تجارت، مال، اولاد، بیع اور لہو کی فہرست میں قرآن نے ایک اور چیز کا اضافہ کر دیا کہ جس میں انسان مشغول رہتا ہے اور یہ امل خالصتاً قلبی و ذہنی مشغولیت ہے، امل یعنی آرزوئیں، وہی نکتہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ دو چیزوں کا خطرہ ہے،

اِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيَ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْأَمَلِ......(۲۱)

میں اپنی اُمّت کے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف رکھتا ہوں وہ ہوائے نفس کی پیروی اور لمبی امیدیں رکھنا ہے......

لمبی آرزوؤں کو اگر عام زبان میں استعمال کریں تو کہیں گے کہ شیخ چلی کے

منصوبے۔ ملا نصیر الدین کی طرح شیخ چلی بھی فرضی شخصیت ہے، اگر اس کی وضاحت کروں تو آپ کہیں گے کہ ہم نے تو ایسے بہت دیکھیں ہیں جو ابھی بھی موجود ہیں، شیخ چلی ایک تخیلاتی انسان تھا، خیالی منصوبے اور خیالی پلاؤ بناتا تھا اور خیالی لمبی آرزوئیں بنا کر اسی میں مصروف رہتا تھا، اس کا انڈوں کا کاروبار تھا یعنی انڈے خریدتا تھا اور بیچتا تھا، ایک دن اس نے ایک لمبا کاروباری منصوبہ بنایا کہ آج میں انڈے بیچتا ہوں تو کل میرا یہ بزنس (Business) بڑھے گا اور چمکے گا، پھر میں مزید مرغیاں خریدوں گا، پھر وہ اور زیادہ چمکے گا اور پھر میں اس کے بعد بکریاں خریدوں گا اور بکریوں کا فارم جب بہت بڑھے گا تو پھر میں گائیں خریدوں گا اور پھر اس طرح کرتے کرتے انڈسٹری لگاؤں گا اور اس کے بعد میں بڑا مالدار اور سرمایہ دار انسان بن جاؤں گا اور جب بہت زیادہ سرمایہ میرے پاس ہوگا تو اس وقت میں بادشاہ کی لڑکی سے شادی کروں گا، وہ میرا سرمایہ دیکھ کر مجھے رشتہ دے دے گا چونکہ بادشاہ ایسے ہوتے ہیں کہ جو لالچی ہوتے ہیں، کہا کہ پھر وہ شہزادی میرے گھر میں آجائے گی اور جب میں دن بھر اپنی انڈسٹری (Industry) سے تھکا ہوا اپنے گھر آؤں گا اور آکر اس سے پوچھوں گا کہ کھانا پکایا ہے یا نہیں پکایا ہے تو وہ بھی تو معمولی نہیں ہے، وہ بھی شاہ کی بیٹی ہے اور شہزادی ہے، وہ کب میرے لئے کھانا پکائے گی اور اس بات پہ کہ اس نے کھانا نہیں پکایا میں غصے میں آجاؤں گا اور غصے میں آکر اسے لات ماروں گا، جب اس نے زور سے لات ماری تو وہ انڈوں کی ٹوکری وہیں الٹ گئی، اس کو کہتے ہیں شیخ چلی۔

اب غور کریں کہ کتنے لوگ شیخ چلی ہیں؟ شادی نہیں کی اور انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں،

☆ آرزوؤں میں مشغول دل

شادی کیوں نہیں کرتا؟ کیونکہ ابھی اس انتظار میں ہے کہ میرا اقامہ لگے گا، اقامہ لگنے کے بعد پھر میں پڑھوں گا، پھر اس کے بعد ایک بہت بڑا خطیب بنوں گا، پھر میری شہرت ہو گی اور میری سی ڈیز بکیں گی، پھر میرے چرچے ہوں گے، پھر مجھے لوگ آفر کریں گے اور میں بہت بڑے آیت اللہ کی بیٹی سے شادی کروں گا، پھر اس کے بعد میں تقریر کر کے تھکا ہوا گھر میں آؤں گا اور کھانا مانگوں گا، پھر وہ کھانا نہیں پکائے گی تو میں اس کو لات ماروں گا، اس کے بعد ٹوکرا وہیں پر الٹ جاتا ہے اور اگلے مہینے کہتا ہے کہ چلو چلتے ہیں، تھک گئے ہیں لیکن اقامہ نہیں ملا۔ یہی شیخ چلی ہے۔

اسی طرح آپ دیکھ لیں کہ عملی دنیا میں بھی لوگ ایسے ہی ہیں، آرزوؤں کیلئے فرائض ترک کئے ہوئے ہیں، بیٹا یورپ و امریکا جائے گا اور وہاں سے ڈگری لے کر آئے گا تو پھر اس کی شادی کریں گے۔ پاکستان میں ایک اسکول ہے اور دنیا بھر میں اس اسکول کی برانچز (Branches) ہیں کہ جہاں پر یہ بات شرم آور بھی ہے کہ جوں ہی بچے کا نطفہ منعقد ہوتا ہے تو اسی وقت اسکول میں اس کا ایڈمیشن (Admission) کرانا ہوتا ہے کیونکہ ولادت کے بعد جگہ نہیں ملے گی یعنی ابھی بچے کا نطفہ منعقد ہوا ہے اور آپ اسکول میں جا کر اس کا نام لکھوائیں کہ یہ بچہ جب پیدا ہو گا اور پیدا ہونے کے بعد پانچ سال کا ہو گا تو پھر اس اسکول میں آ کر پڑھے گا اور لوگ پچیس ہزار ایڈوانس دے کر اس کا اسکول میں نام لکھواتے ہیں، یہ شیخ چلی کے منصوبے ہیں، پھر بیٹا پیدا ہوتا ہے، پڑھتا ہے، پھر یورپ میں جاتا ہے اور ماں اِدھر لڑکی ڈھونڈ کے رکھتی ہے اور جب وہ پڑھ لکھ کر نوکری کر کے واپس آتا ہے تو ساتھ بیوی اور پانچ چھے بچے بھی لے کر آتا ہے، شیخ چلی کا منصوبہ وہیں پر ناکارہ

ہو جاتا ہے۔

لوگوں نے انہی آرزوں کے اندر زندگیاں ترک اور ضائع کر دی ہیں، خیالی اور من گھڑت پلاؤ پکاتے ہیں، بعض رہتے ہی خیال کی دنیا میں ہیں، حقائق کی دنیا میں نہیں آتے ہیں چونکہ خیالی دنیا میں بہت لذت ہے، خیالی دنیا میں انسان عالمِ خیالات کا فرماں روا ہوتا ہے چونکہ ساری اپنی بنائی ہوئی صورتیں ہیں لہٰذا ان کا حاکم ہوتا ہے اور ان صورتوں کو جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے، آرزوئیں ایسے ہی بنتی ہیں اور ایسے ہی ٹوٹ بھی جاتی ہیں،

☆ آرزوؤں میں مشغول دل

وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ......

ان کو آرزوئیں مشغول رکھیں، آرزو پسند و آرزو زدہ انسان عبادت میں کبھی بھی حضورِ قلب پیدا نہیں کرسکتا ہے، قرآن کو توجہ سے نہیں پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کا دل مشغول ہے۔

سورہ لقمان کی آیہ ۶ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ○

لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو مہمل باتوں کو خریدتا ہے تا کہ ان کے ذریعے بغیر سمجھے بوجھے لوگوں کو راہِ خدا سے گمراہ کرے اور آیاتِ الٰہیہ کا مذاق اڑائے، درحقیقت ایسے ہی لوگوں کے لئے درد ناک عذاب ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو باقاعدہ خریدتے ہیں، کسب کرتے ہیں، حاصل کرتے ہیں لیکن کیا

چیز؟

لَهْوَ الْحَدِيْثِ......

یعنی مشغول کن باتیں، ایسی باتیں جو لوگوں کو مشغول کریں، یہ جو یہاں پر تقریریں تیار کرتے ہیں اور نعرے کیلئے چٹکلے نکتے بناتے رہتے ہیں، بیٹھ کر کاپیوں کی کاپیاں بھرتے ہیں، انہی میں سے ایک کہ جنہوں نے تقریروں کی کاپیاں تیار کی ہوئی تھیں ان کو بارڈر (Border) پہ پولیس نے پکڑ لیا کہ آپ کے پاس کتابیں زیادہ ہیں تو انہوں نے کاپی اٹھا کر کہا کہ باقی لے لو یہ کاپی ہم سے نہیں لینا، پولیس والے نے بھی مذاق کیا اور کہا کہ ہمیں یہ کاپی ہی چاہئے کہ جو آپ کے پاس ہے، چونکہ اس کی ساری زندگی کا سرمایہ تھا، اس کے اندر نکتے لکھے ہوئے تھے، اس کے اندر تقریریں سن کر، کیسٹیں سن کر، اِدھر اُدھر ذاکروں کی اور خطیبوں کی سُن کر نکتے جمع کیے ہوئے تھے، پولیس نے کہا کہ ان سارے نکتوں کا کیا کریں گے، چٹکلے کیوں لکھے ہوئے ہیں؟ کہا کہ یہ مجلس میں پڑھیں گے، مومنین نعرے لگائیں گے، یہ لہوالحدیث ہے، خود ہدایت پاؤ تا کہ کسی کی ہدایت کرسکو، بارگاہِ خدا میں خود حاضر رہو تا کہ کسی اور کو بھی حاضر کرسکو، جب ہم خود ہی غیر حاضر ہیں تو ہم کسی کو کیا عبادت کا مزہ چکھا سکتے ہیں، ہمارے کہنے پر کس کو عبادت میں کیا لذت آئے گی، جب ہم خود تمتع میں مشغول ہیں، لذتیں اٹھانے میں مشغول ہیں، ذہنی لذتیں اٹھانے میں مشغول ہیں۔

پس دیکھیں کہ قرآن نے کتنی چیزوں کو الھا کہا ہے؟

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝

☆ آرزوؤں میں مشغول دل

تمہیں باہمی مقابلۂ کثرتِ مال واولاد نے غافل بنادیا۔

اِعۡلَمُوۡا اَنَّمَا الۡحَیَاۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّلَہۡوٌ وَّزِیۡنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَتَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ......(۲۲)

یادرکھو کہ زندگی دنیا صرف ایک کھیل، تماشہ، آرائش، باہمی تفاخر اور اموال و اولاد کی کثرت کا مقابلہ ہے اور بس......

یَا اَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُلۡہِکُمۡ اَمۡوَالُکُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخَاسِرُوۡنَ ۝

اے ایمان والوں خبردار تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں یادِ خدا سے غافل نہ کردے کہ جوایسا کرے گا وہ یقیناً خسارہ والوں میں شمار ہوگا۔

☆ آرزوؤں میں مشغول دل

تکاثر الھا ہے، اولاد الھا ہے، اموال الھا ہیں، تجارت الھا ہے، بیع الھا ہے، آرزوئیں الھا ہیں، ہمارے دل سخت مشغول ہیں اور پھران دنوں کے سامنے رمضان آجاتا ہے، اب رمضان میں ذرا مسجد میں بھی جانا ہے لیکن مسجد میں دل حاضر نہیں ہورہا ہے، آخر کیسے ہوگا؟ آپ نے اس کو مسجد میں پھنسادیا ہے، یہ توفوراً کہتا ہے کہ جاؤ ڈرامہ دیکھو، جاؤ جاکرٹی وی دیکھو، گپ شپ لگاؤ۔

پس جب تک اسبابِ حضور نہ ہوں تو دل کا حضور ممکن نہیں ہے اور تینوں میدانوں کے اندر یعنی عبادت کے اندر، مطالعہ کے اندر اور قرآن پڑھتے ہوئے فہم کے لئے اس دل کو آزاد کرائیں، مشغولیتوں سے آزاد کرائیں اور عبادت، قرآن اور علم کے ساتھ انس پیدا کرائیں، دلِ مانوس

درحقیقت حضور چاہتا ہے، جہاں انس نہ ہوتو حضور اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔

۱۱) دنیا کسے کہتے ہیں؟

سورۂ عنکبوت، سورۂ محمدؐ اور سورۂ انعام میں دنیا کی تعریف کی گئی ہے یعنی دنیا کو پہچنوایا گیا ہے کہ دنیا کس کو کہتے ہیں؟ اور لوگوں کے پاس دنیا کا بہت ہی مبہم مفہوم ہے، بعض سمجھتے ہیں کہ دنیا سے مراد زندگی ہے، بعض سمجھتے ہیں کہ دنیا سے مراد معیشت ہے، بعض سمجھتے ہیں کہ دنیا سے مراد یہ عالمِ مادہ ہے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی فہم کے مطابق دنیا کی تفسیر کی ہے درحالیکہ قرآن نے بقدرِ کافی واضح طور پر دنیا کو متعارف کروایا ہے کہ دنیا کیا ہے؟ دنیا کی تعریف کی ہے، تعریف سے مراد اُردو والی تعریف نہیں ہے، اردو میں تعریف سراہنے کو کہتے ہیں، تعریف یعنی ڈیفنیشن (Definition) کی ہے، قرآن نے دنیا کی وضاحت وتفسیر کی ہے، اسے کھول کر بیان کیا ہے کہ وہ دنیا جس کی مذمت کی گئی ہے کونسی دنیا ہے؟ البتہ اس سلسلے میں بہت ساری آیات ہیں،

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۝(۲۳)

اور یہ زندگانیٔ دنیا ایک کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں ہے اور آخرت کا گھر ہمیشہ کی زندگی کا مرکز ہے اگر یہ لوگ کچھ جانتے اور سمجھتے ہوں۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا

یَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ○ (٢٤)

یہ زندگانی دنیا تو صرف ایک کھیل تماشہ ہے اور اگر تم نے ایمان اور تقویٰ اختیار کر لیا تو خدا تمہیں مکمل اجر عطا کرے گا اور تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ (٢٥)

اور یہ زندگانی دنیا صرف کھیل تماشہ ہے، اور دار آخرت صاحبانِ تقویٰ کے لئے سب سے بہتر ہے۔ کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے۔

دنیا کسے کہتے ہیں

دنیا کس چیز کا نام ہے؟ کیا گھر کو دنیا کہتے ہیں؟ مال کو دنیا کہتے ہیں؟ وسائلِ زندگی کو دنیا کہتے ہیں؟ معیشت کو دنیا کہتے ہیں؟ نا، یہ دنیا نہیں ہے، دنیا لہو ولعب ہے یعنی یہ تمہاری مشغولیتیں، یہ تمہارے تعلقات دنیا ہیں، جن چیزوں کے تم اسیر ہو مثلاً انگوٹھی دنیا نہیں ہے بلکہ انگوٹھی سے تمہارا تعلق دنیا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ○ (٢٦)

لوگوں کے لئے خواہشاتِ دنیا، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، تندرست گھوڑے یا چوپائے، کھیتیاں، سب مزیّن اور آراستہ کر دی گئی ہیں کہ یہی متاعِ دنیا ہے اور اللہ کے پاس بہترین

انجام ہے۔

اموال دنیا نہیں ہیں بلکہ حبِ اموال دنیا ہے، عورتیں دنیا نہیں ہیں بلکہ عورتوں کے ساتھ شہوانی حب دنیا ہے، اولاد دنیا نہیں ہیں بلکہ اولاد میں مشغولیت دنیا ہے، گھر دنیا نہیں ہے بلکہ گھر سے انسان کا تعلق دنیا ہے۔ ہمارے لئے گھر کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں، اگر گھر مہم ہوں تو اتنے سارے گھر بنے ہوئے ہیں پھر ہمیں الحمد للہ کہنا چاہئے اور خوش رہنا چاہئے لیکن ہمیں گھر نہیں چاہئے بلکہ گھر کے ساتھ تعلق چاہئے مثلاً بعض کو گاڑی کا شوق ہے، گاڑی کا شوق ہے تو روڈ پہ کھڑے ہو جائیں آپ کے سامنے سے ایک ہی وقت میں کئی گاڑیاں گزریں گی اور اپنا شوق پورا کرلیں، پیسے سے محبت ہے تو بینک میں جائیں اور پیسہ دیکھیں کہ لوگ پیسہ جمع کرا رہے ہیں اور نکال رہے ہیں لیکن ہمیں اس پیسے سے غرض نہیں ہے، ہمیں کس پیسے سے غرض ہے؟ جو ہمارا ہو یعنی تعلق۔ پیسہ نہیں تعلق چاہئے، گاڑی نہیں تعلق چاہئے، گھر نہیں تعلق چاہئے، یہ سارے تعلقات دنیا ہیں، لہو ہیں۔

حیاتِ دنیا یعنی ایسی ثانوی، فرعی اور غیر اصلی مصروفیتیں اور مشغولتیں کہ جن کی وجہ سے انسان اصلی کام یعنی جس کام کے لئے ہم پیدا ہوئے ہیں چھوڑ دیتا ہے۔ سارا مشغلہ دنیا کو اپنا بنانے میں ہے، یہ بھی میری ہو جائے، وہ بھی میری ہو جائے، جس طرح کبھی انسان تھک جاتا ہے تو چاہتا ہے کہ کسی پارک میں جا کر تھوڑی دیر بیٹھے اور دل بہلا کر واپس آجائے تو وہاں تو نہیں کہتا ہے کہ یہ درخت بھی میرا ہونا چاہئے، یہ پودا بھی میرا ہونا چاہئے، یہ پائپ بھی میرا ہونا چاہئے اور یہ دروازہ بھی میرا ہونا چاہئے، نا، بلکہ وہاں کہتا ہے کہ یہ پارک ہے اور سب کا ہے، کچھ دیر کے لئے آؤ، دل

بہلاؤ اور چلے جاؤ۔ یہ دنیا بھی اسی طرح سے ہے۔ اگر یہ ساری چیزیں کہ جو ہمیں اچھی لگتی ہیں تو جا کر صرف دیکھ لیں، شوروم میں کھڑی ہوئی گاڑی جا کر دیکھ لیں تو کہتے ہیں کہ نہیں یہ میری ہونی چاہئے، یہ تعلق لہو ہے اور یہی دنیا ہے۔ انسان اسی کے اندر غرق ہے اور یہی مانع از حضور ہے۔

۱۲) دنیا کی کشش، حربۂ شیطان

قرآن مجید نے بہت سارے امور کو لہو قرار دیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ یہاں سے اپنی جان چھڑاؤ، ان مہلکوں سے اپنے آپ کو نجات دو، اگر چاہتے ہو کہ حضورِ دل کے ساتھ قرآن پڑھنا ہے، نماز پڑھنا ہے اور مطالعہ کرنا ہے تو اس کے لئے آپ کو لغویات ولہویات سے باہر نکلنا ہوگا یعنی وہ ثانوی چیزیں کہ جنہوں نے ہماری توجہ ہمارے اصلی کام سے ہٹا دی ہے چونکہ ان کی کشش بھی بہت ہوتی ہے، جن چیزوں کے اندر فائدہ نہیں ہے یا جو ہمارا مقصود نہیں ہے وہ پُرکشش چیزیں ہیں اور مقصود خشک ہے، مقصود کی طرف بسا اوقات ایک کٹھن راستہ درپیش ہوتا ہے مثلاً زائرین جب زیارت کے لئے پاکستان سے یہاں آتے ہیں تو تفتان سے لے کر قم تک بے آب وگیاہ صحرا اور خشک راستہ ہے اور اس کے بجائے اگر فرض کریں کہ تفتان نہ آئیں بلکہ پاکستان میں سرسبز مقامات پر چلے جائیں تو راستے بڑے خوبصورت ہیں، وہاں پر ہریالی ہے، سبزہ ہے اور واقعاً خوبصورت علاقے موجود ہیں، پُرکشش بھی ہیں لیکن ان پُرکشش راستوں پر کسی معصوم علیہ السلام کی زیارت نہیں ہے مثلاً آپ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں چلے جائیں کہ جو بہت ہی خوبصورت علاقہ ہے لیکن وہاں پر کوئی

زیارت نہیں ہے۔

زیارت جس طرف ہے وہ صحرائی اور خشک راستہ ہے جو بیابان سے گزرتا ہے، تو جو انسان فقط سبزوں کو دیکھ کر اور پرکشش راستوں کو دیکھ کر اپنا راستہ انتخاب کرتے ہیں تو وہ کشش دیکھ کر ثانوی راستوں پر چل پڑتے ہیں کہ جہاں ان کا مقصود نہیں ہوتا ہے، جیسے سیر و تفریح کرنے والے جاتے ہیں درحالیکہ جدھر ہمارا مقصود ہے وہاں پر۔ بے شک صحرا ہے اور خشک راستہ ہے لیکن اس سے گزرنا ضروری ہے چونکہ ہمارا مقصود وہاں پر رکھا ہوا ہے، لیکن ثانوی چیزیں ہماری توجہ اپنی طرف کیوں کھینچتی ہیں؟ چونکہ ان کے اندر کشش زیادہ ہے اور یہی حربۂ شیطان ہے، شیطان نے قسم کھا کے خدا سے کہا تھا کہ

لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (۲۷)

ان بندوں کے لئے زمین میں ساز و سامان آراستہ کروں گا اور سب کو اکٹھا گمراہ کروں گا۔

یعنی زمین میں جو کچھ ہے میں ان کے لئے زینت بنا کر پیش کروں گا، اس کے اندر جاذبہ اور کشش پیش کروں گا، ان کے سامنے دنیا کو سجا کر پیش کروں گا اور یہ انسان بھی تو ایسے نہیں ہیں کہ جو اپنے مقصد کے اتنے متوالے ہوں کہ مقصد کو کبھی ترک نہ کریں، نہیں، یہ کشش دیکھ کر کشش کے پیچھے کھنچے چلے جاتے ہیں لہٰذا شیطان کا یہ آسان طریقہ ہمارے لئے کافی ہے کہ لہو میں مبتلا کرنے کیلئے کہ ہمارے راستے میں کچھ چیزیں سجا کر رکھ دے۔

جس طرح چھوٹے بچوں کو جب اسکول بھیجتے ہیں تو بعض کارٹون جو بچوں کی کہانیوں

دنیا کی کشش، حربۂ شیطان

میں بنائے جاتے ہیں وہ اسکول کے راستے میں رکھے ہوتے ہیں، ان کے اندر یہی کشش ہوتی ہے لہٰذا بچے راستے میں ہی رک جاتے ہیں مثلاً ایک کارٹون ہے جو شاید سب نے دیکھا ہوگا اور نہیں دیکھا ہے تو ضرور دیکھیں، یہ بچوں کے لئے ہے لیکن بڑے بھی ضرور دیکھیں، پنوکیو (Pinocchio) کے نام سے ہے اور بہت ہی بامعنیٰ کارٹون ہے، اب یہ ضمنی مطلب ہے اور میں اس لئے عرض کررہاہوں چونکہ یہ خوب ہے، بے شک پنوکیو کی بچوں کے لئے لکھی ہوئی کتاب بھی ملتی ہے اس میں کارٹون بھی بنا ہوا ہے، کہانی پڑھ لیں یا جو بھی آپ کو جاذب لگے لیکن ضرور مطالعہ کریں، میں اس کا پسِ منظر بتادوں کہ پنوکیو ہے کیا چیز؟ ایسی چیزیں فلمی دنیا میں یا کارٹون میں بہت کم بناتے ہیں یا عموماً ورغلانے کے لئے اور مشغول کرنے کے لئے کرتے ہیں لیکن اس جیسی داستانیں بنانے والے بہت کم لوگ ہیں کہ جن کے ذہنوں کو خدا نے اتنی توفیق دی ہوئی ہے کہ بچوں کے لئے ایسی ہی بامعنیٰ کہانیاں لکھیں۔

پنوکیو (Pinocchio) ایک انسان کی کہانی ہے، بالکل ایسی کہ جیسے میری اور آپ کی کہانی ہے، اس میں ایک نجّار ہے اور یہ بڑھئی بچے کی شکل کا ایک لکڑی کا مجسمہ بناتا ہے کہ جس طرح بچوں کے کھیلنے کیلئے بناتے ہیں، یہ نجار خود بے اولاد تھا اور لکڑی کا مجسمہ بنا کر اس نے آرزو کی کہ اے کاش میرا بھی کوئی بچہ ہوتا، ظاہر ہے کہ بوڑھا تھا اور بچے کی طرف اس کی توجہ بھی نہیں تھی تو اس مجسمے کو دیکھ کر وہ یہ کہتا تھا کہ اے کاش یہی میرا بچہ ہوتا، یہی میری اولاد ہوتا، بہر کیف پھر اس میں ایک اتفاق ہوتا ہے، کوئی ستارہ آتا ہے کہ جو کئی سو سال بعد طلوع کرتا ہے اور اس وقت انسان جو آرزو کرے وہ

پوری ہوتی ہے تو اس نے یہی آرزو کی اور اس لکڑی کے مجسمہ میں آہستہ آہستہ حیات آ گئی، پورا انسان نہیں بنا لیکن اس میں شعور آ گیا اور اس نے چلنا شروع کر دیا تھا، وہ ابھی لکڑی کا ہی تھا، یہ انسان کی کہانی ہے کہ انسان جب پیدا ہونا شروع ہوتا ہے تو وہ انسان نہیں ہوتا ہے بلکہ بے جان ہوتا ہے اور اس کو انسان بننا پڑتا ہے، بہر کیف اس کی آرزو پوری ہوتی ہے اور اس لکڑی کے مجسمے کے اندر حرکت اور تھوڑا شعور آ جاتا ہے لیکن ساتھ یہ شرط رکھ دی جاتی ہے کہ اگر اس بچے نے عمر بھر میں کوئی گناہ نہ کیا اور کوئی معصیت نہیں کی تو آہستہ آہستہ یہ پورا انسان بن جائے گا لیکن اگر اس نے جھوٹ بولا، خیانت کی، چوری کی اور اس طرح کی کوئی غلطی کی تو اس صورت میں اس کو سزا ملے گی از جملہ ایک سزا جو اس کو ملتی تھی وہ یہ تھی کہ جب وہ جھوٹ بولتا تھا تو اس کی ناک لمبی ہو جاتی تھی جبکہ اس کو کہا گیا تھا کہ جھوٹ نہیں بولنا۔

اس کہانی کے اندر تین اور کیریکٹرز (Characters) بھی پنوکیو کے ساتھ موجود ہیں، ایک پری ہے کہ اسے فرشتہ یا ضمیر کہہ لیں اور دو اور قوتیں ہیں کہ ان میں سے ایک لومڑی اور ایک بھیڑیا ہے، ظاہراً لومڑی، بھیڑیا اور ایک پری پنوکیو کی زندگی میں ساتھ ساتھ ہیں، لومڑی اور بھیڑیا اس کو غلط کاموں پہ اکساتے ہیں مثلاً گھر سے نکلتا ہے تو وہ اس کو ورغلاتے ہیں، بہکاتے ہیں اور اس سے برے کام کرواتے ہیں اور فرشتہ جو ہمیشہ اس کے ساتھ ہے مثلاً یہ اس کا ضمیر ہے کہ جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ایک جانور کی شکل میں ہے تو یہ اس کو جگہ جگہ ٹوکتا ہے لیکن یہ ضمیر کی آواز کم سنتا ہے اور لومڑی اور بھیڑیئے کی آواز زیادہ سنتا ہے اور اکثر مشکلات کا شکار ہوتا ہے، جب مشکلات

میں جا پڑتا ہے تو پھر فرشتہ آتا ہے اور آ کر اس کی مشکل کو حل کرتا ہے مثلاً اس کی ناک بڑھتے بڑھتے بہت دراز ہو جاتی ہے تو یہ روتا ہے پھر فرشتہ اس کی مدد کو آتا ہے کہ اب توبہ کرو کہ جھوٹ نہیں بولو گے اور پھر اس سے عہد لیتا ہے، پھر ناک اپنی جگہ پر آ جاتی ہے، بہر کیف اس طرح کرتے کرتے جب اس کے اندر وہ تمام انسانی خصائل و صفات کہ جو فرشتے اور ضمیر کی مدد سے پیدا ہوتی ہیں ان کی وجہ سے یہ نا گہاں گوشت و پوست والا مکمل انسان بن جاتا ہے۔

یہ عام انسان کی یعنی میری اور آپ کی داستان ہے کہ جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ہمیں بھی مکمل انسان بننے کے لئے یہی مشکلات درپیش ہیں یعنی ہر انسان پنوکیو ہے، ہر انسان انسانِ کامل نہیں ہے، انسان بننے کی صلاحیت و استعداد ہے لیکن اس استعداد سے انسان بننے کے لئے شرط ہے، شرط یہ ہے کہ اس نے یہ کام کرنے ہیں اور وہ کام نہیں کرنے ہیں، خدا نے اس کے اندر ایک ضمیر دیا ہے اور باہر خدا نے ملائکہ بنائے ہیں لیکن ساتھ ہی شیطان ہے اور انسان کے اندر شہوت و غضب ہے یعنی شیطان اندر بھی ہے اور باہر بھی ہے، شیاطین انسان کو انسانیت کے راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف لے جانا چاہتے ہیں لیکن ملائکہ اور ضمیر انسان کو اس انسانیت کے راستے پر لے جانا چاہتے ہیں، ایک شخص مکمل انسان کب بنے گا؟ جب ضمیر اور ملائکہ کی آواز سنے، وحی کی آواز سنے، اس لحاظ سے وہ داستان بہت خوبصورت ہے، اگر اس کو بڑے دیکھیں چونکہ بڑوں میں فہم زیادہ ہے اور سمجھدار تر ہیں اور بچوں کو تحلیل کر کے بتائیں کہ یہ کہانی یا یہ کارٹون یہ پیغام دے رہا ہے اور یہ بچوں کے ذہنی ہوش کے لئے خوب ہے، جو طلبہ بچوں میں تبلیغ اچھی کر لیتے ہیں تو وہ اسی کارٹون کو

بچوں کے لئے پیش کریں اور پھر مقابلہ رکھیں کہ بچے اس کہانی کی اصلی روح اور لب بتائیں کہ یہ کہانی کیا کہنا چاہتی ہے؟ پھر آپ اس بچے کو منہ مانگا انعام دیں کہ جو واقعاً بتادے یعنی یقین جان لیں کہ وہ بچہ کچھ بننے کے قابل ہے کہ جو بتادے کہ اس کہانی میں کیا کہا جا رہا ہے یا کم ازکم قریب قریب بتادے، آپ اس کی حوصلہ افزائی کریں پھر اس کے بعد آپ خود بچوں کو بتائیں کہ یہ کہانی درحقیقت ہمیں یہ بتانا چاہتی ہے اور ہم اس کو اپنے اوپر تطبیق کریں۔

غرضیکہ ایک انسان جب انسانیت کے تکامل کی طرف بڑھنا چاہتا ہے تو بہت ساری چیزیں اسے اس راستے سے ہٹانا چاہتی ہیں، مشغول کرنا چاہتی ہیں، اس میں اس بھیڑیے اور لومڑی کا کردار بہت نمایاں ہے کہ جو صبح وشام مشغول ہیں کہ اس پنوکیو کو انسانی راستے سے ہٹا کر کبھی جنگل میں لے جاتے ہیں، کبھی پارک میں لے جاتے ہیں، کبھی دریا پہ لے جاتے ہیں یعنی اصلی کام سے توجہ ہٹانے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور وہ کبھی کبھار دور بھی ہو جاتا ہے لیکن پھر توبہ کرتا ہے اور واپس آجاتا ہے، پھر ناک چھوٹی ہو جاتی ہے، دوبارہ غلطی کرتا ہے تو اس کی ناک پھر بڑھ جاتی ہے، یہ ہماری کہانی ہے، ہماری داستان ہے، حقیقت یہ ہے کہ آخرت میں جب ہمارا روپ کھلے گا تو دیکھیں گے کہ بعض لوگوں کی کہ جو جھوٹ بولتے ہیں پنوکیو کی طرح ایک ایک کلومیٹر کی ناک ہوگی، ابھی تو ناک چھوٹی ہے لیکن یہ ناک بہت بڑھ جائے گی، جب قیامت میں پردے ہٹائے جائیں گے تو ہمارا اصلی روپ سامنے آئے گا اور سب کا اصلی پنوکیو باہر آئے گا، پھر معلوم ہوگا کہ کیا کیا بنایا ہے۔

صبح وشام ایسی طاقتیں اندر اور باہر سے ہمیں مشغول کرنے میں لگی ہوئی ہیں، ایڑی چوٹی کی سرگرمی ہے مثلاً میڈیا خناس صبح وشام ہمیں مشغولیت میں رکھا ہوا ہے، ٹی وی اور دیگر ذرائع سب ہمیں مشغول کرنے میں اور ہماری توجہ ہٹانے میں مشغول ہیں، بازار، مارکیٹ، شہر کی سرگرمیاں، سیاست اور یہ جتنی چیزیں بھی دائیں بائیں ہیں مثلاً اگر آپ صنعتی سامان دیکھیں چونکہ اس وقت صنعتی دنیا اپنی معراج اور عوج وعروج پر ہے اور صنعتی دنیا کی پوری کوشش یہ ہے کہ ہر وہ وسیلہ پیدا کرے کہ جو انسان کو اصلی مقصد سے دور کرے اور مشغول رکھے۔ اس وقت اسی صنعتی دنیا کی پیدا کردہ جو مشغولیات ہیں ان میں انسان کس قدر مشغول ہے اور اتنا مشغول ہے کہ اس کو خبر بھی نہیں ہے کہ میں کس مقصد کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اس دنیا میں جکڑا ہوا انسان اتنا مشغول و لہوی انسان ہے کہ اس کو کبھی کبھی خدا یاد آتا ہے تو نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور پھر شکوہ کرتا ہے کہ حضورِ قلب نہیں ہے۔ مطالعہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ دماغ حاضر نہیں ہے، کیسے دماغ حاضر ہو کہ جب اتنی مشغولیات ہیں، یہ جو نماز میں جسمانی طور پر کھڑا ہو گیا ہے تو یہ بھی بہت بڑی غنیمت ہے کہ معلوم نہیں کیسے آ کے کھڑا ہو گیا ہے؟ دل کس مقصد میں کھڑا ہو گیا ہے؟ پس دل کو حاضر رکھنے کے لئے اسباب ہیں۔

قرآن کے مطابق رجال کون ہیں؟

۱۳) قرآن کے مطابق رجال کون ہیں؟

قرآن کے مطابق رجال کبھی بھی ذکرِ خدا سے غافل نہیں رہتے۔ سورۂ نور آیت ۳۶ اور ۳۷ میں ارشادِ خداوندِ متعال ہے کہ

فِی بُیُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ

وَالْآصَالِ ٥

یہ چراغ ان گھروں میں ہے جن کے بارے میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی بلندی کا اعتراف کیا جائے اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے کہ ان گھروں میں صبح و شام اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

لیکن اس سے آگے آیہ میں فرمایا کہ ان گھروں میں کون لوگ رہتے ہیں؟ رجال، یہ وہ لوگ ہیں کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ

يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ٥

وہ مرد جنہیں کاروبار یا دیگر خرید و فروخت ذکرِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوۃ سے غافل نہیں کر سکتی یہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن کے ہول سے دل اور نگاہیں سب الٹ جائیں گی۔

ذکرِ خدا دل سے ہوتا ہے، ذکر فعلِ قلب ہے، ذکر زبان کا کام نہیں ہے، زبان سے اظہارِ ذکر ہوتا ہے، زبان سے یا اللہ کہنا، یا رب کہنا اظہارِ ذکر ہے، ذکر یاد کو کہتے ہیں اور یاد زبان سے نہیں ہوتی ہے بلکہ یاد کا ظرف دل ہے، جو چیزیں ہمیں یادِ خدا سے دور کرتی ہیں انکی فہرست میں قرآن نے دو چیزوں کا اضافہ کیا ہے یعنی ان گھروں میں وہ لوگ رہتے ہیں جو رجال ہیں اور

لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ......

قرآن کے مطابق رجال کون ہیں؟

اگر وہ تاجر بھی ہیں اور بیع بھی کرتے ہیں کیونکہ بالآخر انہوں نے زندگی بھی بسر کرنی ہے۔اس ساری بحث کا خلاصہ کوئی یہ نہ نکالے کہ اس کے معانی یہ ہوئے کہ ہم سب کو چھوڑ دیں یعنی یہ لہو ہے، کھانا پینا لہو ہے، گھر بنانا لہو ہے، شادی کرنا لہو ہے، تجارت کرنا لہو ہے، معیشت اور یہ سب لہو ہے اور ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے غار میں جا بیٹھنا ہے، غار میں جن مل جاتا ہے لیکن خدا نہیں ملتا ہے۔انسان اسی دنیا، اسی معاشرے، اسی معیشت اور انہی لوگوں کے ساتھ رہ کر قربِ سفر طے کرے یہی کمال ہے۔غاروں اور خانقاہوں میں رہ کر یہ سفر طے نہیں کرنا ہے، پس تجارت و بیع کرنی ہے لیکن یہ تجارت و بیع لہو نہ بنے، تجارت لہو کب ہوتی ہے؟ جب تجارت ہمیں اتنا مشغول کر دے کہ ہم خدا کو بھول جائیں۔

عموماً تبلیغ کے لئے جب مومنین سے واسطہ ہوتا ہے اور کوئی ایسی گفتگو ہوتی ہے تو مختلف لوگ اپنا اپنا اظہارِ خیال کرتے ہیں، بسا اوقات ان سے چاہتے بھی ہیں کہ اپنا اپنا اظہارِ نظر کریں، بعض اوقات خوبصورت اظہارِ نظر کرتے ہیں، ایک جوان نے کہا کہ یہ باتیں جو آپ کرتے ہیں ہمیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں، ہمارے پلے کچھ نہیں پڑتا ہے چونکہ آپ فارغ آدمی ہیں، کوئی معیشت کی فکر نہیں ہے، کوئی کمائی کی فکر نہیں ہے، کام کاج آپ کو نہیں کرنا ہوتا ہے، آپ کو سارا پکا پکایا مل جاتا ہے، اس لئے آپ خدا خدا، نماز، ذکر، سجدے اور خلوص و خشوع و حضور وفلاں کی باتیں کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ جب ہم صبح اٹھتے ہیں تو ایک دن بجلی کا بل پڑا ہوتا ہے، ایک دن گیس کا بل پڑا ہوتا ہے، ایک دن کیبل کا بل پڑا ہوتا ہے، ایک دن بچے کی فیس کا بل پڑا ہوتا ہے، ایک دن فلاں کا بل پڑا ہوتا

قرآن کے مطابق رجالُ کون ہیں؟

ہے اور یہ بل بھی اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ہمارا سارا مہینہ اسی فکر میں گزر جاتا ہے کہ یہ بل کیسے ادا کریں گے؟

یہ صحیح بات کہتا ہے، یعنی اس زندگی میں کہ جس میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟ اور ان سے یہی عرض کیا کہ آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہوگیا؟ کہ آپ گھر بنائیں اور ان گھروں میں بیٹھ کر فقط ایک ہی مقصد ہے کہ بل بھرتے جائیں۔ یہ بل آپ لوگوں نے خود بنائے ہیں، یہ بجلی، گیس اور کیبل کو آپ نے استعمال کیا ہے، جبھی آج مہینے کے اوّل میں دس بل آپ کے گھر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان گھروں میں رہ کر آپ نے یہی سیکھا ہے کہ مصرف کرتے جائیں اور بل بناتے جائیں اور پھر اداروں میں جا کر ملازمت کریں اور یہ بل ادا کرتے جائیں یعنی آدھی زندگی بل بنانے میں گزر جاتی ہے اور آدھی زندگی بل ادا کرنے میں گزر جاتی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ گھروں کو ہم نے بلوں میں تبدیل کیا ہوا ہے یعنی اردو والا بل، واقعاً ہم بلوں میں گھسے ہوئے ہیں اور بلوں میں بیٹھ کر بل بنا رہے ہیں یعنی ساری زندگی اسی میں گزر رہی ہے، یہی لہو ہے، یہی مشغلہ ہے اور انہوں نے صد در صد صحیح کہا، وہ انسان کہ جس کا مشغلہ بل بنانا اور بل ادا کرنا ہے تو اس کو خدا کب یاد آتا ہے؟

پھر ہم کیا کریں؟ بجلی مصرف نہ کریں؟ گھر میں نہ رہیں؟ گیس کا استعمال نہ کریں؟ کریں لیکن یہ لہو نہ بنیں، یہ چیزیں ہمیں خدا سے غافل نہ کریں، تجارت بھی کریں، مال بھی کمائیں، ملازمت بھی کریں لیکن یہ سب کچھ ذکرِ خدا سے غافل نہ کرے،

لَا تُلْهِيهِمْ ......

قرآن نے بعض جگہ رجال کی تعبیر عورتوں کے مقابلے میں استعمال کی ہے اور بعض جگہ نامردوں کے مقابلے میں استعمال کی ہے، بعض جگہ ہے کہ

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ......(۲۸)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا اور تم کو مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روک دیا اور قربانی کے جانوروں کو (قربان گاہ پہنچنے سے) روک دیا اور اگر صاحبِ ایمان مرد اور باایمان عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم نہیں جانتے تھے (اور یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ کہیں تم ان کو روند ڈالو اور بے خبری میں ان کی وجہ سے تمہیں بھی ضرر پہنچ جائے (تو اذنِ جہاد مل جاتا) تا کہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے.....

لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ٥(۲۹)

خبردار آپ اس مسجد میں کھڑے بھی نہ ہوں بلکہ جس مسجد کی بنیاد روزِ اوّل سے تقویٰ پر ہے وہ اس قابل ہے کہ آپ اس میں نماز ادا کریں۔ اس میں وہ مرد بھی ہیں جو طہارت کو دوست رکھتے ہیں اور خدا بھی پاکیزہ افراد سے محبت کرتا ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ٥ (۳۰)

مومنین میں ایسے بھی مردِ میدان ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے وعدے کو سچ کر دکھایا ہے، ان میں بعض اپنا وقت پورا کر چکے ہیں اور بعض اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور ان لوگوں نے اپنی بات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔

مومنین میں سے کچھ مرد ہیں، اس کا دوسرا حصہ کیا بنتا ہے کہ کچھ نامرد ہیں، اس کی دوسری شق نہج البلاغہ میں ہے، امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ

يَا أَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَ لَا رِجَالَ...... (۳۱)

اے مردوں سے شباہت رکھنے والوں جو کہ مرد نہیں ہو.......

یعنی کچھ مرد ہیں اور کچھ نامرد ہیں، نامرد کون ہیں؟ جو امیر المومنین علیہ السلام کی آواز پر اٹھتے نہیں ہیں، جہاد نہیں کرتے ہیں، بزدل ہیں، شجاع نہیں ہیں ان کو کہا کہ یہ نامرد ہیں، داڑھی اور مونچھ سے تو رجالیت نہیں آتی ہے، مردانگی سے انسان مرد بنتا ہے، یہ نر و مذکر ہے لیکن مرد نہیں ہے۔ مرد میں مروت ہوتی ہے، مردانگی ہوتی ہے لیکن ان کے اندر مروت نہیں ہے۔ قرآن نے بھی کہا ہے کہ کچھ مرد ہیں اور کچھ نامرد ہیں، وہ جو اللہ کے ساتھ عہد کر کے نبھاتے ہیں وہ مرد ہیں اور جو عہد ہی نہیں کرتے یا توڑ دیتے ہیں وہ نامرد ہیں۔ اس آیہ میں بھی ہے کہ مردانگی اس میں ہے کہ تم تجارت بھی کرو، ملازمت بھی کرو، پڑھو بھی، بچے بھی پیدا کرو، انکی تربیت بھی کرو، سب کچھ کرو لیکن یہ ساری چیزیں تمہیں خدا سے غافل نہ کریں، پس مرد وہ ہیں کہ جنہیں تجارت خدا سے غافل نہ کرے نہ کہ جو تجارت نہ کریں۔

لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ......

تجارت وبیع انہیں ذِکر خدا سے غافل نہیں کرتی ہے۔ وہ معمولاتِ زندگی بھی انجام دے رہے ہیں اور انہی معمولاتِ زندگی کے اندر خدا کی یاد میں بھی ہیں اور ان کا حضور خدا کے سامنے ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام، امیرالمومنین ہوتے ہوئے سب کچھ کرتے تھے، محنت بھی کرتے تھے اور معمولاتِ زندگی بھی انجام دیتے تھے، امیرالمومنین علیہ السلام کی اولاد بھی تھی اور ان کی تربیت بھی ہورہی تھی، نظامِ مملکت بھی چلاتے تھے لیکن ایک لحظے کے لئے بھی خدا کی بارگاہ سے غافل نہیں تھے۔ یہ معمولات اگر خدا سے غافل نہ کریں تو یہی زندگی وحیات ہے، یہی نجات کا ذریعہ ہے لیکن اگر یہی معمولاتِ زندگی ہمیں خدا سے دور کردیں تو یہ لہو ہیں اور دنیا ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ○

وہ مرد جنہیں کاروبار یا دیگر خرید وفروخت ذکرِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوۃ سے غافل نہیں کرسکتی، یہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن کے ہول سے دل اور نگاہیں سب الٹ جائیں گی۔

پس رجال وہ ہیں جو ایک دن کے لئے بھی قیامت کو نہیں بھولتے ہیں، ایک لحظے کے لئے بھی خدا سے غافل نہیں ہوتے ہیں یعنی ان کا جسم معمولات میں مشغول ہے چونکہ عموماً جو معمولاتِ زندگی ہیں ان میں جسمانی حضور کافی ہوتا ہے لیکن مطلوب یہ ہے کہ جسم معمولات میں مشغول رہے اور روح یعنی دل خدا میں مشغول رہے، جیسے تاجر کی مثال دی کہ وہ تجارت کرتے ہوئے ولیِ خدا تھا

اور دوسرا جو خانقاہ میں بیٹھا ہوا تھا اس کی کچھ قوتیں بیدار ہوئیں لیکن اس خانقاہ نے اسے اپنے دل و نفس پر قابو نہیں سکھایا، یہ طاقت اس کے اندر پیدا نہیں ہوئی۔

١٤)قرآن پڑھتے ہوئے حدیثِ نفس کی ممانعت

☆ و ترک حدیث النفس......

اس کے بعد صدر المتألہینؒ مزید فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھتے ہوئے حدیثِ نفس نہ کریں، یہ بھی اسی تخیل کا ایک شعبہ ہے، حدیثِ نفس یعنی جیسے انسان اپنے ساتھ دل ہی دل میں بات کر رہا ہوتا ہے، اپنے آپ کو خطاب کرتا ہے مثلاً اپنے آپ کو کہتا ہے مولانا صاحب، حجۃ الاسلام صاحب، آپ بڑی شخصیت ہیں، آپ کے بڑے کمالات ہیں، آپ کا بڑا اثر ہے، یہ اپنے ساتھ بات کرتا ہے، خود اپنے آپ کو داد دیتا ہے کہ کیا کہنے ہیں آپ کے۔

ایک بزرگوار تھے جو مرحوم ہو گئے ہیں ان کا تھوڑا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا، وہ اپنے ساتھ خود تکلف کیا کرتے تھے، خود کو اپنے آپ کا تعارف کراتے تھے، جب اکیلے دروازے پہ پہنچتے تھے تو ایک سائڈ پہ کھڑے ہو کر اپنے آپ کو کہتے تھے، بسم اللہ پہلے آپ تشریف لے جائیں، پھر دوسری طرف کھڑے ہو کر کہتے تھے، آپ بڑے ہیں، آپ سید ہیں، آپ پہلے چلے جائیں۔ انسان ایسا کرتا ہے، کبھی انسان اپنے ساتھ بات کرتا ہے، یہ حدیثِ نفس ہے، اپنے ساتھ بات نہ کریں، جب آپ قرآن پڑھ رہے ہیں تو حدیثِ نفس نہ کریں، قرآن مخاطِب ہو اور ہم مخاطَب ہوں، قرآن بول رہا ہو

قرآن پڑھتے ہوئے حدیثِ نفس کی ممانعت

اور ہم سنیں نہ کہ خود بولیں اور خود ہی سنیں، حدیثِ نفس ترک کر دیں۔ اس صفت کے بارے میں کسی مناسبت سے انشاء اللہ بحث ہوگی یہ اہم نکتہ ہے اور یہی زیادہ بڑھ جائے تو بیماری بن جاتی ہے، بعض کو دیکھا ہوگا کہ روڈ پہ جا رہے ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ اونچی آواز میں باتیں کر رہے ہوتے ہیں، بعض بیٹھے بیٹھے اشارے بھی کر رہے ہوتے ہیں، انسان سمجھتا ہے کہ پتہ نہیں انسان حالتِ تقریر میں ہے یا اس وقت کس حالت میں ہے؟ وہ اشارے بھی کر رہا ہوتا ہے اور باتیں بھی کر رہا ہوتا ہے، یہ حدیثِ نفس بڑھ کر انسان کے ذہن میں جنون بن جاتی ہے اور ذہنی بیماری بن جاتی ہے،

☆ و هذه الصفة يتولد عما قبلها......

یعنی حضورِ قلب کیسے حاصل ہو؟ یہ طہارتِ قلب سے حاصل ہوگا، طہارتِ قلب اور حضورِ قلب میں کیا ربط ہے؟ عرض کیا تھا کہ حضور اس وقت ہوتا ہے کہ جہاں انس ہو، انس وہاں ہوتا ہے کہ جہاں مناسبت ہو، مناسبت وہاں ہوتی ہے کہ جہاں پر صفتِ مشترک ہو اور قرآن چونکہ پاک ہے، مطہر ہے،

لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ ٥ (۳۲)

اسے پاک و پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے۔

لہٰذا جب انسان خود کی تطہیر کر لیتا ہے تو قرآن کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، اس مناسبت سے انس پیدا ہوتا ہے اور یہ انس انسان کو حضور کے لئے آمادہ کر دیتا ہے لہٰذا طہارت کے ذریعے سے حضورِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ آلودہ دل کبھی بھی قرآن کے سامنے حاضر نہیں ہو سکتا ہے،

☆ وهو طهارة القلب عن شوائب الاغراض النفسانية......

دل کے اندر جو آلودگیاں ہیں، نفسانی اغراض، خودخواہی، کینے، نفرتیں، تعلقات اور غرور و تکبر ہے تو ان چیزیں سے دل پاک ہو تا کہ قرآن کے ساتھ مناسبت و مسانخت پیدا ہو،

☆ فان من اخرج عن قلبه محبة الباطل......

جس نے اپنے دل سے باطل کی محبت کو نکال کر باہر پھینک دیا

☆ فيد خل في قلبه الانس بالحق......

بقول حافظ شیرازی

دیو چو بیرون رود فرشته در آید......(۳۳)

یعنی جہاں سے جن نکلتا ہے، دیو اور بھوت باہر جاتا ہے تو فرشتہ آتا ہے، بھوت اور فرشتہ دونوں ایک کمرے میں جمع نہیں ہو سکتے ہیں لہٰذا ہمارے دل سے محبتِ باطل نکلے تا کہ اُنسِ حق و اُنسِ قرآن پیدا ہو۔

۱۵) قرآن، باعثِ سرور

☆ ففي القرآن ما يستبشر به القلب ان كان اهلاله......

قرآن کے اندر ایسی چیزیں ہیں کہ جو انسان کو مسرور کرتی ہیں، خوشحال کرتی ہیں، استبشار یعنی جو چیز انسان کے بُشرہ پہ اثر انداز ہو اور باعثِ خوشحالی ہو، باعثِ انبساطِ بشرۂ انسان بنے، چونکہ

خوشی میں انسان کھل اٹھتا ہے، انسان جب خوش ہوتا ہے تو چہرے کا انقباض اور انبساط ظاہر ہوتا ہے لیکن جب پریشان ہوتا ہے تو اس کا منہ لٹکا ہوا ہوتا ہے، چھوٹا ہوتا ہے، اچھا خاصا چوڑا منہ تھا لیکن پریشانی کی وجہ سے لٹکا ہوا اور مرجھایا ہوا ہو جاتا ہے، اس وقت آپ ناپ لے لیں، جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو چہرے کا طول وعرض کم ہو جاتا ہے لیکن جب خوشی ہو، جب کوئی مژدہ سنائے تو اس وقت پھیل جاتا ہے یعنی انسان کی جلد پھیل جاتی ہے لہٰذا قرآن کے اندر ایسی بہت ساری چیزیں ہیں کہ جو انسان کو خوشی وسرور دے سکتی ہیں اور انسان کے اندر خوشحالی اور انبساط پیدا کر سکتی ہیں، شرط یہ ہے کہ دل اہلِ قرآن ہو ورنہ انسان قرآن سن کر بور ہوتا ہے۔

☆ وکیف لایطلب الانسان الانس بتدبر القرآن،

اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کو قرآن سے انس نہ ہو اور تدبّرِ قرآن سے انس نہ ہو،

☆ ویستأنس باشعار المتنبی و محاضرات الراغب و مقامات الحریری؟......

یہ خصوصاً طلبہ کے لئے ہے، عوام اس آفت میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ ان کے لئے الگ سرگرمیاں ہیں، طالب علم کتنے خوش ہوتے ہیں؟ آج کل کے طلبہ کو شاید ان چیزوں کا نام بھی معلوم نہیں ہے، یہ پرانے طلبہ کے زمانے کی بات ہے، پہلے ادبیات میں بہت ساری کتابیں پڑھاتے تھے جیسے ہمیں دیوانِ متنبّی، حماسہ اور مقاماتِ حریری کہ یہ بھی ادبیات کی کتاب ہے، یہ نام ذہن میں رہیں یہ آج کل نہیں پڑھائے جاتے ہیں اور ایک لحاظ سے اچھا ہے کہ نہیں پڑھائے جاتے ہیں چونکہ

آلودہ چیزیں تھیں، جاہلیت کے شعراء اور ان کے اندر غیر اخلاقی مسائل، ایک لحاظ سے بہتر ہے لیکن حوزوں نے ان کو اس وجہ سے نہیں چھوڑا کہ ان کے اندر اخلاقی مشکلات ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ادبیات ہی کو سرے سے چھوڑ دیا، اب سب کچھ ادب کے بغیر پڑھنا ہے، ادبیات کے بغیر پڑھنا ہے، متنبّی کے شعر سلیبس (Syllabus) کا حصہ تھے، نصاب میں پڑھائے جاتے تھے اور بڑی خوشی سے پڑھتے تھے، متنبّی کے شعر پڑھ کر بڑا سرور محسوس ہوتا تھا یا مثلاً محاضرات الراغب، مقاماتِ حریری اور اس طرح کی بہت ساری کتبِ ادبیات تھیں، ان کو پڑھ کر لذت محسوس کرتے تھے، قرآن میں تو اس سے بھی بڑی لذت موجود ہے مثلاً انسان ادب کی کتابیں پڑھتا ہے چاہے وہ کسی بھی زمانے کی ہوں تو لذت محسوس کرتا ہے، ادبیات بڑا لذیذ علم ہے، فرماتے ہیں کہ ان میں انسان کو لذت محسوس ہوتی ہے لیکن قرآن میں لذت محسوس نہ ہو،

☆ **وفیہ مالایخفی من متنزھات القلوب......**

درحالیکہ قرآن میں ایسی بہت ساری چیزیں ہیں کہ جو باعثِ تفریحِ دل ہیں، باعثِ خوشحالیٔ دل ہیں، باعثِ خوشی وسرورِ دل ہیں۔

۱۶)قرآن، باعثِ تفرج

☆ **ومتفرجات الارواح......**

تفرج، غم غلط کرنے کو کہتے ہیں، محاورہ بھی ہے کہ غم غلط کرنا، غم غلط کرنا یعنی نہ کہ غلط چیزوں

قرآن، باعثِ تفرج

سے غم دور کرنا بلکہ غم غلط کرنے سے مراد ہے غم کو ختم کرنا، جب انسان پریشان ہوتا ہے تو کسی محفل میں جا کر تھوڑی دیر کیلئے بیٹھ جاتا ہے مثلاً وہاں ہنستا کھیلتا ہے تا کہ ٹینشن (Tension) کو دور کر سکے، عموماً جو لوگ گھروں میں مشکلات کا شکار ہوتے ہیں مثلاً میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا ہے، میاں اٹھ کر باہر روڈ پہ جا بیٹھتا ہے، دوستوں کے ساتھ جا بیٹھتا ہے، دو چار گپے لگا کے پھر انتظار میں ہے کہ بیوی سو جائے تو جاؤں گا، یہ انسان کا تفرج ہے یا مثلاً کسی جگہ فلم دیکھنے چلا گیا تو یہ تفرج یعنی غم غلط کرنا ہے، فرماتے ہیں کہ قرآن کے اندر آئیں یہاں خیالی غم نہیں بلکہ انسان کے حقیقی غم غلط ہوتے ہیں، حقیقی غم دور ہوتے ہیں، حقیقی غموں سے انسان کو نجات ملتی ہے، دنیوی غموں سے انسان کو نجات ملتی ہے،

☆و بساتين الضمائر......

تفرج گاہِ قرآن بُساتینِ ضمائر رکھتی ہے، قرآن میں ضمیر کا چمن ہے نہ کہ وہ چمن آنکھوں کیلئے ہے، انسان کے ضمیر کے لئے قرآن میں باغات، گلستان اور چمن ہیں،

☆ واغذية النفوس .....

غذائے نفس، غذائے روحِ انسان قرآن کے اندر موجود ہے،

☆ و قرة العيون ...

اور آنکھوں کی ٹھنڈک قرآن کے اندر موجود ہے،

☆ و حيوة الحيوان......

اور ہر ذی حیات کی حیات کا اصلی راز قرآن کے اندر موجود ہے،

☆ و روح الانسان.......

اور حقیقی آسودگی یا روحِ حقیقی قرآن کے اندر موجود ہے، حیاتِ حقیقی قرآن کے اندر موجود ہے، جناب غزالی نے ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جن کو محفلوں میں بڑی لذت محسوس ہوتی ہے، اہلِ محفل لوگ ہوتے ہیں، خلوتوں میں گھبراہٹ ہوتی ہے، اُکتاہٹ ہوتی ہے، تنہائی میں اکتاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو خدا سے مانوس نہیں ہیں، اگر انسان اللہ سے مانوس ہو، قرآن سے مانوس ہو تو پھر اپنی خوشحالی کیلئے محفلوں کا سہارا نہیں لیتا ہے۔ بعض ہوتے ہیں کہ جب بوریت شروع ہو جاتی ہے یا تھوڑے سے تنہا ہوں تو کسی کو فون کر دیں گے یا کسی کے ہاں جا بیٹھیں گے، یہ بے وقت ایک دوسرے کے لئے مزاحم ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کو اکیلے بیٹھنے سے وحشت محسوس ہوتی ہے، اگر انس قرآن کے ساتھ ہو، دل قابلِ قرآن و اہلِ قرآن ہو تو آپ قرآن کھول کر پڑھیں۔ لکھا ہے کہ یہ لوگ جو محفلوں کا سہارا لے کر اپنے آپ کو خوشحال رکھتے ہیں یہ وہ ہیں کہ جن کو خدا سے انس نہیں ہے، اگر ہمارا انیس خدا بن جائے تو پھر ہم ان محفلوں میں بیٹھنے کا اور ان لوگوں کا سہارا نہیں لیں گے بلکہ خلوت میں بارگاہِ قرآن اور بارگاہِ خدا میں ہوں گے۔ ادبِ چہارم انشاء اللہ فصلِ ادبِ چہارم میں تحریر کیا جائے گا۔

قرآن با عترت قرآن

حوالہ جات

(۱)......(کشف الخفاء و مزیل الالباس - العجلونی،ناشر دار احیاء التراث العربی،الجزء۲،صفحہ ۱۴۵)

(۲)......(نہج البلاغہ،خطبہ۱۷۷)(آشنایی با قرآن - متفکر شہید استاد مرتضی مطہریؒ)(التبیان فی تفسیر القرآن - شیخ الطائفۃ أبی جعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ،الجزء۹،صفحہ۳۱۱)(التفسیر الأصفی -الفیض الکاشانیؒ، الجزء۱،صفحہ۱۱۲)(التفسیر الصافی - الفیض الکاشانیؒ،الجزء۱،صفحہ۲۶۱)(تفسیر الامام العسکریؒ)(تفسیر المیزان - العلامۃ الطباطبائیؒ،الجزء۲، صفحہ۱۰۷)(تفسیر مجمع البیان - امین الاسلام أبی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ،الجزء۲،صفحہ۴۴)(تفسیر نمونہ -جمعی از فضلا)(منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغۃ - الخوئیؒ)(تلخیص البیان فی مجازات القرآن - الشریف الرضیؒ،الجزء۲،صفحہ۵۰)(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی - شھاب الدین محمود بن عبد اللّٰہ الحسینی الألوسی - المتوفی: ۱۲۷۰ھ،الجزء۴،صفحہ۱۲۶)(مناھل العرفان فی علوم القرآن - محمد عبد العظیم الزُّرقانی،الجزء۲،صفحہ۳۱۵)(شرح نہج البلاغۃ - عبد الحمید بن ھبۃ اللّٰہ بن محمد بن الحسین بن أبی الحدید، أبو حامد، عزالدین،المتوفی : ۶۵۶ھ،الجزء۱۰،صفحہ۱۷۳)

(۳)...... (الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی

مدظلہ،الجزء۱۴،صفحہ۳۵۳)،(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء۶۷،صفحہ۲۵)(جامع الاخبار)(پرتوی از اسرار نماز،الجزء۴،صفحہ۲۲)(میزان الحکمة - الریشھری،الجزء۲،صفحہ۱۴۵) (الانسان الکامل فی نھج البلاغة،الجزء۱،صفحہ۲)

(۴)......(تفسیر نمونہ - جمعی از فضلا)

(۵) . (مثنوی معنوی،بہ تصحیح :رینولد ا.نیکلسون،دفتر دوم،صفحہ ۳۲۸)

(۶)......(سورۂ مبارکہ کافرون،آیہ۶)

(۷)......(نھج البلاغہ،حکمت ۳۱۲)

(۸)......(مناجاتِ شعبانیہ)

(۹)......(مفاتیح الجنان)

(۱۰)......(الصحیفة الکاملة السجادیة،دعا ۱۵۵)

(۱۱)......(الصحیفة الکاملة السجادیة،دعا ۲۸)

(۱۲) .(تسنیم تفسیر قرآن کریم- آیة اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ) (قرآن و تبلیغ،الجزء۲،صفحہ۷)

(۱۳) (سورۂ مبارکہ طہ،آیہ۱۱۴)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ انبیاءؑ،آیہ۳)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ انشقاق،آیہ۶)

(۱۶)......(وسائل الشیعہ،الجزء۱۶،صفحہ۹۵)

(۱۷)......(وسائل الشیعه،الجزء۱۶،صفحه۹۵)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ تکاثر،آیہ۱)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ انبیاء،آیہ۳،۲،۱)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ حجر،آیہ۳،۲)

(۲۱)......(وسائل الشیعة - الفقیه المُحدّث الشیخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ،المتوفی سنَة ۱۱۰۴ھ،الجزء۲،صفحه۳۳۸))(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰهِ المُنزَل -الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی،الجزء۱۶،صفحه۲۱۷) (تفسیر نور الثقلین،الجزء۴،صفحه۵۰۰)(تفسیر نمونه-جمعی از فضلا) (علوم طبیعت در قرآن)(الخصال،الجزء۱،صفحه۵۹)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ حدید،آیہ۲۰)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ عنکبوت،آیہ۶۴)

(۲۴)......(سورۂ مبارکہ محمدؐ،آیہ۳۶)

(۲۵)......(سورۂ مبارکہ انعام،آیہ۳۲)

(۲۶)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران،آیہ۱۴)

(۲۷)......(سورۂ مبارکہ حجر،آیہ۳۹)

(۲۸)......(سورۂ مبارکہ فتح،آیہ۲۵)

(۲۹)......(سورۂ مبارکہ توبہ،آیہ۱۰۸)

(۳۰)......(سورۂ مبارکہ احزاب،آیہ۲۳)

(۳۱)......(نہج البلاغہ)(معانی الاخبار)(علی "علیہ السلام" من المھد الی اللحد)(علیؑ والخوارج)(الکافی - الکلینیؒ، الجزء۵، صفحہ۷)
(در سرزمین تبوک - آیة اللّٰہ جعفر سبحانی مدظلہ)
(دعائم الاسلام، الجزء۱، صفحہ ۳۳۹)(تفسیر القرآن الکریم - السید مصطفٰی الخمینیؒ، الجزء۳، صفحہ۱۳۶)(میزان الحکمة - الریشھری، الجزء۱۰، صفحہ۵۳۷)
(مصباح الفقاھة-السید الخوئیؒ، الجزء۱، صفحہ۴۶۳)
(منیة الطالب - تقریر بحث النائینی للخوانساریؒ، الجزء۳، صفحہ۳۷۱)
(۳۲) ......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ۷۹)
(۳۳)......(دیوان حافظ شیرازی، از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی، غزل ۲۳۲، صفحہ ۱۸۲)

فصلِ ادبِ چہارم

﴿تدبر در قرآن﴾

(حصّہ اوّل)

۱)تدبر کا معنیٰ

۲)تدبر اور حضورِ قلب دو علیحدہ مرحلے

☆محو اور صحو کا فرق

۳) قرآن کے ظاہر میں مشغولیت تدبر میں مانع

٤)قرآن میں تکرار نہیں

٥)قرآن میں تدبر کی تاکید

٦)روایات میں تدبر کی تاکید

۷)تدبر کیلئے متدبر بننا شرط ہے

۸)متدبر انسان ہر چیز میں تدبر کرتا ہے

۹)جہاں بینی اور جہاں بانی میں فرق

۱۰)عالم اور عامی میں فرق

۱۱)ہم اہلِ تدبر کیوں نہیں ہیں؟

۱۲)اللہ کی نشانیوں سے اجنبی نہ بنیں

۱۳)قرآن کا اجنبیوں کیلئے پیغام

بحثِ آدابِ فہم قرآن میں صدرالمتالھینؒ نے ادبِ چہارم تدبر ذکر کیا ہے۔

☆ الرابع: التدبر، وهو غير حضور القلب......

آدابِ فہم قرآن میں ادبِ چہارم تدبر ہے، حضورِ قلب اور تدبر دونوں الگ چیزیں ہیں۔ پہلے بھی درج کیا تھا کہ یہ آداب پڑھ لینے سے فقط ان کی طرف توجہ ہو جاتی ہے لیکن جب ہم قرآن پڑھ رہے ہوں تو اس کے لئے عملی کوشش کی ضرورت ہے، یہ آداب عملاً ہمارے اندر ایجاد ہوں۔ اس کتاب میں فقط توجہ دلانا مقصود ہے اور کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اب جب کہ ہم نے اس بحث کو پڑھ لیا ہے تو لہٰذا آدابِ قرآن ہمارے اندر آ بھی گئے ہیں، نہیں بلکہ فقط ہماری توجہ آئی ہے۔

۱) تدبر کا معنٰی

تدبر در قرآن کی مبادی تصوری بحث میں اگر ہم غور کریں تو تدبر کا مفہوم کے لحاظ سے لغتاً یہ استعمال ہوتا ہے کہ کسی چیز کے اس پنہاں حصے تک پہنچنا کہ جس کے سامنے بہت سارے دوسرے حصے حائل ہوں یعنی تدبر، غور اور فکر کے ذریعے کسی حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کو کہا جاتا ہے۔ پردوں کے پیچھے پنہاں یا ظاہر کے پیچھے پنہاں حقیقت تک دسترس ہی کو تدبر کہتے ہیں، بعض چیزیں ترتیب کے ساتھ ہوتی ہیں، ایک سامنے کا حصہ ہوتا ہے، وسط کا حصہ ہوتا ہے اور پھر آخری حصہ ہوتا ہے، تہہ در تہہ امور ہوتے ہیں اور ان تہہ در تہہ امور میں انسان سامنے کے حصوں کو ہٹا کر آخری حصے تک رسائی پیدا کریں تو اس کو لغت میں تدبر کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں بھی تدبر اسی کو کہتے ہیں۔ دَبور یا دُبُر اس حصے کو کہتے ہیں کہ جو چھپا ہوا ہو، پیچھے ہو، پردوں کے پیچھے ہو اور بعض دیگر حصوں سے پنہاں حصوں کو یا

تدبر کا معنٰی

چھپے ہوئے مخفی حصے کو ذبور یا دبر کہتے ہیں اور کاوش کر کے، کوشش کر کے اسی چھپے ہوئے حصے تک رسائی کو تدبر کہتے ہیں مثلاً بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں کہ جو نمایاں و روشن ہیں اور پنہاں نہیں ہیں لہٰذا ایسی چیزیں محتاجِ تدبر بھی نہیں ہیں کیونکہ انہیں انسان سطحی نگاہ سے بھی دیکھ لیتا ہے اور ان کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔

مثلاً جس طرح سطحِ زمین پر بہت ساری چیزیں ہیں جیسے سبزہ ہے، درخت ہیں، پتھر ہیں، ریت ہے یا انسان آسمان کی طرف نگاہ کرتا ہے تو ستارے ہیں، سورج ہے، چاند ہے، یہ ساری چیزیں بغیر پردے کے سامنے کا حصہ ہیں، ہر موجود کا ایک سامنے کا حصہ ہے اور سادہ نگاہ سے انسان انہیں دیکھ کر سمجھ جاتا ہے لہٰذا ان کو دیکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ بصر کی ضرورت ہے، سماعت کی ضرورت ہے یا حواس کے ذریعے سے فقط انسان کی توجہ کے محتاج ہیں تو ان کی حقیقت پلے پڑ جاتی ہے لیکن انہی ظاہری چیزوں کے پیچھے کچھ دیگر امور بھی ہیں مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ زمین کے اُوپر ریت ہے، مٹی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس مٹی اور ریت کے نیچے کچھ اور چیزیں بھی ہیں، عموماً زمین کے نیچے پانی موجود ہوتا ہے لیکن تہہِ زمین اس کے اوپر آ کر اسے چھپائے ہوئے ہوتی ہے لہٰذا سطحِ ظاہر کو ہٹا کر زمین کے نیچے چھپے ہوئے پانی کو، پنہاں پانی تک پہنچنے کو تدبر کہتے ہیں۔ بعض حقیقتوں کے سامنے جسمانی پردے حائل ہیں کہ جنہیں انسان ہاتھوں سے ہٹاتا ہے اور پردوں کی تہہ کے نیچے یا پردوں کے پیچھے پنہاں حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور بعض اوقات غیر جسمانی طور پر کسی معنیٰ و حقیقت تک پہنچتا ہے اور اسکے لئے ذہن کے ذریعے، فہم کے ذریعے اور تعقل و تفکر کے ذریعے وہ پردے

ہٹاتا ہے اور تہہ کے نیچے چھپی ہوئی حقیقت تک جا پہنچتا ہے۔ اسی طرح ضروری نہیں ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے حائل چیزیں کی ترتیب اوپر نیچے کی ترتیب ہو، ممکن ہے کہ ہم سطح ترتیب ہو مثلاً فرض کرلیں کہ بہت سارے پردے اور کپڑے لٹکا کر پیچھے کسی کو پنہاں کیا گیا ہے، پردوں کے پیچھے کوئی چھپا ہوا ہے لہٰذا ان پردوں کو ہٹا کر اس پیچھے موجود پنہاں چیز تک پہنچنا تدبر ہے۔

عموماً آج صنعتی دور میں یہ مطالب مثالوں کے ذریعے سمجھنا زیادہ آسان ہیں مثلاً اگر قیمتی چیز ہو یا ایسی چیز ہو کہ جو ٹوٹ سکتی ہے تو اسے کئی پردوں کے پیچھے پنہاں کرتے ہیں یعنی اسکی پیکنگ (Packing) کرتے ہیں اور انسان جو قیمت ادا کرتا ہے وہ بھی اسی کی ادا کرتا ہے کہ جو اندر چھوٹی سی چیز ہے لیکن بڑے کارٹن (Carton) میں اس کو باندھا ہوا ہوتا ہے، پیک کیا ہوا ہوتا ہے، اس کے اندر پھر ایک اور پیکنگ لگی ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ چیز نازک ہو تو تہہ در تہہ چند تہیں لگا کر اس کے اندر اس قیمتی چیز کو چھپا کر رکھا ہوتا ہے اور ہم بھی جب معاملہ کرتے ہیں، خرید و فروخت کرتے ہیں تو اسی چیز کی کرتے ہیں، کارٹن کی نہیں کرتے ہیں یا اس کی پیکنگ کی نہیں کرتے ہیں اور پھر آ کر اس کو کھولتے ہیں، اس کے حائل پردوں کو اتارتے ہیں اور اتار کر جب اس کے اندر دیکھتے ہیں تو وہ پنہاں اور پیچھے چھپی ہوئی چیز دبور یا دبر ہوتی ہے اور ہمارا اس تک پہنچنا تدبر ہے یعنی اصلی مقصود تک پہنچنا تدبر کہلاتا ہے۔

انسان کے تکلم اور کلام کے اندر بھی ایسا ہی ہوتا ہے، بعض اوقات انسان گفتگو کرتا ہے تو بہت ہی واضح اور روشن گفتگو کرتا ہے اور جو کچھ کہنا ہوتا ہے بالکل صاف کہہ دیتا ہے مثلاً ایک انسان

کو پیاس لگی ہے تو کہتا ہے کہ مجھے پانی چاہئے، یہاں صاف اس نے پانی کا نام لے لیا، یہاں کوئی چیز حائل نہیں ہے، پردوں کے پیچھے، الفاظ کے پیچھے، تعبیرات کے پیچھے کوئی مراد و مقصود چھپا ہوا نہیں ہے لیکن بعض اوقات انسان اس صراحت کے ساتھ اپنی مراد بیان نہیں کرتا ہے بلکہ کنایے اور استعارے کا استعمال کرتا ہے یا دیگر ادبی قواعد کا استعمال کر کے اپنے مقصود کو چند الفاظ کی تہہ کے پیچھے چھپا کر پیش کرتا ہے اور پھر لوگوں کے سامنے مثلاً شعر کی صورت میں بیان کرتا ہے۔

عموماً ایسے ہوتا ہے کہ ہم کتاب پڑھتے ہیں تو نثر میں آسانی سے بات سمجھ میں آجاتی ہے لیکن شعر بہت کم لوگ سمجھتے ہیں حتیٰ اردو دان اور اُردو بول چال والے بھی بعض اوقات اردو کا کوئی شعر نہیں سمجھ پاتے ہیں کہ اس شعر میں مقصود کیا ہے؟ مثلاً ہم فارسی بول چال لیتے ہیں، خرید و فروخت کر لیتے ہیں اور ٹیکسی میں ایڈریس (Address) بتا دیتے ہیں، کرایہ چکا لیتے ہیں، لڑائی جھگڑا بھی بعض اوقات کر لیتے ہیں لیکن اگر کوئی فارسی شعر مثلاً مولانا کا، حافظ کا یا سعدی کا کوئی شعر ہمارے سامنے پڑھ دے تو باوجود اینکہ ہم فارسی بول لیتے ہیں لیکن ہم شعر میں مرادِ شاعر تک نہیں پہنچ سکتے ہیں، اسی طرح عربی شعر ہے مثلاً ممکن ہے کہ ہم صرف و نحو پڑھتے ہیں، لغت پڑھتے ہیں اور دیگر ادبیات پڑھتے ہیں لیکن عربی شعر کی مراد تک آسانی سے نہیں پہنچ سکتے ہیں، کیا فرق ہوتا ہے؟ حالانکہ وہ بھی اردو ہے اور یہ بھی اردو ہے، نثر میں لکھی ہوئی بھی اُردو ہے اور بول چال والی بھی اردو ہے اور شعر بھی اردو ہے لیکن چونکہ شاعر نے ادبی قوعد کے استعمال کے ذریعے سے بظاہر تعبیریں استعمال کی ہیں، کنایے استعمال کئے ہیں اور اپنا اصل تخیل اس نے ان تشبیہات کے پیچھے پنہاں رکھا ہوا ہے، مرادِ

درر ولایت

اصلی ان تشبیہات کے پیچھے مخفی ہے لہٰذا شعر میں تدبّر کی ضرورت پڑتی ہے یعنی تعبیرات کے پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی چیز یا اس چھپے ہوئے آخری حصے تک پہنچنے کو تدبر کہتے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید میں بھی ایک ظاہرِ قرآن مجید ہے، الفاظِ قرآن مجید ہیں لیکن ان الفاظ کے پیچھے معانی ہیں اور باطنِ قرآن ہے۔ ایک ظاہرِ قرآن ہے اور ایک باطنِ قرآن ہے، حقیقتِ قرآن و مرادِ اصلی ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ یا ہدایتِ حقیقی جو قرآن کا اصلی مقصود ہے اس تک انسان تدبر کے ذریعے ہی پہنچ سکتا ہے۔ اگر چہ قرآن کا اسلوب یہ ہوتا ہے کہ جیسے عام بول چال کا اسلوب ہے کہ ہر چیز واضح، اور صاف وشفاف بیان کر دی جائے، اس صورت میں قرآن تدبر کا محتاج نہیں ہے، یہی الفاظ ہیں، یہی پڑھنا اور یہی قرأت کرنا ہے۔ ان الفاظ کے پیچھے کچھ اور پنہاں چیز نہیں ہے لیکن قرآن نے چونکہ خود دعوتِ تدبر و تعقل دی ہے،

تطبیق

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (۱)

اس میں بھی صاحبانِ عقل کے لئے بڑی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

وَلَقَدۡ تَّرَکۡنَا مِنۡهَاۤ اٰیَةًۢ بَیِّنَةً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (۲)

اور ہم نے اس بستی میں سے صاحبانِ عقل و ہوش کے لئے کھلی ہوئی نشانی باقی رکھی ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ...... (۳)

یعنی انہوں نے قرآن میں تدبر کیوں نہیں کیا؟

اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا ۝

یا ان کے دلوں میں قفل پڑے ہوئے ہیں؟

اور دوسری طرف سے روایات میں بھی ہے کہ

اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهْراً وَ بَطْنًا وَ لِبَطْنِهِ بَطْنًا اِلٰى سَبْعَةِ اَبْطُنٍ ... (۴)

بیشک قرآن کیلئے ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر باطن کیلئے باطن ہے، یہاں تک کہ سات باطن ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس ظاہر سے باطن تک پہنچنے کے لئے تدبر کی ضرورت ہے، الفاظ ایک ظاہری سطح ہیں، ایک تہہ ہیں اور الفاظ کے بعد معانیٔ ظاہریہ کی ایک اور تہہ ہے اور ان معانیٔ ظاہریہ کے پیچھے حقائقِ حقیقی و مقصودِ اصلیٔ قرآن کی ایک اور تہہ ہے، اس تہہ تک پہنچنا، ان ظواہر کے پردوں کو ہٹا کر مقصود تک پہنچنا اصطلاح میں یا لغت میں تدبر کہلاتا ہے۔

۲) تدبر اور حضورِ قلب دو علیحدہ مرحلے

پس اگر انسان قرآن کی خدمت میں آئے کہ عظمتِ کلامِ خدا کی طرف بھی متوجہ ہو، تطہیرِ قلب بھی کر لے اور حضورِ دل بھی ہو اور قرآن ہی سے سروکار ہو، فرض کرلیں کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی توفیق نصیب ہوگئی کہ حضورِ قلب کے ساتھ قرآن پڑھتا ہے یعنی جب قرآن پڑھ رہا ہوتا ہے تو فقط قرآن کی طرف متوجہ ہے اور غیرِ قرآن کی طرف متوجہ نہیں ہے، الھا میں مشغول نہیں ہے، لہو نہیں ہے، سرگرمی نہیں ہے، تعلقات اس نے سارے ختم کردیئے ہیں اور محو در قرآن

ہے، یہ سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن درعینِ حال تدبر بھی نہیں ہے یعنی متوجہ اور محو ہے لیکن فقط تعبیراتِ قرآن کی طرف اور الفاظِ قرآن کی طرف توجہ ہے، جس طرح عموماً جن لوگوں نے قرآن کے ظواہر یا قرآن کے الفاظ پہ بہت ساری زحمتیں کی ہیں، فرض کرلیں معجم جس شخص نے لکھی ہے، اب تو کئی معجم آگئی ہیں، قرآن کے الفاظ تلاش کرنے کے لئے یا آیات جستجو کرنے کیلئے جو زحمتیں کی گئی ہے، وہ موضوعاتی ہیں یا ترتیبی ہیں یا مثلاً الف، ب کے اعتبار سے جو معجم ترتیب ہوئی ہیں یہ مختلف قسم کی فوق العادۃ زحمت ہے، ان لوگوں نے معمولی کام نہیں کیا ہے، آج یہی کام کمپیوٹر کے ذریعے کریں تو وقت لگتا ہے درحالیکہ یہ ان لوگوں نے ان ایام میں زحمت کی ہے کہ جب ابھی کمپیوٹر نامی کوئی چیز ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی، کس دقت کے ساتھ انہوں نے الفاظِ قرآن پہ غور کرکے تعدادِ الفاظ شمار کئے ہیں کہ کتنی دفعہ قرآن میں لفظِ اللہ استعمال ہوا ہے ان ساری آیات کو الگ کرنا، کتنی دفعہ مثلاً لفظِ رحمٰن استعمال ہوا ہے ان آیات کو الگ کرنا، کتنی بار رحیم استعمال ہوا ہے ان آیات کو الگ کرنا، کام آپ کے سامنے ہے یہ معمولی کام نہیں ہے بلکہ غیر معمولی کام ہے اور بغیر حضور کے، بغیر توجہ کے اور بغیر قطعِ تعلق کے یہ کام ہونے والا نہیں ہے۔

☆محو اور صحو کا فرق

☆محو اور صحو کا فرق

قرآن کے مطالعے کے لئے حالتِ محو ضروری ہے۔ محو اور صحو عرفان کی دو اصطلاحیں ہیں۔ محو کہتے ہیں لاتعلق ہوکر کسی امر کے اندر، عبادت کے اندر، مطالعے کے اندر یا کسی اور چیز کے

اندر فقط یک سو ہو جانا اور صحو اس کو کہتے ہیں کہ اس حالت سے باہر آ کر پھر تعلقات کی دنیا میں آ جانا، بعض اوقات انسان محو ہوتا ہے اور کبھی محو کی حالت سے باہر نکل کر حالتِ صحو میں آ جاتا ہے، مطالعہ اگر محو کی حالت میں ہو تو ذہن حاضر ہوتا ہے، بات سمجھ میں آ رہی ہوتی ہے، پلے پڑ رہی ہوتی ہے لیکن جب انسان صحو کی حالت میں مطالعہ کر رہا ہو یعنی تعلقات بھی ہوں، ہر طرف توجہ بھی ہو اور مطالعہ بھی ہو تو یہ مطالعہ نہیں ہوتا ہے، اس سے مطلب سمجھ میں نہیں آتا ہے، اول سے آخر تک صفحہ پڑھ جاتے ہیں لیکن معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اس صفحے میں کیا پڑھا ہے؟ کس موضوع کا صفحہ تھا؟ حالانکہ اس کو پڑھا ہے، اس کے سارے الفاظ دہرائے ہیں اور شاید ہم نے تلفظ بھی کیا ہو لیکن درعینِ حال ہمارا ذہن متوجہ نہیں ہے کہ اس صفحے میں کیا کچھ درج ہے۔ پس دل کو حاضر رکھنے کے حالتِ محو ضروری ہے۔

☆ محو اور صحو کا فرق

مثلاً اگر انسان متوجہ نہ ہو اور محو در قرآن نہ ہو تو مطالعۂ قرآن میں ممکن ہے کہ بعض آیات میں لفظ اللہ استعمال ہوا ہو اور بے توجہی کی وجہ سے وہ آیت گزر جائے اور انسان اُس کو اس کالم میں درج نہ کر سکے، جیسا کہ سطحی اور سرسری انسان کرتے ہیں کہ ان کی نظروں سے وہ آیت گزر جاتی ہے اور یہ دقت نہیں کرتے ہیں، پس یہ ان کا حضور تھا، حضورِ ذہن کے ساتھ اور حضورِ قلب کے ساتھ یہ معجم تدوین ہوئی ہے، اسی طرح جن لوگوں نے مثلاً اعرابِ قرآن لکھے ہیں وہ ان کا حضورِ ذہن اور ان کا حضورِ قلب تھا یعنی ساری توجہ الفاظِ قرآن پہ مرکوز کی ہے، متمرکز کی ہے تب جا کر انہوں نے اعرابِ قرآن لگائے ہیں یا اسی طرح جنہوں نے دیگر ادبی حوالے سے قرآن کے لئے خدمات انجام دی ہیں مثلاً جنہوں نے قرآن کے قواعدِ تجوید، قواعدِ قرأت وقوائدِ دیگر تدوین کئے ہیں، کس دقت کے

ساتھ انہوں نے آیات کے اوپر علامتیں لگائی ہیں، چند حروف کے بعد ایک علامت ہے پھر چند کلمات کے بعد ایک اور علامت ہے، ایک ہی آیت کے اندر کئی علامتیں ہیں اور وہ بھی اس وقت کے ساتھ کہ ہر علامت اپنے محل میں ہو، بے محل نہ ہو مثلاً کہاں وقف ہے؟ کہاں وقفِ لازم ہے؟ کہاں وقفِ مطلق ہے؟ کہاں وقفِ جائز ہے؟ کہاں وقفِ مرخص ہے؟ کہاں وقفِ مجوز ہے؟ کہاں وقفتہ ہے؟ اور کہاں سکتہ ہے؟ یہ ساری علامتیں وضع کرنا بغیر توجہ مرکوز کئے اور بغیر حضورِ ذہنی کے ہرگز ممکن نہیں تھا لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی قرآن کے اندر تدبر نہیں ہے، اس کام کو تدبر نہیں کہتے ہیں۔

فرض کریں کہ یہ قاری حضرات جو بڑا خوبصورت قرآن پڑھتے ہیں، اس طرح سے کہ لوگ ان کی صوت یا لحن کی وجہ سے قرآن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور آدابِ تلاوتِ قرآن و آدابِ قرأتِ قرآن میں بھی ہے کہ اچھی آواز میں قرآن پڑھو، بھونڈی آواز میں نہ پڑھو کہ لوگ سن کر بیزار ہو جائیں، حتیٰ روایت میں بھی کہا گیا ہے کہ مؤذن ہمیشہ خوش لحن مؤذن ہونا چاہئے، خوش آواز مؤذن ہونا چاہئے تا کہ لوگ اذان کی آواز سن کر مسجد کی طرف اور نماز کی طرف راغب ہوں، اس کی آواز کے اندر کشش ہو، جاذبہ ہو، اس کے اندر طرب نہ ہو، لعب نہ ہو، انسان اس قسم کی اذان دے، اسی طرح قرآن کیلئے بھی روایت میں ہے کہ اچھی آواز میں پڑھو، جب بلند آواز سے قرآن پڑھتے ہو تو اچھی آواز میں پڑھو تا کہ لوگوں میں قرآن کیلئے جاذبہ پیدا ہو اور کشش پیدا ہو۔

۳)قرآن کے ظاہر میں مشغولیت تدبر میں مانع

یہی قاری حضرات جو محنت و مشقت کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آسانی سے آدابِ قرأت و آدابِ تلاوت نہیں آتے ہیں، اس کے لئے انسان کو چند سال محنت کرنی پڑتی ہے پھر جا کر تلاوت میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے، یہی سورہ جو ہم ان سے سادگی سے سن لیتے ہیں اس ایک سورہ کو پڑھنے کے پیچھے اُن کی کئی سال کی زحمت کارفرما ہوتی ہے، جیسے یہاں ہم حوزے میں دیکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کو مجتہد بننا ہے تو کم ازکم بیس سے تیس سال تک وہ درس پڑھتا ہے، محنت کرتا ہے اور دقت کرتا ہے پھر جا کر ملکہ اجتہاد اس کے اندر پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سے ایک قاری بھی کم ازکم دس سے پندرہ سال محنت کرتا ہے پھر جا کر اس استادی کے درجے پر فائز ہوتا ہے، فوق العادۃ محنت کرنی پڑتی ہے لیکن درعینِ حال ساری توجہ فقط الفاظ کی ادائیگی میں ہے، وقف میں ہے اور مخارج میں ہے اور ان چیزوں میں ہے کہ بعد میں اس کو مفصل ذکر کریں گے کہ یہ امور اگر افراط میں ہوں تو قرآن پڑھنے کے اندر کیا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

یہ آداب تو ملحوظ ہیں کہ ہر چیز سے منقطع ہو کر حضورِ ذہن و حضورِ دل کے ساتھ آتے ہیں اور یہ فنون قرآن کے اندر سیکھتے ہیں لیکن درعینِ حال تدبر نہیں ہے، یہ قرأتِ قرآن بدونِ تدبر ہے یا فرض کرلیں کہ حفاظ جب قرآن حفظ کرتے ہیں تو وہ بھی آسان کام نہیں ہے، مشکل کام ہے پھر ترتیب کے ساتھ حفظ کرنا اور پھر آج کل حفظ کے اندر جو نئے اور جو مزید اضافات ہوئے ہیں، اختراعات و ایجادات کہ حفظ کرنا ہے تو ان ان خصوصیات کے ساتھ حفظ کرنا ہے اس نے حفظ کے امر کو اور مشکل تر

کر دیا ہے، حفظ کرنے کیلیے فوق العادۃ زحمت چاہئے اور لوگ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ حضورِ دل نہ ہو، حضورِ ذہن نہ ہو، تمرکز نہ ہو تو حفظ نہیں ہو سکتا ہے، ایک آیہ انسان کتنی دفعہ تکرار کرے تا کہ ذہن میں بیٹھ جائے، حفظ ہو جائے، پھر اس کا دورہ کرنا، جو لوگ مشغول ہیں انہیں پتہ ہے کہ کتنی زحمت چاہئے؟ ان کا کاروبارِ زندگی بالکل ٹھپ ہو جاتا ہے، وہ صرف حافظ رہتے ہیں اور کسی کام کے نہیں ہوتے، حفظ میں مشغول ہوتے ہیں اور باقی ساری چیزیں بھول جاتے ہیں، زندگی بھول جاتے ہے، گھر بار بھول جاتے ہیں، تعلقات بھول جاتے ہیں حتیٰ باقی دروس بھی بھول جاتے ہیں۔ اس ترتیب کے ساتھ قرآن کو حفظ کرنا بہت سنگین کام ہے لیکن کرتے ہیں، بغیر توجہ اور بغیر تمرکز کے یہ کام نہیں ہو سکتا ہے، حضورِ دل کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا ہے، اگر انسان متوجہ نہ ہو اور حفظ کر رہا ہو مثلاً تخیل کہیں اور زبان پر تکرار کسی اور آیت کی کر رہا ہو تو حفظ نہیں ہوتا ہے، حضورِ دل چاہئے، درعینِ حال تدبّر بھی نہیں ہوتا ہے چونکہ سارا زور حفظ میں ہے کہ یہ ذہن میں بیٹھ جائے، الفاظ وعباراتِ قرآن میرے ذہن میں بیٹھ جائیں، پس اصلاً تدبر نہیں ہوتا ہے، کیوں؟ کیونکہ فقط اس ظاہر کے ساتھ مشغول ہے درحالیکہ قرآن ہمیں فہمِ قرآن کے لئے دعوتِ تدبر دیتا ہے یعنی انسان ان ظواہر سے آگے بڑھے اور ان ظواہر کے جو پیچھے جو بہت ساری حکمتیں پوشیدہ ہیں، ان ظواہر کے پیچھے جو نورانیت موجود ہے، جو حقیقت موجود ہے، جو ہدایت موجود ہے ان تک پہنچے۔

اگر حفظ کے لئے کہا بھی گیا ہے تو اس وجہ سے کہ قرآن کا حافظ آسانی سے تدبر کر سکتا ہے چونکہ سارا قرآن یکجا اس کے سینے میں موجود ہوتا ہے، حافظ کے لئے تدبر کرنا بہت آسان ہے چونکہ

قرآن کے ظاہر میں مشغولیت تدبر میں مانع

جب انسان آیات میں غور کر رہا ہوتا ہے اور حقیقتِ آیات تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو سارا قرآن حاضر ہے اور اس کے سامنے موجود ہے، حفظ مقدمہ ہے مقصد نہیں ہے، درست قرأت کر لینا تدبر در قرآن کے لئے مقدمہ ہے کیونکہ بعد میں آپ نے قرآن کے اندر تدبر کرنا ہے، جس انسان کو قرآن حفظ نہ ہو تو اس کے لئے مشکل ہوتا ہے، ممکن ہے ایک آیت کے اندر غور کر رہا ہو اور دوسری آیت سے غافل ہو اور یہی مضمون آیۂ دیگر میں موجود ہو لیکن اس کے ذہن میں نہیں ہے لیکن حافظ کے لئے یہ سب کچھ کرنا بہت آسان ہے، پس علاوہ تلاوت و قرأت و حفظ و دیگر امور کے کہ جن کا تعلق ظاہرِ قرآن کے ساتھ ہے تدبر اس ظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی چیز تک پہنچنا ہے، حکمت تک پہنچنا ہے۔ پس قرآن ہمیں خود دعوتِ تدبر دے رہا ہے اور تدبر نہ کرنے کی مذمت کرتا ہے۔

٤)قرآن میں تکرار نہیں

متعدد آیات میں قرآن مجید میں ہمیں تدبر کی دعوت دی گئی ہے، اگر ان آیات کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں۔ سورۂ مبارکہ نساء میں آیہ ۸۱ اور ۸۲ میں ہے کہ

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ٥ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ٥

اور یہ لوگ پہلے اطاعت کی بات کرتے ہیں، پھر جب آپ کے پاس سے باہر نکلتے ہیں تو ایک گروہ اپنے قول کے خلاف تدبیریں کرتا ہے اور خدا ان کی ان باتوں کو لکھ رہا ہے، آپ ان سے اعراض کریں اور خدا پر بھروسہ کریں اور خدا اس ذمہ داری کے لئے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف ہوتا۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ...

کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں؟ تدبّر غیر از تفکر ہے، تدبر اور تفکر میں فرق ہے، ممکن ہے کہ مصداق میں ایک جگہ باہم مل جائیں یعنی ایک ہی مطلب میں انسان تفکر بھی کر رہا ہے اور اس میں تدبر بھی کر رہا ہے، یہ ذہن میں رکھیں کہ کبھی بھی الفاظ مترادف نہیں ہیں، خصوصاً عربی جیسی فصیح لغت میں الفاظ مترادف نہیں ہیں، جو الفاظ ہم مترادف سمجھتے ہیں ان کی اپنی خصوصیات ہیں کہ جو منفرد ہیں اور اسی لفظ کے ساتھ مخصوص ہیں یعنی دوسرے لفظ کے ساتھ وہ خصوصیات نہیں ہیں، مثلاً اردو میں ہم سارے الفاظ کا ایک ہی معنیٰ سمجھتے ہیں، غور، خوض، غوص، تدبر، تفکر، تعقل، تامل، ہم سب الفاظ کا ایک ہی معنیٰ سمجھتے ہیں چونکہ اردو کا دامن تنگ ہے اور اردو کے پاس اتنے الفاظ نہیں ہیں، ہم سب کا معنیٰ کرتے ہیں سوچنا درحالیکہ غور اور چیز ہے، خوض اور چیز ہے، غوص اور چیز ہے، تدبر اور چیز ہے، تعقل اور چیز ہے اور تامل اور چیز ہے، ان میں خصوصیات کا فرق ہے۔

اس وقت ہماری بحث تدبر در قرآن کے حوالے سے ہے اور قرآن میں تدبر کو موضوعیت حاصل ہے کہ تدبر در قرآن کریں، اب اس کا یہ معنیٰ یہ نہ کریں کہ تفکر در قرآن حالانکہ قرآن نے تفکر کی

بھی دعوت دی ہے اور اہل تفکر اور اہل تدبر خود طبقات مشخص کیے ہیں لیکن یہاں پر قرآن میں فرمایا کہ تدبر کیوں نہیں کرتے ہیں؟ مثلاً فرض کرلیں کہ بعض کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن میں تکرار بہت ہے اور فراواں تکرار ہے، یہی وہ طبقہ ہے کہ جو تدبر نہیں کرتا ہے، اگر تدبر در قرآن کرے تو پتہ چلے گا کہ قرآن میں تکرار موجود نہیں ہے، تکرار کیسے لگتی ہے؟ بظاہر الفاظ ہمیں لگتے ہیں کہ یہ جملہ پہلے بھی استعمال ہوا تھا اور یہی جملہ پھر استعمال ہو رہا ہے، یہ لفظ پہلے بھی استعمال ہوا تھا اور یہی لفظ دوبارہ استعمال ہو رہا ہے، یہی انسان جو معجم کی طرح دیکھتا ہے یا معجم سے قرآن دیکھتا ہے کہ ایک لفظ کئی دفعہ آیا ہے، اللہ قرآن میں کئی دفعہ استعمال ہوا ہے، تکرار ہوا ہے، مرحوم علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن میں بسم اللہ تکرار نہیں ہوئی ہے مثلاً

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ایک سو چودہ دفعہ بسم اللہ آئی ہے، آیا یہ مکرر ہے؟ فرماتے ہیں کہ نہیں ایک سورہ میں بھی مکرر نہیں ہے، ایک جگہ بھی یہ آیہ مکرر نہیں ہے، بسم اللہ تکرار نہیں ہوئی ہے، بسم اللہ جو فاتحہ کے آغاز میں ہے یہ اور بسم اللہ ہے، بسم اللہ جو بقرہ کے آغاز میں ہے یہ اور بسم اللہ ہے، بسم اللہ جو سورۂ آلِ عمران میں ہے یہ اور بسم اللہ ہے، سورہ نساء میں الگ بسم اللہ ہے لیکن جو تدبر نہیں کرتا ہے وہ کہتا ہے کیا فرق ہے؟ یہ وہی بسم اللہ ہے، یہ ب وہی ب ہے، یہ اسم رحمٰن وہی رحمٰن ہے، یہ رحیم وہی رحیم ہے لیکن جو تدبر در قرآن کرتا ہے اس کے لئے مکرر نہیں ہے، اسی لئے قرآن نے کہا کہ تدبر کریں، اگر یہاں پر سورۂ مبارکہ نساء کی آیہ ۸۲ میں ہے کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف ہوتا۔

اگر قرآن میں تدبر کرو تو ایک چیز آپ کے لئے ثابت ہو جائے گی اور وہ یہ ہے کہ قرآن میں اختلاف وتضاد و تعارض نہیں ہے، آیاتِ قرآن ٹکراتی نہیں ہیں، ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتی ہیں، قرآن کے اندر اختلاف نہیں ہے، قرآن کے اندر تضاد نہیں ہے، اسی طرح قرآن کے اندر اگر تدبر کرتے تو معلوم ہوتا کہ لاتکرار فی القرآن، اصل میں قرآن میں تکرار نہیں ہے اور سب سے زیادہ تکرار ہونے والی آیہ بسم اللہ ہے لیکن اصحابِ تدبر فرماتے ہیں کہ بسم تکرار نہیں ہوئی ہے، ہر آیت میں بسم اللہ کا الگ معنیٰ ہے، اگر یہ کوئی معمولی ساذاکر کہتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ایسے ہی اس نے ایک چٹکلا چھوڑا ہے لیکن جب علامہ طباطبائیؒ کہ جس شخص کی عمر قرآن میں گزری ہے یا قرآن کے سائے میں گزری ہے اور قرآن کی خدمت میں گزری ہے، ایک قرآنی انسان علامہ طباطبائیؒ نے یہ بات ہمیں بتائی ہے، واقعاً وہ قرآنی انسان ہیں، آداب میں قرآنی ہیں، اخلاق میں قرآنی ہیں، فکر میں قرآنی ہیں، سوچ میں قرآنی ہیں، زندگی میں قرآنی انسان ہیں، پوری حیات علامہ کی قرآن کے مطابق بسر ہوئی ہے، انہیں اللہ نے نورانی زندگی نے دی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً

قرآن میں تکرار نہیں

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ٥(٥)

جو شخص بھی نیک عمل کرے گا وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے اور انہیں ان اعمال سے بہتر جزا دیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے تھے۔

اگر انسان عملِ صالح کریں تو انہیں حیاتِ طیبہ نصیب ہو جاتی ہے، یہ قرآن کا نتیجہ ہے، یہ شخصیت بیان فرما رہی ہے کہ بسم اللہ قرآن میں تکرار نہیں ہوئی ہے، یہ تدبّر سے معلوم ہو جاتا ہے، اگر ہم بھی تدبر کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ بسم اللہ تکرار نہیں ہوئی ہے لیکن الفاظ وہی الفاظ ہیں، تدبر یعنی بسم اللہ کے پیچھے حقیقت، بسم اللہ کے پیچھے موجود معنیٰ، بسم اللہ کے پیچھے موجود حکمت، بسم اللہ کے پیچھے موجود جہت مختلف ہے اور ہر آیہ میں مختلف ہے اور بسم اللہ اس لئے بھی نہیں ہے کہ جیسے اہل سنت سمجھتے ہیں چونکہ قرآن پڑھنا ایک اچھا کام ہے لہٰذا ہر اچھا کام بسم اللہ سے شروع ہونا چاہئے لہٰذا یہ قرآن کا حصہ نہیں ہے، یہ کہتے ہیں کہ یہ ادب ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے بسم اللہ پڑھو، کہیں بھی نہیں ہے کہ قرآن سے پہلے بسم اللہ پڑھو بلکہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے اعوذ باللہ پڑھو،

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ٥(٦)

لہٰذا جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطانِ رجیم کے مقابلے کے لئے اللہ سے پناہ طلب کریں۔

مثلاً فرض کریں کہ آپ ایک پورا جزِ قرآن پڑھتے ہیں، تیسواں جز پڑھتے ہیں اور آغاز میں

قرآن میں تکرار نہیں

ایک دفعہ بسم اللہ پڑھ لی تو اب ہر سورہ میں تکرار کیوں کروں؟ اچھا کام ایک دفعہ شروع کر دیا، بار بار تو شروع نہیں ہوتا ہے، اگر آپ تیسواں پارہ پڑھ رہے ہیں اور ہر صفحے میں دو دفعہ یا تین دفعہ بسم اللہ تکرار کرنا پڑ رہی ہے، کیوں پڑھیں؟ کیونکہ یہ جزوِ قرآن ہے اور ہر جگہ اس کا ایک خاص معنیٰ ہے، یہ ہمیں تدبّر سے معلوم ہوگا۔

٥) قرآن میں تدبر کی تاکید

سورۂ مومنون میں آیات ٦٦، ٦٧، ٦٨ اور ٦٩ میں ہے کہ

قَدْ كَانَتْ آيَاتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ٥

جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں واپس چلے جا رہے تھے۔

مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ٥

اکڑتے ہوئے، قصّہ کہتے اور بکتے ہوئے۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِيْنَ٥

کیا ان لوگوں نے ہماری بات پر تدبر نہیں کیا یا ان کے پاس کوئی چیز آ گئی ہے جو اُن کے باپ دادا کے پاس بھی نہیں آئی تھی۔

أَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ٥

یا انہوں نے اپنے رسول کو پہچانا ہی نہیں ہے اور اسی لئے انکار کر رہے ہیں۔

بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو سرسری طور پر سن کر ہرگز اس کلام کے پیچھے موجود حقیقت کی طرف جانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔

سورہ ص آیہ ۲۹ میں ہے کہ

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ○

یہ ایک مبارک کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تا کہ یہ لوگ اس کی آیتوں میں غور وفکر کریں اور صاحبانِ عقل نصیحت حاصل کریں۔ یہ مبارک کتاب ہم نے آپ پر اتاری ہے، کس لئے اتاری ہے؟

لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ .....

تا کہ اس کی آیات میں تدبر کریں، تا کہ وہ اس کی آیات کی تہہ میں موجود مطالب تک پہنچیں،

لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ○

لیکن یہ نکتہ کس کو سمجھ میں آئے گا؟ اولی الالباب کو، اولی الالباب کے بارے میں ابھی تحریر ہوگا، اولی الالباب کا تدبر کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور آیہ دیگر سورۂ مبارکہ محمد ﷺ میں ہے، اس میں بعض طبقات کا ذکر کر کے آیہ ۲۴ میں فرمایا کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ○

قرآن میں تدبر کی تاکید

تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی تدبر نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں میں قفل پڑے ہوئے ہیں؟

بصورتِ مانعۃ الخلو ان کے دلوں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں یعنی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہے کہ یا دلوں پہ تالا ہے یا پھر انہوں نے تدبر نہیں کیا ہے، اگر دل پہ تالا ہو کہ جیسے پہلے بحث کر آئے ہیں کہ دل ناپاک ہو، آلودہ دل ہو تو اس آلودہ دل یا بیمار دل کی ایک حالت یہ ہے کہ دل مقفل ہو جاتا ہے، دل پر تالا پڑ جاتا ہے، تالا علامت ہے یعنی جو چیز بند کردی جائے، جس جگہ ورود و خروج ممنوع ہو اس کو تالا لگا دیتے ہیں، اس کمرے میں آ اور جا نہیں سکتے ہیں، اس مدرسے میں آ اور جا نہیں سکتے ہیں جیسے اکثر مومنین کی مسجدوں کو تالا لگا ہوتا ہے کہ کوئی اندر آ اور جا نہیں سکتا ہے، کوئی نمازی نہ اندر آ سکتا ہے نہ باہر جا سکتا ہے، آیا دلوں پہ تالے ہیں کہ کوئی چیز اندر نہیں جا رہی ہے اور دل کہیں نہیں جا رہا ہے چونکہ تالا جس دل پہ ہو تو نہ اس دل میں کوئی چیز جاتی ہے، نہ دل کسی طرف جاتا ہے، نہ دل کسی مطلب کی تہہ تک جاتا ہے اور نہ کوئی مطلب دل کی تہہ میں اترتا ہے چونکہ اس کے اوپر تالا پڑا ہوا ہے یا یہ کہ انہوں نے قرآن کے اندر تدبر نہیں کیا ہے۔

٦)روایات میں تدبر کی تاکید

معصومین علیہم السلام کی روایات میں کثرت سے اسی تدبر کے بارے میں ذکر ہوا ہے، البتہ مختلف مواد کے تحت مختلف جملات ہیں، اسی تعبیرِ تدبر کے ساتھ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ

آلا......

یہ خبردار کرنے کے لئے ہے یعنی توجہ دلانے کے لئے ہے، آلا یعنی جان لو، متوجہ رہو، خبردار رہو،

أَلَا لَا خَيْرَ فِي قِرَاءَةٍ لَا تَدَبُّرَ فِيهَا......(۷)

آگاہ رہو! جس قرأت میں تدبر نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

یعنی ایسا قرآن پڑھنا کہ جس کے اندر تدبر نہ ہو اس کے اندر کوئی خیر نہیں ہے، دوسری بہت ساری چیزیں ہیں جو انسان کو مل جاتی ہیں لیکن خیر نہیں ہے، ایسی قرآن خوانی کے اندر کوئی خیر نہیں ہے کہ جس کے اندر تدبر نہ ہو۔

وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ: لَا خَيْرَ فِي عِبَادَةٍ لَا فِقْهَ فِيهَا وَلَا فِي قِرَائَةٍ لَا تَدَبُّرَ فِيهَا......(۸)

امام علیؑ ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں: اس عبادت کا کوئی فائدہ نہیں جس میں غور و فکر نہ ہو اور نہ اس قرائت میں کہ جس میں تدبر نہ ہو......

اس عبادت میں بھی کوئی خیر نہیں ہے کہ جس کے اندر تفقہ نہ ہو، تفقہ یعنی فہم، یہ قرآنی اصطلاح ہے، تفقہ یعنی حقیقتِ دین کو سمجھنا، دین شناسی، قرآن شناسی، توحید شناسی، اس شناخت اور اس فہم کو تفقہ کہتے ہیں، جس عبادت کے اندر تفقہ نہ ہو اس عبادت کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کے اندر خیر نہیں ہے اور یہ روایت بھی امیرالمومنین علیہ السلام ہی سے ہے کہ

تَدَبَّرُوْا آيَاتِ الْقُرْآنِ وَ اعْتَبِرُوْا بِهِ فَإِنَّهُ أَبْلَغُ الْعِبَرِ......(۹)

قرآن مجید کی آیات میں تدبّر کرو اور ان کے ذریعے عبرت لے لو بے شک یہ سب سے زیادہ عبرت والی ہیں......

یعنی قرآنی آیات بہترین، بالغ ترین اور رسا ترین عبرتیں ہیں اور روایتِ دیگر میں ہے،

حتیٰ روایتِ دیگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ میں کتنے دنوں میں قرآن پڑھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تین مہینوں میں، اس نے کہا کہ میں اس سے بھی جلدی پڑھ سکتا ہوں، فرمایا کہ مثلاً ایک مہینے میں، اس نے کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ جلدی پڑھ سکتا ہوں، کہا کہ ایک ہفتے میں، اس نے کہا کہ میں پڑھ سکتا ہوں یعنی میری صحت ٹھیک ہے، فرصت بھی ہے، فارغ آدمی ہوں اس سے بھی زیادہ جلدی پڑھ سکتا ہوں، فرمایا کہ نہیں اس سے زیادہ جلدی کی اجازت نہیں ہے، کیوں؟ کیونکہ مقصود فقط قرآن کے الفاظ زبان سے دہرانا نہیں ہے بلکہ ان کے اندر تدبر بھی کرنا ہے اور اس تدبر کے لئے تجھے فرصت چاہئے، ایک ہفتے سے کم عرصے میں جب تو قرآن ختم کرے گا تو اس کے اندر تدبر کیسے کرے گا؟

روایات میں تدبر کی تاکید

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

فَإِنَّهُ لَا يَفْقَهُ مَنْ قَرَأَهُ فِيْ أَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ......(۱۰)

یعنی بے شک جو انسان تین دن سے پہلے قرآن ختم کرے وہ قرآن سے کچھ نہیں سمجھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے بہت سرعت سے قرآن پڑھنا پڑے گا، اتنا طوطے کی طرح تیز تیز اور فرفر

پڑھنا پڑے گا کہ اصلاً تدبر اور تفکر و فہم کی اس کو فرصت ہی نہیں ملے گی جیسے عموماً مقابلوں میں ہوتا ہے، سات منٹ میں پارہ پڑھنا عالمی ریکارڈ ہے، اس وقت معلوم نہیں کہ اب ٹوٹا ہے یا نہیں ٹوٹا ہے، اس جدید ڈیجیٹل (Digital) دور میں مزید مقابلے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی نے اگر سات منٹ میں پڑھا ہے تو کسی نے کچھ سیکنڈ اس میں کمی کر دی اور دوسرا اس سے بھی کچھ سیکنڈ اور کم کرتا ہے، سات دنوں میں اگر کوئی پارہ کھول کر پڑھے تو مشکل سے سمجھ میں آتا ہے چہ جائیکہ سات منٹ میں انسان پورا پارہ پڑھے، اس میں تدبر نہیں ہوسکتا ہے، قرآن ہرگز اجازت نہیں دیتا ہے، یہ قرآن کے ساتھ بے ادبی ہے۔ بغیر تدبر کے جو قرآن ثواب کے لئے اور برکت کے لئے اور معلوم نہیں کن کن چیزوں کے لئے پڑھا جاتا ہے آیا اس میں کوئی خیر ہے یا نہیں ہے؟ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس کے اندر کوئی خیر نہیں ہے۔

۷) تدبر کیلئے متدبر بننا شرط ہے

تدبر در قرآن کے لئے خود انسان کو پہلے متدبر بننا پڑے گا، یوں نہیں ہے کہ آج سے ہم قرآن میں تدبر کرنا شروع کر دیں درحالیکہ ہم خود متدبر نہیں ہیں مثلاً انسان تعقل شروع کرے درحالیکہ ابھی عاقل نہیں ہیں، جیسے آپ احکامِ شرعیہ بیان کریں کہ نماز واجب ہے، روزہ واجب ہے، فلاں واجب ہے اور ایک بچہ بیٹھا ہوا ابھی ارادہ کر لے کہ آج سے میں یہ سارے واجبات ادا کروں گا، نا، آپ بالغ نہیں ہو، یہ سارے واجبات بالغوں کے لئے ہیں، بالغ کر سکتا ہے، عہدہ برآ ہوسکتا

ہے، مکلف کی شرائط میں سے ہے کہ عاقل ہو، بالغ ہو، اس شرط تک پہلے پہنچو پھر اس سے عہدہ برآ ہوسکو گے، تدبرِ قرآن کے لئے پہلے انسان متدبر بنے پھر اس سے یہ عملِ تدبر سرزد ہوتا ہے اور وہ قرآن میں تدبر کرتا ہے۔ انسانِ ظاہر بین یعنی بینِ انسانی جو سرسری نگاہ رکھتا ہے، سطحی نگاہ رکھتا ہے اور ہر چیز پر ایسے ہی اٹھتی ہوئی نگاہ ڈالتا ہے تو یہ اہلِ تدبر نہیں ہے، موجوداتِ جہانِ ہستی اور ہمارے اردگرد کی جتنی دنیا ہے، متدبر انسان سب میں تدبر کرتا ہے نہ کہ صرف قرآن میں تدبر کرتا ہے اور باقی کسی چیز میں تدبر نہیں کرتا ہے۔ جب اہل تدبر ہو جاتا ہے تو پھر ساری آیاتِ خدا میں تدبر کرتا ہے مثلاً معمول کے واقعات ہمارے اردگرد روزانہ رونما ہوتے رہتے ہیں، اتفاقات رونما ہوتے رہتے ہیں، حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں اور ہم انہیں پڑھتے بھی ہیں، بعض کو ان واقعات وحوادث سے بڑی دلچسپی بھی ہوتی ہے لیکن واقعات وحوادث پڑھ کر گزر جاتے ہیں کہ فقط معلومات ہوگئی ہیں یا تسکین ہوگئی ہے۔

متدبر انسان ہر چیز میں تدبر کرتا ہے

۸)متدبر انسان ہر چیز میں تدبر کرتاہے

انسان کے اندر جو جاننے یا جستجو کی حس ہے اسے چند ایک واقعات کا علم ہو جانے سے تسکین مل جاتی ہے لیکن اگر انسان اہل تدبر ہو تو ان واقعات کے اندر تدبر کرتا ہے اور ان حوادث کے اندر تدبر کرتا ہے کہ یہ واقعات کیوں رونما ہو رہے ہیں؟ کیسے رونما ہو رہے ہیں؟ ان واقعات کا پسِ منظر کیا ہے؟ ان واقعات کو جنم دینے والے اسباب کیا ہیں؟ عوامل کیا ہیں؟ سرسری انسان، سطحی

انسان جو خبروں کی طرح ہر چیز سنے اور اٹھ جائے، جس طرح روزنامہ پڑھا جاتا ہے، اخبار پڑھا جاتا ہے، اسی طرح سے حوادث کو پڑھ کر گزر جائے اور ان حوادث سے سرسری طور پر عبور کر جائے تو یہ اہلِ تدبر نہیں ہے، جو حوادث اور واقعاتِ زمانہ میں تدبر نہیں کرتا ہے وہ قرآن میں بھی ہرگز تدبر نہیں کر سکتا ہے، جہانِ ہستی میں یہ موجودات کہ جن کو خداوند نے فرمایا ہے کہ یہ میری آیات ہیں، میری نشانیاں ہیں، اگر انسان ان میں تدبر کرنے والا نہ تو ہو قرآن میں ہرگز تدبر نہیں کر سکتا ہے، تدبر ایسی چیز نہیں ہے کہ ہم جہاں چاہیں اس کو استعمال کریں اور جہاں چاہیں اس کو ختم کر دیں۔

عاقل انسان اگر قرآن کی بارگاہ میں ہے تو بھی عاقل ہے، اگر گھر میں ہے تو بھی عاقل ہے، کاروبار میں ہے تو بھی عاقل ہے، وہ ہر جگہ عقل استعمال کرتا ہے، یہ ساری چیزیں عقل کا میدان ہیں، اگر تعقل کے مقام پہ فائز ہو گیا ہے تو انسان احساسات سے بالاتر ہو گیا ہے، تو ہمات سے بالاتر ہو گیا ہے اور حواس سے بالاتر ہو کر مقامِ تعقل میں پہنچ آیا ہے، اس کے اندر عقلانیت آ گئی ہے، یہ عقلانیت اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر چیز کے اندر تعقل کرے، ہر چیز کو عینکِ عقل سے دیکھے، اس کے ہر عمل کے اندر تعقل کا شائبہ ہو، یوں تو نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ باقی سارے امور میں عاقل نہیں ہے لیکن جب قرآن کھول کر بیٹھے گا تو تعقل شروع کر دے گا، یہ کیسے تعقل کرے گا؟ جب شخصی عقلانیت ہی نہیں آئی ہے تو عاقل بھی شمار نہیں ہوتا ہے، جب عقلاء کے زمرے میں نہیں آیا ہے تو یہ کس طرح سے قرآن میں تعقل کرے گا؟

خداوندِ متعال نے فرمایا ہے کہ تمہارے نفس کے اندر، آفاق میں اور تمہارے گرد و پیش کو ہم

تدبر انسان ہر چیز میں تدبر کرتا ہے

نے اپنی نشانیوں سے بھر دیا ہے، یہ عالم سراپا نشانیٔ خدا ہے اور ان نشانیوں سے ہم صبح وشام سرسری گزرتے ہیں، تدبر اور تعقل نہیں کرتے ہیں یعنی کسی چیز میں ہمیں خدا نظر نہیں آتا ہے، کوئی چیز ہمیں خدا کی طرف نشاندہی نہیں کراتی ہے؟ چونکہ نشانی کہتے ہی اس کو ہیں کہ جو نشاندہی کرے مثلاً جب آپ گاڑی چلاتے ہیں تو راستے میں ٹریفک کے سگنل ہیں، مختلف سائن لگے ہوئے ہیں اور ہر ایک قانون کی نشاندہی کر رہا ہے، انسان کے اندر اگر تدبر پیدا نہیں ہوا یعنی ایک انسان متدبر بالفعل نہیں بنا تو وہ کس طرح سے قرآن میں تدبر کر سکتا ہے؟ ان حوادث سے، ان اتفاقات سے سرسری نہ گزریں بلکہ آپ رک جائیں، توقف کریں اور ان واقعات وحوادث اور ان نشانیوں کی تہہ تک پہنچیں چونکہ ہر حادثہ اپنے اندر ایک جہانِ اسباب وعوامل اور معرفت چھپائے ہوئے ہے، خواہ طبعی حادثہ ہو، انسانی حادثہ ہو، اجتماعی حادثہ ہو، ناگوار حادثہ ہو، خوشگوار حادثہ ہو یا جس قسم کا بھی حادثہ ہو مثلاً انسان اسی طلوع وغروب میں غور وتدبر کرے۔

۹)جهاں بینی اور جهاں بانی میں فرق

ہم سرسری کیوں ہیں؟ اہل تدبر کیوں نہیں بنتے ہیں؟ یعنی یہ سرسری پن اور سطحی پن انسان کے اندر کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یہ نکتہ پہلے بھی بہت ساری مناسبتوں سے عرض ہوا ہے لیکن یہاں بھی اس کا تذکر ضروری ہے، عالِم میں اور عامی میں یعنی علماء اور عوام میں فرق کیا ہے؟ عوام کا جن چیزوں سے سروکار ہے علماء کا بھی انہی چیزوں سے سروکار ہے، علماء سے مراد مدرسے کے فارغ التحصیل نہیں

ہیں بلکہ قرآن کی اصطلاح میں جو علماء ہیں یا جن کو آج کی اصطلاح میں مفکرین، دانشور، حکماء اور فیلسوف کہا جاتا ہے، جن کا کام شناختِ جہان ہے اور شناختِ جہان تدبیرِ جہان سے زیادہ مشکل کام ہے، علامہ اقبالؒ کے بقول

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی......(۱۱)

جہاں بانی یعنی پورے جہان پر حکومت کرنا، پورے عالم پر حکومت کرنا، فرمانروائی کرنا بہت آسان ہے لیکن جہاں بینی بہت مشکل کام ہے۔ انسان جہاں بین کب بنتا ہے؟ اور جہاں بان کب بنتا ہے؟ جہاں بان کوئی بھی بن سکتا ہے، اسکندر جہاں بان تھا اور اس نے پورے جہان میں سے آدھے جہان سے زیادہ پہ قبضہ کرلیا تھا اور جہاں بانی کی، چنگیز جہاں بان بنا اور آدھے سے زیادہ جہان پہ قبضہ کرلیا اور اس نے بھی جہاں بانی کی، استعماری طاقتوں نے جہاں بانی کی ہے، جہاں بانی سب کرسکتے ہیں لیکن جہاں بینی بہت مشکل کام ہے اور ہر زمانے میں کئی لوگ جہاں بان ہیں لیکن صدیوں بعد ایک جہاں بین پیدا ہوتا ہے، ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہے کہ جو جہان کی تہہ تک اترتا ہے، ان موجودات کے اندر تک جاتا ہے، دانشور وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے راز کھولے ہیں۔

۱۰)عالم اور عامی میں فرق

جن لوگوں نے ہستی کے سربستہ راز کھولے ہیں ان کو عالم کہا جاتا ہے، عالم کہتے ہی اس کو ہیں کہ جو ان موجودات سے اثر کی توقع نہیں رکھتا ہے، صرف فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا ہے، انہی چیزوں

سے عوام کا سروکار ہے اور انہی چیزوں سے علماء کا بھی سروکار ہے۔ عوامی اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو فقط اس شے سے اپنا مطلوبہ اثر، اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے چاہے اس کی حقیقت اس کو سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ حقیقت جاننے کے درپے نہیں ہوتا ہے مثلاً یہی ایٹم (Atom) کہ اس سے صدیوں سے استفادہ ہوتا رہا کہ جب سے انسان ہے، بالآخر ایٹم انسان کی دنیا میں داخل ہے لیکن ایٹم کی شناخت کی ضرورت انسان کو محسوس نہیں ہوئی چونکہ ہمارا کام تو پورا کر رہا ہے، اب اس کا نام ہی انہوں نے ایٹم رکھا ہوا تھا یعنی ناشکن، نہ ٹوٹنے والی شے۔ ایٹم یعنی ناشکن، کیونکہ انہیں اس سے غرض نہیں تھی، ٹوٹے نہ ٹوٹے اس کے اندر انرجی ہے لیکن اس کے اندر کیا چیز ہے؟ یہ خود کیا ہے؟ ہمیں اس سے کیا غرض؟ صرف اس سے ہماری ضرورت پوری ہو رہی ہے۔

مثلاً پانی کیا ہے؟ ہمیں کیا معلوم پانی کیا ہے؟ اسکی حقیقت کیا ہے؟ جب پیاس بجھا رہا ہے، آپ کے کھیت کو سیراب کر رہا ہے، آپ کے کپڑے پاک کر رہا ہے مثلاً دھوبی کو کیا معلوم کہ پانی کی حقیقت کیا ہے؟ آکسیجن، ہائیڈروجن ہے، عنصر ہے یا نہیں ہے، اس کو تو گھاٹ کے لئے پانی چاہئے کہ یہ کپڑے دھوئے اور یہ میل اتار دے بس تمام شد، ایک کسان کو پانی کی حقیقت جاننے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں؟ کیونکہ وہ پانی سے فقط کھیت کو سیراب کرنا چاہتا ہے اور اسی طرح سے ایک شخص ہے کہ جو پانی سے فقط غسل کرنا چاہتا ہے، فقط وضو کرنا چاہتا ہے، حقیقتِ آب اسکے لئے اہمیت نہیں رکھتی ہے، یہ فقط فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، یہ عامی انسان ہے۔

عالم کون ہے؟ عالم وہ ہے کہ خود پانی اسکے لئے معمہ ہے مثلاً یہ سوال کہ پانی اوپر سے نیچے

کی طرف کیوں بہتا ہے؟ نیچے سے اوپر کی طرف کیوں نہیں جاتا؟ کسان روزانہ پانی کو اسی طرح اوپر سے نیچے کی طرف، فراز سے نشیب کی طرف استعمال کرتا ہے لیکن ایک دن بھی اس کے ذہن میں یہ سوال نہیں اٹھا کہ آخر پانی کی طب میں ایسا قانون کیوں شامل ہے کہ یہ اوپر سے نیچے کی طرف حرکت کرتا ہے درحالیکہ باقی چیزیں مثلاً دھواں، گیس اور ہوا نیچے سے اوپر کی طرف جاتے ہیں لیکن کسان کے لئے یہ سوال نہیں اٹھا۔

عالم اور عامی میں فرق

بعض اہل قلم کے بقول اگر یہ نیوٹن گھر میں ہی سویا رہتا، بیوی سے اس کا جھگڑا نہ ہوتا اور وہ روٹھ کر باہر اس سیب کے درخت کے نیچے نہ سوتا اور وہاں سے سیب اس کے سر پہ نہ گرتا تو آج تک اصلاً بشریت کششِ ثقل سے محروم ہوتی، یہ آکر بیٹھا اور وہاں اس کے سر پہ سیب گرا تو اس نے سوچا کہ یہ سیب صرف نیچے کیوں آیا؟ اوپر کی طرف کیوں نہیں گیا؟ اس نے سوال اٹھایا، اسی کو تدبّر کہتے ہیں لیکن ایک عامی کے لئے سیب سر پر گرا اور اس نے پکڑ کر خوش ہو کر کھالیا، سیب اس کے لئے فقط کھانے کی چیز ہے۔ اہل تدبر میں اور عامی میں یہی فرق ہے، متدبر کے لئے سیب کتابِ خدا اور مطالعے کی کتاب ہے۔

استادِ بزرگوار حضرت آیت اللہ جوادی آملی دام ظلہ العالی کے گھر میں انار کا درخت تھا اور اس کے اوپر بہت ہی خوبصورت انار لگے ہوئے تھے اور وہ پک کر بالکل پھٹنے کے قریب تھے چونکہ انار جب پک جاتا ہے، سرخ ہو جاتا ہے اور اپنی اوج پہ پہنچتا ہے تو پھر اس کے اندر دراڑیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں، یہ پھٹنا شروع ہو جاتا ہے، بالآخران کے محافظوں میں سے یا خدام میں سے کسی

نے وہ توڑ کر کھالیا، جب حضرتِ استاد واپس آئے تو دیکھا کہ درخت کے ساتھ وہ انار نہیں ہے، پوچھا کہ انار کہاں گیا؟ معلوم ہوا کہ وہ فلاں شخص نے توڑ کر کھالیا، اس پر بہت ناراض ہوئے کہ تو نے یہ کیا ظلم کیا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ تو ظلم نہیں ہے، یہ تو ایک پکا ہوا انار تھا، ابھی گر جاتا، خراب ہو جاتا، کھانے کی چیز تھی بالآخر کھا گیا، فرمایا کہ تجھے اگر انار ہی کھانا تھا تو بتاتا منڈی سے پانچ کلو، دس کلو، بیس کلو انار تیرے لئے لے آتے، وہ حیران تھا کہ آخر کیا فرق ہے منڈی کے انار میں اور اس انار میں، یہ بھی کھانے کا ہے اور وہ بھی کھانے کا ہے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک حکیم، ایک فیلسوف کیلئے انار کھانے کی چیز نہیں ہے، انار مطالعہ ہے، انار ایک حکمت کی کتاب ہے، جس کے اندر فراواں رازِ خدا پوشیدہ ہیں، انار معرضِ تدبرِ حکیم ہے، وہ کس نگاہ سے دیکھ رہا ہے؟ اور یہ کس نگاہ سے دیکھ رہا ہے؟

۱۱) ہم اہلِ تدبر کیوں نہیں ہیں؟

بھینس کو خدا نے تدبر کے لئے پیدا نہیں کیا ہے، بھینس کو نہیں کہا کہ تجھے گاس کی تہہ میں چھپی ہوئی حکمت تک بھی پہنچنا ہے، بلکہ اس کیلئے فقط یہ ہے کہ صرف تجھے گھاس تک پہنچنا ہے لہٰذا خدا نے بھینس کو وہ تمام آلات و ابزار دیئے ہیں کہ جن سے گھاس پیٹ میں منتقل کر سکے لیکن انسان کو پیٹ بھی دیا، معدہ بھی دیا اور ساتھ عقل بھی دی ہے کہ یہ ساری چیزیں تجھے پیٹ میں نہیں پہنچانی ہیں، تجھے بعض چیزیں عقل میں بھی پہنچانی ہیں اور عقل کے ذریعے تجھے ان کی گہرائی میں بھی اترنا ہے، یہ چیزیں روزانہ تیرے سامنے سبز ہوتی ہیں، اگتی ہیں، تیرے سامنے چیزیں سر اٹھاتی ہیں لیکن انسان

سرسری گزر جاتا ہے، کیوں سرسری بن جاتا ہے؟ ہم کیوں سرسری ہیں؟ کیوں ان چیزوں سے عبور کرتے ہیں؟ چونکہ فقط اشیاء کے فائدوں سے سروکار ہے، اشیاء کی حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہے یعنی عقل کے بجائے ہمارا معدہ زیادہ فعال ہے چونکہ فائدے سارے معدہ کی طرف جاتے ہیں، ہمارے لئے محرک معدہ ہے نہ کہ عقل، اگر عقل محرک ہوتو بہت ساری چیزیں کھانے کو جی نہیں کرتا ہے۔

مرحوم علامہ طباطبائیؒ کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے گھر میں مرغ پالے ہوئے تھے اور جب بھی کوئی مہمان آتا تو بازار سے خرید کر اس کے لئے مرغ لے آتے حالانکہ گھر میں موجود تھا لیکن ایک دفعہ وہ اتنا بوڑھا ہوگیا یا مریض ہوگیا کہ مرنے کے قریب ہوگیا لیکن اس کو پھر بھی نہیں کاٹا، کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک جاندار چیز تھی، حیات کا ایک نمونہ تھا کہ جو ایک حکیم کے مطالعے کی چیز ہے، جس کی حرکات، جس کی سکنات، جس کا وجود، جس کی ساخت اور جس کی بناوٹ خدا کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔

مثلاً آپ نہج البلاغہ پڑھیں کہ جس میں امیر المومنین علیہ السلام نے مور اور چیونٹی کی تفسیر بیان کی ہے یعنی مولا علی علیہ السلام کو چیونٹی میں کیا نظر آتا ہے؟ خدا نظر آتا ہے، یہ چیونٹیاں جو روزانہ ہمارے سامنے پیدا ہوتی ہیں، نکلتی ہیں، غائب ہوتی ہیں، کبھی سوچا کہ گرمیوں میں آجاتی ہیں لیکن سردیوں میں کہاں ہوتی ہے؟ سردی میں کوئی چیونٹی نظر نہیں آتی ہے، امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں پورا خطبہ چیونٹی کی حقیقت کے بارے میں بیان کیا ہے اور ایک خطبہ مور کے بارے میں بیان کیا، ایک

خطبہ خفاش یعنی چمگادڑ کے بارے میں دیا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ امیر المومنین علیہ السلام آشناسائے حکمتِ خدا ہیں، خدا نے اس جہان میں ایک طرف سے اپنے راز پیدا کئے تو دوسری طرف سے علی علیہ السلام کو پیدا کیا کہ یہ دنیا تو چرنے میں لگی ہوئی ہے کوئی ایسا بھی ہو جو ان رازوں کو کھولے اور امیر المومنین علیہ السلام نے وہ راز کھولے، فراواں راز کھولے ہیں، خود امیر المومنین علیہ السلام کے خطبے ایک راز ہیں، ان کو کھولنے والا بھی کوئی ہوتا کہ ان سے ہم حقیقتِ جہان تک پہنچیں، پس انسان اس وقت سرسری انسان ہو جاتا ہے کہ جب اشیاء کی معرفت وحقیقت ہمارے لئے اہمیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ ان کے اندر چھپے ہوئے فائدے اہمیت رکھتے ہیں، اس وقت انسان عامی بن جاتا ہے، عالم نہیں بنتا ہے، بے شک پڑھ لکھ جائے لیکن اگر ساری توجہ فائدوں کے اوپر ہے تو یہ کبھی بھی عالم نہیں بن سکتا ہے۔

ایک دفعہ ایک مہمان کمرے میں داخل ہوئے، انہوں نے کتابیں دیکھیں، ان کا ذہن بالکل کیلکولیٹر (Calculator) کی طرح تھا، فوراً ہی انہوں نے ایک مختصر نگاہ میں یعنی ایک منٹ سے کم کے حصے میں پورے کمرے میں موجود کتابوں کا اسٹیمیٹ (Estimate) لگا کر کہا کہ لگتا ہے یہ کتابیں اتنے ملین (Million) کی ہوں گی یعنی انہیں فوراً کتابوں کے اندر ملین روپیہ نظر آیا یا تو مان نظر آئے، انہیں کتابوں کے اندر چھپا ہوا علم نظر نہیں آیا، یہ نہیں پوچھا کہ یہ کتابیں کس موضوع پر ہیں؟ یہ کتابیں کیا بتاتی ہیں؟ ان کتابوں سے کیا ملتا ہے؟ نا، فوراً کتابوں میں روپیہ نظر آیا لیکن علم نظر نہیں آیا۔

پس انسان عجائباتِ عالم کو دیکھ کر سرسری نہ گزر جائے اور اس کی سوچ فقط ان اشیاء میں موجود فائدوں پر مرکوز نہ ہو بلکہ ان میں تدبر کرے۔

۱۲)اللہ کی نشانیوں سے اجنبی نہ بنیں

انسان خدا سے یہ توفیق مانگے کہ خدایا ہمیں اہلِ تدبر قرار دے، اپنی آیات کے اندر، اپنی نشانیوں کے اندر، اپنے جہان کے اندر اور ان حوادث کے اندر کہ جو صبح وشام ہمارے سامنے رونما ہوتے ہیں، بقول علامہ اقبالؒ

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ......(۱۲)

یہ گلزارِ ہست و بود، یہ بستانِ موجودات، یہ باغِ چمنستانِ حقائقِ ہستی، جس کی باغبان خود ذاتِ خدا ہے اس کو اجنبی بن کر نہ دیکھو، بیگانہ بن کر، اجنبی بن کر اس جہان میں گھوم رہے ہو گویا تمہارا تعلق اس جہاں سے ہی نہیں ہے، اگر تمہارا تعلق نہ ہوتا تو تمہیں اس جہان میں پیدا کیوں کیا جاتا؟ بلکہ تمہیں کسی اور ملکوت میں پیدا کیا جاتا، بقول حافظ

من ملک بودم و فردوسِ برین جایم بود......(۱۳)

وہاں پیدا کرتا جہاں یہ سارے درخت نہ ہوتے، یہ جانور نہ ہوتے، یہ پرندے نہ ہوتے، یہ موسم کی تبدیلی نہ ہوتی، اختلافِ لیل ونہار نہ ہوتا، کچھ بھی نہ ہوتا۔ اگر آپ اجنبی ہوتے اور اس دنیا سے بیگانہ ہوتے تو آپ کو عالمِ تجرد میں پیدا کیا جاتا۔ آپ خود کو اس جہان میں اجنبی کیوں سمجھتے ہو؟ خداوندِ متعال نے فرمایا کہ

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِى الْأَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ

سَبۡعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٌ٥(۱۴)

وہ خدا وہ ہے جس نے زمین کے تمام ذخیروں کو تم ہی لوگوں کے لئے پیدا کیا ہے، اس کے بعد اس نے آسمان کا رخ کیا تو سات مستحکم آسمان بنا دیئے اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔

اور مزید فرمایا کہ

أَلَمۡ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِي الۡأَرۡضِ وَالۡفُلۡكَ تَجۡرِيۡ فِي الۡبَحۡرِ بِأَمۡرِهٖ وَيُمۡسِكُ السَّمَاءَ أَنۡ تَقَعَ عَلَى الۡأَرۡضِ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ......(۱۵)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے اور کشتیاں بھی دریا میں اسی کے حکم سے چلتی ہیں اور وہی آسمانوں کو روکے ہوئے ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر زمین پر گر نہیں سکتا ہے۔

یعنی اپنے آپ کو اجنبی کیوں سمجھتے ہو؟ جب کہ یہ سب کچھ تمہارے لئے پیدا ہوا ہے اور جس ماحول میں ہم اجنبی بن کر رہیں گے اس ماحول میں ہم عامی بن جائیں گے۔

۱۳)قرآن کا اجنبیوں کیلئے پیغام

آیا معلوم ہے کہ قرآن نے اجنبیوں کے لئے کیا کہا ہے؟ مثلاً یہاں انقلابِ اسلامی میں، حوزۂ انقلابی میں رہتے ہیں، ایک ایسی مملکت میں کہ جس میں انقلابِ اسلامی یعنی اپنی صدی کی، تاریخ اسلام کی بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ بشری کی منفرد دُر ودادرُ ونما ہوئی ہے، لیکن اس میں

اجنبی بن کر رہتے ہیں کہ انقلاب سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ اجنبی بن کر کہتے ہیں کہ یہ ایرانی انقلاب ہے۔ معلوم ہے اجنبیوں کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے؟ یعنی اقبالؒ کے بقول اس گلزارِ ہست و بود میں جو بیگانہ وار رہتے ہیں قرآن انہیں کیا کہتا ہے؟ قرآن ان کو نہیں سراہتا بلکہ سخت الفاظ میں مذمت کرتا ہے، سورۂ اعراف اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ اجنبی بن کر اس عالم میں زندگی بسر نہ کریں،

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ○(١٦)

اور یقیناً ہم نے انسان و جنات کی ایک کثیر تعداد کو گویا جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں اور آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں، یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں اور یہی لوگ اصل میں غافل ہیں۔

ایک بہت بڑی تعداد

كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ......

جنوں اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد ہم نے جہنم کے لئے مخصوص کر دی ہے، ہم نے انہیں چھوڑ دیا ہے کہ یہ جہنم میں جائیں گے، کیوں؟ آخر انہوں نے کیا کیا ہے کہ یہ جن و انس جہنم میں جائیں گے؟ اس لئے کہ یہ اجنبی ہیں، گلزارِ ہست و بود میں بیگانہ وار رہتے ہیں، چرتے ہیں اور پھر

اس کے بعد اجنبی بن کر بیٹھ جاتے ہیں، انہیں کوئی غرض نہیں ہے کہ دیکھیں یہ طلوع کیا ہے؟ یہ غروب کیا ہے؟ یہ شمس کیا ہے؟ یہ قمر کیا ہے؟ یہ کہکشانیں کیا ہیں؟ یہ جہانِ ظاہر کیا ہے؟ یہ جہاں غیر ظاہر کیا ہے؟ یہ عالم نزدیک کیا ہے؟ یہ عالم دور کیا ہے؟ یہ صبح کیا ہے؟ یہ شام کیا ہے؟ اور اس کے اندر یہ سب کچھ رونما ہونے والے اتفاقات کیا ہیں؟

بعض کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے بھی کہا کہ مثلاً میر جعفر اور میر صادق کہ جو دو ہندوستانی کردار ہیں، اہل ہند کو اس کی خبر ہے، ہندوستان سے مراد برصغیر ہے، میر جعفر اور میر صادق کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی کلام میں لکھا ہے کہ یہ بہت بڑے خائن ہیں، انگریزوں کے تسلط میں ان دو خائنین کا بہت بڑا ہاتھ تھا، سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی شکست میں ان دونوں کا ہاتھ تھا اور اتفاقاً دونوں شیعہ تھے، میر جعفر بھی اور میر صادق بھی، ان کے بارے میں کہا کہ یہ اتنے بڑے خائن ہیں کہ انہیں جہنم بھی قبول نہیں کرے گی، جہنم بھی ان سے بیزار ہوگی، بعض انسان واقعاً اتنے پست ہیں، خدا کی زمین پہ رہتے ہیں لیکن اتنے گھٹیا اور پست ہیں کہ جہنم کے قابل بھی نہیں ہیں، اس لئے خداوند نے سورۂ رحمن میں جہنم کو نعمتوں میں سے شمار کیا ہے کہ

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ (۱۷)

یہی وہ جہنم ہے جس کا مجرمین انکار کر رہے تھے۔ اب اس کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر لگاتے پھریں گے۔ پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے۔

خدا نے جہنم کو نعمتوں میں شمار کیا ہے، واقعاً یہ طبقہ کہ جو جہانِ ہستی میں بیگانہ وارو رہتا ہے اگر یہ دربدر طبقہ جہنم میں نہیں جائے گا تو اور کدھر جائے گا؟

سورۂ مبارکہ اعراف کی آیہ ۱۷۹ کے مطابق جن و انسان کی کثرت کو جہنم میں کیوں ڈالیں گے؟

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا......

ان کو دل دیئے ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں ہیں،

وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا......

ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ہیں،

وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا......

ان کو کان دیئے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں ہیں،

أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ......

یہ جانوروں کی طرح ہیں،

بَلْ هُمْ أَضَلُّ .....

بلکہ جانوروں سے بھی پست تر اور بدتر ہیں،

أُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ٥

یہ غافل ہیں، یہ بیگانہ لوگ ہیں، یہ اجنبی لوگ ہیں، کیا تمہیں اس لئے انسان بنایا تھا

قرآن کا اجنبیوں کیلئے پیغام

اور عقل وشعور دیا تھا کہ اجنبی بن کر رہو؟ پھر تو جانور بہتر ہے کیونکہ جانور کو تو خدا نے عقل وشعور نہیں دیا، عقل وشعور لے کر بھی اگر انسان جانور کی طرح اجنبی رہے تو پھر تو یہ جانور سے بھی بدتر ہے مثلاً فرض کریں کہ ایک جانور اِدھر آتا تو اس کا انقلاب سے کیا تعلق ہوتا؟ آیا اس کا کوئی تعلق تھا؟ مثلاً اگر کوئی بھینس آتی، کوئی گائے آجاتی، کوئی پرندہ اِدھر آجاتا تو اس کا انقلاب سے کیا تعلق تھا؟ اجنبی آیا اور اجنبی اڑ کر چلا گیا کہ جیسے مہاجر پرندے آتے ہیں، خدا نے جس انسان کو عقل وشعور دیا اور وہ بھی اجنبی وار یہاں پر رہ کر چلا گیا تو واقعاً حق بنتا ہے کہ یہ جانور سے بھی بدتر ہے، پس چونکہ ان قلوب نے اجنبی نہیں رہنا بلکہ ان سے سمجھنا ہے، ان سے سوچنا ہے، ان سے تفکر کرنا ہے، ان سے تدبر کرنا ہے، خدا نے قلوب دیئے ہی اس لئے ہیں کہ ان کے ذریعے سے تدبر اور تفقہ کرو۔

پس پہلے انسان اس مقام پر فائز ہو، پہلے اپنے آپ کو اہلِ تدبر بنائے، اہل تدبر کب بنے گا؟ جب سرسری پنا ختم کردے، ہر چیز میں تدبر کی عادت بنالے، انسان تدبر کے مقام پر فائز ہو یعنی اس دل سے تفقہ کرے، رکے، سوچے اور اشیاء کے اندر غور کرے، مطالعہ کرے، فقط ان کو کھانے کے چکر میں نہ رہے، فقط ان کو ہڑپ کرنا مقصد نہ ہو، فقط معدہ بھرنے کی فکر میں نہ ہو بلکہ ذہن بھرنے کی فکر میں ہو، وہ انسان جب قرآن کے سامنے آتا ہے تو تدبر کرتا ہے ورنہ اگر انسان دیگر جہانِ ہستی میں، حوادثِ عالم میں اور روزگارِ زندگی میں سرسری ہو اور یہی سرسری انسان قرآن کے سامنے آجائے اور ناگہاں تدبر شروع کردے تو ایسا کوئی معجزہ یا اتفاق رونما نہیں ہوتا ہے، ایسا ممکن ہی نہیں ہے، جب تک انسان خود عملاً پوری زندگی کے اندر اور باہر تدبر نہ کرے تو قرآن کے اندر تدبر کرنا دوراز فہم ہے۔

حوالہ جات

(۱)..... (سورۂ مبارکہ رعد، آیہ ۴) (سورۂ مبارکہ روم، آیہ ۲۴)

(۲)......(سورۂ مبارکہ عنکبوت، آیہ ۳۵)

(۳)..... (سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ ۲۴)

(۴)..... (تفسیر المیزان - العلامة الطباطبائیؒ، مقدمة و بحثِ روائي، الجزء ۳، صفحه ۴۰) (شرح خطبه البیان امام علیؑ بن ابی طالبؑ) (باطن و تأویل قرآن)

(۵)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۹۷)

(۶)..... (سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۹۸)

(۷)......(التفسیر و المفسرون)

(۸)..... (تنبیه الغافلین وارشاد الجاهلین عما یقع لهم من الخطأ حال تلاوتهم لکتاب اللّٰه المبین، باب تنبیهات، الجزء ۱، صفحه ۱۱۹)

(۹)..... (غرر الحکم و درر الکلم، الجزء ۱، صفحه ۵۷) (میزان الحکمة - الریشهری، الجزء ۸، صفحه ۲۰۷)

(۱۰)..... (مَصَاعِدُ النَّظَرِ لِلاشْرَافِ عَلی مَقَاصِدِ السُّوَرِ - ابراهیم بن عمر بن حسن الرباط بن علی بن أبی بکر البقاعی، المتوفی: ۸۸۵ ھ، الجزء ۱، صفحه ۳۳۸)

(۱۱)......(بانگِ درا، حصۂ سوم، عنوان: طلوعِ اسلام، صفحه ۲۶۸)

(۱۲)..... (بانگِ درا، حصۂ اول، غزلیات، صفحه ۹۸)

(۱۳)......(دیوان حافظ شیرازی،از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی،غزل۳۱۷،صفحہ۲۴۷)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۲۹)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ حج،آیہ۶۵)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ اعراف،آیہ۱۷۹)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ رحمٰن،آیہ۴۳،۴۴،۴۵)

فصلِ ادبِ چهارم

﴿تدبر در قرآن﴾

(حصّه دوم)

١)عالمِ خلقت کے مطالعے کی ضرورت

٢)قیمتی چیزیں پردوں میں مخفی

٣)اهلِ تدبر جنت کے حقدار

٤)تدبر، ترقی کا پیش خیمه

٥)علماءِ دین کون هیں؟

٦)اولوا الالباب کون هیں؟

٧)اهلِ لُبّ هی خدا کو پاسکتے هیں

٨)تدبر کی مشق کے مراحل

٩)سوال پیدا هوتا هے

١٠)سات ملین سوالوں کی تیاری

١١) قرآن اهلِ تدبر کا راهنما

١٢)متدبر بنے بغیر قرآن سمجھ نهیں آسکتا

١٣)رسول اللهﷺ کا قرآن میں غور و فکر کرنا

۱) عالمِ خلقت کے مطالعے کی ضرورت

خدانے عالمِ طبیعت کا نظام اس طرح خلق کیا ہے کہ جتنی بھی قیمتی چیزیں، نازک چیزیں اور کارآمد چیزیں ہیں انہیں خدانے کسی نہ کسی طبعی پردے کے اندر مخفی و پنہاں کر کے خلق کیا ہے، مثلاً ہم یہی چیزیں جو کھاتے ہیں مثلاً سیب ہے، انگور ہے، انار ہے، اسے انسان فقط معدے کی اِشتہا کے اثر میں نہ دیکھے کہ یہ کھانے کی چیز ہے اور فقط دیکھتے ہوئے انسان کی رال ٹپک آئے، بلکہ اس کا مطالعہ کریں، پہلے اس کو ذہن سے دیکھیں، غور کریں، فکر کریں، یہ ایک کتاب ہے کہ جو خداوند تبارک و تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے لہٰذا پہلے اس کتاب کو پڑھیں۔

عموماً پاکستان میں چونکہ آزادی ہے اور شاید کوئی ایسا آزاد ملک نہ ہو البتہ ہندوستان میں بھی سنا ہے کہ ایسی آزادی موجود ہے کہ وہاں پر حیوانات جس سڑک پر چاہتے ہیں آجاتے ہیں مثلاً بھینسیں، بیل، گدھے جو جانور بھی آکر روڈ بلاک کرنا چاہیں، جہاں چاہیں بیٹھ جائیں اور جہاں جو مرضی ہے کریں، عموماً یہ آوارہ بھینسیں یا گائیں شہروں میں کہ جہاں ظاہر ہے کہ سبزہ، گھاس یا ان کے چرنے کی چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ یہاں پلاسٹک ہے، تھیلیاں ہیں، کچرا ہے لہٰذا یہی ان کی یہ مرغوب غذا ہے، یہی کھا کے ان کا پیٹ بھرتا ہے۔ یہ آوارہ بھینس یا آوارہ گائیں جو شہر کے اندر پلاسٹک، کچرا، ردی کاغذ اور اخبار کھاتی ہیں اگر کسی لائبریری میں چلی جائیں یا کسی بک اسٹال پہ چلی جائیں تو انہیں وہ لائبریری نظر نہیں آئے گی بلکہ یہ چراگاہ نظر آئے گی، مرغوب ترین غذائیں نظر آئیں گی چونکہ کاغذ کھانا، پلاسٹک کھانا، چپل کھانا، جوتے کھانا، کچرا کھانا ان کی خوراک

ہے، میونسپل کمیٹی (Municipal committee) کا کام وہاں پر بھینسیں اور گائیں انجام دیتی ہیں۔ یہ گائے سب کچھ کھا جاتی ہے، کاغذ، چمڑا، تھیلیاں اور پلاسٹک بھی کھا جاتی ہیں، یہ چیزیں کھانے کی نہیں تھیں لیکن شہر میں اس گائے کو کچھ اور نہیں ملتا ہے، آوارگی کی وجہ سے یا مالک نہ ہونے کی وجہ سے یا اس کا کوئی نگہبان نہ ہونے کی وجہ سے اس کو ان چیزوں کو کھانے کی عادت پڑ گئی ہے کہ جو کھانے کی نہیں ہیں، از جملہ کتابیں بھی کھا جاتی ہے مثلاً اخبار کا کوئی اسٹال لگا ہوا ہو یا کوئی اخبار فروشی کا مرکز ہو اور اس کے مالک نے بھی آزاد چھوڑا ہوا ہو تو یہ گائے جائے گی اور سارے اخبار کھا جائے گی، اخبار پڑھنے کے لئے ہے، گائے، بھینس کے لئے نہیں ہے لیکن یہاں بھینس کے کھانے کی چیز ہے اور اس کی خوش مزہ غذا ہے۔

انڈیا کی ایک خبر آئی تھی کہ ایک زچہ اسپتال میں بچہ پیدا ہوا اور اسکے کچھ گھنٹوں کے بعد اس عورت کو بچے سمیت ہسپتال والوں نے مُرخّص کیا کہ گھر جائے، اس کا شوہر حساب کتاب کر رہا تھا، ہسپتال میں پیسے دے رہا تھا اور عورت بچہ لے کر بیٹھی ہوئی تھی، آوارہ کتا اندر ہسپتال میں آیا اور اس نومولود بچے کو کہ جو چند گھنٹے پہلے پیدا ہوا تھا اٹھا کر لے گیا، اتنی آزادی اور دنیا میں حیوانات کے حقوق کا احترام شاید جتنا ہندوستان و پاکستان میں ہے کہیں بھی نہیں ہے۔

ان مناظر کو دیکھ کر انسان سمجھے کہ یہ جانور جو کتابیں کھا جاتا ہے، آپ کیسے بڑی قیمتی مطالعے کی کتاب اور علم کا ذخیرہ ہے لیکن ایک بھینس کے لئے ایک لقمہ و چارہ ہے، اسی طرح بہت سارے مناظر خدا نے بنائے ہیں، بہت ساری اشیاء خلق کی ہیں کہ جو اہلِ عقل کے لئے کتابیں ہیں

لیکن اہل معدہ کے لئے یہ چارہ ہے یعنی خدا نے بہت ساری چیزیں کتابیں بنا کر خلق کی ہیں، کتابیں یعنی جن کے اندر معرفت اور آیاتِ وجودئ خدا موجود ہیں لیکن انسان بھی آوارہ بھینسوں کی طرح ان سب کو کھا جاتا ہے۔ انسان حشرات اور پرندوں پر غور کرے، یہ موجودات جو ہمارے اردا گرد صبح و شام رہتے ہیں یہ سب تجلیاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں لیکن انسان غافل ہے،

لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ٥(١)

درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

یعنی بصیرت نہیں ہے، یہ چیزیں ہمیں آنکھوں سے نظر آتی ہیں اور پھر رال ٹپکتی ہے اور انہیں کھانے کا جی کرتا ہے لیکن ان کے مطالعہ کی طرف اور ان کے اندر غور وفکر وتدبر کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا ہے اور ان میں متجلی نظر نہیں آتا ہے، ان لوگوں کو خدا نے جانوروں کی مانند قرار دیا ہے۔

جانور چار قدموں والے بھی ہیں اور دو قدموں والے بھی ہیں، جیسے قرآن نے بھی کہا کہ جن کو ہم نے دل دیا ہے لیکن ان سے سمجھتے نہیں ہیں، جن کو آنکھیں دی ہیں لیکن اس سے دیکھتے نہیں ہیں، جن کو کان دیئے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں ہیں،

أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ ......(٢)

یہ جانوروں کی طرح ہیں، مویشیوں کی طرح ہیں، مویشیوں کی طرح کیوں ہیں؟ چونکہ یہ ہر چیز کو چارہ سمجھتے ہیں، جس چیز کو سمجھنا ہے اسے بھی کھا جاتے ہیں، جس چیز کو پرکھنا ہے اسے بھی

علم و معرفت کے حصول کی ضرورت

کھا جاتے ہیں، جس چیز کو پڑھنا ہے اسے بھی کھا جاتے ہیں یعنی جو چیزیں ہم نے پڑھنے کے لئے خلق کی ہیں یہ وہ بھی کھا جاتے ہیں، جو چیزیں ہم نے سمجھنے کے لئے خلق کی ہیں یہ ان کو بھی کھا جاتے ہیں، یہ جانور ہیں جس طرح سے ایک بھینس لائبریری میں آجائے اور ردی کاغذ کھانے کے عادت ہو تو وہ ساری کتابیں کھا جائے گی اسی طرح سے ہم بھی درحقیقت بہت ساری کتابیں کھا رہے ہیں، جو چیزیں مطالعے کی ہیں ان کو بھی کھا رہے ہیں، جو چیزیں سمجھنے کی ہیں ان کو بھی کھا رہے ہیں، ہر چیز پہ نگاہ کرتے ہیں کہ اس کو کھا جائیں درحالیکہ بہت ساری چیزیں غور وفکر کے لئے ہیں۔

چونکہ قرآن نے ہمیں دعوت دی ہے کہ غور کریں، اللہ نے یہ جہانِ ہستی خلق کیا ہے، عالمِ طبیعت بنایا ہے لہٰذا ہم اس کے اندر غور کریں، اس کے بارش برسنے میں غور کریں، اس کے پانی بہنے میں غور کریں، کشتی چلنے میں غور کریں، دن رات بدلنے میں غور کریں، ہوائیں چلنے میں غور کریں، بیج اور فصلیں اگنے میں غور کریں، خزاں میں غور کریں، بہار میں غور کریں، یہ سب خدا کی کتابیں مطالعے کے لئے ہیں، یہ ساری کتبِ توحیدی ہیں لیکن انسان ان سب کو یا چراگاہ سمجھتا ہے یا چرنے کا سامان سمجھتا ہے، اس لئے قرآن نے کہا کہ

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ......

یہ تو مویشیوں سے بھی بدتر ہیں، جو چیزیں ہم نے ان کے سمجھنے کے لئے بنائی ہیں یہ انہیں کھانے کی نیت سے دیکھتے ہیں، ہم مناظرِ طبیعت، پھل، سبزیوں، کھیت اور روزمرہ کے حوادث پر اگر غور کریں، مطالعہ کریں تو تدبر سے انسان ان کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور یہی خداوند تبارک وتعالی

کی نشانیاں ہیں چونکہ راز خدا نے چھپائے ہوئے ہیں، راز کہتے ہی اس کو ہیں کہ جو چھپا ہوا ہو، جو پنہاں نہ ہو اس کو تو راز نہیں کہتے ہیں۔ آپ پھلوں کی ترکیب دیکھیں، پھلوں میں جو قیمتی اور نازک حصہ ہے کہ جس کے اندر غذائیت ہے اس کو کس اہتمام کے ساتھ رکھا ہوا ہے؟ خداوند تبارک وتعالیٰ نے طبعی طریقے پر کس طرح سے اس کی خلقت کی ہے؟ آپ اخروٹ کی ساخت میں غور کریں، بادام میں غور کریں، یہ چیزیں جو ہم خرید کر کھاتے ہیں ان پر غور کریں، انسان جب سبزیوں اور مختلف قسم کے فروٹز (Fruits) کو دیکھے تو غور وتدبر کرے کہ کیا عجیب لطفِ الٰہی ہے اور کیا حسین ترتیب ہے؟ کیسی خلقت ہے؟ کیسی بناوٹ ہے؟ کس طرح سے ان کے اندازے ہیں؟ کس طرح سے ان کے اندر مٹھاس ہے؟ کس طرح سے ان کے اندر غذائیت ہے؟ کس طرح سے ان کے اندر پاکیزگی ہے؟ ان کے اندر کس قدر نفاست ہے؟ انسان کو حیرت ہو جاتی ہے اور اصلاً کھانے کو جی نہیں کرتا ہے،

مثلاً جب انسان ایک انار کھول کر اس کے اندر بناوٹ کو دیکھے، اس کے اندر یہ چنے ہوئے دانے دیکھے، ان دانوں کی پاکیزگی کو دیکھے، ان کے اندر ذائقہ دیکھے، ان کا رنگ دیکھے، ان کا سائز دیکھے، ان کی شکلیں دیکھے، ان کی انجینئرنگ (Engineering) دیکھے اور ان کے اندر شفافیت دیکھے تو اس کے اندر ایک حیرت کی دنیا ہے۔ انگور کو دیکھے تو غور کرے کہ یہ ایک چھوٹی سی بیل ہے کہ جو گھاس سے اگی ہے، اسی زمین پر دوسری چیزیں بھی اگتی ہیں لیکن کس طرح سے انگور کا دانا بنتا ہے؟ کس طرح اس کا ظاہر بنتا ہے؟ کس طرح اس کے اندر جوس آجاتا ہے؟ کس طرح اس کے اندر مٹھاس آتی ہے؟ کس طرح اس کے اندر غذائیت پیدا ہوتی ہے؟ اور اس کے اندر کتنی شفافیت و

عالم خلقت سے مطالعہ کی ضرورت

نزاکت وظرافت موجود ہے؟

ناریل میں غور کریں کہ یہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی صناعت اور خلاقیت کا کس قدر زیبا اور حسین منظر ہے، انڈہ جو روز ابال کر اور فرائی کر کے کھا جاتے ہیں اس پر غور کریں، فکر کریں کہ یہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی خلقت کی کیسی نشانی ہے؟ وجودِ خدا کی کیسی نشانی ہے؟ پرندوں کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھیں، بارش برستے ہوئے دیکھیں تو ان ساری حقیقتوں پر تدبر کریں، چنانچہ اہلِ تدبر گئے اور انہوں نے پانی کو کھول کر دیکھا اور کہا کہ یہ پانی عنصر نہیں ہے، ہمارے گزشتگانِ علمی اور بزرگانِ علمی خطا کرتے تھے کہ پانی کو عنصر سمجھتے تھے، درحقیقت پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مجموعہ ہے، پانی دو ہواؤں کا مجموعہ ہے، یہ تدبر سے معلوم ہوا ورنہ پانی کی رطوبت سے ہی سروکار تھا اور پانی سے فقط نہانا دھونا اور دھوبی گھاٹ پر پانی استعمال کرنا ہی مقصود تھا، ردبر کے بغیر انسان ہرگز پانی کی حقیقت تک نہیں پہنچتا۔ عالمِ طبیعت ہمیں تدبر کی طرف بلاتا ہے، راہنمائی کرتا ہے، اگر تدبر نہ کریں تو سمجھ میں نہیں آتا ہے، روزمرہ یہ چیزیں ہمارے ہاتھ آتی ہیں لہٰذا ان پر غور وفکر کریں۔

۲)قیمتی چیزیں پردوں میں مخفی

خدا نے ہر قیمتی اور نادر چیز پر پردے چڑھا دیئے ہیں اور ان پردوں کے اندر اس حقیقی چیز کو پنہاں رکھا ہے کہ جو ہماری جسم کی غذائی ضرورت ہے، یہ غذائی ضرورت اگر سامنے ہوتی مثلاً اخروٹ کا مغز سامنے ہوتا، پتوں کی طرح چھلکے کے بغیر ہوتا اور ہر جگہ لٹکا ہوا ہوتا تو انسان زحمت ہی نہ کرتا،

اخروٹ توڑنا بھی نہ پڑتا، یہ کام آسانی سے ہوسکتا تھا، جیسے بعض نے آکر جب بھینگی دید اور بھینگی آنکھ سے اس جہان کو دیکھا تو انہیں اس میں کچھ خلل نظر آیا، انہوں نے کہا کہ آپ یعنی قائلینِ توحید مدعی ہیں کہ جہان بڑا منظم ہے، احسن نظام ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس نظام ہستی کا بہترین نظام بنایا ہے اور اس سے بہتر ممکن نہیں ہے، سب سے بہترین نظام یہی ہے کہ جو بنا ہوا ہے، انہوں نے کہا کہ ہمارے نزدیک یہ بہترین نظام نہیں ہے، بہترین نظام یہ ہوتا کہ مثلاً انسان کا دل جو اتنے پردوں کے نیچے پنہاں ہے، چھپا ہوا ہے، اگر بیمار ہو جائے تو آپریشن کرنا پڑتا ہے اور آپریشن آسان بھی نہیں ہے، یہ دل باہر ہی کسی تھیلی میں پڑا ہوتا جیسے کینگرو کے شکم کے نیچے تھیلی ہوتی ہے اور اس کے اندر اس کا بچہ پڑا ہوتا ہے، اس طرح سے انسان کا دل بھی ایک تھیلی کے ساتھ ہوتا جو بدن کے ساتھ لٹکی ہوئی ہوتی لہٰذا جب بیمار ہوتا تو نکال کر اس کو ٹھیک کر لیتے، دل اتنا پیچھے چھپا کر رکھا ہوا ہے مثلاً گردہ اتنی تہہ کے نیچے ہے کہ اگر گردے کی بیماری ہو جائے تو اس کو نکال کر ٹھیک کیسے کیا جائے؟ یہ ساری چیزیں سامنے ہونی چاہئے تھیں، انہوں نے خدا کی صنائع پر اعتراضات کئے، ظاہر ہے کہ بھینگا آدمی احمقانہ اعتراض کرتا ہے، پھر تو اگر انسان کا مغز خراب ہو جائے تو مغز تک رسائی اور مشکل ہے چونکہ اس کے چاروں طرف ہڈی ہے، چاروں طرف کوئی دریچہ نہیں ہے، مغز کے آپریشن کے لئے ڈرل سے سوراخ کرنا پڑتا ہے، اس کے لئے بھی جیب کی طرح کوئی چیز ہوتی کہ جس میں مغز پڑا ہوتا اور جب خراب ہوتا تو انسان مغز ٹھیک کروالیتا۔

اگر کھوپڑی میں دماغ اور مغز ہوتا تو انسان کے ذہن میں ایسا اشکال یا شبہ نہیں آتا۔ بدن کی

چیزیں پردوں میں مخفی

ساخت میں جو بھی کوئی قیمتی ترین چیز ہے وہ بدن کے اندر مخفی ترین ہے، پنہاں ترین ہے، اس کو زیادہ پردوں کے نیچے چھپایا گیا ہے اور سخت پردوں کے حصار کے اندر کھا گیا ہے، یہ سب چیزیں انسان کو تدبر کے لئے دعوت دیتی ہیں۔ آپ ایک فروٹ کے اوپر سے چھلکا اتار کر اس کی حقیقت تک یعنی اس کے مغز تک پہنچتے ہیں اور جب مقصود تک پہنچتے ہیں تو وہ عمل درحقیقت ہم سے تدبر کروا رہا ہوتا ہے، یہ تدبرِ عملی ہے، مثلاً آپ کیلا کھاتے ہیں تو چھلکا اتارتے ہیں اور اس کے مغز تک پہنچتے ہیں پھر اسے کھاتے ہیں تو یہ تدبرِ عملی ہے، آپ کو عملاً تدبر کی مشق کروائی جارہی ہے، جانور کو تدبر نہیں کرنا ہے لہٰذا وہ چھلکے سمیت کھا جاتا ہے بلکہ شاید اسکے لئے چھلکا زیادہ مرغوب ہے۔ عالمِ طبیعت انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دے رہا ہے یعنی انسان کا مقصود پردوں کے نیچے پنہاں رکھا ہے گیا تاکہ انسان تلاش کرے، جسمانی کاوش ہو اور جسمانی کوشش کے ذریعے ان حقائق تک جا پہنچے، اسی طرح سے الفاظ ہیں، الفاظ کے اندر حکمتیں ہیں، معانی ہیں اور انسان تدبر سے ان کی حقیقتوں تک پہنچتا ہے۔

انسان کے لئے خدا نے کوئی چیز اس طرح برملا نہیں رکھی ہے چونکہ انسان کو عقل دی ہے اور جانور کو نہیں دی ہے لہٰذا جانور کے مقصود واضح و روشن ہیں، کھلم کھلا اس کی دسترس میں ہیں لیکن انسان کی مطلوبہ چیزیں اور انسان کے لئے حقائق خداوند تبارک وتعالیٰ نے پردوں کے پیچھے مخفی رکھے ہیں، انہی پردوں کے پیچھے جانا، ان پردوں کو چیر کے حقیقت تک پہنچنا تدبر ہے۔ الفاظ ایک پردہ ہے، مفاہیم بھی ایک پردہ ہیں، تصورات بھی ایک قسم کا پردہ ہیں، انسان کے خیالات بھی ایک قسم کا پردہ ہیں، یہ سب حقائق تک پہنچنے کے لئے ہیں اور اہلِ تدبر وہ ہیں کہ جو الفاظ کے پردوں کو چاک کر کے

ان کی حقیقتوں تک پہنچتے ہیں۔ آپ غور کریں کہ احادیث کے چھوٹے چھوٹے جملوں سے یا ایک چھوٹی سی آیہ سے اہلِ تدبر نے کتنا علمی مواد اور کتنا حکمت کا مواد نکالا ہے، جس طرح ایک معدن ہے، کان ہے، ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا ہے لیکن اس کے اندر کتنی قیمتی معدنیات بھری ہوئی ہیں کہ اہل تدبر ان معدنیات تک پہنچتے ہیں۔

جس طرح سے یہاں پانی کی نہریں بہتی ہیں اور نالیوں میں پانی بہتا ہے تو پانی کے بجائے یہ تیل بھی اسی طرح نالیوں میں بہایا جا سکتا تھا۔ انسان نے اتنا تدبر کیا کہ اس نے کئی کلومیٹر نیچے جا کر زمین میں موجود چیز نکال دی، یہ کام انہی لوگوں نے کیا جو اہلِ تدبر تھے، جن کو خدا نے عقل دی تھی۔ انہوں نے زمین کے پردے چاک کئے، چیرے اور کئی کلومیٹر دبیز پردے چیر کر زمین کے نیچے موجود ایک حقیقت تک جا پہنچے، اپنی ضرورت تک جا پہنچے لہٰذا ان سے اسی لئے عرض کیا تھا کہ علامہ اقبالؒ کے بقول کارِ جہاں بینی، کارِ جہاں بانی سے سخت تر ہے چونکہ جہاں بانی میں ظاہر ہے کہ آپ کا زمین سے سروکار ہے لیکن جہاں بینی میں آپ کو زمین کے اندر اترنا پڑتا ہے، عالم کے اندر جانا پڑتا ہے، جہاں بینی تدبر کی محتاج ہے بلکہ جہاں بانی بھی جہاں بینی پر موقوف ہے، اگر انسان جہان شناس نہ ہو، اہلِ تدبر نہ ہو اور حقیقتِ عالم سے آشنا نہ ہو تو اس جہان کو بھی نہیں چلا سکتا ہے، اس جہان پر حکم فرمائی و حکمرانی نہیں کر سکتا ہے، کارِ جہاں بینی انسان کے لئے دشوار تر ہے، آپ ایک ایک کر کے موضوع دیکھیں کہ جن لوگوں نے ان حقیقتوں تک رسائی پیدا کی ہے وہ کس قدر عظیم اور گراں قدر لوگ ہیں؟

قیمتی چیزیں پردوں میں مخفی

۳)اہلِ تدبر جنت کے حقدار

ہم داڑھی اور اس میں بھی داڑھی کے سائز اور پائنچا دیکھ کر کہتے ہیں کہ کون جنت میں جائے گا؟ اور کون جہنم میں جائے گا؟ لیکن قرآن کہتا ہے کہ جو تدبر کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا...... (۳)

اور یقیناً ہم نے انسان و جنات کی ایک کثیر تعداد کو گویا جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں......

یعنی ہم نے جہنم کے لئے کونسی مخلوق پیدا کی ہے؟ جو تدبر نہیں کرتی ہے، جنوں اور انسانوں میں سے جو غور نہیں کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے ورنہ انسان تدبر کئے بغیر پائنچا تھوڑا اوپر نیچے رکھنے سے اور ڈاڑھی تھوڑی زیادہ بڑی کرنے سے جنت میں چلا جائے تو یہ ناممکن ہے۔ خود دین پکار کر کہہ رہا ہے کہ جس عبادت میں تدبر نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں ہے، جس قرآن خوانی میں تدبر نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں ہے، کتنا ہی اچھا اور مقدس کام ہو لیکن اگر انسان اس میں تدبر نہ کرے تو اس کے اندر کوئی خیر موجود نہیں ہے، اہلِ خیر وہ ہیں کہ جو تدبر کرتے ہیں اور انہی کے تدبر کے نتیجے میں دنیا میں رونق ہے۔

٤)تدبر، ترقی کا پیش خیمہ

دنیا میں جتنی بھی کشفیات، ایجادات اور مصنوعات ہیں یہ سب اہل تدبر کے تدبر کا نتیجہ ہیں، اگر وہ تدبر نہ کرتے اور ہماری طرح ہی ہوتے، تدبر کا میٹر آف (Off) کر کے بچت کر رہے ہوتے چونکہ ہم بچت اسکیم کے تحت عقل بھی استعمال نہیں کرتے، کہتے ہیں نا کہ پانی میں بچت کریں! بجلی میں بچت کریں! گیس میں بچت کریں! کم خرچ کریں! تا کہ بل زیادہ نہ آئے، اسی طرح اکثر نے اپنا تدبر کا میٹر بھی آف کیا ہوتا ہے کہ بل زیادہ نہ آئے، اگر ان لوگوں نے بھی ہماری طرح میٹر آف کیا ہوتا اور کسی چیز میں تدبر نہ کرتے تو ہم بھی آج خچروں پہ اور گھوڑوں پہ بیٹھے ہوتے اور کچے گوشت پکڑ کے لومڑ، گیدڑ کھا رہے ہوتے اور وہی شکار کے زمانے اور پتھر کے زمانے کا تمدن ہوتا۔

ترقی اور پیش رفت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ اہلِ تدبر نے آکر راز کشف کئے ہیں، حقائق کشف کئے ہیں، آپ غور کریں کہ ایک سادہ سے جملے سے انہوں نے کس قدر حکمتیں استخراج کی ہیں، یہ فکر اہلِ تدبر کا ہی نتیجہ ہے کہ ایک حدیث سے ایک پوری کتاب تحریر کردی۔ مثلاً چند آیات اور احادیث سے پوری کتاب الصلوٰۃ بن گئی، ایک پوری کتاب الصوم بن گئی، کتابِ حج بن گئی، اگر یہ فقہا، یہ اہل تدبر نہ ہوتے اور ان الفاظ کے پردوں کو چیر کے اور ان کے اندر موجود حقائق و مفاہیم تک نہ پہنچتے تو ہمارے پاس اتنا عظیم ذخیرہ موجود نہ ہوتا، چھوٹے چھوٹے جملوں سے، نیم سطر کے ایک جملے سے اہلِ تدبر نے ایسی حکمتیں کشف کی ہیں کہ انسان کی عمر بھر کے لئے کافی ہیں۔

۵) علماءِ دین کون ہیں؟

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علومِ اسلامی کہ جن کے اوپر اسلام کا بینر لگا دیا جائے اور جو عربی میں ہیں تو وہ سارے علومِ اسلامی ہیں اور دوسرے علوم جو کسی اور زبان میں ہیں یا جن کے اوپر اسلامی بینر نہ لگا ہوا ہو وہ اسلامی نہیں ہیں، علمائے دین کہ جن کو ہم کہتے ہیں کہ علمائے دین کیا کر رہے ہیں؟ جو علمائے دین آیاتِ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں، جو علمائے دین روایات کی تفسیر کرتے ہیں اور ان کے اندر موجود حقائق کو کشف کرتے ہیں ان کو ہم علماء کہتے ہیں لیکن جو فزکس کے عالم ہیں، کیمسٹری کے عالم ہیں اور دوسرے علوم کے عالم ہیں انہیں علماءِ دین نہیں کہتے ہیں بلکہ سائنسدان کہتے ہیں، یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ یہ بھی تو یہی کام کرتے ہیں، یہ بھی ایک آیتِ خدا کو لے کر اس کی تفسیر کرتے ہیں، اس کی تشریح کرتے ہیں اور اسکی حقیقت تک پہنچتے ہیں، وہ علماء الفاظ کے اندر چھپے ہوئے حقائق تک پہنچتے ہیں اور یہ علماء ان موجودات کے اندر چھپے ہوئے حقائق تک پہنچتے ہیں۔

اگر دونوں کی غرض حقیقت کشف کرنا ہو تو دونوں علمائے دین ہیں لیکن اگر غرض یہ ہو کہ ہم اس سے ملازمت حاصل کریں گے، نوکری حاصل کریں گے اور شہرت پیدا کریں گے تو اس صورت میں یہ عالمِ دنیا ہیں، اگر کوئی قرآن اس لئے پڑھے کہ میری شہرت ہو، قرآن اس لئے پڑھے کہ مادیت تک پہنچے، قرآن کی تفسیر اس لئے کرے کہ لوگوں میں اپنا نام پیدا کرے تو یہ عالمِ دنیا ہے نہ کہ عالمِ دین ہے، اگر حقائق تک پہنچے تو یہ عالم ہے، ہمارے مطابق کوئی الفاظ کی تشریح کرے تو یہ دین ہے لیکن کوئی موجوداتِ عینیہ کی تشریح کرے، موجوداتِ حقیقی کی تشریح کرے تو یہ دین نہیں

ہے،حالانکہ یہ بھی دین ہے، یہ بھی تو آیاتِ خدا ہیں، ایک آیتِ لفظی خدا ہے اور ایک آیتِ عینی خدا ہے، ایک آیتِ لفظی کی تفسیر میں مشغول ہے اور ایک آیتِ عینی کی تفسیر میں مشغول ہے لیکن اگر دونوں کا مقصد اس سے دنیوی مفاد حاصل کرنا ہو تو دونوں علمائے دنیا ہیں، قرآن پڑھا کر بھی عالمِ دنیا ہیں، فقہ پڑھا کر بھی عالمِ دنیا ہیں اور فزکس پڑھا کر بھی عالمِ دنیا ہیں لیکن اگر ان کا مقصود یہ ہو کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس ظاہر کے اندر خدا نے کیا حقیقت چھپا رکھی ہے؟ ہم اس راز تک پہنچنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس راز سے آشنا کرنا چاہتے ہیں تو یہ علمائے دین ہیں۔ انبیاءؑ و اولیائے خداؑ نے بھی یہی کام کیا ہے۔

٦) اولوا الالباب کون ہیں؟

جو لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں انکی قرآن نے سخت الفاظ میں مذمت کی ہے کہ سورۂ اعراف کی ایک آیہ میں آپ کیلئے صرف اشارہ کیا تھا، اسی کے مقابلے میں ایک اور طبقہ بھی قرآن نے ذکر کیا ہے کہ جنہیں اولوا الالباب کہا ہے، پہلے طبقے کو کالانعام گیا ہے،

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا...... (۴)

عقل ہے لیکن اس سے کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں لیکن اس سے عبرت نہیں لیتے ہیں، کان ہیں لیکن اس سے موعظہ نہیں سنتے ہیں، ان لوگوں کو کہا ہے کہ یہ کالانعام ہیں اور ان کے بجائے کچھ ایسے ہیں جو اولی الالباب ہیں، متعدد آیات میں قرآن مجید نے اولی الالباب کا ذکر کیا ہے از جملہ

سورۂ آلِ عمران میں آیہ ۱۹۰ میں فرمایا کہ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَآیَاتٍ لِّاُولِی الْأَلْبَابِ۝

بیشک زمین و آسمان کی خلقت اور لیل و نہار کی آمد و رفت میں صاحبانِ عقل کے لئے قدرت خدا کی نشانیاں ہیں۔

لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْأَلْبَابِ......(۵)

یقیناً ان کے واقعات میں صاحبانِ عقل کے لئے سامان عبرت ہے.....

وَوَهَبْنَا لَهٗ أَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِکْرٰی لِأُولِی الْأَلْبَابِ۝(۶)

اور ہم نے انہیں ان کے اہل و عیال عطا کر دیئے اور اتنے ہی اور اپنی خاص مہربانی سے عطا کیے اور صاحبانِ عقل کے لئے عبرت و نصیحت (قرار دی)۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَکَهٗ یَنَابِیْعَ فِی الْأَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُهٗ حُطَامًا إِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِأُولِی الْأَلْبَابِ۝(۷)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے پھر اسے مختلف چشموں میں جاری کر دیا ہے پھر اس کے ذریعہ مختلف رنگ کی زراعت پیدا کرتا ہے پھر وہ کھیتی سوکھ جاتی ہے تو اسے زرد رنگ میں دیکھتے ہو پھر اسے بھوسا بنا دیتا ہے، ان تمام باتوں میں صاحبانِ عقل کے لئے

یاددہانی اور نصیحت کا سامان پایا جاتا ہے۔

هُدًى وَّذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ (۸)

جو کتاب مجسمۂ ہدایت اور صاحبانِ عقل کے لئے نصیحت کا سامان ہے۔

ان لوگوں کو کہا ہے کہ یہ اولی الالباب ہیں، اولی الالباب یعنی صاحبانِ لُبّ ہیں، اولی بمعنیٰ ذو ہے یعنی صاحب، یہ صاحبانِ لُبّ ہیں، لُبّ حقیقت کو کہتے ہیں، اصلی مقصود کو لُبّ کہتے ہیں، بادام اور اخروٹ کے اندر موجود مغز کو لُبّ کہتے ہیں کیونکہ ان کے اندر اصلی چیز وہ ہوتی ہے، حقیقت اور روح وہ ہوتی ہے، لُبّ اس حقیقت کو کہتے ہیں کہ جو چھپی ہوئی ہے، پنہاں ہے، پردوں کے نیچے ہے اور اس کی وجہ سے شے کی قیمت ہے، اسی وجہ سے عقل کو بھی لُبّ کہتے ہیں کیونکہ انسان کی انسانیت، انسان کی قیمت، انسان کا سارا مقام عقل کی وجہ سے ہے، اگر عقل کی تعطیل ہو جائے، عقل ختم ہو جائے تو انسان اور ایک جانور میں، انسان اور ایک ستون میں کوئی فرق نہیں ہے، حقیقتِ انسان، قدرِ انسان رہینِ عقلِ انسان ہے، علماء نے اولی الالباب کا دو طرح سے معنیٰ کیا ہے، ایک وہی رائج تفسیر اولی الالباب یعنی صاحبانِ عقل، عقل کو بھی لُبّ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ بھی حقیقتِ انسان ہے، مقصودِ اصلیٔ انسان ہے، کچھ لوگ صاحبِ عقل ہیں یعنی صاحبِ تدبر و صاحبِ تفقہ ہیں۔ کالانعام کی طرح نہیں ہیں کہ ان کے دل ہیں لیکن یہ ان سے تفکر و تدبر نہیں کرتے ہیں،

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا......

انکے قلوب بغیر تفکر کے نہیں ہیں بلکہ " لهم قلوب يفقهون بها، يتدبّرون بها،

یتفکّرون بھا، یعقلون بھا "، یہ ان قلوب سے تفقہ کرتے ہیں، تدبر کرتے ہیں، تفکر کرتے ہیں، تعقل کرتے ہیں اور اس عقل کی مدد سے حقائقِ عالم میں غور کرتے ہیں۔ تدبر یعنی یہ لوگ موجودات کی حقیقت تک رسائی پیدا کرتے ہیں، اس وجہ سے ان کو اولی الالباب کہا گیا ہے۔

اولی الالباب کا دوسرا دقیق ترمعنیٰ بھی کیا گیا ہے، کچھ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ ظاہر کے تابع ہوتے ہیں، لُبّ کے مقابلے میں قِشر ہے، قشر یعنی چھلکا، کچھ ایسے لوگ ہیں جو فقط قشر کے درپے ہیں، چھلکے کی حد تک رسائی ان کا ہم وغم ہے، چھلکا ہاتھ آجائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں بہت کچھ حاصل ہو گیا ہے، جیسے کہ موجود بھی ہیں، علمی مدرسوں میں ادبیات پڑھ کر، صرف ونحو پڑھ کر حجۃ الاسلام ہو جاتے ہیں، اسلام سے پہلے پہلے ہی کہ ابھی اسلام بھی شروع نہیں ہوا ہے پہلے ہی حجۃ الاسلام ہو گئے، الفاظ کے آداب پڑھ لئے، الفاظ کی ابحاث پڑھ لیں، مبتدا و خبر پڑھ لی، صرف ونحو پڑھ لیا، کلمات کے اعراب و بنا پڑھ لئے لیکن اس کو علم کہاں ہے کہ الفاظ تو چھلکا ہیں، الفاظ تو ظاہر ہیں، لفاظی سیکھ لی ہے، علمِ الفاظ اگر حاصل کر لیا تو اب معانی کی نوبت ہے، آپ الفاظ کے اندر موجود پنہاں حقائق تک پہنچو، آپ نے الفاظ پر ہی اکتفا کر لیا، یہ لوگ اہلِ لُب نہیں ہیں، یہ لُب کے درپے نہیں ہیں۔

جیسے مزار میں جوس کی دکانیں ہوتی ہیں، جوس والے فروٹ سے جوس نکال کر کچرا جمع کرتے ہیں، انہی بازاروں میں جا کر غور کریں، دیکھیں کہ لوگ کیا کر رہے ہیں، کون آدمی کیا کر رہا ہے؟ ایک جوس نکال رہا ہے، ایک جوس پی رہا ہے، ایک جوس بیچ رہا ہے، یہ سارے کام ہو رہے ہیں

اور ایک آدمی آخر میں شام کو گدھا گاڑی لے کر آتا ہے اور وہ جتنا بھوسا یعنی نچوڑے ہوئے فروٹ پڑے تھے وہ سارا گدھا گاڑی میں ڈال کر لے جاتا ہے، اگر اسے جوس کا پیالہ دیں تو بھی وہ اس کا نہیں ہے، یہ جوس پینے نہیں آیا ہے، کبھی بھی آپ اس کو جوس پیتے ہوئے نہیں دیکھیں گے چونکہ وہ آتا ہی فقط نچوڑے ہوئے فروٹ کے چھلکے، کچرا اور بھوسا اٹھانے کے لئے ہے یعنی اس کی غرض یہی ہوتی ہے، فقط چھلکے جمع کرنا اس کا کام ہے، جوس والا جوس نکالتا ہے اور فروٹ کے دو حصے الگ کر دیتا ہے، جن کے پاس پیسے ہیں وہ جوس پی لیتے ہیں اور وہ بے چارہ پیسے کمانے کے لئے، فروخت کرنے کیلئے یا جانوروں کے کھانے کیلئے چھلکے اُٹھا کر لے جاتا ہے، اسی کو ہم دیکھیں کہ یہی کام دوسرے لوگ بھی کر رہے ہیں یعنی بعض دوسری دکانوں پر جہاں مثلاً چھلکا نہ پھینکا جاتا ہے، نہ بیچا جاتا ہے، وہاں پر بھی لوگ یہی کام کرتے ہیں، اگر آپ علمی مراکز میں چلے جائیں تو آپ کو وہاں بھی اسی طرح دو قسم کے لوگ نظر آئیں گے، کچھ ایسے ہیں جو گدھا گاڑی لئے ہوئے چھلکے جمع کر رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو جوس پی رہے ہیں، کچھ ہیں جو فقط ظواہر پہ اکتفا کئے ہوئے ہیں لیکن کچھ ایسے ہیں جو ان ظواہر کے اندر ان کی گہرائی میں اور عُمق میں اترے ہوئے ہیں، جوس یعنی وہ حقیقت اور لُبّ۔

کچھ ایسے ہیں کہ جو صاحبانِ لُبّ ہیں یعنی درپئے کشفِ لُبّ ہیں، اہل تدبر ہیں، قرآن نے ان کو بہت سراہا ہے اور فرمایا ہے کہ ہم نے اپنی نشانیاں اس عالم میں پھیلا دی ہیں لیکن ان نشانیوں تک کون پہنچے گا؟ صاحبانِ لُبّ پہنچیں گے،

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَآیَاتٍ لِّأُولِی

الْأَلْبَابِ ○ (۹)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ......

زمین اور آسمان کی خلقت، زمین اور آسمان یعنی پوری کائنات، قرآن میں جب یہ زمین اور آسمان کے الفاظ باہم استعمال ہوں تو اس سے مراد پورا جہانِ ہستی، پورا عالمِ ہستی اور پوری کائنات مراد ہے فقط زمین اور آسمان نہیں ہے، اس عالمِ ہستی میں ہم نے اپنی نشانیاں پھیلا دی ہیں، مقصودِ وجودِ عالمِ ہستی یہی تھا۔ زمین و آسمان کی خلقت میں ہماری نشانیاں ہیں،

وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ......

زمین کی گردش اور صبح و شام ہونا، دن کا آنا اور رات کا جانا، ان سب کے اندر

لَاٰیٰتٍ......

اللہ کی نشانیاں ہیں لیکن کس کے لئے ہیں؟

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○

جو صاحبانِ لُب ہیں نہ کہ جو صاحبانِ چھلکا ہیں، صاحبانِ چھلکا وہ ہیں کہ وہ کب افطار کریں؟ کب پکوڑے کھائیں؟ سموسے کے انتظار میں ہیں، کب دن نکلے تو ہم اپنے کام کاج کریں؟ کب کھیت میں جائیں؟ کب کھانا شروع کریں؟ ناشتے کا ٹائم کب ہوگا؟ بار بار گھڑی دیکھتے ہیں کہ صبح ہوئی ہے یا نہیں ہوئی ہے لیکن رات اور دن کے آنے میں کبھی غور نہیں کیا کہ یہ رات اور دن کیسے بدلتے ہیں؟ صرف انسان اس تفاوت کو دیکھے کہ رات کے بعد دن کا آنا اور دن کے بعد

رات کا آنا، اختلاف سے مراد ہے کہ ایک کا دوسرے کے خلف میں آنا، دن خلیفۂ رات ہے اور رات خلیفۂ دن ہے، خلیفہ یعنی بعد میں آنا، یہ ایک دوسرے کے بعد نوبت سے اور بڑے نظم کے ساتھ آتے ہیں، انسان اس حقیقت کو اور اس ظاہر کو کھولے، اس کے اندر اترے تو آپ کو کیا ملے گا؟ خدا کی نشانیاں ملیں گی بلکہ خود خدا ملے گا۔

۷) اہلِ لُبّ ہی خدا کو پاسکتے ہیں

اختلافِ لیل و نہار میں اللہ کی نشانیاں ہیں اور نشانیاں خدا کی طرف انسان کی نشاندہی کراتی ہیں، اہلِ لُبّ وہ ہیں کہ جن کا یہ کہنا ہے کہ

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ......(۱۰)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا......

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَ بَعْدَهُ......(۱۱)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا، اس کے ساتھ بھی اور اس کے بعد بھی......

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ مَعَهُ......(۱۲)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس کے ساتھ خدا کو دیکھا......

یعنی امیر المومنین مولا علی علیہ السلام کے مطابق ہر چیز میں خدا ہے کہ جو صاحبانِ لب کو نظر آتا

ہے، ہمیں درخت، درخت نظر آتا ہے لیکن امیرالمومنین علیہ السلام کو درخت میں خدا نظر آتا ہے، امیرالمومنین علیہ السلام کو درخت آیتِ خدا نظر آتا ہے، ہمیں پھل نظر آتا ہے لیکن امیرالمومنین علیہ السلام کو یہ اللہ کی نشانی نظر آتا ہے، اس کے اندر خدا نظر آتا ہے، ہمیں خرمہ اور کھجور یعنی فقط کھانے کے لئے ایک شے نظر آتی ہے لیکن امیرالمومنین علیہ السلام کو اسی کے اندر خدا نظر آتا ہے، ہمیں چیونٹی نظر آتی ہے لیکن امیرالمومنین علیہ السلام کو چیونٹی کے اندر اللہ کی نشانی اور خدا نظر آتا ہے۔ یہ صاحبانِ لُب ہیں، پس ایک طبقے کو کالانعام کہا اور ایک کو اولی الالباب کہا،

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا......

عقل ہے، دل ہے، دماغ ہے، سوچنے کی قوتیں ہیں لیکن ان سے تدبر نہیں کرتے ہیں، اولی الالباب یعنی جو لُب تک پہنچتے ہیں، حقیقت تک پہنچتے ہیں، اگر کوئی ارادہ کرے کہ آج سے ہم قرآن میں تدبر شروع کرتے ہیں تو ممکن نہیں ہوگا، بسا اوقات ہوتا ہے کہ انسان کو جب توجہ ہوتی ہے تو آمادگی کے بغیر جا کر عمل شروع کر دیتا ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

حضرت امام باقر علیہ السلام سے ایک روایت لوہے کی خلقت کے بارے میں ہے کہ خدا نے لوہا پیدا کیا ہے اور اس کی حکمت کے طور پر یہی کافی ہے کہ آئینہ اس سے آئینہ بنتا ہے اور آئینہ معرفتِ خدا کے لئے ایک بہترین چیز ہے، انسان کو اگر حقیقتِ آئینہ معلوم ہو جائے کہ آئینہ کیا ہے تو یہ معرفتِ خدا کیلئے بہترین چیز ہے، یہی آئینہ جو ہم صبح و شام دیکھتے ہیں، جس کے سامنے کھڑے ہو کر ڈریسنگ کرتے ہیں، اپنے آپ کو سنوارتے ہیں، کنگھا کرتے ہیں، بال ٹھیک کرتے ہیں، میک اپ کرتے

ہیں، سب کچھ کرتے ہیں، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آئینے میں خود کو دیکھتے ہیں جبکہ امیر المومنینؑ کو ہر چیز میں خدا نظر آتا ہے۔

ہمیں ہر چیز میں ہم خود نظر آتے ہیں، یہ بھی میری ہے، وہ بھی میری ہے، جو میری نہیں ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے، بہترین چیزیں وہی ہیں کہ جو ہم سے منسوب ہیں، بہترین مدرسہ کونسا ہے؟ جس میں ہم پڑھتے ہیں، جس میں ہم نہیں پڑھتے ہیں وہ بیکار ہے، دوسرے میں کیا ہے؟ اس میں کچھ بھی نہیں رکھا ہے، بہترین استاد وہ ہے کہ جس کے پاس ہم پڑھتے ہیں، بہترین کتاب کونسی ہے؟ جو آپ نے خریدی ہے وہی بہترین کتاب ہے، جو آپ نے نہیں خریدی تو اس میں رکھا ہی کیا ہے؟ بہترین علاقہ کونسا ہے؟ جو ہم نے دیکھا ہے، جن علاقوں میں ہم نہیں گئے وہ بیکار ہیں، ہمیں ہر چیز میں ہم خود نظر آتے ہیں، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو ہر چیز میں خدا نظر آتا ہے، یہ جہان پورا آئینہ ہے، اس آئینے میں جب ہم کھڑے ہوتے ہیں تو ہم خود اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ ہم خود خواہ ہیں، خود غرض ہیں، خود محور ہیں، اگر خدا پرست ہوتے تو ہمیں امیر المومنین علیہ السلام کی طرح ہر چیز میں خدا نظر آتا، خود خواہ انسان کو خود اپنا سراپا ہی نظر آتا ہے۔

ایک دفعہ جب یہ روایت پڑھی کہ آئینہ خدا شناسی کے لئے ایک بہترین کتاب ہے تو ایک بزرگوار درس سے اٹھے اور سیدھے آئینے کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیونکہ آئینے عموماً ہوتے بھی واش روم میں ہیں تو وہاں پر انہوں نے آئینے کے سامنے معلوم نہیں کتنی دیر لگائی اور کھڑے رہے، پھر واپس آ کر کہا کہ آپ نے کہا تھا کہ انسان آئینہ دیکھے تو خدا شناسی کے لئے بہترین ہے، میں نے آئینہ دیکھا

مجھے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا، اس نے درست کہا، ایسے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے کہ انسان درس سے اٹھے اور جا کر آئینہ دیکھنا شروع کر دے، مثلاً درس سے اٹھے اور سیدھا جا کر قرآن میں تدبر کرنا شروع کر دے، ایسے کیا تدبر ہوگا؟ اس تدبر سے کیا ملے گا؟ سوائے سر درد کے، انسان کے سر میں درد ہونا شروع ہو جائے گا چونکہ تدبر کا مطلب یہ ہے کہ ایک آیت لے کر اس کو پڑھیں، غور کریں لیکن کیا غور کریں؟ غور کہاں سے کریں؟ کس طرح غور کریں؟ اس میں کیا ہے جو ہم غور کریں؟ یہی سوالات اٹھ اٹھ کر آخر سر میں درد ہونا شروع ہو جائے گا اور روزہ رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا، پھر کہیں گے کہ انہوں نے عجب تدبر بتایا کہ قرآن میں تدبر کریں۔

تدبر کیلئے پہلے انسان متدبر بنے اور آمادہ ہو نہ کہ ابھی ہم مقامِ تدبر پہ اہلِ تدبر ہیں یا اولی الالباب ہیں کہ صبح سے اگر ہم نے تدبر شروع کر دیا تو قرآن کچھ نہ کچھ ہمیں بتانا شروع کر دے گا یا ہم ان رازوں تک پہنچنا شروع کر دیں گے۔

مثلاً اگر کسی بچے کو بتایا جائے کہ عالمِ ہستی میں جو حقائق ہیں ان کے اندر بہت سارے راز چھپے ہوئے ہیں اور وہ بغیر اس کے کہ انہیں پڑھے، اسکول جائے اور ایک سائنسدان بنے صبح جا کر مثلاً کسی دانے کو کھول کر اس کے اندر حقیقت دیکھنا شروع کر دے کہ اس کے اندر کیا رکھا ہوا ہے؟ تو سوائے سر درد کے اور کچھ سر میں نہیں آئے گا۔ پہلے صاحبِ لُب بنتا ہے، صاحبِ لُب یعنی پہلے انسان اس ابتدائی حالت سے، ناقص حالت سے اوپر آئے فہم میں ترقی کرے، تخیل کی دنیا سے باہر آئے، ظاہر بینی کی دنیا سے باہر آئے، قشر بینی سے باہر آئے اور خود بینی سے باہر آئے تا کہ اس کو کچھ اور نظر

آئے یعنی انسان کے اندر تکاملِ علمی حاصل ہو۔

۸)تدبر کی مشق کے مراحل

ہم ابھی فقط حواس کی مدد سے کسی چیز کو دیکھتے ہیں یعنی ابھی ہماری آنکھیں ہمارے سب کام کرتی ہیں، عقل کچھ بھی کام نہیں کرتی ہے، آنکھ سے جو چیز نظر آتی ہے وہی ہم دیکھتے ہیں، آنکھ سے تو تدبر نہیں ہوتا ہے بلکہ عقل سے تدبر ہوتا ہے، کبھی عقل کو بھی موقع دو، ابھی تک تو آنکھ نے عقل کو موقع نہیں دیا، ابھی تک کان نے عقل کو موقع نہیں دیا ہے اور عقل میں سب سے بڑی مزاحم زبان ہے، زبان نے ابھی تک عقل کو موقع نہیں دیا ہے، کہتے ہیں کہ سکوت، خاموشی عقل کے کمال کی علامت ہے، یہ عقل کے کمال کی علامت کیسے ہے؟ چونکہ جب عقل فعال ہوتی ہے تو باقی ساری چیزیں سوئچ آف (Switch off) کرنی پڑتی ہیں، سارے حواس بند کرنے پڑتے ہیں پھر عقل اپنا کام کرتی ہے، اگر ایک آدمی بول رہا ہے اور اتنا بولتا ہے، اتنی باتیں کرتا ہے کہ کسی کو فرصت نہیں دیتا ہے تو یہ تعقل کیسے کرے گا؟ یہ کب سوچے گا؟ پہلے تدبر کے مقام پر پہنچے اور اپنے آپ کو متدبر انسان بنائے اور عرض کیا کہ تدبر کر سکتے ہیں، ہر چیز ہر ذرّۂ عالم ہمیں تدبر کی دعوت دے رہا ہے، ہمیں کہہ رہا ہے کہ مجھے کھولو اور دیکھو میرے اندر کیا ہے؟ یہی فروٹ جو فوراً کھا لیتے ہیں ان کو کھول کر دیکھیں، ان میں غور و فکر کریں کہ یہ ہمیں دعوتِ تدبر دے رہے ہیں۔

رمضان میں کھجور کھاتے ہیں، اس کھجور کو دیکھیں، غور کریں کہ یہ کھجور کہاں اور کس درخت

پہ لگی؟ اس درخت کو کھا کر دیکھیں تو اس میں یہ ذائقہ نہیں ہے، جس مٹی سے یہ کھجور اُگی ہے اس کے اندر تو یہ خاصیت نہیں ہے بلکہ اس کے درخت کی مٹی کو کھاد ڈالی گئی اور اس مضر مٹی سے یہ کھجور جیسی بہترین چیز بنی کہ جس کے اندر اتنی غذائیت ہے، پھر اس کھجور کی بناوٹ دیکھیں اور کھجور کے درخت پر تدبر کریں، اگر انسان کائنات کے ہر ذرے پر غور کرنا شروع کر دے، سوال اٹھانا شروع کر دے اور ان سوالوں کا جواب وہاں سے طلب کرنا شروع کر دے تو پھر انسان آہستہ آہستہ مشق کر کے اہلِ تدبر میں سے بن جاتا ہے یعنی انسان کی عقل کام کرنا شروع کر دیتی ہے، جب ہماری عقل کام کرنا شروع کر دے تو اس وقت اولی الالباب ہیں اور یہی لوگ جب قرآن کی طرف آتے ہیں تو قرآن انہیں کچھ اور بتاتا ہے لیکن اگر ہم فقط قرآن میں زبان چلائیں اور فقط آنکھوں سے قرآن پر نگاہ کریں تو صاحبِ لُب نہیں ہیں بلکہ اس طرح فقط الفاظ حاصل ہوں گے۔

پس یہ دو طبقے قرآن نے ذکر کئے کہ کچھ ایسے ہیں کہ دل ہیں، آنکھیں ہیں، کان ہیں، سب کچھ ہے لیکن انہیں استعمال نہیں کرتے، استعمال کرنے سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ انہیں درخت، درخت نظر نہیں آتا ہے، نا، بلکہ انہیں درخت کے اندر موجود راز نظر نہیں آتا ہے، یوں نہیں ہے کہ انہیں جانور نظر نہیں آتے ہیں، جانور نظر آتے ہیں لیکن ان جانوروں کے اندر موجود خدا کی نشانیاں نظر نہیں آتی ہیں، یہ اہل لُب نہیں ہیں اور دوسرے گروہ کو کہا کہ یہ اولی الالباب ہیں، خدا فرماتا ہے کہ ہم نے پورے عالم میں اپنی نشانیاں پھیلائی ہیں اور اِدھر سے ان انسانوں کو پیدا کیا ہے کہ ہماری نشانیوں کو جا کر مطالعہ کرو، کل عالمِ ہستی کتابِ خدا ہے،

مرا بہ ہیچ کتابی مکن حوالہ دگر

کہ من حقیقتِ خود را کتاب می بینم...... (۱۳)

یعنی مجھے کسی کتاب کے حوالے نہ کرو میں خود اپنی حقیقت کو کتاب پاتا ہوں......

انسان خود ایک صحیفۂ خدا ہے، انسان خود ایک کتابِ خدا ہے، ہم نے انسان کے لئے ان کے انفس میں اور آفاق میں آیات رکھی ہیں،

روایت میں ہے کہ

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ...... (۱۴)

جس نے اپنے آپ کو پہچانا بتحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا......

کبھی اپنے آپ میں غور کریں، کبھی اپنی شناخت پیدا کریں اور اپنی حقیقت میں غور کریں تا کہ اہل تدبر بن سکیں، بہت سارے سوال اپنے لئے اٹھائیں، ابھی تو ہم امتحان میں جواب دیتے ہیں مثلاً بیس سوال آتے ہیں ان کا بھی مشکل سے جواب دیتے ہیں یا فرض کریں پچاس سوال آتے ہیں اور ان میں اختیار ہوتا ہے کہ اتنے سوالوں کا جواب دیں لیکن خداوند نے ہمیں اس عالم میں بھیجا ہے کہ یہ دارِ امتحان ہے، اس عالم میں ہمیں کس لئے بھیجا ہے؟ اس کو توجہ کے ساتھ ذہن نشین کریں، اہلِ تدبر فرماتے ہیں کہ ہمیں اس عالم میں بھیجا ہے تا کہ ہم سات ملین (Seven Million) سوالوں کا جواب دیں، جو ان سوالوں کا جواب تلاش کرے وہ انسان کامل ہے۔

وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ٥ (۱۵)

اور یہی لوگ فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں۔

یہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جنہوں نے سات ملین سوالوں کا جواب کشف کر لیا ہے، ہماری زندگی کا اور یہاں پیدا ہونے کا یہی ایک کام تھا۔ جیسے کمرۂ امتحان میں جاتے ہیں تو کس لئے جاتے ہیں؟ ان بیس سوالوں کا جواب دینا ہے، ان سو سوالوں کا جواب دینا ہے، اگر جواب نہیں دیا تو پھر فیل ہیں، کامیابی کیلئے ان سوالوں کا صحیح جواب دینا ہے۔ ہم اس دارِ امتحان میں، اس دنیا میں کس لئے پیدا ہوئے؟ سات ملین سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لئے۔

۹)سوال پیدا ہوتا ہے

انسان سوال کا جواب اس وقت ڈھونڈتا ہے کہ جب سوال پیدا ہو، ویسے بھی عام طور پر کہتے ہیں کہ "سوال پیدا ہوتا ہے"، سوال کی پیدائش ہوتی ہے، سوال کی پیدائش کے لئے ماں باپ چاہئیں، سوال کو ماحول چاہئے، سوال کو کوئی رحم چاہئے کہ جہاں پر کوئی چیز جاتی ہے اور وہاں جا کر سوال بن جاتی ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو زور لگا کر سوال بناتے ہیں، زور لگا کر بہت ساری چیزیں بنائی جا سکتی ہیں لیکن زور لگا کر سوال نہیں بنایا جا سکتا ہے، جیسے زور لگا کر بعض شعر لکھتے ہیں اور پھر اس سے ڈبل زور لگا کر شعر کو سننا پڑتا ہے، لیکن شعر پیدا ہوتا ہے، شاعر وہ ہوتا ہے کہ جس میں شعر خود پیدا ہوتا ہے، شعر شاعر کو بناتا ہے، شاعر شعر کو نہیں بناتا ہے یعنی لوگ شاعر کیسے بنے ہیں؟ مرزا غالب کیسے شاعر بن گیا ہے، اشعار نے ان کو شاعر بنایا ہے نہ کہ غالب نے اشعار بنائے ہیں۔

حافظ شیرازی میر شریفِ جرجانی کے شاگرد ہیں یعنی مؤلفِ صرف میر کے شاگردوں میں سے ہیں، میر شریفِ جرجانی کی کلاس میں شعر پر پابندی تھی، شعر پڑھنے پر بھی اور شعر کہنے پر بھی چونکہ یہ رات کو بیٹھ کر شعر لکھتے تھے اور صبح آ کر سناتے تھے، جو شعر زور لگا کر لکھا جائے، اس شعر کو سننے میں بہت تکلیف ہوتی ہے، لیکن حافظ کو خود کہتے تھے کہ حافظ جو شعر بنا ہے سناؤ، سب کو تعجب ہوتا تھا کہ ہمیں شعر سے روکتے ہیں اور ان سے شعر سنتے ہیں، جب ان سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کہا اس وجہ سے کہ تم زور لگا کر شعر بناتے ہو اور حافظ پر شعر زور لگاتا ہے۔

بعض لوگ سوال بھی زور لگا کر بناتے ہیں، جو زور لگا کر سوال بنائے تو وہ سوال سننا بھی سخت ہوتا ہے اور اس کا جواب بھی سخت ہوتا ہے چونکہ وہ سوال نہیں ہوتا ہے، وہ ایسے ہی انہوں نے زور لگایا ہوتا ہے، بنایا ہوا ہوتا ہے لیکن سوال خود پیدا ہوتا ہے، سوال کب پیدا ہوتا ہے؟ جب انسان کو کوئی معرفت ہو، کوئی علم ہو، علم سوال اٹھاتا ہے، جہالت سے سوال کبھی بھی پیدا نہیں ہوتا ہے لہٰذا کہا جاتا ہے کہ

حُسْنُ السُّوَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ......(۱۶)

اچھا سوال آدھا علم ہے......

یعنی سوالِ صحیح نصف علم ہے، البتہ زور لگا کر جو سوال بنے وہ ناقص ہوتا ہے، ناقص الخلقت ہوتا ہے لیکن جو سوال طبعی طور پر پیدا ہوتا ہے وہ بہت بجا سوال ہوتا ہے، الغرض انسان کے اندر سوال خود پیدا ہوتا ہے، پہلے ہمارے لئے یہ سوال اٹھے، ہمارے لئے سوال یہ ہے کہ مولانا روم شیعہ تھے یا

سنی تھے،فلاں آدمی کیا تھا؟ کیا نہیں تھا؟ کس فرقے سے تعلق رکھتا تھا؟ یہی ہمارے سوال ہیں جو پیدا ہوئے ہیں، ابھی اصل سوال پیدا ہی نہیں ہوئے۔

۱۰)سات ملین سوالوں کی تیاری

اہلِ تدبر کے مطابق ہمیں اس عالم میں اسلیئے بھیجا ہے تاکہ ہم سات ملین (Seven Million) سوالوں کا جواب دیں اور جو ان سوالوں کا جواب تلاش کرلے وہ انسان کامل ہے۔ابھی ہمارے اندر عالمِ ہستی کے بارے میں ان سات ملین میں سے سات سوال بھی پیدا نہیں ہوئے؟ ان سوالوں کو اٹھانا ہے لیکن یہ کس طرح سے اٹھیں گے؟ تدبر سے، غور سے یہ سوال اٹھیں گے اور ان سوالوں کا انسان کے پاس جواب بھی ہو، یہ قبر میں پوچھیں جائیں گے، ان سات ملین سوالوں کا ہی جواب پوچھا جائے گا؟ یہ قبر کے سوال ہیں اور یہی آخرت میں ہے۔

ہم ان سات ملین سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور قبر میں وہی پوچھے جائیں گے، چند ایک سوال ہم نے سنے ہوئے ہیں کہ جو تلقین میں پڑھے جاتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صرف یہی چند سوال ہوں گے لہٰذ وہ رٹا دیئے جاتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ اب کام تمام ہوگیا ہے، نہیں بلکہ عالمِ برزخ بہت طولانی ہے، جب تک یہ سات ملین تکمیل نہیں ہوئے تو فارم (Form) آگے نہیں بڑھیں گے، جن کی تکمیل ہوگئی ہے وہ لوگ مرتے ہیں تو قیامت میں پہنچ جاتے ہیں،

فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ......(۱۷)

بے شک تم میں سے جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو پس اس کی قیامت واقع ہو جاتی ہے......

مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ......(۱۸)

جو مر جاتا ہے پس اس کی قیامت قائم ہو چکی ہے......

پس جب ابن آدم مرتا ہے تو اس کی قیامت برپا ہو جاتی ہے لیکن وہ ابنِ آدم کہ جس کا سارا فارم بھرا ہوا ہے یا سارا غلط یا سارا صحیح ہے، جس نے کچھ صحیح اور کچھ غلط بھرا ہوا ہے تو اس کو کوارنٹائن (Quarantine) میں ڈال دیں گے کہ تم برزخ میں رہ کے سارا غلط کرو یا سارا صحیح کرو اور برزخ بہت طولانی اور بڑی سخت ہے، عالمِ قبر و عذابِ قبر بہت سخت ہے، عذابِ قبر سے مراد وہ مٹی نہیں ہے کہ جس گڑھے کے اندر جسم ڈالتے ہیں، اس میں تو روح نہیں ہے، روح عالمِ قبر میں ہے نہ کہ جسم ہے، جسم لحد میں ہے، ہم نے لحد اور قبر میں اشتباہ کر دیا ہے، قبر اور چیز ہے لحد اور چیز ہے، روح قبر میں ہے اور جسم لحد میں ہے، فشارِ قبر اور فشارِ لحد، لحد تو فشار نہیں دیتی ہے، لحد میں کیڑے آتے ہیں، وہ تو شکرِ خدا کرتے ہیں کہ یہاں پر ایک ایسی لاش آئی ہے، ایک ایسا بہترین کھانا میسر آیا ہے اور ایسی بہترین چربی اس کے اوپر چڑھی ہوئی ہے کہ کیا کچھ کھایا ہوگا اس نے؟ کیڑے اس کو کھا کر شکرِ خدا کرتے ہیں، یہ روح ہے کہ جو اس وقت عالمِ قبر میں ہے اور فشار میں ہے، جسم سے سوال جواب نہیں کرتے ہیں بلکہ روح سے کرتے ہیں، روح کو بتاتا ہے کہ

مَنْ رَبُّكَ وَمَنْ نَبِيُّكَ وَ مَنْ دِينُكَ وَ مَنْ كِتَابُكَ وَمَنْ قِبْلَتُكَ وَمَنْ

اَنۡتُکَ......

یہ سوالات چند ایک نہیں ہیں کہ جو انگلیوں پر تمام ہو جائیں گے چونکہ ہمارا دین بھی انگلیوں پر تمام ہو جاتا ہے اور سوال و جواب بھی انگلیوں پر ختم ہو جاتے ہیں، دین کیا ہے؟ خدا ایک ہے، نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں، امام بارہ ہیں، معصوم چودہ ہیں، اصولِ دین پانچ ہیں، فروعِ دین دس ہیں، تمام شد، دین کم ہے اور انگلیاں پھر بھی زیادہ بن جاتی ہیں، یہی بچپن میں سکھاتے ہیں، بڑھاپے تک یہی دین ہمارے ذہن میں رہتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہی چند سوال ہیں، نہیں، بلکہ وہ فارم کونسا ہے؟ وہ صفحہ کونسا ہے؟ وہ کتاب کونسی ہے کہ جو ہمیں ان سوالوں سے بھرنی ہے؟ وہ کتاب صحیفۂ نفسِ انسان ہے، وہ خود اپنے نفس کے اندر ہے۔

اِقۡرَاۡ کِتَابَکَ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا۝(۱۹)

یعنی کہا جائے گا کہ آؤ اپنی کتاب پڑھو، وہ کہے گا کہ پروردگارا میری کتاب کہاں ہے؟ آواز آئے گی کہ خود پر نگاہ کرو۔ تو خود اپنی کتاب ہے، تو نے اپنی کتاب خود بھری ہے، یہ فارم (Form) تو نے خود فِل (Fill) کیا ہے، دیکھ اس میں تو نے کیا بھرا ہے؟ کتنے سوال ابھی باقی ہیں کہ جو تجھے جاننے تھے اور تو نے نہیں جانے۔

انسان غور و فکر کرے اور خود سے سوال اٹھائے کہ یہ سارا عالم کیسے پیدا ہو گیا؟ کس طرح سے یہ مخلوقات پیدا ہوئیں؟ جواب ڈھونڈو انہی میں بہت سارے سوال حل ہو جائیں گے۔

یہ معرفت خود انسان کی حقیقت ہے بقول مولانا روم

ای برادر تو همان اندیشه ای

مابقی تو استخوان و ریشه ای...... (۲۰)

تیری حقیقت فقط یہی علم ہے، دانش ہے، باقی تولنے کی چیز ہے، اس کو تولو تو چند کلو ہڈیاں ہیں، چند کلو رگیں ہیں، چند کلو انتڑیاں ہیں، چند کلو چربی اور چند کلو بیچ میں کچھ اور کچرا ہوگا۔

پس انسان مشق کرے، تدبر شروع کرے یعنی اپنے آپ کو اس ظاہر سے اوپر لے آئے، اس نقص سے اوپر لے آئے، ترقی کرے، تعالی یعنی بلندی پر آئے تاکہ تدبر در قرآن کے قابل ہو جائے ورنہ اسی طرح سے اٹھ کر کہیں کہ اب قرآن میں تدبر بھی کرنا ہے اور قرآن کھول کر یا ترجمے والا قرآن کھول کر بیٹھ جائیں، کیا حاصل ہوا؟ سر درد، قرآن میں رات کو اتنا تدبر کیا کہ صبح گولی کھانی پڑی، نا، پہلے متدبر بنیں، اہلِ لُب بنیں، اپنے اندر لُب پیدا کریں پھر آپ کے اندر سوال اٹھیں گے۔

۱۱) قرآن اہلِ تدبر کا راہنما

اہلِ تدبر جب گزشتہ آداب کے ساتھ قرآن کی بارگاہ میں اپنے سوال لے کر آئے تو قرآن خود سوال حل کرے گا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا...... (۲۱)

اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے......

پھر راستے کھلتے جاتے ہیں، قرآن خود انسان کا ہاتھ تھام لیتا ہے کہ آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے؟ خود قرآن راہنمائے انسان بن جاتا ہے، ہمیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، اگر قرآن کے ساتھ ایک دفعہ انس پیدا ہو جائے اور روحِ قرآن کے ساتھ ہماری روح آشنا ہو جائے تو پھر قرآن ہمارا راہنما ہے نہ کہ ہم قرآن کے راہنما ہیں، ہم مفسرِ قرآن نہیں ہیں، قرآن ہمارا مفسر ہے۔

مولانا روم نے ایک خوبصورت تمثیل بیان کی ہے کہ یہ جو شکاری ہرن کا شکار کرنے جاتے ہیں، یہ کھوجی کو ساتھ رکھتے ہیں، کھوجی پاؤں کے کھر سے کھوج لگاتا ہے، بعض لوگوں کے اندر یہ مہارت ہے اور ایک فن ہے کہ جہاں سے کوئی جانور یا انسان چل کے گیا ہو اس کے قدموں کے نشان سے اس تک پہنچ جاتے ہیں یعنی یہ کھر شناس انسان ہوتے ہیں، اسی طرح شکاری بھی کھوجی کو ساتھ لے کر جاتے ہیں، کھوج لگانے والے کو چند قدم تک اس کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب آپ ہرن کے قریب ہوتے ہیں تو پھر کھوجی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، چند قدم تک نقشِ پا راہنما ہوتا ہے، فرماتے ہیں کہ

چند گاھش گامِ آھو در خور است

بعد از آن خود نافِ آھو رہبر است...... (۲۲)

چند قدم نقشِ پائے آھو راہنما ہوتا ہے، آھو یعنی ہرن، انسان کو ہرن کا نقشِ پا چند قدم آگے لے جاتا ہے لیکن جب قربت پیدا ہوتی ہے تو پھر نقشِ پا کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، پھر وہاں سے

قرآن اہلِ تدبر کا راہنما

مشکِ آہو راہنما ہو جاتی ہے، نافِ آہو میں خوشبو ہوتی ہے، وہ خوشبو انسان کو کھینچتی ہے اور رہبر بن جاتی ہے یعنی وہ خود اپنی ضمام ہمارے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔

اسی طرح آپ چند قدم خدا کی نشانیوں، آیاتِ تکوینیٔ خدا، خلقتِ خدا، آثارِ خدا اور فعلِ خدا کی طرف جائیں، چند قدم تک انسان آثارِ خدا دیکھ کر خدا کی طرف جاتا ہے لیکن جب تھوڑی سی قربت پیدا ہوتی ہے تو انسان کے لئے خود وہ آیاتِ خدا رہبر بن جاتی ہیں یعنی وہ خود ہمارا ہاتھ تھام لیتی ہیں اور یہ قرآن کے اوپر بھی صدق کرتا ہے، ہم قرآن کی طرف اقوال کے ذریعے، قاعدوں کے ذریعے، لفظی قاعدوں کے ذریعے چند قدم خود آئیں اور تھوڑا سا قرآن کے ساتھ اپنی روح کو آشنا کریں، جب قرآن سے آشنا ہوں گے تو خود قرآن آپ کے لئے مثلِ مشک رہبر بن جائے گا، خود مہکِ قرآن، خوشبوئے قرآن، حقیقتِ قرآن اور روحِ قرآن آپ کا ہاتھ تھام لے گی، پھر خود قرآن آپ کا راہنما بن جائے گا۔

۱۲) متدبر بنے بغیر قرآن سمجھ نہیں آسکتا

پہلے انسان متدبر بنے اور تدبر کے مقام پر پہنچے ورنہ اپنے آپ کو اتنا بلند کئے بغیر تدبر شروع کر دیا تو پھر آپ کو گولی کھانی پڑے گی، سر میں درد ہوگا، اکتاہٹ، بیزاری اور چہ بسا انسان قرآن سے ہی بیزار ہو جائے، بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جن کیلئے درس کی بہت اہمیت ہے لیکن کسی کو درس میں بوریت بھی ہوتی ہے کہ پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہیں، زمین و آسمان کی باتیں کر رہے ہیں،

تدبر کے بغیر قرآن سمجھ نہیں آسکتا

سر پیر سمجھ میں نہیں آتا ہے لیکن کوئی کہتا ہے کہ بہت اچھی باتیں ہو رہی ہیں، عموماً ایسا ہوتا ہے، معلوم نہیں آپ کو تجربہ ہوا ہو یا نہ ہو مجھے ہوا ہے کہ بعض دوست دوسرے ایسے لوگوں کو لے آتے ہیں کہ آؤ یہ مولانا قم سے آیا ہے اس کے درس میں آؤ، اس کی تقریر سننے چلو کہ بڑی اچھی تقریر کرتے ہیں، وہ یہ سن کر آجاتے ہیں کہ ظاہر ہے اچھا آدمی ہے، اچھی باتیں کرتا ہے تو چلو چلتے ہیں لیکن جب وہ آکر بیٹھتے ہیں تو پہلے تو وہیں ان کو نیند آجاتی ہے، اونگھ آجاتی ہے، بعض اوقات سو بھی جاتے ہیں، پھر اٹھ کر اس دوست کو کوستے ہیں کہ یہ ہمیں کہاں لے کر آئے ہو، اصلاً گفتگو کا نہ کوئی سر تھا اور نہ کوئی پاؤں تھا، ایسے ہی ہونا چاہئے، جو آدمی ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہے، جس نے اپنے آپ کو اس مرتبے تک آمادہ نہیں کیا ہے، اس کے لئے یہی ہونا ہے، قرآن نے خود نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرآن پڑھتے تھے اور بعض اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے اور خود قرآن نے ذکر کیا ہے کہ گزرتے ہوئے جنوں نے جب قرآن کی تلاوت سنی تو وہیں رک گئے اور مدہوش ہو گئے، ارواحِ جن پر قرآن نے اثر کیا یا مشرکین جو جاسوس بھیجتے تھے تو چونکہ ان کے نفوس آمادہ تھے لہذا قرآن ان پر اثر کرتا تھا، وہ وہیں بیٹھ جاتے تھے اور بھیجنے والے منتظر رہتے تھے کہ وہ کب آکر ہمیں خبر دیتے ہیں لیکن وہ صبح تک وہیں رسول اللہ ﷺ سے قرآن سنتے رہتے تھے، پس جب تک تدبر کے لئے نفس آمادہ نہ ہو تو عملاً تدبر نہیں ہوتا ہے۔

صدر المتالھین ؒ فرماتے ہیں کہ تدبر اور چیز ہے حضورِ دل اور چیز ہے، یہ نہ کہنا کہ پس دل قرآن پڑھتے ہوئے حاضر ہے تو یہی کافی ہے، کیوں؟

☆ اذ ربّ وقت لا يشغل الانسان قلبه بغير القرآن......

بعض اوقات انسان اپنے دل کو غیرِ قرآن میں مشغول نہیں کرتا ہے، یہ فقط قرآن میں مشغول ہوتا ہے یعنی حضورِ دل حاصل ہوگیا اور اس نعمت تک پہنچ آیا جیسے عبادت میں دل حاضر رہتا ہے، قرآن پڑھتے ہوئے بھی دل قرآن ہی میں ہے اور ایک لحظے کے لئے بھی اِدھر اُدھر نہیں جاتا ہے لیکن اس حضور کے باوجود ممکن ہے کہ تدبر نہ ہو،

☆ ولكن يقتصر على سماع القرآن من نفسه من غير تدبر......

فقط حضورِ دل کے ساتھ پڑھ رہا ہے یا فقط قرآن سن رہا ہے جیسے مثلاً محافل میں قاری آتے ہیں یا مصری قاری آتے ہیں اور محفلِ قرآن میں واقعاً بہت خوبصورت قرآن پڑھتے ہیں اور سننے والے محو ہو جاتے ہیں، حضورِ دل کے ساتھ ان کی تجوید وقرأت و رَفْعَہ سنتے ہیں اور قرآن سے اِدھر اُدھر ذہن نہیں جاتا ہے لیکن یہ حضور باوجود حضور کے فقط سننے کی حد تک حضور ہے یعنی کان وسماعت حاضر ہیں لیکن تدبر نہیں ہے،

☆ والمقصود الاصلی فيه هو التدبر......

درحالیکہ قرآن کا مقصودِ اصلی تدبر در آیاتِ قرآن ہے اور مفاہیمِ قرآن ہے،

☆ وهو روح كل عبادة......

اور تدبر کرنا ہر عبادت کی روح ہے، آپ امیر المومنین علیہ السلام سے یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ

☆ وعن امير المؤمنين عليه السلام: لَا خَيْرَ فِي عَبَادَةٍ لَا فِقْهَ فِيهَا......

اس عبادت میں کوئی خیر نہیں ہے کہ جس میں تفقہ نہ ہو، نہ کہ جس میں احکامِ فقہ نہ ہو، فقہ سے مراد لغتاً تفقہ ہے کہ جو فہم کو کہتے ہیں، فقہ یعنی فہم، قرآن نے جس معنیٰ میں لفظ فقہ استعمال کیا ہے اور جو روایات میں استعمال ہوا ہے وہ اسی فہم دین کو کہتے ہیں، یہ بعد میں اصطلاح بن گئی ہے کہ علم احکام کو علم فقہ کہتے ہیں اور جو یہ احکام جانتا ہے اس کو فقیہ کہتے ہیں، یہ متاخر اصطلاح ہے،

اس عبادت میں کوئی خیر نہیں ہے، اس عبادت میں کچھ بھی نہیں ہے کہ جس میں تفقہ نہ ہو، تدبر نہ ہو، فہم نہ ہو،

☆ وَلَا فِي قِرَائَةٍ لَا تَدَبُّرَ فِيهَا......

اور ایسے قرآن پڑھنے کا کوئی خیر و فائدہ نہیں ہے کہ جس کے اندر تدبر نہ ہو،

☆ و اذا لم يتمكن من التدبر الابترديده فليردد......

تردید یعنی دہرانا، تکرار کرنا، اگر تردید سے نہیں ہوتا یعنی تدبر کے بغیر دہرانا، تکرار کرنا تو پھر دوبارہ پڑھو اور اس وقت تک پڑھتے رہو کہ جب تک نکتے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہو۔ بعض اوقات جو انسانوں میں قوی ہوتے ہیں، تدبر و تفکر اور قوی فہم کے مالک ہیں ممکن ہے کہ وہ ایک ہی دفعہ آیت کو پڑھنے سے مقصود تک پہنچ جائیں لیکن سب تو ایسے نہیں ہوتے ہیں، بعض کو رکنا اور وقف کرنا پڑتا ہے، جیسے قرأت کے قواعد ہیں کہ یہاں وقف ہے، یہاں وقفِ لازم ہے، یہاں وقفِ مطلق ہے، یہاں وقفِ جائز ہے، یہاں وقفِ مجوز ہے، یہاں وقفِ مرخص ہے، یہاں سکتہ ہے، یہاں وقفہ ہے، یہاں ناجائز ہے، اسی طرح سے فہم کے بھی وقف ہیں کہ اس آیت پر رکو، غور

تدبر کے بغیر قرآن سمجھ نہیں آسکتا

کرو، خوض کرو، تعقل کرو، تامل کرو، تفکر کرو اور تدبر کرو۔

بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ کچھ علماء چار چار مہینے اور چھ چھ مہینے تک فقط ایک آیت پڑھتے رہے یعنی ختم قرآن شروع کیا تو ایک ہی آیت پڑھتے ہوئے چھ مہینے گزر گئے، چھ مہینے سے آگے نہیں بڑھے، کیوں؟ کہا کہ یہ آیت مجھے ابھی سمجھ میں نہیں آئی، یہ آیت ابھی حل نہیں ہوئی ہے میں کس طرح اگلی آیت میں پہنچوں؟ اب ایسا تو نہیں ہے کہ پہلی آیت کو تاڑ کے معاذ اللہ دوسری آیہ پہ پہنچیں اور پھر اس کا بھی حشر کرنے جائیں، پہلی کا کیا حشر کیا؟ اس کو میں نے خوب مخارج کے ساتھ نکالا ہے، دبا کے نکالا ہے، قرآن بھی ایسے قاری سے پناہ مانگتا ہے کہ خدایا مجھے اس سے بچا، جیسے بعض لوگ ہیں کہ بہت امام زمانہ علیہ السلام کی طلب میں ہیں، امام زمانہ علیہ السلام کو ملاقات کیلئے ڈھونڈتے ہیں، کسی نے مذاق کیا اور کہا کہ میں نے رات کو خواب میں امام زمانہ علیہ السلام کو دیکھا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ جو میرے پیچھے لگا ہوا ہے اس سے میری جان چھڑاؤ، قرآن بھی بعض قاریوں سے پناہ مانگتا ہے۔

☆ الا ان یکون فی الصلوة خلف امام......

البتہ نماز میں یہ کام نہیں کرنا مثلاً امام جب نمازِ عشاء پڑھا رہا ہے اور

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۝ (۲۳)

پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

پڑھتا ہے تو ہم غور و فکر کرنا شروع ہو جائیں حتیٰ امام عشاء پڑھ کے بھی چلا جائے اور ہم اسی جگہ غور و تدبر کر رہے ہوں، نا، نماز میں یہ کام نہیں کرنا ہے، نماز میں جیسے امام جا رہا ہے آپ بھی اس

کے ساتھ چلے جائیں۔

۱۳) رسول اللہ ﷺ کا قرآن میں غور و فکر کرنا

☆ و روی انه صلی اللّٰه علیه و آله قرء بسم اللّٰه الرحمن الرحیم......

روایت میں نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ بسم اللہ کو پڑھتے تھے یا پڑھا

☆ فرددها......

اور اس کو تکرار کیا

☆ عشرین مرة......

بیس دفعہ رسول اللہ ﷺ نے آیہ بسم اللہ کو تکرار کیا،

☆ وانما رددها لتدبر، فی معانیها......

رسول اللہ ﷺ نے اتنی دفعہ کیوں تکرار کیا؟ چونکہ رسول اللہ ﷺ تدبر کر رہے تھے، بسم اللہ کے اندر تدبر کر رہے تھے اور بسم اللہ اتنا عمیق سمندر ہے کہ میں نے خود ایک دانشمند سے کہ جو بظاہر عالم بھی نہیں ہے، اس کی داڑھی بھی نہیں ہے مگر اس سے ابھی تک بسم اللہ کی پچاس سے زیادہ تفاسیر سنی ہیں اور ہر دفعہ پہلی تفسیر سے عمیق تر تفسیر کی، اب اندازہ کریں کہ رسول اللہ ﷺ کس سطح تک پہنچے ہوں گے، تردد سے رسول اللہ ﷺ نے جو بیس دفعہ تکرار کیا ہے تو بیس درجے اس کے اندر گئے، رسول اللہ ﷺ کی بسم اللہ کے باطن تک کہاں تک رسائی ہوئی ہوگی؟

☆ وعن ابی ذرؓ......

جنابِ ابی ذرؓ سے یہ روایت مروی ہے،

☆ قال: قام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم بنا لیلۃ......

ایک شب یعنی ایک شب جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ گزاری، ان شبوں میں سے ایک شب جو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے ساتھ بسر کی،

☆ فقام بایۃ یرددھا......

ایک آیہ لے کر رسول اللہ ﷺ نے اس کو بار بار دہرانا شروع کر دیا، تکرار شروع کیا اور وہ کونسی آیہ تھی؟

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

اگر تو ان پر عذاب کرے گا تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر معاف کر دے گا تو تو صاحبِ عزّت بھی ہے اور صاحبِ حکمت بھی ہے۔

یہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۱۱۸ ہے کہ جب لوگوں نے کہا کہ مسیح علیہ السلام خدا ہے تو خداوند نے حضرت مسیح علیہ السلام سے کہا کہ آپ نے ان کو کہا ہے؟ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا کہ اگر میں نے کہا ہوتا تو آپ کو علم ہوتا، میں نے تو ان کو خدا کی طرف متوجہ کیا ہے، پھر اس کے بعد کہا کہ یہ نادان ہیں، جاہل ہیں، جہالت کی وجہ سے تثلیث کے قائل ہیں، جہالت کی وجہ سے مسیح علیہ السلام اور روح القدس علیہ السلام کو بھی انہوں نے خدا کے زمرے میں شامل کیا ہے، پھر خداوند سے فرمایا کہ اس گناہ پر، اس شرک پر اگر تو انہیں

عذاب دینا چاہے تو تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو بھی تیرے بندے ہیں۔

☆ وقال صلی اللہ علیہ وآلہٖ لما نزل علیہ قولہ تعالیٰ:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝

بیشک زمین و آسمان کی خلقت اور لیل و نہار کی آمد و رفت میں صاحبانِ عقل کے لئے قدرت خدا کی نشانیاں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو یہ آیت پڑھتا ہے یعنی سورۂ آل عمران کی آیہ (۱۹۰) اور یہ آیہ پڑھ کر اس میں تفکر نہ کرے تو

☆ ویل لمن قرأها ولم يتفكر فيها.

ویل یعنی مردہ باد۔ نفرین ہے، بددعا ہے، ہلاک ہو جائے وہ شخص، مردہ باد ہے وہ قاری کہ جو یہ آیہ قرآن پڑھتا ہے اور اس میں تفکر نہیں کرتا ہے، اب اس ویل کو مردے کے لئے نہ بھیجو یعنی بغیر تفکر کے قرآن پڑھ کر پھر نہ کہو کہ خدایا جو کچھ ہم نے کیا ہے یہ اس کو بھی پہنچا، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اگر تفکر نہیں کیا، تدبّر نہیں کیا تو آپ کیلئے ویل ہے، انشاء اللہ خداوند تبارک وتعالیٰ اس تدبر اور تفکر کو سب کے لئے نعمت کے طور پر عطا فرمائے۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ حج، آیہ ۴۶)

(۲)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۷۹)

(۳)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۷۹)

(۴)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۷۹)

(۵)......(سورۂ مبارکہ یوسف، آیہ ۱۱۱)

(۶)......(سورۂ مبارکہ ص، آیہ ۴۳)

(۷)......(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۲۱)

(۸)......(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ ۵۴)

(۹)......(سورۂ مبارکہ آل عمران، آیہ ۱۹۰)

(۱۰)......(تفسیر المیزان - العلامة الطباطبائیؒ، بحث روائی، الجزء، صفحہ ۱۴۶)(شرح نہج البلاغہ - جعفری)(مرآة العقول فی شرح اخبار آل الرسول - العلامة المجلسیؒ، الجزء ۱۰، صفحہ ۳۹۱)

(۱۱)......(مفاهيم القرآن الجزء السادس)

(۱۲)......(شرح نہج البلاغہ - جعفری)

(۱۳)......(دیوان شمس مغربی)

(۱۴)......(مستدرک نہج البلاغة، الجزء ۱، صفحہ ۴)(منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغة - الخوئیؒ)(نفحات الولاية فی شرح نهج البلاغة)(شرح نهج

البلاغة - عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن أبى الحديد، ابو حامد، عز الدين، المتوفى: ٦٥٦ ھ، الجزء ٢٠، صفحہ ٢٩٢)
(جامعه علوى در نهج البلاغه، الجزء ٨، صفحه ٢)

(١۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۵)(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ١٠۴)(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ ٨٨)
(سورۂ مبارکہ نور، آیہ ۵١)(سورۂ مبارکہ روم، آیہ ٣٨)(سورۂ مبارکہ لقمان، آیہ ۵)

(١٦)......(قرآن در نهج البلاغه، الجزء ۵، صفحه ١)(نهج السعادة - الشيخ المحمودى، الجزء ٨، صفحه ٣٤٧)(شرح حكم نهج البلاغة)
(شرح نهج البلاغة - ابن ابى الحديد)

(١٧)......(ارشاد القلوب، صفحه ١٨)

(١٨)......(بحار الانوار-علامه مجلسیؒ، الجزء ٧٠، صفحه ٦۵)

(١٩)......(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ ١۴)

(٢٠)......(مثنوی معنوی، به تصحیح: رینولد ا. نیکلسون، دفتر دوم، صفحه ١٩٢)

(٢١)......(سورۂ مبارکہ عنکبوت، آیہ ٦٩)

(٢٢)......(مثنوی معنوی، به تصحیح: رینولد ا. نیکلسون، دفتر دوم، صفحه ١٨٧)

(٢٣)......(سورۂ مبارکہ فاتحہ، آیہ ۵)

فصلِ ادبِ پنجم

﴿استنباط﴾

(حصّہ اول)

١)مطالعۂ قرآن کے لحاظ سے لوگوں کی اقسام

٢)استنباط کا معنٰی

☆راویوں کے طبقے

☆ پیغامِ دین کو اَفُقَہ تک پہنچانے کی حکمت

٣)میڈیا کے اہلِ استنباط

٤)ادارتی اہلِ استنباط

٥)سیاسی اہلِ استنباط

٦)اقتصادی اہلِ استنباط

٧)طبی اہلِ استنباط

٨)دینی اہلِ استنباط

٩)چیزوں کو اہل تک پہنچائیں

١٠)قرآن کے اہلِ استنباط

١١)احادیث کے اہلِ استنباط

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ پنجم استنباط ہے، صدر المتألھینؒ ادبِ پنجم کو اس طرح سے بیان فرماتے ہیں،

☆ الخامس: الاستنباط، وهو ان يستوضح من كل آية ما يليق بها،

پانچواں ادب استنباط ہے اور اس کا مطلب ہر آیت کے مطابق اس کی وضاحت چاہنا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض انسان اہلِ تدبر ہوں یعنی مطالب کی تہہ تک پہنچ جاتے ہوں لیکن اس تہہ سے خالی ہاتھ واپس لوٹ آتے ہوں۔

۱) مطالعۂ قرآن کے لحاظ سے لوگوں کی اقسام

اگر ہم قرآن کو سمندر سے تشبیہ دیں تو بعض ایسے لوگ ہیں کہ جو سطحِ سمندر دیکھنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، بعض تو اصلاً سرے سے سمندری علاقے کے ہی نہیں ہیں بلکہ ساری عمر خشکی میں بسر کر کے صحراؤں میں چلے جاتے ہیں اور اس سمندر تک آتے ہی نہیں ہیں، کچھ ایسے ہیں کہ جو کبھی کبھار سمندر پہ جاتے ہیں، گردش کے لئے، آؤٹنگ (Outing) کیلئے، تفریح کے لئے اور ساحل پہ گھوم پھر کے واپس آجاتے ہیں، یہ لوگ ساحل پیما ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ جنہیں ساحل سے تھوڑا سا شوق اور لگاؤ ہوتا ہے، وہ تھوڑا سا جوتے اتار کے چند قدم اندر بھی چلے جاتے ہیں لیکن پانی جب پنڈلیوں تک آتا ہے تو پھر واپس آجاتے ہیں، انہیں مزید آگے جانے سے ڈر لگتا ہے، یہ لوگوں کے درجات ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ممکن ہے تھوڑا اور ہمت کر کے سمندر میں آگے چلے جائیں اور سمندر کے اندر تیر بھی لیں لیکن سطحِ سمندر پہ تیرتے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو سمندر میں غوطہ بھی لگاتے ہیں یعنی

مطالعۂ قرآن کے لحاظ سے لوگوں کی اقسام

سمندر کی تہہ میں بھی جاتے ہیں لیکن ایسے لوگ کم ہیں کہ جو تہہ میں جاتے ہیں، بعض ایسے ہیں کہ جو سمندر کی تہہ میں چلے جاتے ہیں لیکن ایسے ہی جیسے بعض فقط مناظر دیکھنے کے لئے ساحل پہ آتے ہیں اسی طرح یہ بھی تہہ میں جاتے ہیں لیکن صرف دیکھنے کے لئے کہ تہہِ سمندر میں کیا ہے؟ جیسے بعض ملکوں میں ایسے ہوٹل یا سمندر کی تہہ میں شیشے کے راستے، شیشے کے ٹنل (Tunnel) ہیں کہ انسان ان کے اندر جائے تو سمندر کی تہہ تک جا پہنچتا ہے، دائیں بائیں دیکھ سکتا ہے، تیرتی مچھلیوں کو دیکھ سکتا ہے اور سمندری موجودات کا نظارہ کرسکتا ہے، بعض نے ممکن ہے کہ ایسے ریسورٹ (Resort) کا وزٹ (Visit) بھی کیا ہو، لیکن کچھ ایسے ہیں جو تہہِ سمندر میں پہنچتے ہیں اور اس تہہِ سمندر میں موجود قیمتی گوہر، جوہر اور صدف کو بھی ساتھ لے کر آتے ہیں۔

اگر ہم غور کریں تو سمندر پہ جانے والوں میں ہمیں یہ سارے طبقات ملیں گے، بالکل یہی حال قرآن کے بارے میں بھی ہے، بعض ایسے ہیں کہ جنہوں نے ساری عمر خشکی اور صحرا میں بسر کر دی ہے اور صحرا پیما ہیں، سرے سے ایک دن بھی قرآن نہ دیکھا نہ پڑھا اور ایسے مسلمان بھی ہیں کہ جن کو قرآن پڑھنا بھی نہیں آتا ہے، یہ بغیر قرآن اور بغیر اسلام کے مسلمان ہیں، صرف شناختی کارڈ کی وجہ سے مسلمان ہیں، بعض ایسے ہیں کہ جو قرآن کے ساحل پیما ہیں، صرف ساحلِ قرآن تک آتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی کبھار پڑھ لیتے ہیں، جب رمضان آتا ہے تو ثواب کی خاطر پڑھ لیتے ہیں یا کسی قاری کی مجلس میں جا بیٹھتے ہیں تو سن لیتے ہیں یا اگر کوئی قاری اچھا لگا اور اس کی صوت ولحن اچھی لگی تو ساحلِ قرآن تک آجاتے ہیں، بعض ایسے ہیں جو تھوڑا سا سمندر کے اندر بھی چند قدم آگے

آتے ہیں اور پھر واپس لوٹ جاتے ہیں، کبھی کبھار ترجمہ پڑھ لیا، کبھی کبھار سروکار رکھتے ہیں بالآخر کبھی کبھار آجاتے ہیں، بعض ایسے ہیں جو اس سمندر میں تیراکی کر رہے ہیں لیکن نیچے نہیں جاتے ہیں، فقط تیراکی کر رہے ہیں، جو تیراکی جو کر رہے ہیں یعنی یہی جو فقط فنونِ قرأت و تجوید و حفظ یعنی فقط ظاہر کی حد تک سروکار رکھتے ہیں، یہ سرے سے معانی کی طرف جاتے ہی نہیں ہیں، فقط الفاظ کے فنون، قاعدے، ضابطے اور الفاظ کی حد تک ہیں، قرآن کے بحر میں ان کی فقط اتنی تیراکی ہے، کچھ ایسے ہیں جو کبھی کبھار نیچے تہہ میں چلے جاتے ہیں، غور بھی کرتے ہیں، پڑھتے بھی ہیں، تدبر بھی کرتے ہیں، تفسیر کا مطالعہ بھی کرتے ہیں لیکن تہہِ سمندر میں جا کر فقط منظر دیکھ کر واپس آجاتے ہیں، تفریح کے طور پر جاتے ہیں، ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا ہے، یہ اہلِ تدبر ہیں لیکن اہلِ استنباط نہیں ہیں چونکہ قیمتی چیزیں سمندر کی تہہ میں ہوتی ہیں، سطحِ سمندر پہ جھاگ زیادہ ہوتی ہے اور چند چیزیں ہوتی ہیں، بعض اوقات ممکن ہے کہ آپ تہہ سمندر سے زیادہ سے زیادہ مچھلی پکڑ سکتے ہیں یا فرعی فائدے حاصل کر سکتے ہیں لیکن تہہ سمندر نے قیمتی چیزیں چھپا کر اور وہ بھی صدف کے اندر چھپا کر رکھی ہوتی ہیں، قیمتی گوہر صدف کے اندر موجود ہوتا ہے۔ قرآن کے لئے اب جو ادب بتایا جا رہا ہے وہ فہم قرآن کیلئے نہایت اہم ہے۔ آپ قرأتِ قرآن کریں، درست کریں اور آیاتِ قرآن میں تدبر کریں یعنی آپ ان آیات کی تہہ میں موجود معانی تک بھی پہنچیں فقط تلفظ پر اکتفا نہ کریں، بعد از تلفظ یا بعد از سماع اس میں تدبر بھی کریں۔

۲) استنباط کا معنٰی

تدبر کے بعد ادبِ استنباط شروع ہوتا ہے کہ جب آپ قرآنی سمندر کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں تو ساتھ کچھ لے کر بھی آئیں، اس سمندر سے کچھ حاصل بھی کریں۔ استنباط لغت میں بھی اسی معنٰی میں استعمال ہوتا ہے، استنباط کا اصطلاحی معنٰی ہم فقط اجتہاد کو سمجھتے ہیں یعنی فقیہ روایات سے، منابعِ دین اور ادلّہَ دین سے حکمِ خدا استنباط کرتا ہے یعنی استخراج کرتا ہے، نکالتا ہے، حاصل کرتا ہے، اجتہاد اسی کو کہتے ہیں اور اسی کو استنباط بھی کہتے ہیں، یعنی بعد از تدبر در قرآن انسان کچھ حقائق تک پہنچتا ہے یعنی ظواہر اور الفاظِ قرآن سے انسان حکمتِ قرآن، معانیٔ قرآن اور اسرارِ قرآن تک پہنچتا ہے کہ جو مقصود ہیں۔

یہاں تک پہنچ کر پھر دوسرا عمل شروع ہوتا ہے اور وہ استنباط ہے، استنباط مادہ نبط سے ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان جس طرح کنویں کی تہہ میں موجود پانی کو زحمت کے ذریعے سے نکالتا ہے اور باہر سطحِ زمین پہ لے آتا ہے تو اسی طرح سے انسان تہہِ الفاظ میں اور قرآن کے ظواہر کی تہہ میں موجود اسرار کو اپنی استعداد و لیاقت کے مطابق نکال کر برملا کرتا ہے اور اپنی فہم کی حد تک لے آتا ہے پھر اسکے بعد عمل کی حد تک لے آتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی معرضِ استفادہ قرار دیتا ہے۔ لغت میں کنویں کا پانی نکالنا استنباط کہلاتا ہے، کنویں کی تہہ میں موجود پانی کو انسان کسی ذریعے سے، کسی وسیلے سے، کسی حیلے سے باہر نکال لے اور سطحِ زمین پر لے آئے تو اس کو نبط کہتے ہیں اور استنباط یعنی یہی پانی کھینچ کر باہر لانا، استفادے کے لئے، اپنے لئے اور دوسرے موجودات کے لئے باہر

استنباط کا معنٰی

لانا۔ آج کل برقی طریقوں سے اور جدید آلات کی مدد سے زمین کے نیچے موجود گہرے کنوؤں میں برقی آلات اور موٹروں کے ذریعے سے پانی کھینچ کر باہر لے آتے ہیں، یہی استنباط ہے، یہ استنباطُ الماء ہے یعنی پانی نکالنا۔

کنواں کھودنے کو تدبر کہتے ہیں چونکہ آپ نے سطحِ زمین کھودی، پردے ہٹائے، ریت ہٹائی، مٹی ہٹائی اور نیچے پانی کی تہہ تک پہنچ گئے، یہ تدبر ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض لوگ کنویں کھودلیں مگر پانی نہ نکال سکیں اور ایسا ہوتا بھی ہے مثلاً وہ کاریگر کہ جن کا کام زمین کھودنا ہے وہ فقط بڑے گہرے کنویں کھود سکتے ہیں لیکن اگر آپ انہیں کہیں گے کہ کنویں کا پانی بھی باہر نکالنا ہے تو یہ نہیں نکال سکتے کیونکہ پانی نکالنے کے لئے ایک الگ انجینئر کی ضرورت ہے کہ جو آکر اس میں موٹر فٹ کرتے ہیں، پائپ فٹنگ کرتے ہیں، اوزار اور دیگر برقی آلات کی مدد سے اور اپنے ایک معقول طریقے سے پانی کو باہر نکالتے ہیں، پس پانی تک پہنچنا ایک ہنر ہے اور پانی کو زمین کی سطح تک منتقل کرنا ایک فنِ دیگر وہنرِ دیگر ہے اور اسی کو استنباط کہتے ہیں، یہ استنباطُ الماء ہے۔

معانیٔ عقلیہ بھی اسی کی شبیہ ہیں کہ پہلے انسان عبارتوں کے اندر، الفاظ کے اندر، آیات کے اندر، روایات کے اندر، جملوں کے اندر اور ان کی تہہ میں موجود معانی تک پہنچے یہ تدبر کا مرحلہ ہے یعنی الفاظ سے ہی نہ کھیلتا رہے، فقط الفاظ کا جمع خرچ کر کے، ادبیات پڑھ کے، اعراب وبناپڑھ کے، صرف ونحو پڑھ کے، صیغے پڑھ کے وہیں پہ حجۃ الاسلام نہ ہو جائیں بلکہ الفاظ سے آشنا ہونے کے بعد اب معانی تک پہنچیں، ان الفاظ کی تہہ میں جو معانی ہیں ان تک رسائی حاصل کریں یہ تدبر در

استنباط کا معنی

قرآن ہے اور اگر قرآن کی تہہ میں پہنچ گئے ہیں اور معانی تک رسائی حاصل ہوگئی ہے تو اب ان معانی کو حاصل بھی کریں یہ استنباط ہے، چنانچہ قرآن میں تدبر کرنے کے بعد معانیٔ قرآن، حکمِ قرآن اور اسرارِ قرآن کا استخراج کرنا استنباط کے زمرے میں شامل ہے، دوسرے الفاظ میں معانیٔ قرآن میں غور وخوض کر کے آیات کے مقصود ومطالب کو حاصل کرنا، ان آیات کے معانی ومقاصد کو پھیلانا اور ان سے مربوط حکمتیں اور اسرار ومطالب کہ جو بعض ظواہر کے پیچھے پنہاں ہیں انہیں حاصل کرنا ہے استنباط کہلاتا ہے، استنباط کے مرحلے میں انسان بعض اوقات آیاتِ الٰہی سے احکام وحدود استنباط کرتا ہے، بعض اوقات خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے جو نظام مقرر کئے ہیں اور انہیں قرآن میں ذکر فرمایا ہے ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے، کبھی قصصِ اقوام وامِمِ ماضیہ سے عبرتیں استنباط کرتا ہے۔

استنباط کا معنیٰ

قرآن کی آیات کے اندر جب انسانِ متدبر غور وخوض کرتا ہے، اسرار وحکمِ قرآن مجید میں کھلے اور آمادہ ذہن کے ساتھ جاتا ہے تو چونکہ تدبر اس کے لئے ملکہ ہے لہٰذا معانیٔ قرآن کے اندر موجود مختلف اسرار جو انسان کی زندگی سے مرتبط ہیں لیکن بصورتِ جامع اور بصورتِ جمعی قرآن کے اندر موجود ہیں لہٰذا ان سب کو استخراج کرنا استنباط کے زمرے میں شامل ہوتا ہے۔ البتہ قرآن سے معانی کیسے حاصل کریں؟ ممکن ہے کہ بعض کے ذہن میں یہ بات آتی ہو کہ جب انسان معانیٔ قرآن تک پہنچ جاتا ہے تو حاصل بھی ہو جاتے ہیں، نہیں اس طرح حاصل نہیں ہوتے ہیں بالکل ایسے جیسے پانی کی تہہ تک پہنچ جائیں تو حاصل نہیں ہوتا ہے، ممکن ہے آپ خالی واپس آئیں اور پیاسے واپس

آئیں یا باہر جو منتظر بیٹھے ہوئے ہیں ان کے لئے کچھ نہ لائیں، فرض کریں کہ جس انسان کے پاس پانی نکالنے کا کوئی ظرف نہیں ہے اس کو رسی باندھ کر کنویں میں اتار دیا گیا اور پھر رسی سے کھینچ کر کنویں سے باہر لایا جائے تو چلو میں تو یہ پانی نہیں لا سکتا ہے، ممکن ہے یہ خود پی کے آگیا ہو لیکن آپ کے لئے یا دوسرے موجودات کے لئے، کھیت کے لئے، پیاسے جانوروں کے لئے اور دیگر مقاصد کے لئے پانی نہیں لایا ہے۔

اہلِ استنباط ان لوگوں کو کہتے ہیں کہ جو تہہِ سمندر میں جائیں اور وہاں موجود صدف و گوہر و جوہر بھی ساتھ لے کر آئیں اور یہ غواصوں کا حق ہے کہ جو غواصی کر سکتے ہیں، تہہ میں جا سکتے ہیں اور تہہ میں جا کر صدف شناخت کر کے اور پھر ان میں گوہر اور موتی بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس کو سطحِ سمندر اور ساحلِ سمندر پر واپس بھی لے آتے ہیں اور پھر اس کو دوسروں کے سامنے پیش بھی کرتے ہیں۔

استنباط کا معنی

قرآن ہدایت کی کتاب ہے اور انسان کے لئے قرآن منشور ہے، جو کچھ بشر کی ضرورت ہے وہ سب قرآن کے اندر موجود ہے لیکن اس کے لئے انسان کو قرآن میں تدبر کرنا پڑے گا اور تدبر کے بعد استنباط کرنا پڑے گا، استنباط ایک قدیمی اصطلاح ہے یا کہہ سکتے ہیں مدرسئی اصطلاح ہے، ممکن ہے کہ عام لوگوں کو اس اصطلاح سے کوئی سروکار نہ ہو لیکن اہلِ علم کو اور اہلِ فن کو معلوم ہو جاتا ہے کہ استنباط کس کو کہتے ہیں؟ یا اتنی تحلیل سے ممکن ہے کہ بعض متوجہ ہو گئے ہوں کہ یہ استنباط کیا چیز ہوتی ہے لیکن عام لوگوں کے لئے استنباط کا یہ معنیٰ قابلِ فہم نہیں ہے چونکہ استنباط بہت ہی مدرسئی اصطلاح ہے، اس کو ہم عام فہم بنانے کے لئے دوسری مثال یا دوسرے طریقے سے بیان کرتے ہیں

ممکن ہے کہ سب متوجہ ہو جائیں۔

قرآن مجید نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے اور قرآنی اصطلاح سے یا قرآنی تعبیر سے یہ لفظِ استنباط بہتر سمجھ میں آجاتا ہے یعنی قرآن نے بھی فرمایا کہ کچھ لوگ اہلِ استنباط ہیں، سب لوگ نہیں ہوتے ہیں، جیسے نہج البلاغہ میں ہے کہ بعض ناقلِ روایت ہیں کہ جو فقط روایت کو نقل کرتے ہیں اور وہی کہ جو روایت نقل کر رہے ہیں خود اس کو نہیں سمجھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ بعض ایسے ہوتے ہیں جو ناقلِ روایت نہیں ہیں، راوی نہیں ہیں بلکہ اہلِ درایت ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اہلِ رعایت ہیں۔

☆راویوں کے طبقے

راویوں کے تین طبقے ہیں، بعض اہل روایت ہیں، بعض اہلِ درایت ہیں اور بعض اہلِ رعایت ہیں۔ اہل روایت وہ ہیں کہ جو بات سنتے ہیں اور نقل کر دیتے ہیں، یہ ایک رپورٹر (Reporter) کی طرح ہیں، ایک خبر نگار کی طرح ہیں، جو دیکھتے ہیں، جو سنتے ہیں، جو انہیں ملتا ہے وہ دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں، یہ راوی ہیں لیکن کچھ لوگ اس کو ساتھ ساتھ سمجھتے بھی ہیں، جو کچھ نقل کر رہے ہیں یا جو کچھ دیکھا ہے اس کو کچھ سمجھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں یہ اہلِ درایت ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ سنتے بھی ہیں، سمجھتے بھی ہیں، نقل بھی کرتے ہیں، دوسروں کو بھی پہنچاتے ہیں اور جو کچھ اس خبر کے اندر موجود ہو اس پر عمل بھی کرتے ہیں یعنی اسے عملی شکل بھی دیتے ہیں، عملی جامہ بھی پہناتے ہیں تو یہ لوگ اہلِ رعایت ہیں۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ دین کو مشکل یہ پیش آئی ہوئی ہے کہ دین میں اہلِ روایت بہت ہیں، راویانِ دین بہت زیادہ ہیں لیکن جو رعایتِ دین کریں وہ بہت کم ہیں، اکثر اہلِ دین رواتِ دین ہیں، اہلِ رعات نہیں ہیں یعنی مدرسوں میں آکر صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ عوام کو جا کر مجلسیں سنانی ہیں یا عوام کو متاثر کرنا ہے لیکن کسی چیز پر خود رعایت نہیں کرتے ہیں، خود اس کو عملی جامہ نہیں پہناتے ہیں، یہ اہلِ رعایت نہیں ہیں بلکہ اہلِ روایت ہیں، ان کا سارا ہم وغم یہ ہے کہ ہم یہاں سے کتابوں سے پڑھ کر منبروں پر جا کر بیان کردیں یا اِس مدرسے سے پڑھ کر اُس مدرسے میں تدریس کردیں، ایک کتاب سے پڑھا اور دوسری کتاب میں نقل کیا یا یہ اہلِ تحریر ہیں مثلاً ایک کتاب میں پڑھا اور دوسری کتاب میں لکھ دیا، اہلِ رعایت وہ ہیں کہ جو دین کو کتابوں سے پڑھ کر اس کو اپنے وجود میں اتارتے ہیں، اپنے قلب میں اتارتے ہیں، اپنے نفس میں اتارتے ہیں یعنی دین عملاً نظر آتا ہے، جس طرح سے لباس انسان کے وجود پہ نظر آتا ہے اسی طرح سے دین انسان کے وجود میں نظر آتا ہے نہ کہ انسان فقط زبان سے بتائے کہ یہ حقیقتِ دین ہے اور یہ معارفِ دینی ہیں یا یہ راہِ دین ہے مثلاً امام خمینیؒ "زبان نہ بھی کھولیں تو آپ" کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ یہ دین ہے، جو پڑھ رہے ہیں وہ دین ہے، جو بول رہے ہیں وہ دین ہے، جو موقف اختیار کیا ہے وہ دین ہے، جو فیصلہ کیا وہ دین ہے، جو حرکت انجام دی وہ دین ہے، اس کو دین کہتے ہیں، یہ دین رعایت شدہ ہے نہ کہ دین روایت شدہ۔

تاریخ میں دوسرے لوگوں نے بہت زحمتیں کیں، فقط دین کو کتابوں میں منتقل کیا،

☆ دراویوں کے لئے

لائبریریوں میں منتقل کیا یا ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل کیا لیکن امام خمینیؒ نے دین کو عملی شکل دی یعنی رعایت کی نہ کہ فقط دین کی روایت کی، دین کے لئے یہ طبقات ہیں، اسی طرح قرآن میں بھی کچھ فقط راویانِ قرآن ہیں یعنی کچھ اہلِ روایت درقرآن ہیں، کچھ اہلِ درایت درقرآن ہیں اور کچھ اہلِ رعایت درِقرآن ہیں، اہلِ رعایت درقرآن یعنی قرآن کی مراعات کرتے ہیں، اپنے وجود میں قرآن کو اتارتے ہیں، اس کو عملی شکل دیتے ہیں، مراعات کرنا یعنی اس کو عمل میں لے آنا، اس کو عملی جامہ پہنانا، یہ قرآن کے لحاظ سے طبقات ہیں، دین کی بھی یہی مشکل ہے اور دین کے منابع کی بھی یہی مشکل ہے۔

☆ پیغامِ دین کو اَفُقَہ تک پہنچانے کی حکمت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حجۃ الوداع کے موقع پر خطبۂ غدیر بیان فرمایا تو اس جملے سے آغاز کیا کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں اس کو غور سے سنو اور کہا کہ اس کو لکھو، ان باتوں کو یادداشت میں رکھو، صرف حافظے میں نہیں رکھو بلکہ اس کو لکھ بھی لو اور جن کے پاس لکھنے کا سامان نہیں ہے تو اس کو حفظ کرو، سید الشہداء علیہ السلام نے خطبۂ منیٰ میں یہی فرمایا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو لکھو، باقاعدہ تاکید کی، کیوں؟ تاکہ جو یہاں موجود نہیں ہیں، یہاں سے غائب ہیں ان تک میری یہ بات پہنچائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا اور حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے بھی انہی مقدمات کے ساتھ اور اسی اہتمام وتمہید کے ساتھ سننے والوں سے کہا کہ آپ یادداشت میں رکھو اور اس کو لکھو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساتھ توجیح بھی کی، تحلیل بھی کی کہ کیوں لکھو؟ فرمایا اس لئے کہ

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلَى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ...... (۱)

بہت سے فقہ بتانے والے اس کو بتاتے ہیں جو ان سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے......

بعض اوقات ایک شخص ایک مطلب کو حمل کر رہا ہوتا ہے یعنی روایت کرتا ہے، نقل کرتا ہے، ایک مطلب اس کے ذہن میں، سینے میں ہے لیکن اسے سمجھتا نہیں ہے اور جب یہ مطلب انسان دوسرے کو منتقل کرتا ہے تو جس کو منتقل کرے وہ بخوبی سمجھتا ہے، اس لئے فرمایا کہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ تمہیں سمجھ میں آجائے، جب خداوندِ عالم نے رسول اللہ سے ارشاد فرمایا کہ

يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ...... (۲)

اے پیغمبرؐ آپ اس حکم کو پہنچادیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپؐ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا کہ اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔

یہ پیغام پہنچنا چاہئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں کوئی چیز تھی، کھٹکا تھا کہ یہ پیغام کس طرح سے ان لوگوں تک پہنچایا جائے لیکن خداوند نے جب فرمایا کہ

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ....

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیغام پہنچائیں خدا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچائے گا اور خدا سے ڈریں، لوگوں سے نہ

☆ پیغام ودین کو واقعیت تک پہنچانے کی حکمت

ڈریں۔ چنانچہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ پیغام ابلاغ کر دیا، اس تمہید کے ساتھ کہ اس کو سنو، اس کو لکھو، اس کو ذہن میں بٹھاؤ، حفظ کرو اور جو لوگ ابھی موجود نہیں ہیں ان تک میرا یہ پیغام پہنچاؤ، ساتھ یہ علت بھی بیان کی کہ

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلَی مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ......

یعنی فرمایا کہ ضروری نہیں ہے کہ میں تمہیں ہی سب کچھ سنا رہا ہوں، ایسا ممکن ہے کہ جیسے آج کل صنعتی دنیا نے یہ مشکل آسان کر دی ہے یعنی تمہاری حیثیت فقط ایک ٹیپ ریکارڈر کی ہو، اس کو کسی قوم کے لئے ریکارڈ کر لو وہ اس مطلب کو سمجھے گی، کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک معجزۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، آپ دیکھیں کہ حقیقتاً ایسا ہی ہوا، چودہ سو سال تک یہ مطلب اسی طرح سے حاملِ فقہ نقل ہوتا رہا، ولایت کسی کو بھی سمجھ میں نہیں آئی، کوئی ولایت کا معنیٰ محبت کرتا تھا، کوئی ولایت کا معنیٰ کچھ اور کرتا تھا، پوری تاریخ میں ولایت کے ساتھ یہی کرتے رہے تھے تا اینکہ

اِلَی مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ......

ایک افقہ تک یہ بات پہنچی، اس کو سمجھ میں آگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا اعلان کیا تھا، وہ افقہ کون تھا؟ وہی امامِ خمینیؒ کہ غدیر کی آواز امامؒ تک پہنچی اور چودہ سو سال بعد پتہ چلا کہ ولایت کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟ اور اس کو نظام میں بدل دیا، عقیدے سے نظام میں بدلا، محبت سے نظام میں بدلا کہ یہ ولایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان کی ان ریکارڈرز کو سمجھ میں نہیں آرہی تھی، انہوں نے نقل تو کر دیا لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا کہہ رہے ہیں؟ حتیٰ بعد میں بھی کسی کو سمجھ میں نہیں

☆ پیغامِ دین کو افقہ تک پہنچانے کی حکمت

آیا، تا اینکہ افقہ تک یہ بات پہنچی اور اس افقہ نے راز کو دریافت کرلیا، اس نے پیغام سے مقصودِ پیغام استنباط کرلیا۔

یہ جو مدرسی اصطلاح کا استنباط ہے اس استنباط کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک حقیقت تک پہنچ گئے ہو تو اب اس حقیقت کا تجزیہ کرنا ہے، اب اس حقیقت کی تحلیل کرنی ہے، اب آپ نے اس حقیقت کی جانچ پڑتال کرنی ہے، اس حقیقت کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ کرنی ہے، روشنی ڈالنی ہے اور اس کے جتنے متعلقات اور لوازمات ہیں ان سب کو حاصل کرنا ہے۔

۳) میڈیا کے اہلِ استنباط

بسا اوقات ریڈیو پر خبریں نشر ہوتی ہیں تو جو اناؤسر (Announcer) خبریں پڑھ کر سنا رہا ہے ان میں سے پچیانوے فیصد خبریں خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آتی ہیں کہ یہ کیا پڑھ کر سنا رہا ہے، اس کو لکھ کر دی جاتی ہیں اور وہ پڑھ کر سنا دیتا ہے، یہ جیسے عموماً کہتے ہیں کہ کاتب جو کچھ لکھ رہا ہوتا ہے وہ کاتب کو سمجھنا بھی نہیں چاہئے، اگر کاتب سمجھنے کی کوشش کرے تو خراب کر دیتا ہے، کاتب کا کام یہ ہے کہ جیسی لکھی ہوئی چیز اس کو دی ہے اس کو اسی طرح ٹائپ کردے یا لکھ دے، اس کو خوشخطی میں لکھ دے، اس کو خود نہ سمجھے بلکہ جو اسپیکر (Speaker) بول رہا ہے اسی طرح لکھ دے اور جو کچھ لکھا ہے وہ دوسروں کے سامنے جا کر بیان کردے، جیسے ہم ایک مطلب ٹیپ میں ڈالتے ہیں تو ٹیپ کا کام اس کو سمجھنا نہیں ہے بلکہ ٹیپ کا کام ہے اس کو محفوظ رکھنا، بعد میں جس کو سننا ہے اس کو منتقل کردے،

اسی طرح سے یہ خبروں کے اناؤنسر ہیں کہ بہت ساری چیزیں ان کو خود سمجھ میں نہیں آتی ہیں مثلاً یہ لوگ بڑی بڑی سیاسی خبریں اور بڑے بڑے مطالب نقل کرتے ہیں لیکن خود انہیں معلوم نہیں ہوتا ہے، اسی لئے یہی اناؤنسر ایک ماہر کو یا ایرانی اصطلاح میں، فارسی کی اصطلاح میں ایک کارشناس کو، ایک ماہر کو بلاتا ہے، خبر یہ پڑھ کر سُناتا ہے پھر اس سے کہتا ہے اب آپ اس کی تفسیر کرو، آپ اس پر تبصرہ کرو، آپ اس کا تجزیہ کرو، آپ اس کی تحلیل کرو، یہ جو تجزیہ و تحلیل کرتا ہے یہ درحقیقت خبر کی سمجھ رکھتا ہے، خبر نقل کرنا اور بات ہے اور اس خبر کو تجزیہ کر کے اس خبر کی حقیقت اور پس منظر میں پہنچنا اور بات ہے اسی کو استنباط کہتے ہیں۔

اکثر میں یہ خصوصیت نہیں ہوتی ہے بلکہ چند افراد ہوتے ہیں کہ جن کو تبصرہ نگار، تجزیہ نگار یا محلل کہتے ہیں، یہ اخباروں کے یا حالات کے محلل ہوتے ہیں مثلاً فرض کرلیں کہ دنیا میں کوئی سیاسی یا کوئی اور اتفاق رونما ہوتا ہے تو اس کے بعد ماہرین بلا لیتے ہیں خصوصاً میڈیا نے یہ کام آسان کردیا جیسے آج کل پاکستان میں ایک نورا کشتی کی سیاست چلی ہوئی ہے، میڈیا کا یہ سیاسی کھیل پاکستان میں شطرنج کی طرح ہے، پہلے گیم کا ٹائم اوور ہوگیا تھا اب انہوں نے نیا گیم شروع کیا ہے، کچھ مہرے ہیں کہ جنہیں آگے پیچھے کیا جارہا ہے مثلاً فوجی مہرے ہیں، سول (Civil) مہرے ہیں، مغربی مہرے ہیں، مشرقی مہرے ہیں، داڑھی والے مہرے ہیں، بغیر دھاڑی کے مہرے ہیں، یہ سارے مہرے ہیں، یہ آگے پیچھے کیے جاتے ہیں اور اصل شطرنج کا کھیل کوئی اور کھلاڑی کھیل رہا ہوتا ہے، وہ ان مہروں کو فقط آگے پیچھے چلا رہا ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے نام ہوتے ہیں، شطرنج کے مہروں

میں ایک کا نام سپاہی ہوتا ہے، ایک کا نام گھوڑا ہوتا ہے، ایک کا نام وزیر ہوتا ہے، ایک کا نام بادشاہ ہوتا ہے، اِس وقت گھوڑے آگے پیچھے ہو رہے ہیں، سپاہی نہیں، پہلے سپاہی آگے پیچھے ہوتے تھے اب گھوڑے آگے پیچھے ہو رہے ہیں، یہ عوام کو بھی پتہ ہے کہ کیا کام ہو رہا ہے؟

لیکن آپ میڈیا(Media) پر دیکھیں تو روزانہ کچھ سیاست کے ماہرین، اجتماعیت کے ماہرین اور تبصرہ نگار آتے ہیں اور ایک آدمی میزبان بن کر ان سے سوال کرتا ہے کہ یہ جو اس وقت صورتحال بنی ہوئی ہے آپ اس کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالیں یا آپ ان حالات کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں؟ پھر وہ کبھی اس کا قانونی پہلو چھیڑ دیتے ہیں، کبھی اس کا سیاسی پہلو چھیڑتے ہیں، کبھی اس کا عالمی پہلو چھیڑتے ہیں، کبھی اس کا معاشرتی پہلو چھیڑتے ہیں، کبھی عوامی پہلو چھیڑتے ہیں بالآخر ہر ایک اپنی دید کے تحت اس کا کوئی نہ کوئی پہلو اور کوئی نہ کوئی مطلب نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے یہی کام کرنا استنباط ہے، استنباط یعنی تدبر کے بعد کا مرحلہ یعنی ان حالات کے پسِ منظر میں جانا اور اس پسِ منظر سے کچھ حقیقت سامنے لا کر لوگوں کو بیان کرنا اور کہنا کہ یہ سازش ہے اور یہ کہنا کہ مثلاً اسکے پیچھے کوئی بیرونی مخفی ہاتھ ہے، اس کے پیچھے کوئی تیسری قوت موجود ہے، کیا کام کس کے مفاد کے لئے ہو رہا ہے؟ اور کس کے کیا عزائم ہیں؟

٤)ادارتی اہلِ استنباط

ایک جملہ بظاہر سب استعمال کرتے ہیں اور اسکی ایک مصنف نے بڑی خوبصورت تعبیر

لکھی، پاکستان کے ساٹھ سال لکھ کر اس نے کہا کہ ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے آج تک کیا کچھ ہوا ہے چونکہ سب یہی جملہ کہتے ہیں کہ یہ ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے ہے مثلاً ہر ڈکٹیٹر (Dictator) آتا ہے اور آکر کہتا ہے کہ ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے میری ضرورت ہے اور ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے قبضہ کرتا ہے اور دوسرا آکر ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے اس کو پھانسی دیتا ہے پھر تیسرا آکر ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے اس کے خلاف ایکشن لیتا ہے، چوتھا آکر ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے اس کو نامزد کرتا ہے پھر وسیع تر مفاد کے لئے اس کو انتخاب کیا جاتا ہے پھر وسیع تر مفاد کے لئے اس کو ہٹایا جاتا ہے پھر وسیع تر مفاد کے لئے اس کو ملک بدر کیا جاتا ہے پھر وسیع تر مفاد کے لئے دوبارہ واپس لایا جاتا ہے، یہ ملک کے ایسے وسیع مفاد ہیں کہ پاکستان کے وسیع رقبے کے اندر یہ سب کچھ کھپتا ہے، یہ سب کچھ اس ملک کے اندر ہو رہا ہے۔

وزارتوں میں یا حکومتی اداروں میں ایسے محلل، تجزیہ نگار اور ماہرین ہوتے ہیں کہ جن کا کام فقط حالات کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے، یہ اہلِ استنباط ہیں۔ ہر ملک کے لئے یہ ضروری ہیں اور پوری دنیا میں ہیں، اہلِ استنباط لوگ بیٹھتے ہیں اور بیٹھ کر فقط حالات کا تجزیہ کر کے مطالعہ کر کے اس کے پسِ منظر میں اترتے ہیں کیونکہ ان کو فراواں معلومات ہوتی ہیں اور یہ ہنر اور فن بھی ان کے اندر ہوتا ہے کہ ان حالات کے پسِ منظر کا جائزہ لے سکتے ہیں، فقط ان کے لئے ظاہر نہیں ہوتا ہے، بعض چیزیں میڈیا میں دے دیتے ہیں اور بعض نہیں دیتے ہیں، میڈیا کے اندر اور مخصوصاً ہر ملک کے اندر انٹیلی جنس (Intelligence) ادارے ہیں، یہ پکڑ دھکڑ کا شعبہ نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ خفیہ ایجنسیوں کا ایک

الگ شعبہ ہوتا ہے کہ جو لوگوں پر نظر رکھتے ہیں، جاسوسی کرتے ہیں، دوسروں کی خبر لیتے ہیں اور دوسروں کے حالات کا کھوج لگاتے ہیں۔ان اداروں کا ایک جاسوس محکمہ ہوتا ہے اور ایک اور اصلی محکمہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ یہ جاسوس میں ان تک منتقل کرتے ہیں وہ ان کو بیٹھ کر تجزیہ اور تحلیل کرتے ہیں یعنی جاسوسوں کی بتائی ہوئی رپورٹوں کے مطابق وہ حالات کے پسِ منظر کا جائزہ لیتے ہیں کہ جس کو آج تھنک ٹینک (Think tank) یا تجزیاتی ٹینک کہتے ہیں، یہ شعبہ ہر اطلاعاتی ادارے یا انٹیلی جنس ادارے میں ہوتا ہے کہ جو حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور سارا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے یعنی اہلِ استنباط پر ہوتا ہے، اگر انہوں نے صحیح استنباط کیا تو یہ صحیح فیصلہ کر پائیں گے لیکن اگر انہوں نے غلط استنباط کیا تو یہ غلط فیصلہ کریں گے۔

سیاسی اہلِ استنباط

۵)سیاسی اہلِ استنباط

کچھ لوگ سیاسی مسائل میں اہلِ استنباط ہیں اور اس میں ان کو تخصص حاصل ہے کیونکہ عوام کو پتہ کہ ہوتا ہے کہ کیا کچھ ہو رہا ہے؟ واقعاً عوام میں اتنا شعور نہیں ہے، نہ صرف پاکستان میں نہیں ہے بلکہ کہیں بھی عوام میں اتنا شعور نہیں ہے۔عوام کس کو کہتے ہیں؟

اَلنَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِھِمْ...... (۳)

لوگ اپنے بادشاہوں (حاکموں) کے دین پر ہوتے ہیں......

لوگوں کے چند طرح کے دین ہیں ان میں سے ایک دین دینِ ملوکی ہے،ملکوتی نہیں بلکہ

دینِ ملوکی یعنی لوگ دینِ ملوک پر ہیں، لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر اور حکمرانوں کے دین پر ہوتے ہیں یعنی جو کچھ حکمران بتاتے جاتے ہیں لوگ اسی کو باور کرتے جاتے ہیں، اسی کو مانتے جاتے ہیں، عوام کو معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ اتفاقات، یہ حوادث، یہ روئیدادیں اور یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے مثلاً عالمی سطح پر اس وقت فرض کریں کہ عراق میں کیا ہو رہا ہے؟ خود عراقی عوام کو نہیں معلوم ہے کہ اس کے بارے میں کیا ہو رہا ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ تیل کے لئے آئے ہوئے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ ہمیں نجات دینے کے لئے آئے ہوئے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ حرم آزاد کرانے کے لئے آئے ہوئے ہیں، یہ عوام ہیں بالآخر یہی انہیں کہنا چاہئے، جو زبان پر ڈال دو وہی دہرانا شروع کر دیتے ہیں لیکن کچھ لوگ اہلِ استنباط ہیں، یہ لوگ انہی واقعات کے اندر تدبر کر کے، ان واقعات کے پسِ منظر میں جا کر، ان واقعات کے اصلی علل و اسباب تلاش کر کے اس کو خود اپنے لئے یا بالآخر کسی مخصوص طبقے کے لئے یا پھر عوام کے لئے پیش کرتے ہیں۔

اسی مطلب کو ایک اور مثال سے سمجھیں کہ انقلابِ اسلامی جب رونما ہو رہا تھا تو یہاں پر امریکا قابض تھا اور اس کی رسائی اندر تک تھی، امریکی تجزیہ نگار کہ جن کا کام اس وقت سوچنا تھا، حالات کا جائزہ لینا تھا وہ صد در صد ناکام رہے، یہ خود ان کی رپورٹیں ہیں کہ ان کے مطابق وہ صد در صد ناکام رہے یعنی ایران میں کیا ہو رہا ہے؟ ایران میں کیا ہونے والا ہے؟ یہ ان واقعات اور حالات کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکے اور اس وجہ سے ان کی موجودگی کے باوجود یہاں پر انقلابِ اسلامی رونما ہو گیا۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ کیا ہو رہا ہے یا اس طبقۂ انقلابی کہ جو اس وقت انقلاب کے

باری اہلِ استنباط

لئے کوشش کر رہا تھا اس سے دوری کی وجہ سے یا مثلاً غرور کی وجہ سے، بسا اوقات ہوتا ہے کہ تکبر اور غرور بھی انسان کیلئے مانع بنتا ہے، وہ لوگ صحیح تجزیہ اور تحلیل نہیں کر سکے بالآخر ضمامِ اُمران کے ہاتھ سے نکل گئی اور ناخواستہ ان کو یہاں پر سب کچھ چھوڑنا پڑا، بعد میں انہوں نے اعتراف کیا کہ ہمارے تجزیاتی بورڈ نے سخت اشتباہ کیا ہے اور حالات کا درست تجزیہ نہیں کر سکے کہ یہ حالات کس رخ پر جا رہے تھے۔

اسی طرح سے ابھی عراق کے اندران کے تجزیہ کرنے والے لوگ سخت اشتباہ میں ہیں، انہیں نہیں معلوم کہ مسئلہ کس طرف جا رہا ہے، اصلاً یہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے، یہ ضمامِ امران کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور عراقی حالت اس وقت کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے، نہ عراقیوں کے ہاتھ میں ہے، نہ عراقی لیڈر شپ کے ہاتھ میں ہے، نہ بیرونی لیڈر شپ کے ہاتھ میں ہے، اصلاً عراقی حالت شترِ بے مہر کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ جس کی لگام کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے، جس طرح ایک وحشی جانور بھاگ جاتا ہے، جس گاؤں سے گزرتا ہے تو اس گاؤں کے رہنے والے کوشش کرتے ہیں کہ اس کو قابو کریں لیکن ایک آدھ پاؤں ان کی رسی پہ آتا ہے تو وہ دوسرے ہی لمحے جھٹکا دے کر چھڑا کے بھاگ جاتا ہے، اسی طرح اس وقت عراق کے حالات ایک وحشی چموش جانور کی طرح ہیں کہ ہر ایک کوشش کرتا ہے کہ اس پہ اپنی گرفت ڈالے، حکومت کوشش کرتی ہے، دوسرے لوگ کوشش کرتے ہیں، ہمسائے کوشش کرتے ہیں، عالمی طاقتیں اور UNO سب ملکر کوشش کر رہے ہیں لیکن کسی کے ہاتھ میں اس کی ضمام نہیں ہے، کیوں نہیں ہے؟ چونکہ انہی لوگوں نے اشتباہ کیا تھا، انہی مجتہدینِ

سیاست نے اشتباہ کیا تھا کہ جن کا کام درست تجزیہ کرنا تھا، حالات کا درست تجزیہ کرنا تھا، وہ صحیح تجزیہ نہیں کر سکے یعنی صحیح تدبر نہیں کر سکے، وہ یا تو اہلِ تدبر و بصیرت نہیں تھے یا صحیح تحلیل نہ کر سکے پس منظر کے اندر نہیں اُتر سکے اور سیاست دانوں کو موقع پر حالات نہیں بتا سکے مثلاً ملک کا حکمران تجزیہ نگار نہیں ہوتا ہے، اسے مطالعہ شدہ چیز سمری (Summary) کی صورت میں پیش کی جاتی ہے، مجتہدینِ سیاست اور لوگ ہوتے ہیں، وہ اپنے مشاورین کی جماعت بناتے ہیں اور کسی کا اعلان کرتے ہیں کسی کا اعلان نہیں کرتے ہیں مثلاً جو لوگ سب کچھ مطالعہ کر کے، سوچ سمجھ کے، تجزیہ و تحلیل کر کے اس کو سامنے لا کر پیش کرتے ہیں یہ لوگ سیاسی اہلِ استنباط کہلاتے ہیں۔

۶)اقتصادی اہلِ استنباط

اسی طرح اقتصادی میدان میں بھی کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کا کام فقط اقتصادی واقعات وحالات سے متعلق ہوتا ہے لیکن ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو مجتہدِ اقتصاد ہیں یعنی جو اقتصادی حالات کا درست تجزیہ اور تحلیل کرنے کے قابل ہوتے ہیں، اقتصادی مسائل کے پسِ منظر میں جا کر ساری نبض انکے ہاتھ میں ہوتی ہے، یہ تجزیہ و تحلیل کر کے آئندہ کے اقتصادی حالات کو دیکھ لیتے ہیں۔

۷)طبی اہلِ استنباط

طب میں بھی اسی طرح سے ہے کہ ایک ڈاکٹر صرف علامتیں چیک کرتا ہے، اس کو پتہ ہے کہ اس مریض کے اندر یہ یہ علامتیں ہیں اور یہ علامتیں کس بیماری کی ہیں، بس اس کو معائنے کی رپورٹ معلوم ہے، عموماً نرسوں کو یہ پتہ ہوتا ہے کہ مریض میں یہ علامتیں ہیں لیکن نرسیں دوا تجویز نہیں کرسکتیں، کیوں؟ اسلئے کہ وہ استنباط نہیں کرسکتی ہیں، اسی معائنہ کی رپورٹ سے کسی چیز کو استنباط نہیں کرسکتی ہیں، ان کے اندر تدبر ہے، تدبر کر کے انہوں نے دیکھا ہے کہ اس کو یہ تکلیف ہے، اس کے گردے میں یہ علامت ہے، اس کے مغز میں یہ علامت ہے، اس کے معدے میں یہ علامتیں ہیں لیکن جو کچھ گردے، مغز اور معدے میں ہو رہا ہے اس سے کوئی چیز دریافت نہیں کرسکتی ہیں لہٰذا اس کے لئے ایک ڈاکٹر ہوتا ہے یا بسا اوقات ڈاکٹر کو بھی معلوم نہیں ہوتا ہے بلکہ پورا ایک میڈیکل بورڈ (Medical board) بٹھایا جاتا ہے اور اس کے سامنے مریض کی حالت اور ساری رپورٹیں پیش کی جاتی ہیں پھر وہ تجزیہ وتحلیل کر کے سمجھتے ہیں کہ اس کو کیا بیماری ہے؟

۸)دینی اہلِ استنباط

یہی صورت اجتماعی یا دینی مسائل میں بھی ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو باصلاحیت اور اہلِ استنباط ہوتے ہیں، قرآن مجید نے اتفاقاً اسی تناظر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے کہ یہ جو بات سنتے ہو وہ آپ اہل تک پہنچاؤ کہ شاید وہ زیادہ بہتر سمجھتے ہوں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ......

جو فہم اور جو مطلب آپ لوگوں کو ملا ہے شاید آپ درست نہ سمجھ سکتے ہوں لہٰذا فرمایا کہ اس کو ضبط کرو، دوسروں کے لئے نقل کرو کہ جن تک تم نقل کرو گے ممکن ہے وہ بہت بعد میں آئیں، شاید اگلی صدی میں ہوں، شاید اس سے اگلی صدی میں ہوں، یہ مطلب محفوظ کر لو کہ انہیں سمجھ میں آجائے گا، جس کی مثال بھی دی ہے، سورہ نساء کی آیہ (۸۲) اور (۸۳) میں پہلی آیہ پہلے لکھ چکے ہیں، آیہ (۸۳) اسی سے مربوط ہے اور اسی آیہ میں ہمارا شاہد ہے، آیہ ۸۲ میں ہے کہ

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ......

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں؟ مثلاً منکرین یا جو لوگ بھی قرآن سے سروکار نہیں رکھتے ہیں یا قرآن کی طرف مائل نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ اسی طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا، چار یا چھے آدمیوں کی بات نہیں ہو رہی ہے کہ مثلاً وہ فلاں فلاں قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں، قرآن کے مخاطب تا قیامت کے ناس ہیں، ہمیں آج کی مثال دینی چاہئے نہ کہ چودہ سو سال پہلے کی مثال کہ چودہ سو سال پہلے فلاں فلاں تدبر نہیں کرتے تھے مثلاً ابن مسعود، ابن عباس تدبر کرتے تھے اور دوسرے چند ایک نہیں کرتے تھے، نہیں بلکہ آج کی نسل میں تلاش کریں کہ کون قرآن میں تدبر نہیں کرتا ہے؟

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۝

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہیں کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف ہوتا۔

یعنی اگر قرآن میں تدبر کرتے تو انہیں ایک چیز بخوبی معلوم ہو جاتی اور وہ یہ کہ قرآن میں اختلاف نہیں ہے اور اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے نہ ہوتی تو جس طرح سے دوسروں کا کہنا تھا کہ یہ اساطیر اولین ہیں مثلاً یہ رسول اللہ ﷺ کے اپنے افکار ہیں، خود اپنی آراء ہیں کہ جو جمع کر کے مثلاً دوسرے ادیان کا مطالعہ کر کے یا دوسری امتوں کا مطالعہ کر کے یا ان کے انہوں نے لکھی ہیں، بعض لوگ پیغمبر اکرم ﷺ پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ یہ آراء و افکار مختلف لوگوں سے سن کر اور ایک اچھی کتاب تدوین کر کے کہا کہ یہ وحی خدا ہے، افکار اپنے، تدوین اپنی اور اس کو ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کی جانب نسبت دے دی، خداوند نے فرمایا کہ اگر یہ غیرِ خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں غیرِ خدا کی ایک حتمی علامت ہوتی اور وہ یہ کہ اختلاف ہوتا اور شدید اختلاف ہوتا اور اسکے مطابق اس میں تناقص ہوتا، کیا یہ قرآن کے اندر تدبر نہیں کرتے ہیں، غور نہیں کرتے ہیں کہ

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ......

اگر یہ غیرِ خدا کی طرف سے ہوتا، حتیٰ رسول اللہ ﷺ کی اپنی طرف سے ہوتا یا مثلاً جیسے وہ کہتے ہیں کہ بُحیرہ کی طرف سے تھا یا بحیرہ سے حضرتؑ کی ملاقات ہوئی اور اس سے کچھ چیزیں لے کر پھر پوری تشریح لے کر کتاب تدوین کر دی،

لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۝

اس میں فراواں اختلاف ہوتا، تضاد ہوتا درحالیکہ نہیں ہے یعنی منطق کی اصطلاح کے مطابق ایک قیاسِ استثنائی ہے کہ اگر یہ غیرِ خدا کی طرف سے ہوتا تو اس کے اندر اختلافِ کثیر ہوتا اور اب جبکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے تو یہ غیرِ خدا کی جانب سے نہیں ہے یعنی خدا کی جانب سے ہے، یہ تدبر کا نتیجہ ہے۔

۹) چیزوں کو اہل تک پہنچائیں

آیہ (۸۳) اسی آیہ کے ساتھ متصل ہے یعنی آیہ تدبر کے ساتھ ہی آیتِ استنباط ہے،

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ......

یعنی جب کوئی بھی خبر آتی ہے، جب بھی کوئی بات امن کے بارے میں، جنگ کے بارے میں، خوف کے بارے میں یا کسی اور چیز کے متعلق کہیں سے بھی کوئی خبر آتی ہے،

أَذَاعُوا بِهِ ......

تو فوراً نشر کر دیتے ہیں، فوراً پھیلا دیتے ہیں یعنی شائع کر دیتے ہیں، افواہ پھیلا دیتے ہیں، یہ نفسیاتِ عوام ہے کہ اہلِ افواہ ہوتے ہیں، افواہ فوہ سے ہے اور فوہ سے مراد منہ ہے، افواہ کو افواہ اسی لئے کہتے ہیں یعنی وہ بات جو فقط منہ کی حد تک ہے اور منہ سے پیچھے اس کی کوئی حقیقت نہ ہو یعنی فقط ایک زبانی گفتار ہے اور اس کے بعد اس کی کوئی حقیقت، کوئی معنیٰ اور کوئی اور مصداق نہیں ہے۔

یہ عام چیز ہے کہ لوگوں کا سارا دارومدار افواہوں پر ہوتا ہے، دینِ افواہی، اعتقادِ افواہی،

عملِ افواہی، فقۂ افواہی، سنا ہے کہ چاند نظر آ گیا ہے، سنا ہے کہ چاند نظر نہیں آیا ہے، سنا ہے فوہ سے نکلا ہے، آپ نے چاند کو دیکھنا ہے نہ کہ سننا ہے، چاند تو سننے کی چیز نہیں ہے بلکہ چاند دیکھا جاتا ہے لیکن لوگوں کا سارا دارومدار افواہ پہ ہوتا ہے، جیسا ابھی حالیہ دنوں میں ہے چونکہ ایران میں رہنے والوں کو نہیں پتہ ہے کہ ایران کے بارے میں باہر کیا خبر ہے؟

اس وقت باہر دنیا کا خیال یہ ہے کہ ایران جنگ کے شعلوں میں جل رہا ہے اور باقاعدہ ٹائم اور ڈیٹ (Time & Date) بھی دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو رات فلاں بجے اٹیک (Attack) ہونا ہے اور ساتھ ایڈریس (Address) بھی دیتے ہیں کہ کن کن نقطوں پر ہونا ہے، مثلاً تین سو نقطوں پر اٹیک ہونا ہے، چار سو جگہوں پر اٹیک ہونا ہے، ابھی ریسنٹلی (Recently) انہوں نے کہا ہے کہ سات سو نقطے ہیں کہ جو مشخص ہو چکے ہیں، ان کی نشاندہی ہو چکی ہے اور میزائل ان کی طرف بالکل تیار ہیں، یہ صرف افواہیں ہیں یعنی میزائل اس پہ فٹ (Fit) کر دیئے گئے ہیں، نشانہ لے لیا گیا ہے اور عنقریب اس کو فائر کرنے والے ہیں، باہر میڈیا کی وجہ سے یہ افواہیں گردش کر رہی ہیں اور لوگ پریشان ہیں لیکن آپ دیکھیں کہ خود ایران کے اندر ایسی کوئی خبر نہیں ہے، جو باہر سے آتا ہے وہ اندر آ کر زیادہ مطمئن ہو جاتا ہے، ایئر پورٹ تک سخت پریشان ہوتا ہے کہ معلوم نہیں پہنچ بھی پاؤں گا یا نہیں لیکن یہاں آ کر دیکھتا ہے کہ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے، افواہیں اسی کو کہتے ہیں، خناس کا کام بھی افواہیں پھیلانا ہے اور افواہوں پر ایمان لانا بھی اتنا ہی غلط ہے کہ جتنا افواہ پھیلانا غلط ہے، شائع پراکنی غلط کام ہے، حرام ہے۔ اگر خوف کے

بارے میں، امن کے بارے میں، جنگ کے بارے میں، صلح کے بارے میں یا کسی بھی بارے میں کوئی ایسی افواہ یا اُڑتی ہوئی خبر پہنچتی ہے تو

أَذَاعُوا بِهِ......

اسے فوراً پھیلا دیتے ہیں۔ حالانکہ اسے پھیلانا نہیں ہے، پھر کیا کرتے؟

وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ......

آپ اسے رہبر کی طرف پلٹاتے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پلٹاتے، کچھ کام ہیں کہ جو خدا نے رہبر کے ساتھ مخصوص کئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رہبر، امام اور حاکم مقرر کیا ہے اور کچھ اختیارات دیئے ہیں کہ اگر چاند نظر بھی آیا ہے تو کس کو بتانا ہے؟ فقط رہبر کو بتانا ہے، خود کچھ بھی اعلان نہیں کرنا ہے، جو بھی ہو حتیٰ مرجعِ تقلید ہو لیکن کسی کا حق نہیں بنتا ہے کہ اعلان کردے کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے اور کل عید ہے یا کل روزہ ہے، بلکہ کیا کرنا ہے؟

وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ......

جو خبر بھی پہنچتی ہے اسے فوراً پھیلاؤ نہیں بلکہ اس کو فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاؤ، رسولؐ بعنوانِ مصداق ہیں لیکن اگر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں اور امیر المومنین علیہ السلام ہیں تو امیر المومنین علیہ السلام تک پہنچاؤ، امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام ہیں تو ان تک پہنچاؤ، سید الشہداء علیہ السلام ہیں تو ان تک پہنچاؤ، جو بھی زمانے کا امام ہے اس تک پہنچاؤ، اگر زمانۂ غیبتِ کبریٰ ہے تو پھر پھیلا دو؟ چونکہ قرآن نے کہا ہے کہ اگر امن و خوف کی کوئی بات تم تک پہنچتی ہے تو اسے پھیلاؤ نہیں بلکہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاؤ اور اب تو

زمانہ غیبتِ کبریٰ ہے اور اس میں نہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں نہ امام ہیں، پس اب پھیلا سکتے ہیں، نہیں، اب بھی پھیلانے کا حق نہیں بنتا ہے، کیوں؟ کیونکہ بالآخر ترتیب ہے، جیسے اگر ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہوتے تو آپ نماز کیسے اور کہاں پڑھتے؟ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیچھے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہیں ہیں تو کس کے پیچھے پڑھو گے؟ امام معصومؑ کے پیچھے اور اگر امامِ معصوم علیہ السلام نہیں ہیں تو؟ نائبِ امام علیہ السلام کے پیچھے، ایک جامع الشرائط انسان کے پیچھے یا ملنگوں کی طرح یہ کہو گے کہ نہیں ہم نے تو نماز رسول اللہؐ کے پیچھے ہی پڑھنی ہے اور اگر رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہیں ہیں تو پھر نماز ہی نہیں پڑھنی، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیچھے کہہ لیں تو اتنی شانس بھی نہیں ہے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی اتنا ملنگ بھی نہیں ہے کہ کہے ہم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیچھے پڑھیں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم صرف امام زمانہ علیہ السلام کے مقلد ہیں اور کسی کی تقلید نہیں کرنی ہے، جب امامِ زمانہ علیہ السلام ہیں تو امام علیہ السلام کی تقلید کرو لیکن جب تک امام علیہ السلام تک رسائی نہیں ہے تو نائبِ امام کی تقلید کرو کہ جن کو خود انہوں نے متعین کیا ہے اور آپ کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے متعین کیا ہے۔

دین سیکھیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ اگر کوئی گم شدہ چیز ملتی ہے تو کیا کریں؟ حج پہ عموماً لوگوں کی بہت ساری چیزیں گم ہو جاتی ہیں، ایک عام چیز جو گم ہو جاتی ہے وہ جوتا ہے، کبھی حج پہ جانا پڑے تو پندرہ، سولہ جوتے ساتھ لے کر جائیں، نہ کہ لوگ چراتے ہیں بلکہ رش کی وجہ سے گم ہو جاتے ہیں، بسا اوقات انسان رکھتا ہے اور بھول جاتا ہے، بسا اوقات صفائی کرنے والے اٹھا کر کہیں پھینک دیتے ہیں اور جوتا گم ہو جاتا ہے، یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض نے خود اپنے طور پر اجتہاد کر کے کہ چونکہ ہمارا جوتا

کسی نے اٹھالیا ہے تو کسی اور کا جوتا ہم اٹھالیتے ہیں لہٰذا وہ کسی کا پہن کر آجاتے ہیں اور اسی میں پوراحج بھی کرلیتے ہیں۔اگر کوئی گم شدہ چیز ملی ہے تو کیا کریں؟ معلوم ہونا چاہئے، یہ تربیت کا حصہ ہے، بچوں کو تعلیم وتربیت میں بتاؤ کہ اگر کوئی چیز ملے تو اس کو کیا کریں؟ اسکول میں اگر بچے کو زمین پر پینسل، ربڑ، کاپی، کتاب، پیسہ یا جو کچھ بھی ملے تو بچہ کیا کرے؟ اس چیز کو اسکول کے آفس میں دے،

چیزوں کو اہل تک پہنچائیں

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ......

اگر یہ بچے اسے آفس میں نہ دیں تو اس سے دکان پہ جاکر ٹافی خرید کے کھالیں گے، اس طرح سے ہر چیز کا ایک اہل ہے، ہر چیز کے لئے ایک اتھارٹی (Authority) ہے، ہر کام اس کی اتھارٹی کی طرف لوٹاؤ یعنی یہ قرآن کا قاعدہ ہے کہ ہر کام، ہر مطلب اپنی اتھارٹی کی طرف لوٹاؤ، ہر کام اس کے اہل کی طرف لوٹاؤ، اس کے منبع کی طرف لوٹاؤ، اگر ملکی حالت کے بارے میں امن و خوف کی کوئی خبر آئی ہے کہ حملہ ہونا ہے یا کچھ اور ہونا ہے تو لوگوں کو ڈراؤ، فوراً نہ پھیلاؤ کہ یہ ہوگیا وہ ہوگیا بلکہ یہ اس کے اہل تک پہنچاؤ کہ یہ خبر ہم نے سنی ہے، دیکھو کیسی ہے؟

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى أُولِى الْأَمْرِ مِنْهُمْ......

اگر یہ لوگ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف واولی الا ، طرف لوٹادیں یعنی فقط رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں بلکہ بعد میں صراحت ہے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولی الامر کی طرف لوٹاتے تو کیا ہوتا؟

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ......

اس وقت جان لیتے، کون؟

يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ......

جولوگ استنباط کرتے ہیں یعنی وہ امر جو خوف وامن کے بارے میں پھیلایا جارہا ہے یا افواہ اڑائی جارہی ہے، شائع کی جارہی ہے اگر اسے رسول ﷺ یا اولی الامر کی طرف لوٹاتے تو وہاں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو مستنبط ہیں، استنباط کرنے والے ہیں، وہ جان لیتے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ آیا خبر درست ہے یا نہیں ہے؟ واقعاً کوئی خطرہ ہے یا نہیں ہے؟ لوگ بسا اوقات امن کی افواہ اڑا دیتے ہیں درحالیکہ خطرہ ہوتا ہے اور بعض اوقات خطرے کی افواہ اڑاتے ہیں درحالیکہ امن ہوتا ہے، اس کے لئے باقاعدہ طبقہ ہے، لوگ معین شدہ ہیں لہٰذا جن کا کام استنباط کرنا ہے،

الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ......

یعنی ان لوگوں میں سے جو اہلِ استنباط ہیں وہ جان لیتے، استنباط کون کرتے ہیں؟ بعض نے تحقیق کرنے والے، جستجو کرنے والے لکھا ہے یہ تعبیریں درست ہیں لیکن انہوں نے دقیق معنیٰ استنباط روشن نہیں کیا، نہ ترجموں میں اور نہ تفسیروں میں کہ استنباط کا صحیح معنیٰ کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ کے پاس یا اور اولی الامر کے پاس ایسے افراد ہیں یا لوگوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں کہ اگر یہ خبر ان تک پہنچ جائے تو اس میں سے استنباط کرتے ہیں، یعنی اس خبر کی تہہ تک پہنچیں گے اور تہہ تک پہنچ کے جو حقیقت ہے وہاں سے نکال کر سامنے لے آئیں گے اسی کو استنباط کہتے ہیں، کنویں کے اندر تہہ میں موجود پانی کو نبط کہتے ہیں، اس پانی تک رسائی تدبر ہے اور پھر اس پانی کو لے کر باہر منتقل کرنا استنباط ہے۔

چیزوں کو اصل تک پہنچانا تمیں

۱۰)قرآن کے اہلِ استنباط

لہٰذا کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تجزیہ نگار ہیں، تبصرہ نگار ہیں، ان کے لئے مختلف اصطلاحیں ہیں عموماً میں رائج اصطلاحیں استعمال کرتا ہوں یعنی جو اہلِ تحلیل ہیں، اہلِ تجزیہ ہیں وہ حالات کے پسِ منظر میں اتر سکتے ہیں، یہ اہلِ مطالعہ اور اہلِ معلومات ہیں کہ ہر چیز کی تہہ میں اور پسِ منظر میں جا کر حقیقت کو تلاش کر کے آپ کے لئے کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ جیسے بیان کیا ہے کہ میڈیا میں یہ چیز رائج ہے اور روزمرہ ہو رہی ہے، دین میں بھی ایسے ہی ہے، اداروں کے لئے بھی ایسے ہی ہے، اسی طرح قرآن کے لئے بھی ہونا چاہئے، اب آیہ کو آخر تک پڑھتے ہیں،

الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

یعنی جب ان کے پاس امن یا خوف کی خبر آتی ہے تو فوراً نشر کر دیتے ہیں حالانکہ اگر رسول اور صاحبانِ امر کی طرف پلٹا دیتے تو ان سے استفادہ کرنے والے حقیقتِ حال کا علم پیدا کر لیتے اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند افراد کے علاوہ سب شیطان کا اتباع کر لیتے۔

اور اگر اہلِ استنباط کو یہ بات نہ دو بلکہ خود ہی اس کو افواہ بنا کر پھیلانا شروع کر دو تو پھر اگر رحمتِ خدا و فضلِ خدا شاملِ حال نہ ہوا تو تم میں سے اکثر شیطان کے پیروکار بن جاؤ گے۔ جس قوم کے اندر، جس طبقے کے اندر اہلِ استنباط لوگ نہ ہوں کہ جو حقائق کو تجزیہ کر کے، تحلیل کر کے ان کے

سامنے بیان کریں تو اس صورت میں آپ کو شیطان کی پیروی کرنی پڑے گی چونکہ دوسری صورت میں شیطان بتائے گا چونکہ شائع کرنا، افواہ پھیلانا شیطان کا کام ہے، خناسیت شیطان ہے اور شیطنت ہے،

لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ اِلَّا قَلِيْلًا۝

پھر استنباط در قرآن سے کیا مراد ہوئی؟ استنباط در قرآن سے مراد یہ ہے کہ آپ کے سامنے قرآنِ نازل شدہ ہے، نازل شدہ یعنی لفظی قالب میں موجود ہے، عربی کے ساتھ موجود ہے، کتابی شکل میں موجود ہے اور اس عربیت، ان تعبیرات و عبارات کے پیچھے معانی ہیں، حقائق ہیں، باطنِ قرآن ہے۔ یہ ظاہرِ قرآن ہے اور اس کے پیچھے حکمتِ اصلی تر آن ہے، اس سے پہلے ادب یہ تھا کہ قرآن میں تدبر کرو یعنی ظواہر پر ہی اکتفا نہ کرو، ساحل پیمائی نہ کرو، ساحلِ قرآن میں اور سطحِ سمندر میں ہی ساری عمر صرف نہ کردو بلکہ اسکی گہرائی میں بھی جاؤ چونکہ قیمتی گوہر اس کی گہرائی میں موجود ہیں، تدبر کے بعد پھر کیا کرنا ہے؟ تدبر کے بعد ان آیات کا جو مقصود ہے، ان آیات کے اندر خدا نے جو حکمت رکھی ہوئی ہے، ان آیات کے اندر تمہارے لئے جو ہدایت موجود ہے اس ہدایت کو لے کر آؤ، اپنے اندر بھی اتارو اور اس ہدایت کو لوگوں کے سامنے بھی پیش کرو لیکن استنباط سے مراد ذرا وسیع تر ہے چونکہ جب آپ آیت کے پسِ منظر اور آیت کی گہرائی میں جاتے ہیں تو لکیر کا فقیر نہیں بننا ہے۔

بعض موانعِ فہمِ قرآن صدر المتالھینؒ نے خود الگ سے بیان کیے ہیں، ابھی آدابِ فہمِ قرآن میں استنباط پر بحث ہے، اگلی فصل میں جو چھٹا ادب آ رہا ہے اس میں موانعِ فہمِ قرآن بیان

قرآن کے اہل استنباط

کریں گے کہ جن چیزوں کی وجہ سے انسان فہمِ قرآن پہ قدرت حاصل نہیں کر پاتا ہے۔

جب آپ آیتِ قرآن میں پہنچتے ہیں تو اس آیتِ قرآن کے معنیٰ کو لے کر پھیلائیں مثلاً

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

اسی ایک آیت کو لے لیں اور اس کی تہہ میں اتریں یا اس کے اندر تدبر کریں یعنی جب آپ ظاہرِ لفظ سے معنیٰ باطن تک پہنچیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ معنیٰ ایک عالم ہے، اس عالمِ معنیٰ کے اندر ایک اور دنیا ہے، جس طرح سے یہ چیزیں کہ جو ہم کھاتے پیتے ہیں یا جہاں آپ سوتے ہیں یا جہاں بیٹھے ہوئے ہیں ہم عام آنکھ سے دیکھ رہے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے لیکن اگر آپ اسی کو اگر مائکرواسکوپ (Microscope) میں دیکھیں گے تو کو آپ کو یہاں ایک عجیب دنیا آباد نظر آئے گی، یہاں پر عجیب وغریب قسم کے جاندار موجود ہیں کہ جو تدریجاً میری ناک میں داخل ہو رہے ہیں، پھیپھڑوں میں جا رہے ہیں، پانی کا ایک قطرہ لے کر مائیکرواسکوپ کے اندر دیکھیں تو اندر ایک عجیب وغریب دنیا ہے۔

اسی طرح سے ہم جب قرآن کے معنیٰ تک پہنچتے ہیں تو اب کس چیز کی باری آجاتی ہے ؟ مائکرواسکوپ کی باری آتی ہے، لفظ سے معنیٰ تک پہنچے، ادبیات وصرف ونحو نے ہمیں معنیٰ تک پہنچا دیا ہے لیکن اب یہاں سے آگے کیا چاہئے؟ مائکرواسکوپ چاہئے یعنی وہ آنکھ کہ جو انتہائی چھوٹی چیزیں بھی دکھاتی ہے، جب اس سے دیکھیں تو ہر چھوٹا سا معنیٰ اپنے اندر ایک پورا عالم لئے ہوئے ہے، اس کے اندر پوری دنیا ہے، پھر اس کے بعد استنباط کرنا ہے یعنی انسان معنیٰ قرآن میں اس دید

کے ساتھ، اس بصیرت کے ساتھ اترے کہ وہ جہانِ معانی، عالمِ معانی میں اُتر جائے اور عالمِ معانی میں سے معانی کو لے کر باہر آئے جیسے علامہ طباطبائیؒ ہیں، یہی آیت جو بہت سارے لوگوں نے لکھی بھی اور پڑھی بھی، فرض کریں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

یا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ○

لکیر کا فقیر بن کر چونکہ اس نے الحمد کہا ہے کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں لہٰذا میں ایک کلمہ اوپر نیچے کرنے کا مجاز نہیں ہوں، مجھے بھی یہی کہنے کا حق ہے کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں کیونکہ میرا حق نہیں بنتا ہے، سارے نمبر کٹ جائیں گے، اگر کسی نے کہہ بھی دیا تو لوگ اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے کہ اس نے ایک اور بات کر دی ہے، لیکن اسی آیہ کے اندر جب مستنبط اترتا ہے تو وہ ایک عجیب جہانِ معانی اپنے ہمراہ لے کر واپس آتا ہے۔

علامہ طباطبائیؒ کہتے ہیں کہ قرآن میں بسم اللہ تکرار نہیں ہوئی ہے تو معلوم ہوا کہ جہانِ بسم اللہ ہے، عالمِ بسم اللہ ہے، بسم اللہ ایک آیہ نہیں ہے بلکہ بسم اللہ پوری ایک دنیا ہے، جب بسم اللہ معانی کی ایک پوری دنیا ہے تو اس دنیا میں اترنا اور اس دنیا سے پھر اپنی استطاعت و طاقت کی حد تک معانی لے کر باہر آنا اصطلاح میں استنباط کہلاتا ہے۔

حضرت آیت اللہ سید محسن الحکیم رضوان اللہ علیہ نے اپنی کتاب شرح کفایہ میں نقل کیا ہے

کہ ہم ایک استاد کے پاس جاتے تھے، ایک دن گئے تو انہوں نے ایک آیہ قرآن پڑھی اور اس کی تفسیر کی، دوسرے دن ہم پھر دوبارہ گئے، یہ سب مجتہدین تھے کہ جو ان کے پاس جاتے تھے، دوسرے دن گئے تو اسی آیہ کی ایک اور تفسیر کی، تیسرے دن گئے تو انہوں نے اسی آیہ کی ایک اور نئی تفسیر کی، چوتھے دن اسی آیہ کی ایک اور تفسیر کی اور کہا کہ ہم تیس دن مسلسل گئے اور تیس دن تیس تفسیریں کیں اور ہر ایک تفسیر دوسری سے دقیق تر تھی یعنی اناڑی عوام بھی نہیں تھے کہ جن کو سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں، یہ مجتہدین تھے کہ جو اس میں شرکت کرتے تھے، پس اہل استنباط اگر آیات کے اندر اتریں تو ایسے ہی ہوتا ہے۔

یہ فہمِ قرآن کا ادب ہے کہ اس کو انسان اپنے وجود کے اندر ایجاد کرے اور ادبِ قرآنی کے ساتھ مؤدب ہو جائے۔ قرآن کو آداب کے ساتھ پڑھیں اگر آداب کے بغیر قرآن پڑھیں تو اس کو بے ادبی کہتے ہیں، وضو کے بغیر قرآن پڑھنا بے ادبی ہے، طہارت کے بغیر قرآن پڑھنا بے ادبی ہے، تلفظ کے بغیر پڑھنا بے ادبی ہے، قرآن کو بغیر وضو کے چھونا بے ادبی ہے اسی طرح بغیر تدبر کے پڑھنا بھی بے ادبی ہے، استنباط کے بغیر پڑھنا بھی بے ادبی ہے، بالآخر ادبیوں کے درجات ہیں، کوشش کریں کہ وہ ادیب بنیں جو قرآن بنانا چاہتا ہے، قرآن نے سرزنش کی ہے کہ کیوں تدبر نہیں کرتے ہو، یہاں پر فرمایا کہ اگر یہ بات استنباط کرنے والوں کو پہنچائیں اور خود نہ پھیلاتے پھریں تو پھر دیکھیں گے کہ یہ ان سے کیا معارف نکال کر دیتے ہیں۔

قرآن کے مستبطان نے کتابِ خمس فقط ایک آیتِ قرآن سے استنباط کی گئی ہے۔ یہ ایک

پوری کتاب ہے کہ پورا ایک سال کا سلیبس (Syllabus) بنتا ہے، کم از کم اگر ایک محنتی آدمی وقت کے ساتھ پڑھے یا ایک اعلیٰ اُستاد پڑھائے تو کتابِ خمس پڑھتے ہوئے انسان کو ایک سال لگتا ہے۔

۱۱) احادیث کے اہلِ استنباط

اسی طرح کچھ لوگ احادیث کی دنیا میں اترتے ہیں تو وہاں ایک عظیم جہانِ معانی پاتے ہیں، مجتہدین کی مثال دیکھ لیں کہ ایک روایت لے کر اس سے استنباط کرتے ہیں اور پوری کتابِ فقہ ایک روایت سے استنباط کرتے ہیں اور ان کا حق بنتا ہے چونکہ اہل استنباط ہیں یعنی جب فقیہ روایت کے جہانِ معانی میں، دنیائے معانی روایت میں پہنچا تو اس نے وہاں پر دیکھا کہ اس کا تو ایک معنیٰ نہیں ہے، ایک دال و مدلول نہیں ہے بلکہ یہ تو عجیب وغریب عالم ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ......(۴)

جس نے اپنے آپ کو پہچانا تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا......

یہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے اور علوی علیہ السلام بھی ہے، یعنی یہ روایت دو معصومین علیہم السلام سے منقول ہے، استادِ محترم حضرت استاد حسن زادہ آملی دام ظلہ العالی نے درس کے اندر فرمایا تھا کہ میں نے اس حدیث کی تفسیر میں ڈھائی سو الگ الگ تفسیریں لکھی ہیں یعنی دو سو پچاس تفسیریں اور ہر تفسیر دوسری سے مختلف ہے، دوسرے لفظوں میں اس کے دو سو پچاس معانی کیے، پھر فرمایا کہ میں نے کہیں تذکرہ کیا تو کسی نے اس کو سنا اور اس کا شوق بڑھا کہ یہ مجھے دکھائیں اور وہ کتاب لے کر چلا گیا اور

حضرتِ استاد کو بہت افسوس تھا کہ وہ شخص پتہ نہیں مر گیا، کھپ گیا، کیا ہوا کہ وہ کتاب واپس نہیں لایا، انہیں یاد بھی نہیں تھا کہ کون لے گئے ہیں، طالب تھا یا عالمِ دین تھا کہ جو لے گیا تھا لیکن اس نے واپس نہیں کی اور فرمایا کہ ابھی چند مہینوں سے دوبارہ کوشش کر رہا ہوں کہ حافظے کی مدد سے ایک دفعہ پھر لکھوں چونکہ وہ پہلی ساری تفسیریں یاداشت سے کھوگئی ہیں، اس وقت تک یعنی جب حضرتِ استاد کی خدمت میں درس میں حاضر ہونے کی توفیق تھی یعنی آج سے تقریباً دس سال پہلے فرمایا تھا کہ ابھی تک میں اس کی نوے تفسیریں حافظے کی مدد سے دوبارہ لکھ چکا ہوں اور پھر دعا بھی کرتے تھے کہ خدا لطف کرے، عنایت کرے کہ ان باقی پر بھی قادر ہو جاؤں، بعد میں وہ درس معطل ہو گئے اور کہا تھا کہ وہ بھی بے ادبی کی وجہ سے ہوئے، کسی بے ادب نے وہ فیض حوزے سے چھین لیا، بے ادب بہت نقصان پہنچاتے ہیں، آپ توجہ کریں کہ اہلِ استنباط کیا ہوتے ہیں، اس حدیث کے اندر کتنے لفظ ہیں؟

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ......

پانچ چھے لفظ ہیں، ان پانچ چھے لفظوں کے اندر ایک عجیب وغریب دنیا ہے کہ اگر اس کے اندر اہلِ استنباط اترے ایک استادِ حوزہ وایک حکیمِ الٰہی اترے تو اسکی ڈھائی سو تفسیریں کر سکتا ہے اور منحصر نہیں ہے کہ یہ ڈھائی سو ہی ہوں بلکہ مزید بھی ہیں۔ ہر حقیقت ایسے ہے، امیر المومنین علیہ السلام کا یہ جملہ انسان کے بارے میں ہے کہ

أَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ وَ فِيكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الأَكْبَرُ......(۵)

(اے انسان) کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو بس اک چھوٹا سا جسم ہے درحالیکہ تیرے وجود

میں ایک بڑی دنیا (عالمِ اکبر) پوشیدہ ہے......

اسی طرح قرآن کی ہر آیت کے اندر معانی کی ایک پوری کائنات ہے، اس لئے انسان اگر آنکھیں کھول کر بصیرت کے ساتھ تدبر کر کے اسکی تہہ میں اترے، سمندر میں اترے اور دل میں بھی نورانیت ہو نہ کہ اندھیرا ہو تو نورانیت میں دیکھیں کہ ایک عالم ہے، انسان ایک نئے عالم میں آجاتا ہے، اسی طرح نہج البلاغہ بھی ہے اور جنہوں نے نہج البلاغہ میں یہ کام کیا ہے اس کا مطالعہ کریں از جملہ محمد عبدہ کی کتاب کا مقدمہ پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ ایک مسیحی جب نہج البلاغہ کی دنیا میں اترتا ہے تو اس کو اس کتاب کے اندر سے کیا کیا معلوم ہوتا ہے۔ جارج جرداق، ابونعیمہ، جرجی زیدان یا اس طرح کے غیر مسلم لوگ کہ جو نہج البلاغہ کی دنیا سے آشنا ہوئے ہیں تو ان کو حیرت ہوئی ہے کہ ہر لفظ کے اندر ایک پوری کائنات بھری ہوئی ہے اور قرآن تو معجزاتی حد تک کائنات ہے، ہر لفظ کے اندر اور ہر آیہ کے اندر پورا جہانِ معانی پوشیدہ ہے، آپ قرآن کی طرف بڑا ظرف لے کر جائیں تو پھر دیکھیں کہ قرآن کیا عطا کرتا ہے، انشاءاللہ خدا سب کو توفیق دے۔

حوالہ جات

(۱)......(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیۃ اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ)(مرآۃ العقول فی شرح أخبار آلِ الرسولؐ - العلامۃ المجلسیؒ،الجزء ۱،صفحہ ۱۵۱)(مستدرک سفینۃ البحار - العلامۃ آیۃ اللّٰہ الشیخ علی النمازی، الجزء ۲،صفحہ ۲۳۳)(عوالی اللآلی- ابن ابی جمہور احسائی،الجزء ۴، صفحہ ۲۴)(منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغۃ - الخوئیؒ)(بہج الصباغۃ فی شرح نہج البلاغۃ)(أحکام القرآن-أحمد بن علی أبو بکر الرازی الجصاص الحنفی،المتوفی: ۳۰۷ھ،الجزء ۲،صفحہ ۲۰۷)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ،الجزء ۱۷،صفحہ ۲۸۵)(بحار الأنوار- العلامۃ المجلسیؒ، الجزء ۷۴،صفحہ ۱۴۶)

(۲)......(سورۂ مبارکہ مائدہ،آیہ ۶۷)

(۳)......(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی مدظلہ،الجزء ۱۲،صفحہ ۵۲)(تفسیر القرآن الکریم - السید مصطفی الخمینیؒ،الجزء ۲،صفحہ ۲۶۴)(تفسیر المیزان - العلامۃ الطباطبائیؒ، الجزء ۴،صفحہ ۳۳)(تفسیر نور- حجۃ الاسلام و المسلمین حاج شیخ محسن قرائتی مدظلہ)(نفحات القرآن-آیۃ اللّٰہ العظمی مکارم الشیرازی مدظلہ)(شرح أصول الکافی- مولی محمد صالح المازندرانیؒ)(مستدرک

سفينة البحار - العلامة آية اللّٰه الشيخ علی النمازیؒ)(وصول الأخيار الی أصول الأخيار - والد البهائی العاملیؒ)(الامام علیؑ بن ابی طالب عليه السلام من حبه عنوان الصحيفة)(الامام علیؑ- أحمد الرحمانی الهمدانی)

(۴)......(مستدرک نهج البلاغة،الجزء ١ ،صفحه۴)(منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغة - الخوئیؒ)(نفحات الولاية فی شرح نهج البلاغة)

(شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن ابی الحديد، أبو حامد، عز الدين،المتوفی : ۶۵۶ ھ،الجزء ۲۰،صفحه۲۹۲)

(جامعه علوی در نهج البلاغه،الجزء۸،صفحه۲)

(۵) ....(پيام امام امير المؤمنينؑ)(شرح نهج البلاغه - جعفری)

(نفحات الولاية فی شرح نهج البلاغة)

فصلِ ادبِ پنجم

﴿استنباط﴾

(حصّہ دوم)

١)الفاظ،معانی اور حقائق کا آپس میں ارتباط

٢)استنباط کی ضرورت

٣)استنباط کے رائج ثمرات

٤)قرآن سے علماء کا محدود استنباط

٥)قرآن،معدنِ معارف

٦)استنباط کیلئے حسِ جستجو چاھئے

٧)استنباطِ تقلیدی

٨)لقمہ خورِغرب نہ بنیں

٩)قرآن و اھلبیتؑ باعثِ ثروت

١٠)قرآن بصورتِ معدن ہونے کی حکمت

١١)علوم کو قرآن سے استنباط کرنے کی ضرورت

١٢)اثارۂ قرآن

١٣)اثارۃ الموضوع

صفحہ

☆ سَبَقَتْ رَحْمَتُکَ غَضَبَکَ...... 359

☆ وَأَنْتَ الَّذِیْ تَسْعٰی رَحْمَتُهُ أَمَامَ غَضَبِهٖ..... 359

☆ فَاِنَّکَ فَعَّالٌ لِمَا تَشَاءُ...... 461

☆ اِلٰهِیْ وَاجْعَلْنِیْ مِمَّنْ نَّادَیْتَهٗ فَاَجَابَکَ وَلَا حَظْتَهٗ
فَصَعِقَ لِجَلَا لِکَ فَنَاجَیْتَهٗ سِرّاً...... 493

☆ بَیْنَکَ وَ بَیْنِیْ اِنِّی یُنَازِعُنِیْ فَارْفَعْ بِفَضْلِکَ
اِنِّیْ مِنَ الْبَیْنِ..... 503-504

☆ رَبَّنَا لَا تَکِلْنَا اِلٰی اَنْفُسِنَا طَرْفَةَ عَیْنٍ اَبَدًا...... 583

۱)الفاظ،معانی اور حقائق کا آپس میں ارتباط

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ پنجم استنباط ہے اور اس فصل کے حصہ اول میں عرض ہوا تھا کہ قرآن کریم کے الفاظ سے جب انسان معانی تک جاتا ہے تو معانی کا اپنا پورا ایک عالم ہے کہ جس طرح الفاظ کا اپنا ایک عالم ہے۔الفاظ میں آپس میں ارتباطات ہیں، جو لوگ ادبیاتِ عرب سے آشنا ہیں یا کسی بھی زبان کی ادبیات سے آشنا ہیں،لٹریچر (Literature) سے آشنا ہیں،وہ جانتے ہیں کہ الفاظ کا آپس میں رابطہ ہے، جس طرح سے ہم عربی لٹریچر میں یا دوسری ادبیات میں پڑھتے ہیں کہ بعض الفاظ دوسرے بعض الفاظ کے ساتھ مرتبط ہیں، آپس میں عامل اور معمول کا رابطہ ہے، آپس میں مبتدا و خبر کا رابطہ ہے، صفت و موصوف کا رابطہ ہے یا ممکن ہے کہ آپس میں مضاف اور مضاف الیہ کا رابطہ ہو تو یہ الفاظ کی دنیا ہے۔

اسی طرح سے معانی کے اندر بھی ارتباط موجود ہے، جب ہم ایک معنیٰ تک پہنچتے ہیں تو کوئی بھی معنیٰ تنہا نہیں پڑا ہوا ہے،کوئی معنیٰ کسی جگہ بھی تنہا نہیں ہوتا ہے، معانی کے اندر بھی آپس میں ارتباطات ہیں،ایک معنیٰ دوسرے معنیٰ سے مربوط ہے،ایک معنیٰ دوسرے معنیٰ کی تفسیر کرتا ہے،ایک معنیٰ دوسرے معنیٰ کا سبب بنتا ہے،ایک معنیٰ دوسرے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے،ایک معنیٰ دوسرے معنیٰ کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اسی طرح ایک معنیٰ دوسرے معنیٰ کا ثمرہ اور نتیجہ بنتا ہے، یہ معانی کی دنیا کے آپس میں ارتباطات ہیں کہ جو منطق میں بیان ہوتے ہیں۔

علمِ ادب ہمیں الفاظ کے روابط پڑھاتا ہے اور علمِ منطق ہمیں معانی کی دنیا کے آپس میں

ارتباطات سکھاتا ہے کہ تصورات کس طرح سے آپس میں مربوط ہیں، تصدیقات کس طرح سے آپس میں مربوط ہیں، یہ معانی کی دنیا سے آشنائی ہے اور پھر اس کے بعد انسان حقائق کی دنیا میں آجاتا ہے یعنی ان معانی اور مفاہیم سے مصادیق اور حقائق تک آجاتا ہے، عیناً الفاظ اور معانی کی طرح حقائق بھی آپس میں مربوط ہیں، کوئی حقیقت اس دنیا میں منقطع اور بے رابطہ نہیں ہے، ہر حقیقت کا دوسرے حقائق کے ساتھ رابطہ موجود ہے، جس طرح ہم معانی میں پڑھتے ہیں کہ معنیٰ کا ایک کا لازمہ ہے اور ایک ملزوم ہے اور اس معنیٰ کے ساتھ دوسرے معانی مربوط ہیں، اس ارتباط کو ہم بعض علوم کی مدد سے سیکھتے ہیں، کشف کرتے ہیں کہ ان کا آپس میں کس قسم کا رابطہ ہے، اسی طرح سے حقائق کی دنیا میں بھی آپس میں ارتباط ہے، واقعتاً حقیقتوں میں، واقعات میں اور موجودات میں اسی طرح کے روابط موجود ہیں، ایک حقیقت دوسری حقیقت کی علت ہے یا اس کے لئے معلول ہے، ایک حقیقت دوسری حقیقت کے لئے شرط ہے یا اس کے لئے مشروط ہے، اس کی صفت ہے یا اس کا موصوف ہے، لازم ہے یا اس کا ملزوم ہے، اس کا نتیجہ ہے یا اس کے مبادی و علل میں دخیل ہے، بالآخر ہر حقیقت ایک مجموعۂ حقائق کے ساتھ مربوط ہے۔

۲) استنباط کی ضرورت

ایک مثال کے ذریعے استنباط کی ضرورت پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ کتابوں کے اندر ہم ایک منظومۂ شمسی کو پڑھتے ہیں، اسے ہم دیکھتے کم ہیں اور پڑھتے زیادہ ہیں۔ منظومۂ شمسی کے اندر

ایک ستارہ بنام سورج ہے اور اس کے اردگرد ایک پورا عالم ہے، منظومۂ شمسی کے نام سے ایک پورا جہان ہے یعنی کچھ سیارے ہیں جو اس کے گرد موجود ہیں، کچھ ستارے اس کے اردگرد موجود ہیں، سیاروں کے اردگرد کچھ اور موجودات ہیں کہ جو گردش کر رہے ہیں کہ جن کو قمر یا چاند کہتے ہیں اور اس طرح سے ایک مجموعہ بنام منظومۂ شمسی بنا ہوا ہے اور پھر یہی منظومۂ شمسی دیگر منظومات کے ساتھ مل کر ایک اور دنیا کا حصہ ہے، وہ بھی حقائق کا ایک عالم ہے کہ جسے کہکشاں کہتے ہیں، ایک کہکشاں کے اندر متعدد منظومے موجود ہیں اور ایک منظومہ کے اندر بہت سارے فلکی موجودات، ستارے اور سیارے موجود ہیں۔ اسی طرح سے یہ ساری حقائق کی دنیا ہے، حقائق کا عالم آپس میں اسی منظومۂ شمسی کی طرح مربوط ہے، بعض معانی دیگر معانی کے ساتھ اور بعض حقیقتیں دوسری حقیقتوں کے ساتھ منسلک ہیں، اسی وجہ سے انسان کو استنباط کی ضرورت پڑتی ہے۔

تدبر کی ضرورت اس وجہ سے پڑتی ہے کہ یہ معانی آشکار نہیں ہیں بلکہ یہ کچھ پردوں کے پیچھے ہیں، یہ معانی کچھ ظواہر کے پردوں کے پیچھے پنہاں ہیں اور باطن میں موجود ہیں، تدبر کے ذریعے انسان وہاں تک رسائی پیدا کرتا ہے، اس بحر کے عمق کے اندر پہنچتا ہے اور پھر جب وہاں جا کر ان معانی کو سمیٹتا ہے تو ان معانی کے ارتباطات کو کشف کرتا ہے اور ان معانی کو اپنے ذہن میں اور اپنے وجود میں منتقل کرتا ہے اور جب ان کی دنیا سے آشنا ہو کر ان کے ارتباطات کو ظاہر کرتا ہے تو اس کو استنباط کہتے ہیں، مثلاً زمین سے فضا کے اندر پہنچنا تدبر ہے اور فضا کے اندر پہنچ کر اس منظومہ کے موجودات کا آپس میں رابطہ سمجھنا مثلاً زمین کے گرد چاند ہے اور چاند اور زمین کا فاصلہ ہے، چاند

استنباط کی ضرورت

کا مدار کیا ہے؟ زمین کا مدار کیا ہے؟ مریخ کا مدار کیا ہے؟ مشتری کا مدار کیا ہے؟ سورج کے گرد کتنے سیارے ہیں؟ اوران سیاروں کے گرد کتنے قمر موجود ہیں؟ یہ انسان کا استنباط ہے، پس تدبر ان حقائق تک یعنی ظواہر سے حقائق تک پہنچنا ہے اور استنباط ان حقائق کے آپس میں ارتباطات کو کشف کر کے انہیں اپنے وجود میں منتقل کرنا ہے، انہیں اپنی فہم کی حد تک لے آنا ہے، یہی چیز قرآن کے لئے ضروری ہے، تدبر کے بغیر کوئی خیر نہیں ہے۔

اَلَا لَا خَیْرَ فِیْ قِرَاءۃٍ لَا تَدَبُّرَ فِیْھَا......(۱)

آگاہ رہو! جس قرأت میں تدبر نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

اگر انسان قرآن کے اندر تدبر بھی کرلے تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ استنباط پر قدرت نہ رکھتا ہو یعنی انسان اس بحر میں اتر گیا ہے لیکن اس میں صدف اور گوہر نکالنے کی طاقت نہیں ہے یا کسی رسی کی مدد سے پانی کے اندر کنویں میں اتر گیا ہے لیکن اس میں پانی نکالنے کی طاقت موجود نہیں ہے، ممکن ہے کہ ایسے متدبرین موجود ہوں کہ جو استنباط نہیں کر سکتے ہیں اور اکثر لوگ اہلِ تدبر نہیں ہیں، اہلِ تدبر بہت قلیل لوگ ہیں اوران قلیل لوگوں میں بھی اَقلِ قلیل لوگ ہیں کہ جو اہلِ استنباط ہیں، جو معانی کے اندر اتر کے وہاں سے گوہر و صدف جمع کر کے اوران کے ارتباطات سمجھ کے خود اپنے وجود میں منتقل کرتے ہیں اور دوسروں کے اختیار میں قرار دیتے ہیں۔

قرآن کی ہر آیہ انسان سے تدبر اور استنباط مانگتی ہے، ہر آیہ ایک بحر کی حیثیت رکھتی ہے، ہر آیہ ایک منظومہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے معانی ایک منظومہ کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی ہر آیہ کے

استنباط کی ضرورت

اندر حقائق ومعانی کی ایک دنیا ہے کہ جو منظومہ کی طرح آپس میں مرتبط ومنسلک ہے اور ان تک رسائی ضروری ہے، اگر انسان فقط تلفظِ آیہ پڑھ کے یہ سمجھے کہ میں نے قرآن کا حق ادا کر دیا ہے تو یہ مہجوریتِ قرآن ہے یعنی قرآن ابھی مہجور ومتروک ہے یعنی قرآن کو ابھی انسان نے چھوا تک نہیں ہے'

لَّا یَمَسُّهٗ......(۲)

ابھی کسی نے قرآن کو ٹچ (Touch) تک نہیں کیا ہے، اتنی قرأت کے باوجود، دس قرأتوں سے قرآن کو پڑھنے کے باوجود بھی ابھی قرآن کو مَس تک نہیں کیا ہے حتیٰ اگر انسان مفاہیم تک پہنچ بھی جائے تو پھر بھی، لایمسہ، کا مصداق ہے کہ جب تک انسان آیت کا وہ منظومہ تلاش نہیں کر لیتا۔ اب ممکن ہے کہ کسی نے یہ کام نہ کیا ہو، اتفاقاً بہت سارے ایسے بزرگان ہیں مثلاً امام غزالی وہ فرد ہیں کہ جو قرآنیات میں اور اخلاقیات میں بہت متبحر انسان ہیں، بعض دوسرے علوم میں ان کو مشکل درپیش ہے لیکن قرآنیات میں اور اخلاقیات میں متبحر ہیں: ایسا مقامِ علمی جو شیعہ وسنی دونوں تسلیم کرتے ہیں، اس مورد میں غزالی کا مقام قرآنی حقائق، قرآنی مسائل اور اخلاقیات کے اندر ایک حجت سمجھا جاتا ہے، ویسے بھی حجۃ الاسلام سب سے پہلے غزالی کے لئے استعمال ہوا ہے، اگر علی الاطلاق حجۃ الاسلام کہا جائے تو مراد امام غزالی ہوتے ہیں، جن کا لقب ہی حجۃ الاسلام تھا، اسلئے کہ اس شخص کا بہت رسوخ تھا، اس نے قرآنیات کے اندر اور اخلاقیات کے اندر عمر صرف کی اور محنت کی مثلاً یہی مطالب انہوں نے ذکر کیئے کہ انسان اہلِ استنباط ہو لیکن خود جو کچھ استنباط کیا وہ ان کے ہاں

نظر نہیں آتا ہے، دوسروں کو انہوں نے راہ دکھائی کہ انسان اہل تدبر ہو، اہل استنباط ہو لیکن خود اتنا کشف کر سکے کہ قرآن کو استنباط کی ضرورت ہے اور انسان قرآن کے اندر استنباط کرے لیکن خود اس استنباط کا نتیجہ لے کر سامنے دیا ہو تو ایسی کوئی چیز غزالی سے نہیں ملتی، اگرچہ غزالی کی فراواں خدمات ہیں، غزالی کی ایسی بہت ساری کتابیں ہیں کہ جو قابلِ استفادہ ہیں اور علمی کتابیں ہیں۔

اگر قرآن میں تدبر نہ ہو اور استنباط نہ ہو تو قرآن متروک و مہجور ہے یعنی ابھی کسی نے اس کو مس نہیں کیا ہے، اکا دکا افراد آئے ہیں کہ جنہوں نے آکر اس توفیق کو پیدا کیا ہے، خداوند تبارک وتعالی نے انہیں یہ نعمت اور توفیق عطا کی کہ دوسروں کی کچھ راہنمائی کریں لیکن بیشتر دیکھیں کہ جیسے تفسیر کشاف ہے یا امثالِ کشاف، ہمارے ہاں بھی ایسی تفاسیر موجود ہیں چونکہ اس مسئلے میں وہ ہم پر مقدم ہیں، وہ پہلے کام کرتے ہیں پھر ان کی دیکھا دیکھی ہمارے یہاں بھی ہوتی ہے، وہ ادبی تفسیر ہے، قرآن کے اعراب و بنا جیسی چیزیں کشاف نے حل کر دیں پھر آکر دوسروں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی قرآن کی ایک اور ادبی تفسیر کر دی یا بعض نے آکر کلامی تفسیر کی یعنی اس کے مقابل میں ایک اور کلامی تفسیر وجود میں آ گئی، وہ استنباط چاہیئے جو حقیقی معنیٰ میں قرآن کے لئے درکار ہے اور جو شایانِ شانِ قرآن ہے چونکہ جیسے پہلے عرض کیا تھا کہ انسان تدبر اس وقت کرتا ہے کہ جب پہلے خود متدبر ہو یعنی تدبر صفتِ انسان ہے نہ کہ صفتِ قرآن ہے، انسان متدبر ہے اور قرآن محلِ تدبر ہے یعنی انسان مستنبط ہے نہ کہ قرآن مستنبط ہے۔

پہلے انسان اہلِ استنباط بنے پھر قرآن کے اندر استنباط کرے گا، مستنبط بنے بغیر اگر قرآن

استنباط کی ضرورت

پڑھے گا جیسے ادیب بنے بغیر اگر قرآن کو پڑھے گا تو تلاوت بھی نہیں کر پائے گا، قرآن کا صحیح تلفظ بھی نہیں کر پائے گا، انسان پہلے مقامِ استنباط و مرتبۂ استنباط پہ فائز ہو، صفتِ استنباط انسان کی صفتِ راسخ بن جائے تو پھر اس کے بعد انسان قرآن کے اندر کچھ حاصل کرتا ہے، البتہ یہ صفت بھی قرآن کے اندر استنباط سے ہی پیدا ہوتی ہے یعنی تمرین اور مشق بھی خود انسان قرآن کے اندر ہی کرتا ہے اور جیسے پہلے اشارہ بھی ہوا تھا کہ پھر آہستہ آہستہ قرآن انسان کا ہاتھ تھام لیتا ہے، جس طرح سے ایک بچہ اگر کسی کے پیچھے بہت زیادہ چلتا ہے اور زیادہ نہیں چل پاتا اور نہیں اٹھ سکتا ہے تو پھر وہ اس کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اسی طرح انسان اگر قرآن میں استنباط کیلئے اصرار کرے، قرآن کی تکرار کرے تو ایک دن قرآن اسکا ہاتھ تھام لیتا ہے، اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے اور اپنے حقائق انسان پر عیاں کر دیتا ہے، نمایاں کر دیتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، اگر ہم بعض بزرگان کے حالاتِ زندگی پڑھیں تو ان کے ساتھ اسی طرح سے اتفاق ہوا ہے کہ آغاز میں ان کو قرآن کی طرف کوئی راہ نہیں مل رہی تھی لیکن جب قرآن نے خود در کھول دیا تو پھر ان کیلئے در پہ در کھلتے گئے اور ان کے اندر جتنی طاقت و استعداد تھی اس لحاظ سے انہوں نے حقائقِ قرآن کو حاصل کیا۔

۳) استنباط کے رائج ثمرات

اہلِ استنباط نے قرآن سے ابھی تک کیا حاصل ہے؟ مطالب استنباط کئے ہیں لیکن استنباطِ قرآن میں فقط آیاتِ احکام کی حد تک اسکا نمونہ یا مصداق موجود ہے مثلاً قرآن کی آیات کی جو مجموعی

تعداد ہے ان میں سے تقریباً، لگ بھگ تکرار و مکررات سمیت مثلاً آیاتِ صلوٰۃ و آیاتِ زکوٰۃ جو متعدد دفعہ تکرار ہوئی ہیں، ان مکررات کو ملا کر پانچ سو آیات آیاتِ احکام ہیں کہ جن کے اندر علماء نے استنباط کیا ہے لیکن وہ بھی فقط در حدِ حکم استنباط کیا ہے یعنی آیاتِ احکام کی تہہ میں اترے ہیں اور ان آیات کی تہہ سے انہوں نے فراواں احکام استنباط کئے ہیں جیسے عرض کیا کہ بعض آیات ایسی ہیں کہ ایک ایک آیت سے پوری کتابِ فقہ استنباط کی ہے مثلاً کتابِ خمس ایک آیتِ قرآن سے استنباط کی گئی ہے۔ ایک سال کا مواد ایک آیت سے استخراج ہوا ہے، کس طرح سے استخراج ہوا؟ استنباط کے نتیجے میں استخراج ہوا ہے، فقط قرأت سے نہیں ہوا ہے، تلاوت سے نہیں ہوا ہے۔ پہلے قرآن کی گہرائی اترے، تدبر کیا اور تدبر کر کے اس کے احکام کے متعلقات کو کشف کیا، روابط کو کشف کیا اور اس طرح سے دوسروں کے لئے ایک پوری کتابِ خمس تدوین کی ہے، درحالیکہ قرآن چونکہ ہدایتِ بشر ہے، ھدی للناس ہے لہٰذا ہدایت کے لئے ایک حکم کافی نہیں ہے۔

٤)قرآن سے علماء کا محدود استنباط

ہدایتِ انسان کے لئے بہت سی چیزوں کا ہونا ضروری ہے، سب سے پہلے معرفت چاہئے، حکم سے بھی پہلے انسان کو معرفت کی ضرورت ہے، آگاہی کی ضرورت ہے، شعور کی ضرورت ہے اور معرفت کے بعد انسان کو پھر نظام کی ضرورت ہے، انسان کو علوم کی ضرورت ہے، علوم بمعنی معرفت نہیں بلکہ مجموعۂ علوم یعنی یہ مجموعہ جو تدوین شدہ ہے جیسے علمِ ادب ہے، علم فقہ ہے، علم کلام

ہے، انسان کے لئے ان علوم کا جو مجموعہ موجود ہے اور ان کی مدد سے انسان حقائق کو سمجھنے کے اور پرکھنے کے قابل ہوتا ہے، ہدایتِ انسان کے لئے ان علوم کا ہونا ضروری ہے، شناخت کا ہونا ضروری ہے اور ہدایت کے لئے انسان کے لئے نظم کا ہونا اور نظام کا ہونا ضروری ہے، مستنبطینِ قرآن فقط احکام کی حد تک آئے ہیں لہٰذا انہوں نے قرآن سے آیات کو انتخاب کیا ہے اور ان پانچ سو آیات کے اندر خوب استنباط کیا ہے۔ چودہ سو سال سے تمام فرقہ اسلامی کے جو علماء، فقہاء اور قرآن شناس ہیں انہوں نے انہی آیات میں آکر کام کیا البتہ اپنی حد تک، کسی نے سطحی استنباط کیا، کسی نے دقیق استنباط کیا، کسی نے دقیق سے دقیق تر استنباط کیا، کوئی اَدق یعنی انتہائی باریک و دقیق تر استنباط تک پہنچا، درجاتِ علمی ہر ایک کے محفوظ ہیں لیکن میدانِ استنباط محدود رہا ہے۔

اول یہ کہ قرآن سے انہوں نے استنباط کے لئے آیات منتخب کیں اور وہ بھی فقط پانچ سو آیاتِ احکام، باقی چھے ہزار آیات میں استنباط نہیں کیا گیا یا استنباط کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور فقط پانچ سو کو اس قابل سمجھا گیا کہ ان میں استنباط کیا جائے۔

دوم یہ کہ ان آیات کے اندر جب استنباط کیا گیا تو علوم استنباط نہیں کئے گئے بلکہ فقط احکام استنباط کئے گئے ہیں اور سوم یہ کہ ان سے نظام استنباط نہیں کیا گیا ہے، قرآن انسان کے لئے ہدایت ہے، ہدایت کے لئے معرفت کی ضرورت ہے، نظام کی ضرورت ہے، علوم کی ضرورت ہے اور قرآن یہ سب کچھ لے کر آیا ہے چونکہ اگر یہ نہ ہو تو ہدایت ممکن ہی نہیں ہے، کیسے بشر کی ہدایت کریں گے؟ اگر قرآن سے پوچھیں کہ بشر کے لئے کوئی نظام ہے؟ اور یہ کہے کہ نہیں نظام نہیں ہے بلکہ نظام بشر کو

خود بنانا ہے، پھر پوچھیں کہ وہ علوم جو انسان کو مختلف مہارتیں عطا کریں، مختلف شناخت عطا کریں، انسان کی مختلف صلاحیتیں بیدار کریں اور اس جہانِ ہستی کو انسان کے لئے کھول کر، عیاں کر کے بتائیں تو ایسی کوئی چیز قرآن کے اندر موجود ہے؟ اگر جواب دے کہ نہیں قرآن تو فقط ثواب کے لئے آیا ہے، قرآن احکام بیان کرنے کے لئے آیا ہے تو پھر اس کو کیوں کہتے ہیں کہ یہ کتابِ ہدایت ہے؟ ہدایت کے لئے تو انسان کو ان ساری چیزوں کی ضرورت ہے، ہدایت کے لئے قانون کی ضرورت ہے، ہدایت کے لئے سیاسی نظام کی ضرورت ہے، اجتماعی نظام کی ضرورت ہے، تعلیمی نظام کی ضرورت ہے، ارتباطات کے نظام کی ضرورت ہے اور تمام ضروریاتِ حیات کی ضرورت ہے، اگر آپ کے پاس یہ سارے علوم اور نظام نہیں تو پھر کیوں کہتے ہیں کہ یہ کتابِ ہدایت ہے؟ اور حقاً یہ کتاب ہدایت ہے، مشکل یہ ہے کہ قرآن کے اندر سب کچھ موجود ہے لیکن بصورتِ معدن موجود ہے۔

۵) قرآن، معدنِ معارف

قرآن ایک معدن کی طرح معارف سے مالا مال ہے، جس طرح کسی ملک کے اندر فراواں معدنیات ہوں مثلاً افغانستان معدنیات کے لئے لحاظ سے مالا مال ملک ہے، ہر قسم کی معدنیات ہیں، گیس وہاں ہے، تیل وہاں ہے، قیمتی پتھر وہاں ہیں، قیمتی دھاتیں وہاں پر موجود ہیں لیکن ایک ایسی قوم اس سرزمین کے اوپر موجود رہی ہے کہ اس کو اطلاع نہیں ہے کہ اس معدن کے نیچے کیا کچھ موجود ہے؟ چونکہ زمین کے اوپر ان کی اتنی سرگرمیاں ہیں کہ ان کی زمین کے نیچے

موجودات کی طرف توجہ نہیں ہے لیکن معدنیات سے مالا مال اس ملک کے بارے میں دوسروں کو پتہ چل گیا، پڑوسیوں کو پتہ چل گیا، روسیوں کو، امریکیوں کو، پاکستانیوں کو اور ایرانیوں کو معلوم ہے کہ اس کے اندر کیا ہے؟ لہٰذا سب کی نظریں افغانستان میں ہیں اور افغانی کی نظریں باہر ہیں کہ مجھے کہیں اور کا پاسپورٹ (Passport) مل جائے تا کہ میں کسی دوسرے ملک میں سکون سے زندگی بسر کروں اور یوں ہی ہوا، اسکا اپنا ملک معدنیات سے بھرا ہوا ہے اور اسی میں وہ ایک فقیر محتاج اور ایک ایسی امت کی سی زندگی بسر کر رہا ہے کہ جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، سب کچھ اس کے لئے باہر سے آتا ہے، یہ حالت تمام مسلمانوں کی ہے۔

عرب کسی زمانے میں اسی صحرا میں زندگی بسر کرتے تھے اور ریت کے اوپر اونٹ دوڑاتے تھے درحالیکہ اسی ریت کے نیچے تیل کی عظیم ثروت کا ذخیرہ موجود تھا لیکن آگاہی نہیں تھی، ان کے اندر اتنی فراست اور مہارت نہیں تھی کہ ریت کے نیچے دیکھ لیں کہ چند کلومیٹر نیچے خدا نے کیا چیز، کیا ثروت چھپا رکھی ہے یعنی استنباط چاہئے تھا، استنباط یعنی استخراج چاہئے، کنویں سے پانی نکالنے کو نبط کہتے ہیں، کنویں سے تیل نکالنے کو بھی نبط ہی کہتے ہیں، یوں تو نہیں ہے کہ فقط پانی ہو تو صرف اس کو نبط کہیں گے، اگر گیس ہو تو اس کو بھی نبط ہی کہتے ہیں، استنباط یعنی وہ چیز باہر نکالنا، استخراج کرنا۔

یہ سب کچھ ان کے یہاں موجود تھا لیکن مستنبط موجود نہیں تھے، مستنبط کسی اور مغربی ملک میں بنے چونکہ علوم ان کے پاس تھے، علوم انہوں نے کشف کئے، علوم کی طرف انہوں نے توجہ کی، علوم کی ترویج انہوں نے کی اور ثروت یعنی کنویں یہاں موجود تھے یعنی مستنبط وہاں پیدا ہوئے

قرآن بعنوان معارف

اور ثروت یہاں موجود تھی لہٰذا سارا تیل نکال کر، معدنیات نکال کر وہ سب اپنے اپنے ممالک میں چلے گئے، پاکستان کے ایک معدن کار اور صنعت کار کے بقول وہ سروے آف پاکستان والوں کے پاس گئے کہ جس کا کام یہی ہے کہ ملک کی سرزمین کے مختلف حصوں کا سروے کر کے یہ بتائے کہ ملک کے کن کن حصوں میں کونسی معدنیات ہیں؟ تا کہ بعد میں سرمایہ داروں کو بتایا جاسکے کہ یہاں کس قسم کا معدن ہے تا کہ وہ انتخاب کر کے سرمایہ لگاسکیں، وہاں پر انویسٹمنٹ (Investment) کرسکیں، انہوں نے سروے آف پاکستان سے جا کر پوچھا کہ ہمیں آپ معدنیات کا نقشہ دیں کہ پورے پاکستان کے اندر کون کونسی معدنیات ہیں؟ تا کہ ہم دیکھیں اور پھر اس کے مطابق جہاں ہمیں انویسٹمنٹ کرنی ہیں وہاں سرمایہ لگائیں، انہوں نے بڑا کھرا سا اور صادقانہ جواب دیا اور کہا کہ سروے رپورٹ پوری کمپلیٹ (Complete) موجود ہے، پاکستان کا بڑا دقیق سروے ہوا ہے لیکن وہ برٹش ایمبیسی (British embassy) میں ہے، یہ رپورٹ ہمارے پاس نہیں ہے اور ہمیں بھی جب ضرورت پڑتی ہے تو ان سے جا کر لے لیتے ہیں، کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہماری ہے لیکن سروے رپورٹ برٹش ایمبیسی میں پڑی ہوئی ہے، انہوں نے کہا کہ چونکہ یہ سروے انہوں نے کیا ہے ہم نے نہیں کیا ہے، ہم نے فقط یہ کیا ہے کہ ان سے پیسے لے کر سروے کی اجازت دی ہے، انہوں نے ہمیں پیسے دے دیئے اور اب ان کے سروے کی رپورٹ ان کے پاس ہے لہٰذا آپ کو چاہیئے تو آپ بھی وہاں پر جائیں اور پیسے دے کر وہ کاپی لے لیں۔ یہاں پر غور کریں کہ یہ ایک نہایت معدنیات سے سرشار اور مالا مال ملک ہے لیکن اس کا مستنبط برطانیہ ہے

یعنی جس نے آ کر مطالعہ کیا، جس نے آ کر دقت کی، جسے پتہ چلا کہ اس معدن کے نیچے کیا ہے۔

قرآن بھی ایسے ہی ہے، قرآن بھی مسلمانوں کے پاس موجود ہے، عربوں کے پاس موجود ہے، عجم کے پاس موجود ہے، مشرق کے پاس موجود ہے لیکن مشرق کی عادت استنباط کرنا نہیں ہے، اصلاً مزاج ہی استنباطی نہیں ہے، ان کا مزاج یہ ہے کہ ہم اس میں مقابلے کریں، اس کی تلاوت کے مقابلے رکھیں، حفظ کے مقابلے رکھیں اور سرعت سے پڑھنے کے مقابلے رکھیں، یہ کام قرآن کے ساتھ فراواں ہیں اور اسی حد تک قرآن زندہ ہے لیکن یہ کہ قرآن میں استنباط کریں، یہ کام مفقود ہے۔ قرآن ایک معدن ہے اور اس معدن کے نیچے ثروت ہے، انسانی اور بشری ثروت ہے اور وہ ثروت ہے کہ جس کا نام ہدایت ہے، ھدی للناس ہے، بشر کی ساری ہدایت قرآن کے اندر موجود ہے لیکن معدن کی صورت میں موجود ہے، اس کے اوپر تہہ ہے، الفاظ کی تہہ ہے اور بہت ساری چیزوں کی تہیں ہیں، ان تہوں کے اندر اترنے والا مستنبط چاہئے اور شاید یہی ہو کہ کوئی مغرب سے آئے اور آ کر استنباط کرے۔

استنباط کیلئے حسِ جستجو چاہئے

٦) استنباط کیلئے حسِ جستجو چاہئے

تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ مغربیوں کے اندر استنباط کا عنصر زیادہ ہے، ان کے اندر حسِ جستجو زیادہ ہے، زیادہ ماجرے وہاں سے ہوتے ہیں مثلاً مشرقی ممالک میں بھی الٹی سیدھی جگہوں پر جا کر اگر کوئی بندہ گھوم رہا ہو تو وہ بھی کوئی مغربی ہی ہوگا اور مشرقی اس کا گائیڈ (Guide) ہوگا کہ جو

اس کا سامان اٹھا کر، اس کی کٹ (Kit) اٹھا کر مزدور کے طور پر اس کے ساتھ جا رہا ہوگا لیکن یہ کہ خود اس کے پاس حسِ جستجو نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں کیا ہے؟ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جو مشرقی ممالک کو مغربی ممالک نے کشف کر کے بتائی ہیں، جیسے ایک نمونہ سروے آف پاکستان کا آپ کی خدمت میں ذکر کیا ہے۔

امام خمینیؒ نے اپنے خطبات میں ایک نمونہ ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ جب میں طالب علم تھا، جوان تھا تو اس وقت ہمدان میں گیا تھا، انقلاب سے بہت پہلے امامؒ قم میں پڑھتے تھے، فرمایا کہ میں کسی سے ملنے کے لئے ہمدان گیا، وہاں ایک بزرگوار سید عالم دین نے یہ واقعہ نقل کیا اور کہا کہ ایک آدمی نقشہ لے آیا اور اس کے اوپر مختلف نشانات لگے ہوئے تھے، کہیں سرخ نشان، کہیں سبز نشان، کہیں آبی نشان، کہیں سیاہ نشان، کہیں سفید نشان، نقشے کی مختلف جگہوں پر یہ نشانات تھے اور کچھ بھی نہیں تھا، فقط ایک نقشہ تھا، لائنیں تھیں اور یہ نشانات تھے، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیسے نشانات ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ امریکیوں نے پورے ایران کا سروے کیا ہے اور یہ مختلف نشان مختلف معدنیات کی علامت ہیں، ہمیں نہیں پتہ کہ مثلاً سفید علامت کے نیچے کون سی معدن موجود ہے مثلاً لوہا ہے، پیتل ہے، سونا ہے، تیل ہے، کوئلہ ہے یا کیا ہے یہ معلوم نہیں ہے؟ یہ خود سے انہوں نے نقشہ بنایا ہے اور علامتیں بھی ایسی لگائی ہیں کہ جو خود انہیں ہی معلوم ہیں مثلاً فرض کرلیں کہ ہمدان میں فلاں معدن ہے لیکن ہمدان کے کونسے علاقے میں ہے؟ مشرق میں ہے؟ مغرب میں ہے؟ جنوب میں ہے؟ کونسی پہاڑی میں ہے؟ صحرا میں ہے؟ ندی میں ہے؟ نالے میں ہے؟ یہ نہیں بتایا بس نقشے کے اوپر

ایک نشان لگا ہوا ہے، اس کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے، پوری دنیا کا یہی حال ہے، حسِ جستجو چاہئے۔

وہ لوگ اہل استنباط ہیں، آج کیوں سرمایۂ مشرق اور سرمایۂ مسلمین مغرب کے پاس منتقل ہوگیا ہے؟ اس وجہ سے کہ حسِ جستجو ان کے پاس موجود ہے اور یہ مختلف قوموں میں رہا ہے، کسی زمانے میں علم کے اندر ایسے پیش رو مسلمان تھے، اس سے پہلے کسی زمانے میں اہلِ یونان تھے اور اِس وقت اہلِ مغرب اہلِ جستجو بن گئے ہیں، بعض بزرگان کے بقول اگر یہی مغربی مسلمان ہوجائیں تو شاید وہ یہ کام کریں کہ جو ہمارا مقصود ہے یعنی استنباط چونکہ ان کے اندر حسِ جستجو زیادہ ہے اور وہ اہلِ استنباط ہیں۔ جب ریت کے نیچے سے تیل نکال لیا گیا ہے تو ممکن ہے کہ قرآن کے نیچے سے بھی بعض حقائق اور نظام استخراج کرلیں اور بعید نہیں ہے کہ کرلیں، بعض مغربی ممالک کے جو اس وقت قرآن کے اوپر حملے ہیں اور قرآن کی نسبت جو کچھ حساسیت ہے وہ یہ بتاتی ہے ان کو قرآن کے اندر موجود مطالب کی کچھ بو آئی ہے اور انہوں نے مسائل حس کیے ہیں، اس وجہ سے چاہتے ہیں کہ قرآن کی طرف سرے سے توجہ نہ ہو مثلاً لگتا ہے کہ قرآن کے بعض حقائق ان پر آشکار ہوئے ہیں۔

استنباطِ تقلیدی

۷)استنباطِ تقلیدی

مسلمانوں میں مقلد زیادہ ہیں اور مستنبط بہت کم ہیں حتیٰ مثلاً فرض کرلیں کہ قرآن کی آیاتِ احکام میں پہلے ایک شخص نے آکر استنباط کرلیا لیکن دوسرے نے بھی آکر وہی استنباط کیا تو یہ استنباطِ تقلیدی ہے یعنی اس استنباط میں تقلید ہورہی ہے، استنباط کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے

تیل نکالا ہے تو آپ گیس نکالیں، استنباط اس کو تو نہیں کہتے ہیں کہ پہلے ایک آدمی کنواں کھودے، تیل نکالے پھر دوسرے آکر وہی کنواں کھودیں اور وہی تیل نکالیں، یہ کام ہو چکا ہے آپ اس کے ساتھ دوسری زمین میں جا کر کہیں سروے کریں اور وہاں موجود کچھ اور ثروت نکالیں یعنی آپ غیر کشف شدہ اسرار کشف کریں تو آپ مستنبط ہیں، فرض کریں کہ اس وقت ہم کہیں کہ ہم بہت بڑے مستنبط ہیں، کیوں؟ اسلئے کہ وہ تیل جو پچاس سال پہلے نکالا گیا ہم بھی وہی تیل پھر سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ تیل وہ لوگ نکال چکے ہیں، آپ وہ چیز نکالیں جو وہ پہلے نہیں نکال سکے ہیں، جس چیز تک ان کی دسترسی نہیں ہوئی ہو، پہلا مستنبط بننا سخت ہے جیسے متدبر بننا و مدبر بننا سخت ہے، اہل تدبر ہونا سخت ہے اسی طرح اہلِ استنباط ہونا بھی دشوار ہے، اسی لئے علامہ اقبالؒ نے کہا کہ

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہان بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا......(۳)

جہاں بینی بہت سخت کام ہے جبکہ جہاں بانی بہت آسان ہے، اس وقت پاکستان میں دیکھیں جہاں بانی کے لئے الیکشن (Election) ہو رہے ہیں اور سب تیار ہیں کہ جہاں بانی کی ضمام ہمیں دی جائے لیکن جہاں بین بننے کے لئے الیکشن نہیں ہیں، جہاں بینی دوسرے کر کے دیں لیکن جہاں بانی کرنے کے لئے ہم تیار ہیں، جہاں بانی کے لئے، اقتدار کے لئے ہزار پارٹیاں بنی ہوئی ہیں لیکن جہاں بینی کے لئے کوئی گروہ نہیں بنا ہوا ہے، اکا دکا فرد آتے ہیں اور ان کو بھی ایسی سزا ملتی ہے کہ دوسرے عبرت لے کر کبھی اس طرف رخ نہیں کرتے ہیں، جہاں بین کی وہ درگت بنائی

جاتی ہے کہ وہ انسان اس طرف کبھی رخ نہیں کرتا ہے، پھر وہ یہ کہتا ہے کہ جہاں بان بنو، جہاں بین نہ بنو، اکا دکا انسان جہاں بین بنتا ہے، جہاں بین یعنی یہی مستنبط انسان، وہ مستنبط انسان کہ جو قرآن سے احکام بھی استنباط کریں، مطلق ہدایت بھی استنباط کریں، احکام بھی استنباط کریں، نظام بھی استنباط کریں اور علوم بھی استنباط کریں۔

لقمہ خورِ غرب نہ بنیں

۸) لقمہ خورِ غرب نہ بنیں

قرآن منبعِ علوم ہے لیکن اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ہم یعنی اہلِ مشرق یا مسلمان لقمہ خورِ غرب بنے ہوئے ہیں اور وہ بھی اس حالت میں کہ جو چیز ہمارے پاس موجود ہے اسکے اپنے پاس ہوتے ہوئے بھی لقمہ خورِ غرب بنے ہوئے ہیں، ہم مغرب کے لقمہ خور ہیں، جو کچھ وہ بنا کر دے دیتے ہیں یا جس کی ہمیں اجازت دیتے ہیں وہ ہم کر لیتے ہیں اور اپنی طرف سے خود کوئی قدم نہیں اٹھتا درحالیکہ منبعِ علوم، منبعِ انکشافات اور منبعِ ہدایت ہمارے اختیار میں ہے، قرآن ہمارے اختیار میں ہے لیکن دسترخوان کسی اور کا بچھا ہوا ہے، لقمہ کسی اور کا بچھا ہوا ہے اور ہم طفیلی کے طور پر اس پہ بیٹھے ہوئے ہیں۔

جیسے یہاں ایران میں ایک بہت بڑا ہنر یہ ہے کہ کمپیوٹر وہ بناتے ہیں اور نام یہ رکھتے ہیں، انہوں نے کمپیوٹر بنایا اور اس کا نام کمپیوٹر رکھا لیکن انہوں نے کہا کہ اس کا نام رایانہ ہے، ہیلی کاپٹر انہوں نے بنایا لیکن انہوں نے اس کا نام بدل کر کہا کہ یہ بالگرد ہے، کیا یہ ہنر ہے کہ کام وہ کریں،

مسمیٰ وہ بنائیں اوراسم آپ رکھتے جائیں؟ یہ کارنامہ نہیں ہے، مہم یہ ہے کہ آپ مسمیٰ بنائیں اورلوگ آکراس کے نام رکھیں، یوں نہ ہو کہ سارا کام دنیا کرتی رہے اور ہم فقط اس کا نام اپنی زبان میں بدل بدل کر رکھتے رہیں اور پھر ایک امتِ مترقی ہونے کا دعویٰ کریں، اگر آپ نے امتِ مترقی بننا ہے تو اس کے لئے پہلے مسمیٰ پیدا کرنا پڑے گا، نام بھی آپ کا ہو اور مسمیٰ بھی آپ کا ہو اور کسی کا حق نہ ہو ورنہ جنہوں نے کوئی چیز بنائی ہے اوراس کا نام رکھا ہے تو اس کے نام کو وہی رہنے دیں، نام بدلنے سے چیز آپ کی نہیں ہو جاتی ہے، پھر بھی یہ چیزیں انہی کے نام سے منسوب ہیں چونکہ استنباط کا عنصر یہاں پر کم ہے، رجحان نہیں ہے، اب شکوہ عوام سے نہیں ہے اور یہ عوام کے لئے ممکن بھی نہیں ہے بلکہ یہ اہلِ علم سے ممکن ہے، اہلِ حوزہ سے ممکن ہے اور اس مرکزِ علمی سے ممکن ہے کہ جس کی سلیبس (Syllabus) کی کتاب ہی قرآن ہے۔ حوزۂ علمیہ، حوزۂ اسلامیہ، حوزۂ دینیہ، دین یعنی قرآن، جس کا مرکز ہی دین ہو اس سے لوگوں کو توقع ہے کہ یہ سارا کام کر کے دے اور لوگوں کو استنباط کا ڈھنگ سکھائے۔

اس وقت جتنے علوم بھی ہیں کہ جن سے سروکار ہے اور جن سے لوگ اپنی ضروریات پوری کر رہے ہیں یہ سب علوم دوسروں نے غیر قرآنی منابع سے استنباط کئے ہیں۔ ان کے غیر قرآنی منابع میں ممکن ہے کہ فلسفہ ہو، ممکن ہے تاریخ ہو، ممکن ہے کہ جہانِ طبیعت ہو، عالمِ مادہ ہو اور ممکن ہے کہ آباؤ اجداد کی رسومات ہوں کہ بیشتر آباؤ اجداد کی رسومات ہیں کہ جہاں سے انہوں نے یہ علوم استنباط کر کے، تدوین کر کے دیئے اور مشرق و مغرب دونوں نے ان کو اپنی زبان میں ترجمہ کر لیا، کسی

نے فارسی میں، کسی نے عربی میں اور کسی نے اردو میں ترجمہ کیا اور عالم بن گئے۔

ایک یونانی فیلسوف ایران آئے تھے، ارسطو کے زمانے کے نہیں بلکہ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ یونان کے ایک اسکالر (Scholar) آئے اور انہوں نے یہاں آکر بہت سارے لوگوں سے کہ جو پی ایچ ڈی (PhD) ہیں، ڈاکٹر ہیں یا فلسفے کے اندر اسکالر ہیں، جن کو شدبُد حاصل ہے ان سب سے ملاقاتیں کیں، ان ملاقاتوں کے بعد سب نے تبادلہ خیال کیا، اس اسکالر کو تعجب ہوا اور کہا کہ یہ تو ساری وہ باتیں ہیں جو ہم نے آپ کو پڑھائی ہیں، میں تو یہاں اس لئے آیا تھا کہ کچھ آپ لوگوں سے سنوں کہ آپ کے پاس کہنے کے لئے کیا ہے، یہ تو سب کچھ آپ نے وہ باتیں کی ہیں جو آپ نے ہم سے پڑھی ہیں، چونکہ پی ایچ ڈی کی ڈگری وہیں سے لے کر آتے ہیں، اگر ڈگری نہ بھی لے کر آئے تو کتاب وہیں کی ہوتی ہے یعنی ان ہی کے افکار، انہی کے اقوال، انہی کی آراء یہاں پر پڑھ کر اس پر ڈاکٹریٹ کر کے پھر انہی کی تحویل میں دیتے ہیں کہ یہ ہم پڑھ کر ڈاکٹر بن گئے ہیں۔

اس یونانی اسکالر نے جواب دیا کہ یہ علوم تو آپ کی طرف ہم نے بھیجے تھے، ہم یہاں پر یہ دیکھنے کے لئے آئے ہیں کہ آپ کی اپنی متاع کونسی ہے؟ آپ کے پاس بھی کہنے کے لئے کوئی اپنی بات ہے یا نہیں، پھر تہران سے اس کو حوزے میں لے کر آئے کہ اپنی بات کریں، حوزے میں بھی دیکھا کہ اس وقت ڈگریوں کی طرف رجحان زیادہ ہے، پہلے لوگ اپنے شان کے لئے حجۃ الاسلام لکھتے تھے، آیت اللہ بھی لکھتے تھے لیکن ابھی ڈاکٹر آیت اللہ لکھتے ہیں، ڈاکٹر واضح لکھتے ہیں اور آیت اللہ چھوٹا سا لکھتے ہیں وہ بھی اگر کوئی متدین طبقہ تو ہو اس کے لئے آیت اللہ لکھتے ہیں ورنہ فقط ڈاکٹر

لکھتے ہیں مثلاً اگر روزہ خوان ہے تو ڈاکٹر فلاں روزہ خوان، اگر کوئی استاد ہے تو کہتے ہیں یہ ڈاکٹر ہے، وہ حوزے میں آ کر بھی حیران ہوا کہ میں یہ سمجھا کہ یہ حوزہ دین کا ہے، یہاں کوئی مجھے دین کی رائے بتائے گا، کوئی مجھے قرآن کی رائے بتائے گا لیکن یہاں پر بھی سارے ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر بھی سارے مغرب کی حکمت وفلسفہ ودیگر علومِ مغرب پڑھے ہوئے ہیں، یہاں بھی مجھے وہی باتیں بتانے لگے۔

تا اینکہ اس شخص کو حکیمِ مطلع کے پاس لایا گیا، یہ خدا کی نعمتیں ہیں کہ جن کی قدر دانی ہمارے پاس نہیں ہے، اسے حکیمِ مطلع حضرت آیت اللہ جوادی آملی دام ظلہ العالی کے پاس لایا گیا، یہاں آ کر اس کو پتہ چلا کہ دین کے پاس بہت بڑا عظیم سرمایہ ہے کہ پوری گفتگو کے اندر جس طرح امامؒ نے گورباچوف کو خط لکھا اور دین کے منابع متعارف کروائے تو اس میں کوئی مغربی منبع نہیں تھا کہ آپ کسی کا فلاں ترجمہ پڑھو، سب کے سب اصیل اسلامی منابع، شرقی اور قرآنی منابع متعارف کروائے کہ آپ یہ پڑھو، کہا کہ ملاصدراؒ کو پڑھو، آپ فتوحات پڑھو، آپ یہ اسلامی کتابیں پڑھو تا کہ تمہیں پتہ چلے کہ اسلام میں کیا کچھ موجود ہے اور قرآن کیا دیتا ہے؟!

یہ اسکالر ان کی طرف آیا تو اس وقت اسے احساس ہوا کہ جنہیں میں سمجھ رہا تھا کہ یہ تو وہی فقط ڈاکٹر ہیں، نہیں یہ ڈاکٹر نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہیں اور اس نے کہا کہ پہلے دن مجھے آپ کو یہاں لانا چاہئے تھا، آپ مجھے غلط جگہ گھماتے رہے ہیں، ڈاکٹروں کے ہاں گھما گھما کے مجھے آخر میں یہاں لائے، جب وہ مایوسی کے بالکل قریب پہنچ گیا تو اس کو حکیمِ قرآنی کے پاس لے گئے، حکیمِ مطلع کے

پاس لائے، جس کی الٰہیات، جس کا علم سارا کا سارا نتیجۂ قرآن ہے یا جیسے ایک فرانسیسی اسکالر ہنری کاربون جب فکری طور پر سرگردان آیا اور دامنِ علامہ میں آیا تو اس کو سکون محسوس ہوا، یہاں آ کر اس نے احساس کیا کہ قرآن کے پاس کیا کچھ موجود ہے؟ قرآن کے اندر کتنے علمی سمندر موجود ہیں؟ !ایک مستنبطِ قرآن کے پاس جب ایک مستنبطِ غربی آیا تو اس کو سکون ملا اور پھر جا کر مغرب میں اس نے لوگوں کو خود بتایا۔ اس کے اپنے بقول میں نے مغرب میں بتایا کہ دین کا دامن کتنا پُر ہے اور قرآن کا دامن کتنا پُر ہے۔

اسی دینی حوزے میں بیٹھ کر ہم نے دسترخوانِ غربی بچھائے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر، ڈگری اور دوسرے مدرک کے درپے ہیں اور پھر وہی مثلاً ہیگل وھابز وفلاں کے افکار یاد کریں کہ ان سے دوسروں کے اوپر دھاک ڈالیں، اس سے کوئی متاثر نہیں ہوتا ہے مثلاً اس وقت آپ کلاشنکوف ان لوگوں کے پاس لے کر جائیں کہ جنہوں نے کلاشنکوف بنا کر خود ہمیں بیچی ہے اور ہم لے کر انہی کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں کہ مسلمان ہو جاؤ تو کیا وہ اس طرح کلاشنکوف سے ڈریں گے؟ یہ تو بنائی ہی انہوں نے ہے، یہ انہوں نے ہی بنا کر ہمیں بیچی ہے، جو چیزیں خود انہوں نے بنا کر دی ہیں اور ہماری طرف ایکسپورٹ (Export) کی ہیں ان سے وہ کب متاثر ہوتے ہیں؟ اس طرح جب یہ ہمارے ڈاکٹر ہیگل وفلاں پڑھ کر جب مغرب میں جا کر تبلیغ کریں گے تو ان سے کون متاثر ہوگا؟ چونکہ یہ خود انہوں نے ہمیں تعلیم دی ہے، ان کے ترجمے ہیں جو پڑھ پڑھ کے ڈاکٹر بن گئے ہیں۔

اگر آپ نے متاثر کرنا ہے تو آؤ قرآن ان کے سامنے پیش کرو، ان کے سامنے اہلبیت علیہم السلام

کو پیش کرو، ان کے سامنے اصالتِ دین پیش کرو اور اس کے لئے وہاں کئی لوگ تشنہ ہیں حتیٰ آپ دیکھیں کہ اس وقت عرفانِ ہندی اس وقت عرفانِ مغرب کی مقبول ترین دینی شکل ہے چونکہ اس کے اوپر مغربی رنگ طاری نہیں ہوا ہے یعنی جو بدھائی ہیں، ان کے مذہبی راہنما وہاں جاتے ہیں اور مُرتاض لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں، اس وقت مغرب کا شدید رجحان ہندی عرفان کی طرف ہے یعنی ہندوؤں کے عرفان کی طرف ہے، سب سے زیادہ احترام اس وقت وہ سادھوؤں کا کرتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ فقط ہندی ہے اور اس کے اندر مغربی رنگ نہیں ہے، لیکن جب ہم تبلیغِ دین کے لئے جاتے ہیں تو ان کو وہی چیزیں پیش کرتے ہیں کہ جو انہوں نے پیک (Pack) کر کے ادھر بھیجی تھیں، ہم یہ واپس انہی کی طرف لوٹا دیتے ہیں، اس سے وہ کب متاثر ہوں گے؟ اگر ہم قرآنِ اصیل، اصالتِ قرآن کو ان کے سامنے پیش کریں تو یہ اثر کرتی ہے۔ اس وقت ہماری دانشگاہوں میں حتیٰ ہمارے حوزوں کے اندر جو علوم رائج ہیں، قرآن کے ہوتے ہوئے یہ سارے علوم ہم نے مغرب سے قرض لے کر، مستعار لے کر اپنے سلیبس (Syllabus) میں شامل کئے ہیں درحالیکہ سب کچھ قرآن کے اندر موجود ہے، کمی اس بات کی ہے کہ مستنبط نہیں ہیں، کوئی آئے اور انہی چیزوں کو قرآن سے استنباط کرے۔

مثلاً کتابِ خمس تو قرآن میں نہیں ہے، فقط ایک آیہ خمس ہے، اگر ایک قاری پڑھتا ہے تو وہ صرف چند سیکنڈ میں پڑھ کر اس سے گزر جاتا ہے لیکن ایک فقیہ ایک سال رکتا ہے، آیہ خمس پر توقف کرتا ہے، تدبر کرتا ہے، اس کی گہرائی میں اترتا ہے یعنی قاری کا چند سیکنڈ کا مواد فقیہ کا ایک سال کا

مواد ہے۔ یہ تو ایک آیت کا حکم ہے لیکن جو جہاں بینی کی آیات ہیں، حقیقت شناسی کی آیات ہیں، ہستی شناسی کی آیات ہیں، انسان شناسی کی آیات ہیں، طبیعت شناسی کی آیات ہیں، افلاک شناسی کی آیات ہیں، یہ ساری آیات اپنے اندر ایک دنیائے علم رکھتی ہیں اور اسی طرح آپ نہج البلاغہ میں آئیں جیسے اس فصل کے پہلے حصے میں اشارہ کیا ہے کہ جو لوگ دنیائے نہج البلاغہ سے آشنا ہوئے ان کے احساسات پڑھیں کہ انہیں کیا ملا؟ نہج البلاغہ کے اندر ہر ہر جملے کے نیچے ایک عظیم علوم کا منبع پوشیدہ ہے۔

مثلاً اس وقت ہم مغرب کی ترجمہ شدہ نفسیات پڑھتے ہیں، اس وقت زیادہ تر جتنی بھی علمِ نفسیات یا سائیکالوجی (Psychology) کی کتابیں ہیں یہ سب مغربی سائیکالوجی ہے، اس میں ہم وہ نفسیات پڑھتے ہیں کہ جس میں نفس کا کوئی تصور نہیں ہے یعنی نفس کے بغیر نفسیات کی کتابیں پڑھتے ہیں، دقیق تر مطالعہ کر کے دیکھ لیں کہ نام نفسیات ہے لیکن سب جسمانیات ہیں، مادیات ہیں یعنی اس نفسیات کے اندر نفس کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، ہم جتنے بھی معاشرتی علوم پڑھتے ہیں، جتنی بھی سوشیالوجی (Sociology) پڑھتے ہیں یہ سب مغرب سے ترجمہ شدہ معاشرت ہے کہ جو ہم نے ترجمہ کر کے یہاں پر اپنی کتابوں میں رائج کر دی ہے درحالیکہ قرآن انسان کی ہدایت کا سب سے اصیل منبع ہے، قرآن نے بشری معاشرے جس طرح تحلیل کر کے بتائے ہیں، تجزیہ کر کے بتائے ہیں، جتنے قصے ہیں، قوم عاد و ثمود، بنی اسرائیل و قومِ لوط علیہ السلام و نوح علیہ السلام و فلاں یہ سب جامع شناسی قرآن ہیں لیکن ہم چونکہ لقمہ خور ہیں، طفیلی ہیں اگر ایک دن اپنے ہاں کھالیں تو اس کو حرام سمجھتے ہیں،

کہتے ہیں کہ مولانا سے کسی نے پوچھا کہ کبھی حرام کھایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک دن کھایا ہے، مجبوراً کھانا پڑا، کہا کہ وہ کونسا دن تھا؟ کہا کہ بارش تھی، آندھی تھی، طوفان تھا، گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے، اس دن گھر میں پکا کر کھانا پڑا، پوری عمر میں یہ ایک حرام کھایا باقی کبھی بھی حرام نہیں کھایا چونکہ موسم معمولی ہوتا تھا یعنی دوسروں کے ہاں جا کر کھاتے تھے۔

۹)قرآن و اہلبیتؑ باعثِ ثروت

سب مفید چیزیں قرآن میں موجود ہیں، بقول حافظ شیرازی

سالہا دل طلب جامِ جم از ما می کرد......(۴)

یعنی کئی سالوں سے، مدتوں سے دل کا ایک تقاضا تھا، روز مانگتا تھا، کیا مانگتا تھا؟ جامِ جم۔ یہ اصطلاح ہے یعنی ایسی دید، ایسی بصیرت کہ جس کے اندر انسان دنیا کو سمجھ سکے، حقیقت کو سمجھ سکے۔ کہتے ہیں کہ جمشید جو ایران کا بادشاہ تھا، اس کے پاس ایک پیالہ تھا، آج کے مطابق راڈار (Radar) تھا کہ جس میں وہ بہت دور کے حالات دیکھ لیتا تھا، اب واللہ عالم تھا یا نہیں تھا، معلوم نہیں افسانہ ہے یا حقیقت، بہرکیف جس کو آج ریڈار کہتے ہیں، ریڈار اسی جامِ جم کو کہتے ہیں، انسان یہاں بیٹھا ہوا سارا عالم دیکھ رہا ہوتا ہے کہ کون کدھر جا رہا ہے، اسی طرح سے ایک جام جم انسان کے اندر موجود ہے،

گفتم این جامِ جہان بین بتو کی داد حکیم

گفت آنروز کہ این گنبد مینا میکرد

یعنی وہ شخص کہ جامِ جہاں بین جس کے پاس ہے، یعنی ایسا دل ہے کہ جس سے وہ پوری کائنات کو سمجھتے ہیں، پورے احوالِ عالم سمجھتے ہیں، میں نے پوچھا کہ یہ جامِ جہاں بین خدا نے تجھے کب دیا یعنی یہ دل خدا نے تجھے کب دیا؟

گفت آنروز کہ این گنبد مینا میکرد

کہا کہ جس وقت عرش بنا رہا تھا، آسمان اور سماوات وارضین کی بساط بنا رہا تھا، جس وقت جہان بنا رہا تھا، میں نے کہا کہ مجھے جامِ جہاں بین بھی عطا کردے،

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد

وانچہ خود داشت زبیگانہ تمنا می کرد

سالوں سے دل مطالبہ کر رہا تھا کہ یہ جامِ جہاں بین مجھے مل جائے، یعنی جو کچھ اس کے اپنے پاس تھا وہ دوسرے سے مانگ رہا تھا، جو کچھ اپنی جیب میں تھا، اپنے پاس تھا وہی چیز دوسروں سے مانگ رہا تھا، جامِ جم تیرے پاس ہے، جامِ جم قرآن ہے، جامِ جہاں بین قرآن ہے، یہ کس قدر فقر وزبوں ہے کہ انسان کے پاس ملینز کے اعتبار سے اربوں، کھربوں کے اعتبار سے سرمایہ ہو اور وہ ایک کاسہ لے کر پل پہ کھڑا ہو اور ہر آنے جانے والے سے کہے کہ یہاں تم ایک سکہ ڈال دو، قرآن غنیٰ کا مجموعہ ہے، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ

وَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَيْسَ عَلَى أَحَدٍ بَعْدَ الْقُرْآنِ مِنْ فَاقَةٍ......(۵)

قرآن واہلبیتؑ باعثِ ثروت

جان لو کہ قرآن کریم کی قرأت کے بعد کوئی بھی انسان فقر وفاقہ سے دوچار نہیں ہوتا......

لَا فَقْرَ بَعْدَ الْقُرْآن،

"قرآن کے بعد کوئی فقر نہیں ہے،"

ایک شخص امام صادق علیہ السلام کے پاس آیا، اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، جوتے نہیں تھے، برا حال تھا، پیٹ بھی خالی تھا اور آ کر رونے لگا، کہنے لگا کہ میں فقیر ہوں، میرے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے، میں محتاج ہوں، حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ تو بہت بڑا غنی ہے، اس نے سمجھا کہ شاید میرا تمسخر اڑا رہے ہیں، طنزاً کہہ رہے ہیں کہ تو بہت امیر ہے، جس طرح ہوتا ہے کہ بعض طنزاً فقیروں کو سیٹھ کہتے ہیں، رئیس کہتے ہیں، وہ بے چارہ جس کا کچھ نہیں ہے اس کو بعض طنز کے طور پر سیٹھ یا رئیس کہہ دیتے ہیں، اس نے کہا کہ شاید امام علیہ السلام اس حوالے سے مجھے کہہ رہے ہیں، امام علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں تو واقعاً غنی ہے، اس نے پوچھا کہ میرے پاس کیا غنیٰ ہے فرمایا کہ آیا ہم اہلبیت علیہم السلام کی محبت تیرے دل میں ہے یا نہیں ہے اس نے کہا کہ ہے، فرمایا کہ جس کے پاس یہ سرمایہ موجود ہے وہ سب سے بڑا غنی ہے، یعنی ولایت کی نعمت جس کے پاس ہو اور وہ کہے کہ محتاج ہیں! کس چیز کے محتاج ہیں؟ یہ نہ کہو کہ محتاج ہیں بلکہ کہو کہ نا اہل ہیں، نظامِ ولایت ہوتے ہوئے جمہوریت کے پیچھے دوڑتے ہیں، یہ نا اہل ہیں، نظامِ ولایت ہوتے ہوئے تمہارے اوپر استبداد حاکم ہو، نظامِ ولایت ہوتے ہوئے ڈکٹیٹروں کے تحت رہتے ہو، نظامِ ولایت ہوتے ہوئے شہنشائیت کے زیر سایہ رہتے ہو، نظامِ ولایت کے ہوتے ہوئے فوجیوں کی حکومت کے تحت رہتے ہو، یہ کہو کہ ہم نا اہل ہیں یہ نہ کہو کہ

ہم فقیر ہیں، سرمایہ تمہارے پاس موجود ہے، نظامِ دینی، قرآن کا بنایا ہوا نظام موجود ہے اور تم دوسروں کے نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہو، اس سے زیادہ برا فقر کونسا ہے؟

۱۰)قرآن بصورتِ معدن ہونے کی حکمت

قرآن ہدایت ہے اور تمام علوم قرآن میں موجود ہیں لیکن اسے کوئی مستنبط چاہیے۔ تمام نسلوں کے لئے استنباط شدہ چیزیں نہیں دی جاسکتی ہیں کیونکہ وہ ایک نسل کے لئے ہیں لیکن پھر دوسری نسل کے لئے نہیں ہوسکتی ہے، میں اسی معدنیات کی مثال سے اس مطلب کی تکمیل کروں گا مثلاً کیوں خدا نے تیل کو زمین کے نیچے رکھا؟ اور کیوں بہت ساری مٹی کے اندر کئی کلومیٹر نیچے معدن بنا کر رکھا ہے؟ اگر طبعی طور پر پٹرول پمپ پیدا ہوتے اور پٹرول پمپوں میں تصفیہ شدہ تیل ہوتا تو ہمیں اتنی زحمت کرنے کی، استنباط کرنے کی ضرورت نہ پڑتی، ایک نسل تو استفادہ کر لیتی لیکن باقی نسلیں اس سے استفادہ نہیں کرسکتیں۔

یہ بھی ممکن تھا کہ کسی طرح صاف شدہ تیل آپ تک پہنچایا جاتا یا اسی کو خلق کیا جاتا اور اس میں کوئی آلودگی نہ ہوتی، پٹرول الگ ہوتا، ڈیزل الگ ہوتا ہے اور اس میں دوسری قسمیں الگ الگ ہوتیں لیکن یہ ایک نسل کے لئے ممکن ہوتا ہے مثلاً اگر ہم سو سال پہلے ہوتے اور کسی کو سواری چاہیے ہوتی تو کیا مانگتے؟ گدھا گاڑی مانگتے چونکہ اس وقت بہترین شاہی سواریاں یہی گھوڑا گاڑیاں یا گدھا گاڑیاں تھیں، اُس وقت لوگ سوچتے ہوں گے کہ آخر خدا نے یہ گدھا گاڑیاں کیوں نہیں پیدا

کیں؟ اگر خدا ساری گدھا گاڑیاں سب نسلوں کے لئے پیدا کر دیتا تو آج یہ پٹرول کی گاڑیاں اور آگے آنے والے زمانوں میں اور جدید گاڑیاں جو ہمارے تصور سے بھی باہر ہیں نہ ہوتیں اوران آئندہ کی نسلوں کی ارتقاء کا سلسلہ رک جاتا۔

معدن کی شکل میں کسی چیز کو بنانا نسلوں کے لئے ترقی کا میدان کھلا رکھنا ہے، اگر پروڈکٹ (Product) تیار کر کے کسی کے سامنے رکھ دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ہم نے ترقی کرنے نہیں دینا ہے لہٰذا قرآن میں استنباط شدہ سب چیزیں بھی بیان کی جا سکتی تھی لیکن نہیں کیں، کیوں؟ کیونکہ اس سے انسان ارتقاء نہیں کر سکتا ہے، مقصود انسان کا ارتقاء تھا، اس لئے قرآن معدنی صورت میں ہے، سب کچھ قرآن میں ہے، علوم جتنے بھی ہیں سب قرآن کے اندر موجود ہیں حتیٰ یہ علومِ رائج کہ جو ہم حوزوں میں پڑھتے ہیں یہ کوئی اِدھر اور کوئی اُدھر سے دوسروں نے استنباط کر کے ہمیں دیئے ہیں۔

۱۱) علوم کو قرآن سے استنباط کرنے کی ضرورت

بالخصوص صدر المتالھین ؒ کا ایک اصرار یہ ہے کہ علومِ قرآن وہ علوم ہیں کہ جو انسان کی ہدایت میں مؤثر اور ضروری ہیں لہٰذا انسان یہ سارے علوم قرآن سے عکس کریں چونکہ قرآن میں یہ سب موجود ہیں۔ ایک دن انسان یہی چیزیں قرآن سے استنباط کر کے دیکھیں، فلسفہ قرآن سے لیں، منطق قرآن سے لیں، نفسیات قرآن سے لیں، جامع شناسی قرآن سے لیں، مسئلہ یہ درپیش

ہے کہ مستنبطاتِ قرآنی نہیں ہیں حتیٰ آپ دیکھیں کہ عربی ادب شروع ہی قرآن سے ہوا چونکہ لوگ قرآن غلط پڑھتے تھے لہٰذا احساس ہوا کہ اس کے لئے ایک علم ہونا چاہیے تاکہ قواعد وضوابط لغتِ عرب کے مطابق بیان ہوں تاکہ لوگ صحیح قرآن پڑھیں، صحیح قرآن پڑھنے کے لئے جس علم کی ضرورت محسوس ہوئی اس علم کی ساری بنیاد جاہلیت کے شعروں میں ہے یعنی اس علم کے قواعد بھی قرآن سے استنباط نہیں ہوئے بلکہ جاہلیت کے شعر ہیں مثلاً سبع معلقہ ہے کہ ان کے ذریعے سے استنباط کرتے ہیں، آپ بڑے بڑے نحویوں کو دیکھیں کہ کہتے ہیں یہ لفظ اس طرح سے پڑھا جائے، یہ اعراب اس طرح سے ہونے چاہئیں، کیوں؟ اس لئے کہ فلاں شاعرِ جاہلی نے عصرِ جاہلیت میں اپنے شعر میں اس کو استعمال کیا ہے یعنی وہ علم جو قرآن کی ضرورت کے تحت وجود میں آیا اس کے مستنبطات بھی قرآنی نہیں ہیں، صرف ونحو کے مستنبطات بھی قرآنی نہیں ہیں، درحالیکہ منطق انسان کا فطری علم ہے لیکن اس میں بھی ان مستنبطین کے قواعد پر اکتفا کیا ہوا ہے کہ جو آج سے ڈھائی ہزار، تین ہزار سال پہلے پیدا ہوئے۔

علومِ قرآن سے استنباط کرنے کی ضرورت

قرآن ہمارے پاس موجود ہے لہٰذا آئیں ہم منطق کو قرآن سے استخراج کریں، ابھی تک جو علوم قرآن سے استنباط ہوئے ہیں ان میں سے ایک فقہ ہے، فقط یہ ایک علم استنباط ہوا ہے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن سے علم استنباط ہوسکتا ہے، یہ کسی ایک چیز کا وقوع دوسری چیزوں کے استنباط کے امکان پر دلیل ہے، اگر قرآن سے ایک علم استنباط ہوسکتا ہے یعنی علمِ شریعت وعلمِ فقہ تو پھر بشر کی تمام ضرورتوں کے علوم بھی قرآن سے استنباط ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ہدایت کے لئے ہوں سرگرمی

کے لئے نہ ہوں، ہدایتِ بشر سے متعلقہ ہر چیز قرآن کے اندر موجود ہے، یہ سارے علوم جو اس وقت دانشگاہوں میں یا حوزوں میں پڑھائے جاتے ہیں وہ مستنبطینِ قرآنی نے استنباط نہیں کئے ہیں بلکہ دوسروں نے دیگر منابع سے استنباط کئے ہیں۔

ہم تعلقہ لگا دیتے ہیں، حاشیہ چڑھا دیتے ہیں کہ یہاں یہ آیتِ قرآنی ہے حالانکہ اول سے متن قرآن کا ہونا چاہئے تھا اور دوسرے حاشیے ہونے چاہئے تھے، آباؤ اجداد نے ہمیں یوں کہا تھا یا فلاسفہ نے یوں کہا تھا یا مثلاً دوسرے انسانوں نے یوں کہا تھا یہ حاشیے میں ہونے چاہئے تھے نہ کہ قرآنی آیات حاشیے میں ہوں، فٹ نوٹ کے طور پر ہوں اور متن اور اصل دوسروں کے اقوال ہوں۔ معلوم ہوا کہ قرآن میں استنباط کا عمل نہیں ہوا ہے، یہ در کھلا ہوا ہے۔ ہم اس وقت قرآنی انسان بنیں گے، قرآنی معاشرہ بنے گا، قرآنی ہدایت عام ہوگی اور قرآن مہجوریت سے نکلے گا کہ جب اس میں استنباط ہو اور ہر آیت میں ہو یعنی بسم اللہ میں استنباط ہو، ایک استادِ بزرگوار فوت ہو گئے ہیں، خدا ان پر رحمت کرے، انہوں نے بسم اللہ کی بتیس ترکیبیں کیں تھیں، ترکیب طالب علموں کی اصطلاح ہے یعنی تجزیہ یعنی یہ ب کونسی ب ہے؟ اسم کیا ہے؟ رحمٰن کیا ہے؟ رحیم کیا ہے؟ مبتدا کیا ہے؟ خبر کیا ہے؟ یہ سارے نحوی اور صرفی قوانین ہیں، ان نحوی اور صرفی قاعدوں کی رو سے بتیس الگ الگ ترکیبیں و تجزیے انہوں نے فقط بسم اللہ کے کئے ہیں، فقط قواعدِ ادبی میں ترکیبیں کی ہیں کہ اس کو کس کس طرح پڑھ سکتے ہیں؟ مثلاً

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنَ الرَّحِيْمِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمِ

انہوں نے کہا کہ یہ سب جائز اور درست ہیں، بسم اللہ پڑھنے کے بتیس طریقے ہیں لیکن اس فکر کو چھوڑیں کہ بسم اللہ صحیح پڑھی ہے یا نہیں کیونکہ بعض لوگ بسم اللہ صحیح نہیں پڑھ سکتے ہیں، بیشک نہ پڑھیں، حضرت بلالؓ بھی بہت ساری چیزوں کو درست نہیں پڑھ سکتے تھے، ش کو س پڑھتے تھے، اسھد الا پڑھتے تھے، اسی شہادت میں کہ جس کا تلفظ درست نہیں تھا بلالؓ کا استنباط بہت درست تھا، بلالؓ کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر اوپر چٹان رکھ کر کہتے تھے کہ اشہد الا نہ کہو لیکن پھر بھی کہتا تھا کہ اسھد الا یعنی یہی غلط س اس سے نہیں رکوا سکے، یہ شہادت بلال کے اندر راسخ تھی ورنہ ابھی بہت سارے ایسے لوگ ہیں کہ جن کا اعتقاد و ایمان نہیں ہے جیسے بعض لوگ پیسے لے کر ریڈیو، ٹی وی پر شیعہ اذان پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں اشھد انّ علی ولی الله لیکن اگر انہی بہت بڑے قاری حضرات کے سینے پر چٹان رکھ کے کہو کہ انکار کرو تو یہ سب کا انکار بھی کر سکتے ہیں۔

۱۲)اثارۂ قرآن

صدر المتالھینؒ ایک بہت خوبصورت تعبیر ابن مسعود سے نقل کرتے ہیں، ابنِ مسعود جو صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے تھے اور ایک قرآن شناس انسان تھے، یہ ان چیدہ چیدہ افراد میں سے ہیں کہ جن کو قرآنیات میں رسوخ تھا لیکن ان کے سیاسی یا دیگر مسائل امام غزالی کی طرح الگ

ہیں،غزالی کے بہت سارے مسائل ہیں لیکن قرآنیات میں غزالی واقعاً معرکہ ہے۔

صدر المتألہینؒ ابن مسعود سے ایک قول نقل کرتے ہیں اور یہ قول مبالغہ نہیں ہے یعنی خطابی نکتہ نہیں ہے کہ خطابت کر کے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے یا با اصطلاحِ دیگر کہ جس طرح بعض لوگ نعرہ لگوانے کے لئے فضائلِ اہلبیت علیہم السلام پڑھتے ہیں اسی طرح فضائلِ قرآن پڑھ کر لوگوں سے واہ واہ کروانے کے لئے یہ بات نہیں ہے بلکہ ایک حقیقتِ کاملہ ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کو علوم چاہئیں، علمِ اولین و آخرین چاہئے تو وہ قرآن کی بارگاہ میں آئے، لیکن کیا کرے؟ اثارہ قرآن کرے،

مَنْ أَرَادَ عِلْمَ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ فَلْيُثَوِّرَ الْقُرْآنَ......(٦)

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ علمِ اوّلین و آخرین سیکھے تو اسے چاہئے کہ اثارہ قرآن کرے.....

اثارہ قرآن کی اصطلاح ہم نے نہیں سنی ہے، تلاوتِ قرآن، قرأتِ قرآن، تفسیرِ قرآن کی اصطلاحیں سنی ہیں لیکن اثارہ قرآن نہیں سنی ہے درحالیکہ یہ تعبیر استعمال کس نے کی ہے؟ ابنِ مسعود نے کہ جو صحابیٔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں یعنی چودہ سو سال سے یہ تعبیر مباحث میں اثارہ قرآن کے نام سے موجود ہے، یہ بہت اہم نکتہ ہے، آپ قرآن کو اثارہ کریں، یہ ثورہ سے ہے، ثورہ یعنی ابھارنا، اکسانا، ثورہ انقلاب کو کہتے ہیں، انقلاب کو اس وجہ سے ثورہ کہتے ہیں چونکہ اس میں لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، قیام کرتے ہیں، مظاہرہ کرتے ہیں اور لوگوں کے احساسات ابھرے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے اس کو ثورہ کہتے ہیں، ثورہ کا معنیٰ ہے ابھارنا یا جس طرح سے روایت میں بھی ہے کہ

مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا ظَهَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰى لِسَانِهٖ......(۷)

یعنی جس نے چالیس دن اپنے اندر خدا کے لئے اخلاص پیدا کیا تو حکمت کے چشمے اس کے دل سے (پھوٹیں گے اور) زبان پر ظاہر ہوں گے۔

یہ بھی اصطلاح ہے اور اثارہ کی تعبیر ہے یعنی خدا اس کے دل پر حکمت کے سوتے اور چشمے جاری کرتا ہے اور وہ پھوٹ پڑتے ہیں لہٰذا اثورہ بھی اسی کو کہتے ہیں، جب پانی زمین کو چیر پھاڑ کر خود اُبل کر نکلے تو اس کو ثورہ کہتے ہیں۔

بسا اوقات ہوتا ہے کہ پانی نیچے سے ابل کر نکلتا ہے، جوش مار کر نکلتا ہے، ابلنے سے مراد گرم ہونا نہیں ہے، ٹھنڈے پانی کا چشمہ بھی جوش کے ساتھ نکلتا ہے اسی کو ثورہ کہتے ہیں اور یہ کام قرآن کے اندر ضروری ہے، اثارۂ قرآن یعنی ابھارنا، بھڑکانا، اکسانا اور چھیڑنا۔

اس چھیڑنے سے مراد محاوراتی زبان میں ہے مثلاً کسی معاشرے کے اندر ایک موضوع نہیں ہوتا ہے تو لوگ اس میں بحث و مباحثہ نہیں کر رہے ہوتے ہیں، قیل وقال نہیں کر رہے ہوتے، سوچ بچار نہیں کر رہے ہوتے ہیں، اصلاً فراموش شدہ موضوع ہوتا ہے لیکن بعض افراد آ کر وہی موضوع اس معاشرے میں چھیڑ دیتے ہیں۔

۱۳)اثارۃ الموضوع

فرض کریں کہ حوزے میں اس وقت بہت سارے موضوع چھڑے ہوئے ہیں، یہ حوزے کے زندہ موضوعات ہیں کہ جن پر بحث وتمحیص ہوتی ہے، غور وخوض ہوتا ہے، قیل وقال ہوتا ہے، نقد ہوتا ہے، تنقید ہوتی ہے ان سارے موضوعات کو کہتے ہیں کہ یہ مُطرَّ اموضوعات یا چھڑے ہوئے موضوعات ہیں، برانگیختہ موضوعات ہیں، جنہیں کسی نے ابھار دیا ہے، اٹھا دیا ہے۔فرض کریں کہ بہت سارے موضوعات ہیں کہ جو ابھی حوزے میں چھڑے ہوئے نہیں ہیں، جن موضوعات کو حوزے کی اصلی بحث کا حصہ ہونا چاہئے یعنی فضلائے حوزہ، اساتیدِ حوزہ اور بزرگانِ حوزہ کو چاہئے کہ ان موضوعات پر غور وخوض کریں لیکن نہیں کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ موضوع کسی نے چھیڑا نہیں ہے، مثال کے طور پر وحدت کا موضوع، جیسے ایک پورے سال کو مقامِ معظم رہبری نے وحدت اور انسجامِ اسلامی کا سال قرار دیا تھا تاکہ اس موضوع پر عملی توجہ ہو سکے، وحدت ایک مفہوم کے طور پر یا ایک ضرورت کے طور پر تو موجود ہے، کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے، قرآن میں اس کا ذکر ہے لیکن عملاً معاشرے کے اندر چھڑا ہوا موضوع نہیں تھا، وحدت فراموش شدہ موضوع تھا راکد وجامد موضوع تھا، متروک موضوع تھا، اس کے اوپر کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی لیکن رہبر نے اس موضوع کو چھیڑا ہے، ابھارا ہے، اکسایا ہے اور اٹھایا ہے اس کو کہتے ہیں اثارۃ الموضوع یعنی ایک دبا ہوا، فراموش شدہ موضوع زندہ کر دینا، ابھار دینا، اس کو لوگوں کے سامنے بحث کے لئے آمادہ کر دینا، ضرورت ہے کہ بہت ساری چیزیں کو چھیڑیں مثلاً معاشروں کے اندر، انسانی معاشرے کے اندر

خصوصاً علمی ماحول کے اندر جب تک یہ علمی موضوعات کہ جو ضروری ہیں کہ ان پر غور و خوض وجستجو ہو، جب تک یہ موضوع چھیڑے نہیں جائیں یا کوئی چھیڑنے والا نہ ہو تو لوگ توجہ نہیں کرتے ہیں۔

انسان خود ہی خود دبے ہوئے موضوعات، فراموش شدہ موضوعات اور متروک موضوعات کی طرف نہیں آتے ہیں، ہمیشہ اس زمانے کے چھڑے ہوئے موضوعات کی طرف رجحان ہوتا ہے، اجتماعی طور پر یا سیاسی طور پر ان میں زیادہ غور و خوض ہوتا ہے مثلاً آپ میڈیا میں دیکھیں، خبروں میں دیکھیں کہ وہ موضوعات کہ جو آج کل چھڑے ہوئے ہیں ان کی طرف زیادہ توجہ ہے مثلاً اس وقت دنیا میں ایران کا ایٹمی مسئلہ ایک چھڑا ہوا اور ابھارا ہوا موضوع ہے جسے شرق و غرب میں بہت سارے لوگ دبنے نہیں دیتے ہیں، ایران کی پوری کوشش ہے کہ یہ موضوع ختم ہو جائے، فراموش ہو جائے اور اس پہ گفتگو نہ ہو، حتیٰ یو این او (UNO) میں ایرانی پریذیڈنٹ (President) نے اعلان بھی کیا کہ ہماری طرف سے یہ موضوع تمام شدہ موضوع ہے، اب اس پر کوئی گفتگو نہیں ہوگی اور دنیا نے کہا کہ یہ تمام شدہ موضوع نہیں ہے بلکہ ابھی جاری ہے، یہ لوگ اس موضوع کو زندہ رکھنے کیلئے کئی بلین کا سرمایہ صرف کر رہے ہیں، یہ ہے کسی موضوع کو ابھارنا، زندہ کرنا، چھیڑنا اور اس کو اثارۃ الموضوع کہتے ہیں، یہ اجتماعی یا سیاسی موضوع ہے۔

ہر ملک کے اندر حزبِ اقتدار یا حزبِ اختلاف یعنی حکومت یا حکومت کے مخالفین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی مفاد کا کوئی نہ کوئی موضوع چھیڑ کر رکھیں اور اس پر میڈیا کے اندر بحث و تمحیص ہو، خود میڈیا کا بھی ایک یہی رول (Role) ہے کہ بعض چیزیں ابھارنا، چھیڑنا اور بعض چھڑی ہوئی چیزوں

کو، مُطْرَاً چیزوں کو دبا کر رکھنا کہ ان پر کوئی بحث و تمحیص نہ ہو، کچھ علماء کی یہ خصوصیت ہوتی ہے یعنی ہر عالم کی ایک صفتِ خاص ہے مثلاً بعض علماء کا کام فقط علمی بحث کرنا ہے اور پھر کئی عنوانات سے اور کئی موضوعات کے تحت کرتے ہیں، بعض علماء کا یہ تخصص اور فن ہے کہ وہ تعلیم اچھی دے سکتے ہیں، بعض تحقیق اچھی کر لیتے ہیں، بعض اچھا سمجھا سکتے ہیں، بعض محقق تو بہت خوب ہیں لیکن اچھے معلم نہیں ہیں، یہ مختلف افراد کی، معلمین کی، اساتید کی اور بزرگان کی خصوصیات ہیں۔

ایک شخص ہے کہ خود تنہائی میں کسی موضوع کے اندر غور و خوض کر کے اچھے نتائج لے سکتا ہے لیکن یہی موضوع دوسروں کو تفہیم کرنا پڑے، دوسروں کو سمجھانا پڑے تو نہیں سمجھا سکتا ہے، ایسے بہت سارے لوگ ہیں کہ جن کو خدا نے نعمتِ بیان عطا کی ہے، بیان یعنی قوتِ تفہیمِ مطلب، کسی کے پاس سمجھانے کی صلاحیت بھرپور موجود ہوتی ہے، بعض بڑے فاضل ہیں لیکن اپنا مافی الضمیر کسی تک آسانی سے منتقل نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ سادگی سے بیان کرنے میں ان کو مشکل پیش آتی ہے لیکن کچھ علماء کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دبے ہوئے موضوعات کو چھیڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں، فراموش شدہ موضوعات کو اچھے طریقے سے، علمی طریقے سے، آداب کے ساتھ اور خوبصورتی کے ساتھ چھیڑ دیتے ہیں اور پھر علمی حلقوں کے اندر اس موضوع پہ لے دے شروع ہو جاتی ہے یا قیل و قال ہوتی ہے اور پھر اہلِ فضل آ کر اپنا اظہارِ نظر کرتے ہیں۔

لہٰذا موضوع چھیڑنے والا ایک خاص ہنرمند عالم ہوتا ہے، ہر ایک یہ موضوع نہیں چھیڑ سکتا ہے، شہید مطہریؒ نے امام رازی کے بارے میں ان کی یہی تصویر پیش کی ہے چونکہ امام رازی اہل

ادارۃ المرضوع

سنت کے بڑے معروف عالم تھے کہ جو ہر فن میں اور ہر علم میں تبحر تھے، ان کی ایک اختلافی شخصیت ہے یا یوں کہہ لیں کہ نزاعی شخصیات میں سے ہیں، جن کے بارے میں مختلف آراء ہیں، یہ ان شخصیات میں سے ہیں کہ جن کے بارے میں بعد والوں میں افراط وتفریط ہوتا ہے، بعض نے ان کو افراط کی حد تک تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور بعض نے سرے سے تنقید ہی نہیں کی، بعض نے مثلاً ان کو بہت سراہا ہے اور یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ عموماً وہ شخصیات کہ جو اس طرح کا کام کریں ان کے بارے میں ایسی ہی آراء ہوتی ہیں اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، دوسرے انہیں کہتے ہیں کہ یہ امام مشککین ہیں، امام رازی کا یہ لقب معروف ہوگیا ہے کہ یہ شک کرنے والوں کے امام ہیں، شک کرنا، شک ڈالنا، مسلم مسائل میں بھی شک کرنا ان کا تخصص ہے، ان کو مہارت ہے لہٰذا مبداء سے لے کر معاد تک جتنے مسائل ہیں ان کے اندر انہوں نے شک کیا ہے، کسی بھی چیز کو انہوں نے کنفرمڈ (Confirmed) اور مسلم نہیں رہنے دیا۔

یعنی بعض چیزوں کو کچھ لوگ مسلماتِ دین میں سے سمجھتے تھے لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں یہ مسلماتِ دین میں سے نہیں ہیں ان میں بھی بحث ہوسکتی ہے، ان میں شکوک وشبہات کیے، نتیجہ یہ ہوا کہ جو علماء ان کے بعد آئے خوانخواہ ان کو ان کے شکوک وشبہات کا جواب اپنے اپنے موضوع اور فن میں دینا تھا، شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ امام رازی نے درحقیقت علوم کی جو خدمت کی ہے وہ یہ ہے کہ بہت سارے فراموش شدہ موضوعات کہ جن کو مسلم سمجھ کر، طے شدہ سمجھ کر یا ثانوی سمجھ کر لوگوں نے چھوڑا ہوا تھا اور ان میں بحث وتمحیص نہیں کرتے تھے امام رازی نے شبہات کے ذریعے ان

موضوعات کو دوبارہ زندہ کیا ہے، دوبارہ ابھارا ہے اور پھر اس کے بعد انہوں نے دوسرے علماء کو میدان دیا جیسے خواجہ طوسیؒ ہیں اور سب سے بڑھ کر صدر المتالھینؒ ہیں، ملا صدراؒ نے آکر بہت ایسے بہت سارے مسائل میں بحث کی ہے کہ جن کو اگر امام رازی نہ چھیڑتے، نہ ابھارتے، نہ اکساتے تو یہ زحمت بھی نہ کرتے اور ضرورت بھی نہ سمجھتے کہ ان مسائل میں وارد ہوں۔ یہ فراموش شدہ موضوع تھے، علم کلام میں یا دوسرے علوم کے اندر طے شدہ موضوعات تھے اس وجہ سے دوسرے ان پر بحث کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے لیکن امام رازی نے آکر انہیں چھیڑ دیا اسی کو اثارۂ موضوع کہتے ہیں یعنی موضوع کو چھیڑنا۔

مثلاً کسی محفل میں بعض لوگ ایسے ہی آپس میں دو دو کر کے بات کر رہے ہوتے ہیں لیکن وہاں کچھ ایسے ہنرمند بھی بیٹھے ہوتے ہیں کہ جو پوری محفل ومجلس کو ایک موضوع پر لے آتے ہیں یعنی سب لوگ ایک ہی موضوع پر گفتگو کرنا شروع کر دیتے ہیں، عموماً افطار کی مجالس میں، محافل میں ایسے ہی ہوتا ہے کہ جو ساتھ ساتھ دو بیٹھے ہوتے ہیں وہ اپنی ذاتی دلچسپی کے مسئلے پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، کبھی موسم پر، کبھی ٹریفک پہ اور اس طرح کے جزئی اور ذاتی تعلقات پر کہ بچوں کا حال پوچھنا، اپنا حال بتانا، روزہ بہت لمبا ہے، اس سال یوں ہوگا، پچھلے سال روزہ ایسا تھا، چاند کے مسئلے پر بات ہوگی اور اس طرح کے اپنی دلچسپی کے امور پر گفت وشنید کر رہے ہوتے ہیں لیکن بعض دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ ایک اچھی فرصت ہے، سارے مومنین، سارے اہل فضل، سب اہل کمال جمع ہیں لہٰذا سب کی موجودگی سے استفادہ کیا جائے تو وہ بیچ میں ایک ایسا موضوع چھیڑتے ہیں کہ جو سب کی توجہ کا مرکز

اثارۃ الموضوع

بن جاتا ہے اور پھر سب اس میں اظہارِ نظر کرنا شروع کر دیتے ہیں، یہ ان کا ہنر ہے کہ انہوں نے موضوع چھیڑا ہے اسی کو اثارہ کہتے ہیں یعنی ابھار دینا، چھیڑ دینا تا کہ لوگ آئیں اور آ کر اس کے اوپر اظہار نظر کریں۔

۱۴) اثارة الفتنه

بعض لوگوں کے اندر فتنہ چھیڑنے کی، فتنہ پھیلانے کی بڑی مہارت ہے، اثارہ فتنہ یعنی فتنہ پھیلانا اور فتنے کو ہوا دینا، دوسرے لفظوں میں چھیڑنے کو اردو زبان میں، محاورے کی زبان میں ہوا دینا کہا جاتا ہے، اس سے آگ بھڑکتی ہے، جب آگ خاکستر کے نیچے بجھی ہوئی ہوتی ہے تو پنکھا لے کر اس کو ہوا دیتے ہیں اور ہوا کھا کر اس کا شعلہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ عموماً جہاں تکّے اور کباب بنتے ہیں وہاں ان کے نیچے کوئلوں پر آگ کا شعلہ جلا کر پنکھے کی ہوا دیتے ہیں، یہ ہوا دینا ہے کہ ہوا سے آگ مزید پھیلتی ہے، اس سے آگ پھیلانا مقصود ہے، اگر آپ ہوا نہ دیں تو آگ پھیلتی نہیں ہے، ایک کوئلہ سرخ ہوتا ہے لیکن وہ جل کر وہیں پر خاکستر ہو کر بجھ جاتا ہے اور ساتھ والے کوئلے میں آگ سرائیت نہیں کرتی ہے چونکہ آگ کو پھیلانے کی ضرورت ہے اور وہ ہوا ہے جو آگ کو پھیلاتی ہے، بلڈنگز (Buildings) کو آگ لگ جاتی ہے، جنگلوں کو آگ لگ جاتی ہے، یہ ہوا ہے جو آگ کو پھیلاتی ہے، یہ عمل ہم نے دیکھا ہوا ہے مخصوصاً کھانے پکانے کی ضرورت کے وقت جب آگ جلاتے ہیں تو اس کو ہوا دیتے ہیں۔

مثلاً پاکستان میں ایک فقہی مسئلہ یعنی سادہ سا نماز کا مسئلہ پھیلایا گیا ہے اور اس کو ہوا دی گئی کہ نماز میں شہادت جائز ہے یا نہیں ہے، یہ مسئلہ توضیح المسائل سے حل ہوسکتا ہے۔ سادہ مسائل کو اسی لئے سادہ کہتے ہیں کہ یہ توضیح المسائل کے ذریعے حل ہو جاتے ہیں، ان کو عدالتوں میں لے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اگر یہ مسئلہ علماء کے پاس ہوتا، فقہا کے پاس ہوتا تو مشکل نہیں تھی لیکن آپ دیکھیں کہ یہ فتنہ جب بعض لوگوں کے پاس آیا تو انہوں نے چند مہینوں کے اندر بلکہ چند ہفتوں کے اندر اس کو ایسا چھیڑا، ایسا ابھارا کہ دیکھیں اس فتنے کے شعلے کہاں تک بھڑک رہے ہیں، کچھ لوگوں میں منفی امور کو ابھارنے کی مہارت ہوتی ہے اور کچھ لوگوں میں مثبت چیزوں کو چھیڑنے کی مہارت ہے، انسان کوشش کرے کہ مثبت چیزوں کو چھیڑے، ہم بھی اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں لیکن نہ کہ فتنے چھیڑنے کی اور اختلافات کو ہوا دینے کی بلکہ علوم کو ہوا دیں، اچھے موضوعات کو ہوا دیں، اقدار کو ہوا دیں، صفاتِ کمالیہ کو ہوا دیں تا کہ یہ مثبت چیزیں لوگوں کے اندر پھیلیں۔

اختلافات کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ ان کو ہوا نہ دیں، اختلافات کو ہوا دینے سے اختلافات پھیلتے ہیں، تفرقے کو ہوا نہ دیں، ہوا دینا یعنی تفرقے کا اگر چھوٹا سا شر رہے تو اس کو شعلہ نہ بنائیں، اسے ہوا نہ دیں، اس موضوع کو نہیں چھیڑیں اور اس موضوع کو دبا رہنے دیں۔ اختلافی موضوعات کو اثارہ نہ کریں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ افراد کے درمیان کوئی سیاسی مسئلہ ہو، کوئی اختلافی مسئلہ ہو، کوئی اختلافی شخصیت ہو، کوئی اختلافی موضوع ہو یا کوئی مذہبی اختلاف ہو مثلاً اگر ٹرین میں دوسنی اور شیعہ ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں یا بس میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہاں پر کوئی اور گفتگو ہو رہی ہے

لیکن کسی نے آ کر مسئلۂ خلافت چھیڑ دیا تو وہ دوسرا آدمی کہتا ہے کہ اس موضوع کو رہنے دیں، اسے یہاں پر نہ چھیڑیں کہ اختلاف کو ہوا ملے گی اور یہ آہستہ آہستہ تفرقہ بن جائے گا، لڑائی جھگڑا ہو جائے گا اور پھر مسئلہ الجھ جائیگا لہٰذا بعض چھڑے ہوئے مسائل کیلئے کوشش ہوتی ہے کہ اس کو دبائیں اور بعض مسائل کو کہتے ہیں کہ ان کو ہوا دیں، ہوا دینا یعنی اس مسئلے کو پھیلانا یا کسی مسئلے کو اُبھارنا۔

افواہوں کو بھی ہوا دے کر پھیلایا جاتا ہے مثلاً ایک آدمی حرم جاتا ہے اور حرم میں نماز کے بعد تعقیبات کے طور پر کسی کے کان میں کہتا ہے کہ میں نے یہ بات سنی ہے اور یہ کسی کو نہیں بتانی ہے، یہ کوڈ (Code) ہے یعنی سب کو بتانی ہے، جب طلبہ میں اور عورتوں میں کہا جاتا ہے کہ یہ کسی کو نہیں بتانا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کو بتانا ہے اور وہ بھی دوسرے کو یہی کہہ کر بتاتے ہیں کہ یہ بات کسی اور کو نہیں بتانی ہے۔

بعض طالبعلموں کی صفات عورتوں سے ساتھ ملتی ہیں، ان میں سے ایک یہ صفت ہے یعنی افواہ اور شائعات پھیلانا اور وہ بھی تاکید کے ساتھ کہ اس بات کو کسی اور کو نہیں بتانا، یہ پھیلانے کا بہترین طریقہ ہے پھر آپ دیکھیں کہ یہ ایک دم پھیل جاتی ہے، تجربے کے طور پر بھی کریں کیونکہ یہ تجربہ شدہ بات ہے، اس کے لئے نئے تجربے کی ضرورت نہیں ہے، آپ خود ایک بات مذاق کے طور پر کسی سے کریں پھر آپ دیکھیں کہ وہ سنجیدہ بات بن جاتی ہے اور پھیلتی ہی جاتی ہے اور جوں جوں پھیلتی ہے اس کے اندر شدت بھی آتی جاتی ہے یعنی آپ نے دیا سلائی سے آگ لگائی تھی اور اب اس افواہ کے یا اس شائعات کے شعلے آسمان پہ لپک رہے ہیں۔

۱۰) اثارۃ الارض

بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان انہیں چھیڑے نہیں، ان کو ابھارے نہیں، انہیں اٹھائے نہیں تو وہ چیزیں خود بخود انسان کو کچھ بھی عطا نہیں کرتی ہیں جبکہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جنہیں ہمارے چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے جیسے زمین کے اندر خدا نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ موسم بہار میں یا مختلف موسموں میں وہ خود ہی کچھ نہ کچھ اگلنا شروع کر دیتی ہے لیکن بعض چیزوں کے لئے ہمیں زمین کو آمادہ کرنا پڑتا ہے، انسان کی غذا کے لئے زمین کو آمادہ کرنا پڑتا ہے لیکن حیوان کی غذا خود ہی خود زمین سے اگتی ہے یعنی ہمیں زمین کو جا کر چھیڑنا پڑتا، اکسانا پڑتا ہے، آمادہ کرنا پڑتا ہے، اس پر ہل چلانا پڑتا ہے، اس کا منہ کھولنا پڑتا ہے، اس کے اندر ایک مناسب حد تک رطوبت ایجاد کرنا پڑتی ہے پھر اس کے اندر بیج بونا پڑتا ہے اور دیگر متعدد امور زمین کے اوپر انجام دیے جاتے ہیں کہ جن کی بنا پر زمین کچھ اُگانے کیلئے آمادہ ہوتی ہے، اس کو اثارۃ الارض یا احیاء الارض کہتے ہیں۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ پانی کے ذریعے زمین کو زندہ کیا گیا ہے لیکن یہی زمین جو پانی سے زندہ ہوتی ہے جب تک انسان اس کو اثارہ نہ کرے اور اس کے اندر ثورہ ایجاد نہ کرے یعنی ابھار وا کھاڑ کر کے آمادہ نہ کرے تو زمین وہ فصلیں اگانے کے قابل نہیں ہوتی ہے کہ جو انسان کے لئے مفید ہیں اور یہ چیز ہم روزمرہ مشاہد کرتے ہیں۔ ایک کھیت انسان کو اس وقت غذا یا غلہ دیتا ہے کہ جب خود کسان جا کر اس میں زحمت کریں، محنت کریں اور اثارۃ الارض کریں۔

۱۶)ٹیکنالوجی وایجادات، ثمراتِ اثارہ

ٹیکنالوجی (Technology) اور یہ سب ایجادیں دانشمندوں اور سائنس دانوں کی مرہونِ منت ہے، ابھی ہم نے تقسیم بندی کردی ہے کہ آرٹسٹ الگ ہوگئے، ہنرمند الگ ہوگئے اور علماء الگ ہوگئے ہیں، نہیں، حقیقتاً بنیادی طور پر ایک عالم ہوتا ہی ہنرمند ہے، سب سے بڑا آرٹ ایک عالم کے پاس ہوتا ہے، ایک سائنٹسٹ (Scientist) وہی ہوتا ہے کہ جو سب سے بڑا ہنرمند ہو یعنی جس کو پتہ ہے کہ اس شے کے اندر کیا راز موجود ہے اور اس نے اس کو کشف کرلیا ہے اور یہ چھیڑنے سے کشف ہوا نہ کہ چھوڑنے سے مثلاً یہ بڑے بڑے طبیب کہ جنہوں نے جڑی بوٹیوں سے اور دوسری چیزوں سے انسانی علاج کے لئے دوائیں ایجاد کی ہیں، یہ کون لوگ تھے؟ جنہوں نے آکر ان ساری چیزوں کو چھیڑا، اگر نہیں چھیڑیں گے تو ان کے اندر سے کچھ بھی نہیں نکلے گا، ہزاروں سال سے یہ بوٹیاں اگتی آرہی ہیں، بہار میں اگتی ہیں اور خزاں میں خشک ہوجاتی ہیں، جانور ان کو چر جاتے اور انسان کو ان کی کوئی خبر نہ تھی لہٰذا ان کو چھیڑنے والا بھی کوئی موجود نہیں تھا، نتیجہ یہ تھا کہ ان کو ساری چیزوں کے راز بھی معلوم نہیں تھے، لیکن جب چند پڑھے لکھے لوگوں نے ان نباتات کو آکر اکسایا، ابھارا اور چھیڑا تو انہی پودوں نے اپنے ثمرات عیاں کرنے شروع کردیئے۔

۱۷)اثارۃ العقل، انبیاءعلیہم السلام کا مقصدِ بعثت

عقل بھی ان چیزوں میں ہے کہ اگر پڑی رہے اور کوئی اس کو نہ چھیڑے، نہ ابھارے اور نہ

اکسائے تو عقل خود ہی خود پڑے پڑے کچھ بھی نہیں کرتی ہے، ضروری ہے کہ کوئی آ کر اس دبے ہوئے خزانے کو ابھارے اور اکسائے تاکہ اس کے اندر پنہاں اسرار انسان کے لئے نمایاں ہو جائیں، اس کام کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاءؑ کو مقرر کیا ہے اور امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں انبیاءؑ کے مقاصدِ بعثت میں سے ایک عمدہ مقصد یہی بیان کیا ہے کہ

لِيُثِيرُوا فِيهِمْ دَفَائِنَ عُقُولِهِمْ.... (۸)

(انبیاءؑ اسلئے تشریف لائے) تاکہ وہ ان کی عقول کے پوشیدہ خزانوں کو ان میں ابھاریں......

ایک اور حدیثِ مبارکہ میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا کہ

وَأَنَّ الْأَنْبِيَاءَ اِنَّمَا جَاؤُوا لِيُثِيرُوا دَفَائِنَ الْعُقُولِ فِي النَّاسِ.... (۹)

بے شک انبیاءؑ اس لئے آئے تاکہ وہ لوگوں میں عقلوں کے خزانوں کو ابھاریں......

انبیاءؑ انسانوں کی دبی ہوئی عقلیں اور دبی ہوئی فطرتیں کہ جو ساکت اور جامد ہیں ان کو اکسانے اور ابھارنے کے لئے آئے ہیں۔ دفاعن یعنی مدفون عقلیں، دفائنِ عقلی یعنی خزینۂ عقلی یا عقل کے خزانے، ان کو ابھاریں، اس طرح سے کہ عقلِ انسان جوش مارے، انبیاءؑ عقل کو ختم کرنے نہیں آئے ہیں یا عقل کے خلاف کوئی چیز لے کر نہیں آئے بلکہ مخاطبِ انبیاءؑ عقل ہے اور مخاطب کو جگانا بھی انبیاءؑ کا کام ہے، مخاطب کو ابھارنا بھی انبیاءؑ کا کام ہے۔ ایک ٹھنڈا اور جامد آدمی کہ جس کے لئے ایک موضوع بیان کریں لیکن وہ اس موضوع کے لئے آمادہ نہ ہو، بھڑکا ہوا نہ ہو

تو اس کے سامنے موضوع بیان کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے بھینس کے سامنے بین بجانا ہے اور انبیاءؑ بھینسوں کے لئے نہیں آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام اس لئے آئے تھے کہ ایسے لوگ تیار کریں کہ پہلے ان کی عقل کو ابھاریں پھر ان کے سامنے قرآن پیش کریں۔

ابھری ہوئی عقل کی مثال رحم کی طرح ہے، بعض عورتیں بانجھ ہوتی ہیں، بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتی ہیں یعنی ان کے رحم میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ نطفے کو انسان بناسکیں لیکن جو بانجھ نہیں ہیں ان کے رحم میں اگر جائے تو وہ اس نطفے کو انسان بنا دیتی ہیں، اس پر غور کریں تو وہ قطرہ بھی نہیں ہوتا ہے بلکہ قطرے سے بہت کم ہوتا ہے کہ جس کو ہم نطفہ کہتے ہیں، وہ نامرئی چیز ہے اصلاً نظر بھی نہیں آتا ہے، مثلاً اس ایک اسپرم میں ایک جرثومہ ہے کہ جو آنکھ سے نظر نہیں آتا ہے، یہ نامرئی جرثومہ جب اس رحم آمادہ میں جاتا ہے کہ جس کو خدا نے بنایا ہے لیکن اس نے کیا کیا؟ اس کو انسان بنا دیا، کیسا انسان بنادیا؟ ایسا انسان کہ جس میں تمام اعضاء اور پیچیدہ ترین نظام موجود ہے اور جس کے اندر روح بھی آگئی ہے، اس رحم کے اندر کیوں بنا؟ کیونکہ یہ رحم آمادہ تھی، اسی طرح رحمِ علمی بھی ہے، انسان کا ذہن، انسان کا دل انسان کا رحم ہے، اس رحم کے اندر اگر ایک قطرہ چلا جائے، ایک اسپرم علمی چلا جائے تو وہ اس کو بہت کچھ بنا سکتا ہے اسی انسان کو مستنبط کہتے ہیں ورنہ بعض ایسے ہیں کہ جو پورا قرآن حفظ کر لیتے ہیں لیکن ایک ہدایت کا کلمہ یا ایک ہدایت کا اثر تک ان کے اندر موجود نہیں ہوتا ہے، سالہا سال درس پڑھ لیتے ہیں لیکن عملاً ہدایت حاصل نہیں کرتے ہیں، کیوں؟ اسلئے کہ بانجھ ہیں، ان کے رحم آمادہ نہیں ہیں۔

ایک بدو عرب رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ مجھے قرآن پڑھنا ہے لیکن میرے پاس وقت نہیں ہے، میں اپنی بھیڑیں چھوڑ کر آیا ہوں اور مجھے جلدی واپس جانا ہے جیسے آج کل بعض شارٹ کٹ (Short cut) مانگتے ہیں کہ یہ لمبی چوڑی باتیں، یہ توضیح المسائل، یہ رسالہ عملیہ یہ ہم سے نہیں ہوسکتا ہے بلکہ ایک شارٹ کٹ بتائیں، رسول اللہ ﷺ نے اس کو ایک شارٹ کٹ کے بجائے ایک فولڈر (Folder) بتادیا، شارٹ کٹ، شارٹ کٹ ہی ہوتا ہے لیکن فولڈر کے اندر بہت کچھ ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کو دو آیات پڑھ کر سنائیں، یہ سورۂ زلزال کی دو آیات ہیں لیکن دونوں ملا کر ایک آیہ کے برابر بھی نہیں بنتی ہیں،

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (۱۰)

پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

یہ آیات سن کر کہا کہ خدا حافظ یہی لینے آیا تھا، وہ دوسرے جو بیٹھے ہوئے تھے جو کئی کئی سالوں کے سینئر شاگرد تھے کہ جن کو ابھی تک سورۂ بقرہ یاد نہیں ہوا تھا وہ یہ دیکھ کر ہنسنے لگے کہ یہ دیکھو جاہل بدو ابھی آیا اور ایک آیہ سن کر واپس جا رہا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے لئے کافی ہے، رسول اللہ ﷺ نے جب ان کی طنز آمیز ہنسی دیکھی، ان کا خندہ دیکھا، مذحکہ دیکھا تو کیا فرمایا؟

لَقَدْ رَجَعَ الرَّجُلَ فَقِيْهًا ..... (۱۱)

کیا سمجھتے ہو؟ یہ فقیہ بن کر لوٹ کر جا رہا ہے، فقیہِ دین، فقیہِ قرآن بن کر لوٹ کر جا رہا ہے،

اگر در خانہ کس است یک حرف بس است......

یعنی اگر گھر کے اندر کوئی ہے تو اس کے لئے ایک کلمہ ہی کافی ہے، ایک مستنبط کے دل میں یہ آیات ڈال دی ہیں لہٰذا یہ ان آیات کو خود کھولے گا،

لِيُثِيرُوا فِيهِمْ دَفَائِنَ عُقُولِهِمْ......

پہلے اس کی عقل ابھاری اور پھر اس ابھری ہوئی عقل کے اندر ایک نکتہ ڈال دیا۔ الغرض تمام پیغمبر علیہ السلام و انبیاء علیہم السلام اس لئے آئے ہیں کہ لوگوں کی عقل کو ابھاریں تا کہ ان عقلوں میں پیغامِ خدا اتر جائے اور جب ان کو آسمانی پیغام پیش کیا جاتا ہے تو کوئی سلمانؓ بنتا ہے، کوئی مقدادؓ بنتا ہے اور کوئی ابوذرؓ بنتا ہے۔

۱۸) اثارۃ الناس

اسی طرح وہ امور کہ جن کو ابھارے کی ضرورت ہے اس میں سے خود لوگ بھی شامل ہیں تا کہ ان کے اندر کوئی اثر پیدا ہو، اثارہ کا اور ثورہ کا ایک میدان قومیں اور عوام ہیں، اپنی روزمرہ ضروریاتِ مادی اور طبعی کے تحت ان کے اندر بھی رکاوٹ آجاتی ہے، معاشرے کے اندر جمود اور رکود پیدا ہو جاتا ہے اور عملِ ارتقاء رک جاتا ہے، بجائے اس کے کہ لوگ معاشرے کے اندر رشد و نشو نما کریں ایک ہی حالت پر منجمد ہو جاتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں، ٹھہرا ہوا معاشرہ یعنی جس کے اندر کوئی شخصیت پیدا نہیں ہوتی ہے، جس کے اندر علوم ترقی نہیں کرتے ہیں، علوم نشو نما نہیں کرتے ہیں اور

تکامل یافتہ افراد پیدا نہیں ہوتے ہیں، ناقص افراد کمال تک نہیں پہنچتے ہیں بلکہ سب ایک ہی سطح کے اور ایک ہی درجے میں رکے ہوئے ہوتے ہیں، معاشرے کے بہت سارے نمونے اس وقت موجود ہیں، اکثر معاشرے جو مادیت کے ملبے میں دبے ہوئے ہیں کہ جن کے اندر انسانی اقدار و انسانی کمالات کی افتتاح کا عمل رُکا ہوا ہے تو یہ مغلوب اور رکے ہوئے معاشرے ہیں، اگر کوئی ان کو نہ ابھارے، نہ چھیڑے اور نہ اکسائے تو یہ خود بخود آگے نہیں بڑھتے ہیں ان کو بھی ثورہ اور اثارہ کی ضرورت ہے جیسے زمین کو ابھارنے کی ضرورت ہے تاکہ کچھ اگلے اور اگائے، اس زمین کے اندر یہ ساری چیزیں موجود ہوتی ہیں لیکن اسے اکسانے کی اور چھیڑنے کی ضرورت ہے، اسی طرح انسانوں کے اندر بہت طاقت ہے، انسانوں کے اندر بہت قوت ہے، ارتقاء کی قوت ہے، تکامل کی قوت ہے، جہالت کو ختم کرنے کی قوت ہے، باطل کو مٹانے کی قوت ہے، ظلم وستم کو ختم کرنے کی قوت ہے، یہ سب انسانی معاشرے کے اندر موجود طاقتیں اور قوتیں ہیں لیکن جب تک کوئی ان انسانوں کو ابھارے نہیں تو یہ قوتیں پڑے پڑے ختم ہو سکتی ہے لہٰذا انسانوں کو بھی اثارہ کی ضرورت ہے۔

امام خمینیؒ میں یہ مہارت و تخصص تھا کہ وہ لوگوں کو ابھارنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ ٹھنڈا برف زدہ معاشرہ، یخ زدہ معاشرہ کہ جس کے اوپر تہہ لگی ہوئی تھی، یخچال گلیشئر (Glacier) بنے ہوئے تھے وہ سارے امام خمینیؒ نے اس طرح سے پگھلائے کہ ایک بحرِ بیکراں کی شکل اختیار کر گئے اور اس ٹھنڈے اور منجمد معاشرے کو امامؒ نے متحرک معاشرہ بنا دیا، یہ ثورہ ہے یہی انقلاب تھا اور یہی اثارۃ الناس تھا۔

اس کام کے لئے بھی خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاءؑ کو مامور کیا، اولیاءؑ کو مامور کیا اور ائمہ اطہارؑ کو مامور کیا، ان کا اساسی کام یہی تھا کہ لیثیر و الناس یعنی لوگوں کو ابھاریں، جس طرح سے خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاءؑ کو مبعوث کیا، انبیاءؑ کا کام بھی معاشروں کو مبعوث کرنا ہے، ابھارنا ہے اور تکامل کے لئے تیار کرنا ہے ورنہ معاشرے رک جاتے ہیں، ان کے اندر رکود وجمود آجاتا ہے اور تکامل کی طرف ان کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔

ابوذرِ غفاریؓ صحابیٔ رسول ﷺ نے کتنے سال درس پڑھا؟ حوزوں میں کتنے سارے ابوذر نامی طلبہ بھی ہوں گے کہ جنہوں نے پندرہ سال پڑھا ہوگا لیکن ابوذر غفاریؓ نے کتنے سال درس پڑھا؟ ابوذرؓ نے چند منٹ میں یہ درس پڑھا، یہ انبیاءؑ کا کام ہے۔

انبیاءؑ ہماری طرح ٹھنڈے لوہے پہ چوٹ نہیں لگاتے ہیں، ہم ہر سال تبلیغ کے لئے جاتے ہیں اور خود ہی زخمی ہو کر آجاتے ہیں چونکہ ٹھنڈے لوہے پہ جب چوٹ لگتی ہے تو وہ واپس اپنی پیشانی پہ آکر لگتی ہے، خود مایوس ہو کر آتے ہیں کیونکہ ٹھنڈے لوہوں پر چوٹ لگاتے ہیں، انبیاءؑ پہلے لوہا گرم کر دیتے تھے، لوہا گرم کرنا یعنی عقل کو ابھارنا، دل کو ابھارنا، دل جب ابھر جائے تو پھر ایک نکتہ ہی کافی ہے۔

اگر در خانہ کس است یک حرف بس است

یعنی اگر گھر کے اندر کوئی ہے تو اس کے لئے ایک کلمہ ہی کافی ہے، اگر کوئی بھی نہیں ہے تو بیشک آپ پوری تقریر جھاڑ دیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پہلے رسول اللہ ﷺ نے دلِ ابوذرؓ کو ابھارا،

وہی کام جو خدا نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا وہی کام رسول اللہ ﷺ نے ابوذرؓ کے ساتھ کیا،

خداوند تعالیٰ نے رسول ﷺ کے ساتھ کیا کیا؟ مبعوث کیا،

بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا...... (۱۲)

بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا...... (۱۳)

بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا○ (۱۴)

خدا نے بعث کیا یعنی ابھارا، اللہ نے رسول ﷺ کو اس طرح سے اٹھایا کہ پھر اس رسولؐ کو دنیا کی کوئی طاقت بٹھانے پہ قادر نہ ہوسکی اور یہی ابوذرؓ کے ساتھ ہوا، ابوذرؓ کو رسول اللہ ﷺ نے چند منٹ میں اس طرح ابھار دیا کہ دنیا کی کوئی طاقت قادر نہیں تھی کہ ابوذرؓ کو چپ کرا سکے، ابوذرؓ کے اسلام لانے سے پہلے مسلمان موجود تھے لیکن ابوذرؓ نے جوں ہی سیکھا کہ اشھد ألا الـٰـه الا اللہ تو فوراً جا کر کعبہ کی دیوار کے ساتھ کہ جہاں لوگ سنگسار کرنے کے لئے تیار تھے وہیں بانگِ دہل کہا أشھد ألا الـٰـه الا اللـّٰـه، پانچ منٹ کے درس نے ابوذرؓ کو کیا بتایا گیا اور پھر خلافت کی پوری مشینری (Machinery) استعمال کی گئی، طاقت صرف کی گئی، جلاوطن کیا گیا، سزائیں دی گئیں اور ابوذرؓ کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا؟ لیکن ابوذرؓ کو خاموش نہیں کرا سکے۔

اکسانا یعنی درد پیدا کرنا، درس اگر درد پیدا کرے تو خوب ہے لیکن اگر درس ٹھنڈا کر دے تو خوب نہیں ہے، علامہ اقبالؒ کو مدرسوں سے یہی شکوہ تھا کہ مدرسے درد پیدا نہیں کرتے ہیں بلکہ گلا دبا دیتے ہیں،

اقارۃ الناس

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا

کہاں سے آئے صدا الا الـــہ الا اللہ ......(۱۵)

گلا گھٹا ہوا ہو تو اس سے صدائے لا الـــہ الا اللہ نہیں آتی ہے، مدرسے کا کام درد پیدا کرنا ہے، انسان دردمند ہو، امام خمینیؒ کے اندر وہی درد تھا، انسان کو درد اٹھاتا ہے درس نہیں اٹھاتا ہے اور اسی کو ثورہ کہتے ہیں، درد کس طرح اٹھاتا ہے؟ دانت میں درد ہو تو پھر بیٹھنے دیتا ہے؟ سونے دیتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ پھر وہ انسان کو تگنی کا ناچ نچاتا ہے، یہ دانت کا درد ہے اور دانت کا درد جسمانی درد ہے الٰہی درد نہیں ہے، اگر الٰہی درد پیدا ہو جائے، بشریت کا درد پیدا ہو جائے تو پھر انسان نہیں بیٹھ سکتا ہے، اس دل کو کوئی بٹھا نہیں سکتا ہے، ممکن نہیں ہے کہ کوئی طاقت اس کو بٹھا سکے، چاہے اس کے قتل کے منصوبے بنائے، اسے ڈرائے، دھمکائے، لالچ دے، جو کچھ بھی کرے لیکن اس کے درد کو تسکین نہیں ملتی ہے۔ ابوذرؓ میں وہی برانگیختگی پیدا ہوئی، ثورہ پیدا ہوا، اب اس ابوذرؓ کو ایک آیۂ قرآن پڑھ کر سنائیں تو اس کے لئے کافی ہے۔

۱۹) اثارۃ القرآن کی ضرورت

آج سب سے بڑھ کر ضرورت یہ ہے کہ آئیں اور قرآن کے اوپر اپنی طاقت آزمائی کریں۔ اثارۃ القرآن کی شدید ضرورت ہے وَ اِلّا پڑے پڑے انسان کو کچھ بھی نصیب نہیں ہوتا ہے۔ یہ کام مستنبط انسان کر سکتا ہے، فارسی میں اس کے لئے شوراندن کا لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی کسی

کو برانگیختہ کرنا، ابھارنا، اکسانا، اس کے اندر ایک ایسی حالت ایجاد کرنا کہ جس طرح سے آتش فشانی حالت ہوتی ہے، اس کے اندر ابھار پیدا ہو۔

قرآن ہمارے پاس موجود ہے لیکن جب تک قرآن کو ابھارنے والے، اکسانے والے اور قرآنی مسائل اور مطالب کے اسرار کو چھیڑنے والے نہ ہوں تو خود ہی خود قرآن اپنے خزانے باہر نہیں نکالتا ہے یعنی قرآن کے خزانے چشمے کی طرح خود ہی نکل کر باہر نہیں آتے ہیں کہ جب تک کوئی قرآن کو چھیڑے نہیں۔ لوگوں کے اندر قرآنی موضوعات چھیڑیں، چھیڑنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کے اندر اپنی تفسیر بالرائے شروع کردیں، البتہ یہ الگ موضوع ہے کہ تفسیر بالرائے کے کیا معانی ہیں، ہمیں قرآن کے اوپر اپنی بات ٹھونسنی نہیں ہے، قرآن کے اوپر تحمیل نہیں کرنا ہے، قرآن کو اپنے کسی مفاد پر تطبیق بھی نہیں کرنا ہے بلکہ ان سے پرہیز کرنا ہے، چھیڑنے سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ قرآن کو اپنے مدعا پر تطبیق کرنا شروع کردیں یا قرآن کے اندر معاذ اللہ تحریف شروع کردیں، یہ کام قرآن کے ساتھ نہیں کرنے ہیں بلکہ ان سے اجتناب کرنا ہے، اس سے مراد موضوعاتِ قرآن کو ابھارنا ہے تا کہ یہ معاشرے کی عام گفتگو کے موضوع بن جائیں، گھر گھر میں قرآنی موضوع پر بحث ہو رہی ہو، مثلاً گلی محلے میں جب لوگ بات کر رہے ہوتے ہیں تو چھیڑا ہوا موضوع وہی ہوتا ہے کہ اخباروں میں بھی اسی پر گفتگو ہو رہی ہوتی ہے، گھروں میں بھی اسی پر گفتگو ہوتی ہے، دسترخوان پر بھی اسی پر گفتگو ہوتی ہے، بس، اڈے، چوک اور حتیٰ ٹیلیفون پر بھی اسی پر گفتگو ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ لوگ جو ایک دوسرے کو فضول ٹیلیفون کرتے ہیں اور کوئی بات نہیں بنتی ہے تو فقط کہتے ہیں اور سناؤ، اگر کوئی

موضوع چھڑا ہوا ہو تو فوراً اسی موضوع پر آجاتے ہیں کہ یہ موضوع جو آج کل جاری ہے اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

موضوعِ قرآنی اگر چھڑے ہوئے ہوں تو اسی پر ایس ایم ایس (SMS) کریں، اسی پر ٹیلیفون کریں اور ظاہر ہے کہ چھڑے ہوئے موضوع پر دوسرے بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب ہم ایک موضوع چھیڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سب مجبور ہوتے ہیں کہ اس موضوع پر سوچ بچار کریں، سب لوگ اس موضوع پر کہنے اور سننے کے بارے میں مجبور ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب اتنے لوگ مل کر ایک موضوع پر سوچیں بھی، کہیں بھی اور سنیں بھی تو خوانخواہ یہ موضوع لوگوں کو زیادہ فائدہ دیتا ہے اور یہ موضوع بھی پختہ تر ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس موضوع پر سوچ بچار کرنے کیلئے باصلاحیت اور بااستعداد لوگ بھی ہوتے ہیں، اہلِ فضل اور اہلِ علم بھی ہوتے ہیں، اہلِ درایت اور اہلِ تحقیق بھی ہوتے ہیں، وہ جب اس موضوع کو لے کر آگے بڑھتے ہیں تو اس کے اچھے ثمرات آتے ہیں، ممکن ہے کہ کوئی اس موضوع پر اچھی تقریر کردے، کوئی اچھا مقالہ لکھ دے، کوئی اچھی کتاب لکھ دے، اسی موضوع کے بارے میں ممکن ہے کہ کوئی اچھا کام ہو جائے، چھڑے ہوئے موضوعات کے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے صدرالمتالہین" فرماتے ہیں کہ استنباط یعنی قرآنی موضوعات کو ابھارنا، چھیڑنا، پھیلانا، ہوا دینا اور ان کے پیچھے لگ جانا، ان کے تعلقات و روابط و لوازمات کو کشف کرنا اور پھر اس کا نتیجہ لے کر اپنے لئے اور لوگوں کیلئے بیان کرنا اشد ضروری ہے۔

۲۰)قرآنی موضوعات کے احیاء کیلئے مہارت کی ضرورت

قرآنی موضوعات کو چھیڑنے، ہوا دینے اور ابھارنے کے لئے مہارت کی ضرورت ہے تا کہ وہ موضوع پہلے خود انسان کے اندر چھڑے، خود میرے اندر مسئلہ اٹھے، سوال بن کر اُبھرے تا کہ میں اس کی جستجو میں لگوں، میں اس کے بارے میں سوالات اٹھاؤں اور پھر ان سوالات کو جوابات میں تبدیل کروں، پھر اسکے بارے میں تحقیق کروں، انسان کے اندر ابھرا ہوا موضوع، چھڑا ہوا موضوع کہ جس کے بارے میں انسان کو الجھن ہوتی ہے اور جو انسان کا ہم و غم بن جاتا ہے تو پھر وہ اس مسئلے میں اپنے لئے اور دوسروں کیلئے جستجو کرتا ہے۔ یہ کام مستنبط انسان کرسکتا ہے، یہ تخصص اور مہارت صدر المتألھین کے اندر موجود ہے یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ طباطبائیؒ ہیں، اگر دو چار افراد کے نام لئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی اور نہیں ہیں، بہت سارے بزرگان ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں یہ کمال کیا ہے، انہوں نے بعض معارف کو چھیڑا ہے، ہوا دی ہے، ان مسائل کو اور ابھارا ہے، موضوع کے قابل اور بحث کے قابل بنایا ہے اور پھر دوسرے علماء نے آ کر ان کے بارے میں بحث و گفتگو کی ہے۔

قرآنی علوم کو اور قرآنی معارف کو ابھارنے کی ضرورت ہے یعنی شعبۂ قرآن سے متعلق ایسے متخصص اور ماہرین آئیں کہ جو آ کر معارفِ قرآن کو چھیڑیں۔ قرآنی معارف کو ہوا دینے کی ضرورت ہے یعنی علمی ہوا دینے کی ضرورت ہے نہ کہ پنکھے کی کہ قرآن سامنے رکھ کر اس کو پنکھا جھلکتے رہیں یا فقط قرآن سے ہوا جھلتے رہیں اور کہیں کہ قرآنی موضوعات کو ہوا دے رہے ہیں، قرآنی

موضوعات کو ہوا وہ دے سکتے ہیں کہ جو معارفِ قرآنی میں مہارت رکھتے ہوں، جو قرآن کے ساتھ اُنس رکھتے ہوں، جن کا قرآن کے اندر تخصص ہو اور بہت سارے لوگوں نے یہ کام کیا ہے، خود صدرالمتالھین ؒ کہ جن کی کتاب کا متن ہم اس کتاب میں وقتاً فوقتاً ملاحظہ کر رہے ہیں اور یہ آدابِ قرآن ان کی کتاب سے درج کر رہے ہیں چونکہ مفاتیح الغیب قرآنی علوم کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی ہے، انہوں نے یہ کام کیا ہے، اتفاقاً ایک تخصص اس بزرگوار ہستی کو یہ بھی حاصل تھا کہ انہوں نے بہت سارے معارف کو چھیڑا ہے، ابھارا ہے کہ جو دوسروں کے ہاں فراموش شدہ اور مفقود تھے اور ان کے بارے میں کوئی بحث و گفتگو نہیں ہوتی تھی۔

مرحوم علامہ طباطبائی ؒ نے معارفِ قرآنی کو ایک مستنبط کے طور پر ابھارا ہے اور معارفِ قرآنی کو پیش کیا ہے لیکن چونکہ ہمارا معاشرہ قرآنی معاشرہ نہیں ہے تا کہ یہ بحثیں پھر سے چھڑ جائیں، علمِ اصول کی ایک بحث چھیڑیں تو فوراً چھڑ جاتی ہے، فقہ کی باتیں چھیڑیں تو وہ بھی چھڑ ہی جاتی ہیں لیکن قرآن کا کوئی موضوع چھیڑیں تو وہ نہیں چھڑتا ہے، یہ اتنا ٹھنڈا ہے کہ اس کو مثلاً آپ بہت بڑے ٹربائن (Turbine) کے ذریعے بھی ہوا دیں تو بھی اصلاً اس کے اندر یہ ہوا نہیں پھیلتی ہے اور دوسروں تک سرائیت نہیں کرتی ہے، جب ہم سنتے ہیں کہ قرآن کہ بارے میں فلاں نے یہ گفتگو کی ہے، یہ اظہارِ نظر کیا ہے تو لوگ اس کو لے کر آگے نہیں بڑھتے ہیں۔

پس قرآن کو اثارہ کی ضرورت ہے، نہیں ابھاریں گے، نہیں اکسائیں، نہیں چھیڑیں گے تو قرآن آپ کو کچھ بھی نہیں دے گا جیسے زمین کو چھیڑنے کی ضرورت ہے تا کہ فصل اگ جائے، اگر

زمین کو نہیں چھیڑیں گے تو کچھ بھی نہیں ہوگا، جانوروں کے لئے گھاس اگ آئے گی لیکن آپ کے لئے کچھ بھی نہیں ہوگا، جب تک آپ زمین میں ہل نہیں چلائیں گے، جب تک آپ اس میں اثارہ و ثورہ ایجاد نہیں کریں گے۔ لہٰذا اگر کوئی موضوعاتِ قرآن کو چھیڑے تو یہ تخصص اور فن کسی کے پاس ہونا چاہئے۔

عالم بنیادی طور پر اسی ہنر مند انسان کا نام ہے کہ جو چھیڑنا جانتا ہو، عالمِ قرآنی اسی کو کہتے ہیں کہ جو قرآنی معارف کو چھیڑ سکتا ہو، اپنے اندر بھی چھیڑ سکتا ہو اور معاشرے کے اندر بھی چھیڑ سکتا ہو اور قرآنی معارف کے اندر سے پنہاں اسرار کو اور حکمتوں کو باہر نکال کر انسانی ہدایت کے لئے آمادہ کر کے پیش کر سکتا ہو، وہ اس کے دونوں کام جانتا ہو، پہلے قرآن سے حکمت کو نکالے، نبط کرے، استنباط یعنی اس بحرِ قرآن کے عمق سے اور اس کی تہہ سے ان جواہر و گوہر کو باہر نکالے اور نکال کر پھر ایک اچھے بیان کے ساتھ اور ایک مناسب انداز میں لوگوں کے سامنے پیش بھی کرے اور ایسی مثالیں فراواں ہیں۔

اگر ایک مستنبط انسان کی مثال دی جائے تو شہید مطہریؒ کی مثال ہے کہ کس خوبصورتی سے یہ انسان دینی معارف کے اندر اترا اور اس نے دینی موضوعات کو چھیڑا، اس انسان نے چھیڑ کر خوبصورتی سے وہ حقائق اور حکمتیں نکالی اور نکال کر اپنی نسل کے لئے پیش کیں، پہلے اپنی نسل کو دیکھا، اتفاقاً شہید مطہریؒ نے فرمایا کہ میں نے دو آنکھوں سے دو چیزیں دیکھیں، جب میں نے اس زمانے میں رائج دینِ اسلام پر نگاہ ڈالی تو مجھے اسلام کا ایک عجیب چہرہ نظر آیا اور پھر جب میں نے

اپنی موجودہ نسل پہ نگاہ ڈالی تو مجھے اس کا عجیب تر چہرہ نظر آیا، پھر اس کے بعد اس شخصیت نے اسلام کے اندر، دین کے اندر غواصی کی اور دین کی گہرائی میں اتر کر استنباط کیا لہٰذا یہ مستنبط انسان ہے، یعنی انہوں نے بحرِ دین سے قیمتی گوہر نکالے اور نکال کر ایک خوبصورت بیان کے ساتھ اپنی نسل کو پیش بھی کئے لہٰذا بہت ساری چیزیں شہید مطہریؒ سے پہلے چھڑی ہوئی نہیں تھیں، شہید مطہریؒ نے ان موضوعات کو چھیڑا، دوسروں نے آ کر بعض کو جاری رکھا اور بعض کو جاری بھی نہیں رکھ سکے، ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی شخصیت پیدا ہو کہ جو ان موضوعات کو آگے بڑھا سکے اور اگلے مرحلے میں ان کو داخل کر سکے، ظاہر ہے کہ پہلا کام پہلا کام ہوتا ہے، تکمیل دوسرے کرتے ہیں۔

شہید مطہریؒ نے اس نسل کے لئے پہلا قدم اٹھایا اور ظاہر ہے کہ اسی نسل میں کچھ اور لوگ ہوں کہ جو اس کام کو اگلے مرحلے میں داخل کریں۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ جب انسان معارفِ دینی کو چھیڑنے جاتا ہے، استنباط کرنے جاتا ہے اور وہاں سے اپنی ہدایت کا سامان دریافت کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن کے اندر فراواں علوم اور فراواں موضوعات موجود ہیں لیکن اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ میں ترجیحات کی بنیاد پر اور پھر ترتیب کے ساتھ استنباط کروں، آخری چیز پہلے دن استنباط نہ کروں اور پہلی چیز آخری دن کے لئے نہ رکھ دوں اور یہ ہوتا بھی ہے کہ بعض پڑھتے ہیں لیکن بے ڈھنگا پڑھتے ہیں، آخری کتاب کا پہلے دن مطالعہ کرتے ہیں اور پہلی کتاب کا آخری دن، جب فارغ التحصیل ہوتے ہیں تو ان کو یاد آتا ہے کہ کتاب الامثلہ بھی پڑھنی تھی، صرف بھی آنی چاہئے، صرف کے بغیر تو مولانا نہیں ہوں لہٰذا پہلے دن پہلی چیز پڑھے اور آخری دن آخری چیز پڑھے، اسفار پہلے دن کی

کتاب نہیں ہے، امثلہ سے شروع کریں اور اسفار آخری دن پڑھیں یعنی ترتیب کے ساتھ پڑھیں۔

قرآن میں اہم ترین علوم تین چیزیں ہیں کہ جو معارفِ قرآنی کو چھیڑنے سے حاصل ہوں گی ایک احکام یعنی احکامِ الٰہی، دوم نظام یعنی نظامِ الٰہی اور سوم علوم، اگر قرآنی موضوعات چھڑ جائیں تو یہ تین چیزیں تحفہ ہیں، یہ ہر نسل کیلئے قرآن کا ہدیہ ہیں، جو نسل بھی قرآن کو چھیڑ دے گی تو قرآن اسے یہ سب کچھ عطا کردے گا کیونکہ قرآن کے پاس اتنا ذخیرہ موجود ہے۔

۲۱) اثارۂ قرآن نہ کرنے کا نقصان

عموماً اگر سادہ سا ساز دیکھیں کہ جس کو ستار یا گٹار کہتے ہیں، پہلے کسی زمانے میں چھوٹا تھا تو دیکھتا تھا کہ انہوں نے سادہ سا ساز بنایا ہوتا تھا، کدو میں سوراخ کر کے اس کے اندر ڈنڈا لگا کر پھر اسکے ساتھ تاریں جوڑ کے انہوں نے سادہ سا ایک گھریلو ساز بنایا ہوتا تھا، یہی صنعتی دنیا میں آکر ذرا ماڈرن (Modern) ساز بن گیا ہے لیکن اس کا بنیادی فارمولا ایک ہی ہے، یہ تاریں اگر کسی گھر میں اسی طرح سے رکھی رہیں کہ جیسے ڈیکوریشن پیس (Decoration piece) کے طور پر لوگ نے ابھی گھروں میں ساز لٹکایا ہوتا ہے، ساز کا ماڈل یا خود ساز کا آلہ، بعض مومنین کے گھروں میں جائیں تو ظاہر ہے کہ روح کی غذا ہے، مومنین کو بھی روح کی غذا چاہئے بالآخر مومنین نے گھروں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر یہ ساز لٹکایا ہوتا ہے، اس میں غور کریں کہ اگر یہ ساز اسی طرح سو سال تک بھی گھروں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر سجا رہے اور کوئی بھی اس کے تاروں کو نہ چھیڑے تو اس میں

سے کوئی آواز نہیں نکلتی ہے، سوسال پہلے یہ دادا یا نانا نے خرید ا تھا، باپ کو بجانا نہیں آتا ہے پھر پوتے کو بھی نہیں آتا ہے لیکن انہوں نے ڈیکوریشن پیس اور نانا جان کی نشانی کے طور پر رکھا ہوا ہے، یہ ساز خاندانی وراثت ہے۔

سوسال سے اس میں آواز پیدا نہیں ہوئی ہے، کوئی نغمہ، کوئی سُر پیدا نہیں ہوا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ ٹھہرا ہوا اور رکا ہوا ساز ہے، اس کو کسی نے چھیڑا نہیں ہے حتیٰ اگر کسی بچے کا ہاتھ کھیلتے کھیلتے بھی اس تار پر لگ جائے تو وہیں سے ایک آواز پیدا ہو جاتی ہے، ساز وہ ہیں کہ جن کو چھیڑنے سے نغمے پیدا ہوتے ہیں، ساز ان تاروں کے اندر ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی انہیں نہیں چھیڑے تو ہزار سال تک یہ ساز خاموش ہی رہتے ہیں، سازوں کو خدا نے بہت صَبُور بنایا ہے البتہ اگر خدا نے بنایا ہو تو بہت صبور ہے، یہ کبھی بھی اپنے راز نہیں اگلتے ہیں، جو سازوں کو نہیں چھیڑتے ہیں ان کے لئے ساز اپنا کوئی راز نہیں اگلتے ہیں لیکن جو سازوں کو چھیڑنے کا فن جانتے ہیں، بڑے بڑے ماہر موسیقار گزرے ہیں، ایک سے ایک بڑا موسیقار، بڑے موسیقار ہونے کی علامت کیا ہے؟ کہ جو سازوں کو زیادہ مہارت سے چھیڑ کر سازوں کی صدا اور سوز کو زیادہ نکال سکتا ہے، اسی کو موسیقی دان کہتے ہیں، بعد میں یہ عیاشوں کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں اور اس سے وہ لہو ولعب وطرب ودھمال شروع کر دیتے ہیں لیکن موسیقار کو کبھی بھی آپ نے دھمال ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا، جو علومِ موسیقی کے ماہر ہیں، علومِ موسیقی کے ماہر کون لوگ ہیں؟ جو جانتے ہیں کہ موسیقی کے اندر یا سازوں کے اندر، تاروں کے اندر نخفتہ نغمے کونسے ہیں؟ اور ان نغموں کو چھیڑنے کا طریقہ جانتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھاتے

اشارۂ قرآن تدبر کرنے کا نقصان

ہیں، یہ استادِ موسیقی ہو جاتے ہیں اور اس وجہ سے آپ دیکھیں کہ کتنے خوبصورت ترنم سے پڑھتے ہیں، ظاہر ہے کہ سُریں تو اچھی ہوتی ہیں، گانے کے اوپر سُریں لگاتے ہیں، ہمیں تو سُر اچھی لگتی ہے اور اس کو قصیدے اور نوحے پر منتقل کر دیتے ہیں لیکن چاشنی تو اس کے اندر وہی رہتی ہے، یہ ہنر کس نے دکھایا؟ یہ ہنر اسی نے دکھایا کہ جس کو اس ساز کے اندر موجود یا اس تار کے اندر موجود راز کا پتہ ہے اور انہوں نے اسے چھیڑا اور اسکا طریقہ بتایا، اگر ان کو نہ چھیڑیں تو ہزاروں سال بھی یہ ساز خاموش پڑے رہیں گے اور کچھ بھی نہیں کہیں گے۔

انسان اگر قرآن کو نہ چھیڑے تو ہزاروں سال رکھا رہے گا اور کچھ بھی نہیں کہے گا، اگر پوری نسل کے اندر کسی کو قرآن چھیڑنے کا طریقہ نہیں آتا ہے تو قرآن ہزار سال خاموش بیٹھا رہے گا اور کچھ بھی نہیں دے گا لیکن اسی نسل کے اندر ایک ایسا شخص پیدا ہو جائے کہ جس کو قرآن آجائے تو قرآن خود اس کا راہنما بن جاتا ہے اور اپنے ثمرات دینا شروع کر دیتا ہے۔

۲۲)قرآن گفتگو کرتا ہے

امیر المومنین علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ قرآن بولتا ہے، تنطق کرتا ہے،

ذٰلِکَ الْقُرْآنُ فَاسْتَنْطِقُوْهُ......(۱۶)

یہ قرآن (اللہ کا کلام) ہے پس تم لوگ اس کے بولنے اور نطق کو طلب کرو......

قرآن کو استنطاق کرو، استنطاق یعنی اسے بولنے پر مجبور کرو، قرآن کیسے بولے گا؟ اس کو

چھیڑو، مثلاً آپ کسی گھر میں جاتے ہیں تو وہاں شرمیلا بچہ ہوتا ہے، والدین اس سے کہتے ہیں کہ جاؤ آغا کو سلام کرو، وہ سلام کرنے آتا ہے تو بیچارے کی نہ آواز نکلتی ہے، نہ آنکھیں کھلتی ہیں اور جھجکتا ہوا، شرماتا ہوا آتا ہے لیکن اگر مہمان بچے کو چھیڑنے کا طریقہ جانتا ہو، بعض مہمان ایسے ہوتے ہیں کہ بچے کی شرم دیکھ کر مہمان کو بھی شرم آنا شروع ہو جاتی ہے لیکن بعض بچوں سے جلدی مانوس ہو جاتے ہیں، شرمیلا بچہ آئے تو ایک منٹ میں اس بچے کی ساری شرم وحیا دور کر کے اس کے ساتھ آزادی سے ہم کلام ہو جاتے ہیں یعنی بچوں کو چھیڑنا، اگر آپ بچے کو نہیں چھیڑ سکتے ہیں تو آپ جتنی دیر بھی گھر میں رہیں گے وہ بھی کسی کونے میں چھپا کھڑا رہے گا لیکن اگر آپ بچے کو چھیڑنے کا طریقہ جانتے ہیں اور پھر بچے کو چھیڑیں گے تو وہ ایک دم آپ کے ساتھ باتیں بھی کرنے لگے گا اور آپ سے مانوس بھی ہو جائے گا۔

اس موضوع کیلئے بہت میدان ہیں، صرف استنباط کا مطلب سمجھانے کیلئے کہ استنباط کا معنی چھیڑنا ہے فراواں مثالیں ہیں مثلاً موضوع چھیڑنا ہے، زمین کو چھیڑنا ہے، چھیڑ کے اس چیز کے اندر پنہاں چیز کو باہر نکالنا ہے، زمین کے اندر گنجِ نخفتہ موجود ہیں لیکن جو چھیڑنا جانتے ہیں انہوں نے نکال لئے ہیں۔

حوالہ جات

(۱)......(التفسیر و المفسرون)(پیام امام امیرالمؤمنین علیہ السلام)(بهج الصباغة فی شرح نهج البلاغة)

(۲)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ ۷۹)

(۳)......(بانگِ درا، حصۂ سوم، عنوان: طلوعِ اسلام، صفحہ ۲۶۸)

(۴)......(دیوان حافظ شیرازی، از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی، کلام ۱۴۳، صفحہ ۱۱۲)

(۵)...... (ترجمہ نهج البلاغہ - انصاریان)(بهج الصباغة فی شرح نهج البلاغة)(تمام نهج البلاغة)(تصنیف نهج البلاغة)(شرح نهج البلاغة- المقتطف من بحار)(شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحدید)(منهاج البراعة- الراوندی)(قرآن در آیینہ نهج البلاغہ)

(۶)......(نظرات معاصرة فی القرآن الکریم)(اتجاهات التفسیر فی القرن الرابع عشر، الجزء ۱، ۳۶۹)(الاتقان فی علوم القرآن، الجزء ۴، صفحہ ۲۲۶)(البرهان فی علوم القرآن)(التفسیر و المفسرون، الجزء ۲، صفحہ ۲۶۳)(البرهان فی علوم القرآن، الجزء ۲، صفحہ ۱۵۴)

(۷)......(بحار الانوار، الجزء ۶۷، صفحہ ۲۴۹)(جامع الخبار، الجزء ۱۲، صفحہ ۱۰)(الرواشم السماویة، الجزء ۱، صفحہ ۱۷۶)

(۸)......(شرح نهج البلاغہ - جعفری)

(۹)......(مبانی نقد متن الحدیث)

(۱۰)......(سورہ مبارکہ زلزلہ، آیہ ۸، ۷)

(۱۱)......(تفسیر نور الثقلین)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ جمعہ، آیہ ۲)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ آل عمران، آیہ ۱۶۴)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ ۴۱)

(۱۵)......(بالِ جبریلؑ، کلام ۲۳، صفحہ ۴۶)

(۱۶)......(الانسان الکامل فی نهج البلاغة، الجزء ۲، صفحه ۱)(بهج الصباغة فی شرح نهج البلاغة)(پیام امام امیر المؤمنینؑ)(ترجمه نهج البلاغه - انصاریان)(قرآن در نهج البلاغه)(قرآن در آیینه نهج البلاغه)(مهدیؑ منتظر در نهج البلاغه)(شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحدید)

فصلِ ادبِ پنجم

﴿استنباط﴾

(حصّہ سوم)

۱)قرآنی موضوعات کا اشارہ، نظم و ترتیب کے ساتھ

۲)توحید،قرآن کا بنیادی موضوع

۳)معرفتِ خدا ایک حد تک مقدور ھے

٤)اسماء اللّٰہ،معرفتِ خدا کا پھلا باب

☆آیات کے آخر میں اسماء اللّٰہ کی حکمت

☆دعائے جوشن،خزانۂ اسماء اللّٰہ

٥)افعالِ الٰھی،معرفتِ خدا کا دوسرا باب

☆فعلِ الٰھی سے مراد

٦)افعالِ الٰھی کے دو چھرے

۷)بابصیرت انسان کی دید

۸)کتابِ تکوینیٔ خدا کی تفسیر کی ضرورت

۹)فعل سے فاعل کا استنباط

۱۰)کوئی شے خدا کے مقابلے میں نھیں

۱۱)اشیاء کی حقیقی دید کی ضرورت

۱۲)فیضِ اقدس اور فیضِ مقدس

۱۳)باطل الوجود اورباطل الذات کا مطلب

۱)قرآنی موضوعات کا اشارہ، نظم و ترتیب کے ساتھ

صدر المتألہینؒ کا اس بات پر اصرار ہے کہ قرآن کی آیات سے علوم کو استنباط کیا جائے۔آیاتِ قرآن نے بہت سارے علوم کی طرف راہنمائی کی ہےلیکن انسان قرآن کی بارگاہ میں جائے تو ابتدائی موضوعات کو پہلے چھیڑے یا پہلے وارد ہو چونکہ قرآنی موضوعات کے اندر ترتیب ہے،ایک موضوع کو چھیڑیں تو اس موضوع کے اندر دوسرا موضوع موجود ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو اس طرح سے تدوین کیا ہے، الگ الگ کتابیں نہیں ہیں، پہلے ہمارے بہت سارے علوم اسی طرح سے تھے مثلاً فلسفے کے اندر بہت سارے علوم موجود تھے لیکن آہستہ آہستہ علوم نے بغاوت کی اور اعلانِ آزادی کر دیا،اب ان علوم کا فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں ہے مثلاً ریاضیات پہلے فلسفہ میں تھی،طبیعات یا فزکس (Physics) یہ کسی زمانے میں فلسفی علوم تھےلیکن آہستہ آہستہ ان کو استقلال حاصل ہوا۔

حوزوی علوم میں منطق جزوِ فلسفہ تھا لیکن اس نے بھی اعلانِ آزادی کر دیا،علمِ اصول جزوِ علمِ فقہ ہے،مقدماتِ علمِ فقہ میں سے ہے، یہ اصالی علم نہیں ہے بلکہ ایک ضمنی علم ہے جو کہ ہمیں فقہ پڑھنے کے لئے چاہئےلیکن علمِ اصول نے سب سے زیادہ بغاوت کی اور فقہ سے بھی زیادہ ترقی کی، اب فقہ کی کتاب چھوٹی ہوتی ہے اور اصول کی کتاب بڑی ہوتی ہے، اس طرح سے ہر علم نے اپنا اعلانِ استقلال کیا لیکن ابھی قرآن میں ایسا اتفاق رونما نہیں ہوا ہے کہ قرآنی موضوعات نے بھی اعلانِ استقلال کیا ہو، جس طرح خداوند نے ان کو ترتیب دیا تھا یہ ویسے موجود ہیں یعنی ایک علم

ہے، اس علم کو آپ کھولیں تو اس کے اندر علمِ دیگر ہے، پھر اس علم کو بھی کھولیں تو اس کے اندر علمِ دیگر ہے، اسی طرح انسان تہہ بہ تہہ قرآنی موضوعات کے اندر اترتا جاتا ہے اور یہ اس آیہ میں بھی موجود ہے کہ

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا......(۱)

اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے......

یہ راستے انہیں کس طرح بتائے جائیں گے؟ آپ پہلے کمرے میں آئیں، پہلے کمرے میں ہی ایک دروازہ دوسرے کمرے کے لئے کھلتا ہے لیکن بعض باہر کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ نہیں سارے کمروں کی چابیاں ہمارے پاس ابھی ہونی چاہئیں، یہ نہیں ہوسکتا ہے، پہلے کمرے میں جاؤ وہاں آپ کو دوسرے کمرے کی چابی دے دی جائے گی پھر دوسرے میں جاؤ، وہاں تیسرے کمرے کی چابی لٹکی ہوئی ہے، پہلا علم پڑھو تو پہلے علم کے اندر دوسرے علم کا، دوسرے علم کے اندر تیسرے علم کا، تیسرے علم کے اندر چوتھے علم کا میدان موجود ہے۔

۲) توحید، قرآن کا بنیادی موضوع

شرافت اور عظمت کے لحاظ سے علوم میں فرق ہے، اشرف العلوم اور باعظمت ترین علم کہ جو انسان کی دنیا و آخرت کی سعادت اور تکاملِ انسان کے لئے لازمی ہے وہ علمِ الٰہی و علمِ توحید ہے اور

اس کے بعد علمِ اسماء اللہ ہے، علمِ صفاتِ الٰہی ہے اور علمِ افعالِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

پہلا علم جو قرآنی معارف میں سے ہے کہ جس کو چھیڑیں تو پھر اس کے اندر سے انسان کے لئے علومِ فراواں نکلتے ہیں، فرمایا وہ علمِ توحید ہے، علمِ خدا ہے، ذاتِ خدا کے بارے میں انسان کی معرفت ہے، یہ قرآن کا پہلا علم ہے، اس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ متنِ قرآن ہے باقی سب حاشیۂ قرآن ہے، توحید متنِ قرآن ہے، توحید متنِ دین ہے، امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ...... (۲)

اولِ دین اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے......

اساسِ دین، بنیادِ دین یا اولِ دین معرفت ہے، یہ گنتی کا اول نہیں ہے کہ اول دین معرفتہ وثانیہ دین فلاں، جس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا...... (۳)

میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں......

تو کچھ لوگوں نے کہا کہ پھر یہ حدیث ناقص ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور مناسبتوں سے فرمایا کہ فلاں کھڑکی ہے، فلاں روشندان ہے، آخر شہر کی تو کھڑکیاں نہیں ہوتی ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینۂ علم کہا ہے نہ کہ بیت العلم، مدینے کی کھڑکیاں اور روشندان نہیں ہوتے بلکہ دروازہ ہوتا ہے لہٰذا انہوں نے وہ حدیثیں جالی بنائی ہیں۔

یہ جو اولِ دین کہا ہے تو اس اول کا معنیٰ ثانی کے مقابلے میں نہیں ہے کہ ثانیٔ دین بھی کوئی

چیز ہے، دوسری اساس الدین بھی کوئی چیز ہے، اول الدین یعنی بنیاد، اساس اور پھر اس کے اوپر دین کی جتنی عمارت تعمیر ہوگی یہ اسی اساس پر تعمیر ہوگی۔

أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ......

یعنی معرفتِ خدا اساسِ دین ہے، اس علم سے جو دین شروع ہوگا وہ درست دین ہے، وہ انسان کو خدا تک پہنچاتا ہے،

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ٥ (۴)

ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں۔

یعنی خدا سے شروع کرنا ہے اور خدا تک پہنچنا ہے لیکن جو معرفت خدا سے شروع نہ ہو، جو دین خدا سے شروع نہ ہو، جو علم خدا سے شروع نہ ہو وہ ہرگز خدا تک نہیں پہنچتا ہے اور نہ ہی وہ دین خدا تک پہنچاتا ہے کہ جس کا آغاز خدا سے نہ ہو، پس مدرسے والوں کے لئے، مومنین کے لئے، عوام کے لئے اور سب کے لئے اساسی علم یا بنیادی علم علمِ توحید ہے، علمِ توحید سے مراد فقط وحدانیت نہیں ہے، علمِ توحید الٰہیات کا عنوان ہے، الٰہیات یعنی خدا کے بارے میں، اللہ تعالیٰ کے بارے میں، اللہ کے بارے میں معرفت، اللہ کی معرفت۔ کچھ معرفتیں کسی حد تک انسان کے لئے مقدور ہیں کہ جو خداوند تبارک وتعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہیں، کنہہ خدا کی معرفت کوئی بھی حاصل نہیں کرسکتا ہے، حقیقتِ خدا کیا ہے؟ یہ کسی کے لئے مقدور نہیں ہے، غیر اللہ کے لئے مقدور نہیں ہے، حقیقتِ ذاتِ خدا، رازِ ذاتِ خدا، کنہہِ ذاتِ خدا، یہ خدا کے علاوہ کسی پر منکشف نہیں ہے، نہ فرشتے پر، نہ نبی پر، نہ

توحید قرآن کا بنیادی موضوع

ولی پر اور نہ کسی اور پر۔

۳) معرفتِ خدا ایک حد تک مقدور ہے

انسان کیلئے معرفت ایک حد تک مقدور ہے، البتہ انسانوں کے درجات ہیں، ظاہر ہے کہ ملائکہ کے لئے ایک حد تک مقدور ہے، انسانوں کے لئے ایک حد تک مقدور ہے اور انسانوں میں بھی معصوم کے لئے اور غیر معصوم کے لئے سب کی درجہ بندی ہے لیکن ہر ایک کے لئے معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کی ایک مقدارِ معین، ایک حدِ معین اور معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کا ایک طے شدہ راستہ کھلا ہوا ہے چونکہ اگر ہم کہیں کہ سرے سے معرفتِ خدا کا باب تعطل کا شکار ہے تو اس صورت میں دین کی ساری بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ انسان کا خدا سے رابطہ ہے، ہر ذرے کا خدا سے رابطہ ہے، ہر مخلوق کا خدا سے رابطہ ہے لیکن مخلوق کی حد تک رابطہ ہے نہ کہ خدا کی حد تک رابطہ ہے، خدا لامحدود ہے اور مخلوق محدود ہے، پس یہ محدود اور لامحدود کا رابطہ محدود رابطہ ہوتا ہے۔

جیسے آپ منطق میں پڑھتے ہیں کہ اگر ہم قیاس تشکیل دیتے ہیں، صغریٰ و کبریٰ کو قیاس بناتے ہیں تو نتیجہ ہمیشہ اخص سے مقدمہ کے تابع ہوتا ہے یعنی نتیجہ پست مقدمے کے اور ادنیٰ مقدمے کے تابع ہوتا ہے جیسے پہلے مثالیں دی تھیں کہ ایک اچھے اور برے انسان کی دوستی ہمیشہ بری ہوتی ہے چونکہ مقدمہ پست حصے اور پست جزو کے مطابق ہوتا ہے، اگر آپ ایک برتن میں بڑی مقوی غذا و دوا ڈالیں اور ساتھ تھوڑا زہر بھی ڈالیں تو نتیجہ زہر نکلے گا، یہ پورا مجموعہ زہر بن جائے گا،

مقوی نہیں بنے گا چونکہ مجموعے کا نتیجہ ہمیشہ گھٹیا جزو اور گھٹیا حصے کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا اچھے اور بُرے لوگوں کی مجلس میں ہمیشہ برا نتیجہ نکلتا ہے، وہ بری محفل بنتی ہے اور ہمیشہ بری صحبت میں شمار ہوتی ہے چونکہ نتیجہ گھٹیا جزو کے مطابق شمار کیا جاتا ہے۔

معرفتِ خدا ایک حد تک مقدور ہے

پس انسان محدود ہے، خدا لامحدود ہے، محدود اور لامحدود کا رابطہ محدود ہوگا یعنی جتنا یہ اس سے محدود ہے اتنا ہی اس کا رابطہ ہوگا اور مخلوقات کی حدود مختلف ہیں، کچھ مخلوقات کی حدود بڑی اور وسیع ہیں لیکن کچھ مخلوقات کی حدود بہت تنگ ہیں، جیسے ذہن ہے کہ بعض ذہن بہت چھوٹے اور بعض بند ذہن ہیں، بعض تھوڑے بڑے اور کھلے ذہن ہیں، کہتے ہیں کہ فلاں وسیع الظرف انسان ہے، وسیع النظر انسان ہے، وسیع النظر انسان کی دنیا بہت بڑی ہوتی ہے، تنگ دل انسان کی دنیا بہت چھوٹی ہوتی ہے۔

بعض متدینین و مومنین کے بارے میں یہ لطیفہ بنایا ہوا ہے کہ یہ جنت میں جائیں گے تو ان کیلئے جنت میں ایک چار دیواری بنی ہوگی اور اس پر خاردار تار لگی ہوگی، آگے درخت اور پیچھے یہ ہوں گے، باقی سارے بہشتی کھلے میدان میں ہوں گے، پوچھا جائے گا کہ ان کو یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟ جواب یہ ملے گا کہ جب یہ دنیا میں تھے تو ان کی ذہنیت یہ تھی، ان کا اعتقاد یہ تھا کہ فقط ہم جنت میں جائیں گے اور ہمارے علاوہ کوئی بھی جنت میں نہیں جائے گا تو اب جب یہ بندگانِ خدا جنت میں آئیں گے تو دیکھیں گے کہ سب جنت میں ہیں تو انکا دل ٹوٹے گا، اس وجہ سے ان کی جنت کو دیوار بنا کر محدود رکھا گیا ہے تا کہ ان کو یہی معلوم ہو کہ فقط ہم جنت میں ہیں۔

تنگ نظر انسان کی جنت بھی بہت تنگ ہے، وسیع النظر انسان کی دنیا بہت وسیع ہے، بعض حکماء کے بقول ہر انسان ایک الگ دنیا میں رہتا ہے، ہر انسان کی کونسی دنیا ہے؟ جتنی اس کی نظر ہے، ہر انسان کی نظر کے مطابق اس کا جہان ہے، اگر وسیع انسان ہے تو اس کا جہان بہت وسیع ہے، تنگ انسان ہے تو اس کا جہان بھی بہت تنگ ہے اور یہی مطلب مولانا روم نے خداوند تبارک وتعالیٰ کے بارے میں بھی ذکر فرمایا ہے کہ

ہر کسی از ظنّ خود شد یار من

از درونِ من نجُست اسرار من...... (۵)

یعنی ہر انسان اپنے گمان کے مطابق میرے ساتھ مرتبط ہے ورنہ جتنی میری حقیقت ہے اس طرح کوئی بھی میرے ساتھ مرتبط نہیں ہے،

ہر کسی از ظنّ خود شد یار من

یعنی اپنے گمان کے مطابق میری طرف آیا ہے ورنہ

از درونِ من نجُست اسرار من

اور معلوم بھی نہیں ہوسکتا ہے لہٰذا ہر انسان کو مقدر بھر حد تک معرفتِ خدا میسر ہے اور یہ ممکن ہے لیکن اتنی مقدر بھر معرفت کے لئے بھی کوشش کرنی پڑے گی اور سب سے بہترین منبع قرآن ہے۔

٤) اسماء اللہ، معرفتِ خدا کا پہلا باب

معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کے لئے بابِ اصلی معرفت اسماء اللہ ہے، خداوند تبارک و تعالیٰ کے بارے میں سب سے پہلی معرفت کہ جہاں سے ہم معرفت خدا کا آغاز کریں وہ معرفتِ اسماء اللہ ہے، حضرت امام صادق علیہ السلام سے یہ حدیث اصولِ کافی میں مرحوم کلینیؒ نے بابِ اشتقاقِ اسماء میں نقل کی ہے کہ امام علیہ السلام سے کسی شخص نے آکر سوال کیا کہ اتنے زیادہ اسماء اللہ ہیں، ان کی حکمت کیا ہے؟ خدا نے اتنے زیادہ اسماء کیوں اختیار کئے ہیں؟ اول اس کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو رائج ہے کہ اسماء اللہ ننانوے ہیں، ایسا نہیں ہے، اسماء اللہ لا محدود ہیں، اسماء اللہ کی کوئی حد نہیں ہے، یہ جو تدوین کئے گئے ہیں یہ تعلیم کے لئے تدوین کئے گئے ہیں، یہ ننانوے ہیں نہ یہ کہ فقط یہی اسماء اللہ ہیں، لامتناہی یعنی ان اسماء اللہ کی کوئی انتہا نہیں ہے، ہمیں ننانوے سمجھ میں آئے ہیں یعنی یوں کہیں کہ ہم ننانوے درجے کی حد تک آگے پہنچ سکے ہیں وِالّا ابھی اس سے آگے بھی ماجرا ہے اور اس سے آگے بھی اسماء اللہ کی دنیا ہے۔

جب اس شخص نے امام علیہ السلام سے پوچھا کہ ان اسماء کی حکمت اور فلسفہ کیا ہے تو امام علیہ السلام نے بہت خوبصورت تعبیر بیان فرمائی اور فرمایا کہ ان اسماء کو خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنی معرفت کے دروازے قرار دیا ہے، یہ اسماء ابوابِ معرفتِ خدا ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان جس وادی میں، جس میدان میں جاتا ہے تو اس کو اس کے در سے جانا چاہئے، اگر انسان معرفتِ خدا و معرفتِ توحید حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا دروازہ اسماء اللہ ہیں، اب قرآن مجید میں اسماء اللہ کی طرف آئیں کہ کس

خوبصورتی سے قرآن نے اسماء اللہ ترتیب دیئے ہیں اور آیات کے اندر کس طرح سے اسماء اللہ چمک رہے ہیں، اسماء اللہ کے ساتھ اسماء اللہ کی کس قدر درخشندگی ہے۔لیکن تفاسیر میں اور خصوصا مترجمین نے اسماء اللہ کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے، وہی کیا ہے جو شاعر قافیے کے ساتھ کرتا ہے چونکہ پہلی آیت میم پہ ختم ہوئی ہے تو دوسری بھی میم پہ ختم ہو، پہلے میم حکیم آیا ہے تو دوسری میں علیم آنا چاہئے، یہاں علیم کیوں ہے؟ چونکہ پہلے میں حکیم آیا ہے، حالانکہ یہ وجہ نہیں ہے،قرآن شعر نہیں ہے،

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ۝ (۲)

اور ہم نے اپنے پیغمبر کو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور نہ شاعری اس کے شایان شان ہے یہ تو ایک نصیحت اور کھلا ہوا روشن قرآن ہے۔

یہ قرآن شعر نہیں بلکہ سراسر ہدایت ہے، حکمت ہے، نور ہے، قرآن سراسر آیہ ہے، اخلاق کے بارے میں، فقہ کے بارے میں، اجتماعی مسئلے کے بارے میں، سیاسی مسئلے کے بارے میں، جہان بینی کے بارے میں، حقیقت شناسی کے بارے میں، انسان شناسی کے بارے میں، طبیعت اور عالمِ طبیعت کے بارے میں آیہ ہے، یہ سب قرآن میں ہے، لیکن آیات منتہی کہاں پر ہو رہی ہیں؟ اسماء اللہ پر، اکثر وبیشتر آیات اسمائے حسنۂ خدا پر جا کر منتہی ہو رہی ہیں، کیا حکمت ہے؟ آیا اختتامِ آیہ برکت کے تحت ہے؟ برکت کے لئے بھی نہیں ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں اور کرتے ہیں کہ شروع نام اللہ کے ساتھ، اُردو کے پرانے ترجمے میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ کرتے ہیں کہ ''شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے'' یعنی اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں،

یہ آیہ کے اندر اسم کیا کر رہا ہے مثلاً

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں، بسم اللہ کو ختم کس پہ کرتا ہوں؟ رحیم پر، رحیم بھی اسمِ خدا ہے تو پھر معنیٰ یوں ہو جائے گا کہ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے نام کے ساتھ ختم بھی کرتا ہوں یعنی برکت کے لئے اسم سے شروع کیا اور برکت کے لئے اسم پر جا کر ختم کیا، عموماً برکت کے لئے لوگ ایسا کام کرتے ہیں مثلاً حوزے میں اتوار کو درس شروع ہوتے ہیں، ویسے کہتے ہیں کہ جمعے میں برکت ہیں لیکن درس اتوار کو پڑھتے ہیں، حوزوی خرافات بھی عوامی خرافات سے مختلف ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بدھ کو درس شروع کرتے ہیں یا اتوار کو شروع ہونا چاہیے، ویسے جمعہ متبرک دن ہے لیکن جمعے کو اصلاً درس نہیں پڑھنا ہے، جو جمعے کو درس پڑھے گا وہ جنت نہیں جائے گا، جب برکتی دن ہے تو زیادہ درس جمعے کے دن پڑھنے چاہئیں، ویسے بھی سورۂ مبارکہ جمعہ آیہ ۱۰ میں ہے کہ جمعہ پڑھ کر کام کرو،

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانۡتَشِرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ......

یعنی جب نماز قائم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ......

وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ......

اور فضل خدا کو تلاش کرو......

وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا......

اور خدا کو بہت یاد کرو......

اختتامِ اسمائے حسنیٰ پر آیات کا صرف ایک اشارہ کرتا ہوں چونکہ ہماری بحث تفسیرِ قرآن میں نہیں ہے یا ان اسماء میں نہیں ہے، صرف اس بات کی وضاحت کیلئے اسماء اللہ کی ایک حکمت عرض کرتا ہوں کہ صدر المتألھین کا اس بات پر اصرار ہے کہ قرآن کی آیات سے علوم کو استنباط کیا جائے، لیکن انسان قرآن کی بارگاہ میں جائے تو پہلے ابتدائی موضوعات کو چھیڑے پھر فرمایا کہ علمِ توحید اساسی علم ہے اور معرفتِ خدا کے بارے میں ذکر کیا کہ اسماء اللہ ابوابِ معرفتِ خدا ہیں یعنی قرآن میں سب سے پہلے انسان کس کے پیچھے جائے؟ توحید کے پیچھے جائے، انسان قرآن کے اندر جستجو گرِ توحید ہو، توحید کے اندر سب لپٹا ہوا ہے، توحید ایک فولڈر (Folder) ہے کہ جس کے اندر سارے علوم ہیں، اس کے اندر جا کر پتہ چلے گا، ابھی باہر سے ہی چابی نہ مانگیں،

توحید کے اندر جائیں گے تو دیکھیں گے کہ آپ کو وہاں سے بہت کچھ ملے گا، انسان کس طرح سے توحید تک پہنچے؟ اسماء اللہ کے ذریعے سے پہنچے، قرآن نے اسماء اللہ کو ابوابِ معرفتِ خدا مقرر کیا ہے۔

☆ آیات کے آخر میں اسماء اللہ کی حکمت

قرآن میں بہت سی آیات کے اختتام پر اسماء اللہ ذکر کیے گئے ہیں۔ آیہ فقہی، آیہ اخلاقی، آیہ اجتماعی، آیہ سیاسی، آیہ علمی، آیہ جہاں بینی، آیہ فلسفی اور جو بھی آیہ کا مضمون ہو تو یہ آیہ کسی نہ کسی اسم پر جا کر منتہی ہو رہی ہے، اس اسم کا اس آیہ کے ساتھ کیا ربط ہے؟ برکت کے لئے نہیں ہے، بالآخر

کہیں تو منتہی ہونا ہی تھا، مثلاً آیات کے آخر میں یہ اسماء اللہ ہوتے ہیں،

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ٥(٧)

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ٥(٨)

أَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ٥(٩)

اب کوئی یہ نہ سوچے اس کے بجائے أَنَّ اللّٰهَ رَحِيمٌ حَلِيمٌ کہہ دیتے تو قافیہ بھی مل جاتا اور وزن بھی برابر ہو جاتا۔ یہ ساتھ میں غفور کیوں کہا؟ اس کی کیا حکمت ہے؟ اس لئے کہ جو کچھ آیہ کے اندر پیش ہوا ہے یہ اسمِ خدا اس آیہ کیلئے بمنزلۂ برہان ہے۔

یہ مطلب حضرتِ استاد آیت اللہ جوادی آملی دام ظلہ العالی سے نقل کر رہا ہوں، وہ یہ فرماتے ہیں کہ اسماء اللہ کا وقوع ان آیات کے اختتام پر بمنزلۂ برہان ہے، نہ صرف بمنزلۂ برہان بلکہ حقیقتاً برہانِ آیت ہے یعنی دلیلِ آیت ہے، یہ اسمِ خدا علتِ آیت ہے یعنی یہ آیت اس اسمِ خدا کی تجلی ہے، اس اسمِ خدا سے یہ مطلب ثابت ہوتا ہے، یہ مفسر کا کام ہے، مستنبط کا کام ہے کہ ربط دے، آیت کو اسمِ خدا کے ساتھ ربط دے، تفسیر کا یہی معنیٰ ہوتا ہے، تفسیر کا مطلب صرف مبتدا و خبر تلاش کرنا نہیں ہے، تفسیر یعنی آپ آئیں اور مضمونِ آیت کو پہلے کشف کریں کہ کیا ہے؟ آیہ کیا کہنا چاہ رہی ہے؟ پیغامِ آیت کیا ہے؟ آیت کا پیغام لے کر اب اس کا رابطہ اسمِ الٰہی سے مربوط کرو اور ذکر کرو کہ اس کا اسمِ خداوند تبارک وتعالیٰ کے ساتھ کیا رابطہ ہے؟ پس معلوم ہوا کہ جہاں عزیز و حکیم ہے، غفور و شکور ہے، علیم و حکیم ہے، شکور و حلیم ہے، غفور و رحیم ہے، قوی و

☆ آیات کے آخر میں اسماء اللہ کی حکمت

عزیز ہے یا جہاں کوئی اور اسم ہے تو اسی اسم کے مطابق یہ آیت تدوین کی گئی ہے، یہ جلوۂ اسمِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے، پس پہلا باب معرفتِ اسمائے خداوند تبارک وتعالیٰ ہے لیکن خود ہی فرماتے ہیں کہ یہ معرفت اخص لوگوں کے لئے ہے، مخصوص لوگوں کے لئے ہے، یہ معرفت عام نہیں ہے کہ ابوابِ معرفتِ خدا سے خدا کی طرف جانا، اسماء اللہ سے خدا کی طرف جانا۔

☆دعائے جوشن، خزانۂ اسماء اللہ

ایک دعا کہ جسے ہم نے پورے سال ہاتھ نہیں لگایا ہے کہ کہیں اس کا تقدس پائمال نہ ہو جائے، جو فقط لیلۃ القدر کے لئے رکھی ہوئی ہے وہ دعائے جوشن ہے، بعض ہاتھ نہیں لگاتے ہیں کہ یہ چیزیں میلی ہو جاتی ہیں، خراب ہو جاتی ہیں، دعائے جوشن پڑھیں، دعائے جوشن کیا ہے؟ اس کے اندر فقط اسماء اللہ ہیں، ایک ہزار اسمائے خدا ہیں اور اسے اسپیڈ (Speed) کے ساتھ نہیں پڑھنا ہے، دعائے جوشن کا یہاں مقابلہ ہوتا ہے، ایک سینٹر (Centre) والے آتے ہیں اور دوسرے سینٹر میں پوچھتے ہیں کہ آپ کے مولانا نے کتنے منٹ میں پڑھی؟ کہتے ہیں کہ پندرہ منٹ میں پڑھی، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے مولانا نے چودہ منٹ میں پڑھی، وہ پھر افسوس کرتا ہے کہ ہمارا ایک منٹ ضائع ہوا ہے۔

ایک جگہ خود میرا اپنا تجربہ ہے، دعا میں نے خود لے لی کیونکہ وہ جس طرح سے دعائے جوشن کی درگت بنا رہا تھا تو ان سے درخواست کی کہ میری آواز اور سُر تو آپ جیسا نہیں ہے لیکن مجھے

دیں میں پڑھتا ہوں، پڑھنا شروع کی تو پیچھے سے عجیب وغریب قسم کی آوازیں آنے لگیں کہ جس طرح برتن کھنکنے کی آوازیں ہوتی ہیں، جب میں دُعا کا وہ ایک حصہ پڑھتا چونکہ اسماء اللہ اس طرح بند بند کی صورت میں ہیں، وہ جب پڑھتا تو زورزور سے آوازیں آنا شروع ہو جاتی تھیں، ایک دفعہ جو پیچھے مڑا تو دیکھا کہ سب کے پاس پانی کے بھرے ہوئے جگ رکھے ہوئے ہیں اور بیچ میں تسبیحاں لے کر منتظر ہیں اور جوں جوں میں پڑھتا تھا وہ پانی کے اندر بیچ میں تسبیحاں ہلاتے تھے، پھر ان سے کہا کہ ان کا کیا کرنا ہے؟ کہا کہ یہ مریضوں کو پلانا ہے اور یہ فلاں کو پلانا ہے، کسی نے ان لوگوں سے کہا کہ اٹھو یہ سارے جگ انڈیل کے آؤ، یہ ختم کرو، یہ جوشن کے ساتھ تم نے کیا شروع کر دیا؟ یہ اسماء اللہ کا ذکر ہو رہا ہے، تم اسمائے خدا سنو اور اسمائے خدا میں غور کرو، اسماءِ خدا سے خدا سے اپنا رابطہ برقرار کرو، ان اسماء کے ساتھ تمسک کرو شاید آج کی رات کوئی اسم تمھارے شاملِ حال ہو جائے، کسی اسم کی تجلی تمہارے دل پر ہو جائے، شاید کسی اسم سے تمہارا ربط جڑ جائے اور وہ دولتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہو جائے، آپ یہ کیا عمل کر رہے ہو؟

جوشنِ کبیر یعنی مجموعۂ اسماء اللہ، بہت زیادہ نورانی دعا ہے، اس دعائے شریفِ جوشن کے لئے توصیف کے لئے واقعاً الفاظ نہیں ہیں، اس کے اندر گدائی نہیں ہے بس صرف اسماء اللہ ہیں یعنی سراپا نور ہی نور ہے، تمام اسماء جو قرآن میں ہیں اور جن کی طرف قرآن نے راہنمائی کی ہے وہ سب کے سب دعائے جوشن میں ہیں، خدا نے یہ نعمتیں ہمیں ائمہ علیہم السلام کی صورت میں عطا کیں ہیں، اہلبیت علیہم السلام نے ہمارے لئے یہ تحفے اور یہ میراث چھوڑی ہے لہٰذا اس سے سروکار رکھیں۔

الغرض اسماء اللہ معرفتِ خدا کا پہلا باب ہیں اور اسماء اللہ سے خواص کا تعلق ہوتا ہے، وہ اہلِ معرفت خاص لوگ ہیں کہ جن کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ معرفتِ خدا کیلئے اسماء اللہ کے باب سے داخل ہوں کیونکہ باہمت لوگ ہوتے ہیں البتہ سب جاسکتے ہیں کسی کے لئے ممنوع نہیں ہے۔

۵) افعالِ الٰہی، معرفتِ خدا کا دوسرا باب

صدر المتالھین "فرماتے ہیں کہ اسماء اللہ کے بعد افعالِ الٰہی معرفتِ خدا کا باب ہیں، کیونکہ اکثر لوگ اسماء اللہ کی طرف ہمت نہیں کرتے ہیں بلکہ افعالِ خدا میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ کوئی حرج نہیں ہے اگر اسماء اللہ تک رسائی نہیں ہے تو افعالِ الٰہی کے ذریعے سے آئیں اور معرفتِ قرآن میں اثارہ وثورہ کریں اور افعالِ الٰہی میں غور وفکر کے ذریعے سے معارفِ قرآنی کو چھیڑیں یعنی اگر اسماء سے استنباط کے قابل نہیں ہیں تو افعالِ الٰہی سے استنباط کریں کہ یہ در بھی قرآن نے ہمارے لئے کھولا ہے۔

☆فعلِ الٰہی سے مراد

فعل سے مراد یہی مخلوقات اور موجودات ہیں، فعل سے مراد معنیٰ مصدری نہیں ہے، فعلِ خدا خلق کرنا نہیں ہے بلکہ خود مخلوق فعلِ خدا ہے، صرف زمین بنانا فعلِ خدا نہیں ہے بلکہ خود زمین فعلِ خدا ہے، خود آسمان فعلِ خدا ہے، خود موجودات جو کسی بھی شکل میں موجود ہوں، جسمانی وغیر جسمانی، مادی وغیر مادی، ارضی وسماوی یا زمین کے اندر جس شکل میں بھی موجود ہوں، بصورتِ جماد

موجود ہوں، بصورت نبات موجود ہوں، بصورتِ معدن موجود ہوں، بصورتِ حیوان یا بصورتِ انسان موجود ہوں یہ سب کچھ افعالِ الٰہی ہیں۔

عام انسانوں کے لئے آسان ترین علم، علمِ افعالِ الٰہی ہے کہ جسے انسان سادگی اور سہولت سے حاصل کرسکتا ہے اور ہر انسان مقصودِ علم ہے، علم سے مراد ڈگری (Degree) و مدرک نہیں ہے، ممکن ہے کہ ایک انسان عام مطالعہ کے ذریعے سے، موجودات اور نظامِ ہستی کے مطالعہ سے بہت ساری چیزوں سے آگاہ و مطلع ہو درعینِ حال کسی علمی مرکز میں رسماً نہ پڑھا ہو اور کوئی ڈگری و مدرک اس کے پاس موجود نہ ہو، یہاں پر مراد افعالِ الٰہی میں غور و خوض کرنا ہے نہ کہ بنامِ علم جو دینی مراکز یا غیر دینی مراکزِ علمی تاسیس ہوئے ہیں ان کے اندر جا کر باقاعدہ ایک مدرک و ڈگری حاصل کرنا ہے۔

☆ فعلِ الٰہی سے مراد

آج کل رائج ہے کہ عالم اسے کہتے ہیں جو کسی علمی مرکز کا فارغ التحصیل ہو یا اس نے کہیں سے یہ تدوینی کتابیں بصورتِ لفظی پڑھی ہوں لیکن جس نے عالمِ ہستی میں، موجودات میں اور عالمِ الٰہی میں خود غور و خوض کیا ہوا ہو اسے کوئی عالم کے زمرے میں شمار نہیں کرتا۔ قرآن میں عالم سے مُراد یا یہاں پر مُراد از علوم یہ ہے کہ انسان جو علوم افعالِ الٰہی سے استنباط کرتا ہے اور افعالِ الٰہی سے علوم استنباط کر کے انہیں کتب کی شکل میں اور دیگر صورتوں میں تدوین کر کے طلاب علوم کیلئے آمادہ کرتا ہے۔

٦)افعالِ الٰہی کے دو چہرے

صدر المتألہین ساتھ ہی یہ نکتہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ جب ہم افعالِ الٰہی میں غور واستنباط کریں تو اس نکتے کی طرف متوجہ رہیں کہ ہر فعلِ الٰہی دو پہلو رکھتا ہے، فعلِ خدا کے دو چہرے ہیں، انسان کس چہرے سے افعالِ خدا کا مطالعہ کرے؟

انہی افعال کا ایک چہرہ انسان کو خدا سے غافل کر دیتا ہے اور ایک چہرہ ایسا ہے کہ اگر ہم اُس پہلو سے فعلِ خدا میں غور واستنباط کریں تو وہ ہمیں اسماء وصفاتِ الٰہی تک پہنچاتا ہے اور اسماء و صفاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ سے ذاتِ خدا تک پہنچاتا ہے اور یہ وہ چہرہ ہے کہ جسے ہم وجہ اللہ کہتے ہیں۔ ہر موجود کے اندر دو وجہ ہیں، ایک اس کا اپنا مخصوص وجہ ہے، جس وجہ کے لحاظ سے، جس چہرے کے لحاظ سے وہ ایک شے ہے اور ایک وجہ اسی کے اندر وجہ اللہ ہے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید نے بھی فرمایا ہے کہ

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ٥(١٠)

اور اللہ کے لئے مشرق بھی ہے اور مغرب بھی پس جدھر بھی رخ کرو وجہ خدا وہیں موجود ہے، بے شک وہ صاحبِ وسعت بھی ہے اور صاحبِ علم بھی ہے۔

یعنی آپ جدھر نگاہ کرو وجہ خدا آپ کو وہیں پر ملے گا یا جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ٥(١١)

جو بھی روئے زمین پر ہے سب فانی ہیں اور صرف تمہارے رب کی ذات جو صاحبِ جلال واکرام ہے وہی باقی رہنے والی ہے۔

ہر چیز کو فنا ہے لیکن وجہ خدا کو فنا نہیں ہے یعنی یہ اشیاء جو معرضِ ہلاکت میں ہیں اور فانی ہیں لیکن ان کا چہرہ وجہِ الٰہی باقی ہے چونکہ وہ متصل باذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں اور اسی لحاظ سے ہر موجود خداوند تبارک وتعالیٰ سے حکایت کرتا ہے اور اس چہرے سے اگر انسان کسی موجود کو، کسی مخلوق کو دیکھے تو اس سے پہلے کہ وہ شے نظر آئے انسان کو خدا کی ذات نظر آتی ہے البتہ نہ کہ اس ظاہری آنکھ سے، ممکن ہے کہ انسان اس آنکھ سے، اس بصر سے مخلوق کو دیکھتا ہو لیکن بصیرت سے اسی شے کے اندر خدا نظر آتا ہے، جس طرح خود امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اس شخص کے جواب میں کہ جس نے آپ علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ آیا آپؑ نے خدا کو دیکھا ہے؟ فرمایا کہ ہاں، میں ایسے خدا کی عبادت نہیں کرتا کہ جسے میں نے دیکھا نہ ہو،

لَمْ أَكُنْ أَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَهُ...... (۱۲)

میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی ہے جسے میں نے دیکھا نہ ہو......

مَا كُنْتُ لِأَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَهُ...... (۱۳)

یعنی میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا کہ جسے دیکھا نہ ہو،

میں نے آج تک کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی مگر یہ کہ پہلے اس میں خدا کو دیکھا ہے، اس نے پوچھا کہ خدا کو کہاں دیکھا ہے؟ اور کیسے دیکھا ہے؟ فرمایا کہ خدا نورِ ایمان اور بصیرتِ ایمان سے

دیکھا جاتا ہے۔

انسان کی دو آنکھیں ہیں۔ایک دل کی آنکھ ہے اور ایک جسم کی آنکھ ہے، جسم کی آنکھ سے ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے ہیں بلکہ فقط جسمانیات اور محسوسات کو دیکھ سکتے ہیں لیکن دل کی آنکھ، ایمان کی آنکھ اور نورِ بصیرت سے ہم خدا کو دیکھ سکتے ہیں، جیسا کہ بصیرت سے انسان بہت کچھ دیکھ سکتا ہے، بہت ساری چیزیں ہیں کہ جو بصیرت دیکھتی ہے مثلاً ہم ٹریفک کا اشارہ دیکھتے ہیں تو آنکھ ہمیں فقط ایک تیر بنا ہوا دکھاتی ہے، آنکھ ایک سرخ گول دائرہ دکھاتی ہے لیکن بصیرت اس کے اندر موجود قانون دکھاتی ہے، بصیرت یہ کہتی ہے کہ اس نشانی کے پیچھے یا اس بورڈ کے اندر قانون موجود ہے، پس بصر سے انسان رنگ دیکھتا ہے، بصر سے انسان ایک سائن (Sign) دیکھتا ہے لیکن بصیرت سے یہی انسان اس قانون کو دیکھ رہا ہوتا ہے، اگر بصیرت نہ ہو تو انسان کو قانون نظر نہیں آتا ہے جیسا کہ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو بورڈ نظر آتا ہے لیکن قانون نظر نہیں آتا ہے کیونکہ ان کے پاس بصیرت نہیں ہوتی ہے۔

اسی طرح سے یہ سب مخلوقات آیاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں، سب ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کی نشانیاں ہیں، کوئی چھوٹی نشانی ہے تو کوئی بڑی نشانی ہے، اگر کوئی ان نشانیوں کو صرف نشانی کے پہلو سے، نشانی کے چہرے سے دیکھے تو ان موجودات کے اندر انسان کو خدا نظر آئے گا چونکہ یہ سب آئینہ ہیں، یہ سب خدا نما ہیں، خدا نما یعنی ہستیِ خدا کی نمائش کر رہی ہیں، تجلیِ خدا ہیں اور یہ اشیاء صفاتِ خدا کی نمائش کر رہی ہیں اور یہ سب کچھ ہمیں خدا کی کوئی نہ کوئی صفت بتا رہی ہیں، روئے

زمین پر یا کائنات میں جتنے موجودات ہیں اور جو کچھ انسان کی بصیرت میں آتا ہے یہ سب ہمیں خدا کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔

۷) بابصیرت انسان کی دید

نکتۂ دیگر یہ بیان فرماتے ہیں کہ جب ہم وجہِ الٰہی کے پہلو سے اشیاء کو دیکھتے ہیں تو اس لحاظ سے اشیاء کو بقا حاصل ہے لیکن جب ہم اس کے دوسرے چہرے کو کہ جس چہرے کے لحاظ سے وہ خود ایک شے ہے، ایک موجود ہے، ایک مخلوق ہے کہ جو دیگر مخلوقات کی مانند ہے یا ان کے مقابلے میں ہے تو اس لحاظ سے یہ شے ہالک ہے۔ پس اگر ہمیں صحیح دید عطا ہو جائے، اگر ہم صحیح بصیرت کے ساتھ کسی چیز کو دیکھیں تو ہمیں ایک چیز کے اندر دو منظر نظر آئیں گے، ایک ہی شے کے اندر، ایک ہی نگاہ کے اندر دو منظر نظر آئیں گے، ایک منظر بقا کا نظر آئے گا اور ایک منظر فنا کا نظر آئے گا یعنی وہ شے ہمیں باقی نظر آئے گی اور وہی شے ہمیں فانی نظر آئے گی، ہم اسی شے کو ہلاکت میں دیکھیں گے، ہر شے ہالک ہے اور ہر شے کے اندر ایک گوہر، ایک جوہر اور دیکھیں گے کہ جو حالتِ بقا میں ہے اور اسی سے منسوب ایک شعر ہے کہ جو جاہلیت کے زمانے کی تنہا چیز ہے جس کی رسول اللہ ﷺ نے تعریف کی ہے، لبید بن ربیعہ بن عامر زمانۂ جاہلیت کا شاعر ہے، یہ سبعِ معلقہ میں شامل تھا یعنی ساتھ ہی شاہکارِ ادبِ عربی ہے، عرب کے اندر جو قصیدے جاہلیت کے زمانے میں موجود تھے ان میں سے ایک قصیدہ اسی کا تھا، لبید نے ایک شعر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بہت تمجید کی اور فرمایا کہ

صادق ترین قول جو کسی عرب کی زبان سے نکلا ہے وہ یہی قول ہے اور وہ قول یہی مطلب ہے کہ جو یہاں بیان فرما رہے ہیں کہ

علی کل شیء ما خلا اللہ باطل

اللہ کے علاوہ ہر چیز باطل ہے، نہ کہ باطل ہو جائے گی،

یہ وہی مطلب ہے کہ جسے یہ آیہ بیان کر رہی ہے، لبید کے شعر میں اسی کو ذکر کیا گیا ہے، آیہ میں ہے کہ

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ...... (۱۴)

اس کا معنی یا ترجمہ عموماً یہ کرتے ہیں کہ کل شیء سیھلک یعنی ہر چیز ہلاک ہو جائے گی۔ نہیں بلکہ ابھی حالتِ فنا میں ہے، ہر چیز ابھی حالتِ ہلاکت میں ہے، ہر چیز ابھی بالفعل ہالک ہے، حالِ حاضر میں ہر چیز ہالک ہے،

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ......

یعنی ہر شے ہالک ہے لیکن اس شے کے اندر ایک وجہ ہے کہ جو باقی ہے اور ہالک نہیں ہے، انسان اگر ہر شے کے اوپر نگاہ کرے اور یہ دو منظر دیکھ لے کہ

علی کل شیء ما خلا اللہ باطل

وکل نعیم لا مھالۃ زاھل

اور ہر نعمت کو بالآخر زائل ہونا ہے، یہ زوال پذیر ہے اور زائل ہے۔ انسانِ با بصیرت،

انسانِ مستنبط اور انسانِ متدبّر وقرآن شناس کہ جس کو خدائی بصیرت عطا ہوگئی ہو وہ جب اشیاء پر نگاہ کرتا ہے تو انہیں ہالک دیکھ رہا ہوتا ہے، معرضِ ہلاکت میں دیکھ رہا ہوتا ہے اور انہی اشیاء کے اندر ایک وجہِ خدا ہے کہ جو باقی ہے اسے بھی دیکھ رہا ہوتا ہے۔

پس اگر انسان بصیرت کے ساتھ مطالعۂ فعلِ خدا، تدبر در فعلِ الٰہی و استنباط در فعلِ خدا کرے اور ہر شئے کو بصیرت کے ساتھ دیکھے تو وہاں سے انسان علومِ متعدد کشف کر سکتا ہے۔

۸)کتابِ تکوینیٔ خدا کی تفسیر کی ضرورت

جب انسان افعالِ خدا کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو یہی طبیعیات اور یہی معمولی علوم کہ جن کو ہم فقط سند کے لئے، ڈگری کے لئے، مقام کے لئے، ملازمت کے لئے، عزت کیلئے، شہرت کیلئے پڑھتے ہیں علومِ الٰہی بن جاتے ہیں کہ ان ہی علوم سے انسان افعالِ الٰہی کی تفسیر کرے اور انہی افعال کے ذریعے سے خدا تک پہنچے لہٰذا تفسیرِ اقوالِ الٰہی و تفسیرِ افعالِ الٰہی میں کوئی فرق نہیں رہے گا مثلاً قرآن کلامِ خدا اور قولِ خدا ہے، کچھ لوگ آئیں اور قولِ خدا و کلامِ خدا کی تفسیر میں مشغول ہوں، اس میں کسی کو شک نہیں ہوتا ہے کہ یہ علمِ دین و علمِ الٰہی ہے پھر اگر ایک انسان فعلِ الٰہی کی تفسیر میں مشغول ہو تو وہ بھی علمِ دین ہے، اگر نہ کہیں کہ یہ بالاتر دین اور بالاتر علم ہے اس علمِ قول سے، یعنی قول کی تفسیر سے بڑا علم فعل کی تفسیر ہے چونکہ کائنات فعلِ خدا ہے اور قرآن قولِ خدا ہے، یہ بھی کتابِ خدا ہے اور وہ بھی کتابِ خدا ہے، قرآن کتابِ تدوینیٔ خدا ہے اور کائنات کتابِ تکوینیٔ خدا ہے،

قرآن کے اندر کلماتِ لفظی خدا ہیں اور کائنات کے اندر کلماتِ وجودی خدا ہیں۔

لہٰذا کوئی اس کتابِ تدوینی کی بھی تفسیر کرے اور اس کتابِ تکوینی کی بھی تفسیر کرے لیکن اس دید کے ساتھ کہ جو بیان ہوئی ہے یعنی یہ سب موجودات فعلِ خدا ہیں اور میں فعلِ خدا کی تفسیر کر رہا ہوں اور فعلِ خدا کی تفسیر میں بھی دو چہرے دیکھ رہا ہوں، ایک اشیاء کا ہالک چہرہ، فانی چہرہ، ختم ہونے والا چہرہ اور فنا و نیستی کی جانب جانے والا چہرہ اور ایک ان کا باقی چہرہ، اگر انسان اس طرح سے فعل کو دیکھے تو ہر موجود کے اندر انسان کو خدا ملے گا۔ یہ قرآن انسان کی راہنمائی کر رہا ہے، قرآن انسان کو ہدایت کر رہا ہے کہ آؤ تدبر کرو، دعوتِ تدبر و استنباط دیتا ہے کہ موجوداتِ ہستی میں، آیاتِ خدا میں، آیاتِ لفظیۂ خدا میں اور آیاتِ تکوینیۂ خدا میں غور و تدبر کرو، اب ہم کتاب کی عبارت کو پڑھ لیتے ہیں تا کہ یہ ادبِ پنجم تمام ہو جائے اور بعد کے ادبِ دیگر شروع کریں۔

فعل سے فاعل کا استنباط

۹)فعل سے فاعل کا استنباط

☆ فینبغی ان یتدبّر فی الفعل تدبرا کاملا بحده و حقیقته......

انسان کو چاہیے کہ فعلِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں اس طرح سے تدبر کرے کہ حقِ تدبر ادا کرے،

☆ لیشهد فی الفعل الفاعل دون الفعل......

تا کہ فعل کے اندر اس کو فاعل نظر آئے نہ کہ اس کو صرف فعل نظر آئے یعنی جب مخلوق کو

دیکھے، جب دشت وکوہ ودمن دیکھے، جب پہاڑ وستارے وکہکشاں دیکھے تو اس کے اندر اسے فاعلِ فعل نظر آئے گا، جس طرح سے اگر انسان آیاتِ لفظیہ وآیاتِ تدوینیہ قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے متکلم نظر آئے گا، جیسے حضرت امام سید ساجدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس حد تک، اس قدر امام علیہ السلام بعض آیات کو تکرار فرماتے تھے اور ساتھ ہی فرماتے تھے کہ اب میں قرآن سے یا صفحے سے نہیں یا دل و حافظے سے ان آیات کو نہیں پڑھ رہا ہوں بلکہ متکلم سے سن رہا ہوں، جیسے

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ○

اگر انسان ان آیاتِ لفظی میں بھی غور کرے تو انسان کو متکلم نظر آتا ہے، اگر انسان فعلِ خدا میں تدبر وغور کرے تو انسان کو فاعل نظر آتا ہے،

☆ و من عرف الحق راہ فی کل شیء......

اور جو بھی حق تعالیٰ کی شناخت رکھتا ہو تو اسے ہر شے میں دیکھتا ہے، اگر واقعاً اسے خدا کی شناخت ہو تو اسے خدا ہر چیز میں نظر آتا ہے،

☆ اذ کل شیء فمنہ و الیہ و بہ و لہ......

چونکہ ہر چیز خدا کی جانب سے ہے، ہر چیز خدا کی طرف جا رہی ہے، ہر چیز کی حقیقت خدا کے لئے ہے اور ہر چیز میں خدا ہے۔

۱۰)کوئی شے خدا کے مقابلے میں نہیں

☆ فهو الكل على التحقيق فى وحدته......

بلکہ آپ کو کہیں غیرِ خدا نظر نہیں آئے گا کہ وہ خود ہی سب کچھ ہے، اسی کی تجلیاں ہیں، اسی کی آیات ہیں، اسی کی نشانیاں ہیں، اسی کے افعال ہیں، اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، وہی مطلب جو شیخ سعدی نے عرض کیا کہ

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست

بر عارفان جز خدا ہیچ نیست......(۱۵)

اگر انسان واقعاً اس کائنات کے اندر حقِ تدبر و حقِ غور ادا کرے، عارف یعنی جو معرفتِ خدا رکھتے ہیں، عارف دیواریں دوڑانے والے کو نہیں کہتے ہیں، باطنی حال بتانے والوں کو نہیں کہتے ہیں، کرتب دکھانے والوں کو نہیں کہتے ہیں چونکہ ان کو سارے مرید نظر آتے ہیں یہ جو عرفاء بنے ہوئے کرتب دکھاتے ہیں ان کو خدا بھی نظر آتا ہے اور مرید بھی نظر آتے ہیں عارف یعنی معرفتِ خدا رکھنے والا، مقربِ خدا، فانی در خدا، مشغول بہ خدا۔ان کے پاس خدا کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، وہ دیواریں انہیں نظر نہیں آتیں چہ جائیکہ وہ دیواریں دوڑائیں۔

توان گفتن این با حقایق شناس

ولی خردہ گیرند اہل قیاس

حقیقت شناس لوگوں کو تو یہ بات بتائی جا سکتی ہے، ان کے سامنے تو اس بات کا اظہار کرنا

آسمان ہے کہ اہلِ معرفت کے نزدیک خدا کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ حقیقت شناس کو بتا سکتے ہیں کہ خدا کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے لیکن اہلِ قیاس کہ جو عقلِ ظاہری وعقلِ محدود کے ذریعے سے سوچنے والے ہیں، وہ اشکال کریں گے اور اعتراض کریں گے،

کہ پس آسمان و زمین چیستند

بنی آدم و دام و دد کیستند؟

کہ پھر یہ زمین و آسمان کیا ہے؟ یہ بنی آدم کیا ہے؟ یہ حیوانات و چرند و پرند، یہ سب کیا ہیں؟ یہ تو خدا نہیں ہیں،

ہمہ ہر چہ ہستند از آن کمترند

کہ با ہستیش نام ہستی برند

ہاں یہ مخلوق ہیں، یہ ساری چیزیں ہیں لیکن یہ اس کے مقابلے میں نہیں ہیں، یہ اس کے علاوہ نہیں ہیں۔ یہ سب اگر موجود کہلاتے ہیں تو اس کی وجہ سے موجود کہلاتے ہیں چونکہ یہ اس کی تجلیاں ہیں، اس کی نشانیاں اور فعل ہیں، اسی کے جلوے ہیں نہ کہ خدا کے مقابلے میں ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ توحیدِ کامل یہ ہے کہ خدا کے ساتھ دوسرا خدا نہ ہو یعنی انسان خدا کے علاوہ کسی خدا کا قائل نہ ہو، نا، توحیدِ حقیقی یہ ہے کہ خدا کے مقابلے میں نہ خدا ہو اور نہ غیرِ خدا ہو، نہ کوئی معبود ہو اور نہ کوئی غیرِ معبود ہو، فقط خدا ہو۔ پھر یہ کثرت کیا ہوگی؟ یہ زمین و آسمان کیا ہوں گے؟ یہ بنی آدم و دیو و دد کیا ہوں گے؟ یہ خدا کے مقابلے میں نہیں ہیں، یہ خدا کی آیات ہیں، یہ خدا کی تجلیاں ہیں، یہ خدا کے جلوے ہیں مثلاً

کوئی شے خدا کے مقابلے میں نہیں

سورج ہوتو ایک سورج ہو، سورج کے مقابلے میں نہ سورج ہے نہ چاند ہوسکتا ہے، یہ نہ کہو کہ یہ شعاعیں کیا ہیں؟ یہ شعاعیں تو سورج کی شعاعیں ہیں، یہ سورج کے وجود کی دلیل ہیں، یہ تاکید کررہی ہیں کہ فقط سورج ہے یعنی یہ کہ جن کو آپ خدا کے مقابلے میں سمجھتے ہو، یہ بنی آدم و دیو و دد یہ خدا کے مقابلے میں نہیں ہیں بلکہ یہ تاکید کررہے ہیں کہ غیر از خدا کچھ بھی نہیں ہے،

ھر گیاھی کہ از زمین روید

وحدہٗ لاشریک لہ گوید

یعنی یہ ہر پتہ جو زمین سے اگتا ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے یعنی ہر موجود دلیل بر توحیدِ خدا ہے، بقول اہلِ معرفت کے کہ ان سے پوچھا گیا روئے زمین پر اور کائنات کے اندر خدا کی وحدانیت کی کتنی دلیلیں ہیں؟ کہا کہ جتنے موجودات ہیں۔ وجودِ خداوند تبارک وتعالیٰ پر ہر ذرّہ ایک برہانِ مستقل ہے، ہر چیز پکار کر کہہ رہی ہے، وحدہٗ لاشریک لہٗ، اس کے ساتھ کوئی شریک موجود نہیں ہے،

☆ ومن لا یراہ فی کل ما یراہ......

وہ شخص کہ جو ہر چیز دیکھتا ہے مگر اس میں اس کو خدا نظر نہیں آتا تو

☆ فکأنہ ما عرفہ......

اس نے خدا کو نہیں پہچانا،

☆قال امیر المؤمنین علیہ السلام: ما رأیت شیئاً الاّ ورایت اللّٰہ فیہ......

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی مگر اس میں خدا دیکھا ہے، چونکہ امیر المومنین علیہ السلام وہ فن و ہنر اور وہ معرفت و درایت رکھتے تھے کہ یہ لطفِ خدا شاملِ حال تھا کہ اشیاء کو اسی چہرے سے دیکھتے تھے کہ جس چہرے سے خدا نظر آتا ہے، نہ کہ اس چہرے سے کہ جس چہرے سے اشیاء، اشیاء نظر آتی ہیں بلکہ ہر چیز آیتِ خدا نظر آتی تھی اور امیر المومنین علیہ السلام کا یہ بھی فرمانا ہے کہ سب سے بڑی آیتِ خدا میں خود ہوں،

وَمَا لِلّٰهِ آيَةٌ أَكْبَرُ مِنِّی...... (۱۶)

اور اللہ کی کوئی آیت مجھ سے بڑی (بزرگ و عظیم المرتبت) نہیں ہے......

اور جیسے عرض کیا تھا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ ہر شے کے دو چہرے ہیں، ایک چہرے سے وہ خود اپنا پتہ بتاتی ہے اور ایک چہرے سے خدا کا پتہ بتاتی ہے لیکن علی علیہ السلام دونوں چہروں سے خدا کا پتہ بتاتے ہیں، علی علیہ السلام کا جو چہرہ علوی چہرہ ہے اس چہرے سے بھی وہ نشانیٔ خدا ہیں اور علی علیہ السلام کے اندر جو چہرۂ وجہ اللہ ہے وہ بھی علامتِ خدا و نشانیٔ خدا ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

لَا تَسُبُّوا عَلِيّاً فَإِنَّهُ مَمْسُوسٌ فِي ذَاتِ اللّٰهِ...... (۱۷)

تم علیؑ کو گالی نہ دو (برا بھلا نہ کہو) بے شک یہ ذاتِ خدا میں ضم ہے (جذب ہے)......

علی علیہ السلام کو کبھی بھی ناسزا نہیں کہنا چونکہ علی علیہ السلام فانی در ذاتِ خدا ہے یعنی حتیٰ علی علیہ السلام کا وہ چہرۂ دیگر کہ جو چہرہ فانی ہوتا ہے وہ چہرہ بھی فانی در ذاتِ خداوند تبارک و تعالیٰ ہے، لہٰذا فرمایا کہ

وَمَا لِلّٰهِ آيَةٌ أَكْبَرُ مِنِّی......

۱۱)اشیاء کی حقیقی دید کی ضرورت

☆ ومن عرفه عرف ان كل شیء ما خلا الله باطل......

اور جس نے خدا کو پہچان لیا، خدا کی شناخت کی علامت یہ ہے کہ ماسوا اللہ انسان کو ہر شے ہالک نظر آئے، ہر شے فانی نظر آئے نہ کہ ہر شے فانی ہوگی کہ فقط کہیں پر خبر پڑھ لے، کسی روایت کو پڑھ لے، کسی شعر میں پڑھ لے کہ

علی کل شیء ما خلا الله باطل،

یا آیہ قرآن پڑھ لے کہ

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ......

اور اس کا معنی کیا کرے؟ کلّ شیء سیھلک یعنی ہر چیز بعد میں ہلاک ہو جائے گی یعنی ابھی ہالک نہیں ہے بلکہ ابھی تو موجود ہے۔

اگر ابھی موجود نظر آ رہی ہے تو اس کے معانی یہ ہیں کہ صحیح نظر نہیں آ رہی ہے، چونکہ آپ کو پائیدار نظر آ رہی ہے۔ناپائیدار جب پائیدار نظر آئے تو ہم اس کو حقیقی طور پر نہیں دیکھ رہے ہیں مثلاً ایک چیز جو رکی ہوئی ہے اور ہمیں چلتی ہوئی نظر آئے اور ایک چیز جو چل رہی ہے وہ ہمیں رکی ہوئی نظر آئے تو اس کے معانی یہ ہیں کہ ہم درست نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بسا اوقات انسان کسی تیز رفتار گاڑی مثلاً ٹرین پر سفر کرتا ہے تو اطراف میں درخت، کھمبے اور گھر چلتے ہوئے، حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ دیدِ اشتباہ ہے چونکہ وہ تو ثابت ہیں لیکن گاڑی چل رہی ہے، جو چیز چل

رہی ہے وہ ہمیں ثابت نظر آتی ہے اور جو چیز رکی ہوئی ہے وہ حرکت میں نظر آتی ہے لہٰذا ہماری دید خطا کر رہی ہے، ہماری دید اشتباہ کر رہی ہے، اسی طرح سے بہت ساری خطائیں ہیں اور انسان ان پر ایمان رکھتا ہے مثلاً ہمیں سورج طلوع وغروب ہوتا ہوا نظر آتا ہے درحالیکہ سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد چکر لگا رہی ہے لہٰذا زمین طلوع وغروب کرتی ہے نہ کہ سورج طلوع وغروب کرتا ہے۔

اسی طرح قرآن نے بھی متوجہ کیا ہے کہ آیا آپ ان پہاڑوں کیلئے گمان کرتے ہو کہ یہ جامد اور رکے ہوئے ہیں؟

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ اِنَّهٗ خَبِيْرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ○(۱۸)

اور تم دیکھو گے تو سمجھو گے کہ جیسے پہاڑ اپنی جگہ پر جامد ہیں حالانکہ یہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے، یہ اس خدا کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو محکم بنایا ہے اور وہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ......

یہ پہاڑ بادلوں کی طرح گزر رہے ہیں۔ اگر ہم روزانہ پہاڑوں کو دیکھیں اور دقت کے ساتھ نگاہ کرے تو پھر بھی یہ ہمیں رکے ہوئے ہی نظر آتے ہیں، معلوم ہوا کہ ابھی وہ آنکھ، وہ دید قرآنی نہیں ملی ہے، قرآن خود کہتا ہے کہ آپ پہاڑوں کو کیا سمجھتے ہو؟ پہاڑ رکے ہوئے ہیں؟ نہیں، یہ پہاڑ رکے ہوئے نہیں ہیں،

تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ......

یہ بادلوں کی طرح گزر رہے ہیں، کون آئے کہ جو آ کر ایسی دید خدا دے کہ جو پہاڑوں کو بھی گزرتا ہوا دیکھے، پہاڑوں کو بھی ہالک دیکھے۔

ہمیں چلتی ہوئی نہریں رکی ہوئی نظر آتی ہیں، اگر ایک ایسی نہر کہ جس کے اندر موج نہ ہو اور ہموار زمین پر پانی بہہ رہا ہو تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ پانی رکا ہوا ہے، جب ہمیں چلتی ہوئی نہر رکی ہوئی نظر آتی ہے تو پہاڑ کس طرح سے چلتا ہوا نظر آئے؟ چونکہ ہم فقط اس ظاہری آنکھ سے دیکھتے ہیں، فقط موجودات کا ایک چہرہ دیکھتے ہیں، ملّا صدرؒ جیسا حکیم آئے کہ جس کو پہاڑ گزرتے ہوئے نظر آئیں، جس کو جسم بھی گزرتے ہوئے نظر آئیں، جس کو ہر چیز کے جوہر میں حرکت نظر آئے، جو ایک لحظے کے لئے بھی کہے کہ کسی چیز میں آرام اور پائیداری حاصل نہیں ہے، علامہ اقبالؒ کے بقول

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں......(۱۹)

فقط ایک چیز پائیدار ہے اور وہ تغیر ہے، فقط تغیر ثابت ہے اور ہر چیز متغیر ہے، ہر چیز ہالک ہے، ہر چیز ختم ہو رہی ہے،

علی کل شیء ما خلا اللہ باطل،

اللہ کے علاوہ ہر چیز حالتِ گزر و حالتِ فنا و نابودی کے اندر ہے،

☆ ومن عرفه......

جو اس طرح سے خدا کو پہچانے کہ

☆ **عرف ان کل شیء ما خلا اللہ باطل......**

اللہ کے علاوہ ہر چیز ہالک ہے اور باطل ہے۔

☆ **وان کل شیء ھالک الا وجھه**

ہر شے ہالک ہے یعنی ابھی ہالک ہے نہ کہ موت کے بعد ہالک ہوگی۔

اگر ہم غور کریں تو بہت ساری چیزیں ہمیں درست نظر نہیں آتیں مثلاً جب ہم ایک چولہا جلتا ہوا دیکھتے ہیں یا روشن شمع دیکھتے ہیں تو ایک مسلسل شعلہ نظر آتا ہے لیکن اسی کو مائیکرو اسکوپ (Microscope) سے دیکھیں تو آپ کو ایک عجیب منظر نظر آئے گا، وہ یہ ہے کہ مسلسل آگ جل بجھ رہی ہے یعنی مسلسل ایک شعلہ پیدا ہوتا ہے پھر وہ بجھتا ہے پھر اس کی جگہ ایک شعلۂ دیگر پیدا ہوتا ہے، جس طرح آپ ٹی وی دیکھتے ہیں مثلاً کارٹون فلم میں ایک کارٹون مسلسل حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اگر خود فلم کو روک کر دیکھیں تو کوئی حرکت نہیں ہے بلکہ فلم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں اور ان رکے ہوئے ٹکڑوں کو سرعت سے ہمارے سامنے سے گزارتے ہیں تو ہمیں وہ حرکت نظر آتی ہے یعنی جمود حرکت نظر آتا ہے اور حرکت جمود نظر آتی ہے، رکی ہوئی فلمیں ہمیں چلتی ہوئی نظر آتی ہیں اور چلتے ہوئے پہاڑ ہمیں رکے ہوئے نظر آتے ہیں، دید کی اور بصیرت کی اتنی اصلاح کی ضرورت ہے کہ کس آنکھ سے انسان انہیں دیکھے کہ حقائق ہمیں ویسے نظر آئیں کہ جیسے موجود ہیں، جس طرح سے پیغمبر اکرم ﷺ کی دعا ہے کہ

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ..... (۲۰)

اے اللہ ہمیں اشیاء کو ویسی دکھا جیسی وہ ہیں......

مجھے حقائق کو ایسا دکھا کہ جیسے یہ ہیں نہ کہ حقائق کچھ ہوں اور مجھے نظر کچھ اور آئیں۔ یہ عالم ہمیں دھوکہ دے رہا ہے یعنی ہم خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں چونکہ ہمارے اندر وہ بصیرت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ ہمیں حقائق ویسے نظر آئیں کہ جیسے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ،

کواکب کی حقیقت کچھ اور ہے اور ہمیں کچھ اور نظر آتے ہیں، زمین سے کئی گنا بڑے ستارے ہمیں ٹمٹماتے ہوئے دیے نظر آتے ہیں۔ اشیاء کا وہ پہلو کہ جو آیتِ خدا ہے، جو آئینۂ خدا ہے، جس میں خدا نظر آتا ہے وہ چہرہ ہمیں نظر نہیں آتا ہے،

☆وان کل شیء هالک الا وجهه، ای هالک......

یعنی ہر چیز ہالک ہے سوائے اس کی ذات کے لیکن کس طرح سے ہالک ہے؟ ہم کس طرح سے دیکھیں؟ انسان خدا سے دعا کرے، ارادہ کرے، عزم کرے کہ خدا مجھے وہ دید عطا کر، وہ بصیرت عطا کر کہ حقائق مجھے ویسے ہی نظر آئیں کہ جیسے یہ ہیں،

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ......

ہمیں اس طرح سے اپنے موجودات، اپنے افعال اور اپنی مخلوقات کو دکھا کہ ان میں ہم تجھے دیکھ سکیں نہ کہ تجھے بھی دیکھیں تو اس میں بھی ہمیں روٹی نظر آئے، قرآن بھی دیکھیں تو اس میں بھی ہمیں روٹیاں نظر آئیں، بعض ایسے ہیں کہ جن کو قرآن میں بھی مال اور روٹیاں نظر آتی ہیں، علم

میں بھی روٹیاں نظر آتی ہیں، انہیں ہر چیز میں درحقیقت روٹی نظر آتی ہے اور آیتِ قرآن بھی ہے کہ ہم نے یہ کتاب ہدایت کے لئے اتاری تھی اور تم نے اس میں روٹیاں دیکھنی شروع کردی ہیں، بلکہ ہم نے جو روٹیاں اتاری ہیں ان میں بھی تمہیں خدا نظر آنا چاہئے، دانے میں بھی تمہیں خدا نظر آنا چاہئے، سنبلہ میں تمہیں خدا نظر آنا چاہئے، حَبّہ میں تجھے خدا نظر آنا چاہئے اور اس کے اوپر لگے ہوئے خوشے میں تمہیں خدا نظر آنا چاہئے، پتے اور پودے میں تمہیں خدا نظر آنا چاہئے یعنی ساری مخلوقات فعل خدا ہیں، اس فعل میں تمہیں فاعل نظر آنا چاہئے، اس طرح سے دیکھیں کہ ہمیں یہ اشیاء ہالک نظر آئیں یعنی ہم دونوں چہرے دیکھ لیں کہ یہ چہرہ ہالک ہے اور یہ چہرہ باقی ہے، فرماتے ہیں کہ

☆ **ای هالک ان اعتبر شیئیته و وجوده لنفسه......**

اگر انہیں خدا سے کاٹ کر دیکھیں اور فقط اس شے کے اوپر انحصار کر کے دیکھیں تو وہ ہالک نظر آئے یعنی اگر کوئی بھی چیز اس طرح سے دیکھے کہ خدا سے اس شے کا رابطہ منقطع کر لے، صرفِ نظر کر لے، چشم پوشی کر لے تو ہر شے ہالک نظر آئے،

☆ **لا ان یعتبر وجوده من حیث انه موجود بالله و بقدرته......**

شے کو اس طرح سے نہ دیکھے کہ جس لحاظ سے شے موجود ہے بلکہ قدرتِ خدا کے ذریعے اور متصل با خدا ہو کر دیکھے، اس چہرے سے دیکھا تو ہر شے ثابت نظر آئے گی لیکن جب شے کو خدا سے کاٹ کر دیکھو تو ہالک نظر آئے گی۔ مومنِ حقیقی وہ ہے کہ جو بصیرت سے دیکھے، دونوں آنکھوں سے دیکھے اور اس کو اشیاء کے دونوں چہرے نظر آئیں، خدا نے دو آنکھیں اسی لئے دی ہیں کہ دونوں

چہرے نظر آئیں، ہم دونوں آنکھوں سے ایک چہرہ دیکھتے ہیں اور وہ اس کا وہی ہالک چہرہ ہے لیکن وہ ہمیں ثابت نظر آتا ہے،

☆ فیکون له بطریق التبعیة ثبات، وبطریق الاصالة بطلان محض......

اگر اس چیز کو تابعِ قدرتِ خدا، تابعِ ارادۂ خدا و تابعِ حکمتِ خدا جانیں تو یہ شے باقی ہے، اس کو ثبات حاصل ہے یعنی جس لحاظ سے یہ شے تابع ہے یعنی تابعِ خدا ہے تو یہ ثابت ہے لیکن اس شے کو اصالت، استقلال اور خودی سے دیکھیں تو اس لحاظ سے یہ شے بطلانِ محض ہے، اس کے اندر کچھ بھی نہیں ہے۔

۱۲)فیضِ اقدس اور فیضِ مقدس

اب یہاں پر ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اشیاء دو جگہ پر ہیں اور عوام کے بجائے حکماء کے لئے، اہل علم کے لئے یہ نکتہ زیادہ مہم ہے کہ جو اس بات کی وضاحت بھی کرتا ہے جسے قرآن نے ذکر کیا ہے اور علماء نے بیان کیا ہے کہ خدا کی ذات وحدہ ہے۔

وحدہٗ لا شریک له،

آیتِ قرآن ہے کہ

تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ......(۲۱)

تم خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان لے آؤ......

اس ذات نے ظہور کیا ہے چونکہ نور ہے،

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ...... (۲۲)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے......

اب کسی سے یہ نہ پوچھئے گا کہ اس نے ظہور کیوں کیا ہے؟ نور کا کام ہی ظہور کرنا ہے، اگر نور ظہور نہ کرے تو پھر کیا کرے؟ جس طرح سے کوئی یہ پوچھے کہ سورج نے کیوں نورانیت دی ہے؟ کیوں شعاعیں دیں ہیں؟ یہ نور ہے، نور کا کام ہی یہ ہے، نور کی تعریف وذات یہی ہے کہ اس کا کام نورانیت پھیلانا ہے،

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ......

خدا کی ذات نور ہے، اس نور سے نور کی تجلی ہوئی، اس سے اسماء وصفات وجود میں آئے، اسماء وصفات سے پھر افعالِ الٰہی پیدا ہوئے اور اب یہ سب کے سب افعالِ الٰہی اسی تجلی کے ساتھ مربوط ہیں۔ پہلی تجلی یہ ہوئی کہ خود ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ نے ظہور کیا اور ظہورِ ذات سے اسماء و صفات پیدا ہوئے، جن میں سے ایک مرتبہ علم کا ہے یعنی علمِ الٰہی کا ایک مرتبہ پیدا ہوا۔ خدا ذاتِ علیم ہے، سب سے پہلے اشیاء علمِ خدا میں پیدا ہوئیں ہیں، پھر علمِ خدا سے وجود میں آئی ہیں اور اس عالم میں آئی ہیں۔

بعض ادیبوں نے اسے خوبصورتی سے نقل کیا ہے کہ اس کو دو خلقتیں کہتے ہیں، خدا کے دو فیض ہیں، فیضِ اقدس اور فیضِ مقدس۔ فیضِ اقدس یعنی خلقتِ اشیاء در عالمِ علمِ خدا اور فیضِ مقدس

یعنی خلقتِ اشیاء ودر عالمِ ہستی یعنی آپ پہلے علمِ الٰہی میں پیدا ہوئے ہیں پھر علمِ الٰہی سے اس عالمِ عینی میں اترے ہیں، جس طرح سے آپ خود کوئی چیز ایجاد کرتے ہیں، تعجب نہ کریں کہ خدا نے یہ کام کیسے کیا؟ مثلاً آپ ایک کتاب یا مقالہ لکھتے ہیں تو پہلے کہاں پر لکھتے ہیں؟ ذہن میں لکھتے ہیں، پھر کاغذ پر لکھتے ہیں یعنی کاغذ پر جو کچھ آتا ہے وہ پہلے آپ کے ذہن سے آتا ہے، علم سے آتا ہے، ذہن عالمِ علم ہے، عالمِ علم سے ہر چیز ذہن میں نزول کرتی ہے، اسی طرح سے ہر چیز علمِ الٰہی سے اس عالم میں اتری ہے، پہلے اس نے وجودِ علمی پایا ہے لہٰذا اشیاء پہلے عالمِ علمِ خدا میں آئی ہیں، ظہور کیا ہے پھر اشیاء کو عالمِ علم سے اس عالمِ عینی میں اتارا گیا ہے، اہل علم واہلِ معرفت کی اصطلاح میں ایک کو فیض مقدس کہتے ہیں اور دوسرے کو فیضِ اقدس کہتے ہیں۔

۱۳) باطل الوجود اور باطل الذات کا مطلب

یہ بزرگان فرماتے ہیں کہ اشیاء جب عالمِ علم میں موجود تھیں تو وجودِ عینی نہیں تھا، ان کا یہ وجود نہیں تھا کہ جیسے آج موجود ہیں مثلاً یہ زمین و آسمان جب عالمِ علمِ خدا میں تھے تو یہاں نہیں تھے، ان کا وجودِ زمینی، وجودِ آسمانی اور وجودِ جسمانی نہیں تھا، یہ اشیاء اس ظاہری وجود سے خالی تھیں، یہ حقائق اس وجود کے بغیر تھے اور چونکہ اس وجود کے بغیر تھے تو اس لحاظ سے انہیں کہا جاتا ہے کہ وہ چیزیں بھی باطل تھیں یعنی وہ موجود نہیں تھیں، وہ چیزیں فانی تھیں یعنی ان کا وجود کے لحاظ سے باطل ہونا اور ان کا اپنی ذات کے لحاظ سے باطل ہونا یہ دو بطلان ہیں، فرماتے ہیں کہ یہ جو ہم نے یہاں پر

ذکر کیا ہے اس کو آپ مخلوط نہ کر دیں، اگر کسی نے کتاب میں پڑھا ہوا ہے یا سنا ہوا ہے یا پڑھیں گے تو انشاء اللہ بعد میں یہ دونوں مطلب آپس میں مخلوط نہیں کر دینا کہ اشیاء جو علمِ خدا میں موجود ہیں لیکن ابھی اس عالمِ عینی میں یہ اشیاء نہیں اتری ہیں ان کے بارے میں بھی کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ باطل ہیں لیکن ان کو کہا جاتا ہے کہ یہ باطل الوجود ہیں نہ کہ باطل الذات ہیں، لیکن اگر اب وہ علمِ خدا سے اس عالم میں آجائیں، اِس عالم یعنی یہی جو ہمارے اطراف میں ہے، اردگرد ہے، یعنی ہم خود اور یہ ساری چیزیں تو اس عالم میں کہا جاتا ہے کہ یہ اشیاء باطل الذات ہیں۔ وہاں ان کو باطل الوجود کہا جاتا ہے یعنی ان کو علمِ خدا میں علمی تحقق و علمی حیثیت حاصل ہے لیکن وجودی حیثیت حاصل نہیں ہے لیکن یہی اشیاء اب جب اِس عالم میں پیدا ہوگئی ہیں تو ان کو حتیٰ ذاتی حیثیت بھی حاصل نہیں ہے، وہاں ذات تھی وجود نہیں تھا، یہاں نہ ذات ہے اور نہ ہی وجود ہے، پھر یہ سب کچھ کیا ہیں؟ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ تجلیٔ خدا ہیں، یہ سب کچھ فیضِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں یعنی وہ پہلو جو وجہ الٰہی کا پہلو ہے اس کی وجہ سے باقی ہیں لیکن اس پہلو سے کاٹ کر دیکھیں تو کچھ بھی نہیں ہیں بلکہ ہالک الذات ہیں۔

باطل الوجود اور باطل الذات کا مطلب

☆ **فیکون له بطریق التبعیة ثبات، وبطریق الاصالة بطلان محض، وهذا البطلان غیر بطلان الماهیات و الاعیان الثابتة......**

ان بزرگانِ کیلئے یہ اعیانِ ثابتہ ہیں یعنی علمِ الٰہی میں موجود، وجودِ علمی کے ذریعے موجود حقائق کو اصطلاح میں اعیانِ ثابتہ کہتے ہیں، وہ موجودات جو ابھی اس عالمِ جسمانی، عالمِ کائنات، عالمِ ہستی میں نہیں اترے ہیں بلکہ ابھی علمِ الٰہی میں ہیں وہ اعیانِ ثابتہ ہیں، وہ بھی باطل ہیں،

☆ اذا اخذت من حیث ھی، او مجردۃ عن الوجود......

یعنی جب ان ماہیات یا ان حقائق کو کہ جو علمِ خدا میں ہیں جب انہیں لحاظ کیا جائے تو یہ خالی از وجود ہیں، مجرد از وجود ہیں چونکہ ان میں وجود نہیں ہے لہٰذا ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ باطل ہیں یعنی وجود نہیں رکھتی ہیں، اس معنیٰ میں ان کو باطل کہا جاتا ہے،

☆ فانھا من تلک الحیثیۃ باطلۃ الوجود......

وہ حقائق جو علمِ الٰہی میں موجود ہیں چونکہ وہ وجودِ عینی نہیں ہیں لہٰذا اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ باطل ہیں، یہ باطل فقہی اصطلاح والا باطل نہیں ہے، جیسے نماز باطل ہوتی ہے، وضو باطل ہوجاتا ہے، فقہ میں باطل کا معنیٰ ہوتا ہے ناصحیح یعنی جس طرح سے حدِ شرعی تھی، دستورِ خدا تھا، امرِ خدا تھا یہ اس کے مطابق نہیں ہے، چونکہ بسا اوقات ہوتا ہے کہ ذہنوں میں کسی علم کی ایک اصطلاح بیٹھی ہوتی ہے اور پھر اسی کے تناظر میں ساری چیزوں کی تفسیر و معنیٰ کرتے ہیں اور بات بجائے سنورنے کے بگڑ جاتی ہے۔ استادِ بزرگوار حضرت آیت اللہ تبریزی دام ظلہ العالی ہفتے کے اندر چار دن کتاب طہارت کا درس دیتے تھے اور ایک دن دیات کا درس دیتے تھے، ایک نئے طالب علم کو ان کے درس دینے کا طریقہ معلوم نہیں تھا لہٰذا ان چار دنوں میں اس نے شرکت کی تو طہارت کی بحث ہو رہی تھی، وضو کی بات ہو رہی تھی، مبطلاتِ وضو کی بات ہو رہی تھی اور پانچویں دن جب بحث شروع ہوئی تو وہ حدود کی بحث تھی اور بحث شروع ہی ایسے ہوئی کہ مثلاً اگر یہ مکلّف مرتکب ہو، اس قسم کی خطا کرے تو اتنے کوڑے ماریں جائیں گے تو یہ فوراً حیران ہوا کہ طہارت نہ کرنے پر کس کو کوڑے مارے جائیں

گے؟ کس فقیہ نے آج تک یہ مسئلہ دیا ہے؟ چونکہ وہ اس وادی میں نہیں تھا، اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اور بحث تھی اور یہ اور بحث ہو رہی ہے تو یہاں بھی اسی طرح نہ ہو جائے کہ ذہنیتیں آپس میں مل جائیں۔ فقہ کے اندر باطل اور صحیح کی اصطلاح ہے کہ نماز صحیح ہے، نماز باطل ہے، وضو باطل ہے، وضو صحیح ہے، وہ اور چیز ہے لیکن یہ بطلانِ حقائق کی بات ہو رہی ہے نہ کہ بطلانِ نماز کی۔

ایک حقیقتِ باطل ہے، یہاں باطل سے مراد یہ ہے کہ موجود نہیں ہے، یہاں بطلان بمعنیٰ عدم ہے، نیستی ہے، نہ ہونا ہے، باطل ہو جانا یعنی فانی ہوگئی ہے۔ یہ شے نہیں ہے یعنی یہ شے اب موجود نہیں ہے،

☆ فانها من تلک الحیثیة باطلة الوجود، ثابتة الشیئیته......

اس کی شیئت ثابت ہے لیکن وجود باطل ہے،

☆ بخلاف الهویات الوجودیة......

درحالیکہ یہ موجودات وحقائق کہ جن سے ہمیں سروکار ہے اگر انسان ان کو درست دیکھے اور ان کے دونوں چہرے دیکھے تو

☆ فانها مأخوذة علی وجه الاستقلال باطلات صرفة......

یہ باطلِ محض ہیں،

☆ وهذا مفتاح من مفاتیح علم المکاشفة.

اور فرماتے ہیں کہ یہ بات ایک مفتاح ہے، مفاتیحِ علم میں سے، علم کی چابیوں میں اگر چند

باطل الوجود اور باطل الذات کا مطلب

مفتاح ہوں تو یہ ایک مفتاح ہے، مفاتیح کی اگر مفتاح ہو تو پھر الگ بحث ہے لیکن اگر مفاتیح جمعِ مفتاح ہو تو اس کے معانی یہ ہیں کہ یہ ایک چابیِ علمی ہے لیکن یہ چابی کس کے ہاتھ آتی ہے؟ یہ ان کے ہاتھ لگتی ہے کہ جو علومِ حضوری اور علومِ مکاشفات پر قدرت رکھتے ہوں یعنی جنہوں نے اپنے نفس کو، اپنے دل کو، اپنے قلب کو پاک کر لیا ہو تو یہ چابیاں ان کو دے دی جاتی ہیں۔ علم کی چابیاں کہ اسرارِ حقائق وعلوم ان چابیوں سے کھلتے ہیں اور خداوند تبارک وتعالیٰ نے بعض پر یہ لطفِ عنایت کیا ہے، یہ راستہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے، اپنے آپ کو کم ہمت نہ سمجھیں، انسان کی قیمت بھی بقدرِ ہمتِ انسان ہے، اپنی قدرِ ہمت بڑھائیں، مقدارِ ہمت بالا کریں تا کہ قدرِ انسان بڑھ جائے، قیمتِ انسان بڑھ جائے اور جب قیمتِ انسان بڑھ جائے تو پھر وہ خزانے انسان کے اوپر کھل جاتے ہیں۔ انشاء اللہ اس کتاب کی جلد دوم میں فہم قرآن کے باقی پانچ آداب تحریر کئے جائیں گے۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ عنکبوت، آیہ ۶۹)

(۲)......(نهج البلاغه)(تفسير الميزان-العلامة الطباطبائیؒ، بحث روائى، الجزء۶، صفحه ۵۰)(شرح أصول الكافى - مولى محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء۳، صفحه ۳۲۰)(الأمثال القرآنية القياسية المضروبة للايمان بالله - عبد الله بن عبد الرحمن الجربوع، الجزء۱، صفحه ۲۶۴)(الكليني والكافى - الشيخ عبد الرسول الغفارى، الجزء۱، صفحه ۳۱۴)(شرح نهج البلاغة - ابن ابى الحديد، الجزء۱، صفحه ۶۷)(یک هزار سخن از حضرت علیؑ، الجزء۶، صفحه ۱)(ميزان الحكمة - الريشهرى، الجزء۳، صفحه ۲۸۶)

(۳)......(التفسير الأصفى - الفيض الكاشانیؒ، الجزء۱، صفحه ۱۱۰)(تفسير كنز الدقائق - الميرزا محمد المشهدیؒ، الجزء۱، صفحه ۴۷۲)(تفسير نور الثقلين، الجزء۱، صفحه ۱۹۹)(تلخيص البيان فى مجازات القرآن موافقا للمطبوع - الشريف الرضیؒ)(تفسير القمیؒ، الجزء۱، صفحه۶)(أسباب النزول فى ضوء روايات أهل البيت)(كشف اليقين - العلامة الحلیؒ)(التفسير الصافي - الفيض الكاشانیؒ، الجزء۱، صفحه ۲۵۰)(أحكام القرآن- القاضى محمد بن عبد الله أبو بكر بن العربى المعافرى الاشبيلى المالكى (المتوفى: ۵۴۳ھ، الجزء۳، صفحه۸۶)(معترك الأقران فى اعجاز القرآن، ويُسمَّى (اعجاز القرآن ومعترك الأقران)- عبد الرحمن بن أبى بكر، جلال

الدين السيوطی،المتوفی ۹۱۱ ھ،الجزء۳،صفحه ۳۶۰)(روح المعانی فی تفسير القرآن العظيم والسبع المثانی- شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسينی الألوسی، الجزء۱۳،صفحه۲۰)(بيان المعانی-عبد القادر بن ملّا حويش السيد محمود آل غازی العانی،الجزء۲،صفحه۵۲۵)(المفردات فی غريب القرآن - ابو القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الأصفهانی،الجزء۱، صفحه ۱۵۰)(شرح أصول الكافی - محمد صالح المازندرانیؒ،الجزء۱،صفحه۲۶)

(۴)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۱۵۶)

(۵)......(مثنوی معنوی،به تصحيح :رينولد ا.نيكلسون،دفتر اول،صفحه ۵)

(۶) .... (سورۂ مبارکہ یٰس،آیہ۶۹)

(۷)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۲۴۷)(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۲۶۱)(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۲۶۸) (سورۂ مبارکہ مائدہ،آیہ۵۴)(سورۂ مبارکہ نور،آیہ۳۲)(سورۂ مبارکہ آل عمران،آیہ۷۳)

(۸)..... (سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۲۰۹)،(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۲۲۰)(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۲۶۰) (سورۂ مبارکہ انفال،آیہ۱۰)(سورۂ مبارکہ توبہ،آیہ۱۷)(سورۂ مبارکہ لقمان،آیہ۲۷)

(۹)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۲۳۵)(سورۂ مبارکہ آل عمران،آیہ۱۵۵)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۱۱۵)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ رحمٰن،آیہ۲۷،۲۶)

(۱۲)......(ارشاد القلوب،الجزء۲،صفحه ۲)(متشابه القرآن،الجزء۱، صفحه ۱۱۶)(مختصر بصائر الدرجات- الحسن بن سليمان الحلی،الجزء۱،

صفحہ۱۶۷)(مستدرک سفینۃ البحار - آیۃ اللّٰہ الشیخ علی النمازی، الجزء۳،صفحہ۴۴۰)

(۱۳)......(أهل البیت فی تفاسیر أهل السنۃ)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ قصص،آیہ۸۸)

(۱۵).. .(کلیات سعدی،بر اساس نسخہ محمد علی فروغی،صفحہ۲۸۰)

(۱۶)......(مسند الامام علیؑ)(تفسیر القمی - ابی الحسن علی بن ابراهیم القمیؒ)(تفسیر نور الثقلین)(مسند الامام الرضا (ع)- الشیخ عزیز اللّٰہ عطاردی،الجزء۲،صفحہ۹۴)(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ،الجزء۳۶،صفحہ۱) (موسوعۃ الامام علی بن أبی طالب علیہ السلام فی الکتاب و السنۃ و التاریخ، الجزء۹،صفحہ۱۸۴)

(۱۷)....(غریب الحدیث فی بحار الانوار،الجزء۳،صفحہ۱۹۷)(شرح نهج البلاغہ -جعفری)(شعراء الغدیر فی القرن الحادی عشر،الجزء۷،صفحہ۱۸)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ نحل،آیہ۸۸)

(۱۹)......(بانگِ درا،عنوان :ستارہ،صفحہ۱۱۱)

(۲۰)......(تفسیر رازی،باب ۷۵،الجزء۶،صفحہ۳۴۳)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ ممتحنہ،آیہ۴)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ نور،آیہ۳۵)

فہرستیں

▼ فہرست آیات 738

▼ فہرست روایات 763

▼ فہرست دعا و مناجات 768

▼ فہرست اشعار 770

▼ فہرست متفرقات 782

▼ فہرست منابع و مآخذ 783

فہرست آیات

	آیت	صفحہ
سورۂ فاتحہ		
اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُo	۵	580,716
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo	۱	619
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَo	۲	619
سورۂ بقرہ		
شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْآنُ......	۱۸۵	19
ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَo	۲	23
ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَo	۲	34
ھُدًی لِّلنَّاسِ......	۱۸۵	34
وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ......	۱۸۶	56
نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ......	۱۷۶	56
قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ......	۹۷	57
سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ......	۶	69,295,315,325,338
خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ......	۷	69,295,325

	آیت	صفحہ
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ......	۷۴	71,98,296,299,332
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۱۰	71,324
وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ..	۵۷	161
وَاِذْ قُلْتُمْ يَا مُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى......	۶۱	165
فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ......	۶۱	167
يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا......	۶۱	167
يَا مُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ......	۵۵	205
يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ......	۱۸۳	252
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ......	۲۲۲	313
وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا......	۲۸۳	320
وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ......	۸۸	333
وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ......	۹۳	335
اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ......	۷۵	347
وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ٥	۴۵	377,420
رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ	۲۰۱	395
رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا......	۲۵۰	395
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ......	۶۸،۶۹،۷۰	397
قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ... ..	۲۵۸	397
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ......	۲۹	535

	آیت	صفحہ
وَأُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo	۵	568
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَo	۱۵۶	696
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌo	۲۴۷،۲۶۱،۲۶۸	704
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌo	۲۰۹،۲۲۰،۲۶۰	704
أَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌo	۲۳۵	704
وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا......	۱۱۵	709

سورۂ آلِ عمران

هُدًى لِّلنَّاسِ......	۴	30,53
هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَo	۱۳۸	34
نَزَّلَ عَلَيْکَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا......	۳	56
لِأُولِي الْأَلْبَابِ......	۱۹۰	68
رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ......	۱۹۳	206,396
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ......	۱۶۹	263
وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ......	۷۷	310
فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ......	۱۵۹	317
هُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ عَلَيْکَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ......	۷	328
رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا......	۸	329,395
وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا وَقِيْلَ لَهُمْ......	۱۶۷	335

	آیت	صفحہ
أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَاءَ......	١٦٢	370
إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ......	٥١	397
زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ......	١٤	477
إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ.....	١٩٠	557,560,583
وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ○	١٠٤	568
بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا......	١٦٤	677
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ○	٧٣	704
أَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ○	١٥٥	704

سورۂ نساء

	آیت	صفحہ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللّٰهِ......	١٣٦	56
أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ......	٨٢	96,515,518,608
أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً......	١٥٣	207
مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ......	٤٦	346
فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ......	١٣	346
يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ......	١٤	346
لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ......	٩٥	369
وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ	٨١	515

	آیت	صفحہ
سورۂ مائدہ		
فَاتَّقُوا اللّٰهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَo	۱۰۰	69
قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً......	۱۳	70
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۵۲	71
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۵۲	324
فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ......	۱۳	332
قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ......	۱۰۰	374
اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ......	۴۴	416
يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ......	۶۷،۴۱	567
اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ......	۱۱۸	582
يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ......	۶۷	597
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌo	۵۴	704
سورۂ انعام		
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً......	۹۹	37
فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ	۱۲۵	60,273
فَلَوْلَا اِذْ جَاءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا......	۴۳	70
وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ......	۵۹	158

	آیت	صفحہ
وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا......	۲۵	333
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ○	۳۷	357
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ......	۵۰	370
أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا......	۱۲۲	370
وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ......	۱۲۱	382
قُلْ مَنْ أَنزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ......	۹۱	417
وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ......	۳۲	477

سورۂ اعراف

قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ......	۶۰	31
قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ......	۶۶	31
قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ......	۷۵	31
وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ......	۹۰	32
قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ......	۸۸	32
قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ......	۱۰۹	32
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ○	۱۲۸	35
إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ......	۱۹۶	56
وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا	۲۰۴	100
وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ كُلُوا......	۱۶۰	161

	آیت	صفحہ
لَنْ تَرَانِیْ......	۱۴۳	207
وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا......	۱۴۳	208
فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا......	۱۴۳	208,232
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ......	۱۷۶	305
فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ......	۱۷۶	306
خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ٥	۱۲	318
اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ......	۱۲	318,320
تِلْكَ الْقُرٰی نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا......	۱۰۱	327
وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ......	۱۷۹	328,537,553
اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ٥	۱۳۱	357
رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ٥	۱۲۶	396
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ......	۱۳۴	397

سورۂ انفال

	آیت	صفحہ
فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۴۹	71
اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ......	۲۴	226
اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ٥	۳۴	357
اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ٥	۱۰	704

	آیت	صفحہ

سورۂ توبہ

	آیت	صفحہ
فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۱۲۵	71
خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ......	۱۰۳	303
اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَأْذِنُوْنَكَ......	۹۳	326
لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ......	۱۱۷	329
وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ......	۱۵	336
فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ......	۷۷	335
لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً......	۱۱۰	336
أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ......	۱۹	368
لَا تَقُمْ فِيْهِ أَبَدًا لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ......	۱۰۸	489
وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○	۸۸	568
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ○	۷۱	704

سورۂ یونس

	آیت	صفحہ
ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ......	۷۴	327
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ○	۵۵	357

	آیت	صفحہ
سورۂ ہود		
فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرَاكَ......	۲۷	32
مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْأَعْمٰى وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ......	۲۴	369
وَاِلٰى ثَمُوْدَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ......	۶۱	397
سورۂ یوسف		
اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ٥	۲	95,96
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ......	۳	96
قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ......	۹۸	398
لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ......	۱۱۱	557
سورۂ رعد		
أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً......	۱۷	37
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ......	۱۶	371
أَفَمَنْ يَّعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ......	۱۹	371
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ٥	۴	508

	آیت	صفحہ
سورۂ ابراہیمؑ		
رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ......	۴۱	396
سورۂ حجر		
نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ......	۶	57
وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ	۲۱	158
فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ	۳۴	179
وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ......	۴۷	334
رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا......	۲	467
ذَرْهُمْ یَاْکُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا......	۳	467
لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَo	۳۹	480
سورۂ نحل		
وَهُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَo	۱۰۲	34
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً......	۶۵،۱۰	37
فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ......	۹۸	100,347,354,519
ذٰلِکَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیَاةَ الدُّنْیَا......	۱۰۷	322
اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ......	۱۰۸	322,326

	آیت	صفحہ
أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ٥	۱۰۱، ۷۵	357
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا......	۷۵	368
وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا......	۷۶	368
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى......	۹۷	518
سورۂ اسراء		
وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ......	۷۹	60,61
وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ أَكِنَّةً......	۴۶	333
اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ......	۱۴	573
سورۂ کہف		
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ......	۲۸	321
سورۂ مریم		
تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا......	۶۳	35
سورۂ طٰہٰ		
يَا بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنَاكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ......	۸۰	162

	آیت	صفحہ
وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًاo	۱۱۴	455

سورۂ انبیاء

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ......	۳	337,456,465
أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ......	۲۴	357
اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ......	۱	465
مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ......	۲	465

سورۂ حج

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً......	۶۳	37
وَالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ......	۵۳	70
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۵۳	71
فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى......	۴۶	329
أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ......	۶۵	536

سورۂ مؤمنون

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَا......	۲۴	33
وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا......	۳۳	33

	آیت	صفحہ
قَدْ كَانَتْ آيَاتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ......	۶۶	520
مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ○	۶۷	520
أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَ هُمْ......	۶۸	520
أَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ○	۶۹	520

سورۂ نور

اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ......	۲۶	375,404
فِيْ بُيُوْتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ......	۳۶	486
رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ......	۳۷	486,491
وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○	۵۱	568
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ○	۳۲	704
اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ......	۳۵	728

سورۂ فرقان

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا......	۳۰	27
قُلْ أَذٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ......	۱۵	35
تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ......	۱	57
بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا○	۴۱	677

	آیت	صفحہ
سورۂ شعراء		
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍO	۱۹۵	90
سورۂ نمل		
هُدًى وَّبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَO	۲	34
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَO	۶۱	357
وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ......	۸۸	722
سورۂ قصص		
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَO	۸۳	35
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَO	۱۳،۵۷	357
أَفَمَنْ وَّعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيهِ......	۶۱	372
كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ......	۸۸	713,721
سورۂ عنکبوت		
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْقِلُونَO	۶۳	357
وَمَا هٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ......	۶۴	476
وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً......	۳۵	508

	آیت	صفحہ
وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا......	٦٩	574,694

سورۂ روم

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ......	٥٩	326
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَo	٢٤	508
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo	٣٨	568

سورۂ لقمان

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَo	٣	34
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ......	١٩	128
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَo	٢٥	357
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍo	١٨	357
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ......	٦	473
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo	٥	568
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌo	٢٧	704

سورۂ سجدہ

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا......	١٨	368

	آیت	صفحہ
سورۂ احزاب		
اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ......	۳۳	52
فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۱۲،٦٠	71
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ......	۲۳	176
سورۂ فاطر		
أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً......	۲۷	37
وَمَا يَسْتَوِی الْبَحْرَانِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ......	۱۲	371
وَمَا يَسْتَوِی الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُo	۱۹	371
وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّوْرُo	۲۰	371
وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُo	۲۱	371
وَمَا يَسْتَوِی الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ......	۲۲	371
سورۂ یٰس		
وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ......	۱۷	301
وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِیْ لَهٗ......	۶۹	701

	آیت	صفحہ
سورۂ ص		
لِأُولِی الْأَلْبَابِ......	۴۳	68
كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ......	۲۹	94,521
فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ......	۷۷	179
خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ٥	۷۶	318
أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ......	۷۶	318,320
وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ......	۴۳	557
سورۂ زمر		
أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً......	۲۱	37
الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ......	۱۸	68
فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ......	۲۲	70,332
وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ......	۴۵	330
أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ......	۲۲	332
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ٥	۴۹،۲۹	357
ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ......	۲۹	369
أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا......	۹	372

	آیت	صفحہ
سورۂ غافر (مؤمن)		
لِأُولِي الْأَلْبَابِ......	۵۴	68
الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ آيَاتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ......	۳۵	317
وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ......	۵۸	372
هُدًى وَّذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ٥	۵۴	558
سورۂ فصلت		
كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهٗ قُرْآنًا عَرَبِيًّا......	۳	90
تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ٥	۴۲	90
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ......	۴	92
وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْ أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَا......	۵	93
سورۂ زخرف		
إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ٥	۳	90
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ......	۴۹	397

	آیت	صفحہ
سورۂ دخان		
اِنَّا اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ......	۳	210
اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ o	۳۹	357
سورۂ محمدؐ		
اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا o	۲۴	70,331,521
فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ......	۲۰،۲۹	71
اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّہُمۡ......	۲۳	88
وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡکَ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوۡا......	۱۶	326
اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ......	۱۴	373
مَثَلُ الۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ فِیۡہَا......	۱۵	373
اِنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّلَہۡوٌ......	۳۶	476
سورۂ فتح		
بَلۡ کَانُوۡا لَا یَفۡقَہُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا o	۱۵	357
ہُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡکُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ......	۲۵	489
سورۂ حجرات		
اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ o	۴	357

	آیت	صفحہ
سورۂ قٓ		
وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِo	۱۶	226
سورۂ طور		
أَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَo	۴۷	357
سورۂ قمر		
وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍo	۴۰،۳۲،۲۲،۱۷	73
سورۂ رحمٰن		
هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِىۡ يُكَذِّبُ بِهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَo	۴۳	538
يَطُوۡفُوۡنَ بَيۡنَهَا وَبَيۡنَ حَمِيۡمٍ اٰنٍo	۴۴	538
فَبِاَىِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِo	۴۵	538
كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍo	۲۶	709
وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِo	۲۷	709

	آیت	صفحہ
سورۂ واقعہ		
اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌ ○	۷۷	23,51,54,75,96
فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ○	۷۸	23,54,75,96
لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ○	۷۹	23,54,75,96
تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ○	۸۰	75,91
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ○	۸۵	226

	آیت	صفحہ
سورۂ حدید		
فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ......	۱۶	70
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ○	۲۳	357
وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ......	۱۰	373
اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ......	۲۰	475

	آیت	صفحہ
سورۂ حشر		
لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ......	۲۱	208
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ......	۱۹	265,266
وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا......	۱۰	334
لَا يَسْتَوِيْ اَصْحَابُ النَّارِ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ......	۲۰	374

	آیت	صفحہ
سورۂ ممتحنہ		
تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ......	۴	727
سورۂ جمعہ		
هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ	۲	302
مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا......	۵	305
يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا نُوْدِىَ لِلصَّلَاةِ مِنْ......	۹	463
فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ......	۱۰	463,702
وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا......	۱۱	463
سورۂ منافقون		
سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ......	۶	315
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ آمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى......	۳	326
يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا......	۹	462,475
سورۂ حاقہ		
تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَo	۴۳	75,91

	آیت	صفحہ
سورۂ مزمل		
اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ٥	۵	60,274
اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ٥	۶	60,61
وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلًا ٥	۴	80,100
سورۂ مدثر		
فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۳۱	71
سورۂ قیامة		
بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ٥	۱۴	314
سورۂ انسان		
وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا......	۲۱	244,245
سورۂ نبا		
اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا ٥	۳۱	35

	آیت	صفحہ
سورۂ مطففین		
كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ٥	۱۴	337
سورۂ انشقاق		
يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلٰى......	۶	456
سورۂ شرح		
أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ٥	۱	60,274
وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ٥	۲	274
سورۂ قدر		
إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ٥	۱	210
سورۂ زلزلہ		
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ٥	۷	673
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ٥	۸	673

	آیت	صفحہ
سورۂ تکاثر		
اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُO	ا	459,460,461,674
حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَO	٢	460,461
سورۂ عصر		
وَالْعَصْرِO	ا	24
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍO	٢	24
سورۂ کافرون		
لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِO	٦	444

فہرست روایات

حدیثِ قدسی

اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ...... 226

رسول اللہ ﷺ

اِنَّا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ أُمِرْنَا أَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ...... 59
اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهْراً وَ بَطْنًا وَ لِبَطْنِهٖ بَطْنًا اِلٰى سَبْعَةِ اَبْطُنٍ...... 81-509
رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهٗ...... 89
اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ مَأْدُبَةُ اللّٰهِ...... 108,112
لَا تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتَمَارُوْا بِهِ السُّفَهَاءَ، وَتُجَادِلُوْا بِهِ الْعُلَمَاءَ...... 137
مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِاَرْبَعٍ دَخَلَ النَّارَ : لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ...... 137
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ...... 263
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ أَهْلِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ...... 263
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ...... 263
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَظْلَمَتِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ...... 264
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِيَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ...... 264
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ نَفْسِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ...... 264
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِرْضِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ...... 264

اِنَّ اَفْوَاهَكُمْ طُرُقُ الْقُرْآنِ فَطَيِّبُوْهَا بِالسِّوَاكِ......	280
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ مَعَالِيَ الْاُمُوْرِ وَيَكْرَهُ سَفَاسِفَهَا......	307
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ مَعَالِيَ الْاَخْلَاقِ......	307
اَرِحْنَا يَا بِلَالُ......	377
جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ......	418
اِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيْ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ......	470
فَاِنَّهُ لَا يَفْقَهُ مَنْ قَرَأَهُ فِيْ أَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ......	524
مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ......	568,621,622
حُسْنُ السُّؤَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ......	570
مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ......	572
فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ......	572
رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ......	597,598,608
مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا ظَهَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ......	660
لَقَدْ رَجَعَ الرَّجُلُ فَقِيْهًا......	673
اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا......	695
لَا تَسُبُّوا عَلِيًّا فَاِنَّهُ مَمْسُوْسٌ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ......	720

حضرت امام علی علیہ السلام

اَلَا لَا خَيْرَ فِيْ قِرَاءَةٍ لَا تَدَبُّرَ فِيْهَا......	78,523,631

لَا خَيْرَ فِيْ عِبَادَةٍ لَا فِقْهَ فِيْهَا...... 81,523
تَدَبَّرُوْا آيَاتِ الْقُرْآنِ وَ اعْتَبِرُوْا بِهِ فَإِنَّهُ أَبْلَغُ الْعِبَرِ...... 83,524
مَا عَبَدْتُكَ خَوْفًا مِنْ نَارِكَ وَلَا طَمَعًا فِيْ جَنَّتِكَ...... 85
لَا تَجْتَمِعُ الْفِطْنَةُ وَ الْبِطْنَةُ...... 111
اَفْضَلُ الْاَدَبِ اَنْ يَّقِفَ الْاِنْسَانُ عِنْدَ حَدِّهِ وَلَا يَتَعَدّٰى قَدْرَهُ 125
خُذُوْا مِنَ الْعِلْمِ مَا بَدَا لَكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تَطْلُبُوْهُ لِخِصَالٍ اَرْبَعٍ.... 138
اِنَّ بِذَوِي الْعُقُوْلِ مِنَ الْحَاجَةِ اِلَى الْاَدَبِ كَمَا يَظْمَأُ 151,180
بِالْاَدَبِ تَشْحَذُ الْفِطَنُ...... 152,158,180
اِنَّكُمْ اِلٰى اِكْتِسَابِ الْاَدَبِ أَحْوَجُ مِنْكُمْ اِلٰى اِكْتِسَابِ...... 151,180
يَا أَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا رِجَالَ...... 176
ذٰلِكَ الْقُرْآنُ فَاسْتَنْطِقُوْهُ...... 192
لَمْ أَكُنْ أَعْبُدُ رَبًّا لَمْ أَرَهُ...... 206,218,710
مَا كُنْتُ لِأَعْبُدَ رَبًّا لَمْ أَرَهُ...... 206,710
فَتَجَلّٰى لَهُمْ سُبْحَانَهُ فِيْ كِتَابِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّكُوْنُوْا رَأَوْهُ...... 218
اِنَّ اَفْوَاهَكُمْ طُرُقُ الْقُرْآنِ فَطَهِّرُوْهَا بِالسِّوَاكِ...... 281
يَا كُمَيْلُ بْنِ زِيَادٍ، اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ أَوْعِيَةٌ، فَخَيْرُهَا أَوْعَاهَا...... 291
النَّاسُ ثَلَاثَةٌ: فَعَالِمٌ رَبَّانِيٌّ، وَمُتَعَلِّمٌ عَلٰى سَبِيْلِ نَجَاةٍ...... 291
طَهِّرُوْا قُلُوْبَكُمْ مِنْ دَرَنِ السَّيِّئَاتِ تُضَاعَفْ لَكُمُ الْحَسَنَاتُ...... 297
طَهِّرُوْا قُلُوْبَكُمْ مِنَ الْحَسَدِ فَإِنَّهُ مُكْمِدٌ مُضْنِيْ...... 297
طَهِّرُوْا قُلُوْبَكُمْ مِنَ الْحِقْدِ، فَإِنَّهُ دَاءٌ مُوْبِئٌ...... 297

اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ......	306
قُلُوْبُ الْعِبَادِ الطَّاهِرَةُ مَوَاضِعُ نَظَرِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ فَمَنْ طَهَّرَ......	309
كَمْ مِنْ عَقْلٍ أَسِيرٍ تَحْتَ هَوًى أَمِيرٍ......	353
وَأَنَّ الْأَنْبِيَاءَ اِنَّمَا جَاؤُوْا لِيُثِيْرُوْا دَفَائِنَ الْعُقُوْلِ فِي النَّاسِ......	355,671
يُثِيْرُوْا فِيْهِمْ دَفَائِنَ عُقُوْلِهِمْ......	355,671,674
قُلُوْبُ الرِّجَالِ وَحْشِيَّةٌ......	401
لِكُلِّ شَيْءٍ آفَةٌ وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ......	430
لَا يَشْغَلُهٗ شَأْنٌ عَنْ شَأْنٍ......	431
لِلْقَلْبِ اِقْبَالٌ وَ اِدْبَارٌ......	447
مَنِ اسْتَوٰى يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ......	457
مَنْ كَانَ آخِرُ يَوْمِهٖ شَرَّهُمَا فَهُوَ مَلْعُوْنٌ......	458
وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ: لَا خَيْرَ فِيْ عِبَادَةٍ لَا فِقْهَ فِيْهَا وَلَا......	523
مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهٗ......	562
مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهٗ وَمَعَهٗ وَ بَعْدَهٗ......	562
مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ مَعَهٗ......	562
لَا خَيْرَ فِيْ عِبَادَةٍ لَا فِقْهَ فِيْهَا وَلَا فِيْ قِرَائَةٍ لَاتَدَبُّرَ فِيْهَا......	578-579
اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ......	603
أَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ وَ فِيْكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ......	622
وَاعْلَمُوا أَنَّهٗ لَيْسَ عَلٰى أَحَدٍ بَعْدَ الْقُرْآنِ مِنْ فَاقَةٍ......	652
لَافَقْرَ بَعْدَ الْقُرْآنِ......	653

أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ...... 695,696

وَمَا لِلّٰهِ آيَةٌ أَكْبَرُ مِنِّي...... 720,721

امام محمد باقر علیہ السلام

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ، أَوْ يُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ. ... 138

امام جعفر صادق علیہ السلام

اَلْعِلْمُ نُورٌ...... 45

مَا كَلَّمَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الْعِبَادَ بِكُنْهِ عَقْلِهِ قَطُّ. 58

فَالْعِبَارَةُ لِلْعَوَامِ وَالْإِشَارَةُ لِلْخَوَاصِ وَاللَّطَائِفُ لِلْأَوْلِيَاءِ وَ...... 157

لَقَدْ تَجَلَّى اللّٰهُ لِخَلْقِهِ بِكَلَامِهِ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يُبْصِرُونَ...... 217-218

وَاللّٰهِ لَقَدْ تَجَلَّى اللّٰهُ لِخَلْقِهِ فِي كَلَامِهِ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يُبْصِرُونَ 218

اَلْعِلْمُ نُورٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِي قَلْبِ مَنْ يَشَاءُ...... 271

اَلْقَلْبُ حَرَمُ اللّٰهِ فَلَا تُسْكِنْ حَرَمَ اللّٰهِ غَيْرَ اللّٰهِ...... 438

إِنَّ قَلْبَ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ...... 438

فہرست دعا و مناجات

صفحہ

☆ وَاَنِرْ اَبْصارَ قُلُوبِنَا بِضِيَاءِ نَظَرِهَا اِلَيْکَ حَتّٰى تَخْرِقَ اَبْصارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ فَتَصِلَ اِلٰى مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ...... 154

☆ اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُکَ مِنْ جَمَالِکَ بِاَجْمَلِهٖ وَ كُلُّ جَمَالِکَ جَمِيْلٌ اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُکَ بِجَمَالِکَ كُلِّهٖ...... 306

☆ اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُکَ مِنْ عُلُوِّکَ بِاَعْلَاهُ وَ كُلُّ عُلُوِّکَ عَالٍ اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُکَ بِعُلُوِّکَ كُلِّهٖ...... 307

☆ يَا اِلٰهِی صَبَرْتُ عَلٰى حَرِّ نَارِکَ فَكَيْفَ اَصْبِرُ عَنِ النَّظَرِ اِلٰى كَرَامَتِکَ...... 310

☆ عَقْلِی مَغْلُوبٌ وَ هَوائِی غالِبٌ...... 352

☆ اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ أَعَنْتَنِی عَلٰی خَتْمِ کِتَابِکَ
الَّذِیْ أَنْزَلْتَهُ نُوراً...... 417

☆ وَیَا قُرَّةَ عَیْنِ مَنْ لاذَ بِکَ وَانْقَطَعَ اِلَیْکَ...... 448

☆ وَلَا تَشْغَلْنَا عَنْکَ بِغَیْرِکَ...... 448

☆ اَللّٰهُمَّ اِنِّی أَخْلَصْتُ بِانْقِطَاعِی اِلَیْکَ
وَأَقْبَلْتُ بِکُلِّی عَلَیْکَ...... 448

☆ أَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَایَنْفَعُ...... 455

☆ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا هِیَ...... 724,725

فهرست اشعار

صفحه

شیخ سعدی

سعدی حجاب نیست تو آیینه پاك دار
زنگار خورده چون بنماید جمال دوست 99

هرگز وجود حاضر غایب شنیده ای؟
من درمیان جمع و دلم جای دیگرست 394

ره عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عارفان جز خدا هیچ نیست 717

توان گفتن این با حقایق شناس
ولی خرده گیرند اهل قیاس 717

کــہ پــس آســمــان و زمیــن چیستنــد

بــیــنــی آدم و دام و دد کیســتــنــد؟ 718

ھــمــہ ھــر چــہ ھستنــد از آن کمتــرنــد

کــہ بــا ھستیــش نــام ھستــی بــرنــد 718

غالب

ھیں کــواکــب کــچــھ نــظــر آتــے ھیں کــچــھ 725

بھرتری ھری

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ھے ھیرے کا جگر

مــردِ نــاداں پــر کــلامِ نــرم و نــازک بــے اثــر 314

علامہ اقبالؒ

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا 139

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں 140

جوانوں کو مِری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے 140

تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں 142

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا 142

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا 142

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کیلئے 173

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ 535

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا 643

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ 678

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں 723

حافظ شیرازی

واعظان کاین جلوہ در محراب و منبر میکنند
چون بخلوت میروند آن کارِ دیگر میکنند 141

خلوتِ دل نیست جایِ صحبتِ اضداد
دیو چو بیرون رود فرشتہ در آید 270

من ملک بودم و فردوسِ برین جایم بود 535

سالہا دل طلب جامِ جم از ما می کرد
وانچہ خود داشت زبیگانہ تمنا می کرد 652

گفتم این جامِ جہان بین بتو کی داد حکیم
گفت آنروز کہ این گنبد مینا میکرد 651-652

مولانا روم

هر گیاهی که از زمین روید
وحدهٗ لا شریک له گوید — 719

دیده‌ای باید سبب سوراخ کن
تا حُجُب را بر کَنَد از بیخ و بُن — 156

از خدا جوییم توفیقِ ادب
بی ادب محروم شد از لطفِ رب — 159-160

بی ادب تنها نه خود را داشت بد
بلک آتش در همه آفاق زد — 160

مائده از آسمان در می رسید
بی صداع و بی فروخت و بی خرید — 162

درمیانِ قومِ موسیٰؑ چند کس
بے ادب گفتند کو سیر و عدس 163

منقطع شد نان و خوان آسمان
ماند رنج زرع و بیل و داسمان 167-168

باز عیسیٰؑ چون شفاعت کرد حق
خوان ورستاد و غنیمت بر طبق 169

باز گستاخان ادب بگذاشتند
چون گدایان زلہا برداشتند 169

لابہ کردہ عیسیٰؑ ایشانرا کہ این
دایمست و کم نگردد از زمین 170

بد گمانی کردن و حرص آوری

کفر باشد پیشِ خوانِ مہتری 170

زآن گدا رُویان نادیدہ زآز

آن در رحمت بر ایشان شد فراز 171

ابر بر ناید پی منعِ زکات

وز زنا افتد وبا اندر جہات 171

ہرچہ بر تو آید از ظلمات و غم

آن زبی باکی و گستاخیست ہم 171

ہر کہ بی باکی کند در راہِ دوست

رہ زنِ مردان شد و نامرد اوست 173

از ادب پر نور گشتست این فلک
وز ادب معصوم و پاک آمد مَلک 177

هر که او بی سر بجنبد دُم بود
جنبشش چون جنبش کژدم بود 177-178

بُد ز گستاخی کسوفِ آفتاب
شد عزازیلی ز جرات ردِّ باب 178

این دهان بستی دهانی باز شد
کاو خورندهٔ لقمه هائی راز شد 206

نام احمدؐ نام جمله انبیاست
چون که صد آمد نود هم پیش ماست 246

ای برادر قصّه چون پیمانه ای ست
معنی اندروی مثال دانه ای ست
دانهٔ معنی بگیرد مرد عقل
ننگرد پیمانه را گر گشت نقل 441

ای برادر تو همان اندیشه ای
مابقی تو استخوان و ریشه ای 574

چند گاهش گامِ آهو در خوراست
بعد از آن خود نافِ آهو رهبراست 575

هر کسی از ظنّ خود شد یار من
از درونِ من نجُست اسرارِ من 699

امام خمینیؒ

من بخال لبت ای دوست گرفتار شُدم
چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شُدم 175

شمس مغربی

مرا به هیچ کتابی مکن حواله دگر
که من حقیقتِ خود را کتاب می بینم 568

لبید

علی کل شیء ما خلا الله باطل
و کل نعیم لا مهالة زاهل 713

متفرق

عبارتنا شتی وحسنک واحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر 129

جو بیچتے تھے دوائے دل،وہ دکان اپنی بڑھا گئے 298

فہرست متفرقات

اَلْعِلْمُ هُوَ حُصُوْلُ صُوْرَةِ الشَّيْءِ عِنْدَ الْعَقْلِ......	43
اِنَّ الْعِلْمَ هُوَ الصُّوْرَةُ الْحَاصِلَةُ مِنَ الشَّيْءِ عِنْدَ الْعَقْلِ......	44
اَلْعِلْمُ هُوَ : حُضُوْرُ صُوْرَةِ الشَّيْءِ عِنْدَ الْعَقْلِ......	44
اِنْ شَاءَ فَعَلَ وَ اِنْ لَمْ يَشَاءُ لَمْ يَفْعَلْ......	120
تمام بد بختی ہائی مسلمین از دست آمریکہ است......	172
بَيْنَ الْاَحْبَابِ تَسْقُطُ الْآدَابُ......	174
لَاجَنَّةَ فَوْقَهَا	309
از کوزہ انچہ تراود کہ در اُوست،	312
الجنس يميل الجنس،	407
کبوتر با کبوتر باز با باز	
کند ہم جنس با ہم جنس پرواز......	407
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست،	469
مَنْ رَبُّکَ وَمَنْ نَبِيُّکَ وَ مَنْ دِيْنُکَ وَ مَنْ كِتَابُكَ وَمَن	
قِبْلَتُکَ وَمَنْ اِمَّتُکَ......	572-573
اگر در خانہ کس است یک حرف بس است......	674,676

فہرست منابع و مآخذ

◄القرآن الکریم

◄نهج البلاغه

◄صحیفۂ سجادیه

◁ الف

◄اتجاهات التفسیر فی القرن الرابع عشر

◄اثنا عشر رسالة - المحقق الداماد

◄اختیار مصباح السالکین

◄اخلاق از دیدگاه قرآن، پیامبرؐ و عترتؑ

◄اخلاق در قرآن

◄ارشاد القلوب

◄اسرارِ نماز

◄اقبال الاعمال

◄الاتقان فی علوم القرآن

◄الاکلیل فی استنباط التنزیل - عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی

◄الامام علیٌ بن ابی طالب علیه السلام من حبه عنوان الصحیفة

◄الامام علیٌ ونهج البلاغه

◄الامام علیٌ- أحمد الرحمانی الهمدانی

◄الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰهِ المُنزَل- الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی مدظله

◄الانسان الکامل فی نهج البلاغة

◄الأخلاق عنوان الایمان ومنطلق التقدم

◄الأمالی للطوسیؒ

◄الأمثال القرآنية القياسية المضروبة للايمان باللّٰه - عبد اللّٰه بن عبد الرحمن الجربوع

◄البحر المدید فی تفسیر القرآن المجید

◄البرهان فی علوم القرآن

◄البلد الأمین

◄البیان فی تفسیر القرآن

◄التبیان فی تفسیر القرآن- شیخ الطائفة أبی جعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ

◄التحفة السنية

◄التفسیر الأصفی- الفیض الکاشانیؒ

◄التفسیر الصافی- الفیض الکاشانیؒ

◄التفسير والمفسرون

◄الحدائق الناضرة - المحقق البحرانیؒ

◄الخصال

◄الرواشم السماوية

◄السلام فی القرآن والحديث

◄العمدة - ابن البطريق

◄الفصول المهمة فی أصول الأئمة - الحر العاملیؒ

◄الفوائد الرضويه

◄الكافی- الكلينیؒ

◄الكلينی والكافی- الشيخ عبد الرسول الغفاری

◄الگوهای رفتاری امام علی عليه السّلام

◄المرشد الوجيز لقراء كتاب اللّٰه العزيز

◄المسترشد - محمد بن جرير الطبری، الشيعی

◄المفردات فی غريب القرآن- أبو القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الأصفهانی،المتوفی: ۵۰۲ھ

◄المنطق - مظفرؒ

◄النظام القرآنی

◀النظرية الاجتماعية فی القرآن الكريم

◀الوجيز فی أصول العقائدوأحكام التقليد والبلوغ

◀امالی السيد المرتضیؒ

◀امام علیؑ فرهنگ عمومی و همبستگی اجتماعی

◀امثال القرآن

◀انسان و قرآن

◁ آ

◀آشنایی با قرآن- متفکر شهيد استاد مرتضی مطهریؒ

◀آموزه های بنيادين علم اخلاق - محمد فتحعلی خانی

◁ أ

◀أحاديث أم المؤمنين عائشة - السيد مرتضی العسكری

◀أحكام القرآن - القاضی محمد بن عبد اللّٰه أبو بكر بن العربی المعافری الاشبیلی المالكی ،المتوفی: ۵۴۳ھ

◀أحكام القرآن - أحمد بن علی أبو بكر الرازی الجصاص الحنفی،المتوفی: ۳۰۷ھ

◀أدعيه جامع الاحاديث

◄أسباب النزول فی ضوء روایات أهل البیتؑ

◄أسطورة العبوسة

◄ أعلام الدین فی صفات المؤمنین

◄أهل البیت فی تفاسیر أهل السنة

◁ب

◄باطن و تأویل قرآن

◄بحار الأنوار- العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسیؒ

◄بررسی تطبیقی مفهوم و آثار اضطرار در حقوق مدنی

◄برگی از دفتر آفتاب

◄بصائر ذوی التمییز فی لطائف- الکتاب العزیز مجد الدین أبو طاهر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی

◄بهج الصباغة فی شرح نهج البلاغة

◄بهجت عارفان در حدیث دیگران

◄بیان المعانی [مرتب حسب ترتیب النزول]المؤلف: عبد القادر بن مّلا حویش السید محمود آل غازی العانی،المتوفی: ۱۳۹۸ھ

◁پ

◀پرتوی ازاسرار نماز

◀پیام امام امیرالمؤمنینؑ

◁ت

◀تحریرات فی الأصول - السید مصطفی الخمینیؒ

◀تذکرة الفقهاء

◀ترجمه تفسیر المیزان - علامه محمد حسین طباطبائی رحمة اللّٰه علیه

◀ترجمه نهج البلاغه -انصاریان

◀ تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰه جوادی آملی مدظله

◀تصحیح القرائة فی نهج البلاغة

◀تصنیف نهج البلاغة

◀تفسیر الامام العسکریؑ

◀تفسیر القرآن الکریم-السید مصطفی الخمینیؒ

◀تفسیر القمی - ابی الحسن علی بن ابراهیم القمیؒ

◀ تفسیر المیزان-العلامة الطباطبائیؒ

◀تفسیر جوامع الجامع -الشیخ ابی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ

◀تفسیر رازی

◀تفسیر کنز الدقائق-المیرزا محمد المشهدیؒ

◀تفسیر مجمع البیان - امین الاسلام أبی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ

◀تفسیر نمونہ - جمعی از فضلا

◀تفسیر نور الثقلین

◀تفسیر نور - حجة الاسلام و المسلمین حاج شیخ محسن قرائتی مدظله

◀تلخیص البیان فی مجازات القرآن - الشریف الرضیؒ

◀تمام نهج البلاغة

◀تنبیه الغافلین وارشاد الجاهلین عما یقع لهم من الخطأ حال تلاوتهم لکتاب الله المبین

◀تهذیب الاحکام فی شرح المقنعة للشیخ المفید رضوان الله علیه - الشیخ الطوسیؒ

◁ج

◀جاذبه و دافعه علیؑ - شهید مرتضیٰ مطهریؒ

◀جامع الاخبار

◀جامع آیات و احادیث موضوعی نماز

◄جامعه علوی در نهج البلاغه

◄جلوه تاریخ در شرح نهج البلاغه

◄جمال الاسبوع

◄جواهر القرآن - ابو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی

ح ◁

◄حقائق الاصول

◄حلية الأبرار - السيد هاشم البحرانی

◄حياة أمير المؤمنينؑ عن لسانه - الشيخ محمد محمديان

د ◁

◄در سرزمین تبوک - آیة اللّٰه جعفر سبحانی مدظله

◄دراسات فی علم الاصول

◄دعائم الاسلام

◄دیوانِ امام خمینیؒ

◄دیوانِ حافظ شیرازی،از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامه محمد قزوینی

◄دیوانِ حکیم ثنائی غزنوی

◄دیوانِ شمس مغربی

ذ

◀ذخیرة المعاد - المحقق السبزواریؒ

ر

◀رجال الکشی

◀رساله سیروسلوک بحر العلومؒ

◀روح المعانی فی تفسیز القرآن العظیم والسبع المثانی- شهاب الدین محمود بن عبد الله الحسینی الألوسی،المتوفی: ۱۲۷۰ھ

ز

◀زهر الأکم فی الأمثال والحکم

س

◀سنن النبی الاکرم ﷺ

◀سنن النبیؐ- السید الطباطبائیؒ

◀سیرة الامام جعفر صادقؑ

◀سیمای کارگزاران علیؑ ابن ابی طالبؑ

ش

- شبى در پايتخت بهشت
- شرح أصول الكافى- مولى محمد صالح المازندرانىؒ
- شرح حكم نهج البلاغة
- شرح خطبه البيان امام علىؑ بن ابى طالبؑ
- شرح نهج البلاغه - جعفرى
- شرح نهج البلاغة - ابن ابى الحديد
- شرح نهج البلاغة - الحائرى
- شرح نهج البلاغة - المقتطف من بحار
- شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن أبى الحديد، أبو حامد، عز الدين، المتوفى : ٥٦٥٦
- شرح نهج البلاغة - الدخيل
- شعراء الغدير فى القرن الحادى عشر

ص

- صحائف الأبرار فى وظائف الأسحار
- صحيفة الامام علىؑ

ع

◄علوم طبیعت در قرآن

◄علی المرتضی(علیه السلام) نقطة باء البسملة

◄عليٌ فی الکتاب والسنة والادب

◄عليٌ والخوارج

◄علی "علیه السلام" من المهد الی اللحد

◄عوالی اللآلی-ابن ابی جمهور احسائی

◄عیون الحکم والمواعظ- علی بن محمد اللیثی الواسطی

غ

◄غرر الحکم و درر الکلم

◄غریب الحدیث فی بحار الانوار

ف

◄فضائل القرآن للقاسم بن سلام - أبو عُبید القاسم بن سلاّم بن عبد اللّٰه الهروی البغدادی

◄فضائل و سیره چهارده معصوم (ع) در آثار استاد علامه حسن زاده

آملی مدظله

◄فی رحاب القرآن

◄فی ظلال نهج البلاغة

◁ق

◄قبسات من نهج البلاغة

◄قرآن در آيينه احكام

◄قرآن در آيينه نهج البلاغه

◄قرآن در نهج البلاغه

◄قرآن كريم از منظر امام رضا عليه السلام

◄قرآن و تبليغ

◁ ک

◄كاملة دفاع عن القران الكريم

◄كان خلقه القرآن

◄كتاب الطهارة - الشيخ الأنصاريّ

◄كشف الخفاء و مزيل الالباس- العجلونى

◄كشف اليقين- العلامةالحلىّ

◀کلمات الرسولؐ

◀کلیاتِ اقبالؒ

◀کلیاتِ سعدی،بر اساس نسخه محمد علی فروغی

◀کیف نقرأ القرآن

◁ گ

◀گفتگو در محضر امیرالمومنین علیؑ

◁ م

◀مباحث فی علوم القرآن - صبحی الصالح

◀مبانی نقد متن الحدیث

◀متشابه القرآن

◀مثنوی معنوی،به تصحیح :رینولد ا.نیکلسون

◀مجموعۂ ورام

◀مجموعة ورام - ورام بن ابی فراس

◀مختصر بصائر الدرجات - الحسن بن سلیمان الحلیی

◀مراجعات قرآنیة

◀مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ

◀مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ

◀مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰه الشیخ علی النمازیؒ

◀مستدرک نهج البلاغة

◀مستطرفات السرائر - ابن ادریس الحلیؒ

◀مستمسک العروة-السید محسن الحکیمؒ

◀مسند الامام الرضا(ع) - الشیخ عزیز اللّٰه عطاردی

◀مسند الامام علیؑ

◀مسند فاطمة بنت الحسین علیهما السلام

◀مشارق الشموس-المحقق الخوانساریؒ

◀مصباح الشریعة المنسوب للصادقؑ

◀مصباح الفقاهة - السید الخوئیؒ

◀مصباح المتهجد

◀مصباح کفعمی

◀معانی الاخبار

◀معترک الأقران فی اعجاز القرآن، ویُسمّٰی (اعجاز القرآن ومعترک الأقران) - عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی

◀معجم أحاديث المهدیّ

◀معراج السعادة

◀مفاتيح الجنان

◀مفاهيم القرآن الجزء السادس

◀مفاهيم القرآن - العلامة جعفر السبحاني مدظله

◀مكارم الأخلاق

◀من لا يحضره الفقيه - للشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسين بن بابويه القمیّ

◀من وصايا العترة (عليهم السلام)

◀مناقب أمير المؤمنين (ع) - محمد بن سليمان الكوفی

◀مناهل العرفان فی علوم القرآن- محمد عبد العظيم الزُّرقانی

◀منتهی المطلب - العلامة الحلیّ

◀منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغة - الخوئیّ

◀منهاج البراعة - الراوندی

◀منية الطالب - تقرير بحث النائينی للخوانساریّ

◀موسوعة الامام علی بن أبی طالب عليه السلام فی الكتاب و السنة والتاريخ

◀مهج الدعوات

◄مهدیٌ منتظر در نهج البلاغه

◄میزان الحکمة - الریشهری

◄مَـصَـاعِـدُ الـنَّـظَرِ للاشْرَافِ عَلٰی مَقَاصِدِ السُّوَرِ - ابـراهیـم بن عمر بن حسن الرباط بن علی بن أبی بکر البقاعی،المتوفی: ۸۸۵ھ

◁ن

◄نزول القرآن والعنایة به فی عهد النبیؐ- عبد الودود مقبول حنیف

◄نظرات معاصرة فی القرآن الکریم

◄نفحات القرآن-آیةاللّٰه العظمی مکارم الشیرازی مدظله

◄نفحات الولایة فی شرح نهج البلاغة

◄نهج البلاغة - الشیخ محمد عبده

◄نهج السعادة

◄نهج السعادة - الشیخ المحمودی

◄نهج البلاغه موضوعي

◁و

◄وسـائل الشیعة - الـفـقیـه الـمُـحُـدِّثِ الشیخُ مُـحَـمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ،المتوفی سنَة ۱۱۰۴ھ

◄وصول الأخيار الى أصول الأخبار- والد البهائى العاملیؒ

◄ولأول مرة فی تاريخ العالم

ھ

◄هداية العلم فی تنظيم غرر الحكم للامام علیؑ بن أبی طالبؑ

ی

◄یک هزار سخن از حضرت علی علیہ السلام

- اجمالی طور پر وہ اوصاف جن کی مدد سے قرآن سے استفادہ کیلئے فہم کو آمادہ کیا جاسکتا ہے، آدابِ فہم قرآن کہلاتے ہیں لیکن دقیق معانیٔ ادب معلوم کرنے کے لئے اس موضوع پر ہم بحث کر رہے ہیں یعنی "آدابِ فہم قرآن"، لہٰذا ادب کے معانی کی شناخت کی ضرورت ہے......

- مفاتیح الغیب یعنی اللہ کے خزانوں کی کنجیاں، یہی چابیاں آداب ہیں اور ان آداب ہی کے ذریعے سے انسان الٰہی خزانوں تک پہنچتا ہے لہٰذا اہلِ خرد و فہم چابی مانگ لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ خزانے کے اندر ان کی رسائی ہو جاتی ہے، خزانوں سے جتنی ضرورت ہے، جتنی بھوک و پیاس ہے وہ اس حد تک حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا سے ادب مانگنا یعنی چابی لے لینا......

- ان صفات کو ادب کہیں گے کہ جن کے اندر دو خصوصیات پائی جاتی ہوں، اول یہ کہ باعث زینتِ فعل ہوں، دوم باعثِ حصولِ غرضِ فعل ہوں۔ ان خصوصیات کے ساتھ اگر انسان سے ایک فعل سرزد ہوتا ہے اور اس فعل کے اوپر یہ صفات طاری ہوں تو نتیجے میں فعل ایک حالتِ حسنہ و حالتِ موزوں پیدا کر لیتا ہے اسی کو ادب کہتے ہیں......

کوہاٹ: عظیم خان مارکیٹ، سیکنڈ فلور، کچہ پکہ، شیر کوٹ، کوہاٹ 0312-9808280

گلگت. نزد DHQ ہاسپٹل، خزانہ روڈ، گلگت 05811450568 /0315-4011020

سیالکوٹ: نزد مسجد خدیجۃ الکبریٰ، مظفر پور سیالکوٹ 0300-7163180/0313-7925944

کراچی۔ شاپ D.8، ایم ایل پارک ویو، سولجر بازار، کراچی 0345-2715082/03343454643

کوئٹہ. شاپ نمبر 7، نزد گلگتی امام بارگاہ، علمدار روڈ، کوئٹہ 0300-9388400/0307-8866699

لاہور: 2-A، بخاری سٹریٹ، مسلم ٹاؤن موڑ، وحدت روڈ، لاہور 042-5005761/0323-5777439

اسلام آباد. آفس نمبر 4، پلاٹ 2-B، بالمقابل جامعہ امام الصادقؑ، G-9/2، اسلام آباد 051-2252016/0321-5046472

جلد دوم

آداب فہم قرآن

سید جواد نقوی

مرکز تحقیقات اسلامی بعثت

بسم الله الرحمن الرحيم

آدابِ فہمِ قرآن

(جلد دوم)

نام کتاب: آدابِ فہمِ قرآن

مؤلف: حجۃ الاسلام والمسلمین سید جواد نقوی

ترتیب: مرکز تحقیقاتِ اسلامی بعثت

ناشر: متاب پبلیکیشنز

اشاعت اول: جمادی الاول ۱۴۳۳ھ (مئی 2012 عیسوی)

تعداد: ۲۰۰۰

جملہ حقوق متاب پبلیکیشنز کے لئے محفوظ ہیں

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آدابِ فہم قرآن آج لباس طباعت میں ملبوس پیروان قرآن کریم کی خدمت میں حاضر ہے، اس کا ماجرا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے طالب علم کی حیثیت سے بارگاہِ کتابِ الٰہی میں حاضری کی توفیق تو نصیب ہوئی لیکن یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ نگاہیں تو کلامِ الٰہی کے نورانی الفاظ کی زیارت سے منور ہیں، سماعتیں خوش الحان قاریوں کی آواز سے لطف اندوز، زبانیں تلاوتِ کلامِ وحی سے معطر، حافظے آیات قرآن سے مملو اور محفلیں ذکر کتابِ خدا سے مزیّن جبکہ دل نورِ کلامِ الٰہی سے خالی ہیں۔

اس محرومیت اور خلاء پر بے تابی و بے چینی نے اسباب محرومیت تلاش کرنے کی جستجو ایجاد کی۔ اس کے نتیجے میں ایک کھلی، آشکارا اور بیّن حقیقت سامنے آئی کہ قرآن کریم کی کتابت میں خوشخطی کا نہایت اعلیٰ اہتمام کیا جاتا ہے یعنی آیاتِ الٰہیہ کو لکھنے کے مرحلے میں تمام آدابِ کتابت بروئے کار لائے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں حسین و زیبا رسم الخط سے مزین نسخے معرضِ طباعت میں آئے ہیں اور آج دُنیا بھر میں ہنری شاہکار مانے جاتے ہیں۔ ایسے ہی تلاوت کے مرحلے میں خوش لحن قاری تجوید و قرأت کے تمام آداب کے ساتھ جب آیات کلامِ خدا پڑھتے ہیں تو سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ علم تجوید و قرأت ان آداب کا مجموعہ ہے جو قرآنی آیات کی تلاوت کو نہایت حسین بنا دیتے ہیں اور سماعتوں کو کلامِ الٰہی کی طرف جذب کر لیتے ہیں۔

لیکن جب قرآنِ کریم کو سمجھنے کا مرحلہ آتا ہے تو وہ لطف و سرور جو دلوں میں حاصل ہونا چاہیے محسوس نہیں ہوتا جبکہ آیاتِ الٰہی دلوں کے لئے اُتری ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سمجھنے کے بھی آداب ہیں جنہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے جبکہ آدابِ فہم قرآن کلام کو سمجھنے کے لئے دلوں کو کہیں زیادہ آمادہ تر کر دیتے ہیں بہ نسبت پڑھنے اور لکھنے کے آداب کے۔

چنانچہ قم المقدسہ میں ایک ماہ رمضان المبارک میں بعض طلاب کرام کے لئے اس بحث کا

آغاز ہوا،محور کے طور پر صدر المتالہین ؒ کی کتاب مفاتیح الغیب کو انتخاب کیا گیا اور اس طرح آدابِ فہم قرآن کی پیدائش ہوگئی، کافی عرصہ تک اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا تا اینکہ کچھ قرآن دوست ادب پسندوں نے اس کی تحریر کا فریضہ نبھادیا۔

دیگر بیسیوں عناوین کی طرح یہ موضوع بھی کمپیوٹر کے حافظے اور مناب کی بے نظمی میں خاموش زندگی بسر کر رہا تھا کہ جناب سید وصال حیدر نقوی صاحب کے علم میں آگیا، پھر کیا تھا کہ سیّد صاحب نے فوراً اس کی طباعت کا اصرار شروع کردیا۔ ہماری تمام تر ٹال مٹول کے باوجود انہوں نے تمام مراحل سے سرخروئی سے چھاپ ہی دیا۔ اس بابت جس ہستی نے ناقابل توصیف عرق ریزی کی، دن رات کی محنت، شوق، جذبہ اور نہایت ادب کے ساتھ آداب فہم قرآن کو قرآن دوستوں تک پہنچایا وہ عزیز القدر جناب دانش صاحب ہیں۔ وصال صاحب کے اہتمام اور دانش صاحب کی محنت نے یہ اُمید پیدا کردی ہے بلکہ اسے یقینی بنا دیا ہے کہ انشاءاللہ سستی، غفلت، ٹال مٹول، لاپروائی جیسے غبار کے نیچے دبے ہوئے سینکڑوں موضوعات اب طباعت کے لباس میں ملبوس ہوکر قارئین کرام تک پہنچتے رہیں گے۔

غلطیاں انسانی کام کا لازمہ ہیں، مشاہدے کی صورت میں عفو و درگزر کے ساتھ مطلع فرمائیں۔شکریہ

خداوند متعال سے ان عزیزوں اور ہر اس عزیز کے لئے توفیقاتِ فراوان کے متمنی ہیں جس نے آداب فہم قرآن کے طباعتی سفر میں کوئی قدم اُٹھایا ہے۔

احقر العباد

سید جواد نقوی

جامعہ العروۃ الوثقیٰ۔ لاہور

04/05/2012

فہرست

فصلِ ادبِ ششم 16

رفعِ موانعِ فہم

(حصہ اول)

۱) اکثریت کو قرآن کیوں سمجھ نہیں آتا؟ 18

۲) موانع کب رکاوٹ بنتے ہیں؟ 19

☆ مال و دولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں 22

۳) بے رغبتی محرک نہ ہونے کی وجہ 26

۴) علامت سے رغبت کی پہچان 28

۵) ناکامیوں کی بڑی وجہ 28

۶) موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے 29

۷) موانعِ علم 33

۸) عبادت کی راہ میں حائل موانع 35

۹) دل مانندِ آئینہ 36

۱۰) دل کی راہ میں دو مشکلات 37

۱۱) فہم کی راہ میں حائل رکاوٹیں 40

☆ طفولیت 40

☆ بلادت 43

فصلِ ادبِ ششم 52

رفعِ موانعِ فہم

(حصّہ دوم)

۱) فقط مخارج کی ادائیگی پر توجہ 54

☆ مخارج کیلئے حساسیت پیدا نہ کریں 57

☆ عجم کو عرب بنانا مقصود نہیں 59

☆ قاریٔ قرآن ہونا عالمِ قرآن ہونے کی دلیل نہیں 62

۲) تقلیدِ محض 63

☆ تقلیدِ شرعی اور تقلیدِ آبائی میں فرق 64

☆ تقلید کی مزید وضاحت 66

☆ مذموم تقلید 69

☆ طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں 70

☆ درس پڑھنے کا نسخہ 72

☆ جمود، باعثِ تعصب 73

☆ کمزور نفوس کی مشکل 75

☆ استاد اور شاگرد کا رابطہ 76

☆ رشد حاصل نہ ہونے کی وجہ 78

☆ شیطانِ تقلید کا حملہ 80

☆ تعصّبات، مذہبی دنیا کا بڑا مسئلہ 83

☆تضاربِ آراء کو تحمل کریں 84
☆علم کے ساتھ حلم کی ضرورت 86
☆صوفیاء کی حقیقت 88
☆عرفاء کے نزدیک علم حجاب ہے 90
☆ٹھگ صوفیاء وعرفاء 91
☆محقق عرفاء کی بات کا صحیح معنٰی مراد لیں 93
☆جدلی مزاج، مذہبی دنیا کی ایک اور مشکل 94
☆تقلیدی وجدلی علم حجاب ہے 97
۳) عربی علوم 100
☆معانی فقط الفاظ میں منحصر نہیں ہوتے 102
☆عربی ضرور سیکھیں لیکن افراط وتفریط کے بغیر 105
☆مقصودِ اصلی قرآن 108
۴) تفاسیر پر جمود 110
☆تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء 113

فصلِ ادبِ ششم 121

رفعِ موانعِ فہم

(حصہ سوم)

۱) قلبی میلانات، لہو ولعب 122

۲)عدم تدبر در آیات 127

۳)قرآن کی صحیح معرفت کا نہ ہونا 128

☆استخارے کی حقیقت 132

۴)وہم وخیال 136

۵)زود باوری اور شکاکیت 137

۶)ظاہر بینی 139

۷)ہوی وہوس 141

۸)دنیا پرستی 142

۹)غرور وتکبر 143

۱۰)تنگ نظری 145

۱۱)دنیوی افکار ونظریات سے متاثر ذہن 147

۱۲)سائنس زدہ ذہن 149

۱۳)عوام زدگی 154

فصلِ ادب ششم 163

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصہ چہارم)

۱)ظن وگمان پر اکتفا کرنا 165

☆یقینِ حقیقی 166

☆جہلِ مرکب	168
☆تقلیدی یقین معرضِ زوال میں	171
☆یقینِ حقیقی کیلئے تین ارکان	171
☆اوائلِ قرآن میں مُخاطَبِینِ قرآن کی تقسیم	172
الف) پہلا طبقہ	172
ب) دوسرا طبقہ	173
ج) تیسرا طبقہ	174
☆علُماء اور ظنُناء	175
☆امانی، بنی اسرائیل کی مشکل	175
۲) قساوتِ قلبی	178
۳) ترکِ عمل	182
۴) قرآن کا آلائی استعمال	185
۵) کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا	192
۶) جلد بازی	197
۷) لکیر کا فقیر ہونا	199
۸) خود کو راہنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھنا	202
۹) ثانوی مطالب پہ توجہ دینا	207
۱۰) اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجہی	212
۱۱) فقط انتخابی آیات پر توجہ دینا	212

فصلِ ادبِ هفتم 218

تخصیص

۱) تخصیص سے مراد 220

۲) فقط لافظِ قرآن نہ بنیں 221

۳) خود کو مُخاطَب نہ سمجھنا، قرآن کی مہجوریت کا سبب 223

۴) دعا کو اپنے دل کی آواز بنائیں 224

☆ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کی دعاؤں میں استغفار کی وجہ 225

☆ تعلیم دینے کی دو صورتیں 226

☆ معصومین علیہم السلام کی استغفار کو خود پر قیاس نہ کریں 228

۵) قرآن کو فقط علمی کتاب سمجھ کر نہ پڑھیں 231

۶) مُخاطَبِ قرآن نہ بننے کا نقصان 232

۷) انسان عکس العمل کب دکھاتا ہے؟ 234

۸) مُخاطَب بننے کے ثمرات 236

۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ تربیت 239

۱۰) قرآن کو قصہ شب نہ سمجھیں 240

☆ خود کو قلبِ قصہ میں ڈھال کر پرکھیں 242

۱۱) حیوانات اور دیگر موجودات سے عبرت 245

۱۲) قرآن کی ہر آیہ میں اپنے لئے پیغام تلاش کریں 247

۱۳) قرآن کا اندازِ تخاطب خطابی ہے 249

۱۴)مخاطب بننے کے اثرات 254
۱۵)شکر سے مراد 258
۱۶)قرآن فقط معصومین علیہم السلام کیلئے نازل نہیں ہوا 259
۱۷)مذہبی طبقے کی دیگر مشکلات 261

فصلِ ادب ہشتم 265

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ اول)

۱)وجد کا معنیٰ 268
۲)اللہ کو پانا ہے، نہ کہ سمجھنا ہے 269
۳)قرآن کو اپنے وجود میں اتاریں 273
۴)وجد، اہلِ معرفت کی نظر میں 274
۵)متاثر ہونا کمال کی علامت 277
۶)ہر چیز سے متاثر ہونا ضعف ہے 278
۷)وجد، شوق کی ایک حالت 279
۸)حالتِ وجد کے اثرات 282
۹)عشق، اصطلاحِ دینی 286
۱۰)انسان پر قرآن کی مقناطیسیت کی علامات 287
۱۱)کسی چیز کو پانے اور سمجھنے میں فرق 289

۱۲)معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں 290
۱۳)رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام پر حالتِ وجد 295
۱۴)جیسی آیت ویسی حالت 297
۱۵)عبادات کا شوق خدا پیدا کرتا ہے 299
۱۶)شوق و وجد، عالم توحید وملکوت کے مقناطیس 300
۱۷)قرآنی کشش کے باوجود دل کی قرآن سے دوری کی وجہ 303

فصلِ ادبِ ہشتم 306

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ دوم)

۱)دل کب متاثر ہوتا ہے؟ 308
۲)قلب کو تاثر کیلئے آمادہ کرنے والی چیزیں 309
☆خشیت 310
☆راہب دل 311
۳)دل کی سختی ونرمی کے اسباب 314
۴)تاثر، انسان کے بلوغ کی نشانی 316
۵)عزت کا معنی 318
۶)بہترین دل معرفت سے متاثر ہوتا ہے 320
۷)عشقِ الٰہی کی مقناطیسیت 321

۸)منظومۂ شمسی، عکسِ منظومۂ انسانی 325
۹)طبیعت وفطرت میں محاذ آرائی 329
۱۰)مولا علی علیہ السلام، فانی درذاتِ خدا 332
۱۱)مجنوں کیلیے لیلیٰ کے خط کی اہمیت 333
۱۲)مشکلات میں شکرِ خدا 337
۱۳)عاشقانہ دعاو مناجات کریں 339
۱۴)اہلبیت علیہم السلام کی سیرت میں جاذبۂ خدا 340
۱۵)قرآنی زبان سے مراد 341

فصلِ ادبِ ہشتم 346

﴿تاثر و وجد﴾

(حصہ سوم)

۱)اقسامِ انسان بلحاظِ اوصاف 348
☆صاحبِ اوقات 348
☆صاحبِ احوال 349
☆صاحبِ مقامات 349
۲)قسی القلب، غیر متاثر نفس 352
۳)آیاتِ وعید کا انسان پر اثر 354
۴)خدا کی ربوبیت رحمانی ہے 355

۵) خدا کا غضب بھی بغیر رحمت کے نہیں 358
۶) آیاتِ رحمت کا اثر 360
۷) ہر عبادت کی بنیاد معرفت ہے 363
۸) گستاخ افراد کے اقوال پر مشتمل آیات کا اثر 367
۹) جنت کے ذکر کا انسان پر اثر 371
۱۰) جہنم کے ذکر کا انسان پر اثر 372
۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرآن سے اثر لینے کی کیفیت 373
۱۲) فقط حاکیٔ قرآن نہ بنیں بلکہ محققِ قرآن بنیں 376
۱۳) آیاتِ توکل کا انسان پر اثر 378
۱۴) آیاتِ صبر کا انسان پر اثر 380
۱۵) انسان میں قرآنی صفات پیدا نہ ہونے کا نتیجہ 381
۱۶) غیر متاثر افراد کیلئے قرآن کیا کہتا ہے؟ 385
۱۷) قرآن کا ہدف، انسان کو صفاتِ ربوبیہ سے متصف کرنا 387
۱۸) اعلیٰ مرتبۂ معرفت 390

فصلِ ادبِ ہشتم 397

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ چہارم)

۱) بصیرتِ کشفیہ کا مطلب 398

۲)بصیرۃ کشفیہ، قرآن مجید دالانزال ہے 400
۳)تمثیلِ استوائے قرآن برقلب 401
۴)خَلق اور خُلق کا فرق 407
۵)خُلق کے منابع 408
۶)خَلق اور خُلق میں ہم آہنگی کی ضرورت 409
۷)استوائے قرآن برقلب نہ ہونے کا نتیجہ 411
۸)تابعِ قرآن کون ہے؟ 412
۹)نزولِ قرآن بمناسبتِ دل 414
۱۰)دل کب تابعِ قرآن ہوتا ہے؟ 420
۱۱)جیسا عارف ویسی معرفت 423
۱۲)مکاشفۂ قرآنی 425
۱۳)قرآنِ مجید خُلقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے 429

فصلِ ادب ہشتم 434

تاثر و وجد

(حصّہ پنجم)

۱)رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ تلاوت 435
۲)عینِ تدبر وفہمِ قرآن 436
۳)عرشِ دل پر قرآن نازل نہ ہونے کی وجہ 438

۴) فقط ظواہرِ قرآن پہ توجہ مطلوب نہیں 442
۵) فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے 444
۶) حقیقتِ تقویٰ اوراس کے آثار 447
۷) قرآن اور انسان میں تشابہ، کب اور کیسے؟ 451
۸) فہمِ حقیقی، مرادِ متکلم کا حصول 455
۹) قرآن کو خود متکلم سے سمجھیں 457

فصلِ ادبِ نهم 462

﴿ترقی﴾

(حصہ اول)

۱) تکامل کیلئے ترقی کا حصول 463
۲) ترقی کیلئے دو بنیادی چیزیں 465
۳) ترقی کے لامتناہی مراتب 467
۴) بے ادبوں سے عبرت 468
۵) دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے 471
۶) مرتبوں کی طلب میں اضافہ 472
۷) ارتقاء یا زوال، تیسری حالت محال 474
۸) باطنِ قرآن عمیق ہے 478
۹) تالیِ قرآن ہی ارتقاء کرتا ہے 481

فصلِ ادبِ نہم 489

﴿ترقی﴾

(حصہ دوم)

۱) قرآن میں ارتقاء کے مختلف پہلو 490

☆ ارتقاء کا پہلا پہلو 490

(الف) پہلا درجہ 490

(ب) دوسرا درجہ 492

(ج) تیسرا درجہ 495

۲) ظہورِ ذات برائے ذات 495

۳) پوری کائنات تجلیٔ الٰہی 497

۴) خود بینی، خدا بینی میں مانع 500

۵) مشاہدۂ متکلم میں استغراق 501

۶) سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات 504

۷) مقربین کیلئے امام صادق علیہ السلام کا فرمان 512

۸) عظمت کا اثر 514

۹) عبادات وتلاوتِ قرآن میں حلاوت 517

۱۰) توحیدِ خالص سے مراد 522

فصلِ ادبِ نہم 530

﴿ترقی﴾

(حصّہ سوم)

۱)ارتقاء کا دوسرا پہلو 531

☆پہلا مرحلہ 531

☆دوسرا مرحلہ 532

☆تیسرا مرحلہ 533

۲)ارتقاء کا تیسرا پہلو 534

۳)ارتقاء کا چوتھا پہلو 535

۴)ارتقاء کا پانچواں پہلو 540

۵)ارتقاء کا چھٹا پہلو 547

☆پہلا مرحلہ 547

☆دوسرا مرحلہ 548

☆تیسرا مرحلہ 550

۶)ارتقاء کا ساتواں پہلو 552

۷)ارتقاء کا آٹھواں پہلو 554

۸)ارتقاء کا نواں پہلو 555

فصلِ ادبِ دہم 567

تبری

۱)تبری کا معنیٰ 568
۲)تولا وتبرا، انسانِ سالک کے دوپَر 570
۳)عبادات میں سفرِ قربی وسفرِ بُعدی 572
۴)انسان ہجرت کیوں نہیں کر پاتا؟ 573
۵)تولا وتبرا کی وسعت 574
۶)اپنی حول وقوت سے تبرا 575
۷)قارونِ علمی نہ بنیں 579
۸)جسے خدا اپنے حال پہ چھوڑ دے وہ مغضوب ہے 582
۹)برائت کا دوسرا مرتبہ 584
۱۰)انسان اپنی معرفت پیدا کرے 586
۱۱)انبیاءؑ انسان کو انسان بنانے آئے ہیں 589
۱۲)انسان ترقی پذیر ہے 593
۱۳)موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا، ترقی کی ضمانت 595
۱۴)کون لوگ مطمئن ہیں؟ 601

فہرستیں 606

فصلِ ادبِ ششم

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصّہ اول)

۱)اکثریت کو قرآن کیوں سمجھ نہیں آتا؟

۲)موانع کب رکاوٹ بنتے ہیں؟

☆مال ودولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

۳)بے رغبتی، محرک نہ ہونے کی وجہ

٤)علامت سے رغبت کی پہچان

٥)ناکامیوں کی بڑی وجہ

٦)موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے

۷)موانعِ علم

۸)عبادت کی راہ میں حائل موانع

۹)دل مانندِ آئینہ

۱۰)دل کی راہ میں دو مشکلات

۱۱)فہم کی راہ میں حائل رکاوٹیں

☆طفولیت

☆ بَلَادَتْ

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ ششم رفعِ موانعِ فہم ہے یعنی جب انسان قرآن کی بارگاہ میں آئے تو موانع ہٹا کر آئے یعنی انسان جب بارگاہِ قرآن میں حاضر ہوتا ہے اور قرآن سے کچھ لینے کی کوشش کرتا ہے تو پہلے اپنے آپ کو آمادہ کرے، اپنے دل، وجود اور روح سے موانعِ فہم کو برطرف کرے کیونکہ انسان کا دل بعض اوقات ایسے موانع اور رکاوٹوں سے دوچار ہو جاتا ہے کہ عملِ فہم اس سے سرزد نہیں ہو پاتا ہے اور دل کوئی چیز قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ قرآن کا بھی ادب ہے اور ہر اس کام کا ادب ہے کہ جس سے انسان کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر پڑھنا چاہتا ہے، محصل بننا چاہتا ہے، عالمِ دین بننا چاہتا ہے تو پہلے اپنی راہ سے اور اپنے وجود سے موانعِ تحصیلِ علم کو برطرف کرے، اسی طرح اگر کسی اور میدان میں حتیٰ کسی دنیوی میدان میں بھی وارد ہوتا ہے تو بھی اس کو پہلے اس میدان میں موجود موانع کو برطرف کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ چیزیں فہم کے آگے حائل ہیں جو انسان کو فہم کے مرحلے میں آگے نہیں بڑھنے دیتی ہیں لہٰذا انسان یہ ساری رکاوٹیں اتار کر آئے، یہ نہ ہو کہ قرآن پڑھتے ہوئے مزید کئی رکاوٹیں ساتھ لے آئے۔

بعض اوقات انسان کے اندر قرآن کو سمجھنے کا ارادہ موجود ہوتا ہے، شوق اور رغبت بھی موجود ہوتے ہیں لیکن جب قرآن کی طرف آتا ہے تو موانع ساتھ لے کر آتا ہے یا انسان کی فہم میں اور قرآن میں موانع حائل ہو جاتے ہیں اور اسی عالم میں کوشش کرتا ہے کہ قرآن کو سمجھے۔ ظاہر ہے کہ یہ موانع انسان کو فرصت و مہلت نہیں دیتے ہیں کہ حقیقتاً انسان قرآن کی مراد اور سر کو کہ جو قرآن میں موجود ہے درک کر سکے، پس قرآن شناس کو یا قرآن خواں کو ان موانع سے آزادی کیلئے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

۱)اکثریت کو قرآن کیوں سمجھ نہیں آتا؟

ایسے بہت سے موانع انسان کی راہ میں حائل ہیں کہ جو قرآن کو سمجھنے نہیں دیتے ہیں اور ہمارے ساتھ یہی اتفاق روز تکرار ہوتا ہے، قرآن تو روز پڑھتے ہیں، انشاءاللہ، حُسنِ ظن تو یہی ہونا چاہئے کہ روز قرآن پڑھتے ہیں لیکن جب قرآن پڑھتے ہیں اکثر کو قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے اور جو کچھ یہ بزرگان بتا رہے ہیں کہ اس طرف آجاؤ، قرآن کی اس حقیقت کی طرف آجاؤ تو اس طرف ہم نہیں جاتے ہیں، کیوں نہیں جاتے ہیں؟ ان رکاوٹوں اور موانع کی وجہ سے، فرماتے ہیں کہ چونکہ قرآن کا محل دلِ انسان ہے، کان وزبان نہیں ہے، قرآن اترا بھی دل پر ہے، سمجھنا بھی دل کا کام ہے، شہیدِ لیلۃ القدر حضرتِ امیرالمومنین علیہ السلام نے کمیلؓ سے یہی بیان فرمایا کہ

يَا كُمَيْلُ بْن زِيَادٍ، اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ أَوْعِيَةٌ، فَخَيْرُهَا أَوْعَاهَا......(۱)

اے کمیلؓ یہ دل ظرف ہے، ظرفِ حقائق ہے، ظرفِ معرفت ہے، ظرفِ قرآن ہے اور ان میں سے بہترین دل وہ ہے کہ جس کی ظرفیت بہت زیادہ ہو،

فَخَيْرُهَا أَوْعَاهَا......

ان دلوں کو تیار کرو چونکہ دل درحقیقت ظرفِ نزولِ قرآن وظرفِ فہمِ قرآن ہے، دل آمادہ کرنا ہے، آداب اسی لئے ہیں کہ دل آمادہ ہو، فہم کے لئے آمادہ ہو لیکن اس دل کے سامنے بہت ساری رکاوٹیں حائل ہیں۔

۲)موانع کب رکاوٹ بنتے ہیں؟

البتہ موانع تک نوبت اس صورت میں پہنچتی ہے کہ جب محرک موجود ہو، اگر انسان کسی چیز کوانجام دینے کا عملی ارادہ رکھتا ہوتو پھر اس کے بعد دیکھتا ہے کہ مجھے کون کونسے موانع درپیش ہیں۔ یہ عقلائی قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کے اندر محرک موجود نہ ہوتو موانع تک اس کی نوبت نہیں پہنچتی ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ موانع اس کی راہ میں حائل ہیں، اگر محرک اس شے کو تحریک دیں اور پھر کسی مرحلے پر جاکر حرکت کے دوران اس کو مسائل درپیش ہوں تو پھر کہا جاتا ہے کہ اس کو موانع درپیش ہیں، اس کے لئے عملی وعلمی بہت ساری مثالیں دی جاسکتی ہیں مثلاً فرض کریں کہ ایک گاڑی میں انجن نہیں ہے اور آگے پولیس نے روڈ بھی بند کیا ہوا ہے، ناکہ بندی بھی ہے، دیوار بھی لگی ہوئی ہے، روڈ سے آگے جانے بھی نہیں دیا جاتا ہے، آپ کیا کہیں گے کہ یہ گاڑی آگے کیوں نہیں جارہی ہے؟ چونکہ آگے پولیس نے سخت ناکہ لگایا ہوا ہے یا روڈ بلاک کیا ہوا ہے اس وجہ سے گاڑی نہیں جارہی ہے؟ اگر پولیس ناکہ اٹھالے تو پھر پہنچ جائے گی؟ یا یہ کہ اس میں تو سرے سے انجن ہی نہیں ہے، محرک ہی نہیں ہے چونکہ محرک نہیں ہے اس وجہ سے یہ شے منزل تک نہیں پہنچ سکتی ہے، موانع تک تو نوبت ہی نہیں آتی ہے، پہلے کسی شے کو موانع تک تو پہنچنا چاہئے پھر نوبت آتی ہے کہ اب کون کونسے موانع درپیش ہیں؟ یا اگر ایک انسان کہیں سفر کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کے اندر سفر کا محرک موجود ہو، وہ محرک اس کو سفر کیلئے اکسائے، محرک کوئی مادی فائدہ بھی ہوسکتا ہے اور معنوی فائدہ بھی اور سب سے بڑا محرک انسان کے اندر اس فائدے کے حصول کا ارادہ ہے، اگر انسان کے اندر ارادہ موجود ہوتو انسان اس

مقصد تک پہنچنے کے لئے حرکت کرتا ہے لیکن جس انسان کے اندر سفر کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو یعنی اندر کوئی چیز محرک کے طور پر نہ ہو کہ جو اسے اُکسائے اور اُٹھائے تو پھر راستے بھی بند ہوں اور یہ انسان سفر نہ کر پائے تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہ موانع کی وجہ سے سفر نہیں کر سکا، ہر چند موانع بھی موجود تھے لیکن سفر نہ کرنا محرک کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

مثالِ دیگر بعنوانِ طالب علم ہے، خصوصاً اس جہت سے کہ بعض مسائل میں انسان غور وفکر کرتا ہے اور کرنی بھی چاہئے اور ہر ایک کی فکر کا ایک نتیجہ بھی ہے، ہم ان مسائل میں بھی حتماً غور وفکر کریں کہ ہم حوزۂ علمیہ میں بعنوانِ طلاّب اردو زبان مختلف علاقوں عموماً ہندوستان اور پاکستان سے موجود ہیں اور دوسری زبانوں کے طلاّب بھی ہیں لیکن اردو زبان بولنے والے طلاب کسی حد تک کثرت سے ہیں، فرض کریں کہ دوسرے لوگ عربی اور فارسی بولنے والے لوگ ہیں، عربی بولنے والوں میں عراقی، لبنانی، بحرینی اور فارسی بولنے والوں میں ایرانی اور افغانی سرفہرست ہیں، اردو زبان بولنے والوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کی مادری زبان اردو ہی ہو، اس کا مطلب ہے کہ ہندوستان اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے لوگ، لیکن حوزوی رشد اور ارتقاء کے لحاظ سے دوسری زبانیں بولنے والوں کا تناسب اردو بولنے والوں سے زیادہ ہے مثلاً اگر ہم فقہی میدان کے اندر، تفسیر میں، حدیث میں اور دیگر حوزوی علوم میں کہ جو رائج ہیں اجتہاد کی بات کریں تو ان علمی درجوں کے لحاظ سے اردو زبان حضرات اس جگہ نہیں پہنچتے کہ جہاں دوسرے پہنچتے ہیں، اکا دکا کوئی استثنائی پیدا ہو جائے تو الگ بات ہے لیکن کوئی قاعدہ وضابطہ نہیں ہے، دوسری زبانوں میں قاعدہ و

ضابطہ ہے، ان میں معلوم ہے کہ اتنے فیصد اس مقام تک پہنچ جائیں گے لیکن یہاں توقع بھی نہیں ہوتی ہے، بہت سارے لوگ اس مطلب کو سوچتے ہیں اور غور کرتے ہیں۔

حتیٰ قم میں بعض ایسے افراد کہ جو اس مسئلے میں سوچتے تھے اور اس بابت پریشان تھے، انہوں نے متعدد جلسات بھی تشکیل دیئے اور اس مسئلے کی تحلیل بھی کی کہ ایسے کیوں ہوتا ہے؟ بہت سارے لوگوں نے وہاں جو آراء دیں ان کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی اور پاکستانی طلاب کی راہ میں فراواں موانع حائل ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم اعلیٰ علمی درجات تک نہیں پہنچتے ہیں اور بہت جلد یا تو تعلیم ترک کر دیتے ہیں یا وہ موانع ہم سے چھڑا دیتے ہیں یعنی اس مطلب پر ایک قسم کا اجماع تھا کہ اعلیٰ علمی درجات تک ہم لوگ ان موانع کی وجہ سے نہیں پہنچ پاتے ہیں، اگر وہ موانع برطرف ہو جائیں تو ہم بھی وہاں پہنچ سکتے ہیں کہ جہاں دوسرے پہنچتے ہیں اور عمدتاً جو موانع ذکر کیے گئے تھے وہ سارے موانع بھی مادی تھے یعنی چونکہ مادّی لحاظ سے ہندوستان و پاکستان کے طلاب فقیر و نادار اور بے کس ہیں، ان کے پاس پیسے کم ہوتے ہیں تو اس وجہ سے یہ اعلیٰ علمی درجات تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ ان بحثوں میں وارد ہونا چاہئے لیکن اس وجہ سے نہیں کہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں گے بلکہ حقیقت کو تلاش کرنے کے لئے تاکہ اس حقیقت کو تلاش کر کے پھر اس کیلئے کوئی راہِ حل پیش کریں۔

موانع کس رکاوٹ بنتے ہیں؟

ہندوستان، پاکستان کے طلاب استعداد کے لحاظ سے اگر نہ کہیں کہ بہت ساروں سے بہتر ہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں، کم از کم مبالغہ کئے بغیر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اوسطاً ہندوستان و پاکستان کے طلاب کی استعداد دوسروں سے کم نہیں ہے بلکہ برابر ہے لیکن نتیجہ اور کارکردگی میں بہت

فرق ہے، یہ فرق کیوں ہے؟ یہ ان بزرگان کے نزدیک موانع کی وجہ سے ہے۔اب اخیراً کچھ موانع اس میں اضافہ کر دیئے گئے ہیں کہ جو باہر بہت زیادہ تبلیغ ہوئے ہیں اور معلوم نہیں کہ کس طرح سے اور کیسے نیت سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ کہ ہندوستانی و پاکستانی طلاب کو جان بوجھ کر مجتہد بننے نہیں دیا جاتا ہے یعنی ایرانی مسئولین یا ایرانی ذمہ داران یا یہاں پر ایسا تفکر ہے کہ وہ کسی کو مجتہد بننے نہیں دیتے ہیں، علمی ارتقاء میں آگے بڑھنے نہیں دیتے۔غرضیکہ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موانع حائل ہیں، ان موانع میں بعض مادی و مالی موانع کے قائل ہیں اور بعض قائل ہیں کہ یہاں کا نظام ہمارے لئے مانع ہے لیکن اس بات پر اتفاق ہے کہ موانع کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ واقعاً موانع کی ہی وجہ سے ہمیں یہ مشکل پیش آئی ہے یا اس کا کوئی اور سبب ہے؟ کیوں ارتقاء کا تناسب وہ نہیں ہے کہ جو دوسروں میں ہے؟ اب ایک ناقص رائے کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ موانع کی وجہ سے نہیں ہے، بے شک موانع بھی ہیں، میں موانع کا انکار نہیں کرتا ہوں البتہ یہ موانع نہ مالی ہیں اور نہ ہی وہ موانع ہیں کہ جو حوزے کے اندر اور باہر زیادہ ترویج ہو رہے ہیں جو کاذب موانع ہیں۔

☆مال ودولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

☆مال و دولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

بعض کہتے ہیں کہ ہم لوگ اس وجہ سے مجتہد نہیں بنتے ہیں چونکہ ہماری جیب میں پیسے نہیں ہوتے ہیں اور دوسرے اس وجہ سے مجتہد بنتے ہیں کہ ان کی جیب میں مال ہوتا ہے۔پیسوں سے کوئی

مجتہد نہیں بنتا ہے، جو لوگ کسی اعلیٰ علمی درجے پر پہنچے ہیں ان کے حالاتِ زندگی پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت فقر و کسمپرسی میں پڑھ کر یہاں تک پہنچے ہیں، ان میں بہت سارے یتیم تھے، دربدر تھے، کفالت نہیں تھی۔

حضرت آیت اللہ تبریزی قدس سرہ کے حالاتِ زندگی پر نظر کریں، جب یہ قم میں پڑھتے تھے تو ان کا جی چاہتا تھا کہ پڑھنے کے لئے نجف بھی جائیں لیکن ان کے پاس قم سے نجف تک کا کرایہ نہیں تھا، سالہا سال اس انتظار میں رہے کہ کرایہ مل جائے اور اس وقت بس میں جانے کا کرایہ بھی معمولی سا تھا، آخر کار کسی مجلس میں انہوں نے اپنی ذہانت و فطانت دکھائی اور کسی شخص نے کوئی سوال کیا کہ جس کا جواب باقی بزرگان نہیں دے سکے، انہوں نے ایک طالب علم ہونے کے حوالے سے جواب دے دیا، اس شخص کو یہ جوان طالب علم پسند آیا اور ان کی یہ ذہانت دیکھی تو اس نے پوچھا کہ آپ کی کوئی خواہش ہو تو بتائیں، انہوں نے کہا کہ میرے پاس نجف کا کرایہ نہیں ہے اگر آپ لطف کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کرایہ دے دیں، غور کریں کہ اس طرح کے لوگ بھی تھے۔

استاد تقی جعفریؒ کہ جو ایک عالمی علمی شخصیت ہیں، جب وہ نجف جا رہے تھے تو راستے میں ایک جوتا گم ہو گیا، ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اپنے لئے ایک جوتا خرید سکیں، ایک جوتے میں ایران سے نجف چلے گئے۔ اسی طرح سے آپ دوسرے بزرگان کے حالاتِ زندگی پڑھیں تو جو اعلیٰ درجات تک پہنچے ہیں وہ پیسوں کی وجہ سے نہیں پہنچے ہیں اور نہ ہی اس وجہ سے کہ انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا، مجتہد بننے کے میدان میں کوئی ان کی راہ میں حائل نہیں تھا، رکاوٹیں بھی

☆ مال و دولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

فراواں تھیں لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے اندر ایک بہت قوی محرک موجود تھا۔

ہمیں علمی ارتقاء کے درجے میں موانع بھی درپیش ہیں لیکن وہ دونوں موانع نہیں ہیں، نہ مال مانع ہے کہ الحمدللہ بہت ساروں کی حالت بہتر ہے، مالی لحاظ سے کوئی فقر کی وجہ سے حالتِ احتضار میں نہیں پہنچا ہوا اور نہ ہی یہاں کوئی ایسا مانع ہے کہ یہ لوگ ہمارے طلاب کو پسند نہیں کرتے ہیں کہ یہ اعلیٰ درجات تک نہ پہنچ جائیں، بڑی وجہ یہ ہے کہ محرک کی کمی ہے، بڑے درجات تک پہنچنے کا ارادہ نہیں ہے۔

☆ مال و دولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

حوزے میں ہمارے ایک دوست تھے لیکن انہوں نے چند سال پڑھا، جب وہ واپس جا رہے تھے تو ان سے کہا کہ آپ کچھ عرصہ اور ٹھہر کر پڑھیں تو انہوں نے کہا کہ چند سال اور پڑھ کر جو کچھ ملے گا وہ اگر آج ہی مل رہا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے یہاں پر عمر ضائع کرنے کی، یعنی چند سال اور پڑھ کر مجھے کیا ملے گا؟ لوگ قبول کریں گے، مقبولِ عام ہو جاؤں گا، مشہور ہو جاؤں گا، بڑی شخصیت بن جاؤں گا، بغیر پڑھے اگر بڑی شخصیت بن سکتا ہوں تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ یہاں حوزے میں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کروں۔ پس محرک نہیں ہے ارادہ نہیں ہے اور اس ارادے کے پیچھے کوئی اکسانے والی چیز نہیں ہے، دوم یہ کہ موانع بھی ہیں لیکن وہ موانع کچھ اور سنخ کے ہیں، وہ موانع کچھ ہمارے اندرونی ہیں، کچھ ہمارے ماحول سے مربوط ہیں، کچھ ہماری سوچ سے مربوط ہیں اور کچھ ہمارے اردگرد موجود ہیں۔

اسی طرح سے اگر انسان کے اندر قرآن فہمی کا محرک موجود ہو تو پھر موانعِ قرآن فہمی تک

نوبت آتی ہے، یعنی دل کے اندر، قلبِ انسان میں محرکِ قرآن موجود ہو، قرآن کی طرف آنے کا جاذبہ اور کشش موجود ہو، کوئی چیز ہمیں قرآن کی طرف لانے کے لئے اکسا رہی ہو، قرآن کی طرف آنے کے لئے دل آمادہ ہو پھر اسکے بعد ہم یہ بحث کریں گے کہ اب قرآن فہمی میں کون کونسے موانع پیش آگئے ہیں، فرض کرلیں کہ ہم نے باقی آداب حاصل کر لئے اور ہمارا دل اس وقت آمادہ ہے، محرک بقدرِ کافی وقوی موجود ہے کہ جو ہمیں قرآن کی بارگاہ تک لے آیا ہے تو اب موانع کی نوبت آتی ہے، بعض لوگ ہیں کہ جن کے اندر محرک موجود ہے، ان کو قرآن سے شدید عشق و محبت ہے اور اتفاقاً قرآن کی طرف آتے بھی ہیں پھر اچھا خاصا وقت بھی قرآنی مسائل اور قرآنیات پر صرف کرتے ہیں، بعض تو قرآنی مسائل میں اور قرآنی آیات کے اندر اپنی پوری عمر گزار دیتے ہیں لیکن اسکے باوجود فہم سے قاصر رہتے ہیں، اس نکتے سے قاصر رہتے ہیں کہ جو قرآن بتانا چاہتا ہے، پیغامِ قرآن دریافت کرنے سے محروم رہتے ہیں، یہاں کہا جاسکتا ہے کہ محرومیت از فہم درحقیقت موانع اور رکاوٹوں کی وجہ سے ہے۔

☆ مال و دولت کی محبت فہم میں رکاوٹ نہیں

یہ نکتہ صرف اس لئے عرض کیا کہ ہمیں قاعدہ سمجھ میں آجائے کہ جب کہا جاتا ہے کہ کسی شے کی راہ میں موانع حائل ہیں تو یہ اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب محرک کے بارے میں ہم مطمئن رہیں کہ اس کے اندر محرک موجود ہے اور محرک کے بعد اب یہ شخص موانع سے دوچار ہوا ہے لہٰذا یہ رکاوٹیں اس کی راہ سے برطرف ہونی چاہئیں۔

۳) بے رغبتی، محرک نہ ہونے کی وجہ

غالباً ناکامیاں انہیں چیزوں کا نتیجہ ہیں کہ ہم کسی میدان کے اندر اس طرح سے داخل ہو جاتے ہیں کہ جس کا ہمارے اندر ارادہ وشوق موجود نہیں ہوتا کیونکہ بعض دوسرے عوامل ہمیں اس میدان میں دھکیل دیتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ تعلیمی میدان میں خود شخص کے اندر بقدرِ کافی شوق موجود نہیں ہوتا مثلاً بچے کے اندر رغبت موجود نہیں ہوتی ہے لیکن والدین اصرار کر کے اسے ایک میدانِ علمی میں ڈال دیتے ہیں مثلاً ایک بچے کو انجینئر بننے کا، ڈاکٹر بننے کا یا پائلٹ بننے کا شوق نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کسی اور میدان کی طرف رغبت و میلان ہے لیکن والدین کے اصرار پر یا معاشرے کی وجہ سے یا ماحول کی وجہ سے وہ کسی ایسے میدان میں قدم رکھ دیتا ہے کہ جس کے لئے اس کے اندر رغبت نہیں ہے لہٰذا یہ اس میدان میں ناکام ہے، ممکن ہے کہ وہ ڈگری حاصل کر لے لیکن کبھی بھی اس میدان کا ایک اچھا ماہر یا ایک اچھا انسان ثابت نہیں ہوگا، ہمیشہ یہ میدان اس کے لئے بوجھ ہی رہے گا اور ترقی نہیں کر پائے گا، ممکن ہے کہ وہ اپنا ٹائم پاس کر لے لیکن کبھی بھی اس میدان میں ترقی نہیں کر سکے گا اور اتفاق سے ہر دوسرے تیسرے آدمی کے ساتھ یہی الجھن اور المیہ موجود ہے کہ اسے ناخواستہ طور پر بعض میدانوں میں ڈال دیا گیا ہے۔

جب بچوں اور نوجوانوں کے پاس اختیار نہیں ہوتا ہے تو ان کو ایسی وادیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے کہ جن کیلئے ان کے اندر کوئی میلان نہیں ہوتا ہے اور جب وہ صاحبِ اختیار ہوتے ہیں تو پھر اپنے پسند کے میدان کا ٹائم گزر چکا ہوتا ہے، اس لئے وہ دونوں میدانوں میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

بے رغبتی محرک نہ ہونے کی وجہ

اسی طرح علمِ دین میں بھی بہت سارے لوگوں میں اندرونی رغبت اور شوق نہیں ہوتا ہے لیکن ان کے والدین متدین ہوتے ہیں اور وہ والدین کے اصرار پر آجاتے ہیں یا چونکہ ان کا اختیار نہیں ہوتا ہے لہٰذا ناخواستہ و بے اختیار طور پر انہیں اس میدان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ارتقاء و ترقی نہیں کر سکتے ہیں چونکہ ان کے اندر محرک موجود نہیں ہے، یہاں موانع رکاوٹ نہیں ہیں بلکہ محرک و شوق و رغبت موجود نہیں ہے۔ اسی طرح انسان جب قرآن کی طرف آتا ہے تو سب سے پہلے اپنے اندر رغبت و شوق پیدا کرے لیکن اس کے بھی اسباب و عوامل ہیں۔

موانع کی بات اس وقت شروع ہوتی ہے کہ جب رغبت، شوق اور اندرونی طور پر محرک موجود ہو لہٰذا جب انسان محرک و رغبت کے ساتھ کسی میدان میں اترتا ہے یا قرآن کی وادی میں آتا ہے تو پھر ایک ایک کر کے موانع سر اٹھانا شروع کرتے ہیں مثلاً تعلیمی میدان میں اگر ایک شخص بقدرِ کافی رغبت اور شوق رکھتا ہے، بقدرِ کافی تعلیمِ دین کا شوق رکھتا ہے تو جب اس میدان میں داخل ہوتا ہے تو ایک ایک کر کے موانع اس کی راہ میں پیش آنا شروع ہو جاتے ہیں، یہاں یہ بحث شروع ہوتی ہے کہ ان موانع کو برطرف کریں، کچھ موانع قبل از ورود یعنی اس سے پہلے کہ میدان میں وارد ہوں کچھ موانع برطرف کرنا ضروری ہیں اور کچھ موانع اثنائے عمل میں برطرف کرنا ضروری ہیں یعنی جب انسان میدانِ علمی میں داخل ہوتا ہے تو تعلیم سے پہلے اور پڑھائی کے دوران ان موانع کو پہچاننا بھی ہے اور ایک ایک کر کے ختم بھی کرتا ہے۔

باطنی محرک نہ ہونے کی وجہ

٤) علامت سے رغبت کی پہچان

چونکہ اس مسئلے کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے لہٰذا یہ ہر ایک کے لئے مبتلا شدہ مسئلہ ہے، ممکن ہے کہ ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہو کہ ہمیں کیسے پتہ چلے کہ یہ ہمارا اپنا شوقیہ میدان ہے، رغبت کا میدان ہے یا ہم پر ٹھونسا گیا میدان ہے۔ رغبت کی کوئی نہ کوئی علامت ضرور ہوتی ہے لہٰذا ان علامتوں کے ذریعے سے ہم آسانی سے پرکھ سکتے ہیں۔ انسان جس شعبے میں بھی جائے اور جانے کے بعد انسان کو قلبی طور یہ احساس ہو کہ گویا مجھے اپنی کوئی گمشدہ چیز مل گئی ہے تو سمجھ لیں کہ یہی آپ کی مطلوبہ چیز تھی۔ آپ کا ضمیر، آپ کا وجدان، آپ کا نفس، آپ کی روح اسی کی تلاش میں تھی اور جس میدان میں بھی بیزاری اور اکتاہٹ ہو اور یہ احساس موجود نہ ہو کہ مجھے اپنی گمشدہ چیز ملی ہے اور اس کے اندر لذت وسرور محسوس نہ ہو تو جان لے کہ یہ میدان میرا موردِ رغبت نہیں ہے۔ اگر والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ارتقاء وترقی کریں تو انہیں چاہئے کہ وہ بچوں اور جوانوں کی راہنمائی کریں لیکن انتخابِ علم میں، میدان اور شعبے کے انتخاب میں بچوں کی رغبت وشوق کو پہلی ترجیح حاصل ہے لیکن اگر ملازمین بنانا چاہتے ہیں اور ٹائم پاس کرنے کے لئے ایک فرضِ تربیت کرنا چاہتے ہیں تو یہ چیز انہیں مشکلات میں دھکیل دیتی ہے۔

علامت سے رغبت کی پہچان

٥) ناکامیوں کی بڑی وجہ

ناکامیوں کا پہلا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمیں اپنی رغبت اور شوق کے میدان میسر نہیں آتے

ہیں، لوگ ناخواستہ معاشرے، والدین، اردگرد کے لوگ، بزرگان اور تقلیدِ ناخواستہ کی وجہ سے بعض وادیوں کے اندر اُتر جاتے ہیں اور اگر انہیں تھوڑی سی آزادی دیں، اگر انہیں لوگوں کی سرزنش کا خطرہ نہ ہو کہ کوئی ہمیں برا بھلا نہیں کہے گا، کوئی ہم پر تہمت و بہتان نہیں باندھے گا، کوئی ہماری حوصلہ شکنی نہیں کرے گا تو آپ دیکھیں گے کہ بہت سارے لوگ میدانوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے مثلاً یہی طلابِ علومِ دینی کہ اگر بعض جبر اِن سے اٹھالئے جائیں مثلاً والدین، سوسائٹی (Society)، بزرگان اور مسئولین کی سرزنش کا خوف اور انہیں آزادی دیدی جائے کہ جو پڑھنا ہے پڑھیں تو پھر پتہ چلے گا کہ رغبت سے کتنے لوگ پڑھتے ہیں؟ عبادت بھی وہ فائدہ مند ہے کہ جو رغبت کے ساتھ ہو یعنی اگر جہنم کا کوڑا اٹھا بھی لیا جائے اور جنت کی لالچ ہم سے لے بھی لی جائے لیکن پھر بھی انسان عبادت کرتا رہے تو وہ حقیقی عبادت گزار ہے۔ رغبت و شوق کی عبادت، عبادتِ مشتاقانہ اور عبادتِ عاشقانہ ہو نہ کہ عبادتِ عبادانہ کہ جو غلاموں کی طرح یا کوڑوں کے ڈر سے کام کرتے ہیں یا عبادتِ تاجرانہ کہ جو سود و زیاں کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں لہٰذا رغبت و شوق کا نہ ہونا ناکامی کی بڑی وجہ ہے۔

٦) موانع کی صحیح تشخیص ضروری ھے

ناکامیوں کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ جس میدان میں انسان حتیٰ رغبت اور شوق کے ساتھ بھی اترتا ہے تو موانع کو نظر انداز کر کے اترتا ہے اور شناخت نہیں کرتا ہے کہ اس راہ کے اصلی موانع

موانع کی تشخیص ضروری ہے

کون کونسے ہیں؟ پس پہلا امر شناختِ موانع ہے، انسان اسی وقت موانع کو برطرف کرنے پر قادر ہے کہ جب متوجہ ہو کہ اصل موانع کیا ہیں؟ اگر توجہ اور شناخت ہی نہ ہو تو خوانخواہ انسان ان سے دوچار رہتا ہے۔

مثلاً اگر ایک شخص طالب علم بننا چاہتا ہے، دینی علم پڑھنا چاہتا ہے تو عموماً سوچتا ہے کہ رہائش کہاں ہوگی؟ پیسہ کتنا ملے گا؟ مہینہ گزرے گا؟ یا نہیں گزرے گا؟ عموماً یہ سوالات کرتے ہیں درحالیکہ یہ زندگی کی راہ کے موانع ہیں نہ کہ تعلیم کی راہ کے موانع ہیں مثلاً اقامہ ہونا یا نہ ہونا یہ تو تحصیلِ علم میں دخیل نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ آپ کے بعض دیگر امور اور زندگی کے مسائل میں مانع ہو۔ موانع کی شناخت کریں کہ عبادت کے موانع کونسے ہیں؟ آسائش کے موانع کونسے ہیں؟ زندگی کے موانع کونسے ہیں؟ ان کو مخلوط نہ کریں، ایک دوسرے کے اندر خلط ملط نہ کریں، بعض امور کے موانع کی دیگر چیزوں کے موانع کے ساتھ ملاوٹ نہ کریں مثلاً ممکن ہے کہ ایک مانع انسان کے سونے میں حائل ہے، بعض انسانوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر لائٹ کھلی ہوئی ہو تو نہیں سوسکتے ہیں، جب تک پورا اندھیرا نہ ہو جائے وہ نہیں سوسکتے لیکن یہ نیند کا مانع ہے نہ کہ تعلیم کا، اگر وہ حوزہ چھوڑ کر چلا جائے اور کوئی پوچھے کہ کیوں چھوڑ کے آگئے ہو؟ تو کہے کہ رات کو میرے کمرے میں لائٹ آف نہیں کرتے تھے اس لئے میں نہیں پڑھ سکتا ہوں۔ آپ یہ کہیں کہ میں وہاں سو نہیں سکتا تھا نہ کہ پڑھ نہیں سکتا تھا، نیند کی راہ کے موانع اور ہیں اور تعلیم کی راہ کے موانع اور ہیں، ہم عموماً بعض موانع کہ جو تعلیم کی راہ میں حائل نہیں ہیں انہیں موانعِ تعلیم سمجھتے ہیں اور جو موانع تعلیم کے ہیں ان کی طرف اصلاً سرے سے

توجہ نہیں ہے بلکہ ان سے صرفِ نظر اور چشم پوشی کرتے ہیں۔لہٰذا انسان پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے، بہت سارے لوگ رغبت وشوق سے پڑھنے کے لئے آتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں اور کسی مقام و درجہ علمی تک نہیں پہنچتے ہیں چونکہ ان موانع کے اندر ہی رہتے ہیں اور انہیں برطرف نہیں کرتے ہیں۔

سب سے پہلے شناختِ موانع ضروری ہے، ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میں جس وادی میں اترا ہوں اس وادی کے موانع کونسے ہیں؟ رکاوٹیں کونسی ہیں؟ اب کسی کا جو بھی میدان ہو لیکن چونکہ ہماری بحث قرآن کے بارے میں ہے لہٰذا ہمیں سب سے پہلے قرآن کے موانع سے آشنا ہونا چاہئے لیکن قاعدہ وضابطہ عام ہے، ہر شعبۂ زندگی میں یہ عمل ہمیں پہلے انجام دینا ہوگا تاکہ ناکام نہ رہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم مایوس ہو جائیں اور پوری عمر اس میدان میں لگا کر نادم اور پشیمان نہ ہوں۔

پس پہلے رغبت پیدا کریں، قرآن کی طرف آئیں اور شوق پیدا کریں، شوق کے بعد پھر موانع کی شناخت کریں کہ عمدتاً قرآن کے اندر مشغول لوگوں کی راہ میں کیا کیا موانع ہیں کہ جس کی وجہ سے قرآنی میدان میں ناکام رہ جاتے ہیں اور کسی مقام و مرتبے تک نہیں پہنچتے ہیں، مقام و مرتبہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ تفسیر نہیں کر سکتے یا کتاب نہیں لکھ سکتے ہیں، بلکہ چہ بسا قرآن کی تفسیر بھی کرتے ہیں اور قرآن کے بارے میں کتابیں بھی لکھتے ہیں لیکن پھر بھی میدانِ قرآن میں ناکام انسان ہیں چونکہ حقیقی ہدایتِ قرآنی انہیں حاصل نہیں ہوئی۔

کامیاب اور ناکام لوگوں کا تذکرہ خود قرآن نے بھی کیا ہے کہ

أُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ٥(٢)

یہ کامیاب لوگ ، ہیں، مُوافق لوگ ہیں اور بعض کو کہا ہے کہ

أُولٰئِکَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ٥(٣)

یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن سے مطلوبہ ہدایت نہیں ملتی یا ناکامی کا معنیٰ یہ ہے کہ انہیں ہدایت نہیں ملتی ہے، پہلے انہیں اسباب تلاش کرنے چاہئیں کہ ہم کیوں خاسرین میں سے ہیں، سب کچھ کرنے کے باوجود بھی خسارے میں سے ہیں، اس بارے میں فراواں روایات ہیں۔

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(٤)

کَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(٥)

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(٦)

یعنی بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے،

بعض قرآن خواں ایسے ہیں کہ جن پر قرآن لعنت کرتا ہے اور یہی ناکام لوگ ہیں باوجودیکہ انہوں نے ساری عمر قرآن کے اندر صرف کی ہے، پس پہلے ہم موانع کی تلاش کریں، نہ وہ موانع کہ جو دوسرے کاموں میں موانع ہیں اور ہم ان کو قرآنی موانع شمار کرتے ہیں مثلاً آپ کے پاس ایک اچھا پرنٹڈ (Printed) قرآن موجود نہیں ہے لہٰذا یہ قرآن کے نہ سمجھنے کا ایک مانع ہے۔ یہ مانع فہم قرآن نہیں ہے یا مثلاً یہ کہے کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں اس وجہ سے قرآن سمجھ نہیں آتا ہے تو یہ بھی

موانع کی تشخیص ضروری ہے

مانعِ فہمِ قرآن نہیں ہے لہٰذا پہلے موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے تا کہ انسان انہیں برطرف کرنے کی کوشش کر سکے۔

۷)موانعِ علم

بہت سے موانع علم کی راہ میں حائل ہیں، کہا جاتا ہے کہ

لِكُلِّ شَيْءٍ آفَةٌ وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ......(۷)

ہر چیز کی ایک آفت و بیماری ہے لیکن علم کے لئے بہت ساری چیزیں آفت ہیں، ہر چیز علم کی رکاوٹ ہے، اگر ایک انسان علم حاصل کرنے آئے لیکن آتے ہوئے جتنے بھی دوست، عزیز، ہمسائے، رشتہ دار اور ٹرین پہ بیٹھا تو اس کے گارڈ، قلی، مسافر اور ٹکٹ کلکٹر تک سے سے ٹیلیفون نمبر اور موبائل نمبر ساتھ لیتے ہوئے آئے، بارڈر کراس (Cross) کیا ہے تو وہاں پر دونوں طرف کے لوگوں کا یا ایئر پورٹ والوں سے ٹیلیفون نمبرز لے کر آئے کہ میں پہنچتے ہی آپ سب سے رابطہ کروں گا، جب آپ اتنے ٹیلیفون نمبرز اور ای میل ایڈریس ساتھ لے کر آئے ہیں تو پھر آپ پڑھیں گے کب؟ اگر آپ پڑھنے کے لئے آئے ہیں تو یہ سارے موانع ہٹا کر آئیں، یہ آفاتِ علم ہیں کہ جو آپ ساتھ لے آئے ہیں۔

بعض اساتیدِ بزرگان کے بقول طالب علم کو آتے ہوئے ایک بات گھر میں کہہ کر آنی چاہئے کہ جب تک میرا کوئی خط نہیں آتا تو سمجھو خیریت سے ہوں یعنی جب تک ٹیلیفون نہیں کرتا ہوں

موانعِ علم

اس وقت تک سمجھو خیریت سے ہوں، ٹیلیفون آیا تو سمجھو کہ کوئی نہ کوئی مشکل ہے، جب تک خیریت سے ہیں تو ٹیلیفون نہ کریں اور اس کے بعد پڑھائی میں مشغول ہو جائیں، ورنہ انسان اتنے تعلقات اور اتنے موانع خود لے کر آئے تو ٹیلیفون الگ کرے، پھر رات کو مہمان کی دعوت کرے اور جس رات مہمان اِدھر نہ آئے تو یہ خود کسی کے ہاں مہمان چلا جائے، پھر یہ پڑھے گا کس وقت؟ حرم کے جتنے خادم ہیں سب کے ساتھ اسکا رابطہ ہو، جتنے مدرسہ کے خادم ہیں ان سب کے ساتھ اس کے تعلقات ہوں، جتنے ٹیکسی ڈرائیورز ہیں سارے اس کے دوست ہوں تو اس صورت میں یہ انسان کب پڑھے گا؟

پڑھائی کے لئے موانع ہیں، ان موانع کو ہٹا کر، ان رکاوٹوں کو ہٹا کر ادب کے ساتھ پڑھو۔ پڑھنے کے آداب ہیں، اسی طرح سے قرآن کی بارگاہ میں جب آتے ہو تو بھی موانع ہٹا کر آؤ، جس طرح سے نماز ہے کہ جب نماز کی طرف آتے ہو تو موانع ہٹا کر آؤ،

اِنِّی اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًیo(۸)

میں ہی آپ کا رب ہوں، پس اپنی جوتیاں اتار دیں، بتحقیق آپ طوی کی مقدس وادی میں ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام جب معراج پر بارگاہِ خدا میں پہنچے تو خداوند نے فرمایا کہ یہ ساتھ کیا لے کر آئے ہیں؟ نالین!

فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ......

پس اپنی جوتیاں اتار دیں......

اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًیo

آپ کو معلوم نہیں ہے کہ وادیٔ مقدس میں نالین پہن کر آ رہے ہیں، نعلین سے مراد فقط جوتے نہیں ہیں، جوتوں میں اضافی چیزیں بھی ہیں، یہ نہیں کہا کہ فاخلع قدمیک کہ پاؤں اتار کر آؤ نہیں، بلکہ پاؤں میں فالتو چیزیں اُتار کر آؤ، نعلین فالتو چیزیں ہیں، پاؤں کے ساتھ آؤ لیکن جوتوں کے ساتھ نہ آؤ چونکہ پاؤں تمہارا جزو ہے لیکن جوتے تمہارے جزو نہیں ہیں۔ انسان جب حوزے میں آئے تو نعلین اتار کر آئے، نعلین یعنی وہ سارے تعلقات چھوڑ کر آئے، ساری وابستگیاں اور دلبستگیاں ترک کر کے آئے۔

۸)عبادت کی راہ میں حائل موانع

اس طرح جب انسان نماز میں داخل ہوتا ہے تو اسی طرح موانعِ حضورِ بارگاہِ خدا ہٹا کر نماز میں جائے ورنہ نماز میں بعض ہوتے ہیں کہ ٹی وی بھی آن کر کے رکھتے ہیں، ٹیلیفون بھی آن کر کے رکھتے ہیں، سب کچھ آن کر کے اللہ اکبر کہتا ہے تا کہ اگر نماز میں بھی کہیں ٹیلیفون آ گیا تو اس کو ریسیو (Receive) کر کے زور سے کہوں کہ سبحان ربی العظیم و بحمدہ، تا کہ اس کو پتہ چلے کہ میں نماز میں مصروف ہوں، لہٰذا دوبارہ کال کرے گا، پھر کہتا ہے کہ حضورِ دل نہیں ہوتا ہے، مولانا کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ حضور کے ساتھ نماز پڑھوں؟ جب سارے موانعِ حضور بھی ساتھ

ہیں تو کس طرح سے حضور پیدا ہوگا ؟اسی طرح دعا ومناجات اور خدا کی بارگاہ میں راز و نیاز کے دوران ہم بہت سارے موانع کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اور نتیجے میں مطلوبہ مقاصد تک نہیں پہنچ پاتے۔

جب قرآن کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں تو نالین اتار کر آئیں نعلین سے مراد ذہنی نالین، فکری نالین اور فالتو چیزیں ہیں، جتنی بھی فالتو چیزیں ہیں سب چھوڑ کر آئیں، اپنی ساری رکاوٹیں اتار کر محض قرآن کی خدمت میں آجائیں۔

۹)دل مانندِ آئینہ

ایک تشبیہ کے ساتھ فرماتے ہیں کہ دل مانندِ آئینہ ہے، دل کی مثال ظرفِ فہم ہونے کے اعتبار سے مانندِ آئینہ ہے، آئینے میں اگر غور کریں تو اپنے دل کی کیفیت سمجھ میں آجائے گی۔ آئینے کے حالات پر، آئینے کی مختلف شکلوں اور آئینے کی مختلف صورتوں پہ غور کریں تو اپنے دل کی حالت کو سمجھے میں آسانی ہوگی۔ بسا اوقات ہم آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو اس کے اوپر غبار پڑا ہوتا ہے، عموماً جو آئینے کھلی ہوا میں، کھلی فضا میں ہوتے ہیں اور روزانہ ہوا چلتی ہے تو ان کے اوپر مٹی اڑتی ہے لہٰذا ان کے اوپر غبار پڑا ہوتا ہے، عموماً جب اس آئینے کے سامنے جا کر کھڑے ہوتے ہیں تو تصویر نظر نہیں آرہی ہوتی ہے لہٰذا فوراً آئینے کو غبار سے پاک کرتے ہیں، اسی طرح سے دل پر بھی انسان کا غبار چڑھ جاتا ہے، جب آئینہ صاف کررہے ہوتے ہیں تو پہلی توجہ دل کی طرف ہو کہ جب

یہ صورت کا آئینہ اور جسمانی آئینہ غبار آلود ہے تو کہیں قرآن کا آئینہ بھی غبار آلود نہ ہو، وہ بھی تو میں نے کھلی فضا میں رکھا ہوا ہے، ہر ایک کے سامنے یہ دل رکھا ہوا ہے، ہر چیز اس پر اثر ڈال رہی ہے، اس دل پر بھی غبار آجاتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ آئینے کے لئے دو قسم کے موانع ہیں بعض موانع آئینے کے اندرونی ہیں کہ جو رُکاوٹیں خود آئینے کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض رکاوٹیں باہر سے آئینے کے اوپر آجاتی ہیں، فرماتے ہیں کہ اندرونی رکاوٹیں یا سلبی اور عدمی ہیں یا منفی رکاوٹیں اور وجودی ہیں یعنی یا کسی چیز کا نہ ہونا ایک رکاوٹ ہے یا کسی موجود کا، کسی حالت کا، کسی صفت کا اس کے اوپر طاری ہونا دوسری رکاوٹ ہے اور اسی طرح سے بیرونی رکاوٹیں بھی دو طرح کی ہیں، یا عدمی رکاوٹیں ہیں یا وجودی رکاوٹیں ہیں، عدمی رکاوٹیں یعنی جو چیز باہر سے ہونی چاہئے تھی وہ موجود نہیں ہے یا پھر وجودی رکاوٹیں ہیں یعنی جو چیزیں باہر سے نہیں ہونی چاہئے تھیں وہ بھی آئینے کے اوپر موجود ہیں۔

۱۰) دل کی راہ میں دو مشکلات

اسی طرح سے انسان کا دل بھی مانندِ آئینہ ہے، دل کے کچھ اندرونی مسئلے ہیں، دل کی اندرونی مشکلات ہیں اور یہ دو طرح کی ہیں یعنی سلبی اور اثباتی، اسی طرح سے دل کے اوپر باہر سے جو چیزیں آکر طاری ہو جاتی ہیں یہ بیرونی رکاوٹیں ہیں اور ان کی بھی دو صورتیں ہیں سلبی اور اثباتی و ایجابی یعنی کچھ ایسی منفی چیزیں ہیں کہ جو دل کے اوپر آکر چھا گئی ہیں، طاری ہو گئی ہیں اور کچھ ایسی

مثبت چیزیں ہیں، وجودی چیزیں ہیں، مثبت سے مراد وجودی چیزیں ہیں کہ جنہیں نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن یہ بھی دل کے اوپر طاری ہیں، حائل ہیں، اس قسم کا دل جوان موانع میں مبتلا ہو تو جب یہ قرآن کے سامنے آتا ہے تو اگر باقی سارے آداب انسان نے فراہم کر بھی لئے ہیں لیکن یہ رکاوٹیں برطرف نہیں کی ہیں تو قرآن ہرگز دل میں نہیں اترتا کیونکہ رکاوٹوں نے دل کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔

کونسی حالتیں ہیں کہ جو اندرونی اور سلبی ہیں کہ جو نہیں ہونی چاہئے تھیں اور دل کے اندر موجود ہیں، فرماتے ہیں کہ جس طرح آئینے کے اندر بسا اوقات داغ و دھبہ لگ جاتا ہے، کیونکہ بعض آئینے ناقص جنس سے بنے ہوتے ہیں یا رطوبت کی فضا میں رہتے ہیں تو ان کے اندر زنگ کا داغ پڑ جاتا ہے چونکہ آئینے کے پیچھے سیسہ لگا ہوتا ہے، اس وجہ سے وہ زنگ ایجاد کرتا ہے، آئینہ تو شیشہ ہوتا ہے، شیشے کے پیچھے اگر سیسہ لگا دیں تو اس کو آئینہ بنا دیتا ہے، اس کے اندر انعکاس کی خصوصیت پیدا کر دیتا ہے، اسی طرح سے دل کے اندر بھی انعکاس کی خصوصیت ہے لیکن اگر یہ دل پڑا رہے، اس کا خیال نہ رکھیں اور اس کو نہ بچائیں تو اس کے اندر خود ہی خود رطوبت آجاتی ہے اور زنگ لگ جاتا ہے، اس کے اندر داغ و دھبہ آجاتا ہے۔ دل کی اندرونی کیفیت آئینے کی طرح ہے اور بعض اوقات دل پر باہر سے کوئی غبار آکر بیٹھ جاتا ہے، جس طرح آئینے پر باہر سے مثلاً گرد و غبار آکر طاری ہو جاتا ہے تو اسی طرح سے دل پر بھی باہر سے کوئی غبار آکر بیٹھ جاتا ہے اور یہ مانع بنتا ہے، یہ بھی اندرونی رکاوٹ ہے یعنی دل کی کیفیت بھی مانندِ آئینہ ہے، اندرونی وجودی چیز اور اندرونی عدمی چیز یعنی بسا اوقات آئینہ اندر سے آمادہ نہیں ہوتا اور بسا اوقات اندر سے کوئی ایسی وجودی چیز آئینے میں پیدا

ہو جاتی ہے، اسی طرح دل کے اندر بھی کبھی ایک سلبی چیز پیدا ہوتی ہے، دل کے اندر عدمِ آمادگی پیدا ہوتی ہے اور دل کی اندرونی حالت ضعیف ہو جاتی ہے، جیسے طفولیت و بچپنہ ہے یا بلاذت وحماقت ہے۔

یعنی دل کی کچھ اندرونی رکاوٹیں ہیں اور فہم کی راہ میں کچھ بیرونی رکاوٹیں ہیں، یہاں پر صدرالمتالہینؒ کا زیادہ تر نکتہ کہ جس کے اوپر انہوں نے بحث کو متمرکز کیا ہے وہ موانعِ بیرونی ہیں یعنی باہر سے جو موانع دل کو پیش آتے ہیں چونکہ اندرونی موانع سے پہلے درج کر آئے ہیں کہ ان سے تطہیر ہونی چاہئے، دل پاک وصاف ہو، دل آمادہ ہو یعنی ادبِ دوم کہ جو طہارتِ قلب کے بارے میں ذکر کیا تھا اس کے اندر تقریباً اندرونی موانع کی نشاندہی موجود ہے کہ جن کو برطرف کرنے کی ضرورت ہے۔ خارجی موانع میں سے جو موانع اکثر اہلِ علم کو پیش آسکتے ہیں اور مبتلا بہ موانع ہیں ان سے خال خال انسان مستثنٰی ہیں، اکادکا افراد ہیں کہ جنہوں نے ان موانع کو عبور کیا ہے اور یہ ان کی راہ میں حائل نہیں ہیں، ان میں بھی فرماتے ہیں کہ کچھ عدمی ہیں اور کچھ وجودی ہیں۔ وجودی موانع وہ ہیں جو خارج سے انسان کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

آپؒ مزید فرماتے ہیں کہ اندرونی رکاوٹیں دوطرح کی ہیں، عدمی ہیں اور وجودی ہیں یعنی سلبی اور اثباتی ہیں، عدمی رکاوٹیں یعنی کچھ امور جنہیں ہونا چاہئے تھا اور نہیں ہیں، یہ نہ ہونا رکاوٹ ہے اور دوسری قسم کی اندرونی رکاوٹ وہ چیزیں ہیں کہ جو وجودی ہیں یعنی وہ امور کہ جو موجود ہیں اور انہیں نہیں ہونا چاہئے تھا، سلبی وعدمی رکاوٹوں میں مثال دیتے ہیں کہ قرآن فہمی کے لئے دل کے اندر

عدمِ بلوغ، طفولیت اورانسان کا بچپنہ رکاوٹ ہے یا بلادت وحماقت مانع ہے۔ یہ دل کے اندرونی حالات کے نام ہیں یعنی پیدائشی طور پر یا ابھی بالغ نہیں ہوا ہے، فقدانی حالت ہے یا عدمِ بلوغ ہے تو اس وجہ سے بھی دل کو قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے یا بلادت کی وجہ سے ہے یعنی بالغ تو ہوگیا ہے لیکن اَبلہ ہے، اَبلہ یعنی بیوقوف، احمق، نافہم اور کند ذہن ہے۔

۱۱)فہم کی راہ میں حائل رکاوٹیں

☆ طفولیت

موانعِ فہمِ قرآن میں ایک مانع طفولیت ہے کہ جس کا صدر المتألھین ؒ کی کتاب مفاتیح الغیب میں ذکر موجود ہے۔ طفولیت یعنی عدمِ بلوغ، جب انسان بچہ ہو، بالغ نہ ہو اور رشدِ ذہنی ورشدِ فکری موجود نہ ہو تو انسان کے اندر یہ ایک سلبی وعدمی مانع ہے، اب انسان اس مانع کے برطرف ہونے کا انتظار کرے، ظاہر ہے کہ بچپنہ اختیاری نہیں ہے، عمر گزارے اور کچھ عرصہ انتظار کرے تاکہ رشدِ ذہنی اور بلوغِ ذہنی کی حد تک پہنچے، یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ انسان کو جسمانی بلوغ کے ساتھ ساتھ عقلی اور قلبی بلوغ بھی حاصل ہو، چہ بسا جسمانی بلوغ انسان کو حاصل ہوجاتا ہے لیکن عقلی بلوغ حاصل نہیں ہوتا ہے، بعض اوقات انسان مثلاً تیس چالیس سال کا یا اس سے بھی بڑا ہوجاتا ہے لیکن ذہنی طور پر، سوچ کے لحاظ سے، فہم کے لحاظ سے، فکر کے لحاظ سے ایک بچہ ہی ہوتا ہے لیکن کبھی برعکس ہوتا ہے، بعض انسان جسمانی طور پر بلوغ سے پہلے ذہنی طور پر بالغ ہوجاتے ہیں لیکن اسے عمومیت

حاصل نہیں ہے۔

یہ دونوں اتفاق استثنائی ہیں، کم لوگ ایسے ہیں کہ جو جسمانی طور پر بالغ ہو جاتے ہیں لیکن ذہنی طور پر نہیں ہوتے ہیں اوران سے بھی کم تر لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جو ذہنی طور پر بالغ ہو جاتے ہیں اور ابھی جسمانی طور پر بالغ نہیں ہوتے ہیں، عمومیت اور اکثریت ان لوگوں کی ہے کہ جن کے ہاں جسمانی اور ذہنی بلوغ تدریجاً ایک ساتھ پیدا ہوتا ہے، اگر یہ لوگ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں تو بلوغِ ذہنی کا انتظار کریں۔

اس نکتے کی طرف توجہ کی شدید ضرورت ہے کہ ہم بچوں کے اوپر قرآن کو ٹھونسیں نہیں بلکہ ان کے ذہن، سن اور عمر کے مطابق قرآن میں وارد کریں کہ ان پر بوجھ نہ ڈلے، ایسا نہ ہو کہ یہ بیزار ہو جائیں، بسا اوقات یہی ہوتا ہے، یہ آفات میں سے ہے اور نقصان دہ چیز ہے کہ بچوں کو بجائے اس کے کہ قرآن سے اس طرح آشنا و مانوس کریں کہ آئندہ مستقبل میں یہ انسانِ قرآنی اور قرآن شناس انسان بنیں لیکن کچھ قرآنی کرتب کہہ لیں یا کچھ قرآنی ہنر اور فن ان کو سکھا دیتے ہیں اور پھر مجمع لگا کر اس کے سامنے وہ بچہ لوگوں کو محظوظ کرنے کے لئے مظاہرہ کرتا ہے یعنی لوگ قرآن سے مانوس نہیں ہو رہے ہوتے ہیں بلکہ بچے سے مانوس ہو رہے ہوتے ہیں کہ کیا بچہ ہے؟ کیا کمال کرتا ہے یہ بچہ؟ کچھ عرصے بعد بچے میں بھی قرآن کیلئے جاذبہ نہیں رہتا ہے بلکہ لوگوں کی واہ واہ اس کو پسند آجاتی ہے چونکہ قرآن کے ذریعے سے اور قرآن کے بعض مسائل حفظ کرنے سے یا ہنر مندی دکھانے سے لوگ اس کو اچھا کہتے ہیں لہٰذا یہ اور شوق سے پڑھتا ہے، یہ قرآن آموزی کا طریقہ نہیں ہے۔

بچے کی سطح تک بچے کو قرآن بتایا جائے یعنی جتنی اس کی سطحِ ذہنی ہے چونکہ اس بچے کو بالغ ہونا ہے، ابھی نہ جسمانی طور پر بالغ ہے اور نہ ذہنی طور پر بالغ ہے، ہم ہرگز اس بچے سے توقع نہ رکھیں کہ یہ بڑوں جیسے قرآن کے مفاہیم، معانی اور معارف کو درک کرے گا اور وہ طوطا وار رٹا کے اسے پھر تکرار کروانا بھی بچے کے تکامل پر کوئی دلیل نہیں ہے، ایک وقت میں آکر یہی چیز اس کیلئے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے چونکہ ابھی بچہ ہے، لوگوں کو محظوظ کرتا ہے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے یہ بعد میں بڑا ہو جائے گا، داڑھی مونچھ نکل آئے گی، اب وہ جاذبہ اس کے اندر موجود نہیں ہوگا اور یہ پہلے سے پُر توقع بچہ بن چکا ہے، پہلے سے تالیوں کا، واہ واہ کا، نعروں کا اور صلواتوں کا عادی وخوگر ہو چکا ہے لیکن جب اس کی داڑھی نکل آتی ہے تو اب لوگ اس سے محظوظ نہیں ہوتے ہیں، داڑھی والا قرآن پڑھتا ہے تو اسے پڑھنے دو اس سے ہمیں کیا ہے مزہ تو یہ ہے کہ چھوٹا سا بچہ پڑھے، لوگ اسی وجہ سے بچے سے محظوظ ہوتے ہیں، بڑا ہو کر جب اس کو یہی پروٹوکول (Protocol) نہیں ملتا ہے تو اس کے لئے مشکل پیش آتی ہے، نفسیاتی طور پر الجھن کا شکار ہو جاتا ہے، پھر کاذب حرکتیں کرنا شروع کرتا ہے صرف لوگوں کی توجہ اپنی طرف جذب کرنے کے لئے۔ یہ اچھی مثال نہیں ہے لیکن اس مثال کے بغیر چارہ نہیں ہے کہ جس طرح سے فرض کریں کہ ایک جوان لڑکی ہے، جوانی کی وجہ سے خوبصورت ہے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے لیکن بالآخر جب اس کی عمر ڈھلتی ہے تو یہی حسن ماند پڑ جاتا ہے، چہرے پہ جھریاں پڑ جاتی ہیں، بڑھیا ہو جاتی ہے لیکن وہ لوگوں کی نگاہوں کی ابھی بھی تشنہ ہے اور ان نگاہوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لئے ہر حرکت کرتی ہے، کبھی الٹے سیدھے لباس پہنتی ہے، کبھی سرخی

لگاتی ہے اور کبھی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے تاکہ وہ نگاہیں جو پہلے میری طرف تھیں، کوچہ و بازار میں جب باہر نکلتی تھی تو سب مثلاً اپنے کام بھول جاتے تھے اور مجھے دیکھنا شروع کر دیتے تھے، اب بھی وہی رونما ہونا چاہئے، یہ پرتوقع ہے لیکن اسے معلوم نہیں ہے کہ وہ کسی اور وجہ سے تھا۔

بچے کو اگر آپ نے پر جاذبہ بچہ بنا دیا ہے تو یہ پرتوقع بچہ ہے، یہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اس کی توقعات زیادہ ہوتی جاتی ہیں، پھر یہ پوری کرنا مشکل ہیں اور جب درست راستوں سے پوری نہیں ہوں گی تو وہ کاذب راستے، اسی بڑھیا جیسے، اجوبن جیسے راستے اپنائے گا، اس کو کاذب شخصیت بنانی پڑے گی، شروع سے آپ بچے کو نہجِ قرآن پہ ڈال دیں، بچے کے اندر قرآن فہمی کی لحاظ سے ایک چیز مانع ہے اور وہ یہ ہے کہ ابھی طفل ہے، نابالغ ہے، نابالغ یعنی اندرونی مانع اس کے اندر موجود ہے اور سلبی مانع ہے۔

پس مانعِ قرآن میں ایک وجہ عدمِ بلوغت ہے، غیر بالغ انسان کو قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے البتہ یہ برطرف کرنا اختیاری نہیں ہے، برطرفی کیلئے انتظار اختیاری ہے کہ تھوڑا انتظار کرلیں، اس وقت تک بچے کے اندر قرآن کے بارے میں اور فہمِ قرآن کیلئے رغبت پیدا کریں۔

☆ بلادت

☆ بلادت

فہمِ قرآن کی راہ میں دوسرا مانع بلادت ہے یعنی کند ذہنی، بے وقوفی اور فقدانِ عقل، ابلہ ہونا یعنی ذہن کا درست کام نہ کرنا، جیسے کچھ لوگوں کا ذہنی رشد اصلاً کم ہوتا ہے، بہت سارے مسائل

کی وجہ سے ان کے اندر فہم کم ہوتی ہے، یہ بھی ایک اندرونی وسلبی مانع ہے، چہ بسا انسان اسّی (80) سال تک پہنچ جائے لیکن بلادت کی وجہ سے انسان کو رشدِ ذہنی حاصل نہ ہو، یہ اور بات ہے کہ عمر کے لحاظ سے انسان میں عقل نہ ہو، بلوغ نہ ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ عمر کے لحاظ سے جسمانی طور پر بالغ ہو جائیں لیکن ابھی بھی اس کے اندر عقل نہیں آئی ہو لہٰذا اس کو اَبلَہ یعنی بیوقوف، نافہم اور ڈل (Dull) انسان کہتے ہیں، اس کو جتنا بھی سمجھاتے رہیں لیکن کوئی چیز اس کے پلے نہیں پڑتی ہے کہ متأسفانہ بعض ایسے ہیں کہ جن کے اندر یہ عارضہ موجود ہے یا پیدائشی طور پر ہوتا ہے یا بعد میں حالات کی وجہ سے ان کے اندر یہ بلادت آجاتی ہے اور اتفاقاً آج کل تھوڑا تو فرق پڑا ہے لیکن پاکستان میں سنی اور شیعہ دونوں کے اندر یہ ایک رجحان تھا کہ جو بچہ اَبلَہ ہوتا تھا، ڈل ہوتا تھا، نافہم اور کند ذہن ہوتا تھا اس کو قرآن حفظ کرنے کے لئے بھیج دیتے تھے یعنی میدانِ قرآن کے لئے اَبلَہ لوگوں کو بھیجتے تھے اور ان کو بھی سالہا سال لگ جاتے تھے، حفظِ قرآن کبھی الٹا لٹکا کے حفظ کروایا جاتا تھا، کبھی زنجیروں میں باندھ کر حفظ کروایا جاتا تھا، بعض چینلز (Channels) نے حفظِ قرآن پر فلمیں بھی بنائی ہیں کہ کس طرح سے پاکستان میں حفظ کراتے ہیں یعنی ان استادوں کے ڈنڈے کی مار کھا کھا کے وہ جان دے دیتے ہیں، مر جاتے ہیں چونکہ کند ذہن ہیں اور حفظ نہیں کر سکتے ہیں۔

اسی طرح سے علمِ دین پڑھنے کے لئے بھی پاکستان میں وہی معیار ابھی بھی ہے لیکن پہلے زیادہ تھا کہ کند ذہن ترین آدمی کو علمِ دین کے لئے انتخاب کر کے بھیجتے تھے، جو بچہ اچھا ہو اس کو اسکول میں، تجارت میں یا کسی اور میدان کے لئے انتخاب کرتے تھے اور جو کند ذہن ہو وہ دین پڑھنے

چلا جائے اور نتیجہ بھی ظاہر ہے کہ جب کند ذہن لوگ قرآن کی طرف آئیں گے، کند ذہن لوگ دین پڑھنے کے لئے آئیں گے تو اس دین کا کیا حشر ہوگا؟ اس قرآن کا کیا حال ہوگا؟ اس مذہب کا کیا حال ہوگا؟ کہ جس کے علماء یا جس کے طلبہ یا جس کی طرف رغبت رکھنے والے لوگ کند ذہن لوگ ہوں۔ قرآن اگر کند ذہنوں کا میدان ہو جائے تو نتیجہ وہی ہوگا کہ جو آج ہے، اس سے بہتر نہیں ہوسکتا ہے، یہ انہی کند ذہن طبقے کے دین کی طرف آنے کا نتیجہ ہے کہ جو آج موجود ہے، کند ذہنی بھی ایک مانع ہے، خدا کا لطف اگر کسی کے شاملِ حال ہو جائے تو یہ برطرف ہوسکتی ہے، مگر کند ذہنی کا کوئی علاج نہیں ہے، خصوصاً حماقت اور بیوقوفی کا کوئی علاج نہیں ہے۔

حتیٰ انبیاء علیہم السلام بھی احمقوں اور ابلہ لوگوں سے پناہ مانگتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مناجات میں ہے کہ خدایا میں لاعلاج مریض کا علاج کرسکتا ہوں، مردہ زندہ کرسکتا ہوں، مبروص ومجذوم کا علاج کرسکتا ہوں، ہر بیمار کا علاج کرسکتا ہوں لیکن احمق اور اَبلَہ کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے یعنی ہر دردمند انسان میری طرف بھیج دے میں علاج کرلوں گا لیکن بیوقوف سے میرا پالا نہ پڑے اسلئے کہ بیوقوفی کا کوئی علاج نہیں ہے مگر یہ کہ لطفِ خاصِ خدا شاملِ حال ہو جائے، بعض افراد کے حالاتِ زندگی میں ہے کہ لطفِ خدا ان کے شاملِ حال ہوا ہے یعنی اوائلِ عمر میں کند ذہن تھے لیکن بعد میں یا دعا کی یا توسل کیا، بالآخر کچھ بھی اتفاق ہوا لیکن ان کی وہ کند ذہنی برطرف ہوگئی اور انہی لوگوں نے بہت علمی کارنامے انجام دیئے، دنیوی میدان میں یا دینی میدان میں ہر دو میں ایسا اتفاق ہوا ہے۔

☆ کوثر

یہ جو مخترِ بلب ہے یعنی ایڈیسن، یہ اَبلَہ ترین انسان تھا اور بلادت و کند ذہنی کی وجہ سے اس کو کوئی اسکول میں داخلہ نہیں دیتا تھا بلکہ نکال دیتے تھے حتیٰ اس کی ماں نے ان استادوں کے ساتھ لڑائی کی، شاید ان کی ماں کی ان کے ساتھ ہاتھا پائی تک ہوئی چونکہ اس کے بچے کا سر زیادہ فوق العادہ تھا، موٹا تھا، اس کی جسامت سے زیادہ بڑا سر تھا اور اس وجہ سے وہ کہتے تھے کہ یہ کند ذہن ہے، ابلہ ہے، اس کو معمولی چیزیں سمجھ نہیں آتی تھیں مثلاً ان کے بقول اس کو اے بی سی بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور ماں نے عہد کیا کہ جسے تم کند ذہن سمجھ کر نکال رہے ہو میں اسی کو تعلیم دوں گی یعنی آپ یہ کہیں کہ محکمۂ تعلیم نے اس کو کند ذہن ہونے کا رسمی سرٹیفیکیٹ (Certificate) دے دیا تھا تو ماں نے یہ چیلنج قبول کیا، خواتین یہ مطالب ذہن میں رکھیں کہ اس ماں نے اپنے لئے اس کو ایک چیلنج سمجھا اور کہا کہ جس کو تم نے کند ذہن قرار دے کر نکال دیا ہے میں اسی کو تعلیم دے کر تمہارے سامنے پیش کروں گی اور نہایتاً اس ماں کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے اس بچے کے اندر رغبت بھی پیدا کی، اس کو تعلیم بھی دی اور نہایتاً وہ دنیا کے نامی گرامی ترین انسانوں میں سے ایک انسان بنا یعنی وہ کام جو بڑے بڑے نام اور ذہن نہیں کر سکے وہ اس ابتدائی عمر کے کند ذہن بچے نے کر دیا اور اس نے نابغہ لوگوں میں اپنا نام درج کروایا، ایسے نمونے اور بھی موجود ہیں، بہرکیف اس کے اندر لطفِ خدا اہم شرط ہے۔ باقی کوئی طبی علاج یا یوگا (Yoga) جیسا کوئی علاج نہیں ہے کہ جس سے انسان کی کند ذہنی برطرف ہوتی ہو، خدا سے دعا کریں، لطفِ خدا ہو جاتا ہے، بہت سارے دینی نمونے بھی ہیں، میں ان شخصیات کے جان بوجھ کے نام نہیں لے رہا ہوں، ممکن ہے کہ ذہنوں میں تصویر اچھی بنی ہوئی ہے اور اگر ان کے

ابتدائی زمانے کے بارے میں ایسے ذکر کیا جائے کہ کند ذہن تھے تو تھوڑا فرق پڑ جاتا ہے، احترام کم ہو جاتا ہے لیکن یقین جان لیں کہ دینی میدان میں بھی بعض افراد ایسے ہیں کہ حوزۂ علمیہ میں گئے تو وہاں کند ذہن تھے لیکن خدا سے دعا کی، روئے، گڑگڑائے کہ کیوں دوسروں کو مطلب سمجھ میں آتا ہے اور ہمیں سمجھ نہیں آتا چنانچہ خدا نے ایک لطف ان کے شاملِ حال کیا اور انہوں نے بہت بڑے علمی کارنامے انجام دیئے۔

روایت میں ہے کہ

أَكْثَرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ الْبُلْهُ.....(۹)

اکثر اہلِ بہشت ابلہ ہوں گے....

چونکہ ان کا گناہ نہیں ہوتا ہے، یہ مکلّف نہیں ہوتے ہیں اور کسی بے گناہ کو خدا جہنم میں نہیں ڈالے گا تو ظاہری بات ہے کہ یہ پھر جنت میں ہی جائیں گے۔ ابلہ لوگ یعنی جن کی سوجھ بوجھ صحیح نہیں ہے، جن کو عموماً عام عوام الناس اللہ والے کہتے ہیں اور بعض کے بقول یہ جنت جائیں گے بھی تو بغیر حساب وکتاب کے جائیں گے، ظاہر ہے کہ ان کی عقل وہوش تو ہے نہیں لہٰذا ان کو کسی جگہ ٹھہرایا بھی نہیں جائے گا، ان سے پوچھا بھی نہیں جائے گا، ان سے حساب وکتاب بھی نہیں ہوگا، جن کا حساب کتاب زیادہ ہو تو ان کو ٹائم بھی زیادہ لگتا ہے لیکن جن کا حساب نہ ہو تو وہ جلدی نکل جائیں گے، حساب کتاب والے جب پہنچیں گے تو جنت میں آگے رش ہوگا کیونکہ یہ سارے وہاں پہلے سے موجود ہوں گے۔

چونکہ یہ مکلّف نہیں ہیں اس وجہ سے ان کا کوئی گناہ بھی نہیں ہے، کہتے ہیں کہ یہ مَرفوع القلم ہیں لیکن جن کو خدا نے عقل جیسی نعمت دی ہے ان کے لئے معاملہ دشوار ہے، اسی لئے خداوند نے فرمایا تھا کہ انسان نے اپنے لئے ایک ایسا پر خطر راستہ انتخاب کیا ہے کہ

اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ اِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ٥ (١٠)

بیشک ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا بس انسان نے اسے اٹھالیا کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے۔

ان کو کیا پتہ کہ یہ کیسی وادی ہے؟ اور یہ سفر کیسے طے ہونا ہے؟ یہ انسان ظلوم وجہول ہے، ظلوم ہے یعنی حدیں تجاوز کرے گا، ظالم یعنی تجاوزِ حد کرے گا، جانا کہیں اور ہے اور یہ کہیں اور چلا جائے گا، جہول ہے یعنی اصلاً اس کو پتہ نہیں ہے، اس کو اندازہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے لئے کتنا پر خطر راستہ انتخاب کیا ہے؟ ہم نے جب یہ امانت کائنات کو پیش کی تو اس نے قبول نہیں کی لیکن انسان نے بڑھ کر قبول کیا، وہ ظلوم اور جہول ہے۔ یہی پر خطر وادی تھی کہ عقل خدا نے دی ہے، دل خدا نے دیا ہے اور یہ اس دل کو قابو میں نہیں رکھ پائے گا، اس دل کو آلودگیوں سے نہیں بچا سکے گا، اس دل کو موانع سے نہیں بچا سکے گا، اس دل کے اندر موانع آ جائیں گے، کچھ غیر اختیاری موانع ہیں، جیسے طفولیت ہے اور ابلہ ہونا ہے، یہ عیب نہیں ہے بلکہ اس میں فائدہ بھی ہے، بعض عقل مندوں نے خدا سے دعا

کی تھی کہ اے کاش! خدایا ہمیں بھی اسی طرح بیوقوف بنا دیتا، یہ اتنے درد و رنج، اتنی مشکلات، اتنے مصائب اور یہ سب کچھ نہ ہوتا، جس طرح وہ خوش ہیں اس طرح ہم بھی خوش ہوتے، کیوں ہمیں اتنی سوجھ بوجھ دی ہے کہ ہمیں ہر چیز سمجھ میں آتی ہے؟ ان کی طرح بنایا ہوتا کہ جن کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

یہ مانع اگر برطرف ہو جائے تو فَبِھَا، جیسے طفولیت ہے کہ ایک دن برطرف ہو جائے گی لیکن یہ بلادت، حماقت اور سفاہت برطرف ہونے والی نہیں ہیں، یہ آخر تک رہتی ہیں اور سخت بیماریاں ہیں کہ خدا کسی کو ان میں مبتلا نہ کرے۔

ان کے علاوہ کئی دیگر موانع بھی موجود ہیں کہ جو فہمِ قرآن کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، انشاءاللہ اس فصل کے حصۂ دوم میں ان موانع کی نشاندہی بھی کی جائے گی۔

حوالہ جات

(۱). (شرح نهج البلاغة - المقتطف من بحار، الجزء ۱، صفحه ۱)
(جلوه تاریخ در شرح نهج البلاغه، الجزء ۱۹، صفحه ۱)(مناقب أمير المؤمنينؑ - محمد بن سليمان الكوفي، الجزء ۲، صفحه ۷۷)(سیمای کارگزاران علیؑ ابن ابی طالبؑ، الجزء ۱۷، صفحه ۱۳)

(۲). . .(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۵۷)

(۳) . . .(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۷)(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ ۳۷)(سورۂ مبارکہ عنکبوت، آیہ ۵۲)
(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۶۳)

(۴). . .(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آية اللّٰه جوادی آملی مدظله)
(تفسير القرآن الكريم - السيد مصطفى الخمينيؒ، الجزء ۲، صفحه ۱۸۹)
(بحار الأنوار - علامه محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحه ۱۸۴)
(مستدرك سفينة البحار - العلامة آية اللّٰه الشيخ على النمازی، الجزء ۸، صفحه ۱۲۶)(ميزان الحكمة - الريشهری، الجزء ۸، صفحه ۲۱۰)

(۵) . (فی رحاب القرآن)(مستدرك الوسائل ومستنبط المسائل - الحاج ميرزا حسين النوری الطبرسیؒ، الجزء ۴، صفحه ۲۵۰)(سنن النبی الاكرمؐ)

(۶). . (روح المعانی فی تفسير القرآن العظيم والسبع المثانی، الجزء ۱۱، صفحه ۳۶۵)

(۷) . (كشف الخفاء و مزيل الالباس - العجلونی، ناشر: دار احياء التراث

العربی،الجزء۲،صفحه۱۴۵)

(۸)......(سورۂ مبارکہ طہ،آیہ۱۲)

(۹)...... (مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ،الجزء۱۱، صفحه۱۹۵)(امالی السید المرتضیؒ)(بحار الأنوار - العلامة المجلسیؒ،الجزء۵، صفحه۱۲۸)(مستطرفات السرائر- ابن ادریس الحلیؒ،الجزء۱،صفحه۱۹) (مستدرک سفینة البحار- العلامة آیة اللّٰه الشیخ علی النمازیؒ،الجزء۱، صفحه۱۴۲)(کلمات الرسول،الجزء۱،صفحه۲۶۷)(العمدة- ابن البطریق، الجزء۱،صفحه۱۸۹)(اختیار مصباح السالکین)(رجال الکشی)(جواهر القرآن - ابو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی،المتوفی:۵۰۵ھ، الجزء۱،صفحه۴۷)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ احزاب،آیہ۴۷)

فصلِ ادبِ ششم

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصّہ دوم)

۱)فقط مخارج کی ادائیگی پر توجہ

☆مخارج کیلئے حساسیت پیدا نہ کریں

☆عجم کو عرب بنانا مقصود نہیں

☆قارئ قرآن ہونا عالمِ قرآن ہونے کی دلیل نہیں

۲)تقلیدِ محض

☆تقلیدِ شرعی اور تقلیدِ آبائی میں فرق

☆تقلید کی مزید وضاحت

☆ مذموم تقلید

☆طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں

☆درس پڑھنے کا نسخہ

☆جمود،باعثِ تعصب

☆کمزور نفوس کی مشکل

☆استاد اور شاگرد کا رابطہ

☆رشد حاصل نہ ہونے کی وجہ

☆شیطانِ تقلید کا حملہ

☆تعصبات،مذہبی دنیا کا بڑا مسئلہ

☆تضاربِ آراء کو تحمل کریں

☆علم کے ساتھ حلم کی ضرورت

☆صوفیاء کی حقیقت

☆عرفاء کے نزدیک علم حجاب ہے

☆ٹھگ صوفیاء و عرفاء

☆محقق عرفاء کی بات کا صحیح معنٰی مراد لیں

☆جدلی مزاج،مذہبی دنیا کی ایک اور مشکل

☆تقلیدی وجدلی علم حجاب ہے

۳)عربی علوم

☆معانی فقط الفاظ میں منحصر نہیں ہوتے

☆عربی ضرور سیکھیں لیکن افراط و تفریط کے بغیر

☆مقصودِ اصلیٔ قرآن

٤)تفاسیر پر جمود

☆تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء

آدابِ فہمِ قرآن میں ہماری بحث ادبِ ششم میں جاری ہے اور وہ ادب رفعِ موانع سے عبارت ہے، بعض موانع ایسے ہیں کہ جو باہر سے انسان کے دل پر طاری ہو جاتے ہیں اور فہمِ قرآن میں رکاوٹ بنتے ہیں یعنی نورِ قرآن انسان کے دل میں نہیں اترتا ہے۔ صدرالمتألھینؒ نے کتاب میں کچھ بیرونی موانع ذکر فرمائے ہیں کہ جن کی تشریح ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

۱) فقط مخارج کی ادائیگی پر توجہ

الاول: ان یکون الانسان مصروف الھم الی تحقیق الحروف و اخراجھا من المخارج......

صدرالمتألھینؒ کے مطابق بیرونی موانع میں سے پہلا مانع یہ ہے کہ انسان اپنی ساری تحقیق ہمت، طاقت وارادہ ادائے حروف والفاظ میں صرف کر دے یعنی جو لوگ قرآن کی طرف رغبت رکھتے ہیں یا انہیں اس طرف ڈال دیا جاتا ہے غالباً نوخیز لوگوں کو، کم عمر لوگوں کو کہ جن کے اندر محبت و رغبتِ قرآن ہے لیکن شناختِ کافی نہیں ہے یا یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہمیں کس طرح سے قرآن سے استفادہ کرنا ہے لہذا یہ کسی بڑے سے پوچھتے ہیں اور راہنمائی لیتے ہیں لیکن وہ راہنما بھی انہیں عموماً ان کاموں میں ڈال دیتا ہے کہ یہ کام کریں اور پھر ساری عمر اسی کے اندر صرف کر دیتے ہیں۔

جب انسان قرآن پڑھنے لگتا ہے تو اس پر یہ قاری حضرات زیادہ حساسیت ایجاد کر دیتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک حرفِ قرآن مثلاً ''الف''، ''ب'' یا وہ حروف کہ جو عربوں کے علاوہ دوسروں سے تلفظ نہیں ہوتے ہیں غلط پڑھے تو اس کیلئے جہنم ہے، مثلاً اگر کسی نے درست طریقے سے ''ض'' ادا

نہ کیا تو وہ جہنم چلا جائے گا، اگر کسی نے ''س'' اور ''ص'' میں فرق نہ کیا تو وہ جہنم میں جائے گا، ظاہر ہے کہ جہنم سے تو کسی نہ کسی طرح بچنا ہے، بعض لوگ یہ فرق نہیں کر سکتے ہیں اسی لئے وہ قرآن پڑھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں کہ جہنم کیوں جائیں، اگر قرآن پڑھیں تو بھی جہنم جانا ہے کہ ہم ''س'' اور ''ص'' میں فرق نہیں کر سکتے ہیں تو بہتر ہے کہ قرآن نہ پڑھیں اور جہنم میں جائیں، توجہ فرمائیں کہ درست ہے یہ روایات میں بھی ہے کہ قرآن عربوں کی طرح پڑھو، عربی لحن میں پڑھو لیکن جس کو تکلیفِ مالا یطاق کہتے ہیں یعنی طاقت سے باہر تکلیف وہ خدا نے کسی پر عائد نہیں کی ہے، مکلّف نہیں بنایا ہے،

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا اِلَّا مَا آتَاهَا......(۱)

اللہ کسی کو اس سے زیادہ مکلّف نہیں بناتا جتنا اسے دیا ہے......

اور قرآن نے مزید کہا کہ

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا.....(۲)

اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا...

جتنی خدا نے طاقت دی ہے اتنی ہی ذمہ داری ڈالی ہے، یہ طاقت مختلف لحاظ سے ہے، از جملہ علاقائی اور نژادی تفاوت جو اس وقت موجود ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پورے مخارج کے ساتھ یعنی گلے کے نیچے جو مخرج موجود ہے جو آخری سینے کے ساتھ متصل ہے وہاں سے لے کر لب تک بیچ میں تمام مخارج ہیں اور ان تمام مخارج کو استعمال کرو کہ اس طرح جیسے عرب بولتے ہیں۔ عرب جب بولتے ہیں تو وہ اس داخلی فضا کی ہر جگہ سے ایک نہ ایک حرف نکال لیتے ہیں، ایک صوت نکال لیتے

تلفظِ مخارج کی ادائیگی پر توجہ

ہیں لیکن ساری قومیں ایسی نہیں ہیں، سارے علاقے ایسے نہیں ہیں، بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو سرے سے بولنے میں گلا استعمال نہیں کرتے ہیں یعنی ان کے گلے سے کوئی صوت نہیں نکلتی ہے اور یہ نکال بھی نہیں سکتے ہیں، اگر ان کو مجبور کریں کہ گلے سے نکالو تو ان کو اِستفراغ ہونے لگتی ہے، مثلاً ہمزہ (ء) ہے، عموماً آپ دیکھیں کہ حمزہ قلب سے ادا ہوتا ہے، یہ عربوں کے اندر بعض قرائتوں میں ہے کہ ''ع'' سے بھی زیادہ غلیظ ہمزہ ہے چونکہ حمزہ جب عرب تلفظ کرتا ہے تو اس طرح سے کہ جیسے انسان تھوع یعنی متلی کرتا ہے کہ اندرونی مواد باہر نکلنا ہوتا ہے، ہمزہ ادا کرتے وقت انسان کی وہ حالت بنی ہوتی ہے اس لئے خود عرب بھی پسند نہیں کرتے ہیں کہ گفتگو میں ہمزہ ادا کریں، چونکہ خود انہیں بھی اچھا نہیں لگتا ہے کہ قرأت میں بولتے ہوئے تھوع کی حالت ہو لہٰذا وہ عموماً ہمزہ کو سلب کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ کسی اور آسان سے مخرج کا استعمال کرتے ہیں کہ جہاں یہ حالت ادا نہ کرنی پڑے۔

یہ عربی لہجے اور عربی علاقے کی ایک خصوصیت ہے، عربی ماحول میں جب بچہ پرورش پاتا ہے تو بچپن سے ہی وہ گلے اور گلے کے اطراف کی ساری آوازوں سے صوتیں نکالنا سیکھ لیتا ہے، اس کی مشق ہوتی ہے لیکن فرض کریں کہ ایک کورین، ایک جاپانی، ایک چائینیز کہ جو صرف ہونٹوں سے بولتے ہیں اور پورا منہ بھی استعمال نہیں کرتے ہیں یعنی یہ لوگ جو صوت نکالتے ہیں تو اپنے منہ کا داخلی حصہ بھی پورا استعمال نہیں کرتے ہیں اور سب سے زیادہ چار سو (400) کے قریب چائینیز کے حروف تہجی ہیں، یہ سارے چار سو حروف ہونٹوں سے ادا کرتے ہیں یعنی منہ کے داخلی حصے کہ جن کو تالو کی فضا یا جوفِ دہن کہتے ہیں یعنی یہ جو منہ کا داخلی اور بتیسی کے اندر کا حصہ ہے اس کو بھی استعمال نہیں کرتے

ہیں، یہ ساری لغت جس نے ہونٹوں سے بولنی ہے اس کو اگر آپ کہیں کہ وہ تہہ دل کے ساتھ وہ مخرج کہ جو سینے کے ساتھ اور پھیپھڑے کے ساتھ اٹیچ (Attach) ہے اس کو بھی تم نے استعمال کرنا ہے تو اصلاً اس کے لئے یہ مقدور نہیں ہے۔

☆مخارج کیلئے حساسیت پیدا نہ کریں

بعض لوگ مخارج کی ادئیگی کیلئے اسی طرح سے حساسیت پیدا کرتے ہیں خصوصاً غیر عربوں کے لئے کہ ان کو اس طرح سے حساس بنا دیا جائے کہ انسان عِفریت کی حد تک آجائے اور فقط درست ادائیگی الفاظ پر ہی اکتفا کرلے، اس کے معانی یہ نہیں ہیں کہ ادائے الفاظِ قرآن نادرست بھی درست وصحیح ہے، انسان ہر لحاظ سے کوشش کرے کہ قرآن کا درست تلفظ کرے لیکن درست تلفظ پر ہی نہ رک جائے کہ انسان ساری ہمت درست الفاظ کی ادائیگی پر ہی صرف کردے اور اسی میں ساری عمر گزار دے۔

اتفاقاً ایک دفعہ سفرِ تبلیغی میں ایک معمر خاتون نے مجلس و درس سنا اور پھر آخر میں کہنے لگی کہ ایک مشکل ہے، انہوں نے بتایا کہ میں پہلے قرآن سے مانوس تھی، قرآن پڑھتی تھی اور مجھے قرآن میں لذت محسوس ہوتی تھی، اس نے بتایا کہ میں پہلے کس طرح سے قرآن پڑھتی تھی؟ نماز پڑھتی تھی؟ کہا کہ بعد میں تم سے پڑھی ہوئی ایک محترمہ آئیں اور انہوں نے آکر ہمیں اچھے طریقے سے تبلیغ کی اور از جملہ انہوں نے یہ تجوید و قرأت وغیرہ بھی سکھائی، انہوں نے کہا کہ مثلاً نماز میں اس طرح سے

مخرج نکالتے ہیں، صراط کو میں پہلے سراط کہتی تھی، اس نے کہا کہ نہیں اس طرح سے ادا کرنا ہے اور اسی طرح بتایا کہ نعبد کس طرح کہتی تھی؟ نستعین کس طرح کہتی تھی؟ اس نے سارے مخارج ٹھیک کرائے، الحمد پہلے میں اور طرح پڑھتی تھی اور اس نے اور طرح سے پڑھایا پھر اس نے اتنا ڈرایا کہ ہم نے اسی سے یہ سارا کچھ سیکھا، سیکھنے کے بعد بھی اب ظاہر ہے کہ بڑھاپے میں وہ کس طرح سے ادا کریں، اس نے اپنی الجھن ذکر کی اور وہ بیان کرتے ہوئے رو پڑی کہ اب میری یہ حالت ہوگئی ہے کہ میں جب قرآن پڑھتی ہوں تو بسم اللہ کا مجھ سے درست تلفظ نہیں ہوتا ہے اور میں کئی دفعہ پڑھنے کے بعد اکتا کر قرآن بند کر کے رونا شروع کر دیتی ہوں، مجھ سے نہ رحمٰن ادا ہوتا ہے نہ رحیم ادا ہوتا ہے درحالیکہ پہلے رحمٰن ورحیم غلط پڑھتی تھی لیکن مجھے پتہ تھا کہ رحمتِ خدا میرے شاملِ حال ہے، نہ نماز میں وہ لطف رہا نہ لذت رہی، نہ قرآن میں وہ لذت رہی، کہا کہ میں اس کے لئے دعا کرتی ہوں لیکن اس نے مجھے ایسی الجھن میں ڈال دیا ہے کہ اب سب عبادتیں آہستہ آہستہ مجھ سے چھٹتی جارہی ہیں، کہا کہ میں پہلے ہر نماز کے بعد مناجات و کثرت سے مفاتیح پڑھا کرتی تھی لیکن مجھے خود پتہ ہے کہ میں غلط پڑھ رہی ہوں لہٰذا اب دعا و مناجات پڑھنے کو جی نہیں کرتا ہے۔

جب انسان اپنا سارا ہم و غم اسی مخرج پر لگا دے تو ایسے ہی ہوتا ہے، آپ حتی المقدور کوشش کریں، جس زبان کا تلفظ کر رہے ہیں اس کا صحیح تلفظ کریں لیکن مقدور بھر حد تک، ظاہر ہے کہ ایک عرب کے لئے جو مقدور ہے وہ ایک عجم کے لئے قطعاً مقدور نہیں ہے کہ عجم اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے عرب بن جائے، زندگی، کاروبار، بیوی، بچے سب کو چھوڑ کر عرب بننے کی کوشش کرے کہ اپنا

مخرج درست کریں یہ درست نہیں، جتنا آپ کے لئے مقدور ہے کوشش کریں کہ اس زبان کو اسی کے لہجے میں پڑھیں۔ جب ہم دوسری زبانیں بولتے ہیں تو کیا معنی بدل جاتا ہے؟ مثلاً آپ انگریزی بولتے ہیں، انڈین اور پاکستانی کا انگریزی میں اپنا خود ایک مستقل لہجہ ہے کہ جو انگریزوں کو بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے اور اصلاً کوئی پرواہ نہیں ہے، بڑی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ جب عرب فارسی بول رہا ہوتا ہے تو کیا معنی بدل جاتے ہیں؟ جب وہ عربی لہجے میں فارسی بول رہا ہوتا ہے تو کیا الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں؟ مثلاً جب ایرانی کہتا ہے کہ حال شما چطورِہ لیکن عرب کسی اور طریقے سے بولتا ہے تو کیا اس میں معنیٰ بدل جاتا ہے؟ کیا چطورہ اور چہ تورہ سے معنیٰ بدلتے ہیں؟ واقعاً یہ مانع ہے اور بعض صرف اسی کو کلِ قرآن سمجھتے ہیں، اگر ہم درست تلفظ کی یہ قدرت پیدا کرلیں تو کیا جبرئیل علیہ السلام سے بھی بڑھ کر قرآن شناس بن جائیں گے؟ مصری قاریوں کا تخصص فقط یہی ہے۔ ''س'' کے ساتھ سراط ہو یا ''ص'' کے ساتھ صراط ہو، لیکن یہ صراط کیا ہے؟ اس کیلئے ان مخارج کی مشق نے فرصت ہی نہیں دی تاکہ ہم اس کے معنیٰ کی طرف بھی جانے کی کوشش کرتے۔ مگر ہم لاابالی رہیں اور غلط سلط پڑھیں وہ بھی درست نہیں ہے، اس قید کے ساتھ کہ مقدور بھر حد تک درست پڑھے، اس سے کوئی غلط معنیٰ اخذ نہ کرے، جتنا عجم کے لئے مقدور ہے۔

☆عجم کو عرب بنانا مقصود نہیں

عجم کو عرب بنانا خدا کی طرف سے فریضہ نہیں ہے۔ اگر سارے عجم چاہیں کہ عرب بن

جائیں تو نہیں بن سکتے ہیں، اصلاً پیدائشی طور پر ہم نے وہ مخارج کبھی استعمال ہی نہیں کئے ہیں، ہماری زبانوں میں، اردو میں، فارسی میں اور دوسری زبانوں میں وہ مخارج ہیں ہی نہیں تو ہم کس طرح مہارت سے ادا کر سکتے ہیں مثلاً یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک عرب کو کہیں کہ ''ڈ'' ادا کرو، کیا وہ کر سکتا ہے؟ جو ''ڈ'' ادا نہیں کر سکتا ہے وہ جہنم میں جائے گا، کیسے جہنم میں جائے گا؟ عرب والے ''ڈ'' ادا نہیں کر سکتے ہیں، ''ٹ'' ادا نہیں کر سکتے ہیں، کچھ چیزیں ہیں کہ جو ہم ادا کر سکتے ہیں اور وہ ادا نہیں کر سکتے ہیں اور کچھ چیزیں ہیں کہ جو وہ ادا کر سکتے ہیں اور ہم ادا نہیں کر سکتے ہیں، مثلاً ایک عرب نے آکر عجم کے سامنے اپنا کوئی مدعا بیان کرنا ہے تو حتماً پہلے ''ٹ'' کی تمرین کر کے آئے، مشق کر کے آئے، ''ڈ'' کی تمرین کر کے آئے، پہلے ''ژ'' درست کر کے آئے، وہ یہ کام نہیں کر سکتا ہے اور نہیں کرتا لیکن پھر بھی معنیٰ نہیں بدلتا ہے، ہم جس کو ڈاللہ کہتے ہیں وہ دالدہ ہی کہتے ہیں، پھر بھی ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے؟ ہم ''ٹی'' کہتے ہیں وہ اس کو ''تی'' کہتا ہے، وہ ''ٹی'' نہیں بول سکتے ہیں چونکہ ان کے لئے مقدور نہیں ہے۔

آپ ایک ایرانی سے ''ڑ'' کا تلفظ ادا کروا کے دیکھ لیں، ہمارے لئے ''ڑ'' بولنا کتنا آسان ہے، مثلاً اسے کہو کہ آڑو بولو جنت میں جاؤ گے تو وہ نہیں بول سکتا ہے، یہ اس کی زبان نہیں ہے، اس کا مخرج نہیں ہے، اس کی تمرین اور اس کی مشق نہیں ہے، کیوں اس پر ایسا غیر طبعی بوجھ ڈالتے ہو؟ عربی درست پڑھو، فارسی کا درست تلفظ کرو، ہر زبان درست پڑھو لیکن مقدور بھر حد تک۔ یہ کبھی بھی نہیں ہوسکتا ہے کہ ہم ایرانیوں کی طرح فارسی بول سکیں، ہم جتنی بھی کوشش کریں کہ وہی لہجہ بنالیں تو پھر بھی

کہیں نہ کہیں پکڑے جاتے ہیں۔ یہ ترک جو ایرانی ہیں یہ فارسوں کے لہجے میں نہیں بول سکتے ہیں تو ہم باہر سے آکر کیسے فارسی لہجے میں بول سکتے ہیں؟ یہ ساری زبانوں کا مسئلہ ہے، قرآن کی ایک عربی زبان ہے، عجم کے لئے اس کے مخارجِ دقیقِ عربی مشکل ہیں لیکن اب اپنے لئے چیلنج نہ سمجھ لیں کہ اب یہی کرنے ہیں اور یہ قدرت وصلاحیت بعض میں کثرتِ تمرین سے پیدا ہو جاتی ہے، ان سے جا کر کوئی پوچھے کہ آپ کو یہ مخارج درست کرنے میں کتنا وقت لگا؟ مثلاً ایک عجم قاری کو تلفظ درست کرنے میں کتنے سال لگتے ہیں؟ پس مقدور بھر حد تک ہو اور پھر اس کے بعد اصل مقصود کی طرف آئے، اصل معنیٰ کی طرف آئے۔

یہ مُسامَحت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھی اور سب سے بڑی مثال خود رسول اکرم ﷺ وحضرتِ بلالؓ ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ شاید یہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حکمت تھی، حضرت بلالؓ عرب نہیں تھے، افریقی تھے، عربوں کے اندر افریقی کو اذان دلواتے تھے یعنی غیر عرب کو اور وہ اذان درست بھی نہیں دے سکتا تھا، عملِ رسول ﷺ تو ہمارے لئے حجت ہے لہٰذا مقدور بھر کوشش کریں، ظاہر ہے کہ بلالؓ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے تھے، کوشش کرتے تھے کہ ''ش'' کہیں لیکن نہیں نکلتا تھا، وہ ''س'' ہی کہتے تھے اور اس ''س'' سے رسول اللہ ﷺ کو اتنا سکون ملتا تھا کہ جب اذان کا وقت ہوتا تھا تو فرماتے تھے کہ

اَرِحْنَا يَا بِلَالُ......(۳)

اے بلالؓ ہمیں سکون پہنچا دیجئے (یعنی نماز کیلئے اذان کہیے)......

☆قاریٔ قرآن ہونا عالمِ قرآن ہونے کی دلیل نہیں

اس وقت بڑے معروف عالمی شہرت کے حامل و مالک قاریانِ قرآن موجود ہیں کہ جو مخارج میں، صوت میں، لحن میں مجتہد نما ہیں لیکن اگر ان سے کبھی معانیٔ قرآن و مفاہیم و معارفِ قرآن کے بارے میں ایک سوال ہو جائے تو انہیں معلوم نہیں ہے، درحالیکہ فوق العادہ اجتہاد ہے، اس وقت بعض لوگ قرآن کے الفاظ کی ادائیگی میں ایسے مرتبے پر ہیں کہ اجتہاد سے بھی بالاتر اگر کوئی ڈگری تعبیر ہو تو وہ اس پر فائز ہیں، حقیقتاً فائز ہیں لیکن معانیٔ قرآن سے خود وہی غافل ہیں اور ان کی وجہ سے ایک جمعیتِ کثیر معانیٔ قرآن سے غافل ہے۔

اتفاقاً اسی مضمون کی عیناً حدیث بھی میزان الحکمہ میں موجود ہے، میزان الحکمہ میں بابِ قرآن میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے مستقبل کے بارے میں یہ خوف ہے یا احتمال ہے کہ قرآن مَزامیر بن جائے گا، اسی طرح رسولِ اکرم حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

فَعِنْدَهَا يَكُوْنُ أَقْوَامٌ يَتَعَلَّمُوْنَ الْقُرْآنَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَيَتَّخِذُوْنَهُ مَزَامِيْرَ...... (۴)

اس وقت لوگوں کے کئی گروہ ہوں گے جو قرآن کو غیر اللہ کیلئے سیکھیں گے اور اسے مزامیر (دھن) قرار دیں گے......

مزامیر یعنی فقط دھن بن کر رہ جائے گا، لحن بن کر رہ جائے گا اور منع کیا کہ ایسا نہ کرو کہ قرآن تمہارے اندر فقط مزامیر بن کر رہ جائے، مزامیر یعنی ردھم کے ساتھ قرآن پڑھنا، جیسا کہ بن گیا ہے یعنی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عجیب حدیث ہے کہ جو کچھ اس میں منع کیا گیا کہ ایسا نہ ہو کہ قرآن

تمہارے درمیان فقط مزامیر بن جائے یعنی دھن بن کر رہ جائے تو یہ واقعاً محض دھن بن کر رہ گیا ہے، اس وقت دُھنِ مصری ہے، عربی دھن ہے، سعودی دھن ہے، شامی دھن ہے، ایرانی دھن ہے اور فلانی دھن ہے، قرآن بالکل مزامیرِ محض بن کر رہ گیا ہے، اس کے بارے میں کتاب میں بھی وضاحت موجود ہے۔

تقلیدِ محض

۲) تقلیدِ محض

☆ و ثانیها: التقلید لمذهب سمعه من الشیوخ و جمد علیه......

اور دوسرا مانع تقلید ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جب معانیٔ قرآن میں غور کرتا ہے تو اس سے پہلے بعض بزرگان کہ جنہوں نے تفسیر کی ہے یا قرآن کے بارے میں کوئی اظہار کیا ہے ان میں سے کسی ایک کے مسلک کا قائل ہو جاتا ہے، انسان کسی سے متاثر ہو جاتا ہے یا ایسی شخصیت ہے کہ اس کے اندر جاذبہ ہے، اسی طرح علمیت، شہرت، قابلیت یا روحانی اور نفسیاتی اسباب کی وجہ سے انسان کسی شخصیت کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور اسی کے مسلک کے پیچھے چل پڑتا ہے کہ غالباً اکثر افراد اس مشکل میں گرفتار ہیں کہ جو لاشعوری طور پر یا ناخواستہ طور پر کسی نہ کسی شخصیت کے حصار میں آجاتے ہیں، اس کی کشش میں آجاتے ہیں اور پھر یہ طے کر لیتے ہیں کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ ہم قبول کریں گے اور اس کے علاوہ نہ خود غور کرنا ہے اور نہ کسی دوسرے سے کوئی بات سننی ہے یعنی انسان قرآن کی طرف مقلدانہ ذہن لے کر آئے۔

☆تقلیدِ شرعی اور تقلیدِ آبائی میں فرق

تقلید سے مراد وہ دینی تقلیدِ شرعی نہیں ہے کہ جو عوام الناس کے لئے ہے کہ وہ احکامِ فقہ میں مجتہد و مراجع کی تقلید کریں، وہ ایک الگ باب ہے، مقلدانہ ذہن یعنی دوسروں نے جو کچھ کہا ہے اس کو بلا دلیل و حجت قبول کرنا، تقلید کا یہی معنیٰ ہے کہ کسی سے کوئی بات دلیل و حجت کے بغیر قبول کرنا اور وہ تقلید جو دین میں ہے، احکامِ شریعہ میں ہے وہ اسی لئے درست تقلید ہے چونکہ اس میں ہم بغیر دلیل و حجت کے کوئی بات قبول نہیں کرتے ہیں، پہلے ثابت کرتے ہیں کہ آیا یہ فقیہ ہے؟ مجتہد ہے؟ اس کے پاس دلیل و حجت ہے؟ اور دلیل و حجت سے استنباط کرنے کے قابل ہے یا نہیں ہے؟ عادل ہے یا نہیں ہے؟ عاقل ہے یا نہیں ہے؟ دنیا پر حریص ہے یا نہیں ہے؟ یہ ساری تحقیقات کر کے پھر اس کی تقلید کرتے ہیں لیکن تقلیدِ عام اسے کہتے ہیں کہ جیسے عام کوچہ و بازار میں سب تقلید کر رہے ہیں، سب ایک طرف جا رہے ہیں، دوسرے بھی ان کے پیچھے پیچھے اُدھر ہی جا رہے ہیں، معلوم نہیں ہے کہ کیوں جا رہے ہیں؟

ایران میں جب راشن سسٹم تھا، کیونکہ ابھی تو پٹرول کا راشن سسٹم ہے لیکن پہلے ضروریات زندگی کا بھی راشن سسٹم ہوتا تھا، ایران میں جنگ کے زمانے میں راشن کے لئے جگہ جگہ دکانوں پر کوئی نہ کوئی چیز راشن کے طور پر مل رہی ہوتی تھی، کہیں کمبل مل رہا ہوتا تھا، کہیں ہیٹر مل رہا ہوتا تھا، کہیں گوشت مل رہا ہوتا تھا، کہیں چینی مل رہی ہوتی تھی اور ہر دوسری تیسری دکان کے آگے لائن لگی ہوتی تھی، کسی دن سورج نکلنے سے پہلے ایک شخص دکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور دکان کو تالا لگا ہوا تھا،

پھر دوسرا شخص آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا، پھر تیسرا آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور کرتے کرتے ایک بہت لمبی لائن لگ گئی، جب آخری آدمی آیا تو اس نے پوچھا کہ کیا مل رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں نہیں معلوم، اگلے سے پوچھا کہ کیا مل رہا ہے، اسے بھی معلوم نہیں تھا، اس سے اگلے کو بھی نہیں معلوم تھا کیونکہ بغیر پوچھے ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے، یہ سوال منتقل ہوتا ہوتا اس پہلے شخص تک جا پہنچا جو سب سے پہلے کھڑا ہوا تھا، اس سے پوچھا کہ کیا مل رہا ہے؟ تو اس نے کہا کہ کچھ نہیں مل رہا ہے، لوگوں نے پوچھا کہ پھر کس لئے کھڑے ہو؟ کہا کہ میں تو کسی کے انتظار میں کھڑا ہوا ہوں یہاں پر کچھ نہیں مل رہا ہے۔

یہی اتفاق مقلدین کے ساتھ رونما ہوتا ہے، جس کے پیچھے ہم جا رہے ہیں اسکا پتہ نہیں ہے کہ کس لئے جا رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ ہم سمجھ رہے ہیں کہ یہ دین کی طرف جا رہا ہے، خدا کی طرف جا رہا ہے۔ ہر ایک کے پیچھے تو نہیں چلا جاتا ہے۔ خصوصاً قرآن کو سمجھنے کے لئے آپ راہنمائی ضرور لیں، سب سے راہنمائی لیں لیکن مقلدِ محض نہ بنیں کہ جس نے جو بات کہہ دی اسی پر جمود ہو جائے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہی ماننا ہے اور اس کے علاوہ خود سے کچھ بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی ہے۔ یہ انسان کے علم کی راہ میں بھی مانع ہے کہ بعض اوقات انسان کسی ایک شخصیت کی راہ کو اپنا لیتا ہے یا اس کے افکار کو لے لیتا ہے پھر اس کے طریقۂ کار کا جمود اختیار کر لیتا ہے اور بالآخر اس کا مقلدِ محض بن جاتا ہے اور خود غور نہیں کرتا ہے، خود اپنے آپ کو زحمت نہیں دیتا ہے کہ تفکر کرے، تدبر کرے اور بصیرت سے پرکھے، اس شخصیت نے جو کچھ کہا ہے بس اسی کو دیکھتا ہے، اس کے علاوہ ممکن ہے کوئی مطلبِ جدید،

نکتۂ جدید اس کے ذہن میں آجائے لیکن اس کو مجاز نہیں سمجھتا ہے، اپنے لئے روا اور جائز نہیں سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس شخصیت نے کہا ہے اس سے ہٹ کر بھی میں کسی مطلب پر غور کر سکتا ہوں۔

☆تقلید کی مزید وضاحت

وہ تقلید کہ جو عوام مجتہد کی کرتے ہیں اس کا تقلید سے الگ کوئی نام رکھتے تو بہتر ہوتا۔ تقلید اس عمل کے لئے کہ جو عوام علماء کی کرتے ہیں ایک نامناسب نام ہے، چونکہ یہ ایک رائج چیز ہے لہٰذا میں اشارہ کرتا چلوں کہ کسی کی ذہن میں اس کے بارے میں شبہہ قائم نہ ہو جائے، چونکہ وہ تقلید اس وجہ سے ہے کہ جس طرح سے قرآن نے بھی کہا ہے کہ

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥(۵)

ان سے کہئے کہ اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو۔

اور عرفِ عام میں بھی یہ کام ہوتا ہے، دین سے باہر بھی یہ کام ہوتا ہے مثلاً جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو طبیب کی طرف رجوع کرتا ہے یا کسان کو اگر فصل اگانے کے بارے میں، کھیت کے بارے میں یا کھاد کے بارے میں کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی تو وہ زرعی ماہرین کی طرف رجوع کرتا ہے، اس شخص کی طرف رجوع کرتا ہے کہ جو جانتا ہے، اگر ہم قدیمی معاشرہ، روایتی اور سنتی معاشرہ دیکھیں تو اس میں بھی یہی ہے کہ رجوعِ جاہل بہ عالم اور دین کے اندر بھی یہی ہے کہ رجوعِ جاہل بہ عالم، اس کا نام تقلید نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن اب رائج ہو گیا ہے، مگر لغتاً جس کو تقلید کہتے ہیں یا جس کو

☆تقلید کی مزید وضاحت

تقلیدِ رائج کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بلا حجت و بلا دلیل فقط کسی کی بات کو مان لینا کہ یہ کہہ رہا ہے، درحالیکہ جب انسان مجتہد کی تقلید کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کرتا کہ مجتہد مان رہا ہے، چونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس نے قرآن سے، سنت سے، منابعِ دین سے یہ مطلب پڑھا ہے، استنباط کیا ہے اور مجھے بتایا ہے یعنی یہ رجوعِ جاہل بہ عالم ہے۔

جاہل کا عالم کی طرف رجوع کرنا ایک عرفی چیز ہے اور یہ ہر شعبۂ زندگی میں ہے اس معنیٰ میں ہمارا سارا عمل تقلیدی عمل ہے چونکہ ہم جو شعبہ نہیں جانتے ہیں اس میں اس شعبے کے ماہر کی طرف رجوع کرتے ہیں حتیٰ یہی مرجعِ تقلید جب بیمار ہوتا ہے تو ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے، خود بیماری میں مقلدِ طبیب ہوجاتا ہے اور طبیب دین میں مقلدِ مرجع ہوجاتا ہے۔

فرض کریں کہ اگر مرجع کے گھر میں نلکے کی ٹونٹی خراب ہوگئی ہے یا پانی کا پائپ لیک (Leak) ہوگیا ہے تو وہ پلمبر کو بلاتا ہے کہ آکر ٹھیک کرے یعنی اس مسئلے میں وہ نہیں جانتا ہے، انجان ہے اور جاننے والے کی طرف رجوع کرتا ہے۔ فنی مسائل ہوں، علمی مسائل ہوں یا روزمرہ کے معمولات کے مسائل ہوں اسی عمل پر انسانی معاشرتی زندگی استوار ہے، اگر رجوعِ عالم بہ جاہل بیچ میں سے نکل جائے تو علماء بھی بے کار ہوجائیں گے اور دیگر شعبۂ زندگی کے ماہرین بھی بے کار ہوجائیں گے لہٰذا یوں ہی ہونا چاہئے کہ کوئی شخص جو چیز نہیں جانتا ہے وہ اس میں اس شعبے کے ماہر کی طرف رجوع کرے۔

اسی طرح دین کے بھی ماہرین اور متخصص لوگ ہیں لہٰذا جو نہیں جانتے ہیں وہ ان کی طرف

رجوع کریں، اسی لئے جو جانتے ہیں ان کے لئے یہ کام حرام ہے یعنی جو خود دین سمجھتے ہیں، خود دین جانتے ہیں اور جاہل نہیں ہیں وہ دوسرے کی طرف رجوع نہ کریں بلکہ خود سے دین کو شناخت کریں اور اپنے احکام استنباط کریں، اسی لئے اعتقادات میں رجوع نہیں کر سکتے ہیں چونکہ اعتقادات میں آپ کو عالم بننا ضروری ہے، فقط فروعی مسائل میں تقلید جائز ہے، فروعی مسائل میں چونکہ علم نہیں چاہیئے بلکہ عمل چاہیئے، جس طرح سے ہم زندگی کے دیگر مسائل میں دوسروں کی طرف رجوع کرتے ہیں مثلاً جب ہم طبیب کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں بیماری کا علم اور اس سے متعلقہ ساری چیزوں کی تفصیل نہیں چاہیئے بلکہ علاج چاہیئے اور شفا چاہیئے، چونکہ ہمیں شفا چاہیئے لہٰذا طبیب کی طرف رجوع کرتے ہیں ورنہ اگر ہمیں بیماری کا علم، دوا کا بھی علم اور بیماری کی علامات و اسباب کا علم بھی چاہیئے ہوتا تو پھر ہم اسپتال میں جانے کے بجائے میڈیکل کالج جاتے اور طبیب کی طرح خود پڑھتے اور سیکھتے، اسی لئے اعتقادات میں، جہان شناسی میں، ہستی شناسی میں انسان کو خود عالم بننا ہے، یہاں تقلید نہیں کرنی ہے، اگر تقلیداً کسی سے کوئی مطلب قبول کر لیا تو باطل ہے، حتیٰ یہاں پر رجوعِ جاہل بہ عالم بھی جائز نہیں ہے بلکہ عالم بننا جائز ہے، نہ یہ کہ آپ اپنی حالت پر باقی رہیں اور اپنی وقتی مشکل عالم کی طرف رجوع کر کے حل کر لیں، یہ عملی مسائل میں ہوسکتا ہے لیکن اعتقادی مسائل میں ممکن نہیں ہے۔

☆ مذموم تقلید

مذموم تقلید وہ ہے کہ جس کی قرآن نے بھی مذمت کی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام لوگوں کے سامنے دین پیش کرتے تھے تو وہ جواب دیتے تھے کہ ہم تو آباء کے مقلد ہیں،

اِنَّا وَجَدْنَا آبَائَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ......(٦)

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے......

یہ مذموم تقلید ہے، اس کی قرآن نے مذمت کرتے ہوئے کہا کہ

اَوَلَوْ کَانَ آبَاؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ٥(٧)

یعنی کیا یہ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں۔

اگر وہ آباء احمق، نادان و نافہم تھے تو کیا پھر بھی تم انہی کے پیچھے چلو گے؟ یہ جائز نہیں ہے اور شانِ انسان بھی نہیں ہے کہ اس طرح کوئی کسی کے پیچھے چلے بلکہ انسان سمجھ کر چلے کیونکہ انسان کو خدا نے عقل دی ہے۔

مزید وضاحت کیلئے کہیں گے کہ تقلید یعنی دیکھا دیکھی کہ جو گزشتگان نے کر دیا ہے ہم نے وہی کرنا ہے، جیسے آباء کی تقلید ہے، آبائے علمی کی تقلید ہے، آبائے نسبی کی تقلید ہے، آبائے ثقافتی کی تقلید ہے، آبائے سیاسی کی تقلید ہے۔ انسان طبیعتاً مقلد ہے، پیچھے چلتا ہے، جس راہ پر دوسرے چل کر گئے ہیں بس اسی پہ چلنا ہے اور جو راہ انہوں نے طے نہیں کی ہے تو وہ ہم نے بھی طے نہیں کرنی

ہے، اسی طرح یہ قرآن کی طرف آیا ہے لیکن مقلدِ محض بن کر آیا ہے، کن لوگوں کا؟ ان سابقہ مفسرین کا کہ جو گزرے ہیں اور انہوں نے آکر تفسیرِ قرآن کی ہے، یہ ان کا مقلدِ محض ہے، قرآن سمجھنے آیا ہے لیکن قرآن نہیں سمجھ رہا ہے، یہ فقط یہ سمجھ رہا ہے کہ سابقہ مفسرین نے قرآن کے بارے میں کیا کہا ہے، صرف یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور خود جرأت نہیں کرتا ہے کہ قرآن سے کسی نکتے کا استفادہ کرے، جو کچھ سابقہ مفسرین نے کہہ دیا ہے اسی پر جمود اور سکوت ہے۔

☆طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں

حافظ شیرازی جو فارسی کے بڑے شہرت یافتہ اور مشہور شاعر ہیں اور تقریباً ساری دنیا میں شناختہ شدہ ہیں ان کے دیوان کے بارے میں کسی نے لکھا ہے کہ حافظ کی غزلیں بہت دشوار ہیں یعنی فارسی ادیبوں کے لئے بھی بہت سخت ہے، سعدی کا شعر آسانی سے سمجھ میں آتا ہے، مولانا کا شعر زور لگا کر سمجھ میں آتا ہے لیکن حافظ کا شعر سمجھنا بہت دشوار کام ہے اور جو حافظ کا شعر سمجھنا شروع کردے تو سمجھے کہ وہ ادیب ہے۔

ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ حافظ کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ شارحین ہیں کہ جنہوں نے حافظ کے کلام کی شرح کی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ پہلے آئے ہیں اور حافظ کے کسی شعر کا معنیٰ انہوں نے پہلے کیا ہے، بعد میں آنے والا انسان جب شعر پڑھتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ میں شارح کے کلام کے تناظر میں شعر کو سمجھوں لیکن اس نے حافظ کے شعر کا رخ کسی خاص سمت میں موڑا

ہوا ہے اور آنے والا بھی مقلدِ محض ہے، وہ تو لکیر کا فقیر ہے، لکیر کسی نے پہلے لگا دی ہے کہ حافظ یہ کہنا چاہتے ہیں اور بعد میں آنے والے سب اسی طرف مڑتے جاتے ہیں کہ حافظ یہ کہنا چاہتے ہیں، اگر یہ شارحین کلامِ حافظ نہ ہوتے تو آج بہت سارے لوگ حافظ کو آسانی سے سمجھ سکتے، اگر شروحات نہ ہوتیں تو مشکلات بھی نہ ہوتیں۔

بعض علمی کتابوں کی شروحات لکھی گئی ہیں لیکن درسی کتابوں، سلیبس (Syllabus) کی کتابوں کی شرح نہیں ہونی چاہئے، جو کتاب درس ہے اس کی شرح نہیں ہونی چاہئے، اگر ہے بھی تو طالب علم کو خریدنی نہیں چاہئے، خرید بھی لے تو اسے پڑھنا نہیں چاہئے، صرف تبرک کے طور پر گھر میں ثواب کے لئے رکھیں ورنہ اگر طالب علم جس کتاب کو پڑھ رہا ہے اور اس نے اس کی شرح کی مدد لینا شروع کر دی ہے تو یہ آخر تک آخوند بی سواد رہے گا، یہ قادر نہیں رہے گا اور اس کے اندر کبھی بھی ملکہ پیدا نہیں ہوگا۔ کتاب ہو، استاد ہو اور شاگرد ہو، چوتھی کوئی بھی چیز بیچ میں نہ ہو، استاد کی راہنمائی سے انسان خود کتاب حل کرے، پھر انسان کسی نقطے تک پہنچ جاتا ہے ورنہ شروحات، خلاصے، جزوے اور نہ جانے کیا کیا پڑھ کے انسان کہیں نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اگر عادی ہو چکے ہیں تو اجتناب کریں، آہستہ آہستہ ان چیزوں سے جان چھڑائیں کہ جب تک طلبہ ہیں البتہ جب استاد بن جائیں تو پھر بے شک شروحات کا مطالعہ کریں، گویا استاد کے لئے واجب ہے کہ جو کتاب پڑھا رہا ہے اس میں ساری شروحات کا مطالعہ کر کے آئے اور طالب علم کے لئے حرام ہے کہ کسی شرح کا مطالعہ کرے، وہ فقط درس پر اکتفا کرے۔

☆ طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں

☆درس پڑھنے کا نسخہ

پہلے طالبِ علم اپنے اس کام پر غور وفکر کرے کہ جو اس نے درس سے پہلے، درس کے دوران اور درس کے بعد کرنا ہے، اس سے انسان کے اندر ملکہ پیدا ہوتا ہے، تجربہ کر کے دیکھ لیں، تین مہینے اس طرح سے درس پڑھیں کہ جیسے عرض کر رہا ہوں، تین مہینے ضائع ہو گئے تو اتنی مشکل نہیں ہے، مجھے معاف کر دینا، تین مہینے اس طرح سے درس پڑھیں کہ پہلے اس کتاب کا خود مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ آپ کو کتاب سے کیا سمجھ میں آتا ہے پھر حاضر دماغ ہو کر، حاضر ذہن ہو کر استاد کا درس سننے جائیں اور سنیں کہ استاد کیا کہتا ہے بشرطیکہ استاد ہو نہ کہ آپ پر ٹریننگ (Training) کر رہا ہو، استادی کے ساتھ اس کو پتہ چلے کہ استاد ہے، بالآخر جس فن کا کوئی استاد ہو اس کا خود پتہ چل جاتا ہے، پھر اسے دیکھیں کہ استاد نے کیا بتایا ہے، پھر اس کے بعد استاد کی بتائی ہوئی راہنمائی کی روشنی میں خود دوبارہ مطالعہ کریں اور نوٹ تیار کریں، پھر اس کا مباحثہ کریں۔

تین مہینے اس طرح سے درس پڑھ کر دیکھیں کہ آپ کو کوئی فرق محسوس ہوتا ہے یا نہیں۔ جو درس آپ شروحات ہی کی وجہ سے پڑھتے ہیں اگر چھ مہینے بعد اسی کتاب کو کھول کر دیکھیں تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ ابھی تک میں نے یہ کتاب پڑھی بھی نہیں ہے کیونکہ شارح نے ساری کتاب حل کی ہوئی ہے نہ کہ میں نے حل کی ہے، یہ شارح کی حل شدہ ہے میرے لئے تو حل نہیں ہوئی بلکہ مجھے یہ کتاب خود حل کرنی ہے، شارحین نے حل کر کے کتابیں لکھ کر اپنے پیسے کما لیے، میں محروم ہوں، آپ نے بھی حل کرنی ہے لیکن ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، جس نے جو زحمت کی ہے اس کی قدر دانی

کرنی چاہیے، جن لوگوں نے آکر قرآن کی تفاسیر لکھی ہیں، ان کا ہم سب پر حقِ عظیم ہے، خصوصاً طلاب پر اور تمام مسلمین پر کہ جنہوں نے آکر قرآن کے بارے میں کوئی بھی خدمت کی ہے، ترجمہ کیا ہے، قرآن چھاپا ہے، قرآن پڑھایا ہے یا جو کچھ بھی سکھایا ہے بالآخر بہترین کام، بہترین عبادت و افضل عبادت قرآن پڑھانا ہے، اس کے برابر کوئی اور عبادت نہیں ہے لیکن ساتھ یہ بھی توجہ رکھیں کہ قرآن فہمی میں بھی ایک لحاظ سے سب سے بڑی مشکل یہی مسائل ہیں۔

قرآن فہمی کیلئے اسی لئے آداب کی ضرورت ہے، نہ کہ ہر کس و ناکس آئے اور جس حالت میں ہے اسی طرح آکر قرآن پڑھنا اور سمجھنا شروع کر دے، اور نہ انسان یہ سمجھے کہ اصلاً قرآن ہمیں سمجھ ہی نہیں آ سکتا، افراط و تفریط کا شکار نہ ہو، قرآن کو پڑھے لیکن اس کو آداب کے ساتھ پڑھے، قاعدوں و ضابطوں کے ساتھ پڑھے اور ان موانع سے جان چھڑائے۔

☆جمود، باعثِ تعصب

☆جمود، باعثِ تعصب

☆ التقلید لمذهب......

صدر المتألھین ؒ فرما رہے ہیں کہ کسی ایک مسلک کا مذہب، مذہب سے مراد مذہبِ مُصطلَح نہیں ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے اندر یا کسی بھی مطلب کے بارے میں

☆ سمعه من الشیوخ......

یا اپنے بزرگوں اور اساتید سے اس نے جو کچھ سنا ہے،

☆وجمد علیہ......

اس پر جمود اختیار کرلے،

☆ و ثبت فی نفسه التعصب له بمجرد الا تباع......

یعنی اس انسانِ مقلد کے نفس کے اندر تعصب پیدا ہو جاتا ہے، اس شخص کی پیروی کرنے سے کہ

☆ لمن وقع منه الاسماع......

جس سے یہ مطلب سنتا ہے اور سن کر پلے باندھ لیتا ہے اور اسی پر اس کے دل میں تعصب پیدا ہوتا ہے۔

☆ من غیر وصول الیه ببصیرة......

یعنی سننے سے جس مطلب تک پہنچتا ہے نہ کہ بصیرت سے، نہ تجزیے و تحلیل سے، نہ غور و فکر سے بلکہ شخصیت سے متاثر ہو کر جس مطلب تک پہنچتا ہے۔

پس انسان جوں ہی کسی سے سنتا ہے اس کے اوپر جمود اختیار کر لیتا ہے، جمود کے بعد انسان کے اندر تعصب پیدا ہو جاتا ہے، تعصب یعنی جو کچھ اس نے کہا ہے اس کو آنکھیں بند کر کے قبول کرنا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور نکتے کی طرف یا کسی اور بات کی طرف توجہ نہیں کرنی ہے۔

☆جمود، باعث تعصب

☆کمزور نفوس کی مشکل

عموماً ضعیف نفوس کی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے سے قوی تر انسانوں میں سے کسی نہ کسی کے اسیر ہو جاتے ہیں یا یہ روحانی اور نفسیاتی مسائل ہیں، بعض اوقات کسی شخصیت کا کمال، کسی کی اچھی صفات ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور بعض اوقات ہمیں اپنا ضعف کسی کا اسیر بنا دیتا ہے یعنی چونکہ ہم اس سے کمزور ہیں اور وہ ہم سے قوی تر ہے اس وجہ سے اپنے ضعف کی وجہ سے انسان اس کا اسیر ہو جاتا ہے۔ پھر یہ شخصیات ان موانع میں سے ہیں کہ انسان اس طرح سے کسی کا اسیر ہو جائے کہ جو کچھ کسی نے کہا ہے وہ درست ہے اور جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں غور و فکر کی بھی ضرورت نہیں ہے، یہ شخص کبھی بھی اس کو ترقی نہیں کرنے دے گا، بعض دیگر مباحثات میں کہ جو اسی سے ملتے جلتے مباحثات ہیں ان میں عرض کیا ہے کہ طلابِ علوم کے لئے خصوصاً یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے کہ کبھی بھی اساتید کو پیر نہ بنائیں، حوزے میں یہ ایک مشکل ہے کہ فوراً استاد و شاگرد کا رابطہ تبدیل ہو جاتا ہے اور پیر مرید کا رابطہ بن جاتا ہے اور جب پیر مرید بن جاتے ہیں تو پھر انسان استفادہ نہیں کر سکتا ہے چونکہ پیر سے کوئی استفادہ نہیں کرتا ہے بلکہ پیر کی فقط تقدیس ہوتی ہے اور مرید کو پیر کچھ دیتا نہیں ہے بلکہ وہ فقط اس سے آداب و احترامات و تقدیسات وغیرہ طلب کرتا ہے، نہ پیر سے اس کو کچھ ملتا ہے نہ مرید کچھ لینے کے لئے پیر کے پاس جاتا ہے۔

☆استاد اور شاگرد کا رابطہ

استاد اور شاگرد کا رابطہ استفادہ اور افادہ کا رابطہ ہے، شاگرد یعنی کچھ لینے والا اور استاد یعنی کچھ دینے والا، استاد اور شاگرد کے بقدرِ کافی آداب ہیں کہ کیا رابطہ ہونا چاہئے، شاید انسانی رابطوں میں سے مقدس ترین رابطہ استاد و شاگرد کا ہے حتیٰ یہاں تک ہے کہ اس دین میں یا دینی نصوص کے اندر جو تین والد متعارف کروائے گئے ہیں کہ آپ کے تین والد ہیں، اول وہ کہ جس سے آپ پیدا ہوتے ہیں، دوم وہ کہ جو آپ کو بیٹی دیتا ہے اور سوم وہ کہ جس سے آپ پڑھتے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس والد کی ہے کہ جس نے آپ کو تعلیم دی ہے، اب انسان کے اس اعتبار سے کتنے آباء بن جاتے ہیں، جن جن سے ہم نے ایک حرف سیکھا ہے، امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفاً فَقَدْ صَیَّرَنِیْ عَبْدًا......(۸)

جس نے مجھے ایک حرف سکھایا اس نے مجھے اپنا غلام بنایا......

یہ سب سے اہم اور مقدس ترین رابطہ ہے، لیکن پیری مریدی جیسا رشتہ عموماً حوزوں اور مدارس میں ہوتا ہے اور یہ ضعفِ مرید کی وجہ سے ہوتا ہے، کمالِ پیر کی وجہ سے یہ رابطہ نہیں بنتا ہے چونکہ مرید بہت ضعیف ہوتا ہے، کنویں کا مینڈک ہوتا ہے، اس نے اور کسی کو دیکھا ہی نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے وہ فوراً اپنے استاد کو مرشد و پیر مان لیتا ہے اور پھر اس کی آنکھوں میں محبت کی پٹی بندھ جاتی ہے اور وہ کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتا ہے، اس سے جان چھڑائیں کہ یہ ہمارے لئے اسارت ہے۔

☆استاد اور شاگرد کا رابطہ

اب یہاں ضمنی بات آ گئی ہے تو بد نہیں ہے کہ یہاں میں اس کا اظہار کروں کہ مثلاً ہمارے پاکستانی کلچر میں یہ بات زیادہ نمایاں ہے، دوسری قومیتوں کی نسبت پاکستانیوں کے اندر یہ عنصر زیادہ ہے اور پیر بھی بن جاتے ہیں، لوگ پرائمری کے استاد کو ہی پیر بنا لیتے ہیں نہ کہ کسی ہائی کلاس کے استاد کو پیر بنائیں، مثلاً پاکستان میں پہلی دفعہ جس مدرسے میں جا کر داخلہ لیا ہے اس کے پرائمری استاد کو حوزے میں آنے کے بعد اپ ڈیٹ (Update) نہیں کرتے ہیں، اگر پیر ہی ماننا ہے تو کسی بڑی سطح کے استاد کو پیر مان لیں، اول تو نہ مانے، نہ مرجعِ تقلید کو پیر مانے، نہ کسی بڑے استاد کو اور نہ کسی چھوٹے استاد کو، انہیں پیر نہیں ماننا بلکہ استاد ماننا ہے، ثانیاً یہ کہ بالفرض اگر پیر بھی ماننا ہے تو کسی بڑے کو پیر مان لو، بڑے بڑے مجتہدین اور مراجع موجود ہیں ان میں سے جو درسِ خارج پڑھاتے ہیں اسی کو پیر مان لو لیکن اس پرائمری کے استاد کو پیر کیوں بناتے ہو؟ حوزے میں رہ کر بھی آخر تک اسی سے راہنمائی لیتے ہیں، ہمارے طلبہ کے اندر علمی رشد نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہی حجاب ان کو درپیش ہے، اپنے پرائمری استادوں کی اسارت میں گرفتار ہیں، پرائمری استاد پرائمری استاد ہی ہوتا ہے اس کی ذہنی اپروچ (Approach) اتنی نہیں ہوتی ہے، اس کی سوچ اتنی بڑی نہیں ہوتی ہے، اس کی آگاہی اتنی زیادہ نہیں ہوتی ہے، اس کا ہم پر سارا لطف و کرم و کمال یہی ہوتا ہے کہ اس نے ہمیں حوزے تک پہنچا دیا ہے۔

یونیورسٹی کے طلبہ کبھی بھی پرائمری استاد کے اسیر نہیں ہوتے ہیں، اگر ہوں تو بھی تو اس آخری بڑے درجے کے استاد کے اسیر ہو جاتے ہیں کہ جو انہیں یونیورسٹی میں میسر آتا ہے یا کسی بڑی

اور باکمال شخصیت کے اسیر ہو جاتے ہیں لیکن دینی طلبہ پرائمری استاد کے اسیر ہو جاتے ہیں، حوزے میں آ کر اگر کوئی شرعی مسئلہ پوچھنا ہو تو مراجع قم میں رہتے ہیں اور یہ توضیح المسائل کا مسئلہ ٹیلیفون کر کے پاکستان میں پوچھتے ہیں کہ مثلاً نماز میں دو اور تین میں شک ہو جائے تو کیا کریں؟ یا اگر کوئی درس انتخاب کرنا ہے کہ یہاں پر کس کے پاس پڑھیں؟ کس کے پاس نہ پڑھیں؟ وہاں سے راہنمائی لیتے ہیں۔ یہاں اب آپ بڑی کلاس میں آگئے ہیں، بڑی سطح پر آگئے ہیں، حوزے کی سطح پر آگئے ہیں، حوزے کی سطح پر آنے کے لئے صرف ایک زمینی سفر کافی نہیں ہے بلکہ حوزے کی سطح پر آنے کے لئے بہت سارے نالین اتارنے پڑیں گے،

فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ......(۹)

پس اپنی جوتیاں اتار دیں......

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے فرمایا کہ آپ وادیِ مقدس میں آگئے ہیں لہٰذا یہ نالین جو پہنے ہوئے ہیں اتار کے آئیں۔ پس یہ رابطے، یہ اسارتیں، یہ قید، یہ زنجیریں اپنے پاؤں سے اتار کر آئیں تو آپ ترقی و رشد حاصل کرسکیں گے۔

☆رشد حاصل نہ ہونے کی وجہ

ہمارے رشد نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اسیر ہیں، اسیر بھی بہت نچلی سطح پر ہیں، یہ ضمنی نکتہ تھا، قرآن فہمی میں بھی انسان کے لئے یہ نکتہ مانع بن جاتا ہے، قرآن شناسوں کو بھی دیکھیں تو

وہ کسی نہ کسی کے اسیر ضرور ہیں اور فقط اسی کے قول کو ترجیح دیتے ہیں مثلاً کوئی اسیرِ امام رازی ہے، کوئی اسیرِ زمخشری ہے، کوئی اسیرِ طبرسیؒ ہے، کوئی اسیرِ شیخ طوسیؒ ہے، کوئی اسیرِ فلاں ہے حتیٰ ممکن ہے کہ کوئی مرحوم علامہ طباطبائیؒ کا اسیر ہو جائے کہ جو کچھ مرحومِ علامہؒ نے کہا ہے بس اس کے علاوہ نہ سوچنا ہے اور نہ دیکھنا ہے، آپ آزاد ہیں حتیٰ حضرت آیت اللہ جوادی آملی مدظلہ جو علامہ طباطبائیؒ کے شاگرد ہیں آپ ان کی کتابِ تسنیم پڑھیں جو حضرت آیت اللہ جوادی آملی مدظلہ کی تفسیرِ قرآن ہے، حضرتِ استاد اس میں بہت سارے مقامات پر علامہ طباطبائیؒ پر نقد وارد کرتے ہیں، ان کے نظریے کو نقد کرتے ہیں بااینکہ شاگرد ہیں اور جتنا احترام ان کے دل میں علامہؒ کا ہے شاید کسی کے دل میں اتنا احترام نہ ہو لیکن درعین حال کیوں انتقاد کیا، حضرت استاد جوادی آملی اس وقت عالمِ اسلام کی ایک منحصر شخصیت ہیں چونکہ کسی شخصیت کے اسیر نہیں ہوئے ورنہ اگر کسی کے اسیر ہو جاتے تو پھر ترقی نہیں کر سکتے تھے، اس لئے فرماتے ہیں کہ کسی مذہب کے اوپر تقلید، کسی استاد کے اقوال، کسی بزرگ یا کسی اور شخص کی تقلید اور اس پر تعصب کی حد تک اتر آنا انسان کے لئے حجاب ہے۔

☆ ارتقاء حاصل نہ ہونے کی وجہ

☆ فهذا شخص قد قيده معتقده......

اپنے اعتقاد نے اس کو زنجیر میں باندھ لیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تعصب، یہ زنجیر بھی خود انسان نے اپنے اندر ہی ڈالی ہوئی ہے، باہر سے کسی نے ہمیں نہیں روکا ہوا ہے بلکہ اندر ہمارے عقیدے نے، ہمارے اپنے نظریئے نے ہمیں ترقی اور ارتقاء سے روکا ہوا ہے،

☆ فصار نظره موقوفا على مسموعه، لايمكنه ان يتجاوز عن مقامه.

جب انسان کسی کی سنی ہوئی بات، اپنے ہی بنائے ہوئے عقیدے اور تعصب کی زنجیر میں جکڑا جاتا ہے تو اس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اپنے مقام سے آگے بڑھ سکے یا ترقی کر سکے چونکہ زنجیر کھلے گی تو یہ آگے بڑھے گا لیکن زنجیر نہیں کھلے گی تو اگر یہ سالہا سال بھی قرآن پڑھتا رہے اور حوزے میں بیٹھا رہے تو بھی کسی اعلیٰ علمی مقام تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

☆شیطانِ تقلید کا حملہ

☆ **فان لمع برق علی بعد......**

بعد میں اگر کوئی ایسی تجلی، کوئی ایسی برقِ معنوی یعنی کوئی نورِ علم دور سے اس کی طرف آجائے، بسا اوقات ہوتا ہے کہ انسان کے پیشِ نظر ایسی چیزیں آجاتی ہیں، مثلاً کسی مجلس میں، کسی محفل میں، کسی کتاب کے مطالعے سے، کسی تذکرے میں کوئی ایسا نایاب نظریہ یا کوئی معنوی مطلب انسان کے سامنے آگیا ہے،

☆ **وبداله معنی من المعانی......**

یا کوئی ایسا معنیٰ خالص معانی میں سے اس کیلئے ظاہر اور نمایاں ہو،

☆ **التی تباین مسموعه......**

جو اس کی سنی ہوئی باتوں کے خلاف ہے،

☆ **حمل علیه شیطان التقلید حملة......**

تو فوراً شیطانِ تقلید آ کر اس پر حملہ کرتا ہے۔ ایک نکتہ جو انہوں نے یہاں پہ بیان فرمایا ہے کہ متعصب مقلد جو زنجیرِ تقلید میں، مسموعات کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں وہ لوگ جب بھی کوئی بات سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو ہم نے پہلے نہیں سنی ہوئی تھا یعنی ہم نے پہلے ایسا تو نہیں سنا تھا، یہ وہی لوگ ہیں کہ جو مقلدِ محض ہیں۔ کیا آپ نے سن سن کر ہی ساری حقیقت تک پہنچنا ہے؟ آپ کبھی یہ نہیں کہتے کہ اس پر میں نے غور نہیں کیا تھا، اس پر میں نے فکر نہیں کی تھی بلکہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہم نے پہلے نہیں سنا ہوا تھا یعنی سننے پر ہی سارا اکتفا کیا ہوا ہے لہٰذا فوراً شیطانِ تقلید آ کر حملہ کرتا ہے کہ یہ بات تو تیری سنی ہوئی باتوں کے خلاف ہے، یہ غلط بات ہے، کیوں غلط ہے؟ چونکہ تو نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی، تیرے شیخ نے یہ بات بیان نہیں کی تھی، تو نے یہ مطلب تو اپنے پیر و مرشد سے نہیں سنا تھا اس لئے غلط ہے۔

اگر پرائمری ٹیچر نے یہ بات نہیں کی تو کر بھی نہیں سکتا ہے چونکہ اس کو معلوم نہیں ہے، وہ پرائمری ٹیچر ہے۔ آپ اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ خدا نے میرے لئے وسیلہ دیگر پیدا کیا ہے، کسی اور کو میرے لئے مقرر کیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے یہ تعلیم حاصل کروں لہٰذا ہر دم انسان نئے مطلب کے در پے رہے، اگر نئے معانی استنباط کرنے کے لئے دوسرے کوشش نہیں کر رہے ہیں تو خود کوشش کرے مثلاً وہی تکراری چیزیں جو ایک بیان کرتا ہے وہی دوسرے نے بیان کی ہوتی ہیں۔

اگر آپ قرآن کی لائبریری میں جا کر ساری تفسیروں کا خلاصہ نکالیں تو شاید دس جلدی کتاب بھی نہیں بنتی ہے، ہزاروں جلدوں کا خلاصہ دس جلدی کتابوں میں سما جائے گا، کیوں؟ چونکہ

ایک تفسیر میں جو بات لکھی ہے، اسی کے ذیل میں بھی وہی بات لکھی ہوئی ہے جو دوسرے نے تفسیر لکھی ہے پھر وہی بات تیسرے نے بھی لکھی ہے، اس طرح ایک تفسیر دوسری میں منتقل ہے وہی تیسری اور چوتھی میں منتقل ہے، فقط کاغذ کا ڈھیر لگا ہوا ہے لیکن مطلب کا اضافہ نہیں ہوا ہے، سو تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن بیچ میں دو مطلب بھی نہیں ہیں، کس وجہ سے؟ یہ اسی تقلید کی وجہ سے ہے۔

ورنہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ نئی تفسیر جب لکھی جا رہی ہے تو انسان نئے مطالب سے آشنا ہو جیسے المیزان ایک نئی تفسیر تھی، اس میں انسان کو نئے مطالب ملتے ہیں جو المیزان سے پہلی والی تفاسیر میں موجود نہیں ہیں، یہ تفسیر لکھنے کا جواز ہے، اگر کوئی یہ کام نہیں کر سکتا ہے تو خوامخواہ لوگوں پر بوجھ ڈالنا، پریس (Press) کو مشغول کرنا، اتنا کاغذ مصرف کرنا اور لوگوں کے پیسے اور وقت کو ضائع کروانا آسان ہے بلکہ انسان ایڈریس دے دے کہ فلاں تفسیر بہت اچھی ہے، جس سے میں نقلِ مطالب کرنے والا ہوں وہ تفسیر بہت اچھی ہے۔ بجائے اس کے میں جتھے تفاسیر کے مطالب اپنی ایک کتاب میں منتقل کروں تو مجھے ایک نیا کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس میں کیا تحقیق ہے؟ کیا محقق ہے؟ کیا علمیت ہے کہ میں کسی کے مطالب اپنے کتاب میں نقل کر دوں، اگر میرے پاس کوئی نیا مطلب نہیں ہے تو رہنے دوں اور فقط گزشتہ لوگوں کی کتابوں کا احیاء کروں، لوگوں کی راہنمائی کروں کہ ان کی کتابوں کی طرف رجوع کریں،

☆ وقال: کیف مخالف معتقد ابائک......

شیطانِ تقلید آ کر اس کو یہ کہتا ہے کہ تو نے تو یہ بات نہیں سنی ہوئی تھی، پہلے تیرے پیر و مرشد

☆ شیطانِ تقلید کا حملہ

نے تو یہ بیان نہیں کیا تھا، تو کس طرح سے اپنے بزرگ یعنی بزرگِ علمی، آباءِ علمی کے خلاف سوچ رہا ہے؟ ایسی زنجیر میں جکڑا ہوا انسان فوراً شیطان کے حملے کی زد میں ہوتا ہے، تعصّبات کی دنیا یہی ہے۔

☆تعصبات، مذہبی دنیا کا بڑا مسئلہ

مذہبی دنیا کی ایک بڑی مشکل یہی ہے کہ تعصّبات کی دنیا ہے، مذہب اور تعصب ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے ہیں، جس دن انسان تعصب چھوڑے گا تو اسے مذہب بھی چھوڑنا پڑے گا لیکن مشکل یہ ہے کہ مذہبی تعصب رکھتے ہوئے انسان درست عمل کیسے کر سکتا ہے؟ یہ حل طلب مسئلہ ہے، یہ تمام مذہبیوں کے لئے ایک چیلنج (Challenge) ہے، چیلنج اس طرح ہے کہ مذہبی دنیا متعصب دنیا ہے اور تعصب چھوڑ دیں گے تو آپ کا مذہب بھی ساتھ جائے گا مثلاً درست ہے کہ فلاں ہمارے مذہب کا نہیں ہے لیکن آیا اس نے کوئی صحیح بات نہیں کی ہے؟ اس کے پاس کوئی درست بات نہیں ہے ؟ تعصب کہتا ہے کہ ان کی صحیح باتیں بھی غلط ہیں چونکہ یہ آپ کے مذہب کے نہیں ہیں، یہاں انسان کو مشکل پیش آجاتی ہے اور اپنی ہر بات درست ہے اگرچہ وہ غلط ہی ہو مثلاً میرے مذہبی آدمی نے، میرے ہم آہنگِ مذہب نے جو بات کی ہے وہ درست ہے اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو، اشتباہ ہی کیوں نہ ہو، انسان کہتا ہے کہ وہی درست ہیں، تو کس طرح سے انسان مذہبی بھی ہو اور در عینِ حال متعصب بھی نہ ہو یعنی مذہب بھی باقی رہے اور تعصب بھی ختم ہو جائے؟ وہ انسان حق تک پہنچ سکتا ہے کہ جس کے اندر تعصب نہ ہو، خصوصاً اس جہت سے تعصب نہ ہو کہ جہاں

☆تعصبات، مذہبی دنیا کا بڑا مسئلہ

سے حق ملتا ہے انسان وہاں سے حق نہ لے۔ ہماری دینی تعلیمات کا حصہ یہ ہے کہ

اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤمِنِ......(۱۰)

حکمت ودانائی مومن کا گمشدہ مال ہے......

حکمت آپ کی گمشدہ چیز ہے، کہیں بھی ملے حتیٰ اگر منافق کے پاس بھی حکمت ہے تو لے لو، یہاں پر تعصب نہ کرو کہ چونکہ منافق یہ بات کر رہا ہے لہٰذا ہم نہیں کہیں گے، ممکن ہے کسی عالم کی زبان پر یہ مطلب جاری ہوا ہو کہ جو آپ کا ہم مسلک نہیں ہے، ممکن ہے غیر مسلم ہو کہ اس کی زبان پر خدا نے یہ بات ڈال دی ہے کہ جو آپ کا ہم مسلک نہیں ہے، حق جہاں بھی ہے وہاں سے لے لو اگرچہ آپ کے دشمن کے پاس ہی کیوں نہ ہو۔

☆تضاربِ آراء کو تحمل کریں

☆ فیز عم ان ذلک غرور من الشیطان......

اس وقت انسان اس غرورِ شیطانی میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ یہ گمان کرتا ہے کہ جو بات بھی میرے مرشد، میرے شیخ، میرے بزرگ، میرے آباءِ علمی یا میرے استاد کی رائے کے خلاف ہے وہ مطلب درست نہیں ہے، انسان نئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہے، بعض علماء اسی موثر زمانے میں ابھی موجود ہیں کہ جنہوں نے بعض مسائل میں کچھ اختلافی آراء پیش کی ہیں، اختلافی آراء سے مراد یعنی وہ جو پہلے سے پیری مرشدی کے ماحول کے اندر طے شدہ مسائل ہیں ان سے ہٹ کر اگر کوئی

☆ تضاربِ آراء کو تحمل کریں

بات کرے تو شور و غوغا، تفسیق، تضحیک، تذلیل اور فسق و فجور و تکفیر کے فتوے جاری ہونا شروع ہو جاتے ہیں، قبول کرنا ضروری نہیں ہے، آپ تحمل کریں، اگر کوئی اختلافی رائے ظاہر کرتا ہے تو غور کرو شاید ممکن ہو کہ درست کہہ رہا ہو، اگر درست کہہ رہا ہے تو بھی آپ کو شور نہیں مچانا چاہئے، اگر نادرست ہے تو آپ اس کو رد کر دیں، درست ہے تو اس کو قبول کر لیں۔

حوزے کے اندر علماء اور طلاب کے یہ شایانِ شان نہیں ہے اور یہ ان کیلئے سزاوار نہیں ہے کہ آرائے اختلافی کو اس طرح سے دیکھیں کہ جس طرح سے جہلاء دیکھتے ہیں، عوام الناس دیکھتے ہیں، عوام الناس تحمل نہیں کر سکتے ہیں، وہ اصلاً سرے سے اہل آراء نہیں ہیں، امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ انسان حق تک پہنچتا ہی تضاربِ آراء سے ہے، تضارب آراء یعنی ایک دوسرے سے ٹکراتی آراء، اختلافی آراء۔ مشورے لیں مشورے مختلف آئیں گے اور اختلافی مشورے آئیں گے، ان ہی میں سے انسان بہترین راہ تک پہنچتا ہے، مشاورت کی حکمت بھی یہی ہے کہ اختلافی باتیں سنو تا کہ درست راستہ اپنا سکو اور کہا گیا ہے کہ چاپلوسوں سے کبھی مشورہ نہ لو چونکہ وہ اختلافی رائے کبھی بھی ظاہر نہیں کرتا۔

درباروں اور سرکاروں میں زیادہ چاپلوس ہوتے ہیں، ایک بادشاہ نے پوچھا ٹائم کیا ہوا ہے تو چاپلوس نے جواب دیا کہ جو اعلیٰ حضرت کی مرضی ہو یعنی اعلیٰ حضرت جو ٹائم اس وقت پسند فرماتے ہیں وہی ہوا ہے، یہ لوگ تو کبھی بھی آپ کو حق نہیں بتا سکتے ہیں لہٰذا کہا گیا ہے کہ چاپلوس سے مشورہ اور رائے نہ لو، ناقص انسان سے رائے نہ لو، خسیس سے، بخیل سے، کنجوس سے کبھی بھی مشورہ نہ

کرو چونکہ یہ کبھی بھی صحیح رائے نہیں دیں گے، جو شخص ہمیشہ اختلافی رائے دیتا ہے اس سے حتماً رائے اور مشورہ لو شاید وہ کسی نکتے کی طرف آپ کو متوجہ کردے۔

☆علم کے ساتھ حلم کی ضرورت

علم کے ساتھ حلم ضروری ہے، اس وقت علم موجود ہے لیکن حلم نہیں ہے، اس مطلب کو علماء نے اپنی کتب میں مختلف منابع سے نقل کیا ہے، امامِ زمانہ علیہ السلام دعائے افتتاح میں اللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی حِلْمِہٖ بَعْدَ عِلْمِہٖ......(۱۱)

اللہ کی حمد وثنا ہے اس کے علم کے بعد اس کے حلم پر......

یعنی الحمدللہ تو علم رکھتے ہوئے بھی اتنا حلیم ہے کہ ہم جیسوں کو تحمل و برداشت کیا ہوا ہے۔ کیا ہم واقعاً قابلِ تحمل ہیں؟ اپنے نفس میں جھانک کر دیکھیں، ضمیر کو دیکھیں، اپنے وجدان اور باطن کو دیکھیں کہ آیا ہم واقعی قابلِ برداشت و قابلِ تحمل ہیں؟ حوصلۂ خدا دیکھیں کہ ہم جیسوں کو بھی تحمل کیا ہوا ہے، درحالیکہ علم ہے، خدا کو ہماری ہر چیز کا علم ہے، یہ حلمِ خدا ہے کہ ہمیں برداشت کیا ہے ورنہ کب کا عذاب نازل کردیا ہوتا اور سب ضائع و تلف ہو چکے ہوتے، ہلاک ہو چکے ہوتے۔ علم کے ساتھ حلم بہت ضروری ہے ورنہ فقط علم کے ساتھ تعصب آجائے گا، اگر حلم نہیں آئے گا تو تعصب آجائے گا، ہمیشہ علم و حلم دونوں حاصل کرو، حوزۂ علمیہ اور حوزۂ حلمیہ دونوں ہونے چاہئیں وَاِلَّا اگر حوزہ میں صرف

علوم ہوں تو حوزہ علمیہ تعصبی ہو جائے گا۔

☆ علم کے ساتھ حلم کی ضرورت

اگر علمی ماحول میں آراء تحمل نہ ہوئیں تو پھر کسی اور عوامی ماحول میں تو ممکن ہی نہیں ہے کہ آراء تحمل ہوں، تضاربِ آراء سے علوم ترقی کرتے ہیں، افراد اس طرح سے بنتے ہیں، افراد کی ترقی اور رشد کا راز یہ ہے کہ وہ تضاربِ آراء سے آگے بڑھتے ہیں اور حق تضاربِ آراء سے سامنے آتا ہے۔ اس کے لئے مشق کیا کریں، اپنے اندر تحمل ایجاد کریں، اپنے بارے میں، اپنی آراء اور اپنے اعتقادات کے بارے میں سننے کا حوصلہ پیدا کریں چونکہ کتاب پڑھنے سے علم آجاتا ہے لیکن حلم نہیں آتا ہے، حلم عملی تمرین اور عملی مشق سے آتا ہے کہ انسان برداشت کا مادہ پیدا کرے۔ مذہبی مشکل، مذہبی طبقے کی مشکل یہ ہے کہ ان کو علم ہوتا ہے حلم نہیں ہوتا ہے اس لئے ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں، یہ غیر مذہبی کو برداشت کر لیتے ہیں لیکن مذہبی مذہبی کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ جیسے وہ سوتنیں ہوتی ہیں، ایک مرد کی بیویاں کہ وہ پڑوسن کو تو برداشت کر لیتی ہیں لیکن اپنی سوتن کو برداشت نہیں کر سکتی ہیں، مذہبی بھی ایک دوسرے کے ساتھ یہی رشتہ روا رکھتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے سوت ہیں۔ ایک دوسرے کیلئے حلم ہونا چاہئے۔

☆ **فیتباعد منه و یحترز عن مثله......**

وہ گمان کرتا ہے کہ یہ میرے پیشوا اور مرشد کی بات کے خلاف ہے لہٰذا انسان اس سے اجتناب کرتا ہے اور دوری اختیار کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ اسے قبول نہیں کرتا بلکہ ٹھکرا دیتا ہے اور رد کر دیتا ہے۔

☆صوفیاء کی حقیقت

☆ ولمثل هذا قالت المتصوفة:......

صوفیاء یعنی عرفاء واہلِ معرفت لوگ، صوفی کا لفظ بدنام لفظ ہے، جس طرح سے بہت سارے الفاظ ہیں جو اپنی ذات میں اچھے ہیں لیکن غلط لوگوں نے اپنے اوپر استعمال کر کر کے ان کو برا بنا دیا ہے، جیسے علامہ ہے، پاکستان اور ہندوستان میں عالم کو عالمِ دین کہتے ہیں اور جاہل کو علامہ کہتے ہیں، یہ بھی ایک لطافت ہے اور برصغیر کا ادبی ذوق ہے کہ جاہل کو علامہ کہتے ہیں اور دوسرے کو عالم کہتے ہیں۔کوئی فون پر کہہ رہا تھا کہ لوگ ہم سے اب تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ہمیشہ علامہ بلاتے ہیں اس دفعہ آپ کوئی عالم بلائیں لہٰذا آپ ہمیں کوئی عالم دے دیں اس دفعہ ہم علاموں سے تنگ آ گئے ہیں ،لفظِ علاّمہ بدنام ہو گیا ہے، اس وجہ سے کہ جہلاء نے اسے اپنے لئے استعمال کیا ہے یا جہلاء کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح سے لفظِ تصوّف وصوفی بھی ہے، یہ لفظِ صوفی شعبدہ بازوں کے لئے ،ٹھگوں کے لئے ، چوروں کے لئے اور مرید بازوں کے لئے اتنا استعمال ہوا ہے کہ لفظِ صوفی آتے ہی انسان کے ذہن میں زلفیں، پھٹے پرانے کپڑے، کشکول اور دیگر چیزیں آنا شروع ہو جاتی ہیں،صوفی س اور ص دونوں سے لکھا جاتا ہے، الگ الگ نہیں ہیں، س کا سوفی اور ص کا صوفی دونوں ایک ہی لفظ ہیں، اس کا مطلب علم ودانش ہوتا ہے،صوفی یعنی جیسے آج کل لفظِ ڈاکٹر ہے،صوفی کا معنیٰ وہی ہے کہ جو آج کل ڈاکٹر کے نام سے موسوم ہے،ڈاکٹر بھی طبیب کو نہیں کہتے ہیں، معالج کو ڈاکٹر نہیں کہتے ہیں بلکہ

☆صوفیاء کی حقیقت

لغت میں ڈاکٹر اسکالر (Scholar) کو کہتے ہیں یعنی دانشور، دانشمند آدمی، جس کے اندر دانش ہو، یہ لفظ طبیبوں نے اپنے لئے چن لیا ہے اسی لئے ان کو بھی اب ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر یعنی دانشمند، صوفی اور اسکالر، صوفی اصل میں یونانی لفظ ہے عربی لفظ بھی نہیں ہے، بعض نے اس کو جان بوجھ کر عربی لفظ بنایا ہے، زبردستی عربی بنا کر کہا کہ صوفی اس کو کہتے ہیں کہ جو صوف پہنتا ہے، صوف سے مراد اون، جو لباس جانوروں کے بالوں سے بنایا جاتا ہے، اس سے جو خرقہ بنتا ہے اور وہ ایسا لبادہ پہنتا ہو تو اس کو صوفی کہتے ہیں۔ پھر تو جو جیسا لباس پہنتا ہے اسی کے نام سے اس کو یاد کرنا چاہئے مثلاً جو اون کا لباس پہنتا ہے وہ صوفی ہو جائے اور جو ریشم کا لباس پہنتا ہے وہ ریشمی ہو جائے، لباس سے تو کسی کا نام نہیں پڑتا ہے کہ اس نے کونسا فیبرک (Fabric) پہنا ہوا ہے، یہ لفظ اصل میں یونانی لفظ تھا اور بمعنیٰ اسکالر ہے، فیلسوف میں جو سوف استعمال ہوتا ہے فیلسوف لفظ مُعرّب از فیلوسوفا ہے، یونانی لفظ فیلوسوفا ہے، سوفا یونانی تلفظ ہے اس کا عربی تلفظ سوف ہے، فیلوسوفا یعنی محبِّ دانش، سوفی یعنی دانشور لیکن بعد میں ٹھگوں نے اس کو اپنے لئے اتنا استعمال کیا کہ اب صوفی کا لفظ سنتے ہی ہمارے ذہن میں عجیب و غریب حلیے کے لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں مثلاً یہ دھمالی و خانقاہی طبقہ اور جو درباروں میں ادھر اُدھر بیٹھا ہوتا ہے۔

عرفاء بھی انہی کو کہتے ہیں یعنی اہلِ معرفت لوگ، عرفان بھی ان چیزوں کا نام نہیں ہے کہ جو آج کل متعارف ہیں، جس کی طرف لوگ زیادہ راغب ہیں، دیواریں دوڑانا، راز بتانا اور پیش گوئیاں کرنا وغیرہ عرفان نہیں ہے، ان چکروں میں انسان کبھی بھی نہ پڑے، اس وقت ایک لہر دوڑی

ہوئی ہے بلکہ جمہوری اسلامی کی رسمی مشکلات کا تجزیہ کرتے ہیں، اینالائز (Analize) کرتے ہیں کہ اس وقت ہم کو سب سے بڑے چیلنجز کیا درپیش ہیں، سیاسی، اجتماعی، مذہبی، دینی اور دوسرے مسائل تو ان میں اس وقت ایران کو ایک بڑا چیلنج یہی منحرف صوفیانہ اور عارفانہ افکار ہیں اور اتفاق سے یہ حوزے میں زیادہ ہیں، اس وقت یہ حوزے سے زیادہ پھوٹ رہے ہیں، ایک سال لیلۃ القدر میں خطیبِ حرم کا موضوع یہی تھا، انہوں نے اسی بات پر تقریر کی اور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ قم سے ایسی باتیں نہیں ہونی چاہئیں، قم سے ملک کے اندر ایسی بدعتیں نہیں پھیلنی چاہئیں اور مقامِ معظم رہبری مدظلہ بھی ہمیشہ اپنے ہر خطبے میں اس خطرے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جوانوں کو اس سے محفوظ رکھیں۔ اس کی بہت ساری داستانیں اور قصے ہیں، شاید بہت حد تک آپ آگاہ ہوں گے، یہاں پر متصوفہ سے مراد اہلِ معرفت ہیں یعنی جو اہلِ سیر و سلوک ہیں، جو اولیائے خدا اور مقربینِ الٰہی میں سے ہیں۔

☆عرفاء کے نزدیک علم حجاب ہے

بعض اہلِ معرفت نے یہ کہا ہے کہ

☆ ان العلم حجاب......

عرفاء کہتے ہیں کہ علم حجاب ہے، اس علم سے کونسا علم مراد ہے؟ فرماتے ہیں کہ یہی مسموعی علم جو زنجیر بن جاتا ہے، جو انسان کو کسی کا قیدی بنا دیتا ہے، جس کے ہمراہ تعصب ہوتا ہے تو یہ علم حجاب

ہے، مثلاً انسان نے ایک مطلب کسی سے سن لیا ہے، سن کر اس کو زنجیر بنالیا اور تعصب کی پٹی بنا کر اپنے دماغ پہ چسپاں کر دیا لہٰذا اب کسی اور طرف نہیں جاتا ہے، حجاب اسی کو کہتے ہیں کہ جو انسان کو کہیں اور نہ جانے دے۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ معرفت نے کہا ہے کہ

☆ **ان العلم حجاب، وهذا القول ان صدر عن محققيهم......**

بے شک علم حجاب ہے اور اگر یہ قول محققین صوفیاء نے کہا ہے، کیونکہ کچھ جہلائے صوفیا بھی ہیں۔

☆ ٹھگ صوفیاء و عرفاء

صدر المتالھینؒ نے جہلاءِ صوفیاء کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے یعنی جو ٹھگ طبقہ، مرید باز طبقہ ہے کہ جو خود مرید بناتے ہیں، بیعت کراتے ہیں اور خرقے پہنتے ہیں ان کے بارے میں سب سے بہترین کتاب صدر المتالھینؒ کی ہے کسرُ اصنامِ الجاہلیہ کے نام سے رسالہ ہے جو بہت ہی خوبصورت ہے، اس میں انہوں نے رد کیا ہے کہ یہ لوگ اصلِ تصوف یا عرفان نہیں ہیں، یہ سارے ٹھگ ہیں اور پھر فرمایا کہ ان میں سے محققین ہیں، البتہ ہر شعبے میں ہیں، فقہا میں بھی ایسے ہی ہیں، فقہا کے اندر تھوڑے لوگ ٹھگ ہیں کہ جو فقیہ نہیں ہیں لیکن فقیہ بن جاتے ہیں، خطیبوں میں اچھے یا درست خطیب ہیں لیکن اکثر ٹھگ ہیں، ڈاکٹروں میں بھی ٹھگ ہیں، اتائی ڈاکٹر کہ جو دوا دارو کرنے والے ہیں اور انگلش میں جتنے حروف کی ترکیبیں یاد ہوتی ہیں ان سے ڈگریاں لکھ کر بورڈ لگا لیتے ہیں یہ ٹھگ ہیں، اسی طرح سے اس عرفاء کے طبقے کے اندر بھی اور اس لبادہ عرفان میں بھی ٹھگ موجود

ہیں لیکن محققین بھی ہیں، جس طرح سے فقہا میں محققین بھی ہیں اور ٹھگ فقہا بھی ہیں یعنی وہ فقہا جو کسی اور کے رسالۂ عملیہ پر اپنا ٹائٹل چڑھالیں، خود میں تو اتنا علم نہیں ہے کہ حتیٰ اپنی توضیح المسائل بھی لکھ سکیں پس کسی اور کی توضیح المسائل میں اپنا ٹائٹل چھاپ کر اس کے اوپر چسپاں کر دیا کہ آیت اللہ العظمیٰ فی العالمین مثلاً فی الملک والملکوت والعرش والکرسی والکہکشاں، لوگوں کو فریب دینے کے لئے یہ آیت اللہ العظمیٰ ہو جاتے ہیں۔

آپ دیکھیں کہ ایسے بہت ہیں اور لوگ ان کے اسیر ہیں، ذرا باہر جا کر عام لوگوں کے اندر جائیں تو بہت سے لوگ انہی ٹھگوں کے اسیر نظر آئیں گے، عموماً ضعیف نفوس اس مشکل سے دوچار ہو جاتے ہیں، مذہب کے بھیس میں ٹھگ بہت ہیں، وہ لوگوں کی امام زمانہ علیہ السلام سے ملاقات کراتے ہیں، خواب کی تعبیر بتاتے ہیں، کوئی غیب گوئی کرتے ہیں، کوئی مستقبل کے حالات بتاتے ہیں، کوئی انہیں امیر بننے کا راستہ بتاتے ہیں، یہ ساری ٹھگوں کی دنیا ہے، یہ ٹھگی سیکھتے ہیں اور پھر مذہب کے اندر آ کر ڈیرا ڈالتے ہیں چونکہ مذہبی لوگ بہت آسانی سے ٹھگے جا سکتے ہیں، ان کو بہت آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے لہٰذا اکثر ٹھگ لوگ منبروں پر ہیں یا پیر و عامل بنے ہوئے ہیں اور عورتوں یا دوسروں کو خرافات کا نشانہ بناتے ہیں۔ نالائق ترین انسان ٹھگ ہوتا ہے، جس کو نہ کچھ پڑھنا آتا ہے نہ لکھنا آتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضعیف تر اور بھولا بھالا وہ شخص ہے جو اس ٹھگ کا اسیر ہو جاتا ہے اور اس کو اپنا مرشد مان لیتا ہے، ٹھگ آتا ہے اور چند دن تک پیر بن کر کسی کے گھر میں رہتا ہے اور جاتے ہوئے ان کی لڑکی بھی ساتھ لے جاتا ہے، پھر پولیس کی طرف دوڑتے ہیں کہ پیر صاحب ہماری لڑکی

☆ علیؑ صوفیاء و عرفاء

لے گئے، یہ ضعیف ہیں یہ لوگ نہیں پہچان سکتے ہیں کہ یہ ٹھگ ہے، چور ہے اور شعبدہ باز ہے۔

بعض مریض کسی ٹھگ ڈاکٹر کے پاس پھنسے ہوئے ہیں، بعض کسی ٹھگ صوفی کے آگے پھنسے ہوئے ہیں، بعض کسی ٹھگ فقیہ کے ہاتھ پھنسے ہوئے ہیں اور بعض کسی اور ٹھگ کے ہاتھ پھنسے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے اندر معرفت وشعور آئے تو انہیں پتہ چلے کہ اسی میدان کے اندر محققین بھی موجود ہیں۔ انسان محقق طبیب کے پاس جائے، محقق فقیہ کے پاس جائے اور محقق عارف کے پاس جائے۔

☆محقق عرفاء کی بات کا صحیح معنٰی مراد لیں

اگر محققین عرفاء کوئی بات کہیں تو اس کا صحیح معنیٰ کرنا چاہیے، جب بھی کسی محقق سے کوئی بات وارد ہو تو کوشش کریں کہ اس کا صحیح معنیٰ کریں، یہ روشِ علماء ہے، مثلاً ہر کلام میں کچھ پہلو غلطی کے بھی نکالے جاسکتے ہیں کچھ پہلو درست معنیٰ کے بھی نکالے جاسکتے ہیں لیکن انسان کوشش کرے اور دیکھے کہ کس کی زبان سے یہ مطلب ادا ہوا ہے، اگر ایک عالمِ محقق اور دانا و دانشور انسان سے یہ بات صادر ہوئی ہے تو آپ اس کا صحیح معنیٰ نکالیں اگر چہ غلط بھی نکل سکتا ہے لیکن آپ صحیح معنیٰ لیں اور اگر ایک صحیح بات ظاہراً غلط آدمی کر رہا ہے کہ جیسے خوارج کہتے تھے کہ

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ......(۱۲)

حکم صرف اللہ کے اختیار میں ہے......

تو امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا

☆محقق عرفاء کی بات کا صحیح معنٰی مراد لیں

كَلِمَةُ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا الْبَاطِلُ...... (۱۳)

(خوارج کی زبان پر) جو الفاظ ہیں وہ حق ہیں لیکن اس سے باطل معنیٰ کا ارادہ کیا گیا ہے......

یہ آیتِ قرآن سے بھی غلط معنیٰ نکال رہے ہیں، یعنی قرآنی آیات سے بھی غلط معنیٰ نکالا جاسکتا ہے، روایت میں ہے کہ اگر ایک شخص قرآن کی آیات میں سے کسی ایک آیت پر عمل کرلے، عمر بھر درست عمل کرلے تو یہ اس کی نجات کے لئے کافی ہے، ایک نے کہا کہ میں تو اول سے ہی ایک آیت پر عمل کررہا ہوں کہ

لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ...... (۱۴)

اس آیت پر عمل کیا ہے اور پابندی کے ساتھ آج تک کبھی بھی نماز کے قریب نہیں گیا ہوں، لہٰذا آیاتِ قرآن اور حدیث سے غلط معنیٰ نکالا جاسکتا ہے چونکہ یہ محققین صوفیاء یا محققینِ عرفاء کی بات ہے تو ان کی مراد کا صحیح معنیٰ کرنا چاہئے، اس سلسلے میں انسان جدلی مزاج نہ اپنائے۔

☆جدلی مزاج، مذہبی دنیا کی ایک اور مشکل

ایک اور بڑی مشکل مذہبی طبقے کے اندر یہی جدلی مذہب ہے، یعنی مذہبیوں کا مزاج ہی جدلیاتی ہوجاتا ہے، جس کے اندر ٹکراؤ ہو، جس کے اندر حقیقت تک پہنچنا مقصود نہیں ہوتا ہے لہٰذا وہ علوم جو جدلی فضا بناتے ہیں وہ زیادہ رائج ہیں اور پررونق تر ہیں، علمِ کلام یہی کام کرتا ہے، لوگ فلسفہ

کی طرف نہیں آتے ہیں چونکہ فلسفہ یہ لڑائی، مار پٹائی نہیں سکھاتا ہے لیکن علمِ کلام یہی سکھاتا ہے کہ آپ نے کیا کرنا ہے، علم کلام خدا پر بھی جھگڑا کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے، اللہ پہ لڑائی کیسے ہوسکتی ہے؟ معاد پہ لڑائی کیسے ہوسکتی ہے؟ نبوت وامامت پہ لڑائی کیسے ہوسکتی ہے؟ علمِ کلام کا ایک مثبت پہلو دفاع از مذہب ہے جو درست ہے لیکن وہ بھی البتہ جھگڑا ہی ہے کہ کسی نے حملہ کیا تو آپ دفاع کرسکیں لیکن علمِ کلام ایک اور چیز بھی بتاتا ہے کہ آپ دوسرے پر حملہ کیسے کرسکتے ہیں؟ یہ جدلی علم ہے، یہ محض جدلیاتی مزاج بھی بنادیتا ہے، ہم جو عقائد پڑھتے ہیں وہ بھی اکثر جدلی کتب سے پڑھتے ہیں، جوں ہی عقائد کی دنیا میں وارد ہوتے ہیں تو اس سے پہلے کہ اپنا عقیدہ پڑھیں پہلے دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔

جس طرح سے ہمارے منبروں پر رائج ہے کہ اہلبیتؑ کے فضائل سے مراد دوسروں پر حملہ کرنا لیتے ہیں، اس کو فضیلت سمجھتے ہیں، فلاں کی ایسی تیسی، یہ اہلبیتؑ کی فضیلت ہے؟ کس نے کہا کہ یہ فضیلت ہے؟ یہ جدلی ماحول اور جدلی ذہنیت ہے مثلاً ہم اگر قرآن کے فضائل بیان کریں تو کیا پہلے تورات وانجیل پر حملہ کریں گے اور پھر کہیں گے کہ قرآن یہ ہے؟ اور اب تو اہلبیتؑ کے فضائل کیلئے دوسری راہیں ایجاد کرلی ہیں اور اہلبیتؑ کے مخالفین یا منکرین کی سرکوبی کرکر کے نکتے پرانے ہوچکے ہیں، اب کوئی نئی بات بھی نہیں رہی، ان پر جتنے حملے کرسکتے تھے کیے۔

حتیٰ اب یہاں تک نوبت پہنچ آئی ہے کہ جو بہت ہی تعصب آور بات ہے، جدلیاتی ذہن اس طرح سے کام کرتا ہے کہ نئے نئے نکتے نکالو، یہ اس میں انبیاءؑ کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے

ہیں تا کہ اہلبیت علیہم السلام کی فضیلت ثابت ہو، بعض یہ کام کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بارے میں گستاخانہ اور انتہائی نازیبا تعبیریں استعمال کریں گے اور پھر اہلبیت علیہم السلام کی فضیلت ثابت کریں گے اور بعض تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، بعض شرک وکفر کی حد تک آگے بڑھ گئے ہیں، مثلاً امیر المومنین علیہ السلام کو امیر المومنین علیہ السلام ثابت کرنے کے لئے پہلے خدا کو مومن ثابت کرتے ہیں پھر کہتے ہیں خدا مومن ہے اور یہ امیر المومنین علیہ السلام ہیں، معاذ اللہ یہ فضیلت ہے؟ جدلی ذہنیت خطرناک ذہنیت ہے، آپ ساتھ ساتھ یہ موضوع بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ مذہبی دنیا کی مشکلات ہیں یعنی مذہبی دنیا کی جدلی ذہنیت و جدلی مزاج ان کو ایک دوسرے سے ٹکرواتا ہے، اسی سے فرقہ واریت پیدا ہوتی ہے، اسی سے جھگڑے دشمنیاں اور نفرتیں پیدا ہوتی ہیں، اسی سے ایک دوسرے سے دوریاں پیدا ہوتی ہیں، اسی سے مذہبی مذہبی کو برداشت نہیں کرسکتا ہے۔

جن دنوں افغانستان کے اندر طالبان چھائے ہوئے تھے تو ایک صاحب نے طالبان کے بارے میں ایک خوبصورت تبصرہ کیا اور کہا کہ میں سوچتا رہا کہ یہ طالبان یعنی یہ مذہبی طبقہ، یہ مدرسوں کے لوگ، ہمیشہ انکے ذہنوں میں یہ لڑائی جھگڑا اور مار پٹائی کیوں رہتی ہے؟ یہ مارنے کے علاوہ اور کوئی بات سوچتے ہی نہیں ہیں، کہا کہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جب یہ مدرسے میں داخل ہوتے ہیں تو پہلی کتاب یا پہلا علم ان کو صَرف پڑھایا جاتا ہے اور علمِ صرف میں ان کو جو پہلی گردان پڑھائی جاتی ہے وہ ضَرَبَ سے شروع ہوتی ہے، ضرب، ضربا، ضربو، ضربت، ضربتا، ضربن اور اس میں اتنے صیغے ہیں کہ سب کچھ شامل ہے یعنی، ایک مرد نے مارا، دو مردوں نے مارا، سب نے مارا، عورتوں نے مارا،

☆ جدلی مزاج، مذہبی دنیا کی ایک اور مشکل

اس نے مارا، سب نے مارا، اِس کو مارو، اُس کو مارو، مارا گیا، انہوں نے کہا کہ یہ لوگ مارا ماری سے اپنا درسِ دین آغاز کرتے ہیں، اس وجہ سے جب فارغ التحصیل ہوتے ہیں تو ان کا وہی مزاج بنا ہوتا ہے۔

اپنی ذہنیت کو جدلی ذہنیت نہ بنائیں ورنہ آپ کبھی بھی حق تک نہیں پہنچ سکیں گے، آپ یہ طے کرلیں کہ تعصب کے ساتھ کبھی بھی حق تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ ہاں اپنے دفاع کے لئے حق تلاش کرلیں، حق کے دفاع کے لئے دلیل ہونی چاہئے، اس حد تک کہ اگر کوئی حملہ کرتا ہے تو ہم دفاع کرسکیں اور اس حد تک کہ اگر کوئی حق کا جستجو گر ہے تو ہم اس کو قانع کرسکیں، ہمارے پاس دلیل ہونی چاہئے لیکن جدلی ذہنیت نہ ہو۔

☆تقلیدی و جدلی علم حجاب ہے

☆تقلیدی و جدلی علم حجاب هے

☆ فالمراد بالعلم العقاید التی استمر علیها اکثر الناس بمجرد التقلید او مجرد کلمات جدلیة......

محققین کے نزدیک کون سا علم حجاب ہے؟ وہ علم جو انسان نے تقلیداً لیا ہوا ہے یا وہ علم جو جدلی مناظروں سے لیا ہوا ہے، مناظروں میں حق تک پہنچنا مقصود نہیں ہوتا ہے فقط اپنے طرفِ مقابل حریف کو شکست دینا مقصود ہوتا ہے لہٰذا جدل میں کبھی بھی لوگ درپے حق نہیں ہوتے ہیں، سوچ یہی ہوتی ہے کہ میں یہاں شکست نہ کھاؤں اور دوسرے کا منہ بند کرانا مقصود ہوتا ہے لہٰذا

کوئی جدلی مزاج انسان یا جدلی کتب یا جدلی علماء کے ذریعے حق تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا ہے۔ پس تقلیدی علوم یا محض جدلی کلمات حجاب ہیں۔

☆ حررها المتعصبون للمذاهب و القوها اليهم……

مذہب کے متعصب لوگوں نے جن علوم کو تحریر کیا ہے اور انہیں تعلیم دی ہے۔ بعض نے جدلی نظریے، نئے طریقے گھڑنے اور ان کی ترویج کرنے کی فیکٹریاں لگائی ہوئی ہیں کہ اس طرح سے جواب دو، اس طرح سے گھیرو۔ فخرِ رازی، امام رازی اہل سنت کی بہت معروف شخصیت اور ذوالفنون ہیں، ہر علم میں امام رازی کا ایک کارنامہ موجود ہے، ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ فخر رازی نے اپنی خلوت میں گریہ کیا، پھر رونے کا سبب یہ بتایا کہ چالیس سال تک میں ایک غلط مطلب پر معتقد تھا اور چالیس سال بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ بات غلط ہے، بعد میں بعض اہل معرفت، بعض عرفاء جو ان کے معاصر تھے ان تک یہ ماجرا پہنچا کہ اس بات پر امام رازی چالیس سال روئے ہیں کہ ایک مطلب پر عقیدہ تھا اور بعد میں خود ہی معلوم ہو گیا کہ یہ غلط ہے، چالیس سالہ جہالت پر گریہ کیا ہے تو انہوں نے ان کو خط لکھا کہ کیوں اس راستے پہ نہیں آ جاتے ہیں کہ جہاں تمہیں ہر چالیس سال بعد رونا نہ پڑے؟ کیوں عروۃ الوثقیٰ اور وہ راستہ اختیار نہیں کرتے کہ جس میں یہ نوبت ہی نہ آئے کہ انسان ہر چالیس سال بعد گریہ کرے؟ یا ہر چند دن بعد پتہ چلے کہ چالیس سال سے جہالت میں مبتلا ہوں یعنی انہیں کہا کہ ان علوم سے، ان جدلی علوم سے نکلو اور حقیقی علوم کی طرف آؤ، قرآن کی طرف آؤ، دین کی طرف آؤ، حقائق کی طرف آؤ، علوم جدلی کو چھوڑ کر علوم حضوری اور علومِ

☆تقلیدی و جدلی علوم حجاب ہے

☆ فطری وجدلی علم حجاب ہے

شہودی کی طرف آؤ کہ جو نورانیتِ محض ہیں،

☆ و اما العلم الحقیقی الحاصل بالکشف والمشاھدة بنور البصیرة......

لیکن وہ علمِ حقیقی تو حجاب نہیں ہے، وہ علمِ حقیقی جو مشاہدہ وحضور و کشف وشہود سے انسان کو حاصل ہوا ہو وہ حجاب نہیں ہے، البتہ ایک معنیٰ میں وہ بھی حجاب بن سکتا ہے، اس طرح کہ جب انسان کو پنا علم نظر آنا شروع ہو جائے یعنی انسان جب اپنے آپ کو عالم سمجھنا شروع کر دے تو اس وقت وہ علمِ حقیقی بھی حجاب ہو جاتا ہے، فرض کریں کہ کسی نے یہ جدلی علم حاصل نہیں کیا۔ اہل عرفان میں ہی کوئی اپنے آپ کو بڑا عارف سمجھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے پاس جو علم ہے وہ کسی کے پاس نہیں ہے، انسان کو اگر اپنا علم نظر آنے لگے تو یہ بھی حجاب ہے، حجاب کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ جو نظر آنا شروع ہو جائے، اگر انسان کو اپنی انا نظر آنا شروع ہو جائے تو یہ انا حجاب ہے، اگر انسان کو اپنا نفس نظر آنا شروع ہو جائے، میں میں کرنا شروع کر دے تو یہ حجاب ہے، اگر انسان کو اپنے اندر کوئی کمال نظر آنا شروع ہو جائے تو یہ کمال حجاب ہے، جو چیز ہماری توجہ اپنی طرف جذب کر لے وہی حجاب ہے۔

علم نور ہے، نور اپنی طرف توجہ جذب نہیں کرتا ہے بلکہ انسانوں کی توجہ دوسری طرف لیکر جاتا ہے مثلاً اگر یہی نور جو اس کمرے میں موجود ہے کہ جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں لیکن اگر ہم ایک دوسرے کو دیکھنا چھوڑ کر نور کو دیکھنا شروع کر دیں تو یہ نور اس صورت میں حجاب ہے، اگر چہ یہ نورِ حقیقی ہے،

☆ فكيف يكون حجابا؟، وهو عين المقصد و منتهى المطلب.......

یہ کیسے حجاب ہوسکتا ہے؟ جبکہ یہ تو عینِ مقصد اور منتہائے مطلب ہے۔

۳)عربی علوم

☆ و ثالثها: ان يكون مستغرقا بعلم العربية و دقايق الالفاظ، مصروف العمر فی تحقیقها.......

اور تیسرا مانع بیرونی جو انسان کی راہ میں آجاتا ہے وہ طلاب کے لئے مانع ہے کہ آئے تھے قرآن سیکھنے کے لئے اور قرآن سیکھنے کے لئے عربی ضروری ہے لیکن جب عربی سیکھنا شروع کی تو قرآن بھول گئے اور عربی ہی کے ہوکر رہ گئے، اپنی ساری عمر انہوں نے اسی عربیت کے اندر صرف کردی اور عربی میں اجتہاد شروع کردیا، مجتہد در عربی بن گئے اور بعض ایسے ہیں جو مجتہد در نحو ہیں، بعض مجتہد در صَرف ہیں، یہ فقط ایک علم کے مجتہد ہیں، دین وقرآن کی تو نوبت ہی نہیں آتی ہے، تیسرا مانع یہی علومِ عربی ہیں کہ انسان علومِ عربی وادبی میں ہی اپنی ساری عمر خرچ کردے، پوری عمر صرف صَرف ونحو اور قرآن کے قواعد ولغات میں صرف کردے درعین حال معانیٔ قرآن سے غافل رہے، یہ بہت بڑا مانع ہے۔

آپؒ مثال بھی دیتے ہیں کہ جیسے زمخشری ہیں، زمخشری واقعاً شاہکار ہیں، تفسیرِ زمخشری قرآن کے اندر اپنی جگہ ادبی شاہکار ہے لیکن یہی تفسیر باعث بنی کہ زمخشری کو قرآن سمجھ میں نہیں آیا

عربی علوم

اور یہ امام رازی کو بھی پتہ تھا کہ زمخشری کو قرآن سمجھ میں نہیں آیا۔ قرآن پڑھنا آتا تھا، قرآن کا تجزیہ و تحلیل خوب آتا تھا، عربی عبارت کی مبتدا و خبر زمخشری کو بہت دقیق معلوم تھی، زمخشری قرآنی ادبیات یعنی صرف و نحو میں امام بن گئے لیکن ایک آیہ آتی ہے تو زمخشری فوراً جبری ہو جاتے ہیں، ایک آیہ آتی ہے تو زمخشری فوراً معتزلی بن جاتے ہیں، جب معنیٰ آیت کا وقت آتا ہے تو زمخشری گونگوں کی طرح ہیں اور زمخشری وہ مطالب کہتے ہیں کہ جو واقعاً ایک بچہ بھی نہیں کہتا، یہی امام ادب، امامِ صرف و نحو کہ جس نے وہ نقابِ دقیقِ نحوی و صرفی قرآن کے اندر بیان کیے ہیں کہ لوگ حیران ہیں، ابھی تک زمخشری کی امامت ادبیات کے اندر مسلم ہے، اس سے موافق کوئی کام نہیں ہوا ہے اگرچہ دوسروں نے کرنا چاہا لیکن نہیں کر سکے اور اسی لئے امامتِ زمخشری اس مسئلے میں محفوظ ہے لیکن زمخشری قرآن شناس نہیں ہیں، آپ کبھی بھی زمخشری سے معانی نہ لیں، یہ دیکھنا کہ یہ آیت مبتدا ہے، یہ خبر ہے، تمیز ہے، حال ہے، یہ زمخشری سے پوچھ لیں لیکن اس آیہ کا معنیٰ کبھی بھی زمخشری سے نہ پوچھیں چونکہ زمخشری کو اس کام کے لئے خود فرصت نہیں ملی ہے۔

قرآن شناسوں اور قرآن فہموں کے لئے بھی یہ ایک مانع ہے، چونکہ قرآن ہدایت و نور ہے، قرآن کے اندر اسرار و حکمت موجود ہے اور اگر انسان انہی مخارج اور زیر و زبر میں لگا رہے اور وہ بھی تخصصی بحثِ زیر و زبر میں یعنی ایک زیر و زبر یہ ہے کہ ہم صحیح پڑھیں اور جو درست زیر و زبر پڑھ لیتا ہے تو کافی ہے لیکن یہ زیر کیوں ہے؟ اس کی بیس وجوہ ہیں، جب تک وہ بیس وجوہ بھی معلوم نہ ہوں تو کہتے ہیں کہ یہ جنت میں نہیں جائے گا۔ زیر پڑھ دی ہے تو کافی ہے اور اب اس کے معنیٰ کی

طرف آؤ، یعنی اس انسان کے اندر رغبتِ محرک ہے، شوق قرآن تک لے آیا ہے مثلاً ابھی قرآن کے بارے میں حوزۂ علمیہ کا شعبۂ تخصصی موجود ہے، وہاں پر یہی بتا دیتے ہیں مثلاً زمخشری اور فلاں و فلاں کی یہ کتاب سلیبس ہے، یہ کتابیں پڑھ کر انسان متخصصِ قرآن ہو جاتا ہے لیکن اس متخصصِ قرآن سے کہو کہ اقتصادِ اسلامی پر قرآن سے ایک مقالہ لکھو تو وہ کہتا ہے کہ نحو اسلامی تو لکھ سکتا ہوں لیکن اقتصادِ اسلامی نہیں لکھ سکتا، اس سے کہو کہ سیاستِ اسلامی، حکومتِ اسلامی اور عدالتِ دینی پر قرآن سے ایک مقالہ لکھو تو وہ نہیں لکھ سکتا ہے۔ اصل ہدایاتِ قرآنی انہی فرعی کاموں کے آگے پیچھے ہو کر چھپ جاتی ہیں، قرآن فہمی کی راہ میں یہ سب سے بڑے موانع ہیں۔

☆معانی فقط الفاظ میں منحصر نہیں ہوتے

علومِ عربی و ادبی مقدمۂ فہمِ قرآن ہیں البتہ ضرورت کی حد تک کہ ان کے بغیر چارہ نہیں ہے چونکہ قرآن عربی میں ہے اور عربی قواعد و عربی آداب قرآن فہمی اور قرآن شناسی کے لئے ضروری ہیں لیکن ضرورت کی حد تک ہیں، بعض لوگ ترجموں کی مدد سے قرآن کو سمجھتے ہیں، ترجمے کے ذریعے بھی قرآن سمجھ میں آتا ہے لیکن حقِ قرآن ترجموں سے ادا نہیں ہوتا ہے، چونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآن قابلِ ترجمہ نہیں ہے مثلاً ممکن نہیں ہے کہ کوئی قرآن کا ترجمہ کر سکے اس لئے کہ معانی فقط الفاظ میں نہیں ہوتے ہیں کہ ہم الفاظ کو دوسرے الفاظ میں بدل لیں، سیاق کے اندر بھی معانی ہوتے ہیں، ترکیب کے اندر بھی معانی ہوتے ہیں، تنظیم کے اندر بھی معانی ہوتے ہیں اور ربط کے اندر بھی

معانی ہوتے ہیں۔

جس طرح سے آپ ایک تقریر کو تحریر میں لائیں تو اس کے اندر نصف معانی فوت ہو جاتے ہیں، تقریر سے مراد یعنی اگر انسان شفاہی طور پر کچھ مطالب بیان کر رہا ہو تو اس وقت نصف معانی قلم میں لانے سے فوت ہو جاتے ہیں اس لئے کہ جب انسان بول رہا ہوتا ہے تو فقط زبان سے الفاظ ادا نہیں ہوتے ہیں بلکہ انسان کئی زبانوں سے بول رہا ہوتا ہے، ایک الفاظ کی زبان بول رہا ہوتا ہے، ایک اشارے کی زبان بول رہا ہوتا ہے، ایک اعضاء وجوارح کی زبان بول رہا ہوتا ہے، کئی زبانیں آنِ واحد میں بول کر وہ اپنے مطالب ومفاہیم کو ادا کر رہا ہوتا ہے، یہ چیز آج کل دنیا میں بھی رائج ہے اور اس پر بعض دنیاوی امور کے حصول کے لئے تاکید بھی کی جاتی ہے مثلاً جن کا کام مارکیٹنگ (Marketing) ہے ان کو ایک زبان سکھائی جاتی ہے کہ جو باڈی لینگویج (Body language) کہلاتی ہے، ہمارا دینی ادب یہ ہے کہ بالکل آرام سے، سکوت کے ساتھ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاؤ، اگر عورت کے ساتھ بات کر رہے ہو تو نیچے دیکھو لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ گفتگو کا نامعقول ترین طریقہ ہے، مارکیٹنگ کی دنیا میں کہتے ہیں کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو چونکہ انسان آنکھوں سے بھی گفتگو کر رہا ہوتا ہے، جب آپ کسی کی نگاہ میں نگاہ ملا کر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو اس کا اور اثر ہوتا ہے، جب نگاہ جھکا کر بات کرتے ہیں تو اس کا اثر کچھ اور ہوتا ہے اور پھر آپ تبسم کے ساتھ گفتگو کریں، تبسم کا خود ادائیگی میں ایک دخل ہوتا ہے، انسان کا تبسم ایک معنیٰ ادا کر رہا ہوتا ہے اور جب آپ بول رہے ہوتے ہیں تو پورے وجود کے ساتھ بولیں، پورے جسم کے

ساتھ بولیں لہٰذا آپ مغربی طرزِ تخاطب دیکھیں تو وہ بولتے ہوئے پورے وجود سے بول رہے ہوتے ہیں لیکن مشرقی طریقۂ گفتگو محجوب اور شرمیلا طریقہ ہے، حتیٰ مرد اگر مرد کے ساتھ بھی گفتگو کر رہا ہوتا ہے تو ایسے جیسے کسی عورت کے ساتھ بات کر رہا ہے۔

چنانچہ مشرقی طریقہ ہو یا مغربی طریقہ، محجوب طریقے سے بولیں یا غیر محجوب طریقے سے لیکن انسان کا لہجہ اور اعضاء و جورح بھی معانی ادا کر رہے ہوتے ہیں مثلاً آپ ایک شخص کو گفتگو کرتے ہوئے دیکھیں، اس کے چہرے کی بناوٹ، اس کے چہرے کی رنگت، اس کی حرکات وسکنات، اس کی آنکھوں کی حرکت، اس کی نگاہ کا انداز، اس کے ہاتھوں کا انداز، یہ سب کچھ معانی ادا کر رہا ہوتا ہے اور جب اسی گفتگو کو قلم میں لاتے ہیں تو یہ سارے معانی وہاں فوت ہو جاتے ہیں چونکہ یہ اندازِ گفتگو ضبطِ تحریر میں نہیں آتا مثلاً نہج البلاغہ کے خطبے جو امیر المومنین علیہ السلام نے بیان کئے ہیں اگر یہ خطبہ شقشقیہ انسان وہاں سامنے بیٹھ کر سن رہا ہوتا یا کمیلؒ جس طرح سے مطالب نقل کرتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام نے میرا بازو پکڑا اور پھر اپنے سینے پہ ہاتھ مارا اور پھر فرمایا کہ

اِنَّ هَاهُنَا لَعِلْماً جَمّاً......(۱۵)

تحقیق یہاں اس جگہ علم کا ٹھاٹھے مارتا سمندر ہے......

امیر المومنین علیہ السلام کا انداز اور چہرے کے تاثرات معانی ادا کر رہے ہوتے ہیں مثلاً انسان کبھی سنجیدگی سے بول رہا ہوتا ہے، کبھی شوخی میں بول رہا ہوتا ہے، کبھی غصے میں بول رہا ہوتا ہے، کبھی حیرت میں بول رہا ہوتا ہے، یہ سب انسان کے چہرے کا انداز بتاتا ہے، اسی طرح سے قرآن کی عربی

زبان میں ایک خاص ترکیب یا خاص ادائیگی ہے، قرآن کچھ معانی ومطالب الفاظ کے ذریعے سے ادا کرتا ہے، کچھ مطالب اپنی بندش، ترتیب، تنظیم الفاظ وسیاق کے ذریعے سے ادا کر رہا ہوتا ہے اور جب ہم اس کو دوسری زبان کے قالب میں تبدیل کرتے ہیں تو وہ ساری حقیقت فوت ہو جاتی ہے لہٰذا قرآن پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ عربی سیکھ لیں۔

☆عربی ضرور سیکھیں لیکن افراط و تفریط کے بغیر

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے کہ جو ہمارے لئے ہدایت کی کتاب ہے اور ہماری دنیوی واخروی فلاح کی ضامن ہے لیکن قرآن سے ہدایت صحیح معنوں میں اسی وقت لیں سکتے ہیں کہ جب عربی سے آشنا ہوں لہٰذا عربی زبان ضرور سیکھیں۔ کیا حرج ہے عربی سیکھنے میں؟ انگریزی سیکھ لیتے ہیں کہ جس کے اندر فقط ملازمت ہے۔ آیا ملازمت کے لئے بچہ پیدا ہوتا ہے؟ بلکہ ابھی تو انگریزی اسکولوں میں بچے کی پیدائش سے پہلے داخلے شروع ہو گئے ہیں، بعض ایسے اسکول ہیں کہ جوں ہی نطفہ منعقد ہوتا ہے اسی وقت جا کر ایڈمیشن (Admission) کروائیں تو ٹھیک ہے ورنہ پیدا ہو کر داخلہ نہیں ملے گا، بچے کو پانچ سال بعد اسکول جانا ہے لیکن داخلہ ابھی جا کر کروائیں۔

انگریزی کے لئے اتنا اہتمام کرتے ہیں، ایسی زبان کہ جس کے اندر کوئی مطالب، کوئی معانی کچھ بھی نہیں ہیں، معارف و ہدایت نہیں ہے بلکہ اس کے اندر صرف ملازمت ہے اور اپنے تئیں اسٹیٹس (Status) ہے، متدین ترین مسلمان کی کوشش اور آخری آرزو یہی ہوتی ہے کہ میرا

بچہ انگریزی سیکھ جائے اور جس دن انگریزی میں ماں باپ کو یاد کرتا ہے، مما، پپا کہتا ہے تو وہ اس دن پھولے نہیں سماتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کم از کم اس بچے کے بارے میں تو کامیاب ہو گئے ہیں، فزت و ربّ الکعبۃ، جب وہ انگریزی بولتا ہے، اس دن وہ کہتے ہیں کہ ہم کامیاب ہو گئے، موفق ہو گئے، بچہ انگریزی بولنا شروع ہو گیا ہے لیکن جو آپ کی ہدایت کی زبان ہے، جو آپ کی سعادت کی زبان ہے، جس کے اندر قرآن ہے اس کی سرے سے کوئی فکر ہی نہیں ہے۔

☆ عربی فہم و درک میں عربیت لیکن افراط و تفریط سے گریز

عربی سیکھنے کے لئے یہی ایک محرک کافی ہے کہ اس کے اندر قرآن ہے۔ یہ کلامِ خدا کی زبان ہے پھر زبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، زبانِ ائمہ علیہم السلام ہے، ایک طرف سے ہم ائمہ اہل البیت علیہم السلام کے ساتھ اتنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف سے ائمہ علیہم السلام کی زبان سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، قرآن کی زبان سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ضروری ہے کہ انسان ان ادبی علوم سے آشنا ہو اور دیگر علوم بھی جو ابھی ذیل میں اشارہ ہوں گے لیکن افراط نہ کرے، اس طرح سے نہ ہو کہ اگر میں نے قرآن کی عربی کی مشکل حل کر لی تو بس کلِ قرآن میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ بسا اوقات یہی قواعدِ عربی فہمِ قرآن میں مانع بن جاتے ہیں کہ جیسے مثال بھی دی تھی کہ جو کام زمخشری نے انجام دیا ہے، مشکلِ عربی حل کر کے، قرآن کی عبارتوں کی تصحیح و اعراب و بنا و مبتدا و خبر بیان کر کے چھوڑ دیا کہ بس قرآن حل ہو گیا، اب پیچھے کیا کام رہ گیا کہ میں بیان کروں مثلاً

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کی کئی ترکیبیں اور کئی تجزیے بیان کر کے چھوڑ دیئے کہ بس بسم اللہ حل ہو گئی، بسم اللہ میں

اور کیا رہ گیا؟ اب کیا بیان کریں گے؟ یہ خود فہمِ قرآن میں ایک مانع بن جاتا ہے، البتہ یہ مسئلہ عوام کو درپیش نہیں ہے، عوام کو برعکس معنیٰ درپیش ہیں کہ انہیں سرے سے اصلاً قواعدِ عربی ہی معلوم نہیں ہوتے ہیں، یہ مانع اہلِ علم کو، مدرسے والوں کو درپیش ہیں کہ عربی پڑھ کر وہ ہیں فارغ التحصیل ہو جاتے ہیں، یہ قواعدِ عربی اور صرف ونحو دین کی راہ میں بھی مانع ہیں اور قرآن کی راہ میں بھی اس لحاظ سے مانع ہیں کہ بعض علومِ عربی پڑھ کر وہ ہیں پر حجۃ الاسلام ہو جاتے ہیں کہ بس ہم دین سیکھ گئے، سیوطی تک تو دین نہیں ہے، سیوطی تک تو فقط مبتدا وخبر اور کچھ چیزیں ہیں، کتنے سارے لوگ ہیں کہ جو سیوطی پڑھ کر فارغ التحصیل ہو گئے ہیں؟ سیوطی سے آگے نہیں پڑھا لیکن حجۃ الاسلام ہیں، ان کو حجت الادب کہہ دیں، ان کو حجۃ العرب کہہ دیں، ان کو کوئی اور نام دے دیں تو ان پر جچتا ہے لیکن عربی پڑھ کر یہ اسلام کی حجت کیسے بن گیا؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس کو نحو نہیں آتی، صَرف نہیں آتا تو وہ جنتی ہو ہی نہیں سکتا ہے، مولانا روم نے ایک نحوی کا قضیہ ذکر کیا ہے کہ ایک نحوی سمندری سفر کر رہا تھا، یہ مجتہد در نحو اَصالتِ نحو کا قائل تھا یعنی دین وایمان وتوحید ومعاد سب اس کی نحو تھی، راستے میں اس نے کشتی میں ملاح سے پوچھا کہ اے ناخدا تجھے نحو آتی ہے؟ اس نے کہا نہیں مجھے نحو نہیں آتی ہے، میں تو ساری عمر بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کشتی چلاتا رہا ہوں تو اس نحوی نے کہا کہ تیری آدھی عمر ضائع ہو گئی ہے، تباہ ہو گئی ہے، تو وہ پریشان ہوا کہ سمندر میں ہی میری آدھی عمر تباہ ہو گئی اور نحو نہیں پڑھ سکا، تھوڑا سا آگے چلے تو طوفان آگیا اور موجیں اٹھنا شروع ہو گئیں تو اب ناخدا نے نحوی سے پوچھا کہ جناب نحوی تیرنا آتا ہے؟

☆ عربی ضرور، تعصب لیکن افراط و تفریط سے گریز

انہوں نے کہا کہ یہ تو نہیں آتا ہے، ملّاح نے کہا کہ تمہاری ساری عمر تباہ ہوگئی۔ اب یوں نہیں ہے کہ انسان انہی علوم کا ہو کر رہ جائے، بقدرِ ضرورت لازمی ہے، عربی کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا لہذا بقدرِ ضرورت سیکھے۔

☆مقصودِ اصلیٔ قرآن

☆**فان المقصود الاصلی من انزال القرآن لیس الا سیاقة الخلق الی جوار اللّٰہ بتکمیل ذواتھم و تنویر قلوبھم بنور معرفة اللّٰہ و ایاتہ......**

نزولِ قرآن سے مقصود یہ تھا کہ یہ خلق کو جوارِ خدا میں لے جائے، تکمیلِ ذاتِ انسان مقصود تھا، معرفتِ خدا سے اور آیاتِ کریمہ کے نور سے انسانی نفوس اور دلوں کو نورانی کر کے قربِ خدا عطا کرنا مقصودِ اصلی قرآن ہے،

☆ **دون صرف الاوقات فی نحو الکلام و تحسین الالفاظ و علم البلاغة و فن البدیع،**

اسلیئے نازل نہیں ہوا تھا کہ ہم قرآن کے بہانے سے الفاظ سے متعلقہ دیگر علوم کو حاصل کرنا شروع ہو جائیں مثلاً حسن الفاظ و علمِ بلاغت و فنِ بدیع وغیرہ، کہتے ہیں کہ ادبیات کے چودہ علم ہیں پھر بعض نے اس میں عروض و دیگر علوم بھی بیچ میں شامل کر لئے ہیں کہ اگر ایک انسان انہی میں ساری عمر صرف کر دے تو وہ کہیں نہیں پہنچ سکتا ہے،

☆مقصودِ اصلیٔ قرآن

☆ فان ذلک من التوابع التی بها یقع الاحتجاج علی المنکرین......

یہ علوم توابع یعنی لوازم ہیں اور ضمنی چیزیں ہیں کہ ان کو از بر رکھو تا کہ اگر کسی دن کسی کو قرآن سمجھ نہ آیا تو آپ قاعدۂ ادبی کے ذریعے سے اس کو سمجھا سکو اور قائل کر سکو، فقط اتنی حد تک،

☆ واما الاستبصار لمعانی ایات القرآن فیکفی لها دون ما بلغ الیه الزمخشری واترابه......

لیکن آیاتِ قرآن میں لفظی بحثیں کرنا اور ادبی علوم میں تدقیق کرنا جیسے زمخشری، پیروانِ زمخشری وہم فکرانِ زمخشری نے کیا ہے یہ درست نہیں ہے،

☆ واستفرغوا اوقاتهم......

اورانہوں نے اپنا سارا وقت اسی میں صرف کر دیا،

☆ وبذلوا غایة سعیهم وجهدهم فیه......

اور انہوں نے اپنی ساری غایت، کلِ کوشش ونہایتِ جہد انہی الفاظ میں صرف کر دی مثلاً زیر، زبر میں، مبتدا وخبر میں اور نحوی وصرفی مسائل میں،

☆ فلاجرم حجروا المعانی الاصلیة وحرموا عن جدوی الکلام.

نتیجہ یہ ہوا کہ زمخشری کے کلام میں آپ کو آیت کا معنیٰ کہیں بھی نہیں ملے گا، جیسے آپ کسی بیوٹی پارلر میں چلے جائیں کہ جہاں آرائش وتزئین ہوتی ہے یا ایسی دکان کہ جہاں آرائش کا سامان بکتا ہے تو وہاں پر آپ کو کوئی چیز کھانے کی نہیں ملے گی مثلاً بیوٹی پارلر میں آپ آئسکریم مانگیں تو وہاں

نہیں ہوگی، کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے چونکہ سب آرائش کا سامان ہے، اسی طرح سے زمخشری نے قرآن کی آرائش وزیبائش الفاظ کی چیزیں پیش کی ہیں لیکن آپ کو وہاں پر معانی نہیں ملیں گے۔

٤)تفاسیر پر جمود

☆ورابعها: الجمود والوقوف علی ما قرأه من التفاسير......

قرآن فہمی میں ایک بہت بڑا مانع تفاسیر بھی ہیں البتہ اس سے کوئی یہ مطلب نہ نکالے کہ اب ہم نے کوئی تفسیر نہیں پڑھنی ہے۔ تفسیر پڑھنی ہے، تفسیر کو راہنمائی کے لئے پڑھیں، معلم کے طور پر پڑھیں، جس طرح سے آپ نے دوسری کتابیں پڑھی ہیں تو وہ اس لئے تو نہیں پڑھی ہیں کہ ہم انہی کتابوں کے اسیر ہو کر رہ جائیں گے کہ جو ان کتابوں میں ہے وہ حق ہے اور جو ان کتابوں میں ہے وہ کچھ نہیں ہے اور اس میں کسی کو اظہار کا حق نہیں ہے مثلاً فرض کر لیں کہ ہم نے تاریخ کی کتاب پڑھی ہے تو اس تاریخ کی کتاب میں جو بات لکھی ہے وہ درست ہے اور اس کے علاوہ کوئی چیز درست نہیں ہے یا ریاضی کی لیٹسٹ (Latest) کتاب پڑھی ہے تو کوئی یہ نہیں کہتا ہے کہ پہلے ریاضی کی کتاب میں یوں لکھا ہوا تھا تو بعد میں اس طرح کیوں لکھا ہوا ہے؟ یہ کوئی نہیں کہتا ہے کہ جو اس میں لکھا ہوا تھا میں وہ مانوں گا اور اس کے علاوہ دوسری چیز نہیں مانوں گا۔ کچھ لوگ قرآن نہیں پڑھ سکتے ہیں مثلاً ایک رسم الخط میں قرآن ہے تو فقط اسی رسم الخط میں پڑھ سکتے ہیں اور دوسرے رسم الخط سے ان سے قرآن قرأت بھی نہیں ہوتا ہے، تفاسیر سے راہنمائی ضرور لیں اور یہ دیکھیں کہ اس مفسر کو کیا

سمجھ آیا ہے، اس نے آیات سے کیا استنباط کیا ہے؟ لیکن راہنمائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں خود غور نہ کروں۔

تفاسیر پر جمود

بعض سابقہ بزرگان نے تفاسیر لکھیں ہیں اور ان کو یہ کام کرنا بھی چاہئے تھا لیکن یہی تفاسیر اب قرآن فہمی میں ایک مانع کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ ایک رکاوٹ ہیں، کونسی تفاسیر؟ جن کو انسان پڑھتا تو ہے لیکن خود تدبر نہیں کرتا، اس میں قصور تفاسیر کا نہیں ہے بلکہ خود انسانِ مقلد کا قصور ہے، تفاسیر راہنمائی لینے کے لئے ہیں، یہ اسلئے ہیں کہ بالآخر دیکھیں کہ دوسروں نے اس بارے میں کیا کہا ہے؟ لیکن جو انسان تفاسیر کا مطالعہ اس لئے کرے کہ مجھے کچھ نہیں کرنا ہے تو یہ رکاوٹ ہے لیکن اگر انسان ساری تفاسیر دیکھے کہ یہ دوسروں نے کہا ہے اور اب میں قرآن سمجھتا ہوں، میں اس آیت میں غور کرتا ہوں، میں دیکھوں کہ مجھے کیا بات سمجھ میں آتی ہے یا انہی لوگوں نے جو کچھ راہنمائی کی ہے اس راہنمائی کے روشنی میں اب میں قرآن سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس لحاظ سے تفاسیر خوب ہیں یعنی اگر فہم میں مدد دیں اور معاونِ فہم بنیں۔

لیکن اگر تفاسیر ہمیں روک لیں اور ایک جگہ پر جمود اختیار کر لیں مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص نے آکر آیت کا معنیٰ کیا ہے تو اس سے سب سے پہلے دوسرے بھی یہ سوال پوچھتے ہیں یا اس کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے مفسرین سے نقلِ قول کرے کہ انہوں نے اس بارے میں کیا کہا ہے؟ اور خصوصاً قدماء حرام سمجھتے ہیں کہ ابنِ عباس، مجاہد، قتادہ، مقاتل اور چند افراد کے علاوہ کسی اور کا نقلِ قول بھی کریں، کہتے ہیں کہ آپ نے قرآن میں بدعت کی ہے کیونکہ ابنِ عباس اور ان چند افراد کے

علاوہ کسی کا نقلِ قول بھی نہیں کر سکتے ہیں، یہ جمود اور تقلید انسان کو قرآن سمجھنے سے روکتے ہیں درعینِ حال تفسیر بالرائے نہیں کرنی ہے، تفسیر بالرائے ایک لغزش گاہ ہے لیکن تفسیر بالرائے کی بھی وضاحت کی ضرورت ہے، صدرالمتالھینؒ نے اسی کتابِ مفاتیح الغیب میں فصلِ ''الفاتحة الثالثة'' کے اندر تفسیر بالرائے کی وضاحت بھی کی ہے لہٰذا قارعین وہاں رجوع کر سکتے ہیں۔

مفسرین قرآن میں غور کرنے کے اعتبار سے ہمارے نائب نہیں ہے، یہ نیابت اگر کسی نے دی ہوئی ہے تو غلط ہے، بارہا یہ عرض کیا ہے کہ دین میں نیابت درست نہیں ہے کہ مثلاً ہم لوگ حوزوں میں بیٹھے ہوئے ہیں تو عوام کے نائب بن کر دین سمجھ رہے ہیں اور عوام ہماری نیابت میں دنیا کما رہی ہے۔ نہ وہ نیابت درست ہے اور نہ یہ نیابت درست ہے بلکہ یہ واجبات ہیں، یہ واجبات آپ نے خود ادا کرنے ہیں، جس طرح سے اپنی نماز خود پڑھنی ہے اس میں اپنا نائب نہیں بنا سکتے ہیں اسی طرح سے دین سیکھنا، قرآن سیکھنا ہر ایک کا فریضہ ہے، یہ فریضۂ عینی ہے نہ کہ کفائی کہ ایک نے قرآن پڑھ لیا تو سب کیلئے کافی ہے، اگر ایک بچہ ایران میں الٹا حافظ بن گیا تو بس وہ پوری شیعہ قوم کے لئے کافی ہے۔ بلکہ فرد فردِ مسلم کو، عورت، مرد، بچے اور بوڑھے ہر ایک کے لئے واجب ہے کہ قرآن سمجھتا ہو، یہ نیابت نہیں دی جا سکتی ہے کہ طلباء بیٹھے ہوئے ہیں، علماء بیٹھے ہوئے ہیں، ہم ان کیلئے دعا کرتے ہیں اور وہ ہماری نیابت میں قرآن پڑھ رہے ہیں اور انہی سے شب قدر کو ٹیلیفون اور ایس ایم ایس (SMS) پر التماسِ دعا کہتے ہیں،

☆ الجمود والوقوف علىٰ ما قرأه من التفاسير ......

جمود

یعنی تفاسیر میں جو پڑھا ہے اسی پر رک جائے اور وقوف کرے،

☆ و ان یعتقد ان لا معنی لکلمات القرآن الاما یتنا وله علی النقل عن ابن عباس و قتادہ و مجاھد و مقاتل و غیرھم......

یعنی ابن عباس نے جو کہا ہے بس وہی درست ہے، اگر ابنِ عباس، قتادہ، مجاہد، مقاتل اور چند افراد سے ہٹ کر کسی نے کچھ کہا تو یہ درست نہیں ہے، ایک مدت تک تشیع میں یہ مشکل تھی، شیخ طوسیؒ نے جو کچھ کہا ہوا تھا سو سال تک اس کے خلاف کسی کو اظہار کی جرأت نہیں تھی تا اینکہ خود شیخِ طوسیؒ کے خاندان سے ہی ابن ادریس نامی دلیر آدمی پیدا ہوا اور انہوں نے آ کر اپنے ہی جد کے نظریات کو نقد کیا اور لوگوں سے کہا کہ یہ کر سکتے ہو، تشیع کے اندر شیخ طوسیؒ ایک منفرد شخصیت ہیں، واقعاً منفرد شخصیت ہیں، آپ شیخ طوسیؒ کو تشیع کا محافظ کہہ سکتے ہیں لیکن یوں نہیں ہے کہ جو کچھ شیخ طوسیؒ نے کہا ہے بس ہم نے اسی پر جم جانا ہے اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔

☆تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء

☆ وان ماوراء ذلک تفسیر بالرأی......

تفسیر بالرائے بھی ایک کوڑا بن گئی ہے، تفسیر بالرائے کوڑا بنا کر برساتے ہیں، ہر وہ شخص جو قرآن پڑھنے کی طرف آتا ہے اور کوشش کرتا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ تم تفسیر بالرائے کرتے ہو حالانکہ خود تفسیر بالرائے کا معنیٰ بھی نہیں پتہ ہے کہ یہ ہوتی کیا ہے؟ اور اگر کوئی اظہارِ نظر کرے، کوئی انسان

غور وفکر کرے تو کہتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کر رہے ہیں،

☆ **و ان من تجاوز عن النقل منهم......**

یعنی جو یہ نہ کہے کہ ابن عباس نے یہ کہا ہے، ابن مسعود نے یہ کہا ہے اور سابقہ تاریخی قدیم مفسرین نے یہ کہا ہے تو اس کو فوراً کہتے ہیں کہ یہ تفسیر بالرائے کر رہا ہے،

☆ **فورد عليه مفاد: من فسر القرآن برأيه فقد تبوء مقعده من النار......**

رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث ہے کہ جس نے بھی قرآن کو اپنی رائے سے تفسیر کیا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ درست ہے، تفسیر بالرائے جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے، ممنوع ہے لیکن تفسیر بالرائے ہے کیا؟ تفسیر بالرائے کو تدبّر در قرآن کرنے والوں پر کوڑا بنا کر استعمال نہ کریں، لوگوں کی قرآن میں تدبر نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم سے تفسیر بالرائے نہ ہو جائے، آپ یہ نہ کہیں اور یہ کوڑا استعمال نہ کریں بلکہ لوگوں کو رغبت دلائیں اور تفسیر بالرائے کا معنی اور معیار بیان کریں کہ یہ تفسیر بالرائے ہے اور فقط اس سے پرہیز کرنا ہے،

☆ تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء

☆ **فهذا ايضاً من الحجب العظيمة التى اوقعها الشيطان...**

یہ بھی ایک حجاب ہے کہ انسان کہے کہ جو قدماء نے کہا ہے وہی درست ہے اور آج ہم نے غور وتدبر نہیں کرنا ہے اور اگر کسی نے قدماء سے ہٹ کر کچھ کہہ دیا تو یہ تفسیر بالرائے ہے، یہ بھی شیطانی القاء ہے،

☆ **ليصرف قلوب الكثيرين عن فهم معانى التأويل و انوار التنزيل......**

چونکہ شیطان نہیں چاہتا ہے کہ بنی آدم قرآن سے آشنا ہو، قرآنی نور ان کے دلوں میں اترے، ہر اچھے برے بہانے سے قرآن سے روکتا ہے، کسی کو روک لیتا ہے کہ ابھی ڈرامہ ہو رہا ہے کیا ضرورت ہے قرآن پڑھنے کی؟ ابھی فلم لگی ہوئی ہے اس طرف جاؤ، پہلے مزاج دیکھتا ہے کہ اس کو قرآن سے روکنے کے لئے کونسا حربہ درست ہے اور بعض کو روکتا ہے کہ خوب ڈرامے چھوڑ کر آ گیا ہے تو اب فقط مخرج ٹھیک کر باقی سارا معاملہ حل ہے، فقط تمہاری مخرج کی مشکل ہے، بعض کو کہتا ہے کہ صرف ونحو کی حد تک رک جاؤ اور بعض کو کہتا ہے کہ اگر آپ نے قرآن میں غور کیا تو تفسیر بالرائے ہو جائے گی اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ تفسیر بالرائے تمہیں جہنم لے جائے گی،

☆ و عدم قبولهم اياها عن اهل المكاشفات القرآنية.....

مکاشفات وحقائق اور اسرارِ قرآنی شیطان قبول نہیں کرنے دیتا ہے،

☆ وسيأتى اماطة، هذا الحجاب......

فرماتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کا حجاب کس طرح سے مرتفع ہو؟ ہم انشاء اللہ بعد میں کسی مناسبت سے اس پر مفصل بحث کریں گے، البتہ آدابِ قرآن کے بعد، آدابِ قرآن میں یہ بحث نہیں آئے گی، آدابِ قرآن کی فصل کے بعد جو فصل اس کتاب میں شروع ہوتی ہے وہ اسی بارے میں ہے کہ تفسیر بالرائے کیا ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں؟ اور تفسیر بالرائے اور تدبر میں کیا فرق ہے؟

☆ وفک هذه العقدة ببيان المعنى المراد من التفسير بالراى......

ہم یہ عقداء کھولیں گے کہ تفسیر بالرائے سے مراد کیا ہے؟ اور ممنوعہ چیز کونسی ہے؟

☆ **و ان ما فهموه يناقض قول امير المؤمنين عليه السلام:.......**

اور یہ جوانہوں نے سمجھا ہے کہ تفسیر بالرائے سے قرآن نہیں پڑھنا چاہئے اور قدماء کے علاوہ کوئی بات نہیں سوچنی چاہئے، تفکر نہیں کرنا چاہئے تو یہ امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کے صریح خلاف ہے، کلامِ امیر المومنین علیہ السلام میں اور ان لوگوں کی ذہنیت میں تضاد ہے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ قدماء کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کرو، امیر المومنین علیہ السلام نے کیا فرمایا ہے؟

☆ **الا ان يؤتي العبد فهماً في القرآن......**

امیر المومنین علیہ السلام نے علامت بتائی ہے یعنی انسان اس وقت موردِ لطفِ خدا واقع ہوتا ہے کہ جب اپنے اندر احساس کرے کہ خدا نے اس کو فہمِ قرآن عطا کردی ہے،

☆ **و انه لو كان المعنى مقصوراً على الظاهر المنقول، لما وقع فيه الاختلاف بين الناس.**

اور یہی معنیٰ جو ظواہر میں ہے اگر یہی تھا تو پھر تو اختلاف کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک اِس طرح سے قرآن کا معنیٰ کرے ایک اُس طرح سے قرآن کا معنیٰ کرے، ہر ایک کا فریضہ ہے کہ قرآن کو خود ذاتاً سمجھے۔ اپنے باقی سارے کام خود کرتے ہیں، سانس ہم خود لیتے ہیں، آکسیجن خود سونگھتے ہیں، افطار خود کرتے ہیں، سحری خود کھاتے ہیں، یہاں نہیں کہتے کہ جب مدرسے میں بیٹھے ہوئے ہیں تو ہمیں خود سانس لینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ وہ واجبات ہیں کہ جو آپ کی بقا اور حیات کے لئے ضروری ہیں، فرد فرد کو قرآن کی طرف رجوع کرنا ہے، فرد فرد آئے اور اپنے آپ کو قابلِ قرآن، اہلِ

قرآن اور مخاطبِ قرآن بنائے۔

ان موانع کے علاوہ بھی دیگر بہت سے موانع فہمِ قرآن کی راہ میں حائل ہیں اور انسان جب تک ان موانع سے اپنا پیچھا نہیں چھڑاتا ہے تو قرآن فہمی کے مراحل میں آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ ہم دیگر موانع کو اس فصل کے حصہ سوم سے فہرست وار بیان کریں گے اور ان کی مختصر سی تشریح بھی کی جائے گی۔

حوالہ جات

(۱)....(سورۂ مبارکہ طلاق، آیہ ۷)

(۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۸۶)

(۳).... (تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ) (التفسیر الصافی - الفیض الکاشانیؒ، الجزء ۱، صفحی ۱۳۴) (روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، المعروف تفسیر الألوسی - شهاب الدین محمود بن عبد اللّٰہ الحسینی الألوسیؒ) (پرتوی ازاسرار نماز) (بحار الأنوار - العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۸۰، صفحہ ۱۶۱) (سنن النبی ﷺ - السید الطباطبائیؒ، الجزء ۱، صفحہ ۲۳۵)

(۴).... (الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی، الجزء ۱۶، صفحہ ۳۷۰) (تفسیر القمی - ابی الحسن علی بن ابراهیم القمیؒ) (وسائل الشیعة - الفقیہ المُحَدّثِ الشیخُ مُحمّدْ بن الحسن الحُر العاملیؒ، الجزء ۱۷، صفحہ ۳۱۰) (معجم أحادیث المهدیؑ) (بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسی " قدس اللّٰہ سرہ ". الجزء ۶، صفحہ ۳۰۸) (مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازی، الجزء ۸، صفحہ ۴۸۹)

(۵)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۴۳)(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ ۷)

(۶)......(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ ۲۲)(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ ۲۳)

(۷)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۷۰)

(۸)......(تحریرات فی الأصول - السید مصطفی الخمینیؒ، الجزء ۱، صفحه ۹۱)
(شبی در پایتخت بهشت، الجزء ۵، صفحه ۲۸)

(۹)......(سورۂ مبارکہ طٰہٰ، آیہ ۱۲)

(۱۰)......(باطن و تأویل قرآن، الجزء ۶، صفحه ۱)(علوم طبیعت در قرآن، الجزء ۲، صفحه ۷)(شرح أصول الكافی - مولی محمد صالح المازندرانی، الجزء ۳، صفحه ۹۴)(نهج البلاغة - الشیخ محمد عبده، الجزء ۴، صفحه ۱۱)(الأمالی للطوسیؒ، الجزء ۲، صفحه ۲۱۳)
(میزان الحكمة - الريشهری، الجزء ۲، صفحه ۳۲۷)

(۱۱)......(تهذیب الاحكام فی شرح المقنعة للشیخ المفید رضوان الله علیه - الشیخ الطوسیؒ، الجزء ۳، صفحه ۱۰۹)(بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۸۸، صفحه ۱۷۵)(علیؑ فی الكتاب والسنة والادب)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۵۷)(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ ۴۰)(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ ۶۷)

(۱۳)......(شرح أصول الكافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء ۸، صفحه ۳۲۷)(ترجمه نهج البلاغه - انصاریان، الجزء ۱،

صفحه ۱۵۲)(شرح نهج البلاغة - الحائری)(الگوهای رفتاری امام علی علیه السّلام)(مناقب أمیر المؤمنینؑ)(جاذبه و دافعه علیؑ - شهید مرتضی مطهریؒ، الجزء ۱، صفحه ۱۵۶)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۴۳)

(۱۵)......(الانسان الکامل فی نهج البلاغة)(تصحیح القرائة فی نهج البلاغة)(شرح نهج البلاغة-الدخیل)(فی ظلال نهج البلاغة)

فصلِ ادبِ ششم

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصّہ سوم)

۱)قلبی میلانات،لھوو لعب

۲)عدم تدبر در آیات

۳)قرآن کی صحیح معرفت کا نہ ہونا

☆استخارے کی حقیقت

٤)وھم وخیال

٥) زودباوری اورشکاکیت

٦)ظاھر بینی

۷)ھویٰ و ھوس

۸)دنیا پرستی

۹)غرور و تکبر

۱۰)تنگ نظری

۱۱)دنیوی افکارو نظریات سے متاثر ذھن

۱۲)سائنس زدہ ذھن

۱۳)عوام زدگی

جو موانع قرآن کی راہ میں اور فہمِ قرآن کی راہ میں موجود ہیں ان میں سے کچھ مفاتیح الغیب میں بیان کیے گئے ہیں اور بعض دوسرے منابع مثلاً روایات اور خود قرآن سے مستنبط ہیں، یہاں موانعِ فہمِ قرآن کی ایک فہرست درج کی جارہی ہے اوران کی مختصر سی تشریح بھی ہوگی۔

۱)قلبی میلانات،لھو و لعب

قرآن فہمی کی راہ میں مانعِ دیگر جوانسان کے دل کے اندر موجود ہے وہ قلبی میلات ہیں، یہ سلبی وعدمی نہیں ہیں بلکہ وجودی اور ثبوتی چیزیں ہیں لیکن دل کے اندر موجود ہیں، جیسے دلِ لہوی ہے کہ جسے پہلے ذکر کیا ہے کہ یہ دل کی ایک حالت ہے، یہ اندرونی مانع ہیں کہ دل کے اندر لہوولعب، وقت گزارنے اور ضائع کرنے کی طرف رجحان ہے۔

پہلے بھی اشارہ ہوا ہے کہ ہر وہ چیز جوانسان کو اصلی کام سے روک کے توجہ ہٹادے اور اپنی طرف مشغول کرلے اسے لہو کہتے ہیں اور ہر وہ چیز کہ جس میں مقصدیت نہ ہو اور عقلاء کے نزدیک قابلِ مذمت ہو تو وہ لعب ہے۔ بعض قلوب کیلئے قرآن نے فرمایا کہ ان کی مشکل یہ ہے کہ ان کے قلوب لہوی ہیں یعنی ان کے دل کے اندر لہو رچ بس گئی ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کا ایک اصلی کام ہے کہ جو خدا نے ان کے سپرد کیا ہے یعنی جس کام کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے وہ ان کا اصلی کام ہے لیکن ان کی مصروفیات اتنی ہیں کہ ان کو اصلی کام کے لئے فرصت نہیں ملتی ہے، جیسے کسی نے پوچھا کہ آپ درس پڑھتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ مجھے درس کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے؟ میرے اپنے مباحثے ہیں کہ درس کی فرصت نہیں ملتی ہے، بعض ہوتے ہیں کہ جو مباحثوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور ان کو درس

کی فرصت نہیں ہوتی ہے، بعض ایسے مشغول ہیں کہ انہیں حتیٰ مباحثے کی بھی فرصت نہیں ہوتی ہے، امتحان کے وقت عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم بہت مصروف تھے، ہمیں کوئی کام درپیش تھا یہی قلوبِ لہوی ہیں، حضورِ قلب کی فصل میں آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ دل کیوں حاضر نہیں ہوتا ہے؟ چونکہ قلب لہوی ہے، لہو مانعِ از فہمِ قرآن ہے مثلاً نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو تجارت، بچے، گھر، دل، سفر یہ ساری چیزیں ہمیں نماز میں یاد آتی ہیں یہی علامت ہے کہ ہمارا قلب لہو میں مشغول ہے یعنی ان چیزوں نے ہماری توجہ اصلی کام سے ہٹا کر اپنی طرف لگائی ہوئی ہے، عبادتوں سے باہر جیسا دل ہوتا ہے تو عبادت میں بھی تو وہی دل ہوتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا دل اس طرح سے ہو کہ عبادت سے باہر، مسجد سے باہر یہ دل دنیوی ہو اور جوں ہی ہم مسجد کی دہلیز پر قدم رکھیں تو یہ دل خدائی بن جائے، اصلاً یہ شعبدہ تو نہیں ہے بلکہ دل ہے، جو دل مسجد سے باہر ہے وہی دل مسجد کے اندر ہے، مسجد سے باہر یہ دل کہاں مشغول ہے؟ مسجد کے اندر بھی یہ دل وہیں مشغول ہے۔ بقول اقبالؒ

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں......(۱)

یہ صنم پرست دل کہ جس کے اندر ہزاروں صنم بیٹھے ہوئے ہیں، یہ خدا کی بارگاہ میں جھک رہا ہے اور اس پر فرشتے بھی ہنستے ہیں کہ یہ بت کدہ اپنے سارے بت لے کر مسجد میں لوگوں کو کیا دھوکہ دینا چاہتا ہے؟

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ٥ (۲)

یہ خدا اور صاحبانِ ایمان کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ خود ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور سمجھتے بھی نہیں ہیں۔

اس نماز میں اسے کیا ملے گا جبکہ اس کا دل صنم آشنا ہے؟ دل خدا آشنا ہونا چاہئے۔ کہا گیا ہے کہ رمضان میں انسان روزہ رکھ کر سو بھی جائے تو یہ عبادت ہے، کیوں؟ اس لئے کہ دلِ لہوی عبادت میں ہو تو بھی کچھ نہیں ملے گا لیکن دلِ مشغول در خدا، دلِ الٰہی اگر عبادت نہ بھی کر رہا ہو اور سو رہا ہو تو بھی وہ اس کی عبادت ہے، واقعاً یہ معاملۂ دل ہے، اگر دل واقعاً خدا کے لئے ہو اور سو جائیں تو بھی عبادت ہے، اگر نہ سوئے اور ہزار سجدے کرے تو ان سجدوں میں بھی انسان کو کچھ نہیں ملتا ہے کیونکہ دل مشغول ہے، دل لہوی ہے یعنی وہ دل جو ہماری توجہ اصلی کام سے ہٹا دے، کتنے ایسے کام ہیں؟ فارسی اور عربی ملا کر ایک مخلوط طنزیہ شعر ہے، یہ شعر استادِ بزرگوار مرحوم حضرت آیت اللہ صالحیؒ اپنے درس میں اور اپنی سخنرانیوں میں کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے چند بیت ذکر کئے تھے، آخر میں انہوں نے یہ پڑھا کہ

شغلتنا عن ربّنا کثرت کارنا

یعنی کام اتنے زیادہ ہیں کہ ہمیں خدا کی طرف توجہ کی فرصت ہی نہیں ملتی ہے،

ومالنا وقت لپروردگارنا

کہ ہمارے پاس اپنے پروردگار کے لئے وقت ہی نہیں ہے،

حقیقتاً ایسے ہی ہے دل مشغول ہے اور کبھی دیکھا دیکھی میں آ بھی جاتے ہیں، جب لیلۃ

القدر میں کسی محفل میں جا بھی بیٹھتے ہیں تو وہاں بھی ذہن انہی چیزوں میں مشغول ہوتا ہے، پہلے تو دلِ لہوی کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن اب ٹیکنالوجی (Technology) نے یہ مشکل بھی حل کر دی ہے بلکہ مشکل زیادہ کھڑی کر دی ہے کہ دلِ لہوی پہلے چھپا ہوا تھا، پہلے اس پر خدائے ستار العیوب نے پردہ ڈالا ہوا تھا، کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ ساتھ میں بیٹھا ہوا لہوی ہے یا نہیں ہے لیکن جب سے موبائل فون آ گئے ہیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ لہوی ہے، لیلۃ القدر میں بیٹھ کر ایس ایم ایس (SMS) کر رہا ہوتا ہے، یہ یہاں آیا کیوں ہے؟ دعائے جوشن سننے کے لئے، اُدھر یا رب، یا عظیم یا خالق کہہ رہا ہے اور اِدھر ایس ایم ایس میں لگا ہوا ہے، اسے لیلۃ القدر میں کیا ملے گا؟ ہمارا ذہن ایسے ہی ہے، ہمارا ذہن مسلسل ایس ایم ایس کر رہا ہوتا ہے، قرآن کی بارگاہ میں جب ہم دلِ لہوی لے کر جائیں تو قرآن میں نکلتا نہیں ہے، قرآن میں فوراً توجہ کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے، ہزاروں چیزوں نے ہمارا دل مشغول کیا ہوا ہے، درحالیکہ دل کا ایک مشغلہ ہونا چاہئے یعنی ذکرِ خدا۔

اسی طرح فرض کریں کہ ایک شخص کو منبر دے دیا گیا ہے کہ آپ ایک گھنٹے کے لئے پڑھیں اور یہ ہزار افراد کا مجمع آپ کے سامنے ہے، ہزار آدمیوں کا ایک ایک گھنٹہ ملا کر کتنے ہو گئے؟ اور فرض کریں عشرہ پڑھ رہا ہے یعنی دس دن، دس دن ہزار آدمیوں کا مجمع آپ کے پاس ہے یعنی ہزار گھنٹے روز کے حساب سے کُل دس ہزار گھنٹے آپ کے پاس ہیں، یہ دس ہزار گھنٹے اس نے کیا کئے؟ ان دس ہزار گھنٹوں میں کیا کیا؟ مثلاً آپ بڑے بڑے اداروں میں جائیں کہ دس ہزار گھنٹے جن کے لئے بڑا سرمایہ ہیں، عموماً بڑی بڑی جائیدادوں کے بارے میں خبروں میں اعلان ہوتا ہے کہ اس کے اوپر اتنے

گھنٹے کام ہوا ہے، مثلاً ایران دس ہزار گھنٹے لگا کر ایٹمی ٹیکنالوجی تک پہنچ گیا ہے، دس ہزار گھنٹے کام کر کے انہوں نے کیا کر لیا؟ ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کر لی اور ہمارا خطیب دس ہزار گھنٹے لوگوں کے لطیفوں میں گزار دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی چیز لہو بھی ہو چونکہ مشغول کر کے اصلی کام سے توجہ ہٹا دیتی ہے، اصلی کام سے توجہ ہٹانے کے اعتبار سے یہ لہو ہے اور مقصد نہ ہونے کی وجہ سے لعب ہے، اگر انسان لعب میں مشغول ہو تو بھی قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے، کھیل کو لعب اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ چونکہ اس میں کوئی مقصد موجود نہیں ہوتا ہے لیکن انسان ورزش کیلئے، صحت کیلئے، تندرستی کیلئے جو ایکسر سائز (Exercise) کرتا ہے وہ الگ چیز ہے، جو کام ویسے ہی سرگرمی کے طور پر، ٹائم پاس کرنے کیلئے کرتا ہے یہ لعب ہے چونکہ اس کے اندر کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے۔ شیطانی وساوس اس کام میں زیادہ آسانی سے اثر کرتے ہیں۔ کتاب کے اندر متن میں روایت بھی ہے، غالباً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ اگر شیاطین نے انسان کے دل کا احاطہ نہ کیا ہوتا تو انسان کو قرآن سمجھ میں آنا شروع ہو جاتا، شیاطین نے احاطہ کیا ہوا ہے، دلوں کو محاصرے میں لیا ہوا ہے، جس طرح سے امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ بعض دل تو آشیانہ شیطان ہیں، شیطان کے لئے بہت آرام کی جگہ ہیں یعنی شیطان کو اپنا پورا دل کرائے پہ دیا ہوا ہے، اس نے وہاں انڈے بھی دیئے ہیں، بچے بھی نکالے ہیں، چوزے بھی نکالے ہیں، وہیں پر اس کا گھونسلا ہے یعنی اس نے دل کو شیطان کے لئے اتنا آمادہ کیا ہوا ہے۔ لہٰذا لہو لعب کی طرف مائل دل کبھی بھی قرآن کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔

۲)عدم تدبر در آیات

مانعِ دیگر عدم تدبر در آیات ہے کہ انسان قرآن کی طرف راغب تو ہے لیکن یہ رغبت ایسی ہے کہ جیسے انسان بہت رغبت سے افطار پہ آتے ہیں اور آ کر پکوڑوں اور سموسوں سے ہی پیٹ بھر لیتے ہیں اور اصلی کھانے کے لئے جگہ ہی نہیں چھوڑتے ہیں، چونکہ افطار میں جو پہلی چیز آتی ہے اس کو انسان شوق ورغبت اور حرص وپاس سے کھاجاتا ہے۔اس کو کنٹرول (Control) سے کھائیں تاکہ بعد میں جو اصلی کھانا آنے والا ہے اسکے لئے جگہ باقی رہے۔

ایران میں زائرین کے ساتھ یہ اتفاق زیادہ رونما ہوتا ہے کہ پہلے وہ ایک غذا لاتے ہیں جس کو اپیٹایزر (Appetizer) کہتے ہیں، یہ بھوک چمکانے کے لئے لائی جاتی ہے لیکن وہ اسی سے بھوک مار لیتے ہیں، سوپ پہلے پی لیتے ہیں، ساری سلاد پہلے کھالیتے ہیں، جو چیز پہلے آتی ہیں اسی کو کھا پی کے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں اور جب بعد میں کھانا آتا ہے تو جگہ نہیں ہوتی ہے، کھانا ایسے ہی واپس چلا جاتا ہے، یہی حال قرآن کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ قرآن کی طرف شوق بڑھا مثلاً کسی عالم نے تقریر کی یا کتاب پڑھی تو رغبت وشوق پیدا ہوا کہ بھرپور طریقے سے قرآن کی طرف جانا ہے اور اب شروع کرنا ہے، تب شروع کرنا ہے یا شروع تو کردیا ہے لیکن یہ سارا شوق کس میں پورا کرلیا؟ اسی ظاہری سلاد اور سوپ سے پورا کرلیا مثلاً یہی کہ تھوڑا حفظ کرلیا، ایک آدھ آیت حفظ کرلی یا فرض کریں کہ ناظرہ میں ہی، قرأت میں ہی، تجوید میں ہی یا عربی علوم میں ہی سارا شوقِ قرآن کا ذوق پورا کرلیا اور تدبر تک نوبت ہی نہیں پہنچی کہ جو اصل مقصود تھا، جو اصل دسترخوانِ خدا تھا۔ جو اصل غذا

خدا نے اس پہ تیار کر کے رکھی ہوئی تھی اس کے لئے کہ اب جگہ ہی نہیں ہے، بھوک ہی نہیں ہے، اسلئے تدبر نہیں کرتے ہیں یعنی رغبت ہونے کے باوجود اس میں تدبر نہیں کرتے ہیں، یہ چیز فہمِ قرآن میں مانع ہے۔

۳) قرآن کی صحیح معرفت کا نہ ہونا

ایک اور مانع شناختِ نادرست از قرآن ہے، سب سے پہلا مطلب یہ ہے کہ خود قرآن کی شناخت ہونی چاہئے، اس سے پہلے کہ قرآن ہمیں شناخت کروائے یا قرآن ہمیں معرفت دے ہمیں پہلے خود قرآن کی معرفت ہونی چاہئے کہ قرآن ہے کس چیز کی کتاب؟ اور اس وقت جو اتفاق ہو رہا ہے یعنی ہمیشہ سے ہے نہ کہ صرف اس وقت ہے لیکن اس وقت ہم اس کو لمس کر رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں کہ قرآن کی طرف رغبت و رجحان ہے، سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب قرآن ہے، سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن ہے، سب سے زیادہ رجوع جس کتاب کی طرف ہوتا ہے وہ قرآن ہے لیکن درعینِ حال قرآن پھر بھی مہجور و متروک، غریب و اجنبی اور نامانوس ہے، اس لئے کہ قرآن کی جو شناخت ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اسے سمجھا جائے، اس سے ہدایت لی جائے اور اسے اپنی زندگی میں اتارا جائے بلکہ یہ ہے کہ یہ کتابِ ثواب ہے۔ یہ شناختِ نادرست از قرآن ہے۔

بے شک قرآن پڑھو تو ثواب ہوتا ہے لیکن یہ کتابِ ثواب نہیں ہے بلکہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، کتابِ انقلاب ہے، کتابِ انسان سازی ہے، کتابِ سعادت و نجاتِ انسان ہے۔ ہم

نے اس کو کتابِ ثواب بنادیا ہے البتہ قرآن پڑھنے پر فراواں ثواب ہے، منکرِ ثواب نہیں ہیں، ثواب یقینی ہے، قطعی ہے اور فراواں ہے، شاید قرآن پڑھنے کا جتنا ثواب ہے اتنا کسی اور چیز کا ثواب نہیں ہے لیکن ثوابؔ حکمتِ قرآن نہیں ہے یعنی ثواب عنوانِ قرآن نہیں ہے کہ اس کو ہم کتابِ ثواب کہہ دیں۔ عموماً مجالسِ ترحیم میں، میت کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن کو پڑھتے ہیں یا اگر کوئی حالتِ احتضار میں پہنچا ہوا ہے تو اس کے لئے سورۂ یاسین پڑھ دیتے ہیں یا پھر کاروبار میں برکت کیلئے قرآن کو پڑھتے ہیں چونکہ ذہن یہی بنا ہوا ہے، شناخت یہی ہے، قرآن ہمیں متعارف ہی یوں کروایا ہوا ہے کہ اگر ثواب کمانا ہے تو ثواب حاصل کرنے کے لئے سب سے بڑا منبع و ذخیرہ قرآن ہے۔

ثواب قرآن کی طرف رغبت بڑھانے کے لئے ہے یہ فلسفۂ قرآن اور حکمتِ قرآن نہیں ہے، ثواب اس لئے رکھا ہے چونکہ بعض لوگ معرفتِ قرآن نہیں رکھتے ہیں، ان کا ذہنی بلوغ اتنا نہیں ہے کہ ثواب کے بغیر یا سود وزیاں سے ماوراء ہو کر قرآن کی طرف آئیں اس لئے ان میں رغبت پیدا کرنے کے لئے کثرت سے ثواب نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیہ یا سورہ پڑھو تو اس پہ اتنا ثواب ہے، وہ سورہ پڑھو تو اس میں اتنا ثواب ہے اور ہم وہی سورہ پڑھتے ہیں اور فقط اسی ثواب کے لئے پڑھتے ہیں۔

ثواب فقط ہمیں قرآن کی بارگاہ میں لانے کا ذریعہ ہے کہ ثواب کی خاطر قرآن کی بارگاہ میں آجائیں، پھر دیکھیں کہ قرآن ہمیں عطا کیا کرتا ہے؟ قرآن سے لینا کچھ اور ہے، قرآن سے ثواب نہیں لینا ہے، ثواب ذریعۂ رجوع با قرآن ہے، پس قرآن کے بارے میں ہماری یہ ایک

شناختِ نادرست ہے کہ ہم نے اسے محض ایک کتابِ ثواب بنالیا ہے مثلاً ایک طبقہ ہے کہ جس نے قرآن کو تعویزوں کی کتاب کی حد تک گرادیا ہے، جس طرح بعض ہوتے ہیں کہ جو تعویز لکھتے ہیں، بعض یہ کام کرتے ہیں کہ قرآن کی آیات کیلئے کہتے ہیں یہ آیاتِ خدا ہیں، نورانی کلمات ہیں یہ آیہ پڑھو تو یہ اثر ہوتا ہے اور یہ آیہ پڑھو تو وہ اثر ہوتا ہے، یہ شناختِ نادرست از قرآن ہے۔

قرآن تعویذوں کی کتاب نہیں ہے، اعوذ بمعنیٰ پناہ ہے، چہ بسا قرآن پناگاہ ہے، قرآن بچاتا ہے لیکن عذاب سے، ہلاکت سے، خسارے سے، نقص سے، انحطاط اور زوال سے بچاتا ہے نہ یہ کہ معمولی معمولی چیزوں کے لئے اس کو تعویذ بنا کر وردِ قرآن شروع کردیں، تعویذ کئی طرح کے ہوتے ہیں، بعض وردی تعویذ ہیں، بعض باندھنے کے تعویذ ہیں، بعض لٹکانے کے تعویذ ہیں، بعض پینے کے تعویذ ہیں اور بعض چاٹنے کے تعویذ ہوتے ہیں، قرآن نہ کتابِ ثواب ہے اور نہ ہی کتابِ تعویذ ہے، اسی وجہ سے مہجوریت ہے، باوجود اس کے کہ قرآن کی طرف رجوع زیادہ ہے درعینِ حال قرآن متروک و مہجور ہے۔

قرآن کی صحیح معرفت کا نہ ہونا

یہ بہت اہم مانعِ فہمِ قرآن ہے کہ قرآن کے بارے میں شناختِ نادرست ہے، صحیح تصویر پیش نہیں کی گئی ہے، ہم نے سمجھا کہ یہ تعویذوں کی کتاب ہے، ہدایت کے نسخے تعویذ بنا دیئے ہیں، اس موقع پر میں ہمیشہ وہ مثال عرض کرتا ہوں کہ یہ کہانی ہے ایک انگریز ڈاکٹر کی کہ جو افریقہ میں مریضوں کا علاج کرنے کے لئے گیا تھا، افریقی دیہاتی یا اس جنگلی زمانے کے لوگوں کے پاس، البتہ اتنا قدیم قصہ بھی نہیں ہے بلکہ تقریباً چالیس، پچاس سال پہلے کا اصلی قصہ ہے، یہ داستان یا افسانہ

نہیں ہے بلکہ حقیقی واقعہ ہے۔

ڈاکٹر بنام البریٹ شوئٹزر نے افریقہ میں جا کر مریضوں کا علاج کرنا شروع کیا، پھر واپس آ کر انہوں نے آپ بیتی لکھی کہ وہاں میرے ساتھ کیا اتفاقات ہوئے، ایک یہ لکھا کہ جب میں انہیں علاج معالجے کے لیے دوا لکھ کر دیتا تھا کہ یہ جا کر میڈیکل اسٹور سے خریدنی ہے تو وہ اسی نسخے کو کھا جاتے تھے، اس کاغذ کو کھا جاتے تھے مثلاً میں جو زخم پر پٹی باندھنے کے لئے دیتا تھا تو پٹی کھا لیتے تھے، مرہم زخم پہ لگانے کے لئے دیتا تھا اور وہ اس کو نگل لیتے تھے، اس وقت جب یہ داستان پڑھ رہے تھے تو لگ رہا تھا کہ صرف محظوظ ہونے کے لئے پڑھ رہے لیکن بعد میں اس داستان نے بہت ساری حقیقتیں کھولیں کہ قرآن کے ساتھ ہم بھی یہی کر رہے ہیں کہ جو افریقیوں نے اس طبیب کے نسخوں کے ساتھ کیا ہے، ہم بھی تو یہی کام کر رہے ہیں، خداوند تبارک وتعالیٰ نے یہ قرآن ہمارے لئے نازل کیا ہے یعنی قابلِ فہم بنایا ہے اور اس کو لفظی شکل میں اتارا ہے لیکن ہم اسی کو گھول گھول کر پی رہے ہیں، کسی کو بازو کے ساتھ باندھا ہوا ہے، کسی کو گردن میں لٹکایا ہوا ہے، کسی کو اِدھر اور کسی کو اُدھر باندھا ہوا ہے، یہ قرآن کے ساتھ نادرست رویہ ہے، یہ بعض مقامات پر توہینِ قرآن ہے، قرآن ان مقاصد کے لئے نہیں تھا، یہ شناختِ نادرست ہے، یہ مانع از فہمِ قرآن ہے، قرآن کی طرف رغبت ہے لیکن شناخت درست نہیں ہے۔

☆استخارے کی حقیقت

قرآن کی طرف ایک اور رجوعِ شدید کہ جو صبح و شام ہوتا ہے وہ استخارہ ہے مثلاً آپ اگر حرم میں جائیں تو کوئی آپ کو قرآن پڑھتا ہوا نہیں ملے گا بلکہ وہ سب مفاتیح پڑھ رہے ہوتے ہیں لیکن استخارے کے لئے قرآن کی طرف رجوع ہوتا ہے، مثلاً قم میں بھی ٹیلیفون پر استخاروں کے لئے اس وقت پوری دنیا کی طرف سے رجوع ہوتا ہے، بعض ماہرین ہیں کہ جو استخارے کے ایکسپرٹ (Expert) ہیں ان کی طرف رجوع ہوتا ہے، وہ ساری داستان بتاتے ہیں کہ یہ کام ہونا ہے، یہ کام نہیں ہونا ہے، اول یہ فال ہے، توجہ فرمائیں میں یہ فقط اس لئے آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ مانعِ فہمِ قرآن ہے، کسی چیز پر تنقید کرنا یا محض کسی چیز کو ہدف بنانا مقصود نہیں ہے، ہم موانع شناخت کر رہے ہیں کہ یہ ہماری راہ میں رکاوٹ ہیں، قرآن سے استخارہ نکالنا بھی مانعِ فہمِ قرآن ہے، وہ لوگ استخارے کے ساتھ پھر ساری داستان بتاتے ہیں کہ یوں کرنا ہے، یوں نہیں کرنا ہے، فلاں کام کرنا ہے، فلاں نہیں کرنا ہے، یہ استخارہ نہیں بلکہ فال ہے، یہ جو قرآن کھول کر دیکھتے ہیں، دائیں بائیں، دائیں جو آیت ہو وہ خوب ہے اور بائیں جو ہے وہ خوب نہیں ہے، دائیں طرف صفحے پر جو آیت ہو اور اس میں فلاں کا تذکرہ ہو تو خوب تذکرہ ہے اور فلاں کا تذکرہ ہو تو بد ہے، یہ خوب و بد میں آیاتِ قرآن کو جو تقسیم کیا ہوا ہے اس کو تفاؤل کہتے ہیں اور روایت موجود ہے کہ تفاؤل بالقرآن درست نہیں ہے، فال گیری نہ کرو، قرآن کتابِ فال نہیں ہے۔

فال کا یہ مسلک ظاہراً ہندوستان سے شروع ہوا ہے، زیادہ تر یہی لگتا ہے کیونکہ ہندوستان

☆استخارے کی حقیقت

میں اس کی جڑیں زیادہ ہیں، ابھی بھی وہاں پر یہ مطلب زیادہ پُر رونق ہے لیکن فال گیری پوری دنیا میں ہے، ہر چیز سے فال نکالتے ہیں مثلاً ابھی ایران میں ایک چیز رائج ہے کہ دیوانِ حافظ سے فال نکالتے ہیں، حافظ کی دیوان میں پہلے تفاؤل کا طریقہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ حافظ کے دیوان سے فال کیسے نکالنی ہے، فال کا مطلب نیک و بد تشخیص دینا ہے، استخارہ دعا ہے، اصلاً وہ اور چیز ہے اور یہ اور چیز ہے، یہ کس طرح مخلوط ہو گئے؟ کہاں مخلوط ہو گئے؟ کس نے مخلوط کر دیا؟ جن دو چیزوں کا آپس میں کوئی ربط بھی نہیں تھا وہ دونوں مل کر ایک ہو گئی ہیں۔

فال یعنی ایسا عمل کرنا کہ جس سے انسان یہ تشخیص دے کہ یہ اچھی چیز ہے، یہ بری چیز ہے، کروں یا نہ کروں، خوب ہے یا بد ہے۔ استخارہ یہ ہے کہ میں خدا سے خیر کی دعا مانگتا ہوں، استخارہ کا معنیٰ لغوی بھی یہی ہے کہ خدا سے خیر کی دعا مانگنا صحیفۂ سجادیہ میں حضرت امام سید الساجدین علیہ السلام کی ایک دُعا بنامِ دعائے استخارہ ہے، یہ استخارہ ہے، خدا سے خیر مانگو اور یہ واجب ہے، لازم ہے کہ انسان خدا سے خیر مانگے اور پھر خدا پہ توکل کرے، توکل کا معنیٰ بھی یہی ہے کہ اللہ سے خیر مانگے کہ اے اللہ میں نے یہ نیت کی ہے، میں نے یہ ارادہ کیا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ اس میں خیر ہے یا نہیں ہے، میں تجھ سے اس کام میں خیر طلب کرتا ہوں۔ خوب و بد فال ہے اور یہ اب عادت ہو چکی ہے، فال نفسیاتی مسئلہ ہے دینی مسئلہ نہیں ہے، فال نفسیاتی الجھن دور کرتا ہے نہ کہ دینی مسئلہ دور کرتا ہے لہٰذا سب فال نکالتے ہیں، ہندو بھی فال نکالتا ہے، سکھ بھی فال نکالتا ہے، انگریز بھی فال نکالتا ہے، سنی و شیعہ بھی فال نکالتا ہے، سب لوگ فال نکالتے ہیں۔

کسی نہ کسی شکل میں یہ فال گیری ہر جگہ ہے، جنتریوں میں فال ہے، مثلاً یہ جو خرافات ہیں کہ صبح اٹھ کر کالی بلی دیکھی تو بد ہے، سفید بلی دیکھی تو خوب ہے یہ بھی فال ہے، یہ بھی تفاؤل ہے، تفاؤل وتطاؤل یا تفیل وتطیر اسی کو کہتے ہیں، بدقدم ہونا یا خوش قدم ہونا مثلاً عموماً شادی کے دن جب گھر میں دلہن آئی تو اتفاقاً اسی دن ساس گٹر یا کسی اور جگہ گر گئی تو وہ ساس بہو کو کہتی ہے کہ یہ بدقدم ہے، اس کی وجہ سے میں گر گئی ہوں، بڑھیا کو پتہ نہیں ہے کہ خود گر گئی ہے، عینک نہیں تھی یا کسی اور وجہ سے گر گئی ہے، یہ بیچاری دلہن کو کہتی ہے کہ یہ بدقدم ہے یہ بھی فال ہے، تطاؤل وتطیر ہے یا اگر منڈیر پر کوا آ کر بیٹھ جائے اور کائیں کائیں کرے تو بعض کوے کے بولنے کو خوب سمجھتے ہیں کہ آج مہمان آئیں گے، بعض جگہ کہتے ہیں کہ نہیں بیماری آئے گی، کوا ہر جگہ الگ الگ چیزوں کی علامت ہے، یہ سب تطاؤل وتفاؤل ہے، تطیر وتفال ہے، یہ سب غلط ہے، حرام ہے، یہ درست نہیں ہے، قرآن ہمیں انہی چیزوں سے نجات دینے کے لئے آیا تھا اور ہم نے قرآن کو انہی چیزوں کا ذریعہ بنا لیا۔

یہ ہمارے اسکول کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ہمارے جاننے والوں میں سے ایک بندۂ خدا منشیات کا عادی ہو گیا تھا، وہ چرس پیتا تھا، پھر اس نے جب شادی کی تو بیوی اس پر بہت اعتراض کرتی تھی کہ تم یہ چرس چھوڑ دو تو اس نے چرس چھوڑنے کے بجائے بیوی کو بھی چرس پہ لگا دیا، پھر دونوں ملکر پیتے تھے، یہی کام ہم نے قرآن کے ساتھ کیا ہے، قرآن نے کہا کہ یہ تطیر نہ کرو، بنی اسرائیل موسیٰؑ کے ساتھ تطیر کرتے تھے، موسیٰ علیہ السلام کو کہتے تھے کہ یہ بدقدم ہیں، جب سے موسیٰ علیہ السلام آئے ہیں ہمارے لئے ناگوار اتفاقات رونما ہوتے ہیں، تطاؤل وتطیر کرتے تھے یعنی اس سے بدفال نکالتے

تھے، موسیٰ علیہ السلام کو سختیوں کی علامت سمجھتے تھے، جن کو خدا نے ہدایت کے لئے اور نجات کے لئے بھیجا تھا یہ ان کیلئے کہتے تھے کہ ان کی وجہ سے یہ سارے اتفاقات رونما ہوتے ہیں۔

یہ تطیر ہر گھر میں ہے مثلاً آپ دیکھیں کہ جب سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے ہمارے حالات سنورنا شروع ہو گئے ہیں، جب سے وہ بچہ پیدا ہوا ہے ہم مقروض ہونا شروع ہو گئے ہیں، مثلاً تجارت خوب ہونے لگے تو کہتے ہیں کہ جب سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے ہماری تجارت اچھی ہوگئی ہے یہ تفاؤل ہے، یہ غلط ہے اور اسی وجہ سے بچوں میں تفریق کرتے ہیں، جب یہ پیدا ہوا تھا تو فوراً بچے کا ماموں مر گیا تھا، ماموں اس وجہ سے مرے کہ گاڑی غلط چلا رہے تھے بچے کا اس میں کیا قصور ہے؟ بچہ خرافاتی خاندانوں میں کتنی چیزوں کا ذمہ دار پیدا ہوتا ہے، بیچارہ ناکردہ گناہوں میں پکڑا جاتا ہے، یہ پیدائشی طور پر ہی منحوس ہے، یہ نحوست جب پیدا ہوئی تھی تو اسی دن دادا مر گئے تھے اور پھر آخر تک جتنے بھی ناگوار اتفاقات ہوتے ہیں سب کچھ اسی معصوم اور بے گناہ کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح سے جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ قرآن کے گلے میں کیوں ڈالتے ہیں؟ یعنی قرآن نے کہا ہے کہ یہ خوب ہے اور یہ بد ہے، قرآن نے کہا ہے کہ یہ کام نہ کرو، کیا قرآن اس لئے آیا تھا؟ قرآن کے بارے میں یہ شناختِ نادرست ہے، قرآن کی طرف کتنا رجوع ہے؟ لیکن رغبتِ فراواں قرآن سے استخارہ نکالنے میں ہے، رجوعِ فراواں درعینِ حال نادرست ہے، استخارہ کا مطلب ہے خدا سے خیر مانگو، دعا مانگو، اللہ پر بھروسہ کرو، توکل کرو اور ظاہر ہے کہ خدا نے ہی خیر قرار دینی ہے، کُل خیر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن کے بارے میں ہمارے جو نادرست تفکرات اور اعتقادات ہیں اس کی وجہ

استخارے سے علمی حقیقت

شناختِ نادرست ہے، یہ قرآن میں نافہمی کا بہت بڑا سبب ہے اور بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

٤)وہم وخیال

ایک بڑا مانع وَہْم وخیال ہے، قرآن فہمی میں وہم وخیال کی دخالت ہے کہ جب انسانِ مشتاق کہ جو قرآن سے رغبت رکھتا ہے اور فہمِ قرآن میں آتا ہے تو تخیل وخیال کی قید سے آزاد نہیں ہوتا ہے اور یوں سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہ میری عقل ہے درحالیکہ یہ وَہْم ہے نہ کہ آپ کی عقل ہے، تو ہم انسان کو کبھی ایسی ایسی چیزیں دکھاتا ہے کہ جو کسی اور کو نظر نہیں آتی ہیں۔

مولانا روم نے چاند دیکھنے کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، کہا کہ سب چاند دیکھ رہے تھے، پہلے زمانوں میں چاند دیکھا کرتے تھے، آج کل ٹی وی پر سنتے ہیں، چاند دیکھنے کی چیز ہے سننے کی چیز نہیں ہے، ہم آدھی رات تک بیٹھے رہتے ہیں کہ سنیں چاند آیا ہے یا نہیں آیا ہے، مغرب کے وقت باہر نکل کر دیکھ لو معلوم ہو جائے گا، چاند دیکھنا چاہئے، بہرکیف لوگ چاند دیکھ رہے تھے اور ایک آدمی کو نظر آ رہا تھا باقی کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ بڑا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ چاند سامنے ہے، یہ آپ لوگوں کو کیوں نظر نہیں آ رہا ہے؟ اور انگلی کے اشارے سے سب کو چاند دکھاتا بھی تھا، ایک دانا آدمی نے اس نے کہا کہ دیکھوں یہ مسئلہ کیا ہے کہ کسی اور کو نظر نہیں آ رہا ہے اور صرف اس کو نظر آ رہا ہے تو اس نے آ کر غور سے اس کی آنکھ کی طرف دیکھا تو یہ آنکھ کی ابرو کا ایک بال تھا کہ جو نیچے اس کی آنکھ کے سامنے لٹکا ہوا تھا، کیونکہ شمشیری شکل ہوتی ہے، ہلالی شکل ہوتی ہے، اس کو وہ بال نظر آ رہا تھا اور سمجھتا

وہم وخیال

تھا کہ آسمان پہ چاند نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح بعض قرآن کی طرف آتے ہیں اور ان کے وہم و تخیل میں یہ بال لٹکا ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ آپ کا وہم و خیال یہ کہہ رہا ہے نہ کہ قرآن کہہ رہا ہے، یہ پہلے ذکر کیا تھا کہ انسان اس شیطان سے پناہ مانگے کہ

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ٥(٣)

لہٰذا جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطانِ رجیم کے مقابلے کے لئے اللہ سے پناہ طلب کریں۔

لہٰذا انسان اس شیطان سے کہ جو انسان کی فہم میں مداخلت کرتا ہے پرہیز کرے کہ وہم و خیال اس کے دریچے ہیں، وہم وخیال کے راستے بند کرے اور عقل کے مطابق آئے، عقل کو قرآن کے اختیار میں قرار دے نہ کہ توہم اور تخیل کی زبان سے قرآن کو سمجھنا شروع کرے۔

٥) زودباوری اور شکاکیت

مانعِ دیگر زود باوری اور شکاکیت ہے، کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی نفسیاتی مشکل شکاکیت ہوتی ہے یعنی شکاک ذہن لوگ۔ اسی طرح بعض زود باور ہوتے ہیں یعنی ایک دم یقین کر لینے والے، جلدی یقین کرنا بھی ایک مرضِ نفسانی ہے، بعض لوگوں کو ایک دم یقین ہو جاتا ہے، افواہوں سے بھی یقین پیدا ہو جاتا ہے، خواب دیکھتے ہیں تو یقین پیدا ہو جاتا ہے، چڑیا اڑتی ہے تو ان کو یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات انسان کے جسم کے کچھ حصے ایسے ہیں جو سستی کی وجہ سے یا ان کا

اپنا کوئی اور فزیکل مسئلہ (Physical problem) ہوتا ہے کہ جو ڈاکٹر یا دوسرے لوگ بتا سکتے ہیں کہ ان کی کبھی آنکھ پھڑکنے لگتی ہے، کبھی کان پھڑکنے لگتا ہے، کبھی جسم کا کوئی اور حصہ پھڑکنے لگتا ہے، ان کو اسی پھڑکنے سے یقین ہو جاتا ہے کہ آج یہ کام ہونے والا ہے، یہ خرافات ہیں یہی وہ تفاؤل ہے، دائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو سسرال والے آئیں گے، بائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو میکے والے آئیں گے، یہ خرافات ہیں، یہ انسان کا توہم ہے، یہ روانی و نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جس میں انسان کو یقین حاصل ہو جاتا ہے، انسان زود باور ہو جاتا ہے، بچہ بات کرے تو یقین ہو جاتا ہے، کوئی عورت بات کرے تو یقین ہو جاتا ہے کہ عورتیں عموماً ایسی ہوتی ہیں، نفسیاتی طور پر زود باور ہوتی ہیں، بعض زنانہ صفات مرد میں بھی ہوتی ہیں اور ان کی بھی یہی عادت ہوتی ہے کہ انہیں ایک دم یقین ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سے شکاکیت بھی ایک بیماری ہے، جو کبھی وسوسے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جن کا وضو نہیں ہوتا ہے، پانی کی ٹنکی ختم ہو جاتی ہے لیکن ان کا وضو نہیں ہوتا ہے، کئی کئی گھنٹے حمام میں لگا کے آجاتے ہیں اور ان کا غسل نہیں ہوتا ہے، حمام میں ٹانکوں کے نیچے پانی چلا جاتا ہے لیکن ان کے بالوں کے نیچے ابھی تک نہیں گیا ہوتا ہے، یہ انسان شکاکیت مزاج بن جاتا ہے، ذہن نہیں ہے، عقل نہیں ہے بلکہ نفسیات ہے، اس نفسیاتی بیماری میں پھنسا ہوا انسان اگر شکاکیت کے ذہن کے ساتھ قرآن کی طرف آئے تو اس کو قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے،، یہ پہلے اس بیماری کا علاج کرائے اور شکاکیت برطرف کر کے قرآن کی خدمت میں آئے تاکہ اس کے دل میں یقین آسکے۔

٦)ظاہر بینی

مانعِ دیگر ظاہر بینی ہے یعنی بہت سطحی نگاہ رکھنا، سرسری عبور کرنا، فقط ظواہر پر اکتفا کر کے گزر جانا کہ بس یہی ہے اور ان ظواہر کے پیچھے کچھ بھی نہیں ہے، کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ ان کی عقل ان کی آنکھوں میں ہے یعنی اس کا یہی دقیق معنیٰ بنتا ہے کہ یہ ظاہر بین ہیں چونکہ آنکھوں سے فقط ظاہر نظر آتا ہے اور اس ظاہر کے ماوراٗ جو باطن ہے، جو اس کی حقیقت ہے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں، یہ فقط ظواہر پر اکتفا کر لیتے ہیں، اول تو یہ تشخیص دینا بھی اہم ہے کہ خود ظواہرِ قرآن کیا ہیں؟ اس کے لئے بھی آداب اور فہم کی ضرورت ہے اور بعد از تشخیصِ ظاہر انسان فقط ظاہر ہی پر اکتفا نہ کر لے بلکہ اس ظاہر کے آگے بھی دیکھے، اس ظاہر کے پیچھے اسرار ہیں، حکمتیں ہیں، ان حکمتوں کی طرف بھی انسان توجہ کرے، اس ظاہر کے پیچھے ایک روحِ باطن بھی ہوتی ہے، ظاہر و باطن کے پیچھے سے ہماری مراد سامنے اور پیچھے کا حصہ نہیں ہے کہ اوجھل حصہ باطن اور سامنے کا حصہ جو نظر آ رہا ہے وہ ظاہر نہیں، بلکہ ظاہر و باطن سے ظاہر و روح، جسد و روح مراد ہے، جس طرح پہلے بھی ایک بحث کے ضمن میں اشارہ ہو چکا تھا۔

مثلاً انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے، باطنِ انسان سے مراد انسان کا معدہ نہیں ہے بلکہ وہ بھی ظاہر ہے یعنی یہ جلد جس طرح سے ظاہر ہے اسی طرح اس جلد کے نیچے کا حصہ بھی عالمِ ظاہر ہے، یہ بھی عالمِ شہادت ہے، باطن سے مراد روحِ انسان، دلِ انسان، قلبِ انسان، نفسِ انسان، حقیقتِ انسان اور باطنِ انسان ہے۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا ظاہر و باطن ہے

بلکہ کل عالمِ ہستی اس طرح سے ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس عالم کو دو حصوں میں یعنی مُلکْ وملکوت بنایا ہے، ملکوت روح ہے اور ملک جسم ہے، جس طرح سے انسان میں جسم وروح ہے اسی طرح قرآن بھی جسم وروح ہے اور عبادات میں بھی جسم وروح ہے، یعنی عبادات کا بھی ظاہر وباطن ہے۔ فقہ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ظاہر وجسمِ عبادات ہے مثلاً وضو کا ایک ظاہر ہے کہ جو احکامِ فقہ سے عبارت ہے، جس کو ہم احکامِ شریعہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر بھی دین ہے، اب کوئی ایسا عرفان نکال کر نہ لے آئے کہ جو کہے کہ اصلاً ان ظواہر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ظواہر بھی دین ہے کہ جس طرح سے یہ ظاہری جسم بھی انسان ہے، جس طرح سے یہ روح بھی انسان ہے اسی طرح سے عبادت کا ظاہر بھی عبادت ہے اور عبادت کا باطن بھی عبادت ہے لیکن یہ ظاہر اس وقت زندہ عبادت ہے کہ جب اس کے اندر باطن موجود ہو، روح موجود ہو۔

جب ہمارا کسی انسان سے پالا پڑے تو اس کے ظاہر پر نہ جائیں عموماً لوگ خطا اسی وجہ سے کرتے ہیں لہٰذا گھریلو مسائل پیش آتے ہیں، اکثر شادی بیاہ میں مشکل اس لئے پیش آتی ہے کہ لوگوں کا فقط ظاہر دیکھتے ہیں اور باطن نہیں دیکھتے ہیں یعنی صورت دیکھتے ہیں سیرت نہیں دیکھتے ہیں، ظاہر سے تو انسان کسی بات پر اعتماد نہیں کرسکتا ہے، کسی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا ہے، جس چیز کا بھی جسم وروح ہو تو آپ اس کے جسم سے اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کریں، عبادتوں کا جسم ہے تو کوشش کریں کہ آپ اس کی روح تک پہنچیں، قرآن کا بھی جسم ہے، جسد ہے اور آپ اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کریں، پس ظاہر بینی اور ظاہر پر اکتفا کرنا بھی مانع از فہمِ قرآن ہے کہ ہم روحِ

قرآن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔

۷)ہویٰ وہوس

ایک مانع ہویٰ و ہوس ہے، پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی فرمایا تھا کہ مجھے اپنی امت کے بارے میں دو چیزوں کا خوف ہے کہ یہ دو چیزیں میری اُمت کو ڈبو سکتی ہیں،

إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيَ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْأَمَلِ.... (۴)

میں اپنی اُمّت کے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف رکھتا ہوں وہ ہوائے نفس کی پیروی اور لمبی امیدیں رکھنا ہے......

دو چیزوں سے پیغمبر ﷺ اُمت کے بارے میں نہایت خوف زدہ ہیں، ان میں سے ایک یہی لمبی خواہشیں، لمبی آرزوئیں ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا حملہ بھی دل پر ہوتا ہے، ان کا مرکز بھی دل ہے، خواہشات بھی دل میں پیدا ہوتی ہیں اور آرزوئیں بھی دل میں پیدا ہوتی ہیں اور ان ہی آرزوؤں کے لئے لگے ہوئے ہیں، ان کی تکمیل کے لئے اپنی جان فنا کرنے میں اور خود کو ہلاک کرنے میں لگے ہوئے ہیں حتیٰ کہ انسان خواہش پرست بن جاتا ہے، قرآن نے فرمایا کہ

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ......(۵)

کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے۔

جو اپنی خواہشات کی پرستش کرتا ہے، پرستش کے معانی یہی ہیں کہ صبح وشام ان کی خدمت

میں رہنا، پرستشِ خدا بھی یہی ہے، پرستشِ خدا فقط باوضو ہو کر نماز میں کھڑے ہونا تو نہیں ہے، پرستشِ خدا یعنی صبح وشام یادِ خدا میں رہنا، فکرِ خدا میں رہنا، یہی پرستشِ خدا ہے، اگر ایک انسان صبح وشام یادِ شہوات میں رہے اور شہوات اس کو ستا رہی ہوں تو یہ انسان پرستش کر رہا ہے، اس نے خواہشات کو اپنا معبود قرار دیا ہے، اپنا رب قرار دیا ہے اور انہی خواہشات میں کہ جس کو قرآن نے بھی بہت مستثنیٰ کر کے بیان کیا اور نہج البلاغہ میں خصوصیت کے ساتھ قرآن کے اس مطلب کی تفسیر نمایاں طور پر موجود ہے یعنی دنیا پرستی۔

۸)دنیا پرستی

موانعِ فہمِ قرآن میں ایک چیز دنیا پرستی ہے، حبِ دنیا ہے، دنیا سے مراد معاشرت نہیں ہے، دنیا سے مراد زندگی نہیں ہے یعنی اولاد، بچے، بیوی اور گاڑی دنیا نہیں ہے، بعض اوقات ہم دنیا کا غلط معنیٰ کرتے ہیں۔ دنیا یعنی ان چیزوں کی محبت، ان چیزوں کا تملک، ان چیزوں کا مالک بننا، ان چیزوں سے اپنی شخصیت بنانا، ان چیزوں کو اپنے وجود کا حصہ قرار دینا، ان پر اترانا اور ان پر فخر ومباہات کرنا، ورنہ اگر یہی ضروریاتِ زندگی ہوں تو یہ دنیا نہیں ہیں بلکہ عینِ دین ہیں، اگر ان کے ذریعے سے انسان زندہ رہتا ہے اور ان کے ذریعے سے انسان قوی ہوتا ہے کہ جس طرح سے علی علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہ دعا طلب کی کہ پروردگارا! میرے جوارح کو قوی فرما، کس لئے؟

عَلٰی خِدْمَتِکَ.....(۶)

دنیا پرستی

اپنے دین کی خدمت کے لئے، لیکن ضروریاتِ زندگی جزوِ دنیا نہیں ہیں، یہ دنیا کے مضمون کا حصہ نہیں ہیں، یہ اس دنیا کا حصہ ہیں کہ جنہیں مزرعۃ الآخرہ کہا گیا ہے کہ آخرت مزرعہ ہے اور دنیا کھیتی ہے، وہ ایک الگ دنیا ہے کہ جسے آباد کرنا ہے، جس کی دنیا ویران ہے اس کی آخرت بھی ویران ہے، جس کا کھیت ویران ہے اس کی فصل بھی ویران ہے لیکن جو دنیا مذموم ہے اس کو قرآن نے بیان کیا ہے اور دنیا کی خوبصورت ترین تفسیر خود قرآن نے کی ہے کہ

اِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ......(۷)

یہ زندگانیٔ دنیا تو صرف ایک کھیل تماشہ ہے......

یہ لہو ولعب، یہ سرگرمیاں، یہ مشغولیتیں جو انسان نے ذہنی طور پر بنائی ہوئی ہیں۔ انسان زمین کو آباد کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ زمین کا مالک بننے کے لئے آیا ہے لیکن اس وقت دوڑ ہی اس پر قبضہ جمانے کے لئے ہے یہی دنیا ہے، دنیا یعنی میرا حصہ زیادہ ہو یعنی تکاثر، میرا میرا کرنا یہ سب دنیا ہے۔ دنیا کی مزید وضاحت فصلِ ادبِ سوم کے حصۂ دوم میں کی جا چکی ہے۔

غرور و تکبر

۹) غرور و تکبر

مانعِ فہم دیگر بہت سے ہیں لیکن جو موانع پیش ہو رہے ہیں یہ عمومی بھی ہیں یعنی تحصیل وتعلیم کے لئے بھی موانع ہیں۔ ان میں سے ایک غرور وتکبر ہے کہ انسان مغرور ہو کر اور تکبر کے ساتھ قرآن میں آئے، اپنے آپ کو کچھ سمجھ کر قرآن میں آئے، ایک مفسر، ایک مفکر، ایک فیلسوف اور فقیہ بن کر

قرآن میں نہ آئے۔انسان کو قرآن کی بارگاہ میں خشوع کے ساتھ اور عاجزی کے ساتھ آنا چاہئے، اس انداز کے ساتھ آئے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں، ایک جاہل اور معترف بہ جہالت بن کر قرآن کی خدمت میں آئے، فہم میں اور علم کے حصول میں غرور وتکبر سب سے بڑا مانع ہے، عموماً کچھ لوگ ذہین ہوتے ہیں کہ جو پیدائشی طور پر یا طبعی طور پر دوسروں سے فہم کے لحاظ سے تھوڑا بالاتر ہوتے ہیں، ان کو ایک بیماری فوراً لگ جاتی ہے، ابتداء سے ان کو ایک بیماری لگ جاتی ہے اور وہ ہے غرور و تکبر، ایک دم مغرور ہو جاتے ہیں چونکہ ایک ہی دفعہ مطلب بیان کرنے سے ان کو سمجھ میں آجاتا ہے، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم تو بہت بالا ہیں، ہمارا فہم بہت بالا ہے اور اپنے آپ کو آہستہ آہستہ مستغنی سمجھنے لگتے ہیں یعنی غور وفکر و تدبر اور مطالعہ سے بھی آہستہ آہستہ خود کو مستغنی اور بے نیاز سمجھتے ہیں۔ نہایتاً یہی طبقہ سب سے زیادہ محروم رہ جاتا ہے۔

غرور و تکبر

آپ طلاب میں بھی غور کریں کہ متوسط استعداد والے محنت کرتے رہتے ہیں لیکن یہ ذہین مغرور ہوتے ہیں، کلاس میں بھی درست توجہ نہیں کرتے ہیں، مطالعہ بھی درست نہیں کرتے ہیں، غرور کی وجہ سے سوال بھی نہیں کرتے ہیں، تکبر کی وجہ سے کسی کے پاس جاتے بھی نہیں ہیں، گھمنڈ کی وجہ سے سیکھتے بھی نہیں ہیں چونکہ ان کے اندر غرور موجود ہے اور بالآخر یہ طبقہ محروم رہ جاتا ہے۔تکبر لے کر قرآن کے پاس نہ جائیں بلکہ خضوع وفروتنی لے کر قرآن کے پاس جائیں، قرآن متکبرین کو کبھی بھی کچھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے چونکہ تکبر فقط خدا کو جچتا ہے، غیرِ خدا کو راس نہیں آتا ہے، صرف ذاتِ خدا متکبر ہے۔تکبر یعنی بزرگی، اظہارِ کبریائی۔ جب انسان اظہارِ کبریائی کرے تو اس کو متکبر کہتے ہیں

یعنی ایک بڑا انسان ہو، جس کے اندر کوئی خوبی ہو اور اس خوبی کا اظہار بھی کرے، دوسروں کے سامنے جتلائے بھی تو اس کو تکبر ہے، یہ فقط خدا کو جچتا ہے چونکہ ماسوا اللہ کسی میں کوئی کبریائی نہیں ہے، ماسوا اللہ سب میں فقر، عجز، احتیاج اور ناداری ہے لیکن کبریائی خدا میں ہے اور اظہارِ کبریائی بھی فقط خدا کو جچتا ہے۔

۱۰)تنگ نظری

تنگ نظری

مانع دیگر تنگ نظری ہے، قرآن نے خود بھی ذکر کیا ہے کہ تنگ نظری مانعِ فہمِ دین بھی ہے، مانعِ علم بھی ہے اور مانعِ ہدایت و مانعِ فہمِ قرآن بھی ہے، قرآن کا صریح دستور اور فتویٰ ہے کہ

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ... ..(۸)

پس خدا جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے.....

پہلے انسان اپنے اندر شرحِ صدر اور وسعتِ نظر پیدا کرے، وسعتِ دل پیدا کرے پھر قرآن اترتا ہے چونکہ قرآن بہت وسیع ہے، تنگ نظر، تنگ دل اور تنگ ذہن میں قرآن اترتا اور سماتا ہی نہیں ہے لہٰذا تنگ نظری کے جو باقی شعبے ہیں مثلاً تعصب ہے، حسد ہے، اگر یہ بیماریاں انسان کے اندر موجود ہوں تو انسان قرآن سے محروم ہے جیسا کہ علم سے بھی محروم ہے، کہتے ہیں کہ

اَلْحَسُوْدُ لَا یَسُوْدُ..... (۹)

اس کے دو معانی کیے گئے ہیں یعنی حسود، حسد کرنے والا کبھی محترم نہیں بن سکتا ہے، یہ کبھی

بھی ایسی شخصیت نہیں بنے گی کہ لوگ اس کا احترام کریں، اسے سیادت حاصل نہیں ہوگی، ایک یہ مانع ہے۔ ممکن ہے حسود لا یسود کا معنیٰ یہ ہے کہ حسود کبھی باسواد نہیں ہوسکتا ہے، کبھی عالم و آگاہ نہیں بن سکتا ہے چونکہ تنگ نظر و تنگ دل ہے، اس میں شرحِ صدر چاہئے اور خدا اگر کسی کو گمراہ کرنا چاہے تو اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔

اسی آیہ کے ذیل میں ہے کہ

وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ...... (۱۰)

اور جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار گزار بنا دیتا ہے جیسے آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو......

پس اس کا سینہ ہدایت کے لئے تنگ ہو جاتا ہے، اس میں ہدایت اترتی ہی نہیں ہے۔ سِفال گر بہت سارے برتن بناتے ہیں، کچھ برتن ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا پیٹ چھوٹا ہوتا ہے اور منہ بہت بڑا ہوتا ہے جیسے گملے اور گلدان ہیں، آپ گملا دیکھیں تو اس کا پیٹ چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن منہ بہت بڑا ہوتا ہے اسی لئے اس میں کچھ اگتا ہے، اسی لئے اس میں پھول وغیرہ اگاتے ہیں لیکن بعض برتن ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا گلا بہت تنگ ہوتا ہے لیکن پیٹ بڑا ہوتا ہے، ان میں کوئی بڑی چیز نہیں ڈال سکتے ہیں فقط مائعات ڈال سکتے ہیں جیسے صراحی ہے، اس کے اندر کوئی اور چیز نہیں ڈال سکتے ہیں چونکہ نہ ڈالی جاسکتی ہے اور نہ اس سے نکل سکتی ہے، تنگ دل انسان کے اندر کوئی چیز جاتی بھی نہیں ہے اور کوئی چیز باہر بھی نہیں آتی ہے۔

تنگ نظر سے کوئی استفادہ بھی نہیں کر سکتا ہے اور تنگ دل آدمی کو کوئی افادہ بھی نہیں ہو سکتا ہے اسلئے کہ اس کا منہ اور گلا ابھی اتنا تنگ ہے کہ معارف کا کوئی مطلب اس کے اندر اتر تا ہی نہیں ہے، قرآن کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ o (۱۱)

کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کا سینہ کشادہ نہیں کیا؟

یعنی ہم نے آپ کا سینہ کھولا اور موسیٰ علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہی دعا مانگی کہ

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي o (۱۲)

پروردگار میرے سینے کو کشادہ کر دے۔

یعنی اگر مجھے یہ ماموریت دینی ہے، مجھے یہ کام کرنا ہے تو اس کے لئے شرحِ صدر چاہیے، بدونِ شرحِ صدر یہ کام ممکن نہیں ہے۔

پس تنگ نظری بھی قرآن فہمی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۱۱) دنیوی افکار و نظریات سے متاثر ذہن

ایک اور مانع جو اس وقت زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقے کو درپیش ہے چونکہ قرآن کی طرف اس وقت رجحان ورغبت ہے لیکن موانع کے ساتھ رغبت ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن سے باہر بالآخر بہت سارے نظریات وافکار اور مفروضے موجود ہیں، تجربے کے تحت، فلسفے، تاریخ یا دیگر علوم کی وجہ سے

بہت سارے نظریات موجود ہیں، یوں تو نہیں ہے کہ لوگوں نے فقط قرآن پہ اکتفا کیا ہوا ہے، لوگوں نے اپنے طور پر بھی کئی نظریات بنائے ہوئے ہیں مثلاً دینِ آبائی ہے، رسوم و رواج ہیں، کلچر (Culture) ہے، ثقافت ہے، تمدن ہے۔

قرآن سے باہر یہ بھی ایک حقیقت ہے، بہت سارے کلچر ایسے ہیں کہ جن کا قرآن سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے حتیٰ مسلمان کلچر بھی ایسے ہیں کہ جو قرآن سے دور اور ضدِ قرآن کلچر ہیں، غیر مسلمانوں کے اندر بھی اپنے کلچر ہیں جیسے مغربی کلچر ہے کہ جس کا قرآن سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ضدِ قرآن ہے، اسی طرح سے بہت سارے فلسفے ہیں، مادی فلسفہ ہے یا دیگر فلسفی نظریات ہیں۔ کچھ لوگ فلسفہ زدہ ہیں کہ جو کچھ کسی فیلسوف کے نام پر یا کسی نے فلسفے کے نام پر بتا دیا ہے تو ان کے دل پر وہ درست بیٹھ گیا ہے، یہ بھی مقلد ہیں یعنی فلسفی نہیں ہیں بلکہ افکارِ فلسفی کی طرف ان کی رغبت ہے، یہ مقلدِ محض اور فلسفہ زدہ ہیں، جیسے اس وقت یہ مشکل کثرت سے ہے حتیٰ آہستہ آہستہ ابھی علماء و روحانیوں کے اندر بھی سرائیت کرتی جا رہی ہے، آپ حوزے میں بھی دیکھیں کہ اب آپ کو حجۃ الاسلام کم اور ڈاکٹرز زیادہ ملیں گے، وہی جو چند سال پہلے حجۃ الاسلام تھے اب کاٹ کر انہوں نے اپنے ساتھ ڈاکٹر لگا دیا ہے، کیوں ڈاکٹر ہو گئے ہیں؟ پہلے مثال پیش کر چکا ہوں کہ کسی فلسفے میں، کسی شعبے میں ایک ڈگری لے لی، چونکہ مدرک یا ڈگری کی طرف رجحان ہے، ڈگریوں کے ذریعے کاذب شخصیت بنانے کا یہ ایک ذریعہ ہے اور اس یونانی فیلسوف کا تذکرہ یہ ہے کہ وہ اسلام سیکھنے کے لئے آیا، مذہب تشیع دیکھنے کے لئے آیا اور اسے بڑی بڑی شخصیات سے ملایا گیا، سب

ڈاکٹروں سے ملایا تو اس نے کوئی نئی بات نہیں سنی، اس نے کہا کہ یہ تو وہی ہے جو ہم نے آپ کو سکھایا ہے، اب آپ کوئی ایسی بات بتائیں کہ جو آپ ہمیں سکھائیں، بعض اس طرح سے فلسفہ زدہ ہیں کہ بڑے بڑے فلسفیوں کے نام انہوں نے حفظ کیے ہوئے ہیں یا بعض کی آراء وافکار رٹ لیے ہیں اور ان کو ہر جگہ مناسبت سے یا بے موقع ٹھونستے ہیں مثلاً وضو کے مسئلے میں بھی جب تک یہ نہ کہیں کہ یاسپرس نے یہ کیا ہے اور ھائڈگر نے یہ کہا ہے تو ان کو تسلی نہیں ہوتی ہے، وضو کا ھائڈگر سے کیا تعلق ہے؟ یہ فلسفہ زدگی ہے کہ بے جا و نا جا اس کو فٹ کرتے جائیں۔ قرآن مادی اور من گھڑت فلسفوں کی تائید کے لئے نہیں آیا ہے۔

سائنس زدہ ذہن

۱۲) سائنس زدہ ذہن

سائنس زدہ ذہن بھی مانعِ فہمِ قرآن ہے چونکہ اس صورت میں قرآن اپنی کوئی مستقل بنیاد نہیں رکھتا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قرآن فلسفے کی تائید کے لئے یا سائنس کی تائید کے لئے آیا ہے یعنی قرآن کے پاس اپنی کوئی بنیادی چیز نہیں ہے، ان چیزوں کے اوپر بھی بحث کی ضرورت ہے، گنجائش ہے، ان مطالب پر بحث ہونی چاہئے جبکہ سائنس ناپائیدار علم ہے، خود سائنس کا یہ دعویٰ نہیں ہے، جتنے بھی علوم ہیں کہ جن کو ہم سائنس کہتے ہیں جیسے کیمسٹری، فزکس اور ان سے متعلقہ جو دیگر دوسرے شعبے ہیں ان میں بہت کم رنگ شعبہ شناخت و معرفتِ اشیاء کے بارے میں ہے، زیادہ تر ان کا شعبہ ساخت کے بارے میں ہے، سائنس ساختِ وسائل کا علم ہے نہ کہ شناختِ حقیقت کا علم

ہے، شناختِ حقیقت کے علم کو سائنس نہیں کہتے ہیں، سائنس یعنی تجربی علوم، تجربہ شناخت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ ساخت کا ذریعہ ہے، استفادے کا ذریعہ ہے یعنی آپ اس حقیقت سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں، یہ آپ کو سائنسی وسائل مہیا کر کے دے سکتے ہیں لیکن آیا اس شے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سائنس کا کام نہیں ہے، نہ وہ علم یہ کرتا ہے اور نہ مدعی ہے، یہ مدعی سست گواہ چست والی بات ہے۔

جیسے دو نمازی تھے ایک آدمی کسی اور مسجد میں نماز پڑھتا تھا دوسرا دوسری مسجد میں پڑھتا تھا، ایک نے دوسرے سے کہا کہ ہماری مسجد میں پڑھا کرو ہمارے مولانا مجتہد ہیں، دوسرے نے کہا کہ ہاں اچھے آدمی ہیں لیکن مجتہد نہیں ہیں، بہرکیف دونوں میں آپس میں بحث ہوگئی، جیسے ابھی ہوتا ہے کہ جس مدرسے میں میں پڑھتا ہوں اس مدرسے میں آجاؤ کہ یہ آغا بہت بڑے ہیں، جس درس میں میں جاتا ہوں اس درس میں آجاؤ کہ وہ درس بہت بہترین ہے، اسی طرح ان میں بھی ہوگیا کہ اس مسجد میں آؤ کہ یہ آغا مجتہد ہیں، بہرکیف یہ آپس میں الجھ پڑے، فیصلہ نہیں ہوا، انہوں نے کہا کہ جا کر خود ان سے پوچھ لیتے ہیں کہ مجتہد ہیں یا نہیں ہیں، جب ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ نہیں میں مجتہد نہیں ہوں۔ یا تو واقعاً منصف تھے کہ نہیں تھے اور انہوں نے اقرار کیا یا انکسار کیا کہ مجتہد تھے اور کہہ دیا کہ میں مجتہد نہیں ہوں، ہر دو صورتوں میں انہوں نے انکار کیا کہ میں مجتہد نہیں ہوں، دونوں باہر نکلے تو جو مدعی تھا کہ مجتہد نہیں ہے اس نے کہا کہ دیکھا میں تو کہتا تھا کہ مجتہد نہیں ہے لیکن دوسرا جو مرید تھا اس نے کہا کہ نہیں، یہ مجتہد ہے، یہ پاگل ہے اس کو پتہ نہیں ہے کہ یہ مجتہد ہے، کہا کہ اس کا دماغ خراب ہے، یہ مجتہد ہے اس کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے اسی طرح خود سائنس

سائنس زدہ ذہن

مدعی نہیں ہے کہ ہمارا کام شناختِ حقائق ہے لیکن یہ کہتے ہیں کہ سائنسدانوں کا دماغ خراب ہے درحقیقت شناختِ حقائق کا یہی ذریعہ ہے۔

جو لوگ یہ کام کرتے ہیں انہیں درست سائنس بھی معلوم نہیں ہے، اتفاقاً جو اس وادی میں آگئے ہیں اور گمراہی پھیلا رہے ہیں انہیں نہ قرآن کا درست علم ہے اور نہ سائنس کا درست علم ہے، اگر سائنس کو مبانی کے ساتھ اور بنیاد کے ساتھ درست سمجھا ہوتا تو کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے، کبھی بھی کسی سائنسدان نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جنہوں نے سائنس کی دو کتابیں پڑھ لیں، چار فارمولے رٹ لئے اور پھر میدان میں آگئے پھر آکر لوگوں کو تنگ کرتے ہیں اور مسائل کھڑے کرتے ہیں، نیم حکیم خطرۂ جان ہوتا ہے تو نیم سائنسدان خطرۂ قرآن ہے اور اس طرح کے بعض مذہبی متعصبی بھی مانعِ فہم قرآن ہیں کہ ایسے لوگ خارج از قرآن خواب دیکھ کر اور خواب سن سن کر فرقہ ای تعصبی ذہنیت بنا لیتے ہیں پھر اس کے بعد قرآن کی طرف آتے ہیں اور قرآن سے خواب کے سارے مضمون استخراج کرتے ہیں، یہ بھی مانع از فہمِ قرآن ہیں، یعنی خارج از قرآن کی بات ہو رہی ہے کہ انسان من گھڑت نظریات و تصورات بنا کر پھر ان کے تناظر میں قرآن کو سمجھے، سائنسی نظریات رٹے اور ان کو قرآن کے تناظر میں بیان کرنا شروع کردے یا خارج از قرآن اپنے متعصبانہ مذہبی افکار بنالے اور ان کی روشنی میں کلچرل مسائل، ثقافتی مسائل اور فرہنگی مسائل کو قرآن سے آکر استخراج کرے تو یہ مانع از فہمِ قرآن ہے۔

بعض لوگ تجربی علوم میں اتنے سائنس زدہ ہیں کہ ان کے نزدیک خارج از قرآن جو کچھ

سائنس نے کہا ہے وہ درست ہے اور جوان کے دل پہ بیٹھا ہوا ہے اسی کو مانتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ سائنس کے افکار کو قرآن سے نکالیں۔ آہستہ آہستہ باہر یہ کام شروع ہوا ہے اور یہ عوام پسند چیز ہے، قرآن کی سائنسی تفسیریں اس وقت زیادہ مقبولِ عام ہو رہی ہیں مثلاً چودہ سو سال بعد آج سائنس دانوں نے کشف کیا ہے لیکن یہ چودہ سو سال پہلے قرآن میں تھی، بعض نے سوال اٹھایا کہ اگر چودہ سو سال پہلے تھی تو پھر چودہ سو سال پہلے سے یہ سب کچھ کیوں نہیں تھا؟ کہتے ہیں یہ بجلی چودہ سو سال پہلے سے قرآن نے پیش کی ہوئی تھی اور دلیل دیتے ہیں کہ

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ...... (۱۳)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے......

یہ بجلی ہے؟ انسان قرآن سے کس قدر دور ہے کہ

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ......

سے بجلی استفادہ کرے، جس طرح ذاکر کرتے ہیں کہ قرآن سے ذوالجناح ثابت کر رہے ہیں، انہوں نے ثابت کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ آیتِ قرآن دلیل ہے،

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ (۱۴)

اور جب وحشی جانور اکھٹے کر دیے جائیں گے۔

یعنی جب قیامت میں میدانِ محشر ہوگا اور بعض کو کہا جائے گا کہ ان وحشیوں کو جہنم کی طرف لے جاؤ لیکن یہ اس آیت سے ذوالجناح ثابت کر رہا ہے، چونکہ قرآن نہیں آتا تھا، پڑھا ہوا نہیں تھا

حالانکہ گھوڑوں کا ذکر قرآن میں فراواں ہے لیکن اسے کہیں اور نظر نہیں آیا لہٰذا کہا کہ

وَإِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ○

اور اس سے ذوالجناح ثابت کیا یا وہ دوسرا جس نے جلوس کا رُوٹ (Route) ثابت کیا، اس سے سوال اتنا ہوا تھا کہ ہم پر ماتم میں اشکال ہوتا ہے کہ شیعہ ماتم کرتے ہیں اس کی کیا دلیل ہے؟ قرآن سے کیا دلیل ہے؟ انہوں نے کہا کہ قرآن میں دلیل ہے، میں آج ثابت کرتا ہوں، ماتم ثابت کرتا ہوں، جلوس ثابت کرتا ہوں، قرآن سے جلوس کا روٹ بھی ثابت کرتا ہوں اور اس نے ثابت کیا کہ کراچی میں ایک جلوس نشتر پارک سے صدر جاتا ہے، انہوں نے ثابت کیا کہ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ○

علم کا جلوس نشتر پارک سے صدر تک، یہ تمسخرِ قرآن، استہزائے قرآن ہے اور قرآن کے ساتھ مذاق اور تمسخر آیاتِ خدا ہے، اسی طرح سے یہ بھی اسی کی شبیہ ہے کہ جنہوں نے سائنسی بجلی

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ......

سے کشف کی ہے۔ دیگر آیاتِ کریمہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا،

بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا......(۱۵)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو ایسے ستونوں پر استوار کیا ہوا ہے کہ جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے، اس سے انہوں نے کیا کشف کیا؟ کششِ ثقلِ زمین ثابت کی، اس کے علاوہ بھی بہت ساری اس طرح کی چیزیں ہیں، یہ اشتباہ ہے، قرآن سائنسی تائید کے لئے نہیں آیا ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ طبقہ

زیادہ مبتلا ہے اور اس وقت زیادہ مفسر اسی طبقے سے پیدا ہو رہے ہیں مثلاً پاکستان میں اس وقت یہ کام ہو رہا ہے چونکہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم نے مولویوں سے اسلام کو نجات دینی ہے البتہ اپنی جگہ ٹھیک کام ہے کہ اگر اسلام کو ان مولویوں سے نجات مل جائے لیکن مولویوں سے نجات دے کر اسلام کو بدتر طبقے کے سپرد نہیں کرو، مولویوں سے نجات دے کر ان کو جہلاء کے سپرد نہ کرو کہ جن کو نہ اسلام کی خبر ہے، نہ دین کی خبر ہے، نہ دنیا کی خبر ہے اور وہ انٹیلیکچولز (Intellectuals) بن کر آئیں کہ جنہوں نے مثلاً قرآن کی الف ب بھی نہیں پڑھی ہے اور قرآن کی آیات کو اس طرح سے لوگوں کے سامنے پیش کریں، یہ بھی آیاتِ خدا کا مذاق ہے اور آیاتِ خدا کا تمسخر اڑانے والوں کیلئے قرآن نے صریح اعلان کیا ہے کہ

وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَاصِرِيْنَ ٥ ذٰلِكُمْ بِأَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ٥(١٦)

اور تم سب کا انجام جہنم ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ تم نے آیاتِ الٰہی کا مذاق بنایا تھا اور تمہیں زندگانیٔ دنیا نے دھوکے میں رکھا تھا تو آج یہ لوگ عذاب سے باہر نہیں نکالے جائیں گے اور انہیں معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں دیا جائے گا۔

۱۳)عوام زدگی

ان موانع میں سے ایک عوامانہ ذہنیت ہے یعنی عوام پسندی، عوام پرستی وعوام زدگی قرآن فہمی

کی راہ میں بہت بڑا مانع ہے، اگر انسان میں عوام زدگی کی خصلت پیدا ہو جائے تو اس کے کام خراب ہیں، اس کا دین و دنیا ویران ہے، جو عوام زدہ اور عوام پسند بن گیا اس کی دنیا و آخرت تباہ ہے، اگر اس انسان میں قرآن اور قرآن شناسی کا محرک موجود ہے، قرآن کی طرف رغبت بھی ہے اور دل آمادہ کر کے قرآن کی بارگاہ میں پہنچ بھی آیا ہے تو یہ مانع حائل ہو جاتا ہے لہٰذا یہ ہمیں مرادِ قرآن و حقیقتِ قرآن و مقصودِ قرآن تک پہنچنے نہیں دیتا ہے۔

عوام زدگی

عوام زدگی یعنی انسان کا ذوق و ذائقہ اور مزاج عامیانہ ہو جائے، عوام کو خوش کرنا، عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا، یہ صرف قرآن ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام علوم ایسے ہیں، علمِ دین میں خصوصاً یہ مانع بہت بڑا مانع ہے کہ جو اکثریت کو لاحق ہے، اکثریت کا دامن اس مانع میں آلودہ ہے اور بہت بڑی دیوار بن کر حائل ہے یعنی جو کچھ انسان پڑھتا ہے، جو کچھ کر رہا ہے تو ایک نیم نگاہ عوام پہ لگی ہوئی ہے کہ میں وہ تیاری کروں کہ جو عوام کو پسند آجائے، میں وہ مضمون اپناؤں کہ جو عوام کو پسند آئے، میں ایسا حلیہ اپناؤں کہ جو عوام کو پسند آئے یعنی عوام میں مقبول بننا اور عوام میں اپنے آپ کو موردِ قبولیت قرار دینے سے انسان قرآن سے محروم رہ جاتا ہے، نہ صرف قرآن سے بلکہ ہر چیز سے محروم رہ جاتا ہے، عوام زدہ انسان اور عوام پسند کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مقلدِ عوام ہے، اس انسان کا ذہن ہی عوامانہ اور عامیانہ ہو جاتا ہے، ایسے لوگ بہت سارے ہیں کہ جو مطلب اور حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن عوام پسندی اور عوام زدگی کی وجہ سے حقیقت کا اظہار نہیں کرتے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ عوام کو جیسی بات پسند ہے ہم ویسی بات کریں۔

ہمارا معاشرہ اس آفت میں زیادہ مبتلا ہے، اہلِ علم کو متوجہ ہونا چاہیئے، آفاتِ علماء اور آفاتِ طلابِ علومِ دینی میں سب سے بڑی ایک آفت اور بلا یہ ہے کہ ان کا مطمح نظر اور مقصود یہ بن جائے کہ ہم نے عوام کو خوش کرنا ہے، عوام میں مقبول واقع ہونا ہے، عوام کی توجہ ہماری طرف آئے، روایات میں جن اہلِ علم کی مذمت کی گئی ہے اور جس علم کی مذمت کی گئی ہے اس میں سے ایک مصداق یہ بھی ہے کہ وہ شخص جو علم فقط اس لئے حاصل کرے کہ اس علم کے ذریعے میں لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراؤں، زیادہ سے زیادہ میری طرف توجہ ہو، لوگوں میں ہمیشہ مرکزِ توجہ واقع رہوں، فراموش شدہ انسان نہ رہوں،

ایک وہ انسان ہے کہ جو علم کے ذریعے سے معیشت کماتا ہے،

يَأْخُذُبِهِ مِنَ الْأُمَرَاءِ. (۱۷)

یعنی علم کے ذریعے سے اپنا روزگار اور اپنا کھانا پینا بناتا ہے، علم فروشی کرتا ہے، دین فروشی کرتا ہے، ایک وہ انسان ہے جو مباہات وفخر فروشی کرتا ہے صرف دوسروں پر تکبر وغرور کرنے کے لئے کہ میں کتنا بڑا عالم ہوں؟ اور ایک انسان اس لئے علم حاصل کرتا ہے کہ

لِيُصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ......

جو علم حاصل کرتا ہے تاکہ لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرائے، یہ عوام زدگی اور عوام پسندی ہے، بہت اعلیٰ درجات تک پہنچ کر بھی نظریں عوام پر لگی ہوتی ہیں، جیسے وہ ایک طنزیہ نکتہ کسی نے علامہ اقبالؒ کے اس ماڈل (Model) پرندے یعنی شاہین کے بارے میں تنقید کے طور پر بیان کیا

عوام زدگی

ہے۔علامہ اقبالؒ نے یہ ماڈل انسان کے لئے، جوان کے لئے اور مسلمان کے لئے پیش کیا ہے اور شاہین کی خصوصیات بیان کی ہیں کہ شاہین کی مطلوبہ حالت معراجِ انسانیت پر پرواز ہے۔

کسی نے علامہ اقبالؒ پر طنزیا نقد کیا کہ آپ نے جو ماڈل پیش کیا ہے وہ اتنا اچھا بھی نہیں ہے کہ آپ اس کے ذریعے سے وجد میں آئے ہوئے ہیں، یہ شاہین بہت اونچا اڑتا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس میں شجاعت بھی ہے اور جھپٹتا بھی ہے، لپکتا بھی ہے، اس کے اندر بڑی خصوصیات ہیں لیکن بہت اونچی اڑان اڑ کر بھی اس کی نگاہیں زمین پر ہوتی ہیں اور زمین پر بھی چوہا ڈھونڈ رہا ہوتا ہے، یہ شکاری ہے کہ جب اس کو کوئی شکار نہیں ملتا ہے تو چوہے شکار کرتا ہے، پس انہوں نے کہا کہ یہ مناسب مثال نہیں ہے، پہلے بھی عرض کیا کہ علامہ اقبالؒ کا دفاع کیا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں جب کوئی مثال دی جاتی ہے تو اس کی ساری منفی یا مثبت خصوصیات مدِنظر نہیں ہوتی ہیں بلکہ مثال کے اندر ایک جہت مدِنظر ہوتی ہے۔

جب کسی کو کہا جاتا ہے کہ یہ شیر ہے تو دم، پنجے اور باقی چیزیں اس تشبیہ میں شامل نہیں ہوتی ہیں، یہ ادبیات کا ایک قاعدہ ہے لہٰذا علامہ اقبالؒ کے شاہین کا چوہا ڈھونڈنا علامہ اقبالؒ کی تشبیہ میں شامل نہیں ہے، صرف پرواز دخیل ہے، پرواز اور صرف پرواز، یعنی شاہینِ اقبال زمین کی طرف نگاہ نہیں کرتا ہے بلکہ فقط آسمان کی طرف دیکھتا ہے لیکن اپنی جگہ پر جس نے بھی نقد کیا ہے بہت ظریف و لطیف ہے، جو اقبالؒ پیش کرنا چاہتے ہیں اگر اس پہ نہ بھی فٹ (Fit) آتا ہو تو بہت سارے لوگوں پر فٹ ہے، بعض لوگ بڑی اونچی پرواز اڑتے ہیں، علم کے بہت اعلیٰ ترین درجے پر جا پہنچتے ہیں مگر

وہاں پہنچ کر بھی نظریں زمین پر، مال پر، مادیت پر، خمس پر اور دیگر وجوہات پر لگی ہوتی ہیں، اتنے اعلیٰ درجے پر پہنچ کر بھی نگاہیں مقلدین پر لگی ہوتی ہیں، عوام پسندی یہاں انسان کو نقصان دیتی ہے اور گرادیتی ہے کہ اکثریت کے اندر یہ موجود ہے۔

اس رجحان عوام زدگی میں بڑی لذت ہے، جو اس لذت میں مبتلا ہیں ان کو جا کر دیکھیں کہ وہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں کہ صرف عوام میں مقبول رہیں، بعض ایسے لوگ ہیں کہ جو عوام میں مقبول بننے کے لئے مثلاً جہاں مجلس پڑھنی ہوتی ہے یا جہاں جلسہ جلوس کرنا ہوتا ہے وہاں خود اپنا اشتہار لکھتے ہیں اور پیسہ بھی اپنی جیب سے دیتے ہیں اور اشتہار کا سائز بھی خود بتاتے ہیں کہ ہمارے نام کا یہ اشتہار لگایا جائے یعنی بانی مجلس کا کچھ بھی خرچہ نہیں ہوتا ہے، سب کچھ یہ خود کرتا ہے کیونکہ عوام پسندی کے اندر لذت ہے، جب آپ عوام کے نزدیک مقبول واقع ہو جائیں اور عوام آپ کو قبول کرلے تو انسان کو بہت فوق العادہ لذت محسوس ہوتی ہے، جو اس عارضے میں مبتلا ہیں ان کو پتہ ہوگا کہ کتنی لذت بخش چیز ہے، خدا بچائے اس لذت سے، عوام میں مقبول ہونا عیب نہیں ہے لیکن اس سے لذت اٹھانا عیب ہے کہ میں عوام میں بڑا مقبول انسان ہوں۔

حکیم ثنائی غزنوی فرماتے ہیں کہ

زینے ردو قبول عامہ خود را خرمساز

زان کار عامہ بنود جز خری یا خرخری

گاو را دارند باور در خدائی عامیان

عوام زدگی

نوح دا باور نداد انداز پئے پیغمبری...... (۱۸)

یعنی عوام کا کام یہ ہے کہ یا تو خر بن جاتے ہیں کہ دوسرے ان پر سواری لیتے ہیں، جس طرح سے ابھی پاکستان میں ہے، دو تین پارٹیاں گدھے پر سوار ہونے کے لئے تیار ہیں، اب معلوم نہیں ہے کہ گدھا کس کو سواری دیتا ہے، گدھا یعنی یہی عوام۔ اس وقت بعض فوجی و غیر فوجی آپس میں مرج (Merge) ہو کر ایک ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار ہیں اور وہ گدھا اتنا مضبوط ہے کہ دونوں کو سواری دے سکتا ہے، پاکستانی عوام کا گدھا دونوں کو سواری دے سکتا ہے، یا خرخری ہے یعنی نافہمی، نابلدی، اگر یہ عوام ماننے پہ آجائیں تو گائے کو خدا مان لیتے ہیں اور اگر نہ ماننے پہ آئیں تو نوح علیہ السلام کو نبی بھی نہیں مانتے ہیں۔ آپ نے اگر ان کے پیچھے چلنا شروع کر دیا، ان کو خوش کرنا، ان کی خوشنودی حاصل کرنا اور ان کے اندر مقبول بننا شروع کر دیا تو محروم رہ جاؤ گے،

خَسِرَ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃَ .... (۱۹)

یعنی دنیا بھی تباہ اور آخرت بھی تباہ ہے، بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جو سوچتے ہیں کہ ہمارے بارے میں لوگ کیا کہیں گے؟ لوگوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ عوام کی خاطر گدھے کو سواری دینا پڑتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ باپ اپنے بیٹے کے ساتھ جا رہا تھا، گدھا بھی ساتھ تھا اور دونوں گدھے پر بیٹھے ہوئے تھے، ایک محلے کے عوام نے کہا کہ یہ کتنے ظالم ہیں کہ معصوم بے زبان جانور پر ظلم کر کے دونوں بیٹھے ہوئے ہیں، دونوں اتر گئے اور چلنا شروع کر دیا، اگلے محلے کے عوام نے کہا کہ کتنے بیوقوف ہیں؟ خالی سواری ساتھ جا رہی ہے اور یہ دونوں پیدل چل رہے ہیں، پھر باپ بیٹھ گیا اور

بیٹے نے چلنا شروع کر دیا، تیسرے محلے کے عوام نے کہا کہ زمانہ کتنا الٹا ہو گیا ہے کہ چھوٹا سا معصوم بچہ چل رہا ہے اور یہ گھبرو باپ سواری لے رہا ہے، پھر باپ اتر گیا اور بیٹے کو بٹھا دیا، اگلے چوتھے محلے کے عوام نے کہا کہ آج کل کے بچے دیکھو کہ بوڑھا باپ ساتھ چل رہا ہے اور بچہ سواری لے رہا ہے، عوام راضی نہیں ہوئے، آخر کار ان دونوں نے مل کر گدھے کو سر پر اٹھا لیا کہ شاید اس طرح سے عوام راضی ہو جائے اور جو شخص بھی عوام کو راضی کرتا ہے یہ مثال اسکے لئے ہے، جو شخص بھی عوام کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ میرے متعلق لوگ اچھی رائے رکھیں تو آخر کار اس کو گدھے کو سواری دینا پڑتی ہے، یہ طے ہے کہ آخر کار گدھا اٹھایا ہوتا ہے۔

واقعاً عوام زدگی قرآن کی فہم میں بہت بڑا مانع ہے، یہ عامیانہ طریقہ ہے کہ قرآن سے وہ نکتے ڈھونڈیں کہ جو عوام کو خوش کریں اور عوام کو قرآن سے ایسی راہیں بتائیں کہ جو دین خدا اور خود قرآن کے خلاف ہیں چونکہ مقصود نہ قرآن ہے، نہ خدا ہے، نہ دین ہے بلکہ فقط عوام مقصود ہیں اور عوام زدہ لوگ جب قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو سمجھ نہیں پاتے ہیں چونکہ ذہنوں پہ غلبۂ عوام زدگی ہوتا ہے، یہ بہت خطرناک چیز ہے، اس سے زیادہ درج کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً اہل علم و طلابِ علوم کیلئے چونکہ یہ لوگ اس معرضِ خطر میں ہیں، طلابِ علومِ دینی عوام زدگی کے معرضِ خطر میں ہیں، دوسرے بھی ہیں لیکن اس خطرے میں سب سے زیادہ اہلِ علم اور علماء ہیں۔ دیگر موانع اس فصل کے حصۂ چہارم میں درج کیے جائیں گے۔

عوام زدگی

حوالہ جات

(۱)......(بانگِ درا،حصۂ سوم،صفحہ ۲۸۱)

(۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ۹)

(۳)......(سورۂ مبارکہ نحل،آیہ۹۸)

(۴)......(وسائل الشیعة- الفقیه المُحَدِّثِ الشیخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ،المتوفی سنَة ۱۱۰۴ ھ،الجزء ۲،صفحہ ۴۳۸) (الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰهِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی،الجزء ۱۶،صفحہ ۲۱۷) (تفسیر نور الثقلین،الجزء ۴،صفحہ ۵۰۰)(تفسیر نمونہ-جمعی از فضلا) (علوم طبیعت در قرآن)(الخصال،الجزء ۱،صفحہ ۵۹)

(۵)......(سورۂ مبارکہ جاثیہ،آیہ۲۳)

(۶)......(دعائے کمیلؒ)

(۷)......(سورۂ مبارکہ محمدؐ،آیہ۳۶)

(۸)......(سورۂ مبارکہ انعام،آیہ۱۲۵)

(۹)......(مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ- العلامة المجلسی، الجزء ۱۰، صفحہ ۱۶۶) (مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسی، الجزء ۱۲، صفحہ ۲۱) (بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسی " قدس اللّٰہ سرہ "، الجزء ۷۰، صفحہ ۲۲۸)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ۱۲۵)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ شرح، آیہ۱)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ طہ، آیہ۲۵)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ نور، آیہ۳۵)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ تکویر، آیہ۵)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ رعد، آیہ۲)(سورۂ مبارکہ لقمان، آیہ۱۰)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ۳۵،۳۴)

(۱۷)......(بحار الانوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء۲، صفحہ۳۸، حدیث۲۱)

(۱۸)......(دیوان حکیم ثنائی غزنوی، قصیدہ شمارہ۱۸۵)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ حج، آیہ۱۱)

فصلِ ادبِ ششم

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصّہ چہارم)

۱)ظن و گمان پر اکتفا کرنا

☆یقینِ حقیقی

☆جہلِ مرکب

☆تقلیدی یقین معرضِ زوال میں

☆یقینِ حقیقی کیلئے تین ارکان

☆اوائلِ قرآن میں مُخَاطَبِیْنِ قرآن کی تقسیم

الف)پہلا طبقہ

ب)دوسرا طبقہ

ج)تیسرا طبقہ

☆عُلَمَاء اور ظُنَنَاء

☆امانی، بنی اسرائیل کی مشکل

۲)قساوتِ قلبی

۳)ترکِ عمل

٤)قرآن کا آلائی استعمال

٥)کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

٦)جَلد بازی

٧)لکیر کا فقیر ہونا

٨)خود کو راھنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھنا

٩)ثانوی مطالب پہ توجہ دینا

١٠) اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجہی

١١)فقط انتخابی آیات پر توجہ دینا

آدابِ فہمِ قرآن میں ہماری بحث ادبِ ششم یعنی رفعِ موانعِ فہم میں جاری ہے کہ قرآن خوان اور قرآن شناس انسان اگر چاہتا ہے کہ قرآن کی بارگاہ سے استفادہ کرے اور اسرار و حکمتِ قرآن و معارفِ قرآن سے اپنے وجود کو منور کرے تو پہلے وہ اپنے دل کے اندر یا وجود سے باہر حائل موانع کو برطرف کرے اور موانع سمیت اگر اپنی پوری عمر بھی فہمِ قرآن میں صرف کر دے تو اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

۱) ظن و گمان پر اکتفا کرنا

ایک مانعِ دیگر ظن و گمان پر اکتفا کرنا ہے۔ فہمِ قرآن کے لئے اگر انسان ظن پرست اور تابعِ گمان زدہ ہو تو یہ مانع از فہمِ قرآن ہے۔ قرآن مجید نے بھی بعض کو اسی لئے محروم سمجھا ہے کہ

وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ٥(١)

اور انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان کے خیالات ہیں اور بس۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ٥(٢)

ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور بس وہ اپنے خیالِ خام میں رہتے ہیں۔

ان کی مشکل یہ ہے کہ ان کے ظنون ہی ان کی کتابیں ہیں یعنی از نظرِ فہم و از نظرِ ادراک انہوں نے اتنا تکامل نہیں کیا ہے کہ اپنے ذہن کو درحدِ یقین لے آئیں، یہ یقین سے نیچے کم تر از یقین پر اکتفا کر لیتے ہیں کہ اس مورد و مشکل میں اکثر انسان مبتلا ہیں۔ انسان کے بہت سارے

اعتقادی مسائل اور مشکلات کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان یقین سے نیچے نیچے کسی حالت پر اکتفا کرلیتا ہے، ایک تو حالتِ شکاکیت ہے یعنی تذبذب و تردید کی حالت ہے، گمان تردید سے ہٹ کر ایک حالتِ دیگر ہے، انسان کے دل میں ایک رجحان پیدا ہوتا ہے لیکن یقین نہیں ہوتا ہے اور بالفرض اگر یقین ہو بھی تو وہ بصورتِ جہلِ مرکب ہے یعنی بعض اوقات انسان جہلِ مرکب کو یقین سمجھ لیتا ہے۔

☆یقینِ حقیقی

ایک حالت کو اصطلاح میں یقینِ حقیقی کہا جاتا ہے، اہلِ علم کی اصطلاح میں یہ یقین بمعنیٰ اخص ہے یعنی ایسا یقین کہ جس کے اندر مزید کئی اور یقین بھی موجود ہیں، یقینِ حقیقی دراصل کئی اور یقینوں کا مجموعہ ہوتا ہے، انسان اس وقت یقینِ حقیقی کی تعبیر کرسکتا ہے کہ اس کے اندر اعتقادِ جازم ہو یعنی ایسا اعتقاد کہ جس کے خلاف انسان کے ذہن میں کوئی احتمال موجود نہ ہو اور دوسری خصوصیت اس کے اندر یہ ہے کہ یہ مطابق بہ واقع بھی ہو یعنی یہ بھی یقین ہو کہ میرا یقین بمطابقِ واقع ہے یعنی حقیقت بھی ایسے ہی ہے کہ جیسے مجھے یقین ہے، چونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک شے کی نسبت یقین حاصل کرتا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہوتی ہے کہ جسے جہلِ مرکب کہا جاتا ہے، غالباً جو اپنے آپ کو عالم سمجھتے ہیں، حقائق کے بارے میں خود کو اہلِ علم سمجھتے ہیں وہ اغلب جہلِ مرکب کو علم کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ ہم اس کو روزمرہ کی مثالوں میں ہی تلاش کرسکتے ہیں یعنی ہم خود بھی بعض اوقات جہلِ مرکب کا شکار ہیں اور یہ ساری بحث اسی لئے ہے کہ ہم خود اپنے لئے ہی یہ سب کچھ

سمجھیں، اصلاح کریں اور یقین کی منزل تک پہنچیں۔

مثلاً انسان کسی اور کا جوتا اس اعتقاد کے ساتھ پہن لیتا ہے کہ یہ میرا اپنا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ میرا اپنا ہے لیکن یہ یقین مطابق بہ واقع نہیں ہے، حقیقت ایسے نہیں ہے، پس یہ یقین پر ہے لیکن یقین غیرِ واقعی ہے، یقینِ کاذب ہے، اکثریت کے یقین اسی قبیل کے ہیں یعنی ہمیں جو بہت ساری چیزوں کا یقین ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ چونکہ حقیقت کچھ ہے اور ہمیں اس کے لئے کسی اور طرح کا یقین ہے اور ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارا یقین حقیقت کے مطابق، واقعیت کے مطابق اور ہمارے ذہن سے باہر موجود واقعیت کے مطابق نہیں ہے، پس دوسری خصوصیت یہ ہو کہ انسان کا یقین مطابق بہ واقع بھی ہو یعنی انسان کے پاس حجت ہو، ایسا ذریعہ ہو کہ جس سے یہ کشف کر سکے کہ جیسا مجھے یقین ہے ویسا ہی حقیقت میں بھی موجود ہے، مثلاً اگر مجھے معلوم ہے کہ میرے سامنے یہ میز ہے تو واقع میں بھی یہ میز ہونی چاہئے نہ یہ کہ فقط میرے ذہن میں میز ہو یا مجھے یوں گمان ہو یا خیال ہو کہ یہ میز ہے درحالیکہ یہ کوئی اور چیز ہو اور اس کے اندر خصوصیتِ دیگر یہ ہے کہ یقین کہ جو مجھے حاصل ہے وہ جزم ہے، اعتقاد بہ واقع ہے۔ یہ معرضِ زوال میں بھی نہ ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ میرا یہ یقین بعد میں زائل ہو جائے، یقین کیوں زائل ہو جاتا ہے؟ اس لئے کہ جن منابع سے، جن ذریعوں سے انسان کو یقین حاصل ہوتا ہے ان میں سے بعض پائیدار اور بعض ناپائیدار ذریعے ہوتے ہیں۔

اگر تقلید کے ذریعے سے انسان کو یقین حاصل ہوا ہو تو وہ بعد میں زائل ہو سکتا ہے، تقلید کے معانی یہ ہیں کہ کسی نے کچھ کہا اور مجھے بھی یقین ہو گیا، اس سے میں نے کوئی دلیل و حجت نہیں مانگی

اور نہ اس نے پیش کی ہے، اس نے بھی ساتھ میں برہان قائم نہیں کیا بلکہ صرف اس کے کہنے پر مجھے یقین ہو گیا ہے یا اس کے کہنے پر میرا یقین بھی ہے لیکن اگر کل کو وہ اپنی رائے سے منصرف ہو جاتا ہے کہ جس کے کہنے پر مجھے یقین ہوا تھا تو خوانخواہ میرا یقین بھی ختم ہو جائے گا۔ مثلاً فرض کریں کہ میں نے کسی سے پوچھا یہ آواز کس کی آئی ہے؟ وہ کہے کہ آپس میں گاڑیاں ٹکرائی ہیں، ایکسیڈنٹ (Accident) کی آواز آئی ہے، مجھے بھی یقین ہو گیا کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، بعد میں اس نے کہا کہ نہیں ایسے نہیں ہوا بلکہ مجھے اشتباہ ہوا تھا، درحقیقت کوئی چیز چھت سے گری تھی وہ اس کی آواز تھی، پس وہ انسان اپنی رائے سے پھر گیا، خوانخواہ اس اتفاق کا یا حادثے کا میرا یقین بھی متزلزل ہو گیا ہے لہٰذا یہ تقلیدی اور دیکھا دیکھی یقین ہے کہ جو انسان کو دوسروں کے کہنے پر بغیر دلیل و حجت کے حاصل ہوتا ہے۔ یہ یقین معرضِ زوال میں ہوتا ہے، اس کو یقین بمعنیٰ اخص یا یقینِ حقیقی نہیں کہتے ہیں بلکہ یہ یقینِ کاذب ہے۔ یقینِ متزلزل یعنی ناپائیدار یقین یا جہالت کہ جس کے اندر انسان کو احساسِ یقین ہوتا ہے لیکن وہ جہلِ مرکب ہے۔

☆جہلِ مرکب

جہلِ مرکب یقین نما ہوتا ہے، اس کی شکل اور حلیہ یقین جیسا ہے لیکن حقیقتاً یقین نہیں ہے، یہ حقیقتاً جہالت ہے کہ انسان ایک چیز کو نہیں جانتا ہے اور اپنے نہ جاننے کو بھی نہیں جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوں، اکثریت کو کہ جسے اپنے اندر احساسِ علم ہوتا ہے جہلِ مرکب کی وجہ سے یقین

ہوتا ہے چونکہ استثنائی لوگ ایسے ہیں کہ جن کا یقین واقعاً دلیل و مدرک و برہان کی وجہ سے ہے یعنی ان کو ایک معتبر اور قابلِ قبول منبع سے یقین حاصل ہوا ہے تو یہ یقینِ حقیقی ہے لیکن غیر قابلِ قبول منبع سے حاصل شدہ یقین جہلِ مرکب ہے جیسے خرافاتیوں کو یقین ہوتا ہے۔ جو لوگ خرافات کے قائل ہوتے ہیں یا مبتلا ہوتے ہیں تو انہیں یقین ہوتا ہے کہ فلاں چیز کی وجہ سے مجھے یہ حادثہ پیش آیا ہے جیسے عموماً رہتا ہے کہ اس پر جن آ گئے ہیں، اس پر جادو کر دیا گیا ہے، اس کے اوپر تعویذ کر دیا گیا ہے، اس کو کسی نے نفرین کر دی ہے، اس کی کسی نے روزی بند کر دی ہے، کسی نے اس کا رزق بند کر دیا ہے اور اسی طرح کی خرافاتی چیزیں لوگوں کے اندر موجود ہیں، ان کو یقینِ کامل ہوتا ہے لیکن ان کا یہی یقین جہلِ مرکب ہے، مثلاً ایک شخص بیمار ہوا ہے اور انہیں اس کی بیماری کا علم نہیں ہے لیکن انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ ہمیں اس کی بیماری کا علم نہیں ہے، وہ اپنی جہالت کو بھی نہیں جانتے ہیں،

لَا أَدْرِي نِصْفُ الْعِلْمِ......(۳)

مجھے معلوم نہیں ہے کہنا، آدھا علم ہے......

قَوْلُ لَا أَعْلَمُ نِصْفُ الْعِلْمِ......(۴)

یہ کہنا کہ میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے......

جہل بسیط نصف العلم ہے اور آدھی جہالت ہے لیکن جہلِ مرکب مکمل جہالت ہے، یہ جہالت علم بن کے انسان کے سامنے ظاہر ہوتی ہے اور قرآن نے بھی فرمایا ہے کہ قرآن انسان کو یقین کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ قرآنی مطالب و معارف بھی انسان کو اسی وقت درست سمجھ میں آتے

ہیں کہ جب ان معارف کے بارے میں انسان یقین کی حد تک پہنچ چکا ہو، مثلاً بہت سارے موضوعات ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا ہے کہ ان کے اندر ہماری نشانیاں ہیں لیکن

لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ۝(۵)

یعنی اس قوم کے لئے ہیں، ان لوگوں کے لئے ہیں کہ جو اہلِ یقین ہیں۔

اگر لوگ اہلِ یقین نہیں ہیں تو اہلِ جہلِ مرکب اور اہلِ تقلید ہیں، فصلِ ادبِ ششم کے حصۂ دوم میں تقلید کی وضاحت کی جا چکی ہے لہذا کوئی اس تقلید سے وہ تقلید مراد نہ لے کہ جو عوام مجتہد کی کرتے ہیں چونکہ وہ تقلید اس وجہ سے ہے کہ جس کیلئے قرآن نے بھی کہا ہے کہ

فَاسۡئَلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝(۶)

ان سے کہئے کہ اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو۔

وہ مذموم تقلید کہ جس کی قرآن نے بھی مذمت کی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام لوگوں کے سامنے دین پیش کرتے تھے تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ ہم تو آباء کے مقلد ہیں،

اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ......(۷)

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے......

یہ مذموم تقلید ہے، اس کی قرآن نے مذمت کی ہے کہ

اَوَلَوۡ کَانَ اٰبَآؤُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡئًا وَّلَا یَہۡتَدُوۡنَ ۝(۸)

یعنی کیا یہ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ

نہ رہے ہوں۔

پس وہ تقلید مستثنیٰ ہے، جب تقلید کی بات کی جاتی ہے تو فوراً اس تقلید کی طرف ذہن نہ جائے۔

☆تقلیدی یقین معرضِ زوال میں

تقلیدی یقین معرضِ زوال میں ہوتا ہے، جیسے افواہیں ہیں مثلاً آپ نے ایک بات کی، آپ سے میں نے سنی، میں نے کسی اور کو بتائی، اس نے مجھ سے سنی، نہ میں نے آپ سے دلیل مانگی اور نہ آپ نے مجھے دلیل دی، نہ میں نے کسی کو دلیل دی، نہ کسی نے مجھ سے دلیل مانگی اور یہ مطلب نقل ہوتے ہوتے کئی لوگوں تک پہنچ گیا اور آخر میں پتہ چلا کہ یہ افواہ تھی، اول شخص کہ جس نے یہ افواہ پھیلائی اس کا اشتباہ تھا و غلط فہمی تھی، نتیجتاً یہاں پر سب کا یقین زائل ہو جاتا ہے۔

☆یقینِ حقیقی کیلئے تین ارکان

لہٰذا یقینِ صحیح و یقینِ حقیقی کیلئے ان تین ارکان کا ہونا ضروری ہے، ایک یہ کہ انسان کے پاس احتمالِ خلاف موجود نہ ہو، اعتقادِ انسان میں، فہم انسان میں یا باورِ انسان میں یہ احتمال موجود نہ ہو، مثلاً میں کہوں کہ یہ میز ہے تو پھر اس کے میز نہ ہونے کا ایک فیصد احتمال بھی نہ ہو، اگر ایک فیصد

احتمال ہو اکہ یہ میز نہیں ہے تو پھر یقین نہیں ہوگا، اگر اس کا احتمالِ خلاف موجود ہو تو یہ گمان کہلاتا ہے اور دوم یہ کہ یقین مطابق بہ واقع ہو، مجھے یہ بھی پتہ ہو کہ مجھے جس چیز کے میز ہونے کا یقین ہے تو وہ واقعی میز ہو یعنی میرے پاس تصدیق کا ذریعہ بھی موجود ہو اور سوم یہ کہ یہ یقین معرضِ زوال میں نہ ہو۔ اتنی زیادہ خصوصیات ملیں تو یقین بنتا ہے ورنہ بہت سارے یقین غفلت کی وجہ سے، نہ جاننے کی وجہ سے، جہلِ مرکب ہونے کی وجہ سے انسان کے لئے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

☆اوائلِ قرآن میں مُخاطَبِین قرآن کی تقسیم

☆اوائلِ قرآن میں مُخَاطَبِیْنِ قرآن کی تقسیم

قرآن نے بہت سارے موضوعات بیان فرمائے ہیں کہ جو یقین سے تعلق رکھتے ہیں یعنی درحدِ یقین ان تک پہنچنے کی کوشش کرو مثلاً معاد ایک موضوع ہے، یقینی طور پر قرآن نے اپنے مخاطبین کو آغاز سے ہی تقسیم کر دیا ہے کہ

هُدًى لِّلنَّاسِ......(۹)

یہ ناس کے لئے ہدایت ہے لیکن ناس کی تین قسمیں ہیں۔

الف) پہلا طبقہ

پہلا طبقہ وہ ہے کہ جس کیلئے فرمایا کہ

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ٥(۱۰)

قرآن متقین کیلئے ہدایت ہے، متقین یعنی جو ہدایتِ قرآن لینے کے لئے آمادہ ہیں،

انہوں نے اپنے دلوں کو آمادہ کیا ہوا ہے، تیار کیا ہوا ہے، ان کی صفات میں سے آخری صفت یہی ہے
کہ جو قرآن نے ذکر کی ہے،

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ (۱۱)

یہ اہلِ یقین ہیں، البتہ پہلی صفت سے بھی ہم یقین استنباط کر سکتے تھے کہ متقین کون ہیں؟

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ...... (۱۲)

یعنی جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، ایمان کے ضمن میں بھی یقین موجود ہے لیکن آخر میں آ کر متقین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اہل یقین ہیں، جن کو نہ صرف آخرت پر یقین ہے بلکہ ہر وہ چیز کہ جس پر ان کو یقین ہونا چاہئے اس پر ان کو یقین ہے، انہیں یقینِ حقیقی ہے کہ جو صحیح اور اپنے خاص معنیٰ میں ہے۔

ب) دوسرا طبقہ

دوسرا وہ طبقۂ ناس ہے کہ جو

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۱۳)

اے رسولؐ! جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا ہے ان کے لئے سب برابر ہے، آپؐ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر گویا مہر لگا دی

ہے کہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں، ان کے واسطے آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

یعنی جو اپنی استعداد کھو بیٹھا ہے، قرآن ان کی ہدایت کے لئے بھی آیا ہے لیکن قرآن سے ہدایت لینے کی توفیق ان کے اندر ختم ہو چکی ہے۔

ج) تیسرا طبقہ

تیسرا طبقہ وہ ہے کہ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ...... (۱۴)

ابھی اس حد تک نہیں پہنچے کیونکہ یہ کمزور دل ہیں، ضعیف دل ہیں، ان کے اندر کھوٹ اور بیماری موجود ہے۔ ان کا یقین متزلزل ہوتا ہے، عام طور پر ہمارا سروکار جن چیزوں سے ہے خصوصاً علوم میں کہ ان میں غیر یقینی علوم سے ہمارا زیادہ سروکار ہے، یہاں یقین کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر درحدِ اطمینان یا اطمینان سے بھی کم تر ایک گمانِ غالب بھی پیدا ہو تو لوگ عمل کر سکتے ہیں، اس سے انسان خوگرِ ظنون بن جاتا ہے اور اہلِ ظنون شمار ہونے لگتا ہے۔

☆عُلَمَاء اور ظُنَنَاء

صدرالمتالھین ؒ فرماتے ہیں کہ علماء کو علماء اس لئے کہتے ہیں چونکہ صاحبِ علم ہیں یعنی جس کے پاس علم ہو وہ عالم ہے لیکن جس کے پاس ظن ہو، گمان ہو وہ تو عالم نہیں کہلاتا ہے بلکہ جس کے پاس ظن ہو اس کو ظان کہتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اگر آپ لوگوں میں جا کر جستجو کریں، ٹٹولیں اور کریدیں کہ ان کے پاس واقعاً علم ہے یا نہیں ہے تو اکثر علوم اندر سے ظنون نکلیں گے اور جن کے پاس ظنون ہو ان کو عالم نہیں کہتے ہیں بلکہ ان کو تو ظان کہتے ہیں کہ جس کی جمع ظُنَنَاء ہے، لہٰذا فرماتے ہیں کہ تفتیش کریں، اگر اہلِ علم کے علم کی تفتیش کریں تو اندر سے ظنون نکلیں گے اور اکثر علماء کا علم جب ظنون ہے تو علماء بھی ظنناء ہو جائیں گے، یعنی علماء الدین کے بجائے انہیں ظنناء الدین کہنا پڑے گا یعنی دینی معارف کے بارے میں جن کو گمان ہے، اندازے ہیں اور تخمینے ہیں لیکن یہ یقین تک نہیں پہنچے۔

☆امانی، بنی اسرائیل کی مشکل

قرآن نے بنی اسرئیل کی جو مشکل ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدس و گمان و تخمینے اور انہی جیسی چیزوں پر اکتفا کرتے تھے،

وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ... ...

ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی

آرزوؤں کے......

امانی یعنی تخمینہ وحدس وظن وگمان کہ یوں ہوگا، سادہ مثال سے عرض کرتے ہیں کہ امانی کس کو کہتے ہیں؟ یہ حدس، گمان اور اندازہ لگانے کو کہتے ہیں مثلاً حوزۂ علمیہ میں جب ایک شخص آتا ہے تو کئی تخمینے ذہن میں لے کر آتا ہے، اس کے اندازے ہوتے ہیں مثلاً وہ شہر کہ جہاں پہلی دفعہ آرہا ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ شہر ایسا ہوگا، لوگ ایسے ہوں گے، دوست ایسے ہوں گے، مدرسے ایسے ہوں گے، حرم ایسا ہوگا، جو سن کر اس نے اپنے ذہن میں ایک نقشہ بنایا ہوتا ہے لیکن جب آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک سو اسی (180) درجے نقطۂ اختلاف ہے، وہ کچھ اور سوچ کر آیا تھا لیکن یہاں کچھ اور ہے، وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں ٹرمنل (Terminal) پہ اتروں گا تو سب سے پہلے میرے استقبال کے لئے مرکزِ جہانی کی طرف سے ایک ہیئت آئے گی، جو مجھے لے جائے گی کہ آغا یہاں پر پڑھنے کے لئے آئے ہیں، اسے کیا خبر تھی کہ یہاں نہ خوابگاہ ملے گی، نہ اقامہ ملے گا، نہ شہریہ ملے گا یعنی وہ جو اندازے لگا کر آیا تھا وہ سارے اندازے یہاں آکر غلط نکلتے ہیں۔

اسی طرح سے کچھ لوگوں نے دین کے بارے میں فقط اندازے لگائے ہوئے ہیں اور بسا اوقات شعر میں، تقریر میں اور نثر میں ان اندازوں کو بیان بھی کر دیتے ہیں کہ جب ہم جنت میں جائیں گے تو پھر یوں ہوگا، ایسے ہوگا، ویسے ہوگا اور جب یہ وہاں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ معاملہ بالکل برعکس ہوگا، کہتے ہیں کہ کسی شخص کو قیامت کے بارے میں شک تھا لیکن جب وہ مر گیا تو مرنے کے کچھ عرصہ بعد کسی نے اس کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اب بتاؤ کہ آپ جب زندہ تھے تو کہتے

☆امانی یعنی اسرار آمیز مشغلہ

تھے کہ قیامت کوئی چیز نہیں ہے، کوئی حساب وکتاب نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، اب بتاؤ کہ کچھ ہے یا نہیں ہے، اس نے کہا کہ نہیں اب بھی کچھ بھی نہیں ہے، کوئی حساب وکتاب نہیں ہے، پوچھا کیسے؟ کہا کہ جوں ہی ہم مرے فوراً بغیر حساب وکتاب کے جہنم لے گئے۔

اس نے جو اندازہ لگایا ہوا تھا وہ وہاں غلط نکلا اور لوگ حقیقتاً ایسے ہی اندازے لگاتے ہیں کہ مثلاً جب ہم پکڑے جائیں گے تو فلاں بچانے آجائیں گے، ہم فلاں کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتے ہوئے سیٹیاں بجاتے ہوئے جنت چلے جائیں گے، یہ سارے اندازے ہیں، یہ ایسے ہی غلط ہیں کہ جیسے حوزے میں باطل ہو جاتے ہیں۔ قیامت میں تو بدرجۂ اولیٰ یہ اندازے باطل ہو جائیں گے، یہاں پر اندازے لگاتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر عالم وفاضل بن کر جب واپس جائیں گے تو قوم استقبال کرنے اسٹیشن (Station) پر آئے گی لیکن انسان کو سیٹ (Seat) بھی نہیں ملتی ہے، ٹرین میں قلی بھی دوسروں کا سامان اُٹھالیتا ہے لیکن اس کا نہیں اُٹھاتا ہے، اس نے جو اندازہ لگایا ہوا تھا کہ قوم استقبال کرے گی اور ہار پہنائے گی تو وہ سارے اندازے باطل ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنا دین اندازوں پہ نہ بنائے کہ چونکہ ہم یہ نعرہ لگاتے ہیں، فلاں کام کرتے ہیں لہٰذا ہم بغیر حساب وکتاب کے پاس (Pass) ہو جائیں گے، بغیر حساب کتاب کے رَد ہو جائیں گے۔

دین خدا ایک نظام ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے اسی لئے اس کو کھول کر بیان کیا ہے کہ ان چیزوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اپنی طرف سے من گھڑت اندازے نہ لگاؤ، ہمیشہ دانشگاہوں اور یونیورسٹیوں میں پہلے سے ایک وضاحت نامہ لکھ دیا جاتا ہے تاکہ کوئی اپنی طرف سے من گھڑت

اندازے نہ لگائے کہ یہ ہوگا اور یہ نہیں ہوگا، سب پہلے ہی کھول کر بیان کر دیا جاتا ہے، جب قرآن نے سب کچھ کھول کر بیان کر دیا ہے تو اب اندازے لگانے کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا گمان، حدس اور تخمینے قرآن فہمی میں سب سے بڑا مانع ہے، ان اندازوں کی وجہ سے کہ جو ہم نے پہلے سے لگا کر رکھے ہوئے ہیں قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے، اپنے ذہن کو آزاد چھوڑیں، اس کو قرآن کی طرف جانے دیں اور دیکھیں کہ قرآن اس کو کیا بتاتا ہے پھر جو کچھ قرآن بتائے اسے تحویل میں لیتے جائیں۔

۲) قساوتِ قلبی

عاملِ دیگر کہ جو خود قرآن نے بھی ذکر کیا ہے کہ قرآن و دین کیوں سمجھ میں نہیں آتا ہے؟ موعظہ کیوں اثر نہیں کرتا ہے؟ وہ قساوتِ قلبی ہے کہ دل سخت ہو جاتا ہے، یہ بحث ہم نے مفصل کی ہے، ہم نے تفسیر کے ضمن میں، آیاتِ قرآن سے اور دیگر منابع سے قلب کے مختلف حالات اور اسی آیہ کے ذیل میں کی ہے کہ جس میں قساوت کا ذکر کیا گیا ہے،

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً...... (۱۵)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت......

انسان کا دل بسا اوقات اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے، دل کی سختی سے مراد یہ ہے کہ اب یہ دل اثر قبول کرنا چھوڑ دیتا ہے، سخت دل یعنی متاثر نہیں ہوتا ہے، نہ موعظہ اس پر اثر کرتا ہے، نہ کلامِ خدا اس پر اثر کرتا ہے، نہ کوئی اور چیز اس پر اثر کرتی ہے، انسان کا

دل اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ عبرتناک مناظر اس پر اثر نہیں کرتے ہیں، ایسے مناظر کہ جس سے لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، موم ہو جاتے ہیں لیکن اس کا دل وہاں بھی نرم نہیں ہوتا ہے، ایسے لوگ موجود ہیں مثلاً اگر ظاہر کو بھی دیکھیں تو بعض لوگ ہوتے ہیں جو ظواہر کے لحاظ سے بڑے نرم دل ہوتے ہیں مثلاً یہ کسی جانور کو بھی تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے ہیں، اگر کوئی جانور ذبح کیا جا رہا ہو تو وہ منظر نہیں دیکھ سکتے ہیں۔

اگر آپ ایک قصاب کے پاس جائیں تو دیکھیں گے کہ وہ کتنا سخت دل ہوتا ہے، اس کے دل میں کوئی رحم نہیں ہوتا ہے یعنی اس جانور کی نسبت اس کا دل سخت ہوتا ہے یا عموماً ہسپتالوں میں جو نرسیں ہوتی ہیں یہ روز لوگوں کو انجکشن لگا لگا کر اور زخم دیکھ دیکھ کر عادی ہو جاتی ہیں، ان کا بیماروں سے روزمرہ سروکار رہتا ہے لہٰذا ان کا دل بہت سخت ہو گیا ہے، اب کوئی بڑی دردناک آواز میں رو رہا ہو تو بھی اس کے دل پر ذرا اثر نہیں ہوتا ہے، اگر مریض کو دیکھنے کیلئے کوئی وزیٹر (Visitor) گیا ہو تو اس کا دل نرم ہو جاتا ہے، وہ بے چارہ پریشان ہو جاتا ہے لیکن یہ دل بیٹھے رہتے ہیں اور انہیں کوئی اثر نہیں ہوتا ہے چونکہ ان کا دل سخت ہو جاتا ہے اور حتیٰ روایاتِ حج میں ہے کہ جوں ہی حج کرو تو فوراً واپس آجاؤ، کیوں؟ کیونکہ جو حج کے بعد وہاں زیادہ رہے گا اس کا دل سخت ہو جائے گا یعنی کعبہ اب اس پر اثر نہیں کرتا چونکہ حج تک توجہ میں مشغول ہوتا ہے لیکن حج کے بعد بازاروں، مارکیٹوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور یہ امور انسان کے دل کو سخت کر دیتے ہیں۔ روایات میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کن کن چیزوں سے دل سخت ہوتا ہے، مر جاتا ہے اور بالکل اثر قبول کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

ایک حالت جو فہمِ قرآن میں مانع بنتی ہے یہی قساوت وسختیٔ قلب ہے، اس کو نرم کریں، قساوت کے مقابلے میں خشوع ہے،

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ٥(١٦)

نماز بہت مشکل کام ہے مگر ان لوگوں کے لئے نہیں جو خشوع وخضوع والے ہیں۔

سخت دل لوگوں پر عبادتیں گراں گزرتی ہیں، جب دل قساوت کا شکار ہو تو عبادات، مناجات، دعا اور معنویت گراں گزرتی ہیں یعنی عبادتیں اور مناجات انسان پر ایک ہتھوڑے کی طرح اثر کرتی ہیں، یہ برداشت نہیں کر سکتا ہے لیکن خاشع دل، نرم دل پر اثر ہوتا ہے اور وہ یہ چیزیں سن کر گریہ کرتا ہے۔اسی لئے مواعظ بھی سخت دلوں پر بہت گراں ہوتے ہیں،

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ٥

خشوع یعنی دل کو نرم کرو، دل نرم کرنے کے لئے ایک چیز گریہ ہے، تاکید ہے کہ آپ عبادت کے اندر روئیں چونکہ رونے سے دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں، انسان کا دل نرم ہو تو رونا آتا ہے اور رونے سے دل نرم ہوتا ہے، نرم دل روتا ہے لیکن جس کا دل بہت سخت ہو وہ اصلاً سرے سے نہیں روتا ہے، کوشش بھی کرے تو آنسو نہیں نکال سکتا ہے لیکن نرم دل لوگ روتے ہیں اور قرآن نے بھی فرمایا ہے کہ

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ......(١٧)

کیا صاحبان ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل ذکر خدا کیلئے نرم

ہو جائیں......

دل جب تک نرم نہ ہو تو قرآن بھی اثر نہیں کرتا ہے۔ دل کی سختی کے موجبات میں سے ایک گناہ بھی ہے اور قرآن سمجھنے کی راہ میں ایک مانع گناہ اور معصیت ہے۔ روایت میں ہے کہ بسا اوقات عبادتوں میں لذت محسوس نہیں ہوتی ہے یا بعض اوقات عبادتیں ترک ہو جاتی ہیں، مستحبات ترک ہو جاتے ہیں، فرمایا کہ یہ گناہ کی وجہ سے ہے،

حتیٰ رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

عَلاقَةُ الْقَلْبِ مَعَ الدُّنْيَا تَمْنَعُ حَلاوَةَ الْعِبَادَةِ..... (۱۸)

دنیا سے دل کی محبت عبادت کی شیرینی کو روک دیتی ہے......

یہ گناہ کہ جن کو ہم اہمیت نہیں دیتے ہیں چاہے چھوٹے گناہ ہوں یا بڑے گناہ، ان کی وجہ سے دل سخت ہو جاتا ہے، ہم سزا کے اعتبار سے چھوٹے بڑے گناہ تقسیم کرتے ہیں یعنی جس کا طمانچہ معمولی سا ہو وہ چھوٹا گناہ ہے اور جس کا تھپڑ زوردار ہو وہ گناہِ کبیرہ ہے، ہم اثر کے لحاظ سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ نتیجے کے لحاظ سے دیکھتے ہیں، سزا کے لحاظ سے دیکھتے ہیں، اثر کے لحاظ سے دیکھیں، گناہ کی سزاؤں کو چھوڑ دیں بلکہ آپ فقط یہی دیکھیں کہ گناہ کا اثر کیا ہوتا ہے؟ گناہ انسان کے دل کو سخت کر دیتا ہے، بعض چیزیں ہوتی ہیں کہ اگر ان کے اوپر پانی چھڑک دیا جائے تو سخت ہو جاتی ہیں، جب تک پانی اس پر نہیں پڑا وہ نرم ہے اور جوں ہی اس کے اوپر پانی پڑے گا یہ سخت ہو جائیں گی، ایک قطرہ پانی پڑا تو بھی سخت ہو جائیں گی، اگر آپ نے پورا لوٹا اس کے اوپر گرایا تو بھی

سخت ہو جائیں گی لہٰذا اس کے اوپر ایک قطرہ بھی نہ گرنے دیں، سیئات و گناہ انسان کے دل کو سخت کر دیتے ہیں، ہمیں عبادتوں میں لذت کیوں محسوس نہیں ہوتی ہے؟ قرآن میں لذت کیوں محسوس نہیں ہوتی ہے؟ اور قرآن کیوں ہمیں اپنی طرف نہیں بلاتا ہے، نہیں کھینچتا ہے باوجود اینکہ قرآن کے اندر کشش ہے، جذب کرتا ہے، قرآن کے اندر جاذبہ شدید ہے لیکن مشکل ہماری وجہ سے ہے۔

جس طرح سے مقناطیس اور لوہا ہیں، مقناطیس میں لوہے کو کھینچنے کے لئے شدید کشش موجود ہے لیکن اگر لوہے کو زنگ لگا ہوا ہو اور لوہے کی راہ میں کوئی مانع پڑا ہوا ہو تو یہ مقناطیس اس لوہے کو نہیں کھینچتا ہے، حجاب میں چھپا ہوا لوہا کہ جس کے اوپر پردے چڑھے ہوئے ہیں اور موانع نے اس کو لپیٹا ہوا ہو تو اس لوہے کو مقناطیس نہیں کھینچتا ہے، عبادتوں کے اندر لذت ہے، عبادتوں میں مقناطیسیت ہے اور کلامِ خدا میں یہ مقناطیسیت و کشش درحقیقت خود خدا کی کشش ہے چونکہ وہ رب ہے اور رب اپنے مربوب کو اپنی طرف کھینچتا ہے، خالق مخلوق کو اپنی طرف کھینچتا ہے، یہ مقناطیسیت ہے لیکن مخلوق اور مربوب کبھی گناہوں کے پردے میں لپٹ جاتے ہیں اور ان میں زنگ پڑ جاتا ہے لہٰذا اب مقناطیس جتنا شدید بھی ہو پھر بھی اسے اپنی طرف نہیں کھینچتا ہے۔

۳) ترکِ عمل

قرآن فہمی کی راہ میں ایک بڑا مانع یہ ہے کہ جب انسان بارگاہِ قرآن میں جاتا ہے خصوصاً جو رغبت و شوق رکھتے ہیں وہ قرآن کی بارگاہ میں جاتے ہیں اور اس کے اندر غور و خوض کرتے ہیں تو

ایک مطلب سمجھ میں آجاتا ہے، بالآخر روحِ قرآن و ظاہرِ قرآن میں سے کچھ نہ کچھ حاصل ہو جاتا ہے اور پھر اس سے آگے گزر جاتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا ہے یعنی ترکِ عمل مطابق با قرآن۔ جب انسان قرآن کو سمجھتا ہے تو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کو اپنا تا بھی جائے، ایک اصطلاح کہ جو اہلِ علم استعمال کرتے ہیں وہ تحقق کہلاتی ہے، تحقیق اور چیز ہے تحقق اور چیز ہے۔

اگر انسان قرآن میں تحقیق کرے تو محقق بنتا ہے اور محققینِ قرآن فراواں ہیں لیکن بزرگان واہلِ معرفت کہتے ہیں کہ آپ محققِ قرآن سے آگے بڑھیں یعنی متحققِ قرآن بنیں، محققِ قرآن یعنی جس نے بہت سارے موضوعات میں مطالعہ کرلیا ہے اور بڑی کثرت سے معلومات اکٹھی کرلی ہیں۔ متحققِ قرآن یعنی جس نے قرآنی تعلیمات کو اپنے وجود کے اندر منتقل کر دیا ہے، اپنے وجود کا حصہ بنالیا ہے۔ بعض اساتید اس کی تعبیر کرتے ہیں البتہ یہ فارسی تعبیر ہے اور اردو میں رائج نہیں ہے لیکن اردو میں اس کا کوئی متبادل بھی نہیں ہے، اردو میں صرف اس کی تفسیر کی جاسکتی ہے، وہ تعبیر یہ کرتے ہیں کہ دانائی اور دارائی، تحقیق اور تحقق میں فرق کیا ہے؟ ایک دانائی ہے اور ایک دارائی ہے، دارا ہونا یعنی مالک ہونا، اس چیز کا صاحب ہونا، دانا ہونا یعنی فقط آگاہ ہونا، اس کو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے سرمایہ دار اور سرمایہ دان میں فرق ہے، سرمایہ دان کون ہیں؟ سرمایہ دان وہ ہیں کہ جن کو سرمایہ کا علم ہے، یہ یونیورسٹیوں میں جو اقتصاد پڑھاتے ہیں وہ سرمایہ دار نہیں ہیں، سرمایہ کمانے کا علم ان کے پاس موجود ہے لیکن سرمایہ نہیں ہے، سرمایہ دار اور ہوتا ہے، سرمایہ دان اور ہوتا ہے۔

اسی طرح سے دین دار اور دین دان دونوں میں فرق ہے، دین دان وہ لوگ ہیں کہ جو دین

کے بارے میں دانائی رکھتے ہیں، دانشِ دین ان کے پاس ہے لیکن دین دار وہ ہوتے ہیں کہ جن کے اندر دین اترا ہوا ہوتا ہے، دین جن کے وجود کا حصہ بنا ہوتا ہے، یہ دین دار ہوتے ہیں، دین دانی کافی نہیں ہے بلکہ دین داری ضروری ہے، اسی طرح سے قرآن دانی کافی نہیں ہے بلکہ قرآن داری ضروری ہے، انسان قرآن دار ہو نہ کہ فقط قرآن دان ہو، یہ کس طرح سے بنتا ہے؟ اس طرح سے کہ قدم بہ قدم، لفظ بہ لفظ ایک ایک مرحلہ طے کرتے جاؤ اور اس کو اپنے وجود کے اندر منتقل کرتے جاؤ تاکہ انسانِ قرآنی بن جاؤ، قرآن اس طرح اپنے اندر لے کر آتا ہے نہ یہ کہ فقط علمی دروازے و دریچے کھولتا ہے کہ ایک آیہ سمجھ لی ہے اب دوسری آیہ سمجھتے ہیں پھر تیسری آیہ سمجھتے ہیں، نہیں بلکہ پہلی آیہ سمجھ لی تو اس کو اپنے وجود میں منتقل کرو، جب وجود میں منتقل کر دیں اور آپ اپ گریڈ (Upgrade) ہو جائیں تو اب دوسرے مرحلے میں چلے جائیں گے۔

جیسے بچوں کے ڈیجیٹل گیمز (Digital games) میں ہوتا ہے کہ جو عموماً بڑے کھیلتے ہیں، بہانہ بچوں کے لئے ہوتا ہے لیکن زیادہ تر کھیلتے بڑے ہیں، ان گیمز کے اندر یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک مرحلہ یا ایک منزل ہوتی ہے اگر آپ اس کو کھیل لئے تو پھر اس سے آگے دوسرا مرحلہ یا دوسری اسٹیج (Stage) شروع ہو جاتی ہے، دوسرا مرحلہ خود ہی آٹومیٹکلی (Automatically) کھل جاتا ہے، اگر اس کو بھی آپ نے پورے طریقے سے کھیل لیا تو پھر تیسرا مرحلہ خود بخود آٹومیٹکلی کھل کر سامنے آتا ہے، اب آپ تیسرے میں آجائیں لیکن جو پہلا نہیں کھیل سکا وہ کبھی بھی دوسرے مرحلے میں نہیں جا سکتا ہے۔ آپ اسی سے سمجھ لیں کہ ترقی و ارتقاء اس کو کہتے ہیں کہ قرآن میں انسان پہلی آیہ

سمجھ کے دوسری آیہ میں نہیں جاسکتا ہے، پہلے پہلی آیہ کو سمجھ کے اس کو وجود میں اتارنا ہے پھر دوسری آیہ کا آپشن (Option) خود ہی کھل جاتا ہے، جب دوسری کو اپنے دل میں اتارتا ہے تو پھر تیسری آیہ انسان پر اپنا دروازہ کھول دیتی ہے، یہ ہوتا ہے انسانِ قرآن دار نہ کہ انسانِ قرآن دان، یہ ایک مانع ہے کہ انسان قرآن کو فقط زبانی جمع خرچ کے ساتھ اس کا حساب بے باق کردے۔

٤)قرآن کا آلائی استعمال

ایک اور مانع جو فہمِ قرآن میں رکاوٹ ہے البتہ یہ ایک طرح سے قرآن کے ساتھ جفا بھی ہے وہ قرآن سے ابزاری فائدہ اٹھانا ہے یعنی انسان اس دید سے قرآن کی طرف جائے کہ قرآن کو بعنوانِ آلہ استعمال کرے۔قرآن نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور روایات میں بھی معصومین علیہم السلام نے منع کیا ہے کہ قرآن کو آلہ کے طور پر استعمال نہ کرو بلکہ ایک منبعِ ہدایت کے طور پر استعمال کرو۔بعض لوگ قرآن سے ہدایت نہیں لیتے ہیں بلکہ فقط ایک ذریعہ، ایک وسیلہ اور ایک ابزار کے طور پر قرآن کو استعمال کرتے ہیں، اردو میں اس کیلئے لفظِ اوزار استعمال کرتے ہیں، ابزار فارسی میں ہے، اصل ابزار ہی ہے لیکن اردو تلفظ میں اس کو اوزار کہتے ہیں، اوزار یعنی آلات، ایک آلہ کے طور پر قرآن کو استعمال کرنا۔

آلات بہت سارے ہیں مثلاً کھانے کے آلات ہیں، پکانے کے آلات ہیں، اُٹھانے کے آلات، رکھنے کے آلات ہیں، ایسی بہت ساری چیزیں ہماری زندگی میں ہیں، صرف صنعتی دنیا کی

وجہ سے یہ آلات کی دنیا زیادہ ہوگئی ہے، آلات اس وقت کثرت سے ہیں اور اتنے ہیں کہ ان کے اندر صاحبِ آلات گم ہیں، آلات کا ڈھیر لگا ہوتا ہے، ہمارا گھر آلات سے بھرا ہوتا ہے، چمچے، کانٹے، چھری، پلیٹیں یہ سارے آلات ہیں، کچھ پکانے کے، کچھ کھانے کے اور کچھ مہمانوں کے آلات ہیں حتیٰ انسان اسیرِ آلات ہے، ہر چیز کو بعنوانِ آلہ استعمال کر کے دیکھتا ہے۔

بعض لوگ دین کو بھی آلے ہی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، خصوصاً پاکستان میں یہ دین فقط ایک آلہ ہے، حکومتیں آ کر دین کو فقط ایک آلے کے طور پر اور اپنے اقتدار کے ذریعے کے طور پر استعمال کرتی ہیں، حتیٰ بہت ساروں کے ہاتھوں میں دین فقط ایک آلہ ہے، آلہ یعنی وہ ذریعہ کہ جس کی مدد سے انسان کوئی کام کرتا ہے جیسے قلم ہے، قلم کو آلہ کہتے ہیں، کیوں کہتے ہیں؟ چونکہ اس کی مدد سے ہم لکھتے ہیں، اصل مقصود لکھائی ہوتا ہے، قلم مقصود نہیں ہے، قلم کے ذریعے سے لکھتے ہیں اس لئے قلم آلہ کہلاتا ہے، کام میں نے کیا ہے اور کام خود لکھائی ہے لیکن قلم کی مدد سے کیا ہے اس وجہ سے قلم کی حیثیت فقط آلے جیسی ہے، آلے کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، اصلی پوزیشن (Position) اس کو کبھی بھی نہیں دیتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہیں گے کہ آلہ وہ چیز ہوتی ہے کہ جسے انسان کسی کام کے کرنے کے لئے ایک ذریعے کے طور پر اختیار کرتا ہے لیکن وہ مقصد نہیں ہوتا ہے، مقصد انسان خود ہوتا ہے یا وہ کہ جس کے حصول کے لئے انسان فعل انجام دیتا ہے۔ انسان کے پاس آلاتِ عمل و آلاتِ کار فراواں ہیں اور جوں ہی کام ختم ہوتا ہے تو انسان ان آلات کو ترک کر دیتا ہے، جس طرح سے قلم سے جوں ہی

لکھائی کا کام ختم ہوتا ہے تو انسان اس آلے کو ترک کر دیتا ہے۔

لوگ دین کو بھی آلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں مثلاً اپنی شخصیت بنانے کے لئے، اپنی شہرت کے لئے، اپنا کاروبار چمکانے کے لئے، بعض ایسے ہیں یعنی سیٹھ بہت زیادہ دین دار بن کر آتے ہیں کیونکہ اس سے ان کا ایک دینی چہرہ بنتا ہے اور ان پر اعتماد کر کے گاہک زیادہ آتے ہیں کہ یہ دینی آدمی ہے لہٰذا یہ گھپلا نہیں کرے گا اور جتنا گھپلا یہ کرتا ہے اتنا کوئی دوسرا نہیں کرتا ہے۔

دین کو تجارت کا آلہ بنانا، شہرت کا آلہ بنانا، معیشت کا آلہ بنانا، یہ سب دین سے ابزاری فائدہ اُٹھانا ہے، دین آلہ نہیں ہے، ابزار مقاصدِ انسان نہیں ہے بلکہ دین منشورِ حیات ہے، اسی طرح سے قرآن سے آلہ کے طور پر استفادہ نہ کریں، قرآن سے ابزاری فائدہ کیا ہے؟ فرض کریں کہ ایک شخص مقالہ لکھتا ہے اور مقالے کو وزنی بنانے کے لئے چند آیات بھی اس کے اندر ڈالنی ہیں لہٰذا معجم کھولتا ہے اور مناسب آیات اس میں سے اٹھا کر ڈال دیتا ہے تاکہ کسی طرح سے مقالہ وزنی بنے، یہاں قرآن آلے کے طور پر استعمال ہوا ہے، مقالہ نویسی کے لئے مقالہ اعلیٰ ہونا چاہئے۔ مقاصدِ قرآن کھولنے کے لئے مقالہ آلہ ہونا چاہئے نہ کہ مقالے کو وزنی بنانے کے لئے قرآن آلہ ہونا چاہئے۔

حضرتِ جبرئیل علیہ السلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آلہ نزولِ قرآن نہیں ہیں، اگرچہ جبرئیل علیہ السلام قرآن لے کر آئے ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ نورانی پر نازل ہوا ہے لیکن ان کی حیثیت آلے جیسی نہیں ہے۔ جو چیز بھی بطورِ آلہ استعمال ہوتی ہے وہ فاعل کے ہاتھ میں فقط ایک ذریعہ ہے

لیکن اس عمل میں آلے کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس عمل سے آلے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہوتا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واسطۂ وحی ہیں نہ کہ آلۂ وحی، واسطے سے مراد یہ ہے کہ اس وحی کے نزول میں دونوں کی تاثیر ہے، جس طرح سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تاثیر ہے اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی تاثیر ہے اور ساتھ تاثر بھی ہے یعنی جس طرح سے قرآن دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی یہ وحی اثر انداز ہے درحالیکہ آپ قلم کی مدد سے جو کچھ لکھیں، جتنے علمی مطالب لکھیں تو خود قلم کا ان علمی مطالب میں کوئی دخل نہیں ہوتا، نہ یہ علمی مطالب اس قلم پر اثر انداز ہوتے ہیں، نہ قلم کی کوئی تاثیر ان مطالب کے اوپر ہوتی ہے اور نہ ہی ان سے قلم کوئی فائدہ اٹھاتا ہے، فاعل ہوتا ہے اور فعل ہوتا ہے درحالیکہ واسطہ ایسا نہیں ہوتا ہے، واسطہ اس عمل کے اوپر تاثیر بھی ڈالتا ہے اور اس عمل سے متاثر بھی ہوتا ہے لہٰذا واسطے فیضِ خدا ہیں۔

قرآن بھی ہدایت کا ذریعہ ہے لیکن اسے آلہ کے طور پر استعمال نہ کریں، انسان قرآن کو اپنے مقاصدِ دنیوی وغیر دنیوی کے لئے آلہ وابزار کے طور پر استعمال نہ کرے، ممکن ہے کہ یہ مقصد علمی مقصد ہو اور قرآن آلے کی حیثیت رکھتا ہو، ایک اوزار یا ابزار کی حیثیت رکھتا ہو مثلاً ایک تقریر کرنی ہے تو اس تقریر کو وزنی بنانے کے لئے، مؤثر بنانے کے لئے یا یہ کہ اس مقابلے کو جیتنے کے لئے انسان قرآن کو بطورِ آلہ استعمال کرے۔

اس طرح سے جب قرآن کو یا آیاتِ قرآنی کو استعمال کیا جاتا ہیں تو ان آیاتِ قرآنی سے انسان نہ متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی آیاتِ قرآنی کی حقیقت ومفہوم کو درک کرتا ہے، استفادۂ ابزاری از

دین، استفادۂ ابزاری از دینی شخصیات، استفادۂ ابزاری از دینی منابع کثرت سے ہے اور اسی وجہ سے درعینِ حال انسان کا دین سے اور دینی منابع سے سروکار ہے لیکن متاثر نہیں ہوتا ہے اور ان پر عمل نہیں کرتا ہے یا ان سے ہماری زندگیوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم دینی منابع کو بعنوانِ آلہ استعمال کر رہے ہوتے ہیں، اپنی شخصیت بنانے کے لئے یا ڈگری اور مدرک کے لئے قرآن کو فقط ایک آلہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

بعض لوگ قرآن کو کسی مدرسے تک رسائی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں یہ بھی استفادۂ ابزاری از قرآن ہے مثلاً قرآن حفظ کریں کہ اقامہ مل جائے، قرآن حفظ کریں کہ انسان کو ویزہ ملا جائے یا قرآن حفظ کریں کہ ہمیں شہرت مل جائے، ملازمت مل جائے، کم عمری میں حفظِ قرآن کا کوئی ریکارڈ (Record) ٹوٹ جائے، قرآن پڑھنے سے انسان کو پروموشن (Promotion) مل جائے اور دنیوی لحاظ سے کوئی پوسٹ (Post) مل جائے، یہ سب قرآن سے استفادۂ ابزاری اور اوزاری ہے، اسی طرح سے اگر ساری دنیا بھی قرآن کی طرف آجائے تو قرآن سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا جیسے کہ نہیں پڑتا ہے۔ قرآن کا آلائی، ابزاری و اوزاری استعمال وسیع ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اہلِ مذہب ہی کر سکتے ہیں، جو بے دین ہیں یا غیر مذہبی لوگ ہیں وہ تو اس سے ابزاری فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں، زیادہ تر دینی مذہبی لوگ یہ کام کرتے ہیں۔

کم و بیش ہر طبقے نے یہ استفادہ کیا ہے اور قرآن کے علاوہ اہلبیتؑ سے بھی استفادہ ابزاری کرتے ہیں بلکہ اہلبیتؑ سے اوزاری استفادہ زیادہ لیتے ہیں، ولایت ولایت کرنا، علیؑ علیؑ

کرنا، اہلبیت علیہم السلام کا دم بھرنا، ایامِ فاطمیہ علیہا السلام برگزار کرنا، ایامِ فاطمیہ علیہا السلام کو بعنوانِ ابزار استعمال کرنا، کس لئے؟ تاکہ لوگ آئیں اور ہمارا گھر رجوع کا ایک منبع بن جائے، اہلبیت علیہم السلام سے معاذ اللہ ایک آلے کے طور پر استفادہ نہ کریں مثلاً اپنی شخصیت بنانے کے لئے، لوگوں سے پی آر (Personal Relation) بنانے کیلئے، مال کمانے کیلئے یا کسی اور وجہ سے۔

مذاہب اور ادیان میں حتیٰ علمی میدان میں بھی قرآن سے استفادۂ ابزاری زیادہ ہوا ہے۔ کلامی نظریات کہ جس میں لوگ خارج از قرآن جبر کے قائل ہوئے ہیں یا تفویض کے قائل ہوئے ہیں کہ آیا انسان اپنے فعل میں مختار ہے یا آزاد؟ بالآخر جدھر رجحان گیا، جیسی تعلیم و تربیت ہوئی، جس مکتب و مسلک سے انسان منسلک و متاثر رہا یا تقلیداً انسان نے جس چیز کو اپنا لیا تو اب بعد میں ان لوگوں نے قرآن سے آیات ڈھونڈ کر اپنے مسلک کو ثابت کرنا ہے، یہ بھی استفادۂ ابزاری از قرآن ہے۔ انسان قرآن سے ہدایت نہیں لے رہا ہے یا مثلاً قرآن کی قسم کھانا ہے، منع بھی کیا گیا ہے کہ قرآن کی قسم نہ کھائیں لیکن پھر بھی عموماً لوگ قرآن کو قسم کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ابزار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ذریعۂ قسم بناتے ہیں۔ سامان مہنگا بیچنے کے لئے یا سستا خریدنے کے لئے عموماً دکاندار حضرات قرآن کی قسم فوراً کھالیتے ہیں۔

ایک اور استفادہ جو قرآن سے فراواں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جیسے وہابیت نے خارج از قرآن بیٹھ کر دین کے بارے میں، توحید کے بارے اپنا ایک نظریہ بنالیا ہے اور پھر قرآن سے استفادہ ابزاری کرتے ہیں، وہ بعض آیات کو لے کر کہتے ہیں کہ یہ وہابیت کی تائید کر رہی ہیں یا پھر

انسان غلو کا قائل ہو جاتا ہے اور پھر قرآن پڑھتے ہوئے اس کو بعض آیات اپنی معین و مددگار نظر آتی ہیں چونکہ اس کا رجحان اسی طرف ہے اس وجہ سے یہ آیات اس کو اپنی حامی و معین نظر آتی ہیں لہٰذا یہ بھی استفادہ ابزاری کرتا ہے، اسی طرح سے قرآن کو نیزوں پہ اٹھایا گیا تو یہ بھی استفادہ ابزاری از قرآن ہے۔ جنگِ صفین میں اوزار کے طور پر، آلہ کے طور پر قرآن کو نیزوں پہ اٹھا کر ایک بہت بڑا فتنہ ایجاد کیا گیا کہ جس کے نتیجے میں امیر المومنین علیہ السلام کی سپاہ میں سے ایک بڑی اکثریت اس کے فریب میں اور دام میں آگئی حالانکہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دھوکہ ہے، یہ قرآن کو فقط ایک ابزار و اوزار کے طور پر استعمال کرنا ہے، آپ اس دھوکے میں نہ آئیں، قرآن اس لئے نہیں آیا تھا کہ جس مقصد کے لئے یہ لوگ استعمال کر رہے ہیں. یا مثلاً انہوں نے قرآن سے ہی ایک آیت لے لی کہ

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ......(۱۹)

حکم صرف اللہ کے اختیار میں ہے......

اور خوارج نے امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت کی نفی کی، یہ قرآن سے استفادہ اوزاری ہے، ایک آلے کے طور پر قرآن سے استفادہ کیا گیا، قرآن منبعِ ہدایت ہے نہ کہ اپنے مقاصد تک پہنچنے اور اپنے من گھڑت اعمال انجام دینے کا اوزار یا اپنی شخصیت بنانے کا آلہ۔ قرآن کا اس طرح کا استعمال اگر گھر گھر بھی فراواں شروع ہو جائے تو بھی قرآن سے ہماری زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن فراوانی انہی کاموں کی نظر آتی ہے کہ قرآن کو آلہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے مثلاً جیسے پہلے بھی

اشارہ ہوا تھا کہ تعویزوں کے لئے قرآن کا استعمال کرنا، قرآنی آیات کی خوبصورت خطاطی کرنا کہ یہ آپ بیچیں یا قرآن کی سی ڈیز بنانا اور اس سے اپنا کاروبار بنانا یا چمکانا، یہ سب قرآن سے استفادہٴ اوزاری ہے۔

اس زمانے میں لوگ کثرت سے قرآن سے مانوس ہیں، اس وقت قرآن کی طرف جتنی توجہ ہے شاید ہی کسی زمانے میں اتنی توجہ ہو، قرآن کی طرف اس وقت اہلِ قرآن یعنی مسلمانوں کی توجہ بھی زیادہ ہے، غیر مسلموں کی بھی اور دشمنانِ قرآن کی توجہ بھی قرآن کی طرف سب سے زیادہ ہے، اگر کوئی تندی کر رہا ہے تو بھی قرآن کو فقط آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے، اگر کوئی خاموش اور ساکت ہے تو بھی قرآن کو آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے یعنی قرآن کے ذریعے سے اپنے اعمال کی توجیہ کرتا ہے کہ جس طرح مغیرہ کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام نے عمارؓ سے کہا تھا کہ اس کو چھوڑ دو، اس شخص نے اس لئے دین پڑھا ہے، اس لئے علمِ قرآن و تفسیر حاصل کیا ہے تاکہ اپنے اعمال کی توجیح کر سکے یعنی یہ قرآن سے بعنوانِ آلہ و ابزار اپنے غلط کاموں کو صحیح قرار دینے کے لئے استفادہ کرتا ہے، یہ بڑا پرخطر مانعِ فہم ہے کہ انسان قرآن کی طرف آتا بھی ہے لیکن محروم رہ جاتا ہے، عمر بھر قرآن کے ساتھ بسر ہوتی ہے لیکن درعین حال قرآن سے استفادہ نہیں کر پاتا۔

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

۵) کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

ایک بڑا مانع کہ جس میں مسلمان اور مومنین زیادہ مبتلا ہیں وہ قرآن کا متبادل قرار دینا ہے

یعنی کسی بھی چیز کو متبادلِ قرآن قرار دے دینا اور متبادل کے طور پر استعمال کرنا، قرآن کا کوئی متبادل نہیں ہے، یہ طے کرلیں کہ قرآن کی طرف اسی لئے رغبت نہیں ہیں کیونکہ انسان کے نزدیک متبادل موجود ہے، ہمیشہ جس چیز کا بھی متبادل موجود ہو وہ چیز اتنی موردِ رجوع نہیں ہوتی ہے۔

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

بازار میں دوائیں ملتی ہیں لیکن بہت ساری دوائیں ایسی ہیں کہ جن کا کوئی متبادل نہیں ہے، ان کی طرف سب آتے ہیں اور ان کی ڈیمانڈ (Demand) سب سے زیادہ ہوتی ہے کہ جن کا کوئی متبادل نہیں ہے لیکن بعض ایسی دوائیں ہیں کہ جن کا متبادل موجود ہے کہ یہ نہیں ملی تو ہم دوسری لے لیں گے، ایسے راستے بھی ہیں کہ جن کا متبادل راستہ کوئی بھی نہیں ہے، ایسی سڑک شہر کے اندر یا ملک کے اندر موجود ہو سکتی ہے کہ جس کا کوئی متبادل نہ ہو تو اس پر بڑا رش ہوتا ہے لیکن جن سڑکوں کا متبادل موجود ہو، دوسرے فرعی راستے موجود ہوں تو وہاں اتنا رش نہیں ہوتا ہے چونکہ وہاں دوسرے راستوں سے بھی لوگ آجا سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے قرآن کا متبادل بنالیا ہے یا گھڑ لیا ہے وہاں قرآن کم رنگ ہے چونکہ متبادل موجود ہے لیکن جہاں قرآن کا متبادل نہیں ہے وہاں قرآن کے اوپر زیادہ رش اور رجوع ہے، ممکن ہے کہ یہ متبادل مختلف طریقوں سے متبادل بنایا ہے، بعض نے کہا کہ عقل قرآن کی متبادل ہے، جس طرح سے بعض نے ختمِ نبوت کی یہ تفسیر بھی کی ہے کہ عقلِ بشری اب کامل ہوگئی ہے یعنی عقل کو دین کا متبادل راستہ اور قرآن و نبوت کا متبادل قرار دیا ہے، کسی نے عقل کو دین کا متبادل لے لیا ہے اور کسی نے سائنس و ٹیکنالوجی اور علم کو کہا کہ چونکہ قرآن اس وقت ضروری تھا جب بشر نے اتنی ترقی نہیں کی

تھی، اتنی علمی پیش رفت نہیں ہوئی تھی، بہت ساری چیزوں کے اسرار معلوم نہیں تھے اور طبیعت میں انسان نے اتنا غور وخوض نہیں کیا تھا لہٰذا اس وقت تک انسان کو قرآن اور دین کی ضرورت تھی لیکن اب جب کہ علم آ گیا ہے، سائنس آ گئی ہے، ترقی ہو گئی ہے لہٰذا ٹیکنالوجی بہترین متبادل قرآن ہے۔

بعض کے نزدیک ٹیکنالوجی نعم البدلِ قرآن ہے، اسی لئے بعض سیکولر (Secular) ذہنیت کے لوگ اسی نظریے کے قائل ہیں کہ ٹھیک ہے قرآن کتابِ خدا ہے لیکن اس معاشرے کے لئے ہے کہ جس میں علم وترقی وسائنس وٹیکنالوجی نہ ہوں، اب جبکہ ساری چیزیں میسر ومہیا ہیں تو پھر کیوں قرآن کی طرف اصرار کرتے ہیں؟ یہ تو سیکولر طبقہ کی بات تھی لیکن بعض دینداروں نے دین ہی میں سے کوئی چیز اٹھا کر اس کو متبادلِ قرآن قرار دیا ہے، از جملہ بعض کے نزدیک فلسفہ متبادلِ قرآن ہے، دیگر علوم متبادلِ قرآن ہیں۔

بعض کے نزدیک اہلبیت علیہم السلام متبادلِ قرآن ہیں اسلئے قرآن کی طرف رجوع کم ہے اور اس میں شیعہ زیادہ مبتلا ہیں کہ اہلبیتؑ کو قرآن کے متبادل راستے کے طور پر اپنایا ہوا ہے، غلط تعارف ہوا ہے قرآن کا بھی اور اہلبیت علیہم السلام کا بھی، جیسے پہلے اشارہ ہوا کہ ایک مانع یہ ہے کہ ہمیں کسی چیز کی شناختِ درست نہ ہو یعنی قرآن کی درست شناخت نہ ہو یا اہلبیت علیہم السلام کی درست شناخت نہ ہو تو یہ انہی تک پہنچنے کے لئے بہت بڑا مانع ہے، اہلبیت علیہم السلام اور قرآن کا صحیح تعارف نہیں ہوا ہے، جس طرح سے آغازِ اسلام میں یہ انحراف پیدا ہوا، آغازِ اسلام میں ہی بعض لوگوں نے جب یہ نعرہ لگایا کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ...... (۴۰) ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے......اسی وقت سے یہ انحراف پیدا ہوا یعنی

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

انہوں نے قرآن کو اہلبیت علیہم السلام کا متبادل سمجھا، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متبادل سمجھا اور کہا کہ ہمارے لئے یہ متبادل کافی ہے، جب یہ ہمارے پاس ہے تو ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے طبقے نے آکر وہی کام کیا لیکن متقابلِ دوم نے متبادل دوم کو لے کر کہا کہ ہمارے لئے اہلبیت علیہم السلام کافی ہیں قرآن ضروری نہیں ہے، دونوں انحراف ہیں کہ قرآن بدلِ اہلبیت علیہم السلام ہے اور اہلبیت علیہم السلام بدلِ قرآن ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو متبادل راستے پیش نہیں کیے ہیں بلکہ دو ہم آہنگ راستے پیش کیے ہیں یعنی دو منابع پیش کیے ہیں کہ جن کے اندر کمالِ ہم آہنگی اور ساتھ ہے، دونوں کے اندر معیت ہے نہ کہ یہ متبادل ہیں۔

اِنّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَینِ کِتَابَ اللّٰهِ وَعِترَتِی اَهْلَبَیتِی......(۲۱)

بے شک میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میرے اہلبیت علیہم السلام......

عترت، سنت یا اہلبیت علیہم السلام جو بھی تعبیر ہو چکی ہے، اہل سنت کے ہاں اس طرح کی روایت نقل کی گئی ہے کہ کتاب اللہ و سنتی، سنتی ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، بے شک قرآن اور سنت کو مان لیں یا قرآن اور اہلبیت علیہم السلام کو مان لیں لیکن نہ سنت متبادلِ قرآن ہے اور نہ ہی قرآن متبادلِ سنت ہے بلکہ دونوں ہم آہنگ ہیں، قرآن اور اہلبیت علیہم السلام دونوں ایک ساتھ ہیں، پھر اس کے بعد فرمایا کہ دونوں کا ساتھ نہ ٹوٹنے والا ساتھ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تاکید کے ساتھ بیان فرمایا کہ

وَاِنَّهُمَا لَنْ یَفْتَرِقَا.....

کیا چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے......

یہ اصلاً ایک دوسرے سے دور نہیں ہو سکتے ہیں خواہ متبادل قرار دے کر ایک کو لے لیں اور ایک کو چھوڑ دیں یعنی اہلبیت علیہم السلام کو لے کر قرآن چھوڑ دیں یا قرآن کو لے کر اہلبیت علیہم السلام کو چھوڑ دیں تو بھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہو سکتے ہیں، یہ عِدل ہیں، عِدل یعنی ہم پلہ نہ کہ متبادل، یہ غلط تصورِ قرآن و اہلبیت علیہم السلام ہے کہ یہ ایک دوسرے کے متبادل ہیں، وہ قرآن کے پیچھے چلتے ہیں اور ہم فلاں کے پیچھے چلتے ہیں، اگر جنت جانے کے لئے اہلبیت علیہم السلام کو انتخاب کیا تو بدونِ قرآن ممکن نہیں ہے اور اگر بہشت کے لئے قرآن کا انتخاب کیا تو بدونِ اہلبیت علیہم السلام ممکن نہیں ہے، دونوں ایک ساتھ ہیں لہٰذا کوئی چیز متبادلِ قرآن نہیں ہے اور قرآن کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ ممکن نہیں ہے، اصل میں خدا نے ایسا راستہ بنایا ہی نہیں ہے، ممکن ہے کہ کوئی حدیث کو متبادل راستہ بنا لے مثلاً اہلِ حدیث یا اخباری، شیعوں کے اندر ایک گروہ بنامِ اخباری ہے کہ یہ لوگ ابھی دوبارہ زندہ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن مشکل ہے چونکہ پہلے جنہوں نے یہ مکتب شروع کیا تھا باسواد لوگ تھے، پڑھے لکھے تھے لیکن ابھی جو کوشش کر رہے ہیں وہ بے سواد اور ان پڑھ لوگ ہیں جو اخباریت کے احیاء میں مشغول ہیں، پہلے اخباری پڑھے لکھے ہوتے تھے، دانا تھے لیکن یہ ان پڑھ اخباری ہیں کہ جن کو صحیح لکھنا بھی نہیں آتا ہے کہ اخباری کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ کس سے مشتق ہے؟ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ حدیث متبادلِ قرآن ہے، یہ قرآن کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔

اہل سنت میں ایک گروہ بنامِ اہلِ حدیث ہے وہ بھی ایسے ہی ہے، جو کچھ حدیث میں ہے

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

وہ ان کے لئے حجت ہے، قرآن کا متبادل انہوں نے حدیث کو ڈھونڈ لیا ہے۔ کوئی بھی چیز متبادلِ قرآن نہیں ہے، نہ مفاتیح متبادلِ قرآن ہے، نہ فقہ متبادلِ قرآن ہے، نہ حدیث متبادلِ قرآن ہے اور نہ اہلبیت علیہم السلام متبادلِ قرآن ہیں، یہ سب کے سب تابعِ قرآن ہیں اور قرآن سے متخذ ہیں، قرآن سے لئے گئے ہیں اور قرآن کی وجہ سے حجت ہیں مثلاً اگر قرآن نہ ہو تو حدیث کی حجیت نہیں رہ جاتی ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام نے ہمارے لئے حدیث پرکھنے کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ اس کو قرآن پر پیش کرو اگر مطابق بہ قرآن ہے تو درست ہے اور اگر مطابق بہ قرآن نہیں ہے تو درست نہیں ہے، تعبیریں ہیں کہ اگر مخالفِ قرآن ہے تو اس کو دیوار پہ دے مارو، نہ کہ حدیث کو لے لو اور قرآن کو چھوڑ دو۔ قرآن پر عمل کرنا ہے، اگر حدیث کی سند بہترین سند ہو لیکن خلافِ قرآن ہو تو وہ حدیث حجیت نہیں رکھتی ہے، وہ من گھڑت حدیث ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام نے خود فرمایا کہ جو مخالفِ قرآن ہے اس کو جال کر کے، گھڑ کے ہمارے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے، ہمارے ساتھ اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے چونکہ ہم کبھی بھی خلافِ قرآن اظہارِ بیان نہیں کرتے ہیں۔

جلد بازی

٦) جَلد بازی

فہمِ قرآن میں مانعِ دیگر عجلت اور جلد بازی ہے کہ انسان جلدی جلدی میں، ایک رات میں سارا قرآن سمجھنے کی کوشش کرے، جس طرح سے قرأتِ قرآن میں جلد بازی ہوتی ہے، جیسے تراویح میں پڑھتے ہیں، معلوم نہیں ہوتا ہے کہ وہ کیا پڑھتے ہیں؟ کسی کو پتہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ عربی پڑھ رہے

ہیں یا غیر عربی پڑھ رہے ہیں، اتفاقاً یہ وہ طبقہ ہے کہ جو ایک طرف سے کہتا ہے کہ اگر ایک مخرج یا ایک تلفظ غلط ہو گیا یا جا بجا ہو گیا تو اس صورت میں جہنم چلے جائیں گے لیکن دوسری طرف سے خود اسی طرح سے قرآن پڑھتا ہے، یہ خود کدھر جائیں گے جو سات منٹ میں سپارہ پڑھتے ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک ہفتے یعنی سات دنوں سے کم تر قرآن ختم کرنا جائز نہیں ہے، ایک شخص نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ جلدی کر سکتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے زیادہ نہیں، پہلے فرمایا تین ماہ میں پھر فرمایا ایک ماہ میں ختمِ قرآن کریں چونکہ آپ نے سمجھنا ہے، آپ جلد بازی اور عُجلت نہ کریں۔

قرآن میں بعض جگہیں رکنے کی، وقف و توقف کی اور ٹھہرنے کی ہوتی ہیں، ترتیل کا یہی معنیٰ کیا گیا ہے، یہ روایت امیر المومنین علیہ السلام سے ہے، پوچھا گیا کہ ترتیل سے کیا مراد ہے تو حضرتؑ نے یہی فرمایا کہ جس آیہ پہ جاتے ہو اس آیت پر رک جاؤ، غور کرو، فکر کرو، تدبر کرو یہ ترتیل ہے۔ ابھی ترتیل ایک فن بن گیا ہے کہ اگر لمبی سر کے ساتھ پڑھے تو وہ قرأت ہے اور چھوٹی سر کے ساتھ پڑھے تو ترتیل کہلاتی ہے۔ حالانکہ ترتیل کا مطلب غور کر کر کے، فکر کر کر کے پڑھنا، کسی آیت سے ایسے ہی نہ گزر جاؤ، آیاتِ قرآن کو جلدی کے ساتھ عبور نہ کرو، جس طرح سے قواعدِ تجوید میں ہے کہ وقف ہیں، یہاں پر سانس توڑنی ہے، یہاں پر سانس نہیں توڑنی ہے، یہاں پر وقف کرنا ہے، یہاں پر وقف جائز و لازم و ممنوعہ ہے، اسی طرح سے معانیٔ قرآن کے لئے بھی وقف لازم ہیں، ایک قرآن ایسا تدوین ہو کہ جس میں یہ غور و فکر کرنے کے وقوف درج ہوں۔

ابھی قرآن کا استخارہ ایڈیشن (Edition) بھی نکلا ہے کہ جس کے اوپر خوب و بد لکھا ہوا ہے، دکانوں پر ملتا بھی ہے، جس کے اوپر لکھا ہوا ہے استخارہ ایڈیشن۔ آج کل قرآن کے مختلف ایڈیشن ہیں مثلاً ایک جہیز ایڈیشن ہے کہ جس کی جلد گولڈن ہے اور بہت مہنگا ہے جو دلہن کو دیتے ہیں، جسے ہاتھ نہیں لگانا ہوتا ہے صرف جہیز میں رکھتے ہیں اور اس کا عنوان ہی جہیز ایڈیشن ہے، اسی طرح سے استخارہ ایڈیشن ہے، اس کو پڑھنا نہیں ہے، اس کے اوپر لکھا ہوا ہے کہ یہ صفحہ خوب ہے اور یہ صفحہ بد ہے۔ کاش ایک ایڈیشن ایسا چھپے کہ اس میں غور و فکر کرنے کے آداب لکھے گئے ہوں، ہر صفحے میں غور و فکر و تدبر کے آداب لکھے ہوئے ہوں، مثلاً آدابِ فہم قرآن ایڈیشن۔ کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ ختمِ قرآن کتنے دنوں میں کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ چھ مہینوں سے ایک آیہ میں مشغول ہوں، اور حقیقت ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اگر ایک انسان کی روح قرآن سے مانوس ہو جائے، حقیقتِ قرآن سے انسیت پیدا کر لے تو شاید انسان کو ایک آیت ہی آگے نہ بڑھنے دے، قرآن کے اندر اتنا عمق اور اتنی گہرائی ہے۔

۷) لکیر کا فقیر ہونا

ان موانعِ فہمِ قرآن میں سے ایک لکیر کا فقیر ہونا ہے، لکیر کا فقیر ہونا اصطلاح ہے، لکیر کے فقیر سے کیا مراد اندھی تقلید ہوتی ہے، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کہیں کہ مثلاً یہ کپ اُٹھالیں تو کپ اٹھالیتے ہیں اور پرچ نہیں اٹھاتے ہیں، ایسے لوگ متعدد ہیں کہ جو ایسے اطاعت گزار

ہیں، یہ پرچ کیوں نہیں اٹھاتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ آپ نے تو نہیں کہا تھا کہ پرچ اُٹھاؤ بلکہ آپ نے کپ اٹھانے کا کہا تھا، انسان اتنا لکیر کا فقیر نہیں ہونا چاہیے، چونکہ ہر فرمان کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں، ہر تکلم اور گفتگو کے بھی لوازمات ہوتے ہیں، بسا اوقات محاورہ یا کنایہ استعمال کیا جاتا ہے، کنایہ و محاورہ نہ ہو اور صراحت سے بھی اگر ایک بات کی جائے تو اس سے بھی انسان بہت کچھ سمجھ لیتا ہے، اگر انہیں کہہ لیں کہ دروازہ بند کر دو تو وہ کھڑکی بند نہیں کرتے ہیں چونکہ فقط دروازہ کہا تھا یا مثلاً انہیں کہیں کہ تھوڑی سی اِدھر جگہ بناؤ تو وہ تھوڑی سی جگہ بناتے ہیں کہ وہ بیٹھنے کے بھی قابل نہیں ہوتی۔ عموماً کنایہ ہوتا ہے کہ مثلاً تھوڑا سا پانی دینا تو وہ آپ کے لئے تھوڑا سا پانی رسد کرتا ہے، وہ آپ کو اس گلاس کی تہہ میں تھوڑی سی رطوبت ڈال کے دے گا، اگر انہیں کچھ کہیں تو کیا کہیں گے؟ آپ نے ہی کہا تھا کہ تھوڑا سا پانی دے دو، یعنی محاوراتی زبان کے لوازمات اور معانی کے لوازمات یہ نہیں سمجھتے ہیں، یہ سادہ لوحی، سادگی، نافہمی اور کج فہمی ہے، اس طرح سے لکیر کا فقیر نہیں بننا۔

بعض لوگ عام زندگی میں بھی ایسے ہیں، ہی لکیر کے فقیر ہیں مثلاً حرم کی مثال لے لیں، حرم کے کئی دروازے ہیں، اگر انسان پہلی دفعہ کسی دروازے سے اندر آیا تھا یا حرم کے پہلے دروازے سے کسی دوست کے ساتھ اندر گیا تھا تو اب ساری عمر جتنا عرصہ وہ حوزے میں ہے اسی دروازے سے آتا جاتا ہے اسی کو کہتے ہیں کہ لکیر کا فقیر ہے، اس کے اندر یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی ہے کہ میں ایک دن کسی دوسرے دروازے سے بھی آؤں، وہاں سے بھی آ کر دیکھوں کہ وہاں کیا منظر ہے؟ وہاں سے کیا نظر آتا ہے؟ وہاں کیا اتفاق رونما ہوتا ہے؟ چونکہ پہلے دن اسی دروازے سے آیا ہوں

لہذا اسی دروازے سے جانا ہے، جس گلی سے مجھے دوست حرم لے کر گیا تھا اب میں ساری عمر اسی گلی سے آنا جانا کروں تو یہ لکیر کا فقیر ہونا ہے۔

یہ موانعِ فہمِ قرآن میں سے ہے کہ کسی نے ایک لکیر کھینچ دی تو چونکہ پہلے کسی نے یہ بات نہیں کی تو ہم بھی نہیں کرتے ہیں اور اکثر لوگوں کی یہ عادت بھی بنی ہوئی ہے، فرض کریں کہ ایک جوان طالب علم ایک مقالہ لکھتا ہے، ایک بیان نامہ لکھتا ہے، تھیسس (Thesis) لکھتا ہے اور اس میں ایک نئی تحقیق پیش کرتا ہے، پھر وہ اسے اپنی اس جیوری (Jury) میں پیش کرتا ہے کہ جہاں داور بیٹھا ہوتا ہے اور وہ اس سے سب سے پہلا سوال کیا کرتے ہیں؟ اس کا حوالہ کہاں ہے؟ کیا ضروری ہے کہ ہر بات کا حوالہ ہو؟ اگر وہ کہے کہ اس کا حوالہ نہیں ہے بلکہ یہ مطلب میں نے خود سوچا ہے تو اس کو رد کر دیتے ہیں، آپ کو سوچنے کا حق ہی نہیں ہے، ہر چیز کا حوالہ ہونا چاہیے، چونکہ حوالہ مانگتے ہیں تو ایک بزرگوار نے تھیسز لکھا اور اس میں امامؒ کا یہ قول لکھا کہ

دین ما عین سیاستِ ما است و سیاست ما عین دین ما است؛

چونکہ نیچے حوالہ لکھنا ضروری تھا، ان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حوالہ کہاں ہے تو انہوں نے نیچے فٹ نوٹ (Footnote) میں لکھا کہ جمہوری اسلامی کا دس کا نوٹ،، چونکہ اس پہ یہ جملہ لکھا ہوتا ہے کہ

دیانت ما عین سیاستِ ما است و سیاست ما عین دیانتِ ما است؛

انہوں نے دس تومان کا نوٹ حوالے کے طور پر لکھا، ظاہر ہے کہ جب ہر چیز کا حوالہ مانگیں گے تو پھر ایسا ہی حوالہ نقل بھی کرنا پڑے گا۔ ان جوان طلبہ کو اجازت دیں، میدان دیں اور ان سے کہیں کہ اپنی بات کریں، سب سے زیادہ نمبر کس کے ہونے چاہئے؟ جو اپنی بات کرے، یہاں سب سے زیادہ نمبر کس کے ہیں؟ جو دوسروں کے چبائے ہوئے لقمے لا کر دیتا ہے لیکن اگر کوئی خود سے غور وفکر کے ذریعے ایک نتیجے پر پہنچا ہے اور اس کا حوالہ نہیں ہے تو وہ قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ آپ کو سوچنے کا حق نہیں ہے، یہ مانعِ فہم ہے اور اس سے انسان ترقی نہیں کرسکتا ہے۔

۸) خود کو راهنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھنا

مانعِ دیگر کہ جس کو غرور وتکبر کا لازمہ بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ ایک مستقل چیز ہے یعنی بسا اوقات غرور تکبر کی وجہ سے یہ مانع پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی اور وجہ سے بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان قرآن فہمی میں اپنے آپ کو راہنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھے، کوئی یہ کہے کہ قرآن سمجھ میں آیا ہے لیکن میں کسی کا محتاج نہیں ہوں، نہ کسی کی کتاب کا، نہ کسی فن کا، نہ کسی ادب کا، نہ کسی قاعدے کا اور نہ ہی کسی ضابطے کا تو یہ اشتباہ ہے۔ قرآن فہمی کے لئے آمادگی کی ضرورت ہے، علمی آمادگی کی بھی ضرورت ہے، ذہنی آمادگی کی بھی ضرورت ہے، قلبی آمادگی کی بھی ضرورت ہے، ہر طرح کی آمادگی کی ضرورت ہے تاکہ انسان قرآن کو سمجھ سکے۔

آپ بچوں کو اتنا تیار کر کے، آمادہ کر کے، کتابیں بستے میں ڈال کر اسکول کیوں بھیجتے ہیں؟

چونکہ اسکول ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں پر آمادگی ہے یعنی مکانی آمادگی ہے، زمانی آمادگی ہے، انسانی آمادگی ہے، ماحول کی آمادگی ہے، اسی کو اسکول کہتے ہیں، وَ اِلَّا بچے کو آپ چوراہے پر بٹھادیں اور ایک ٹیچر کو کہیں کہ اس کو یہاں کتاب پڑھادے، چوراہا تعلیم کے لئے آمادگی کی جگہ نہیں ہے، جس طرح بعض پڑھاکو ہوتے ہیں کہ وہ گھر میں ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں اور بس اسٹاپ پہ کتاب لے کر پڑھ رہے ہوتے ہیں، اُدھر نمازِ جماعت کھڑی ہوتی ہے اور آواز آتی ہے کہ قد قامت الصلوٰۃ لیکن یہ کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے، اتنے پڑھاکو ہو تو آپ گھر میں کیوں نہیں پڑھتے ہو، اگر انسان بہت پڑھنے والا ہے تو گھر، مدرسے، اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں زیادہ سے زیادہ پڑھ سکتا ہے اور پھر اس کے بعد دوسرے کام بھی نمٹا سکتا ہے۔

مثلاً بس اسٹاپ پہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کتاب ہاتھ میں لئے کھڑے بھی ہیں اور دوسروں کی باتیں بھی سن رہے ہیں چونکہ کچھ لوگ اسٹاپ پہ کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں، اگر کسی نے کوئی اشتباہ والی بات کی تو یہ انہیں وہیں پر ٹوک دیتا ہے کہ نہیں یہاں پر یہ بات آپ نے کی ہے بلکہ وہ ایسے ہیں، جناب آپ تو مطالعہ کر رہے تھے ہماری باتوں میں آپ کی توجہ کیسے ہے؟ یہ ریاکاری ہے لہٰذا یہ کام نہ کریں، کبھی بھی بس اسٹاپوں پہ، بسوں میں، رش میں، چوک میں اور بھیڑ میں مطالعے کی جگہ نہیں ہے، مطالعے کے لئے آسودہ ماحول کی ضرورت ہے، زمانی شرائط ہیں، مکانی شرائط ہیں، جسمانی شرائط ہیں، روحی شرائط ہیں، مطالعہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب یہ شرائط پوری ہوں، اگر انسان تھکا ہوا ہے، نیند آئی ہوئی ہے تو انسان ایک لفظ پڑھتا ہے تو پھر آنکھیں بند ہو جاتی ہیں لہٰذا پھر اٹھتا

ہے اور پھر پڑھنا شروع کر دیتا ہے، یہ ذہن تو سویا ہوا ہے، سویا ہوا ذہن کیا مطالعہ کرے گا؟ انسان کو تازہ ذہن چاہئے، آمادہ ذہن چاہئے۔ کھانا اتنا کھایا ہوا ہے کہ انسان بیٹھ نہیں سکتا ہے اور اس وقت کتاب کھول کر پڑھنا شروع کرے تو اس میں کچھ بھی سمجھ نہیں آتا ہے۔ مرحوم شہید اول ؒ، شہید ثانی ؒ اور دیگر علماء نے مطالعے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ریاکاری ہے، اس طرح سے نہ کریں۔ اس طرح اسٹاپ پہ جب کسی آقا کو مطالعے میں غرق دیکھتے ہیں تو چند ایک جوان متاثر بھی ہو جاتے ہیں چونکہ ان کو خود نہیں پتہ ہے، وہ اَن پڑھ ہوتے ہیں اس لئے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک بزرگوار خاتون تھیں، وہ خود پڑھی ہوئی نہیں تھی، ان کا بچہ اسکول میں پڑھتا تھا اور اکثر کلاسوں میں فیل ہوتا تھا لیکن وہ خود اپنے بچے کی ذہانت کی بڑی قائل تھی، کہتی تھی کہ اس کو ساری کتابیں ازبر ہیں، وہ جب بھی اس بچے سے سبق سنتی تھیں تو وہ آکرامی کو قومی ترانہ سناتا تھا، اس کو فقط قومی ترانہ یاد تھا اور وہ سمجھتی تھیں کہ اس کو ساری کتاب ازبر ہے یعنی وہ کتاب کھولتا تھا اور قومی ترانہ سنا دیتا تھا۔ اس سے ایسے سادہ لوح لوگ ہی متاثر ہو سکتے ہیں لیکن کیا آپ خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں؟ یا اپنے آپ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں؟

قرآن سمجھنے کے لئے بھی شرائط چاہئیں، آمادگی رُوحی چاہئے، جیسے کہا گیا ہے کہ قرآن کے لئے عربی جاننا ضروری ہے، بعض کا اصرار ہے کہ عربی کے بغیر ترجموں سے قرآن سمجھ میں آسکتا ہے، مترجم کو سمجھ میں آیا ہو تو آپ کو سمجھ میں آئے گا، آپ کی فہم مترجم پر موقوف ہے، مترجم تو واسطۂ وحی نہیں ہیں، جس طرح سے کہا کہ آپ ملازمت کے لئے انگریزی پڑھتے ہو اور بچوں پر اتنا پیسہ خرچ

کرتے ہو، بعض تو لاکھوں روپیہ بچوں کی انگریزی پہ خرچ کرتے ہیں درحالیکہ عربی سیکھتے ہوئے نہ صرف خرچہ نہیں ہوتا ہے بلکہ خرچہ ملتا بھی ہے لیکن پھر بھی عربی کی طرف نہیں آتے ہیں، یہ طاغوتی ذہنیت ہے، یہ جس کی بھی ذہنیت ہو اور وہ عربی کو پسماندگی کی علامت سمجھے تو یہ طاغوتی ذہنیت ہے، پوری دنیائے اسلام، امتِ مسلمہ و اہلِ قرآن کے لئے عربی سیکھنے کا ماحول بن جانا چاہئے۔ آپ کو کوئی یہودی بغیر عبری زبان کے نظر نہیں آئے گا، اصلاً وہ یہودی نہیں ہے کہ جس کو عبری نہیں آتی ہے، سب یہودی عبری جانتے ہیں کیونکہ ان کا مطلب، ان کی کتاب عبری میں ہے، ان کا متن عبری میں ہے، ان کی مذہبی زبان عبری ہے۔

ابھی سب کہتے ہیں کہ قرآن انگلش میں ہو حتیٰ اردو بھی انگلش میں لکھتے ہیں یعنی رومن میں، جیسے ایک چیٹنگ (Chatting) کی زبان ہے تو وہ انگلش میں، اردو انگلش میں، عربی انگلش میں، دعائیں انگلش میں، مناجات انگلش میں، سارا کچھ انگلش میں ہو۔ آپ عربی سیکھو، کتنا وقت لگتا ہے عربی سیکھنے میں؟ بہت کند ذہن ہوئے تو بھی دو سال لگیں گے، بارہ سال، چودہ سال تم انگلش سیکھتے ہو تو دو سال عربی نہیں سیکھ سکتے ہو؟ اور اب تو اس کے لئے نیٹ (Net) کے ذریعے اہتمام بھی ہوسکتا ہے اور مواصلاتی ذریعے بھی بہت اچھے ہیں، یہ اہتمام گھر گھر میں ہوسکتا ہے۔ کم از کم آمادگی یہ ہونی چاہئے کہ قرآن عربی میں ہے اور ہمیں عربی معلوم ہونی چاہئے، ضرورت کی حد تک عربی سے ہمیں آشنائی ہونی چاہئے۔

قرآن معارف بتا رہا ہے اور ہدایت کی کتاب ہے لہٰذا ہدایت کے لئے انسان کو علمی لحاظ

سے مسلح ہونا چاہئے، اس کے لئے انسان بہت سارے علوم انسان سیکھے تا کہ آمادہ ہو نہ کہ ان علوم کے ذریعے سے تفسیر کرے، ان علوم کو قرآن پر ٹھونسے یا قرآن کو ان علوم پر زبردستی منطبق کرے۔ وہ علوم جو انسان کو آمادہ کرتے ہیں اور اس کی صلاحیت بڑھا دیتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ فلسفہ پڑھنے کے لئے ریاضی کی ضرورت ہے، ریاضی یعنی ریاضت جو ورزش کو کہتے ہیں، عربی زبان میں ریاضی علم کو نہیں کہتے ہیں، اس علم کا نام وہی جبر ہے، جس کو الجبرا کہتے ہیں، اس کا نام ہی جبر ہے، ریاضی اس کو اس وجہ سے کہتے ہیں چونکہ یہ اس پر مشق کراتی تھی، فلسفہ پڑھنے کے لئے یا کسی بھی علم میں جانے کے لئے علمِ ریاضی پڑھتے تھے چونکہ ریاضی ایک طرح کی ذہنی ورزش ہے یعنی علمِ ریاضی ذہن کو تیار کرتا ہے۔ ریاضی خود اعداد کا علم ہے، اس کے اندر جمع، تفریق ہے لیکن جو یہ کام کرلے اس کا ذہن بہت تیز ہو جاتا ہے لہٰذا اگر انسان نے ریاضی پڑھ کر ذہنی طور پر مشق کی ہوئی ہے اور پھر قرآن پڑھے تو اس کو بہتر قرآن سمجھ میں آئے گا بجائے اس کے کہ جو یہ کام نہیں جانتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو آمادہ کرے۔

البتہ یہاں اس فرق کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ انسان قرآن کے اندر مہارت اور معلمِ قرآن بننے کیلئے تخصص حاصل کرے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر فرد اتنی حد تک تخصص پیدا کرے کہ مثلاً ایک چودہ سالہ قرآنی کورس ہے تو وہ انسان پورے کا پورا پڑھے، ضرورت کی حد تک عربی سیکھے، اتنے مقدماتِ علمی اپنے اندر تیار کرلے کہ اگر سادہ سا قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو قرآن سمجھ میں آئے، وہ کسی مترجم کا محتاج نہ ہو، کسی مفسر کا محتاج نہ ہو بلکہ اپنے دین کی کتاب سے اپنا

منشور خود سمجھ سکے، قرآن منشورِ حیاتِ انسان ہے، انسان کو قرآن پڑھنا نہیں آتا ہے تو اور کیا آئے گا؟ جس کو قرآن پڑھنا نہیں آتا ہے اگر وہ ساری دنیا کے علوم سیکھ لے تو بھی جاہل ترین انسان ہے۔

۹)ثانوی مطالب پہ توجہ دینا

فہمِ قرآن کی راہ میں ایک اور بڑا مانع اصلی مطالب کو چھوڑ کر فرعی اور ثانوی مطالب پر توجہ دینا ہے۔ جیسے قرآن کا طریقہ ہے وہی عام عرفی بول چال کا، عام محاورے کا طریقہ ہے چونکہ قرآن لوگوں کے لئے آیا ہے تو لوگوں کی ہی زبان میں آیا ہے، زبانِ قرآن کی بابت یہ مطلب بعض بزرگان نے تفسیر میں لکھا ہے اور خوب نکتہ ہے کہ قرآن کتابی زبان میں نہیں ہے بلکہ خطابی زبان میں ہے، یہ بڑا لطیف نکتہ ہے، جیسے پہلے درج کیا تھا کہ ایک تقریر جب کتاب بنے اور اسے تحریری شکل دیں تو آدھے معانی گم ہو جاتے ہیں اسی طرح قرآن کی کتابی زبان نہیں ہے بلکہ خطابی زبان ہے لہٰذا مطلب کے اندر مطلب ہے، یہ الکلام یجر الکلام کی طرح ہے اور ایک بات میں سب باتیں ہیں، خطابی زبان ایسی ہی ہوتی ہے، ایک شخص جب کسی کو سمجھا رہا ہوتا ہے، کوئی مطلب ہدایت کر رہا ہوتا ہے اور راہنمائی کر رہا ہوتا ہے تو وہ ہر چیز کی مثال و تمثیل بھی پیش کرتا ہے اور اس کے لئے زبان بھی بدلتا رہتا ہے۔

خطابی زبان بدلتی رہتی ہے مثلاً جب آپ خود بھی گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو غیر محسوس طور پر اپنی زبان بدلتے رہتے ہیں، کس طرح؟ کبھی آپ ''تم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کبھی ''آپ''

ثانوی مطالب پہ توجہ دینا

کہنا شروع کر دیتے ہیں، کبھی ''تو'' کہتے ہیں، اسی طرح کبھی غائب کے صیغے، کبھی حاضر کے صیغے، کبھی متکلم کے صیغے استعمال کرتے ہیں، ایک انسان کو دیکھیں کہ پانچ منٹ میں کتنی دفعہ زبان بدلتا ہے؟ کیوں؟ کیونکہ یہ زبان بدلنا تفہیم کے لئے ضروری ہے، کتاب میں زبان بدلنی نہیں ہوتی ہے، جب آپ کتاب لکھ رہے ہوں تو جہاں لفظِ ''آپ'' ہے تو آخر تک آپ ہی رہے گا، اس میں آپ کو ''تو'' نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن یہاں بولنے والا ہر قالب میں چلا جاتا ہے، بولنے والا کبھی صیغۂ غائب میں گفتگو کرتا ہے، کبھی صیغۂ خطاب میں بولنے لگتا ہے، کبھی صیغۂ متکلم میں بولنے لگتا ہے، کبھی انا ونحن کہنے لگتا ہے اور کبھی انتم وفلاں کہنے لگتا ہے، کبھی ھو وھا اُولاء کہنے لگتا ہے، یہ خطابی زبان کی خصوصیات ہیں، چونکہ قرآن عام لوگوں کی زبان میں آیا ہے اور عام لوگوں کی زبان کتابی زبان نہیں ہے بلکہ خطابی زبان ہے۔

لوگ خطابی زبان بولتے ہیں نہ کہ کتابی زبان بولتے ہیں لہٰذا ہم بھی جب لوگوں کے سامنے جا کر کتابی باتیں کرتے ہیں تو وہ بور ہونے لگتے ہیں، ایس ایم ایس (SMS) شروع کر دیتے ہیں لیکن اگر آپ خطابی زبان میں گفتگو کریں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ اس ترتیب ولطافتِ قرآن پہ غور کریں کہ کس طرح قرآن لہجے بدلتا ہے؟ معانی منتقل کرتا ہے اور انسان کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے، کہاں سے کہاں لے جاتا ہے؟ نہج البلاغہ خطابی زبان ہے، نہج البلاغہ کے خطبوں کے اندر جو چاشنی موجود ہے، جو لطافت موجود ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ خطابی زبان ہے، کتابی زبان نہیں ہے اور جس کو خدا یہ ہنر دے دے، یہ فن دے دے کہ اسے لوگوں کو تفہیم اور بیان کرنے کا ڈھنگ آجائے

تو یہ بیان ایک لطفِ خدا ہے، قرآن نے اس کو نعمتِ خاصِ خدا ذکر کیا ہے، نعماتِ خدا میں سے ہے کہ

الرَّحْمٰنُ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۝ (۲۲)

وہ خدا بڑا مہربان ہے۔ اس نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔ انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور اسے بیان سکھایا ہے۔

یعنی خدا نے انسان کو نعمتیں دیں اور سب سے بڑی نعمت

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۝

یعنی خدا نے قوتِ تفہیم دی ہے، خدا نے سمجھانے کی قوت دی ہے، یہ خطابی زبان میں زیادہ بہتر ہے، خطابی زبان میں ہوتا ہی یہی ہے کہ ایک مطلب کو بیان کرنے کے لئے کئی مطالب کی طرف اشارہ ضمنی کرنا پڑتا ہے، قرآن کے اصلی خطوط واصلی محور ہیں اور ان اصلی خطوط کو قرآن نے ہر طریقے سے بیان کیا ہے، کبھی مثال کے ذریعے، کبھی قصے کے ذریعے، کبھی ضمیر غائب وحاضر کے ذریعے، قرآن نے لہجے بدلے ہیں لیکن ان لہجوں میں اصلی مطلب گم نہیں ہوتا ہے، اصلی مطلب ساتھ رہتا ہے، انسان کو اصلی مطلب کے ساتھ ساتھ رہنا چاہئے اور وہ جو ثانوی چیزیں ہیں ان کو ثانوی ہی رکھے لیکن بعض اس مشکل میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے ثانوی چیزیں اہمیت اختیار کر جاتی ہیں اور اصلی مطلب گم ہو جاتا ہے۔

ثانوی مطالب پر توجہ دینا

آپ تفسیروں میں دیکھیں کہ حتیٰ قرآن میں لوگوں کے اکثر سوالات فرعی مسائل کے بارے میں ہیں، مثلاً قصہ آدم علیہ السلام میں، خلقتِ آدم علیہ السلام میں خداوند تبارک وتعالیٰ کا بنیادی مقصود کیا

ہے؟ لیکن اساسی ترین سوال جو آج تک سب کے ذہنوں میں اٹھتا ہے وہ شجرِ ممنوعہ ہے کہ جو آدم علیہ السلام نے کھایا تھا کہ وہ درخت کونسا تھا؟ یہ لاینحل سوال ابھی تک موجود ہے اور ساری تحقیقات اس کے اوپر ہیں یا خداوند تبارک وتعالیٰ نے نبیؑ بنی اسرائیل کے ذریعے بنی اسرائیل کو کہا کہ

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ...... (۲۳)

اس قریہ میں داخل ہو جاؤ تو ساری بحث اس قریے میں ہے کہ یہ دیہات کونسا تھا؟ جو بھی تھا بالآخر قریہ تھا اس کو چھوڑیں اور اصل مطلب کو پکڑیں کہ کہنا کیا چاہتا ہے، اس طرح کی ثانوی چیزیں جو قرآن نے اصلی مطلب کی تفہیم کے لئے، وضاحت کے لئے ساتھ ذکر کی ہیں تا کہ اصلی مطلب واضح و روشن ہو لیکن ان ثانوی مطالب نے اہمیت حاصل کر لی ہے اور جو قرآن کی اصلی باتیں ہیں وہ گم ہوگئی ہیں اور اس کے فراواں نمونے ہیں، تقریباً ہر جگہ آپ قرآن میں جا کر دیکھ لیں کہ ثانوی باتیں اصلی مقام پر آبیٹھی ہیں، یہی مانعِ فہمِ قرآن ہیں، جن لوگوں کو قرآن کے اندر شدید رغبت ہے وہ ان مسائل میں زیادہ تحقیق میں لگے ہوئے ہیں کہ فرشتے مونث ہیں یا مذکر ہیں؟ اسی بحث میں سارا وقت لگا دیتے ہیں مثلاً جنت کی نعمتوں کے بارے میں تحقیق جاری ہے، ایک روحِ جنت ہے کہ قرآن اسی طرف منتقل کرنا چاہتا ہے اور کچھ جنت کی تفہیم و وضاحت کے لئے ثانوی چیزیں ہیں، جنت کے ذیلی اور ضمنی مسائل ہیں لیکن ساری توجہ ان ضمنی مسائل کے اندر ہے، حوریں و نہریں جنت کی ضمنی بخشیں ہیں، اصل جنت کی طرف توجہ کرو کہ انسان کے لئے جنت ہے کیا چیز؟ قرآن نے اتفاقاً نمونے بھی پیش کئے ہیں کہ صدرِ اسلام میں بھی یہی مشکل تھی، لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت

ثانوی مطالب پر توجہ دینا

سارے سوال کرتے تھے، اگر ان میں اکثر باتیں دیکھیں تو کوئی کام کی بات نہیں پوچھتے تھے، اکثر ثانوی مسائل کے بارے میں پوچھتے تھے مثلاً

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ..... (۲۴)

آپؐ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں، اگر اس سے مراد روحِ انسان ہو تو یہ بڑا عمیق اور دقیق سوال ہے لیکن وہ کیا پوچھتے تھے؟ وہ جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں زیادہ پوچھتے تھے چونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم جو بات کرتے ہیں، جو سازش کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتا دیتے ہیں، تو وہ اکثر پوچھتے تھے کہ یہ کون ہے؟ یہ روح جو آپ کو آگاہ کر دیتی ہے، یہ کبھی ہمارے ہاتھ چڑھ جائے تو اس سے جان چھڑا لیں گے، سوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی ضمنی بات کو پکڑ لیا اور یہ عملاً بھی ہوتا ہے، آپ کو بھی تجربہ ہوگا، مجھے زیادہ تجربہ ہوا ہے چونکہ گفتگو میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ سب حاضرین کو سمجھ میں آجائے، حاضرین مختلف ہوتے ہیں، کوئی پڑھا لکھا ہوتا ہے، کوئی ان پڑھ ہوتا ہے، بالآخر کسی کا مطالعہ ہوتا ہے کسی کا نہیں ہوتا ہے اور ہر ایک کو سمجھانا ہوتا ہے لہٰذا گفتگو میں مثالوں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے لیکن عموماً لوگ انہی مثالوں میں پھنس جاتے ہیں یعنی جو مثال اصل مطلب کی تفہیم کے لئے دی جاتی ہے تو بعض اسی مثال میں پھنس جاتے ہیں، کسی جگہ ایسے ہی مثال دیتے ہوئے بلی کا ذکر آیا اور وہ دو گھنٹے کی گفتگو تھی لیکن جب گفتگو ختم ہوئی تو ایک آدمی بلی پر ہی غور کر رہا تھا، یہ مانع از فہمِ قرآن ہے۔ اصلی خط کو نہ چھوڑیں کیونکہ ضمنی بات ضمنی بات ہے۔

ثانوی مطالب پہ توجہ دینا

۱۰) اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجہی

اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجہی ایک اور مانع ہے کیونکہ قرآن کے کچھ کلیات ہیں یعنی اصلی موٹے خطوط ہیں اور قرآن کی ہدایت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ تمام نسلوں کے لئے ہے، قیامت تک کے لئے ہے اور یہ کسی خاص نسل کے لئے نہیں ہے، امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر قرآن ایک نسل کیلئے ہوتا تو اس نسل کے مرنے سے قرآن بھی مرگیا ہوتا درحالیکہ نسلیں مرگئی ہیں اور قرآن زندہ ہے، پس اس کا مطلب ہے کہ قرآن مصادیق کا اسیر نہیں ہے اور شانِ نزول کا اسیر نہیں ہے لہٰذا آیاتِ قرآن کو شانِ نزول اور مصادیق کے اندر پابند کرنا ایک مانعِ فہم قرآن ہے، شانِ نزول یا مصداق اگر ہے بھی تو اس کو اتنی ہی اہمیت دی جائے کہ جتنا اس پر تطبیق ہوسکتا ہے، قانونِ کلی ایک عام قانون ہے لیکن قانون کی عمومیت اور کلیّت کو بیچ میں سے ختم نہ ہونے دے، ایسا قانون جو تمام نسلوں کے لئے ہے، مفسرِ قرآن کی اسی لئے ضرورت ہے کہ یہی چیزیں الگ کر کے ہمیں بتائے کہ یہ قانون کا خطِ کلی ہے، اصلِ کلی ہے، یہ تمام زمانوں کے لئے ہے لیکن یہ خصوصیت فقط اس مصداق کی ہے، تطبیقی پہلو کو اس کلی پہلو سے جدا کریں۔

اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجہی

۱۱) فقط انتخابی آیات پر توجہ دینا

مانعِ آخر انتخابی اور گزینشی (Selected) عمل کردن، گزینش یعنی چن چن کے آیات ڈھونڈنا، تلاش کرنا مثلاً سو آیات سے گزر کر ایک سو ایک نمبر آیت پر پہنچنا، یہ کام نہ کریں، اس طرح

سے قرآن پر عمل نہ کریں بلکہ تمام قرآن ہدایت ہے، ہر آیۂ قرآن ہمارے ہدایت کے لئے ہے نہ کہ فقط چنی ہوئی چند آیات، اس وقت ہمارے ہاں قرآن بھی منبر پر ہی پیش ہوتا ہے، اہلبیت علیہم السلام بھی منبر پر ہی پیش ہوتے ہیں، پورا دین منبر پر ہی ہے، منبر سے ماورا کچھ بھی نہیں ہے اور منبر پر فقط انتخابی آیات پڑھی جاتی ہیں اور اسی وجہ سے ہمارے بعض حضرات قرآن کی طرف فقط انہی آیات کی وجہ سے غور کرتے ہیں کہ جو اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں ہیں اور جو اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں نہیں ہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہے، یہ عمل نہیں ہونا چاہئے مثلاً فقہ میں بھی یہی کام ہوتا ہے، فقیہ آتا ہے اور قرآن میں جو آیاتِ احکام ہیں وہ چن لیتا ہے باقی آیات سے کوئی سروکار نہیں ہے یا اگر علم اخلاق کا کوئی عالم آئے تو وہ فقط اخلاقی آیات انتخاب کرتا ہے اور باقی قرآن سے کوئی سروکار نہیں ہے،

نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ.....(۲۵)

یعنی ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے۔۔۔

یہ نہ کریں یعنی قرآن کو تکہ پارہ نہ کریں، قرآن کو کاٹیں نہیں، جیسے دین کے ساتھ ایک ستم یہ بھی ہوا ہے کہ دین ایک پورا ہم آہنگ مجموعہ تھا، معارف کا، اعمال کا، اخلاق کا، احکام کا، نظام کا، اس کو ہم نے کاٹ کاٹ کے، الگ الگ کر کے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ دیا ہے، احکام کسی نے لے لئے، اخلاق کسی نے لے لیا، جہان شناسی کسی نے لے لی، دوسرا شعبہ کسی اور نے لے لیا۔ اس طرح سے قرآن گم ہو جاتا ہے، قرآن انسان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے یعنی فقیہ کو فقہ بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے اگر دوسری آیات اس کے سامنے نہ ہوں، حکیم کو حکمت سمجھ میں نہیں آتی ہے اگر فقہ کی

فقط انتخابی آیات پر توجہ دینا

آیات اس کی نظر میں نہ ہوں، اور متخلق کو اخلاق سمجھ میں نہیں آتا ہے اگر باقی آیات اس کی نظر میں نہ ہوں، پورا قرآن ایک مجموعۂ ہدایت ہے اس کو الگ الگ نہ کریں کیونکہ قرآن کی فہم میں یہ بھی ایک بڑا مانع ہے۔

انشاء اللہ خداوند تبارک وتعالیٰ اس قرآن کے صدقے ہمارے دلوں کو ان موانع سے پاک فرمائے۔ آئندہ فصل میں ادبِ ہفتم کی وضاحت کی جائے گی۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ ۲۴)

(۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۷۸)

(۳)......(شرح أصول الكافي- مولى محمد صالح المازندراني، الجزء ۳، صفحه ۲۰۶) (شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة الله بن محمد بن الحسين بن أبي الحديد، أبو حامد، عز الدين، المتوفى : ۶۵۶ ھ، الجزء ۱۹، صفحه ۲۳۶)

(۴)......(غرر الحكم و درر الكلم، الجزء ۱، صفحه ۸)(ميزان الحكمة - الريشهري، الجزء ۳، صفحه ۲۳۰)(شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة الله بن محمد بن الحسين بن أبي الحديد. أبو حامد، عز الدين، المتوفى : ۶۵۶ھ، الجزء ۱۸، صفحه ۲۳۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۱۸)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۵۰)(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ ۴)
(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ ۲۰)

(۶)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۴۳)(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ ۷)

(۷)......(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ ۲۲)(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ ۲۳)

(۸)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۷۰)

(۹)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۸۵)(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۴)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲)

(۱۱) .... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۳)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۷،۶)

(۱۴) ... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۰)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۵۲)(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۴۹)

(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ۱۲۵)(سورۂ مبارکہ حج، آیہ۵۳)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۱۲)

(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۶۰)(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ۲۰)(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ۲۹)

(سورۂ مبارکہ مدثر، آیہ۳۱)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷۴)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۴۵)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ حدید، آیہ۱۶)

(۱۸)......(مجموعة ورام ،الجزء ١ ،صفحه ١٢٨)

(۱۹) .... (سورۂ مبارکہ انعام، آیہ۵۷)(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۴۰)

(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۶۷)

(۲۰) .. (الامثل فی تفسير كتابِ اللّٰهِ المُنزَل - الشَيخ نَاصِر مَكارمالشِيرازی، ،الجزء ١٦، صفحه ٥٢٢)(تدوين القرآن، الجزء ۴،صفحه ١٨) (قرآن كريم از منظر امام رضا عليه السلام، الجزء ٢، صفحه ٥) (شرح أصول الكافي - مولى محمد صالح المازندرانی، الجزء ١٢، صفحه ٢٤٢)(كاملة دفاع عن القرآن الكريم، الجزء ١ ،صفحه٩)

(احاديث أم المؤمنين عائشة - السيد مرتضى العسكرى، ۲، صفحه ۱۷۵)
(على المرتضىؑ نقطة باء البسملة)(ولأول مرة في تاريخ العالم)
(۲۱)......(البيان في تفسير القرآن، الجزء ١، صفحه۵)(مراجعات
قرآنية)(بحار الأنوار- العلم العلامة الحجة فخرالامة المولى الشيخ
محمد باقر المجلسى " قدس الله سره "، الجزء ۲، صفحه ۲۲۶)
(مناقب أمير المؤمنينؑ - محمد بن سليمان الكوفى، الجزء ۲، صفحه ۱۳۵)
(مسند الامام علىؑ، الجزء ۳، صفحه ۱۹۵)(مستدرك الوسائل ومستنبط
المسائل - المحدثين الحاج ميرزا حسين النورى الطبرسىؒ، الجزء ۷،
صفحه ۲۵۵)(المسترشد - محمد بن جرير الطبرى، الجزء ۱،
صفحه ۴۷۹)(دعائم الاسلام، الجزء ۱، صفحه ۲۸)(حياة أمير المؤمنينؑ عن
لسانه - الشيخ محمد محمديان، الجزء ۲، صفحه ۹۴)(وسائل الشيعة- الفقيه
المُحَدِّث الشيخ مُحَمَّد بن الحسن الحُر العامليؒ، الجزء ۱، صفحه۲۷)

(۲۲)..... (سورۂ مبارکہ رحمٰن، آیہ ۴،۳،۲،۱)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۵۸)

(۲۴)......(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ ۸۵)

(۲۵)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۱۵۰)

فصلِ ادبِ هفتم

﴿تخصیص﴾

۱)تخصیص سے مراد

۲)فقط لافظِ قرآن نه بنیں

۳)خود کو مُخَاطَبْ نه سمجھنا، قرآن کی مهجوریت کا سبب

٤)دعا کو اپنے دل کی آواز بنائیں

☆پیغمبر اکرمؐ اور ائمهؑ کی دعاؤں میں استغفار کی وجه

☆تعلیم دینے کی دو صورتیں

☆معصومینؑ کی استغفار کو خود پر قیاس نه کریں

٥)قرآن کو فقط علمی کتاب سمجھ کر نه پڑھیں

٦)مُخَاطَبِ قرآن نه بننے کا نقصان

۷)انسان عکس العمل کب دکھاتا هے؟

۸)مُخَاطَبْ بننے کے ثمرات

۹)رسول اللهؐ کا طریقۀ تربیت

۱۰)قرآن کوقصۂ شب نہ سمجھیں

☆خود کو قلبِ قصہ میں ڈھال کر پرکھیں

۱۱)حیوانات اور دیگر موجودات سے عبرت

۱۲)قرآن کی ہر آیہ میں اپنے لئے پیغام تلاش کریں

۱۳)قرآن کا اندازِ تخاطب خطابی ہے

۱٤)مخاطب بننے کے اثرات

۱۵)شکر سے مراد

۱٦)قرآن فقط معصومینؑ علیہم السلام کیلئے نازل نہیں ہوا

۱۷)مذہبی طبقے کی دیگر مشکلات

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ ہفتم تخصیص ہے، صدر المتالھینؒ کتابِ شریف مفاتیح الغیب میں ادبِ ہفتم کو یوں بیان فرماتے ہیں،

☆ السابع: التخصیص، وھو ان یقدر العبد انہ ھو المقصود بکل خطاب......

۱)تخصیص سے مراد

تخصیص سے مراد یہ ہے کہ خالصتاً مخصوصاً یہ خطاب میرے لئے ہے یعنی انسانِ قرآن شناس وقرآن خوان جب قرآن کی طرف آتا ہے، مطالعۂ قرآن، تلاوتِ قرآن وتدبر در قرآن مجید کرتا ہے تو فقط قاریٔ قرآن نہ ہو بلکہ اپنے آپ کو مُخاطَبِ قرآن قرار دے، ان دونوں چیزوں میں فرق ہے۔ ویسے تو ہم بہت ساری چیزیں پڑھتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام امور کہ جن کا ہم مطالعہ کرتے ہیں ان کے مُخاطَبْ بھی ہوں یعنی سب کچھ ہم سے ہی کہا جارہا ہو، اکثر ایسے ہوتا ہے کہ مخاطبینِ اصلی کوئی اور طبقہ ہوتا ہے لیکن ہم ان خطابات کا مطالعہ کررہے ہوتے ہیں۔

تخصیص سے مراد

روزمرہ گفتگو میں بھی ہمارا یہ معمول رہتا ہے کہ ہم کچھ چیزیں سنتے ہیں لیکن اس کے مُخاطَبْ ہم نہیں ہوتے ہیں، کہا اور سنایا کسی اور کو جارہا ہوتا ہے لیکن سنتے یا پڑھتے ہم ہیں۔ ہم اکثر کتابیں پڑھتے ہیں کہ جن میں کسی کے حالاتِ زندگی درج ہوتے ہیں مخصوصاً تاریخ کی کتابوں کے مخاطب ہم نہیں ہوتے ہیں، بہت سارے قضایا یہ ایسے ہیں مثلاً کسی شہنشاہ نے اپنے کسی درباری کو کوئی حکم دیا یا کسی مافوق نے اپنے ماتحت کو کوئی حکم دیا، یہ ہم پڑھ رہے ہوتے ہیں لیکن پڑھتے ہوئے ہماری

ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ ہم مخاطَب نہیں ہیں لہٰذا مخاطبین والا عکس العمل بھی نہیں دکھاتے ہیں، ہم اس کے قاری ہوتے ہیں اور ہمارا قارئین والا عکس العمل ہوتا ہے یا فقط ایک گزارش کی حد تک، نگاہ کرنے کی حد تک پڑھتے ہیں لیکن اس پہ کوئی ردِعمل نہیں دکھاتے ہیں چونکہ اس کے مخاطب اصلی ہم نہیں ہوتے ہیں۔

۲)فقط لافظِ قرآن نہ بنیں

لہٰذا انسان اجنبی بن کر قرآن نہ پڑھے اور فقط قرآنی الفاظ کو حکایت نہ کرے، اس طرح سے کہ یہ بس معمولی عبارتیں ہیں یا کلام ہے کہ جس طرح سے کتابوں کے اندر یا دیگر مکتوبات کے اندر کچھ عبارتیں درج ہوتی ہیں اور انسان اپنی زبان سے ان کو حکایت کرتا ہے۔ فقط حاکیِ قرآن، مخبرِ قرآن اور لافظِ قرآن نہ بنیں اور ادائیگیٔ الفاظِ قرآن فقط مخارج کی حد تک نہ ہو بلکہ مُخاطَبِ قرآن بنیں یعنی تمام خطابات وآیاتِ قرآن وفرامینِ خدا کو اپنا مُخاطِبْ سمجھیں کہ مجھے خطاب ہو رہا ہے، جس طرح سے حقیقتاً اگر کوئی ہم سے مخاطِب ہو کر ہم ہی سے بات کر رہا ہو تو ہم اس کی بات پوری توجہ سے سنتے ہیں، اس کے ہر جملے پر غور کرتے ہیں، دقت کرتے ہیں، ہمارے لئے اگر کوئی فائدے اور سود کی بات ہو تو اس کے اوپر غور کرتے ہیں، اگر ہمارے لئے ضرر کی بات ہو تو اس پر توجہ کرتے ہیں، کسی مطلب سے ہمیں روکا جا رہا ہو تو اس سے رک جاتے ہیں، کسی مطلب پر اگر ہمیں اکسایا جا رہا ہو تو اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جس طرح سے دو فرد آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر رہے

ہوتے ہیں اور پوری توجہ سے سنتے ہیں، فون پر گفتگو ہو رہی ہو، ایک دوسرے کے حضور میں گفتگو ہو رہی ہو یا بالمشافہہ گفتگو ہو رہی ہو تو پوری توجہ اور انہماک سے محو ہو کر ایک دوسرے کی گفتگو سنتے ہیں، اسی طرح سے انسان اپنے رب کا کلام بھی دوبدو سنے، اس طرح سے سنے کہ فقط رب ہو اور انسان ہو۔ ایسا نہ سمجھے کہ یہ ایک عمومی گفتگو ہے یا کسی اور کے متعلق گفتگو ہے یا یہ کسی اور قوم کے قصے ہیں اور میری معلومات میں اضافے کے لئے مجھے کہا گیا ہے کہ آپ قرآن پڑھو یا ثواب کے حصول کے لئے مجھ سے مطالبہ وتقاضا کیا گیا ہے کہ آپ قرآن کی طرف نگاہ کرو کہ اس میں حکمتیں ہیں۔ اس طرح سے نہ ہو کہ جیسے لغت کی کتابیں یا دیگر علمی کتابیں ہیں کہ جن کی طرف انسان رجوع کرتا ہے تو انسان کو کچھ معانی حاصل ہو جاتے ہیں بلکہ بعض نے اس سے بڑھ کر کہا ہے کہ جس طرح سے مولا اور عبد کے درمیان تبادلۂ خطاب ہوتا ہے اسی طرح سے انسان نماز بھی پڑھے اور عبادت بھی اسی طرح ہو۔

سورۂ فاتحہ کیلئے خصوصاً کہا گیا ہے کہ یہ بینِ رب وعبد ایک مکالمہ ہے۔ حدیثِ قدسی میں خدا فرماتا ہے کہ آدھا کلام میرا ہے عبد کے ساتھ اور آدھا کلام عبد کا ہے میرے ساتھ۔ اگر انسان خدا کا مُخَاطَبْ بننے اور خدا سے مُخَاطِبْ ہونے کا ادب، ڈھنگ اور فن سیکھ جائے تو لطفِ خدا شاملِ حال ہو جاتا ہے، دعا خدا سے بات کرنا ہے، نماز خدا سے بات کرنا بھی ہے اور خدا سے بات سننا بھی ہے اور قرآن خدا کے خطاب کو سننا ہے، یہ ایک قسم کا دوطرفہ تعلق ہے یعنی میں ہوں اور میرا خدا ہے اور میں خصوصاً خودِ خدا سے یہ کلام سن رہا ہوں نہ کہ معمولی قاری کی طرح معمول کی کتب کا مطالعہ کر رہا

ہوں کہ جن کتابوں کے مؤلف سینکڑوں یا ہزاروں سال پہلے اپنی ذہنی محفوظات لکھ کر اس دنیا سے گزر گئے ہیں بلکہ انسان یہ یقین کرے کہ میں ایک زندہ اور حی ذات کے سامنے میں موجود ہوں اور یہ زندہ ذات اور حی ذات ایک زندہ اور حی موجود سے خطاب کر رہی ہے، نہ میں مردہ سے سن رہا ہوں، نہ کاغذ سے سن رہا ہوں اور نہ کسی حجاب کے پیچھے سے سن رہا ہوں بلکہ مستقیم خدا سے یہ کلام سن رہا ہوں۔

۳)خود کو مُخَاطَبْ نہ سمجھنا، قرآن کی مہجوریت کا سبب

قرآن کی مہجوریت کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ عملی طور پر قرآن کی فہم کے دوران یہ آداب ملحوظ نہیں ہوتے ہیں، حتی وہ لوگ جو رغبت بہ قرآن رکھتے ہیں، تلاوتِ قرآن کرتے ہیں اور تفسیرِ قرآن بھی کرتے ہیں تو کم تر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن بھی سمجھیں کہ یہ سب کچھ جو ہم پڑھ رہے ہیں، پڑھا رہے ہیں، تفسیر کر رہے ہیں، تجزیہ کر رہے ہیں، تحلیل کر رہے ہیں یہ سب ہمارے بارے میں ہے، قرآن ہمیں سب کچھ کہہ رہا ہے، قرآن مجید میں ایسی آیات فراواں ہیں کہ جن سے یہی تاثر ملتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ مخاطبِ قرآن ہم سب ہیں، چونکہ ھدی للناس ہے، قرآن مجید اگرچہ قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے لیکن مخاطبِ قرآن فقط نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک وسیلہ ہیں تا کہ اصلی مخاطبین تک وحیِ خدا پہنچ جائے، یہ خطاب امانت کے ساتھ اور صحیح طریقے سے اپنے مخاطبین تک پہنچ جائے، اس لئے رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امین ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کا لقب بھی امین ہے یعنی امانت کے ساتھ یہ خطابات حضرت

جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مخاطبینِ اصلی کے لئے پہنچیں، یعنی دو امین وسیلوں کے ذریعے خداوند تبارک وتعالیٰ نے مخاطبینِ اصلی تک اپنا پیغام پہنچایا ہے۔ اگر انسان کے ذہن میں پہلے سے یہ تصور موجود ہو کہ قرآن کا مخاطب ہم نہیں کوئی اور ہے اور ہم تو صرف ثواب کے لئے پڑھتے ہیں، خیر و برکت کے لئے پڑھتے ہیں تو اس طرح قرآن مہجور ہو جاتا ہے۔

۴) دعا کو اپنے دل کی آواز بنائیں

اسی طرح سے دعائیں بھی ہیں چونکہ قرآن کے کچھ مطالب دعاؤں کے اندر بھی موجود ہیں مثلاً جب ہم خداوند تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتے ہیں، خصوصاً منقول و ماثور دعائیں تو اگر ہم یہ سمجھ کر خدا کی بارگاہ میں دعائیں پیش کریں کہ یہ میرے دل کی آواز ہے، یہ میری اپنی پکار ہے، میری دعا ہے، میرا سوال ہے، میری طلب ہے پھر تو یہ میری دعا شمار ہوتی ہے لیکن اگر میں اس دید سے پڑھوں، اس ذہنیت سے پڑھوں کہ اس دعا کے پڑھنے کا ثواب ہوتا ہے یعنی دعا نہیں ہے بلکہ اس کے تلفظ کا، اس کے ورد کا اور زبان سے دہرانے کا ثواب ہوتا ہے، میں ایک مقدس متن سمجھ کر اس کو پڑھ رہا ہوں اور اس دعا کو میں نے اپنے دل کی آواز اور فریاد میں تبدیل نہیں کیا بلکہ فقط اس وجہ سے پڑھا چونکہ یہ معصومین علیہم السلام سے یہ منقول ہیں اس وجہ سے ایک مقدس چیز ہے، اگر میں اسے اپنی زبان پر جاری کروں تو مجھے ثوابِ کثیر ہوگا تو ایسا شخص محروم رہ جاتا ہے، جو فقط ثواب کے حصول کے لئے پڑھے گا اور اس دعا کو اپنے دل کی پکار نہیں بنائے گا وہ مقصودِ اصلی سے دور رہے گا۔

☆پیغمبر اکرم ﷺ اور ائمہ علیہم السلام کی دعاؤں میں استغفار کی وجہ

ایک اور طریقے سے دعا میں اسی کا شبیہ مطلب بھی موجود ہے، پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ کثرت سے استغفار کرتے تھے۔ جو ہمارے لئے ایک سوال ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں یہ دعائیں جو ائمہ علیہم السلام سے منقول ہیں، یہ ائمہ علیہم السلام کی نہیں ہیں بلکہ یہ تو لگتا ہے کہ بہت گناہگار لوگوں کی دعائیں ہیں درحالیکہ ائمہ علیہم السلام نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے، مولانا روم نے طوطے پر ایک تمثیل پیش کی ہے کہ کسی دکاندار نے طوطا پالا ہوا تھا، وہ طوطا بولتا تھا، ایک دن وہ طوطا اڑا اور اس سے تیل کی شیشی گرادی، دکاندار کو غصہ آیا اور اس نے طوطے کو پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا جس کی وجہ سے اس کے سر کے سارے بال جھڑ گئے اور وہ گنجا ہو گیا، اس طوطے نے بولنا چھوڑ دیا، دکاندار نے جتنے جتن کیے کہ یہ بولے لیکن وہ نہیں بولا، طوطے کی وجہ سے گاہک بھی دکان میں آتے تھے، ایک دن ایک گنجا گاہک آیا کہ جس کے سر کے بال گرے ہوئے تھے، جوں ہی وہ دکان میں داخل ہوا تو طوطا بول پڑا کہ کیا تو نے بھی تیل گرایا ہے؟ اس سے سمجھاتے تھے کہ جس کے بال نہیں ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ اس نے تیل کی شیشی گرائی ہے اور اس کو سزا ملی ہے۔ لوگ بھی اسی طوطے کی طرح ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی استغفار کر رہا ہو وہ ہماری طرح ہی کسی جرم کا ارتکاب کیا ہوا ہے، سب کے سر کے بال شیشی گرانے سے نہیں گرتے ہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اکثر دعائیں جو ائمہ اطہار علیہم السلام سے منقول ہیں وہ ہمارے ساتھ

مناسب اور سازگار لگتی ہیں چونکہ ہماری قلبی و عملی حالت ایسی ہی ہے مثلاً ہم خداوندتبارک وتعالیٰ سے گناہ کی معافی مانگتے ہیں، اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہیں، معصیتوں کا اعتراف کرتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں چونکہ ہم ہیں ہی گناہ گار لیکن بعض سادہ اندیش وسادہ لوح انسان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری دعائیں معصومین علیہم السلام کے لئے نہیں ہیں چونکہ وہ تو معصوم ہیں، انہوں نے جب کوئی گناہ ہی نہیں کیا ہے تو وہ توبہ کیوں کریں؟ وہ کیوں استغفار کریں؟ کیوں اعتراف کریں؟ کس بات کا اقرار کریں؟ یعنی یہ دعا معصومینؑ نے فقط ہمیں تعلیم دینے کے لئے بیان فرمائی ہیں اور خود اپنے دل کی پکار بنا کر ان کا اظہار نہیں کیا، معصوم علیہ السلام کے قلبِ نورانی سے یہ دعا نہیں نکلی ہے بلکہ صرف ہمیں بتانے کے لئے اور ہمیں متوجہ کرنے کے لئے کہ اس طرح سے خداوندتبارک وتعالیٰ کو پکارا جاتا ہے۔

☆تعلیم دینے کی دو صورتیں

تعلیم دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جیسے ایک بڑا آدمی کسی چھوٹے بچے کو تعلیم دے رہا ہو کہ بچہ جو تلفظ ادا نہ کرسکتا ہو یا حرکت انجام نہ دے سکتا ہو تو اس کو مشق کروا رہا ہوتا ہے کہ آپ اس طرح سے انجام دو لیکن وہ بڑا آدمی خود نیت نہیں کرتا ہے، فرض کریں کہ کسی بچے کو آپ نماز پڑھا رہے ہیں اور آپ بھی وہی ذکر زبان سے ادا کرتے ہیں کہ جو بچے سے ادا کروانا چاہتے ہیں اور وہی حرکتیں انجام دیتے ہیں کہ جو بچے سے انجام دلوانا چاہتے ہیں لیکن آپ خود نیتِ نماز نہیں کرتے ہیں اس لئے آپ کی نماز بھی نہیں ہوتی ہے اور اس کو نماز شمار ہی نہیں کیا جاتا ہے مثلاً آپ بچے کو مشق کروانے کے

لئے تکبیرۃ الاحرام انجام دیتے ہیں تو اس اللہ اکبر سے وہ محرماتِ نماز آپ پر لاگو نہیں ہوتے ہیں، اس کے بعد آپ بات بھی کر سکتے ہیں، ہنس بھی سکتے ہیں، رو بھی سکتے ہیں، قبلہ سے دائیں بائیں بھی ہو سکتے ہیں چونکہ آپ نے نیتِ نماز نہیں کی ہے، آپ فقط ایک ادا اپنا رہے ہیں تاکہ بچہ میری تقلید میں یہی اعمال انجام دے اور جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ اس سے سرزد ہو، یہاں پر فقط تعلیم دینا مقصود ہے لہٰذا اس نماز کو بڑے کیلئے نماز سمجھا ہی نہیں جاتا ہے۔

تعلیم دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک انسان بچے کو ساتھ کھڑا کرتا ہے اور خود واقعاً نماز پڑھتا ہے، حقیقتاً نیت کرتا ہے، حقیقی تکبیرۃ الاحرام کہتا ہے اور پھر اس کے بعد ساری حرکات و سکنات حقیقی نیت کے ساتھ انجام دیتا ہے، پھر اس کے بعد وہ محرمات نماز و مبطلاتِ نماز اس کے لئے لاگو ہو جاتے ہیں، آیا آئمہ اطہار علیہم السلام کی پہلی والی صورت ہے؟ یعنی نہ نیت ہے، نہ ارادہ ہے بلکہ صرف خدا کی بارگاہ میں آئے ہیں تاکہ مومنین کو سکھائیں اور مجرمین و گناہ گاروں کو یہ تعلیم دے سکیں کہ خدا کو کس طرح سے پکارا جاتا ہے، خود سے جب اللّٰھم کہتے ہیں، ربنا کہتے ہیں تو نیت نہیں کرتے ہیں کہ واقعاً تہہ دل سے یہ ہماری پکار ہے اور ہم واقعاً صداقت سے خدا کو پکار رہے ہیں، جب ایک طرف سے ہم انہیں معصوم سمجھتے ہیں تو وہ معصوم اس بے ادبی سے بھی معصوم ہیں چونکہ یہ بے ادبی ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں آکر انسان خود نیت نہ کرے، خود ربنا، اللّٰھم نہ کہے فقط دوسروں کو متوجہ کرے کہ آپ کہو اللّٰھم، میں آپ کو سکھا رہا ہوں ورنہ مجھے تو اللّٰھم کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تعلیم دینے کی دو صورتیں

☆معصومین علیہم السلام کی استغفار کو خود پر قیاس نہ کریں

منتہیٰ یہ کہ ہم معصومین علیہم السلام کی دعاؤں، استغفار، توبہ یا اقرار واعتراف کو اپنے اوپر قیاس نہ کریں، جیسا کہ ایک محاورہ ہے کہ

حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن......(۱)

بعض کا درجہ مقربین کا ہے اور بعض کا درجہ ابرار کا ہے یعنی بعض اچھے انسان ہیں لیکن درجۂ ابرار پر فائز ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ان سے بالاتر مقام پر مقربینِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں یعنی قریب تر ہیں اور ابرار سے کافی اوپر ہیں، جو کچھ مقربین انجام دیتے ہیں وہ ابرار انجام نہیں دیتے لیکن جو کچھ ابرار انجام دیتے ہیں وہ مقربین بھی انجام دیتے ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ بعض چیزیں ابرار کے لئے حسنہ ہوں لیکن مقربین کے لئے حسنہ نہیں ہیں، اس کو ایک تعلیمی مثال سے بیان کرتے ہیں، فرض کریں کہ ایک کلاس کے اندر مختلف طلبہ ہیں اور ان طالب علموں میں سے بعض ذہین ہیں، محنتی ہیں اور ہمیشہ سو میں سے سو نمبر لیتے ہیں لیکن ذہین بچے نے ایک امتحان ایسا دیا کہ جس میں اسے پورے سو نمبر نہیں ملے، فرض کرلیں کہ اس نے چالیس نمبر لئے اور اسی کلاس میں کچھ بچے ایسے ہیں کہ جو ہمیشہ فیل ہوتے تھے، وہ تینتیس نمبر بھی نہیں لے سکتے جو پاس ہونے کے لئے ضروری ہیں لیکن اس امتحان میں اتفاقاً ان میں سے کسی نے چالیس نمبر لے لئے لہٰذا جو بچہ ہمیشہ فیل ہوتا تھا وہ چالیس نمبر لے کر خوش ہو جاتا ہے اور وہ جو ہمیشہ اول آتا تھا، سو نمبر لیتا تھا وہ چالیس نمبر لے کر افسردہ ہو جاتا ہے، ایک ان چالیس نمبروں پر خوش ہے اور ایک ان چالیس نمبروں پر ناراحت ہے، ایک کے

لئے جشن ہے اور ایک کے لئے عزا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ایک مقربین میں سے ہے اور ایک ابرار میں سے ہے، یہ چالیس نمبر فیل ہونے والے کیلئے حسنہ ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے لیکن یہی چالیس نمبر اس ذہین کیلئے کہ جو ہمیشہ اول پوزیشن پہ آتا تھا سیئے ہیں، لہٰذا

حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن......

بہت ساری چیزیں ہیں جو ابرار کے لئے خوب ہیں لیکن مقربین کے لئے خوب نہیں ہیں، چونکہ انسانوں کے مختلف درجات ہیں، ائمہ علیہم السلام کا اعتراف وہ نہیں ہے کہ جو ہمارا اعتراف ہے، ہمارا گناہ وہ نہیں ہے کہ جس پر ائمہ علیہم السلام خداوند تبارک وتعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہیں، ہم واقعاً معصیتِ خدا کرتے ہیں، ہم حدودِ شریعتِ خدا توڑ کر اس پر مغفرت طلب کرتے ہیں لیکن معصومؑ حدودِ شریعتِ خدا نہیں توڑتا، وہ اس لحاظ سے بھی معصوم ہیں، پھر وہ کیوں خدا کی بارگاہ میں اتنی مغفرت طلب کرتے ہیں؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں استغفار کرتے تھے؟

جس طرح زوجۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ آپ تو نبیٔ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو کوئی گناہ نہیں کرتے ہیں، پھر یہ کثرت سے استغفار کیوں کرتے ہیں؟ یا کثرت سے شکر کیوں کرتے ہیں؟ ایک جگہ جواب دیا کہ

اَلَا اَکُوْنُ عَبْداً شَکُوْراً......(۲)

یعنی کیا میں خدا کا عبدِ شاکر نہ بنوں؟ اور ایک جگہ پر فرمایا کہ میں جب لوگوں کی تبلیغ میں مشغول ہوتا ہوں، لوگوں کی ہدایت میں جو وقت صرف کرتا ہوں، اس پر استغفار کرتا ہوں، کیوں؟

☆ معصومین علیہم السلام کی استغفار کو خود پر قیاس نہ کریں

اس لئے کہ جب میں مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تو خالق کی طرف توجہ کا مرتبہ کم ہو جاتا ہے، اسی بابت استغفار کرتا ہوں، توجہ در خالق پہ اتنی بھی کمی نہیں آنی چاہئے۔ لہٰذا ان کی مغفرت ان کاموں پر نہیں ہے کہ جو ہمارے کاموں پر ہے۔

یہیں پر مولانا روم نے کہا کہ

کارِ پاکان را قیاس از خود مگیر

گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر......(۳)

پاک لوگوں کی سیرت کو اپنے اوپر قیاس مت کرو، وہ جو استغفر اللہ کہتے ہیں تو کسی اور وجہ سے کہتے ہیں، آپ استغفر اللہ کسی اور وجہ سے کہتے ہیں، ایک آدمی نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے استغفر اللہ کرتا ہے جبکہ ایک آدمی نماز پڑھ کر استغفر اللہ کرتا ہے کہ میں نے جو نماز پڑھی ہے وہ بے ادبانہ اور گستاخانہ نماز پڑھی ہے اور اس کی طرف توجہ نہیں تھی۔

مثلاً ایک آدمی فیل ہونے پر استغفر اللہ کر رہا ہے اور ایک کم نمبر لینے پر استغفر اللہ کر رہا ہے، دونوں کے درجات میں فرق ہے لہٰذا معصومین علیہم السلام معاذ اللہ دعاؤں میں اداکاری نہیں کرتے تھے کہ گویا یہ محض ایک اداکاری تھی اور نیت کے بغیر دعائیں کرتے تھے کہ اتنی مناجاتِ عالیہ بارگاہِ خدا میں کرتے تھے لیکن یہ ان کے دل کی پکار نہیں ہوتی تھیں، ہرگز بارگاہِ معصومین علیہم السلام کے بارے میں ایسا تصور نہیں کرنا چاہئے بلکہ صدقِ دل سے معصومین علیہم السلام نے یہ دعائیں اپنے لئے کی ہیں، یہ مناجاتِ شعبانیہ اپنے لئے کی ہیں، راویوں نے سن کر ان کو ہمارے لئے نقل کیا ہے نہ کہ فقط ہمیں تمرین اور

☆ معصومین علیہم السلام کی استغفار کو خود پر قیاس نہ کریں

مشق کروانے کے لئے معصومین علیہم السلام نے یہ ساری دعائیں بیان کی ہیں۔

۵) قرآن کو فقط علمی کتاب سمجھ کر نہ پڑھیں

اسی طرح قرآن مجید میں جب کسی جگہ بنی اسرائیل کا تذکرہ آجاتا ہے، قوم لوط علیہ السلام کا تذکرہ آجاتا ہے، قوم نوح علیہ السلام کا تذکرہ آجاتا ہے، کہیں قصہ آدم علیہ السلام ہے، کسی جگہ قصہ ابراہیم علیہ السلام ہے اور کسی مقام پر مثلاً قصہ فرعون و نمرود و شداد و قارون و ہامان ہے، جب ہم ان قصوں میں وارد ہوتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خطاب جو فرعون کے لئے آیا ہے تو یہ صرف فرعون کیلئے ہے، یہ خطاب جو بنی اسرائیل کیلئے آیا ہے تو بنی اسرائیل مخاطب ہیں، یہ خطاب جو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے آیا ہے تو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں یا یہ خطاب جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے آیا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں، پس قرآن کی کسی آیہ میں ہمارا نام نہیں ہے لہٰذا ہم مخاطب نہیں ہے، اگر کوئی اس ذہنیت کے ساتھ قرآن پڑھ رہا ہو تو اس کیلئے قرآن ایک علمی کتاب ہے لیکن ہدایت کی کتاب نہیں ہے۔ علمی کتابیں ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے تاریخ کی کتابیں ہیں، تاریخ میں تذکرے فراواں ہیں لیکن کسی چیز کا موضوع ہم خود نہیں ہیں، کسی کا موضوع کوئی بادشاہ ہے، کسی کا موضوع رعیت ہے، کسی کا موضوع دشمن ہے، کسی کا موضوع دوست ہے، کسی کا موضوع وزیر ہے، کسی کا موضوع کچھ اور ہے لیکن تاریخ میں کسی بھی جگہ ہم خود موضوع نہیں ہیں، تاریخ وار کتاب نہ پڑھیں یعنی کلام خدا کو اس طرح سے نہ پڑھیں چونکہ یہ ھدی للناس ہے یعنی فرد فرد بشر کے لئے ہدایت ہے لہٰذا اس کے معانی یہ ہیں کہ فرد

قرآن کو فقط علمی کتاب سمجھ کر نہ پڑھیں

فردِ بشر مخاطبِ قرآن ہے، پس قرآن پڑھتے ہوئے انسان یہ یقین پیدا کرلے کہ میں مخاطبِ اصلیٔ قرآن ہوں اور یہ مجھے کہا جارہا ہے۔

٦)مُخَاطَبِ قرآن نہ بننے کا نقصان

محرم میں اکثر اعلان ہورہے ہوتے ہیں کہ فلاں صاحب فلاں کیمپ (Camp) میں آجائیں، فلاں آدمی فلاں جگہ آجائے یا مثلاً دو آدمی مل کر حرم گئے اور وہاں ایک دوسرے سے دور ہوگئے تو ایک آدمی اطلاعات میں جاکر اعلان کرواتا ہے کہ میرا وہ ساتھی یہاں پر آجائے لیکن ہم اس پر کان بھی نہیں دھرتے ہیں، ہماری موجودگی میں شاید سو دفعہ حرم میں اعلان ہوتا ہے کہ زید وہاں آجائے، بکر وہاں آجائے، عمرو وہاں آجائے لیکن ہم کسی خطاب پر کوئی عکس العمل نہیں دکھاتے ہیں، ہم اپنے عمل میں مشغول رہتے ہیں، اگر نماز پڑھ رہے ہیں تو نماز پڑھتے رہتے ہیں، اگر مفاتیح پڑھ رہے ہیں تو مفاتیح میں مشغول ہیں، اگر قرآن میں مشغول ہیں تو قرآن پڑھ رہے ہوتے ہیں چونکہ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ یہ خطابات ہم سے نہیں ہیں، ہمیں نہیں بلایا جارہا ہے لہٰذا ہم کمال آسودگی سے بیٹھے رہتے ہیں اور عکس العمل نہیں دکھاتے ہیں۔

اسی طرح قاریانِ قرآن جب قرأت قرآن کرتے ہیں تو بڑی اچھی دھن میں، بڑے اچھے سر میں اور بڑے اچھے انداز سے پڑھتے ہیں، بہت خوبصورت مخارج ادا کرتے ہیں اور تجوید و قرأت کے سارے فنون اس پر لاگو کرتے ہیں، حافظانِ قرآن نے سارا قرآن ازبر کیا ہوا ہوتا ہے،

مفسرانِ قرآن ایک ایک آیہ کے ایک ایک لفظ کو تحلیل و تجزیہ کر کے پیش کرتے ہیں اور کتابیں چھاپتے ہیں لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی انسان کسی مورد میں بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ اصلی مخاطبِ قرآن میں خود ہوں یعنی در حقیقت ایک مقدس متن کے طور پر اور فقط ثواب کے حصول کیلئے میں حفظ نہیں کر رہا یا پڑھ رہا بلکہ اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ یہ خطاب میرے مولا کی طرف سے خود مجھ سے ہے۔ خطاباتِ قرآنی کے مقابلے میں ہمارا عکس العمل اس وجہ سے نہیں ہے یعنی ہماری زندگی مطابق بہ خطاباتِ قرآنی اس لئے نہیں ہے چونکہ ہم اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن نہیں سمجھتے ہیں۔

خطابِ قرآن نہ سمجھنے کا نقصان

قرآن نے اگر کہیں روکا ہے تو ہم رکتے نہیں ہیں، قرآن نے اگر کہیں امر کیا ہے تو ہم اٹھتے نہیں ہیں، قرآن نے اگر وعدہ دیا ہے تو ہم اس وعدے سے امیدوار نہیں ہوتے ہیں، قرآن نے اگر دھمکی دی ہے تو ہم ڈرتے نہیں ہیں، قرآن نے اگر جہنم کا کہا ہے تو ہمیں پرواہ نہیں ہوتی ہے، قرآن نے اگر جنت کا کہا ہے تو ہمیں آرزو نہیں ہوتی ہے، قرآن نے اگر توبیخ و سرزنش کی ہے تو ہم متاثر نہیں ہوتے ہیں، قرآن نے اگر کسی کی مدح کی ہے تو ہم اس طرف جانے کی کوشش نہیں کرتے، اس لئے کہ قرآن کا مخاطب بن کر نہیں پڑھتے ہیں۔ قرآن کو قاری بن کر پڑھتے ہیں، ایک حافظ کے طور پر قرآن پڑھتے ہیں کہ ایک آیہ کو بیس دفعہ دہراتے رہیں تا کہ ذہن نشین ہو جائے، ذہن نشین کرنے کے لئے قرآن پڑھتے ہیں فقط اس لئے کہ یہ خطاب میرے ذہن سے کہیں باہر نہ چلا جائے، اسی طرح تقریر کرنے کے لئے، خطاب کرنے کے لئے اور لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ہم قرآن پڑھتے ہیں یا مثلاً کتاب لکھنے کے لئے، تفسیر لکھنے کے لئے اور متعدد جلدیں بنانے کے لئے ہم قرآنی

آیات کا مطالعہ کرتے ہیں، غور و تدبر کرتے ہیں لیکن مخاطب بن کر قرآن نہیں پڑھتے ہیں، ممکن ہے کہ ہم قرآنی آیات سے دقیق ترین تجزیئے اور تحلیلیں کریں لیکن پھر بھی قرآن ہمیں کچھ عطا نہیں کرے گا چونکہ ہم اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن نہیں سمجھتے ہیں۔

۷) انسان عکس العمل کب دکھاتا ہے؟

قرآن کے مقابلے میں عکس العمل دکھانے کیلئے ادب یہی ہے کہ انسان قرآن کا مُخاطَبْ قرار پائے یعنی یہ کہے کہ یہ پورا قرآن مجھ سے مُخاطِبْ ہے، یعنی اس طرح سے ذہنیت ہو کہ روئے زمین پر فقط تنہا میں ہوں اور یہ سارا قرآن فقط مجھ سے خطاب کر رہا ہے، ہر ہر آیت اور ہر ہر لفظِ قرآن درحقیقت مجھے پکار رہا ہے، اگر کمزوریاں بتا رہا ہے تو میری بتا رہا ہے، اگر عیب بتا رہا ہے تو میرے بتا رہا ہے، اگر سرزنش کر رہا ہے تو میری کر رہا ہے، اگر دھمکی دے رہا ہے تو مجھے دے رہا ہے، اگر وعدۂ عذاب دے رہا ہے تو مجھے وعدۂ عذاب دے رہا ہے، اگر کسی مطلب کو جتلا رہا ہے تو مجھے جتلا رہا ہے، جب انسان اس طرح سے مخاطب بنے تو عکس العمل دکھاتا ہے۔

جس طرح سے ان خطابات میں کہ جن میں مخاطب ہم ہی ہوتے ہیں مثلاً جہاں پر ہمیں کہا جاتا ہے کہ آیئے آپ کھانا کھالیں تو ہمیں پتہ ہے کہ ہمیں ہی کہہ رہے ہیں لہٰذا فوراً اٹھ بیٹھتے ہیں، اگر کوئی کہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے اٹھ جایئے تو ہم وہاں پر رک جاتے ہیں چونکہ ہمیں پتہ ہے کہ ہمیں کہہ رہے ہیں اور اگر اس پر کان نہ دھریں تو دوبارہ متوجہ کر کے کہتا ہے کہ بھائی آپ سے کہہ رہا

ہوں یعنی متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ اٹھئے لیکن قرآنی خطابت میں ہماری یہ ذہنیت نہیں ہے، کیوں نہیں ہے؟ کیونکہ ہم اسے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مقدس کتاب ہے، مقدس متن ہے کہ جس کے پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے یعنی معاوضہ ملتا ہے، جیسے اسکول میں پڑھنے سے ڈگری (Degree) ملتی ہے، کالج کی کتابیں پڑھنے سے سند ملتی ہے، یہ پڑھنے سے ملازمت ملتی ہے، یہ پڑھنے سے شہرت ملتی ہے، یہ پڑھنے سے مرید زیادہ ہوتے ہیں، یہ پڑھنے سے مقلد زیادہ ہوتے ہیں، یہ سب معاوضے ہیں درحالیکہ قرآن اس لئے نہیں آیا ہے کہ آپ قرآن پڑھو تو پھر آپ کو قرآن سے باہر ایک معاوضہ دیا جائے گا۔

جس طرح آج کل قرآن کے مقابلے ہوتے ہیں، اس میں بچوں سے کہتے ہیں کہ قرآن پڑھو تو آپ کو ٹرافی دیں گے، سائیکل دیں گے، یادگاری شیلڈ دیں گے یعنی اس کو غیر قرآنی جائزہ، غیر قرآنی انعام دے دیتے ہیں، کسی کو کمپیوٹر دے دیتے ہیں، کسی کو ریٹرن ٹکٹ دے دیتے ہیں اور کسی کو تفریح کا کوئی اور سامان دے دیتے ہیں۔ یہ بچہ جب قرآن پڑھ رہا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو مخاطب نہیں سمجھ سکتا ہے چونکہ وہ قرآن کو جائزے کے لئے پڑھ رہا ہوتا ہے، وہ قرآن اس شے کے لئے پڑھ رہا ہے، بچوں کو اگر قرآن سکھانا ہے تو ان کی صحیح بنیادوں پر تربیت کریں، پہلے بھی بیان کیا تھا کہ بچوں کو سرکس کے حیوان نہیں بنائیں، ان کو سرکس کے گھوڑے نہیں بنائیں، ان کو قرآنی کرتب نہ سکھائیں کہ یہ بچے قرآنی کرتب سیکھ کر لوگوں کو محظوظ کریں، یہ تربیتِ قرآنی نہیں ہے، تربیت قرآنی یہ ہے کہ بچے کو اس طرح سے بنا دیں کہ اپنے آپ کو مُخاطَبِ قرآن سمجھیں، بچہ یہ سمجھے کہ میں قرآن کا مُخاطَب

ہوں، قرآن مجھے پکار کر کہتا ہے اور جب انسان قرآن کا مخاطب بنتا ہے تو یہ سارا قرآن اس کے وجود میں اترتا ہے۔

۸)مُخَاطَبْ بننے کے ثمرات

جب ہم اپنے آپ کو ہر ہر آیت کا مخاطب سمجھتے ہیں تو قرآن ہماری روحوں کے اندر اثر کرتا ہے اور ہماری روحوں کے اندر اترتا جاتا ہے۔ ہم قرآن کو اجنبی بن کر پڑھتے ہیں یعنی لاتعلق ہو کر قرآن پڑھتے ہیں کہ کوئی خطاب اپنی طرف آنے ہی نہیں دیتے، اول تو قرآنی آیات کو ان کے شانِ نزول کے ساتھ منحصر سمجھتے ہیں کہ یہ فلاں منافق کے بارے میں تھی، یہ فلاں کافر کے بارے میں تھی، یہ فلاں مومن کے بارے میں تھی یعنی دوسرے کو بھی اس میں شامل نہیں سمجھتے ہیں نہ فقط اپنے آپ کو مخاطبِ آیہ نہیں سمجھتے ہیں بلکہ کسی اور کو بھی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ اس کو مختص و منحصر از شانِ نزول سمجھتے ہیں کہ یہ آیہ فلاں شخص کے بارے میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر ہم دوسروں کو بھی اس میں شامل کرنا چاہیں تو اپنے علاوہ سب کو شامل کرتے ہیں مثلاً جتنی بھی سرزنش کی اور نفاق کی آیات پڑھتے ہیں تو ایک نیم نگاہ اپنے مخالفین پہ رکھی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ ساری منافقت کی آیات ان کے بارے میں ہیں لہٰذا جب ہمیں موقع ملتا ہے تو جتنی نفاق کی آیات ہیں وہ اپنے مخالفین، اپنے رقیبوں اور اپنے حریفوں پر فٹ (Fit) کرتے ہیں یعنی اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن نہیں سمجھتے ہیں۔

اسی طرح بسا اوقات سوال بھی کرتے ہیں کیونکہ عوام اور طلبہ میں بھی یہ ایک عام معمول اور

نقص ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے، سوال انسان کے اپنے لئے ہونا چاہئے لیکن بعض اپنے لئے سوال نہیں کرتے ہیں بلکہ کسی دوسرے کو سنانے کیلئے کرتے ہیں مثلاً مجلس میں فلاں آدمی بیٹھا ہوا ہے کہ جس سے میری آج کے دن کوئی گفتگو ہوئی تھی یا کسی بات پر اختلاف تھا تو مجلس میں یا کسی گفتگو میں آ کر سوال کرتا ہے کہ مولانا آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور جب وہ جواب دے رہے ہوتے ہیں تو بار بار اس کو متوجہ کرتا ہے کہ اب تم اس کو سنو، یہ سوال اس کا اپنا نہیں ہے لہذا یہ جواب کی طرف بھی توجہ نہیں کرتا ہے چونکہ سوال اس نے کسی اور کے لئے کیا تھا لہذا جواب بھی کسی اور کے لئے مانگ رہا ہے۔

نہج البلاغہ ہم پر کیوں اثر نہیں کرتی ہے؟ اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ نہج البلاغہ کے مُخاطَب کوفی لوگ ہیں، امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے اصحاب کی، اپنے پیروکاروں کی اور اپنی سپاہ کی سرزنش کی ہے، انہیں سخت سست کہا ہے اور کہا کہ تم بدترین لوگ ہو جو مجھے میسر آئے ہو، ہم اصلاً نہج البلاغہ کے ان خطبوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور خود کو مخاطب نہیں سمجھتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اشعث ابن قیس اور فلاں فلاں کے بارے میں ہیں، یہ سب ہمیں نہیں کہا ہے اور ہم میں تو یہ صفات موجود نہیں ہیں، اپنے نفس کو تبریہ کرتے ہیں۔ ہمیشہ سب سے پہلے اپنے آپ کو مخاطب قرار دیں، اگر خود اس فلٹر (Filter) سے درست گزر گئے، اگر خود اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ لیا تو پھر ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی حالت بھی ہمیں نظر آئے یا کسی دوسرے کو بھی مخاطبِ قرآن بنانے میں مدد کر سکیں، مُخاطَبِ قرآن بننا ہنر ہے، اس نکتے پر غور فرمائیں کہ مفسرِ قرآن بننا بہت آسان ہے، حافظِ قرآن

بننا بہت آسان ہے، قاریٔ قرآن بننا بہت آسان ہے لیکن مُخاطَبِ قرآن بننا بہت مشکل ہے اور یہ سب سے بڑا ہنر ہے۔

اگر آپ نے اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن بنا دیا مثلاً بڑے نامی گرامی مفسر جیسے علاّمہ طباطبائیؒ کہ جن کا مقامِ تفسیری بہت بلند اور عالی ہے، بعض اوقات کسی کے ذہن میں آتا ہے کہ آیا ہو سکتا ہے کہ میں بھی ایک دن علامہ طباطبائیؒ کی طرح تفسیرِ قرآن کروں؟ تو آپ کر سکتے ہیں، علامہ بننا کوئی مشکل کام نہیں ہے، اگر آپ محنت و زحمت کریں تو آپ علامہ طباطبائیؒ سے بھی بالاتر مفسر بن سکتے ہیں، علامہ طباطبائیؒ بھی آپ کی طرح تھے، انہوں نے محنت کی، کوشش کی اور لطفِ خدا شاملِ حال ہوا پھر خدا نے نورِ قرآن ان کے سینے میں اتار دیا اور مفسرِ قرآن بنے، یہ کام آپ بھی کر سکتے ہیں اور آسانی سے کر سکتے ہیں۔ فرض کریں اس وقت جو حفاظِ قرآن ہیں کہ جو بیس طریقوں سے قرآن پڑھتے ہیں، الٹا پڑھتے ہیں، سیدھا پڑھتے ہیں، دائیں سے بائیں پڑھتے ہیں، بائیں سے دائیں پڑھتے ہیں، مثلث پڑھتے ہیں، کراس پڑھتے ہیں، دائرہ پڑھتے ہیں، سرکس کے جتنے کرتب ہیں سارے انہوں نے سیکھے ہوئے ہیں، خصوصاً جب چھوٹا بچہ یہ کام کر رہا ہوتا ہے تو بڑے انسان کو بڑی حسرت ہوتی ہے کہ یہ سب چھوٹا سا بچہ کر رہا ہے اور میں ایک آیت بھی درست نہیں پڑھ سکتا ہوں، آپ بھی یہ کام کر سکتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ بڑا کام کر سکتے ہیں لیکن اگر اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن نہیں بنایا تو یہ سب کچھ کر کے بھی آپ کسی بڑے مقام پر نہیں پہنچ سکتے۔

اگر آپ تفسیرِ قرآن نہیں کر سکتے ہیں، حفظِ قرآن نہیں کر سکتے ہیں، درست قرأتِ قرآن

نہیں کرسکتے ہیں تو حرج نہیں ہے لیکن اگر آپ قرآن سے درست اثر لے سکتے ہیں تو آپ نے بڑا کام کیا ہے، اگر مخاطبِ قرآن بن سکتے ہیں تو آپ نے بڑا کام کیا ہے۔

۹) رسول اللہ ﷺ کا طریقۂ تربیت

رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کی تربیت کی وہ اس طرح سے نہیں کی کہ ان میں سے کسی کو بٹھا کر حفظ میں لگا دیا، کسی کو قرأت میں لگا دیا، کسی کو اِس فن میں، کسی کو اُس فن میں لگا دیا، ابوذرؓ کو کہا کہ آپ نے یہ فن سیکھنا ہے، سلمانؓ کو کسی اور فن پہ لگا دیا بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ان سب کو مخاطبینِ قرآن قرار دیا یعنی پہلے مخاطب تیار کئے اور بعد میں قرآن سنایا۔ مخاطبِ قرآن بننا اہم ہے، انسان پہلے مخاطب بنتا ہے تو پھر قرآن دل میں اترتا ہے، اگر ہم ہدایت کرنا چاہتے ہیں، تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے مخاطب پیدا کریں یعنی اگر آپ کے مخاطب پہلے سے بنے ہوئے نہیں ہیں تو انہیں خود بنائیں۔

فرض کریں کہ ایک شخص مجلس پڑھنے جاتا ہے اور اس کی مجلس میں فراواں لوگ آجاتے ہیں تو یہ اس کے مخاطب نہیں ہیں، یہ کس کے مخاطب ہیں؟ یہ کسی شاعر کے مخاطب ہیں، کسی ذاکر کے مخاطب ہیں، کسی خطیب کے مخاطب ہیں۔ یہ مبلغ کے مخاطب نہیں ہیں، مبلغ نے اپنے مخاطبین خود بنانے ہیں، پہلے ان کا ذہن بنائے، ان کا دل بنائے، ان کو آمادہ کرے پھر جب مخاطبِ اصلی بن جائیں تب ان سے خطاب کرے تو معارفِ دینی ان کے دل میں اتریں گے، عموماً درسوں میں ایسے

ہوتا ہے۔ کہ ہم کتابیں پڑھتے ہیں لیکن مخاطبینِ کتب نہیں ہوتے ہیں لہٰذا سارا علم کتابوں میں رہ جاتا ہے اور ہمارے اندر منتقل نہیں ہوتا ہے، ہم فقہ پڑھتے ہیں، اصول پڑھتے ہیں، کلام پڑھتے ہیں، عقائد پڑھتے ہیں، اخلاق پڑھتے ہیں لیکن ہمارے اندران کتب کا مواد ایک فیصد بھی منتقل نہیں ہوتا ہے بلکہ انہی صفحوں میں رہ جاتا ہے، کیوں رہ جاتا ہے؟ چونکہ ہم خودکو ان خطابات کا مخاطب نہیں سمجھتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ فلاں اور فلاں کے بارے میں ہے۔

۱۰)قرآن کو قصۂ شب نہ سمجھیں

صاحبِ کتاب نے خوبصورت تعبیر کی ہے کہ جب آپ قصص انبیاء علیہم السلام پڑھتے ہیں تو ان کو آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ قصہ شب ہیں، یہ الف لیلیٰ کی داستانیں نہیں ہیں، الف لیلیٰ قصوں کی کتاب ہے یعنی ہزار راتیں، اصل لفظ اَلف ہے جس کو غلطی سے الف پڑھتے ہیں، الف لیلیٰ نہیں بلکہ اَلف لیلیٰ یعنی ہزار شب، ہزار داستان، قدیم زمانے میں جب لوگوں کی زندگیوں میں کمپیوٹر داخل نہیں ہوا تھا اور جب ساری رات چیٹنگ (Chatting)، انٹرنیٹ (Internet) اور یہ کام نہیں ہوتے تھے حتیٰ یہ لوگ بجلی سے بھی محروم تھے لیکن بعد میں خصوصاً ٹی وی نے بھی وہ ماحول تھوڑا توڑ دیا لیکن دیہاتوں میں ابھی بھی یہ ماحول ہے کہ لوگ راتوں کو ایک جگہ اکٹھے ہوجاتے ہیں خصوصاً سردیوں کی راتوں میں چونکہ گرمی کی رات چھوٹی سی ہوتی ہے، ان میں مشترک فیملیز (Families) بھی ہوتی تھیں لہٰذا یہ لوگ سردیوں کی راتوں میں ایک جگہ جمع ہوجاتے تھے، پھر گھر کا بڑا آدمی، کوئی خاتون یا

مرد جو اچھی زبان رکھتا ہو، اچھا حافظہ رکھتا ہو کوئی نہ کوئی داستان چھیڑ دیتا تھا، یہ لوگ فرضی کہانیاں اور قصے بیان کرتے تھے، یہ شبانہ قصے کس لئے تھے؟ رات کاٹنے کے لئے تھے، ان قصوں کا مقصود فقط ایک ہوتا تھا کہ کسی طرح سے رات کٹ جائے۔

آج کل کی ڈیجیٹل (Digital) نسل کو یہ معلوم نہیں ہے کہ داستانِ شب کیا ہوتی ہے؟ رات کاٹنے کے لئے کہانیاں قصے کیا ہوتے ہیں؟ البتہ بعض جگہوں پر یہ معمول ہے ابھی بھی اس نسل کے آثار باقی ہیں کہ ان کو چیٹنگ (Chatting) پر مزہ نہیں آتا ہے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر مستقل چیٹنگ کرتے ہیں یعنی گھر سے باہر آ کر روڈ پہ، چوک پر یا کسی نالے کے کنارے بیٹھ کر ساری رات گفتگو کرتے رہتے ہیں، یہ گفتگو کیوں ہوتی ہے؟ فقط ٹائم پاس کرنے کے لئے کہ کسی طرح سے رات گزر جائے، اس کو قصہ شب کہتے ہیں، داستانِ شب اصطلاحی محاورہ ہے، داستانِ شب یعنی رات کاٹنے کے لئے کوئی کہانی سنانا، اکثر کہانیاں اور افسانے اسی لئے بنے ہیں کہ لوگوں کو رات کاٹنے کے لئے مشکل پیش آتی تھی۔

صاحبِ کتاب فرماتے ہیں کہ قرآن کو قصہ شب نہ سمجھو، یعنی قصص قرآن جو انبیاء علیہم السلام کے یا امتوں کے متعلق ہیں ان کو یہ نہ سمجھو کہ یہ داستانِ شب ہیں مثلاً معاذ اللہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ داستان شب ہے۔ داستان شب وغیرہ ایک دوسرے کو محظوظ کرنے اور فقط ٹائم پاس کرنے کے لئے ہیں، کہانیوں کا فن یہیں سے شروع ہوا ہے چونکہ انسان کو ٹائم پاس کرنے کے لئے کچھ مواد کی ضرورت ہے، بیکاری انسان کے لئے جہنم ہے، فراغت عذاب ہے لہٰذا فراغت کے لمحات کو پر کرنے

کے لئے قصے، داستانیں، کہانیاں، ڈرامے اور فلمیں بنائی گئی ہیں اور اس صنعت کی ساری رونق اسی وجہ سے ہے چونکہ بے کار لوگ بہت ہیں، اگر انسان کے پاس بیکاری نہ ہو تو سرے سے یہ ساری صنعتیں ایک دم ٹھپ ہو جائیں گی، جس ملک میں لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہ ہو وہاں یہ صنعتیں اتنی زیادہ نہیں ہیں، لیکن ہم داستانِ قرآن وقصصِ قرآنی کو قصہ شب نہ سمجھیں، ان ساری داستانوں میں ہم ہیں۔

☆خود کو قلبِ قصہ میں ڈھال کر پرکھیں

اگر ہم قرآنی مخاطب بن جائیں تو قصوں کے مخاطب بھی بن سکتے ہیں لیکن کس ذہنیت سے اور کس نفسیات سے انسان نگاہ کرے؟ مثلاً فرض کریں کہ آپ فلم دیکھ رہے ہیں اور وہ ایسی حماسی فلم ہے کہ جس کے اندر ہیرو کوئی اچھا کام کر رہا ہے، بچہ جب یہ فلم دیکھ رہا ہوتا ہے تو وہ کہانی کے اندر چلا جاتا ہے، وجدانی، روحی اور ذہنی طور پر بچہ باہر نہیں ہوتا ہے بلکہ کہانی، ڈرامے یا فلم کے اندر موجود ہوتا ہے یعنی محو ہوتا ہے، ممکن ہے کہ بڑا یہ کام نہ کر سکے لیکن بچہ جب ڈرامہ یا فلم دیکھتا ہے یا بچوں کی جو مثبت داستانیں ہیں ان میں بچہ خود اس ہیرو کی جگہ پہنچا ہوا ہوتا ہے، وہ ہیرو کے قالب میں اپنے آپ کو لے آتا ہے چونکہ وہ کہانی کا مخاطب بنا ہے، ذہنی طور پر اس نے خود کو کہانی میں اتار لیا ہے اور جزوِ کہانی بن گیا ہے، کہانی پڑھنے والا نہیں بلکہ رول پلے (Role-play) کرنے والا ہے، بچے کو پسند نہیں ہوتا ہے کہ سپر مین یا کوئی اور ہیرو اچھا کام کر رہا ہو اور میں فقط اسکے لئے تالیاں بجا رہا ہوں،

وہ بچہ اس ہیرو کے قالب کے اندر روح بن کر اتر جاتا ہے یا یوں کہیں کہ وہ ہیرو بچے کے قالب میں روح بن کر آجاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں ہوں، سارا کارنامہ میں نے کیا ہے، اپنی ذہنیت میں تصور و تخیل کے اندر وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔

☆ خود کو قالبِ قصہ میں ڈھال کر پڑھیں

اسی طرح ہمیں قصصِ قرآنی کے اندر، قالبِ قصہ کے اندر چلا جانا چاہئے، قاریِ قصہ نہ بنیں بلکہ قالبِ قصہ کے اندر اتریں، مثلاً داستانِ بنی اسرائیل کہ جس میں مثبت اور منفی دونوں کردار ہیں، طالوت و جالوت کا قصہ کہ جس میں مثبت اور منفی کردار ہیں، اسی طرح سے حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت داوٗد علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے موجود ہیں، جب انسان آیاتِ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق پڑھ رہا ہو تو اس ادب سے پڑھے کہ خود ابراہیم علیہ السلام بن جائے، انسان ابراہیمؑ کو نہ بنے بلکہ سیرتِ ابراہیم علیہ السلام و اسوہ ابراہیمی کے اندر اتر جائے کہ یہ میں ہوں جو منجنیق میں پڑا ہوا ہوں اور آگ میرے سامنے ہے، یہ بت میں نے توڑے ہیں، یہ نعرۂ توحید و اعلائے کلمۃ اللہ میں نے کیا ہے اور یہ سارے لوگ اس وقت میری طرف متوجہ ہیں، یہ چیز صرف پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتی ہے کہ انسان صرف ان آیات کو رٹ لے۔

اسی طرح کربلا کا میدان ہے، ایک ہے کربلا سن کر رونا اور ایک ہے کربلا میں پہنچنا، ان مصائب کے ذریعے سے اور ان شبیہوں کے ذریعے سے جو منظر بنایا جاتا ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان کربلا کے قالب میں پہنچ جائے، جب ہم مصائب میں سنیں کہ ایک شہید کربلا میدان میں اترتا ہے تو ہم فقط یہ تصور نہ کریں کہ وہ میدان میں جارہا ہے اور ہم فقط اس کا قصہ سن کر روتے رہیں،

بلکہ انسان کا اسوہ اس وقت کربلائی بنتا ہے کہ جب وہ خود اس قصے کے قالب میں پہنچ جائے یعنی میں اس شہید کے قالب میں جا رہا ہوں اور یہ سب میں کر رہا ہوں۔

کہانیوں اور قصوں میں منفی اور مثبت دونوں کردار ہوتے ہیں مثلاً جب داستان میں ایک منفی کردار پیش کیا جاتا ہے تو انسان یہ دیکھے کہ کہیں میں تو اسکے قالب میں نہیں ہوں؟ کہیں یہ میرا روپ تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں کہانی کے اس کردار کی شکل میں باہر آ گیا ہوں؟ مثلاً کسی کہانی کے اندر ایک دھوکہ باز، ایک فریب کار کا کردار ہے تو انسان یہ نہ سمجھے کہ کہیں یہ دھوکہ باز میں تو نہیں ہوں؟

بچوں کی کہانیوں اور بڑوں کی داستانوں میں بعض جگہ احمق اور بیوقوفی کے کردار بھی ہیں کہ ایک آدمی کو بیوقوف کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کو دیکھ کر ہم فقط ہنستے ہیں، وہ ہمیں محظوظ کرنے کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ ہمارا آئینہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ یہ بیوقوف کہیں میں تو نہیں ہوں؟ کہیں میں تو مسخرہ عالم نہیں بنا ہوا ہوں؟ کہیں یہ میری روح تو نہیں کہ جو جسم کی صورت میں فلم اور کہانی میں دکھائی جا رہی ہے کہ تم بھی تو ایسے ہی احمق ہو مثلاً بچوں کیلئے بلی اور چوہے کا جو کارٹون ہے کہ جسے بچوں سے زیادہ بڑے زیادہ شوق سے دیکھتے ہیں اس میں بلی عموماً چوہے سے شکست کھا جاتی ہے یعنی بلی ہمیشہ رسوا ہوتی ہے باوجود اینکہ بلی شکاری ہے اور چوہا بزدل اور ضعیف و ناتوان، لیکن اس کہانی میں بلی کو احمق، بیوقوف اور سفیہ بتایا گیا ہے، بچہ جب یہ دیکھتا ہے تو اس کو چوہا بننا پسند آ جاتا ہے چونکہ چوہا ایک ماہر چالاک، ہوشیار، زیرک اور با فراست ہوتا ہے، اس لئے بچہ پسند کرتا ہے کہ چوہا بنے یعنی

آپ بچے سے پوچھیں کہ آپ ان میں سے کون ہو؟ ٹام یا جیری، تو وہ کیا کہے گا؟ میں جیری ہوں چونکہ ٹام بیوقوف واحمق ہے اور ہمیشہ جیری کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے لہٰذا بچہ پسند کرتا ہے کہ وہ اچھا کردار میں بنوں؟ لہٰذا انسان منفی کردار کو بھی اپنے اوپر تصور کر کے پرکھے کہ کہیں میں تو اسکے قالب میں نہیں ہوں اور اتفاق سے بچپن میں یہ تصور ہوتا ہے لیکن بڑے ہو کر ہم لاتعلق ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے کردار نہیں ہیں۔

۱۱)حیوانات اور دیگر موجودات سے عبرت

روایت میں ہے کہ عبرتیں اسی طرح سے لینی ہیں، روایت میں ہے کہ یہ حیوانات جو تمہارے اطراف میں گھوم رہے ہوتے ہیں یہ تمہاری صفات کا تجسم ہیں لہٰذا تم ان سے عبرت لو۔ ہم آیاتِ قرآن کے مخاطب بھی بنیں اور آیاتِ تکوینی کے مخاطب بھی بنیں، یہ حشرات جو روزمرہ ہماری زندگی میں دخیل ہیں، فرض کریں یہ گھریلو مکھی کہ جس کا ہم سے روز سروکار ہے، اس مکھی کو اگر انسان عبرت کے طور پر دیکھے کہ آیا میں بھی کہیں مکھی تو نہیں ہوں؟ مکھی کا کیا کام ہے؟ ہمیشہ غلاظت پر بیٹھنا، ہمیشہ گندگی پر بیٹھنا، انسان سوچے کہ کہیں میں بھی تو ایسا نہیں ہوں؟ میں بھی ہمیشہ گندی صفات، گندے افعال، گندی سوچ اور گندے کردار کی طرف مائل ہوں، یہ مکھی میرے گھر میں بار بار کیوں آتی ہے؟ میری ناک پہ بیٹھتی ہے، صرف متوجہ کرنے کے لئے کہ تم بھی میری طرح ہی ہو چونکہ حیوانات تجسمِ اعمالِ انسان اور تجسمِ صفاتِ انسان ہیں، ہر جانور میں انسان ہی کی ایک صفت

مجسم ہوتی ہے، ان سے عبرتیں لیں۔ یعنی خدا نے مجھے مخاطب قرار دینے کے لئے آیاتِ تدوینی بھی نازل کی ہیں اور آیات تکوینی بھی خلق کی ہیں اور پھر مجھے کہا ہے کہ

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ......(۴)

یقیناً ان کے واقعات میں صاحبانِ عقل کے لئے سامان عبرت ہے......

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّآثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ٥(۵)

کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے والوں کا انجام کیا ہوا ہے جو ان سے زیادہ زبردست قوت رکھنے والے تھے اور زمین میں آثار کے مالک تھے پھر خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی گرفت میں لے لیا اور اللہ کے مقابلے میں ان کا کوئی بچانے والا نہیں تھا۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ......(۶)

اسی طرح کہیں فرمایا کہ

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ......(۷)

فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ٥(۸)

تو صاحبانِ نظر عبرت حاصل کرو۔

یعنی ان قصوں میں صاحبانِ بصیرت کے لئے عبرت ہے، کیا وہ زمین پر گھوم پھر کر نہیں

دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا؟ اے اولی الابصار عبرت لو، اگر اولی الابصار نہیں ہو تو عبرت نہیں لے سکو گے اور اس وقت ہمیں یہ چیزیں لاتعلق نظر آئیں گی یعنی ہم ان سے لاتعلق اور وہ ہم سے لاتعلق، جب بھی انسان کوئی منظر دیکھتا ہے تو اس مخاطِب کا منظر بنے۔

۱۲)قرآن کی ہر آیہ میں اپنے لئے پیغام تلاش کریں

انسان قرآن کا مخاطَب بن کر اس کے اندر موجود پیغام دریافت کرے یعنی قرآن پڑھنے کے لئے یہ طے کرلو کہ جب بھی

اَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

یا

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پڑھو تو آیت کا مُخَاطَبُ بن کر پڑھو، یعنی ہر آیت کے اندر جو میرے لئے ایک مخصوص پیغام ہے وہ مجھے اس آیت سے تلاش کرنا ہے کہ یہ آیت مجھے کیا دے رہی ہے؟ ہر چند اس میں میرا نام نہیں ہے، ممکن ہے کہ مثبت آیت ہو اور ممکن ہے منفی آیت ہو کہ جس طرح استخارہ میں خوب و بد کہتے ہیں، اگر کسی ظالم و مشرک و کافر کا قصہ ہو تو کہتے ہو کہ یہ استخارہ درست نہیں ہے اور اگر مومنین کا تذکرہ اور مجاہدین کا تذکرہ ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خوب ہے، یہ کام ہو جائے گا حالانکہ دونوں چیزوں میں اصلاً ربط نہیں ہے، اسی طرح سے انسان جب مثبت مضمون کی آیات پر آئے تو دیکھے کہ ان کے اندر میرے

لئے کیا پیغام موجود ہے اور اگر منفی مضمون کی آیات ہیں کہ جو سرزنش کر رہی ہیں تو ان میں بھی تلاش کرے کہ ان آیات کے اندر میرے لئے شخصاً کیا پیغام ہے، ممکن ہے خصوصاً کسی اور کے لئے پیغام ہو لیکن شخصاً ہر آیت کے اندر میرے لئے پیغام ہے اور مجھے اس پیغام تک پہنچنا ہے، جب تک میں خود اس پیغام تک نہیں پہنچتا تو اس کا مطلب ہے کہ ابھی قرآن نہیں سمجھا ہوں۔

قرآن کی ہر آیت میں اپنے لئے پیغام تلاش کریں

مثلاً مجھے معلوم ہو جائے کہ ابن عباس نے، مجاہد نے اور قتادہ و مقاتل نے اس آیت کے ذیل میں کیا کہا ہے لیکن میں پھر بھی ابھی قرآن نہیں سمجھا ہوں، زمخشری کی ساری تفسیر حفظ بھی کرلوں اور مبتدا و خبر و عامل و معمول سب کچھ معلوم بھی ہو جائے تو بھی ابھی قرآن مجھ سے حل نہیں ہوا ہے کہ جب تک میرا پیغام قرآن مجھے نہیں دیتا ہے، ہر آیت سے میرے لئے ایک پیغام ہونا چاہئے، یہ اصلی ادبِ قرآن ہے، اس ادب کے بغیر قرآن جب پڑھا جاتا ہے تو مفسر پیدا ہوتا ہے، حافظ پیدا ہوتا ہے، قاری پیدا ہوتا ہے، استادِ قرآن پیدا ہوتے ہیں، انسان سب کچھ بن جاتا ہے لیکن انسانِ قرآنی نہیں بن سکتا ہے۔

ہم کس طرح سے مُخاطَب بنیں؟ مثلاً آیاتِ اوامر ہیں کہ جن کے اندر امر ہے، خواہ وہ امر بنی اسرائیل کے لئے ہے یا قرآن کی دیگر داستانوں کے ضمن میں ہے یا قرآن کا کوئی شرعی اور فقہی امر ہے، کسی قسم کا بھی امر ہے لیکن وہ خدا کا امر ہے، یہ امر جب انسان کو قرآن میں نظر آئے تو انسان سمجھے کہ مامور میں ہوں مثلاً قرآن میں جب کہا جاتا ہے کہ نیکی کرنے اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو تو انسان یہ سمجھے کہ یہ مجھے کہا جا رہا ہے، اسی طرح تمام منہیات کہ

جو قرآن میں فراواں ہیں، نواہی یعنی جن چیزوں سے قرآن نے روکا ہے، قرآن نے مختلف طبقوں کو مختلف چیزوں سے روکا ہے مثلاً بعض کو کہا ہے کہ جھوٹ نہ بولو، بعض کو کہا کہ چوری نہ کرو، کسی کو کہا ہے کہ غیبت نہ کرو، کسی کو کہا ہے کہ گناہ نہ کرو، معصیت نہ کرو، بعض کو کہا ہے کہ خیانت نہ کرو اور ممکن ہے کہ کسی خاص طبقے کی طرف اشارہ ہو مثلاً کسی چیز سے عورت کو روکا گیا ہو یا کسی مرد کو کہا گیا ہو کہ یہ کام نہ کرو تو فرق نہیں ہے، اگر عورتوں کو فواحش سے روکا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے منع کیا جا رہا ہے، انسان ان تمام اوامر و نہی کا خود کو مخاطب سمجھے۔

۱۳)قرآن کا اندازِ تخاطب خطابی ھے

قرآن کا اپنا ایک انداز اور اسلوب ہے چونکہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کتابی زبان نہیں ہے یہ بعض اہلِ تفسیر کا نکتہ ہے لیکن کسی نے بہت خوبصورت اور لطیف نکتہ بیان کیا ہے، لگتا ہے کہ قرآن سے مانوس تھا، انہوں نے فرمایا کہ قرآن کی زبان کتابی نہیں ہے بلکہ خطابی زبان ہے، کتابی زبان وہی اجنبی زبان ہوتی ہے، کتاب پڑھ کر انسان اپنے آپ کو مخاطِب نہیں کر رہا ہوتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو کسی ریاضی (Mathematics)، فزکس (Physics) اور کیمسٹری (Chemistry) کی کتاب کا مُخاطَب نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ ان میں کتابی زبان ہوتی ہے یا مثلاً فقہ کی کتاب ہے، فقہ کی زبان میں عموماً فرضی مثالیں ہوتی ہیں کہ زید نے یہ کیا، بکر نے یہ کیا، عمرو نے یہ کیا لیکن خطابی زبان میں بات کرنے کا ایک خاص اسلوب ہے، جیسے پہلے اشارہ کیا تھا کہ خطابی

زبان میں اسلوب یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی کردار مختلف روپ بدلتا رہتا ہے، جملے بدلتے رہتے ہیں، مثلاً ایک ہی آدمی کو اگر خطاب کرتے ہوئے دیکھیں تو وہ کبھی ضمیرِ متکلم استعمال کرتا ہے، کبھی ''ہم'' کہنا شروع کر دیتا ہے، کبھی ''آپ'' کہنا شروع کر دیتا ہے، کبھی ''تو'' کہنا شروع کر دیتا ہے، کبھی ''وہ'' کہنا شروع کر دیتا ہے لیکن اگر ''ہم'' کہے تو بھی مراد وہی چیز ہے، اگر ''آپ'' کہے تو بھی مراد وہی چیز ہے، اگر ''وہ'' کہے تو بھی مراد وہی چیز ہے یعنی اس کی ضمیروں کے فرق سے معانی کے اندر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

قرآن کا انداز تخاطب خطابی ہے

فرض کریں کہ کوئی خطیب آپ کے سامنے تقریر کر رہا ہو تو بعض جملوں میں ضمیریں بدل رہا ہوتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ ہم قرآن درست نہیں پڑھتے ہیں، آپ قرآن صحیح نہیں پڑھتے ہیں، لوگ قرآن درست نہیں پڑھتے ہیں یا انسان قرآن درست نہیں پڑھتے ہیں یہ مختلف لہجے ہو گئے لیکن مقصود سب میں ایک ہی تھا، یہ خطابی زبان ہے لیکن کتابی زبان میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ کبھی ''ہم'' کہہ رہے ہیں، کبھی ''آپ'' کہہ رہے ہیں، کبھی ''تم'' کہہ رہے ہیں اور کبھی ''تو'' کہہ رہے ہیں بلکہ کتابی زبان میں انسان اکتا جاتا ہے، مضطرب ہوتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتی ہے لیکن شفاہی خطاب میں یہ اسلوب ہے۔ قرآن کا انداز خطابی لہجے کا ہے، خطابی زبان کا یہ معمول ہے یا لازمہ ہے کہ خطابی زبان میں بعض اوقات سنایا کسی کو جاتا ہے اور مقصود کوئی اور ہوتا ہے یعنی حتماً ایسا ہوتا ہے نہ کہ کبھی کبھار ہوتا ہے، لوگ بھی جب بات کر رہے ہوتے ہیں تو اسی طرح سے کر رہے ہوتے ہیں مثلاً کسی اچھے کو سناتے ہیں اور مقصود کسی برے کو سمجھانا ہے یعنی ایک بہت اچھے آدمی کو کہہ رہے ہوتے ہیں کہ

یہ کیا کیا آپ نے؟ ایسے نہیں کرنا، تاکہ وہ دوسرا سمجھ جائے۔

محاوراتی زبان میں کہتے ہیں کہ کہے بیٹی کو سنائے بہو کو، ساس جب بہو کو سرزنش کرنا چاہتی ہے تو ڈائرکٹ (Direct) بہو کو نہیں کہتی ہے کہ ایسی کی تیسی بلکہ اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہوتی ہے اور بہو بھی سمجھ رہی ہوتی ہے، بیٹی ہنس رہی ہوتی ہے لیکن بہو کو مروڑ پڑ رہے ہوتے ہیں چونکہ اس کو پتہ ہے کہ یہ سب کچھ مجھے کہہ رہی ہے۔

اسی طرح فرض کریں کہ ایک آدمی نے سچ بولا ہے اور ایک آدمی نے جھوٹ بولا ہے، لیکن جس نے سچ بولا ہے اس سے جا کر کہتے ہیں کہ خبردار جھوٹ نہیں بولنا، تو اس نے تو جھوٹ نہیں بولا، وہ بھی نہیں کہتا ہے کہ مجھے کیوں کہہ رہے ہو، اسے بھی پتہ ہے کہ فقط سنایا مجھے جا رہا ہے اور کہا کسی اور کو جا رہا ہے، خطابی انداز یہی ہوتا ہے۔

قرآن میں بہت زیادہ خطاب ایسے ہیں کہ جہاں اللہ فرما رہا ہے:

یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ......(۹)

یہ بھی ہمیں خطاب ہے یا یہ آیا ہے کہ

یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ......(۱۰)

یہ بھی ہمیں خطاب ہے چونکہ یوں تو نہیں ہے کہ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے لئے اترا ہے، یہ انسان کی ہدایت کیلئے اترا ہے، قرآن ھدی للناس ہے لیکن طریقۂ قرآن یہ ہے کہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے، کبھی اطرافیانِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے لیکن درحقیقت مقصودِ خطاب

ہر نسل ہے، ہر نسل کے ہر فرد کو خطاب ہے، اس لئے اجنبی ہو کر قرآن نہ پڑھیں۔

ہم اخبار پڑھتے ہیں تو اس اخبار میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو انسان کو خوشحال کرتی ہیں اور کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ جو پریشان کرتی ہیں مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایرانی اخبار پڑھا اور اس ایرانی اخبار میں لکھا ہوا ہے کہ پٹرول راشننگ شروع ہوگئی ہے تو آپ کہیں گے کہ یہ تو ایرانیوں کے لئے ہوئی ہے، ہمارے پاس پٹرول ہے نہ گاڑی ہے نہ کچھ اور ہے، اس خبر کا ہم سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے یا فرض کرلیں کہ فلاں ملک نے اپنی عوام کے لئے یہ قانون پاس کردیا ہے مثلاً ترکی کے اندر آئندہ سے یہ قانون پاس ہو جائے گا، آپ کہتے ہیں کہ یہ ترکی کیلئے ہے ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟ ہمیں کب ترکی جانا ہے؟ یہ اجنبی بن کر خبر پڑھنا ہے، صرف معلومات میں اضافہ کے لئے ہے، پورا اخبار پڑھ دیتے ہیں یا سن لیتے ہیں لیکن معلومات میں اضافے کے لئے کہ مطلع رہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

قرآن ہمیں فقط دنیا سے مطلع کرنے کے لئے نہیں آیا ہے، اپنے ارد گرد سے باخبر کرنے کے لئے نہیں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں یوں ہوتا تھا، فلاں میں یوں ہوتا تھا، بلکہ قرآن سناتا بنی اسرائیل کو ہے اور سمجھاتا اہلِ قرآن کو ہے، قرآن سناتا اہلِ تورات کو ہے اور مقصود اہلِ قرآن ہیں، جب سورہ جمعہ میں کہا جاتا ہے کہ

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا......(۱۱)

ان لوگوں کی مثال جن پر توریت کا بار رکھا گیا اور وہ اسے اٹھا نہ سکے اس گدھے کی مثال ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو......

تو یہ وہی خطابی زبان ہے، یہ سنا تا کسی کو ہے اور مقصود کوئی اور ہے، قرآن کن لوگوں کو کہہ رہا ہے کہ اگر آسمانی کتاب لے لی اور آسمانی کتاب کے حامل بن گئے لیکن اس پر عمل نہ کیا اور وہ اپنی زندگیوں میں نہ اتاری تو آپ گدھوں کی طرح ہو؟ یہ کن کو کہا گیا ہے کہ اس کو ہر نمازِ جمعہ میں پڑھو؟ یا کم از کم روزِ جمعہ میں پڑھو؟ ہر چند کہ ان آیات میں نام یہود کا ہے لیکن یہ اہلِ قرآن سے کہا جا رہا ہے کہ اسے اس لئے پڑھو کہ مُخَاطَبْ تم ہو،

قُلْ يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ هَـادُوْا اِنْ زَعَـمْتُـمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ......(۱۲)

آپ کہہ دیجئے کہ یہودیوں اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تمام انسانوں میں تم ہی اللہ کے دوست ہو تو موت کی تمنا کرو۔

سنایا کن کو جا رہا ہے؟ اے وہ لوگوں جو یہودی ہو لیکن سمجھایا کن کو جا رہا ہے؟ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو یعنی جو اپنے آپ کو مسلمان اور مومن کہتے ہو، اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو تو

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ○

یعنی اگر اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ مخاطب بنیں، ان ساری آیات کے

مخاطب بنیں، جو سرزنش کر رہی ہیں ان کے بھی اور جو تعریف کر رہی ہیں انکے بھی، البتہ یہ مطلب بعد میں آئے گا کہ ہم کس طرح سے قرآن سے اثر لیں، ابھی یہ بات ہے کہ فقط قرآن کے مخاطب بنیں، اجنبی بن کر قرآن نہ پڑھیں، جس طرح سے سلیبس (Syllabus) کی کتابیں پڑھتے ہیں اسی طرح سے قرآن نہ پڑھیں، اتفاقاً ہم بچوں کو جب قرآن سکھا رہے ہوتے ہیں تو اسی وقت سے ہی ان کو اجنبی قرار دے کر قرآن سکھا رہے ہوتے ہیں، بسا اوقات شانِ نزول بھی بتا رہے ہوتے ہیں کہ یہ فلاں کے بارے میں ہے، وہ فلاں کے بارے میں ہے، اگر تھوڑا بہت اس کے ذہن میں ہوتا بھی ہے کہ یہ میرے بارے میں ہے تو شانِ نزول سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ بس اب کنفرمیشن (Confirmation) ہوگئی ہے کہ یہ میرے بارے میں نہیں ہے، شانِ نزول اگر معنیٰ سمجھنے میں مدد دیتا ہے تو خوب ہے لیکن شانِ نزول میں مخاطب کو گم نہ کریں، یہ نہ ہو کہ مخاطب کوئی تھا اور بنا کسی اور کو جائیں، بات ہمیں سمجھائی جارہی تھی اور ہم یہ کہیں کہ نہیں یہ تو فلاں کے لئے تھی۔

۱۴) مخاطب بننے کے اثرات

کتاب میں بعض مطالب اثنائے عبارت میں بیان ہوئے ہیں،

☆ وهو ان يقدر العبد انه هو المقصود بكل خطاب......

عبد کیا گمان کرے؟ کیا یقین پیدا کرے؟ کیا سوچ کر جائے؟ یعنی اپنی ذہنیت کس طرح بنا کر جائے؟ انسان یقین کرے کہ میں مُخاطَب ہوں، سارا قرآن میرے لئے ہے،

☆ فاذا سمع فی القرآن امراً......

اگر کوئی آیت ایسی آتی ہے کہ جس کے اندر امر موجود ہے،

☆ او نهیاً او وعداً او وعیدا......

یا نہی موجود ہے یا وعد موجود ہے یا وعید موجود ہے، وعد یعنی جنت کا وعدہ، کامیابی کا وعدہ، فلاح کا وعدہ، نجات کا وعدہ، ثواب کا وعدہ اور وعید یعنی دھمکیاں، جہنم، رسوائی، خزی اور قرآن کے بیان کردہ عذاب یعنی عذاب النار، عذابِ الیم، عذابِ مھین، عذابِ عظیم، عذاب شدید، عذاب الحریق، عذابِ مقیم، عذاب الھون، عذاب الخلد، عذاب الخزی، عذابِ غلیظ، عذاب السعیر، عذابِ واصب، عذاب الجحیم، عذاب الحمیم، عذاب السموم، عذابِ مستقر۔

☆ قدر ان الخطاب معه......

یہ سب کس کو کہا جا رہا ہے؟ مجھے کہا جا رہا ہے، انسان ان تمام آیات سے اثر لے، ایک یہ ہے کہ یہ عبرت کے لئے خوب ہے، بسا اوقات کوئی بورڈ لگایا جاتا ہے تو اس کا مخاطب میں ہوں، اگر ڈرائیور گاڑی چلا رہا ہو اور دائیں بائیں ٹریفک کے سائنز (Signs) لگے ہوئے ہیں تو کیا وہ آنکھیں بند کر کے چلائے کہ ان کا مجھ سے کیا رابطہ ہے یہ تو کسی اور کے لئے لگے ہوئے ہیں، نہیں، یہ آپ کے لئے لگے ہوئے ہیں، آپ مخاطب ہیں کہ یہاں پارکنگ ممنوع ہے، یہاں اسپیڈ اتنی رکھیں، یہاں بریک لگائیں، یہاں پر اوور ٹیک (Overtake) نہ کریں، آپ ان سارے سائنز کے مخاطب ہیں، انسان ہر ہر نقطے کا اپنے آپ کو مخاطب سمجھے۔

☆ فلیعمل بمؤادہ......

اس کے معنیٰ کے مطابق عمل کرے۔ مخاطب بنانے سے مراد کیا ہے؟ مخاطب بننے کا ایک اور اثر یہ ہے کہ انسان فوراً اس خطاب پر عمل کرتا ہے، فی الفور عکس العمل دکھاتا ہے، اگر امر ہے تو اٹھ کر عمل کرتا ہے، اگر نہی ہے تو ترک جاتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ میں نے سنا اَن سنا کر دیا ہے، قرآن میں ایک آیت ہے کہ جس کو ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ بعض کو ہم نے دل دیئے ہیں لیکن سمجھتے نہیں ہیں، آنکھیں دی ہیں لیکن دیکھتے نہیں ہیں، کان دیئے ہیں لیکن سنتے نہیں ہیں، یہ کون لوگ ہیں؟

أُولٰئِکَ کَالْأَنْعَامِ......(۱۳)

یہ جانوروں کی طرح ہیں، یہ حیوانوں کی طرح ہیں، یہ دل وعقل وفہم وسب کچھ رکھ کر بھی جانور ہیں یعنی جانور سے بھی بدتر ہیں،

اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ۝(۱۴)

یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین زمین پر چلنے والے وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے ہیں۔

یعنی زمین کے اوپر سب سے برا چلنے والا متحرک موجود وہ انسان ہے کہ جو گونگا، بہرا اور اندھا ہے۔ جس کو خدا نے دل دیا ہے لیکن سمجھتا نہیں ہے، عقل دی ہے لیکن سوچتا نہیں ہے، آنکھیں دی ہیں لیکن دیکھتا نہیں ہے، اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب انسان خطاب پڑھتا ہے تو متوجہ نہیں ہوتا ہیں کہ یہ خطاب مجھ سے ہے، آیاتِ خدا مجھے پکار رہی ہیں، مجھ سے مخاطب ہیں، مجھے بلا رہی ہیں لیکن یہ

نہیں سنتا ہے یعنی بہرا ہے، یہ حشرات یہ جانور اور یہ سارے موجودات اسے عبرت کے نمونے دکھا رہے ہیں لیکن یہ دیکھتا نہیں ہے یعنی اندھا ہے، قرآن اس کے لئے نازل کیا ہے لیکن یہ سمجھتا نہیں ہے۔ بیوقوف یہی ہوتا ہے کہ آپ اس کا صریح نام لے کر بھی کہیں تو یہ سمجھتا ہے کہ کسی اور کو کہا جا رہا ہے مجھے نہیں کہہ رہے ہیں۔

☆ **وان سمع قصص الاولین و الانبیاء علیهم السلام.** ..

اور اگر انسان قرآن میں گزشتہ قوموں کے، انبیاءؑ کے یا ان کی امتوں کے قصے مشاہدہ کرتا ہے،

☆ **فلیذ عن ان قصة السمر، غیر مقصود......**

تو یہ یقین کر لے کہ یہ قصصِ شب نہیں ہیں یا ان قصوں کو بیان کرنے سے مقصود بچوں کو سلانے کے لئے رات کی داستانیں نہیں ہیں، یہ فقط داستان سرائی نہیں ہے کہ جو لوگوں کا معمول تھا کہ راتوں کو بیٹھ کر ٹائم پاس کرنے کے لئے کوئی قصہ پڑھتے تھے، بعض کے اندر قوتِ تخیل قوی تھی لہٰذا وہ فوراً قصہ بھی بنا لیتے تھے اور گھڑ لیتے تھے، قرآن میں مقصود از قصص، قصصِ شب نہیں ہیں۔

☆ **بل الاعتبار** ..

بلکہ ان قصوں سے مقصود عبرت لینا ہے۔

☆ **فلیعتبر کیف لایقدر هذا** ..

انسان دیکھے کہ کیوں میں مخاطبِ قرآن نہیں ہوں؟ ان قصوں سے عبرت لے،

☆ والقرآن ما نزل علی الرسول صلی اللّٰہ علیہ و آلہ خاصۃ......

قرآن فقط رسول اللہ ﷺ کے لئے تو نازل نہیں ہوا ہے بلکہ انسان کے لئے نازل ہوا ہے، ھدی للناس ہے، رسول اللہ ﷺ کے ذریعے نازل ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ واسطۂ نزولِ قرآن ہیں نہ کہ فقط وہ ہی مخاطبِ قرآن ہیں اور صرف رسول اللہ ﷺ کو سارے قرآن پر عمل کرنا ہے،

☆ بل شفاء و ھدی للعالمین......

بلکہ قرآن تمام عالمین کے لئے شفا اور ہدایت ہے۔ قیامت تک آنے والی نسلیں مخاطبِ قرآن ہیں، فرد فرد مخاطبِ قرآن ہے لہٰذا جب انسان قرآن کی ہر آیہ سے اثر لیتا ہے تو قرآنی صفات دلِ انسان پر متمکن ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

۱۵)شکر سے مراد

☆ ولھذا امر اللّٰہ الکافۃ بشکر ھذہ النعمۃ العمیمۃ......

اس وجہ سے خداوند تبارک وتعالیٰ نے سب کو حکم کیا ہے کہ اس عمومی نعمت کے اوپر شکر کرو کہ جو خدا نے تمہیں عطا کی ہے، شکر سے مراد یہ نہیں ہے کہ پیٹ بھر کر پھر آخر میں ڈکار لے کر کہے شکر الحمد للہ، اس کو شکر نہیں کہتے ہیں، شکر سے مراد یہ ہے کہ جو نعمت خدا نے دی ہے اس کو بروئے کار لانا، اس کو استعمال میں لانا۔ خدا نے کتاب دی ہے تو شکرِ خدا اس کتاب اس کو پڑھنا ہے نہ یہ کہ

شکر سے مراد

کتاب الماری یا کسی اونچی جگہ پر رکھ کر کہے کہ شکریہ، یہ شکر نہیں ہے، چہ بسا یہ منافقت ہے کہ انسان بروئے کار نہ لائے اور زبان سے شکریہ کہہ دے۔ شکر یہ ہے کہ جو کچھ دیا ہے اس کو بروئے کار لائے، اگر یہ پڑھنے کے لئے دی ہے تو اس کو پڑھو، یہ شکرِ کتاب ہے، علم کا شکر یہ ہے کہ اس پر عمل کرو، ہر نعمت کا ایک صحیح مصرف ہے لہٰذا اس کو اسی جہت میں استعمال کرنا شکرِ نعمت ہے۔

۱۶)قرآن فقط معصومین علیہ السلام کیلئے نازل نہیں ہوا

☆وقال: وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌo(۱۵)

خدا کی نعمت کو یاد کرو، اس نے کتاب وحکمت کو تمہاری نصیحت کے لئے نازل کیا ہے اور یاد رکھو کہ وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔

خداوند نے فرمایا کہ یہ کتاب اور یہ حکمت جو اس کے اندر ہم نے نازل کی ہے یہ کس لئے ہے؟ یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے تو مخصوصاً نہیں ہے، جس طرح سے ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ امام زمانہ علیہ السلام آئیں گے تو اپنے کام بھی کریں گے اور ساتھ میں ہمارے سارے کام بھی کریں گے یعنی یہ سارا دین امام زمانہ علیہ السلام کے لئے ہے، سارے فرائض امام زمانہ علیہ السلام کے لئے ہیں، ہمارا کام فقط یہ ہے کہ اپنی مشکلات کو امام زمانہ علیہ السلام کے ذریعے سے حل کروالیں، اسی طرح سے قرآن سارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے، ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ خلاص ہونے کے لئے ایک شبہہ یہ بھی نقل کیا

جاتا ہے کہ قرآن تو فقط معصومین علیہم السلام کے لئے نازل ہوا ہے، ہم سے تو قرآن کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ تورات بنی اسرائیل کے لئے ہے، انجیل بنی اسرائیل کے لئے ہے لیکن قرآن معصومین علیہم السلام کے لئے ہے، ہم فارغ ہیں لہٰذا ہمارے لئے کچھ بھی نازل نہیں ہوا ہے۔

وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ......(۱۶)

یہ کتاب جو آپ کے لئے نازل کی ہے،

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ......

اس لئے نازل کی ہے کہ تم اس سے موعظہ لو۔

☆وقال: لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ٥(۱۷)

بیشک ہم نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا بھی ذکر ہے تو کیا تم اتنی بھی عقل نہیں رکھتے ہو۔

یعنی یہ تمہارے لئے تذکر ہے، فرد فرد کے لئے تذکر ہے، تذکر کا لہجہ مختلف ہے یعنی اس غلطی میں نہ پڑ جانا کہ اس میں ہمارا نام نہیں ہے، اس میں تم کہا گیا ہے یعنی تم کہہ کے آپ کو سنایا جا رہا ہے۔ یہ محاورے کا طریقہ ہے، خواص اور عوام دونوں کا یہی طریقہ ہے۔ کبھی اللہ نے سابقہ امتوں سے خطاب کیا، کبھی اس امت سے، کبھی لہوی سے، کبھی فرد سے، کبھی قوم سے، کبھی اجتماع سے، کبھی جنگ میں جانے والوں سے، کبھی جنگ سے کترانے والوں سے لیکن یہ سب تمہارے لئے ہے، آپ ان سب کا مخاطب بنیں۔ جتنی بھی آیاتِ شرک ہیں ان کا مخاطب بنیں اور دیکھیں کہ کہیں ہم تو شرک

کے مرتکب نہیں ہورہے ہیں؟ جتنی بھی آیاتِ نفاق ہیں ان سب پر توجہ کریں کہ کہیں ہمارے دل کے اندر تو یہ اوصاف موجود نہیں ہیں؟ چونکہ قرآن ہمیں مخاطب کر رہا ہے کہ یہ نفاق لوگوں کے اندر موجود ہے، لوگ یعنی میں،

☆وقال: هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ○(۱۸)

یہ عام انسانوں کے لئے ایک بیانِ حقائق ہے اور صاحبانِ تقویٰ کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے۔

۱۷)مذہبی طبقے کی دیگر مشکلات

عرصہ دراز سے اس مسئلے نے میرے ذہن کو متوجہ کیا ہوا ہے اور یہ سنجیدہ مشکل ہے کہ مذہبی طبقے کے اندر ایسی کمزوریاں، ایسے ضعف اور ایسی مشکلات ہیں کہ جو مذہب کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ مثلاً نشئی طبقے میں ایسے کام ہیں کہ جو نشہ بازوں کے ساتھ سازگار ہیں جیسے نشئی ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے ہیں، اگر کبھی ان سے واسطہ پڑا ہے تو آپ ان کو دیکھیں کہ جب وہ دوسرے کو چرس کا سگریٹ پیش کرتے ہیں تو پورے وجود کے ساتھ اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اور بسم اللہ بھی ساتھ کہتے ہیں لیکن ایک مذہبی آدمی اگر افطار میں بیٹھا ہوا ہے اور دوسرے کو کہے کہ کھجور دینا تو وہ عجیب طریقے سے غصے سے پھینکتا ہے حالانکہ مومن کو تو بسم اللہ کہہ کے ادب سے دینا چاہئے۔

اسی طرح دنیاداروں اور تاجروں کو دیکھیں، باوجودیکہ ایک دوسرے کیلئے تجارتی رکاوٹ ہیں لیکن درعینِ حال ایک دوسرے کے حریم کا خیال رکھتے ہیں، ایک دوسرے پہ اعتماد کرتے ہیں، ایک

دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔ بہت سارے غیر مذہبی طبقات کو اپنی اپنی دنیا میں جا کر دیکھیں کہ ان کا اپنی فیلڈ (Field) کے ساتھ اتنا تضاد نہیں ہے کہ جتنا مذہبیوں کا اپنی فیلڈ کے ساتھ تضاد ہے یعنی مذہبی کا مذہب کے ساتھ جتنا تضاد ہے اتنا کسی اور میں نہیں ہے، مذہبی اور مذہب میں جنگ ہے، مذہب کچھ کہتا ہے اور مذہبی کچھ اور کہتا ہے، ایک ناروا کام جو مذہبی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر مذہبی نے دوسروں کو تبدیل کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے کہ میں اس کو ٹھیک کر کے رہوں گا، پوری پوری فائلیں ایک دوسرے کے بارے میں بنا رکھی ہیں، فلاں یہ کرتا ہے، اس کو یوں نہیں کرنا چاہئے اور اس کو یوں نہیں کہنا چاہئے۔ اگر مذہب یہ کہتا ہے کہ تم اپنے ذمہ دار ہو، تم خود کو ٹھیک کرو، اگر خود کو ٹھیک کرلیا تو پھر تمہیں باور ہو جائے گا کہ میں کسی اور کو بھی ٹھیک کر سکتا ہوں کیونکہ انسان نمونے کے طور پر ایک کام کرتا ہے تو پھر امید بڑھتی ہے مثلاً آپ ایک کتاب لکھیں تو اندازہ ہوگا کہ آپ اور کتابیں بھی لکھ سکتے ہیں۔ آپ دوسروں کا ٹھیکہ چھوڑ دیں اور اپنا ٹھیکہ لیں اور اپنا ٹھیکہ اس طرح لے سکتا ہے کہ اپنے آپ کو مُخاطَبِ قرآن قرار دے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۱۹)

یہ عام انسانوں کے لئے ایک بیانِ حقائق ہے اور صاحبانِ تقویٰ کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے۔

جس طرح سے سورۂ مبارکہ بقرہ میں بھی یہی آیا تھا کہ قرآن متقین کیلئے ہدایت ہے۔ اگلی فصل میں انشاءاللہ ادبِ ہشتم درج کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)...(الکافی - الکلینیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۲۰۵)(ترجمہ تفسیر المیزان - علامہ محمد حسین طباطبائی رحمۃ اللّٰہ علیہ)(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیۃ اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ)(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی مدظلہ، الجزء ۷، صفحہ ۱۲۰)(شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ)

(۲)...(نفحات القرآن - آیۃاللّٰہ العظمٰی مکارم الشیرازی مدظلہ)(الکافی - الکلینیؒ، باب الشکر، الجزء ۲، صفحہ ۱۴۲)(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۱۶، صفحہ ۲۶۴)(حلیۃ الأبرار - السید ھاشم البحرانی، الجزء ۱، صفحہ ۲۴۷)(میزان الحکمۃ-الریشھری، الجزء ۱۰، صفحہ ۳۱۵)

(۳)...(مثنوی معنوی، بہ تصحیح :رینولد ا.نیکلسون، دفتر اول،صفحہ ۱۲)

(۴)...(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۱۱۱)

(۵)...(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ۲۱)

(۶)...(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۱۰۹)(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ۸۲)(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ۱۰)

(۷)...(سورۂ مبارکہ روم، آیہ۹)(سورۂ مبارکہ فاطر، آیہ۴۴)

(۸)...(سورۂ مبارکہ حشر، آیہ۲)

(۹)...(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۶۴)(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۶۵)(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۷۰)

(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ۷۳)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۱)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۲۸)

(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۴۵)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۵۰)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۵۹)

(سورۂ مبارکہ ممتحنہ، آیہ۱۲)(سورۂ مبارکہ طلاق، آیہ۱)(سورۂ مبارکہ تحریم، آیہ۱)(سورۂ مبارکہ تحریم، آیہ۹)

(۱۰) (سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۴۱)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۶۷)

(۱۱) (سورۂ مبارکہ جمعہ، آیہ۵)

(۱۲)... (سورۂ مبارکہ جمعہ، آیہ۶)

(۱۳)...... (سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۷۹)

(۱۴)...... (سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۲۲)

(۱۵)...... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۳۱)

(۱۶)... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۳۱)

(۱۷)...... (سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ۱۰)

(۱۸)... (سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ۱۳۸)

(۱۹) (سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ۱۳۸)

فصلِ ادبِ ھشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ اول)

۱)وجد کا معنٰی

۲)اللہ کو پانا ھے،نہ کہ سمجھنا ھے

۳)قرآن کو اپنے وجود میں اتاریں

٤)وجد،اھلِ معرفت کی نظر میں

٥)متاثر ھونا کمال کی علامت

٦)ھر چیز سے متاثرھونا ضعف ھے

۷)وجد،شوق کی ایک حالت

۸)حالتِ وجد کے اثرات

۹)عشق،اصطلاحِ دینی

۱۰)انسان پرقرآن کی مقناطیسیت کی علامات

۱۱)کسی چیز کو پانے اور سمجھنے میں فرق

۱۲)معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

۱۳)رسولِ اکرم ﷺ اور مولا علی علیہ السلام پر حالتِ وجد

۱۴)جیسی آیت ویسی حالت

۱۵)عبادات کا شوق خدا پیدا کرتا ھے

۱۶)شوق و وجد، عالم توحید و ملکوت کے مقناطیس

۱۷)قرآنی کشش کے باوجود دل کی قرآن سے دوری کی وجہ

آدابِ فہم قرآن میں ادبِ ہشتم تاثر و وجد ہے،

☆ الثامن: التأثر والوجد وهو ان يتأثر باطنه ويتنور قلبه بانوار الكلام......

آٹھواں ادب تاثر و وجد ہے کہ اس کا باطن متاثر ہو اور اس کا قلب خدا کے کلام سے نورانی ہو۔ تاثر یعنی متاثر ہونا، اثر قبول کرنا۔ تاثیر اثر چھوڑنے کو کہتے ہیں اور تاثر اثر لینے کو کہتے ہیں، قرآن سے اثر لینا یعنی جب آپ مخاطبِ قرآن بنیں تو قرآن سے اثر بھی لیں اور وجد کی کیفیت ہو۔ مراد یہ ہے کہ انسان متاثر ہو، باطنِ انسان، روحِ انسان پر قرآن اثر کرے اور قرآن کی نورانیت سے انسان کا دل نورانی ہو۔ یہ متاثر ہونا ہے اور یہی وجد ہے۔

گزشتہ ادب یہ تھا کہ انسان اپنے آپ کو مُخاطَبِ قرآن قرار دے، یہ ادبِ ہشتم اسی چیز کا اثر ہے یعنی انسان جب قرآن پڑھے اور بارگاہِ قرآن و خدمتِ قرآن میں حاضر ہو تو اس طرح سے قرآن میں تدبر کرے اور تلاوتِ قرآن کرے کہ متاثر ہو، قرآن سے اثر لے، قرآن کا ہمارے وجود کے اوپر، ہماری روح کے اوپر اثر پڑے اور اثر بھی اس طرح سے پڑے کہ انسان پر حالتِ وجد طاری ہو اور یہ ادبِ ہفتم ہی کا نتیجہ ہے کہ پہلے انسان اپنے آپ کو قرآن کا مُخاطَب قرار دے تا کہ قرآن اس پر اثر کرے اور چونکہ مخاطبِ اصلی قرآن دلِ انسان ہے لہٰذا دل جب تک تاثر کے لئے، اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو تو یہ حالت حاصل نہیں ہوتی ہے، دل کو آمادہ کرنے کیلئے سابقہ آداب مؤثر ہیں جیسے توجہ در عظمتِ قرآن، تطہیرِ قلب اور حضورِ قلب وغیرہ۔ اگر انسان مُخاطَبِ قرآن نہ بن سکے

اور فقط قاریٔ قرآن، حافظِ قرآن اور مفسرِ قرآن رہے تو ادبِ ہشتم تک اس کی نوبت نہیں آتی ہے۔

۱) وجد کا معنیٰ

وجد کی حالت سے مراد یہ ہے کہ انسان اس طرح سے غرق و محو در قرآن ہو کہ بے خود ہو جائے یعنی ایک بے خودی کی حالت انسان کے اوپر طاری ہو، بے خودی یعنی انسان دوسرے تمام تعلقات سے منقطع ہو کر فقط محوِ کلامِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہو اور کلام کے اندر چونکہ ذاتِ متکلم متجلی ہے ،ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ جلوہ گر ہے لہٰذا یہ محوِ تجلیٔ ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہو، اس کی علامت یہ ہے کہ انسان جب قرآن پڑھتا ہے اور مختلف معارف و معالم و تعلیماتِ قرآن سے ایک ایک کر کے آشنا ہوتا ہے تو انہی معارف کے مضامین کے مطابق انسان کے اوپر صفات طاری ہوں اور حالات طاری ہوں اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب یہ ساری چیزیں انسان کے دل میں اتریں، انسان کے اندر منتقل ہوں، انسان پر یہ حالت فقط فہمِ ذہنی یا قرآن کے مفاہیم کو صرف سمجھ لینے سے طاری نہیں ہوتی ہے، جب تک انسان مضامینِ قرآن اور معارفِ قرآن مجید سے متصف نہ ہو۔

وجد لغت میں کسی چیز کے پالینے کو کہتے ہیں، کسی شے کے وجود کو پالینا وجد کہلاتا ہے، سمجھ لینا وجد نہیں ہے بلکہ پانا وجد ہے۔

وجد کا معنیٰ

۲) اللہ کو پانا ہے، نہ کہ سمجھنا ہے

پہلے بھی فصلِ ادبِ اول میں بعض مطالب کے ضمن میں یہ اشارہ ہوا تھا کہ مثلاً ہم بات کرتے ہیں کہ خدا کو ثابت کرنا ہے، خدا کو سمجھنا ہے، خدا کے اوپر دلیلیں قائم کرنی ہیں، ساری عمر انسان یہ کام کرتا رہے پھر بھی خدا سے دور ہی رہے گا کیونکہ خدا کو پانا ہے۔ خدا وہ ذات ہے، وہ حقیقت ہے کہ جس حقیقت تک ہمیں پہنچنا ہے، وصول الی اللہ، قرب الی اللہ، لقاء بخدا اور نہایتاً وجدِ خدا، جس طرح سے سید الشہداؑ نے اور قرآن نے بھی یہ ساری تعبیریں استعمال کی ہیں کہ مثلاً اگر تم انابت کرو، توبہ کرو یعنی خدا کی طرف رجوع کرو،

ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝(۱)

پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا پائے گا۔

وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۝(۲)

اور خدا کے علاوہ اسے کوئی سرپرست اور مددگار مل بھی نہیں سکتا ہے۔

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۝(۳)

تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے ہیں۔

ہم نے اللہ کو پانا ہے نہ کہ فقط ذہن سے سمجھنا ہے، خدا مفہوم نہیں ہے کہ ذہنی چیز ہو اور خدا کو ہم ذہن میں لے آئیں یا محسوسات میں سے نہیں ہے کہ ہم حواس کے ذریعے سے خداوند تبارک وتعالیٰ کو دیکھیں بلکہ خدا پانے کی چیز ہے۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جو ہم نے پائی ہیں یا جن

اللہ کو پانا ہے، نہ کہ سمجھنا ہے

کے لئے ہم جملہ یا تعبیر ہی یہی استعمال کرتے ہیں کہ میں نے اس چیز کو پالیا ہے نہ کہ اس کو سمجھ لیا ہے مثلاً ایک مقام میں نے پالیا ہے، سرور و خوشی میں نے پالی ہے، پالینا یعنی اس کا وجود میرے وجود کے ساتھ ایک ہو جائے اور میرا وجود اس کے وجود کے ساتھ ایک ہو جائے، وہ میرا حصہ اور میرا جزو بن جائے جیسے سرور پانے کی چیز ہے وگرنہ انسان لغت میں لفظِ سرور کے معانی دیکھ لے تو سرور سمجھ تو گیا ہے لیکن پایا نہیں ہے۔

جس طرح سے مریض درد پاتا ہے اور ڈاکٹر درد کو سمجھتا ہے، طبیب میں درد کا وجدان نہیں ہے یا طبیب واجدِ درد نہیں ہے، یہ فقط درد کو سمجھتا ہے لیکن ممکن ہے کہ مریض درد کو بیان نہ کر سکتا ہو اور درد کی طبیب جیسی تشریح اور بلیغانہ و فصیحانہ تفسیر نہ کر سکتا ہو لیکن درد کا اثر اپنے وجود کے اندر رکھتا ہے یعنی درد کا وجود اور مریض کا وجود دونوں آپس میں ملے ہوئے ہوں، وجودِ مریض کے اندر درد موجود ہے نہ کہ مفہومِ درد موجود ہے، درد ذہن مریض کے اندر ہے اور مفہومِ درد ذہن طبیب کے اندر ہے لہٰذا اس درد سے طبیب کراہتا نہیں ہے، اس درد سے طبیب ہائے ہائے نہیں کرتا، اس درد سے طبیب کی فریادیں نہیں نکلتی ہیں، اس درد سے طبیب کرب و ابتلاء میں مبتلا نہیں ہوتا ہے، اس درد سے طبیب کی رنگت ختم نہیں ہوتی ہے، سمجھتا ہے لیکن سمجھنے کے باوجود درد اپنا اثر طبیب کے اندر ایجاد نہیں کرتا ہے، درد کے سارے آثار مریض کے اندر موجود ہیں چونکہ یہ واجدِ درد ہے اور وہ عالمِ درد ہے، طبیب کو درد سمجھ میں آ گیا ہے اور مریض نے درد کو پالیا ہے۔

جس طرح سے انسان نگاہوں سے بہت کچھ پالیتا ہے مثلاً فرض کر لیں کہ اگر ایک شخص

ہمیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہے تو اس کی نگاہوں سے ہم اپنے اندر ایک حالت پا لیتے ہیں درحالیکہ وہ بولا نہیں ہے، ہم فقط سمجھے نہیں ہیں بلکہ ہم نے اس کی آنکھوں سے کسی چیز کو پایا ہے، لمس کیا ہے، اس کی نفرت، اس کا کینہ، اس کا غصہ اور اس کا غضب ہم نے محسوس کیا ہے، لمس کیا ہے اور اس کو اپنے اندر پایا ہے یا مثلاً کہہ لیں کہ کسی شخص کے اندر محبت ہو، کسی شخص کے اندر رجحان و رغبت ہو تو اس کی نگاہوں سے ہم اپنی نسبت اس کی محبت محسوس کرتے ہیں، ہم اپنے وجود سے اس کی محبت کو لمس کرتے ہیں یعنی ہم نے اپنے وجود سے اس کی محبت کو اپنے اندر محسوس کیا ہے اور اسی کو حالتِ وجدان کہتے ہیں۔

اہلِ معرفت کے یہاں وجد ایک اصطلاح بھی ہے، یہ معنیٰ لغوی وجدان تھا، معنیٰ اصطلاحی وجدان کہ جو اہلِ معرفت کے یہاں رائج ہے، اہل معرفت سے مراد پھر وہ شعبدہ باز اور ٹھگ قسم کے لوگ ذہن میں نہ آئیں یعنی جو صوفیاء اور عرفاء کے نام سے دیواریں دوڑاتے ہیں اور طے الارض کرتے ہیں اور فلاں فلاں کام کرتے ہیں وہ مراد نہیں ہیں، مراد از عرفاء مقربین خدا ہیں یعنی جنہوں نے خدا کو پالیا ہے، جن کا ربط و اتصال ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ سے ہے، جو محو و فانی در ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں یعنی ربانی موجودات، ربانی انسان اور ربانی علماءِ عرفاء ہیں، جب اہلِ معرفت کہا جاتا ہے تو اس سے یہ عرفا مراد ہوتے ہیں۔

اہل معرفت کے سب سے کامل نمونے اور مصداق خود ائمہ اطہار علیہم السلام ہیں، ائمہ اطہار علیہم السلام نے اپنا عرفان وتصوف اس طرح سے پیش نہیں کیا ہے کہ جس طرح سے آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ

المزمل دیانا ہے، فزیکی کمانے

جس میں مرید بازی، خانقاہ بازی اور ریاضت و چلے وفلاں فلاں چیزیں شامل ہیں۔اسی شریعت ہے،اسی دین کے ذریعے سے ائمہ اطہار علیہم السلام نے لوگوں کو معرفت کی راہ کا راستہ بتادیا ہے، انہی بہترین طریقوں میں سے ایک طریقہ حضرت سید ساجدین علیہ السلام کی مناجات ودعائیں ہیں،اس سے بالاتر عرفان ابھی تک نہ بشر پیش کرسکا ہے اور نہ اس مقام ومرتبے تک پہنچ سکا ہے کہ جہاں پر عرفانِ ائمہ ھدیٰ علیہم السلام ہے۔

اللہ کو پانا ہے نہ کہ سمجھنا ہے

اسی طرح سے انسان قرآن کو یا ذاتِ خدا کو بھی پائے نہ کہ صرف سمجھے،بعض لوگ ذاتِ خدا کو خوب سمجھتے ہیں،علمائے کلام اور علمائے فلسفہ کہ جنہوں نے دلیلوں کے ذریعے سے خدا کو ثابت کیا ہے اور کئی دلیلیں قائم کی ہوئی ہیں کہ خدا ہے،ان کو خدا سمجھ آگیا ہے لیکن خدا کو پایا نہیں ہے، سمجھ کر بھی انسان دور ہوسکتا ہے،جس طرح طبیب درد کو سمجھ کر درد سے بہت دور ہے، درد کی مشکلات، درد کے وجود، درد کی حقیقت اور درد کی لذتوں سے طبیب بے بہرہ ہے چونکہ اس نے پایا نہیں ہے بلکہ فقط کتابوں سے درد کو سمجھا ہے،اسی طرح انسان اگر خدا کو کتابوں سے سمجھ جائے تو پھر بھی خدا سے دور ہی ہے اور جو خدا سے دور ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز سے دور ہے،جس طرح سے دعائے شریفِ عرفہ میں سید الشہداء علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

مَاذَا وَجَدَ مَنْ فَقَدَکَ وَمَا الَّذِیْ فَقَدَ مَنْ وَّجَدَکَ......

اس نے کیا پایا جس نے تجھے کھویا اور اس نے کچھ نہ کھویا جس نے تجھ کو پایا۔یعنی جس نے خدا کو پالیا ہے نہ کہ سمجھ لیا ہے،خدا سمجھنے والے فراواں ہیں لیکن خدا پانے والے بہت کم ہیں۔

۳)قرآن کو اپنے وجود میں اتاریں

اسی طرح جن انسان باگاہِ قرآن مجید میں مخاطبِ قرآن بنتا ہے تو یوں نہیں ہے کہ فقط سمجھ رہا ہے یعنی قرآن مفہوم بن کر، تصور بن کر، خیال بن کر اور معنی بن کر ہمارے ذہن کے اندر ہے یا قرآن ہماری معلومات اور حافظے میں موجود ہے بلکہ ہم نے قرآن کو اپنے وجود میں پانا ہے، وجود میں اتارنا ہے یعنی جو حقیقتِ قرآن، لذتِ قرآن اور جو روحِ قرآن ہے وہ ہمارے وجود میں منتقل ہو جائے، قرآن کا وجود اور ہمارا وجود ایک ہو جائے کہ جس طرح سے وجودِ درد اور وجودِ مریض ایک وجود بن گئے ہے، جب انسان قرآن کو پالے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پر قرآن کا اثر بھی ہوتا ہے، پس پہلے مخاطبِ قرآن بنے چونکہ مخاطبِ قرآن بننے سے ہم قرآن کی حقیقت کو پائیں گے اور جب حقیقت کو پائیں گے تو وہ حقیقت ہم پر اثر انداز ہوگی، اس درد کی مثال پر خوب غور کریں کہ طبیب درد شناس ہے لیکن دردمند نہیں ہے اسی طرح ممکن ہے کہ انسان قرآن شناس بن جائے لیکن قرآن اس کے وجود کے اندر منتقل نہ ہوا ہو لہٰذا یہ انسان ابھی بھی قرآن سے دور ہے۔

کبھی انسان قرآن شناس بن جاتا ہے لہٰذا تعبیرِ عربی الفاظ، قرآن کے معانی، ادبی علومِ قرآن اور دیگر علومِ متعلقاتِ قرآن کو بخوبی سمجھتا ہے حتیٰ ممکن ہے کہ آیاتِ قرآن اس نے اپنے سینے میں حفظ کرلی ہوں لیکن درعینِ حال قرآن اس کے اندر اثر نہیں کر رہا ہو کہ جس طرح سے درد طبیب کو متاثر نہیں کر رہا ہے، متاثر ہونا ضروری ہے، انسان اس وقت متاثر ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز انسان کے اندر وجوداً منتقل ہوتی ہے، اس چیز کی حقیقت انسان کے اندر منتقل ہوتی ہے اور یہ مخاطب واقع

ہوتا ہے یعنی مخاطب بھی سماعی مخاطب نہیں بلکہ وجودی مخاطب بنتا ہے۔ روحِ قرآن کے ساتھ ہماری روح ہو یعنی ہماری روح مُخاطَبْ ہو اور قرآن ہم سے مُخَاطِبْ ہو، قرآن ہم سے بات کرے اور ہماری روح اس بات کو سنے، اس طرح سے قرآن ہمارے اندر منتقل ہوتا ہے۔

٤) وجد، اہلِ معرفت کی نظر میں

اہل معرفت کے یہاں وجد ایک خاص اصطلاح ہے، عرف عام میں لوگ اس اصطلاح سے آشنا ہیں کہ خصوصاً قوالیوں کی محافل میں جب قوالی ہو رہی ہوتی ہے تو کچھ لوگ اٹھ کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں تو اس کو کہتے ہیں کہ یہ وجد میں آ گئے ہیں، وہ درحقیقت وجد نہیں ہوتا ہے، اس حالت کو وجد نہیں کہتے ہیں، وہاں درحقیقت انسان موسیقی کا ایک سرور محسوس کرتا ہے اور انسان کے اندر حالتِ طرب طاری ہو جاتی ہے، یہ وجد نہیں ہے کہ موسیقی اور تبلیغی آواز سے انسان اٹھ کر ناچنا اور گھومنا شروع کر دے۔

وجد سے مراد اسی معنیٰ لغوی سے محفوظ ہے یعنی متاثر ہونا، وجد یعنی جب انسان خداوند تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ کے قریب ہوتا ہے، ذاتِ خدا کے قریب ہوتا ہے، اسماء وصفاتِ الٰہیہ کو ملاحظہ و مشاہدہ کرتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر جب انسان معانقہ کرتا ہے، یہ ائمہ علیہم السلام کی تعبیر ہے کہ جب انسان اسماء وصفاتِ الٰہیہ کے ساتھ معانقہ کرتا ہے یعنی جب حقیقت وروحِ اسماء اللہ کے اتنا قریب ہو جاتا ہے تو اس وقت انسان کے اوپر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے، حالتِ وجد یعنی حالتِ فنا، ایسی

حالت کہ جس کے اندر انسان کے اوپر ایک بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا ہے یعنی انسان اپنے ارد گرد سے اور ہر اس چیز سے لاتعلق ہو جاتا ہے کہ جو انسان سے متعلق نہیں ہے، جیسے ماحول ہے، انسان کا اردگرد ہے۔ ابھی انسان کی ہر چیز کی طرف توجہ ہے کہ مثلاً در ہے، دیوار ہے، انسان ہے، نور ہے، اسی طرح دیگر چیزیں ہیں، اس حالت کو حالتِ صحو کہتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں حالتِ محو ہے یعنی انسان ایک ایسی کیفیت جذب کر لے، اپنی طرف کھینچ لے کہ وہ انسان کو ہر دوسری چیز سے لاتعلق کر دے۔ بعض انسان ہیں کہ ان پر مطالعہ کے اندر بھی ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں کہ جو مطالعہ بھی کر رہے ہوتے ہیں اور ہر چیز کی طرف توجہ بھی ہوتی ہے، نگاہیں کتاب پر ہیں اور دوسرے کی گفتگو بھی سن رہے ہیں، نگاہیں کتاب پر ہیں اور نیم نگاہ کسی دوسرے کے عمل پر رکھی ہوئی ہے اور ہر چیز کا جائزہ لے رہے ہوتے ہیں، یہ مطالعے میں نہیں ہیں بلکہ مطالعہ صرف ایک بہانہ اور ذریعہ ہے یا ایک مشغولیت ہے؛ یہ ہم زمان کئی مشغولیتوں میں مصروف ہیں لیکن بعض لوگ مطالعہ کے دوران مطالبِ کتاب کے اندر اس طرح سے منہمک اور محو ہو جاتے ہیں کہ اپنے ارداگرد سے بالکل کٹ جاتے ہیں اور لاتعلق ہو جاتے ہیں، ان پر ایک حالتِ بے خودی طاری ہو جاتی ہے حتیٰ اپنے آپ سے بھی لاتعلق ہو جاتے ہیں، اس عالم میں آپ ان کے جیب سے کوئی چیز نکال لیں، ان کے جیب میں کوئی چیز ڈال دیں حتیٰ آپ جسمانی طور پر ان کے وجود سے کوئی چیز ٹچ (Touch) کریں تو انہیں اصلاً سرے سے خبر نہیں ہوتی ہے چونکہ اپنی طرف توجہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود سمیت کسی مطلب دیگر کے اندر محو ہو گئے ہیں۔

بعض شعراء کے بارے میں ایسی کیفیت بیان کی جاتی ہے کہ وہ تخیل کے اس عالم میں پہنچ جاتے تھے کہ جہاں ان کو حالتِ محو و فنا پیش آتی تھی یعنی عالمِ تخیل میں اپنے ارد گرد سے بے خبر ہو جاتے تھے، اس وقت انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا مگر یہ کہ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ معمولی حالت اور آدھی حالت پر پھر واپس آجاتے تھے، پھر ارد گرد سے یعنی اپنے متعلقات سے ان کا ایک ربط برقرار ہو جاتا تھا۔

یہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے بارے میں بھی ہے مثلاً مولا علی علیہ السلام کے پاؤں سے حالتِ نماز میں تیر نکالنے کا معروف واقعہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا کہ ہم کس طرح علی علیہ السلام کے پاؤں سے تیر کو باہر نکالیں کہ تکلیف نہ ہو، حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نماز کے اندر یہ کام کرلو، یعنی نہ یہ کہ درد ہوگا، توجہ ہوگی اور امیر المومنین علیہ السلام کے اعصاب اتنے مضبوط ہیں کہ نماز باطل ہونے نہیں دیں گے بلکہ اگر آپ نے حالتِ نماز میں تیر نکال لیا تو علی علیہ السلام کو واقعاً پتہ ہی نہیں چلے گا اور ایسا ہی ہوا، لوگوں نے تیر نکال لیا اور امیر المومنین علیہ السلام کو محسوس تک نہیں ہوا، کیوں؟ اس لئے کہ وہ حالتِ محو تھی، یہ ربط بخدا و اتصال بخدا ہے، اس عالم میں انسان ارد گرد سے متعلق نہیں ہوتا ہے، یہ بے خودی کی حالت ہے اور جب انسان خدا کو پالیتا ہے تو اس پر یہ حالتِ بے خودی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ اس وجہ سے طاری ہوتی ہے کہ انسان متاثر ہوتا ہے اور انسان کے اندر قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، دل جب سخت ہو جاتا ہے اور اس میں قساوت و شقاوت آجاتی ہے تو قبول کرنا چھوڑ دیتا ہے، متاثر ہونا چھوڑ دیتا ہے۔

۵)متاثر ہونا کمال کی علامت

بعض لوگ متاثر نہ ہونے کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، دلِ کامل وہ ہے کہ جو بہت متاثر ہوتا ہو، ممکن ہے کہ ہم کمال اس کو سمجھتے ہیں کہ جو سرے سے متاثر نہیں ہوتا ہے، جس کے سامنے گھنٹوں گفتگو کی جائے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا کامل انسان ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ یہ شقی ترین اور قسی القلب ترین انسان ہے، جو متاثر نہ ہو، جو مناظر دیکھ کر متاثر نہ ہو، جو موعظہ سن کر متاثر نہ ہو، جو قرآن سن کر متاثر نہ ہو، جو قرآن پڑھ کر متاثر نہ ہو یا جو کسی اثر انداز چیز کے مقابلے میں بھی سختی دکھائے تو وہ دل پتھر کی طرح ہے، جس طرح سے پتھر کو آپ جو بھی منظر دکھائیں تو وہ پتھر کبھی کسی سے متاثر نہیں ہوتا ہے، دل بھی کبھی ایک جماد کی طرح ہو جاتا ہے اور قرآن نے بھی کہا ہے کہ

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً...... (۴)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت...

حالانکہ پتھر بسا اوقات نرم ہو جاتے ہیں، متاثر ہو جاتے ہیں لیکن دل اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ سرے سے متاثر نہیں ہوتا ہے۔ اپنے دل کی طرف سے ہرگز غفلت نہ برتیں بلکہ ہمارا دل نرم ہو، خاشع ہو یعنی اثر قبول کرے، نرم دل یعنی قبول کرنے والا دل، متاثر ہونے والا دل، ہم اپنے اندر یہ صلاحیت بڑھائیں۔

٦)ہر چیز سے متاثر ہونا ضعف ہے

متاثر ہونا کمزوری نہیں ہے لیکن اس چیز سے متاثر ہوں کہ جو متاثر کن ہے نہ کہ ہر چیز سے متاثر ہوں۔ ہر چیز سے متاثر ہونا ضعف کی علامت ہے مثلاً بعض اوقات سردی نہیں ہوتی ہے لیکن بعض کانپ رہے ہوتے ہیں تو یہ بیماری اور ضعف ہے، ممکن ہے کہ جسم کے اندر ملیریا ہے یا کوئی اور بیماری ہے کہ سردی کے بغیر کانپ رہے ہیں لیکن سردی سے کانپنا جسم کی سلامتی کی علامت ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس کا جسم سُن نہیں ہے، بے حس نہیں ہے بلکہ سالم جسم ہے، اسی طرح گرمی میں بدن کو گرمی لگنا، پسینہ آنا سلامتی جسم کی علامت ہے اور اگر شدید گرمی ہو لیکن جسم کو پسینہ نہ آرہا ہو تو یہ گرمی سے متاثر نہیں ہو رہا ہے، اس کے معانی یہ ہیں کہ یہ جسم بیمار ہے، ضعیف ہے، اس میں مرض یعنی ضعف ہے، اسی طرح سے دل بھی ہے۔

بعض دل ایسے ہیں کہ جو متاثر نہ کرنے والی چیزوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں لہٰذا یہ ضعفِ دل ہے، کمزوریٔ دل ہے مثلاً خوف آجانا، اس دشمن سے ڈر جانا کہ جس سے نہیں ڈرنا چاہئے، اس چیز سے ڈرنا کہ جس سے نہیں ڈرنا چاہئے مثلاً چوہے سے ڈر جانا، لال بیگ سے ڈر جانا، مکھی، مچھر سے ڈر جانا، حشرات سے ڈر جانا ضعف ہے لیکن جن چیزوں سے خوف کھانا چاہئے، خشیت ہونا چاہیے، ان سے ڈرنا سلامتیٔ دل ہے، جن چیزوں کے مقابلے میں دل کو مقاومت کرنی چاہئے ان کے خلاف مقاومت کرنا سلامتیٔ دل کی علامت ہے، یعنی یہ قلبِ سلیم ہے۔

قلبِ سلیم یعنی جہاں متاثر ہونا چاہئے وہاں متاثر ہوتا ہے اور جن چیزوں سے متاثر نہیں

ہر چیز سے متاثر ہونا ضعف ہے

ہونا چاہئے وہاں متاثر نہیں ہوتا ہے۔ خدا سے متاثر ہوتا ہے، عبادتِ خدا سے متاثر ہوتا ہے، خوفِ خدا سے متاثر ہوتا ہے، قربِ خدا سے متاثر ہوتا ہے لیکن دنیا کو دیکھ کر متاثر نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کو دیکھ کر جن لوگوں کی رال ٹپک جاتی ہے وہ یہ نہ کہیں کہ دنیا دیکھ کر متاثر ہونا بھی دل کا ایک کمال ہے بلکہ یہ دل کا ضعف ہے، جس چیز سے متاثر نہیں ہونا چاہئے اس سے متاثر ہونا دل کا ضعف ہے، حسن و جمال دیکھ کر متاثر ہونا خوب ہے لیکن قباحت دیکھ کر متاثر ہونا بیماریٔ دل ہے، ضعفِ دل ہے کہ انسان غلاظت دیکھ کر متاثر ہو جائے، دنیا کی مثال امیر المومنین علیہ السلام نے یہی بیان کی ہے کہ دنیا مانندِ غلاظت ہے، غلاظتوں سے انسان متاثر نہیں ہوتا ہے۔ پس اگر دل متاثر ہو یعنی اثر قبول کرنے والا دل ہو اور خواہ نہ خواہ کسی قوی چیز کے مقابلے میں آ کر جب اس سے اثر قبول کرتا ہے تو اس کے اوپر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے، وجد یعنی بے خودی کی حالت طاری ہوتی ہے، پھر یہ ارد گرد سے کٹ جاتا ہے حتیٰ اپنے آپ سے بھی کٹ جاتا ہے، اپنی طرف اس کی توجہ نہیں رہتی ہے اور یہ اسی شے کے اندر محو ہو جاتا ہے کہ جس نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

۷) وجد، شوق کی ایک حالت

متاثر دل اور وجد کی حالت کیلئے فرماتے ہیں کہ یہ شوق کی ایک حالت ہے، شوق ایک نوعِ رغبت ہے، ایک تعلق و طلب ہے، رجحان کا نام شوق ہے۔ بعض چیزیں ہیں کہ جن کا ہمیں شوق ہے، شوق سے مراد یہ ہے کہ ہمارے وجود کے اندر ان اشیاء کی نسبت ایک رغبت اور رجحان موجود ہے

لیکن کچھ چیزوں کا ہمیں شوق نہیں ہے یعنی ہمارا دل ان سے لاتعلق ہے، کوئی چیز ہمیں کھینچ نہیں رہی ہے یعنی کشش نہیں ہے، اس کتاب میں صاحبِ کتاب مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح سے مقناطیس کے اندر مقناطیسیت ہوتی ہے اور وہ لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے، لوہے کے اندر شوق موجود ہے، لوہا مقناطیس کا مشتاق ہے لیکن یہ شوق لوہے کے اندر کیسے پیدا ہوتا ہے کہ جہاں مقناطیس ہو یہ کھنچتا ہوا اس کی طرف چلا جاتا ہے اور جا کر اس کے وجود سے مرتبط ہو کر اس سے متصل ہو جاتا ہے۔ کمال کی وجہ سے، قوت کی وجہ سے اور جاذبے کی وجہ سے مقناطیس کے اندر کشش موجود ہوتی ہے اور جو اس کشش اور جاذبے کے اندر آ جائے اس کے اندر شوق پیدا ہو جاتا ہے، شوق ہمیں انہی چیزوں کا پیدا ہوتا ہے کہ ہم جن کے جاذبے کی مدّ میں آ چکے ہیں، فرض کریں کہ مقناطیس کے جاذبے کی جو مدّ ہے یا جس طرف اس کا رخ ہے اس راستے میں اگر لوہا آ جائے تو جاذبۂ مقناطیس میں آ کر اس میں شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ مقناطیس کی طرف دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے لیکن جو لوہا اس سمت میں نہ ہو یا حجاب کے پیچھے ہو یعنی اس مدّ سے باہر ہو کہ جہاں یہ لوہا نہیں کھنچتا ہے تو اس لوہے کے اوپر وجد کی کیفیت طاری نہیں ہوتی ہے۔

وجد، شوق کی ایک حالت

اسی لئے انسان جب بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں جائے تو مرکبِ شوق کے ساتھ جائے، قرآن بارگاہِ خدا ہے، کلامِ خدا ہے، متکلم ذاتِ خدا ہے، ہم مخاطبِ قرآن بنیں، نہ فقط قاری و حافظِ قرآن، اجنبی بن کر کبھی بھی قرآن نہ پڑھیں، کتبِ روایات میں آیا ہے کہ

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۵)

كَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(٦)

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(٧)

یعنی بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے۔

یہ جو مُردوں کے لئے اجارے پر قرآن پڑھتے ہیں کہ ایک ٹائم کا کھانا مل جائے گا یا آپ مردے کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن پڑھ لیں تو اتنے پیسے مل جائیں گے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انسان اجنبی بن کر قرآن پڑھ رہا ہے، اسی کو اگر اور پیسے دو کہ یہ کسی سکھ کے لئے گرنتھ پڑھ دے تو یہ جا کر ڈبل پیسوں میں گرنتھ پڑھ دے گا،، جیسے وہ ملحد مولوی ہے کہ جو حافظ قرآن بھی ہے اور بچوں کو قرآن بھی پڑھاتا ہے، جمعہ بھی پڑھاتا ہے لیکن بغیر وضو کے اور جب اسے کہتے ہیں کہ یہ کام کیوں کرتے ہو تو کہتا ہے کہ یہ میری جاب (Job) ہے، یہ میری نوکری ہے، جس طرح سے دوسرے لوگ صبح آفس جاتے ہیں اور نوکری کرتے ہیں اسی طرح یہ قرآن پڑھنا، جمعہ پڑھانا، جماعت کروانا اور یہ سارے کام کرنا میری ڈیوٹی (Duty) میں شامل ہیں، حفظ بھی میں نے اسی طرح کیا ہے کہ جس طرح سے تم انگلش پڑھتے ہو اور جس طرح سے عربی ٹیچر اسکول میں جاب کرتا ہے اسی طرح سے میں بھی ایک جاب کر رہا ہوں۔

اسی طرح بعض لوگوں نے قرآن پڑھنا اور مردوں کے اوپر قرآن پڑھنا ایک پیشے کے طور پر، ایک پروفیشن (Profession) کے طور پر اپنایا ہوا ہے حتیٰ زندوں پر قرآن پڑھنا بھی بعض لوگوں کی جاب ہے، قرآن اسی لئے سیکھا ہے، اچھی دھن میں آکر قرآن پڑھتے ہیں اور معاوضہ

وجد، شوق کی ایک حالت

لے کر قرآن پڑھتے ہیں کیونکہ یہ ان کی جاب ہے، اس طرح انسان اجنبی بن کر قرآن پڑھتا ہے تو قرآن اس پر لعنت کرتا ہے۔

مخاطبِ قرآن بنیں، اجنبی نہ بنیں، فقط راویٔ قرآن و مخبرِ قرآن نہ بنیں، فقط مخارج اور قواعدِ تجوید کو ملحوظ نہ رکھیں بلکہ مخاطَبِ قرآن بنیں، مخاطبِ قرآن بننے کے بعد دل بھی خاشع ہو، نرم ہو اور پاک ہو کہ جو آدابِ سابقہ میں بیان کیا ہے، انہی کے تحت انسان کا دل بھی آمادہ ہے، انسان جب قرآن کے اندر آتا ہے تو قرآن مقناطیس کی طرح ہے، قرآن کے اندر جاذبہ ہے، کشش ہے، شدید کشش قرآن کے اندر موجود ہے، اگر دل بھی لوہے کی طرح صاف ہو، اس پر زنگ نہ لگا ہو اور ایسا دل اس جاذبے کے اندر آجائے تو یہ جاذبہ انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جب انسان قرآن کے جاذبے میں آجاتا ہے تو اس پر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے، اس کے اوپر حالتِ تاثر طاری ہوتی ہے، اس وقت انسان غیرِ قرآن سے لاتعلق ہو جاتا ہے اور کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہیں ہوتی ہے، اسی حالت کو بے خودی کی حالت کہتے ہیں لہٰذا جب انسان جاذبے میں آجاتا ہے، کسی شوق میں آجاتا ہے تو اس وقت انسان کے اوپر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے۔

۸)حالتِ وجد کے اثرات

اگر قرآن پڑھتے ہوئے حالتِ وجد طاری ہو تو اس کے اپنے آثار ہیں، ریاکاری نہ کریں مثلاً بسا اوقات دیکھا ہے کہ آپ قرآن سنتے ہیں اور لوگ جھوم رہے ہوتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ سُر پر

جھوم رہے ہوں نہ کہ معانی پہ، ایک اچھا قاری یہی آیت پڑھے تو جھومتے ہیں اور ایک بے سُر قاری جب یہی آیت پڑھے تو پھر نہیں جھومتے ہیں اسکے معانی یہ ہیں کہ دھن پہ جھوم رہے ہیں، معانی پہ نہیں جھوم رہے ہیں، اگر قرآن سادگی سے پڑھا جائے نہ کہ ساتھ اس کی لے یا دھن بھی اتنی اچھی ہو کہ وہ متاثر کن ہو تو پھر انسان کیوں نہیں جھومتا ہے؟ بعض موسیقیت کچھ چیزوں کے اندر اتنا شدید اثر دکھاتی ہے کہ انسان خود اپنے قابو سے باہر نکل جاتا ہے اور اپنے آپ کو کنٹرول (Control) میں نہیں رکھ سکتا ہے، بعض نغمات میں اتنی شدید موسیقیت موجود رہتی ہے، ان نغموں کی تاثیر ہے اور ان دھنوں کا ایک اثر ہے۔

بعض موسیقی شناس افراد کے بقول بعض راگ اور راگنیاں اس طرح کی ہیں کہ وہ آگ لگا دیتی ہیں، گانے والا اگر اس سطح کے راگ ادا کر سکے یا وہ راگنی گائکی میں گا سکے تو ماحول میں آگ لگا سکتا ہے۔ اب دوسری اشیاء کو آگ لگائے یا نہ لگائے لیکن دلوں کو آگ لگا دیتا ہے یا افراد کو اپنی جگہ سے اٹھا دیتا ہے، جذب کر لیتا ہے، یہ تاثر نہیں ہے، یہ موسیقیت، نغمے یا اس دھن کا اثر ہے کہ وہ لوگ راگ اور راگنی سے متاثر ہو رہے ہیں، ممکن ہے کہ یہ راگ کسی گانے پر فٹ (Fit) ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ راگ کسی قصیدے پر فٹ ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ راگ قرآن کی آیات پر فٹ ہو جائے، راگوں سے انسان متاثر نہ ہو بلکہ معانیٔ قرآن سے متاثر ہو، یہ معانی جب انسان کے دل میں اترتے ہیں تو روحِ قرآن یعنی ان معانی کو سن کر انسان کے اوپر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

پہلے درج کیا تھا کہ مسانخت و مناسبت قرآن کے لئے ضروری ہے، جب تک انسان

مسانخ با قرآن نہ ہو، دل کو نورانی نہ بنائے اور دل کو قرآن کے ساتھ مناسبت نہ دے تو انسان اس سے متاثر نہیں ہوتا ہے، وجد اس وقت طاری ہوتا ہے کہ جب انسان معانیٔ قرآن کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دل بھی متاثر ہونے والا دل ہوتا ہے۔قرآن کے الفاظ، قرآن کے معانی اور قرآن کا نور شدید متاثر کن ہیں اور فطرتاً انسان کا دل بھی متاثر ہونے والا دل ہے، قرآن شدید التاثیر ہے اور دل شدید التاثر ہے، مثلاً فرض کریں کہ ایک لیمپ ہے کہ جس کے اوپر کور (Cover) اسی وجہ سے ہے کہ آنکھیں شدید نور کو ڈائریکٹ (Direct) برداشت نہیں کرسکتی ہیں، آنکھوں میں متاثر ہونے کی شدید صلاحیت ہے اور اس کے اندر متاثر کرنے کی شدید صلاحیت ہے، معمولی ٹیوب لائٹ کی طرف ہم نگاہ کرسکتے ہیں، سو، دو سو واٹ (Watt) کے بلب کی طرف ہم نگاہ کرسکتے ہیں لیکن جب ہزار واٹ سے اوپر روشنی چلی جائے تو اس کی طرف ہم ایک نگاہ بھی اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے ہیں چونکہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اس نور کی تاب نہیں لاسکتی ہیں۔

اسی طرح سے دل اور نورِ قرآن ہے، جو دل متاثر ہونے کے لئے آمادہ ہیں وہ نورِ قرآن کو برداشت کرسکتے ہیں اور نورِ شدیدِ قرآن ان کے اوپر اترتا ہے، اس وقت ان کے اوپر حالتِ شوق و حالتِ وجد طاری ہوتی ہے اور وہ جاذبۂ قرآن کے اندر آجاتے ہیں، کششِ قرآن کے اندر آجاتے ہیں اور حالتِ محوان کے اوپر طاری ہوجاتی ہے، اس کی علامت یہ نہیں ہے کہ میں اب ریاکاری کے طور پر اپنے اوپر زبردستی حالتِ وجد طاری کرلوں، یہ ریاکاری کی چیزیں نہیں ہیں، وجدان و وجد اور کشش و شوق میں انسان ریاکاری نہیں کرسکتا ہے، شوق اپنا پتہ خود بتاتا ہے،

حالتِ وجد کے اثرات

مشک آن است که خود ببوید نه آنکه عطار گوید.

یعنی جس خوشبو کی تعریف عطار کرے، خوشبو بیچنے والا کرے وہ خوشبو نہیں ہے، صحیح خوشبو وہ ہے جو خوشبو خود بتائے کہ میں خوشبو ہوں۔

اسی طرح سے شوق وہ ہے جو اپنا پتہ خود بتاتا ہے کہ یہ شوق ہے، جیسے عشق و محبت ہے، عشقِ الٰہی و محبتِ الٰہی قابلِ ریا نہیں ہے بلکہ محبت اپنا پتہ خود بتاتی ہے، ماں کو بچے سے محبت ہے، یہ محبت مشک ہے، یہ خود بتاتی ہے کہ یہاں محبت ہے لیکن بسا اوقات انسان مصنوعی محبت کرتا ہے، مصنوعی محبت کی ریا کاری کرتا ہے لیکن تھوڑے عرصے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ یہ جھوٹی اور کاذب ہے، حقیقی عشق و محبت اپنا پتہ خود بتاتے ہیں، عشق و محبت بھی ایک جاذبے کا نام ہے، اگر ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا کمال ہے، محبت محبّ کا کمال نہیں ہے، محبت محبوب کا کمال ہے، محبّ کی ساری خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو محبوب کی کشش کے بیچ میں لا کر کھڑا کیا ہے، جس طرح لوہا اگر مقناطیس کی طرف جا رہا ہے اور مقناطیس میں غرق ہے تو جاذبہ مقناطیس میں ہے اور لوہا عشقِ مقناطیس میں اسی کی طرف جا رہا ہے اور کھنچا ہوا ہے تو یہ کمالِ مقناطیس ہے نہ کہ کمالِ آہن ہے، یہ فولاد کا کمال نہیں ہے بلکہ اس کا سارا ہنر یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس جاذبے میں قرار دیا ہے اور جاذبے سے اپنے آپ کو ہٹا کر نہیں رکھا ہے وگرنہ دوسری چیزیں بھی ہیں مثلاً لکڑی ہے کہ وہ مقناطیس کے جاذبے میں نہیں ہے کیونکہ ادراکِ جاذبہ اس کے اندر نہیں ہے۔ اسی طرح محبوب کے اندر کشش موجود ہوتی ہے کہ جو محبّ کو اپنی طرف کھینچتا ہے، معشوق کے اندر کشش موجود ہوتی ہے کہ جو عاشق کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

۹)عشق،اصطلاحِ دینی

عشق کششِ شدید کا نام ہے اور محبت اسی کششِ معمولی کا نام ہے، محبت جب بڑھ جائے اور اس قدر بڑھ جائے کہ انسان کے پورے وجود پر چھا جائے تو اسی کو عشق کہتے ہیں البتہ عشق و شہوت میں فرق ہے، لفظِ عشق کا زیادہ استعمال شہوت رانوں نے کیا ہے اور متدینین ابھی عشق کے لفظ سے ڈرتے ہیں بلکہ عشق کا لفظ استعمال کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ کہیں ایمان ہی دور نہ ہو جائے مثلاً فرشتہ بھی قریب نہ آئے۔

عشق دینی معارف میں سے ہے، یہ دینیاتی موضوع ہے، عشق اصطلاحِ دینی ہے، عشق کا لفظ یہاں سے اٹھا کر شہوت رانوں نے اپنے لئے چرا لیا ہے، اس کو دینداروں سے چھین لیا ہے چونکہ یہ دین دار نہیں تھے بلکہ خشک تھے، ان کے پاس جاذبے والا دین نہیں تھا، ان دین داروں نے ایسا مذہب اپنا لیا کہ جس کے اندر سرے سے جاذبہ نہیں تھا بلکہ جس کے اندر محض خشکی تھی لہٰذا وہ عاشقانہ مذہب انہوں نے ترک کر دیا اور عاشقانہ مذہب کے بجائے ان کو تاجرانہ مذہب، معادلے والا، تبادلے والا، تجارت والا، لین دین والا مذہب زیادہ پسند آیا، کیلکیولیٹر (Calculator) والا کہ اِدھر نماز پڑھی اور اُدھر حساب کیا، ایک کے دس برابر، ایک کے نو برابر، ایک کے اتنے برابر کہ جیسے یہ عشق کا مذہب نہیں ہے۔ عاشقانہ مذہب کربلا کا ہے، عاشقانہ مذہب سید الشہداء علیہ السلام کا ہے، عاشقانہ مذہب امیر المومنین علیہ السلام کا ہے، عاشقانہ مذہب اور ہوتا ہے اور تاجرانہ مذہب اور ہوتا ہے، عاشقانہ مذہب میں عاشق معشوق کے جاذبے میں گرفتار ہوتا ہے لیکن تاجرانہ مذہب میں اس معشوق

کی نعمت میں گرفتار ہوتا ہے نہ کہ اس ذات کے جاذبے میں گرفتار ہوتا ہے۔

۱۰)انسان پر قرآن کی مقناطیسیت کی علامات

قرآن کلامِ خدا ہے اور جب انسان جاذبۂ خدا میں آ جاتا ہے، جاذبہ یعنی کشش، جب انسان اس کشش میں آ جاتا ہے تو کلامِ خدا میں اس کیلئے مقناطیسیت پیدا ہوتی ہے اور وہ انسان کو کھینچتی ہے، اگر واقعاً اسکے لئے کشش حقیقی ہے تو اس کی اپنی علامتیں ہیں، اس کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ آیہ بہ آیہ، ایک آیت سے دوسری آیت میں پہنچتا ہے، ایک مطلب سے دوسرے مطلب میں پہنچتا ہے۔ آیات چونکہ متنوع یعنی طرح طرح کی ہیں اور موضوع کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں یعنی قرآن میں مسلسل ایک ہی طرح کی آیات نہیں ہیں کہ مثلاً جیسے خوف کی آیات ہیں، جس طرح سے ابھی موضوعی تفسیر کرتے ہیں کہ خوفِ قرآن، خوف در قرآن، خوف کی ساری آیات یکجا نکال کر پیش کرتے ہیں اور انسان کو یوں لگتا ہے کہ بس خوف ہی خوف ہے اور اس کے ساتھ کوئی بشارت نہیں ہے، قرآن کا یہ انداز نہیں ہے بلکہ قرآن میں خوف ہے تو ساتھ تسلی بھی ہے، بشارت ہے تو ساتھ انذار بھی ہے مثلاً قرآن تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے، تھوڑی سختی دکھاتا ہے پھر قرآن تھوڑی محبت دکھاتا ہے، ساتھ ہی وعدہ دیتا ہے اور ساتھ ہی وعید دیتا ہے یعنی اس طرح سے محبت آمیز طریقے سے قرآن نے انسان کو اپنی طرف جذب کیا ہے، جب ان متنوع آیات میں انسان قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہے تو ہر آیہ کے بعد انسان کا عکس العمل اسی آیہ کے متناسب ظاہر ہوتا ہے۔

انسان پر قرآن کی مقناطیسیت کی علامات

آیۂ بشارت میں انسان کا عکس العمل کچھ اور ہوتا ہے، آیۂ وعد میں کچھ اور ہوتا ہے، آیۂ خوف میں کچھ اور ہوتا ہے، یعنی ہر آیہ کے متناسب انسان کے وجود میں اثر ظاہر ہوتا ہے، سب سے پہلے اس کی رنگت پہ اثر ظاہر ہوتا ہے، چہرے پر اثر ظاہر ہوتا ہے البتہ جو روح کا اثر ہے وہی چہرے پر منعکس ہوتا ہے چونکہ چہرہ غمازِ روحِ انسان ہے، جس طرح سے ہماری روح، جس طرح سے ہمارا دل اثر قبول کرتا ہے تو وہی چہرہ بتا رہا ہوتا ہے، چغلی کھا رہا ہوتا ہے اور سب کو بتا رہا ہوتا ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے، جیسے بیٹھے بیٹھے کسی کو خوف آ جائے تو ہم یہ خوف سب سے پہلے اس کے چہرے پر پڑھتے ہیں، اس کی نگاہوں سے پڑھتے ہیں، درحقیقت چہرہ خوف زدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ روح خوف زدہ ہوتی ہے لیکن چونکہ چہرہ روح سے مربوط ہے لہٰذا فوراً بتا رہا ہے کہ اس کو خوف آ گیا ہے یا اگر بیٹھے بیٹھے کسی کو کوئی خوشخبری سنائی جائے تو سب سے پہلے ہم اس کے چہرے سے سمجھتے ہیں کہ یہ خوشی اس کی روح میں آئی ہے چونکہ چہرے نے اس کی روح کی غمازی کی ہے۔

حالتِ سرور و حالتِ بہجت و حالتِ انبساط اس انسان کی روح میں اور دل میں موجود ہے لہٰذا آیاتِ ابتہاج میں انسان مبتہج ہوتا ہے، آیاتِ سرور میں مسرور ہوتا ہے، آیاتِ غم میں غمگین ہوتا ہے یعنی آیت بہ آیت اثر قبول کرتا ہے، جس طرح سے جاذبہ ہے کہ ایک چیز نے اپنی طرف کھینچا ہوا ہے، اب انسان کا اختیار قرآن کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسان کے اپنے اختیار میں ہے، کہیں پر انسان خوش ہوتا ہے، کہیں پر غمگین ہو جاتا ہے، یہ جاذبۂ قرآن ہے کہ جو انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے، بعض روایات اس چیز کی طرف اشارہ کرتی ہیں مثلاً ایک نمونہ نہج البلاغہ میں ہے کہ قرآن کو جاذبہ سے سننا

انسان پر قرآن کی مقناطیسیت کی علامات

یعنی مُخَاطَبْ بن کر سننا نہ کہ سامعین بن کر سننا۔ سامعین میں اور مخاطبین میں بہت فرق ہے اور مخاطبین میں بھی وہ لوگ جو آمادہ دل کے ساتھ سنتے ہیں، جو ہر چیز کو پالیتے ہیں اور جن پر وجد طاری ہوتا ہے یعنی جو کچھ انہیں بتایا جاتا ہے اس کو پار ہے ہوتے ہیں نہ کہ صرف سُن اور سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

۱۱) کسی چیز کو پانے اور سمجھنے میں فرق

کچھ چیزیں پانے کی ہوتی ہیں، فرض کریں کہ آپ کسی کو محبت پیش کر رہے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ میں آپ کی محبت سمجھ رہا ہوں، محبت سمجھنے کی چیز نہیں ہے یا آپ کسی کو خوف دلا رہے ہیں اور وہ کہے کہ مجھے خوف سمجھ میں آرہا ہے، خوف تو سمجھنے کی چیز نہیں ہے، خوف طاری کرنے کی چیز ہے۔ خوف وجود کے اندر اتارنے کی چیز ہے، خوف پانے کی چیز ہے یا آپ کسی کے سامنے کوئی لذت پیش کریں اور وہ کہے کہ میں اس لذت کو سمجھ رہا ہوں، لذت تو سمجھنے کی چیز نہیں ہے، لذت ذہنی چیز نہیں ہے بلکہ لذت وجودی چیز ہے کہ جو انسان کے وجود کے اندر محسوس ہو یعنی انسان قوتِ لامسہ کے ذریعے سے اس طرح مخاطب بنے کہ پائے یعنی مخاطبِ سماعی نہ ہو، مخاطبِ لفظی نہ ہو بلکہ مخاطبِ وجودی ہو، روحِ انسان مخاطبِ قرآن ہو، روحِ قرآن روحِ انسان سے مخاطِب ہو، روحِ انسان روحِ قرآن کی مخاطَب ہو، روح روح کے ساتھ رابطہ رکھے نہ کہ فقط انسان کانوں سے قرآن کا مخاطبِ سماعی بن جائے یعنی کوئی ایک پڑھے اور ہم کانوں سے سنتے جائیں لیکن روح کے سامنے وہ روحِ قرآن پیش نہ کریں اور نہ ہماری روح اس کو دریافت کرنے کے لئے حاضر ہو، روح کے ساتھ جو چیز سنی جائے،

مخاطب بن کر جو چیز سنی جائے تو اس وقت وجد و جذبہ کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

۱۲)معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

جن لوگوں پر بہت زیادہ جذبہ وفنا کی کیفیت طاری ہوتی ہے ان کے لئے سنبھلنا اور مشکل ہے، جن لوگوں کو ابھی اور ہنسنا ہے اور کھیلنا کودنا ہے، ابھی اور لذتیں اٹھانی ہیں وہ اپنے اندر یہ حالت ایجاد نہ کریں چونکہ یہ حالت انسان کو پریشان کرتی ہے اور اگر شدید ہو جائے تو انسان کو مزید پریشان کرتی ہے اور شاید انسان اس دنیا سے ہی گزر جائے۔

نہج البلاغہ میں ایک خطبہ بنامِ خطبۃ الھمّام ہے، ہمام ایک شخص ہے کہ جس نے امیر المومنینؑ کے پاس آکر تقاضا کیا کہ آپ میرے لئے حقیقتِ تقویٰ بیان فرمائیں، یہ خطبہ بارہا سب نے پڑھا ہوا ہے، اس کی تفسیریں بھی ہوئی ہیں اور اس پر تقریریں بھی ہوتی ہیں، مطالب بھی بیان ہوتے ہیں اور یہ اخلاقیات کا ایک اصلی موضوع واقع ہوا ہے، امیر المومنین علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تقویٰ اچھی چیز ہے، متقی بنو، اچھے کام کرو، خدا حافظ، اس نے کہا کہ یہ تو بات نہیں بنی، مزید بیان کریں، ایسا نہیں تھا کہ امیر المومنین علیہ السلام کا حوصلہ نہیں تھا کہ اس وقت تھکے ہوئے تھے یا معاذ اللہ خستہ تھے اور چاہتے نہیں تھے بلکہ امیر المومنین علیہ السلام یہ دیکھ رہے تھے کہ آیا اس کی عطش حقیقی ہے یا کاذب ہے؟

بعض اوقات ہوتا ہے کہ پیاس نہیں ہوتی ہے لیکن شربت کا رنگ بہت اچھا ہوتا ہے لہٰذا پینے کو جی کرتا ہے، نہ کہ پیاس یا اشتہا کی وجہ سے بلکہ اس وجہ سے کہ شربت بنا ہوا ہے اور ظاہراً بہت

اچھا لگ رہا ہے، پیاس تو نہیں ہے لیکن انسان چاہتا ہے کہ اگر کوئی گلاس بھر کر دے دے تو اس کے دو گھونٹ پی لے۔

جیسے بچے عموماً سبیلوں پہ جاتے ہیں، حالانکہ پیاسے نہیں ہوتے ہیں لیکن وہ چسکے کے لئے اپنے اندر کاذب عطش پیدا کرتے ہیں اور لائن میں کھڑے ہو جاتے ہیں، گلاس لے کر دو گھونٹ بھرتے ہیں اور مزہ نہیں آتا تو آدھا گلاس وہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، یہ کاذب عطش ہے، جھوٹی پیاس ہے کہ جو مصنوعی طور پر اپنے اوپر طاری کی گئی ہے، اگر انسان کے اندر حقیقی پیاس ہو تو پھر وہ رنگتِ شربت کو نہیں دیکھتا ہے کہ کونسا پانی ہے؟ کونسا پانی نہیں ہے؟ منرل واٹر (Mineral water) ہے یا دوسرا واٹر ہے؟ مثلاً قم کا کھارا پانی ہے یا میٹھا پانی ہے یا اگر روزہ رکھا ہوا ہے اور دن کو شدید گرمی اور پیاس ہے تو پھر شام کو روزہ افطار کرتے ہوئے کوئی یہ نہیں پوچھتا ہے کہ یہ کھارا پانی ہے یا میٹھا پانی ہے، اس وقت کہتا ہے کہ پانی ہونا چاہئے کہ جس سے پیاس بجھ جائے، اگر آپ وہ پانی پی کر اس سے کہیں کہ یہ تو قم کا کھارا پانی تھا تو کہتا ہے کہ مجھے محسوس نہیں ہوا چونکہ انسان کو واقعاً پیاس تھی، جب پیاس نہیں ہوتی ہے تو پھر میٹھا پانی بھی کھارا لگنا شروع ہو جاتا ہے، کہتا ہے کہ پانی میں کچھ ہے، پانی میں اس لئے کچھ ہے چونکہ پیاس نہیں ہے، آپ نے ایسے ہی دکھانے کے لئے پی لیا ہے، بعض اوقات شربت کی رنگت دیکھ کر انسان جذب ہو جاتا ہے۔

مثلاً سنا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں، چلو ایک دن ان کے پاس جاتے ہیں اور مجلس و محفل میں بیٹھتے ہیں کہ کیا کہتے ہیں؟ یہ عطشِ کاذب ہے، اس لئے امیر المومنینؑ

نے پہلے دیکھا کہ واقعاً اس کے اندر عطش ہے یا نہیں ہے، یوں نہیں کہ جو بھی آیا اور آ کے بولا کہ مولا کچھ بیان فرمائیں اور مولا علیہ السلام فوراً تفصیلاً بیان کرنا شروع کر دیں لہٰذا امیرالمومنین علیہ السلام نے یہ دیکھنا چاہا کہ اس کے اندر تقویٰ کی خواہش ہے یا نہیں ہے، دل آمادہ ہے یا نہیں ہے، اس کے اندر ہے خشوع ہے یا نہیں ہے، متاثر ہونے کی صلاحیت ہے یا نہیں ہے، دو دفعہ حضرت علیہ السلام نے اس کو سرسری جواب دیا، جسے اجمالاً کہتے ہیں یعنی گول مول، ایسے ہی مُجمل جواب دیا کہ یہ کسی طریقے سے ٹل جائے لیکن وہ نہیں ٹلا اور اصرار کرتا رہا، عطشِ کاذب انسان کو ٹھہرنے نہیں دیتی جیسے عموماً درسوں میں عطشِ کاذب لے آتی ہے لیکن تھوڑا سا سخت درس ہوا تو انسان وہیں پر چھوڑ جاتا ہے، وہیں پر پتہ چل جاتا ہے کہ اس میں عطشِ کاذب تھی۔

فرض کریں کہ ہم استاد کے پاس جاتے ہیں اور ایک دفعہ تقاضا کرتے ہیں کہ آغا آپ ہمیں درس پڑھائیں، وہ عذر ظاہر کرتا ہے کہ نہیں پڑھا سکتا ہوں تو ہم کہیں کہ ٹھیک ہے نہیں پڑھانا ہے تو نہیں پڑھاؤ ہمارے پاس بھی پڑھنے کے لئے ٹائم نہیں ہے، تھوڑے استاد تو نہیں ہیں کسی اور کے پاس جا کر پڑھ لیں گے، اس کے معانی یہ ہوئے کہ عطشِ کاذب ہے، اگر عطشِ صادق ہوتی تو ہم اصلاً ٹلنے والا نہ ہوتے یا مثلاً ہم واقعاً سخت پیاسے ہیں اور راستے میں افطار کا ٹائم ہو گیا ہے لہٰذا کسی جگہ سبیل پر ہم آغا سے کہتے ہیں کہ پانی دو اور وہ آپ کو کہے کہ آپ کو پیاس ہی نہیں ہے پھر ہم وہاں پر اپنی پیاس ثابت کرتے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات یعنی اپنے پورے وجود سے بتاتے ہیں کہ ہم پیاسے ہیں اور جب اس کو معلوم ہو جائے کہ واقعاً پیاسا ہے تو وہ سبیل کا منہ کھول دیتا ہے، اپنے

معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

اندر عطشِ صادق پیدا کریں، اپنے آپ کو پیاسا بنائیں، عموماً ہماری توقع یہ ہوتی ہے کہ اس موضوع پہ کوئی ہمیں سیراب کردے مثلاً کہتے ہیں کہ اس موضوع پہ تشنگی رہ گئی ہے، مشکل یہی ہے، موضوع کو سیراب نہ کریں، انسانوں کو بھی سیراب نہ کریں بلکہ انسانوں کو پیاسا کریں، پیاسے انسانوں کو کچھ ملتا ہے لیکن جن کی بھوک مری ہوئی ہے، جن کی پیاس مری ہوئی ہے وہ کسی چیز کی طرف رغبت بھی نہیں رکھتے ہیں۔

قرآن کی نسبت سے ہماری عطش حقیقی نہیں ہے، قرآن کی پیاس ہی نہیں ہے، بسا اوقات مصنوعی عطش طاری کرتے ہیں، عموماً کسی چھوٹے بچے کو دیکھ کر قرآن کی طرف تھوڑا سا شوق بڑھتا ہے مثلاً جب وہ فرفر قرآن پڑھتا ہے اور بڑے اچھے عربی لحن میں پڑھتا ہے تو ہمیں بھی شوق گدگداتا ہے کہ ہم بھی یہاں آئیں لیکن جب ہم قرآن میں آتے ہیں تو سر میں درد ہونا شروع ہوجاتا ہے اور دوسرے دن بند کرکے رکھ دیتے ہیں، جب کسی حافظ کو دیکھتے ہیں کہ اس نے حفظِ قرآن کیا ہے اور اسے اقامہ مل گیا ہے تو ہمیں بھی شوق گدگداتا ہے کہ حفظ ہی تو ہے، چھ مہینے میں حفظ کرلیں گے تو ہمیں بھی ملے گا لیکن جب سورۂ فاتحہ سے آگے بڑھتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ حفظ کتنا دشوار کام ہے؟ لہٰذا وہیں پر چھوڑ دیتا ہے، ایسا حفظ کیا ہے؟ یہ عطشِ کاذب ہے، اگر صادقانہ پیاس ہو تو انسان ٹلتا نہیں ہے، ٹالنے والے دیکھتے ہیں اور آزماتے ہیں کہ اس کے اندر سچی پیاس ہے یا نہیں ہے؟ لہٰذا ثابت کرنا ہوتا ہے کہ میرے اندر سچی پیاس ہے، پہلے پیاس کا امتحان دینا ہوتا ہے کہ میں واقعاً پیاسا ہوں ورنہ دوسروں کو معصومین علیہ السلام بھی ٹالتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے دو تین دفعہ اس کو گول مول جواب دیا لیکن اس نے ثابت کیا کہ میں پیاسا ہوں پھر اس کے بعد حضرت نے یہ خطبہ اس کے سامنے بیان کیا، خطبۂ المتقین سنتے سنتے ہمام اس دنیا سے چل بسے، ہم بھی خطبہ پڑھتے ہیں لیکن ہم پر اثر نہیں ہوتا، کیوں نہیں ہوتا؟ چونکہ ہم اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا وجد کی کیفیت طاری نہیں ہوتی ہے، کیونکہ ہمارا دل متاثر ہونے والا دل نہیں ہے، مُنفَعِل دل کے ساتھ نہیں جاتے ہیں بلکہ سخت دل کے ساتھ جاتے ہیں۔ سخت دلوں پر کوئی چیز اثر نہیں کرتی ہے۔

اقبالؒ نے یہ شعر کسی دوسرے شاعر ہندی سے نقل کیا ہے کہ

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

نادان انسان، جاہل انسان، جاہلِ مرکب اور احمق انسان پر نرم ترین کلام بھی اثر انداز نہیں ہوتا ہے، پھول کی پتی ہیرے کو کاٹ دیتی ہے لیکن دل اتنا سخت ہے کہ کلامِ نرم و نازک اس پر اثر نہیں کرتا ہے، جب مولا علی علیہ السلام نے یہ خطبہ بیان فرمایا تو راوی نے ایک دفعہ ہمام کی چیخ سنی اور ہمام بے ہوش کر گر پڑا اور وہیں پر مر گیا جبکہ یہ راوی شقی تھا کہ جس نے یہ واقعہ نقل کیا ہے، وہ ساتھ کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا لیکن اس کے دل پر ایسا کوئی اثر نہ ہوا، حضرت علیہ السلام نے ہمام کے دنیا سے گزر جانے کے بعد فرمایا کہ دل اس طرح سے متاثر ہوتے ہیں اور فرمایا کہ مجھے یہی ڈر تھا، اس کو وجد کہتے ہیں، یہ اوجِ وجد ہے، یہ بے خودی ہے، ایک بے مُوَقَّت بے خودی انسان پر طاری ہوتی ہے، تھوڑی دیر کیلئے بے خودی

معارف کیلئے عشقِ حقیقی پیدا کریں

طاری ہوتی ہے تو پھر انسان خودی میں آجاتا ہے، انسان اپنے آپ میں آجاتا ہے، پھر اردگرد سے رابطہ برقرار ہو جاتا ہے لیکن انسان پر ایک دائمی بے خودی طاری ہوتی ہے، انسان اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اس کی کلام کے اندر جان نکل جاتی ہے، متاثر ہونے والے دل اس طرح سے متاثر ہوتے ہیں نہ کہ سیاہ وآلودہ دل کہ جن کے اوپر زنگ کی تہہ لگی ہوئی ہو،

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً......

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت......

ان کے اوپر کوئی بھی چیز اثر نہیں کرتی ہے، قرآن کے کئی کئی دورے ان کے سامنے پڑھ دیں یا وہ خود قرآن پڑھیں تو بھی کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

۱۳) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام پر حالتِ وجد

روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اصحابؓ کو کہتے تھے کہ آپ قرآن پڑھو مثلاً ابن مسعود کو کہتے تھے کہ آپ قرآن کی آیت پڑھو، اور ابن مسعود نے قرآن پڑھنا شروع کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی باوجود اینکہ یہ قرآن اترا ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن مسعود کو قرآن سکھایا ہے پھر بھی ابن مسعود سے کہتے ہیں کہ قرآن پڑھو۔ یہ کلامِ خدا ہے اور کلامِ خدا متاثر ہونے والے دل پر اسی طرح سے اثر کرتا ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ یہ مناجات جو ہم پڑھتے ہیں تو ائمہ علیہم السلام بھی اسی طرح سے مناجات پڑھتے تھے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ مناجات میں بے ہوش اور مدہوش ہو کر گر جاتے تھے، نقل کیا جاتا ہے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا حضرت سیدہ علیہا السلام کے پاس آیا اور بڑی پریشانی کے عالم میں، بڑی مضطرب حالت میں کہا کہ امیر المومنین علیہ السلام اس دنیا سے گزر گئے، آپ کفن و دفن کا انتظام کریں، حضرتِ سیدہ علیہا السلام پریشان نہیں ہوئیں اور بڑے اطمینان سے سنا حالانکہ وہ شخص بڑا مضطرب اور آواز باختہ تھا، کہنے لگا کہ مثلاً میں فلاں جگہ سے گزرا تو مجھے کسی کی عبادت یا مناجات کی آواز آئی؟ جب میں نے دیکھا تو وہ امیر المومنین علیہ السلام تھے، بعد میں ان پر ایک حالت طاری ہوئی لہٰذا امیر المومنین علیہ السلام گرے اور پھر وہیں پر ختم ہو گئے، میں فوراً دوڑا ہوا یہاں آیا ہوں کہ آپ کو اطلاع کروں۔ بی بی علیہا السلام نے فرمایا کہ تم نے آج علی علیہ السلام کی رحلت دیکھی ہے، علی علیہ السلام کو آج اس دنیا سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے، زہرا علیہا السلام ہر شب کو دیکھتی ہے یعنی یہ معمولِ امیر المومنین علیہ السلام ہے۔ یہ ہے وجد اور اس کو کیفیتِ وجد کہتے ہیں، وجد کیوں آتا ہے؟ وجد کی کیفیت اس لئے طاری ہوتی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کا دل آمادہ ترین دل ہے، سب سے زیادہ متاثر ہونے والا دل ہے، امیر المومنین علیہ السلام کے کلام میں تاثیر اسی وجہ سے ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کا دل اثر رکھنے والا دل ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام پر حالتِ وجد

انسان کلامِ خدا میں اس ادب کے ساتھ آئے اور قرآن پڑھے، باادب ہو کر مؤدبانہ قرآن پڑھے نہ کہ بے ادبانہ پڑھے، قرآن کو ہم اجنبی بن کر نہ پڑھیں، حکایات نہ کریں، فقط تلفظ نہ کریں بلکہ اپنی روح، روحِ قرآن کے سامنے پیش کریں، روحِ قرآن کے ساتھ اپنی روح کو آمادہ کریں تا کہ روحِ قرآن ہمارے اندر اترے اور اثر کرے پھر قرآن ہمارے لئے مقناطیس ہو جائے گا اور

ہماری حیثیت اس لوہے کی ہوگی کہ جو جاذبہ مقناطیس میں مبتلا ہے، زنگ آلود دل، زنگ آلود روحوں کے اندر کوئی مقناطیسیت موجود نہیں ہوتی ہے۔

۱۴)جیسی آیت ویسی حالت

صدر المتألھینؒ فرماتے ہیں کہ

☆ و یتفنن احو اله بحسب اختلاف الایات......

چونکہ آیات مختلف ہیں، آیات کا لب ولہجہ، آیات کا پیغام اور روحِ آیات مختلف ہیں، کسی آیت میں بشارت ہے، کسی آیت میں وعدہ ہے، کسی آیت میں وعید ہے، کسی آیت میں نعمت کا تذکرہ ہے، کسی آیت میں نقمت کا تذکرہ ہے اور یہ سب انسانی احوال ہیں، کسی میں جہنم کا عذاب ہے، کسی میں بہشت کی نعمتیں ہیں، کسی میں قربِ خدا کا ذکر ہے اور کسی میں قہرِ خدا کا ذکر ہے، کسی جگہ پر لقاء اللہ کا ذکر ہے اور کسی جگہ پر ذکر ہے کہ

لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌo(۸)

ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ خدا ان سے بات کرے گا اور نہ روزِ قیامت ان کی طرف نظر کرے گا اور نہ انہیں گناہوں کی آلودگی سے پاک بنائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

پس کسی جگہ جہنمِ حرمان کا ذکر ہے اور کسی جگہ پر جنتِ لقاء کا ذکر ہے۔ متاثر ہونے کے معانی یہ ہیں کہ جب انسان آیاتِ لقاء میں جائے تو وہی کیفیت انسان پر طاری ہو جو حالتِ لقاء میں طاری ہوتی ہے اور جب آیاتِ حرمان پہ پہنچے تو اس طرح سے مضطرب ہو جائے کہ جو کیفیت حالتِ حرمان، حالتِ محرومیت اور دوری کی حالت میں طاری ہوتی ہے،

☆ فیکون له بحسب کل فهم وجد وحال......

جس طرح سے اس کی آیات کی فہم ہے اسی اعتبار سے انسان کے اوپر وجد طاری ہو اور حال طاری ہو، حال بھی اسی وجد کے معنیٰ میں ہے، حال یعنی کیفیتِ وجد یا ایسی کیفیت پر طاری ہو کہ جو کسی چیز کی کشش اور جاذبے کی وجہ سے ہو اور انسان کو بے خود کر دے، اس کو حالتِ وجد اور حالتِ حال کہتے ہیں،

☆ من الحزن......

اگر ایسی صورت ہے کہ جہاں پر حزین ہونا ہے، وہاں انسان اس طرح متاثر ہو کہ حالتِ حزن طاری ہو یعنی انسان پر وجدِ حزنی طاری ہو،

☆ والخوف والخشية والرجاء والفرح......

جہاں امید کی آیات ہیں، جہاں خوشحالی کی آیات ہیں، جہاں فرح و سرور کی آیات ہیں تو اسی کے مطابق انسان کی حالت بنے۔

مختلف آیات پر مختلف حالت

۱۰)عبادات کا شوق خدا پیدا کرتا ھے

مولانا روم نے شوق اور وجد کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ انسان کے دل کے اندر جو شوق پیدا ہوتا ہے یہ درحقیقت خدا کی طرف سے ہے، یہ حالت انسان کے دل کے اندر ڈالی جاتی ہے۔ایک شخص کہ جو خدا خدا کرتا تھا اور کوئی جواب نہیں آتا تھا تو شیطان نے جا کر اس کو بہکایا کہ تو چالیس سال سے خدا خدا کر رہا ہے، مناجاتِ پروردگار کر رہا ہے لیکن کبھی جواب نہیں آیا، یہ شیطان کے وسوسے میں آ گیا اور خدا خدا کرنا چھوڑ دیا، ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اس سے پوچھ رہا ہے کہ رات کو کیوں نہیں اٹھتے ہو؟ کیوں خدا خدا نہیں کرتے ہو؟ کہا کہ فائدہ کیا ہے خدا خدا کرنے کا جب کوئی جواب ہی نہیں دیتا، جب لبیک ہی نہیں سنی جاتی ہے، کہا کہ احمق، نادان یہ تیرا لبیک کہنا یہ تیرا یارب کہنا لبیکِ ما اَست، تو یہ سمجھتا ہے کہ تو یارب یارب کر رہا ہے، نہیں، بلکہ ہم یارب یارب کروا رہے ہیں، وہ جو تیرا شوق تھا کیا وہ شوق تو نے اپنے اندر پیدا کیا؟ وہ شوق ہم نے پیدا کیا تھا یعنی وہ ہماری مقناطیسیت تھی کہ جس کی کشش میں تو گرفتار تھا، ہم نے اپنا جاذبہ اور کشش تیرے سامنے رکھی تھی اور تجھے کھینچا تھا، تو یہ سمجھتا ہے کہ تو ہماری بارگاہ میں آیا ہے؟ یہ تیرا اٹھ کر یاربّنا کہنا یہ خود لبیکِ ما اَست، ہر یارب کے نیچے ایک لبیک ہے اور خدا موجود ہے بلکہ فرمایا کہ اس سے پہلے کہ تو یارب کہے میں نے لبیک کہہ دی ہے۔

عبادات کا شوق خدا پیدا کرتا ہے

۱۶)شوق و وجد، عالم توحید و ملکوت کے مقناطیس

☆ فان الشوق والوجد مغناطیس القرب من عالم التوحید والملکوت......

صدر المتالھینؒ فرماتے ہیں کہ وہ شوق جو ہمارے اندر عبادت کیلئے پیدا ہوتا ہے کس طرح مقناطیسِ عالم توحید و عالم بالا ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے بھی فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ سے بھی منقول ہے کہ خدا اگر کسی عبد سے ناراض ہو، اس پر قہر کرے، اس کو سخت ترین سزا دے اور رسوا کرنا چاہے تو اس کے دل سے شوق ولذتِ عبادت نکال لیتا ہے، انسان کا شوق ختم ہو جاتا ہے تو عبادتوں میں لذت ختم ہو جاتی ہے اور یہی بیماری ہے، اگر یہ کیفیت محسوس ہونا شروع ہو جائے اور اس کا آغاز ہو جائے یعنی شوق ولذت کم ہونا شروع ہو جائے تو فوراً علاج کریں، جس طرح سے انسان بھوکا ہو لیکن کھانے کی طرف اشتہا نہ ہو، کھانے کی طرف رغبت نہ ہو تو ہسپتال جا کر علاج کرائے ورنہ چند دنوں میں ہلاک ہو سکتا ہے، کوئی ایسی خطرناک بیماری ہے کہ جس نے اشتہاءِ انسان کو ختم کر دیا ہے۔ کیوں عبادتِ خدا میں، مناجاتِ خدا میں اور قربِ خدا میں شوقِ انسان کم ہوا ہے؟ انسان اپنی اس بیماری کا فوری علاج کرے۔

شوق، رغبت اور رجحان خداوند تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے، البتہ شوق کسی چیز کا بھی پیدا ہو سکتا ہے، یہ بھی مناسبت کی وجہ سے ہے کہ جس چیز کی انسان کی روح سے مناسبت ہو اسی چیز کا انسان کو شوق ہوتا ہے، اگر مشتاقِ دنیا ہے تو رجحان مال کی طرف ہے یعنی اگر انسان اندر سے ظلمانی

ہے تو اس کا شوق ظلمت کی طرف زیادہ ہے، اگر اندر سے نورانی ہے تو اس کا شوق نور کی طرف زیادہ ہے حتیٰ یہاں پر بھی آپ دیکھ لیں کہ علمی حلقوں میں اور علمی دنیا میں بھی ہر ایک کا شوق ایک خاص چیز کی طرف ہے، یہ شوق بتاتا ہے کہ انسان کی روح کی مناسبت کس چیز کے ساتھ ہے؟ یہیں سے روح کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرف مشتاق ہے، شہید مطہریؒ اپنے طالب علمی کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں آغاز میں ہی مثلاً سب کی کتابیں پڑھتا تھا، بزرگوں کی، فقہا کی، مؤرخین کی، محدثین کی اور مفسرین کی لیکن اندرونی طور پر مجھے اس وقت تشنگی محسوس ہوتی تھی کہ جب میں حکماء کی کتابیں پڑھتا تھا یعنی بچپن سے ہی مناسبت نظر آ رہی تھی کہ یہ روح اس چیز کے لئے آمادہ ہے۔ شوق کے بغیر انسان موافق نہیں ہوتا ہے، شوق اسی کشش کو کہتے ہیں کہ کوئی کھینچے اور میں اس کی کشش کے سبب اس کی طرف چلا جاؤں۔

شوق و وجد عالمِ ملکوت کیلئے مقناطیسی جاذبہ رکھتے ہیں مثلاً قطب نما ایک عام آلہ ہے کہ جس سے ہم قبلہ تلاش کرتے ہیں، اس کے اندر ایک سوئی رکھی ہوتی ہے اور جہات مشخص ہوتی ہیں، اس کے اندر نمبر لکھے ہوتے ہیں کہ اس کو جس رخ پر بھی کریں تو وہ سوئی کس طرف چلی جاتی ہے؟ قبلے کی طرف نہیں جاتی ہے، شوال اور جنوب میں جاتی ہے یعنی اس کی دم جنوب کی طرف ہوتی ہے اور اس سوئی کا منہ شمال کی طرف ہوتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یعنی جہاں بھی آپ اس کو چکر دیں، اس کو الٹا کریں، سیدھا کریں، جدھر بھی کریں لیکن اس کا رخ ہمیشہ شمال کی طرف ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ قطب شمال میں ہے، نارتھ پول (North Pole) میں ایک مقناطیسی میدان ہے، جس طرح

شوق و وجد، عالم تو جبروت و ملکوت کے مقناطیس

سے برمودا میں ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ امام علیہ السلام جہاز گراتے ہیں، امام علیہ السلام جہاز نہیں گراتے ہیں، خدا نے امام علیہ السلام کو جہاز ڈبونے کی ماموریت نہیں دی ہے بلکہ یہ مقناطیسی میدان ہے اور یہ اسی مقناطیسی شعاع کا اثر ہے، قطب شمالی کی طرف زمین کے اندر مقناطیسیت موجود ہے اور وہ زمین کے اوپر افقی طور پر پھیلتی ہے، جس طرح سے یہاں میز پر مقناطیس رکھیں تو مقناطیس کی شعاع اسی طرف آئے گی لیکن ایک مقناطیسی شعاع عمودی ہے اور اوپر کی طرف جاتی ہے یعنی ایک ہوریزونٹل (Horizontal) شعاع ہے اور ایک ورٹیکل (Vertical) شعاع ہے اس کی سوئی سیدھی اوپر کی طرف جاتی ہے، برمودا میں سمندر کے نیچے جو مقناطیس ہے اس کی شعاع عمودی ہے کہ کوئی بھی اس کے اوپر جائے تو وہ اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن قطبی علاقے میں جو مقناطیسیت ہے اس کی شعاع افقی ہے، وہ پوری زمین کے اوپر پھیل جاتی ہے لہٰذا کوئی بھی قطب نما چونکہ پارے کے اندر اس کو رکھا ہوتا ہے لہٰذا فری (Free) ہوتا ہے، وہ لوہا فکسڈ (Fixed) نہیں ہوتا ہے اور اس کو کسی چیز نے جکڑا ہوا نہیں ہوتا ہے لہٰذا آزاد آہن ہوتا ہے، کسی چیز کے اندر مقناطیسیت کا رنگ ڈال کر یا مقناطیسیت کا شائبہ ڈال کر اس کے اندر اس کو آزاد رکھیں تو ہر چیز کا رخ شمال کی طرف ہو جائے گا کیونکہ اس کی کشش و جاذبہ وہاں ہے، آپ اس کا رخ مشرق و مغرب کی طرف کریں یا جنوب کی طرف کریں لیکن وہ خود شمال کی طرف ہو جائے گا۔

یہ انسان کو سمجھانے کے لئے بہترین چیز ہے کہ ہمارا رخ جدھر بھی کریں مثلاً دنیا کی طرف کریں تو بھی خدا کی طرف ہو جائیں، اگر ہمیں شیطان کی طرف کریں تو بھی خدا کی طرف ہو جائیں

اور اگر ہمیں مال و دولت کی طرف کریں تو بھی ہم خدا کی طرف ہو جائیں، کیوں؟ کیونکہ عالمِ ملکوت میں قطب شمال سے کہیں زیادہ بڑا میدانِ مقناطیسی موجود ہے لیکن وہ لوہے کو نہیں کھینچتا ہے دلِ مومن کو کھینچتا ہے، دلِ خاشع کو کھینچتا ہے، ملکوت کے اندر بھی مقناطیسیت ہے اور عالمِ ملکوت میں شدید تر میدانِ مقناطیسی موجود ہے، عالمِ توحید میں مقناطیسیت موجود ہے۔

۱۷) قرآنی کشش کے باوجود دل کی قرآن سے دوری کی وجہ

قرآن عالمِ ملکوت سے ہے اور قرآن کے اندر ایک ملکوتی جاذبہ موجود ہے، قرآن کے اندر ایک مقناطیسیت ہے اور یہ کشش انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن انسان اس کشش کی طرف نہیں جا رہا ہے، جس طرح آپ ایک لوہے کو ستون سے باندھ کر مقناطیس اس کے سامنے رکھیں تو یہ لوہا مقناطیس کی طرف نہیں جاتا ہے، اگرچہ مقناطیس میں کشش ہے لیکن یہ نہیں جائے گا مثلاً اگر ہم دیوار میں ٹھکی ہوئے میخ کے نزدیک مقناطیس کو لے جائیں تو بھی یہ میخ مقناطیس کی طرف نہیں آتی ہے، کیوں؟ کیونکہ یہ میخ دیوار کے اندر راسخ ہے، پھنسی ہوئی ہے اور وہ لوہا مقناطیس کی طرف کیوں نہیں آتا ہے؟ چونکہ ستون کے ساتھ ویلڈ (Weld) ہو چکا ہے اور بندھا ہوا ہے، پہلے اس کو کھولیں اور آزاد کریں پھر کششِ مقناطیس اس کو کھینچ لے گی۔

قرآن کے اندر دلوں کے لئے کشش ہے، انسان کی فطرت اور دلِ انسان آہن کی طرح

قرآنی کشش کے باوجود دل کی قرآن سے دوری کی وجہ

ہے اور قرآن مقناطیس ہے لیکن ہمارے دل قرآن کی طرف نہیں جاتے ہیں، کیوں نہیں جاتے ہیں؟ اس لئے کہ ان دلوں کے اوپر تالے پڑے ہوئے ہیں، یہ ان میخوں کی طرح ہیں جو دیواروں کے اندر ٹھکی ہوئی اور گڑی ہوئی ہیں اور گڑی ہوئی میخیں مقناطیس کی طرف نہیں آتی ہیں یا مثلاً اس دل کو شہوات اور خواہشات کی زنجیروں میں باندھا ہوا ہے اور جب اس دل کے سامنے مقناطیس رکھتے ہیں تو یہ مقناطیس کی طرف نہیں جاتا ہے بلکہ الٹا بیزار ہو جاتا ہے، یہ دل شہوات کی رسیوں میں باندھا ہوا ہے، اس دل کو پہلے آزاد کریں، پہلے شفاف کریں، ان شہوات کی زنجیروں کو توڑیں، ان خواہشات کی قید سے پہلے دل کو خلاصی و رہائی دلائیں پھر مقناطیس سامنے رکھیں تو پھر دیکھ لیں گے کہ قرآن کے اندر کیسی کشش ہے۔ تالیِ قرآن وہی ہے جو جاذبۂ قرآن و کششِ قرآن میں آ گیا ہو اور مقناطیسیتِ قرآن کے مدار میں اپنے آپ کو لے آیا ہو، جس نے اپنی ساری رسیاں، سارے بندھن اور ساری زنجیریں توڑ دی ہیں اور جہاں جہاں ان کا رسوخ تھا وہ رسوخ اس نے ختم کر دیا ہے، اب اس نے خود کو قرآن کے سامنے پیش کیا ہے اور قرآن اس کا ہاتھ تھام کے آگے لے جانا چاہتا ہے تو یہ آگے جانے کے لئے تیار ہے۔ البتہ تالیِ قرآن کی مزید وضاحت اس فصل کے حصۂ چہارم میں درج کی جائے گی۔ انشاء اللہ اس فصل کے حصۂ دوم میں دل کی سختی و نرمی کے اسباب اور عشقِ الٰہی کی مقناطیسیت کی وضاحت بھی کی جائے گی۔

حوالہ جات

(۱)..... (سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۱۱۰)

(۲)..... (سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۱۲۳)

(۳)..... (سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۶۴)

(۴)..... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۳۷)

(۵)..... (تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ)
(تفسیر القرآن الکریم - السید مصطفی الخمینیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۱۸۹)
(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحہ ۱۸۴)
(مستدرک سفینة البحار - آیة اللّٰہ علی النمازی، الجزء ۸، صفحہ ۳۶۱)
(میزان الحکمة - الریشھری، الجزء ۸، صفحہ ۲۱۰)

(۶)..... (فی رحاب القرآن) (مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء ۴، صفحہ ۲۵۰) (سنن النبی الاکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

(۷) (روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، الجزء ۱۱، صفحہ ۳۶۵)

(۸)..... (سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۷۷)

فصلِ ادبِ ھشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ دوم)

١)دل کب متاثر ھوتا ھے؟

٢)قلب کو تاثر کیلئے آمادہ کرنے والی چیزیں

☆خشیت

☆راھب دل

٣)دل کی سختی و نرمی کے اسباب

٤)تاثر،انسان کے بلوغ کی نشانی

٥)عزت کا معنٰی

٦)بھترین دل معرفت سے متاثر ھوتا ھے

٧)عشقِ الٰھی کی مقناطیسیت

٨)منظومۂ شمسی،عکسِ منظومۂ انسانی

٩)طبیعت و فطرت میں محاذآرائی

١٠)مولا علی علیہ السلام، فانی در ذاتِ خدا

١١)مجنوں کیلئے لیلٰی کے خط کی اھمیت

۱۲)مشکلات میں شکرِ خدا

۱۳)عاشقانہ دعا و مناجات کریں

۱٤)اھلبیتؑ کی سیرت میں جاذبۂ خدا

۱۵)قرآنی زبان سے مراد

۱) دل کب متاثر ہوتا ہے؟

انسان ہر چیز سے متاثر نہیں ہوتا ہے، بعض خاص چیزیں انسان پر اثر کرتی ہیں کہ جن کو قبول کرنے کے لئے دل تیار ہو مثلاً ہم بہت کچھ پڑھتے ہیں، کتابیں پڑھتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں، ہمیں مختلف لوگوں کے خطوط آتے ہیں، کچھ ایسے لوگوں کے خط موصول ہوتے ہیں کہ جن سے ہم بیزار ہیں، کچھ ایسے لوگوں کے خطوط موصول ہوتے ہیں کہ جن سے بیزار بھی نہیں ہے اور کوئی محبت بھی نہیں ہے، لاتعلقی ہے یا معمول کے مطابق ہے لیکن کچھ ایسے افراد کے خطوط آتے ہیں کہ جن سے انسان کو شدید لگاؤ ہوتا ہے، اگر ایک غیر متعلق آدمی ہمیں خط لکھ بھی دے اور اس کے خط میں ہمیں معلوم بھی ہو جائے کہ وہ بیمار ہے تو ہمارا دل منقلب نہیں ہوتا ہے، اس کی بیماری کا سن کر اثر بہت کم ہوتا ہے لیکن جب اپنی اولاد کا سنتے ہیں، اپنے ماں باپ کا سنتے ہیں، اپنے بہن بھائیوں کا سنتے ہیں، کسی ایسے عزیز کی بیماری کا سنتے ہیں کہ جس سے ہمیں لگاؤ اور محبت ہے اور قلبی ناتا و تعلق ہے تو اس کی بیماری کا سن کر ہمارے اوپر زیادہ اثر ہوتا ہے۔

ہم بہت سارے افراد کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوئے ہیں یا انہیں کوئی توفیق حاصل ہوئی ہے مثلاً پاس (Pass) ہوئے ہیں یا کسی بھی مرحلے میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں تو سن کر ہم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا ہے، ہم ردعمل نہیں دکھاتے ہیں لیکن اپنے کسی عزیز، اپنی کسی محبوب شخصیت کے بارے میں جب یہ خبر سنتے ہیں تو اس کی کامیابی کی خبر ہم پر اثر کرتی ہے، جب ہم اپنے بیٹے کے پاس ہونے کی خبر سنتے ہیں، اپنے بھائی کے پاس ہونے کی خبر سنتے

ہیں، اپنے دوست کے پاس ہونے کی خبر سنتے ہیں اور غیر متعلقہ آدمی کے متعلق یہی خبر سنتے ہیں تو خبریں دونوں ایک جیسی ہیں لیکن ایک خبر ہم پر اثر کرتی ہے اور دوسری اثر نہیں کرتی ہے، اس وجہ سے کہ ایک کے ساتھ ہمارا قلبی تعلق ہے اور دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، قرآن کے ساتھ جب تک انسان کا قلبی تعلق برقرار نہ ہو تو انسان متاثر نہیں ہوتا ہے، پہلے حضورِ قلب کی فصل میں ایک اشارہ ہوا تھا کہ ہمارا دل قرآن کی طرف اور خدا ہی کی طرف متوجہ رہے، عبادت سے اور قرآن سے جب ہماری کوئی مناسبت ہو، کوئی جوڑ ہو، کوئی سنخیت ہو، یہی لفظ استعمال کیا تھا کہ سنخیت ہو یعنی کوئی مناسبت، کوئی ایسی صفت کہ جو ہم میں بھی ہو اور قرآن میں بھی ہو، ایسی قدرِ مشترک کہ جو ہم دونوں کو آپس میں ملائے، ایک دوسرے سے مرتبط کرے، جب تک انسان کا دل قرآن کے ساتھ تناسب پیدا نہ کرے، مسانخت پیدا نہ کرے تو قرآن انسان کے اوپر اثر نہیں کرتا ہے، جب انسان اجنبی بن کر قرآن پڑھتا ہے، حاکیٔ قرآن ہوتا ہے، قاریٔ قرآن ہوتا ہے، راویٔ قرآن ہوتا ہے تو متاثر نہیں ہوتا ہے، چہ بسا انسان کا قرآن کے ساتھ اور قرآنی ابحاث و قرآنی علوم کے ساتھ شدید سروکار ہے لیکن انسان کے وجود پر اس کا اثر نہیں ہوتا ہے۔

۲) قلب کو تاثر کیلئے آمادہ کرنے والی چیزیں

جو حالات ہمیں متاثر کرنے کے لئے دل کو آمادہ کرتے ہیں قرآن نے خود ان حالات کا ذکر کیا ہے۔

قلب کو تاثر کیلئے آمادہ کرنے والی چیزیں

☆خشیت

ایک چیز خوف ہے البتہ بصورتِ خشیت، عظمت کے نتیجے میں جو خوف پیدا ہوتا ہے اس کو خشیت کہتے ہیں، کسی چیز کے کمال اور عظمت کے نتیجے میں انسان خوف زدہ ہو جاتا ہے، باعظمت منظر کو دیکھ کر، باعظمت شے کو دیکھ کر حتیٰ باعظمت جسم کو دیکھ کر انسان مرعوب ہو جاتا ہے، انسان کے دل میں خوف آجاتا ہے مثلاً آپ ایک بہت اونچا پہاڑ دیکھیں تو اس پہاڑ کر دیکھ کر دل مرعوب ہو جاتا ہے عموماً ادبیات میں اس کے لئے دل دہل جانے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اس منظر کو دیکھ کر دل دہل جاتا ہے۔

لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ......(۱)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا ضرور دیکھتے......

اسی طرح اگر کوئی پُر تلاطم دریا دیکھے کہ جس کے اندر طغیانی ہو، اس میں امواج اور لہریں اٹھ رہی ہوں اور اس کی طغیانی کی بہت شدید آواز ہو تو انسان کا دل دہل جاتا ہے یا انسان ناگہاں ایک بے کراں اور بے کنارہ سمندر دیکھتا ہے اور جب اس کا سامنا کرتا ہے تو انسان کا دل دہل جاتا ہے چونکہ اس کے اندر عظمت ہے، اس پانی کے مجموعے کے اندر یا اس پہاڑ کے اندر ایک ہیبت موجود ہے کہ جو انسان کے دل پر اثر کرتی ہے، دل خاشع ہو، دل کے اندر خشیت ہو، انسان کا دل اس اثر کو

☆خشیت

قبول کرے کہ جو کسی شے کی عظمت کے باعث انسان کے اوپر پڑ رہا ہے، دل دہلنا انسان کا ایک کمال ہے، عظمت کے سامنے کھڑے ہو کر انسان کا دل اگر نہیں دہلتا تو اس دل کا علاج کروائے، بہت ساری جگہوں پر انسان کا دل دہل جانا چاہئے کہ جب انسان ایسے باعظمت مناظر کے سامنے جاتا ہے۔

☆ راہب دل

ایک دل، دلِ راہب ہے،

فَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ٥ (۲)

پس تم صرف مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے بھی راہب کا تذکرہ کیا ہے، یہ بھی ایک قسم کا خوف ہی ہے لیکن یہ ایسا خوف ہے کہ جو کسی کی یاد کی وجہ سے انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے، ایک خوف عظمت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جسے خشیت کہتے ہیں، ایک خوف کسی کے یاد آنے سے دل میں پیدا ہوتا ہے مثلاً آپ کو کسی کام سے بھیجا گیا اور پھر جیسے کہا کہ انسان کے ساتھ مشغولیت ہے، انسان لہو میں مشغول ہو جاتا ہے، لہو یعنی ہر وہ کام جو ہمیں اصلی کام سے ہٹا کر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرالے، کھینچ لے، فرض کریں کہ ہم دکان پر افطاری کا سامان خریدنے کے لئے گئے لیکن راستے میں کسی کا کوئی اکسیڈنٹ (Accident) دیکھا تو تماشائی بن کر وہیں کھڑے ہو گئے یا کوئی شخصیت آئی ہوئی ہے

اور لوگ اس کے ارد گرد جمع ہیں تو آپ بھی کھڑے گئے اور اس میں محو ہو گئے تو اس کو لہو کہتے ہیں چونکہ اس کام نے اصلی مقصد سے توجہ ہٹادی ہے، ناگہاں یاد آتا ہے کہ میں افطاری کا سامان لینے آیا تھا، گھر میں سب منتظر ہیں تو یہاں بھی یاد آجانے سے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ ظاہر ہے والد نے بھیجا ہے، والدہ نے بھیجا ہے، کسی شخصیت نے بھیجا ہے یا حتیٰ دوستوں کے لئے فوراً انسان کے دل میں ایک خوف کی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ مجھے جو کچھ کرنا چاہئے تھا وہ میں نے نہیں کیا، وہ میرے منتظر بیٹھے ہیں، کسی نے حکم دیا تھا اور اس حکم کو میں نہیں بجالایا، یہاں بھی انسان کے دل میں ایک خوف پیدا ہوتا ہے، اس کو راہب کہتے ہیں، علمائے یہود، علمائے نصاریٰ اپنے لئے لفظِ راہب استعمال کرتے تھے، رہبان کا لفظ استعمال کرتے تھے، رہبان ور ہبانیت اسی سے مشتق ہے۔

رُہبانیت یعنی ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا اور خدا کے خوف کی وجہ سے کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ جو باعثِ ناراضگی وسخطِ خدا بن جائے، البتہ علمائے نصاریٰ نے خود سے کچھ من گھڑت چیزیں اختیار کر لی تھیں کہ جو خدا نے نہیں کہی تھیں مثلاً ایک بات یہ کہتے تھے کہ جو بھی راہِ خدا میں آئے اور اپنے آپ کو راہِ خدا میں وقف کر دے تو اسے شادی نہیں کرنی چاہئے اور بظاہر یہ نہیں کرتے، خداوند نے فرمایا کہ یہ ہم نے نہیں کہا تھا، ہم نے اس کو جائز قرار دیا ہے، ہم نے اس کو مباح قرار دیا ہے بلکہ بعض حالات میں لازم اور واجب قرار دیا ہے، انہوں نے اپنے لئے خود رہبانیت اختیار کی ہے یعنی حتیٰ اس طرح سے بھی ہم بارگاہِ خدا سے دور نہ ہوں، شادی اس لئے نہیں کرتے تھے کہ اسے بھی تقربِ خدا سے دوری کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے، خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نہیں کہا تھا، ایسی رہبانیت انہوں

نے خود اختیار کی ہے اور اس کا حق بھی ادا نہیں کیا اور پھر یہ چھپ چھپا کر یہ کام کر لیتے تھے، رہبانیت یعنی خوف،

فَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ٥

فقط مجھ سے ڈرو، یعنی حدِ خدا توڑ کر انسان ڈرے تو یہ رہب ہے، آج کی ادبیات میں اور آج کی عربی میں بھی لفظِ ارہاب دہشت گردی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے چونکہ وہ بھی خوف ہے، انسان کو خوف پیدا ہوتا ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ارہاب ہے، بنیادی معنیٰ خوف ہے کہ انسان کسی فرمان کے ترک کرنے سے اور پھر اس ترک کے بعد فرمان کے یاد آنے سے اور عقاب و عذاب و بعد میں آنے والی سزا کو ذہن میں تصور کر کے جب ڈرتا ہے، کانپتا ہے تو اس کو رہب کہتے ہیں،

☆ راہبِ دل

انسان کا دل خاشع بھی ہو اور دلِ راہب بھی ہو، خشوع یعنی دل نرم ہو، یہ بہت اہم صفت ہے، اس ادب کے لئے دلِ خاشع کی ضرورت ہے، خشوع کی ضرورت ہے چونکہ بہت ساری چیزیں گراں گزرتی ہیں، بھاری ہیں اور ہم پر بوجھ ہیں، عبادتیں ہم پر بوجھ ہیں، اگر نرم دل ہو تو بہت ساری چیزیں اس کیلئے بوجھ نہیں ہیں لیکن اگر دل نرم نہ ہو بلکہ سخت ہو تو اس کے لئے بوجھ ہیں، اگر دلِ خاشع نہ ہو تو صبر و صلوٰۃ بوجھ ہے،

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ٥(۴)

صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو، نماز بہت مشکل کام ہے مگر ان لوگوں کیلئے نہیں جو خشوع و خضوع والے ہیں۔

عبادت سخت و دشوار ہے سوائے ان کے کہ جن کے دل نرم ہیں۔ جیسے مطالعہ ہے، کوئی کتاب پڑھنا بعض پر بہت بوجھ ہے، حقیقتاً ایسے ہے کہ مطالعہ نہیں کرتے ہیں اور اگر پڑھیں بھی تو سر میں درد ہونے لگتا ہے، بلڈ پریشر ہائی ہونے لگتا ہے، ان کے لئے مشکلات کھڑی ہوجاتی ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ دل نرم نہیں ہیں، مطالعے کے لئے، علم کے حصول کے لئے دل آمادہ نہیں ہیں، یہی افراد گھنٹوں بیٹھ کر فلم دیکھیں گے، ڈرامے دیکھیں گے، نیٹ پر بیٹھیں گے، چیٹنگ کرتے رہیں گے لیکن ایک صفحہ مطالعہ کرنا ان کے لئے

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ......

یہ ان کے لئے سخت ہے، بہت دشوار ہے چونکہ ہر کام کی مناسبت سے دل کے اندر ایک نرمی چاہئے، دل کی نرمی جسمانی نرمی نہیں ہے، دل کی نرمی یعنی دل منفعل ہوتا ہو، متاثر ہوتا ہو۔ اس دل کو نرم دل کہتے ہیں کہ جو متاثر ہوتا ہو، اثر قبول کرتا ہو یعنی علم کو قبول کرنا دل کی نرمی ہے، دل قابل ہے، قبول کرنے والا ہے، اگرچہ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ دوسروں کو کچھ دیں درحالیکہ تکامل لینے سے ہوتا ہے نہ کہ دینے سے، انسان جتنا لے اتنا بڑا ہوتا ہے اور لینے کے لئے دل کی آمادگی کی ضرورت ہے اور دل خاشع چاہئے۔

۳) دل کی سختی و نرمی کے اسباب

بعض لوگوں کیلئے قرآن بہت گراں اور بوجھ ہوتا ہے، قرآن پڑھنا، قرآن سننا، قرآن کے

اندر تدبر کرنا قرآن کے اندر تفکر کرنا، معارفِ قرآن تک پہنچنا بہت کبیرا اور سنگین ہے چونکہ دل خاشع نہیں ہیں بلکہ قسی ہیں۔ دل کو نرم کریں، دِل کی نرمی اور سختی کے اسباب ہیں کہ دل سخت کیوں ہو جاتا ہے؟ لہو یعنی مشغولیت دل کو سخت کر دیتی ہے، لعب دل کو سخت کر دیتا ہے، مزاح دل کو سخت کر دیتا ہے، قہقہے لگانا، زیادہ ہنسنا دل کو سخت کر دیتا ہے، عورتوں کے ساتھ خلوت دل کو سخت کر دیتی ہے، خلوت بہ نساء نہ صرف نامحرم کے ساتھ حتیٰ محرم کے ساتھ بھی، مرد اگر زنانہ ماحول میں زیادہ رہے تو مرد کا دل بھی سخت ہو جاتا ہے، عورتیں بھی اگر مردوں کے جھرمٹ میں زیادہ رہیں اور ہمیشہ مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلیں تو عورتوں کا دل بھی سخت ہو جاتا ہے۔ یہ اثرِ متقابل ہے، خواہشات سے دل سخت ہو جاتا ہے، گناہوں سے دل سخت ہو جاتا ہے، یہ دل کی سختی کے اسباب ہیں، ان سے دل سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے۔

دل کو نرم کیسے کریں؟ دل کو نرم کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ گریہ ہے، گریہ اور نرمی دونوں لازم و ملزوم ہیں، ہمیشہ نرم دل آدمی روتا ہے اور رونے سے دل مزید نرم ہوتا ہے۔ پہلے نرمی ہوتی ہے تو اس سے انسان روتا ہے اور رونے سے دل کے اندر مزید نرمی آتی ہے، اس لئے عبادتوں کے اندر گریے کی تاکید کی گئی ہے کہ بہترین عبادت وہ ہے جس میں انسان گڑگڑائے، روئے، البتہ خشیتِ خدا اور خوفِ خدا سے روئے نہ کہ دیگر چیزوں کی وجہ سے، ابھی ہم دعا بھی پڑھتے ہیں، مناجات بھی پڑھتے ہیں مگر رونے کے لئے بیچ میں مصائب پڑھنے پڑتے ہیں، وہ گریہ اپنی جگہ ہے، عزاداری کا گریہ ایک الگ گریہ ہے، مناجات کے اندر رونا، بارگاہِ خدا میں رونا، دعا کے اثنا میں ذکرِ

دل کی سختی و نرمی کے اسباب

خدا سے رونا ایک الگ گریہ ہے، مخلوط نہیں کیا کریں مثلاً بسا اوقات ہوتا ہے کہ دل اداس ہے اور رونے کو جی چاہتا ہے، عموماً محفلِ دعا و مناجات میں بھی جو لوگ رو رہے ہوتے ہیں تو سارے دعا و مناجات کی وجہ سے نہیں رو رہے ہوتے ہیں بلکہ کچھ اپنے دکھوں پر رو رہے ہوتے ہیں، مجالس میں بھی مصائب سن کر بعض لوگ جو روتے ہیں تو سارے مصائبِ کربلا پہ ہی نہیں روتے ہیں، کچھ اپنے دردوں کو رو رہے ہوتے ہیں، یہ الگ الگ رونے ہیں، اپنے درد کو رونا ہے تو کسی بند کمرے میں جا کر رو لیا کریں، کسی خلوت خانے میں جا کر چند آنسو بہا لیا کریں کہ جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو، سید الشہداءؑ کے لئے جب رونا ہے تو صرف سید الشہداءؑ کے لئے روئیں لیکن جب مناجات میں رونا ہے تو صرف خدا کے لئے روئیں، نماز میں روئیں، قرآن پڑھتے ہوئے گریہ کریں، دل کو نرم کریں، اس سے دل قرآن کی طرف جذب ہو جاتا ہے، قرآن کے ساتھ دل کا ایک تعلق برقرار ہو جاتا ہے، دل نرم ہوتا ہے تو انسان کے اوپر قرآن اثر کرتا ہے۔

٤) تاثر، انسان کے بلوغ کی نشانی

اگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم بلوغ کی منزل پر پہنچے ہیں یا نہیں تو یہ دیکھیں کہ ہم کس سے متاثر ہوتے ہیں۔ تاثرِ انسان دلیلِ بلوغتِ انسان ہے، متاثر تو سب ہوتے ہیں، کوئی ایسا انسان نہیں ہے حتیٰ شقی ترین انسان، قسی القلب ترین انسان بھی متاثر ہوتا ہے جیسے وہ مظلوموں سے متاثر نہیں ہوتا ہے، اسے لوگوں کے فقر و فاقہ، ناداری اور بیکسی پہ رحم نہیں آتا ہے، نرم نہیں ہوتا ہے لیکن کسی جگہ

آتا ہے تو متاثر ہو جاتا ہے، شہوتوں سے متاثر ہو جاتا ہے، شہوت رانی بھی ایک تاثر ہے، تاثیر نہیں ہے، انسان یہ گمان کرتا ہے کہ شہوت رانی تاثیر ہے حالانکہ یہ بھی تاثر ہے، اس سے انسان مغلوب و متاثر ہو جاتا ہے کیونکہ ماحول ایسا ہے۔

فرض کریں کہ ایک نامحرم بے حجاب یا بدحجاب عورت بازار میں آتی ہے اور اس کو دیکھ کر ایک مرد کے اندر احساسِ شہوانی پیدا ہوتا ہے تو یہ شخص متاثر ہوا ہے، مغلوب ہے، منفعل ہے، یہ بھی متاثر ہوا ہے لیکن منظرِ شہوانی سے متاثر ہوا ہے۔ بچہ دکان میں یا بازار میں جب کھلونا دیکھتا ہے تو وہیں پر مچل جاتا ہے، یہ بھی کھلونا دیکھ کر متاثر ہوا ہے۔ ایک پیٹو انسان جب کھانا دیکھتا ہے تو وہیں پر متاثر ہو جاتا ہے، یہ رال ٹپکنا متاثر ہونے کی علامت ہے، اسی متاثر ہونے سے انسان پہچانا جاتا ہے اور انسان کی شخصیت معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ کیسا انسان ہے؟ کن چیزوں سے متاثر ہوتا ہے؟ فرض کریں کہ کسی کے سامنے آپ بہت کچھ بیان کریں تو وہ کسی سے متاثر نہیں ہوتا ہے لیکن موسیقی چلے تو فوراً متاثر ہو جاتا ہے، اسی سے شخصیت معلوم ہو جاتی ہے، انسان کی شخصیت کھلتی ہے، کیفیتِ تاثر سے، اثر قبول کرنے سے شخصیت معلوم ہوتی ہے۔

بچے عموماً خیالات سے، تخیلات سے بہت متاثر ہوتے ہیں، اگر آپ بچوں کے سامنے کوئی سنجیدہ فلم چلائیں تو ان پر سرے سے کوئی اثر نہیں ہوتا ہے لیکن کارٹون چلائیں یا خیالی دنیا کی کوئی چیز پیش کریں تو فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، خیال باف انسان اس طرح متاثر ہو جاتے ہیں، اگر کوئی ہماری خوشامد کرے تو ہم متاثر ہو جاتے ہیں، اگر کوئی ہم پر تنقید کرے تو ہم متاثر ہو جاتے ہیں، یہیں سے

پتہ چلتا ہے کہ ضعیف انسان ہے یا قوی انسان ہے، اگر شہوتوں سے متاثر ہوتے ہیں، خواہشات سے متاثر ہوتے ہیں، خیالات سے متاثر ہوتے ہیں، خوش آمدوں سے متاثر ہوتے ہیں، تنقید سے متاثر ہوتے ہیں تو ضعیف و کمزور انسان ہیں، یہ ابھی بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔

۵)عزت کا معنٰی

بالغ انسان وہ ہے کہ جو شہوتوں، خواہشوں، خیالوں، خوش آمدوں اور تنقیدوں سے متاثر نہ ہوتا ہو، ان چیزوں کیلئے انسان کو قسی و سخت ہونا چاہئے، اس کو قساوت نہیں کہتے ہیں البتہ اس کو عزت کہتے ہیں، انسان کے اندر دو طرح کی سختی ہے، ایک مثبت سختی ہے اور ایک منفی سختی ہے، مثبت سختی یہ ہے کہ آپ برائیوں سے متاثر نہ ہوں مثلاً جیسے ہم گھر بناتے ہیں تو یہ گھر سخت ہونا چاہئے تاکہ بارش اس کے اندر نہ جائے، یہ مثبت سختی ہے لیکن گھر ایسا بنائیں کہ نور بھی اس کے اندر نہ جائے تو یہ منفی سختی ہے، گھر کے اندر، سردی نہ آئے، پانی نہ آئے لیکن نور تو آنا چاہئے، اگر اچھی چیزوں کے بارے میں سختی آجائے اور انسان اچھی چیزوں سے متاثر ہونا چھوڑ دے یا اچھی چیزوں کو قبول کرنا چھوڑ دے تو اس کو قساوت کہتے ہیں لیکن اگر انسان غلط چیزوں سے متاثر ہونا چھوڑ دے، غلط چیزوں کے مقابلے میں جب مقاومت پیدا ہو جائے تو اس کو عزت کہتے ہیں، یہ بھی ایک سختی ہے، عزت کا معنٰی بھی سختی ہے، خدا کی ذات عزیز ہے چونکہ کوئی چیز خدا پر اثر انداز نہیں ہے، خدا اس سے منفعل نہیں ہے، ذاتِ خداوند تبارک و تعالٰی کسی سے بھی متاثر نہیں ہوتی ہے۔

عزت کا معنٰی

اگر انسان کمالات سے متاثر ہوتا ہے، با عظمت چیزوں سے متاثر ہوتا ہے، معارف سے متاثر ہوتا ہے، علم سے متاثر ہوتا ہے تو یہ بہترین حالت ہے، یہ دلِ خاشع و نرم ہے، جس طرح سے دوسرے لوگ لطیفے سن کر لطف اندوز ہوتے ہیں یعنی متاثر ہوتے ہیں، کوئی لطیفہ سناتا ہے تو ہم ہنس پڑتے ہیں، یہی تاثر ہے یعنی اس نے ہماری روح کے اوپر اثر کیا ہے، اگر کسی نے ہمارے احساسات ابھارے ہیں تو فوراً احساسات متاثر ہوتے ہیں، یہ بھی انسان کے دل کا ایک شعبہ ہے یعنی معرفت، فہم اور تحریکات کے ساتھ احساس بھی دل کا کام ہے، ممکن ہے کہ اگر کوئی ہمارے احساسات کو بھڑکائے اور ابھارے تو ہم فوراً بھڑک جاتے ہیں یعنی منفعل ہو جاتے ہیں، متاثر ہو جاتے ہیں، احساساتی طور پر غضب میں آجاتے ہیں یا خوش ہو جاتے ہی۔ کبھی فوراً نرم ہو جاتے ہیں یا فوراً سختی آجاتی ہے، یہ بھی متاثر ہونا ہے لیکن بسا اوقات انسان کے احساسات کو نہیں ابھارا جاتا ہے جیسے انبیاء علیہم السلام انسان کی عقول کو ابھارنے کے لئے آئے ہیں، تحریکِ عقول کر رہے ہیں نہ کہ تحریکِ احساسات کر رہے ہیں، انبیاء علیہم السلام احساسات ابھارنے نہیں آئے بلکہ افکار ابھارنے آئے ہیں، عقول انسان کو ابھارنے آئے ہیں۔ بہترین انسان وہ ہے جو نبی کے سامنے مقاومت نہ کرے کیونکہ یہ عزت کے معنیٰ کا مصداق نہیں بلکہ قساوت کا مصداق ہوتا ہے، اگر نبی اس کی عقل کو ابھار رہے ہیں تو اس کی عقل ابھر جائے۔

عرفانی

٦) بہترین دل معرفت سے متاثر ہوتا ہے

سب سے بہترین دل وہ ہے جو معارف اور علم سے متاثر ہو، معرفت سے متاثر ہو، لذتِ معرفت سب سے عالی ترین لذت ہے، صاحبِ کتاب صدر المتألھینؒ معروف بہ ملا صدراؒ فرماتے ہیں کہ سب سے عالی لذت معرفت کی لذت ہے، جنت میں بھی انسان کو جو سب سے بہترین لذت ملے گی وہ معرفتِ خدا کی لذت ہے یعنی جنتِ لقاء۔ انگور کھا کے، انار کھا کے، درختوں کی گھنی چھاؤں میں، نرم مسندوں پر بیٹھ کر نظارے کرنے، دودھ اور شہد پی کے اتنی لذت محسوس نہیں ہوتی کہ جتنی لذت انسان کو معرفت سے محسوس ہوتی ہے، یہ لذت اہلِ معرفت کیلئے قابلِ توصیف نہیں ہے مثلاً فرض کریں کہ ہم لوگ جو اہلِ معرفت نہیں ہیں، معرفت کی لذت سے آشنا نہیں ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ لذتِ معرفت کیا چیز ہوتی ہے؟ ایسے ہی جیسے بچے کو نکاح کی لذت معلوم نہیں ہے، اگر نابالغ بچہ ہو، چار پانچ سال کا بچہ ہو تو اس کو آپ جتنا سمجھائیں گے کہ نکاح کی کیا لذت ہوتی ہے؟ عقد کی کیا لذت ہوتی ہے؟ البتہ صرف صیغہ پڑھنے کی نہیں نکاح کی لذت تو اس کو سمجھ نہیں آئے گی یعنی اسے معلوم ہی نہیں ہے چونکہ اس کے اندر وہ جوہر و گوہر ابھی زندہ نہیں ہوا ہے، اس کے اندر لذت محسوس کرنے والا مادہ نہیں ہے، اس کو بلوغ تک پہنچنے دیں، ممیّز ہونے دیں، بارہ تیرہ سال کی عمر کے بعد آہستہ آہستہ اس کے اندر اس لذت کو محسوس کرنے کی حس پیدا ہو جائے گی، اس سے پہلے یہ نابالغ ہے لہٰذا اگر ہمیں اہلِ معرفت کہتے ہیں کہ قرآن لذت دیتا ہے، ہمیں عبادتیں لذت دیتی ہیں تو ہم اس بچے کی طرح ہیں کہ جو حیرت سے دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا لذت ہے؟

جب بچوں پہ قرآن ٹھونستے ہیں، بچوں سے زبردستی قرآن حفظ کراتے ہیں تو اس کیلئے تو یہ عذاب ہے نہ کہ لذت ہے، کیوں کہتے ہیں کہ یہ عذاب ہے حالانکہ قرآن سے تو لذت محسوس ہونی چاہئے، قرآن حفظ کر کے جب لوگ واہ واہ کرتے ہیں تو اس وقت وہ لذت محسوس کرتا ہے، قرآن سے لذت محسوس نہیں کرتا ہے بلکہ لوگوں کی داد سے لذت محسوس کرتا ہے، یہ لذت اس کی حس کی اشباہ پیش کر رہی ہوتی ہے اور اس کی اِشتہا کو پورا کر رہی ہوتی ہے۔

بالغ انسان وہ ہے کہ جو معرفت سے لذت اٹھانا شروع کردے، انسان کے لئے علم لذت بخش ہو جائے، حقیقت شناسی لذت بخش ہو جائے اور انسان اس لذت کا ادراک نہیں کرسکتا کہ جو معرفت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے یعنی ایک صاحبِ معرفت انسان پر جب ایک حقیقت کشف ہوتی ہے تو اس سے وہ جتنی لذت محسوس کرتا ہے اتنی لذت کوئی کھا پی کر اور جسمانی لذتوں سے حاصل نہیں کر پاتا، اصلاً یہ لذتیں آپس میں قابلِ قیاس نہیں ہیں، یہ انسان کے بلوغ کی علامت ہے کہ انسان قرآن سے لذت محسوس کرنا شروع کردے، فرماتے ہیں کہ انسان اتنا متاثر ہو کہ اس کے اوپر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے، وجد کی کیفیت کب طاری ہوتی ہے؟ جب دل بہت متاثر ہو، منفعل ہو اور اتنا متاثر ہو کہ قرآن اس کے اوپر چھا جائے اور یہ ساری حقیقت دل کو گھیر لے۔

۷) عشقِ الٰہی کی مقناطیسیت

جب تک روحِ قرآن، روحِ انسان کا احاطہ نہ کرلے اس وقت تک وجد کی کیفیت طاری

نہیں ہوتی ہے مثلاً جب ہماری توجہ ایک ہی وقت میں کئی چیزوں کی طرف ہوتی ہے تو ایک چیز نے ہمیں گھیرا نہیں ہوتا ہے، جیسے اس فصل کے پہلے حصے میں یہ نکتہ درج ہوا تھا کہ حقائق، معرفت، علم اور کمال کے اندر ایک مقناطیسیت موجود ہے اور سب سے بڑی مقناطیسیت منبع کمال کے اندر یعنی ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں موجود ہے، اسی کو عشقِ خدا کہتے ہیں، عشقِ الٰہی اسی مقناطیسیت کا نام ہے۔

یہ عشق یا یہ مقناطیسیت کس انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے؟ جیسے آہنی مقناطیس ہر چیز کو نہیں کھینچتا جیسے پتھر، لکڑی اور پلاسٹک کو نہیں کھینچتا ہے بلکہ فقط آہن کو کھینچتا ہے اور وہ بھی اس وقت کہ جب اس کے سامنے کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو جیسے قطب نما کی مثال دی تھی کہ شمالی پول میں ایک بڑا مقناطیسی میدان ہے کہ جس سے مسلسل مقناطیسی لہریں اٹھ رہی ہیں اور یہ زمین پر پھیلتی ہیں اس وجہ سے ہمیشہ قطب نما کا رخ شمال کی طرف ہوتا ہے، ایسی ہی مقناطیسیت عالمِ ملکوت، عالمِ توحید، اسماء و صفاتِ خدا اور ذاتِ خدا میں ہے، روحِ انسان کا قطب نما ہمیشہ خدا کی طرف ہے چونکہ جاذبہ، کشش اور مقناطیسیت وہاں پر ہے لیکن جب انسان عالمِ طبیعت میں آتا ہے، عالمِ مادہ میں آتا ہے، اس چراگاہ میں آتا ہے کہ جس کو خدا نے ہمارے لئے فرمایا تھا کہ یہ تمہارے لئے آمادگاہ ہے لیکن ہم نے آمادگاہ کو چراگاہ بنالیا۔

جانوروں کے لئے زمین چراگاہ ہے لیکن انسان کے لئے آمادگاہ ہے، آمادگاہ قرآنی اصطلاح ہے، آمادگاہ یعنی مہد، ہم نے زمین کو تمہارے لئے مہد قرار دیا، ایران میں یہ اصطلاح زیادہ

رائج ہے، عرب ملکوں میں بھی بچوں کی نگہداری کیلئے کہ جہاں چھوٹے بچوں کو رکھتے ہیں اس کو مہدِ اطفال کہتے ہیں، مہد یعنی آمادگاہ کہ جہاں پر بچوں کو نہ صرف رکھا جاتا ہے، دودھ پلایا جاتا ہے بلکہ جہاں پر بچوں کے لئے ہر چیز موجود ہے، آمادہ کی گئی ہے، فقط بچوں کے لئے اس چیز کو بنایا گیا ہے، بچوں کی ساری ضرورتیں وہاں پر موجود ہیں، اسی طرح سے خدا نے زمین کو انسان کے لئے مہد قرار دیا ہے اور جانوروں کے لئے مرتع قرار دیا ہے، جانوروں کے لئے چراگاہ ہے لیکن انسانوں کے لئے آمادگاہ ہے لہٰذا انسان یہ نہ سمجھے کہ میں چراگاہ میں ہوں۔

چراگاہ میں کھانے پینے کا جاذبہ ہے، شہوتوں کا جاذبہ ہے، بہت ساری چیزوں کا جاذبہ ہے، ہم اس وقت بہت ساری چیزوں کے جاذبے میں ہیں یعنی گوناگوں مقناطیس ہمیں اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، دنیا اپنی طرف کھینچ رہی ہے، مال و دولت اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، جہاں طلبی اپنی طرف کھینچ رہی ہے، یہ سب جاذبے ہیں اور جھوٹے مقناطیس ہیں۔ یعنی یوں کہہ لیں کہ ایک حقیقی مقناطیس ہے اور کچھ شیطانی مقناطیس ہیں یعنی کاذب اور جھوٹے مقناطیس ہیں اور بیچ میں انسان ہے۔

یہ مطلب شاید پڑھنے سے اتنا ذہن میں نہ آئے بلکہ اس کو مجسم کرنے کی ضرورت ہے، تصویر کی زبان میں یا کسی عملی زبان میں اس کو دکھانے کی ضرورت ہے یعنی ہمارے چاروں طرف مقناطیسی میدان ہے۔ بازاروں میں مقناطیسی میدان ہے اور ہمارے اندر خواہشات ہیں، ہر خواہش کو ایک مقناطیس اپنی طرف کھینچ رہا ہے، پیٹ کا مقناطیس کھانے ہیں، آنکھوں کے مقناطیس کچھ اور

ہیں، کانوں کے مقناطیس کچھ اور ہیں، شہوات کے مقناطیس کچھ اور ہیں، حشم کے مقناطیس کچھ اور ہیں، حبّ و مال و دنیا کے مقناطیس کچھ اور ہیں، شخصیت سازی کے مقناطیس کچھ اور ہیں، انانیت کے مقناطیس کچھ اور ہیں، ہزاروں مقناطیس ہمارے اردگرد ہیں، تجربہ کرلیں، یہ ایک کھیل ہوگا کہ آپ چار پانچ مقناطیس رکھ کر بیچ میں ایک چھوٹی سوئی رکھیں اور پھر دیکھیں کہ وہ ان کے درمیان ناچ رہی ہوگی یعنی کبھی ایک کی طرف جائے گی پھر اسے دوسرا کھینچے گا، یہ مقناطیسی ناچ ہے، رقصِ مقناطیسی ہے، یہی رقص جو ہم دنیا میں اس وقت کر رہے ہیں، انسان اس وقت مقناطیسی رقص میں مشغول ہے، شہوتیں اپنی طرف کھینچتی ہیں، جہاں طلبی اپنی طرف کھینچتی ہے، انانیت اپنی طرف کھینچتی ہے، دنیا اپنی طرف کھینچتی ہے، مقام و منزلت اپنی طرف کھینچتے ہیں، فلاں اپنی طرف کھینچتا ہے اور بیچ میں ہم مقناطیسی رقص میں مشغول ہیں، کبھی اِس کوچے میں کبھی اُس کوچے میں، کبھی اُس بے روئی میں، کبھی اِس بے روئی میں، کبھی اِس در پر کبھی اُس در پر، کبھی اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا کبھی اس کے سامنے کھجل، کبھی اس کے سامنے رسوائی، یہ سارا مقناطیسی رقص ہے، انسان اس مقناطیسی رقص میں کتنا پست ہو جاتا ہے کہ بسا اوقات فاحشہ عورتیں بھی انسان کو نچانا شروع کر دیتی ہیں، متدینین کو آلودہ لوگ بھی رقص کروانا شروع کر دیتے ہیں اور یہ ان کے ساتھ رقص میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان ان مقناطیسوں سے آزاد نہ ہو تو مقناطیسِ ملکوتی میں جذب نہیں ہوگا، انسان یہ رقص چھوڑ دے تو اس وقت کیفیتِ وجد طاری ہو جاتی ہے یعنی ہمارے سراپا کو چاروں طرف سے باقی کششیں چھوڑ دیں، باقی جاذبے چھوڑ دیں اور فقط جاذبۂ خدا، جاذبۂ الٰہی، جاذبۂ توحیدی و جاذبۂ ملکوتی چاروں

طرف سے ہمارے وجود کو گھیر لے تو اس سے جو اتفاق رونما ہوگا اسی کو وجد کہتے ہیں۔

۸) منظومۂ شمسی، عکسِ منظومۂ انسانی

انسان اس وقت کسی مقناطیس کے جزم میں جاتا ہے کہ جب دوسرے جاذبوں سے آزاد ہو جائے، اس کو اپنا مدار سمجھ میں آ جائے، اپنا راستہ سمجھ میں آ جائے۔ منظومہ شمسی کہ جس کا ایک حصہ ہم بھی ہیں یعنی زمین بھی ہے، زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، یہ سورج ہی کے گرد کیوں گھومتی ہے؟ باوجود اینکہ جتنے بھی سیارے اور ستارے ہیں سب کے اندر جاذبہ ہے، چاند زمین کے گرد گھومتا ہے اور زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، اس طرح یہ پورا منظومہ بنا ہوا ہے، تنہا زمین نہیں ہے اور بھی بہت ساری چیزیں سورج کے گرد گھوم رہی ہیں، یہ سورج ہی کے گرد کیوں گھوم رہی ہیں؟ مثلاً زمین چاند کے گرد کیوں نہیں گھومتی؟ مریخ و مشتری کے گرد کیوں نہیں گھومتی؟ ان کے اندر بھی تو جاذبہ ہے لیکن زمین کو معلوم ہے، اول تو زمین کے شایانِ شان جاذبہ ان کے اندر موجود نہیں ہے بلکہ وہ زمین ہی کی طرح کی چیزیں ہیں۔ مریخ، پلوٹو، یورینس، نیپچون وغیرہ بھی زمین جیسی چیزوں کے نام ہیں، جسامت میں چھوٹے بڑے ہیں لیکن سنخ ایک ہے، قبیلہ ایک ہے، اپنے جیسے کے گرد انسان نہیں گھوم سکتا ہے، زمین کو معلوم ہے کہ میں اپنے جیسے کسی موجود کے گرد نہیں گھوم سکتی اگر چہ اس کے گرد جاذبہ ہے لیکن زمین کو معلوم ہے کہ یہ جاذبہ میرے لئے نہیں ہے، مجھے اس جاذبے سے آزاد ہونا ہے، مجھے اس کشش سے آزاد ہونا ہے، اگر زمین مشتری کی کشش سے آزاد ہوگی تو سورج کے گرد گھوم سکے گی،

چاند زمین کے گرد کیوں گھومتا ہے؟ یہ چاند مشتری کے گرد بھی گھوم سکتا تھا چونکہ اس کے اندر بھی کشش ہے، مریخ و زحل و عطارد کے اندر بھی کشش ہے، جتنے سیارے اس وقت کشف ہو چکے ہیں ان سب کے اندر کشش ہے لیکن چاند فقط زمین کے گرد گھومتا ہے، کیوں؟ کیونکہ چاند نے پہلے اپنے آپ کو سب سیاروں کی کشش سے آزاد کیا ہے، ان کی کشش سے باہر آیا ہے اور اپنے آپ کو فقط زمین کی کشش میں قرار دیا ہے لہٰذا زمین کے گرد ہمیشہ گھومتا رہے گا۔

ہم کب خدا کے گرد گھومیں گے؟ جب غیرِ خدا کے جاذبے سے آزاد ہو جائیں گے یعنی ہمارا منظومہ اس وقت تک درست نہیں ہے، ہماری حرکتیں اس وقت تک درست نہیں ہیں جب تک ہم دنیوی جاذبوں سے آزاد نہ ہو جائیں۔ زمین کی حرکت کتنی موزوں ہے، آپ لمحات بلکہ لحظات کی تقسیم بھی کریں کہ ابھی تک انسان نے کیا کام کیا ہے، اس وقت انسان نے وقت کو تقسیم کیا ہوا ہے مثلاً صدیوں کے سال، سالوں کے مہینے، مہینوں کے ہفتے، ہفتوں کے دن، دنوں کے گھنٹے، گھنٹوں کے منٹ، منٹ کے سیکنڈ اور سیکنڈ کے مزید دقیقے بنائے ہوئے ہیں یعنی سیکنڈ کے ثانیے، ثانیے کے ثالثے، ثالثے کے رابعے، رابعے کے خامسے، خامسے کے ستے بنائے ہوئے ہیں، نجومی جو اوقات بتاتے ہیں کہ مثلاً سورج طلوع ہوگا تو وہ ہمیں ہماری زبان میں بتاتے ہیں کہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر طلوع ہوگا لیکن نجومی اپنی زبان میں کیا کہتے ہیں؟ سورج طلوع ہوگا چھے بج کر پانچ منٹ تیس ثانیے تیرہ ثالثے پندرہ رابعے سولہ خامسے پہ، ہمیں سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ یہ بیچ میں ثانیے وغیرہ کی کیا ضرورت ہے، چونکہ ہم ثانیے تک ہی سمجھ سکتے ہیں، ثانیے سے آگے زمان اتنا چھوٹا ہو جاتا ہے کہ

منظومۂ شمسی، منظومۂ انسان

ہمارے موٹے دماغ میں نہیں آسکتا ہے لیکن ریاضی دانوں کے، نجومیوں کے محاسبے میں آجاتا ہے، وہ ٹائم کو عاشریے تک تقسیم کرتے ہیں۔

زمین کا اتنا دقیق نظام کیوں ہے؟ اس کا اس قدر منظّم و مرتب نظام اس وجہ سے ہے کہ زمین کسی کے جاذبے میں ہے، اگر زمین آزاد ہوتی اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو کیا اتفاق رونما ہوتا؟ کبھی مریخ سے ٹکرا رہی ہوتی، کبھی مشتری سے ٹکرا رہی ہوتی، کبھی زحل سے ٹکرا رہی ہوتی، ہم کیوں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں؟ ہماری ٹکر کبھی اپنے ہم مذہب سے ہوتی ہے، کبھی مخالفِ مذہب سے ہوتی ہے، کبھی پڑوسی سے ہو جاتی ہے، کبھی اپنے ہی ہمدرد سے ہو جاتی ہے، ہم حجرہ سے ہو جاتی ہے، اس طرح ہم آپس میں کیوں ٹکراتے ہیں؟ چونکہ کسی کے جاذبے میں نہیں ہیں، اپنے حال پہ چھوڑے ہوئے ہیں، اگر کسی منظومہ کے اندر ہوتے، کسی کشش کے اندر ہوتے تو ہمارا بھی زمین کی طرح ایک مدار ہوتا کہ جس کے اندر ایک لحظے کیلئے بھی کوئی خلل رونما نہ ہوتا، امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ اگر سارے کے سارے انبیاء علیہم السلام فرض کریں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا علیہم السلام کو ایک بڑے حال میں جمع کر دیا جائے اور سو سال اکٹھے زندگی گزاریں تو ایک چھوٹے سے مسئلے پر بھی ان میں اختلاف رونما نہیں ہوگا، ایک دوسرے سے نہیں ٹکرائیں گے، کیوں نہیں ٹکرائیں گے؟ چونکہ سارے انبیاء علیہم السلام منظومۂ الٰہی میں پیوستہ ہیں اور منظومۂ خدا سے متصل ہیں یعنی سب کا محور خدا ہے۔

یہاں تو کوئی کسی کے گرد گھوم رہا ہے، کوئی کسی اور کے گرد گھوم رہا ہے، کوئی اِس شخصیت کا چاند بنا ہوا ہے، کوئی اُس شخصیت کا چاند بنا ہوا ہے، وہ شخصیت خود کسی جاذبے سے آزاد ہے لہٰذا

شخصیت شخصیت سے ٹکرا رہی ہے، چاند چاند سے ٹکرار ہے ہیں، اِس کے مرید اُس کے مریدوں سے اور اُس کے مرید اِس کے مریدوں سے ٹکرار ہے ہیں، اِس کے مقلدین اُس کے مقلدوں سے اور اُس کے مقلدین اِس کے مقلدوں سے ٹکرار ہے ہیں، کیوں؟ کیونکہ سب آزاد ہیں، کشش نہیں ہے یعنی اس جاذبۂ خدا سے آزاد ہو چکے ہیں، خدا نے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ ہم خدا کی کشش میں کب آئیں گے؟ جب دوسری کششوں سے اپنے آپ کو آزاد کرائیں گے اور یہی سخت ہے، زمین نے یہ کام کرلیا ہے، ستاروں، سیاروں نے اپنا یہ کام کرلیا ہے کہ اپنے آپ کو دوسری تمام کششوں سے آزاد کرا کے اپنا ایک منظومہ بنالیا ہے اوران کیلئے طے ہو گیا ہے کہ ہمیشہ سورج کے گرد گھومنا ہے۔

انسان نے یہ کام ارادتاً کرنا تھا، اسلئے خدا نے زمین وآسمان و پہاڑ اور سب سے پوچھا کہ ہم نے مدار مقرر کر کے آپ کو اس میں جبراً چلانا ہے یا آپ نے خود اپنا مدار ڈھونڈنا ہے؟

اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ......(۴)

بیشک ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا بس انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا......

یعنی ہم نے یہ امانت سب کو پیش کی کہ ہم مدار بنا کے دیں یا آپ خود اپنا مدار بنالو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم سے نہیں ہوسکتا ہے ہمیں بنا کر دو لیکن انسان نے خود قبول کرلیا،

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝

کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے۔

اس ظالم و جاہل کو نہیں پتہ کہ کتنا سخت کام اس نے اپنے ذمے لے لیا ہے؟ یہ مدار ڈھونڈنا کتنا سخت ہے؟ اور مدار پہ چلنا کتنا سخت ہے؟ یہ ہزار جاذبوں میں گرفتار ہو جائے گا تو اس کو اپنا مدار نہیں ملے گا، یہ کبھی اِس کے گرد گھومے گا، کبھی اُس کے گرد گھومے گا، اس کو فرصت ہی نہیں ہوگی کہ یہ خدا کی طرف آئے، طوافِ کعبہ کا ایک فلسفہ یہی ہے کہ انسان کو مدار مل جائے، کعبہ کے گرد جو گھمایا جاتا ہے کہ سات چکر لگاؤ تو یہ سات چکر اس لئے نہیں ہیں کہ تمہاری چربی بیلنسڈ (Balanced) ہو جائے بلکہ یہ سات چکر اس لئے ہیں کہ شاید ان سات چکروں میں سے کسی ایک آدھ چکر میں تمہارے پلے یہ بات پڑ جائے کہ ہمارا وہ نقطہ، وہ منظومہ کونسا ہے کہ جس کے گرد ہمیں گردش کرنا ہے۔ انسان ان کاذب مقناطیسوں کے جاذبوں سے آزاد ہو تو پھر منظومہٗ الٰہی میں پیوستہ ہوتا ہے اور منظومہٗ خدا سے متصل و متاثر ہوتا ہے۔

۹) طبیعت و فطرت میں محاذ آرائی

اسی طرح تمثیلی واقعات بھی پیمانے ہیں، کچھ واقعات کو اگر دینداروں کے سامنے پیش کریں تو تھوڑا جریمہ داران کا تقدس ہو جاتا ہے لیکن مولانا روم کے بقول کہانی و قصہ پیمانہ ہوتا ہے، آپ اس پیمانے کے اندر جو چیز موجود ہے اس پر توجہ رکھیں، پیمانے کو نہ دیکھیں کہ کیسا ہے، پیمانے

بھر کر اندر جو جام دیا جا رہا ہے اس کو دیکھیں، اگر آپ کسی جگہ جائیں اور وہاں آپ کو شربت بھر کر دیا جائے تو آپ گلاس گھما گھما کر نہ دیکھیں کہ گلاس کس قسم کا دیا ہے، یہ دیکھیں کہ اس کے اندر کیا پڑا ہوا ہے؟ یہ عورتیں کسی کے گھر جاتی ہیں اور ان کو وہاں چائے ملے تو عموماً ان کی ساری توجہ پیالی پہ ہوتی ہے کہ کونسا ماڈل ہے؟ کس سال کا ہے؟ اس کی قیمت کیا ہے؟ چائے کی طرف توجہ نہیں ہوتی ہے کہ چائے اچھی بنی ہے یا نہیں، پیمانہ بین نہ ہوں، اس پیمانے کے اندر جو کچھ ہے اسے دیکھیں۔

تمثیلی واقعات کی زبان بزرگان نے ہمیں سمجھانے کے لئے اختیار کی ہے، فقط ہماری تعلیم کی خاطر ہے، لیلیٰ مجنوں کا یہ قصہ بھی ایک پیمانہ ہے، اس کے اندر یہی جاذبہ و کشش بیان کی گئی ہے، مولانا روم نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ مجنوں کسی اور شہر میں تھا اور لیلیٰ کسی اور شہر میں، جس کو ایرانی لیلی کہتے ہیں، تلفظ کا فرق ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے جیسے بعض موسیٰ علیہ السلام کو موسی علیہ السلام تلفظ کرتے ہیں، ہرج نہیں ہے دونوں جائز الوجہین ہیں، یہ بھی غلط نہیں ہے لیکن ہمارے یہاں رائج اردو میں اسے زیادہ تر لیلی تلفظ کرتے ہیں۔ مجنوں نے لیلیٰ کی طرف جانے کا قصد کیا تو اس اونٹنی پہ سفر کیا کہ جو مجنوں نے پالی ہوئی تھی، اتفاق سے اونٹنی کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا، بچے کو مجنوں نے وہیں گھر میں باندھا اور اونٹنی لے کر سفر پر نکل گیا، سفر طولانی تھا، صحرائی سفر تھا، اونٹنی کو بار بار اپنا بچہ یاد آتا تھا یعنی اونٹنی اپنے بچے کی کشش میں تھی، جاذبہ اپنے بچے کی طرف تھا چونکہ ماں ہے اور ماں اور بچے میں بھی کشش ہوتی ہے، ماں بھی مرکزِ ثقل ہے، مرکزِ کشش ہے اور بچہ بھی مرکزِ کشش ہے، کبھی بچہ ماں کی کشش میں مبتلا ہوتا ہے اور کبھی مائیں بچوں کی، جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو ماں کی کشش میں مبتلا ہوتا

ہے لیکن تھوڑی مونچھیں نکلتی ہیں تو فقط بیچاری ماں اس کی کشش میں ہے، یہ حوزے میں آجاتا ہے اور خط تک نہیں لکھتا ہے، ان کو اطلاع تک نہیں دیتا ہے کہ میں خیریت سے ہوں، بھول جاتا ہے، ماں اس کی کشش میں مبتلا ہے اور یہ آزاد ہے۔

یہ اونٹنی اپنے چھوٹے بچے کی کشش میں مبتلا ہے اور مجنوں کس کی کشش میں مبتلا ہے؟ وہ لیلیٰ کے جاذبے میں ہے، یہاں پر اب جنگ ہے، اس تمثیل میں توجہ کریں کہ یہ خوبصورت تمثیل ہے، مجنوں جب بیدار ہے تو اونٹنی کی پشت پر بیٹھا ہوا ہے اور اونٹنی کی مہار مجنوں کے ہاتھ میں ہے، اس وقت اونٹنی کو سیدھا لیلیٰ کی طرف، شہرِ لیلیٰ کی طرف متوجہ رکھتا ہے لیکن چونکہ سفر زیادہ ہے اور سفر میں سختیاں ہیں، صحرا ہے، پیاس ہے، دھوپ ہے لہٰذا تھوڑا سا سایہ آتا ہے تو مجنوں کو اونٹنی کی پشت پر نیند آجاتی ہے اور جوں ہی مجنوں سوتا ہے تو وہ لگام ڈھیلی پڑ جاتی ہے، اونٹنی کی مہار ڈھیلی پڑتی ہے تو اونٹنی کو پتہ چل جاتا ہے کہ مجنوں سو گیا ہے، اونٹنی وہیں سے اپنا راستہ لیتی ہے اور اسے لے کر سیدھی واپس اپنے شہر کی طرف آجاتی ہے چونکہ اس کا بچہ وہاں پر ہے، تھوڑی دیر بعد پھر جب مجنوں آرام کر لیتا ہے، بقول ایرانیوں کے جب یہ چُرت لگا لیتا ہے، جب اپنی ایک جھپکی لے لیتا ہے تو پھر جاگ جاتا ہے، دیکھتا ہے کہ جو سفر طے کیا تھا پھر وہیں پر ہے، جہاں سے چلا تھا وہیں پر ہے، اونٹنی اس کو واپس وہیں پر لے آئی ہے، پھر دوبارہ اس کا رخ موڑتا ہے، لگام کھینچتا ہے اور اس کو دوبارہ شہرِ لیلیٰ کی طرف متوجہ کرتا ہے، یہ کشمکش اونٹنی اور مجنوں کے اندر موجود ہے، کیوں؟ کیونکہ محبوبِ مجنوں کسی اور شہر میں ہے اور محبوبِ ناقہ کسی اور شہر میں ہے، یہ تمثیل کس چیز کی ہے؟ یہ روح اور بدن کی تمثیل ہے۔

روح مجنوں ہے اور بدن ناقہ ہے، روح کی لیلیٰ خدا ہے اور بدن کی لیلیٰ چراگاہ ہے اور دونوں میں یہ کشمکش ہے، انسان کے اندر یہ طبیعت وفطرت کی جنگ ہے، دونوں دو الگ الگ چیزوں کی کشش میں آئے ہوئے ہیں، دونوں الگ چیزوں کی مقناطیسیت میں آئے ہوئے ہیں، ناقہ کسی اور مقناطیس کی کشش میں گرفتار ہے اور مجنوں کسی اور کی، مجنوں یعنی روح، مجنوں کا معشوق خدا ہے لیکن بدن کا معشوق طبیعت، عالم مادہ، خواہشات، شہوات، آرام، آسائش اور عافیت ہے۔ جوں ہی روح غافل ہوتی ہے، غفلت روح کی نیند ہے، مجنوں کا پشتِ ناقہ پر سوجانا غفلتِ روح ہے، روح کے غافل ہوتے ہی یہ ناقہ مجنوں کو بھی لے کر واپس آجاتا ہے، یوں تو نہیں ہے کہ مجنوں کو اتار کر کہ تیرا آدھا راستہ طے ہو گیا تو یہاں بیٹھ میں بچے سے مل کر واپس آؤں، نا، چونکہ یہ اس پر سوار ہے لہذا جب روح غافل ہو جائے تو بدن اس کو روح سمیت واپس انحطاط و پستی و ذلت میں ڈال دیتا ہے لہذا روح کو غفلت سے نکلنا ہے، روح کو بیدار و ہوشیار رہنا ہے، روح کو ایک لحظے کے لئے بھی غفلت نہیں برتنی اور اگر برتی تو اس کا سارا طے کیا ہوا سفر ایک لحظے کی غفلت سے واپس آجائے گا۔

۱۰) مولا علی علیہ السلام، فانی در ذاتِ خدا

مولا علی علیہ السلام ایک لحظے کیلئے بھی اپنے محبوب رب سے غافل نہیں ہیں لہذا ہلا ہلا کے نماز میں تیر کھینچ لیں لیکن اس انسان کو خبر نہیں ہے، یہ جب مناجاتِ خدا میں مشغول ہو جاتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی دنیا سے رحلت ہو گئی ہے، اس کی مناجات پڑھ کر آج لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے جو

اس طرح سے خدا کی بارگاہ میں مناجات پیش کرتا ہے؟ کیوں؟ کیونکہ اس کو سراپا جاذبۂ خدا نے اپنی طرف کھینچا ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانا تھا کہ

لَا تَسُبُّوا عَلِیًّا...... (۵)

تم علیؑ کو گالی نہ دو (برا نہ کہو)......

یعنی علی علیہ السلام کو ناسزا نہ کہنا، کیوں؟

فَانَّہ مَمْسُوسٌ فِیْ ذَاتِ اللّٰہِ......

بے شک یہ ذاتِ خدا میں ضم ہے (جذب ہے)......

مولا علی علیہ السلام مقناطیسِ خدا میں اس قدر مجذوب ہیں کہ علی علیہ السلام کا سراپا الٰہی مقناطیسیت میں گھرا ہوا ہے۔ اس لئے ماسوا اللہ کسی اور کے جاذبے میں مبتلا نہیں ہیں، دنیا آتی ہے تو کہتے ہیں کہ تجھے تین طلاقیں دیدی ہیں، اقتدار آتا ہے تو کہتے ہیں کہ تم میرے نزدیک پھٹے ہوئے جوتے سے بھی زیادہ بدتر ہو، امیر المومنین علیہ السلام غیر از خدا کسی جاذبے میں مبتلا نہیں ہیں، فقط اسیرِ جاذبۂ خدا ہیں، اس حالت میں انسان پر کلامِ محبوب اثر کرتا ہے۔

۱۱) مجنوں کیلئے لیلٰی کے خط کی اہمیت

لیلٰی کا خط اگر آج ہمیں مل جائے تو ہم اس کو ایک ادبی سند کے طور پر رکھیں گے، ادبیات میں ایک یہ خط بھی شامل کرلیں گے یا صرف پڑھ دیں گے لیکن اگر مجنوں کو لیلٰی کا خط مل جائے،

مولانا روم نے ایک اور واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن مجنوں کتے کے قدم کی جگہ کو چوم رہا تھا۔

همچو مجنون کاو سگی را می نواخت
بوسه اش می داد و پیشش می گداخت......(۲)
گرد او می گشت خاضع در طواف
هم جلابِ شکّرش می داد صاف
بو الفضولی گفت ای مجنونِ خام
این چه شَیدا ست این که می آری مُدام

یعنی ایک دن مجنوں کتے کی قدم گاہ کو چوم رہا تھا اور خاضع ہو کر اس قدم گاہ کے گرد گھوم رہا تھا، عاقل لوگ حیران تھے، چونکہ وہ مجنوں تھا اور باقی سارے عاقل تھے۔ کسی نے پوچھا کہ اے مجنون تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو اس کا اس قدر شیدائی ہے کہ یہ فضول کام انجام دے رہا ہے۔ مجنوں نے جواب دیا کہ تمہاری نظروں میں یہ فضول کام ہو گا لیکن اسے میری نظروں سے دیکھو،

گفت مجنون تو همه نقشی و تن
اندر آ و بنگرش از چشمِ من
کاین طلسم بستهٔ مولی است این
پاسبان کوچهٔ لیلی است این

مجنوں کیلئے لیلیٰ کے کتے کی اہمیت

ہمّتش بین و دل و جان و شناخت

کاوجا بگزید و مسکن گاہ ساخت

او سگ فرّخ رخ کہف من است

بلکہ او ہم درد و ہم لہف من است

آن سگی کہ باشد اندر کوی او

من بہ شیران کی دہم یك موی او

یعنی تم فقط ظاہر دیکھ رہے ہو جبکہ میرے پیشِ نظر اس کام کا باطن ہے۔ دراصل یہ کتا لیلیٰ کے کوچے کا پاسبان ہے۔ اس کا درد وغم میرا درد وغم ہے اور میں اس کتے کے ایک بال کا مقایسہ ومقابلہ کسی شیر کے بال تک سے نہیں کر سکتا ہوں۔

اس کا قدم لیلیٰ کے کوچے سے ہو کر آیا ہے لہٰذا تمہیں کیا معلوم کہ اس قدم کی کیا اہمیت ہے؟ مجنوں اس کتے کا قدم چومتا ہے کہ جو لیلیٰ کے کوچے سے ہو کر آتا ہے لیکن اگر لیلیٰ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک عبارت مجنوں کو مل جائے؟ اگر لیلیٰ کا خط مجنوں کو مل جائے تو کیا کرے گا؟ ہمیں ملے تو ہم کیا کہیں گے؟ ہم کہیں گے کہ یہ ایک عربی ادب ہے، ادبیات میں سے ایک کتاب ہے اور اس کو بھی سلیبس (Syllabus) میں ہونا چاہئے، لیلیٰ کا خط بھی حفظ کرنا چاہئے، اس کو حفظ کر کے اقامہ لینا چاہئے، اس کو حفظ کر کے الٹا پڑھنا چاہئے، سیدھا پڑھنا چاہئے اور مجنوں وہاں بیٹھ کر کلمہ بہ کلمہ رٹہ لگانا شروع کر دے، ہمارے لئے لیلیٰ کا خط ذریعۂ آمدن بن جاتا ہے، لوگوں کو جا کر کہیں کہ یہ لیلیٰ کا

مجنوں کے لیے لیلیٰ کے خط کی اہمیت

خط ہے، ابھی نیلام کریں اور اعلان کریں کہ لیلیٰ کا خط آیا ہے تو یہ خط کمائی کا ذریعہ بن جائے گا لیکن مجنوں کو اگر لیلیٰ کا خط مل جائے تو مجنوں کیا کرے گا؟ وہی مولانا روم کی تمثیل والا مجنوں یعنی روح، مجنوں کو اگر لیلیٰ کا خط ملے تو کیا کرے گا؟ مجنوں صرف خط پڑھے گا نہیں بلکہ خط سراپا وجودِ مجنوں کو گھیر لے گا، مجنوں وجد میں آجائے گا، مجنوں بے خود ہو جائے گا کیونکہ مجھے لیلیٰ نے پکارا ہے۔

یہ کلامِ خدا لیلیٰ حقیقی مومن ہے۔ جب خدا کا کلام، خدا کی عبارت ہمارے سامنے آئے تو ہم وجد میں کیوں نہیں آتے؟ کیونکہ صرف کلامِ خدا کو مُردوں کے لئے پڑھتے ہیں، مجنوں کو اگر کلامِ لیلیٰ ملے تو جا کر قبرستان میں مُردے کے ایصالِ ثواب کے لئے پڑھے گا کہ سطر سطر کا ثواب اس مردے کو پہنچے؟ نہیں بلکہ وہ تو وجد میں آجائے گا اور اس کو یہ کلام سراپا گھیر لے گا، یہ اس کو ایک ایک سطر پڑھنا شروع کر دیتا ہے کہ جو جو لفظ لیلیٰ لکھ رہی ہے، مجنوں کی حالت ہمیشہ اسی طرح ہے، روایات میں لکھا کہ ہے جب سید الشہداؑ نے حبیب ابن مظاہرؓ کو خط لکھا اور وہ خط جب حبیبؓ نے پڑھنا شروع کیا تو زوجہ حبیبؓ چہرہ حبیبؓ کو دیکھ رہی تھی اور سطر سطر پر حبیبؓ کی حالت و رنگت بدل رہی تھی، کیوں؟ کیونکہ لیلیٰ کا خط آیا ہے، یہ تاثر ہے، حبیبؓ کی کیفیت بدل گئی، خط دیکھ کر اور اسے ملاحظہ کر کے، اس پر نگاہ ڈال کر حبیبؓ کی کیفیت بدل گئی۔

قرآن کو دیکھ کر انسان کی کیفیت کیوں نہ بدلے کہ یہ میرے پروردگار کا، میرے معبود کا کلمہ ہے، یہ سطر، یہ عبارت، یہ سورہ، یہ آیت، یہ قرآن میرے معشوق کا کلام ہے، خدا کے ساتھ عاشقانہ رابطہ ہو، عبادتیں عاشقانہ کریں۔

۱۲) مشکلات میں شکرِ خدا

ہمارے حالات یہ ہیں کہ ہمیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو فوراً گلہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ یہ کیا گیا ہے؟ عرض کیا کہ یہ سارے قصے تمثیل ہیں، تمثیلات میں نہیں جانا ہے۔ ایک مرتبہ لیلیٰ شربت بانٹ رہی تھی، لوگ شربت لینے کے لئے اپنے اپنے کاسے و پیالے لے کر لائن میں کھڑے تھے، مجنوں بھی لائن میں کھڑا ہو گیا، سارے لوگ شربت کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور مجنوں لیلیٰ کے لئے، کسی کی نگاہ لیلیٰ پر نہیں ہے، سب کی نگاہ شربت پہ لگی ہوئی ہے لیکن مجنوں کی نگاہ لیلیٰ پہ ہے، جب مجنوں کی باری آئی تو سب کو وہ شربت بھر بھر کر دے رہی تھی لیکن مجنوں کی باری آنے پر اس کا پیالہ لے کر پتھر پر مار کر توڑ دیتی ہے، مجنوں ناچنا شروع کر دیتا ہے، مجنوں وجد میں آجاتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ تو تو بہت لیلیٰ لیلیٰ کرتا تھا، آخر یہی رابطہ تھا لیلیٰ کا کہ تو تو صبح و شام جیتا ہی لیلیٰ کے ذکر میں تھا؟ لیکن آخر اس نے تیرا کاسہ توڑ دیا، کہا نادانو غور کرو، تم میں سے کسی کا کیوں نہیں توڑا؟ تم بھی تو بہت سارے تھے، ہزاروں کی صف لگی ہوئی تھی، تم بھی اپنا کاسہ لے کر گئے لیکن تم میں سے کسی کا کاسہ کیوں نہیں توڑا؟ وجد میں آگیا کہ میرا کاسہ توڑ دیا اور شربت بھی نہیں دیا۔

یہ مجنوں کون ہے؟ مجنوں یعنی خدا پرست انسان، مجنوں خدا پرست انسان ہے اور لیلیٰ سے مراد خدا ہے، خدا کی نعمتیں بٹ رہی ہیں، کافر جاتا ہے بوری بھر کر دیتے ہیں، گاڑی بھی دیتے ہیں، بنگلہ بھی دیتے ہیں، ڈرائیور بھی ساتھ دیتے ہیں، سب کچھ دیتے ہیں، منافق جاتا ہے، فاسق جاتا ہے، فاجر جاتا ہے، دنیا دار جاتا ہے، تاجر جاتا ہے، سب جاتے ہیں اور سب کو دیتے ہیں لیکن

جب مومن بارگاہِ خدا میں آتا ہے تو جو اس کے گھر میں ہے وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، پھر یہ مومن گلہ کرنے لگتا ہے کہ خدا خدا کرتے تھے، یہی تمہارا خدا تھا؟ بلکہ وہ یہ کہے کہ خدا تو ہم سے زیادہ راضی ہے، یہاں مومن کو وجد میں آنا چاہئے کہ آخر خدا نے تمہیں کیوں مریض نہیں کیا؟ فقط مجھے کیوں مریض کیا ہے؟ آخر خدا نے تمہارا ہاتھ کیوں نہیں کاٹا؟ فقط میرا ہاتھ کیوں کاٹا ہے؟ آخر خدا نے تمہیں کیوں اس حالت میں مبتلا نہیں کیا ہے؟ مجھے کیوں اس حادثے میں، اس حالت میں مبتلا کیا ہے؟ اس لئے کہ کوئی ربط ہے، کوئی نظر ہے، کوئی عنایت ہے، یہ ہم پر عنایتِ خدا ہے ورنہ شربت مہم نہیں ہے بلکہ خدا مہم ہے، شربت نہ بھی ملا تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مولا علی علیہ السلام کیلئے لیلیٰ کون ہے؟ خدا ہے، اس لئے امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پروردگار تیری جنت کی لالچ میں وجد میں نہیں ہوں بلکہ تیرے جاذبے میں گرفتار ہوں، فھمتک نہیں کہا بلکہ فرمایا کہ

وَجَدْتُکَ أَهْلًا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُکَ......(۷)

(اے خدا!) میں نے تجھے لائقِ عبادت پایا تو میں نے تیری عبادت کی......

تیرے جاذبے میں گرفتار ہوں نہ کہ اوروں کے جاذبے میں گرفتار ہوں، تو معشوق ہے، یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان دوسرے جاذبوں سے نکلے۔

۱۳)عاشقانہ دعا و مناجات کریں

پس دعائیں عاشقانہ مانگیں، مناجات عاشقانہ ہوں، بعض لوگ خدا سے فقط تاجرانہ دعائیں مانگتے ہیں، یہ بھی دے دے، وہ بھی دے دے، فقط لینے کی بات کرتے ہیں، آپ خدا سے عاشقانہ بات کریں۔ دعائے ابوحمزہ ثمالیؒ دیکھیں کہ خدا کے ساتھ عاشقانہ بات کرتے ہیں کہ اے پروردگار اگر تو نے مجھے اپنی عنایتوں سے نہیں نوازا، اگر تیرا لطف میرے شاملِ حال نہیں ہوا تو میں کیا کروں گا؟ اِدلال کروں گا، اِدلال عاشقانہ باتیں کرنے کو کہتے ہیں، کیا کروں گا؟ دنیا کو پکار پکار کر کہوں گا کہ یہ میرا پروردگار و معبود ہے۔ انسان خدا کے ساتھ اس طرح سے متصل ہو تو اس وقت انسان پر کلامِ خدا اثر کرتا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن مسعود سے کہا کہ میرے لئے یہ آیہ پڑھو اور ابن مسعود نے وہ آیہ پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت دگرگوں ہوگئی، ابن مسعود کو رکنا پڑا، آیہ ختم کرنی پڑی کہ ابن مسعود سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال اس سے زیادہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☆ **فان الشوق والوجد مغناطیس القرب من عالم التوحید والملکوت......**

مسلکِ شوق، مسلکِ وجد ہونا چاہئے اور ہم وعدوں کے امیدوار بن کر آئے ہوئے ہیں، وعدے سن کر، ثواب سن کر اور بہت ساری چیزوں کی خاطر، بلکہ جاذبہ محبوب کی طرف ہو، جاذبۂ خدا کی طرف آؤ۔ شوق اور وجد عالم ملکوت کی مقناطیسیت ہے، کشش ہے، آمادہ دل اس میں آجاتا ہے لیکن غیر آمادہ دل کے لئے

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ○

لیلیٰ کا خط پڑھنا ایک عام آدمی کے لئے بہت دشوار ہے لیکن مجنوں کے لئے آرزو اور حسرت ہے،

یہ قربتِ خدا کا مقناطیس وکشش ہے۔ دعا بھی ایسے ہی ہوتی ہے، دعا کر کے جب انسان بارگاہِ خدا میں آجاتا ہے تو ملکوت کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے،

☆ ومن اشتد شوقه......

جس کا شوق شدید تر ہوتا جاتا ہے،

☆ اشتد انجذابه......

اس کا جاذبہ، اتصال وقرب بھی شدید تر ہوتا ہے اور محو بھی زیادہ ہوتا ہے، جتنا شوق بیشتر ہوتا ہے اتنی ہی مجذوبیت بیشتر ہوتی ہے۔

☆ واتصاله......

اس کا اتصال خدا کے ساتھ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، پھر انسان دوسری حالتوں سے باہر آجاتا ہے۔

۱۴) اہلبیت علیہم السلام کی سیرت میں جاذبۂ خدا

اہلبیت علیہم السلام کی سیرت پڑھیں، اہلبیت علیہم السلام کا فرد فرد ہمارے لئے اسوہ ہے، خصوصاً معصومینؑ تو یقیناً اسوہ ہیں، اہلبیت علیہم السلام کا خاندان اسوہ ہے چونکہ پروردۂ مکتبِ قرآن ہے، غیر معصومین جو

اہلبیتؑ کی اولاد میں سے تھے ان میں حسنِ مثنیٰ جو حضرت قاسمؑ کے بڑے بھائی تھے، انہوں نے سید الشہداءؑ سے خود جا کر حضرت سکینہؑ کا تقاضا کیا، رشتہ مانگا، حضرت سکینہؑ حضرت امام حسینؑ کی سب سے بڑی بیٹی کا نام ہے، برصغیر میں مشہور ہو گیا ہے کہ وہ چھوٹی بیٹی کا نام ہے، باقی ساری دنیا میں جو چھوٹی بیٹی ہے اس کا نام رقیہؑ ہے، سید الشہداءؑ کی سب سے چھوٹی بیٹی وہ تین سالہ بیٹی ہے اور واقعاً ہے لیکن ان کا نام رقیہؑ ہے، برصغیر میں ان کو سکینہؑ کہتے ہیں۔ سکینہؑ سب سے بڑی بیٹی کا نام ہے، جو زندہ رہیں اور بڑی باکمال خاتون تھیں، حسنِ مثنیٰ نے جب سید الشہداءؑ سے جنابِ سکینہؑ کا رشتہ مانگا تو امام حسینؑ نے فرمایا کہ ان سے شادی نہ کرو یعنی میری طرف سے اعتراض نہیں ہے لیکن یہ شوہرداری کا حق ادا نہیں کر پائے گی، لیکن کیوں؟ اس لئے کہ میری یہ بیٹی فانی در ذاتِ خدا ہے یعنی یہ بیٹی سراپا مجذوبِ خدا ہے، مقناطیسیتِ الٰہی نے، ملکوت نے اس کو گھیرا ہوا ہے، یہ بہت کم اس دنیا میں ہوتی ہے، زیادہ اُس عالم میں ہوتی ہے لہٰذا تمہاری توقع شاید پوری نہ ہو، یہ خاندانِ اہلبیتؑ کے اسوے ہیں۔

۱۵)قرآنی زبان سے مراد

☆ وتأثر العبد بالتلاوة والتدبر هوان يصير قلبه بصفة الاية المذكورة......

عبد قرآن پڑھتے ہوئے کس طرح سے متاثر ہو؟ جس طرح کی آیت آتی ہے یہ اسی صفت سے متصف ہو جائے۔ آیت میں خدا نے کیا کہا ہے؟ اسی طرح سے انسان بھی بنتا جائے، یعنی

حالات کے لحاظ سے اور عمل کے لحاظ سے تفسیرِ عملی آیت بنتا جائے،

☆ و یتخلق بھا......

انسان متخلق ہو، متخلق یعنی متصف ہو، متحقق ہو، ابھی ہم محقق آیات ہیں، متحقق آیات نہیں ہیں۔ ہمارے لئے آیات فقط وردِ زبان ہیں، فقط ہمارے ذہن اور حافظے میں ہیں اور ہمارے وجود میں نہیں ہیں، جس طرح سے یہ نقاش بعض چیزوں کے اوپر بڑی خوبصورت آیات لکھتے ہیں اور وہ جسم آیات سے مزین ہو جاتا ہے اسی طرح سے یہ آیات فقط ہمارے ذہن و حافظے و لائبریری و کاغذ میں نہیں ہوں بلکہ یہ آیات انسان کی صفات بن جائیں اور انسان کا عمل بن جائیں یعنی انسان قرآنی بن جائے، ایسا نہ ہو کہ جیسے ابھی رائج ہے، کرتبِ قرآنی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مثلاً بعض آیات ہیں کہ جو مناسبت رکھتی ہیں، ان کے اندر کوئی ایک آدھ جملہ ہے مثلاً کوئی آپ سے پوچھے کہ ٹائم کیا ہوا ہے؟ تو جواب دے کہ

اِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا○(۸)

بے شک وقت کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا مومنین پر فرض ہے۔

یا یہ آیہ پڑھ دے کہ

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ○(۹)

کہہ دیجئے: تم سے ایک دن کا وعدہ ہے جس سے تم نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ آگے بڑھ سکو گے۔

یہ جواب میں کہتا ہے کہ نماز وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے اور قیامت بھی آنے والی ہے، یہ قرآن کی زبان میں بولنا نہیں ہے، وہ آپ سے ٹائم پوچھ رہا ہے، یوں تو نہیں ہے کہ ادھر ساعت کا لفظ آیا اور آپ نے کوئی بھی ایسی آیہ پڑھ دی جس میں لفظِ ساعت آیا ہے، اگرچہ ساعت قیامت کے لئے کہا گیا ہو۔ آیہ کا ایک لفظ اگر سوال سے کوئی مناسبت رکھتا ہے تو کیا انسان وہ آیہ اسی مناسبت سے پڑھ دے؟ اگر کوئی آپ سے ایڈریس پوچھتا ہے تو اس کو کیا کہیں گے؟

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ○

صدر المتالھین ؒ فرمارہے ہیں کہ قرآن ہماری حالت وصفت بن جائے نہ کہ فقط کتاب، قرأت اور تلفظ و مفہوم رہے، ان حالات سے اپنے آپ کو متصف کریں یعنی فقط محققِ قرآن نہ ہوں بلکہ متحققِ قرآن بنیں، قرآن کی صفات سے متصف ہوں۔ اسی لئے کہا ہے کہ بے ربط آیات پڑھنا قرآن کی زبان میں بات کرنا نہیں ہے۔ یہ نہ ہو کہ جب کسی فقیر کو دیکھو تو مناسبت سے قرآن کی ایک آیت پڑھ دو مثلاً

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ......(۱۰)

شیطان تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے......

اور وہاں سے گزر جاؤ، یہ قرآنی زبان نہیں ہے، یہ کرتبِ قرآن ہے بلکہ جب انسان فقیر کو دیکھے تو وہ قرآنی حالت جو فقر کے مقابلے میں قرآن نے ذکر کی ہے انسان پر طاری و متجلی ہو یعنی جود وسخا وغنا۔ قرآن کی زبان میں بولنا یعنی قرآنی حالت انسان کے اوپر طاری ہونا، جتنی بھی اچھی

صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں وہ انسان کے وجود میں منتقل ہوں یعنی قرآن ہماری صفت، حالت اور عمل بن جائے، اس طرح سے عمل بن جائے کہ اگر کوئی ہمارے حالاتِ زندگی لکھے تو یہ تفسیرِ آیاتِ قرآن ہو، یہ ہوتا ہے انسانِ قرآنی اور اہلبیت علیہم السلام کے حالاتِ زندگی اسی طرح سے ہیں۔ ائمہ اطہار علیہم السلام اور بالخصوص خود پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسم قرآن تھے، نمونہ خودِ قرآن تھے۔ اگر کوئی امیر المومنین علیہ السلام کے حالاتِ زندگی لکھے تو یہ تفسیرِ قرآن ہے۔ نہج البلاغہ تفسیرِ قرآن ہے۔

انشاء اللہ اس فصل کے حصہ سوئم میں اثر لینے کے لحاظ سے انسانوں کی اقسام اور قرآن کی مختلف آیات سے اثر لینے سے متعلق گزارشات درج کی جائیں گی۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ حشر، آیہ۲۱)

(۲)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۵۱)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۴۵)

(۴)......(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۷۲)

(۵)...(غریب الحدیث فی بحار الانوار، الجزء۳، صفحہ۱۹۷)(شرح نہج البلاغہ - جعفری)(شعراء الغدیر فی القرن الحادی عشر، الجزء۷، صفحہ۱۸)

(۶)...(مثنوی معنوی، بہ تصحیح :رینولد ا.نیکلسون، دفتر سوم، صفحہ ۳۶۳)

(۷)......(الامام علیؑ ونہج البلاغہ، الجزء ۱، صفحہ ۱)(مرآة العقول فی شرح اخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسی، الجزء ۷، صفحہ۸۱)(شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء ۳، صفحہ ۲۳۷)(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۶۷، صفحہ۱۸۶)(میزان الحکمة - الریشھری، الجزء ۱۱، صفحہ۳۱۳)(مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازیؒ، الجزء ۷، صفحہ ۵۷)

(۸)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۱۰۳)

(۹)......(سورۂ مبارکہ سبا، آیہ۳۰)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۶۸)

فصلِ ادب هشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّه سوم)

١)اقسامِ انسان بلحاظِ اوصاف

☆صاحبِ اوقات

☆صاحبِ احوال

☆صاحبِ مقامات

٢)قسی القلب،غیر متاثر نفس

٣)آیاتِ وعید کاانسان پر اثر

٤)خداکی ربوبیت رحمانی هے

٥)خداکا غضب بهی بغیر رحمت کے نهیں

٦)آیاتِ رحمت کا اثر

٧)هر عبادت کی بنیا د معرفت هے

٨)گستاخ افراد کے اقوال پر مشتمل آیات کا اثر

٩)جنت کے ذکر کا انسان پر اثر

١٠)جهنم کے ذکر کا انسان پر اثر

۱۱)رسول اللهﷺ کی قرآن سے اثر لینے کی کیفیت

۱۲)فقط حاکیٔ قرآن نہ بنیں بلکہ متحققِ قرآن بنیں

۱۳)آیاتِ توکل کا انسان پر اثر

۱٤)آیاتِ صبر کا انسان پر اثر

۱۵)انسان میں قرآنی صفات پیدا نہ ہونے کا نتیجہ

۱٦)غیر متاثر افراد کیلئے قرآن کیا کہتا ہے؟

۱۷)قرآن کا ہدف، انسان کو صفاتِ ربوبیہ سے متصف کرنا

۱۸)اعلیٰ مرتبۂ معرفت

جب معارفِ قرآن صفاتِ راسخۂ انسان بن جائیں تو اس وقت انسان کے اندر ان اوصاف کی علامات ظاہر ہوتی ہیں مثلاً جب انسان خوف وخشیتِ خدا کی آیات پڑھتا ہے تو اس وقت حقیقتاً متصف باخشیتِ الٰہی ہو جائے، البتہ اہل معرفت نے ان اوصاف کو تقسیم کیا ہے۔ یہ اوصاف کبھی فقط بصورتِ اوقات ہیں، کبھی بصورتِ حال ہیں اور کبھی بصورتِ مقامات ہیں۔

۱)اقسامِ انسان بلحاظِ اوصاف

☆صاحبِ اوقات

وقت اس کو کہتے ہیں کہ وقتی طور پر، تھوڑی دیر کے لئے ایک وصف یا ایسی حالت انسان پر طاری ہوتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ختم ہو جاتی ہے، اکثریت میں ایسا ہی ہوتا ہے مثلاً اگر کسی اچھی مجلس ومحفل میں جا بیٹھے اور وہاں پر انسانوں کو خوفِ خدا دلایا جا رہا ہو تو وقتی طور پر، اس محفل میں موجودگی کی حد تک دل میں خوف آجاتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے یہ خوف انسان کے دل سے نکل جاتا ہے، جب یہ اس محفل ومجلس سے باہر جاتا ہے تو انسان پر ایک دوسری حالت طاری ہو جاتی ہے، یہاں وقت اصطلاح ہے، ان کی اصطلاح میں یہ وقت ہے اور ایسے انسان کو صاحبِ اوقات کہتے ہیں یعنی ان پر وقتی صفات طاری ہوتی ہیں اور پھر انسان ان صفات سے عاری ہو جاتا ہے۔

☆صاحبِ احوال

بعض لوگ صاحبِ احوال ہیں، صاحبِ احوال یعنی تھوڑی زیادہ دیر کیلئے یہ مثبت صفات انسان کے اوپر طاری ہوتی ہیں، کچھ عرصہ یہ صفات انسان کے اندر رہتی ہیں لیکن پھر ختم ہو جاتی ہیں، تدریجاً غیر محسوس طور یہ صفات انسان کے اندر سے ختم ہو جاتی ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی کافی تعداد اس طرح سے ہے یعنی صاحبِ احوال ہوتے ہیں۔

☆صاحبِ مقامات

کچھ انسان صاحبِ مقامات ہوتے ہیں، صاحبِ مقامات وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے اندر یہ اچھی صفات ہمیشہ کیلئے راسخ ہو جاتی ہیں اور ہرگز ترک نہیں ہوتیں، مقام اسی قیام گاہ سے ہے یعنی یہ صفات انسان کے اندر آ کر قیام کر لیتی ہیں اور راسخ ہو جاتی ہیں، انسان کے وجود اور قلب و روح کا حصہ بن جاتی ہیں اور انسان اس وجہ سے صاحبِ مقام ہو جاتا ہے یا اس طرح سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ انسانِ سالک، سالک الی اللہ یعنی جو قربِ خدا کی طرف جا رہا ہے، سفرِ قربِ خدا طے کر رہا ہے، یہ انسان سفرِ تکاملی کی منزلیں، مرتبے اور مرحلے طے کرتا ہے، جس طرح سے ہم زمینی سفر طے کرتے ہیں تو بعض جگہ منزلیں ہوتی ہیں، بعض جگہ سفر کے مرحلے ہوتے ہیں، سفر کو یا مسافت کو انسان نے تقسیم کیا ہوتا ہے مثلاً اس شہر سے اُس شہر تک یا اس منزل سے اُس منزل تک۔ مقصدِ اصلی تک پہنچنے سے پہلے پہلے انسان نے اپنے سفر کے لئے کئی منزلیں مقرر کی ہوتی ہیں، اسی طرح سے

سفرِ قربِ خداوندِ تبارک وتعالیٰ بھی ہے، انسانِ سالک جب اللہ کی طرف نکلتا ہے تو ہجرت کرتا ہے،

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۝(۱)

اور جو بھی راہِ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے خدا اور رسول کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے گا اس کے بعد اسے موت بھی آجائے گی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ انسان جب خدا کی طرف جاتا ہے، ہجرت کرتا ہے تو مقامات ومنزلیں طے کرتا ہے، بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں کہ جہاں تھوڑی دیر کے لئے رکتا ہے اور پھر وہاں سے نکل جاتا ہے، اسے منزل یا جائے نزول کہتے ہیں، جہاں شب گزارنے کے لئے پڑاؤ ڈالا جاتا ہے، جس طرح قافلے زمینی سفر کرتے ہیں کہ جیسے قدیم زمانوں میں قافلے پیدل یا اونٹوں اور گھوڑوں پہ سفر کرتے تھے اور ایک رات کے لئے ایک منزل پر رک جاتے تھے، اس کو منزل کہتے ہیں، جائے نزول یعنی وقتی طور پر پڑاؤ ڈالنا اور پھر دوسرے دن وہاں سے آگے کوچ کرتے تھے، سفرالی اللہ کی بھی منزلیں ہیں، بعض بزرگان نے اس کی منزلیں ذکر کی ہیں، بعض نے ہزار منزلیں ذکر کی ہیں، بعض نے سو منزلیں ذکر کی ہیں اور کچھ مقامات ہیں یعنی یہ انسانِ سالک سفر کے کچھ ایسے درجات ومرحلے طے کرتا ہے کہ یہ وہاں قیام کرتا ہے اور وہ جگہیں اس کی قیام گاہ میں تبدیل ہوجاتی ہیں لہٰذا ان کو مقامات کہتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ صاحبِ مقامات جب قرآن پڑھ رہا ہے تو خشیتِ خدا ہے اور جب قرآن بند کر دے تو خشیت ختم ہو جاتی ہے، بلکہ خشیت اس کے لئے ایک مقام ہے، مقامِ سالکین میں سے ایک خشیت ہے یا اگر مقامِ صبر کی آیت آئی ہے، استقامت کی آیت آئی ہے تو صبر و استقامت اس کے لئے ایک مقام بن چکا ہے، شکر کی آیت آچکی ہے تو اس کے لئے شکر ایک مقام بنا ہوا ہے، یعنی قرآن کے اثنا میں بھی شاکر ہے اور جب قرآن پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو بھی شاکر ہے یعنی یہ صفتِ قرآنی و مضمونِ قرآنی و تعلیمِ قرآنی اس کے وجود میں منتقل ہو گئی ہے۔

ضروری نہیں ہے کہ فقط پڑھتے ہوئے اس کی یہ حالت ہو بلکہ یہ صفت قرآن نے اس کے اندر دائماً منتقل کر دی ہے، یہ شاکرِ ہمیشگی اور شاکرِ دائمی ہے، جیسے صلوٰۃِ دائمی ہے یعنی انسان ہمیشہ نماز میں ہو، دائم الصلوٰۃ ہو، ضروری نہیں ہے کہ دائم الصلوٰۃ ہمیشہ مصلے پر ہو، نہیں بلکہ اگر گھر میں ہو تو بھی دائم الصلوٰۃ ہو، دفتر میں ہو تب بھی دائم الصلوٰۃ ہو یعنی وہ ہر جگہ کو اپنا مصلیٰ ہی سمجھتا ہے، مصلیٰ یعنی جائے صلوٰۃ، صلوٰۃ یعنی حضور در بارگاہِ خدا، اگر انسان ہمیشہ حاضر در بارگاہِ خدا ہو تو دائم الصلوٰۃ ہے، دفتر میں ہو تو بھی دائم الصلوٰۃ ہے یعنی بارگاہِ خدا میں ہے، راستے میں ہو تو بھی بارگاہِ خدا میں ہے، گاڑی میں ہو تو بھی بارگاہِ خدا میں ہے، گھر میں ہو تو بھی بارگاہِ خدا میں ہے، دستر خوان پر ہو تو بھی بارگاہِ خدا میں ہے، یہ بھولتا نہیں ہے کہ میں بارگاہِ خدا سے نکل کر کسی جگہ پر آ گیا ہوں، سارا عالم مظہرِ خدا ہے، سارا جہانِ ہستی مظہرِ خدا ہے، پوری دنیا اس کا مصلیٰ ہے، ساری زمین اس کا مصلیٰ ہے، ہر جگہ اور ہر ذرہ اس کا مصلیٰ ہے، جہاں بھی دیکھتا ہے وہ بارگاہِ خدا میں سجدہ کرتا ہے، خضوع و خشوع کرتا ہے، یہ ہے دائم

الصلوٰۃ انسان لیکن بعض ایسے ہیں کہ جو فقط اوقات میں صلوٰۃ میں ہیں یعنی صلوٰۃ کے مقابلے میں فقط صاحبِ اوقات ہیں، بعض صاحبِ احوال ہیں اور بعض صاحبِ مقامات ہیں لہٰذا قرآنی تعلیمات اور قرآنی معارف سے جب ہم متاثر ہوں یعنی ہمارے وجود میں قرآنی معارف منتقل ہوں تو اس طرح سے منتقل ہوں کہ ہمیشہ کے لئے ہمارا وجود قرآنی بن جائے، قرآن ہمیشہ کے لئے یہ معارف ہمارے اندر منتقل کر دے، یہ انسان انسانِ قرآنی ہو جاتا ہے، اس انسان کا عمل قرآنی ہے، اس کی بات قرآنی ہے، اس کی حرکات وسکنات قرآنی ہیں، اس کی ضمام اب قرآن کے ہاتھ میں ہے، یہ متاثر ہونے کا ایک مرحلہ ومرتبہ ہے۔ پس کچھ لوگ اس سفرِ قربی میں صاحبِ مقامات ہیں، کچھ لوگ صاحبِ احوال ہیں اور کچھ صاحبِ اوقات ہوتے ہیں۔

۲)قسی القلب،غیر متاثر نفس

کچھ لوگ قسی القلب ہیں لہٰذا وہ صاحبِ اوقات بھی نہیں ہوتے ہیں، جن کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝(۲)

ان کے لئے سب برابر ہے، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر گویا مہر لگا دی ہے کہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور

آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں۔ان کے واسطے آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

یہ نہ صاحبِ اوقات ہیں، نہ صاحبِ احوال ہیں اور نہ صاحبِ مقامات ہیں یعنی اصلاً سرے سے سالک ہی نہیں ہیں، ان کے اندر یہ صفات آتی ہی نہیں ہیں، یہ اس راہ کے راہی نہیں ہیں، صاحبِ اوقات یعنی جن کے اندر یہ صفات وقتی طور پر آتی ہیں، مثلاً انسان قرآن پڑھتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے اثر ہوتا ہے لیکن شقی اور قسی القلب پر سرے سے ایک لحظے کے لئے بھی قرآن کا اثر نہیں ہوتا ہے، جن پر اثر ہوتا ہے وہ یا صاحبِ اوقات ہیں یا صاحب احوال ہیں یا پھر صاحبِ مقامات ہیں۔اگر انسان اس طرح سے متاثر نہ ہو تو فرماتے ہیں کہ یہ فقط حکایت وحا کی قرآن ہے، جس طرح سے عموماً انسان پڑھتا ہے مثلاً بہت ساری عبارتیں درو دیوار پہ لکھی ہوتی ہیں، اِدھر اُدھر لکھی ہوتی ہیں، بعض اچھی عبارتیں، بعض مفہومی اور بعض غیر مفہومی عبارتیں پڑھ کر انسان اجنبی طور پر گزر جاتا ہے، اس کا فائدہ نہیں ہے بلکہ قرآن نے خود اس کی مذمت کی ہے کہ

وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ۝ (۳)

ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور بس وہ اپنے خیالِ خام میں رہتے ہیں۔

بعض ایسے لوگ ہیں کہ جو کتاب سے فقط امانی کی حد تک آشنا ہیں اور امانی سے آگے نہیں بڑھتے ہیں، امانی کا معنیٰ فرماتے ہیں کہ امانی سے مراد یعنی فقط قرأتِ قرآن کرتے ہیں، تلاوتِ قرآن کرتے ہیں لیکن اس سے آگے ان کو قرآن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے چونکہ نفسِ مستعد نہیں

رکھتے ہیں، قرآن سے اثر قبول کرنے کے لئے ان کا نفس آمادہ نہیں ہے، متاثر نفس نہیں ہے، غیر متاثر نفس ہے یعنی قسی وشقی وسخت اور پتھر دل ہے کہ جس پر قرآن اثر نہیں کر رہا ہے۔

۳) آیاتِ وعید کا انسان پر اثر

صدر المتألھین فرماتے ہیں کہ اگر انسان وعید کی آیات پر پہنچے،

☆ فعند الوعيد يتضائل......

وعید یعنی دھمکی، خوف، جہنم، دنیوی واخروی عذاب اور قرآن کے بیان کردہ عذاب یعنی عذاب النار، عذاب الیم، عذابِ مھین، عذابِ عظیم، عذابِ شدید، عذاب الحریق، عذابِ مقیم، عذاب الھُون، عذاب الخلد، عذاب الخزی، عذابِ غلیظ، عذاب السعیر، عذابِ واصب، عذاب الجحیم، عذاب الحمیم، عذاب السموم اور عذابِ مستقر۔

یتضائل یعنی یتصاغر لہٰذا جب انسان آیاتِ عذاب و وعید پر پہنچتا ہے تو کوچک ہو جائے، چھوٹا ہو جائے، اپنے آپ کو حقیر سمجھے، اپنے اندر چھوٹے پن کا احساس کرے، انسان کے اندر تکبر نہ آئے۔ اس وقت اپنے اندر خوفِ خدا محسوس کرے۔

☆ من خيفته.....

خوفِ خدا سے،

☆ كأنه يكاد يموت.....

اس طرح سے اپنے آپ کو چھوٹا کرے، کوچک کرے کہ گویا یہ مرنے والا ہے، جب وعید کی بات آئے، دھمکی کی بات آئے، جہنم اور عذاب کی بات آئے تو انسان پر یہ حالت طاری ہو جائے کہ ابھی اس کی روح نکلنے والی ہے۔ اس طرح سے یہ احساس اس کے اوپر چھا جائے کہ انسان مرنے والا ہو جائے، جس طرح سے جب کسی انسان پر خوفِ شدید مُستَوَلی ہو جاتا ہے، مسیطر ہو جاتا ہے، مسلط ہو جاتا ہے، چھا جاتا ہے، خوف اس کے سراپا وجود کو گھیر لیتا ہے تو انسان پر موت جیسی کیفیت طاری ہوتی ہے، اسی طرح سے انسان جب قرآن پڑھ رہا ہو اور آیاتِ خوف اور آیاتِ وعید سے گزر رہا ہو تو ایسے لگ رہا ہو کہ جیسے ابھی یہ مرنے والا ہے، جیسے ذکر کیا کہ ھمام پر اثر ہوا باا ینکہ امیر المومنینؑ خوف بیان نہیں فرمارہے تھے بلکہ تقویٰ بیان فرمارہے تھے لیکن اس کا نفس سننے کے لئے اس قدر آمادہ تھا کہ موت واقع ہوگئی۔

٤)خدا کی ربوبیت رحمانی ہے

☆وعندالتوسع ووعد المغفرة......

توسیعِ رحمتِ خدا یعنی وسعتِ رحمتِ خدا، خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں بھی فرمایا ہے

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ .... (۴)

اور میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے.....

ہر شے پر رحمتِ خدا شامل ہے، کل جہانِ ہستی مشمولِ رحمتِ خدا ہے، مرحوم ہے، مرحوم یعنی جس کے اوپر رحمت نازل ہوئی ہے، رحمت یافتہ ہے، بدونِ رحمت نظامِ ہستی قائم نہیں ہے، ربانیت و ربوبیتِ خدا در حقیقت رحمانیت ہے، اس کے اندر رحمانیت ہے، اسماء وصفات خدا بہت زیادہ ہیں لیکن سورۂ فاتحہ کی ابتداء میں فرمایا کہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ٥ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ٥ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ٥

یعنی وہ عالمین کا رب ہے اور خداوند تبارک وتعالیٰ کی یہ ربوبیت رحمانی ربوبیت ہے مثلاً جس طرح یونیوسٹیز میں مدیریت پڑھائی جاتی ہے یعنی ایڈمنسٹریشن (Administration)، یہ ایک پورا علمی شعبہ ہے، ابھی حوزوں یا مدرسوں میں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے، شاید ایک صدی اور لگے گی کہ جب دینی اداروں میں بھی اس چیز کی اہمیت کی طرف توجہ آئے گی کہ مدیریت خود ایک فن ہے، مدیریت کی اقسام بیان کی جاتی ہیں، مثلاً ایک مدیریت، مدیریتِ پاداشی ہے یعنی انسان ایسی مدیریت کرے کہ اپنے ماتحتوں کو ہمیشہ صلہ، معاوضہ اور تنخواہ دے کر ان کو لالچ دے اور کام نکال لے۔ ایک مدیریتِ دوستانہ ہے یعنی انسان اپنے ماتحتوں کا دوست بن جائے اور ان کے ساتھ دوستی کے باب سے وارد ہو اور کاریگروں کے ساتھ مزدوروں کے ساتھ ایک ایڈمنسٹریٹر اور دوست بن کر ان سے کام نکلوائے اور ایک مدیریتِ استبدادی ہے یعنی مستبد طور پر انسان اپنے ماتحتوں پر سختی کرے، ان کو خوف دلائے اور کوڑے کے ذریعے سے ان سے کام لے، یہ بھی ایک نوعِ مدیریت ہے، یہ ساری مدیریت کی اقسام ہیں، سب کے تجربے لکھے ہوئے ہیں یا ان کتابوں میں

درج ہیں کہ کونسی مدیریت کتنی کامیاب ہے، یہ ایک پورا فن ہے، اسی طرح سے ربوبیت بھی ہے لیکن مدیریت اور ربوبیت میں فرق ہے، فرض کریں کہ والدین جو مظہرِ ربوبیتِ خدا ہیں، ان کی بھی یہی صورت ہے، بعض والدین اپنے بچوں کے ساتھ معاوضہ، لالچ اور ان چیزوں سے وارد ہوتے ہیں اور بچوں کی تربیت کرتے ہیں، ربوبیت کرتے ہیں یا مظہرِ ربوبیتِ خدا بنتے ہیں، بعض والدین استبدادی ربوبیت کرتے ہیں، بچوں کو سانس نہیں لینے دیتے ہیں، ہمیشہ بچوں کے سر پر کوڑا لٹکائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو ادب ہم سکھائیں گے اور تربیت بھی کریں گے، بعض والدین کی دوستی کی ربوبیت ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ گھل مل کر دوست بن جاتے ہیں اور بچوں کی تربیت کرتے ہیں اور بھی گوناگوں اقسام ہیں۔

استبدادی تربیت یافتہ انسان کا مزاج بھی الگ ہوتا ہے، دوستی کی مدیریت کے اندر تربیت یافتہ یا ربوبیت کے اندر تربیت یافتہ انسان الگ ہوتا ہے، بچوں کو دیکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ کس ماحول سے آیا ہے؟ اس کے گھر کا ماحول کیسا تھا؟ اس کے والدین کیسے تھے؟ لیکن ربوبیتِ خداوند تبارک و تعالیٰ ربوبیتِ قہاریت نہیں ہے باوجود اینکہ ذاتِ خدا قہار ہے، خدا کی صفاتِ جلالیہ بھی ہیں لیکن خداوند تبارک و تعالیٰ کی ربوبیت جلالی نہیں بلکہ جمالی ہے یعنی عالمین کی تدبیر رحمت، رحیمیت، رحمانیت، جمال، کرم اور کریمیت سے ہو رہی ہے،

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ٥(۵)

اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے کریم پروردگار کے بارے میں دھوکے میں رکھا؟

۵)خدا کا غضب بھی بغیر رحمت کے نہیں

اگر چہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی بہت ساری صفات ہیں لیکن غالب صفات رحم وکرم پر مشتمل ہیں لہٰذا غضب بھی ہے لیکن خدا کی مدیریت، مدیریتِ غضبیہ نہیں ہے، عالمین کو خدا نے غضب سے تدبیر نہیں کیا ہے یا غضب کی ربوبیت انجام نہیں پا رہی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ایک لمحے کیلئے بھی اگر خدا کا غضبِ خالص نازل ہو جائے تو ہر چیز نابود ہو جائے گی۔ غضبِ خالص یا غضبِ محض خدا کی طرف سے کبھی بھی نازل نہیں ہوتا ہے حتیٰ دشمنان پر، حتیٰ شیطان پر اور حتیٰ کسی اور پر چونکہ سب مخلوقِ خدا ہیں، اپنی مخلوق پر تو خالق کبھی بھی غضبِ محض نہیں کرتا ہے مثلاً جس طرح سے والدین بچے پر غضبناک ہوتے ہیں تو وہ غضبِ محض نہیں ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہوتی ہے کہ بچہ والدین کے غضب کا شکار ہو کر بھی والدین کے ساتھ ہی رہتا ہے، والدین پھر بھی اس کو گلے لگاتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ غضبِ محضِ خالص نہیں تھا، اگر غضبِ محض ہوتا تو ماں اس کو دوبارہ کیوں گلے لگاتی؟ اور جب ماں کا طمانچہ جھیلتا ہے، تھپڑ کھاتا ہے تو اسی تھپڑ کے اندر، طمانچے کے اندر اس کی مہربانی اسے محسوس ہو رہی ہوتی ہے، اگر ہمسایہ آکر تھپڑ مارے تو شاید بچہ اس سے زیادہ تکلیف محسوس کرے لیکن اس سے زیادہ سخت تر ماں مارتی ہے لیکن اتنا چیختا چلاتا نہیں ہے چونکہ ماں کے طمانچے میں مہربانی، شفقت و رافت اور ماں کی ممتا موجود تھی جو اس نے باقاعدہ محسوس کی لہٰذا خدا کے غضب میں بھی رحمت موجود ہے، متعدد دعاؤں اور مناجات میں آیا ہے کہ

يَا مَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ.... (٦)

اے وہ ذات کہ جس کے غضب پر اس کی رحمت مقدم ہے......

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ بِالرَّحْمَۃِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَکَ......(۷)

اے اللہ میں تجھ سے تیری رحمت کے واسطے سوال کرتا ہوں جو تیرے غضب پر سبقت رکھتی ہے......

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی رَحْمَتِہِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَہٗ......(۸)

اللہ کی تعریف ہے اس رحمت پر جو اس کے غضب پر مقدم ہے......

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَبَقَتْ رَحْمَتُہٗ غَضَبَہٗ......(۹)

وہ ذات پاک ہے کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے......

سَبَقَتْ رَحْمَتُکَ غَضَبَکَ......(۱۰)

اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے......

وَاَنْتَ الَّذِیْ تَسْعٰی رَحْمَتُہٗ اَمَامَ غَضَبِہٖ......(۱۱)

تو وہ ہے جس کی رحمت اس کے غضب سے آگے چلتی ہے......

خدا کا غضب بھی بغیر رحمت کے نہیں

یعنی خدا جب انسان کے اوپر غضبناک بھی ہوتا ہے تو رحمت کے لفافے میں لپیٹ کر غضب نازل کرتا ہے، جن انسانوں پر خدا نے غضب کرنا ہے تو پہلے غضب کو رحمت میں لپیٹتا ہے ورنہ غضبِ محض سے تو یہ نابود ہو جائے، نیست ہو جائے۔ غضب محض سے یہ دنیا، یہ مخلوق خدا تباہ و برباد ہو جائے۔ خالق کبھی بھی رحمت کے بغیر غضب نہیں کرتا ہے۔

٦)آیاتِ رحمت کا اثر

جن اسماء اللہ و صفاتِ خداوند تبارک و تعالیٰ کے ساتھ یہ جہان چل رہا ہے، جب آیاتِ قرآن میں انسان ان پر پہنچتا ہے، آیاتِ رحمت پر پہنچتا ہے، آیاتِ توسیع پر پہنچتا ہے، آیاتِ بشارت پر پہنچتا ہے، آیاتِ نعمت پر پہنچتا ہے تو انسان پر اثر ہو؟ کیسا اثر ہو؟

☆ **یستبشر......**

یعنی انسان خوشحال ہو اور یہ خوشحالی نظر آئے، محسوس ہو کہ خوشحال ہے،

☆ **کانہ یطیر من الفرح......**

اتنا خوشحال ہو کہ گویا خوشی سے اُڑ رہا ہے۔ ہم خوشحال کب ہوتے ہیں؟ جب ہماری جیب میں کچھ آتا ہے، قرآن میں آیاتِ نعمت و رحمت و توسیع پر خوش حال نہیں ہوتے ہیں، جب پیٹ میں کچھ آئے تو خوشحال ہوتے ہیں یعنی ہم نعمتوں پر خوش حال نہیں ہیں یا قرآن کی آیات کے اوپر خوشحال نہیں ہوتے چونکہ ہم پر اثر نہیں ہوتا ہے بلکہ اثر اس وقت ہوتا ہے کہ جب ہماری دنیا یا پیٹ بھرے، اس وقت ہم خوشحال ہو جاتے ہیں یعنی ہماری خوشی شہوانی خوشی ہے، قرآنی خوشی نہیں ہے، روتے بھی ہیں تو تب کہ جب ہماری انا کو ٹھیس پہنچتی ہے، جب ہمیں کوئی تکلیفِ جسمانی ہو تو ہم رو پڑتے ہیں۔

ہم میں عقلانی، الٰہی اور قرآنی غم نہیں ہے، ہم قرآن کے غم میں نہیں روتے ہیں، قرآن پڑھتے ہوئے گریہ نہیں کرتے ہیں، جب اپنا کوئی عزیز مرتا ہے تب گریہ کرتے ہیں یا جب ہمارے احساسات مجروح ہوتے ہیں تو پھر گریہ کرتے ہیں، معرفت سے گریہ نہیں کرتے ہیں، معرفت ہمیں

نہیں رلاتی ہے حالانکہ قرآن مجید نے ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ قرآن پڑھا کرتے تھے تو بعض قدسیانِ مسیحی آ کر قرآن سنتے تھے اور قرآن سن کر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں حالانکہ یہ مسیحی تھے لیکن ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں، کیوں بھر جاتی تھیں؟ اس معرفت کی وجہ سے جو حق کے بارے میں ان کو حاصل ہوئی تھی یعنی یہ معرفت کا رونا تھا، عرفان کا رونا تھا، عرفانی رونا اس کو کہتے ہیں کہ انسان کو معرفت رلائے چونکہ حقیقت کشف ہوگئی ہے، انسان حقیقت کے انکشاف پر روتا ہے، یہ حقیقت انسان کو رلاتی ہے نہ کہ احساسات ابھرے ہیں کہ انسان اس وجہ سے روتا ہے۔

☆ **وعند ذكر صفات الله و اسمائه......**

اور جب اسماء اللہ کا تذکرہ آجائے، قرآن میں جابجا آیات کے اختتام پر یا اثناء و آغازِ آیات میں اسماء و صفاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ فراواں ہیں، جب انسان صفات و اسماء اللہ کی تلاوت و قرأت کر رہا ہو تو پھر ہم پر کیسی کیفیت طاری ہو؟

☆ **يتطأطأ خضوعا لجلاله و عظمته......**

جھک جائے، يتطأطأ یعنی جھک جانا، ختم ہو جانا، عظمت و جلالِ خداوند تبارک وتعالیٰ کے سامنے انسان کے اندر خمیدگی آجائے چونکہ سارے اسماءِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہمیں عظمتِ خدا کا ایک پہلو بتا رہے ہیں، جیسے اس کتاب کی پہلی جلد میں فصل ادب پنجم کے حصہ سوم میں اشارہ ہوا تھا کہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے اسماءِ الٰہیہ کا یہ فلسفہ ذکر کیا ہے کہ یہ ابواب معرفتِ خداوند تبارک و

آیاتِ رحمت کا اثر

تعالیٰ ہیں، اگر ہم ان اسماء کے دروازے سے گزریں تو ہمیں خدا کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے، اسماء اللہ سے سرسری نہ گزریں، یہ صرف وزن برابر کرنے کے لئے آیات میں ذکر نہیں کیے گئے، اسماء اللہ کی تاثیر ہے، انسان اسماء اللہ کے سامنے جھک جائے، خضوع کرے۔

مثلاً مذہبیوں کے اندر جیسے مسیحیوں کے اندر یہ اچھا ادب ہے لیکن عادتاً کرتے ہیں، معرفت کے ساتھ یہ کام نہیں کرتے ہیں کہ مسیحی جب بھی مثلاً کوئی مقدس چیز، کوئی حادثہ یا کوئی ایسی چیز کہ جس کے اندر قدرتِ خدا، بزرگی خدا یا کوئی خوشی و غمی کا موقع و منظر ان کے سامنے آئے تو فوراً اپنے سینے پر صلیب بناتے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا یعنی خدا کی یاد میں چلے جاتے ہیں، اب معلوم نہیں کہ اپنے ذہن سے، اپنے تصور سے جاتے ہیں یا پھر ان کا مذہب انہیں کہتا ہے، مسلمانوں کے اندر البتہ مسلمانوں میں بھی برصغیر میں ہندوستان و پاکستان میں جب کوئی مقدس نام آجاتا ہے مثلاً جب اذان ہو رہی ہوتی ہے اور اس میں شہادتِ نبوتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ آئے تو عموماً آپ نے عام مسلمانوں کے اندر دیکھا ہوگا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ کا نام سن کر فوراً اپنا ہاتھ چوم لیتے ہیں، وہ صلیب بناتے ہیں اور یہ اس طرح سے کرتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ کیوں کرتے ہیں اور اس کی تفسیر کیا ہے؟ لیکن یہ ایک ادب ہے کہ جو بجالاتے ہیں، عادتاً کریں پھر بھی اچھی چیز ہے لیکن اگر یہ معرفت کے ساتھ ہو یعنی بے ساختہ انسان سے یہ حرکت سرزد ہو جائے، صرف اس وجہ سے کہ انسان نے عظمتِ خداوند تبارک و تعالیٰ کو دیکھا ہے یا کوئی مقدس چیز دیکھی ہے، جیسے بعض لوگ حرم کو دیکھتے ہیں تو سینے پہ ہاتھ رکھ کر خضوع و ادب سے جھک جاتے ہیں، عادتاً کریں تو اس کا فائدہ نہیں ہے۔

۷)ہر عبادت کی بنیاد معرفت ہے

بعض چیزیں ہماری عادت ہوگئی ہیں، اگر کوئی عبادت کریں تو معرفت کے ساتھ کریں،

زیارتِ حضرتِ بی بی معصومہ علیہا السلام میں آیا ہے اور حضرت معصومہ علیہا السلام کے حرم کے اوپر بھی درج ہے کہ جو بھی حضرت معصومہ علیہا السلام کی زیارت معرفت کے ساتھ کرے،

مَنْ زَارَهَا عَارِفاً بِحَقِّهَا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ......

جوشخص اس معرفت کے ساتھ (بی بی معصومہ قم علیہا السلام کی) زیارت کرے گا اس کے لئے جنت واجب ہے......

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی حدیثِ مبارک ہے کہ

مَنْ زَارَهَا عَارِفاً بِحَقِّهَا فَلَهُ الْجَنَّةُ......(۱۳)

جوشخص اس معرفت کے ساتھ (بی بی معصومہ قم علیہا السلام کی) زیارت کرے گا اس کی جزا بہشت ہوگی۔

یعنی جو بھی اس بی بی علیہا السلام کی زیارت کرے تو عارفانہ کرے، معرفت کے ساتھ کرے، ہر کام میں بنیاد معرفت ہے،

أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ......(۱۴)

اولِ دین اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے......

دین کا آغاز معرفت خداوند تبارک وتعالیٰ سے ہے،

وَمَنْ نَظَرَ اِلَى الْكَعْبَةِ عَارِفاً بِحَقِّهَا غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ ذُنُوبَهُ وَكَفٰى مَا أَهَمَّهُ......(۱۵)

جو شخص کعبہ کی طرف نظر کرے اس حال میں کہ وہ کعبہ کی معرفت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور اس کے اہم امور کے لئے کافی ہوگا......

لہٰذا جو بھی معصومین علیہم السلام کے حرم میں جائے لیکن

عَارِفاً بِحَقِّهَا......

معرفت کے ساتھ ان کی زیارت کرے تو اس کے اوپر آثار مترتب ہوتے ہیں، جب انسان معرفت کے ساتھ یہ سب کچھ کرے تو وہ سارے آثار انسان کو حاصل ہوتے ہیں، اسی طرح سے جب اسمائے جلیلۂ الٰہی سنتے ہیں تو ایک ادب یہ ہے کہ جب بھی انسان اللہ تعالیٰ کا نام سنے تو ادب کے ساتھ جلّ جلالہٗ کہے، بعض مؤدب مسلمان یہ کام کرتے ہیں کہ جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنٰی میں سے کوئی اسمِ شریف آجائے تو فوراً زیرِ لب جلّ جلالہٗ کہہ دیتے ہیں بسا اوقات دوسرا سن بھی لیتا ہے۔

ہر عبادت کی بنیاد معرفت ہے

ائمہ اطہار علیہم السلام کا نام آجائے، انبیاء علیہم السلام کا نام آجائے تو وہ ادب کے ساتھ آداب ادا کرتے ہیں، عادتاً کریں تو فائدہ نہیں ہے لیکن معرفت کے ساتھ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہو تو اس سے بڑی عبادت کوئی بھی نہیں ہے،

قَالَ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَنْ أَتَى الصَّلَاةَ عَارِفًا بِحَقِّهَا غُفِرَ لَهُ......(۱۶)

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں! جو کوئی نماز کو اس کے حق کی معرفت کے ساتھ بجالائے وہ بخشا جائے گا......

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ

هٰذِهِ الْفَرِيْضَةُ مَنْ صَلَّاهَا لِوَقْتِهَا عَارِفًا بِحَقِّهَا لَا يُؤْثِرُ عَلَيْهَا غَيْرَهَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بَرَاءَةً لَا يُعَذِّبُهُ..... (۱۷)

یعنی اگر کوئی شخص اس فریضۂ نماز کو اس کے وقت میں اس طرح سے ادا کرے کہ وہ اس کے حق کی معرفت رکھتا ہو اور کسی دوسری چیز کو اس پر اہمیت نہ دے تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں برائت لکھ دے گا کہ اسے عذاب نہیں دے گا......

معرفت کے ساتھ کریں، چونکہ انسان متاثر ہو رہا ہے، یہ اسم انسان کے اوپر اپنا اثر چھوڑ رہا ہے اور انسان اس سے متاثر ہو رہا ہے لہذا خضوع کے ساتھ جھک جائے، جھکنا بھی ضروری نہیں ہے کہ فقط جسمانی طور پر جھک جائے یعنی حالتِ رکوع یا حالتِ سجود میں چلا جائے بلکہ روحِ انسان جھک جائے، خضوع آجائے، انسان کے اندر کوچکی آجائے۔

انسان خداوند تبارک وتعالیٰ کے سامنے احساسِ حقارت کرے، جھک جانے سے یہی مراد ہے، جیسے انسان ایک بڑی شخصیت کے سامنے جھک جاتا ہے یعنی تسلیم ہو جاتا ہے، ملائکہ علیہم السلام جو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھکے تو یوں نہیں کہ فقط جسمانی طور پر جھکے کیونکہ ملائکہ کا جسم نہیں ہے کہ انہوں نے ساری پیشانیاں زمین پر رکھ دیں، یہ واقعہ زمین پر رونما نہیں ہوا، زمین پر اترنے سے پہلے

یہ سجدہ ہوا یا وہ شرائط جو انسان سجدے میں پوری کرتا ہے ملائکہ وہ شرائط کس طرح پوری کریں؟ کیونکہ ملائکہ کے تو گھٹنے نہیں ہیں، ملائکہ کے انگھوٹے نہیں ہیں، ملائکہ کی ہتھیلیاں نہیں ہیں، ملائکہ کی پیشانیاں نہیں ہیں، پھر یہ سجدہ انہوں نے اس طرح کیا ہوگا جیسے ہم سجدہ کرر ہے ہیں؟ مولانا روم کے بقول

کار پاکان را قیاس از خود مگیر

گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر ......(۱۸)

پاک ہستیاں اور پاک موجودات کو اپنے اوپر مقایسہ نہ کرو، یہ خیال نہ کرو کہ وہ بھی ہماری طرح یہ سارے کام کرتے ہیں، اس طوطے کی طرح کہ جس نے گنجے کو دیکھ کر کہا تھا کہ کیا آپ نے بھی تیل گرایا ہے، یہ نہ ہو کہ جہاں بھی سجدے کا ذکر آئے تو ہم یہ سمجھیں کہ ہماری طرح ہی سجدہ کیا ہوگا، انہوں نے رخ کدھر کیا تھا؟ قبلہ اس وقت کدھر تھا؟ سجدے کا لغوی معنیٰ یا سجدے کا اصلی معنیٰ خضوع ہے، جھکنا ہے، اگر انسان قلبی طور پر کسی کے سامنے جھک جائے تو یہی سجدہ ہے، بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں ملائکہ خلیفۂ خدا کے سامنے خاضع ہیں، جھکے ہوئے ہیں، جھکنا یعنی اس کی بڑائی، اس کی بزرگی اور اس کی حیثیت کو تسلیم کر لینا، مان لینا، اس کے سامنے جھکنا یعنی میں غرور و تکبر نہیں مانتا، جھکنے کے مقابلے میں ڈٹنا ہے، میں ڈٹ جاتا ہوں، نہیں مانتا ہوں، تکبر اور غرور اس کو کہتے ہیں۔

۸)گستاخ افراد کے اقوال پر مشتمل آیات کا اثر

☆ و عند ذکر الکفار مایستحیل علیه......

قرآن نے کفار کی زبان سے جاری ہونے والی سخت باتیں بھی ذکر کی ہیں، کفار و مشرکین و نادان و نافہم لوگ خداوند تبارک وتعالیٰ کی طرف بہت ساری چیزیں منسوب کرتے ہیں، کبھی خدا کی طرف معاذ اللہ اولاد کی نسبت دیتے ہیں، کبھی خدا کی طرف زوجہ کی نسبت دیتے ہیں، کبھی اولاد کی نسبت دیتے ہیں، کبھی جسمانیت کی نسبت دیتے ہیں اور وہ چیزیں جو شایانِ شانِ خدا نہیں ہیں، محال ہیں ان کی طرف نسبت دیتے ہیں، قرآن خداوند تعالیٰ کے لئے ایسے امور جب کفار و مشرکین اور نادان و جاہل افراد کی زبانی نقل کرتا ہے تو وہاں پر کیا ہونا چاہئے؟

☆ یغض صوته......

یہاں پر صوت یعنی انسان کی آواز دھیمی ہو جانی چاہئے، کس سے؟ شرم و حیا سے، انسان کو شرم آنی چاہئے، اگرچہ بات کوئی اور کر رہا ہو، بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ با معرفت انسان ناگفتہ بات پر شرمسار ہو رہا ہوتا ہے، آپ نے دیکھا بھی ہوگا کہ بالفرض آپ کا ایک بیوقوف دوست ہے، وقوفوں کو دوست نہ بنائیں، فرض کرلیں کہ آپ کا کوئی بیوقوف دوست ہے اور آپ اس کو کسی مجلس و محفل میں یا درس میں لے کر چلے گئے اور یہ درس میں یا مجلس و محفل میں اٹھ کر بول پڑا، اٹھ کر اس نے بیوقوفی کی باتیں شروع کر دیں تو آپ شرم سے جھک جاتے ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ میں شرم سے پانی پانی ہو رہا ہوں، بول وہ رہا ہے شرمسار آپ ہو رہے ہیں اور اس پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا ہے، بیوقوف کی

بیوقوفی پر اگر عقلمند شرمسار ہو رہا ہے تو یہ عقل کی علامت ہے، یہ خوب شرم ہے، یہیں پہ شرمسار ہونا چاہیئے، بعض اوقات ہوتا ہے کہ اوٹ پٹانگ کوئی کر رہا ہوتا ہے، کوئی بول رہا ہوتا ہے اور شرم کسی اور کو آرہی ہوتی ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ جن لوگوں کا شعور زیادہ ہو وہ ہی کسی کی جہالت پر شرمندہ بھی ہوتے ہیں، شعور کی ایک علامت یہ ہے کہ بے شعوروں پر باشعور کو زیادہ شرم محسوس ہوتی ہے، ہر جگہ اس کو شرم وحیا محسوس ہوتی ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرئیل کے مطالبے پر اتنی شرم محسوس ہوئی کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے کہا کہ

نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً......(۱۹)

یعنی ہم خدا کو آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام خدا کے سامنے اس قدر شرمسار ہوئے کہ پانی پانی ہوگئے کہ میری قوم یہ کیا کہہ رہی ہے؟ حقیقت ایسے ہی ہے، مثلاً فرض کریں کہ جن طبقات سے ہم منسوب ہیں مثلاً ایک مسلمان کوئی بے ہودہ کام کرتا ہے تو ہمیں شرم آتی ہے یا کوئی بھی شیعہ اگر اس دنیا میں غلط کام کرتا ہے تو ہمیں شرم آتی ہے اور حقیقتاً شرم آنی چاہیئے کیونکہ شیعہ اور غلط کام کرے یا فرض کریں کہ اگر ہم پاکستانی ہیں اور ایک پاکستانی غلط کام کرتا ہے تو ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے۔کوئی بھی ہو، کسی جگہ بھی ہو، دنیا کے کسی نقطے پر اگر ایک غلط کام کرتا ہے تو انسان کو شرم محسوس ہوتی ہے، جب کوئی جرنیل ذلت پہ اتر آئے اس کی ذلت سے تمام پاکستانیوں کو شرم آنی چاہیئے کہ جن کے اندر شعور موجود ہے اور ان کو شرم آتی بھی ہے، جس طرح سے وہ ذلت پہ اتر آئے اور جو کچھ کر آئے اور اس کے ساتھ دوسرے ذلیل طبقات، افراد اور پارٹیاں وغیرہ قوم وملک ودین وامت کو

ذلت کی جن اتھاہ گہرائیوں کے اندر پھینک رہے ہیں یہ سب شرم آور چیزیں ہیں، شرم انبیاءؑ کا شیوہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے سامنے لوگ بسا اوقات ایسی بے ہودہ باتیں کرتے تھے یا حضرتؐ کو ایسی باتیں کسی سے معلوم ہوتی تھیں تو حضرت ﷺ خود خدا کے سامنے شرمسار ہوتے تھے، قرآن جب کفار و مشرکین و نافہم و نادان افراد کی باتیں نقل کرتا ہے کہ وہ ایسی باتیں کہا کرتے تھے تو اس وقت ہمیں بھی شرم آئے۔ شرم سے انسان کی آواز دھیمی ہو جاتی ہے۔

☆ **و ینکسر فی باطنه حیاء من قبح مقالتهم......**

انسان اپنے باطن میں ٹوٹ جاتا ہے، مُنقَضَبْ ہو جاتا ہے، انسان کے اندر عاجزی آجاتی ہے، انکسار و فروتنی ذاتی ہے، کیوں؟ شرم کی وجہ سے کہ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ حقیقتاً ایسے ہی ہونا چاہئے، ہم یہ کیوں نہ کہیں کہ اپنی بات پر بھی شرم آنی چاہئے، اپنے غلط اعمال پر بھی ہمیں شرم و حیا آنی چاہئے۔

حیا، حیات سے ہے، اگر انسان کا دل مرا ہوا نہ ہو تو اس کے اندر حیا ہوتی ہے، اگر کسی متدین آدمی کی ناموس، بہن، بہو یا بیٹی بے حجاب بازار میں چلی جائے یا باہر چلی جائے تو مرد کو شرم آتی ہے لیکن یہ شرم کب آتی ہے؟ جب اس کے اندر حیا ہو، حیا اس وقت ہوتی ہے کہ جب اندر حیات ہو، حیات اس وقت ہوتی ہے کہ جب دل و ضمیر زندہ ہو، جس کا ضمیر ہی مر گیا ہو، جس کا دل ہی مر گیا ہو تو اس کی بیوی، بیٹی اگر فحش طریقے سے بھی بازار میں گھومتی رہے تو اس کو کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی ہے، کیوں؟ کیونکہ حیا نہیں ہوتی ہے، اس کے اندر حیا کیوں نہیں ہوتی؟ چونکہ اس کے اندر حیات

نہیں ہوتی، اس انسان کا دل مرا ہوا ہے، ضمیر مرا ہوا ہے۔ بقول اکبر آلہ آبادی کے کہ جب مرد کی حیا مرتی ہے، مرد کا دل، ضمیر اور غیرت مرتی ہے تو اس وقت اس کی ناموس بے حیا ہو کر باہر آجاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کے بقول

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اگر مرد کی عقل نہ مرے، شوہر، باپ اور بھائی کی غیرت نہ مرے تو کبھی بھی ناموس بازار میں بے حجاب و بدحجاب نہیں آتی ہے۔ حیا، حیات سے ہے، زندگی سے ہے، دل وضمیر زندہ ہو تو انسان میں حیا ہوتی ہے ورنہ حیا ختم ہو جاتی ہے، یہ علامتِ حیا ہے کہ جب ہم قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن کے اندر جب خدا کے بارے میں، اولیائے خدا کے بارے میں کفار سے منسوب باتیں نقل ہوتی ہیں تو انسان کو شرمسار ہونا چاہئے چونکہ ہمارا تعلق بشریت سے ہے اور جیسے کہا کہ اگر کوئی مسلمان غلط کام کرتا ہے تو ہمارا سر ندامت سے جھکنا چاہئے اور واقعاً شرم سے جھکے کہ ایسا کیوں ہے؟

ہمارا تعلق نوعِ بشر سے ہے، اگر اس زندگی میں زمین پر کوئی جنایت کرتا ہے، ظلم کرتا ہے، جیسے بش وا وبامہ مایۂ شرمساریٔ نوعِ بشر ہیں، اس وقت یہ جنایت کار عراق میں، لبنان و فلسطین میں جو کچھ کر رہے ہیں اگر بشریت کے اندر شرم ہو حیا موجود ہو تو اس پر تمام بشریت کا سر جھکنا

ضروری ہے لیکن چونکہ دنیا کی زمین مردہ ہے اور جو تھوڑے لوگ زندہ تھے وہ میڈیا (Media) نے مار دیئے ہیں یا دوسرے زہروں نے مار دیئے ہیں، اس وجہ سے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے، ظلم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے، شرم آنا انسان کے دل، حیات و زندگی اور انسانیت کی دلیل ہے۔

۹) جنت کے ذکر کا انسان پر اثر

☆ وعند ذکر الجنة.....

اور جب جنت کا تذکرہ آئے،

☆ ینبعث من باطنه شوقاً الیها......

جب جنت کا ذکر آئے تو انسان کے اندر شوق پیدا ہو، طلب پیدا ہو، اس طرف جانے کے لئے رغبت و رجحان و سعی پیدا ہو، نہ کہ صرف خالی آرزو پیدا ہو، بسا اوقات ہوتا ہے کہ انسان کسی اچھی چیز کا تذکرہ کرتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ یہ میرے پاس ہو، رغبت پیدا ہوتی ہے، رغبت یعنی کوشش عملی، سعیِ عملی کہ انسان اس کی طرف اٹھ کر عمل کرے، حرکت کرے اور اس طرف قدم اٹھائے۔ شوق انسان کو بیٹھنے نہیں دیتا ہے، شوق میں اور آرزو میں بڑا فرق ہے، آرزوئیں بہت ہوتی ہیں، اس کو امل کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں اپنی امت کیلئے جن دو چیزوں سے بہت زیادہ پریشان ہوں، خوفزدہ ہوں ان میں سے ایک لمبی آرزوئیں ہیں، آرزوئیں تو انسان کی بہت ہیں لیکن

شوق کم ہے، ہمارے اندر انہی آرزوؤں کے بارے میں شوق نہیں ہے چونکہ شوق انسان کو اٹھاتا ہے، حرکت دیتا ہے اور ارادہ بناتا ہے پھر انسان کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے۔انسان کے باطن کے اندر اس جنت کی طرف شوق ہے۔

۱۰)جہنم کے ذکر کا انسان پر اثر

☆ وعند وصف النار ترتعد فرایصه خوفا منها......

فرایصہ، فریصہ کی جمع ہے، فریصہ پہلو کو کہتے ہیں، بسا اوقات آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو صرف آنسوؤں سے روتے ہیں، یہ بھی ایک نوع رونا ہے یعنی کنٹرول کا رونا ہے کہ ایک انسان رو رہا ہے اور آنسو گر رہے ہیں لیکن باقی کوئی حرکت نہیں ہے، نہ چہرے کی نہ سر کی، یہ رونا تھوڑا رونا ہے یعنی ابھی کیفیت یا احساسات اتنی شدت سے طاری نہیں ہوئے ہیں بلکہ صرف آنسو ٹپک رہے ہیں لیکن انسان بسا اوقات اس طرح سے روتا ہے کہ پورا بدن ہل جاتا ہے اور آواز کے ساتھ روتا ہے، جب انسان شدید گریہ کرتا ہے تو انسان کے پہلو کانپنے اور ہلنے لگتے ہیں، آپ نے دیکھا بھی ہوگا، آپ کئی دفعہ ایسے روئے ہوں گے چونکہ رونے کی حالت میں توجہ نہیں ہوتی ہے لیکن انسان کے پہلو لرز رہے ہوتے ہیں، ان پہلوؤں کو کہ جو روتے ہوئے لرزتے ہیں فریصہ کہتے ہیں، ترتعد یعنی کانپیں، انسان اس طرح سے کانپنے لگے، پہلو بازوں نے بھی کہا ہے کہ یہ جو سینے، کندھے اور پسلیوں کا درمیانی حصہ ہے اس کو فرائص کہتے ہیں، جب انسان روتا ہے تو یہ حصہ زیادہ کانپتا ہے۔

لہٰذا جب جہنم کا ذکر آجائے، نار کا ذکر آجائے، سختیٔ خدا کا ذکر آجائے، خدا کی ناراضگی کا ذکر آجائے، غضبِ خدا کا ذکر آجائے تو انسان روئے اور اس طرح سے روئے کہ اس کے پہلو کانپنا شروع ہوجائیں۔

۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرآن سے اثر لینے کی کیفیت

☆ **ولما قال رسول الله صلى الله عليه و آله لعبد الله ابن مسعود:......**

وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا ہے، جن کا دل محلِ نزولِ قرآن ہے وہ خود آکر اپنے ایک شاگرد کو کہتے ہیں کہ مجھے قرآن سناؤ، عبداللہ ابن مسعود صحابہ میں سے ہیں، علمی لحاظ سے برجستہ شخصیت ہیں، حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کہا کہ

☆ **اقرا علی......**

میرے لئے قرآن پڑھو، قرأت کرو، میرے لئے کوئی آیہ یا سورہ پڑھو،

☆ **قال: افتتحتُ سورة النساء......**

کہتے ہیں کہ میں نے سورہ نساء پڑھنا شروع کردی،

☆ **فاذا بلغت الى قوله:......**

پڑھتے پڑھتے جب میں سورہ نساء میں یہاں پہنچا کہ

☆ **فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاءِ شَهِيْدًا○ (۲۰)**

اس وقت کیا ہوگا جب ہر امت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور پیغمبر آپؐ کو ان سب کا گواہ بنا کر بلائیں گے۔

اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَہِیۡدٍ......

ہر امت کا شہید، شہید یعنی گواہ، معرکہ حق و باطل کا مقتول بھی شہید کہلاتا ہے چونکہ یہ گواہِ اعمالِ امت ہے اور وہ گواہِ اعمالِ قاتلین ہے، شہید دونوں کی گواہی دے گا کہ میرے ساتھی کون ہیں ؟ اور میرے دشمن کون ہیں ؟ مجھے کیوں مارا گیا ؟ کن کی رقابت میں مارا گیا ؟ اور مجھے کن کے رکاب میں مارا گیا ؟ اسی لئے شہید بھی اعمالِ امت کا گواہ ہے، تمام امتوں کے شہداء کو حاضر کیا جائے گا، گواہوں کو حاضر کیا جائے گا اور رسول اللہ ﷺ کو گواہوں کا گواہ بنایا جائے گا، عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ آیت پڑھی،

☆ رایت عینیه تذرفان بالدمع......

میں نے رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں کو دیکھا، رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں میں ایک چشمے کی طرح آنسو امنڈ آئے اور پھر بہہ نکلے۔

تذرفان امنڈ کر بہنے کو کہتے ہیں، پانی جب امنڈتا ہے اور پھر بہنا شروع ہو جائے تو اس کو تذرفان کہتے ہیں، آپؐ کے آنسو بہنے لگے اور وہی حالت ہوگئی یعنی رسول اللہ ﷺ کے پہلو کانپنے لگے،

☆ فقال لی: حسبک الان......

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بس اب اس سے آگے نہیں پڑھنا۔ رسول اللہ ﷺ نے کیوں فرمایا کہ کافی ہے یہاں سے آگے نہیں پڑھنا؟

☆ **و هذا لان مشاهدة تلک الحال......**

یعنی جب رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت سنی تو فقط سامع نہیں تھے، اجنبی نہیں تھے بلکہ قرآن کا مضمون حالت بن کر رسول اللہ ﷺ پر چھا گیا، طاری ہو گیا،

☆ **استغرقت قلبه بالكلية......**

اس حالت نے تمام قلب کو لپیٹ لیا، پارۂ دلِ رسول اللہ ﷺ کو اس حالت نے لپیٹ لیا،

☆ **ولقد كان فی الخائفين من خر مغشياً عليه عند آيات الوعيد...**

اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا گریہ اتنا شدید ہوا، فرماتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی نمونے موجود ہیں، بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب ان پر عذاب و جہنم و وعید اور دھمکی کی آیات پڑھی جاتی تھیں تو وہ غشی میں آجاتے تھے، بے ہوش و مدہوش ہو کر گر جاتے تھے،

☆ **ومنهم من مات فی سماع تلک الايات......**

اور بعض تو ایسے تھے کہ جب ان پر یہ آیات تلاوت کی گئیں تو وہیں پر مر گئے، ان کی روح نکل گئی، ہمام بن شریح انہی میں سے ہیں، امام المتقین مولا علی علیہ السلام نے تقویٰ بیان کیا، متقین کی صفات بیان کیں، اوصافِ متقین کو قرآن سے ذکر کیا تو ہمام اس دنیا سے گزر گئے،

☆ فینبغی لتالی القرآن ان یتصف ذاتہ بمثل ھذہ الاحوال......

تالیٔ قرآن، قاریٔ قرآن، قرآن شناس اور قرآن خوان کو اس طرح سے قرآن پڑھنا چاہئے کہ مضامینِ قرآن و معانیٔ قرآن کو اپنی صفت بنائے نہ کہ فقط مفہوم بنائے، یہ حالات و صفات بنیں اور انسان ان صفات سے متصف ہو۔

۱۲) فقط حاکیٔ قرآن نہ بنیں بلکہ متحققِ قرآن بنیں

☆ حتی یخرج عن ان یکون حاکیاً فی کلامہ......

یعنی قرآن کی صفات اور حالات سے متحقق ہوتا کہ حاکیٔ قرآن نہ بنے، فقط قاری نہ بنے، حاکی یعنی راوی، کمنٹیٹر (Commentator) نہ بنے، ابھی ہم قرآن کے کمنٹیٹر ہیں، فقط کمنٹری کرتے ہیں یعنی ایک آدمی ایسے قرآن پڑھ رہا ہے کہ جیسے کمنٹری نشر کر رہا ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ہم کمنٹیٹر نہ بنیں، قرآن کے فقط حاکی اور راوی نہ بنیں کہ قرآن میں یہ یہ لکھا ہے مثلاً جیسے ہم ایک خط پڑھتے ہیں، کوئی پوچھے کہ کیا لکھا ہوا تھا تو پڑھ کر سنا دیتے ہیں کہ اس نے یہ لکھا ہوا تھا، آج اخبار میں یہ لکھا ہوا تھا، آج فلاں کتاب میں یہ لکھا ہوا تھا، ہم حاکی اور راوی ہیں، قرآن راوی نہیں مانگتا ہے، قرآن کو حاکی و مخبر و رپورٹر نہیں چاہئے، قرآن کو وہ انسان چاہئے کہ جو قرآن اور قرآنی صفات سے متصف ہو، جن کے اندر قرآنی صفات حالات بن کر راسخ ہو جائیں،

☆ فاذا قال: انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم......

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍO(۲۱)

کہہ دیجئے کہ میں گناہ کروں تو مجھے بڑے سخت دن کے عذاب کا خوف ہے۔

جب انسان سورۂ مبارکہ انعام اور زمر میں اس آیہ کی تلاوت کرتا ہے اور خوف زدہ نہیں ہوتا،

☆ فاذا لم یکن خائفا کان حاکیا......

یہ آیت تو پڑھ رہا ہے لیکن خوف زدہ نہیں ہے لہٰذا اگر خائف نہیں ہے تو پھر فقط حاکی و راوی ہے۔ بعض لوگ اسی طرح پڑھتے ہیں مثلاً ان کے لئے رلانا ایک ہنر ہے، بعض کیلئے مصائب پڑھنا ایک فن ہے اور لوگوں کو خوب رلاتے ہیں، بعض تو کہتے ہیں کہ ہم تو پتھر سے بھی آنسو نکال دیتے ہیں تم تو پھر بھی انسان ہو، اس لئے کہ ان کو مہارت ہے اور ان کے پاس فن ہے، جو جھوٹ انہوں نے رٹا ہوا ہوتا ہے اور اگر رٹا نہیں ہوتا ہے تو فوراً اسی وقت بنا بھی لیتے ہیں، کہتے ہیں شمر کسی اسی طرح سے پڑھنے والے کے خواب میں آیا کہ جس نے مجلس پڑھی تھی، شمر نے خواب میں آکر اس کے سر پہ قرآن رکھ کر کہا کہ قرآن کی قسم کھا کر کہہ دو کہ میں نے اتنا ظلم کیا تھا کہ جتنا تو نے پڑھا ہے؟ یہ چیلنج نہیں ہوا ہے، آپ لوگوں کے سامنے مصائب پڑھیں، اگر کسی کی آنکھوں کو خدا نے توفیق دی ہوئی ہے تو رو پڑے گا، رونا لوگوں کا کام ہے نہ کہ ہمارا کام زبردستی رلانا ہے، آپ کا کام یہ ہے کہ صرف پڑھ دو، توفیق ہوئی تو رو لے گا اور نہیں رونا ہوا تو نہیں روئے گا، آپ کا کام ہے دعوت دینا، قبول کرنا اس کا کام ہے یا مثلاً اگر کوئی لطیفہ سنانے والا ہے تو اس کا کام فقط لطیفہ سنانا ہے، کوئی ہنسا تو ٹھیک ہے

نہیں ہنسا تو نہیں ہنسا لیکن شعبدہ بازوں اور جوکرز کیلئے یہ چیلنج ہوتا ہے کہ اگر لوگ نہیں ہنسے یا یہ نہیں ہنسا سکے تو پھر یہ ناکام ہو جاتے ہیں اور تنخواہ نہیں ملتی ہے۔

بسا اوقات کچھ لوگوں کیلئے رلانا پیشہ ہوتا ہے، جب رلاتے ہیں اور خوب دھاڑیں مار مار کر لوگ رو لیتے ہیں تو ایک ہلکا سا تبسم ان کے لبوں پر آجاتا ہے چونکہ اس وقت لوگ رو رہے ہوتے ہیں اور ان کے چہروں کو نہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، بعد میں فلم دیکھیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے دل میں کیا تھا؟ یعنی میں نے رلا دیا، میں نے مجمع کی دھاڑیں نکال دیں، مصائب سید الشہداء علیہ السلام کے پڑھ رہا ہے اور خود ہنس رہا ہے، کیوں؟ کیونکہ راویٔ مصائب ہے، مصیبت زدہ نہیں ہے، ان مصائب میں خود شریک نہیں ہے، صرف حاکیٔ مصائب ہے، حاکیٔ مصائب کا دل تو نہیں جلتا ہے لیکن جس کے پاس دل ہو اور دل میں درد ہو تو وہ حاکی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اس چیز سے متصف ہوتا ہے، اس چیز سے متحقق ہوتا ہے، اس کے اندر یہ چیز اتری ہوئی اور راسخ ہوتی ہے، فرماتے ہیں کہ قرآن کے حاکی اور راوی نہ بنیں، اگر آیاتِ خوف پڑھیں تو خائف ہونا چاہیے۔

۱۳) آیاتِ توکل کا انسان پر اثر

☆ و اذا قال: علیک توکلنا و الیک انبنا......

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ٥ (۴)

خدایا میں نے تیرے اوپر بھروسہ کیا ہے اور تیری ہی طرف رجوع کیا ہے اور تیری ہی طرف

بازگشت بھی ہے۔

یہ آیات نمونے کے طور پر ہیں لیکن ہر آیت ایسی ہے، کہتے ہیں کہ جب انسان اس آیت کو پڑھتا ہے کہ اے پروردگار میں نے تجھ پر توکل کیا اور میں نے تیری طرف رجوع کیا،

☆ **ولم یکن حاله التوکل والانابة کان حاکیا......**

لیکن دوسری طرف سے توکل بھی نہیں ہے تو یہ راویَ توکل ہے، نہ کہ متوکل انسان ہے۔ خدا پر توکل نہ ہونے کی علامتیں ہیں، توکل کے مقابلے میں گلہ شکوہ اور فریادیں ہیں کہ اِس کے پاس جانا، اُس کے پاس جانا، اِس کو مشکل بیان کرنا، اُس کو مشکل بیان کرنا، اِدھر بھی چڑھاوے چڑھانا، اُدھر بھی سفارش کرانا اور رشوت بھی دینا پھر کہتا ہے کہ میں خدا پر توکل کرتا ہوں۔

نقل کیا گیا ہے کہ ایک مسیحی راہب سے لوگوں نے آکر کہا کہ بارش نہیں ہوتی ہے آپ دعا کریں کہ بارش ہو، اس نے کہا کہ کل سب شہر سے باہر صحرا میں آجاؤ، جس طرح ہمارے یہاں نمازِ استقاء ہے، ان کے ہاں دعائے استقاء ہے یعنی طلبِ باران کی دعا، لوگ آگئے اور ساری امت بارش کے لئے دعا کرتی ہے، اس مسیحی راہب نے لوگوں سے کہا کہ واپس چلے جاؤ، لوگوں نے پوچھا کہ کیوں؟ کہا اس لئے کہ تم اس دعا پر کوئی ایمان واعتقاد نہیں رکھتے ہو، لوگ کہنے لگے کہ کیسے پتہ چلا کہ دعا پر اعتقاد نہیں ہے؟ کہا اس لئے کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے ساتھ چھتری لے کر نہیں آیا ہے، اگر تم کو یقین وایمان ہوتا کہ خدا ہماری دعا سنے گا اور دعا کے بعد بارش ہوگی تو تم واپسی کیلئے بارش کا انتظام کر کے آتے لیکن تم اسی طرح سے آئے ہو کہ جیسے تمہیں خشکی میں ہی واپس جانا ہے۔ توکل اس

طرح سے نہیں ہوتا ہے کہ انسان توکل بھی کرے اور چھتری بھی ساتھ لے کر نہ آئے، جب توکل کرنا ہے تو کرنا ہے، اگر پڑھنے کے لئے خدا پر توکل کر کے آئے ہو تو پھر نہ کہو کہ آغا میں جا رہا ہوں، اُس سے بھی کہو کہ آغا میں جا رہا ہوں، فلاں سے بھی کہو کہ میں جا رہا ہوں آپ میرے لئے کچھ کرنا، اگر اللہ پر توکل کیا ہے تو پھر اپنے ہاتھ میں چھتری لے لو، چونکہ خدا کبھی بھی توکل کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا ہے، یہ طے ہے تجربہ کر کے اپنی زندگی میں دیکھ لیں، ہم نے بہت سارے تجربے کئے ہوئے ہیں، ضرر نہیں ہوگا کسی ایک کام میں اللہ پہ توکل کر کے دیکھیں اور صرف اللہ پر توکل کریں، کسی غیر اللہ کی طرف رجوع نہ کریں پھر اس صورت میں آپ کو چھتری لینی پڑے گی۔

۱۴)آیاتِ صبر کا انسان پر اثر

☆ واذاقال فلنصبرن علی ما اذیتمونا......

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰی مَا آذَیْتُمُوْنَا......(۲۳)

جو اذیتیں تم ہمیں دے رہے ہو اس پر ہم ضرور صبر کریں گے......

یہ سب باتیں انبیاء علیہم السلام کی زبان سے ہیں، جب انسان اس آیت پر پہنچے تو فرماتے ہیں کہ

☆ فلیکن حاله الصبر علی الاذی والعزیمة علیه......

اگر اذیتوں، پریشانیوں، لوگوں کی باتوں اور ان تکالیف پر صابر نہ ہوں، استقامت نہ کریں، صبر کا معنی سکوت نہیں ہے، صبر یعنی استقامت، اگر ان مشکلات کے مقابلے میں استقامت

نہ دکھائیں تو یہ اس آیت کا فقط حاکی ہے مثلاً راہِ خدا میں جہاد کے لئے نکلے ہو تو پریشانیاں ہیں لہٰذا صبر کرو، اگر تعلیم کے لئے آئے ہو تو پریشانیاں ہیں لہٰذا صبر کرو،

☆ حتی یجد حلاوۃ التلاوۃ وفضیلۃ التدبر و حسن التخلیق......

اگر اس طرح سے ہر آیہ سے متصف ہو، ہر آیہ سے متاثر ہو اور ہر آیہ کے مضمون سے متصف ہو تو انسان کو لذتِ تلاوت و شیرینیِ تلاوت محسوس ہوگی، اسے پائے گا اور وہ تدبر کی فضیلت سے آشنا ہوگا اور تخلق کے حسن سے وزیبائی اور جمال سے بھی آشنا ہوگا۔

۱۵)انسان میں قرآنی صفات پیدا نہ ہونے کا نتیجہ

☆ فان لم یکن بھذہ الصفات......

اگر یہ صفات اس کے اندر پیدا نہ ہوئیں،

☆ ولم یتردد قلبہ بین ھذہ الحالات......

اور اگر اس کا دل ان حالات کے اندر آمد و رفت نہیں کر رہا ہے، متردد نہیں ہو رہا ہے، تردد یا تردید شک سے نہیں ہے، تردد یعنی آنا جانا،

☆ کان حظہ من تلاوۃ القرآن حرکۃ اللسان مع صریح اللعن علی نفسہ......

اگر یہ حالات طاری نہیں ہو رہے ہیں اور قرآن پڑھے جا رہا ہے تو پھر قرآن کی زبان سے

انسان اپنے آپ پر لعنت کر رہا ہے، خود لعنت ان چیزوں میں سے ہے کہ جو پلٹ کر آتی ہے، جیسے کھیل میں ایک پلیٹ نما چیز ہوتی ہے کہ جسے ہوا میں گھماتے ہیں اور وہ گھوم کے پھر وہیں آجاتی ہے کہ جہاں سے اس کو پھینکا گیا تھا، آپ نے کبھی دیکھا بھی ہوگا کہ یہ ڈسک (Disk) کی طرح ایک چیز ہوتی ہے کہ جس کو گھما کر ہوا میں چھوڑیں تو ہوا میں گھوم پھر کر پھر وہیں آجاتی ہے کہ جہاں سے اس کو چھوڑا تھا، لعنت بالکل ایسی ہی ایک چیز ہے کہ اگر ایک نااہل آدمی، ملعون آدمی لعنت کرے تو لعنت وہاں نہیں جاتی ہے کہ جہاں پر اس نے پھینکی ہے بلکہ لوٹ کر اسی شخص کے اوپر آجاتی ہے، بہت ساری لعنتیں وہاں نہیں جاتی ہیں کہ جہاں ہم بھیجتے ہیں بلکہ وہ خود ہماری طرف لوٹ کر آجاتی ہیں، کیوں؟ کیونکہ ان کا مصداق ہم خود ہوتے ہیں مثلاً ایک آدمی ظالمین پر لعنت کر رہا ہے،

☆فی قوله: أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ○(۲۴)

لیکن خود ظالم ہے تو یہ لعنت کدھر جائے گی؟ یہ ادھر تو نہیں جائے گی کہ جہاں بھیج رہا ہے بلکہ یہ لوٹ کر اسی کے پاس آجائے گی کہ ظالم یہ خود ہے،

لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ○(۲۵)

یعنی کہتا ہے کہ خدا جھوٹوں پر لعنت کرے اور جھوٹا یہ خود ہے تو لعنت گھوم کر یہیں پر آجائے گی۔

اسی طرح سے جب انسان قرآن پڑھتا ہے اور یہ حالات طاری نہیں ہوتے ہیں اور قرآن کی اگلی آیات پر پہنچتا ہے کہ جن میں خداوند تعالیٰ نے لعنت کی ہے تو وہ لعنت اسی قاری پر آجاتی ہے،

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۲۶)

كَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۲۷)

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۲۸)

بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے۔۔۔

یہ خود اس کا نمونہ ہے کہ قرآن کہاں لعنت کرتا ہے؟ مثلاً جب قاری محض تلاوت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ○

تو قرآن اس قاری پر یہاں لعنت کرتا ہے کیونکہ یہ خود ظالم ہے کہ جو قرآن کا حق ادا نہیں کرتا،

☆ وفی قوله:......

یا آیتِ دیگر کہ جس کے اندر اس کی مذمت کی گئی ہے کہ

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ○(۲۹)

اللہ کے نزدیک یہ سخت ناراضگی کا سبب ہے کہ تم وہ کہو جس پر عمل نہیں کرتے ہو۔

سب سے بری چیز کبر مقتاً ہے، مقت بہت ہی بڑی برائی کو کہتے ہیں، ایسی برائی جو تحمل سے باہر ہو، خدا کے نزدیک سب سے بری چیز یہ ہے کہ آپ ایسی چیز کہیں کہ

أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ○

یعنی وہ چیز زبان پر جاری کریں کہ جو خود نہیں کرتے ہیں، یعنی جو حالت ہمارے دل میں نہیں ہے اس کی آیت، اس کی روایت، اس کی حدیث دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے اپنی زبان پر جاری کریں،

☆ وفی قوله: وهم فی غفلة معرضون......

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ٥(۳۰)

لوگوں کے لئے حساب کا وقت آپہنچا ہے اور وہ بھی غفلت ہی میں پڑے ہوئے ہیں اور کنارہ کشی کیے جارہے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں، قرآن پڑھ رہے ہیں لیکن غفلت میں ہیں، وہ چیز خود ان کے اندر منتقل نہیں ہورہی ہے،

☆ وفی قولہ: فَأَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی عَنۡ ذِکۡرِنَا وَلَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیَاةَ الدُّنۡیَا٥(۳۱)

لہٰذا جو شخص بھی ہمارے ذکر سے منہ پھیرے اور زندگانی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے آپ بھی اس سے کنارہ کش ہوجائیں۔

یعنی کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے ذکر سے منہ پھیر لیا ہے اور صرف حیاتِ دنیوی چاہتے ہیں، لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے قرآن بھی پڑھتے ہیں لیکن خود متاثر نہیں ہوتے ہیں،

☆ الی غیر ذلک من الایات......

اس کے علاوہ مذمت کی جتنی آیات ہیں۔ غافل وظالم لوگ جب آیات پڑھتے ہیں ان سے متاثر نہیں ہوتے ہیں، قرآن خود کہتا ہے کہ یہ درست نہیں ہے، بلکہ احادیث کے مطابق خود قرآن ان لوگوں پر لعنت کرتا ہے۔

۱۶)غیر متاثر افراد کیلئے قرآن کیا کہتا ھے؟

☆ وکان داخلا فی مصداق قوله:......

یہ افراد جو متاثر نہیں ہوتے ہیں اور فقط زبان سے تلفظِ قرآن ادا کر دیتے ہیں، قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے کہ

☆وَمِنۡهُمۡ أُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتَابَ اِلَّا أَمَانِيَّ......(۳۲)

ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے......

یہ امّی ہیں، نادان ہیں، نافہم ہیں اور ان کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے، کتابِ خدا سے ان کو فقط امانی معلوم ہے، امانی یعنی حدس و اندازے اور آرزوئیں،

☆ یعنی التلاوة المجردة......

یعنی فقط تلفظات ہیں، فقط ادائیگی حروف ہے، بہت خوبصورت تلفظ بھی کر لیں لیکن چونکہ خود متاثر نہیں ہوتے ہیں لہذا ان کو فقط امانی نصیب ہوئے ہیں،

☆ و فی قوله: وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ○(۳۳)

اور زمین و آسمان میں بہت سی نشانیاں ہیں جن سے لوگ گزر جاتے ہیں اور کنارہ کش ہی رہتے ہیں۔

یہ تو آیاتِ تدوینی تھیں لیکن کتنی آیات تکوینی خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں کہ جو اس زمین و آسمان کے اندر ہیں کہ جن سے ہم اجنبی بن کر گزر جاتے ہیں، منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں اور ان سے متاثر نہیں ہوتے ہیں،

☆ و بالجملة فليكن حاله حال قوم وصفهم الله بقوله:......

بلکہ قرآن پڑھتے ہوئے انسان کی حالت اس قوم کی ہو کہ جس کی توصیف قرآن نے خود کی ہے، جس کی توصیف خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں کی ہے یعنی انسان کی حالت ایسی ہو کہ

☆ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ○(۳۴)

صاحبانِ ایمان درحقیقت وہ لوگ ہیں جن کے سامنے ذکر خدا کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوفِ خدا پیدا ہو اور اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے اور وہ لوگ اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں۔

یعنی جب خدا کا ذکر اور خدا کا کلام پڑھا جائے تو ان کے دل لرز جائیں، خوف وجل اس خوف کو کہتے ہیں کہ جس سے دل لرز جائے، جس سے بدن کانپ جائے، جب انسان پر ناگہاں ایک خوف طاری ہوتا ہے تو کچھ خوف ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے رنگ اڑ جاتا ہے، کچھ خوف ایسے خوف ہوتے ہیں کہ جن سے بدن لرز جاتا ہے لہٰذا انسان کے اوپر لرزہ طاری ہو جائے، بعض دل ایسے ہیں کہ خوف خدا سے ان کے دل لرز جاتے ہیں، اور بعض دل ایسے ہیں کہ جب ان کے اوپر آیاتِ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے توکل میں اضافہ ہو جاتا ہے یعنی ایسا ہونا چاہئے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو انسان پر یوں اثر ہو۔

۱۷)قرآن کا ہدف، انسان کو صفاتِ ربوبیہ سے متصف کرنا

☆ اذ القرآن انما یراد لاستجلاب ھذہ الاحوال......

قرآن ان حالات کے جَلْب و جذب کرنے کے لئے نازل ہوا ہے، یہ صفات ہمارے اندر پیدا ہوں نہ کہ وہ دوسرے کام اور کرتب جو اس وقت قرآن کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ کہیں اس پر قسمیں کھائی جا رہی ہیں، کہیں اپنے گناہ چھپانے کے لئے قرآن پیش کیا جا رہا ہے، کہیں پر لوگوں کو محظوظ کیا جا رہا ہے، کہیں پر مُردوں کو ایصالِ ثواب پہنچایا جا رہا ہے، کہیں قرآن پر استخارے ہو رہے ہیں، کہیں تعویذ وگنڈے بنائے جا رہے ہیں اور کہیں کیا کیا ہو رہا ہے، قرآن اس لئے نازل ہوا ہے

تا کہ انسان کو متصفِ ربّانی بنا دے یعنی صفاتِ ربوبیہ سے متصف کر دے یعنی مظہرِ صفاتِ خدا بنا دے،

تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ......(۳۵)

اپنے آپ کو خدا کے اخلاق میں ڈھال لو......

اور کسی جگہ فرمایا کہ

اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَأْخُذُ بِآدَابِ اللّٰهِ......(۳۶)

بے شک مومن آدابِ خدا کو لے لیتا ہے......

دونوں روایات ہیں، آدابِ خدا سے مؤدب بنو اور اخلاق خدا سے اپنے آپ کو متخلق کرو، اخلاقِ خدا یعنی قرآن مجید،

☆ اذ بهذه الاحوال يزيد القرب والمنزلة عندالله......

چونکہ ان حالات میں انسان کے اندر قربت حاصل ہوتی ہے یعنی خدا کے نزدیک ان حالات میں قرب و منزلت زیادہ ہوتی ہے، لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ ہینڈ بریک (Handbrake) کھینچ کر اکسلریٹر (Accelerator) دبا رہے ہوتے ہیں، جو ڈرائیور ہیں وہ سمجھتے ہوں گے اور نہیں بھی ہیں تو کسی کو دیکھا ہو گا یا تجربہ کر لیں کہ گاڑی کا ہینڈ بریک کھینچ کے پھر اکسلریٹر دبائیں، دیکھیں کہ کیا اتفاق رونما ہو گا؟ گاڑی کا ہینڈ بریک کہ جو بہت سخت ہوتا ہے اگر اسے کھینچ کر اکسلریٹر دبا رہے ہوں تو گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ اکثر نمازوں میں یہی ہوتا ہے، نمازی نے ہینڈ بریک کھینچا ہوا ہے

اور سفرِ قربی کے لئے اکسلر یٹر دبا رہا ہے، ہینڈ بریک کھینچ کے روزہ رکھتا ہے، اِدھر سے ہینڈ بریک کھینچا ہوا ہے اور اُدھر سے دبا کے بھوک کاٹ رہا ہے، افطاری اور سحری دبا کر کر رہا ہے، مناجات کر رہا ہے اور ہینڈ بریک کھینچا ہوا ہے، اس طرح سفرِ قربی طے نہیں ہوتا ہے، آگے ہینڈ بریک کیوں کھینچا ہوا ہے ؟ یعنی چونکہ اندر صفات طاری نہیں ہو رہی ہیں اور تلفظات زیادہ ہیں، قرأت ہے لیکن تدبر و تفکر اور اتصاف نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہینڈ بریک کھینچا ہوا ہے اور اکسلر یٹر دبا رہے ہو، قرب کہاں سے حاصل ہوگا؟ قرب اس وقت حاصل ہو گا کہ اس بریک کو چھوڑ دو، آزاد کردو، فری کر دو پھر اکسلر یٹر دباؤ تو سفرِ قربیٔ خدا طے ہوگا۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ......(۴۷)

اب تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو......

اس طرح قرب حاصل ہوگا۔قرب فقط تلفظات اور ظواہر سے حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ روح سے حاصل ہوتا ہے، یہ چیز ہے کہ جو خدا کی بارگاہ میں انسان کے اندر قرب و منزلت پیدا کرتی ہے،

☆ ومشاهدة جلاله وعظمته......

مشاہدۂ جلال اور عظمتِ خدا ان چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، احوال سے حاصل ہوتی ہے، یہ فقط تلفظات سے حاصل نہیں ہوتی۔

۱۸)اعلیٰ مرتبۂ معرفت

☆ وهي اشد مراتب المعرفة......

یہ عالی ترین مرتبہ معرفتِ انسان ہے، ایسی معرفتِ عملی کہ جس کے نتیجے میں انسان کے اندر قربِ خدا پیدا ہورہا ہو اسی کو معرفت کہتے ہیں،

☆ فالمعرفة هي المبدأ والغاية......

یہاں پر صاحبِ کتاب کی دوسرے علماء سے ہٹ کر ایک مبنیٰ ہے، ایک بنیاد ہے، جس کی طرف ان کی یہ آخری سطر ناظر ہے، بعض لوگ یہ کہتے کہ عمل اصل ہے اور علم اس کا مقدمہ ہے، یہ فرماتے ہیں کہ معرفت اصل ہے اور عمل اس کا مقدمہ ہے۔ البتہ معرفتیں دو ہیں، ایک معرفت وہ ہے کہ جو انسان کو عمل تک لے آتی ہے اور ایک معرفت وہ ہے کہ جس تک انسان کو عمل پہنچاتا ہے اور یہ قرآن مجید میں بھی ہے، یہ نظر درست تر ہے، یہ نظریہ اس وجہ سے درست ہے کہ قرآن بھی یہی بیان فرمارہا ہے کہ

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ٥(۳۸)

ہرگز نہیں! کاش تم یقینی علم رکھتے۔ تو تم ضرور جہنم کو دیکھ لیتے۔

یعنی معرفت اور علم ویقین سے انسان کے اوپر یہ حقائق کھلتے ہیں،

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ٥(۳۹)

اور اس وقت تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے جب تک کہ موت نہ آجائے۔

عبادتِ خدا کرو، عبادت عمل ہے لیکن اس کا نتیجہ معرفت ہے، جب معرفت حاصل ہو جائے تو انسان اس دنیا میں بیٹھ کر سارے احوالِ آخرت جان سکتا ہے، فرماتے ہیں معرفت حاصل ہوگی، لیکن کونسی معرفت؟ نہ معرفتِ لفظی، مفہومی و ذہنی بلکہ معرفتِ عملی کہ جس کے نتیجے میں انسان کے اندر یہ حالات واحوال و مقامات پیدا ہوں۔

پس معرفت ہی آغاز ہے اور معرفت ہی انجام ہے، شروع بھی معرفت ہے اور آخر بھی معرفت ہے، دین کل کا کل معرفت ہے، اوّل الدّین معرفتهٗ و آخر الدّین معرفتهٗ، دونوں معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں،

☆ لانها......

چونکہ یہ معرفت

☆ عین المعروف بها......

یہ معرفت عینِ معروف ہے، عارف یعنی جس کو معرفت ہو، معروف یعنی جس کی معرفت ہو، معرفت یعنی علم و آگاہی، معرفت عینِ معروف بن جاتی ہے، کب؟

☆ اذا کملت و تمت......

جب معرفت تام ہو جائے، کامل ہو جائے تو یہ معرفت عینِ معروف ہے، خود معروف سامنے آجاتا ہے، جب معرفت ناقص ہو تو معرفت اور ہے اور معروف الگ ہے، علم الگ ہے اور معلوم الگ ہے لیکن علم جب اپنی انتہا و کمال پہ جا پہنچتا ہے تو عینِ معلوم بن جاتا ہے، عینِ معروف

بن جاتا ہے،

☆ **ولهذا قيل:......**

اس لئے علمائے معرفت نے کہا ہے کہ

☆ **اذاتم العشق فهو اللّٰه.**

عشق جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو یہ خودِ خدا ہے، عشق خودِ خدا ہے، خدا یعنی سراپا عشق، عینِ عشق۔ انشاءاللہ خداوند تبارک وتعالیٰ سب کو یہ مقام ومنزلت عطا فرمائے۔ آمین

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۱۰۰)

(۲)......(سوررۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۶،۷)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷۸)

(۴)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۵۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ انفطار، آیہ۶)

(۶)......(الصحيفة الكاملة السجادية)(صحيفة الامام عليٌ)(أدعيه جامع الاحاديث)(البلد الأمين)(مصباح المتهجد)(مصباح كفعمى)(مفاتيح الجنان)(مهج الدعوات)

(۷)......(اقبال الاعمال، الجزء ۱، صفحه۱۹۴)

(۸)......(اقبال الاعمال، الجزء ۲، صفحه ۷۰)

(۹)......(البلد الامين، الجزء ۱، صفحه۱۵۶)(مصباح المتهجد، الجزء ۱، صفحه۳۳۹)(مصباح كفعمى، الجزء ۱، صفحه۱۱۵)

(۱۰)......(البلد الامين)(جمال الاسبوع)(صحائف الأبرار فى وظائف الأسحار)(مصباح المتهجد)(مصباح كفعمى)

(۱۱)......(الصحيفة الكاملة السجادية، دعا ۱۶)

(۱۲)...... (بهجت عارفان در حديث ديگران)(برگى از دفتر آفتاب)

(۱۳)...... (مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثين الحاج

میرزا حسین النوری الطبرسیؒ،الجزء۱۰،صفحه۳۶۸)(بحار الأنوار - علامه مجلسیؒ،الجزء۴۸،صفحه۱۴۷)(مستدرک سفینة البحار - العلامة آية اللّٰه الشيخ علی النمازی،الجزء۸،صفحه۲۶۳) (مفاتیح الجنان)

(۱۴) (نهج البلاغه)(تفسير الميزان- العلامة الطباطبائیؒ،بحث روائی، الجزء۶،صفحه۵۰)(شرح أصول الكافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء۳،صفحه۳۲۰)(الأمثال القرآنية القياسية المضروبة للايمان باللّٰه - عبد اللّٰه بن عبد الرحمن الجربوع،الجزء۱،صفحه۲۶۴)(الكلينی والكافی - الشيخ عبد الرسول الغفاری،الجزء۱،صفحه۳۱۴)(شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحديد،الجزء۱،صفحه۶۷)(یک هزار سخن از حضرت علیؑ، الجزء۲،صفحه۱)(ميزان الحكمة - الريشهری،الجزء۳،صفحه۲۸۶)

(۱۵)... (من لا يحضره الفقيه - للشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسين بن بابويه القمیؒ، الجزء ۲، صفحه ۲۰۴)

(۱۶)... (مستدرک سفينة البحار - العلامة آية اللّٰه الشيخ علی النمازی، الجزء۶،صفحه۱۳۲)(بحار الأنوار - علامه مجلسیؒ،الجزء۷۹،صفحه۲۰۷) (جامع آيات و احاديث موضوعی نماز)

(۱۷)......(تفسير مجمع البيان - الطبرسیؒ،الجزء۱۰،صفحه۱۱۱)

(۱۸).... (مثنوی معنوی،به تصحيح :رينولد ا.نيكلسون،دفتر اول،صفحه۱۶)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۵۵)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۴۱)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۱۵)(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۱۳)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ ممتحنہ، آیہ ۴)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ ابراہیم، آیہ ۱۲)

(۲۴)......(سورۂ مبارکہ ہود، آیہ ۱۸)

(۲۵)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۶۱)

(۲۶)......(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ) (تفسیر القرآن الکریم- السید مصطفی الخمینیؒ، الجزء۲، صفحہ۱۸۹) (بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحہ۱۸۴)(مستدرک سفینة البحار- العلامة آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازی، الجزء۸، صفحہ۱۶۴)(میزان الحکمة- الریشهری، الجزء۸، صفحہ۲۱۰)

(۲۷)......(فی رحاب القرآن)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل- المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء۴، صفحہ۲۵۰)(سنن النبی الاکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

(۲۸)......(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، الجزء۱۱، صفحہ ۳۶۵)

(۲۹)......(سورۂ مبارکہ صف، آیہ ۳)

(۳۰)......(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ ۱)

(۳۱)..... (سورۂ مبارکہ نجم، آیہ۲۹)

(۳۲)..... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷۸)

(۳۳)..... (سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۱۰۵)

(۳۴)..... (سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۲)

(۳۵)..... (بیان المعانی - عبد القادر بن ملّا حویش السید محمود آل غازی العانی، المتوفی: ۱۳۹۸ھ، الجزء ۵، صفحه ۲۱۲)(مفاهیم القرآن الجزء السادس)(بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسی "قدس الله سره"، الجزء ۵۸، صفحه ۱۲۹)(قبسات من نهج البلاغة)(شرح خطبه البیان امام علی بن ابی طالبؑ)

(۳۶)..... (وسائل الشیعة - الفقیه المُحَدِّث الشیخ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ، الجزء ۲۱، صفحه ۵۴۱)(آموزه های بنیادین علم اخلاق - محمد فتح علی خانی، الجزء ۲، صفحه ۱۰)(السلام فی القرآن والحدیث)

(۳۷)..... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۴۸)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۴۸)

(۳۸)..... (سورۂ مبارکہ تکاثر، آیہ۶،۵)

(۳۹)..... (سورۂ مبارکہ حجر، آیہ۹۹)

فصلِ ادبِ ھشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ چھارم)

۱)بصیرتِ کشفیہ کا مطلب

۲)بصیرۃ کشفیہ، قرآن مجدد الانزال ھے

۳)تمثیلِ استوائے قرآن بر قلب

٤)خَلْقْ اور خُلُقْ کا فرق

٥)خُلُقْ کے منابع

٦)خَلْقْ اور خُلُقْ میں ھم آھنگی کی ضرورت

۷)استوائے قرآن بر قلب نہ ھونے کا نتیجہ

۸)تالیٔ قرآن کون ھے؟

۹)نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

۱۰)دل کب تابعِ قرآن ھوتا ھے؟

۱۱)جیسا عارف ویسی معرفت

۱۲)مکاشفۂ قرآنی

۱۳)قرآنِ مجید خُلقِ رسول ﷺ ھے

۱) بصیرتِ کشفیہ کا مطلب

آدابِ فہم قرآن میں ادبِ ہشتم التاثر والوجد ہے یعنی انسان آدابِ دیگر کے ساتھ خدمتِ قرآن میں حاضر ہو کر آیات ومضامین قرآن اور معارفِ قرآن سے متاثر بھی ہو، صدر المتألہینؒ اسی کو بیان فرماتے ہوئے نکتۂ دیگر بعنوانِ بصیرتِ کشفیہ ذکر فرماتے ہیں یعنی ایک ایسی بصیرت جو کشف ہو اور جس کا مکاشفہ سے تعلق ہو، یہ معمولی مطلب نہیں ہے، کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنہیں انسان مطالعہ کے ذریعے، فہم کے ذریعے یا حتیٰ سادہ فہم کے ذریعے سے درک کر لیتا ہے، کسی کتاب میں پڑھ لیتا ہے، کسی درس میں سن لیتا ہے، کسی شخصیت سے کوئی مطلب سن لیتا ہے اور پلے باندھ لیتا ہے یعنی وہ چیزیں جو مفاہیم سے تعلق رکھتی ہوں اور ذہنی کاوشوں سے انسان ان کو آسانی سے سمجھنے پر قادر ہو جاتا ہے لیکن بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں انسان آسانی سے درک نہیں کر سکتا ہے بلکہ دلی وقلبی آمادگی کے بعد اور نفس کے تزکیہ کے بعد انسان کو یہ مطالب خداوند تبارک و تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتے ہیں، جس طرح قرآن مجید کا فرمانا ہے کہ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ......(۱)

اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں تعلیمات سے آراستہ فرماتا ہے......

یعنی وہ مطالب کہ جو انسان کو تقویٰ کے نتیجے میں حاصل ہوتے ہیں، وہ تعلیمات جو اسبابِ خاص کے ذریعے سے خداوند تبارک وتعالیٰ بعض نفوس کو عطا فرماتا ہے، جو شہود سے، علمِ حضوری سے یا مکاشفات کے ذریعے سے درک کرتا ہے ان کو کشفی حقائق کہتے ہیں، یہ مسلم حقیقت ہے کہ ہر وہ نفس

بصیرتِ کشفیہ کا مطلب

جو آمادہ ہو اور خداوندِ تبارک وتعالیٰ لطف وعنایت نازل فرمائے تو اس قسم کے مطالب اسے حاصل ہو جاتے ہیں، انسان کو ان معارف اور مطالب کا قدردان ہونا چاہئے چونکہ یہ مطالب ہر جگہ موجود نہیں ہوتے ہیں اور ہر کتاب، ہر شخص یا ہر عالم سے انسان کو یہ چیزیں میسر نہیں آتی ہیں۔

جیسے بعض اہلِ ادب نے ذکر کیا ہے کہ کچھ غذائیں ایسی ہیں کہ جو ہر پرندے کے لئے ہیں لیکن کچھ خوراکیں اور کچھ غذائیں ایسی ہیں کہ جو خدا نے خاص پرندوں کے لئے بنائی ہیں کہ دوسرے اس تک پہنچ بھی نہیں سکتے ہیں، ان کا ہاضمہ بھی اتنا نہیں ہوتا ہے کہ ان خوراکوں کو ہضم کر سکے اور ان کی رسائی بھی ان تک نہیں ہوتی ہے، اسی طرح سے انسان بھی ہیں، انسانوں کے لئے بھی خداوند تبارک وتعالیٰ نے بعض ایسے حقائق و معارف مقرر فرمائے ہیں کہ بعض خاص انسان ان تک پہنچ سکتے ہیں، البتہ راستہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے لیکن اس راستے کو طے وہی کر سکتا ہے اور اس باب و مرتبے تک وہی انسان پہنچ سکتا ہے کہ جو ہمت کرے اور توفیق خداوند تبارک وتعالیٰ اس کے شاملِ حال ہو جائے۔

برتر فہم کا مطلب

صدرالمتألہین رضوان اللہ علیہ انہی بزرگوں میں سے ہیں کہ جن پر خداوند تبارک وتعالیٰ کا یہ لطف اور عنایت شامل ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے انہیں معرفت کے وہ نکتے اور حقائق عطا فرمائے ہیں کہ جو اس حکیمِ الٰہی کی فلسفی کتابوں میں، تفسیری کتابوں میں، حدیث کی کتابوں میں اور دیگر آثار میں موجود ہیں۔ اس قسم کے حقائق کہ جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے مخصوصاً انہیں عطا فرمائے ہیں اور پھر ان کے توسط سے ان کے شاگردوں اور فکری پیروکاروں کو یہ نکتے عطا ہوئے ہیں، فلسفی

کتابوں میں بھی اپنے انہی حقائق کو بصیرتِ کشفیہ، حقیقتِ کشفیہ یا شہودیہ یا عموماً مطالبِ عرشیہ، حقائقِ عرشیہ اور نکاتِ عرشیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲) بصیرۃ کشفیہ، قرآن مجدد الانزال ہے

☆بصیرۃ کشفیہ☆

☆ اعلم: ان القرآن مجدد الانزال علی قلوب التالین......

فرماتے ہیں کہ یہ بصیرتِ کشفیہ ہے یعنی بصیرت افروز اور بصیرت بڑھانے والا نکتہ ہے اور دوسرا یہ ہے کہ یہ مطلب کشفی ہے یعنی یہ مطلب انسان کو سادگی سے میسر نہیں آتا ہے، قرآن کے بارے میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جو ہر انسان جانتا ہے اور وہ کہیں سے بھی میسر آجاتی ہیں مثلاً آدابِ لفظی لیکن قرآن کے بارے میں یہ نکتے انہی لوگوں سے میسر آتے ہیں کہ جو اہلِ کشف و شہود ہیں، جن پر خداوند تبارک وتعالیٰ نے عنایت ولطف فرمایا ہے اور اس مقام تک پہنچایا ہے۔ صدر المتالھینؒ ادبِ ہشتم کے ذیل میں اس نکتے کو کہ جب انسان بارگاہِ قرآن میں جائے تو دلِ انسان پر قرآن کے ہر ہر مطلب سے تاثیر ہو بصیرتِ مزید عطا فرماتے ہیں کہ انسان یہ نکتہ ذہن میں رکھ لے کہ قرآن مجدّد الانزال ہے یعنی نزولِ قرآن مجدد ہے، مجدد یعنی بار بار نازل ہوتا ہے، نزولِ قرآن کے اندر تجدد ہے، تجدد سے مراد یہ ہے کہ قرآن ہر دفعہ ایک نئی حقیقت کے ساتھ انسان کے دل میں نازل ہوتا ہے، قرآن ایک نئی دنیا لے کر اور نئے ادوار لے کر انسان کے دل پر نازل ہوتا ہے اور یہ

بصیرۃ کشفیہ، قرآن مجدد الانزال ہے

تجدد کئی طرح سے ہے، ایک یہ کہ حرف حرف کی نسبت قرآن کا نزول ہے، ایک نزول قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے اور نزولِ دیگر قرآن قلبِ نورانی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قلوبِ مومنین پر ہے اور ضروری نہیں ہے کہ قرآن ہر مومن کے لئے نازل ہو، جس مومن نے بھی اپنے آپ کو آمادہ کیا ہے اور اپنے دل کو قرآن کے نزول کیلئے آمادہ کیا ہے تو قرآن اس کے دل میں نازل ہوا ہے اور مومن کے دل میں جب قرآن نازل ہوتا ہے تو بھی اس میں تجدد ہے یعنی ایک شخص کی نسبت بھی قرآن کے نزول میں تجدد ہے۔

۳)تمثیلِ استوائے قرآن بر قلب

صدرالمتألہینؒ قرآن کے تجدد کی وضاحت فرماتے ہوئے ایک تشبیہ دیتے ہیں کہ قرآن اور دلِ انسان کی نسبت آپس میں وہی ہے کہ جو رحمٰن اور عرش کی نسبت ہے، قرآن نے بھی لفظِ رحمٰن استعمال کیا ہے، اس لئے رحمٰن جس طرح سے عرش پر مستوی ہے اور استوائے رحمٰن بر عرش ہے اسی طرح سے استوائے قرآن بر قلبِ انسان ہے یعنی دلِ انسان بمنزلۂ عرش ہے اور قرآن بمنزلۂ رحمٰن ہے۔ استوائے رحمٰن بر عرش کے مطالب اہل تفسیر نے قرآن کی ان آیات کے ذیل میں کہ جن میں استوائے رحمٰن بر عرش کا ذکر ہوا ہے بیان فرمائے ہیں، استوا اعتدال کو کہتے ہیں یعنی کسی چیز کو متناسب، موزوں اور متعدل حالت میں کرنے کو استوا کہتے ہیں، قرآن نے اس کے مختلف مشتقات و متعلقات استعمال کئے ہیں، سوا بھی استعمال کیا ہے،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا ۝ (۲)

اور نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا۔

یا اس سے متعلق اور بھی لفظ استعمال کئے ہیں، استوا یعنی کسی چیز کو بناتے ہوئے، خلق کرتے ہوئے، ترتیب دیتے ہوئے ایسا موزوں، معتدل اور متناسب بنایا جائے کہ اس کی طبیعت، مزاج یا اس سے متعلقہ قانون کے مطابق ہو، نہ اس میں تفریط ہو نہ افراط ہو، نہ اس میں کمی ہو اور نہ کوئی چیز اضافی ہو۔ عرش درمقابلِ فرش استعمال ہوتا ہے، عرش ایسے محل کو کہتے ہیں جو اوپر ہو، بلندی پر ہو اور محیط بر فرش ہو، فرش نچلے مکان کو کہتے ہیں، یہ دونوں عربی لفظ ہیں، فرش نچلی منزل یا نچلے طبقے کو کہتے ہیں کہ جس کے اوپر سایہ ہو، جس کے اوپر کوئی جسمِ دیگر یا محلِ دیگر محیط ہو، اسی وجہ سے سلاطین اور امراء کے تختِ حکومت کو بھی عرش کہا جاتا ہے چونکہ جسمانی طور پر بھی دوسرے سے بلند تر ہوتا ہے مثلاً جب دربار لگتا ہے تو دوسرے لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ یا نشست گاہیں محل کے اعتبار سے نیچے ہوتی ہیں اور تختِ شہنشاہ اور بادشاہ ان سے جسمانی طور پر یعنی محل کے لحاظ سے، مکان کے لحاظ سے بالاتر ہوتا ہے۔

عرش مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کسی دوسری شے کے اوپر ہر اقتدار، احاطہ اور تسلط عرش ہی کہلائے گا، دل چونکہ عرش ہے، اس اعتبار سے کہ انسان کے دیگر اعضاء و جوارح اور دیگر شعبہ ہای وجود کی طرف دل سے احاطہ ہوتا ہے یعنی دلِ انسان درحقیقت محیط ہے اور رحمان کا استوا عرش پر ہے یعنی خداوند تبارک و تعالیٰ مقامِ اقتدار و احاطہ میں پورے عالم اور نظامِ ہستی کے اوپر جب

اپنے اقتدار وقدرت سے امارت وحکومت کرے تو یہ استوائے رحمان بر عرش ہے، عرش کا لفظ کسی جسمانی چیز کے لئے بھی مخصوص نہیں ہے نہ لفظِ فرش کسی جسمانی چیز کے لئے مخصوص ہے، قرآن مجید کے الفاظ یا جس زبان کے بھی الفاظ ہوں وہ مصادیق کیلئے مقرر نہیں کئے گئے ہیں، عام طور پر جب ہم الفاظ سنتے ہیں تو ان کے معانی کے طور پر مصادیق فوراً ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں مثلاً پانی کہتے ہی فوراً یہ سیال مائع کہ جو آسمان سے نازل ہوتا ہے، ندیوں، نہروں اور سمندروں میں موجود ہے اور گھروں میں استعمال ہوتا ہے مصداق کے طور پر ہمارے ذہن میں آجاتا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پانی فقط اسی مائع اور اسی سیال چیز کے اندر منحصر ہے حالانکہ یہ مصداقِ آب ہے، معنیٰ آب اور چیز ہے لیکن یہ اس کا مصداق ہے۔

مثلاً جوں ہی لفظِ قلم استعمال ہوتا ہے تو ہمارے ذہن کے اندر فوراً قلم کی رائج شکل معنیٰ کے طور پر آجاتی ہے حالانکہ یہ قلم کا مصداق ہے نہ کہ یہ قلم کا معنیٰ ہے یعنی لفظِ قلم اس کے لئے مقرر نہیں ہوا ہے بلکہ لفظِ قلم ایک معنیٰ کے لئے مقرر ہوا ہے اور اسی معنیٰ کے مصادیق میں سے یہ قلم بھی ہے کہ جو ہمارے ہاتھ میں ہے، اسی طرح سے عرش وکرسی و جتنے الفاظ قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں وہ فقط جسمانی مصادیق کے لئے نہیں مقرر ہوئے ہیں بلکہ اپنے معانی کے لئے وضع ومقرر کئے گئے ہیں لیکن ان معانی کے مصادیق اور ان کے ماتحت افراد کہ جن پر ان الفاظ کا اطلاق کیا جاتا ہے اور صدق کیا جاتا ہے ان میں سے بعض جسمانی ہیں اور بعض غیر جسمانی ہیں چونکہ ہم زیادہ تر جسمانی مصادیق کے ساتھ مانوس ہیں لہٰذا فوراً ہمارے ذہن میں یہی مادی معنیٰ تدوین ہوتے ہیں کہ مثلاً ان

سے مراد معانیٔ جسمانیہ ہیں، عرش اس مافوق مقام کو کہتے ہیں کہ جہاں پر بیٹھ کر احاطہ پیدا کیا جائے یا جس چیز کا نچلی چیزوں پر، مادون چیزوں پر اور ماتحت چیزوں پر احاطہ ہو اس کو عرش کہتے ہیں، نشست گاہِ حکمران کو یا سلطان کو بھی اسی وجہ سے عرش کہتے ہیں چونکہ وہاں بیٹھ کر نہ صرف جسمانی طور پر دوسروں سے بلند تر ہوتا ہے بلکہ اس کا احاطۂ قدرت واقتدار وحکمرانی بھی دوسروں پر پیدا ہو جاتا ہے یعنی لوگوں کے اوپر اقتدار خود ایک احاطہ ہے، یہ فقط دربار میں اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے مافوق نہیں ہے بلکہ وہ لوگ جو اس کے دربار میں نہیں ہیں، جو باہر ہیں، اس کے ملک میں ہیں، اس کے شہر میں ہیں، اس کی آبادیوں میں ہیں، اس کے دیہاتوں میں ہیں، ان سب پر بھی وہ محیط ہوتا ہے اور ان سب پر بھی مسلط ہوتا ہے، اصطلاح میں اس کو احاطہ حاصل ہوتا ہے، اس وجہ سے اس نقطے کو کہ جہاں پر بیٹھ کر وہ اپنا اقتدار ظاہر کرتا ہے، اپنی قدرت کا اظہار کرتا ہے اور فرمان روائی کرتا ہے عرش کہا جاتا ہے۔

خداوند تبارک وتعالی کے عرش پر متمکن ہونے سے یہ ظاہری عرش مراد نہیں ہے، نہ عرشِ خدا جسمانی ہے اور نہ ذاتِ خداوند تبارک وتعالی جسمانی ہے، اس عرش سے مقصود یہ ہے کہ خداوند تبارک وتعالی نے زمین کو خلق کیا،

ثُمَّ اسۡتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ......(۳)

اس کے بعد اس نے آسمان کا رخ کیا......

ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ .....(۴)

اور اس کے بعد عرش پر اپنا اقتدار قائم کیا ہے......

یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ نے جہان کو خلق کیا اور پھر خلق کے بعد ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس کے اوپر احاطۂ قدرت پیدا کیا اور اپنے اقتدار سے اس کی تدبیر کا آغاز کیا، خدا کا تمکن جسمانی نہیں ہے کہ جیسے بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے، علیٰ ای حال اس تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید بھی انسان کے دل کی نسبت ایسے ہی ہے کہ جیسے استوائے رحمان بر عرش ہے یعنی دلِ انسان ایک نوعِ عرش ہے اور اس پر قرآن مستوی ہوتا ہے، قرآن کو دلِ انسان پر استوا حاصل ہوتا ہے، اس کے لئے بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح کا دل آمادہ ہو اسی طرح کا دل کے اوپر ظہورِ قرآن اور نزولِ قرآن بھی ہوگا، یہ نزول اس بات پر موقوف ہے کہ انسان نے اس عرش کو فقط قرآن کے لئے خالی رکھا ہوا ہو، اس محل کو انسان نے قرآن کے لئے آمادہ کیا ہوا ہو، اگر یہ عرش کسی کے قبضے میں ہو اور شیاطین اس کے گرد یا اس کے اوپر آ گئے ہوں جیسا کہ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ بسا اوقات شیطان آ جاتا ہے اور انسان کے دل میں آ کر اپنا گھر بنا لیتا ہے اور پھر اس کے بعد حتیٰ اس آشیانے میں تولیدِ نسل کرتا ہے، نہج البلاغہ کی تعبیر کے مطابق شیطان دلِ انسان میں آ کر تولیدِ نسل کرتا ہے، انڈے دیتا ہے، چوزے نکالتا ہے اور وہاں آباد ہو جاتا ہے، بسا اوقات اس عرشِ رحمان پر یا عرشِ قرآن پر خواہشات غالب ہو جاتی ہیں۔ جس طرح سلطان کے تخت پر اگر سلطان توجہ نہ کرے، سلطان اپنے عرش کو اور اپنے تخت کو کوئی اہمیت نہ دے تو دوسرے آ کر سلطان کی جگہ پر متمکن ہو جاتے ہیں، غاصب و نااہل لوگ غالب آ جاتے ہیں اور عرشِ سلطان پر قبضہ کر لیتے ہیں،

اسی طرح سے عرشِ رحمان بھی ہے،

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى ۝ (۵)

وہ رحمٰن جس نے عرش پر اقتدار قائم کیا۔

جس طرح سے روایت میں بھی ہے کہ

اِنَّ قَلۡبَ الۡمُؤۡمِنِ عَرۡشُ الرَّحۡمٰنِ...... (۶)

بے شک مومن کا دل خداوندِ عالم کا عرش ہے......

یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ کی حکمرانی اور حکم فرمائی دلِ انسان پر ہے اور اگر یہ دل خدا کے عرش کے طور پر ہو جائے کہ اقتدار فقط خدا کا ہو اور عہدہ فقط خدا کا ہو تو پھر جسم کے اوپر، انسانی کائنات کے اوپر اور انسانی عوالم کے اوپر اس دل کا احاطہ ہو جاتا ہے یعنی دل حکمران ہو جاتا ہے اور انسان کی باقی کائنات اس کی رعایا بن جاتی ہے اور اسکے ماتحت ہو جاتی ہے نتیجتاً کائناتِ انسانی اقتدارِ الٰہی کے تابع ہو جاتی ہے، کائناتِ نفسِ انسان پر بھی اقتدارِ خدا آجاتا ہے کہ جس طرح سے کائناتِ جہان، کائناتِ انفسی و کائناتِ تکوینی پر قدرتِ خدا ہے، انسان اگر قرآن کے لئے دل کو آمادہ کرے اور اس کو خواہشات، قابضین، شیاطین، آرزوؤں، ہویٰ و ہوس اور دیگر گناہوں سے نجات دے تو قرآن اس وقت اِس عرش پر آکر مستوی و متمکن ہو جاتا ہے۔

پس استوائے قرآن بر دلِ انسان یہ ہے کہ قرآن اس طرح سے دلِ انسان پر محیط ہو جائے اور از طریقِ دلِ انسان، انسان کے تمام اعضاء و جوارح اور تمام وجود و تمام ہستیٔ انسان پر اس طرح

احاطہ کرلے کہ قرآن انسان کی صفت بن جائے، نہ کہ قرآن انسان کے ذہن کے اندر فقط تلفظ یا مفہوم ہو۔

٤)خَلق اور خُلق کا فرق

صدر المتالھینؒ فرماتے ہیں کہ جیسے حدیث میں بھی موجود ہے کہ خُلقِ پیغمبر اکرم ﷺ قرآن تھا، خداوند تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا خُلق قرآن کو قرار دیا ہے۔ خُلق کس طرح سے بنتا ہے؟ خُلق یعنی وہ صفاتِ راسخہ و مَلَکاتِ راسخہ کہ جو نفسِ انسان اور وجودِ انسان کے اندر موجود ہوں، یہ ملکاتِ راسخہ کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ خواہ برے ملکات ہوں، ملکات سے مراد وہ صفات ہیں کہ جو انسان کے اندر آکر بیٹھ جاتی ہیں، گھر بنا لیتی ہیں اور پھر انسان انہی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور انہی کے مطابق عمل کرتا ہے یعنی یہی صفات انسان کے اعمال اور اعضاء و جوارح کی ضمام سنبھال لیتی ہیں اور ہم ان کو اخلاقیات کہتے ہیں۔

ایک خلقتِ انسان ہے اور ایک خُلقِ انسان ہے، خَلقِ انسان وہ چیز ہے کہ جو خدا نے بنا دی ہے جیسے خداوند تبارک وتعالیٰ نے آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں، سر، جسم اور ہمارا وجود بنایا اور اس پیکر میں یہ روح ڈالی، یہ خَلقِ انسان ہے اور خَلق فعلِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے، بعد از خَلق مرحلۂ خُلقِ انسان شروع ہوتا ہے، خُلق وہ عمل ہے یا وہ صفات ہیں کہ جو انسان خود اپنے اندر ایجاد کرتا ہے۔ وہ صفات جو خلقت کی تکمیل کے بعد انسان کے اندر پیدا ہوتی ہیں ان کو خُلق کہتے ہیں اور اس کی جمع

اخلاق یا خُلق بھی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍo(۷)

اور آپؐ بلند ترین اخلاق کے درجہ پر ہیں۔

اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی فرمایا کہ

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ......(۸)

بتحقیق مجھے اس لئے بھیجا گیا تا کہ میں اخلاق کے اعلیٰ مراتب کی تکمیل کروں......

میری بعثت کا مقصد یہی ہے کہ میں اس شعبے میں لوگوں کی مدد کرنے آیا ہوں۔ خِلقت خدا کا کام ہے، تکمیلِ خُلق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام ہے۔

٥)خُلق کے منابع

انسان کا خُلق کہاں سے بنتا ہے؟ اس کے لئے مختلف منابع ہیں عموماً جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو گھر کا ماحول اور سوسائٹی (Society) کے اندر جیسا ماحول ہوتا ہے وہ اس کے اندر صفات پیدا کرتا ہے، ماں باپ، رہن سہن۔ کلچر (Culture)، تہذیب، ثقافت و تمدن اس کے اندر خُلق و صفات پیدا کرتے ہیں یعنی بچہ فقط قبول کر رہا ہوتا ہے، چاروں طرف سے، شش جہات سے اور ہر طرف سے ماحول اس کو کچھ نہ کچھ دے رہا ہوتا ہے اور وہ ان سب سے خُلقیات کشف کر رہا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں میں رہنے والوں کی خُلقیات اور طرح کی ہوتی ہیں، شہروں میں رہنے والوں کی خُلقیات اور طرح کی ہوتی ہیں، قبائل میں رہنے والوں کی خُلقیات قبائلی ہوتی ہیں، اسی طرح سے مغرب میں رہنے والوں کی خُلقیات غربی ہوتی ہیں، مشرق میں رہنے والوں کی خُلقیات شرقی ہوتی ہیں، متدین لوگوں کے گھروں میں پلنے والی اولاد کی خُلقیات دینی ہوتی ہیں، غیر متدین گھرانوں کے اندر پلنے والی اولاد کی صفات غیر اخلاقی ہوتی ہیں، شہوتوں کے اندر پلنے والوں کی صفات شہوت رانی والی ہوتی ہیں اور اسی طرح سے جس ماحول میں انسان تربیت پا رہا ہوتا ہے عموماً اسی طرح کی صفات اس میں پیدا ہوتی ہیں۔ ماں باپ، تربیت، وراثت، ماحول، سوسائٹی، تاریخ، تمدن اور ثقافت وغیرہ انسان کے اندر صفات ایجاد کرتی ہیں۔ انسان کے اندر صفات ایجاد کرنے کا ایک منبع قرآن ہے، کہا گیا ہے کہ آپ جب دوسری جگہوں اور رسم و رواج سے اپنے لئے صفات حاصل کرتے ہیں تو یہ صفات قرآن سے حاصل کریں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا نے اس لئے مبعوث کیا ہے کہ وہ یہ کام کریں لہٰذا اہم صفات کو ماحول سے لینے کے بجائے، سوسائٹی سے لینے کے بجائے تعلیماتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صفات و خُلقیات لیں اور اپنائیں۔

٦) خَلق اور خُلق میں ہم آہنگی کی ضرورت

اسی مطلب کو ذرا واضح تر کر کے بیان کرتے ہیں، خَلق سے انسان کا شخص بنتا ہے اور خُلق سے انسان کی شخصیت بنتی ہے، شخص نتیجۂ خَلق ہے اور شخصیت نتیجۂ خُلق ہے، شخص خدا بناتا ہے اور

شخصیت خود انسان بناتا ہے البتہ شخصیت بنانے کے کچھ منابع ہیں کہ جن کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان میں انسان دیکھے کہ کونسی صفات ہیں جو میرے اندر پیدا ہوں؟ کونسی خُلقیات ہیں جو میں اپنے اندر ایجاد کروں تاکہ میری خَلق کے ساتھ خُلق ہم آہنگ ہو جائے یعنی خَلق اور خُلق ایک جیسے ہو جائیں، خَلق کے بارے میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍo(۹)

تحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔

انسان کی خَلق بہترین خَلق ہے، کہیں فرمایا کہ

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَاo

اور نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے نفس کو پیدا کیا اور اس کے اندر تسویہ کیا، تسویہ یعنی اس کو معتدل، موزوں اور بہتر بنایا ہے، اس کی کریمانہ خلقت کی ہے، اب اس کے اندر جب شخصیت کی نوبت آتی ہے تو یہ بھاری ذمہ داری ہے کہ انسان اس خَلق کے اندر خُلق پیدا کرے، شخص کے اندر شخصیت پیدا کرے، شخصیت بنانے کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو منبع قرار دیا ہے، کہا کہ خاک سے، مٹی سے، ماحول سے، جانوروں سے اور چراگاہوں میں جا کر اپنے لئے خُلق کسب نہ کرو کہ جس طرح سے اپنی غذا ہر چیز سے کسب نہیں کرتے ہو، آپ اپنی خُلق اور اپنی شخصیت بھی خدا کے بنائے ہوئے نظام سے کسب کرو یعنی دین سے حاصل کرو، آسمانی کتابوں سے حاصل کرو یعنی انبیاءؑ سے

حاصل کرو، اولیاءِ خدا علیہم السلام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے ذریعے سے حاصل کرو، ان کو اسوہ اور نمونہ بھی قرار دیا ہے، وہ اسوہ اسی وجہ سے ہیں کہ ان کے اندر جتنی خُلقیات ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں، ان کی خَلق بھی خدا کی طرف سے ہے اور خُلق بھی خدا کی طرف سے ہے یعنی ان کا خُلق قرآن و دین ہے، اسی لئے روایت کے مطابق

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ......(۱۰)

قرآن خُلقِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، قرآن اخلاقِ پیغمبر اکرمؐ، شخصیتِ پیغمبر اکرمؐ اور صفاتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ قرآن فقط قرأت والفاظ نہیں ہے بلکہ قرآن انسان کیلئے صفت بن جائے، پہلے کہا تھا کہ قرآن انسان کے لئے معرفت ہے، قرآن انسان کے لئے حکمت ہے، قرآن انسان کے لئے ہدایت ہے، عملاً ہدایت اس وقت بنتا ہے کہ جب انسان کے اندر منتقل ہو کر انسان کی صفت بن جائے اور وہ بھی صفتِ راسخہ اور خُلق بن جائے۔ اس لئے جب قرآن دلِ انسان میں اترتا ہے تو جیسا قرآن ہے ویسا ہی دل بنا دیتا ہے۔

۷)استوائے قرآن بر قلب نہ ہونے کا نتیجہ

اگر انسان قرآن کو اپنا خُلق نہ بنائے اور اپنی صفت نہ بنائے، اپنے اندر نہیں اتارے، دل متصف بہ قرآن نہ ہو، دل عرشِ قرآن واقع نہ ہو تو فرماتے ہیں کہ اس صورت میں سرے سے انسان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ انسان نے بعض الفاظ کو تجسم کیا ہوا ہے اور انہیں سمجھتا ہے کہ یہ

قرآن ہے، مثلاً قرآن کی آیات کے الفاظ کو اگر انسان دہراتا رہے، تکرار کرتا رہے تو یہ تو قرآن نہیں ہے، اس کے اپنے خیال کے اندر تجسم الفاظ قرآن ہے، یہ قرآن نہیں ہے، قرآن اس حکمت، خصوصیت اور صفت کا نام ہے کہ جو انسان کے دل پر بن جائے، لہٰذا فرماتے ہیں کہ جس طرح کی آیات ہیں تو ہم یہ دیکھیں کہ قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وذات نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کردار و سیرتِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح سے ہے۔

۸) تالیٔ قرآن کون ہے؟

☆ **اعلم: ان القران مجدد الانزال علی قلوب التالین......**

قرآن مجدد الانزال ہے، مجدد النزول ہے یعنی تجدید ہے، اس کے اندر تجدد ہے، بار بار نازل ہوتا ہے، اس کے اندر جدت ہے، لیکن کس کے دل پر؟

☆ **علی قلوب التالین......**

تالینِ قرآن کے قلوب پر۔ تالیٔ قرآن کون ہوتا ہے؟ اور تلاوتِ قرآن سے کیا مراد ہے؟ آیا یہی مراد ہے کہ جو آج رائج ہے کہ جس کو کہتے ہیں پڑھنا، تلفظ کرنا یا نہیں؟ اگر اس کا اجمالی طور پر معنیٰ کریں تو کہیں گے کہ تالیٔ قرآن یعنی دلِ تالی رکھنے والا، تالی تلو سے ہے، تلو یعنی پہلو میں جڑی ہوئی جو چیز ہو اور پیچھے جو چیز ہو، مثلاً کوئی چیز آگے جا رہی ہو اور بغیر فاصلے کے جو چیز متصلاً اس کے ساتھ جا رہی ہو تو اس کو تالی کہتے ہیں مثلاً ماں جا رہی ہو تو بچہ بلا فاصلہ دامن تھام کے اس کے پیچھے

پیچھے جارہا ہو اور ان دونوں کے اندر کوئی فاصلہ نہیں ہوتا ہے اس کو تالی کہتے ہیں، تالی یعنی بالکل متصل پیچھے آنا والا انسان، اس میں اور اُس میں کوئی فاصلہ موجود نہ ہو، محفل میں یا مجلس میں اگر آپ کے ساتھ کوئی انسان کسی وقفے اور فاصلہ کے بغیر بیٹھا ہوا ہو تو اس انسان کو کہتے ہیں کہ یہ آپ کا تالی ہے یعنی بالکل متصل اور آپ کے بعد ہے، البتہ تالیٔ قرآن یعنی ایسا انسان کہ جو قرآن کے پیچھے جارہا ہے، بلا فاصلہ جارہا ہے یعنی اس میں اور قرآن میں کوئی فاصلہ موجود نہیں ہے۔

لغت کے اعتبار سے بھی لفظ تالی بلا فاصلہ کیلئے استعمال ہوتا ہے، کسی کے پیچھے جانے کو تالی کہتے ہیں یعنی آگے ایک شخص جارہا ہو اور کسی فاصلے اور وقفے کے بغیر ایک دوسرا شخص اس کے ساتھ متصل طور پر جارہا ہو البتہ پیچھے ہو لیکن فاصلے کے بغیر ہو تو اِس کو اُس کا تالی کہتے ہیں، اس کو تلوٌ بھی کہتے ہیں یعنی کسی کے پیچھے جانا، پیچھے چلنا، کسی کی پیروی کرنا، پیروی بلا فاصلہ یا بلا فصل پیروی کرنا، اگر بیچ میں کوئی شے حائل ہو جائے تو اس کو تالی یا تلوٌ نہیں کہتے ہیں بلکہ تبع کہتے ہیں یا اس پر دوسرے الفاظ منطبق ہوتے ہیں، پس تالیٔ قرآن کون ہے؟ اول مخاطبِ قرآن دلِ انسان ہے پس تالیٔ قرآن دلِ انسان ہے یعنی قرآن آگے جارہا ہے اور انسان اس کے پیچھے جارہا ہے، دلِ انسان قرآن کے پیچھے ہو یعنی جہاں جہاں قرآن جارہا ہے وہاں وہاں دلِ انسان جارہا ہو۔

ہم تلفظ کرنے والے کو تالیِ قرآن کہتے ہیں اور ادائے الفاظ کرنے کو تلاوتِ قرآن کہتے ہیں حالانکہ تالی کا معنیٰ ہوتا ہے بغیر وقفے کے متصلاً کسی شے کے ساتھ لگ کر رہنا اور اس سے جدا نہ ہونا اور اسکے پیچھے بھی رہنا، اُس کے بعد بھی رہنا یعنی آگے کوئی ہو اور اس کے پیچھے بغیر فاصلے کے ہم

ہوں تو ہمیں اس کا تالی کہا جائے گا، وہ ہمارے آگے چل رہا ہے، وہ مقدم ہے اور ہم تالی ہیں، یہ اصطلاح اہلِ منطق نے معنیٔ لغوی سے لی ہے، اہل منطق اسے قیاسِ استثنائی میں یا جملۂ شرطیہ میں استعمال کرتے ہیں، جملۂ شرطیہ کے دو جزو کو مقدم اور تالی کہتے ہیں، اس کی وجۂ تسمیہ یہی ہے کہ جزوِ دوم بعد از جزوِ اول ہے، متصل بہ جزوِ اول ہے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، قضیۂ منطقیہ میں جزا کو تالی کہتے ہیں اور شرط کو مقدم کہتے ہیں لہٰذا تالیِ قرآن بھی اسی طرح سے ہونا چاہئے، جس طرح سے تالیٔ منطقی ہے اسی طرح سے تالیٔ قرآن بھی ہے، تالیٔ قرآن یعنی قرآن آگے ہو، قرآن امام ہو اور انسان متصل بہ قرآن اور بعد از قرآن ہو، جہاں جہاں قرآن ہو وہاں وہاں انسان ہو تو یہ تالیٔ قرآن انسان ہے، انسان کس حصے سے تلاوت کرے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ گلے کے ذریعے سے، حلق کے ذریعے سے، مخارج کے ذریعے سے، لبوں کے ذریعے سے، تالو کے ذریعے سے، سانس کے ذریعے سے ہی تلاوت ہوتی ہے، یہی تلاوت جو اس وقت رائج ہے، بعض نے اس شعبے میں تخصص کی حدتک ترقی کی ہے، ہم اسی کو سمجھتے ہیں کہ یہ تلاوت ہے، بلکہ تلاوت فعلِ قلب ہے نہ کہ فعلِ زبان ہے یعنی دل ہمراہِ قرآن ہونا چاہئے نہ کہ فقط زبان اور گلا ہمراہِ قرآن ہو۔ پس ایسا تالیٔ قرآن کہ اس کا دل نزولِ قرآن کے لئے آمادہ ہو تو قرآن اس کے لئے مجدد الانزال ہے۔

۹) نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

☆ ونسبة القلب الى نزوله، نسبة العرش الى استواء الرحمن......

قلب اور قرآن کا ناتا اور رشتہ آپس میں ایسے ہی ہے جیسے رحمان اور عرش کا آپس میں رشتہ یا رابطہ ہے، جس طرح رحمان متمکن بر عرش ہے اور عرش محلِ استوائے رحمان ہے اسی طرح سے دلِ انسان قرآن کے لئے عرش ہے اور قرآن بعنوانِ سلطان اور بحیثیت رحمٰن عرشِ انسان پر یعنی دلِ انسان پر نازل ہوتا ہے،

☆ **و بحسب مايكون القلب عليه من الحالات يكون ظهور القرآن و نزوله عليه......**

جیسا دل ہوگا، جیسے قلبی حالات ہوں گے تو نزولِ قرآن بھی ویسا ہی ہوگا یعنی نزولِ قرآن تابع حالاتِ دل ہے، جب دل آمادہ ہو جائے، عرشِ قرآن واقع ہو جائے تو پھر قرآنی صفات دل کے اندر آجاتی ہیں، پہلے قرآن کے نزول کے لئے دل آمادہ ہوتا ہے اور جب دل آمادہ ہوا اور قرآن آجائے تو پھر قرآنی صفات سے دلِ انسان متصف ہو جاتا ہے، قرآن خُلقِ انسان و صفاتِ انسان بن جاتا ہے۔

ایک گروہ ایسا ہے کہ جس کا جیسا دل ہوتا ہے ویسا ہی قرآن اس کے اندر آتا ہے اور ایک گروہ ایسا ہے کہ جیسا قرآن ہے تو قرآن ان کا دل اپنے جیسا بنا لیتا ہے مثلاً بسا اوقات ہم کسی چیز کے اندر پانی ڈالتے ہیں تو پانی کی شکل وہی ہو جاتی ہے کہ جو برتن کی شکل ہے، پانی کا رنگ بھی وہی ہو جاتا ہے کہ جو برتن کا رنگ ہے لیکن بعض اوقات پانی کا رنگ برتن کے اوپر چڑھ جاتا ہے، اگر پانی رنگین اور صاف وشفاف ہو اور اسے شیشے کے صاف شفاف، بلّوری برتن کے اندر ڈالا جائے تو برتن

پانی کورنگ نہیں دیتا ہے بلکہ پانی برتن کورنگ دیتا ہے، اگراس کے اندرآپ سبز پانی ڈالیں تو برتن بھی سبز ہو جائے گا، اگراس کے اندر سرخ پانی ڈالیں تو برتن بھی سرخ ہو جائے گا، اگراس کے اندر سیاہ پانی ڈالیں تو برتن بھی سیاہ ہو جائے گا لیکن رنگین برتن میں اگر صاف پانی ڈالیں تو پانی کے اوپر برتن کا رنگ چڑھ جاتا ہے، اسی طرح آپ بعض اہل معرفت سے نقل کرتے ہیں کہ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی کہا کہ پانی کا رنگ وہی ہے کہ جو برتن کا رنگ ہے۔یعنی قرآن جب انسان کے دل میں جاتا ہے تو جو دل کی حالت ہوتی ہے وہی قرآن کی حالت بھی بن جاتی ہے لہٰذا دل کی حالت موزوں ہو، متناسب ہو تا کہ قرآن اس کے اوپر آ کر مستوی ہو جائے چونکہ استوائے قرآن کے لئے محل کا مناسب ہونا ضروری ہے۔

جس طرح تخت کے اوپر استوائے سلطان ہے کہ اگر یہ تخت نہ ہو یا یہ تخت ہموار نہ ہو، مناسب نہ ہو، موزوں نہ ہو اور خالی نہ ہو تو ہرگز سلطان اس پر متمکن نہیں ہو سکتا ہے، سلطان اس پر نہ بیٹھ سکتا ہے نہ ٹک سکتا ہے، اسی طرح سے اگر انسان کا دل آمادہ نہ ہو، تیار نہ ہو تو ہرگز قرآن اس دل میں داخل نہیں ہوتا ہے، قرآن ایسے دل میں متمکن نہیں ہو سکتا ہے، انسان کا دل اگر ہموار نہ ہو تو دل میں قرآن سرے سے اترتا ہی نہیں ہے پس اس طرح انسان محروم رہ جاتا ہے، لہٰذا فرماتے ہیں کہ قرآن مجدّد الانزال ہے یعنی نزولِ قرآن مجدد ہے، ایسا نہیں ہے کہ فقط ایک دفعہ نزول ہو گیا اور ہمیں نزول یافتہ قرآن سے سروکار ہے۔آغازِ کتاب میں معنیٰ کیا تھا کہ نزول کا معنیٰ فہمِ قرآن ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے اسے ہماری فہم کی دسترس میں قرار دیا ہے اور فہم چونکہ دل کا کام ہے لہٰذا جتنا دل

نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

آمادہ ہوگا اتنا نزولِ قرآن کا تجدد ہوتا رہے گا، تجدد ورنزول ہوتا رہے گا، متناسب بہ قرآن، متناسب بہ دل قرآن نازل ہوتا رہے گا اور پھر قرآن کی صفات دل پر چڑھ جائیں گی اور اس طرح دل قرآنی ہو جاتا ہے اور یہ انسان، انسانِ قرآنی بن جاتا ہے۔

عرشِ دل اگر بہت ہی آمادہ ہے تو قرآن اس طرح سے نازل ہوگا، اگر دل تھوڑا آمادہ ہے تو قرآن اسی طرح نازل ہوگا چونکہ قلب کو قلب تقلب کی وجہ سے کہتے ہیں، تقلب یعنی جس میں ٹھہراؤ نہ ہو، ایک حالت سے دوسرے حال میں بدلتا رہتا ہو، اسی پہلو بدلنے کو، کروٹیں بدلنے کو، ایک حال سے دوسرے حال میں جانے کو تقلب کہتے ہیں اور خداوند تبارک وتعالیٰ کے اسماء و صفات میں بھی ہے کہ وہ مقلب القلوب ہے یعنی جب دل کے حالات بدلتے ہیں تو ان قلوب کا کوئی مقلب بھی ہے یعنی کوئی حالات بدلنے والا بھی ہے، چونکہ دل کے حالات بدلتے رہتے ہیں اس وجہ سے اس کو دل کہتے ہیں، جوں جوں حالات بدلتے رہتے ہیں تو نزول بھی بدلتا رہتا ہے، جیسی حالت ہوگی ویسا نزول ہوگا، دلِ انسان کی طرح ذہنِ انسان بھی ہے، ذہنِ انسان کے بھی حالات بدلتے رہتے ہیں اور فہم بھی بدلتی رہتی ہے، بعض اوقات انسان کو وہی کچھ سمجھ میں آتا ہے اور بعض اوقات وہی نکتہ سمجھ میں نہیں آتا ہے، بعض اوقات انسان پیچیدہ ترین مطالب سمجھ رہا ہوتا ہے اور بسا اوقات سادہ ترین مطلب بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہوتا، چونکہ فہم تابعِ ذہن ہے۔

ذہن جس حال میں ہوگا فہم بھی ویسی ہی ہوگی، یوں تو نہیں ہوسکتا ہے کہ ذہن خواب آلودہ ہو اور فہم تروتازہ ہو مثلاً انسان سوئے ہوئے ذہن سے سمجھنا چاہے اور پھر بھی انسان کی سمجھ بہت ہی

عالی سمجھ ہو جائے تو یہ ممکن نہیں ہے، لہٰذا نماز میں بھی منع کیا گیا ہے کہ سستی کے ساتھ نماز میں نہ جاؤ، سُکاریٰ کی حالت میں نماز کی طرف نہ جاؤ،، کسالہ و سکاریٰ یعنی سستی و کسالت کے ساتھ نہ جاؤ اس لئے کہ نماز بھی ایک قسم کا نزول ہے، نماز میں بھی انسان کا خداوند تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ایک ارتباط ہوتا ہے، ذاتِ حق کے ساتھ یہ اتصال وارتباط آپ کی حالت کے تابع ہے، اگر کسالہ ہو گے تو پھر یہ ارتباط بھی کسالہ ہو جائے گا، اگر سکاریٰ ہوئے تو وہ ارتباط بھی سکاریٰ وسکران کا شکار ہو جائے گا لیکن اگر انسان حاضر دل لے کر جائے تو حضور کی صورت میں انسان کا دل محضرِ نزولِ قرآن ومحضرِ نزولِ رحمتِ خدا بن جاتا ہے، پس بنابراین نزول قرآن یعنی دلِ انسان مانندِ عرش ہے اور قرآن مانندِ رحمٰن ہے کہ جو اس کے اوپر متمکن ہوگا لیکن جیسا دل ہوگا ویسا قرآن اس کے اوپر نازل ہوگا،

☆ و ذلک فی حق طائفة......

البتہ یہ ایک گروہ کے بارے میں ہے،

☆ و اما فی حق طائفة اخری......

لیکن ممکن ہے کہ دوسرے گروہ میں کچھ اور لوگ ہوں،

☆ فیکون القرآن هو الاصل فی الصفة وعرش القلب، یظهر بتلک الصفة عند نزوله......

ایک گروہ وہ ہے کہ جن کا دل جیسا ہوگا تو قرآن بھی ویسے ہو جائے گا اور ایک گروہِ دیگر وہ ہے کہ جیسا قرآن ہوگا ویسا ان کا دل بن جائے گا۔

نزولِ قرآن بمناسبت دل

صدر المتألہین ؒ کی مراد یہ ہے کہ یہ حقیقت دو طرح سے رونما ہوتی ہے، ایک یہ کہ جب انسان اپنے دِل کو پاکیزہ کرے، تزکیہ کرے، اپنے دل کو آمادہ کرے، قرآن کیلئے تیار کرے اور ہر ہر آیہ قرآن سے متاثر ہو اور تاثیر قرآن اس کے اوپر انجام پائے یعنی قرآن دل کے لئے صفت بن جاتا ہے لیکن جیسا دل ہوتا ہے ویسے ہی قرآن ہوتا ہے، جس مرتبے میں دل ہوگا اسی حد تک قرآن بھی ہوگا، اگر دل کریم ہے تو قرآنِ کریم اس دل میں جائے گا، اگر دل مجید ہے تو قرآنِ مجید اس دل میں جائے گا، اگر دل عظیم ہے تو قرآنِ عظیم اس کے اندر جائے گا لیکن جب انسان قرآن کے اندر راسخ ہو جاتا ہے اور دل کو بالکل صاف وشفاف کر لیتا ہے، اس طرح سے کہ کوئی اور چیز دل کے اندر موجود نہیں رہتی ہے، انانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے حتیٰ خود وجودِ دل محو ہو جاتا ہے اور جب دل حالتِ محو وفنا تک پہنچ جاتا ہے تو اس وقت دل ایسے ہوتا ہے جیسے قرآن ہے یعنی بعض اوقات قرآن دل کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور بعض اوقات دل ہے کہ جو قرآن کی صفات سے متصف ہوتا ہے۔

قرآن نے ذکر بھی کیا ہے کہ بعض ایسے ہیں کہ قرآن نازل ہوتا ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ قرآن نازل ہوتا ہے تو ان کے کفر ونفاق میں اضافہ ہوتا ہے، یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ قرآن جن کے دل کے تابع ہے، جیسا دل ہوگا ویسا قرآن ہوگا، ہوسکتا ہے کہ دل نجس برتن کی طرح ہو یا ہوسکتا ہے کہ دل پاک برتن کی طرح ہے، اگر پاک برتن میں پاک چیز ڈالیں تو اگر وہ شے برتن کے تابع ہے تو پاک رہے گی لیکن اگر ایک پاک چیز نجس برتن میں ڈالیں تو اگر وہ شے برتن کے تابع ہے تو نجس ہو جائے گی۔

۱۰)دل کب تابعِ قرآن ہوتا ہے؟

بعض اوقات انسان ناپاک اور پاک کے مرحلے سے گزر کے، دل کی تطہیر اور تزکیہ کی ایک ایسی منزل پہ جا پہنچتے ہیں کہ اب دل تابعِ قرآن ہو جاتا ہے، ظرف تابعِ مظروف ہو جاتا ہے یعنی جیسا قرآن ہے ویسا دل بن جاتا ہے، انسان دل کو ایسی حالت پر پہنچائے۔

لوگوں یا تالیِ قرآن کا ایک گروہ ایسا ہے کہ

☆ **فیکون القرآن هو الاصل فی الصفة......**

درحقیقت قرآن اصل ہے،

☆ **و عرش القلب، یظهر بتلک الصفة عند نزوله......**

اور دلِ انسان یا عرشِ دل ویسا ہی بن جاتا ہے کہ جیسا قرآن ہوگا، دل تابعِ قرآن ہو جاتا ہے،

☆ **و ذلک......**

اور ایسا کب ہوتا ہے کہ انسان کا دل تابعِ قرآن ہو جائے؟ کہ اصل حالت یہی ہے،

☆ **لغایة صفائه ......**

یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب دل بالکل صاف اور شفاف ہو جائے، تزکیہ شدہ ہو جائے، صفائے محض آ جائے، غایہ یعنی نہایتِ صفا، اس کے اندر نہایتِ صفا پیدا ہو جائے، نہایتِ پاکیزگی آ جائے، اس طرح سے کہ اس سے بڑھ کر آپ کیلئے ممکن نہ ہو یعنی دل تمام آلودگیوں سے پاک و

صاف ہو جائے، شیشے کی طرح ہو جائے،

☆ و انمحاء صفاته......

اور دل کی اپنی صفت ختم ہو جائے یعنی دل اپنی صفات کو ختم کر بیٹھے، اپنا رنگ ختم کر دے تو اس وقت مظروف کے رنگ سے رنگین ہو جائے گا مثلاً جیسے پانی اور برتن کی مثال دی تھی کہ آپ شفاف پانی رنگین برتن میں ڈالیں تو پانی کا بھی وہی رنگ ہو جائے گا، اگر ہم چاہتے ہیں کہ برتن پر پانی کا رنگ چڑھے تو اس کے لئے آپ کو برتن کو شفاف کرنا پڑے گا یعنی برتن کا رنگ ختم ہو، جب تک برتن رنگین ہے تو پانی اپنا رنگ برتن پر نہیں چڑھا سکتا ہے، برتن کو اپنا رنگ ختم کرنا پڑے گا، اسی طرح سے دلِ انسان جب تک بہت سارے رنگوں سے رنگین ہے، بہت ساری صفات سے متصف ہے، بہت سارے حالات موجود ہیں تو جب تک اس کی اپنی صفاتِ قلبیہ موجود ہیں اس وقت تک قرآنی صفات اس پر طاری نہیں ہوں گی بلکہ قرآن تابعِ دل ہوگا۔

دل کب تابعِ قرآن ہوتا ہے؟

دل میں اگر اچھا رنگ رنگا ہوا ہو تو قرآن کے اوپر بھی اچھا رنگ چڑھ جاتا ہے لیکن اگر دلِ انسان اچھے رنگ سے رنگا ہوا نہ ہو بلکہ کسی منحرف اور تحریف شدہ رنگ سے رنگا ہوا ہو، کسی ملاوٹ والے رنگ سے رنگا ہوا ہو تو قرآن پر بھی وہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ جیسے اس وقت یہی نظر آتا ہے مثلاً تمام افراد، تمام اہلِ قرآن، تمام مذاہب، تمام فرق اپنے نظریات، اعتقادات اور سب کچھ قرآن سے استفادہ کرتے ہیں، درحقیقت قرآن نے ان پر اثر نہیں کیا ہے بلکہ ان کے دلوں نے قرآن پر اثر کیا ہے، جو مشرک ہے اس کو قرآن سے شرک نظر آتا ہے، جو موحد ہے اس کو قرآن میں توحید نظر آتی

ہے، جو غالی ہے اس کو قرآن میں غلو نظر آتا ہے، جو افراطی ہے اس کو قرآن میں افراط نظر آتا ہے اور جو تفریطی ہے اس کو قرآن میں تفریط نظر آتی ہے لہٰذا ہر ایک کو قرآن میں وہی چیز نظر آتی ہے کہ جیسا اس کا دل ہے، اس کے معانی یہ ہیں کہ دل صاف نہیں ہے، اگر انسان اپنے دل کو آمادہ کرے تو دل قرآن کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، قرآن کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ سارے دل اگر اس طرح سے ہوں اور آمادہ و صاف و شفاف ہوں اور قرآن کا رنگ سارے دلوں پر چڑھ جائے تو پھر اختلاف کی گنجائش نہ رہے اور دل جب قرآنی ہو جائیں تو انسان کا وجود قرآنی ہو جاتا ہے، انسان کی ساری ہستی قرآنی ہو جاتی ہے، انسان کی سوچ و فکر قرآنی ہو جاتی ہے اور ایسے قرآنی انسانوں کا معاشرہ بھی ایک قرآنی معاشرہ بن جاتا ہے۔

دل کب تابع قرآن ہوتا ہے؟

یعنی اگر دل صاف و شفاف ہو جائے، اپنی صفات چھوڑ دے اور محض قرآن کے تابع ہو جائے تو جیسا قرآن ہوگا ویسا دل ہوگا مثلاً اگر ابھی ہم فہم کے لحاظ سے تفاسیر کو دیکھیں تو مختلف تفاسیر ہیں، ہر تفسیر ایک نیا مطلب بیان کر رہی ہے، کیوں بیان کر رہی ہے؟ قرآن اس مرحلے میں مفسرین کے تابع ہے، فہم قرآن، نزولِ قرآن مفسرین کے تابع ہے، جیسا مفسر کا ذہن تھا ویسا قرآن بن گیا، ایک نے قرآن سے جبر استفادہ کیا، ایک نے قرآن سے اختیار استفادہ کیا، ایک نے قرآن سے شرک استفادہ کیا، ایک نے قرآن سے توحید استفادہ کی، ہر ایک نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق استفادے کئے یعنی قرآن اسی رنگ میں رنگا گیا کہ جس رنگ میں ان کا ذہن رنگا ہوا تھا لیکن جن کے دل صاف و شفاف ہیں، ان کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے، اپنا کوئی نظریہ و مفروضہ نہیں ہے لہٰذا

جب قرآن ان کے دلوں میں جاتا ہے تو یہ دل قرآنی ہو جاتے ہیں، یہ نفوس قرآنی ہو جاتے ہیں، قرآن نے انسانی شکلیں و انسانی روپ بہت اپنائے ہیں لیکن انسان نے قرآنی شکل و روپ کم اپنایا ہے۔ انسان نے رنگِ قرآن کم اپنایا ہے، انسان نے خدائی رنگ کم چڑھایا ہے بلکہ دین کو رنگ دیا ہے، دین انسانی رنگوں میں رنگا گیا ہے لیکن انسان دینی رنگ میں بہت کم رنگا گیا ہے۔۔ یہ فرقے، گروہ، حزب، مختلف ہفتاد و دو ملت اور یہ سب ٹکڑے ٹکڑے کیوں ہیں؟ اس وجہ سے کہ دین کو اپنے رنگ میں رنگا ہے، خود دین کے رنگ میں نہیں رنگے گئے ہیں۔

پس قرآن کی خدمت میں جانے کے آداب میں سے یہ ہے کہ انسان دل کو پاک وصاف کر کے جائے، آراء و نظریات، افکار و خرافات، من گھڑت مفروضوں، رجحانات، خواہشات، آرزوؤں، توہمات، تخیلات، اور گناہوں سے پاک کر کے جب انسان شفاف آئینہ اور شفاف ظرف لے کر قرآن کے پاس جائے گا تو قرآن کے پاس بقدرِ کافی رنگ موجود ہے، الٰہی و ربانی رنگ موجود ہے، صبغۃ اللہ موجود ہے، صبغۂ خدا یعنی رنگِ خدا قرآن کے اندر موجود ہے، ایسے صاف دلوں کے اوپر رنگِ قرآن طاری ہو جاتا ہے۔

۱۱) جیسا عارف ویسی معرفت

☆ لما سئل الجنید عن المعرفة والعارف......

جب جنید سے معرفت اور عارف کے بارے میں پوچھا گیا کہ معرفت کیا چیز ہے اور

عارف کیا چیز ہے؟ جنیدِ بغدادی معروف اہلِ معرفت اور عرفاء میں ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ معرفت کیا ہے اور عارف کون ہوتا ہے؟ پہلے بھی بیان ہوا ہے کہ عارف یعنی جس کو معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہو، بارہا عرض ہوا ہے کہ اس وقت مذہبی شکلوں میں سے کہ جو منحرف ہوئی ہیں اور جن کے اندر تحریفات ہوئی ہیں اور لوگوں نے جن کی غلط صورتیں تیار کی ہیں ان میں سے ایک زیادہ مبتلا بہ مسئلہ یہی عرفان ہے کہ عرفان کے نام پر انحرافی شکلیں بہت پیدا ہوئی ہیں، آئے دن اس کی کوئی نہ کوئی شکل ظاہر ہوتی ہے اور اس وقت ایک فتنے کے طور پر یعنی جسے لوگوں کے دین کی آزمائش کہہ لیں، بعض افراد کے لئے خصوصاً جوان طبقہ جو ان چیزوں سے متاثر بھی ہوتا ہے یہ دین کا ایک قسم کا امتحان ہے، عرفان سے مراد معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے، معرفتِ اصولی اور معرفتِ حضوری دونوں معرفتیں عرفان ہی ہیں البتہ معرفت کے بھی درجات ہیں اور بقدرِ معرفت انسان مقربِ خدا ہے، قربِ خدا بقدرِ معرفتِ انسان ہے، جنیدِ بغدادی سے پوچھا گیا کہ معرفت کیا ہے اور عارف کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ

جیسا عارف ویسی معرفت

☆ فقال: لون الماء لون انائہ.

پانی کا رنگ وہی ہوگا جو برتن کا رنگ ہے، یعنی معرفت وہی ہوگی جیسا عارف ہے، اگر اس تشبیہ کے اندر ہم عارف کو اِناء کی جگہ لے لیں اور معرفت کو ماء کی جگہ لے لیں، لیکن اگر ہم یوں کہیں کہ لون الماء لون انائہ یعنی ہم اِناء کی جگہ معروف کو لیں، ظاہراً جنابِ جنید کی مراد بھی یہی تھی، ہم اِناء کی جگہ یعنی برتن کی جگہ معروف کو لیں۔ کہا کہ جیسا معروف ہے ویسا عارف ہے، یعنی آپ کس کی

معرفت چاہتے ہیں؟ خدا کی، تو عارف متصف بہ اوصافِ خدا ہو جائے گا، کیوں؟ کیونکہ

☆ لون الماء لون انائه.

اور معرفتِ عارف ایسی معرفت ہوگی کہ معروف کی صفات سے معرفت بھی متصف ہو جائے گی، معرفت پر معروف کا رنگ چڑھا ہوا ہوگا لہٰذا عارف پر بھی رنگِ معروف چڑھا ہوگا۔

۱۲) مکاشفۂ قرآنی

☆ واعلم: ان اللّٰہ نعت العرش بما نعت بہ القرآن......

خداوند تبارک وتعالیٰ نے جن صفات سے قرآن کو متصف کیا ہے اور جو توصیف قرآن کی بیان کی ہے اسی طرح کی توصیف عرش کی بھی کی ہے، فرماتے ہیں کہ یہ ہم نے اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ یہ بصیرتِ کشفیہ ہے، ہمارے لئے یہ مطلب کہاں سے کشف ہوا ہے؟ اسی قرآن سے ہی کشف ہوا ہے، قرآن انسان کے لئے الہام بخش ہے، قرآن منبعِ مکاشفاتِ انسان ہے، اگر انسان قرآن کے اندر غور کرے، تدبر کرے کہ جیسے پہلے بیان ہوا ہے تو قرآن منبعِ مکاشفاتِ انسان ہے، بہت کچھ کشف ہوتا ہے، اسرار کشف ہوتے ہیں، دنیا کشف ہوتی ہے، قرآن کے اسرار نہ ختم ہونے والے ہیں، صرف انسان دلِ آمادہ لے کر قرآن کی خدمت میں جائے پھر دیکھے کہ قرآن کس طرح اپنا صندوق کھولتا ہے، خزانے کھولتا ہے اور انسانِ عارف کو اپنی طرف کشش وجذب کرتا ہے۔

اسی ادبِ ہشتم کے ذیل میں گزرا تھا کہ قرآن کے اندر درحقیقت عالمِ ملکوت کی ایک

مقناطیسیت ہے، ملکوتی مقناطیسیت ہے، اگر دلِ انسان آمادہ ہو تو قرآن اس دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے لیکن اگر دل زنگ خوردہ ہو تو زنگ والی چیز کو مقناطیس اپنی طرف نہیں کھینچتا ہے، قرآن کے اندر جاذبہ ہے لیکن اس جاذبے میں مجذوب ہونے کے لئے انسان کو صاف وشفاف وآمادہ ہونے کی ضرورت ہے، یہ ہمیں کہاں سے پتہ چلا؟ فرماتے ہیں کہ قرآن رحمان کی طرح ہے اور دلِ انسان عرش ہے، فرماتے ہیں کہ خود قرآن نے راہنمائی کی ہے، ہمارا یہ مکاشفہ قرآنی مکاشفہ ہے چونکہ قرآن مجید نے کچھ صفات عرش کے لئے ذکر کی ہیں اور وہی صفات قرآن کے لئے بھی ذکر کی ہیں، جن صفات سے عرش کو متصف کیا ہوا ہے انہی صفات سے قرآن کو متصف کیا ہے، پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش میں اور قرآن میں ایک نسبت ہے،

☆ **فکل قرآن مستو لعرشه ......**

پس کل قرآن درحقیقت عرش پر مستوی، متمکن اور مستقر ہے،

☆ **بالصفة الجامعة لهما......**

کس طرح سے مستقر ہے؟ ایسی صفات کے ذریعے سے کہ جو دونوں کے اندر موجود ہیں یعنی عرش اور قرآن دونوں کے اندر موجود ہیں، یعنی دل عرش ہے اور قرآن بعنوانِ سلطان اس کے اوپر متمکن ہے لیکن یہ تمکن اس صفت میں ہے کہ جو دونوں کی صفت ہے یعنی وہی دل کی صفت ہے اور وہی قرآن کی بھی صفت ہے،

☆ **فقرآن کریم لعرش کریم......**

قرآنِ کریم میں قرآن کو کریم سے متصف کیا گیا ہے،

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌo(۱۱)

پس قرآنِ کریم کہاں ہوگا؟ قرآنِ کریم عرشِ کریم میں ہوگا،

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِo(۱۲)

قرآن میں بھی عرش کے ساتھ لفظِ کریم استعمال ہوا ہے۔ عرشِ کریم یعنی دلِ انسان جب کریم ہوگا۔ یہ دو طرح سے ہے یا دلِ انسان کریم ہوتا کہ قرآنِ کریم اس میں اترے یا پھر دل اس طرح سے ہے کہ جب قرآن آئے گا تو جس طرح سے قرآن کریم ہے دل کو بھی کریم بنا دے گا۔

☆ وقرآن مجید لعرش مجید......

اسی طرح سے قرآن با مجد ہے یعنی بزرگی رکھتا ہے لہٰذا یہ قرآن بھی دلِ مجید کے لئے ہے، عرشِ مجید کے لئے ہے،

وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِo(۱۳)

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌo(۱۴)

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُo(۱۵)

قرآن میں عرش کیلئے مجید کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآنِ مجید غیر مجید مکان پر نہیں اترتا ہے، غیر مجید محل پر نہیں اترتا ہے، اگر دلِ انسان میں مجد نہ ہو تو اس صورت میں اس کے دل میں قرآن مجید اترنے نہیں آئے گا۔ قرآنِ نحوی آئے گا، قرآنِ صرفی آئے گا، قرآنِ لغوی آئے گا، قرآنِ عربی

آئے گا، قرآنِ لفظی آجائے گا لیکن قرآنِ مجید نہیں آئے گا، وجد و بزرگی تو قرآن انسان کے دل کے قریب نہیں آئے گی،

☆ وقرآن عظیم لعرش عظیم......

قرآنِ عظیم عرشِ عظیم کے لیئے ہے،

وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ٥(١٦)

وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ٥(١٧)

اگر قرآن عظیم ہے، باعظمت ہے تو قرآن محلِ باعظمت میں آسکتا ہے، مگر محل باعظمت نہ ہو تو قرآنِ باعظمت اس عرش پر نازل نہیں ہوگا۔

☆ والدرجات الرفیعه لذی العرش کالایات والسور للقرآن......

عرش کے لئے درجات و مقابات ہیں یعنی سیڑھیاں ہیں کہ جو اس کے درجے ہیں۔ پہلا درجۂ عرش، دوسرا درجۂ عرش، تیسرا درجۂ عرش، یہ سیڑھیاں کیسی ہیں؟ فرماتے ہیں کہ یہ مانندِ آیات و سورہ ہای قرآن ہیں، یہ عرش کے درجات اور سیڑھیاں ہیں۔

☆ ولهذا ورد فی الحدیث:......

اسی لئے حدیث کے اندر آیا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے فرزند محمد ابن حنفیہ سے یہ جملہ بیان فرمایا تھا کہ

☆اقراء وارق کما کنت تقرأ......

اقراء یعنی پڑھ اور ارق یعنی ارتقاء کر، ارتقاء یعنی اوپر، ترقی کرتا جا تکامل کرتا جا، جیسے جیسے تلاوت کرتے جاؤ سیڑھی بہ سیڑھی اوپر چڑھتا جاؤ، پس درحقیقت قرآن کی آیات اور قرآن کی سورتیں درجے ہیں، یہ سیڑیاں ہیں اور ہم نے کس طرح سے پڑھنا ہے؟ پڑھنا ہے اور آگے ارتقاء کرنا ہے، یعنی جس طرح تو آیہ بہ آیہ پڑھتا ہے اسی طرح سے آیہ بہ آیہ، سورہ بہ سورہ ترقی بھی کرتا جا مثلاً انسان ایک سورہ پڑھتا ہے تو ایک سورۂ قرآن سے متصف ہو جائے، اب دوسرا سورہ پڑھتا ہے تو دوسری سورہ سے متصف ہو جائے؛ اسی طرح ایک آیہ پڑھتا ہے تو اس آیہ سے متصف ہو اور دوسری آیہ پڑھتا ہے تو اس آیہ سے متصف ہو۔ ہم انشاء اللہ فصلِ ادبِ فہم کے اندر اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

۱۳)قرآنِ مجید خُلقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ھے

☆ فاذا نزل القرآن علی قلب عبد و ظهر فيه حكمه، واستوی عليه بجميع ماهو عليه مطلقا.. ..

قرآن جب قلب پر نازل ہو جاتا ہے تو جو کچھ قرآن کے اندر ہے وہ دل میں آجاتا ہے، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

☆و كان خلقا لهذا القلب......

قرآن خُلق بن جاتا ہے، اس دل کے لئے صفت بن جاتا ہے، اس دل کے لئے مَلَکَہ

راسخہ وصفتِ راسخہ بن جاتا ہے،

☆ کان هذا القلب عرشا له......

جب قرآن صفت بن کر مقرر و مستقر ہو جائے تو اس وقت انسان کا دل قرآن کا عرش بن جاتا ہے، دلِ انسان میں قرآن کا اتنا نزول ہو کہ قرآن صفتِ انسان بن جائے نہ کہ فقط تلفظِ انسان و قرآن، نہ فقط سماعتِ انسان و قرآن، نہ فقط عقیدۂ انسان و قرآن، نہ فقط مفہومِ قرآن، نہ فقط صوت و لحن کے طور پر بلکہ جب قرآن صفتِ دلِ انسان بن جائے تو اس وقت انسان کا دل قرآن کا عرش بن جاتا ہے۔

☆ كما قيل عندما سئل عن خلق رسول الله صلى الله عليه و آله: ......

یہ زوجۂ رسول ﷺ سے پوچھا گیا تھا کہ خُلقِ رسول ﷺ کیسا ہے؟ اخلاقِ رسول ﷺ کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ

☆ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ......

خُلقِ رسول ﷺ قرآنِ مجید ہے، قرآن صفتِ پیغمبر اکرم ﷺ ہے اور وہی صفت عمل میں آتی ہے یا اعضاء و جوارح میں وہی آتا ہے کہ جو خُلقِ انسان ہے، یہ اخلاقیات ہیں کہ جو عمل میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اس لئے کہتے ہیں کہ قرآن مہجور ہے، جب تک یہاں نہیں پہنچتا ہے، قرآن مستقر بر دل نہیں ہو جاتا ہے، دل عرشِ قرآن نہیں بن جاتا ہے اور خُلق نہیں بن جاتا ہے تو اس وقت تک قرآن مہجور ہے،

☆ **فما من آیة الا ولها حکم فی قلب هذا العبد......**

ہر آیہ کہ جو دل کے اندر موجود ہے تو اس دل کے اوپر اس آیہ کی حکومت اور اقتدار ہے۔

پس قرآن جب انسان کی صفتِ راسخ بن جائے تو اسی کو خُلق کہتے ہیں اس طرح قرآن انسان کا اخلاق، تفکر، سیرت، عمل اور راستہ بن جاتا ہے اور انسان ایک مجسم و متحرک قرآن بن جاتا ہے، صفاتِ قرآن، معالمِ قرآن و معارفِ قرآن وجودِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں راسخ تھے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہمارے لئے اسوہ ہے۔ اس فصل کے اگلے حصے میں انشاء اللہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ تلاوت بھی درج کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)۔۔۔(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۸۲)

(۲)۔۔۔(سورۂ مبارکہ شمس، آیہ۷)

(۳)۔۔۔(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۹)(سورۂ مبارکہ فصلت، آیہ۱۱)

(۴)۔۔۔(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۵۴)(سورۂ مبارکہ یونس، آیہ۳)(سورۂ مبارکہ رعد، آیہ۲)

(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ۵۹)(سورۂ مبارکہ سجدہ، آیہ۴)(سورۂ مبارکہ حدید، آیہ۴)

(۵)۔۔۔۔(سورۂ مبارکہ طٰہٰ، آیہ۵)

(۶)۔۔۔۔(تفسیر نمونہ - جمعی از فضلا)

(۷)۔۔۔۔(سورۂ مبارکہ القلم، آیہ۴)

(۸)۔۔۔(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی مدظلہ، الجزء ۱۸، صفحہ ۵۲۹)(تفسیر مجمع البیان - امین الاسلام أبی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ، الجزء ۱۰، صفحہ ۷۵)(تفسیر نور الثقلین، الجزء ۵، صفحہ ۴۲۰)(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۱۶، صفحہ ۲۱۰)(میزان الحکمة - الریشهری، الجزء ۳، صفحہ ۱۰۸)(اخلاق از دیدگاہ قرآن، پیامبرؐ و عترتؑ، الجزء ۲، صفحہ ۲)(الأخلاق عنوان الایمان ومنطلق التقدم، الجزء ۱، صفحہ ۱۳)(اخلاق در قرآن، الجزء ۳، صفحہ ۸) (مفاهیم القرآن - العلامة جعفر السبحانی مدظلہ) (رسالہ سیر و سلوک بحرالعلومؒ) (معراج السعادة)(مکارم الأخلاق)

(۹)......(سورۂ مبارکہ تین، آیہ۴)

(۱۰)......(كان خلقه القرآن)(الاكليل في استنباط التنزيل - عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي، الجزء ۱، صفحه ۱۷۱)(مباحث في علوم القرآن - صبحي الصالح، الجزء ۱، صفحه ۲۰)(بصائر ذوى التمييز في لطائف الكتاب العزيز مجد الدين أبوطاهر محمد بن يعقوب الفيروزآبادى، الجزء ۲، صفحه ۵۲۸)(نزول القرآن والعناية به في عهد النبيﷺ - عبد الودود مقبول حنيف، الجزء ۱، صفحه ۱۶۸)(فضائل القرآن للقاسم بن سلام - أبو عُبيد القاسم بن سلام بن عبد الله الهروى البغدادى، الجزء ۱، صفحه ۱۱۱)(بيان المعاني مرتب حسب ترتيب النزول عبد القادر بن ملّا حويش السيد محمود آل غازى العاني، الجزء ۱، صفحه ۷۷)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ۷۷)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ مؤمنون، آیہ۱۱۶)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ ق، آیہ۱)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ بروج، آیہ۲۱)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ بروج، آیہ۱۵)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ حجر، آیہ۸۷)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ۱۲۹)

فصلِ ادب هشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّه پنجم)

١)رسولِ اکرمﷺکا طریقۂ تلاوت

٢)عینِ تدبر و فهمِ قرآن

٣)عرشِ دل پر قرآن نازل نه هونے کی وجه

٤)فقط ظواهرِ قرآن په توجه مطلوب نهیں

٥)فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش هے

٦)حقیقتِ تقویٰ اور اس کے آثار

٧)قرآن اور انسان میں تشابه،کب اور کیسے؟

٨)فهمِ حقیقی،مرادِ متکلم کا حصول

٩)قرآن کو خودمتکلم سے سمجھیں

۱) رسولِ اکرم ﷺ کا طریقۂ تلاوت

صدر المتالھین رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اس کتاب میں فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ کا قرآن پڑھنے کا طریقہ کار یہ تھا،

☆ **وکان رسول اللہ صلی اللہ علیه و آله فی تلاوته......**

یعنی سیرتِ رسول ﷺ یہ تھی، رسول اللہ ﷺ کی مسلسل، مرتب، بغیر کسی وقفے کے اور بغیر کسی خلل کے سیرت یہ تھی کہ

☆ **اذا مر بآیة نعیم......**

پیغمبر اکرم ﷺ جب کسی آیہ پر گزرتے تھے کہ جو نعمت کا تذکرہ کر رہی ہوتی تھی،

☆ **یسئل اللہ من فضله......**

تو آیتِ نعمت پر خداوند تبارک وتعالیٰ کا تفضّل وفضل طلب فرماتے تھے یعنی جب کسی قوم پر، کسی ماجرے میں، کسی نبی پر، کسی انسانِ صالح پر یا کسی شخص پر بھی خدا نے کوئی نعمت نازل کی ہوتی تھی تو حضرت ﷺ فضلِ الٰہی سے اس کو طلب فرماتے تھے،

☆ **واذا مر بآیة عذاب و وعید یستعیذ منه......**

اور جب کسی عذاب و وعید کی آیت پر گزرتے تھے تو وہاں پر خداوند تبارک وتعالیٰ سے استعاذہ فرماتے تھے یعنی پناہ مانگتے تھے۔

۲)عینِ تدبر و فہمِ قرآن

جیسے گزشتہ فصل میں عرض کیا تھا کہ یہ حالت انسان پر اس وقت طاری ہوتی ہے کہ جب انسان اپنے آپ کو مخاطَبِ قرآن قرار دے، اگر مخاطبِ قرآن واقع نہ ہوسکے تو ہرگز تاثیر و تاثر و وجد یہ حالات انسان پر طاری نہیں ہوتے ہیں، انسان پہلے ہر آیہ کا مخاطب بنے کہ ہر آیہ مجھ سے خطاب کررہی ہے، ہر آیہ مجھے کچھ پیغام دینا چاہتی ہے یعنی یوں گمان کرے کہ قرآن فقط میرے لئے نازل ہوا ہے، فقط میری ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اس کا کلمہ کلمہ، جملہ جملہ مجھ سے خطاب کر کے مجھے کچھ نہ کچھ پیغام دے رہا ہے، اس وقت انسان ہر نعمت کی آیت میں خداوند تبارک وتعالیٰ سے کچھ طلب کرتا ہے، یہی نعمتیں کہ جو خدا نے دوسروں کو دی ہیں مثلاً اگر خداوند تبارک وتعالیٰ نے تذکرہ کیا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو فضیلت عطا کی ہے تو انسان خدا سے طلب کرتا ہے کہ یہ فضیلت ہمیں بھی ملنی چاہئے، اگر ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو ملکِ عظیم عطا کیا ہے تو انسان خداوند تبارک وتعالیٰ سے طلب کرتا ہے کہ یہ ملکِ عظیم اور یہ دولتِ کریمہ ہمارے عصر میں بھی ہو، اگر خداوند تبارک وتعالیٰ نے کسی کی دنیوی نعمتیں اوراخروی نعمتیں ذکر کی ہیں مثلاً اگر لقمانؑ یا دیگر عبادِ صالح کیلئے خداوند نے فرمایا کہ ہم نے انہیں حکمت عطا کی ہے تو انسان خدا سے طلب کرے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکمت ہمیں بھی عطا ہو۔ جب عذاب اور وعید کے تذکرے آتے ہیں کہ ہم نے قومِ عاد و قومِ ثمود و قومِ لوطؑ پر عذاب نازل کیا ہے تو انسان خداوند تبارک وتعالیٰ سے پناہ مانگے کہ یہ عذاب ہم پر نازل نہ ہو،

عینِ تدبر و فہمِ قرآن

☆ **واذا مر بآية قصص يعتبر......**

وہ آیات جن میں قصص ہیں، جن میں سابقہ امتوں کے یا بعض افراد کے قصے اور داستانیں بیان کی گئی ہیں تو ان سے عبرت حاصل کرے ہے یعنی ہر انسان عبرت حاصل کرے،

☆ **و هذا عين التدبر لايات القرآن و الفهم......**

اور یہ عینِ تدبر در آیاتِ قرآن اور عینِ فہمِ قرآن مجید ہے، یعنی جب انسان آیاتِ نعمت میں پہنچے تو وہاں سے طلبِ فضلِ خداوند تبارک وتعالیٰ کرے اور جب انسان آیاتِ عذاب و وعید پہ پہنچے تو بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں پناہ مانگے چونکہ یہ سوچنا ہے کہ یہ آیات مجھے کہہ رہی ہیں، مجھے یہ سب کچھ سنایا جا رہا ہے، جب کسی آدمی کو مستقیم خطاب کیا جائے تو اسے کہا جاتا ہے کہ تم یوں کرو، تم ایسا کرو، قرآن کے خطابات بہت سارے لوگوں کی طرف مستقیم ہیں لیکن خطاب غیر مستقیم انداز میں ہے یعنی انڈائریکٹلی (Indirectly) خطاب ہے۔

لوگوں کی اکثریت سے قرآن نے غیر مستقیم خطاب کیا ہے اور اقلیت سے مستقیم خطاب کیا ہے۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے چونکہ اکثریت حاضر نہیں ہوتی ہے لہٰذا اکثریت سے غیر مستقیم خطاب کیا جاتا ہے یعنی اس طرح سے کہ مستقیم بات کسی اور سے ہو رہی ہوتی ہے لیکن مقصود کوئی اور ہوتا ہے، سنایا کسی اور کو جاتا ہے لیکن سنانا کسی اور کو مقصود ہوتا ہے۔ غیر مستقیم خطاب یہ ہے کہ اگر آپ کسی شخص کو کسی نکتے کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو ایک داستان، کہاوت، محاورہ یا ضرب المثل اس کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ غیر مستقیم سمجھانا ہے یعنی آپ انہیں ان غیر مستقیم طور طریقوں سے تفہیم

کرتے ہیں تا کہ یہ شخص متوجہ ہو جائے، جتنے بھی قصے قرآن مجید نے ذکر کیے ہیں ان قصوں سے مقصود فقط ان قوموں کے حالات سے ہمیں آگاہ کرنا نہیں ہے بلکہ ان قوموں کے تذکروں سے ہمیں غیر مستقیم طریقے سے کچھ سمجھانا ہے مثلاً محاورہ یا ضرب المثل ایسے ہی استعمال ہوتی ہے، یہ ایک غیر مستقیم خطاب ہوتا ہے، غیر مستقیم تعریف ہوتی ہے، غیر مستقیم سرزنش ہوتی ہے، غیر مستقیم طور پر انسان کوئی نہ کوئی نکتہ دوسرے کو تفہیم کرتا ہے۔

۳)عرشِ دل پر قرآن نازل نہ ہونے کی وجہ

☆ فاذا لم یکن العبد فی تلاوته کذلک......

اگر عبد کا تلاوت میں یہ حال نہ ہو یعنی قرآن پڑھتا جاتا ہے لیکن آیاتِ نعمت میں تفضلِ الٰہی طلب نہیں کرتا، آیاتِ وعد میں استعاذہ نہیں کرتا، آیاتِ قصص سے عبرت نہیں لیتا ہے، یہ آیات اس کی صفت نہیں بنتی ہیں، انسان کے وجود میں نہیں اترتی ہیں اور خُلقِ انسان نہیں بنتی ہیں یعنی تلاوت کر رہا ہے لیکن اگر انسان پر یہ حالت طاری نہیں ہے تو

☆ فما نزل علی قلبه القرآن......

اس کے دل پر قرآن ابھی نازل نہیں ہوا،

☆ ولا کان عرشاً لاستوائه......

اور قرآن کے استوا کے لئے اس کا دل عرش بھی نہیں ہے، درحقیقت جیسے ابھی حدیث میں

بیان کریں گے کہ یہ وہ انسان ہے کہ جو صرف تلفظِ الفاظِ قرآن کر رہا ہے،

☆ لانه ما استوى عليه بهذه الاحكام......

چونکہ قرآن اپنے ان احکام کے ذریعے سے اس کے دل پر محیط و مستقر نہیں ہوا ہے،

☆ وكان نزوله على قلبه احرفاً ممثلة فى خياله....

درحقیقت اس نے حروفِ قرآن کو اپنے تخیل میں تجسم دیا ہوا ہے، جیسے یہ عمومی حالت ہے، انسان عام علوم میں بھی اسی مشکل سے دوچار ہے جیسے قرآن کے بارے میں ہے یعنی انسانوں کی اکثریت اسی مشکلِ فہم سے دوچار ہے اور یہیں پر ہمیں کچھ گمان ہونے لگتا ہے کہ گویا ہم کچھ جانتے ہیں درحالیکہ کچھ بھی نہیں جانتے ہیں۔

مثلاً اگر ہم سے چاہا جائے کہ آپ ایک عدد ذہن میں تصور کریں، ایک عدد کو درک کریں تو ہم فوراً جواب دیتے ہیں کہ میں نے درک کرلیا ہے مثلاً آپ سو (۱۰۰) کا عدد اپنے ذہن میں تصور کرتے ہیں، سب انسان تصور کر لیتے ہیں اور فی الفور ذہن میں سو آجاتا ہے، اب ان سے پوچھیں کہ جو ذہن میں تصور کیا ہے وہ دکھائیں کہ آپ نے ذہن میں کیا تصور کیا ہے؟ تو لکھ کر دکھائیں گے کہ یہ عدد سو (۱۰۰) ہے، وہی سو کا عدد کہ جس کی ہمارے ذہن میں تصویر ہے، یہ وہی ہے جو بلیک بورڈ پر، وائٹ بارڈ پر، کتاب پر یا کاغذ پر لکھا ہوا ہے یعنی ایک کھڑی لائن ہے اور اس کے آگے دو نقطے ہیں، یہ ہمارا سو ہے، لیکن یہ تو لائن، نقطے اور سیاہی ہیں، یہ علامتیں ہیں یہ تو سو نہیں ہیں، یہ سو کی علامت ہے، یہ کتابتِ سو ہے نہ کہ خود عددِ سو ہے، عدد ایک کمیت کا نام ہے، ایک کوانٹٹی (Quantity) کا نام

ہے، عدد ایک حقیقت واقعیت اور ماہیت ہے، ہمیں اس واقعیت کی کوئی خبر نہیں ہے، یہ اس واقعیت کے لئے ایک علامت ہے کہ جو ہم نے مقرر کی ہوئی ہے تا کہ اس کی طرف متوجہ ہوں، یہ کیا ہوا ہے؟ ہم نے علامتِ سو کو نہ کہ خودِ سو کو ذہن میں تجسم دیا ہے۔

اسی طرح سے جتنے بھی حقائق ہیں مثلاً ہم فرشتہ تصور کریں تو ذہن میں کس طرح لاتے ہیں؟ ف ر ش ت ہ، یہ ہمارے ذہن میں فرشتہ ہے یعنی ہم لفظِ فرشتہ کو ذہن میں مجسم کر لیتے ہیں نہ کہ حقیقتِ فرشتہ ذہن میں لاتے ہیں، نہ اس کی تصویر و حقیقت ہمارے ذہن میں آتی ہے اور نہ ہم ادراکِ فرشتہ پر قادر ہیں، اسی طرح جنّ کیا چیز ہوتی ہے؟ ج ن، یہ ہمارا جنّ ہے یعنی لفظِ جن کو ہم ذہن میں تصور کر لیتے ہیں درحالیکہ اس کی حقیقت کچھ اور ہے یعنی ہم کوئی نہ کوئی لفظ ذہن میں تجسم کر لیتے ہیں اور تجسمِ الفاظ کر کے گمان کرتے ہیں کہ یہ علم و معرفت اور حقیقت ہے، اسی طرح سے خدا کے نام پر کیا چیز ہمارے ذہن میں ہے؟ خود لفظِ خدا یعنی خ د ا، یا اللہ مثلاً ا ل ل ہ، اس کو ہم نے اللہ سمجھا ہوا ہے، ہمارے ذہن میں تجسمِ لفظِ خدا ہے، تجسمِ لفظِ اللہ ہے، ذہن میں قیامت کا تجسم کریں یا حقیقتِ قیامت کو درک کریں تو خود لفظِ قیامت کو ہم ذہن میں مجسم کر لیتے ہیں اور اسی طرح سے باقی تمام معارف کو بھی قیاس کریں، قرآن بھی اسی مشکل سے دوچار ہے، تمام علوم و معرفت کہ جو انسان کے لئے ضروری ہیں اس معرفت میں انسانوں کی اکثریت اسی مشکل میں دوچار ہے کہ معرفت کے بجائے، حقائق کے بجائے، ان حقائق کی وضع شدہ علامتوں کو ذہن میں تجسم کر کے گمان کرتے ہیں کہ یہ علم ہے۔

عربی ادب پر غور، قرآن نازل نہ ہونے کی وجہ

قرآن جو ہدایت و حقیقت ہمیں پیش کرتا ہے، جو نوع ہمیں پیش کرتا ہے اور ہمارے لئے لے کر آیا ہے اور جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو الفاظِ قرآن کو ذہن میں تجسم دے کر، تخیل میں مجسم کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو سمجھ لیا ہے، مثلاً

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ......

یا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَo

یہ صرف آیات ہیں کہ جو ہمارے ذہن میں، ہمارے تخیل میں مجسم ہیں، کیا دلیل ہے کہ فقط الفاظِ قرآن کو ہم نے ذہن میں مجسم کیا ہے اور حقیقتِ قرآن ہمارے ذہن میں نہیں آئی ہے؟ دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن کی حقیقت ہمارے دل میں ہوتی نہ کہ فقط الفاظ تو قرآن ہمارا اخلق بن گیا ہوتا، قرآن ہمارے لئے صفت بن گیا ہوتا، قرآن کا رنگ ہمارے دل پہ چڑھ گیا ہوتا، قرآن ہمارا عمل بن گیا ہوتا، قرآن ہمارا تفکر بن گیا ہوتا، ہماری زندگی اور حیات ساری کی ساری قرآنی و نورانی ہو جانی چاہئے تھی درحالیکہ ہم قرآنی الفاظ سے سروکار رکھنے کے باوجود بھی قرآنی صفات سے یا قرآنی ملکات سے خالی ہیں، اس وجہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کے اوپر نزولِ قرآن نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے فقط حروفِ قرآن کو اپنے تخیل میں مجسم کیا ہوا ہے،

☆ و کان له فی تلاوته اجر الترجمة......

اس شخص کو فقط تلاوت کرتے ہوئے ترجمے کا اجر ملے گا یعنی فقط عبارتوں کا اجر ملے گا،

معانی کا اجر نہیں ملے گا، حقائق کا اجر نہیں ملے گا، فرض کریں کہ اگر ہم تاثیر کے قائل ہو جائیں مثلاً الفاظ کی بھی تاثیر ہو، معانی کی بھی تاثیر ہو، حقائق کی بھی تاثیر ہو، قرآن کی جگہ اگر ہم دنیوی مثال لیں مثلاً پیسہ یا سرمایہ لفظ ہیں، روپیہ ایک لفظ ہے، یہ لفظ ایک حقیقت کے لئے ہے، اگر انسان کے پاس یہ حقیقت نہ ہو لیکن انسان نے ذہن میں فقط لفظ تجسم کیا ہوا ہو یعنی انسان صرف لفظِ پیسہ یا لفظِ سرمایہ ذہن میں مجسم کر لے اور اپنے آپ کو مالدار سمجھنا شروع کر دے، اپنے آپ کو سرمایہ دار انسان سمجھنا شروع کر دے، لفظِ پیسہ سے تو انسان پیسوں والا نہیں ہو جاتا ہے، لفظِ مال سے یعنی مال کے لفظ کو ذہن اور تخیل میں لانے سے تو انسان مالدار نہیں ہو جاتا ہے، لفظِ سرمایہ کو ذہن میں مجسم کرنے سے تو انسان سرمایہ دار نہیں ہو جاتا ہے، انسان سرمایہ دار اس وقت ہوتا ہے کہ جب اس لفظ کے پیچھے وہ حقیقت بھی ہمارے پاس موجود ہو کہ جس حقیقت کی طرف یہ لفظ ہماری راہنمائی کرتا ہے، اسی طرح سے اور دنیوی الفاظ اور قرآن کے الفاظ بھی ہیں، جتنی تاثیر الفاظ کی ہے اتنی تو ہوگی لیکن الفاظ جن حقائق کی طرف ہماری راہنمائی کر رہے ہیں اگر وہ حقائق نہ ہوئے تو ہر گز ہم اجرِ حقیقتِ قرآن و اجرِ معانئ قرآن حاصل نہیں کر پائیں گے۔

٤)فقط ظواہرِ قرآن پہ توجہ مطلوب نہیں

☆ کما قال صلی اللہ علیہ وآلہ فی حق قوم من حفاظ حروف القرآن:......

وہ قوم، وہ لوگ کہ جو قرآن کے الفاظ، قرآن کے حروف اور قرآن کے کلمات کو حفظ کرتے ہیں یا حافظِ قرآن بنتے ہیں ان میں سے بعض کے بارے میں کہ جو اس کے مصداق ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

☆ **یقرؤن القرآن ولایجاوز حناجرهم......**

یہ قرآن پڑھتے ہیں لیکن قرآن ان کے حنجرے سے نیچے نہیں جاتا ہے یعنی ان کے گلے سے نیچے نہیں جاتا ہے چونکہ ادائے الفاظ کے مخارج گلے سے اوپر اوپر ہیں، ایک دو مخرج گلے کے نچلے حصے میں ہیں لیکن باقی سب کے سب منہ میں ہیں، مثلاً کچھ تالو میں، کچھ گلے کے ابتدائی حصے میں، کچھ لبوں میں یعنی جتنا بھی تلفظ کا شعبہ ہے وہ سارا گلے اور حلق سے اوپر اوپر اور باہر ہے، حنجرہ اس گلے کو کہتے ہیں کہ جہاں سے انسان کی آواز نکلتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بعض قرآن پڑھتے ہیں لیکن یہ قرآن ان کے حنجرے سے نیچے نہیں جاتا ہے بلکہ گلے کی حد تک رہتا ہے یعنی قرآن ان کے مخارج میں ہی گھوم رہا ہے اور گلے سے گھوم کر باہر آجاتا ہے، آنکھوں سے اندر جاتا ہے یعنی آنکھوں سے قرآن کو دیکھتے ہیں، آیتِ قرآن کو دیکھتے ہیں اور آنکھوں سے گلے میں گھما کے باہر پھینک دیتے ہیں۔

تلفظ پھینکنے کو کہتے ہیں، لفظ کا لغوی معنیٰ پھینکنا ہے اور لافظ یعنی پھینکنے والا، لفظتُ یعنی میں نے پھینک دیا، بات کرنے کو لفظ اسی وجہ سے کہتے ہیں چونکہ انسان پھینکتا ہے، زبان سے الفاظ، کلمات اور حروف پھینکتا ہے اس وجہ سے اس کو تلفظ کہتے ہیں یعنی پھینکنا، یہ قرآن کو پھینکنا ہے یعنی

فلسطینی کل ذکری قرآن پر توجہ مطلوب نہیں

آنکھوں یا کانوں سے قرآن اندر وارد ہوتا ہے لیکن گلے میں گھوم کر مخارج میں تبدیل ہوتا ہے اور بعض نے مخارج کی تمرین زیادہ کی ہوئی ہے اوران کے دقیق تر مخارج سے قرآن پورے گلے سے گھوم کر پھر باہر آجاتا ہے یعنی قرآن کو پھینک دیتے ہیں، تلفظِ قرآن تو قرآن کو پھینکنا ہے، قرآن اندر جائے، قرآن انسان کے اندر منتقل ہو، ذہن انسان وقلبِ انسان میں منتقل ہواور قرآن صفتِ انسان بن جائے، انسان اس طرح سے قرآن کے ساتھ محشور ومانوس ہو۔

☆ ای لم یصل من مقدم الدماغ الا الی لسانهم وحناجرهم، لا الی صدورهم وقلوبهم......

یعنی قرآن ان کے صدور وقلوب تک نہیں پہنچا ہے بلکہ فقط ان کی زبان تک پہنچا ہے، ان کے گلے تک پہنچا ہے، قرآن فقط حروف ومخارج کی حد تک ہے۔

۵) فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے

☆ و لیس التالی فی الحقیقة الا من تلاه من قلبه ......

فرماتے ہیں کہ تالیِ قرآن حقیقتاً وہ شخص ہے کہ جس کا دل تالیِ قرآن ہو، جس کا دل تابع و ہمراہِ قرآن ہو، جو اپنے دل کے ہمراہ قرآن کے پیچھے ہو، کونسا دل؟

☆ المنشرح بنور القرآن......

وہ دل جو نورِ قرآن سے منشرح ہے، وسیع ہوگیا ہے، اس میں شرحِ صدر اور نورانیت آگئی

ہے،

☆ وقلب المؤمن وسعه كالعرش الذى وسع استواء الرحمن......

درحقیقت دلِ مومن کے اندر قرآن کی گنجائش ہے، دلِ مومن ہی تالی قرآن بن سکتا ہے۔
جس طرح سے عرش کے اندر استوائے رحمان کی گنجائش ہے، جس طرح عرش فقط رحمان کے لئے محل واقع ہوسکتا ہے اسی طرح سے دلِ مومن محلِ قرآن واقع ہوسکتا ہے، عرش یعنی اقتدارِ الٰہی کہ درحقیقت خدا کا احاطہ، خدا کی قدرت اور خدا کا سارا نظام اسی مقام سے انجام پا سکتا ہے، اقتدارِ الٰہی بغیر عرش کے قائم نہیں ہے، اسی طرح دل کے بغیر قرآن جسم کے کسی اور حصے میں نہیں آسکتا ہے، نہ آنکھوں میں، نہ زبان میں، نہ مغز میں، نہ خلیات میں، نہ کسی اور حصے میں بلکہ قرآن فقط دلِ انسان میں سما سکتا ہے اور دل سے مراد مرکزِ فہم انسان ہے نہ کہ یہ پمپ (Pump) ہے جو پسلیوں کے اندر موجود ہے، یہ جسم ہے۔

☆ الذى هو رفيع الدرجات ذوالعرش......

خداوند تبارک وتعالیٰ رفیع الدرجات ہے اور صاحبِ عرش ہے،

☆ وما احسن التنبيه على هذا بقوله:......

کس طرح سے زیبا اور خوبصورت قرآن نے ہماری توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی ہے، اس آیہ کریمہ میں کہ

☆ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اَلرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا٥

فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے

پھر عرش پر اقتدار قائم کیا، وہ رحمان ہے لہٰذا اس کے بارے میں کسی باخبر سے دریافت کرو۔

یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ نے جب زمین وآسمان کو بنالیا،

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اَلرَّحْمٰنُ ......

یعنی کائنات بنانے کے بعد اب احاطہ بر کائنات، اقتدار بر کائنات اور تدبیر کائنات کا مرحلہ تھا لہٰذا اس وجہ سے رحمان مستوی بر عرش ہے،

فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا○

یہ سورہ مبارکہ فرقان کی آیہ ۵۹ ہے کہ آپ سوال کرو، عرشِ رحمان کے متعلق سوال کرو، استوے رحمان بر عرش کے متعلق سوال کرو، کئی طرح سے اس کا معنیٰ کیا گیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ بہ بمعنیٰ عنہ ہے، فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا یعنی ذاتِ خدا خبیر ہے آپ خداوند تبارک وتعالیٰ سے سوال کریں، یعنی یہ اس بہ کی ضمیر کے لئے حال ہے،

فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا○

یعنی درحالیکہ آپ خبیر ہو لیکن سوال کرو، استخبار کے لئے، پوچھنے کے لئے کہ رحمان کیا ہے؟ عرش کیا ہے؟

☆ ای المسئول الذی هو بهذه الصفة من الخبرة يعلم الاستواء......

وہ مسئول کہ جس سے آپ نے اس صفت کے بارے میں سوال کرنا ہے وہ اہلِ خبرہ ہے

اور علم رکھتا ہے، اس سے استوا کے بارے میں پوچھیں تو وہ آپ کو بتا دے گا کہ استوائے رحمان بر عرش کیا ہے؟۔

☆ **کما یعلم العرش کیفیة استواء الرحمن......**

کہ جس طرح سے اس کو عرش کا بھی پتہ ہے اور کیفیتِ استوائے رحمان کا بھی علم ہے،

پس جس طرح سے عرش فقط رحمان کے لئے محل واقع ہوسکتا ہے اسی طرح سے دلِ مومن محلِ قرآن واقع ہوسکتا ہے اور اس نکتے کی راہنمائی خود قرآن نے کی ہے۔

٦) حقیقتِ تقویٰ اور اس کے آثار

☆ **وما اعجب تعلیم اللّٰہ عباده المتقین......**

اور خداوند تبارک وتعالیٰ نے عبادِ متقین کو کیا خوبصورت تعلیم دی ہے،

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا......

سورۂ مبارکہ انفال کی اس آیہ ۲۹ میں ہے کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو خدا تمہیں فرقان عطا کرے گا، فرقان یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ تمہیں ایسی معرفت عطا کرے گا کہ جس کے ذریعے سے تم حق و باطل میں فرق کو درک کر پاؤ گے، خوب اور بد کے درمیان فرق کر سکو گے، صحیح اور ناصحیح کے درمیان فرق کر سکو گے کہ یہی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے، انسان جس عالم میں رہتا ہے اس میں حق و باطل مخلوط ہے، اس میں خوب و بد مخلوط ہے، اس میں خالص اور ناخالص مخلوط ہے، اس

میں ہر چیز مخلوط ہے، اگر انسان کے پاس فرقان ہو تو وہ حق تلاش کر سکتا ہے۔

اس وقت لوگ دین کی رغبت و شوق رکھتے ہیں، دین سے محبت رکھتے ہیں لیکن فرقان نہیں رکھتے ہیں لہٰذا اس وجہ سے ملاوٹ والا دین قبول کر لیتے ہیں، فرض کریں کہ انہیں کھانے کا شوق ہے لیکن فرقان نہیں رکھتے ہیں، یہ اچھے اور برے کھانے میں فرق نہیں کر سکتے ہیں لہٰذا ملاوٹ والی چیزیں کھاتے پیتے ہیں، اگر ان کے اندر خواہش بھی ہو اور فرقان بھی ہو، طلب بھی ہو اور فرقان بھی ہو مثلاً اتنی جمعیتِ عظیم تحصیلِ علوم میں مشغول ہے، اس کے معانی یہ ہیں کہ ان کو علوم کے اندر رغبت ہے لیکن اگر ان کے پاس فرقان بھی ہو یعنی انہیں معلوم ہو کہ ہمیں کیا پڑھنا ہے اور کیا نہیں پڑھنا ہے؟ کونسی معرفت حاصل کرنی ہے اور کونی معرفت حاصل نہیں کرنی ہے؟ تو یہ مَغشُوش، ملاوٹ شدہ اور غیر خالص چیزوں کے پیچھے نہ جاتے بلکہ فقط خالص چیزوں کے پیچھے جاتے،

☆الذین قال فیهم:

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا......

اگر تم تقویٰ الٰہی اختیار کرو گے تو وہ تمہیں حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کر دے گا......

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ......

اور اللہ سے ڈرو، اور اللہ تمہیں تعلیمات سے آراستہ فرماتا ہے......

سورہ بقرہ کی اس آیہ ۲۸۲ میں علم حاصل کرنے اور آگاہ ہونے کا ایک طریقہ بتایا ہے، علم

حاصل کرنے سے مراد ڈگری لینا نہیں ہے، اس وقت ہم با قاعدہ کسی مدرسے میں داخلہ لے کر اور وہاں عمر صرف کرنے کو کہتے ہیں کہ یہ تحصیلِ علم ہے اور علم حاصل ہو رہا ہے باوجود اینکہ داخلہ لینے کے بعد وہ بے شک سوتا رہے اور بے کار گھومتا رہے لیکن ایک شخص اگر با قاعدہ داخلہ لے کر نہیں پڑھے بلکہ کسی جگہ بھی بیٹھ کر مشغولِ حصولِ تعلیم ہے تو اس کے لئے یہ نہیں کہتے ہیں کہ یہ تحصیلِ علم کر رہا ہے، یہاں پر مراد یہ ہے کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تمہیں آگاہی مل جائے گی، تمہیں علم حاصل ہو جائے گا، جس طرح سے سورۂ مبارکہ بقرہ کی آیہ ۳۱ میں ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم دی،

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا......

اور خدا نے آدمؑ کو تمام اسماء کی تعلیم دی......

یعنی تمام حقائق آدم علیہ السلام کو تعلیم دے دیئے درحالیکہ آدم علیہ السلام کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوئے تھے، یہ ایک معمول کا طریقہ ہے لیکن معمول کے طریقوں میں سے یہ ہے کہ اگر انسان تزکیہ کرے، تقویٰ اختیار کر کے آلودگیوں سے پرہیز کرے تو خداوند تبارک وتعالیٰ کی جانب سے آگاہی آجاتی ہے۔

حقیقتِ تقویٰ اور اس کے آثار

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ متقی اس کو کہتے ہیں جو بے فائدہ بات زبان سے ادا نہ کرے۔ گالی، بہتان اور تہمت وغیبت تو بہت دور کی بات ہے جو لایعنی بات نہ کرے، لایعنی یعنی بے فائدہ بات نہ کرے، جیسے کسی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں مثلاً چوک میں کسی کی کوئی گفتگو چھڑ جاتی ہے اور طرفین کے لئے کوئی مفید گفتگو نہیں ہوتی ہے، یہ فقط وقت ضائع کرنا ہے، یہ لایعنی بات ہے اور تقویٰ

کے خلاف بات ہے، گفتگو ایسی ہو کہ جس کے اندر کچھ نہ کچھ بولنے والے کا، سننے والے کا یا کسی تیسرے کا فائدہ ہو، ایسی نتیجہ بخش گفتگو کریں کہ اس گفتگو سے قوم کو، معاشرے کو یا بالآخر کسی کو تو فائدہ ہو۔

☆ ای امحو صفات النفس عن قلوبکم......

تقویٰ اختیار کرو سے کیا مراد ہے؟ تقویٰ بھی ایک مُجمَل مفہوم ہے، ایسا مفہوم کہ اس کا نام اور چرچا تو بہت ہے لیکن تقویٰ کی حقیقت یا تقویٰ کا معنیٰ متشابہات میں سے بنا ہوا ہے، تقویٰ کے نام پر جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ بہت ابتدائی سا اور سادہ سا آتا ہے، تقویٰ سے کیا مراد ہے؟ فرماتے ہیں کہ تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ اپنی صفاتِ نفس کو محو کرو، دل کو بالکل پاک اور صاف کرو، شفاف کرو مثلاً ایک شیشے کا برتن ہے لیکن وہ آلودہ ہے، اس کے اندر میل کچیل ہے، داغ دھبہ ہے اور اس کے اندر آلودگیاں موجود ہیں تو تقویٰ کیا ہے؟ یعنی اس شیشے کے برتن کا تقویٰ، اس کا تقویٰ یہ ہے کہ اس کو خالص کر دو، جتنی بری صفات، جتنی آلودگیاں اور جتنے عوارض اس پر طاری ہیں ان سب کو دھو کر اسے بالکل خالصِ محض کر دو تو یہ تقویٰ ہے۔

یہ دل جو پہلے سے بہت ساری صفات سے متصف ہے لہٰذا ان صفاتِ نفسانیہ اور صفاتِ رذیلہ سے دل کو پاک کر دو،

☆ لیصیر مصورة بصورة القرآن وصفاته......

یعنی پہلے جو نقاشی کی ہوئی ہے، پہلے جو تصویریں دل میں بنی ہوئی ہیں ان کو پاک کرو تا کہ تصویرِ قرآن اس کے اندر اپنی تصویر بنا سکے، پہلے سے جس نے غیر قرآنی تصویریں اپنے دل میں

بنائی ہوئی ہیں، دل کی شفافیت کو آلودہ کیا ہوا ہے، دل کو میلا کیا ہوا ہے اور قرآن بھی ساتھ پڑھتا ہے تو قرآن کس طرح سے ان بنی ہوئی تصویروں کے اوپر ایک نئی تصویر بنادے؟ یہ مخلوط ہو جائیں گی،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ......

اور اللہ سے ڈرو، اور اللہ تمہیں تعلیمات سے آراستہ فرماتا ہے......

تقویٰ اختیار کرو یعنی دل کو تمام ان نفسانی کدورات اور صفات سے پاک کرو، ملکاتِ رذیلہ سے پاک کرو، صفاتِ بد سے پاک کرو، کینہ وحسد و تنگ نظری وعُجب سے پاک کرو تاکہ قرآن آکر اپنی صفات اس دل کے اندر ایجاد کرے۔

۷) قرآن اور انسان میں تشابہ، کب اور کیسے؟

☆ كما في قول الشاعر:......

جس طرح سے بعض عارفانہ شعر ہیں، ان میں سے ایک مصرع اپنے مطلب کے شاہد کے طور پر یہاں پر نقل کر رہے ہیں کہ

☆ رق الزجاج و رقت الخمر ‏ ‏ ‏ ‏ فتشابها و تشاكل الامر

زُجاج یعنی شیشہ، پیمانہ، یہ تمثیلات ہیں اور شعری زبان ہے، ان کی اپنی خاص اصطلاحات ہیں اور ان اصطلاحات کو اسی معنیٰ میں لینا چاہیے کہ جن معانی کے لئے ان لوگوں نے اپنی اصطلاحات مقرر کی ہیں، ہم ان کے معانی ڈکشنریز (Dictionaries) میں جا کر تلاش نہیں

کریں، مثلاً زُجاج کا معنیٰ ڈکشنری میں جا کر دیکھیں یا خمر کا معنیٰ ڈکشنری میں دیکھیں۔ ان کی مراد کچھ اور ہے، عرفان کے اس مسلک کے اندر بہت ساری اصطلاحات ہیں کہ جو یہ ان معارف اور معانی کے لئے استعمال کرتے ہیں،

☆ رق الزجاج و رقت الخمر

خمر کو آپ معرفت کہہ لے، خمر یعنی معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ اور زُجاج یعنی انسانِ عارف یا نفسِ انسان و دلِ انسان۔ دلِ انسان ہے اور اسکے اندر خمر ہے، عموماً آپ دیکھیں کہ خصوصاً عرفانی شعراء نے عرفان کو زیادہ تر نظم میں بیان کیا ہے، عرفان زیادہ تر شعر کی زبان میں بیان ہوا ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں کہ کیوں ان لوگوں نے نثر کے بجائے زیادہ تر شعر استعمال کئے ہیں؟ مثلاً جہاں جہاں بھی عارفانہ کلام ہے چاہے کسی بھی زبان میں ہو، عربی، فارسی، اردو یا کسی اور زبان میں بھی ہو تو وہ غالباً شعری زبانوں میں ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شعری زبان بہت فصیح اور وسیع زبان ہوتی ہے، بجائے نثر کے شعر میں انسان بہت کچھ بیان کر سکتا ہے، اس لئے انہوں نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ پیمانہ و ظرف بھی رقیق ہوا، شفاف ہوا اور خمر بھی رقیق تھا یا شفاف تھا، جس جام کے اندر یہ مے پڑی ہوئی ہے، مے یعنی شراب، شراب بھی بہت شفاف ہے اور جام بھی بہت شفاف ہے،

☆ فتشابها......

دونوں رقیق ہیں، اتنے شفاف ہیں کہ امر مشتبہ ہو گیا ہے اور

☆ و تشاکل الامر......

پتہ نہیں چل رہا ہے کہ ان میں شراب کونسی ہے؟ اور پیمانہ کونسا ہے؟ یعنی دونوں اسطرح سے ہم رنگ ہیں یا دونوں بے رنگ ہیں کہ انسان تمیز نہیں کر سکتا ہے کہ زُجاج کون ہے اور شراب کونسی ہے؟

قرآن نے بھی قصہ ملکہ سبا میں بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے استقبال کے لئے جو دالان بنایا تھا وہ شیشے کا تھا اور اس طرح سے بنایا گیا تھا کہ نہر نظر آتا تھا یعنی پانی سے بھرا ہوا حوض نظر آتا تھا لہٰذا یہ عورت جب آئی تو اس نے اپنا لباس اوپر اٹھا لیا کہ تر نہ ہو جائے، بھیگ نہ جائے حالانکہ وہ خشک زمین تھی لیکن معماری کا اتنا خوبصورت نمونہ تھا یعنی اس ہنر اور زیبائی کے ساتھ اس کو بنایا گیا تھا کہ اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ پانی ہے یا زمین ہے، بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ظرف و مظروف دونوں اتنے شفاف ہوتے ہیں کہ آپس میں مخلوط ہو جاتے ہیں اور امر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ پیمانہ کونسا ہے؟ اور مے کونسی ہے؟ اسی طرح سے اس شعر میں جو لفظِ خمر اور زُجاج استعمال ہوا ہے اس میں خمر سے مراد قرآن اور زُجاج سے مراد نفسِ انسان و دلِ انسان ہے۔ قرآن بھی نور ہے اور دلِ انسان بھی نور ہو جائے، جب دل نور ہو جاتا ہے،

☆ فتشابها و تشاکل الامر......

یعنی ان کے اندر تشابہ ہو جاتا ہے، امر مشکل ہو جاتا ہے اور اب یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ قرآن کونسا ہے؟ اور انسان کونسا ہے؟ انسان قرآن ہو جاتا ہے اور قرآن عینِ انسان بن جاتا ہے،

کما اینکہ انسانِ کامل ایسے ہیں، جب قرآن خُلقِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن جاتا ہے تو یہ تشابہ ہوا ہے، یعنی قرآن قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اترا ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل قرآن ہے اور قرآن دلِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن گیا ہے،

☆ وقوله تعالى: يعلمكم الله......

سورۂ بقرہ کی اس آیۂ کریمہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ

يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ......

یعنی خدا آپ کو علم دے گا تو اس يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ سے کیا مراد ہے؟

☆ اى يفهمكم معانى القرآن......

اس سے مراد یہ ہے کہ ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ تمہیں معانی اور مفاہیمِ قرآن عطا فرمائے گی،

☆اشارة الى فهم مقاصد المتكلم......

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کہ جو متکلم ہے اور قرآن جو کلامِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے تو حق تعالیٰ یعنی متکلم تمہیں اپنے مقاصد اس وقت بتائے گا کہ جب تم تقویٰ اختیار کرو یعنی اپنے دل کو شفاف کرو تو مقاصدِ متکلم تمہارے دل میں اترنا شروع ہو جائیں گے،

☆ لان فهم كلامه ......

چونکہ فہمِ کلام اس سے حاصل ہوتا ہے۔

۸)فہمِ حقیقی، مرادِ متکلم کا حصول

☆ ان یعلم ما ینحصر فی ما تواطأ علیه اهل ذلک اللسان......

زبانیں، الفاظ، قراردادی ہیں یعنی لوگوں نے آپس میں طے کئے ہوئے ہیں کہ یہ لفظ ہم اس معنیٰ کے لئے استعمال کریں گے یعنی اہلِ زبان نے ان الفاظ کے بارے میں جو اتفاق و اجماع کیا ہوا ہے کہ ہم یہ یہ الفاظ کن کن معانی میں استعمال کریں گے؟ تو انسان وہی سمجھتا ہے کہ جس پر اہلِ زبان نے اتفاق کیا ہوا ہے،

☆ وهذا ليس بفهم حقيقی......

اہل زبان کا اتفاق کہ فلاں لفظ فلاں معنیٰ پر دلالت کرتا ہے یہ فہمِ حقیقی نہیں ہے، فہمِ حقیقی یہ ہے کہ انسان کو مرادِ متکلم و مقصدِ متکلم معلوم ہو جائے،

☆والمطلوب هو الفهم عن المتكلم......

اہلِ لسان نے جس بات پر اتفاق کر رکھا ہے وہ معرفت نہیں ہے، مقصودِ متکلم کیا ہے؟ یہ مہم ہے مثلاً فرض کریں کہ ایک شاعر ایک شعر کہتا ہے اور ہم اہلِ لسان سے جا کر پوچھتے ہیں کہ شعر کے اندر جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان الفاظ کے بارے میں آپ نے کیا اتفاق کیا ہے؟ یہ الفاظ کیا بتا رہے ہیں؟ اور وہ آپ کو بتا دے کہ یہ الفاظ ان ان معانی پر دلالت کرتے ہیں تو آپ اہلِ لسان کے اتفاق سے کلام کے معانی سمجھ گئے لیکن آپ کو یہ یقین نہیں ہے کہ متکلم بھی یہی مقصود رکھتا ہے کہ جو اہلِ لسان و اہلِ کلام نے آپ کو بتایا ہے، اگر آپ خود متکلم سے جا کر پوچھیں مثلاً اس وقت بڑے

بڑے شعراء کے دیوان کہ جن کی تشریح اور تفسیر کی جاتی ہے، فرض کریں علامہ اقبالؒ کے اشعار کہ جن کی تشریح کی جاتی ہے اور بڑے نامی اور عالمی شہرت کے حامل شعراء بھی ہیں مثلاً جس طرح سے مولانا روم، حافظِ شیرازی اور شیخ سعدی ہیں یا دیگر زبانوں کے شعراء ہیں، شارحین نے جو کچھ ان کے کلام کے معانی بیان کئے ہیں اور ان کے کلام کی تشریح کی ہے تو اگر خود مولانا روم آجائیں اور کہیں کہ مثنوی میں میری کیا مراد تھی؟ تو کاملاً کچھ اور مراد ہوگی مثلاً دوسروں نے آکر کہا کہ مثنوی کی ابتداء میں جو کلام ہے کہ

بشنو از نی چون حکایت می کند
از جدایہا شکایت می کند

اس شعر میں انہوں نے دیکھا کہ ''نی'' کیا ہوتی ہے؟ حکایت کیا ہوتی ہے؟ شکایت کیا ہوتی ہے؟ ان لوگوں نے دیکھا کہ فارسی الفاظ ہیں اور فارسی اہلِ زبان نے ان الفاظ کو ان معانی کے لئے استعمال کیا ہے، ''نی'' فلاں چیز ہوتی ہے، نہستان فلاں چیز ہوتی ہے، اس کو نہستان سے کاٹ کر لے آئیں تو اس سے بانسری بجاتے ہیں، ''نی'' یعنی بانسری، مولانا روم سے کوئی جا کر پوچھے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس بانسری سے کیا مراد ہے؟ یہ کونسی بانسری ہے؟ وہ آپ کو جواب دیں گے کہ یہ نفسِ انسان ہے، یہ روحِ انسان ہے، بانسری یعنی روحِ انسان بول رہی ہے، کیا بول رہی ہے؟ یہ بول رہی ہے کہ مثلاً بانسری جو تم سنتے ہو اور اس سے بڑا غمگین نغمہ نکلتا ہے تو یہ غمگین نغمہ اس کا مرثیہ ہے، کس بات کا مرثیہ ہے؟ اس بات کا کہ اس کو نہستان سے کاٹ کر اپنے وطن سے دور کر دیا گیا ہے،

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق

یعنی اس لئے رو رہی ہے کہ چونکہ اس کو نیستان سے کاٹ کر یہاں لے آئے ہیں، یہ اس کی جگہ نہیں تھی، یہ اس کا وطن نہیں تھا، جدائی و فراق پر رو رہی ہے یعنی روحِ انسان ہے جو رہی ہے، ہر چند ڈکشنری میں کچھ اور لکھا ہوا ہے لیکن مقصودِ متکلم کچھ اور ہے، اسی طرح سے خداوند تبارک وتعالیٰ نے الفاظ کے ذریعے سے کچھ مطالب قرآنی شکل میں، الفاظ کی شکل میں بیان کیے ہیں، ہمیں الفاظ کے معانی ڈھونڈنے ہیں یا متکلم کی مراد کشف کرنی ہے؟ دراصل ہمیں متکلم کی مراد کشف کرنی ہے الفاظ ذریعہ ہیں، کلام ذریعہ ہے تاکہ ہم مرادِ متکلم تک پہنچیں۔

۹) قرآن کو خود متکلم سے سمجھیں

مطلوب یہ ہے کہ ہم کلام کے بجائے خود متکلم سے سمجھیں۔

☆ **لا الفهم عن الكلام......**

یہ تو طے نہیں ہے کہ ہمیں کلام سے ہی سب کچھ سمجھنا ہے، خود متکلم سے جا کر سمجھیں کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے؟

☆ **وذلک لا یعلمه الا من نزل الکلام علی قلبه......**

کون متکلم سے سمجھتا ہے؟ مقصودِ متکلم خودِ متکلم سے وہی سمجھ سکتا ہے کہ جس کے دل پر قرآن نازل ہوا ہے، جس کے دل پر قرآن اترا ہو یعنی جس کے حُجرے سے اس کے دل پہ پہنچ گیا ہو، فقط حُجرے میں، مخارج میں اور ان چیزوں میں نہ گھومو مثلاً،

☆**والفهم عن المتکلم یختص بالخاصة......**

متکلم سے قرآن سننا اور متکلم سے قرآن سمجھنا یہ خاصہ کے لئے ہے یعنی خواص کے لئے ہے، عوام کے لئے نہیں ہے، عام افراد فقط کلام سے مراد سمجھتے ہیں متکلم سے نہیں سمجھتے ہیں،

☆ **و فهم الکلام للعامة......**

متکلم سے سمجھنا خواص کا کام ہے اور کلام سے سمجھنا عوام کا کام ہے،

☆ **و من فهم عن المتکلم، فهم الکلام دون العکس......**

جو متکلم سے مراد سمجھ لے وہ کلام کی مراد کو بھی سمجھ جاتا ہے لیکن جو کلام کی مراد سمجھتا ہو تو ضروری نہیں ہے کہ متکلم کی مراد بھی سمجھتا ہو، صدر المتالھینؒ فرماتے ہیں کہ

☆ **وقد حققنا لک سابقاً معنی الکلام الحقیقی......**

چونکہ ہمارے پیشِ نظر آدابِ فہمِ قرآن مقصود ہیں لہٰذا ہم نے اس کتاب کی ایک فصل انتخاب کی ہے، اس سے پہلے ایک اور فصل انہوں نے حقیقتِ کلام کے بارے میں بیان کی تھی کہ کلام ہوتا کیا ہے؟ جو حصہ ہم نے بیان نہیں کیا، اس کی طرف اشارہ فرما کر کہتے ہیں کہ پہلے میں نے

حقیقتِ کلام آپ کی سامنے بیان کی ہے،

☆ وانه لاینفک عن الفهم......

فرماتے ہیں کہ کلام ہوتا ہی وہی ہے کہ جس سے کچھ سمجھا جائے اگر نہ سمجھا جائے تو سرے سے کلام نہیں ہے،

☆ فقد نبهتک علی ما ان علمته کنت علی خیر کثیر واوتیت الحکمة......

فرماتے ہیں کہ جن چیزوں کی طرف میں نے آپ کی توجہ دلائی ہے اگر آپ نے انہیں درک کرلیا ہے، ان نکات کو جان لیا ہے تو پھر آپ یہ سمجھیں کہ صاحبِ خیرِ کثیر ہیں، مالکِ خیرِ کثیر ہیں، خیرِ کثیر یعنی حکمت آپ کو مل گئی ہے، معرفت کی چابی آپ کو مل گئی ہے۔

☆ فنزول القرآن علی القلب بهذا الفهم هی تلاوة الحق علی العبد....

فرماتے ہیں کہ قرآن کا دلِ انسان پر اس فہم کے طور پر نازل ہونا یعنی اس طرح کی فہم کہ انسان متکلم سے سنے، انسان خود متکلم سے مرادِ متکلم سن رہا ہو،

☆ و الفهم عنه فیه تلاوة العبد علی الحق......

حق تالی ہے، حق تلاوت کر رہا ہے، خدا تلاوت کر رہا ہے عبد کے اوپر۔

کلام کی تلاوت کرنا اور کلام سے کسی نکتے کو سمجھنا حق کے سامنے عبد کی تلاوت ہے لیکن متکلم سے سننا متکلم سے سمجھنا یہ عبد کے اوپر حق کی تلاوت ہے۔

آخر میں دعا فرماتے ہیں کہ اب جب کہ ہم نے ایک راز، حقیقتِ کشفیہ اور ایک بہت باریک نکتہ بیان کیا ہے، اس حقیقتِ کشفیہ میں اول یہ ہے کہ قرآن مجیدٌ دالنزول ہے، دوم قرآن دل کے اوپر اترتا ہے، دل پر نازل ہوتا ہے، سوم یہ کہ دلِ انسان عرشِ قرآن ہے، قرآن کے لئے عرش کی حیثیت رکھتا ہے، قرآن عرش کے اوپر مستقر ہوتا ہے اور دل اگر فارغ ہو، آمادہ ہو، خالی ہو تو قرآن آتا ہے ورنہ پہلے سے مفروضوں سے بھرا ہوا ذہن، خرافات سے بھرا ہوا ذہن اور من گھڑت اوٹ پٹانگ چیزوں سے بھرا ہوا ذہن ہے تو قرآن سرے سے اس کے گلے سے نیچے نہیں اترتا ہے۔ جب قرآن دل کے اوپر اترتا ہے تو قرآن صفت بن جاتا ہے، ملکہ بن جاتا ہے، خُلق انسان بن جاتا ہے اور دلِ انسان صفاتِ قرآنی سے، خصائلِ قرآنی سے متصف ہو جاتا ہے اور انسان عملاً انسانِ قرآنی بن جاتا ہے، انسان کا دل قرآنی بن جاتا ہے۔

☆ **اللّٰھم اجعلنا ممن رزق الفھم عنک......**

خداوندا! ہمیں یہ فہم عطا فرما، کونسی فہم؟ وہ فہم کہ جو عبد کو متکلم سے عطا ہوتی ہے، فقط کلام کی حد تک نہ ہو، سید الشہدا علیہ السلام نے بھی دعائے شریفِ عرفہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں جو مناجات کی ہیں ان میں یہی بیان فرمایا ہے کہ پروردگارا! مجھے خود اپنی ذات کی طرف راہنمائی فرما نہ کہ مجھے اپنے آثار، اپنے افعال، اپنی مخلوق اور اپنے معلولات کے سپرد کردے کہ میں انہی میں بھٹکتا پھروں اور وہ تیری طرف میری راہنمائی کریں، بلکہ خود میرا ہاتھ تھام کے مجھے اپنی طرف راہنمائی فرما، اسی طرح سے یہ دعا بھی بہت عرشی دعا ہے، انہوں نے بڑی بلند دعا کی ہے، یہ عالی مضمون کی دعا

ہے کہ خداوندا ہمیں وہ فہم عطا فرما کہ جس میں ہم متکلم سے قرآن سمجھیں نہ کہ فقط کلام سے سمجھیں یعنی کلام میں وارد ہوں تا کہ متکلم تک پہنچیں اور پھر ہم متکلم سے سمجھیں، جو متکلم سے سنے اس کو کلام بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور مقصودِ متکلم بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور یہ کہ

☆ انک علی کل شیء قدیر.

تیرے لئے یہ کوئی محال نہیں ہے، یہ تیری قدرت میں ہے کہ تو کسی بھی انسان کو جو چاہے دے سکتا ہے، جیسے دعائے کمیلؒ میں کہا گیا ہے کہ

فَاِنَّکَ فَعَّالٌ لِمَا تَشَاءُ......

بے شک تو جو چاہے وہ کرنے والا ہے......

لہٰذا انسان خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہی دعا مانگے کہ ہمیں وہ فہم عطا فرما کہ ہم مقصودِ قرآن خود ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ سے سنیں اور دل کے اوپر اثر ہو اور قرآن ہمارے دل کا حصہ وصفت بنے، اس کے اندر قرآن راسخ ہو اور یہ دل صفاتِ قرآن سے متصف ہو۔ انشاء اللہ آئندہ فصل میں ادبِ فہم کی بحث درج کی جائے گی۔

فصلِ ادبِ نهم

﴿ترقی﴾

(حصّه اول)

١) تکامل کیلئے ترقی کا حصول

٢)ترقی کیلئے دو بنیادی چیزیں

٣)ترقی کے لا یقفی مراتب

٤)بے ادبوں سے عبرت

٥)دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے

٦)مرتبوں کی طلب میں اضافه

٧)ارتقاء یا زوال، تیسری حالت محال

٨)باطنِ قرآن عمیق ھے

٩)تالئ قرآن ھی ارتقاء کرتا ھے

۱) تکامل کیلئے ترقی کا حصول

آدابِ فہمِ قرآن میں سے ادبِ نہم ترقی ہے،

☆التاسع الترقی......

انسانِ تالیٔ قرآن جب بارگاہِ قرآن میں حاضر ہوتا ہے تو دیگر آداب کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک صفت ارتقاء کی ہونی چاہئے یعنی مسلسل قرأت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ترقی بھی ہو، یعنی جب تالیٔ قرآن وقاریٔ قرآن بارگاہِ قرآن میں حاضر ہو تو اس کے اندر جمود نہ ہو بلکہ ارتقاء وترقی کے لئے آمادہ ہو، انسان قرأت اور تلاوت کے اثنا میں مسلسل درحالِ ارتقاء ہو، جس طرح سے حدیث میں بھی آیا ہے کہ

اِقْرَأْ وَارْقَ......(۱)

قرآن پڑھئے اور ترقی کریں......

قیامت میں تالیٔ قرآن اور حاملِ قرآن کو یہی کہا جائے گا اور احادیث بھی اس پر دلالت کرتی ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس مضمون کے ساتھ مرحوم کلینیؒ نے اصولِ کافی کے اندر بابِ فضیلتِ قرآن میں ان روایات کو نقل کیا ہے کہ قیامت میں جب انسانوں میں تالیٔ قرآن داخل ہوگا تو خداوند تبارک وتعالیٰ کی جانب سے اسے یہی خطاب ہوگا،

اِقْرَأْ وَارْقَ فَيَقْرَأُ ثُمَّ يَرْقَى .....(۲)

قرآن پڑھئے اور ترقی کریں (یعنی آگے بڑھیں) پس وہ (قرآن) پڑھے گا پھر ترقی

کرے گا (یعنی آگے بڑھے گا)......

امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث ہے کہ

عَلَيْكُمْ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ فَإِنَّ دَرَجَاتِ الْجَنَّةِ عَلَى عَدَدِ آيَاتِ الْقُرْآنِ، فَإِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُقَالُ لِقَارِيءِ الْقُرْآنِ: اِقْرَأْ وَارْقَ......(۳)

تم ضرور قرآن کی تلاوت کیا کرو چونکہ جنت کے درجات قرآنی آیات کی تعداد کے برابر ہیں، جب قیامت کا دن ہوگا تو قرآن کی تلاوت کرنے والے سے کہا جائے گا: پڑھ اور اپنے درجات میں اضافہ کرتا جا......

یعنی جس طرح سے تو قرأت میں، تلاوتِ قرآن میں اور پیرویٔ قرآن میں درجہ بہ درجہ آگے بڑھا ہے اسی طرح سے ابھی مقاماتِ بہشتی میں بھی درجہ بہ درجہ مقاماتِ عالیہ پر فائز ہوگا، چونکہ قرآن کے کئی پہلو ہیں اور انسان کی ترقی بھی ان سارے پہلوؤں کے لحاظ سے ہوتی ہے، فہمِ انسان کے بھی درجات ہیں اور اسے درجہ بہ درجہ اور رتبہ بہ رتبہ آگے بڑھنا چاہئے یعنی تالیِ قرآن جب قرآن کی بارگاہ میں حاضر ہو تو اس کا دل پیروئے قرآن اور ہمراہ با مراحلِ قرآن ہو، درجہ بہ درجہ جہاں قرآن جا رہا ہو وہیں انسان کا دل بھی جا رہا ہو، خواہ نہ خواہ تلاوت موقوف بر ترقی ہے چونکہ قرآن ایک جگہ پر موقوف نہیں ہے۔

قرآن الفاظ سے معانی کی طرف منتقل ہوتا ہے، معانی سے حقائق کی طرف اور اسی طرح سے دیگر درجاتِ قرآن ہیں جیسے ظاہرِ قرآن ہے اور ظاہر سے باطنِ قرآن ہے اور باطن سے مزید

باطن کی طرف اس کی وسعت ہے، خوانخواہ تالیِ قرآن جب ترقی نہ کرے یعنی درجاتِ قرآن و مراتبِ قرآن کے ساتھ ہمراہ نہ ہو اور آگے نہ بڑھے تو قرآن کہیں اور جا رہا ہوتا ہے اور یہ انسان تالی نہیں کہلاتا ہے بلکہ واقف کہلاتا ہے، تالی یعنی جس کا قرآن سے فاصلہ نہ ہو اور اگر انسان ایک جگہ پر رک جائے مثلاً ایک ہی درجۂ قرآن پر توقف کرے اور ساری عمر اسی درجے کے ساتھ بسر کرے تو یہ انسان واقف ہے، قرآن سے دور ہے، متولی از قرآن ہے نہ کہ تالیِ قرآن ہے۔

۲)ترقی کیلئے دو بنیادی چیزیں

ارتقاء کے کئی پہلو ہیں اور انسان یہی ادب باقی تمام معاملات میں بھی مدنظر رکھے، یعنی تالیٔ قرآن اثنائے تلاوتِ قرآن میں بھی اور دیگر موارد میں بھی ترقی کو مدِنظر رکھے، یہی باعثِ رشدِ انسان ہے، اگر ارتقاء نہ کرے اور ایک ہی عمل پہ تکرار کرتا رہے، بار بار دہراتا رہے تو اس کو اس عمل سے ارتقاء حاصل نہیں ہوتا ہے، حتیٰ عبادتوں میں بھی انسان ارتقاء کرے چونکہ علم و معرفت کے، عبادتوں کے اور انسانوں کے بھی مرتبے و درجات ہیں لہٰذا انسان علم و معرفت میں بھی ارتقاء کی حالت میں رہے، اپنے انسانی مرتبوں میں بھی مرتبہ بہ مرتبہ آگے بڑھے اور عبادات میں بھی ایک ہی درجے کو مسلسل تکرار نہ کرتا رہے، اسی سے انسان کو تکامل حاصل ہوتا ہے۔

انسان کو درحقیقت دو تکامل حاصل کرنے ہیں یا ترقی کے دو زینوں پر چڑھنا ہے، ایک انسانی مراتب پر اور ایک معرفت کے مراتب پر کہ البتہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، جب

انسان معرفت کے مختلف زینوں پہ ترقی کرتا ہے، ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں پہنچتا ہے تو یہ مرحلہ اس کو ایک انسانی مرتبے سے اگلے انسانی مرتبے میں پہنچنے کیلئے مدد و تقویت دیتا ہے، پس یہ دونوں ارتقاء باہم ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ ہیں، اسی طرح سے انسان عبادی اعمال میں بھی ارتقاء کرے۔ غیر عبادی اعمال بلکہ تمام امور میں ارتقاء موجود ہے، یعنی ہر وہ چیز کہ جس کا ظاہر و باطن ہے اس کے اندر درحقیقت ارتقاء ہے اور جمود اس وقت ہو جاتا ہے کہ جب انسان اس ایک مرتبے کو لے کر اسی کو عمر بھر دہراتا رہے، تکرار کرتا رہے، اس دھرانے سے انسان ترقی نہیں کرتا ہے اور اس غایت و نہایتِ منزل تک نہیں پہنچتا ہے۔

وسائل اور ذرائع کے ذریعے سے بھی انسان ارتقاء کرتا ہے، اگر انسان ایک ہی وسیلے کو تھام کر اسی کو دہراتا رہے، تکرار کرتا رہے تو وسیلہ و ذریعہ بات کہ جو انسان کو مرتبہ دیگر تک پہنچاتا ہے اس تک انسان رسائی پیدا نہیں کر سکتا ہے، ترقی تعلیم و عبادت کا بھی ادب ہے اور قرآن کا بھی ادب ہے اور اسی کی طرف امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے فرزند جنابِ محمد ابن حنفیہ کی ہدایت و راہنمائی فرمائی کہ

اِقْرَأْ وَارْقَ۔۔۔۔

یعنی آپ پڑھو، قرأت کرو لیکن اس قرأت کے اندر تکرار نہ کرتے رہو، ایک ہی مطلب نہ دہراتے رہو یعنی ایک درجے پر ہی نہ گھومتے رہو بلکہ ساتھ ساتھ تمہارا ارتقاء بھی ہو یعنی یہ قرأت تمہیں ارتقاء بھی عطا کرے۔

ترقی کیلئے دو بنیادی چیزیں

۳)ترقی کے لا یقفی مراتب

قرأت اور ارتقاء آپس میں لازم وملزوم ہوں یعنی قرآن پڑھو اور قرآن پڑھ کر پھر قرآن کے ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے پر بھی پہنچو، دوسرے رتبے سے تیسرے مرتبے پر پہنچو، تیسرے مرتبے سے اگلے مرتبے پر اور جہاں تک تمہاری وُسع وطاقت موجود ہے، بعض مراحل ایسے ہیں کہ لامتناہی ہیں، انسان جتنا بھی ارتقاء کرتا جائے لیکن ارتقاء کی منازل اور مرتبے ختم نہیں ہوتے ہیں جیسا کہ انسان کے بارے میں اہلِ معرفت کا بھی یہی کہنا ہے کہ انسان کی حد لا یقفی ہے، یہ عرفان کی اصطلاح ہے، حدِ لا یقفی یعنی کوئی حد ایسی نہیں ہے کہ جہاں پر انسان جا کر متوقف ہو جائے اور کہے کہ اب یہاں سے آگے میں مزید ترقی نہیں کرسکتا ہوں، انسان کے تکامل کے سفر میں، تکامل کی دنیا میں اور تکامل کے مراحل میں کسی مرحلے پر وقفہ نہیں ہے، اگر آگے بڑھنے والا انسان موجود ہو، اگر آگے بڑھنے کیلئے انسان آمادہ ہو تو اس کیلئے لامتناہی، لامحدود اور نہ ختم ہونے والے مراتب موجود ہوتے ہیں، اکثر انسان جو رہ جاتے ہیں اور عدمِ بلوغ ہی کی حالت میں رہ جاتے ہیں، یہیں مرجاتے ہیں، یہیں ان کی ساری عمر ختم ہو جاتی ہے اور فرصتِ زندگی تمام ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ارتقاء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں اور ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا ہے کہ ہمیں اس زمین پر خداوند تبارک وتعالیٰ نے فقط ایک چیز کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ ارتقاء وترقی ہے یعنی ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے میں پہنچنا ہے۔

ترقی کے لا یقفی مراتب

٤) بے ادبوں سے عبرت

غزالی سے منقول ہے کہ ان سے پوچھا گیا یہ اخلاق و ادب کہاں سے سیکھا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ بے ادبوں سے سیکھا ہے، بے ادب بھی عبرت کے لئے خوب ہیں اور انسان ان دنیاداروں سے سیکھے، بہت ساری چیزیں انسان دنیا داروں اور دنیا پرستوں سے سیکھ سکتا ہے، اس وقت بڑے سرمایہ دار اور بڑے مالدار لوگ موجود ہیں کہ جن کی عالمی شہرت ہے یہ وہی لوگ تھے کہ جن کے اندر ارتقاء کی حس موجود تھی، جن کے اندر خواہشِ ارتقاء موجود تھی۔ وہ لوگ جو ایک، دو ہزار پہ گزارہ کر سکتے ہیں انہوں نے ہرگز مالی دنیا میں، دنیوی میدان میں اور مالی میدان میں ترقی نہیں کی ہے، ممکن ہے کہ معنویت میں، دین میں اور کمالات میں ترقی کی ہو لیکن دنیا ان کے ہاتھ نہیں آئی ہے بلکہ دنیا اُن کے ہاتھ آئی ہے کہ جنہوں نے دنیا میں ارتقاء کیا یعنی ان کی نظر میں اول سے تھا کہ ہمیں کسی ایک مرتبے پر نہیں رکنا ہے۔

دنیا میں ترقی کرنی چاہیے یا نہیں وہ ایک الگ موضوع ہے، ابھی ہمیں فقط یہ دیکھنا ہے کہ ہم ان دنیاداروں سے، ان بے ادبوں سے ہی ادب سیکھ لیں کہ یہ دنیا میں کسی وقفے کے قائل نہیں ہیں، ان کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں پھر بھی تحصیلِ دنیا میں مشغول رہتے ہیں اور جب ضرورتوں سے کئی گنا زیادہ مال ان کے پاس اکھٹا ہو جاتا ہے تو پھر بھی یہ طلبِ دنیا میں ہی مشغول رہتے ہیں حتیٰ اتنی دنیا کما لیتے ہیں کہ اگر ان کی کئی نسلیں بیٹھ کر اس کمائے ہو مال کو ہی بغیر زحمت و کوشش کے صَرف کرتی رہیں اور کھاتی رہیں تو وہ مال صدیوں تک ختم نہ ہو گا لیکن پھر بھی ان کی حسِ دنیا ختم نہیں ہوتی ہے اور

بے ادبوں سے عبرت

دنیا کے اندر مزید ارتقاء کی طرف راغب رہتے ہیں، انسان ان سے سیکھے کہ یہ جو اس حطامِ دنیا اور لہو کے اندر ارتقاء کرتے ہیں تو کیوں نہ انسان کمالات کے اندر ارتقاء کرے۔

یہ مطلب شیخ رئیس بوعلی سیناؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو ایک عبرت دکھائی، ایک جگہ پر معرکہ لگا ہوا تھا، جس طرح سے شعبدہ باز یا مداری ہوتے ہیں کہ بازار میں کسی جگہ کوئی کرتب دکھاتے ہیں تو لوگ ان کے اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں، اسی طرح کا ایک مداری، ایک شعبدہ باز دو درختوں کے مابین باریک سی رسی باندھ کر اس کے اوپر چل رہا تھا، وہ حکیم اپنے شاگردوں کے ساتھ وہاں سے گزرا تو انہیں روک کر متوجہ کیا کہ دیکھو یہ رسی پہ چلنا آسان تو نہیں ہے، اس شخص نے کتنی محنت کی ہو گی؟ کہ اپنا توازن اس نے رسی کے اوپر برقرار رکھا ہوا ہے، سالہا سال اس نے محنت کی ہے، دن رات مشقت کی ہو گی لیکن ہم تو ہموار اور تنگ راستے پر بھی صحیح نہیں چل سکتے ہیں اور اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتے ہیں لیکن یہ رسی کے اوپر بغیر کسی سہارے کے چل رہا ہے، اس کی زحمت، کوشش، محنت اور مشقت کی دلیل یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو یہاں تک پہنچایا ہے اور اپنا توازن برقرار رکھا ہے، یہ دنیا کے لئے ہے یعنی لوگوں کو خوش کرنے کے لئے، کرتب دکھانے کے لئے اور لوگوں سے چار پیسے بٹورنے کے لئے ہے، اس نے اتنی محنت اور مشقت کی ہے ورنہ کوئی د معرفت کی راہ میں کام نہیں کرتے۔

مثلاً ایک عالمِ دین، حکیم یا فیلسوف رسی پر نہیں چل سکتا ہے جب تک وہ اسی جیسی مشق نہ کرے، نہایتاً اس کوشش اور زحمت کا نتیجہ یہ تھا کہ چند لوگ اس کو دیکھ کر محظوظ ہوں، جب یہ شخص اتنے

بیاہ بول سے عبرت

سادہ سے کام کے لئے اتنی محنت کر سکتا ہے تو کیوں نہ انسان اپنے ارتقاء کے لئے، اپنے تکامل کے لئے محنت کرے اور اس درجے تک پہنچے کہ انسان کے اندر مہارت پیدا ہو جائے، ایسی مہارت جو معنوی مہارت ہو کہ جس سے انسان کی عاقبت بنتی ہو۔ ایسے مناظر سے انسان عبرت و درس لے سکتا ہے، خداوند نے اسی لئے مختلف حالتوں میں بعض دنیا داروں کے، بعض دنیا پرستوں کے اور بعض بے ادبوں کے یہ مناظر بنائے ہیں کہ انسان ان سے سیکھے کہ یہ اپنی دنیا میں کیا کچھ کر رہے ہیں تو ہم بھی کیوں نہ یہی کام اپنی معنویت اور علم کی دنیا میں عملی کریں۔

بے ادبوں سے عبرت

دنیا داروں کو دیکھیں کہ یہ کام عملاً ہوا ہے یعنی بعض لوگ نمونہ بھی ہیں، حالانکہ دنیا میں مالدار ہیں اور سب کچھ ہیں لیکن پھر بھی گرمی کے اندر اور سخت دشوار موسم کے اندر اپنا خون اور پسینہ بہا کر دنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، دن رات میں وہ کم ترین وقت میں سوتے ہیں اور بیشتر اوقات کام کاج کرتے ہیں، انہیں دیکھ کر اہلِ معنیٰ اور اہلِ تکامل کو عبرت لینی چاہئے کہ یہ دنیا میں اس گرمی کے عالم میں اس قدر اپنا خون پسینہ بہانے میں لگے ہوئے ہیں تو ہم بھی کیوں نہ معنویت اور تکامل میں یہ کام کریں۔

اسی طرح سے انسان دیکھے کہ دنیا داروں کی حسِ ارتقاء کبھی بھی سیر نہیں ہوتی ہے، ان کا جی نہیں بھرتا ہے بلکہ حرص بڑھتی ہی رہتی ہے مثلاً انہیں پہلے ہزار کی ضرورت ہوتی ہے، جب ہزار تک پہنچتے ہیں تو ان میں پانچ ہزار کی طلب شروع ہو جاتی ہے، پانچ ہزار پر جب پہنچتے ہیں تو دس ہزار کی طلب پیدا ہوتی ہے، دس ہزار پہ جب پہنچتے ہیں تو بیس ہزار کی طلب شروع ہو جاتی ہے اور ہزاروں

میں جب پہنچتے ہیں تو لاکھوں کی طلب پیدا ہوتی ہے، لاکھوں کے بعد کروڑوں، عربوں، کھربوں کی طلب اور نہ مٹنے والی طلب پیدا ہو جاتی ہے، یہ طلب درحقیقت اہلِ معنیٰ کے اندر اور اہلِ تکامل کے اندر پیدا ہونی چاہئے تھی، ناسیری، ناپذیر اور نہ مٹنے ہونے والی طلب انسان کے اندر پیدا ہو اور یہی حدیث کا بھی مضمون ہے یعنی یہ صرف دنیا داروں اور دین داروں کا سادہ سا مقایسہ نہیں ہے بلکہ حدیث میں بھی ہے۔

۵) دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے

یہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ

مَنْهُومَانِ لَا يَشْبَعَانِ طَالِبُ دُنْيَا وَطَالِبُ عِلْمٍ.. (۴)

دو بھوکے ایسے ہیں کہ ہرگز سیر نہیں ہوتے ہیں، طالبِ علم بھی کبھی سیر نہیں ہوتے اور طالبِ دنیا بھی کبھی سیر نہیں ہوتے، یعنی ایک کمال ہے اور ایک کمال نہیں ہے، کمال اور مال دونوں کی حس کبھی سیر نہیں ہوتی ہے لہٰذا ہم نے نہ طالبِ کمال کو سیر ہوتے دیکھا ہے اور نہ طالبِ مال کو سیر ہوتے دیکھا ہے، انسان اگر طلبِ دنیا میں سیر ہو جائے تو سمجھو کہ یہ طالبِ دنیا نہیں تھا بلکہ یہ تارکِ دنیا تھا، یہ دنیا سے بیزار ہے، اس کو دنیا کی حاجت اور ضرورت ہی نہیں ہے، جو دنیا سے سیر ہو جائے تو سمجھو وہ سرے سے دنیا دار ہی نہیں ہے۔

جس طرح سے امیر المومنین علیہ السلام اصلاً دنیا سے سیر ہیں اور انہیں دنیا کی ضرورت نہیں ہے،

مستغنی از دنیا ہیں لیکن دنیادار کی علامت یہ ہے کہ کبھی بھی سیر نہیں ہوگا، اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں، اس کی نسلوں کی ضرورتیں پوری ہو جائیں اور اس کے پاس اتنا مال آجائے کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے لیکن اس کی طلب ہرگز تمام نہیں ہوتی ہے، اسی طرح سے طالب العلم ہے، مال اور کمال دونوں کی حس دونوں کے طلبگاروں کے اندر یکساں ہوتی ہے یعنی انسان سیر نہیں ہوتا لہٰذا اگر انسان کمالات کی دنیا میں آتا ہے تو اپنے اندر ایسی حس پیدا کرے کہ جو سیر نہ ہونے والی ہو، دنیا میں بھی ان لوگوں نے ترقی کی ہے کہ جن کے اندر یہ حس موجود تھی، انہوں نے سیر نہ ہونے والی حس سے اپنی دنیا بنائی ہے اور کمالات کی دنیا کے اندر بھی وہ لوگ ترقی کریں گے، کسی مقام تک پہنچیں گے کہ جن کے اندر نہ ختم ہونے والی اور نہ سیر ہونے والی حس موجود ہو، ورنہ ادبیات پڑھ کر، عربی پڑھ کے وہیں احساسِ استغناء کر دے کہ ہم عالمِ دین ہو گئے، حجۃ الاسلام ہو گئے، آیت اللہ ہو گئے، صرف صَرف ونحو پڑھ کر مرجعِ خلائق بننے کے قابل ہو گئے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ طالبِ کمال نہیں تھا، یہ آیت کسی اور چکر میں آئی تھی، یہ طالبِ کمال نہیں تھا اور نہ کمال کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک درجۂ کمال دوسرے درجۂ کمال کی طلب میں اضافہ کر دیتا ہے کہ جس طرح سے مال کا ایک مرتبہ دوسرے مرتبے کی طلب میں اضافہ کر دیتا ہے۔

مرتبوں کی طلب میں اضافہ

٦) مرتبوں کی طلب میں اضافہ

کمال کا ایک مرتبہ دوسرے مرتبے کے لئے طلب کو شدید تر کر دیتا ہے یعنی انسان جب

ادبیات پڑھتا ہے، عربی لٹریچر پڑھ لیتا ہے تو پھر اگلے علم کے لئے طلب زیادہ بڑھ جاتی ہے، اُس مرحلے میں پہنچتا ہے تو اگلے علم کے لئے طلب مزید بڑھ جاتی ہے اور یہ طلب کبھی بھی ختم نہیں ہوتی ہے، یہ نہ ختم ہونے والی طلب ہے لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی طلبِ کمال اور ترقی کی وجہ سے خدا نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ ہمیشہ پروردگار سے یہ دعا مانگیں کہ

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا٥ (۵)

اور یہ کہتے رہیں کہ پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما۔

یعنی کہیں جا کر یہ احساس نہ کریں کہ اب مجھے مزید علم کی ضرورت، مزید ترقی کی ضرورت اور مزید ارتقاء کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا جب تک انسان کے اندر یہ ادب، یہ حس اور یہ صفت موجود نہ ہو تو نہ مال میں آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ کمال میں آگے بڑھ سکتا ہے البتہ مال تکامل نہیں ہے اور اسے کمال حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ دنیا ہے لیکن اگر انسان میں یہ ترقی کی حس کمالات کے لئے موجود ہو تو انسان کو باکمال تر بنا سکتی ہے۔

پس تحصیل میں بھی انسان ایسے ہی ہو یعنی مترقی انسان ہو، حالتِ ترقی میں ہو، ارتقاء پذیر اور ارتقاء کا طلبگار ہو، عبادات میں بھی ایسے ہی اہلِ ترقی ہو اور قرآن میں بھی اہلِ ترقی ہو، اس انسان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ کسی نقطے تک اور کسی مقام تک پہنچ جائے گا لیکن جس میں ارتقاء کا شوق ہی نہ ہو اور اپنے نفس کو اس نے نفسِ مترقی نہ بنایا ہو، ترقی پذیر نفس نہ بنایا ہو تو یہ کہیں بھی نہیں پہنچ سکتا ہے، یہ اصطلاحیں جو خالصتاً دینی تھیں اور دینی اقدار میں شمار ہوتی تھیں دین داروں سے دنیا داروں

مرتبوں کی طلب میں اضافہ

نے لے لی ہیں لہٰذا آج سیاست کی دنیا میں یہ اصطلاح بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے مثلاً ترقی پذیر ممالک، ترقی پذیر گروہ، ترقی پذیر احزاب یا اس قسم کی دیگر اصطلاحیں کہ جو اَب مادی دنیا میں استعمال ہوتی ہیں جیسے بعض ترقی یافتہ ممالک ہیں، بعض ترقی پذیر ممالک ہیں یعنی ایسے ممالک جو حالتِ ترقی میں ہیں، اپنے اقتصاد کے لحاظ سے، معیشت کے لحاظ سے، سیاست کے لحاظ سے اور نظام کے لحاظ سے حالتِ ارتقاء میں ہیں، جن ممالک کے اندر ارتقاء کی خواہش ختم ہو جائے وہ زوال پذیر ہو جائیں گے۔

۷) ارتقاء یا زوال، تیسری حالت محال

ارتقاء اور زوال کے درمیان تیسری حالت نہیں ہے اور وہ یہ کہ انسان ایک جگہ رکا رہے کہ نہ ارتقاء و ترقی کر رہا ہو اور نہ زوال و انحطاط کا شکار ہو۔ فقط دو حالتیں ہیں، انسان چونکہ موجودِ ساکن نہیں ہے بلکہ موجود متحرک ہے، اس لئے یا تو بسوئے ارتقاء حرکت کر رہا ہے یا بسوئے زوال یعنی زوال پذیر ہے یا ترقی پذیر ہے۔ اس مطلب کو ہم مادی، دنیوی یا محسوس مثال کے ذریعے سے واضح کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں چونکہ دینی راستہ یا صراطِ مستقیم عمودی راستہ ہے، افقی راستہ نہیں ہے، عمودی راستہ یعنی یہ راستہ نیچے سے اوپر کی طرف جاتا ہے، تکامل کی طرف جاتا ہے، اب اردو زبان میں شاید ممکن ہے کہ بعض عمودی اور افقی کی اصطلاح نہ سمجھتے ہوں، افقی یعنی ہوریزونٹل (Horizontal) کہ جو چیز زمین سے زمین کی طرف پھیلی ہوئی ہو، جیسے افق اسے کہتے ہیں کہ جہاں سورج غروب ہوتا ہے اور طلوع ہوتا ہے، زمین سے زمین کا فاصلہ یا زمین سے زمین کا

خط افق کہلاتا ہے لیکن جو خط زمین سے آسمان کی طرف کھینچا جاتا ہے اس کو عمودی کہتے ہیں یعنی ورٹیکل (Vertical) خط یا ورٹیکل لائن جو زمین سے آسمان کی طرف بڑھتی ہے۔

صراطِ مستقیم ہوریزونٹل نہیں ہے، یہ راستہ زمین سے زمین تک نہیں ہے، افقی نہیں ہے بلکہ صراطِ مستقیم ورٹیکل ہے، اسفل سے اعلیٰ کی طرف ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی خلقت میں بھی یہی بیان فرمایا ہے کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍo ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَo (٢)

بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے پست ترین حالت کی طرف پلٹا دیا۔

یعنی وجود اور ہستی کے سب سے نچلے مرتبے میں انسان کو خلق کر کے قرار دیا اور پھر وہاں سے اس کو دعوت دی کہ تَعَالَوْا یعنی اوپر آؤ، اسفل سافلین میں رکھ کر پھر اس سے کہا کہ اوپر آؤ، یہ نہیں کہا کہ تم اسفل سافلین کے ایک گھر سے نکل کر اسفل سافلین ہی کے دوسرے محلے میں چلے جاؤ، اسفل سافلین بہت ہیں، ساری دنیا اسفل سافلین ہے، اسفل سافلین کے کئی محلے، کئی گلیاں اور کئی اقلیم ہیں، انسان ایک اقلیم اسفل سے دوسرے اقلیم اسفل میں منتقل ہو جائے یا ایک محلۂ سفلاء سے دوسرے محلۂ سفلاء میں منتقل ہو جائے تو اس کو ارتقاء تو نہیں کہتے ہیں، انسان کا جغرافیائی وتاریخی سفر افقی سفر ہے یعنی زمین سے زمین کی طرف ہے، انسان کا دینی سفر زمین سے آسمان کی طرف ہے، یہ ارتقائی اور تکاملی سفر ہے۔ انسان آزمالے کہ اس وقت گھروں کے اندر جو ستون نصب ہیں اور جو فرش

ارتقاء یا زوال، بشری حالت محال

گھروں کے اندر بچھے ہوئے ہیں یہ دونوں انہی دو چیزوں کا تجسم ہیں، گھر کے اندر جو فرش بچھا ہوا ہے اس کی جہت افقی ہے، زمین سے زمین پہ بچھا ہوا ہے، زمین کے ایک کونے سے زمین کے دوسرے کونے کی طرف گیا ہوا ہے لیکن ستون زمین سے اٹھا ہوا ہے، یہ زمین کی طرف نہیں جا رہا ہے بلکہ آسمان کی طرف جا رہا ہے، اب فرش پر چل کر دیکھیں، فرش پر کئی حالتیں ہو سکتی ہیں آپ چاہیں تو رک بھی سکتے ہیں، چاہیں تو حرکت بھی کر سکتے ہیں یعنی افقی راستے میں سکون اور حرکت دونوں متصور ہیں لیکن اگر آپ ستون کے اوپر چلیں تو دو ہی حالتیں متصور ہیں کہ یا تو آپ ستون سے اوپر جا رہے ہیں یا ستون سے نیچے آ رہے ہیں، ستون پہ رکنا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے، جمود ممکن نہیں ہے چونکہ ستون عمودی ہے اور نیچے سے اوپر کی طرف جا رہا ہے، تکامل کا راستہ کہ جو صراطِ مستقیم ہے یہ خود انسان کے اپنے ارتقائی سفر کا نام ہے، تکاملِ انسان کا نام صراطِ مستقیم ہے، ایک محلے سے دوسرے محلے تک جانا، گھر سے مسجد تک جانا صراطِ مستقیم نہیں ہے بلکہ نقص سے کمال کی طرف آنا صراطِ مستقیم ہے، یہ عمودی راستہ ہے، اس راستے میں دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو انسان اوپر جا رہا ہے یا نیچے جا رہا ہے یعنی یا تو انسانیت کے مراحل طے کر رہا ہے یا پھر مراحلِ حیوانی طے کر رہا ہے۔ یہ انسان قرآن کی ان آیات کا مصداق ہے کہ

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا○(۷)

یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ○(۸)

اب ذلّت کے ساتھ بندر بن جائیں......

یا پھر یہ انسان اعلیٰ علیین وملکوت اور عالم ربوبی کی طرف جا رہا ہے، اس وجہ سے یہاں ارتقاء ہے۔ یعنی بعض ایسے ہیں کہ ان سے صراطِ مستقیم چھوٹ گیا، صراطِ مستقیم پر گرفت مضبوط نہیں پڑی یا ان کے قدم مضبوط نہیں ہیں، جس طرح سے خود قرآن کا حکم ہے کہ

خُذُوا مَا آتَیْنَاکُمْ بِقُوَّۃٍ......(۹)

جو چیز ہم نے تمہیں دی ہے اسے پوری قوت سے پکڑ رکھو......

یعنی دین کو مضبوطی سے لو، دین کے اوپر بہت مضبوط گرفت ڈالو، اس لئے کہ اگر ذرا سی گرفت ڈھیلی پڑی تو نہ صرف یہ کہ اوپر نہیں جاؤ گے بلکہ تم رک بھی نہیں سکو گے اور انحطاط وزوال کا شکار ہو جاؤ گے، اس وجہ سے انسان اگر ارتقاء نہ کر رہا ہو تو حتماً زوال وانحطاط کی طرف جا رہا ہے، اگر انسان عبادتوں میں ارتقاء نہ کر رہا ہو تو زوال کر رہا ہے، علم میں ارتقاء نہیں کر رہا ہے تو انحطاط کی طرف جا رہا ہے اور اگر قرآن میں ارتقاء نہ کر رہا ہو تو پس حتماً زوال وانحطاط کی طرف جا رہا ہے، پہلے سے ہی یہ انسان اسفل سافلین میں ہے اور اسفل سافلین سے گر کر عالمِ حیوانی میں جا پہنچتا ہے یا عالم دیگر میں کہ جو انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ پس انسان کے اندر میادینِ ارتقاء فراواں ہیں، ان میادین میں ہمیشہ انسان حسِ ارتقاء کے ساتھ وارد ہو۔

۸) باطنِ قرآن عمیق ھے

ادبِ قرآن فہمی اور قرآنی شناسی یہ ہے کہ انسان ارتقاء کی حس لے کر اور ترقی کی صفت اپنے اندر ایجاد کر کے بارگاہِ قرآن میں وارد ہو چونکہ قرآن ارتقاء کا میدان ہے، ایسا میدان ہے کہ جس کے مرتبے ہیں یعنی قرآن کو آپ یوں کہہ لے کہ سیڑھیاں ہیں اور نہ ختم ہونے والی سیڑھیاں ہیں، جیسے زمین سے آسمان کی طرف ایک سیڑھی بنائی جائے اور اس کی آخری سیڑھی کہیں معلوم نہ ہو، مشخص نہ ہو کہ آخری سیڑھی کہاں ہے؟ اب یہ انسان کی ہمت پر منحصر ہے کہ انسان اس سیڑھی کے کون سے اسٹیپ (Step) پر پہنچا ہے، کونسے مرحلے، درجے اور مرتبے پر پہنچا ہے،

قرآن کے بارے میں ہے کہ

اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهْراً وَ بَطْناً وَ لِبَطْنِهِ بَطْناً اِلٰى سَبْعَةِ اَبْطُنٍ اَوْ اِلٰى سَبْعِيْنَ بَطْناً......

بیشک قرآن کیلئے ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر باطن کیلئے باطن ہے، یہاں تک کہ سات باطن ہیں یا ستر باطن ہیں......(۱۰)

سبعین کثرت کی طرف اشارہ ہے نہ کہ قرآن کے فقط ستر باطن ہیں یعنی قرآن عمیق ہے، امیر المومنین علیہ السلام نے بھی شناختِ قرآن و توصیفِ قرآن میں فرمایا ہے کہ

ظَاهِرُهُ أَنِيْقٌ وَ بَاطِنُهُ عَمِيْقٌ......(۱۱)

اس قرآن کا ظاہر بہت خوبصورت اور اس کا باطن بہت گہرا ہے......

واقعاً قرآن کا ظاہر بہت زیبا و خوبصورت ہے اور باطن انتہائی عمیق اور گہرا ہے مثلاً سمندر کی طرح ہے کہ انسان اس کی گہرائی میں جائے، غواصی کرے اور ارتقاء کرے، پس اگر ارتقاء نہ کرے اور فقط دہراتا رہے مثلاً قرآن کو حفظ کرلیا اور انہی الفاظ کو ساری عمر دہراتا رہا تو یہ ارتقاء نہیں ہے یا بعض معانی تک پہنچا ہے اور انہی معانی میں ساری عمر بسر کردے، سب کے سامنے بس انہی معانی کو ہمیشہ دہراتا رہے تو یہ بھی ارتقاء نہیں ہے، ارتقاء یہ ہے کہ انسان اس کے ظاہر سے باطن اور باطن سے آگے پہنچے، ارتقاء کے چند مرحلے ہیں، جیسے اشارہ کیا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے محمد ابن حنفیہ کو یہ جملہ بیان فرمایا کہ

اِقْرَأْ وَارْقَ......

قرآن پڑھیے اور ترقی کریں......

یعنی تم پڑھو لیکن اس قرأت میں تمہارے مدِ نظر ارتقاء بھی ہو، یوں نہیں ہے کہ ایک مطلب پڑھ کر یہ کہو کہ بس یہ آیہ تو میں نے حل کردی ہے جیسے بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت ہم نے کھنگال دی ہے، اس آیت کے اندر اب کوئی مطلب موجود نہیں ہے اور اب خالی از مطلب ہوگئی ہے چونکہ جو اس کے اندر تھا ہم نے لے لیا ہے، آپ کی خدمت میں اشارہ کیا تھا کہ بعض بزرگان نے اپنا تجربۂ شخصی نقل کیا ہے اور یہ تجربۂ شخصی تجربۂ نوعی بھی ہے یعنی یہ تجربہ دوسروں کے لئے بھی پیش آیا ہے۔

مرحوم آیت اللہ سید محسن الحکیم رضوان اللہ علیہ نے یہ واقعہ اپنی کتاب شرحِ کفایہ میں بیان کیا ہے، شرحِ کفایہ میں ''استعمالِ لفظ در اکثر از معنیٰ'' ایک بحث ہے، یہ عربی ادب و عربی لٹریچر

(Literature) کی ایک بحث ہے کہ آیا ہم ایک لفظ استعمال کر کے اس سے کئی معانی مراد لے سکتے ہیں یا نہیں، مثلاً فرض کر لیں کہ پانی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، پانی پانی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، مائع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، عزت و آبرو کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کہ مثلاً میں پانی پانی ہوگیا، اسی طرح سے پانی کا لفظ اردو میں بھی بہت سارے معانی میں استعمال ہوتا ہے تو آیا ہم ایک دفعہ لفظِ پانی استعمال کریں تو اس سے کئی معنیٰ مراد لیں یا نہیں؟ یعنی پانی کے جو بہت سارے معانی بنتے ہیں وہ سارے ایک ہی استعمال میں مراد لیں یعنی ہم یہ کہیں کہ میری یہ بھی مراد تھی، وہ بھی مراد تھی اور فلاں بھی مراد تھی۔

مثلاً لفظِ پیاس پانی کی پیاس میں بھی استعمال ہوتا ہے، علمی پیاس میں بھی استعمال ہوتا ہے، دنیا کی پیاس میں بھی استعمال ہوتا ہے، شہرت، شہوت، مال اور کمال کی پیاس میں بھی استعمال ہوتا ہے، اگر ایک انسان کہتا ہے کہ میں پیاسا ہوں اور یہ سارے معانی مراد لے یعنی علم کا بھی پیاسا ہوں، مال کا بھی پیاسا ہوں، شہرت کا بھی پیاسا ہوں، شہوت کا بھی پیاسا ہوں، نام و نمود کا بھی پیاسا ہوں اور کمال کا بھی پیاسا ہوں تو آیا ایک استعمال میں اتنے معانی مراد لئے جا سکتے ہیں یا نہیں، اس بحث میں مرحوم حکیمؒ اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہاں قرآن نے یہ کام کیا ہے، قرآن میں لفظ ایک استعمال ہوا ہے اور اس سے کئی معانی مراد ہیں، ظاہر بھی مراد ہے، باطن بھی مراد ہے، باطن کا باطن بھی مراد ہے، یوں تو نہیں ہے کہ یہ آیت کئی دفعہ استعمال کرے اور ہر استعمال میں ایک نیا معنیٰ مراد ہو، ایک ہی استعمال میں یہ سارے معانی مراد ہیں، یہ اپنے لحاظ سے ایک الگ ادبی بحث ہے۔

اس مناسبت سے انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے، آیت اللہ سید محسن الحکیم رضوان اللہ علیہ نجف کے اندر خود درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور بعض اسی درجے کے علماء بھی مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے بلکہ ہمارے بعض اساتیدِ بزرگوار کہ خدا ان پر رحمت کرے، حضرت آیت اللہ ستودہؒ کہ جن سے ہم نے یہی کتابِ کفایہ پڑھی یعنی علمِ اصول، جب وہ اسی مطلب پر پہنچے تو انہوں نے بیان کیا کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ ہم ایک بزرگ کے پاس پہنچے، پہلے دن پہنچے تو اس نے ہمارے سامنے ایک آیہ قرآن پڑھی اور اسکی تفسیر کی، یہ جماعتِ مجتہدین تھی جو اِن کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی نہ کہ معمولی اور مبتدی طلبہ، فرمایا کہ پہلے دن کی تفسیر سے ہم اش اش کر اٹھے کہ کتنی خوبصورت تفسیر کی ہے، دوسرے دن ہم پھر ان کی خدمت میں گئے تو پھر اسی آیت کو پڑھ کے اس کی تفسیر کی جو پہلے دن سے مختلف تھی اور ہم نے سمجھا کہ یہ مزید دقیق تر تفسیر تھی اور اس سے زیادہ لطف اندوز ہوئے، تیسرے دن پھر اسی آیت کی تیسری مختلف تفسیر کی اور اسی طرح تمیں دن ہم مسلسل ان کے پاس جاتے رہے اور وہ ایک ہی آیہ کی ہر روز نئی تفسیر کرتے تھے اور ہر روز پہلے سے زیادہ عمیق تر اور دقیق تر تفسیر فرماتے تھے، حضرت آیت اللہ ستودہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے آغائے حکیمؒ کو خط لکھا کہ آپ نے جس شخص کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ کون تھے؟ تو انہوں نے جواب میں نام بھی لکھا کہ یہ فلاں بزرگوار تھے۔

۹) تالیٔ قرآن ہی ارتقاء کرتا ہے

غرضیکہ اگر انسان کے اندر حسِ ارتقاء موجود ہو تو انسان قرآن کی ایک ہی آیہ کی گہرائی کے

اندر جا سکتا ہے، کبھی یہ نہ کہے کہ میں نے اس آیت میں جو مطلب تھا وہ سارا بیان کر دیا ہے اور کھنگال لیا ہے، آپ نے ایک حد تک یہ کام کیا ہے لیکن آگے بھی ارتقاء کریں، آگے بھی ذرا غور کریں کیونکہ اس آیت کے اندر عمقِ دیگر موجود ہے، پس قرآن میں ارتقاء کئی لحاظ سے مفروض ہے، یہ اتقاء کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے یعنی اب جو مبادین ارتقاءِ در قرآن ہیں کہ جن میں قاریِ قرآن و تالیِ قرآن کو تلاوت کرنا ہے۔

فصلِ ادبِ ہشتم کے حصّہ چہارم میں تحریر کیا تھا کہ تالیِ قرآن کس کو کہتے ہیں یعنی وہ انسان تالیِ قرآن شمار ہوتا ہے کہ جو ہمراہِ قرآن اور پیرویٔ قرآن میں ہو اور اس میں اور قرآن میں فاصلہ نہ ہو، قرآن اگر الفاظ کی حد تک ہے تو یہ الفاظِ قرآن کے ہمراہ ہو لیکن قرآن تو الفاظ سے آگے بھی ہے، قرآن الفاظ پر تو منحصر و موقوف نہیں ہے، الفاظ سے آگے معانیٔ قرآن ہیں، مفاہیمِ قرآن ہیں، تالی اگر الفاظ پر رک گیا ہے اور قرآن کے معانی تک نہیں پہنچا ہے تو یہ تو تالی نہ ہوا چونکہ تالی اس کو کہتے ہیں کہ جو متصل ہو، قرآن کے پیچھے بغیر فاصلے اور بغیر وقفے کے جا رہا ہو اور وہ دلِ انسان ہے کہ جو تالیِ قرآن ہے، قرآن معانی تک پہنچ گیا اور انسان فقط الفاظ پہ رکا ہوا ہے، کیوں؟ کیونکہ اس کو قرآن کے معانی نہیں آتے ہیں، یہ ان کی بات ہو رہی ہے کہ جو فقط تلاوتِ قرآن یعنی تلفظِ قرآن جانتے ہیں، قرأتِ لفظیٔ قرآن جانتے ہیں اور قرأتِ لفظی کا نام تلاوتِ قرآن رکھا ہوا ہے، تلاوتِ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ آپ قرآن کے پیچھے ہیں اور قرآن آگے جا رہا ہے، آپ متصل بہ قرآن جا رہے ہیں، جہاں جہاں قرآن ہے وہاں وہاں آپ جا رہے ہیں۔

قرآن الفاظ کی شکل میں آیا ہے اور آپ نے یہ الفاظ تلفظ کر لئے ہیں لیکن قرآن تو آگے بڑھ گیا ہے اور معانی تک جا پہنچا ہے چونکہ ان الفاظ کے معانی ہیں، اس شخص کو تو قرآن کے معانی نہیں آتے ہیں، قرآن کا ترجمہ نہیں آتا ہے پس یہ تالیٔ قرآن نہیں ہے، یہ فقط واقفِ قرآن ہے، قرآن آگے بڑھ رہا ہے، قرآن مترقی ہے، یہ واقف ہے اور ایک جگہ پر رکا ہوا ہے، اس نے جمود اختیار کر لیا ہے۔ آپ کس طرح سے اپنے آپ کو کہہ سکتے ہیں کہ میں تالی قرآن ہوں؟ قرآن معانی سے آگے بڑھ گیا اور حقائق تک جا پہنچا، ظاہر سے باطن تک جا پہنچا لیکن یہ ظاہر پر ہی رکا ہوا ہے، پس یہ تالیٔ قرآن نہیں ہے، تالیٔ قرآن یعنی متصل بہ قرآن، پیروئے قرآن، الغرض قاریٔ قرآن رکا ہوا ہو اور قرآن آگے بڑھ جائے تو یہ قاریِ قرآن و تالیِ قرآن نہیں ہے۔ لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تالیٔ قرآن ہیں، اہلبیت علیہم السلام تالیٔ قرآن ہیں اور اولیائے خدا علیہم السلام تالیٔ قرآن ہیں، اہلبیت علیہم السلام کے لئے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں اور قرآن میں کوئی فاصلہ نہیں ہے،

لَنْ يَّفْتَرِقَا......(۱۲)

یعنی جہاں قرآن گیا ہے یہ اس کے ہمراہ گئے ہیں، کسی جگہ بھی آپ اہلبیت علیہم السلام اور قرآن کے درمیان فاصلہ نہیں دیکھیں گے، اگر الفاظِ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام ہمراہ با قرآن ہیں، اگر معانیٔ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام ہمراہ بہ قرآن ہیں، حقائق و مصادیقِ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام اس کے ہمراہ ہیں، باطنِ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام ہمراہ ہیں، باطنِ باطنِ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام باطنِ باطنِ قرآن کے ہمراہ ہیں۔

آج کل تلاوت کا یہی معنیٰ ومفہوم لیا جاتا ہے یعنی بغیر ارتقاء کے قرأت کرنا یعنی ہم قدم ہونے کے بغیر اور پیرویٔ متصل کے بغیر اصلاً تلاوت ممکن نہیں ہے، متصور نہیں ہے لیکن ہم نے غلط نام رکھا ہوا ہے، ہم نے بہت سارے کاموں کے اچھے نام رکھے ہوئے ہیں اور یہ انسان کی عادت ہے کہ اپنا جو بھی کام کرے تو اس کو اچھا نام دیتا ہے۔ فرض کریں کہ ایک انسان شرک وکفر کہہ رہا ہے لیکن اس کا نام اس نے عقیدہ توحید وایمان رکھا ہوا ہے، شرک کا نام ایمان رکھا ہوا ہے یا بسا اوقات انسان لہو میں مشغول ہے اور اس کا نام اس نے مصروفیت ومشغولیت رکھا ہوا ہے اور اسی کا نام ممکن ہے کہ کوئی عبادت رکھا ہوا ہو درحالیکہ لہو محض ہے، ہم بعض لہو کو کہتے ہیں کہ یہ مستحبات ہیں اور بعض لہو کو کہتے ہیں کہ یہ خوش اخلاقی ہے اور انہی لہویات کو اپنے بہترین کارنامے میں شمار کرتے ہیں درحالیکہ یہ لہویاتِ محض ہیں، غلط کام، بے فائدہ کام، بے سود کام یا لایعنی کام ہیں۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام متقین کے اوصاف میں سے ایک یہ ذکر فرماتے ہیں کہ متقی اس کو کہتے ہیں کہ جو لایعنی کام نہیں کرتا ہے، جو لایعنی بات نہیں کرتا ہے، لایعنی یعنی بے فائدہ، یہ انسان ساری عمر لایعنی مسائل اور بے فائدہ کاموں میں بھی مشغول ہے اور ان کو اچھے اچھے نام بھی دیئے ہوئے ہیں، اس کے اوپر اچھے اچھے بینر بھی لٹکائے ہوئے ہیں، اس سے تو انسان تالیِ قرآن و قاریِ قرآن نہیں بن جاتا ہے، جس چیز کا بھی ہم نے کوئی مناسب نام نہیں رکھا ہوا ہے وہ درست نہیں ہے مثلاً قرآن آگے بڑھ گیا اور ہم پیچھے رکے ہوئے ہیں تو ہم اس کو کہتے ہیں کہ یہ تلاوتِ قرآن میں مشغول ہے، تلاوت تو ہمراہ جانے کو کہتے ہیں، پیرویٔ قرآن کو تلاوتِ قرآن کہتے ہیں،

تالیِ قرآن کی ارتقاء کرتا ہے

اب پیروی قرآن کہاں ہے؟ قرآن آگے بڑھ گیا اور آپ یہیں پہ رکے ہوئے ہیں، اسی طرح سے اقتداء بھی ہے مثلاً نمازِ جماعت میں کھڑے ہوں اور نیت بھی نہ کریں، جیسے امامِ جماعت نے تکبیر کہہ دی اور سورہ حمد بھی پڑھ دی، رکوع میں بھی چلا گیا، سجدے میں بھی چلا گیا لیکن یہ کھڑا ہوا ہے اور اپنے دوست کے ساتھ باتیں کر رہا ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نمازِ جماعت کھڑی ہو جاتی ہے اور کوئی شخص پیچھے موبائل پر اپنی باتیں کر رہا ہوتا ہے، یہ شخص جو موبائل کے ساتھ مشغول ہے تو یہ تو اقتداء نہیں کر رہا ہے، امام جماعت دوسری، تیسری رکعت میں پہنچ گیا ہے اور یہ ابھی فون پہ باتیں کر رہا ہے، اس کو اقتداء نہیں کہیں گے، بقول مولانا روم

هفت شهر عشق را عطار گشت

ما هنوز اندر خم یك کوچه ایم......(۱۳)

عطار عشق کی ساتوں وادیاں طے کر گئے اور ہم عشق کے پہلے شہر، پہلے کوچے اور پہلے موڑ میں حیران و سرگرداں کھڑے ہوئے ہیں اور پھر ہم یہ بھی کہیں کہ ہم بھی مثلاً عاشق ہیں، قرآن ہفت شہر و ہفتاد شہر طے کر گیا ہے اور ہم

ما هنوز اندر خم یك کوچه ایم

ہم اس کے صَرف و نحو اور ادبیات میں الجھے ہوئے ہیں، ناظرہ میں الجھے ہوئے ہیں یا ابھی حفظ میں الجھے ہوئے ہیں اور اس سے آگے نہیں بڑھے ہیں، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ بعض ایسے ہیں کہ قرآن ان کے حُنجرے سے نیچے نہیں اترا ہے، ان کے ذہن میں بھی نہیں گیا ہے،

تالیِ قرآن ہی اس کی اقتداء کرتا ہے

فقط گلے میں گھوم رہا ہے۔

پس اس سے پہلے کہ انسان ترقی کے مدارج طے کرے پہلے یہ دیکھ لے کہ تالی کہتے کس کو ہیں؟ اگر قرآن کی منزلیں ہیں اور مرتبے و درجات ہیں تو تالی اس وقت کہلائے گا کہ یہ بھی قرآن کے انہی مرتبوں میں ساتھ ساتھ جائے، ورنہ یہ رک جائے اور قرآن آگے بڑھ جائے تو یہ تالی نہیں ہے بلکہ واقفِ قرآن ہے کیونکہ اس نے فاصلہ ڈال دیا ہے، یہ قرآن کے بقول درحقیقت متولی از قرآن ہے یعنی قرآن سے دور ہے، اس نے قرآن سے منہ پھیر لیا ہے، اس نے قرآن کی نسبت پیٹھ پھیر لی ہے، یہ نابذِ قرآن ہے یعنی اس نے پشت کے پیچھے قرآن کو پھینک دیا ہے، مہجوریتِ قرآن اسی وجہ سے ہے، اس وقت قرآن کو گلوں میں گمانے والے بہت ہیں، قرآن کو کاغذ پر چھاپنے والے بہت ہیں، قرآن کو آنکھوں سے نگاہ کرنے والے بہت ہیں حتیٰ معانیٔ قرآن تک پہنچنے والے بھی بہت ہیں لیکن اس کے باوجود بھی قرآن خود مدعی ہے کہ قرآن ابھی مہجور ہے، مہجور کیوں ہے؟ چونکہ قرآن کے ہمراہ کوئی بھی نہیں آتا ہے، اکثریت تلفظ سے آگے بڑھتی ہی نہیں ہے، جہاں قرآن جاتا ہے اور لے جانا چاہتا ہے لوگ ان میادین میں نہیں جاتے ہیں۔ پس ارتقاء کیلئے انسان کو پہلے تالیِ قرآن بننا ہوگا ورنہ اس کے بغیر ارتقاء کا سفر ممکن نہیں ہے۔ اس فصل کے حصۂ دوم سے ارتقاء کے مختلف پہلو ذکر کئے جائیں گے۔

تالیِ قرآن ہی ارتقاء کرتا ہے

حوالہ جات

(۱)......(الانسان الکامل فی نهج البلاغة، الجزء ۱، صفحه ۱)(شرح نهج البلاغة-عبد الحمید بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسین بن أبی الحدید، أبو حامد، عز الدین، الجزء ۸، صفحه ۲۷۸)(شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحدید، الجزء ۱، صفحه ۲۴۱۰)(نهج السعادة-الشیخ المحمودی، الجزء ۸، صفحه ۱۹۸)(مسند الامام علیؑ)

(۲)... (المرشد الوجیز لقراء کتاب اللّٰه العزیز، الجزء ۲، صفحه ۳)(انسان و قرآن الجزء ۴، صفحه ۱۶)(کیف نقرأ القرآن)(الکافی - الکلینیؒ، الجزء ۲، صفحه ۶۱۵)(شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ)(نهج السعادة - الشیخ المحمودی، الجزء ۸، صفحه ۲۱۵)

(۳)... (البیان فی تفسیر القرآن، الجزء ۱، صفحه ۱۱)(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰه جوادی آملی مدظله(وسائل الشیعة-الفقیه المُحدّثِ الشیخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ، الجزء ۶، صفحه ۱۹۰)(بحار الأنوار - علامه محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحه ۱۹۷)

(۴)..... (الکافی-الکلینیؒ، الجزء ۱، صفحه ۳۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ طہ، آیہ ۱۱۴)

(۶).... (سورۂ مبارکہ تین، آیہ ۴،۵)

(۷)... (سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ ۴۴)

(۸)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۶۵)(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۶۶)

(۹)... (سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۶۳)(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۹۳)(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۷۱)

(۱۰)......(تفسير الميزان - العلامة الطباطبائیؒ)

(۱۱).....(تفسير الميزان - العلامة الطباطبائیؒ، الجزء ۱، صفحه ۶)(التفسير و المفسرون، الجزء ۳، صفحه ۲۰)(المرشد الوجيز لقراء كتاب اللّٰه العزيز)(باطن و تأويل قرآن)(غرر الحكم و درر الكلم، الجزء ۱، صفحه ۵۶)(ترجمه نهج البلاغه - انصاريان)(هداية العلم فی تنظيم غرر الحكم للامام علی بن أبی طالبؑ، الجزء ۱، صفحه ۱)

(۱۲) .(البيان فی تفسير القرآن، الجزء ۱، صفحه ۵)(مراجعات قرآنية)(بحار الأنوار-علامه مجلسیؒ، الجزء ۲، صفحه ۲۲۶)(مناقب أمير المؤمنين (ع) - محمد بن سليمان الكوفی، الجزء ۲، صفحه ۱۴۵)(مسند الامام علیؑ، الجزء ۳، صفحه ۱۹۵)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثين الحاج ميرزا حسين النوری الطبرسیؒ، الجزء ۷، صفحه ۲۵۵)(المسترشد -محمد بن جرير الطبری، الشيعی، الجزء ۱، صفحه ۳۷۹)(دعائم الاسلام، الجزء ۱، صفحه ۲۸)(حياة أمير المؤمنينؑ عن لسانه - الشيخ محمد محمديان، الجزء ۲، صفحه ۹۴)(وسائل الشيعة - الفقيه المُحَدِّثِ الشيخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملی، الجزء ۱، صفحه ۷۶)

(۱۳) ..(مولانا روم)

فصلِ ادبِ نہم

﴿ترقی﴾

(حصّہ دوم)

۱) قرآن میں ارتقاء کے مختلف پہلو

☆ارتقاء کا پہلا پہلو

(الف) پہلا درجہ

(ب) دوسرا درجہ

(ج) تیسرا درجہ

۲) ظہورِ ذات برائے ذات

۳) پوری کائنات تجلیٔ الٰہی

٤) خود بینی، خدا بینی میں مانع

٥) مشاہدۂ متکلم میں استغراق

٦) سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

۷) مقربین کیلئے امام صادق علیہ السلام کا فرمان

۸) عظمت کا اثر

۹) عبادات وتلاوتِ قرآن میں حلاوت

۱۰) توحیدِ خالص سے مراد

اب ان قرآنی میادین کی طرف آتے ہیں کہ جہاں پر تالیِ قرآن کو ہمراہِ قرآن آگے بڑھتے جانا ہے، البتہ ہر ایک کی تفصیل ہے لیکن ہم صرف فہرست وار ان مطالب کی طرف اشارہ کریں گے کہ قرآن کے اندر تالیِ قرآن کے ارتقاء کا ایک سلسلہ ہے کہ جہاں پر درجاتِ قرآن ہیں اورانسان کوآگے بڑھنا ہے۔

۱)قرآن میں ارتقاء کے مختلف پہلو

☆ارتقاء کاپہلا پہلو

☆وهو ان يترقى الى ان يسمع الكلام من الله لا من نفسه......

صدرالمتالٔہین" فرماتے ہیں کہ تالیٔ قرآن اتنی ترقی کرے کہ خود خدا سے کلام سنے نہ کہ کلامِ خدا کو کاغذ پہ پڑھے یا خود ہی قاری ہو اور خود ہی سامع ہو بلکہ یہ سامع ہو اور خدا سے سنے،

☆ وقد مر معنى سماع الكلام من الله مراراً، والغرض ههنا الاشارة الى درجات القرائة وهي ثلاث......

خدا سے کلام سننے سے مقصود قرأت وتلاوت کے تین درجے بیان کرنا ہے۔

(الف)پہلادرجہ

☆ ادناها ان يقدر العبد كأنه يقرأ على الله واقفاً بين يديه......

یعنی پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اس طرح پڑھے کہ بندہ خدا کے سامنے قرآن پڑھ رہا ہے،

☆ وهو ناظر اليه......

قرآن میں ارتقاء کے مختلف پہلو

اور ذاتِ خدا کلام سن رہی ہے،

☆ و مستمع منه......

انسان پڑھ رہا ہے، جیسے معلم کے سامنے شاگرد پڑھ رہا ہوتا ہے اور اس کی اپنی علامتیں ہوتی ہیں،

☆ فیکون حاله عند هذا التقدیر السؤال والتملق والتضرع و الابتهال.

جب انسان خدا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور تَمَلُّق وحمد وثنا شروع کرتا ہے تو گریہ وزاری شروع کر دیتا ہے اور اس کے اندر ابتہـــال یعنی خضوع وخشوع اور جھکاؤ آ جاتا ہے کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ میں کس کے سامنے پڑھ رہا ہوں۔

مثلاً جب بچہ اسکول سے گھر آتا ہے اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے سامنے اپنی کتاب پڑھتا ہے تو ٹیچر (Teacher) بن کر پڑھتا ہے، عموماً چھوٹے بچے چھوٹے بچوں کے سامنے ٹیچر بن کر پڑھتے ہیں لیکن یہی بچہ جب اسکول میں معلم کے سامنے پڑھتا ہے تو اتنا خاضع اور جھکا ہوا ہو جاتا ہے کہ اصلاً اس کو جرأت نہیں ہوتی ہے کہ یہ نگاہیں اٹھائے اور معلم کی نگاہوں میں نگاہ ڈال کر پڑھے، کیوں؟ کیونکہ اس کو یقین ہے کہ میرا کلام معلم سن رہا ہے لیکن ہم قرآن ایسے نہیں پڑھتے ہیں چونکہ ہمیں یقین ہے کہ خدا نہیں سن رہا، ہم تو مُردے کو سنا رہے ہیں نہ کہ خدا کو سنا رہے ہیں، ہم تو جس نے تبرک پکایا ہوا ہے، دیگ پکائی ہوئی ہے اس کو سنا رہے ہیں، مقابلہ ہو رہا ہے تو ہم ججز (Judges) کو سنا رہے ہیں، ہمارا قرآن جج صاحبان سن رہے ہیں نہ کہ خدا سن رہا ہے، اگر خدا

ہمارا کلام سنے تو ہم اس طرح سے پڑھیں گے کہ جیسے مقابلوں میں قرآن پڑھا جاتا ہے، پھر انسان ایسے پڑھتا ہے جیسے معلم کے سامنے بچہ پڑھتا ہے، بیٹھ کر بھی نہیں پڑھتا بلکہ کھڑے ہو کر پڑھتا ہے، مؤدب ہو کر، سر جھکا کر آداب کے ساتھ پڑھتا ہے۔

(ب) دوسرا درجہ

☆ الثانية: ان يشهد بقلبه كأن ربه يخاطبه بالطافه و يناجيه بانعامه و احسانه......

دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اس طرح سے خدا کے سامنے قرآن پڑھے کہ خدا اس سے مخاطب ہے، لیکن کس طرح سے مخاطب ہے؟ اپنے لطف وعنایت ورحمت وکرم کے ذریعے سے، خدا اپنی نعمتوں کے ذریعے، اپنے احسانات کے ذریعے انسان کے ساتھ مناجات کر رہا ہے۔ معلوم نہیں کہ ہمیں خدا کی نوازشیں، خدا کی شفقت، خدا کی مہربانی محسوس ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہے؟ ہمیں انسانوں کی نوازش بہت معلوم ہوتی ہے، اگر کوئی ہم سے ہاتھ ملائے تو اس ہاتھ کے اندر اپنائیت، رحمدلی اور ہمدردی محسوس کرتے ہیں، اس کی جلد سے محسوس کرتے ہیں، لمس کرتے ہیں کہ اس نے واقعاً دوستانہ ہاتھ ملایا ہے، بعض ہاتھ ملاتے ہیں تو انسان اس میں منافقت محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ اس کا دل نہیں چاہتا ہے کہ مجھ سے ہاتھ ملائے، بادلِ نخواستہ ہاتھ ملا رہا ہے یعنی وہ جلد خود لمس کرتی ہے کہ آدمی بادلِ نخواستہ ہاتھ ملا رہا ہے، یہ چیزیں انسان لمس کرتا ہے لیکن آیا انسان خدا کی نوازشیں اور

دوم درجہ

بندہ نوازیاں محسوس کرتے ہیں یا نہیں کرتے ہیں؟ غفلت اسی چیز کو کہتے ہیں، انسانوں کی نوازشیں محسوس ہوتی ہیں لیکن خدا کی نوازشیں محسوس نہیں ہوتیں۔

☆ ان یشهد بقلبه کأن ربه یخاطبه......

اپنے دل کے ساتھ مشاہدہ کرے کہ خدا اس سے مخاطب ہے اور اب خدا اپنے لطف و کرم کے ذریعے اس کے ساتھ مناجات کر رہا ہے، یہ مطلب مناجاتِ شعبانیہ میں بھی موجود ہے، ارتقاء کا ایک مرحلہ ایسا تھا کہ انسان خدا کے ساتھ مناجات کرتا ہے اور جب انسان مناجات میں بہت آگے چلا جاتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ خدا انسان کے ساتھ مناجات کرتا ہے یعنی نجوۂ خدا با انسان، مناجاتِ شعبانیہ میں ہے کہ اے خدا مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جن کے ساتھ تو نے نجوہ کیا ہے،

اِلٰهِیْ وَاجْعَلْنِیْ مِمَّنْ نَادَیْتَهٗ فَاَجَابَکَ وَلَا حَظْتَهٗ فَصَعِقَ لِجَلَالِکَ فَنَاجَیْتَهٗ سِرًّا......

میرے خدا! مجھے ان لوگوں میں رکھ جن کو تو نے پکارا تو انہوں نے جواب دیا، تو نے ان پر توجہ فرمائی تو انہوں نے تیرے جلال کا نعرہ لگایا، ہاں تو نے انہیں باطن میں پکارا......

جس کے ساتھ تو نے نجوہ کیا ہے، تو نے بات کی ہے اور وہ تیرا سننے والا تھا۔ انسان خدا کی مناجات سنے، یہ عبد کی طرف سے سفر ہے اور قرب اسی کو کہتے ہیں، عرفان اسی کو کہتے ہیں، عرفان گھوڑے دوڑانا، دیواریں دوڑانا، پانی پہ چلنا اور کرتب دکھانا نہیں ہے۔

☆ و یناجیه بانعامه و احسانه، فمقامه......

اس مقام پر کیا حالت طاری ہوتی ہے؟ مثلاً جب کوئی ہمارے سر پر دستِ نوازش پھیرتا ہے، دستِ شفقت پھیرتا ہے، کوئی بچے کو اپنی آغوش میں لیتا ہے تو اس وقت کیا حالت طاری ہوتی ہے؟

☆ **الحیاء والتعظیم و الاصغاء......**

انسان کے اوپر حیا طاری ہو جاتی ہے، انسان کا سراپا وجود حیائے محض بن جاتا ہے۔ سراپا تعظیم بن جاتا ہے۔ اصغاء یعنی توجہ، انسان کان دھرتا ہے اور توجہ محض بن جاتا ہے، جب خدا مخاطِب ہو اور انسان مخاطَب ہو تو غفلت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے،

☆ **و الفهم......**

اور انسان الطافِ الٰہیہ و رحمت الٰہیہ میں اور جو کچھ خدا کہہ رہا ہے اس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کو سمجھنے میں محو ہو جاتا ہے، اس وقت انسان کو اگر کاٹ بھی دیا جائے تو توجہ نہیں ہوتی ہے، جیسے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی نماز کے بارے میں واقعہ نقل کیا تھا اور حقیقتاً ایسے ہی ہے، امیر المومنین علیہ السلام کا مقام تو بہت ارجمند ہے بلکہ معمولی شہداء نے بھی جب راہِ خدا میں قربانیاں دی ہیں تو ان کے اوپر بھی یہ حالت طاری ہوئی ہے یا شہدائے کربلا میں سے غیرِ معصوم ایسے شہداء بھی تھے کہ انہوں نے گہرے زخم کھائے لیکن درد کا احساس تک نہیں تھا، نہ یہ کہ درد ہی نہ تھا، درد ہو رہا تھا لیکن وہ اس وقت محو دربارگاہِ خدا تھے اور جب انسان بارگاہِ خدا میں محو ہو تو نہ اپنی طرف توجہ ہوتی ہے اور نہ درد کی طرف۔

(ج)تیسرا درجه

☆ الثالثة: ان یری فی الکلام المتکلم......

تیسرا درجہ یہ ہے کہ کہ تالی قرآن اس طرح سے ارتقاء کرے کہ کلام کے اندر متکلم کو دیکھے،

☆ و فی الکلمات الصفات......

اور کلماتِ قرآن کے اندر صفات کو دیکھے نہ کہ الفاظ و معانی کو دیکھے کیونکہ یہی صفات ہیں کہ جو اس کے اندر منتقل ہوں گی، یہ کونسی صفات ہیں؟ یہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی صفات ہیں، ہر آیت کے اندر اور ہر لفظِ قرآن کے اندر ایک صفتِ خدا متجلی ہے، یہ اپنی جگہ پر قانون ہے، خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے اسماء و صفات کے ذریعے سے یہ ساری کائنات بنائی ہے، خود اسماء و صفات بھی تجلیاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں۔

۲)ظهورِ ذات برائے ذات

جیسا کہ اصحابِ معرفت بیان کرتے ہیں کہ تجلیٔ ذات بر ذات ہے یعنی ذات کا ظہور ذات کے لئے ہوا ہے، جس طرح سے قرآن میں ہے کہ

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ......(۱)

یعنی خداوند نے جبل کے لئے تجلی کی، اسی طرح سے تجلی ہر شے کیلئے ہے، ایک تجلی ذات کی خود ذات کیلئے ہے نہ کہ غیر کیلئے ہے یعنی تجلّی ذاتہٗ لذاتہ، ذات کی تجلی ذات کے لئے ہے، ظہورِ

ذات برائے خودِذات ہے چونکہ ذاتِ خدا اپنے آپ سے غافل نہیں ہے، اپنے آپ کو خدا نے نسیاً منسیا نہیں کیا ہوا ہے، انسان خود فراموش ہے لیکن خدا خود فراموش نہیں ہے، خدا کے بارے میں جہل، فراموشی، نیند اور اونگھ جیسی چیزیں صفاتِ سلبیہ میں سے ہیں، خدا کے ہاں غفلت نہیں ہے، خدا کی ذات اپنی ذات سے آگاہ ہے چونکہ ذاتِ حق اپنی ذات سے آگاہ ہے پس ذات ذات کے لئے ظاہر ہے، ذات ذات کے لئے متجلی ہے، ذات کی تجلی ذات پر ہوئی کہ جس سے اسماء وصفات پیدا ہوئے، اسمائے صفات وہ کثرت ہیں کہ جو تجلیاتِ خدا ہیں یا تجلی کا نتیجہ ہیں، پھر ہر اسم کے اوپر ایک تجلیٔ دیگر ہوتی ہے اور اس تجلی کے نتیجے میں بہت سارے افعال، بہت سارے موجودات اور بہت ساری مخلوقات پیدا ہوتی ہیں مثلاً فرشتے خدا کی ایک تجلی کا نتیجہ ہیں، اس کو عرفاء نے یعنی اہلِ معرفت نے نظم کی زبان میں بہت اچھا بیان کیا ہے، حافظ شیرازی نے بھی کہا ہے کہ یہ جو آپ کثرت دیکھتے ہیں، یہ جو آپ موجودات دیکھتے ہیں، یہ جو آپ زمین اور آسمان دیکھتے ہیں یہ سب کہاں سے پیدا ہوئے ہیں؟ انہوں نے قرآن کی آیت کا ترجمہ کیا ہے کہ

وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ٥ (٢)

اور ہمارا حکم پلک جھپکنے کی طرح کی ایک بات ہے۔

خدا کا ایک امر ہے، ایک تجلیٔ خدا ہے اور اس ایک تجلیٔ خدا سے یہ سب کچھ پیدا ہوا ہے۔

بقول حافظ شیرازی

این همه عکسِ می و نقشِ نگارین که نمود

ظہورِ ذات برائے ذات

یک فروغِ رُخِ ساقیست کہ در جام افتاد...... (۳)

یعنی یہ اتنی صورتیں جو آپ کو اوہام میں نظر آتی ہیں، یہ کیسے پیدا ہوئی ہیں؟ پہلے اپنے مقام پر بیان ہوا ہے کہ لفظِ ساقی علمِ عرفان کی اصطلاح میں خدا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رخِ ساقی ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کی ایک تجلی ہے ''کہ در جام افتاد''، اس جام میں ساقی کی ایک تجلی ہوئی ہے اور اتنی کثرت، اتنی مخلوقات اور اتنی ساری چیزیں وجود میں آئی ہیں، ملائکہ بھی ایک تجلی کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں، انسان بھی ایک تجلی کے نتیجے میں پیدا ہوئے، زمین اور آسمان بھی ایک تجلی کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔

۳) پوری کائنات تجلیٔ الٰہی

آیاتِ تدوینی اور آیاتِ تکوینی، موجوداتِ ملکوتی اور موجوداتِ ملکی یہ سب کے سب تجلیاتِ الٰہی ہیں اور ہر تجلی میں متجلی موجود ہے، انسان تجلیٔ آئینہ ہے اس لئے قرآن نے آیت استعمال کیا ہے، یہ آیات ہیں یعنی ایک لحاظ سے ان کا نام تجلیاں ہے اور ایک لحاظ سے آیات ہے، اس کو تجلی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ فاعل نے اس کے اندر جلوہ کیا ہے اور یہ فاعل کا ظہور ہے اور آیت اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ فعل، یہ موجود یا یہ مخلوق سوائے اپنے فاعل وسوائے اپنے خالق کے کسی اور چیز کی نشاندہی نہیں کرتی ہے۔

نابینا اور بینا یہیں پر مشخص ہوتے ہیں، اگر ہسپتال میں ایک ڈاکٹر کسی انسان کو دور

بٹھا کر اس کی ایک آنکھ پہ ہاتھ رکھ کر یہ کہے کہ سامنے لکھی ہوئی اے بی سی (ABC) پڑھو تو وہاں سے معائنہ کرا کے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ بینا اور نابینا کون ہے؟ ممکن ہے کہ انسان کی نگاہیں بالکل درست ہوں لیکن اسی انسان کو جب آئینے کے سامنے کھڑا کریں تو اس کو آئینے میں کچھ بھی نظر نہ آتا ہو لہٰذا یہ نابینا ہے، یہ جو قرآن نے فرمایا ہے کہ

لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَلٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ ۝ (۴)

درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

یعنی خدا نے ہمیں آئینوں کے سامنے کھڑا کیا ہوا ہے، تجلیوں کے سامنے کھڑا کیا ہوا ہے اور پھر اس کے بعد کہا تھا کہ

صُمٌّ بُکۡمٌ عُمۡیٌ...... (۵)

یہ سارے اندھے، بہرے اور گونگے ہیں، سارے نابینا ہیں لیکن نابینائی قلبی ہے، ان کی بصیرت نابینا ہے، آئینوں کے سامنے کھڑے ہیں لیکن انہیں آئینے کے اندر کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے، تجلیوں کے سامنے ان کو متجلی نظر نہیں آتا ہے، آیات کے سامنے ان کو خدا نظر نہیں آتا ہے، پس یہ سارے نابینا ہیں، بقول مولانا روم

چشم باز و گوش باز و این ذُکا

خیرہ ام در چشم بندیِ خدا ...... (۶)

پوری کائنات تجلی الٰہی

یہ خدا نے کیسی چشم بندی کر دی ہے؟ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ان کو کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے، کان کھلے ہوئے ہیں لیکن ان سے کچھ بھی نہیں سنتے ہیں یعنی صبح وشام تجلیاں دیکھتے ہیں لیکن انہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ سب عام لوگ نابینا ہیں اور امیر المومنین علیہ السلام بشریت میں بینا ترین انسان ہیں، بینا کون ہے؟ جس کو سب کچھ نظر آتا ہے اور حقیقت نظر آتی ہے،

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ......(۷)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا......

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَ بَعْدَهُ......(۸)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا، اس کے ساتھ بھی اور اس کے بعد بھی......

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ مَعَهُ......(۹)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس کے ساتھ خدا کو دیکھا......

جس کو ان تجلیوں کے اندر خدا نظر آتا ہے، یہ بینا ترین انسان ہے لہٰذا انسان رویئت کرے، ایک شخص نے پوچھا کہ آیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا

لَمْ أَكُنْ أَعْبُدُ رَبًّا لَمْ أَرَهُ......(۱۰)

میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی ہے جسے میں نے دیکھا نہ ہو......

مَا كُنْتُ لِأَعْبُدَ رَبًّا لَمْ أَرَهُ......(۱۱)

یعنی میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا کہ جسے دیکھا نہ ہو، لیکن میں نے اپنے رب کو بصیرت سے دیکھا ہے، نورِ ایمان سے دیکھا ہے۔ پس انسان کلام میں متکلم کو دیکھے اور کلمات کے اندر صفات کو دیکھے۔

٤) خود بینی، خدا بینی میں مانع

☆ فلا ینظر الی نفسه......

اپنے آپ کو نہ دیکھے یعنی ایسا نہ ہو کہ جب قرآن پڑھ رہا ہو تو بھی اپنا نفس نظر آرہا ہو، یہ خود خواہی وخود بینی ہے، خود بین خدا بین نہیں ہوسکتا ہے، خود خواہ خدا خواہ نہیں ہوسکتا ہے، خود طلب خدا طلب نہیں ہوسکتا ہے، خود پرست خدا پرست نہیں ہوسکتا ہے، جس کو قرآن پڑھتے ہوئے بھی خودی نظر آرہی ہو کہ میں کتنا اچھا قرآن پڑھ رہا ہوں! میں کتنی اچھی تلاوت کر رہا ہوں! میں کتنی اچھی تفسیر بیان کر رہا ہوں! میں قرآن سے متعلق کتنے اچھے مطالب بیان کر رہا ہوں! یہ قرآن کے اندر خود بینی ہے، پس اپنے آپ کو نہ دیکھے اور یہ بھی نہ دیکھے کہ میں اس وقت قرآن پڑھ رہا ہوں چونکہ اپنی طرف یہ ادنیٰ سی توجہ بھی انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے،

☆ ولا الی تعلق الانعام به من حیث انه منعم علیه......

اور یہ بھی نہ دیکھے کہ میرے اوپر خدا کی بڑی نعمتیں ہیں، یہ آخری مرتبے میں ہے، پہلے مرتبے میں تو دیکھے گا، وہ وسطی مرتبہ ہے، متوسط لوگوں کا مرتبہ ہے، عالی مقام ومقامِ فنا میں انسان نہ

خود کو دیکھتا ہے، نہ نعمتوں کو دیکھتا ہے اور نہ یہ دیکھتا ہے کہ میں منعم علیہ ہوں چونکہ اس صورت میں اس کو ساری نعمتیں نظر آئیں گی، اس صورت میں اس کو اپنی ذات اور خدا نظر نہیں آئے گا۔

۵)مشاہدۂ متکلم میں استغراق

☆ بل یکون مقصور الھم علی المتکلم......

اپنی ساری ہمت اور ارادہ و توجہ فقط متجلی کے اوپر گاڑ دے، ذاتِ خداوند تبارک و تعالیٰ کے اندر مبذول کر دے،

☆ موقوف الفکر علیہ......

اپنی ساری فکر کو فقط ذات کی رویت میں متمرکز اور جمع کر دے،

☆ کأنہ مستغرق بمشاھدۃ المتکلم عن غیرہ......

یعنی اس طرح سے دیکھے کہ یہ مشاہدۂ ذات میں، مشاہدۂ متکلم میں غرق ہو اور غیر سے غافل ہو گیا ہو، غیر سے قطعِ تعلق کر دیا ہو۔

پہلے بھی سابقہ آٹھویں ادب کی فصل میں بیان ہوا تھا کہ قرآن میں انسان کی ایک حالت تاثر ہے، تاثر کے نتیجے میں وجد ہے۔ وجد بھی اہلِ عرفان کی اصطلاح ہے نہ کہ شعبدہ بازوں کی کہ جو مرید باز لوگ ہوتے ہیں، جنہوں نے بنامِ تصوف و عرفان دکان بنائی ہوئی ہے، اس دکانِ عرفان کی بات نہیں ہو رہی ہے چونکہ عموماً ان دکانداروں کو مریدوں کے سامنے وجد آ جاتا ہے، ایک نیم نگاہ

سے ہر چیز دیکھ رہے ہوتے ہیں، ان کی نیم نگاہ نوٹوں پہ ہوتی ہے، جیب پہ ہوتی ہے، ان کے ہدیوں، شکرانوں اور تحفوں پہ ہوتی ہے لیکن بظاہر اپنے آپ پر حالتِ وجد طاری کی ہوئی ہوتی ہے وہ وجد نہیں ہے، وجدِ حقیقی وہ ہے کہ جو ہر ایک کا تجربۂ شخصی بھی ہے، ہر ایک پر یہ وجد طاری ہوتا ہے یعنی انسان کے پاس ایسے حالات و لحات آتے ہیں کہ جس میں انسان کاملاً غافل و بے خود ہو جاتا ہے یعنی فقط ایک نقطے پر توجہ ہوتی ہے اور باقی ساری دنیا سے رابطہ کٹ جاتا ہے حتیٰ اپنے بدن، اپنے وجود اور اپنی ہر چیز سے رابطہ کٹ جاتا ہے۔

جس طرح وہ انسان کہ جو عمیق مطالعہ کرنے والے اور واقعاً اہلِ تفکر و اہلِ تدبر ہیں ان پر مطالعہ کے وقت ایسی ہی حالت طاری ہوتی ہے نہ کہ جو بس اسٹاپ پہ مطالعہ کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ بعض اوقات جب ان کے اوپر شعر کا ورود ہوتا تھا یا تدبر و تفکر میں مشغول ہوتے تھے تو دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتے تھے، انہیں پتہ نہیں ہوتا تھا کہ دن ہے یا رات ہے، میرے گرد کوئی ہے یا نہیں ہے، کوئی مجھے بلا رہا ہے، مجھ سے پوچھ رہا ہے یا متوجہ کر رہا ہے اور یہی حالات دوسروں کے بھی ہیں اور سب سے بڑی بات امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کی گئی ہے کہ نماز کی حالت میں تیر نکال لیا گیا، یہی استغراق ہے، استغراق یعنی اس طرح سے غرق ہو جانا کہ باقی کسی چیز کی طرف توجہ نہ رہے، جس طرح سے انسان پانی میں غرق ہوتا ہے، غرق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان پانی میں اس طرح سے ڈوبا کہ اب باقی ساری دنیا سے ناتا کٹ گیا، ورنہ اگر رسی بھی انسان کے ہاتھ میں ہو، کشتی بھی انسان کے پاس ہو اور ساری چیزوں سے رابطہ ہو تو اس کو غرق ہونا نہیں کہتے

ہیں، غرق ہونا یعنی کسی چیز کے اندر راسخ ہو جانا، کسی چیز کے اندر محو ہو جانا، اس طرح سے محو ہو جانا کہ دوسری چیزوں سے انسان کا رابطہ کٹ جائے،

☆ **كانه مستغرق بمشاهدة المتكلم عن غيره.....**

یہ متکلم کو دیکھنے سے غرق ہوا ہے اور غیر سے اس کا رابطہ کٹ گیا ہے، یہی مناجاتِ شعبانیہ میں طلب کرتے ہیں کہ

اِلٰهِیْ هَبْ لِیْ کَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ......

میرے رب مجھے کمالِ انقطاع عطا فرما، یعنی مطلقاً غیر سے میرا رابطہ کاٹ کے فقط اپنی ذات کی طرف متوجہ فرما۔ غرق ہونے، محو ہونے اور فنا ہونے میں سب سے بڑا حاجب، سب سے بڑا حجاب خود انسان ہے، ہمیں خدا کیوں نظر نہیں آتا ہے؟ چونکہ ہم خود اپنے آپ کو نظر آتے ہیں، ہم ہر آئینے میں خود کو دیکھتے ہیں، خود پسندی اسی وجہ سے ہے، جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا، جیسے میں بول سکتا ہوں ایسے کوئی نہیں بول سکتا، جیسے میں پوچھتا ہوں ایسے کوئی نہیں پوچھتا، جیسے میں جواب دیتا ہوں ایسا کوئی جواب نہیں دیتا، جو میرا مقام ہے وہ کسی اور کا نہیں، جو میری طرف توجہ ہے وہ کسی اور کی طرف نہیں، ہم ہر چیز میں خود کو دیکھتے ہیں کیونکہ ہم خود حجاب ہیں، بعض اہلِ معرفت کے بقول

بَیْنِکَ وَ بَیْنِیْ اِنِّیْ یُنَازِعُنِیْ،

یعنی خدا کو خطاب کر کے کہہ رہے ہیں کہ اے پروردگار تیرے اور میرے درمیان فقط ایک

حجاب رہ گیا ہے اور وہ میں ہوں، میری انانیت ہے،

فَارْفَعْ بِفَضْلِکَ اِنِّیْ مِنَ الْبَیْنِ،

اب ایک لطف اور فرما یعنی اس حجاب کو، میری انانیت اور میری انیت کو بھی برطرف فرما کہ میں اپنے آپ کو نہ دیکھوں، میں خود بین نہ بنوں، خود بینی سب سے بڑا مانع ہے، انسان کے تکامل میں سب سے بڑا مانع خود بینی ہے، اس طرح انسان کبھی بھی تکامل نہیں کرسکتا ہے، خود بین غرور و حسد میں مبتلا ہوتا ہے، حسود ہوتا ہے، اگر خود بین نہ ہو تو انسان کے اندر حسد بھی پیدا نہیں ہوتا ہے، انسان کے اندر بہت ساری بیماریاں خود بینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں از جملہ محرومیت از مشاہدہ، محرومیت از رویئتِ خدا بھی خود بینی کی وجہ سے ہے، ہمیں تجلی میں متجلی نظر نہیں آتا ہے چونکہ تجلی میں بھی ہم اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

۶)سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

☆ و هذه درجة المقربين......

فرماتے ہیں کہ یہ مقربین کا درجہ ہے، یہ فنا پہ آجانا مقربین کا درجہ ہے،

☆ وما قبله فهو درجات اصحاب اليمين......

اور جو درجہ اس سے پہلے ہے یعنی خدا کی نعمتیں دیکھنا، خدا کو نعمتوں کے ساتھ دیکھنا اور اپنے آپ کو منعم علیہ دیکھنا وہ درجۂ ابرار اور اصحابِ یمین کا درجہ ہے، یہ تقسیم و درجہ بندی قرآنی ہے۔

سورۂ واقعہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کے جو درجات بیان کئے ہیں، ان درجات ومراتب کے اندر خداوند تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہیں کہ

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ٥ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ٥(۱۲)

اور سبقت کرنے والے تو سبقت کرنے والے ہی ہیں۔ وہی اللہ کی بارگاہ کے مقرب ہیں۔

کچھ مقربون ہیں، کچھ اصحاب یمین ہیں اور کچھ کو کہا کہ یہ اصحابِ شمال واصحابِ مشآمہ ہیں یعنی منحوس لوگ ہیں۔ انسانوں نے دنوں کو، پرندوں کو اور دوسری چیزوں کو منحوس سمجھا ہوا ہے درحالیکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ خود منحوس ہیں، مشآمہ یعنی شوم لوگ، اصحاب المشآمہ یعنی صاحبِ نحوست لوگ اور اصحابِ یمین یعنی صاحبِ یمن وبرکت، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو صاحبِ یمن وبرکت ہیں یعنی کچھ لوگ اپنے اعمالِ منحوس کی وجہ سے منحوس ونحس ہیں، اصحابِ مشآمہ واصحابِ شمال ہیں اور کچھ اصحابِ یمین ہیں یعنی ابرار ہیں اور کچھ مقربین ہیں، یہ قرآنی تقسیم بندی کے درجات ہیں، پہلا درجہ تھا کہ انسان اپنے آپ کو منعم علیہ دیکھے اور خدا کی نعمتوں کو دیکھے یہ درجۂ ابرار ہے یا درجۂ اصحابِ یمین ہے یعنی یہ متوسط درجہ ہے، ایک مقربین کا درجہ ہے، مقربین کون ہیں؟ قرآن میں اصحابِ یمین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ جنت میں جائیں گے اور جنت کی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ انہیں کون کونسی نعمتیں عطا ہوں گی، آغازِ سورۂ مبارکہ واقعہ میں ہے کہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ٥

سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ۝ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا ۝ وَّكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً ۝

جب قیامت برپا ہوگی۔ اوراس کے قائم ہونے میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ وہ الٹ پلٹ کردینے والی ہوگی۔ جب زمین کو زبردست جھٹکے لگیں گے۔ اور پہاڑ بالکل چور چور ہوجائیں گے۔ پھر ذرات بن کر منتشر ہوجائیں گے۔ اور تم تین گروہ ہوجاؤ گے۔

فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝

پھر داہنے ہاتھ والے اور کیا کہنا داہنے ہاتھ والوں کا۔

یہ اصحاب یمین ہیں یعنی اصحابِ میمنہ

وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۝

اور بائیں ہاتھ والے اور کیا پوچھنا ہے بائیں ہاتھ والوں کا۔

یہ شوم لوگوں کا گروہ ہے،

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۝

اور سبقت کرنے والے تو سبقت کرنے والے ہی ہیں۔

یعنی تیسرا گروہ سابقون کا ہے،

أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ۝

وہی اللہ کی بارگاہ کے مقرب ہیں۔

سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ○ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیۡنَ○ وَقَلِیۡلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیۡنَ○

نعمتوں بھری جنتوں میں ہوں گے۔ بہت سے لوگ اگلے لوگوں میں سے ہوں گے۔ اور کچھ آخر دور کے ہوں گے۔

یہ لوگ نعمتوں کے اندر ہوں گے، اصحاب یمین، اصحابِ میمنہ سب کے سب نعمتوں کے اندر ہوں گے، ان کیلئے یہ نعمتیں ہیں کہ

عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ○ مُّتَّکِئِیۡنَ عَلَیۡهَا مُتَقٰبِلِیۡنَ○

موتی اور یاقوت سے جڑے ہوئے تختوں پر۔ ایک دوسرے کے سامنے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔

ان کے بستر ایسے ہوں گے، ان کے سریر ایسے ہوں گے، پلنگ ان کے ایسے ہوں گے، چار پائیاں ایسی ہوں گی، کمرہ ایسا ہوگا، سردی گرمی میں ٹمپریچر ایسا ہوگا، یہ سارے نعمتوں کے اندر اور ایک آسائش کے ماحول میں ہوں گے،

یَطُوۡفُ عَلَیۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ○ بِاَکۡوَابٍ وَّاَبَارِیۡقَ وَکَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ○

ان کے گرد ہمیشہ نوجوان رہنے والے بچے گردش کر رہے ہوں گے۔ پیالے اور ٹونٹی دار کنٹر اور شراب کے جام لئے ہوئے۔

لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡهَا وَلَا یُنۡزِفُوۡنَ○ وَفَاکِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ○

جس سے نہ درد سر ہوگا نہ ہوش و حواس گم ہوں گے۔ اور ان کی پسند کے میوے لئے ہوں

سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

گے۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۝ وَحُورٌ عِينٌ ۝ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۝ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيمًا ۝

اوران پرندوں کا گوشت جن کی انہیں خواہش ہوگی۔اور کشادہ چشم حوریں ہوں گی۔جیسے سربستہ موتی۔یہ سب درحقیقت ان کے اعمال کی جزا اوراس کا انعام ہوگا۔وہاں نہ کوئی لغویات سنیں گے اور نہ گناہ کی باتیں۔

یعنی بہترین ماحول ہوگا اوراس میں لغویات ولایعنی باتیں نہیں ہوں گی،

اِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ۝

ہرطرف صرف سلام ہی سلام ہوگا۔

یعنی سلامتی ہی سلامتی ہوگی،امن ہی امن ہوگا،

وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ۝ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۝ وَّطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۝ وَّظِلٍّ مَّمْدُودٍ ۝ وَّمَاءٍ مَّسْكُوبٍ ۝ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ ۝ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ ۝ إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنْشَاءً ۝ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ۝ عُرُبًا أَتْرَابًا ۝ لِّأَصْحَابِ الْيَمِينِ ۝ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۝ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۝

اوردائیں طرف والے اصحاب! کیا کہنا ان اصحابِ یمین کا۔بے کانٹے کی بیر۔لدے گتھے ہوئے کیلے۔پھیلے ہوئے سائے۔جھرنے سے گرتے ہوئے پانی۔کثیر تعداد کے میووں کے درمیان

ہوں گے۔ جن کا سلسلہ نہ ختم ہوگا نہ ان پر کوئی روک ٹوک ہوگی۔ اور اونچے قسم کے گدے ہوں گے۔

بیشک ان حوروں کو ہم نے ایجاد کیا ہے۔ تو انہیں نت نئی بنایا ہے۔ یہ کنواریاں اور آپس میں ہمجولیاں ہوں گی۔ یہ سب اصحابِ یمین کے لئے ہے۔ جن کا ایک گروہ پہلے لوگوں کا ہے۔ اور ایک گروہ آخری لوگوں کا ہے۔

اور اصحابِ شمال کا محلِ وقوع کیا ہوگا؟ ان کی رہائش گاہ کیسی ہوگی؟ ان کے بارے میں فرمایا کہ

وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ o فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ o وَظِلٍّ مِّنْ يَحْمُومٍ o لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيمٍ o

اور بائیں ہاتھ والے تو ان کا کیا پوچھنا ہے۔ گرم گرم ہوا کھولتا ہوا پانی۔ کالے سیاہ دھوئیں کا سایہ۔ جو نہ ٹھنڈا ہو اور نہ اچھا لگے۔

یہ سخت ترین فضا میں ہوں گے،

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ o

یہ وہی لوگ ہیں جو پہلے بہت آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔

عیاش وہاں ہوں گے،

وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا أَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ o أَوَ آبَاؤُنَا الْأَوَّلُوْنَ o قُلْ اِنَّ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ o لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ o

اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کررہے تھے،اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے۔آپؐ کہہ دیجئے کہ اولین وآخرین سب کے سب ایک مقررہ دن کی وعدہ گاہ پر جمع کئے جائیں گے۔

اوراس طرح سے ان سب کے مقام وغیرہ بیان کرنے کے بعد پھر فرمایا کہ

فَأَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَo

پھر اگر مرنے والا مقربین میں سے ہے۔

اسی سورۂ واقعہ میں تینوں گروہوں کے مقامات،ان کی نعمتیں،عذاب اور سب کچھ بیان کرنے کے بعد آخر میں آیہ(۸۸) میں جا کر پھر مقربین کو استثنا کیا،مقربین نعمتوں میں نہیں ہوں گے۔اصحابِ یمین دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اصحابِ نعمت ہیں،منعم علیہ ہیں لیکن مقربین کیا ہیں،مقربین مافوقِ نعمت ہیں،

فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍo

یعنی یہ خود جنت ہوں گے،یہ خود ریحان ہوں گے،اصحابِ یمین جنت میں ہوں گے لیکن مقربین خود جنتِ نعیم ہیں،

وَأَمَّا اِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِo فَسَلَامٌ لَّکَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِo

اور اگر اصحابِ یمین میں سے ہے۔تو اصحاب یمین کی طرف سے تمہارے لئے سلام ہے۔

پس قرآن پڑھنے والے تالینِ قرآن کے بھی درجات ہیں۔ بسا اوقات جو قرآن پڑھ رہے ہیں وہ اصحابِ یمین ہیں یعنی اصحابِ نعمت ہیں لیکن مقربین جب قرآن پڑھتے ہیں تو ان کی نگاہ فقط ذاتِ خدا پر ہوتی ہے اسی لئے ان کو مقربین کہا گیا ہے، ان کو مقربین نہیں کہا گیا ہے کہ جو حوروں کے ساتھ باغوں میں ٹہل رہے ہوں گے، جو کھانے پینے میں مشغول ہوں گے، جن کا ایک طشت ختم ہوتا ہے تو دوسری ٹرے ان کے سامنے لاکر رکھیں گے کیونکہ ان کو تو فرصت نہیں ہے کہ خدا کی طرف توجہ کریں، یہ سارے اصحابِ یمین نعمتوں میں ہوں گے کیونکہ ان کے اعمال اچھے تھے لہذا ان اعمال کے نتیجے میں انہیں یہ ساری نعمتیں ملی ہیں، یہ خود ان کی اپنی زحمت اور کوشش ہے کہ جو آج نعمتوں کی صورت میں ظاہر ہوگی لیکن مقربین جو قربِ خدا رکھتے ہیں وہ قریب بہ خدا ہیں اور ان کا مقام ومنزلت ایسی ہے،

☆ **وما خرج عن هذا......**

اور جو نہ اصحاب یمین میں سے ہو، نہ مقربین میں سے ہو اور قرآن پڑھتا ہو،

☆ **فهو درجات الغافلين......**

یعنی جو انسان قرآن پڑھے اور اس قرآن کھولتے ہوئے خدا کی نعمتوں کی طرف توجہ نہ کرے یا پھر قرآن پڑھے اور اس قرآن میں مشاہدۂ ذاتِ خدا نہ کرے تو یہ غافل انسان ہے۔ یہ قاری اور تالی قرآن غافل قاری ہے اور اس کے بارے میں ہے کہ

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ ..... (۱۳)

كَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... (۱۴)

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... (۱۵)

یعنی بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے۔

۷)مقربین کیلئے امام صادق علیہ السلام کا فرمان

☆ و عن الدرجة الثالثة اخبر الامام ابو عبداللّٰه جعفر الصادق عليه السلام......

اور آخری مقام والوں یعنی مقربین کے مقام کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ

☆ فقال: والله لقد تجلى الله لخلقه فى كلامه، ولكنهم لايبصرون......

خدا کی قسم! خدا اپنے کلام کے اندر اپنی مخلوق کے لئے، خَلق کے لئے متجلی ہے لیکن خلق دیکھتے نہیں ہیں، کیوں نہیں دیکھتے ہیں؟ چونکہ خلق حجاب میں ہے مثلاً اس وقت ہمیں سورج نظر نہیں آتا ہے، سورج نظر نہیں آتا ہے تو کیا ہم یہ کہتے ہیں کہ سورج پردے میں ہے؟ جبکہ ہم کمرے کے اندر ہیں نہ کہ سورج پردے میں ہے، سورج تو فضا میں اپنے مقام پر ہے، سورج کو کوئی چیز بھی چھپا نہیں سکتی ہے لیکن ہمیں بہت ساری چیزیں چھپا لیتی ہیں، ایک محاورے میں کہتے ہیں کہ انگلی کے پیچھے سورج چھپانا، انسان اگر اپنی آنکھ کھول کے اس کے سامنے انگلی رکھے تو سورج نظر نہیں آتا ہے، آیا

مقربین کیلئے امام صادق علیہ السلام کا فرمان

انگلی سے سورج چھپ رہا ہے یا انگلی سے آپ نے آنکھ چھپائی ہے؟ آنکھ پردے میں ہے نہ کہ سورج پردے میں ہے، آنکھ انگلی جتنی ہے لہذا چھپ جاتی ہے، پس ہم حجابوں میں ہیں اور سب سے بڑا حجاب خودخواہی وخود بینی کا حجاب ہے، ہم اس خود بینی سے باہر نہیں آتے ہیں کہ ہمیں کچھ اور چیز بھی نظر آئے، کوئی دوسرا بھی نظر آئے، کوئی عالمِ ہستی نظر آئے، کوئی حقیقت نظر آئے، ہم خود کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں،

☆**وقد سألوه عن حالة......**

اور امام صادق علیہ السلام سے ہی پوچھا گیا،

☆ **لحقته في الصلوة حتى خرمغشياً عليه......**

جب امام صادق علیہ السلام کی نماز کے اندر ایک حالتِ مخصوص طاری ہوئی، ایک غشی کی حالت طاری ہوئی حتی کہ مدہوش ہوکر نماز میں گر گئے، خر مغشیاً یعنی امام صادق علیہ السلام گر گئے،

☆ **فلما سرى......**

اور جب اس حالت سے افاقہ ہوا تو بعد میں لوگوں نے آکر پوچھا،

☆ **عنه قيل له في ذلك ....**

آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ نماز میں ایسے کیوں ہوا؟

☆ **فقال عليه السلام: مازلت اردد هذه الاية......**

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اس آیہ کو اتنا تکرار کیا، مـازلـت اردد یعنی

میں اس کو مسلسل تکرار کرتا رہا۔ ظاہراً آیت یہ تھی،

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ٥

☆حتی سمعتهامن المتكلم بها......

حتیٰ کہ میں نے خود خدا سے اس آیت کو سنا۔ بسا اوقات انسان نماز کے اندر ایسی تلاوت کرتا ہے کہ خود پڑھتا ہے اور خدا کو سناتا ہے لیکن ایک نمازِ غافلانہ یہ ہے کہ انسان پڑھ رہا ہے اور مقتدیوں کو سنا رہا ہے، یہ جو خوب مخارج نکالتے ہیں، دوہرے دوہرے اور گاڑھے مخارج نکالتے ہیں، یہ اسپیکر آن کر کے متاثر کر رہے ہوتے ہیں کہ مقتدی سنیں اور محلے والے بھی سنیں، خدا کو سنانا مقصود بھی نہیں ہے چونکہ انسان جب خدا کے سامنے پڑھتا ہے تو پھر حالت اور ہو جاتی ہے جیسے مثال بھی دی تھی کہ معلم کے سامنے جب انسان پڑھتا ہے تو انسان کے اندر عاجزی آجاتی ہے، خضوع آجاتا ہے اور آواز خود ہی دھیمی ہو جاتی ہے، جب انسان بڑے کے سامنے، عظمت کے سامنے جاتا ہے تو آہستہ آہستہ آواز رک جاتی ہے اور انسان بول نہیں سکتا ہے۔

۸)عظمت کا اثر

قم میں ایک بہت ہی جالب اتفاق ہوا تھا کہ جب مقامِ معظمِ رہبری حضرت آیت اللہ خامنہ ای مدظلہ صدرِ مملکت تھے اور قم میں آئے تھے کہ جہاں ان کی طلابِ غیر ایرانی یعنی خارجی طلاب سے ایک نشست تھی، سارے طلابِ غیر ایرانی کو اکٹھا کیا گیا کہ جو اس وقت تھوڑے ہوتے تھے، آج

بہت زیادہ ہیں، اُس وقت ظاہراً سب کو ملا کر ڈیڑھ دو ہزار کی تعداد تھی۔

بہرکیف سب حسینیہ میں اکٹھے ہوئے اور وہاں پر آقا تشریف لائے۔جب وہ اسٹیج (Stage) پر بیٹھے تو مرکزِ جہانی نے سپاس نامہ پیش کرنے کیلئے پہلے سے کچھ طلاب کو آمادہ کیا ہوا تھا،ایک فرانسیسی طالب علم تھے کہ جو بعد میں محاذِ جنگ پہ شہید ہو گئے، وہ ایشیائی فرانسیسی نہیں تھے بلکہ وائٹ یورپین فرانسیسی تھے،ان کو اس وجہ سے کھڑا کیا گیا کہ یہ یورپ سے ہیں تو ان کے اندر ایک انفرادیت تھی، بہرکیف بہت پاکیزہ جوان طالب علم تھے،ان کی معصومیت اور پاکیزگی ان کے چہرے سے محسوس ہوتی تھی، ان کو انہوں نے فارسی میں سپاس نامہ دیا کہ پریذیڈنٹ(President) کے سامنے سپاس نامہ پڑھے، یہ آکر اسٹیج پر کھڑے ہوئے،ظاہر ہے کہ جس ملک سے آئے تھے وہاں تو ایسی شخصیات سے نہیں مل سکتے تھے،وہ اپنے وزیرِ داخلہ کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے چہ جائیکہ پریذیڈنٹ کو دیکھتے، یہ صرف ٹی وی پہ یا اخبارں میں دیکھتے ہیں اوراس طرح سے بالمُشافِہَہ ملنا ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہے اور خصوصاً پھرایک شخصیت کا تقدس وعظمت بھی ہو،ایک شخصیت کا پہلے سے ذہن بنا ہوا ہو اور انسان خود کو ناگہاں اس کے پہلو میں پائے تو حواس ٹھکانے نہیں رکھ سکتا ہے، واقعاً ایسا ہی ہوا، یہ بزرگوار اٹھ کر کھڑے ہوئے اورانہوں نے سپاس نامہ کی چند سطریں بیان کیں اور پھراس کے بعد رک گئے،ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی اور کوئی آواز نہیں آرہی تھی، جس نے سپاس نامہ لکھا تھا وہ پیچھے سے لقمے دے رہا تھا،وہ سمجھا کہ شاید پڑھ نہیں سکتے تھے یا کوئی مشکل پیش آگئی ہے، بہرکیف جب دو تین دفعہ اس نے دیکھا تا نا تو وہ بول ہی نہیں سکتے ہیں،

عظمت کا اثر

آخر کیا ہوا تھا؟ وہی خـر مغشیاً، وہ مدہوش ہوگیا تھا یعنی وہ جلوہ دیکھ کر، وہ روپ، مقام اور عظمت دیکھ کر اس کے دل پر اثر ہوا، آنکھیں کھلی ہوئی تھی اور مدہوش تھا، قریب تھا کہ وہ اسٹیج سے گر جائے، دو آدمیوں نے اٹھ کر اسے سنبھالا اور اسٹریچر (Stretcher) پر اٹھا کر حال (Hall) سے باہر لے گئے۔ بسا اوقات انسان جب کسی بھی عظمت کے سامنے جا کر واقع ہو تو اپنے آپ کو کھو بیٹھتا ہے۔ بے خودی اسی کو کہتے ہیں، لیکن جو کہے کہ یہ پریذیڈنٹ کیا ہے؟ میں تو ان سے زیادہ پڑھا ہوا ہوں، میرا نالین اس سے زیادہ قیمتی ہے، میرا جوتا ان سے زیادہ قیمتی ہے، میں نے ان سے زیادہ موٹا عمامہ باندھا ہوا ہے تو وہ ایسے متاثر نہیں ہوتا ہے۔

بہر حال جب امام صادق علیہ السلام کو افاقہ ہوا تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا تھا؟ فرمایا کہ میں نے اس آیت کو اتنا تکرار کیا حتیٰ کہ میں نے خود متکلم سے سننا شروع کر دیا یعنی بولنے میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آغاز میں نے کیا، خدائے حاضر کے سامنے عبادت شروع کی اور اتنا پڑھا کہ پھر خدا نے بولنا شروع کیا اور میں نے سننا شروع کیا، قرآن کی اس صورت میں انسان پر اثر ہوتا ہے یعنی اس وقت اس آیت کے ذریعے سے امام علیہ السلام پر خدا کی تجلی ہوئی،

☆ **فلم یثبت جسمی لمعاینة قدرته......**

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے جسم میں قدرتِ خدا کے ساتھ مواجہہ ہونے کی طاقت ختم ہوگئی، قدرتِ خدا کا سامنا کرنے کی طاقت ختم ہوگئی یعنی عبادت کی حالت میں وہ تجلی پُر ہیبت ہوئی کہ میرے جسم میں طاقت ختم ہوگئی اور جسم ناتواں ہوگیا، وہی حالت جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی

تھی۔

وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا......(۱۶)

اور موسیٰ بیہوش ہوکر گر پڑے......

۹)عبادات وتلاوتِ قرآن میں حلاوت

☆ و فی مثل هذه الدرجة يعظم الحلاوة ولذة المناجاة. ....

حلاوت بہت عظیم ہوجاتی ہے، عبادت کی لذت قابلِ توصیف نہیں رہ جاتی ہے، یہ وہ چیزیں ہیں کہ جو انسان بیان نہیں کرسکتا ہے، کس طرح سے بیان کرے کہ کیا لذت محسوس ہوتی ہے؟ اور وہ بھی مناجات کی لذت اور قرآن کی لذت۔ یہ مطلب کلامِ حضرت امام صادق علیہ السلام سے متخذ ہے کہ جب انسان ہر تجلی میں متجلی کو دیکھتا ہے تو اس وقت انسان کو قرآن اور عبادتوں کے اندر لذت و حلاوت محسوس ہوتی ہے،

☆ و لذلک قال بعض الحكماء: ....

بعض حکماء سے منقول ہے کہ انہوں نے یہ کہا کہ

☆ كنت اقرأ القرآن فلا اجد له حلاوة......

میں نے قرآن پڑھا لیکن کوئی لذت محسوس نہیں ہوئی، جیسے کہ اکثر کو لذت محسوس نہیں ہوتی ہے، فقط ثواب کے لئے پڑھتے ہیں، ثواب کا قرآن لذت نہیں دیتا ہے چونکہ لذت ساری ثواب میں

ہے لہٰذا خود قرآن میں نہیں ہے یعنی جس طرح سے مزدوروں کو لگا دیتے ہیں کہ آپ یہ کام کرو بعد میں تنخواہ دیں گے تو ساری لذت تنخواہ میں ہوتی ہے کام میں نہیں ہوتی ہے، کام انسان کو خستہ کرتا ہے، اجارے کا قرآن پڑھنا، اجارے کی عبادتیں انسان کو تھکا دیتی ہیں اور ان میں لذت نہیں ہوتی، بعض لوگ دوسروں کی اجارے کی نمازیں پڑھتے ہیں لیکن ہم اپنی اجارے کی نمازیں پڑھتے ہیں کہ یہ ملے گا اور وہ ملے گا۔ نمازِ شب پڑھتے ہیں تاکہ فقیر نہ ہو جائیں، یہ اجارے کی نماز ہے، انسان خود اپنی اجارے کی نمازیں پڑھ رہا ہے، اپنی نمازوں کا اپنے آپ کو ٹھیکہ دیا ہوا ہے کہ یہ نماز پڑھو تو تمہیں یہ ملے گا، ان نمازوں میں لذت نہیں ہے لہٰذا لذت امیر المومنین علیہ السلام کو محسوس ہوتی ہے، امام صادق علیہ السلام کو محسوس ہوتی ہے۔ بعض حکماء میں سے کسی نے کہا کہ میں قرآن پڑھتا تھا اور لذت محسوس نہیں ہوتی تھی،

☆ حتی تلوته......

حتیٰ کہ میں نے تلاوتِ قرآن کی یعنی تلاوتِ قلبی قرآن، قرأتِ قرآن سے تلاوتِ قرآن پر آیا یعنی پھر میں نے ارتقاء شروع کیا اور قرآن کی وہی منزلیں طے کیں،

☆ **كأني اسمعه من رسول الله صلى الله عليه و آله يتلوه على اصحابه......**

میں نے قرآن شروع کیا تو پہلے قرآن کے الفاظ کے پیچھے گیا، تلاوت یعنی پس رفتن، پیچھے جانا، پے گیری یعنی پیروی، انسان قرآن کا پیش رو نہ بنے بلکہ قرآن کا پیرو بنے، قرآن کے پیچھے چلنے

والا بنے، جس کو ہم عموماً تلفظِ سادہ میں پیرو کہتے ہیں، کہا کہ میں پیروئے قرآن ہوا، پیروئے قرآن اس طرح سے ہوا کہ پہلے الفاظِ قرآن تک پہنچا پھر معانیٔ قرآن تک پہنچا، پھر حقائقِ قرآن تک پہنچا اور پھر میں نے اس طرح سے قرآن کی پیروی کی کہ قرآن مجھے لے کر آگے بڑھتا رہا، قرآن نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ارتقاء کرواتا رہا حتیٰ کہ میں قرآن پڑھتا تھا لیکن اب میں نہیں پڑھتا تھا بلکہ اب میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن سنتا تھا، جب میں قرآن پڑھتا تھا تو اس طرح سے منظر نظر آتا تھا کہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے سامنے پڑھ رہے ہیں،

☆ **ثم رفعت الی مقام فوقه......**

پھر میں نے اس کے مافوق مقام پہ تلاوت کی یعنی پھر میں آگے بڑھا اور تلاوتِ قرآن کی،

☆ **فكنت اتلوه كأني اسمعه من جبرئيل عليه السلام يلقيه على رسول الله صلى الله عليه و آله......**

پھر مجھے یوں لگا کہ اب جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن پڑھ رہے ہیں یعنی جبرئیل علیہ السلام سے قرآن سنا،

☆ **ثم جاء بمنزلة اخرى......**

پھر اس کے بعد ایک منزلِ دیگر آئی

☆ **فانا الان اسمعه من المتكلم......**

یہ وہ مقام تھا کہ جہاں پر میں نے صاحبِ کلام سے قرآن سنا یعنی خداوند تبارک وتعالی

سے،

☆ فعندها وجدت لذة ونعيما لا اصبر عنه......

یہ وہ لذت تھی، یہ وہ ذوق اور نعمت تھی کہ جس سے میں کبھی بھی پیچھے نہیں رہ سکتا تھا یعنی صبر نہیں کرسکتا تھا کہ اس سے دور رہوں،

☆ و كذلک قال بعضهم......

بعض دیگر حکماء اور عرفاء نے یہ کہا کہ

☆ كابدت......

کابدت یعنی زحمت، تکلیف، مشقت، میں نے مشقت کی،

☆ القرآن عشرين سنة......

میں نے بیس سال قرآن میں محنت کی،

☆ و تنعمت به عشرين سنة......

اور میں بیس سال قرآن کی نعمت سے محظوظ ہوا، متنعم ہوا، میں نے قرآن سے لذت محسوس کی،

☆ وعند ذلک يكون العبد ممتثلا بقوله:......

اور یہاں پر اب انسان درحقیقت اس قول کا امتثال اور اطاعت کر رہا ہوتا ہے،

☆ ففروا الى الله......

کہ تم خدا کی طرف فرار کرو، آیہ قرآن میں ہے کہ

فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ .....(۱۷)

یہ سورۂ ذاریات میں ہے، یعنی اللہ کی طرف رجوع کرو، فرار الی اللہ یعنی انقطاع الی اللہ، تم ہجرت بسوئے خدا کرو یا نہج البلاغہ میں بھی ہے کہ

فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ،

تم خدا سے خدا کی طرف جاؤ یعنی ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے کی طرف جاؤ،

☆ ولقوله: ولا تجعلوا مع اللّٰه الها اخر..

اور یہاں انسان پر وہ مقام صدق کرتا ہے کہ

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ......(۱۸)

خبردار اپنے پروردگار کے ساتھ کوئی دوسرا خدا قرار نہ دینا......

یعنی خدا کے ساتھ کسی اور کو الہٰ نہ قرار دو، جس کی طرف بھی ہم توجہ کرتے ہیں وہ یہ نہ ہو کہ ہمارا الہٰ ہو،

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ......(۱۹)

کیا آپ نے وہ شخص دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟

جو چیز ہماری توجہ کا مرکز بن جائے وہ ہمارے لئے الہٰ ہے اور اکثر خود پرست، ہیں، اکثر کا الہٰ خود ہے، خواہشات الہٰ ہیں، ہمارا معبود ہماری خواہشات ہیں چونکہ ہماری ساری توجہ ان چیزوں کی

طرف ہے، یہ خود خدا بنا ہوا ہے اس لئے ہم خدا تک نہیں پہنچتے ہیں۔

۱۰)توحیدِ خالص سے مراد

☆ بل التوحید الخالص ان لا یری فی کل شیء الا اللّٰہ الواحد القھار.

توحیدِ خالص کیا ہے؟ توحیدِ عملی خالص کیا ہے؟ دید توحیدی کیا ہے؟ قرأت وتلاوتِ توحیدی کیا ہے؟ قرأتِ توحیدی و توحیدِ خالص یہ ہے کہ خدائے واحد کو دیکھیں اور وہ بھی وحدتِ قہاریٔ خدا یعنی وحدتِ غالبۂ خدا کو دیکھیں،

قُلْ اِنَّمَا اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ٥(۲۰)

آپؐ کہہ دیجئے: میں تو صرف تنبیہ کرنے والا ہوں اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو واحد، قہار ہے۔

یَوْمَ ھُمْ بٰارِزُوْنَ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْھُمْ شَیْءٌ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ ٥(۲۱)

جس دن سب نکل کر سامنے آجائیں گے اور خدا پر کوئی بات مخفی نہیں رہ جائے گی، آج کس کا ملک ہے بس خدا وحدہٗ قہار کا ملک ہے۔

جب یہ وحدت رونما ہوتی ہے تو ساری چیزیں چھپ جاتی ہیں یعنی وحدتِ قہارہ اور ایک وحدت وہ ہے جو کثرت کے ساتھ کثرت کو ختم نہیں کرتی اور کثرت کے ساتھ مل بیٹھتی ہے، جس طرح

توحیدِ خالص سے مراد

سے عموماً عامیانہ توحید یہ ہے کہ اس دنیا میں خدا بھی ہے، اوپر خدا ہے، نیچے خدا ہے، اِدھر خدا ہے کہ جس طرح سے مختلف موجودات دائیں بائیں ہیں لہٰذا کسی ایک سائیڈ (Side) میں خدا بھی ہے، یعنی خدا بھی ہے اور باقی سب بھی ہیں، ایک جگہ خدا کے لئے ہے کہ جو انسان کی دسترس سے باہر ہے، وہاں کوئی قبضہ نہیں کر سکا لہٰذا وہ خدا کے لئے چھوڑ دی ہے، کہیں فضاؤں میں اور آسمانوں میں خدا ہے، زمین پر کہیں بھی نہیں ہے یہ ایک توحید ہے یعنی خدا بھی ہے اور غیرِ خدا بھی ہے لیکن جب توحیدِ وحدتِ قہار، وحدتِ غالبہ ظہور کرے تو تمام کے تمام موجودات مغلوب ہو جاتے ہیں، چھپ جاتے ہیں، پنہاں ہو جاتے ہیں۔ اِس وقت جو ہمیں کثرت نظر آتی ہے یہ کیوں نظر آتی ہے؟ اس وجہ سے کہ ہم موحّدِ حقیقی نہیں ہیں، ہم وحدتِ خدا، توحیدِ خدا کے قائل ہیں لیکن نہ توحیدِ غالبہ وقہارہ کے بلکہ توحیدِ سازگار، توحیدِ جامع با کثرت، توحیدِ مجتمع با کثرت کے قائل ہیں ورنہ اگر ہم وحدتِ قہارہ کے قائل ہو جائیں گے یا اس تک پہنچ جائیں گے تو اس وقت ماسوا اللہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بقول شیخ سعدی

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست

بر عارفان جز خدا هیچ نیست...... (۲۲)

عقل نے ہمیں الجھایا ہوا ہے، پیچ وخم میں الجھایا ہوا ہے، ورنہ راستہ بہت سادہ سا اور بات بالکل سیدھی سی ہے، عرفان اسے کہتے ہیں کہ انسان وحدتِ قہارۂ خدا تک پہنچ جائے، مثلاً مرید کیا ہوتا ہے؟ بیعت کیا ہوتی ہے؟ خرقہ کیا ہوتا ہے؟ کرتب کیا ہوتا ہے؟ دیوار کیا ہوتی ہے؟ تا کہ اس کو

دوڑائے، زمین کیا ہے؟ تا کہ اس کو طے کرے اصلاً اس کیلئے "ہیچ نیست"۔

توان گفتن این با حقایق شناس

ولی خردہ گیرند اہل قیاس

حقیقت شناس کو تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ مدرسے والے اعتراض کرتے ہیں، یہ بات ان کو سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ

کہ پس آسمان و زمین چیستند

بنی آدم و دام و دد کیستند؟

پھر اگر خدا ہے اور کچھ بھی نہیں ہے تو یہ زمین و آسمان و بنی آدم اور یہ سب کیا ہیں؟

ہمہ ہر چہ ہستند از آن کمترند

کہ با ہستیش نام ہستی برند

یہ سب کچھ ہیں لیکن موجود نہیں ہیں، خدا کے مقابلے میں نہیں ہیں،

یہ اس ہستی کی وجہ سے موجود ہیں نہ کہ اس کے مقابلے میں موجود ہیں اور پھر اس مصرع میں اس شیخ اجل نے انتہا کر دی اور یہی مطلب بیان کر دیا جو یہاں توحیدِ خالص ہے کہ

☆ ان لا یری فی کل شیء الا اللہ الواحد القہار.......

چو سلطان عزت علم بر کشد

جہان سر بجیب عدم در کشد

توحیدِ خالص سے مراد

جب اسمِ عزیزِ خدا تجلی کرے گا، چونکہ ابھی سلطنت، سلطانِ خالق اور سلطانِ رازق سے منسوب اسماء کی ہے لیکن جب سلطانِ عزت اپنا علم برپا کرے گا تو ساری دنیا معدوم ہو جائے گی۔اسی کا نام قیامت ہے، عارف وہ ہوتا ہے کہ جو اس منظر کو ابھی دیکھ لے یعنی سلطانِ عزت و سلطانِ وحدتِ خدا و سلطانِ قہاریتِ خدا کو ابھی دیکھے، یعنی ابھی پرچم وحدتِ قہاریتِ خدا بلند ہے اور کچھ بھی نہیں ہے، یہ سب سراب ہے، جس طرح سے صحرائی سفر میں انسان دیکھتا ہے تو پانی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رہوتا ہے لیکن جب قریب جاتا ہے تو کچھ بھی نہیں ہوتا ہے، یہی کچھ ہوگا جب

فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَائَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ٥(٢٣)

تو ہم نے تمہارے پردوں کو اٹھا دیا اور اب تمہاری نگاہ بہت تیز ہوگئی ہے۔

تمہاری آنکھیں تیز ہو جائیں گی، آج نگاہیں کند ہیں، بصیرت سکس بائی سکس (6x6) نہیں ہے، آج اس کو عینک کی ضرورت ہے، آج ہر چیز نظر آتی ہے، یہ سارا سراب ہے لیکن جب انسان اس حقیقت تک پہنچے گا تو دیکھے گا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا، پھر یہ ساری کثرت کیا تھی؟

ہمہ ہر چہ ہستند از آن کمترند

کہ با ہستیش نام ہستی برند

جو بھی ہے، بالآخر ہے لیکن اسی کی تجلیاں ہیں اور یہ ساری چیزیں اس کے مقابلے میں نہیں ہے، یہ توحیدِ خالص ہے۔عارف اس کو کہتے ہیں کہ جو اس نقطے تک پہنچ جائے، عارف اس کو کہتے ہیں کہ جسے ہر چیز میں خدا نظر آئے، عارف اس کو کہتے ہیں کہ جو اس سارے جہان کو فقط تجلی دیکھے، عارف

اس کو کہتے ہیں کہ جو خود کو نہ دیکھے، عارف خود خواہ اور خود بین نہیں ہوتا ہے، عارف اصلاً کسی ملک کا نہیں ہوتا ہے۔ فقہاء قوم پرست ہو سکتے ہیں، نحوی قوم پرست ہو سکتے ہیں، سائنس دان قوم پرست ہو سکتے ہیں، فیلسوف بھی قوم پرست ہو سکتا ہے لیکن عارف کبھی بھی قوم پرست نہیں ہو سکتا، اصلاً عارف کو پرواہ نہیں ہے کہ وہ ایرانی ہے یا غیر ایرانی ہے؟ اصلاً عارف زمین کا نہیں ہے، عارف کا کہنا ہے کہ

من ملك بودم و فردوسِ برين جايم بود

آدم آورد درين دير خراب آبادم...... (۲۴)

اصلاً میں ادھر کا نہیں ہوں، میں یہاں پر مسافر ہوں، میں فرشتہ تھا، عرشِ بریں میرا مسکن تھا، اس خراب آباد میں مجھے آدم علیہ السلام لے آیا، وہ دانا کھایا اور یہاں تک پہنچا دیا، میں اصلاً اس علاقے کا نہیں ہوں۔ اگر ہم کسی اجنبی علاقے میں ہوں اور کوئی پوچھے کہ آغا کیا آپ یہاں کے رہنے والے ہو؟ کہتے ہیں نہیں یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں، اسی طرح سے کوئی پوچھے کہ کیا زمین کے ہو؟ کہیں گے نا بابا ہم زمین کے کہاں ہیں؟ ہم عرش بریں کے رہنے والے تھے۔

پس صدر المتالہین ؒ کے مطابق تالیِ قرآن ارتقاء کے ان درجات پر عمل پیرا ہو کر کمال کی لامتناہی منازل پر اپنے الٰہی سفر کو جاری رکھ سکتا ہے۔ اس فصل کے حصہ سوم میں ارتقاء کے مزید پہلو فہرست وار بیان کئے جائیں گے۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۴۳)

(۲)......(سورۂ مبارکہ قمر، آیہ ۵۰)

(۳)......(دیوان حافظ شیرازی، از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی، غزل ۱۱۱، صفحہ ۸۸)

(۴)......(سورۂ مبارکہ حج، آیہ ۴۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۸)(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۷)

(۶)......(مثنوی معنوی، بہ تصحیح: رینولد ا. نیکلسون، دفتر سوم، صفحہ ۳۸۷)

(۷)......(تفسیر المیزان - العلامة الطباطبائیؒ، بحث روائی)
(شرح نهج البلاغه - جعفری)(مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ، الجزء ۱۰، صفحه ۱۳۹)

(۸)......(مفاهیم القرآن الجزء السادس)

(۹)......(شرح نهج البلاغه - جعفری)

(۱۰)......(ارشاد القلوب، الجزء ۴۶، صفحه ۲)
(متشابه القرآن، الجزء ۱، صفحه ۱۱۶)(مختصر بصائر الدرجات - الحسن بن سلیمان الحلی، الجزء ۱، صفحه ۱۶۷)(مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة الله الشیخ علی النمازی، الجزء ۳، صفحه ۴۴۰)

(۱۱)......(أهل البیت فی تفاسیر أهل السنة)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ۱۱،۱۰)

(۱۳)......(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ)
(تفسیر القرآن الکریم - السید مصطفی الخمینیؒ، الجزء۲، صفحہ۱۸۹)
(بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسی "قدس اللّٰہ سرہ"، الجزء ۸۹، صفحہ۱۸۴)(مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازی، الجزء۸، صفحہ۲۶۱)(میزان الحکمة - الریشهری، الجزء۸، صفحہ۲۱۰)

(۱۴)......(فی رحاب القرآن)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء۴، صفحہ۲۵۰)
(سنن النبی الاکرم ﷺ)

(۱۵)......(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، الجزء۱۱، صفحہ۳۶۵)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۴۳)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ ذاریات، آیہ۵۰)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ۲۲)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ۴۳)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ ص، آیہ۶۵)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ۱۶)

(۲۲)..... (کلیات سعدی،بر اساس نسخه محمد علی فروغی، صفحه ۲۸۰)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ ق، آیہ۲۲)

(۲۴)......(دیوان حافظ شیرازی،از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامه محمد قزوینی،غزل ۳۱۷،صفحه ۲۲۷)

فصلِ ادبِ نہم

﴿ترقی﴾

(حصّہ سوم)

١) ارتقاء کا دوسرا پہلو

☆پہلا مرحلہ

☆دوسرا مرحلہ

☆تیسرا مرحلہ

٢) ارتقاء کا تیسرا پہلو

٣) ارتقاء کا چوتھا پہلو

٤) ارتقاء کا پانچواں پہلو

٥) ارتقاء کا چھٹا پہلو

☆پہلا مرحلہ

☆دوسرا مرحلہ

☆تیسرا مرحلہ

٦) ارتقاء کا ساتواں پہلو

٧) ارتقاء کا آٹھواں پہلو

٨) ارتقاء کا نواں پہلو

قرآن میں ارتقاء کے متعدد پہلو ہیں کہ جن میں سے ایک پہلو اور اس کے درجات کی وضاحت اس فصل کے حصہ دوم میں کی گئی ہے، ذیل میں ارتقاء کے مزید پہلو مختصر وضاحت کے ساتھ فہرست وار درج کئے جا رہے ہیں۔

۱) ارتقاء کا دوسرا پہلو

☆پہلا مرحلہ

ترقی کے دوسرے پہلو کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان قرأتِ لسانیٔ قرآن کی حد تک آئے لیکن اسی میں نہ رک جائے کہ ساری عمر قرأتِ لسانیٔ قرآن میں بسر کر دے، اگر قاریٔ قرآن بن گیا مثلاً ناظرہٗ قرآن پڑھ لیتا ہے، تلفظِ قرآن ادا کر لیتا ہے، حروفِ قرآن کو اچھے طریقے سے یا جس طریقے سے بھی ادا کر لیتا ہے تو یہ پہلا قدم ہے، یہ مکمل ارتقاء نہیں ہے، پہلی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ کر یہ خیال نہ کرو کہ ارتقاء حاصل ہو گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ ساری عمر اسی سیڑھی پر بسر کر دو، اگر آپ کو چھت پہ جانا ہے اور سیڑھی لگی ہوئی ہے لیکن پہلی سیڑھی پر ہی دن بھر بیٹھ کر آپ یہ کہیں کہ میں اس سیڑھی کے ذریعے چھت پر جانا چاہتا ہوں، اگر آپ سیڑھی کے ذریعے چھت پر جانا چاہتے ہیں تو ابھی آپ پہلی سیڑھی پر پہنچے ہیں، پہلی سیڑھی اس لئے ہے کہ آپ کو دوسرے سیڑھی کے قابل بنائے، پہلی سیڑھی ہوتی ہی دوسری سیڑھی کے لئے ہے، پہلی سیڑھی چھت کے لئے نہیں ہوتی ہے، پہلی سیڑھی دوسری سیڑھی کا مقدمہ ہے لہٰذا اب آپ دوسرے درجے پر قدم رکھیں۔

پس پہلا مرتبہ قرأتِ لسانیٔ قرآن ہے یعنی زبان سے قرآن کو پڑھنا،

اِقْرَأْ وَارْقَ......(۱)

قرآن پڑھیے اور ترقی کریں......

یعنی پڑھو پھر آگے بڑھو، قرأتِ قرآن یعنی جو کام قاری کرتے ہیں، یہ رائج طریقہ قرأت ہے، جس کو پڑھنے والے اہلِ تجوید، اہلِ صوت واہلِ قرأت کہلاتے ہیں، قرأت کا رائج نام ترتیل پڑ گیا ہے، ترتیل یا صوت سے پڑھنا رائج قرأتِ قرآن ہے۔ اب ہم آگے کہاں بڑھیں؟

☆دوسرا مرحلہ

دوسرا مرحلہ تدبر و فہم در معانیٔ قرآن ہے، قرأتِ لسانی سے فہمِ معانی کی طرف ارتقاء کریں، ساری عمر اسی پہلی سیڑھی پر بسر نہ کریں ورنہ تالیِ قرآن نہیں سمجھا جائے گا چونکہ قرآن الفاظ سے معانی پر آ گیا ہے لہذا تالی بھی ساتھ ساتھ آئے، تالی کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے پیچھے آئے اور متصل آئے پس دوسرا مرحلہ فہمِ معانیٔ قرآن ہے، یہ دوسرا مرحلہ مفسرین نے طے کیا ہے یعنی قرأتِ لسانی سے معانی و مفاہیمِ قرآن کی طرف آئے ہیں۔ ساری عمر اسی میں بھی بسر نہ کردیں کہ ہم قرأت سے تفسیر تک آ گئے تو مقصود حاصل ہو گیا، ساری عمر اسی دوسری سیڑھی پر بیٹھے رہے تو پھر بھی تالیِ قرآن نہیں ہیں، فرق نہیں پڑتا ہے کہ ایک آدمی صبح سے پہلی سیڑھی پر بیٹھا ہوا ہے اور دوسرا صبح سے دوسری سیڑھی پر بیٹھا ہوا ہے اور دوسرا یہ فخر کرے کہ میں مقصد تک پہنچ گیا ہوں اور دوسرا نہیں پہنچا ہے۔ دونوں منزل تک نہیں پہنچے ہیں کیونکہ وہ پہلی سیڑھی پہ بیٹھا ہوا ہے اور آپ دوسری سیڑھی پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن مقصود تک

کوئی بھی نہیں پہنچا ہے، اگر مقصد تک پہنچنا ہے تو ساری سیڑھیاں طے کرنی ہوں گی، جس طرح سے پہلے قرأت سے معانی تک آئیں ہیں لہٰذا اب معانی سے ذرا آگے بھی بڑھو، معانی سے آگے کیا ہے؟

☆تیسرا مرحلہ

☆تیسرا مرحلہ

اس پہلو کا تیسرا مرحلہ تاثرِ قلبی ہے کہ جس کی آٹھویں ادب کی فصل میں بحث ہوئی ہے، تاثرِ قلبی کیلئے خلاصتاً یہ کہیں کہ انسان جب الفاظ سے معانی تک پہنچتا ہے، معارفِ و معالمِ قرآن تک پہنچتا ہے تو قرآنی آیات اور ان کے مضامین و معارف انسان کے دل کے اوپر تاثیر کریں، انسان کا دل متاثر ہو، قبول کرے، کس طرح سے قبول کرے؟ نہ اس طرح سے کہ انسان قرآن کی تصدیق کرے یعنی ساتھ ساتھ سر دھنتا جائے، جیسا کہ ایک آدمی تقریر کر رہا ہوتا ہے اور سامنے بیٹھے ہوئے سر ہلا رہے ہوتے ہیں، تاثر سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس طرح متاثر ہو رہے ہیں، متاثر ہونا عام اردو میں اسی لئے استعمال ہوتا ہے کہ ایک آدمی نے کوئی بات کی ہے اور دوسرے اس سے بہت متاثر ہوئے، اس کی علمیت سے بہت متاثر ہوئے، اس کی خطابت سے بہت متاثر ہوئے، اس کے بیانات سے بہت متاثر ہوئے، یہ متاثر ہونا نہیں ہے، متاثر ہونے سے مراد یہ ہے کہ قرآنی آیات اور قرآنی مضامین انسان کی صفات بن جائیں، انسان کا خُلق بن جائیں، قرآن صفاتِ انسان میں بدل جائے، پس الفاظ سے معانی تک آئے اور معانی سے تاثر تک آئے یعنی تاثرِ قلبی تک، زبان کا کام پڑھنا ہے، ذہن کا کام سمجھنا ہے اور دل کا کام متصف ہونا ہے یعنی انسان قرآنی صفات سے

متصف ہو، قرآنی اخلاق سے متخلق ہو، ادبِ قرآن سے متادب و مؤدب ہو، تہذیبِ قرآن سے مہذب ہو، قرآن انسان کی صفتِ راسخ بن جائے، مَلَکَہ انسان بن جائے، اخلاقِ انسان بن جائے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ......(۲)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق قرآن تھا، پس انسان قرأتِ لسانی سے فہمِ معانی اور فہمِ معانی سے تاثرِ قلبی تک آئے کہ ہر ایک کا اپنا ایک معنیٰ ہے، ہر ایک اپنی جگہ ارتقاء کا ایک میدان ہے۔

۲) ارتقاء کا تیسرا پہلو

ایک میدانِ ارتقائے دیگر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان الفاظ کی مدد سے معانیٔ قرآنی تک جائے اور معانیٔ قرآن سے حقائقِ قرآن کی طرف جائے یعنی قرآن کے الفاظ کے پیچھے معانی ہیں اور معانی کے پیچھے حقائق ہیں تو انسان ان حقائق تک بھی پہنچے یہ بھی ایک میدانِ ارتقاء ہے، یہ نہ ہو کہ معانی پر ہی رک جائے جیسے اشارہ کیا تھا کہ زمخشری کی طرح معانی پر رک جائیں، بہت ساری تفاسیر ہیں کہ جن کے لکھنے والوں کا نام مفسر ہے لیکن انہوں نے تفسیر نہیں کی ہے فقط الفاظ، قواعد، نحو، صرف اور ادبیات وغیرہ پر رکے ہوئے ہیں، جیسے قاریانِ قرآن فقط قرأتِ لسانی پہ رکے ہوئے ہیں اور ساری عمر اسی میں بسر کر دیتے ہیں، یہ ارتقاء نہیں ہے، آپ معانی تک آئے ہیں تو فقط معانی پر ہی نہ رک جائیں بلکہ اب معانی سے آگے حقائقِ قرآن تک آئیں، حقائق کی دنیا میں قرآن کا اپنا ایک

نظام ہے، قرآن کی اپنی ایک دنیا ہے، قرآن کا اپنا ایک عالم ہے، معانی انسان کو اس قرآنی عالم میں پہنچا دیں مثلاً قرآنی معاشرہ، قرآنی انسان، قرآنی حیات، قرآنی ماحول، قرآنی اعتقاد، قرآنی دین، قرآنی فضیلتیں، قرآنی فکر اور قرآنی اخلاق یہ ساری قرآنی دنیا ہے کہ جس کے اندر انسان اتر جائے۔

۳) ارتقاء کا چوتھا پہلو

انسان کے ارتقاء کے لئے ایک چوتھا پہلو بھی موجود ہے، یہ ایک ہی جیسے میدان نہیں ہیں یعنی ان کے درمیان طوٗلیت نہیں ہے، ان میدانوں میں مختلف پہلو ہیں، ارتقاء کا ایک پہلو وہ تھا کہ جس میں تین مرتبے ذکر کیے ہیں یعنی قرأتِ لسانی سے فہمِ معانی اور فہمِ معانی سے تاثرِ قلبی، ارتقاء کے دوسرے پہلو میں یہ ہے کہ انسان الفاظ سے معانی اور معانی سے حقائق تک پہنچے، ارتقاء کا تیسرا پہلو قرآن کے اندر مختلف پہلوؤں سے موجود ہے اور روایات میں بھی ہے، روایت میں ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کو ذووجوہ نازل کیا ہے، یعنی قرآن کی مختلف وُجوہ ہیں۔

روایاتِ شناختِ قرآن میں بھی یہی تعبیر آئی ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو ذوالوجوہ نازل کیا ہے یعنی قرآن کے کئی پہلو ہیں، قرآن انسان کے سامنے کئی دروازے کھولتا ہے نہ کہ ایک در اور وہ بھی تنگ، اگر انسان داخل ہو تو واقعاً کئی دروازے ہیں، جس طرح کعبہ میں جائیں تو مسجد الحرام کے متعدد دروازے ہیں اور ہر دروازے کا ایک خاص نام ہے اور انسان ان سارے دروازوں سے جائے تو الگ الگ منظر دکھائی دیتے ہیں، اسی طرح سے قرآن مجید کے مختلف پہلو اور

مختلف بود ہیں، ہر پہلو سے انسان کو قرآن کی طرف جانا چاہئے، یہ مطلب اس لئے عرض ہورہا ہے کہ ارتقاء میں دخیل ہے، بعض اوقات انسان قرآن کے ایک ہی پہلو سے سروکار رکھتا ہے اور اگر ارتقاء و ترقی کرے بھی تو اسی ایک پہلو سے ترقی کرتا ہے اور دیگر پہلوؤں سے غافل ہوتا ہے، انسان ہر پہلو سے قرآن کے اندر ارتقاء کرے۔

اگرچہ قرآن مجید کے مختلف پہلو ہیں لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں، پہلے دن جو بات سن لی اسی کو پلے باندھ لیتے ہیں لہٰذا یہ ارتقاء نہیں کرسکتے ہیں، لکیر کا فقیر کبھی ارتقاء نہیں کرسکتا ہے، کبھی بھی اس طرح کا فقیر نہ بنیں کہ دوسرے افراد ہمارے لئے لائن کھینچ دیں اور ہم ساری عمر اسی لائن کے ہی پابند ہوجائیں، ممکن ہیں کہ وہ ہمارے آباء ہوں، بزرگانِ علمی ہوں، بزرگانِ مذہبی ہوں، بزرگانِ اجتماعی ہوں یا بزرگانِ سیاسی ہوں، جو بھی بزرگان ہوں وہ ایک خط کھینچ دیں اور ہم اسی کے فقیر بن جائیں، مقلدِ محض بن جائیں، ان کا کہا پتھر پہ لکیر ہو اور ہم لکیر کے فقیر ہوں۔ اب کوئی یہ نہ سوچے کہ یہ زمین پر پڑے ہوئے کسی پتھر پہ لکیر ہے، پتھر پہ لکیر یعنی ان مٹ نقوش، اگر کسی استاد کی زبان سے ایک مطلب نکل گیا ہے تو وہ پتھر پہ لکیر نہیں ہے بلکہ اس سے بالاتر مطالب بھی موجود ہیں،

وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌO (۳)

اور ہر صاحبِ علم سے برتر ایک صاحبِ علم ہوتا ہے۔

خدا نے ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک بڑا عالم بنا کر رکھا ہوا ہے، آپ ایک کے پاس گئے

ہیں، کسی دوسرے کے پاس بھی جائیں اور دیکھیں کہ شاید وہ آپ کے لئے مطلب دیگر بیان کر رہا ہو، پس ان کے لئے راہنمائی خوب ہے لیکن کسی کی بات کو حرفِ آخر نہ سمجھے کہ ان کا کہنا یہ ہے، ممکن ہے کہ اس کے علاوہ بھی نظریات واقوال ہوں، ممکن ہے کہ ان سے عمیق تر نکتہ بھی موجود ہو، ہمیشہ ایسا نہ سوچیں کہ یہ غلط ہے اور یہ صحیح ہے یعنی اگر وہ صحیح ہے تو ان کی بات غلط ہے۔ بعض اوقات ہوتا ہے کہ ایک آدمی سطحی بات کرتا ہے اور یہ سطحی بات بھی ٹھیک بات ہے لیکن دوسرا ذرا عمیق تر بات کرتا ہے تو وہ عمیق بھی ٹھیک بات ہے، ایک بہت سطحی اور سرسری بات کرتا ہے، دوسرا ذرا دقیق بات کرتا ہے اور تیسرا دقیق تر بات کرتا ہے لیکن تینوں درست ہیں چونکہ ایک سطحی حد تک درست ہے دوسرا دقیق حد تک درست ہے اور تیسری بات دقیق تر حد تک درست ہے۔ جس طرح آپ تجزیہ کرتے ہیں مثلاً ڈاکٹر سے پوچھتے ہیں کہ یہ بیماری کیوں ہوئی؟ یہ حادثہ کیوں رونما ہوا؟ اور وہ آپ کو ایک سرسری سی نظر بتا دیتا ہے تو اس نے درست کہا ہے لیکن سطحی بات کی ہے، دوسرے ڈاکٹر کے پاس جائیں تو وہ اسی بات کو ذرا عمیق تر کر کے بیان کر رہا ہے لہٰذا اس نے بھی درست کہا ہے، تیسرے ڈاکٹر کے پاس جائیں تو وہ اس سے بھی زیادہ دقیق تر بات کرے گا لیکن اس نے بھی درست کہا ہے، یہ باتیں ایک دوسرے کو نقض نہیں کرتی ہیں، رد نہیں کرتی ہیں۔

پس قرآن کی ہر آیت اپنے اندر معانی کا عظیم سمندر لئے ہوئے ہے ضروری نہیں ہے کہ اگر کسی نے ایک آیت کی تفسیر کر دی ہے تو اس آیہ میں اس سے دقیق تر معانی موجود نہ ہوں، اگر ہم فقط کسی ایک معنیٰ پر اکتفاء کر لیں تو ہرگز اس آیہ کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکیں گے اور یوں ارتقاء کی راہ

مسدود ہو جائے گی۔ یوں نہ ہو کہ ہم سطحی بات کرنے والے کے فقیر و مقلد بن جائیں اور دوسرے دقیق تر بات کرنے والے کی طرف رجوع نہ کریں یعنی سطحی بات پتھر کی لکیر ہو جائے اور ہم اس لکیر کے فقیر ہو جائیں اور ہرگز عمیق تر بات کی طرف جانے کی کوشش نہ کریں، کسی بڑے کی طرف جانے کی آرزو ہی نہ ہو۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اسی لئے بیان فرمایا تھا کہ انسان اپنی ہمتوں سے پہچانا جاتا ہے، قیمتِ انسان اس کی ہمت کے برابر ہے، یعنی عزم کہ انسان نے کتنا بڑا عزم کیا ہے؟ چھوٹے انسان چھوٹے چھوٹے ارادے کرتے ہیں، جن کے چھوٹے چھوٹے مقصود ہیں، جن کی بہت محدود آرزوئیں ہیں کہ مثلاً ہمیں ایک مجلس مل جائے، یہی ان کی آرزو ہے یا ایسے ہو جائیں کہ مثلاً کہیں جا کر پڑھا سکیں، یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، یہ چھوٹا انسان ہے کہ جس نے اتنی چھوٹی سی آرزو کی ہے، انسان کی قیمت اس کی ہمت کی حد تک ہے، عزم و ارادے کی حد تک ہے، جتنا بڑا ارادہ کرے اتنا بڑا انسان ہے اور بڑے انسان بڑے ارادے کرتے ہیں، بڑے انسان بڑی سوچ سوچتے ہیں، بڑے انسان بڑی ہمت دکھاتے ہیں اور بڑی ہمتوں کے نتیجے ہمیشہ بڑے اور عظیم ہوتے ہیں، آج اگر ہمارے سامنے علمی اور عملی کارنامے ہیں تو یہ کارنامے بڑے لوگوں نے انجام دیئے ہیں، چھوٹے لوگ ہمیشہ مارکیٹ کی حیثیت رکھتے ہیں، چھوٹے لوگ مصرف کنندہ ہیں، یہ کچھ بھی ایجاد نہیں کر سکتے ہیں، بڑے لوگ ایجاد کرتے ہیں اور چھوٹے لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں، انسان یوں نہ ہو کہ استعمال کرنے والوں میں سے ہو، پیچھے چلنے والوں میں سے ہو، بڑی ہمات کریں

نہ کہ سرسری حد تک کہ بس یہی سطحی بات ہماری ہمت ہے اور یہ ہمارے لئے کافی ہے، اس لئے قرآن نے طبقات ذکر کیے ہیں۔

قرآن نے ابرار کا ذکر کیا ہے، اصحابِ یمین کا ذکر کیا ہے اور مقربین کا ذکر کیا ہے، بعض بزرگان ایسے ہیں کہ جنہوں نے قرآن کی انہی آیات کی تفسیر ذکر کی ہے اور ان مراتب و منازل کا تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی بتایا ہے کہ مثلاً یہ درجہ ابرار ہے، یہ درجہ اصحابِ یمین ہے اور یہ درجہ مقربین ہے پھر اس کے بعد خدا سے دعا یہ کی کہ ہمیں سب سے نچلا درجہ عطا فرما، یہ بہت کم ہمت انسان ہے۔ جنت کے مراتب ہیں اور ان درجات میں سے سب سے عالی جنت جنت اللقاء ہے، جنتِ ذات ہے، انسان جنت پڑھ پڑھا کے، سمجھ کے آخر میں آرزو کرے کہ یہی درختوں والی، نہروں والی اور حوروں والی جنت میرے لئے کافی ہے تو یہ بہت چھوٹا انسان ہے، اس انسان نے بہت ہلکی ہمت اور ارادہ کیا ہے، اگر بڑا انسان ہو تو بڑا ارادہ کرتا ہے۔ شخصیتِ امیر المومنین علیہ السلام کتنی عظیم ہے یہ امیر المومنین علیہ السلام کے ارادوں سے دیکھیں، انسان امیر المومنین علیہ السلام کی ہمت سے دیکھتا ہے کہ آپؑ کی شخصیت بہت عظیم ہے، فرمایا کہ اصلاً اگر جنت نہ بھی ہو تو بھی کوئی پرواہ نہیں ہے چونکہ میری ہمت تیری ذات کیلئے ہے، میرا ارادہ تیری ذات کی طرف ہے، میں نے تیری ذات کا عزم کیا ہوا ہے نہ کہ تیری نعمتوں کا عزم کیا ہوا ہے، میرا عزم اور میری مراد تو ہے، مجھے تیری ذات کی طرف جانا ہے۔ لہٰذا انسان اپنی ہمت بلند رکھے اور ہمراہِ قرآن اپنے ارتقاء کے سفر کو جاری رکھے۔

٤)ارتقاء کا پانچواں پہلو

ارتقاء کا پانچواں پہلو یہ ہے کہ کلام کا مقصود سمجھنے کے بعد اب متکلم کا مقصود سمجھو کہ متکلم کیا کہہ رہا ہے؟ البتہ انسان اسی کلام کی ہی مدد سے متکلم کا مقصود سمجھے گا لیکن متوجہ ہو کہ میں مرادِ خدا سمجھنا چاہتا ہوں کیونکہ ایک مرحلے میں تالیٔ قرآن یا قاریٔ قرآن کلام کا مطلب سمجھتا ہے اور کلام کا مقصود قواعدِ کلام کے رہینِ منت ہے چونکہ کلامِ خداوند تبارک وتعالیٰ زبانِ عربی میں ہے، عربی زبان کو ظہورات اور دلالات کے ذریعے سے اور لغتِ عربی کے قواعد کے ذریعے سے یعنی جو قواعد اہلِ زبان نے مقصود واضح کرنے کے لئے یا مقصود سمجھنے کے لئے مقرر کیے ہیں ان قواعد کی مدد سے کلام کا مقصود سمجھ جاتا ہے، ممکن ہے کہ کلام کا مقصود متکلم کا بھی مقصود ہو اور ممکن ہے کہ متکلم کا مقصود کچھ اور ہو اور ظاہری کلام کا مقصود کچھ اور ہو، یہ بحث انہی علومِ ادبی میں کی جاتی ہے، مخصوصاً اصولِ فقہ میں یہ بحث موجود ہے۔

اگر چہ قاعدتاً دیگر علوم میں بھی یہ بحث ہونی چاہئے لیکن زیادہ تر حضراتِ اصولی یعنی اصولِ فقہ کے علماء اس بحث کو چھیڑتے ہیں، ہر زبان کے قاعدے ہیں یہ صرف عربی کے نہیں ہیں یا زبانِ خاص کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں مثلاً، فارسی، اردو یا انگلش زبان بولنے والوں کے لئے بھی ہیں، یہ قاعدے مطلق ہیں کہ جب ہم کہیں سے بھی الفاظ سنتے ہیں، پڑھتے ہیں یا دیکھتے ہیں تو فی الفور بعض معانی ہمارے ذہن میں منتقل ہو جاتے ہیں، انہیں کہا جاتا ہے کہ یہ الفاظ کے مدلولِ تصوری ہیں یعنی معانیٔ تصوریہ ہیں، یہ الفاظ ہم کسی آگاہ اور بیدار و باشعور انسان سے سنیں تو بھی ہمارے ذہن میں

ارتقاء کا پانچواں پہلو

کچھ نہ کچھ مطلب منتقل ہوتا ہے، اگر کسی سوئے ہوئے انسان سے یہی الفاظ سنیں کہ جو خواب کے عالم میں بول رہا ہے تو بھی ان الفاظ کا یہی مطلب ہوتا ہے اور اگر ہم کسی بے جان چیز سے مثلاً ٹیپ پر یہ الفاظ سن رہے ہوں یا ٹی وی پر یہ الفاظ سن رہے ہوں، ریکارڈ شدہ الفاظ کہیں سے سن رہے ہوں یا دو چیزوں کے ٹکرانے سے یہ آواز وصوت پیدا ہو رہی ہو تو بھی یہی معانی تصوریہ فی الفور ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں، یہ اس بات کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ گفتگو کرنے والا شخص آگاہانہ طور پر قصد کرکے، ارادہ کرکے یہ بات کر رہا ہے یا اصلاً سرے سے کوئی ذی شعور موجود نہ بھی ہو اور کسی بے شعور موجود سے ہم یہ الفاظ سنیں جیسے عموماً بعض جانوروں کو سکھا دیئے جاتے ہیں یعنی تقلیدِ صوت، جیسے طوطا آواز نکالتا ہے تو اس سے بھی ذہن میں معانی تصویہ پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً فرض کرلیں کہ اگر ہم کسی باشعور انسان سے سنیں یعنی متوجہ انسان سے کہ جو غافل نہ ہو اور آگاہانہ طور پر بات کر رہا ہو، شعور کے ساتھ جب وہ پانی کہتا ہے تو بھی ہمارے ذہن میں اس کا معنیٰ تصوری آجاتا ہے، سویا ہوا آدمی پانی کہے تو بھی ہمارے ذہن میں معنیٰ آجاتا ہے، کسی پتھر یا لکڑی سے ہم لفظِ پانی سنیں تو بھی ہمارے ذہن میں معنیٰ آجاتا ہے، اگر کسی ٹیپ سے یہ مطلب سنیں تو بھی ہمارے ذہن میں یہ معنیٰ آجاتا ہے، پس تصوری معانی ہمارے ذہن کے اندر الفاظ اور معانی کے رابطے کا نتیجہ ہیں چونکہ ہمارے ذہن میں الفاظ اور معانی کے مابین تلازم موجود ہے۔

جب سویا ہوا آدمی یہی پانی کا لفظ کہتا ہے کہ مجھے پانی دو تو اسے ہم پانی نہیں دیتے ہیں یا ٹیپ سے آواز آرہی ہو کہ مجھے پانی دو، ٹی وی سے آواز آرہی ہو کہ مجھے پانی دو تو کوئی بھی نہیں اٹھتا

ارتقاء کا چوتھا پہلو

ہے کہ جگ بھر کے ٹیپ یا ٹی وی کے سامنے لے جائے، کیوں نہیں لے جاتے ہیں؟ اس لئے کہ اگرچہ ان الفاظ کے تصوری معانی ہیں لیکن یہ تصوری معانی کسی متکلم کا ارادہ نہیں ہیں، کسی شخص نے ان معانی کا ارادہ وقصد نہیں کیا ہے، چونکہ یہ آدمی سویا ہوا ہے لہٰذا سوئے ہوئے کہہ رہا ہے کہ مجھے پانی دو یا ٹی وی میں کہہ رہا ہے کہ مجھے پانی دو یا ٹیپ میں کہہ رہا ہے کہ مجھے پانی دو، ہمیں معلوم ہے کہ اس لفظ کی ادائیگی کے پیچھے قصد وارادہ موجود نہیں ہے اس وجہ سے ہم ان معانی کو اگرچہ سمجھتے ہیں لیکن ان پر کوئی اثر مترتب نہیں کرتے ہیں، ان معانی کے مقابلے میں کوئی عکس العمل نہیں دکھاتے ہیں، فرض کریں کہ اگر ٹیپ میں کوئی کسی کو برا بھلا کہہ رہا ہو یا خدانخواستہ العیاذ باللہ کوئی گالی دے تو کسی کو برا نہیں لگتا ہے چونکہ اسے معلوم ہے کہ یہ ٹیپ شدہ آواز ہے یا سویا ہوا آدمی کسی کو گالی دے رہا ہے یا ایسا آدمی کہ جو اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو کیونکہ بسا اوقات بیمار لوگ ہوتے ہیں یا ایسی مدہوشی و بے ہوشی کے عالم میں چلے جاتے ہیں کہ ہذیان کہنا شروع کر دیتے ہیں، ہذیان کے عالم میں جو کچھ ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو کوئی اس سے برا نہیں مانتا ہے، کیوں برا نہیں مانتے ہیں؟ آیا ان الفاظ کے معانی نہیں ہیں؟ ان الفاظ کے معانی ہیں لیکن پھر بھی کسی کو برا نہیں لگتا ہے چونکہ یہ شخص جو معانی الفاظ ادا کر رہا ہے اس نے ان معانی کا قصد وارادہ نہیں کیا ہے، ہمیں گالی اس وقت بری لگتی ہے کہ جب ایک انسان کی زبان سے غلط کلمہ نکلے اور یہ غلط بات بھی وہ قصد اور ارادے کے ساتھ کرے اور ہمیں یہ بھی پتہ ہو کہ اس نے اس معنیٰ کا ارادہ کیا ہے اور ہمیں یہ معنیٰ منتقل کرنا چاہتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ بعض اوقات ہم کلام کا مقصود سمجھ جاتے ہیں لیکن اس میں متکلم کا مقصد

ارتقاء چوتھا پہلو

موجود نہیں ہوتا ہے، جیسے سویا ہوا شخص جب بات کرتا ہے تو اس کے کلام میں معنیٰ ہے لیکن یہاں پر متکلم کی کوئی مراد نہیں ہے۔ پس یوں نہیں ہے کہ جہاں بھی الفاظ موجود ہوں اور الفاظ جو معانی ادا کر رہے ہوں یقیناً وہی متکلم کی بھی مراد ہوتی ہو اور متکلم بھی انہی معانی کا ارادہ کرتا ہے، بعض اوقات متکلم اصلاً سرے سے ارادہ نہیں کرتا ہے، الفاظ اس سے ادا ہو جاتے ہیں اور متکلم کا کوئی قصد و ارادہ نہیں ہوتا ہے، جیسے سویا ہوا شخص، مدہوش انسان اور ہذیان کہنے والا انسان ہے۔

بعض اوقات متکلم الفاظ بیان کرتا ہے اور ان الفاظ کے معانی ہوتے ہیں اور یہ معانی جو متکلم کے الفاظ میں ہیں یہی اس کی مراد بھی ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ ایسے ہی ہو کہ یہ معانی جو الفاظ کے ذریعے سے ہمارے ذہن میں آئے ہیں تو متکلم کی مراد بھی یہی ہے مثلاً جب ایک شخص مذاق کر رہا ہوتا ہے، کوئی مزاحیہ یا طنزیہ جملہ یا کوئی ایسا مطلب بیان کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت کچھ الفاظ ادا کرتا ہے لیکن یہی الفاظ اگر سنجیدگی کے ساتھ ادا کرے مثلاً انسان عموماً مذاق مذاق میں ایک دوسرے کو بہت کچھ کہہ جاتا ہے، جیسے فرض کریں کہ اردو یا پنجابی بولنے والوں کے مابین مزاحیہ ماحول ہے، خصوصاً جب لاہوری مذاق کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ ایسے الفاظ ادا کرتے ہیں کہ اگر کوئی سنجیدگی سے وہ الفاظ ادا کرے تو بہت بڑی تہمت، گالی اور کیا کیا چیزیں بن جاتی ہیں لیکن چونکہ مذاق میں، مزاح میں سب کچھ کہتے ہیں تو سننے والے کو معلوم ہے کہ ان الفاظ کے یہ معانی بنتے ہیں لیکن برے اس لئے نہیں لگتے کہ یہ صرف الفاظ کے معانی ہیں متکلم کے معانی نہیں ہے، جِدّی نہیں ہے، متکلم نے یہ ارادہ نہیں کیا ہوا ہے اور وہ یہ بات منتقل کرنا نہیں چاہتا ہے بلکہ مذاق کر رہا

ہے۔

پس متکلم کی مراد کبھی وہی ہوتی ہے کہ جو کلام ادا کرتا ہے اور کبھی متکلم کی مراد کچھ اور ہوتی ہے مثلاً جہاں پر مجاز استعمال ہوتا ہے، استعارہ استعمال ہوتا ہے، تشبیہات استعمال ہوتی ہیں وہاں پر الفاظ کے معانی کچھ اور ہوتے ہیں اور متکلم کی مراد کچھ اور ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص مجازگی میں کہتا ہے کہ مجھے پیاس لگی ہے، الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کو پانی چاہئے لیکن متکلم کہہ رہا ہے کہ مجھے علم چاہئے، اس نے یہ لفظ مجازاً استعمال کیا ہے یا مثلاً آپ کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑا شیر ہے، لفظِ شیر بتاتا ہے کہ اس کی دُم بھی ہوگی، پنجہ بھی ہوگا، چار ٹانگیں بھی ہوں گے، یہ غُرّ اتا بھی ہوگا، دھاڑتا بھی ہوگا، یہ درندہ چیرتا، پھاڑتا بھی ہوگا، شیر کا لفظ یہ سب بتا رہا ہے پس یہاں سے بھاگنا چاہئے، لفظ کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگو یہ شیر ہے لیکن انسان نہیں بھاگتا ہے، کیوں؟ کیونکہ جس کے منہ سے یہ لفظ ادا ہوا ہے اس کی مراد کچھ اور ہے، لفظ کچھ اور کہنا چاہتا ہے اور متکلم کچھ اور کہنا چاہتا ہے، لفظ کہہ رہا ہے کہ یہ درندہ ہے لیکن متکلم کہنا چاہتا ہے کہ یہ بہادر ہے لہٰذا کثرت سے ایسے ہوتا ہے کہ الفاظ کچھ اور کہہ رہے ہوتے ہیں اور متکلم کچھ اور ارادہ رکھتا ہے۔

اگر ہم معمول کے کلام میں بحث کریں تو فرض کریں کہ ایک مقرر لوگوں سے خطاب کر رہا ہے اور لوگ اس کے کلام کے معانی سمجھ رہے ہیں، کلام میں جن معانی کی طرف الفاظ دلالت کر رہے ہیں وہ معانی لوگوں کے ذہنوں میں آ رہے ہیں لیکن متکلم جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ مطلب حاضر لوگوں کے ذہنوں میں منتقل نہیں ہو رہا ہے، وہ صرف الفاظ پہ توجہ کئے ہوئے ہیں اور کلام کا

مقصود سمجھ رہے ہیں، متکلم کا مقصود نہیں سمجھ رہے ہیں لہٰذا پھر دہراتا ہے، تکرار کرتا ہے، مثال دیتا ہے چونکہ اس کو پتہ چل رہا ہے کہ یہ کلام کا مقصود تو سمجھ گئے ہیں لیکن ابھی میرا مقصود نہیں سمجھے ہیں مثلاً جب انسان کسی کو طعنہ دے کر بات کرتا ہے تو طعنہ ایک غیر مستقیم حملہ ہوتا ہے، ایک غیر مستقیم سرزنش ہوتی ہے۔

بعض سادہ لوح لوگ کلام کا معنیٰ سمجھ جاتے ہیں لیکن متکلم کا معنیٰ نہیں سمجھتے ہیں، فرض کریں کہ متکلم نے کسی کو کہنا ہے کہ تم بہت بڑے بخیل ہو تو وہ کہتا ہے کہ تم نے حاتم طائی کی قبر پہ لات ماری ہے، اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی شخص کی ایک قبر ہے بنامِ حاتم اور تم اس پر گئے ہو اور تم نے اس کو ٹھڈا مارا ہے، یہ کلام کا معنیٰ ہے، وہ انکار کرتا ہے کہ میں نے آج تک حاتم کی قبر پر لات نہیں ماری اور مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی قبر کہاں ہے؟ لیکن متکلم یہ کہنا نہیں چاہ رہا ہے کہ آپ نے کسی مدفون مردے کی قبر پہ جا کر لات ماری ہے، وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم خسیس ہو، تم بخیل ہو اور بخیل آدمی اگر تھوڑی سی بخشش کر دے تو وہاں پر کہتے ہیں کہ تم نے حاتم کی قبر پر لات ماری ہے یعنی متکلم خِسّت بیان کر رہا ہے اور اس کا کلام کچھ اور بیان کر رہا ہے، اگر انسان سادہ ہو اور متکلم اور مرادِ متکلم نہ سمجھتا ہو تو فقط کلام پر اکتفا کر لیتا ہے، اسی طرح سے انسان اگر قواعدِ عربی کی مدد سے قرآن کی بارگاہ میں آئے اور مقصودِ کلام سمجھ بھی جائے کہ آیات کیا کہہ رہی ہیں، الفاظِ قرآن کیا کہہ رہے ہیں تو یہ فہم کا ایک درجہ ہے لیکن اس پر اکتفا نہ کریں۔

اِقْرَأْ وَارْقَ......

یعنی پڑھو اور پھر درجۂ بالا پر قدم رکھو، ابھی ایک سیڑھی پر قدم رکھا ہے یعنی تم نے کلام کا مقصود سمجھا ہے اب متکلم کا مقصود سمجھو۔

بعض لوگ جان بوجھ کر بھی قرآن کے الفاظ کے وہ معانی کرتے ہیں کہ جو مقصودِ متکلم نہیں ہوتے، اگر ہم عملاً دیکھیں تو دین دار لوگوں کے اندر یہ چیز موجود ہے یا جو لوگ قانون سے سروکار رکھتے ہیں ان کے یہاں بھی یہ عام معاملہ ہے اور رائج چیز ہے مثلاً آپ عدالتوں میں جائیں تو وکلاء جب قاضی کے سامنے، جج کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور جرح کرتے ہیں، وہاں انہیں معلوم ہے کہ قانون کے الفاظ یہ کہہ رہے ہیں لیکن قانون ساز یہ نہیں کہنا چاہتا ہے بلکہ قانون ساز کی کچھ اور مراد ہے لیکن وکیل کو اس سے سروکار نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ الفاظ یہ کہہ رہے ہیں، اب اسے بیشک یہ بتاتے رہیں کہ یہ الفاظ کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو قانون بنانے والے کا مقصد نہیں تھا، وہ کہتا ہے کہ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ قانون بنانے والے کا مقصد کیا تھا؟ مجھے صرف اسی سے غرض ہے کہ قانون کی عبارت یہ کہتی ہے، عبارت فقط یہ کہہ رہی ہے یعنی جان بوجھ کر وکیل اپنا کیس (Case) جیتنے کے لئے فقط الفاظ کی حد تک اکتفا کرتا ہے اور وکیل کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ قانون ساز کی یہ مراد نہیں ہے فقط الفاظ اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اسی طرح ہم دینداروں کی دنیا میں آجائیں، قانونِ الٰہی میں آجائیں تو یہاں بھی ایسے ہی ہے، توضیح المسائل اٹھا کر کہتے ہیں کہ فتویٰ کی عبارت یہ ہے، مثلاً چاند نظر آنے میں فتویٰ کی عبارت یہ ہے، خمس دینے میں فتویٰ کی عبارت یہ ہے، مرجعِ تقلید کے الفاظ یوں کہتے ہیں، جہاں پر جان

چھڑانی ہو اور حکمِ شرعی سے بھاگنا ہو، حدودِ الٰہی سے فرار کرنی ہو تو وہاں پر فقط ان الفاظ کا سہارا لیتے ہیں، اگر انہیں کہہ دو کہ مرجعِ تقلید کی یہ مراد نہیں تھی، معصوم علیہ السلام کی یہ مراد نہیں تھی، خداوند تعالیٰ کی یہ مراد نہیں تھی تو وہ کہتا ہے کہ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ ان کی مراد کیا ہے؟ الفاظ یہ کہہ رہے ہیں، فتویٰ یوں کہتا ہے، عبارت سے یوں استفادہ ہوتا ہے باقی مجھے معلوم نہیں ہے، بسا اوقات لوگ یہ کام کرتے ہیں کہ فقط الفاظ کے معانی دریافت کر لیتے ہیں اور متکلم کے مقصود کی طرف توجہ نہیں ہوتی ہے، اس کو ترقی نہیں کہتے ہیں، یہ قرآن پڑھنے کا ادب نہیں ہے، قرآن پڑھنے کا ادب یہ ہے کہ اگر الفاظِ قرآن سے آپ کو ایک مطلب سمجھ میں آیا ہے تو اب ان الفاظِ قرآن اور ان معانیٔ الفاظ کو مرادِ متکلم سمجھنے کے لئے ذریعہ قرار دیں کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی مراد کیا ہے؟ چونکہ متکلمِ کلام ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

۵) ارتقاء کا چھٹا پہلو

☆پہلا مرحلہ

تالیٔ قرآن اور قاریٔ قرآن کے لئے ارتقاء کے چھٹے پہلو کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان قرآن پڑھتے ہوئے، تلاوت کرتے ہوئے یہ سمجھے کہ خود اپنے لئے تلاوت کر رہا ہے یعنی انسان ہی تالی ہے اور انسان ہی سامع ہے۔ اس میں وہ تلاوتیں شامل نہیں ہیں کہ جو مُردوں پر کی جاتی ہیں، جو ختمِ قرآن میں کی جاتی ہیں، جو تراویح میں کی جاتی ہیں، پیسے لے کر کی جاتی ہیں یا قرآن کے مقابلے

میں کی جاتی ہیں، وہ اصلاً اس موضوع سے خارج ہیں، وہ نہ اپنے لئے ہوتی ہیں، نہ خدا کے لئے ہوتی ہیں اور نہ کسی اور کے لئے ہوتی ہیں۔ انسان نماز میں جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے، فاتحہ پڑھتا ہے، سورہ پڑھتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ پیسے کے لئے نہیں کرتا ہے، کسی مردے کے ایصالِ ثواب کے لئے نہیں کرتا ہے، کسی انعام کو جیتنے کے لئے نہیں کرتا ہے، انسان خود تلاوتِ قرآن کرتا ہے اور خود سنتا ہے یعنی اپنے لئے تلاوت کرتا ہے، یہ ایک مرحلۂ تلاوت ہے اور رائج تلاوت یوں ہی ہوتی ہے مثلاً فرض کریں کہ انسان قرآن پڑھ رہا ہے، صبح وشام کسی وقت بھی توفیق میسر ہو تو آ کر قرآن کھولتا ہے اور اس کا مطالعہ کرتا ہے، قرآن میں غور وتدبر کرتا ہے، خود ہی قرآن پڑھتا ہے، خود ہی سنتا ہے اور خود ہی سمجھتا ہے، عام عوام الناس ایسا ہی کرتے ہیں، یہ قرآن خوانی یا تلاوت کا ایک ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔

☆دوسرا مرحلہ

چھٹے پہلو کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں قرآن پڑھے یعنی خدا کے سامنے قرآن پڑھے، جس طرح سے شاگرد کبھی خود کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے، درس دہرا رہا ہوتا ہے، خود سنتا ہے، خود سمجھتا ہے اور کبھی استاد کے سامنے جا کر سناتا ہے، اپنا آموختہ سناتا ہے کہ میں صحیح پڑھ رہا ہوں یا غلط پڑھ رہا ہوں۔ اپنے طور پر کتاب کا مطالعہ کرنا یہ بھی مطالعہ ہے اور استاد کے سامنے جا کر اپنا آموختہ اور درس سنانا بھی ایک مطالعہ ہے، یہ بھی قرأت ہے، پس پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے

☆دوسرا مرحلہ

لئے پڑھتا ہے، خود ہی سنتا ہے، خود ہی ناظر ہے لیکن ایک دفعہ قرآن پڑھتا ہے تو مُستَمِع اور سامع ذاتِ خداوندِ تبارک وتعالیٰ ہے جیسے انسان دعا کرتا ہے اور سامع ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

ان دونوں قسم کی قرأتِ قرآن میں بہت فرق ہے مثلاً انسان جب اپنے لئے کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے اور جب معلم کے سامنے کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے تو ان دونوں قسم کے مطالعوں میں بہت فرق ہے، حتیٰ انسان کے جسمانی حالات میں بہت فرق ہوتا ہے کہ جب خود پڑھ رہا ہے تو لیٹا ہوا ہے اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھی ہوئی ہے، کبھی سر کے نیچے رکھی ہوئی ہے اور جیسی مرضی ہے ویسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، جیسی مرضی ہے بیٹھا ہوا ہے اور کوئی انداز نہیں ہے، کوئی خوبصورت لحن نہیں ہے بلکہ آزادی سے پڑھ رہا ہوتا ہے لیکن جب معلم کے سامنے جاتا ہے تو ادب سے دوزانوں ہو کر بیٹھتا ہے یا کھڑے ہو کر پڑھتا ہے یعنی جسمانی طور پر بھی اس کے حالات میں فرق آجاتا ہے اور روحانی وقلبی طور پر بھی اس کے حالات میں فرق آجاتا ہے کہ اب میں جس کے سامنے پڑھ رہا ہوں وہ ناظر ہے، وہ حاضر ہے، وہ میرا کلام اور میری بات سن رہا ہے، میری ادنیٰ سی غلطی، خطا اور میرا معمولی سا اشتباہ بھی اس کی گرفت اور نظر میں ہے، جب انسان اس طرح سے خدا کے سامنے قرآن پڑھ رہا ہو تو ظاہر ہے کہ اس وقت انسان کم غلطیاں کرتا ہے لیکن جب خود پڑھتا ہے تو نظر انداز زیادہ کرتا ہے، چشم پوشی زیادہ کرتا ہے، بے ادبی زیادہ کرتا ہے۔ اگر انسان کو معلوم ہو کہ قرآن کتابِ خدا ہے، کلامِ خدا ہے اور میں کلامِ خدا خود خدا کے سامنے پڑھ رہا ہوں تو بے ادبی کس طرح سرزد ہو سکتی ہے۔ پس قرأتِ قرآن خدا کی ذات سنے یہ بھی ارتقاء کا ایک مرحلہ ہے۔

☆تیسرا مرحلہ

اس سے اگلا تیسرا مرحلہ بھی ہے، پہلا مرحلہ یہ ہے کہ خود اپنے لئے پڑھے، دوسرا یہ ہے کہ انسان خدا کیلئے پڑھے اور مرحلہ دیگر یہ ہے کہ تالی قرآن اس طرح سے قرآن پڑھے کہ خدا کلام ادا کرے اور انسان سنے، یہ بھی ارتقاء وترقی درتلاوت ہے، تالی قرآن اس طرح سے قرآن کے ہمراہ جائے کہ یہ کلام جو پہلے کاغذ سے پڑھ رہا تھا اب پڑھتے پڑھتے خود متکلم سے سن رہا ہے، متکلم پڑھے اور انسان سنے، اس میں بعض احادیث کی طرف اشارہ فرماتے ہیں مثلاً حضرت امام صادق علیہ السلام کی یہ روایت سب نے نقل کی ہے، اہلِ سنت نے بھی نقل کی ہے اور ہمارے یہاں تشیع میں بھی موجود ہے کہ امام صادق علیہ السلام کی حالتِ نماز میں ایک کیفیتِ عجیب طاری ہوئی، پہلے کپکپی طاری ہوئی، جسم پر لرزہ طاری ہوا اور پھر کچھ دیر کے بعد حضرت علیہ السلام نماز میں مدہوش ہو کر گر پڑے، لوگوں نے آ کر اٹھایا اور جب افاقہ ہوا تو پوچھا گیا کہ کیا اتفاق رونما ہوا تھا؟ ذرا غور کریں کہ جب ہم نماز پڑھتے ہیں اور اس میں فاتحہ پڑھتے ہیں تو اپنے لئے پڑھتے ہیں اور خود سن رہے ہوتے ہیں جبکہ نماز اس طرح سے پڑھنا چاہئے کہ خدا سن رہا ہو اور آپ پڑھ رہے ہیں لیکن حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے بعض قرآن کے حصوں کو، آیات کو اتنا تکرار کیا مثلاً سورہ فاتحہ کے بعض حصوں کو اس طرح سے تکرار کیا، ایسا ارتقاء کیا کہ آخر کار یہ ہوا کہ پہلے میں خدا کے سامنے پڑھ رہا تھا لیکن پھر خدا نے قرآن پڑھنا شروع کیا، خدا کا کلام خود خدا سے ادا ہونا شروع ہوا اور میں سننے لگا، وہ عالم ایسا تھا کہ مجھ سے تحمل نہیں ہو سکا لہٰذا وہ کیفیت جو نماز کے اندر مجھ پر طاری ہوئی یہ کیفیت تھی۔ یعنی یہ بھی خداوند تبارک وتعالیٰ کی ایک تجلی

تھی، یعنی تجلی متکلم در کلامِ خود۔ امام صادق علیہ السلام سے یہ حدیث بھی منقول ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ اپنے کلام میں متجلی ہے لیکن لوگ غافل ہیں، توجہ نہیں کرتے ہیں، خود امام صادق علیہ السلام متجلی کو دیکھ رہے ہیں اور متجلی سے یہ جلوہ سن رہے ہیں جس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے کلام سنا،

وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا......(۴)

یعنی موسیٰ علیہ السلام مدہوش ہو کر گرے، اس لئے کہ یہ منظر ہر ایک سے تحمل نہیں ہوتا ہے، جیسے اشارہ ہوا تھا کہ جب ہم اپنے لئے نماز پڑھتے ہیں تو خود ہی نمازی ہیں، خود ہی سن رہے ہیں، اس وقت ہماری یہ کیفیت ہو رہی ہوتی ہے کہ کہیں خارش ہو رہی ہوتی ہے، کہیں حساب کتاب میں لگے ہوتے ہیں، توجہ کہیں اور ہوتی ہے اور نماز میں حواس نہیں ہوتے ہیں لیکن جب کوئی کتاب معلم کے سامنے پڑھ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ہم سارے حواس اکٹھے کر کے معلم کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، ادنیٰ حرکت بھی ہم سے سرزد نہیں ہوتی ہے، معمولی سی بے ادبی بھی ہم سے سرزد نہیں ہوتی ہے، ادب خود ہی خود آ جاتا ہے مثلاً جب ہم خود لائبریری میں بیٹھے ہوئے، اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے پڑھ رہے ہوتے ہیں تو کسی ادب کا خیال نہیں رکھتے ہیں لیکن جب کلاس میں معلم کے سامنے پڑھتے ہیں تو ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں، پہلے بن سنور کر جاتے ہیں، مناسب لباس پہنتے ہیں، مناسب حلیہ بناتے ہیں، اپنا جسمانی انداز بناتے ہیں اور پھر اس معلم کے سامنے جاتے ہیں اور قرأت کرتے ہیں اور یہی چیز جو انسان پڑھ رہا ہے اگر معلم سے سن رہا ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا درجہ کچھ

تشیع امر اعظم

اور ہوتا ہے یعنی اگر انسان خود ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہ کلمات سن رہا ہو تو تحمل کرنا آسان نہیں ہے، ہم پڑھیں اور وہ سنے یہ برداشت کرنا بہت مشکل ہے چہ جائیکہ خدا کی ذات کلام کرے اور انسان سنے، بس اس وجہ سے یہ بھی قرأت کا ایک مرتبہ ہے کہ انسان اقراء اور ارتقاء میں وہاں تک جا پہنچے۔

٦) ارتقاء کا ساتواں پہلو

ایک پہلوئے دیگر یعنی ساتواں پہلو بھی ہے، اب جب کہ انسان خدا سے کلام سنتا ہے یعنی جب انسان قرآن پڑھ رہا ہے تو یہ گمان کرے کہ خدا پڑھ رہا ہے اور میں سن رہا ہوں نہ کہ اپنے آپ کو خدا سمجھے چونکہ کلام میں خدا متجلی ہے اور یہ کلامِ خدا ہے، اس کو ایک مثال کے ساتھ تحریر کرتے ہیں، مثلاً آپ ڈراموں، فلموں میں ایک منظر دیکھتے ہیں کہ دور بیٹھا ہوا ایک آدمی کسی کو خط لکھتا ہے، عموماً یہ منظر ہر جگہ اور ہر زبان کی فلم میں موجود ہوتا ہے، فرض کر لیں کہ جو تاریخی مذہبی فلمیں ہیں جیسے اصحابِ کہف، مریمؑ مقدس یا امام علی علیہ السلام کی فلم ہے، ان فلموں میں ہم دیکھتے ہیں یا فلم ڈائریکٹر (Director) بہت خوبصورتی سے اس منظر کو فلماتا ہے کہ مثلاً امیر المومنین علیہ السلام مالکِ اشترؒ کو خط لکھتے ہیں، پہلے مالکِ اشترؒ اس خط کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو مالکِ اشترؒ کی آواز ہوتی ہے لیکن جب چند سطریں پڑھتے ہیں تو آواز بدلتی ہے اور امیر المومنین علیہ السلام کی آواز شروع ہو جاتی ہے، فلم ایک حقیقت کی نمائش ہے، یہ صرف فلم میں نہیں ہونا چاہئے بلکہ حقیقت میں ہونا چاہئے۔

جب فلم میں یہ اتفاق رونما ہوتا ہے تو نہج البلاغہ پڑھتے ہوئے کیوں نہیں ہوتا ہے؟ مثلاً ایک ماں اپنے بیٹے کو خط لکھتی ہے اور وہ فلم ڈائریکٹر اس فلم کو اس طرح سے فلماتا ہے کہ بیٹا جب ماں کا خط پڑھ رہا ہوتا ہے تو پہلے چند سطروں تک بیٹے کی آواز ہوتی ہے لیکن جوں ہی ذرا آگے جا کر احساساتی کلام شروع ہوتا ہے تو پھر وہی آواز بدل کر ماں کی آواز ہو جاتی ہے یعنی ماں خط میں بول رہی ہے اور بیٹا نسوانی آواز میں سن رہا ہے، یہ ایک حقیقت ہے اس کو فقط یوں نہ سمجھیں کہ یہ فقط ایک فلمی حربہ و ہتھکنڈا ہے کہ جو وہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جسے وہ فلم کی مصنوعی دنیا میں دکھاتا ہے، یہ حقیقی دنیا کی بات ہے کہ جو ہم مصنوعی ومجازی دنیا میں جا کر دیکھتے ہیں، مثلاً آپ دیکھیں کہ مریمؑ مقدس کی فلم میں جب وحی نازل ہوتی ہے تو پہلے چند سطریں جناب مریم علیہا السلام کی زبان سے ادا ہوتی ہیں اور پھر اس کے بعد فرشتہ، روح القدس بولنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر جس کا کلام ہے وہ بولنا شروع ہوتا ہے، لیکن جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو آخر تک خود ہی پڑھتے چلے جاتے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ ارتقاء وترقی نہیں کرتے ہیں، نہج البلاغہ پڑھتے ہیں لیکن نہج البلاغہ آخر تک خود ہی پڑھتے جاتے ہیں، انسان نہج البلاغہ پڑھتے ہوئے اتنی ترقی کرے کہ خود امیر المومنین علیہ السلام بولنا شروع کر دیں یعنی آوازِ امیر المومنین علیہ السلام انسان کے کانوں سے ٹکرانا شروع کر دے، البتہ دل کے کان سے نہ کہ جسمانی کان سے، دل کے کان میں امیر المومنین علیہ السلام کی آواز پڑے اور انسان یہ خطبے، یہ شکوے، یہ فریادیں اور یہ حزن خود امیر المومنین علیہ السلام سے سنے، اب جب کہ انسان خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہ کلام سنتا ہے تو اس کے بھی مراتب ودرجات ہیں۔

ارتقاء کا ساز واں پہلو

۷) ارتقاء کا آٹھواں پہلو

بعض اوقات ذاتِ خدا کلام کے ذریعے سے عبد سے مخاطب ہے اور فقط عبد خدا سے کلام سن رہا ہے یعنی اتنا ارتقاء کر گیا کہ ذاتِ خدا سے مستقیماً کلام سن رہا ہے، یہ فقط کلام کی حد تک ہے لیکن اس سے بھی آگے ساتواں پہلو بھی موجود ہے، مرحلۂ بالاتر یہ ہے کہ انسان جب قرآن مجید میں وارد ہوتا ہے، خدا مخاطِب ہوتا ہے اور ہم مخاطَب ہوتے ہیں تو خدا کی ذات بول رہی ہوتی ہے اور ہم سن رہے ہیں تو نہ فقط کلام بلکہ خدا کی نعمتیں اور جو کچھ خدا کے عطایا ہیں وہ بھی انسان کو نظر آ رہے ہوتے ہیں یعنی جو کچھ خدا نے ہمارے لئے مقرر و نازل کیا ہے، جن نعمتوں سے خدا نے ہمیں نوازا ہے وہ ساری نعمتیں مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہیں یعنی خدا مجھ سے کس زبان میں کلام کر رہا ہے؟ وہ نہ صرف مجھ سے بات کر رہا ہے بلکہ اپنی نعمتوں کی زبان سے بھی مجھ سے مخاطب ہے، خدا نہ صرف الفاظ کی زبان سے ہمارے ساتھ ہم کلام ہے بلکہ اپنے فعل، اپنے اثر اور اپنے وجود کی زبان سے ہم سے کلام کر رہا ہے یعنی انسان پہلے خدا کو کلام میں دیکھ رہا ہوتا ہے اور اب نعمتوں میں دیکھ رہا ہوتا ہے، انسان جتنا بھی قرآن پڑھتا ہے تو وہ ایک ایک نعمت کو دیکھتا ہے کہ خدا کی ذات مجھ سے اپنے فعل کے ذریعے سے مخاطِب ہے۔

جس طرح سے ایک والد بسا اوقات بچے کو زبانی وصیت کرتا ہے، شفاہی نصیحت کرتا ہے اور بچہ اس کی آواز کو سنتا ہے، کان دھرتا ہے لیکن یہی والد اب ایک دفعہ خاموش ہے یا یوں کہیں کہ بات بھی کر رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کے افعال بھی ہیں، جیسا کہ کہا بھی گیا ہے کہ آپ بچوں کے

ساتھ ایسے ہی مخاطب ہوں، جب آپ بچوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو صرف زبان سے مخاطب نہ ہوں بلکہ اِن سے اعضاء و جوارح سے بھی خطاب کریں، اپنی آنکھوں سے بھی خطاب کریں، اپنے ہاتھوں سے بھی خطاب کریں، اپنے وجود سے بھی خطاب کریں، مثلاً نوازش کرنا، شفقت کا ہاتھ پھیرنا، جیسے کہا گیا ہے کہ یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرو، یہ بھی ایک نوعِ خطاب ہے، اس میں مفہوم ہے، یتیم سمجھتا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے مثلاً آپ اس کے ساتھ اچھی زبان بھی استعمال کریں مثلاً اس کو بیٹا کہیں، اپنا پیارا کہیں، اپنا عزیز کہیں، اپنا فرزند کہیں لیکن جب اٹھا کر اس کو گود میں بٹھا دیں تو یہ گود میں بٹھانا بات کرنے سے زیادہ مؤثر ہے، یہ گود میں بٹھانا نوازش ہے، انسان جب خداوند تبارک وتعالیٰ سے کلام سنتا ہے تو ساتھ ہی خدا کی ساری نعمتوں کا احساس بھی کرتا ہے، وہ نوازشِ خدا، بندہ نوازیٔ خدا، کرمِ خدا اور رحمانیتِ خدا کا بھی احساس کرتا ہے۔

۸) ارتقاء کا نواں پہلو

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر ایک نواں پہلو ہے کہ جسے ہم تالیٔ قرآن کا آخری مرحلہ کہہ سکتے ہیں، البتہ پہلے عرض کیا تھا کہ ارتقاء کی کوئی حد نہیں ہے، انسان لا متناہی حد تک ارتقاء کر سکتا ہے، کمالات کی دنیا میں غیر محدود ترقی کر سکتا ہے اور معرفت کی دنیا میں ایسی جگہ پہنچ سکتا ہے کہ جہاں کوئی حد نہ ہو، انسان لایقفی حد تک جا سکتا ہے، جہاں وقفہ نہیں ہے، جہاں وقوف نہیں ہے، جہاں انسان کے لئے کوئی آخری اسٹاپ (Stop) نہیں ہے۔

انسان کی تلاوت کا ایک مرحلہ یہ آتا ہے کہ انسان کلام میں پہلے خدا سے سنتا ہے، پھر خدا کی نعمتوں کو دیکھتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے اور نہایتاً ان ساری چیزوں سے غافل ہو جاتا ہے، وہ جو گزشتہ فصل میں تاثر اور وجد بیان کیا تھا کہ انسان کے اندر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، وجد یہ ہے کہ خود ذاتِ خدا مجھ سے ہم کلام ہے، یہ کلامِ خدا ہے اور میں مخاطب ہوں لیکن نہایتاً اب کلام بھی نہیں سن رہا ہے بلکہ خود خدا کا مشاہدہ کر رہا ہے، جس طرح سے امیر المومنین علیہ السلام سے اس شخص نے پوچھا کہ آیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ کہا کہ

لَمْ أَكُنْ أَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَهُ...... (۵)

میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی ہے جسے میں نے دیکھا نہ ہو......

مَا كُنتُ لِأَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَهُ...... (۶)

یعنی میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا کہ جسے دیکھا نہ ہو،

لیکن خدا کو نورِ بصیرت سے اور ایمان کی بصیرت سے دیکھا جا سکتا ہے نہ کہ آنکھ سے دیکھتا ہوں۔

جیسا کہ امام صادق علیہ السلام کی روایت اور دیگر روایات و مضامین میں بھی ہے کہ

لَقَدْ تَجَلّٰى اللّٰهُ لِخَلْقِهِ بِكَلَامِهِ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ...... (۷)

خدا کی ذات اپنے کلام کے اندر متجلی ہے لیکن مخلوق چونکہ حجابوں میں ہے لہٰذا ان حجابوں کی وجہ سے مخلوق کو متجلی دکھائی نہیں دیتا ہے اور یہ قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ درحقیقت تمام عالم تجلی گاہِ خداوند تبارک و تعالیٰ ہے، ان تجلیاتِ الٰہی میں ہماری زندگی کی صبح و شام بسر ہو رہی ہے اور

قرآن نے بھی کہا ہے کہ یہ سب تجلیاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں، دن کا رات ہونا، رات کا دن ہونا، سردی کا گرمی ہونا، گرمی کا سردی ہونا، رات کے اپنے مناظر، دن کے اپنے مناظر، ہواؤں کا چلنا، سمندروں کا چلنا، پانی کا اتنا عظیم مجموعہ اوراس کے اندر کشتیوں کا چلنا اور پرندوں کا ہواؤں میں اڑنا، ہر چیز ایسی ہے کہ جو تجلی گاہِ ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام چونکہ غافل انسان نہیں ہیں، امیر المومنین علیہ السلام خود بھی فرماتے ہیں کہ

لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ يَقِيناً...... (۸)

اگر (میرے سامنے سے) پردے ہٹا دیئے جائیں تو بھی میرے یقین میں (اور) اضافہ نہیں ہوگا......

چونکہ میں ابھی بھی حجابوں کو نہیں بلکہ حجابوں سے پرے موجود حقیقت کو دیکھتا ہوں، میں تجلیات کے اندر موجود متجلی کو دیکھتا ہوں چونکہ میرے سامنے پردے نہیں ہیں، میری شخصیت حجاب میں نہیں ہے، نہ حجابِ نفسانی ہے، نہ حجابِ ظلمانی ہے، نہ حجابِ نورانی ہے، میں ان ساری آلودگیوں سے منزہ اور پاک انسان ہوں، اس وجہ سے

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ...... (۹)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا۔...

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَ رَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَ بَعْدَهُ...... (۱۰)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا، اس کے ساتھ بھی اور اس کے

بعد بھی......

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ مَعَهُ......(۱۱)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس کے ساتھ خدا کو دیکھا......

اسی طرح سے قرآن بھی تجلی عظمتِ خدا ہے، قرآن مجید تجلیٔ اکبر خداوند تبارک وتعالیٰ ہے، یہ قانونِ عام ہے یعنی یہ فقط ایک ذوقی مطلب نہیں ہے کہ جس طرح سے انسان دلیل و برھان سے دیکھتا ہے لیکن تجربے سے ثابت نہ کر سکے بلکہ یہ قانونِ عرفی و قانونِ عقلائی ہے کہ ہر فاعل اپنے فعل کے اندر متجلی ہوتا ہے، فعل درحقیقت فاعل کا ایک حصہ ہوتا ہے، فعل فاعل کا آئینہ ہوتا ہے، اس آئینے میں تمام فاعل موجود ہوتا ہے، فاعل اس فعل کی صورت میں درحقیقت اپنی ہستی اور حسن و جمال کا اظہار کرتا ہے، مثلاً ایک خوبصورت خطاط جب خطاطی کرتا ہے تو درحقیقت یہ الفاظ، سطروں اور خطوط کی بناوٹ نہیں ہے بلکہ یہ جمالِ دَرُونی کاتب ہے کہ جو اس نے کتابت کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

مثلاً جب ایک معمار عمارت بناتا ہے تو اس عمارت کی خوبصورتی میں وہ درحقیقت اپنے جمالِ ذاتی اور وجودی کا اظہار کرتا ہے، آج بھی لوگ انسان کے ہاتھ کے بنے ہوئے شاہکار مثلاً احرامِ مصر کو دیکھتے ہیں تو اتنی احرامِ مصر پر توجہ نہیں ہوتی ہے کہ جتنی ان کے بنانے والوں پر ہوتی ہے چونکہ بنانے والوں نے اپنا تمام ہنر، زیبائی اور عظمت ان احرام کے اندر منتقل کی ہے، یہ ان لوگوں کا فعل ہے لہٰذا انسان آج تک انگشت بدنداں ہے، تمام بشریت کو حیرت ہے کہ ہزاروں سال پہلے انسانوں نے کس طرح اتنی عظیم عمارتیں کھڑی کی ہیں؟ کس ٹیکنالوجی کی مدد سے؟ کس ہنر کی مدد

سے؟ کس علم کی مدد سے؟ کس جیومیٹری اور ہندسے کی مدد سے؟ یہ عظیم الجثہ اور عجیب تعمیرات انجام دی ہیں، اسی طرح سے اور بھی جتنے مشابہ شاہکار ہیں کہ جو انسانوں نے تعمیر کیے ہیں تو لوگ انہیں دیکھ کر ان کے بنانے والوں کی صنائع کی تعریف کیے بغیر نہیں رہتے ہیں۔

اسی طرح جب شاعر ایک نظم لکھتا ہے تو اس نظم کے اندر اپنی روح کا حسن منتقل کرتا ہے، اس لئے شعر جذاب ہو جاتا ہے یعنی شعر درحقیقت تجلیٔ خودِ شاعر ہے، تجلیٔ روحِ شاعر ہے اور جب ایک پاکیزہ شاعر مثلاً اقبالؒ جیسا شاعر شعر لکھتا ہے تو اسی لئے شعر بھی عظیم ہوتا ہے، یہ درحقیقت تجلیٔ روحِ اقبالؒ ہے، لیکن دوسرے شاعر بھی ہیں کہ جنہوں نے شہوانی اور شہوت رانی کے اشعار لکھے ہیں، انہوں نے بھی اپنی شہوتوں کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے، ان کا اظہار شہوت ہے، البتہ لفظِ تجلی شہوتوں کے لئے استعمال نہ ہو، لیکن ان کا بھی ایک اظہار ہے، درحقیقت انہوں نے اپنے اس کام میں اپنی روح اور فاعلیت کا اظہار کیا ہے۔

اگر کسی سے کوئی برا فعل سرزد ہوتا ہے تو درحقیقت یہ فاعل کی برائی ہے کہ جو فعل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اگر کسی سے اچھا فعل سرزد ہوتا ہے تو یہ فاعل کی اچھائی اور حسن ہے کہ جو فعل کی صورت میں انسان کے سامنے ظاہر ہوتی ہے، پس یہ ایک قانونِ عام ہے اور فعل کسی فاعل سے خود بخود سرزد نہیں ہوسکتا ہے، انسان مشین نہیں ہے بلکہ انسان کا فعل ارادی واختیاری فعل ہے، یہ اس کی روح کا فعل ہے، انسان تفکر کے ساتھ فعل انجام دیتا ہے، انسان کا ارادہ اس کے وجود، اس کی روح اور اس کے نفس سے اٹھتا ہے لہٰذا تمام وجودِ انسان درحقیقت اس فعل کے اندر موجود ہوتا ہے، اس وجہ

سے تناسب بھی ہوتا ہے، قرآن کی آیت بھی ہے کہ

كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ......(۱۲)

یعنی ہر فاعل اپنا ہم شکل کام کرتا ہے،

اسی طرح ہر انسان اپنا ہم شکل فعل انجام دیتا ہے، فعل و فاعل کے اندر مشاکلت، مناسبت اور تناسب اسی باب سے ہے کہ فعل خود فاعل کا حصہ ہوتا ہے اور کلام خود متکلم کا فعل اور حصہ ہوتا ہے، قرآنِ مجید فعلِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے اور ذاتِ خدا اس کلام کے اندر متجلی ہے۔

یہی حال عبادتوں کا بھی ہے کہ انسان جب عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کا مشاہدہ کرے، شہود کرے لیکن بصیرت کے ساتھ نہ کہ بصر کے ساتھ، یہ نہ کہے کہ میں نے خداوند تبارک وتعالیٰ کو آنکھ سے دیکھا ہے بلکہ انسان چشمِ بصیرت سے، دل سے اور نور سے خداوند تبارک وتعالیٰ کو دیکھتا ہے، پس انسان خدا کو دیکھے، عبادت میں بھی ارتقاء یہی ہے کہ انسان خدا کو دیکھے، پس خدا کو پائے پھر عبادتِ خدا کرے، اس وقت ہمارا ایمان کیا ہے کہ

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا......(۱۳)

پروردگار ہم نے اس منادی کو سنا جو ایمان کی آواز لگا رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے......

یعنی سنا ہے تو ایمان لے آئے عموماً کہتے ہیں کہ کیسے ثابت کریں کہ یہ قرآن خدا کا کلام ہے؟ تو کہتے ہیں کہ تواتر سے یعنی متواتر نقل ہوا ہے کہ یہ کتاب خدا کی ہے، جس طرح یہ ہے کہ ہمیں

کیسے پتہ چلے کہ بانگِ درا علامہ اقبالؒ کی کتاب ہے؟ ہمارے سامنے تو اقبالؒ نے نہیں لکھی ہے لیکن ہم سب کو یقین ہے کہ یہ علامہ اقبالؒ کی کتاب ہے، ہمیں کہاں سے یقین ہے؟ تواتر سے یعنی لوگوں نے اتنا زیادہ نقل کیا ہے کہ اب اس میں احتمالِ خطا نہیں ہے، اس کے اندر احتمالِ کذب نہیں ہے، صد در صد علامہ اقبالؒ کی ہی کتاب ہے، تواتر مفید ہے، افادہ یقین پیدا کرتا ہے، اسی طرح سے تواتر سے ہمارے لئے ثابت ہے کہ قرآن کلامِ خدا ہے یعنی ہم نے بہت سارے لوگوں سے سنا ہے کہ یہ کلامِ خدا ہے، اس طرح سے ہمارے نزدیک یہ کلامِ خدا ہے یعنی بہت سارے لوگ نے کہا کہ یہ کلامِ خدا ہے تو ہم نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے جب اتنے سارے لوگ کہتے ہیں تو کلام خدا ہی ہوگا۔

انسان اس طرح ارتقاء کرے کہ خود متکلم سے سنے اور متکلم کو دیکھے اور پائے، کلام ذریعہ ہے، خدا متجلی در کلامِ خود ہے، جب متجلی در کلامِ خود ہے تو ہم جلوہ کے ذریعے سے متجلی کو دیکھیں، تجلیات متجلی کو دیکھنے کا ذریعہ ہیں، جس طرح سے قرآن تجلیٔ خدا ہے اسی طرح سارا عالم تجلیٔ خدا ہے، سارا جہان تجلیٔ خدا ہے اور جب انسان کی بصیرت دیکھنا شروع کرے تو انسان ان تجلیاتِ الٰہی میں متجلی کو دیکھتا ہے،

قرآن نے پہلے کہا ہے کہ

لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ......(۱۴)

یعنی ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں،

وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِى الصُّدُوْرِo

بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

یہ دل کے اندھے ہیں، ان کی بصیرت کی آنکھ نہیں ہے بلکہ صرف جسمانی آنکھ کھلی ہوئی ہے، تجلیاں نظر آتی ہیں لیکن بصیرت کی آنکھ سے تجلی کے اندر متجلی نظر آتا ہے، جیسے عرض کیا کہ امام علیؑ کی فلم دیکھتے ہیں، مریمؑ مقدس کی فلم دیکھتے ہیں اور اس فلم میں ایک نامہ پڑھا جاتا ہے، چند سطروں تک پڑھنے والے کی آواز آتی ہے لیکن اس کے بعد لکھنے والے کی آواز آنا شروع ہو جاتی ہے، یہاں سے بھی آگے ایک مرحلہ ہے، وہ یہ کہ اسی نامے کے اندر، بسا اوقات اسی خط کے اندر وہ خط ہٹ جاتا ہے اور خود متکلم آجاتا ہے، صاحبِ نامہ خود نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

عموماً شہداء کے بارے میں جو فلمیں بنی ہیں ان میں یہ منظر بھی فلمایا گیا ہے، ہنرمندی اسی کو کہتے ہیں، سارا ہنر فلموں اور سینماؤں میں جا کر منحصر ہو گیا ہے اور معاشرے سے نکل گیا ہے، علمی جگہوں سے نکل گیا ہے، علماء نے ہنر چھوڑ دیا اور انہوں نے ہنر کو بغیر علم و معرفت کے حاصل کر لیا، جہاں ہنر ہے وہاں معرفت نہیں ہے اور جہاں معرفت ہے وہاں ہنر نہیں ہے، یہ ہنر نماز میں ہونا چاہئے تھا مثلاً شہداء کی فلم بناتے ہیں اور اس میں شہید کی ماں جب اپنے شہید بیٹے کی تصویر کو دیکھتی ہے تو آپ دیکھیں کہ ایک منٹ کے اندر یا چند منٹ کے اندر اندر آہستہ آہستہ اس تصویر میں سے زندہ شہید نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر مجسم ہو کر ماں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور ماں کے ساتھ بات کرنا شروع کر دیتا ہے، کیا یہ فقط فلموں میں ہے؟ اس فلم بنانے والے کے ذہن میں یہ بات کہاں سے آئی؟ کہ تصویر میں صاحبِ تصویر بھی دیکھا جا سکتا ہے یعنی ماں جب شہید کی تصویر کے اندر اتنی

منہمک اور غرق ہو جاتی ہے تو بیچ میں سے تصویر ہٹ جاتی ہے۔

یعنی جب آپ اس ظاہری آنکھ سے دیکھ رہے ہیں تو شہید کی تصویر نظر آتی ہے لیکن شہید کی ماں تو فقط اس آنکھ سے نہیں دیکھتی ہے بلکہ وہ دل کی آنکھ سے دیکھ رہی ہے، فلم ڈائریکٹر اس طرح فلم کی نمائش کرتا ہے کہ وہ دونوں آنکھوں کی رویئت بتا رہا ہوتا ہے، وہ یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ شہید کی ماں باطنی آنکھ سے تصویر دیکھ رہی ہے، بصیرت سے خود شہید کو دیکھ رہی ہے، اگر انسان بصیرت سے دیکھے تو شہید کی تصویر میں شہید نظر آتا ہے اور واقعاً نظر آتا ہے، اسی طرح سے قرآن تجلیٔ خدا ہے، اگر انسان بصیرت سے دیکھے تو تجلی میں متجلی نظر آتا ہے لیکن چونکہ بصیرتیں نابینا، اندھی اور اُمّی ہیں،

لَا تَعۡمَى الۡأَبۡصَارُ وَلٰكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِيۡ فِي الصُّدُوۡرِ ۝

درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

اس وجہ سے تجلیاں دیکھتے ہیں لیکن متجلی نہیں دیکھتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں لیکن ان کو خدا نظر نہیں آتا ہے، انسان خدا کو دیکھے اور پائے، قرآن کے اندر متکلم کو پائے، یہ بھی ارتقاء ہے اور قرأتِ قرآن کا درجۂ دیگر ہے۔

ارتقاء انہی حدود میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس سے بھی ماورا ارتقاء موجود ہیں اور ان تجلیات کے لئے حدودِ دیگر بھی ہیں کہ اس کے لئے فرصتِ دیگر کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ آخری دسواں ادب اگلی فصل میں درج کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)......(الانسان الکامل فی نہج البلاغة، الجزء ۱، صفحہ ۱)(شرح نہج البلاغة-عبد الحمید بن ہبة اللّٰہ بن محمد بن الحسین بن ابی الحدید، أبو حامد، عز الدین، الجزء ۸، صفحہ ۲۷۸)(شرح نہج البلاغة - ابن ابی الحدید، الجزء ۱، صفحہ ۲۴۱۰)(نہج السعادة - الشیخ المحمودی، الجزء ۸، صفحہ ۱۹۸)(مسند الامام علیؑ)

(۲)......(الاکلیل فی استنباط التنزیل - عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی، الجزء ۱، صفحہ ۲۷۱)(مباحث فی علوم القرآن - صبحی الصالح، الجزء ۱، صفحہ ۲۰)(بصائر ذوی التمییز فی لطائف - الکتاب العزیز مجد الدین أبو طاہر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی، الجزء ۲، صفحہ۵۶۸)(نزول القرآن والعنایة بہ فی عہد النبیؐ - عبد الودود مقبول حنیف، الجزء ۱، صفحہ۶۸) (فضائل القرآن للقاسم بن سلام - أبو عُبید القاسم بن سلام بن عبد اللّٰہ الہروی البغدادی، الجزء ۱، صفحہ ۱۱۱)(بیان المعانی - عبد القادر بن مّلا حویش السید محمود آل غازی العانی، الجزء ۱، صفحہ ۷۷)(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی - شہاب الدین محمود بن عبد اللّٰہ الحسینی الألوسی، الجزء ۱۵، صفحہ ۲۹)

(۳)......(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۷۶)

(۴)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۴۳)

(۵)...(ارشاد القلوب،الجزء۲۶،صفحہ ۲)(متشابہ القرآن،الجزء۱، (مختصر بصائر الدرجات -الحسن بن سليمان الحلى،الجزء۱،صفحہ۱۲۷) (مستدرک سفينة البحار - العلامة آية اللّٰه الشيخ على النمازى،الجزء۳،صفحہ۴۴۰)

(۶)......(أهل البيت فى تفاسير أهل السنة)

(۷)......(فى رحاب القرآن)(الامثل فى تفسير كتابِ اللّٰهِ المُنزَل-الشَيخ نَاصِر مَكارم الشِيرازيمدظله، الجزء۸،صفحہ۳۲۴)(النظام القرآنى)(التفسير و المفسرون)(فى رحاب القرآن)(التفسير الصافى - الفيض الكاشانیؒ،الجزء۱، صفحہ۷۷)(بحار الأنوار،الجزء۸۹،صفحہ۱۰۷)(مستدرک سفينة البحار، الجزء۲،صفحہ ۸۳)

(۸)...(آشنایی با قرآن - متفکر شهید استاد مرتضی مطهریؒ)(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰه جوادی آملی مدظله)(تفسیر نور- حجة الاسلام و المسلمين حاج شيخ محسن قرائتی مدظله)(شرح أصول الكافى- مولى محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء ۵، صفحہ۳۲۳) (بحار الأنوار- علامہ مجلسیؒ، الجزء ۲۶، صفحہ ۲۰۹)(غرر الحكم و درر الكلم، الجزء ۱، صفحہ ۲۳)

(۹)...(تفسير الميزان - العلامة الطباطبائیؒ،بحث روائی)(شرح نهج البلاغه - جعفرى)(مرآة العقول فى شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ،الجزء۱۰،صفحہ۱۳۹)

(۱۰)......(مفاهيم القرآن الجزء السادس)

(۱۱)......(شرح نہج البلاغہ-جعفری)

(۱۲) . .(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ۸۴)

(۱۳) . ...(سورۂ مبارکہ آل عمران، آیہ۱۹۳)

(۱۴) ... .(سورۂ مبارکہ حج، آیہ۴۶)

فصلِ ادبِ دهم

﴿تبری﴾

١)تبری کا معنٰی
٢)تولا وتبراء انسانِ سالك کے دو پَر
٣)عبادات میں سفرِ قربی و سفرِ بُعدی
٤)انسان هجرت کیوں نهیں کرپاتا؟
٥)تولا و تبرا کی وسعت
٦)اپنی حول و قوت سے تبرا
٧)قارونِ علمی نه بنیں
٨)جسے خدا اپنے حال په چھوڑدے وہ مغضوب ہے
٩)برائت کا دوسرا مرتبه
١٠)انسان اپنی معرفت پیدا کرے
١١)انبیاء علیہم السلام انسان کو انسان بنانے آئے ہیں
١٢)انسان ترقی پذیر ہے
١٣)موجودہ حالت پر راضی نه ہونا ترقی کی ضمانت
١٤)کون لوگ مطمئن ہیں؟

۱) تبری کا معنٰی

العاشر : التبری......

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ دہم تبری ہے۔ جب تالیِ قرآن درجاتِ قرآن کے ساتھ ساتھ اپنا سفر طے کرتا ہے اور پیرویٔ قرآن کرتا ہے یعنی قرآن کے ایک ہی مرتبے اور منزل پر نہیں رکتا تو اس کو بہت ساری آیات اور بہت سارے مضامینِ قرآن سے سروکار پڑتا ہے کہ جن میں آیاتِ نعمت ہیں، آیاتِ رحمت ہیں، آیاتِ بشارت ہیں، آیاتِ تحسین اور آیاتِ مدح ہیں، جیسا کہ خداوند تبارک وتعالٰی نے بہت سارے طبقات کا ذکر کیا ہے، ان کیلئے دنیوی اور اخروی نعمتوں کا ذکر کیا ہے، شہداء، صدیقین، نبیین، صالحین، مرسلین اور مقربین کا ذکر ہے اور ہر ایک کے لئے خداوند تبارک وتعالٰی نے الگ مقام ذکر کیا ہے لہٰذا تبری سے مراد یہ ہے کہ تالیِ قرآن جب ہمراہ بہ قرآن ان مقامات پر پہنچتا ہے تو اپنے نفس کو ان چیزوں سے بری سمجھے، یہ نہ کہے کہ یہ آیات میرے لئے ہیں اور خود کو ان امور کا مصداق جانے۔

ایسا نہ ہو کہ جب انسان صالحین کے مقام کو پڑھ رہا ہے تو اپنے آپ کو صالحین میں سے شمار کرنا شروع کر دے یا جب مقربین کے مقام کا مطالعہ یا قرأت کر رہا ہے تو اپنے آپ کو زمرۂ مقربین میں شامل کرنا شروع کر دے یا جب ابرار کا تذکرہ آیا ہے تو اس گمان کے ساتھ اور اس احساس کے ساتھ قرآن پڑھے کہ میں ابرار میں سے ہوں یا شہداء، صدیقین، نبیین اور صالحین کا تذکرہ آتا ہے تو یہ سمجھے کہ میں اسی گروہ میں سے ہوں، بلکہ برائت کرے، تبری کرے اور دوری اختیار کرے کہ میں

ان کا مصداق نہیں ہوں لیکن ان مقامات تک پہنچنے کی آرزو کرے اور خداوند تبارک وتعالیٰ سے دعا کرے کہ خدا مجھے ان مقامات میں سے قرار دے، حتیٰ وہ ہستیاں کہ جو یقیناً مقربین کا مصداق ہیں وہ بھی جب ان آیاتِ مقربین پر پہنچتی ہیں تو فقط دعا کرتی ہیں کہ خدایا ہمیں مقربین و صالحین میں سے قرار دے مثلاً معصومین علیہم السلام سے منقول ہے باوجود اینکہ حضراتِ معصومین علیہم السلام صالحین کا مصداقِ کامل اور اتم ہیں لیکن معصومین علیہم السلام بھی جب قرآن پڑھتے ہوئے ان آیات پر پہنچتے ہیں تو وہیں پر خداوند تبارک وتعالیٰ سے دعا اور آرزو کرتے ہیں کہ خدایا ہمیں صالحین میں سے شمار فرما۔

اس کے برعکس جب انسان آیاتِ وعید اور آیاتِ عذاب پر پہنچتا ہے تو وہاں پر بھی تبری کرے یعنی اپنے آپ کو اس عذاب سے مامون اور امن میں نہ سمجھے، یہ نہ کہے کہ یہ آیات دوسروں کے لئے آئی ہیں مثلاً سرزنش کی آیات ہیں، مذمت کی آیات ہیں اور دنیا و آخرت کیلئے آیاتِ وعید ہیں مثلاً قرآن کے بیان کردہ عذاب یعنی عذاب النار، عذابِ الیم، عذابِ مھین، عذابِ عظیم، عذابِ شدید، عذاب الحریق، عذابِ مقیم، عذاب الھون، عذاب الخلد، عذاب الخزی، عذابِ غلیظ، عذاب السعیر، عذابِ واصب، عذاب الجحیم، عذاب الحمیم، عذاب السموم اور عذابِ مستقر کی آیات ہیں یا نفاق و کفر و شرک کے بارے میں آیات ہیں، یہاں پر اپنے آپ کو تبریہ نہ کرے، یہ نہ کہے کہ میں ان چیزوں سے بری ہوں اور میں ان کا مصداق نہیں ہوں بلکہ یہ کہے کہ یہ مجھ سے مخاطب ہیں اور اپنے اندر غور و فکر کرے کہ جن چیزوں کی قرآن مذمت کر رہا ہے، نفی کر رہا ہے اور جن پر عذابِ دنیوی، عذابِ اخروی و خزیِ اخروی کا تذکرہ ہے کہیں میں تو ان کا مصداق نہیں ہوں یعنی اپنے آپ کو ان

تبری کا معنی

آیات کا مخاطب سمجھے کہ یہ میرے لئے آئی ہیں۔

بعض بزرگان سے منقول ہے کہ وہ قرآن پڑھتے ہوئے باوجود اینکہ توحید میں ایک مقامِ رسوخ عظیم تک پہنچے ہوئے تھے، متبلغ اور متولغ درتوحید تھے لیکن اس کے باوجود جب وہ آیاتِ شرک میں پہنچتے تھے تو خدا سے آرزو کرتے تھے کہ خدایا مجھے شرک سے بچانا اور اگر میرے دل میں کہیں لامحسوس شرک کا شائبہ بھی ہے تو اسے میرے دل سے خارج فرما۔ اسی طرح سے اگر کہیں منافقین کی مذمت میں آیت آجاتی ہے تو انسان اپنے آپ کو مخاطب سمجھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفاق کا کوئی شائبہ یا نفاق کا کوئی اثر میری ذات میں موجود ہو، خداوند تبارک وتعالیٰ سے آرزو اور دعا کرے کہ اگر نفاق میرے دل میں ہے تو اس کو میرے دل سے نکال دے، اسی طرح سے قرآن نے بعض مصادیق کے ساتھ اور بعض افراد کے ساتھ یا بعض قوموں کے قصص اور حالات کے ضمن میں بہت ساری اخلاقی پستیوں اور رذائل کا ذکر کیا ہے، ان اخلاقی پستیوں اور رذائل کے تذکرے میں اپنے آپ کو مُخاطَب سمجھے کہ کہیں ان کا مصداق میں نہ ہوں اور اگر خدانخواستہ میں ہوں تو خداوند تبارک وتعالیٰ مجھے ان رذائل اور ناپاکیوں سے منزہ فرمائے۔

۲) تولا وتبرا، انسانِ سالک کے دو پَر

درحقیقت جس طرح تولی ہے اسی طرح سے تبری بھی ہے یا تولّا وتبرّا دونوں باہم ہیں، تولّا کسی چیز کی قربت کو کہتے ہیں اور تبرّا کسی شے سے دوری کو کہتے ہیں یعنی دور ہونا تبرا ہے اور قریب ہونا

تولا ہے۔قرآن بھی مطلقاً ایسے ہے، انسان بارگاہِ قرآن میں ہو یا نہ ہو، عبادت کے اندر ہو یا نہ ہو لیکن ہر حال میں یہ دونوں چیزیں باہم انسان کے پاس ہیں، گویا ارتقاء وتکامل کے لئے انسان کے پاس تولا وتبرا دو پَر ہیں یعنی ایک طرف سے قرب اور دوسری طرف سے دوری، یہ لازم وملزوم ہیں، چونکہ انسان جب کسی کے قریب ہوتا ہے تو خوانخواہ کسی سے دور ہوتا ہے مثلاً اگر ہم حرم کے قریب ہورہے ہیں تو گھر سے یقیناً دور ہورہے ہیں، اگر گھر کے قریب ہورہے ہیں تو حرم سے دور ہورہے ہیں۔

جب ہم ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتے ہیں تو عملاً تولا وتبرا کررہے ہوتے ہیں، فرض کریں اگر ہم مشہد جارہے ہیں اور مشہد کے قریب تر ہورہے ہیں تو اپنے دیار ووطن سے دوری اختیار کررہے ہیں، یہ عملی تبرا اور تولا ہے چونکہ اس کے بغیر سفر ممکن نہیں ہے، جب تک انسان کسی سے دور نہ ہو تو کسی اور کے قریب نہیں ہوسکتا ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ کی قربت بھی بہت ساری چیزوں کی دوری پر موقوف ہے، اگر ہم بہت سارے امور سے دور نہ ہوں تو خداوند تعالیٰ کے قریب نہیں ہوسکتے ہیں یعنی جب تک ہم نے ہوئی کے وہ بت جو اپنے اندر یا باہر بنا رکھے ہیں انہیں مسمار نہ کریں، ان سے دوری اختیار نہ کریں تو قربِ خدا ممکن نہیں ہے، شرک کے اوپر اسی لئے قرآن کی حساسیت ہے کہ شرک تولا نہیں ہونے دیتا ہے بلکہ انسان کو تبرا کی طرف لے جاتا ہے یعنی خدا سے دور کردیتا ہے اور اسی لئے خداوند نے فرمایا کہ خدا بھی مشرکین سے دور ہے۔ یہ بُعدِ طرفینی ودوری طرفینی ہے۔

۳)عبادات میں سفرِ قربی و سفرِ بُعدی

جب انسان راہِ خدا وسبیلِ خدا میں جاتا ہے تو یہاں بھی تولا اور تبرا ہے، سبیلِ خدا میں جانے کے لئے بہت سارے راستے ترک کرنا پڑتے ہیں، کئی راستے یعنی سبل ہیں جو سبلِ شیاطین ہے، قرآن مجید کی تعبیر اور اصطلاح کے مطابق خطواتِ شیاطین ہیں، ان سارے خطوات کو، ان ساری گلیوں، کوچوں کو ترک کرنا پڑتا ہے اور فقط ایک گلی وسبیلِ خدا انتخاب کرنا پڑتی ہے، جب انسان دوسری گلیوں کو چھوڑتا ہے تو اس وقت تبرا کرتا ہے اور جب سبیلِ خدا پر آجاتا ہے تو اس وقت تولا کرتا ہے۔ عبادتوں کے اندر بھی ایسے ہی ہے، عبادت بھی ہم قربۃً اِلی اللہ انجام دیتے ہیں، ہم فقط ایک حرکتِ قربی انجام دیتے ہیں جبکہ حرکتِ قربی کے لئے حرکتِ بُعدی انجام دینا بہت ضروری ہے، اگر ہم بعدی حرکت انجام نہ دیں تو قربی حرکت ہم سے سرزد نہیں ہوسکتی ہے یعنی ہم دیگر چیزوں سے دور ہوئے بغیر نماز میں آکر کھڑے ہوجاتے ہیں، تبرا کے بغیر تولا کی کوشش کرتے ہیں اسی لئے قرب حاصل نہیں ہوتا ہے لہٰذا نماز کی حالت میں بھی انسان ذہنی طور پر انہی چیزوں میں مشغول ومصروف رہتا ہے کہ جہاں خارج از نماز ذہنی طور پر مشغول تھا۔ ذہنی طور پر گھر میں ہے، ذہنی طور پر معمولات میں ہے، ذہنی طور پر دکان میں ہے، ذہنی طور پر حساب وکتاب میں مشغول ہے، ذہنی طور پر اپنی پریشانیوں، مشکلات اور اپنی ذات میں مشغول ہے، اسی لئے ہم ہجرت نہیں کرپاتے۔

٤)انسان ہجرت کیوں نہیں کر پاتا؟

خداوندِ تبارک تعالیٰ کی طرف سفر یعنی تولا کا سفر ہجرت کہلاتا ہے۔ہجرت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان دوسری ساری چیزوں کو ترک و مہجور کردے اور پھر خدا کی طرف متوجہ ہو ورنہ ممکن نہیں ہے کہ انسان تبرا کئے بغیر تولا حاصل کر لے۔بعض نے تبرا اور تولا کو بہت رسوا کر دیا ہے اور ان کو بہت ہی ادنیٰ اور گھٹیا سطح پر اتار دیا ہے کہ جیسے دیگر معارفِ دینی کے ساتھ بھی یہی اتفاق ہوا ہے کہ انہیں اپنے مقامِ شامخ سے گرا کر بہت نیچے لے آئے ہیں اور ان کو بہت ہی پست و گھٹیا معانی کے اندر یا گھٹیا مصادیق کے اندر استعمال کیا جاتا ہے،اسی طرح سے تولا اور تبرا کے ساتھ بھی یہ کام کیا ہے،درحالیکہ تولا و تبرا بہت ہی عالی و شامخ معارف دینی میں سے ہیں اور تمام معارفِ دینی متصف بہ تولا و تبرا ہیں، قرآن پڑھنے میں تبرا و تولا ہیں،کسبِ معرفت میں تولا و تبرا ہیں،توحیدِ عملی میں تولا و تبرا ہیں،سلوکِ عرفانی میں تولا و تبرا ہیں اور حقیقت شناسی میں تولا و تبرا ہیں۔

جب تک انسان باطل سے برائت نہ کرے تو حق کے قریب نہیں ہوسکتا ہے،ممکن نہیں ہے کہ ایک فیلسوف اور ایک حقیقت شناس تولا و تبرا کے بغیر درست جہان بینی تک پہنچ سکے یعنی باطل سے دور ہو اور حق تک پہنچے،انسان حق تک اس وقت پہنچتا ہے کہ جب باطل سے تبرا کرے اور اسی طرح سے معاشرت میں بھی تولا و تبرا ہیں کہ جب تک انسان معاشرتی مسائل میں برائیوں سے تبرا نہ کرے تو اس وقت تک خوبیوں کی طرف تولا نہیں ہوتا ہے،اچھائیوں کے قریب نہیں ہوسکتا ہے،ہمیں آرزوئیں بہت ہیں یعنی امانی بہت ہیں،قرآن کی تعبیر کے مطابق ہماری امانی ہیں،آرزوئیں ہیں کہ

ہم اچھے ہو جائیں لیکن اچھے ہوتے نہیں ہیں، کیوں نہیں ہوتے؟ چونکہ تبرا نہیں کرتے ہیں، یعنی چہ؟ یعنی برائیوں سے دور نہیں ہوتے ہیں، برائیوں میں رہتے ہوئے اچھا ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اس غلاظت میں رہتے ہوئے پاک ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جہالت میں رہتے ہوئے عالم ہونے کی کوشش کرتے ہیں، گمراہی میں رہتے ہوئے ہدایت کی کوشش کرتے ہیں درحالیکہ ہدایت تولا و تبرا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۵) تولا و تبرا کی وسعت

پس یہ ایک وسیع چیز ہے، انسان کی زندگی میں، ہدایت میں، علم میں، عمل میں، معرفت میں، عبادت میں، قرآن پڑھنے میں اور ہر میدان میں تولا و تبرا انسان کے سلوک کا حصہ ہے یعنی تولا و تبرا انسان کے سلوک کی صفات ہیں، کسی بھی سلوک کے اندر بالآخر یہ دو صفات ہونا بہت ضروری اور لازم وملزوم ہیں یعنی تولا بلا تبرا فقط ایک فرضِ محض ہے اور تبرا بلا تولا بھی ایک فرضِ محض ہے، قربِ خدا ان کے بغیر ممکن نہیں ہے یعنی قرب اس وقت ہوتا ہے جب بُعد بھی ہو، کسی سے دوری باعث بنتی ہے کہ انسان کسی کے قریب ہو مثلاً جب انسان زمین سے زمین کا سفر کرتا ہے تو وہاں یہ دونوں صفات کاملاً روشن ہوتی ہیں مثلاً آج ہم حوزہ علمیہ میں ہیں تو کہیں سے دور ہوئے ہیں اسی لئے یہاں سے قریب ہوئے ہیں اور جب حوزے سے دور ہوں گے تو کسی اور جگہ کے قریب ہوں گے، یہ تمام انسانوں کی زندگی میں ہے۔

منتہی جو چیز انسان کے لئے مہم ہے اور اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان یہ تعین کرے کہ مجھے قرب کے لئے کن کن چیزوں کو چھوڑنا چاہئے مثلاً عالم بننے کے لئے مجھے تولا چاہئے یعنی مجھے اجتہاد کے قریب ہونا ہے، مجھے دین شناسی کے قریب ہونا ہے، مجھے ایک اچھا قرآن شناس بننا ہے اور مجھے ایک اچھا خدا شناس بننا ہے تو اس کے لئے مجھے بہت ساری چیزوں سے تبرا کی ضرورت ہے۔

اکثر لوگ اپنی عمریں حوزوں میں صرف کر دیتے ہیں، دینی مدارس میں صرف کر دیتے ہیں لیکن کسی مقامِ عالی علمی تک فائز نہیں ہوتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تولا و تبرا کے بغیر یہ کام کرتے ہیں یعنی مقاماتِ اعلیٰ علمی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں درحالیکہ جو موانع ہیں ان سے تبرا نہیں کرتے ہیں، ان موانع کے نزدیک ہیں، ان کے تعلقات بھی ہیں، ان کی مشغولیاتِ غیر علمی بھی ہیں، ان کے غیر علمی دغدغے اور کھٹکے بھی ہیں، مادیت پرستی بھی ان کے اندر موجود ہے، جہاں طلبی، شہرت پرستی، عوام زدگی بھی موجود ہیں اور درعین حال یہ بھی چاہتا ہے کہ میں ایک اچھے علمی مقام پر بھی پہنچ جاؤں لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں آپس میں جمع ہوسکیں۔

٦) اپنی حول و قوت سے تبرا

پس ہر تولا کے لئے ایک تبرا کی ضرورت ہے، تالیِ قرآن جب اپنا ہاتھ قرآن کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور پھر قرآن انسان کا ہاتھ تھام کر اس کو خدا کی طرف لے جاتا ہے تو اس کے لئے بھی تبرا کی ضرورت ہے، یہاں تبرا کیا ہے؟ یعنی انسان اب یہ نہ کہے کہ میں صالحین میں سے ہوں، پس

صالحین میں سے ہوں لہٰذا انسان کو ضرورت نہیں ہے کہ کوئی حرکت کرے اور آگے بڑھے، اس چیز سے تبرا کرے کہ میں ابھی کامل ہوں، انسان اپنے آپ کو کامل نہ سمجھے البتہ تبرا کے کئی میدان ہیں، یہ فقط قرآن میں ہی نہیں ہے بلکہ ہر میدان میں ہے ان میں سے سب سے پہلا میدان یہ بیان فرماتے ہیں کہ اپنی حول وقوت سے سب سے پہلے تبرا کرے مثلاً ادبِ قیام نماز کے اندر بتایا گیا ہے کہ کہے

بِحَوْلِ اللهِ وَقُوَّتِهٖ اَقُوْمُ وَ اَقْعُدُ،

یعنی میرا یہ قیام اور قعود اللہ کی دی ہوئی قوت سے ہے، البتہ یہ بعنوانِ نمونہ ہے نہ کہ فقط قیام وقعود کیلئے ہے بلکہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ○(۱)

کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری عبادتیں، میری زندگی، میری موت، سب اللہ کے لئے ہے جو عالمین کا پالنے والا ہے۔

یعنی میری پوری زندگی، حرکات وسکنات اور میری ہر چیز میں میری اپنی کوئی حول وقوت نہیں ہے، اپنے حول وقوت پر اعتماد نہ کریں، حول وقوت یعنی اپنی طاقت، اپنی توانائی، اپنی زحمت اور اپنی کوشش کو کبھی موثر نہ سمجھے بلکہ اس سے برائت کرے، اگر چاہتا ہے کہ کسی مقام اعلیٰ معنوی تک پہنچے تو سب سے پہلے اپنے حول وقوت سے اظہارِ برائت کرے کہ میں ان سے اظہارِ بیزاری کرتا ہوں اور حول وقوۃِ خداوند تبارک وتعالیٰ پر بھروسہ کرے، عملاً بھروسہ کرے نہ کہ فقط زبان میں تلفظ کرے یعنی نماز کی حالت میں فقط زبان سے یہ الفاظ ادا کردے کہ

اپنی حول وقوت سے تبرا

بِحَوْلِ اللّٰهِ وَقُوَّتِهٖ اَقُوْمُ وَ اَقْعُدُ۔

بلکہ عملی زندگی میں بھی ایسا ہی ہو کہ انسان اپنے حول وقوۃ پر بھروسہ اور تکیہ نہ کرے، روایات میں وہ قسم کہ جس کے خلاف ممکن نہیں ہے کہ کوئی چیز ثابت ہو سکے وہ اسی کے بارے میں ہے، اول تو قسم تک نوبت نہ پہنچے لیکن بالفرض اگر ایسا مُعاذِ موجود ہے اور قسم تک نوبت آ گئی ہے تو بسا اوقات ہوتا ہے کہ لوگ سادگی سے اللہ کی قسم کھا لیتے ہیں، قرآن کی قسم کھا لیتے ہیں یا مقدسات میں سے کسی اور چیز کی قسم یاد کر لیتے ہیں لیکن روایات کے مطابق اگر کسی کو قسم دینی ہے اور پھر عملاً اس قسم کا اثر بھی دیکھنا چاہتے ہو تو اس کو یہ قسم دو یعنی اسے کہو کہ اگر میں نے یہ کام کیا ہے یا اگر میں ایسا ہوں کہ جیسے آپ کہہ رہے ہیں تو تم یہ قسم کھا کر کہو کہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ کی حول وقوۃ سے بری ہوں یعنی خدا کی حول وقوۃ مجھ سے سلب ہو جائے اور میں اپنے حول وقوۃ پر اعتماد کروں گا، پھر ممکن نہیں ہے کہ یہ قسم رد ہو جائے اور اس کا نمونہ بھی موجود ہے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو جب اپنے ہی قریبیوں میں سے بعض نے متہم کیا، ان کی جاسوسی کی اور دربار میں جا کر ہارون سے کہا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہارون کو برا بھلا کہا ہے تو اس نے امام علیہ السلام کو دربار میں بلانے کے لئے غلام بھیجا اور پوچھا کہ فلاں نے آپؑ کی شکایت کی ہے، امام علیہ السلام نے جو کچھ کہنا تھا سامنے ہی کہہ دیا، کہا کہ مجھے تیری پیٹھ پیچھے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ابھی بھی تجھے صحیح انسان نہیں سمجھتا ہوں، تو عادل حکمران نہیں ہے اور یہ تیرا حق نہیں ہے، اور بھی جو کچھ کہنا تھا منہ پہ کہہ دیا پھر فرمایا کہ میں نے اس طرح سے نہیں کہا ہے کہ جیسے اس شخص نے تجھے

خبر دی ہے، وہ شخص بھی موجود تھا چونکہ وہ ہارون کا قرب چاہتا تھا، ہارون نے اس کو بلایا اور کہا کہ گواہی دیتے ہو کہ موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہمارے بارے میں یہ بات کی ہے؟ اس نے فوراً جھوٹ کہہ دیا کہ ہاں میں شہادت دیتا ہوں، میں گواہ ہوں کہ انہوں نے یہ بات کی ہے، حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ سچ کہہ رہا ہے تو قسم کھائے، اس کو تھوڑا سا تردد ہوا لیکن اُدھر سے جان کا خوف بھی تھا اور اگر قسم نہیں کھاتا تو جھوٹا کہلاتا لہٰذا حاضر ہو گیا اور اس نے فوراً کوئی رائج قسم کھالی، اس کے بعد ہارون نے کہا کہ اب تو اس نے قسم بھی کھالی ہے، امام علیہ السلام نے فرمایا کہ جس طرح سے میں اس کو قسم دوں گا یہ وہ قسم کھائے، امام علیہ السلام نے اس کو قسم دی اور قسم یہی تھی کہ تم یہ قسم کھاؤ کہ اگر میں اس گواہی اور شہادت میں کہ جو میں نے دی ہے جھوٹ بول رہا ہوں تو خدا اپنی حول وقوۃ مجھ سے سلب کر دے اور میں اپنی حول وقوۃ سے اٹھوں اور بیٹھوں گا، چونکہ اس جھوٹے اور کاذب شخص کو بھی معلوم تھا کہ اس نے امام علیہ السلام پر جھوٹ اور اختراع باندھا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے سوچا کہ شاید پہلے والی قسم کی طرح اس کا اثر بھی زائل ہو جائے گا اور اس کو ہارون کی شمشیر کا بھی خطرہ تھا لہٰذا اس نگوں بخت نے یہ قسم کھالی، اب ہارون نے کہا کہ جو قسم آپ نے دی تھی اس نے وہ بھی کھالی ہے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اب مجھے قبول ہے، اب آپ اسے یہاں سے لے جائیں، ہارون نے اسے حکم دیا کہ چلے جاؤ لیکن وہ نہیں ہلا، بالآخر وہ شہنشاہی اور پادشاہی جلال میں آیا اور زیادہ سختی کے ساتھ کہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، بعد میں غصے میں آ کر اس نے درباریوں کو بلایا اور کہا کہ اسے لے جا کر باہر پھینک دو، انہوں نے جتنا زور لگایا لیکن وہ اسے وہاں سے اٹھا ہی نہ سکے، وہ وہیں پر

اپنی حول وقوت سے تبرا

خشک ہوگیا تھا، نہ اس کے ہاتھ پاؤں ہلتے تھے، نہ اس کے جسم میں کوئی حرکت تھی اور نہ ہی اسے کوئی ہلاسکتا تھا، کیوں؟ چونکہ خدا نے اپنی حول وقوۃ اس سے وہیں سلب کرلی تھی، اب اسے اپنے حول وقوۃ سے چلنا تھا، اپنے حول وقوۃ سے حرکت کرنی تھا، پس انسان حول وقوۃِ خدا پر بھروسہ کرے اور اپنے حول وقوۃ سے برائت کا اعلان کرے ورنہ یہ قارونیت ہے۔

۷)قارونِ علمی نہ بنیں

قارون سے جب لوگوں نے کہا کہ تجھے خدا نے اتنا مال دیا ہے لہٰذا اسے خدا کی راہ میں خرچ کرو، اس وقت بھی ہزاروں لاکھوں قارون موجود ہیں کہ جن کے پاس خدا کا دیا ہوا فراواں مال موجود ہے اور اگر انہیں کہا جائے کہ خدا کا دیا ہوا خدا کے لئے خرچ کرو تو یہ حاضر نہیں ہیں، قارون نے کیا جواب دیا؟

قَالَ اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ ....(۲)

قارون نے کہا کہ مجھے یہ سب کچھ میرے علم کی بنیاد پر دیا گیا ہے۔

یعنی یہ میری اپنی کوششوں، میری اپنی مشقتوں، میری اپنی زحمتوں اور خون پسینے بہانے کا نتیجہ ہے، یہ میرے اپنے حول اور قوۃ کا نتیجہ ہے، یہی قارونیت ہے، اگر ایک شخص کے پاس مال ہو اور پھر کہے کہ یہ میری اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے تو یہ قارون ہے، یہ متبری انسان نہیں ہے، اس نے اپنے حول وقوۃ سے برائت نہیں کی ہے، اگر عالم ہے اور اس سے پوچھو کہ آپ اس مقامِ علمی تک کیسے پہنچے

تو وہ بتانا شروع کر دیتا ہے، میں چھوٹا سا تھا، میں بہت ذہین تھا اور اسکول میں اول آیا کرتا تھا، پھر کالج میں اول آیا کرتا تھا، مدرسے میں اول آتا تھا، میں بہت محنت کرتا تھا، میں یہاں بھی پڑھتا تھا وہاں بھی پڑھتا تھا یعنی سب میں ''میں'' ہے کہ میں ایسا تھا، میں ویسا تھا لیکن کہیں بھول کے بھی اس کی زبان سے ادا نہیں ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اگر کوئی شخص پوچھتا کہ اس عظیم مقام تک کیسے پہنچ گئے؟ تو ایک دفعہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ میں غاروں میں بیٹھتا تھا، میں محنتیں، ریاضتیں اور عبادتیں کرتا تھا اور اس طرح یہاں پر پہنچ گیا بلکہ خداوند تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر کسی کو بتانا ہے تو کیا بتاؤ؟

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ٥ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ٥ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ٥ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ٥ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ٥ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ٥ (۳)

کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر پناہ دی؟ اور اس نے آپ کو ناواقف پایا تو آپ کو راستہ دکھایا؟ اور آپ کو تنگدست پایا تو مالدار کر دیا۔ لہٰذا اب یتیم کی توہین نہ کریں۔ اور سائل کو جھڑکی نہ دیں۔ اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کریں۔

لوگوں کو یہ بتاؤ کہ میں کیسے اس مقام تک پہنچا، یعنی میں کچھ بھی نہیں تھا، میں فقیر تھا اور خدا نے مجھے غنی بنا دیا، میں یتیم تھا اور خدا نے مجھے نبی بنا دیا، میں کچھ بھی نہیں تھا اور خدا نے مجھے سب سے افضل بنا دیا، لوگوں کو یہ بات بتاؤ کہ یہ خدا نے مجھے بنا دیا ہے۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ٥

اوراپنے رب کی نعمت کو بیان کریں۔

نہ کہ اپنے کمالات، اپنی محنتیں، اپنی زحمتیں اور اپنی کوششیں لوگوں کو بتاؤ کہ یہ عینِ شرک ہے، قارونِ علمی وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں کہ یہ سب ہمارا اپنا حاصل کیا ہوا ہے، یہ متبری انسان نہیں ہیں، یہ متولی بھی نہیں ہیں، ان کے اندر تولا بھی نہیں ہے یعنی یہ کبھی بھی قریب نہیں ہوسکتے ہیں، یہ لوگ معرفت کے ذریعے اور عمل کے ذریعے بھی خدا کے قریب نہیں ہوسکتے ہیں، قرآن مجید نے اس مطلب کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جب تک انسان تبری نہ کرے تو وہ کہیں بھی نہیں پہنچ سکتا ہے، سورۂ مبارکہ یوسفؑ میں اگرچہ بزبانِ حضرت یوسف علیہ السلام اس کو ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ مطلب عمومی ہے، سورۂ مبارکہ یوسفؑ میں ہے کہ

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ إِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ٥(۴)

اور میں اپنے نفس کو بھی بری قرار نہیں دیتا کہ نفس بہر حال برائیوں کا حکم دینے والا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے کہ وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ......

یعنی میں اپنے نفس کو منزہ نہیں سمجھتا ہوں، یعنی یہ نہیں کہتا ہوں کہ میں پاک انسان ہوں، میں بڑا پرہیزگار انسان ہوں، میرے اندر کوئی نقص نہیں ہے،

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ......

قارونِ علمی کی مذمت

یعنی نفسِ امارہ ہمیشہ انسان کو سوء کی طرف مائل رکھتا ہے، ہمیشہ انسان کو غلطی کی طرف، انحطاط و پستی کی طرف مائل رکھتا ہے،

اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ......

مگر یہ کہ جو مرحوم ہو، جو مصداقِ رحمتِ خدا ہو، رحمتِ خدا جس کے شاملِ حال ہو جائے، ورنہ اگر خدا نے کسی سے اپنی رحمت لے لی اور اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا، اپنے نفس کے حوالے کر دیا تو یہ انسان تباہ ہے۔

۸) جسے خدا اپنے حال پہ چھوڑ دے وہ مغضوب ہے

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں دو شخص مبغوض ترین اور مغضوب ترین ہیں، ان میں سے ایک وہ شخص ہے کہ

رَجُلٌ وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلٰی نَفْسِهٖ.....(۵)

ایسا مرد جسے خدا نے اس کے حال پہ چھوڑ دیا ہے......

جسے خدا نے اس کے نفس کے حوالے کر دیا ہے، اس کی ضمام اسی کو تھما دی ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ میں نے ایسا کیا، میں نے ویسا کیا تو پھر خدا اس کی ضمام اسی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور یہ اسی علم کے ذریعے سے جہاں طلبی و خواہش پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے چونکہ خدا نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے لیکن جو کہتے ہیں کہ نہیں میں کچھ بھی نہیں تھا اور مجھے خدا نے یہ سب کچھ عطا کیا ہے تو پڑھ

لکھ کربھی خدااس کا حافظ اورنگہبان ہوتا ہے چونکہ انسان ہے بالآخر انسان معرضِ خدا میں اگر خطا بھی کرنا چاہے تو ایسے اسبابِ غیبی پیدا ہو جاتے ہیں کہ اسے خطا سے روک دیا جاتا ہے، اسے ہلاک ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔

قارونِ علمی، قارونِ عملی اور مختلف میدانوں کے قارون موجود ہیں، یہ نہ کہیں کہ ہم نے اپنے بھروسے پر اور اپنی حول وقوۃ سے یا اپنی ذہانت وفطانت سے یہ سب مقام ومنصب حاصل کیا ہے۔ یہ سب قارونیت ہے، سب سے برا انسان بھی وہی ہے کہ جس کو خدا نے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہو۔ جسے خدا اسی کے نفس کے حوالے کردے، جس سے خدا اپنی رحمت روک لے اس کا کوئی ہادی و رہنما بھی نہیں ہے،

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ٥(٦)

جسے اللہ گمراہ کرے کوئی اس کی ہدایت کرنے والا نہیں اور اللہ ایسے لوگوں کوان کی اپنی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

خدا اگر کسی کو اپنے حال پر چھوڑ دے، اضلالِ خدا یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت چھوڑ دی، اپنے حال پر چھوڑ دیا کہ دیکھیں یہ اپنے حول وقوۃ سے کیسے ہدایت پاتا ہے؟ چونکہ ماسوا اللہ کوئی ہے بھی نہیں، جس کو خدا اپنے حال پر چھوڑ دے تو وہ شخص اس دنیا میں حیران وسرگرداں اور پاگلوں سے بدتر ہو جاتا ہے لہٰذا ہمیں کہا بھی گیا ہے کہ خدا سے یہی دعا مانگو کہ

رَبَّنَا لَا تَكِلْنَا اِلٰى اَنْفُسِنَا طَرْفَةَ عَيْنٍ اَبَدًا... (٧)

جسے خدا اپنے حال پر چھوڑ دے وہ مغضوب ہے

یعنی اے میرے رب مجھے پلک جھپکنے کی حدتک بھی میرے اپنے حال پر نہیں چھوڑنا، چونکہ مجھ میں کوئی حول وقوۃ نہیں ہے، انسان میں کوئی حول وقوۃ نہیں ہے بلکہ سب خدا کی طرف سے ہے، پس انسان قرآن پڑھتے ہوئے پہلی برائت اپنے حول وقوۃ سے کرے، مغروروں کی طرح قرآن نہ پڑھے کہ میں کتنا اچھا قرآن پڑھتا ہوں؟ میں کتنا اچھا قرآن سمجھتا ہوں؟ میں قرآن کی کتنی اچھی تفسیر کرتا ہوں؟ یہ سب ''میں میں'' بیچ میں سے ہٹادے، اپنے حول وقوۃ پہ اعتماد چھوڑ کر فقط خداوند تبارک وتعالیٰ کے حول وقوۃ پر اعتماد کرے تاکہ یہ سفر طے کر سکے اور قرآن سے اس کو کچھ حاصل ہو، عبادتوں سے کچھ حاصل ہو، علم ومعرفت سے کچھ حاصل ہو، خواہ نہ خواہ غیر اللہ یعنی خدا کے علاوہ کسی اور پر بھی بھروسہ نہ کرے یعنی کسی غیرِ خدا کے حول وقوۃ پر اعتماد نہ کرے، یہ نہ کہنا کہ فقط میں خود پر اعتماد نہیں کرتا ہوں لیکن خدا کے علاوہ کسی اور پر بھی اعتماد کرتا ہوں، کسی اور کے حول وقوۃ پر بھی اعتماد کرتا ہوں بلکہ یہاں پر بھی برائت کی ضرورت ہے، فقط حول وقوۃِ خدا، فقط فرصت وتوفیق کہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے حاصل ہوگی میں اسی کی بنا پر کسی مقام تک پہنچ سکوں گا۔

۹) برائت کا دوسرا مرتبہ

برائت کا ایک اور مرتبہ یہ ہے کہ انسان جب قرآن میں درجہ بہ درجہ ہمراہ با قرآن جاتا ہے جیسے کہ اشارہ ہوا کہ انسان درجہ بہ درجہ مترقی ہے، الفاظِ قرآن سے معانیٔ قرآن تک، معانیٔ قرآن سے حقائقِ قرآن تک اور پھر صفاتِ قرآنی تک درجہ بہ درجہ قرآن کے ہمراہ جاتا ہے، قرآن میں

انسان کو بہت ساری آیات سے سروکار پڑتا ہے لہٰذا قرآن نے جو فضائل ذکر کئے ہیں ان فضائل سے تبریٰ اختیار کرے، یعنی اپنے آپ کو ان فضائل کا مصداق نہ سمجھے، مثلاً جب یہ آیہ پڑھے کہ

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ... (۸)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ ان انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے......

تو یہ نہ کہے کہ

وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقًا○

اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

یعنی میں منعم علیہم میں سے ہوں۔ میں صالحین، صدیقین اور مرسلین میں سے ہوں، جب جنت کا تذکرہ آئے تو یہ مجھے کہا جا رہا ہے، یہ سارے مقامات میرے لئے ذکر کئے ہیں، بلکہ یہاں سے تبریٰ کرے کہ میں ان کا مصداق نہیں ہوں البتہ خواہش مند ضرور ہوں، خدا سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سب مجھے حاصل ہو جائے لیکن میں ایسا ہوں نہیں اور اس کے بجائے جو آیاتِ سرزنش، آیاتِ مذمت اور آیاتِ عذاب و وعید ہیں یہاں اپنے آپ کو کہے کہ میں ان کا مصداق ہوں۔

۱۰)انسان اپنی معرفت پیدا کرے

صدرالمتالہین یہاں پراس کے لئے ایک بہت خوبصورت مقدمہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ کلید اگرانسان کے ہاتھ آجائے، یہ چابی یہ نکتہ کہ جو یہاں پر اشارہ ہورہا ہے یہ اسی مطلب کو سمجھانے کے لئے ہے کہ انسان تبریٰ کیوں کرے؟ انسان قرآن کے اندر، عبادتوں کے اندر، علم کے اندر اپنے آپ کو یہ نہ کہے کہ میں ان بہترین لوگوں، بافضیلت لوگوں اور میں اشرف المخلوقین کا مصداق ہوں، اس لئے کہ اگرانسان پہلے خود اپنی پہچان وشناخت کرلے تو پھر یہ ساری چیزیں میسر آتی ہیں مثلاً ابھی ہم کسی کے سامنے جا کر ترقی وتولی وتبریٰ اور یہ سارے آدابِ قرآن بیان کریں لیکن ابھی تک اس کو انسان ہی سمجھ میں نہ آیا ہو، خود فراموش ہو، اسے یہ ہی معلوم نہ ہو کہ انسان کیا ہے؟ اور میں کیا ہوں؟ تو اس کے لئے یہ سب چیزیں لایعنی ہیں، بے معنی وفضول باتیں ہیں، اگرانسان اپنے آپ سے باخبر نہ ہو، خود شناس نہ ہو بلکہ خود فراموش ہو تو یہ ساری چیزیں اس کے لئے لایعنی ہوجاتی ہے حتیٰ معاذ اللہ قرآن اس کے لئے بے فائدہ اور بے معنیٰ ہوجاتا ہے، اکثریت قرآن سے اس طرح سے بے اعتنائی وچشم پوشی کرتی ہے کہ انسان تعجب کرتا ہے کہ اس طرح سے تو لوگ ایک معمولی کتاب حتیٰ ایک نیوز پیپر (Newspaper) سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے۔

نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ٥(۹)

تو اہلِ کتاب کی ایک جماعت نے کتابِ خدا کو پسِ پشت ڈال دیا گویا کہ اسے جانتے ہی

نہیں......

کتاب خدا کو پسِ پشت ڈالا ہوا ہے، اخباروں، ڈائجسٹوں، فلموں، ڈراموں، انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلز کو اہمیت دیتے ہیں لیکن قرآن کی آیات اور قرآن کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ اس عالم میں تو دینی بھی نہیں چاہئے یعنی ایک معمولی چیز کی حد تک بھی اہمیت نہیں دیتے ہیں اور نہیں دینی چاہئے، کیوں نہیں دینی چاہئے؟ اس لئے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے، کتابِ انسان ساز ہے یعنی انسان بنانے والی کتاب ہے اس لئے اس کے اندر ٹریکٹر بنانے، موٹر سائیکل بنانے، انجن بنانے، جہاز بنانے اور خلائی شٹل بنانے کا تذکرہ کہیں بھی نہیں ہے، سب انسان سازی کیلئے ہے، جو کچھ قرآن نے ذکر کیا ہے وہ انسان بنانے کیلئے ہے۔ بارہا عرض ہوا ہے کہ جیسے آدابِ فہم قرآن ہے اسی طرح سے شناخت قرآن بھی اپنی جگہ پر ایک الگ موضوع ہے کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، ہدایت سے متعلقہ ہر رکوع اس قرآن کے اندر موجود ہے، ہر صغیر و کبیر اس کے اندر موجود ہے لیکن جو چیز ہدایت سے ہٹ کر ہے اور ہدایت سے تعلق نہیں رکھتی ہے تو قرآن نے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔

شناختِ انسان کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے، قرآن نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے اور وہ ہے انسان شناسی، قرآن نے انسان کو انسان سمجھایا ہے، جب انسان کو انسان سمجھ آئے گا تو قرآن سمجھ میں آئے گا اور اس وقت دین بھی سمجھ میں آئے گا، یہ قانون ہے اور اس قانون کو سمجھ لیں، یہ قاعدۂ عامہ سب کے لئے ہے، وہ یہ ہے کہ جو چیز بھی انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ چیز کبھی بھی سمجھ میں نہیں آئے گی، مثلاً جو قانون انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ قانون

سمجھ میں نہیں آسکتا ہے، جو ہدایت انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ ہدایت سمجھ میں نہیں آسکتی ہے، جو کتاب انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ کتاب سمجھ میں نہیں آسکتی ہے، جو ضابطہ انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ ضابطہ سمجھ میں نہیں آسکتا ہے۔ پہلے ہمیں انسان سمجھنا پڑے گا، آغاز اسی خودشناسی سے کریں،

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ......(۱۰)

جس نے اپنے آپ کو پہچانا تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا......

درحقیقت انسان خود نقطۂ آغازِ معرفتِ عالم ہے، خود اپنے آپ سے شروع کرے تو پھر اس کو ساری دنیا سمجھ میں آجائے گی، خداوند تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا......(۱۱)

جس نے زمین کے تمام ذخیروں کو تم ہی لوگوں کے لئے پیدا کیا ہے......

لیکن یہ سب کچھ تمہیں تب سمجھ میں آئے گا جب پہلے خود کو سمجھو گے،

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ٥(۱۲)

اور خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کے نفس کو بھی بھلا دیا اور وہ سب واقعی فاسق و بدکار ہیں۔

یعنی ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ کہ جو اپنے آپ کو بھول گئے ہیں، پھر سب چیزوں کو بھول گئے ہیں، اپنے آپ کو پہچانو پھر دیکھو کہ رازِ ہستی تمہیں کس طرح سے سمجھ میں آتا ہے، کس طرح

انسان اپنی معرفت پیدا کرے

سے اسرارِ نظام اور اسرارِ نظامِ ہستی اور عالمِ ہستی کھل کھل کر تمہارے سامنے آئیں گے۔

آپ نقطۂ آغاز سے سمجھیں کہ جیسے بچوں کے لئے یا سب کے لئے ایک تعلیمی سلیبس ہوتا ہے، سب سے پہلے کیا پڑھیں؟ سب سے پہلے الف ب پڑھیں مثلاً مدرسوں میں سب سے پہلے کہاں سے پڑھیں؟ کیا عربی مقدمات سے پڑھیں؟ یہ آغاز ہے؟ نہیں، بلکہ انسان اپنا سفر اپنے آپ سے شروع کرے، اپنی شناخت سے شروع کرے۔

۱۱)انبیاء علیہم السلام انسان کو انسان بنانے آئے ہیں

وہ کام انبیاء علیہم السلام نے بھی نہیں کئے کہ جو کام بشر خود اپنے تجربے سے، علم سے، زحمت سے، محنت سے، انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر کرسکتا ہے مثلاً یہ انکشافات، یہ ایجادات انبیاء کا کام نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام اسی سرزمین پر رہے، اسی مشرقِ وسطیٰ، مڈل ایسٹ (Middle East) میں رہے لیکن انبیاءؑ نے تیل نہیں نکالا، اس مڈل ایسٹ میں اسی زمانے سے تیل موجود تھا لیکن انبیاء علیہم السلام کو تیل سے سروکار نہیں تھا، اصلاً خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو پٹرولیم نکالنے کے لئے مبعوث نہیں کیا تھا، کیوں نہیں کیا تھا؟ چونکہ پٹرولیم وہ چیز ہے کہ انسان علم و مہارت سے ترقی کرے گا اور ایک دن پٹرولیم نکال لے گا اور چلنے والی گاڑیاں اور مشینیں بھی بنا لے گا، وہ تجربہ کرتے ہوئے اجتماعی طور پر ایک دن یہاں پہنچ جائے گا لہٰذا جو کام چند آدمی مل کر کر سکتے ہیں اسی کام کو کرنے کے لئے آسمانوں سے بھی لوگ مبعوث کئے جائیں تو یہ کام عبث ہے اور خداوند نے فرمایا کہ ہمارا کوئی کام باطل اور عبث نہیں ہے۔

مثلاً ایک آدمی ایک کام کر رہا ہے، آپ اس سے کہیں کہ آغا مجھے دیں میں کرتا ہوں، حالانکہ آپ کو وہ کام کرنا چاہئے جو وہ نہیں کر سکتا ہے، عموماً ہم ان ہی لوگوں کی مدد کرتے ہیں مثلاً کسی بڑی شخصیت نے ہاتھ میں کتاب اٹھائی ہوئی ہے تو کہتے ہیں کہ آغا یہ کتاب مجھے دے دیں میں اٹھالوں گا، ادھر ہی ساتھ ایک اپاہج اور معذور انسان بیٹھا ہوا ہے کہ جس کے پاس سامان ہے اور وہ روڈ کراس (Cross) کرنا چاہے تو اسے جا کر نہیں کہتا ہے کہ مجھے اپنا صندوق دے دیں، آپ زحمت میں ہوا سے میں اٹھالیتا ہوں۔ کسی شخصیت کی کتاب اٹھالیں گے، انہیں کہیں گے کہ یہ پین (Pen) آپ کی جیب میں بھاری ہے، مجھے دیں یہ پین میں اٹھاؤں گا، جو کام وہ نہیں کر سکتا ہے آپ وہ کام کریں۔

خداوند تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام عبث نہیں بھیجے تھے یعنی ان کاموں کے لئے نہیں بھیجے تھے کہ جو کام انسان خود کر سکتا ہو، کسی نبی نے گھڑی نہیں بنائی، کسی نبی نے یہ مشینیں ایجاد نہیں کیں چونکہ خود بشر نے یہ کام کر لیا، بالآخر کھیتی باڑی انبیاء علیہم السلام نے نہیں سکھائی چونکہ بشر نے یہ کام خود کرنا ہے، آخر انسان کو مفت خورہ تو نہیں بنانا ہے کہ سب کام انبیاء علیہم السلام آ کر کر دیں اور یہ شہزادہ ہر تیار شدہ چیز سے لطف اٹھائے، ہر چیز اس کے منہ میں جائے بلکہ انسان یہ کام خود کرے، انڈسٹری خود لگائے، زراعت خود کرے، کھیتی باڑی خود کرے، تعلیم خود حاصل کرے اور اگر اس کے سامنے سب کچھ انجام شدہ لا کر رکھ دیں تو یہ ترقی نہیں کرے گا، علم حاصل نہیں کرے گا۔ حتماً اس کو صفر کی حالت میں چھوڑ دیں اور غیر منکشف دنیا بنا کر اس کے سامنے رکھ دیں تو یہ ترقی کر سکتا ہے۔

بچوں کی تربیت میں بھی یہ چیز اہم ہے، بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جو بچوں کے تسمے بھی باندھتے ہیں، بچوں کی شلواریں بھی باندھتے ہیں، بچوں کے بٹن بھی باندھتے ہیں، بچوں کے منہ میں کھانا بھی ڈالتے ہیں اور جب اسی بچے کی مونچھیں نکل آتی ہیں تو اس وقت .اس کو روٹی بھی توڑنا نہیں آتی ہے، اس وقت بھی اس کو کوئی کام نہیں آتا ہے، اس وقت بھی وہ بوٹ کا تسمہ نہیں باندھ سکتا ہے، یہ پتلون کی بیلٹ بھی نہیں باندھ سکتا ہے بلکہ ماں سارے کام کرتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام اس طرح کے لاڈلے، بے خاصیت، ارزاں اور بے ہنر افراد پالنا نہیں چاہتے تھے، انبیاء علیہم السلام نے کیا کیا؟ لوگوں کی تربیت کی، بچوں کی تربیت اس طرح کرو کہ ان میں خلاقیت پیدا کرو، بچے کو جوتا دے دو اور اسے کہو کہ خود پہنو، بچے کو لباس لا کر دے دو اور کہو کہ اس کو خود پہنو، بچے کے سامنے کھانا رکھ دو اور کہو کہ اس کو خود کھاؤ، بچے کے سامنے مجہول دنیا رکھ دو اور اسے کہو کہ اس مجہول دنیا کو تو نے خود کشف کرنا ہے، یہ بچے کے اندر خلاقیت پیدا کرنا ہے لیکن جن بچوں کو ہم خود ساری دنیا کشف کر کے دے دیتے ہیں وہ آخر تک والدین کے اوپر بوجھ رہتے ہیں، ان کو بڑھاپے تک کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے، بہت سارے ایسے ہیں کہ جن کو معمولی کام بھی کرنے نہیں آتے ہیں، چھوٹے موٹے کام، کچن (Kitchen) کے کام بھی کرنا نہیں آتے ہیں، کیوں نہیں آتے ہیں؟ اس لئے کہ یہ لاڈلے ہیں، لُوس ہیں، ان کو والدین نے سب کچھ کر کے دیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام انسانوں کو لوس بنانے نہیں آئے، انبیاء علیہم السلام انسانوں کو بے خاصیت بنانے نہیں آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام انسانوں کو متحرک کرنے کے لئے آئے اور ہنر مند بنانے کے لئے آئے، اس

لئے خدا نے مجہول دنیا ان کے سامنے رکھی کہ جا کر کوشش کرو، اس زمین کے اندر راز ہیں، اس زمین کے اندر بہت کچھ ہے، زمین کے اندر اور زمین کے باہر فضاؤں کو کشف کرو، اگر یہ سب کام ادیان کر کے دیتے تو انسان بے خاصیت ہوتا، پھر انبیاءؑ کس لئے آئے ہیں؟ انبیاءؑ اس کام کے لئے آئے ہیں کہ اگر جن و بشر، ساری کائنات اور سارا عالم حتیٰ ملائکہؑ اور ساری دنیا مل کر بھی وہ کام کرنا چاہیں تو یہ نہیں کر سکتے ہیں اور وہ کام انسان سازی ہے۔

انسان انبیاءؑ کے بغیر نہیں بن سکتا ہے، اس وقت بھی نہیں بن سکتا تھا اور آج بھی اگر انسان بنے گا تو مکتبِ انبیاءؑ سے بنے گا، آسمانی کتب کے ذریعے سے بنے گا، تعلیماتِ الٰہی کے ذریعے سے بنے گا، یہاں بشر کی نااہلی نہیں ہے، یہ اصلاً اس کے بس میں نہیں ہے، کوئی پوچھ سکتا ہے کہ یہ کام انسان خود کیوں نہیں کر سکتا ہے؟ ہاں انسان یہ کام انبیاءؑ کی تعلیم کے بغیر نہیں کر سکتا ہے، قرآنی آیات کے لب ولہجہ کو دیکھیں، قرآن نے فرمایا ہے کہ

وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ......(۱۳)

یعنی ہم نے تمہیں وہ چیزیں سکھائی ہیں کہ جو تم سیکھنے والے ہی نہیں تھے۔

نہ کہ ہم نے وہ چیزیں سکھائی ہیں کہ مالم تعلم، یعنی ہم نے آپ کو وہ باتیں بتائی ہیں کہ جو آپ نہیں جانتے تھے۔

ہمیشہ سب کے ساتھ ایسے ہی ہوتا ہے کہ انسان جو باتیں نہیں جانتا ہے اسے کوئی اور انسان سکھا دیتا ہے لیکن قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ علمکم ما لم تعلم بلکہ قرآن کہہ رہا ہے

وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ......

کہ ہم نے آپ کو وہ باتیں سکھائی ہیں کہ جو تم جاننے والے ہی نہیں تھے، جان ہی نہیں سکتے تھے، ان کو جاننے کی صلاحیت ہی تمہارے اندر نہیں تھی، اگر ہم نہ بتاتے اور اگر ہماری طرف سے وہ باتیں نہ ہوتیں تو تمہارے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ ان کو سیکھتے اور جانتے، وہ ساری چیزیں انسان سازی کے اندر منحصر ہو جاتی ہیں، پس شناختِ انسان ضروری ہے۔

۱۲)انسان ترقی پذیر ہے

انسان کی شناخت کے اندر ایک نکتہ کہ جو قرآن نے بھی بتایا ہے یا جب انسان اپنے آپ کو سمجھنا شروع کرتا ہے تو اسی فہم اور شناختِ خود میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جہاں پر انسان ایک بہت بڑے راز، حیرت انگیز راز اور شگفت انگیز راز سے آشنا ہوتا ہے، ایسا پر اسرار راز کہ انسان ساری عمر اسی راز میں حیرت میں گزار دے تو درست ہے اور انسان نے اس کے اندر عمر ضائع نہیں کی، وہ کونسا راز ہے؟ وہ راز جو ابھی ہم نے سنا ہوا ہے لیکن اس تک پہنچے نہیں ہیں، جیسے بہت سارے گنج ہیں، خزانہ کسی جگہ دفن ہے اور ہم نے سنا ہوا ہے لیکن ہم نے دیکھا نہیں ہے، آج تک اس خزانے تک پہنچے نہیں ہیں، اسی طرح ہم نے بہت سارے راز سنے ہوئے ہیں لیکن ان رازوں کا فقط تذکرہ سنا ہے ان تک پہنچے نہیں ہیں، وہ راز کونسا ہے؟ وہ یہ ہے کہ انسان موجودِ مستکمل ہے، انسان موجودِ تکامل پذیر ہے۔ جس طرح سے کہتے ہیں کہ فلاں ملک ترقی پذیر ہے ترقی یافتہ نہیں ہے اسی طرح انسان

کمال یافتہ پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ کمال پذیر پیدا ہوا ہے، یہ بہت بڑا راز ہے، اگر کسی کے اوپر کھل جائے، اگر معرفت کے اندر آجائے کہ انسان کمال پذیر ہے۔

اگر آسان الفاظ میں اور اصطلاحوں سے دور ہو کر بات کریں کہ سب کی سمجھ میں آجائے تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان بنا ہوا نہیں آیا ہے بلکہ بننے کے لئے آیا ہے، خدا نے انسان کو بنا کر پیدا نہیں کیا ہے بلکہ بننے کیلئے پیدا کیا ہے، اسی کو تکامل پذیری کہتے ہیں، انسان ناقص ہے، اسفل سافلین میں ہے، عالمِ ادنیٰ میں ہے اور کسی لحاظ سے اس کے اندر کمالات نہیں ہیں، یہاں سے اس کو آغازِ تکامل کرنا ہے، اس کو ایک ایک کر کے، دھیرے دھیرے نقطۂ عروج تک پہنچنا ہے، کہاں تک؟ کہ جب سارے کمالات کہ جو انسان کے لئے مقرر ہیں، وہ سارے اس کے اندر پیدا ہو جائیں۔ یہ بالکل خالی از کمال ہے اور اس کو وہاں پہنچنا ہے کہ جتنے کمالات اس کے لئے مقرر کیے ہوئے ہیں وہ سارے اس کے اندر آجائیں، یہ راز اگر کشف ہو تو معلوم ہو جائے کہ یہ بہت لمبا سفر ہے، انسان کے سامنے بہت دشوار سفر ہے،

اسی لئے خداوند نے فرمایا تھا

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (۱۴)

کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے۔

اس کو اصلاً خبر ہی نہیں ہے، نہ دشواری کا احساس ہے اور نہ اسے اطلاع ہے، یہ بے خبر ہے کہ کیا کر رہا ہے؟ کس راستے میں اس نے قدم رکھا ہے؟ اس کو کس طرف جانا ہے؟ یہ اپنے آپ سے

بھی آگاہ نہیں ہوگا؟ یہ اتنا جہول ہے کہ اپنی شناخت بھی نہیں کر پائے گا اور ظلوم اتنا ہے کہ یہ اس راہ کو طے کرنے سے بھی عاجز آئے گا، نتیجتاً بجائے انسان بننے کے ان آیات کے زمرے میں شمار ہوگا کہ

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ٥(١٥)

اب ذِلّت کے ساتھ بندر بن جائیں......

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا٥(١٦)

یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

یہ بجائے انسان بننے کے اَلْحِمار یا اَلْکَلْب بن جائے گا، بجائے انسان بننے کے پست از انسان بن جائے گا، یہ انسان ظلوم وجہول ہے، جن لوگوں نے اپنی شناخت کر لی اور جنہیں یہ راز مل گیا تو وہ اعلیٰ علیین تک جا پہنچے، وہ عالمِ ملکوت تک جا پہنچے گا، وہ راہنمائے قافلہ بشریت بنے۔

١٣)موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا،ترقی کی ضمانت

وہ لوگ کہ جنہیں یہ راز پتہ چل گیا ہے کہ انسان موجودِ مستکملِ کمال پذیر ہے، کمال یافتہ نہیں ہے پس جب کمال پذیر ہے تو انسان کو یہ احساس ہو کہ میری موجودہ حالت کہ جس حال میں ابھی میں موجود ہوں، اس سے مجھے نکلنا ہے اور نکل کر مجھے اپنی دوسری حالت کہ جو کمال کی حالت ہے اس تک جانا ہے، اس کے لئے انسان کو حرکت کی ضرورت ہے، حرکت اسی وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب انسان اپنی موجودہ حالت کو چھوڑ کر غیر موجود حالت یا مطلوب حالت کی طرف قدم بڑھائے

لیکن اس کے لئے ایک باریکی ہے، یہاں پر ایک لطافت موجود ہے، بالفرض انسان کو سمجھ بھی آجائے کہ میں تکامل پذیر ہوں، ناقص ہوں اور مجھے کمال حاصل کرنا ہے تو پھر بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کے اندر حرکتِ تکاملی پیدا ہو جائے یعنی انسان حرکت شروع کر دے اور کمال کی طرف بڑھنا شروع کر دے، یہ آگاہی کافی نہیں ہے، ایک اور چیز بھی ضروری ہے اور قرآن نے وہ نکتہ بھی ذکر کیا ہے یعنی وہ لطیف ترین مطلب قرآن نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان جب تک اپنی موجودہ حالت پر راضی ہے تو کبھی بھی اس کے اندر حرکت پیدا نہیں ہو سکتی ہے، وہ انسان کبھی بھی حرکتِ تکاملی نہیں کر سکتا ہے کہ جب تک اپنی موجودہ حالت پر راضی ہے۔

موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا ترقی کی ضمانت

بالآخر ہم سب کی بلا استثنا ایک موجودہ حالت ہے، البتہ اس میں بھی فرق ہے، کسی کی موجودہ حالت بہت خراب ہے، کسی کی موجودہ حالت اس سے نسبتاً بہتر ہے، کسی کی موجودہ حالت اس سے بھی بہتر ہے، کسی کی موجودہ حالت بہت ہی ابتر ہے، انسانوں کی موجودہ حالت کا اگر آپس میں موازنہ کریں تو یہ ایک جیسی نہیں ہیں لیکن جو جس حالت میں بھی ہے وہ دوسروں کی نسبت بہتر حالت میں ہے یا ابتر حالت میں ہے، انسان اس وقت حرکت کرے گا کہ جب تک اپنی موجودہ حالت پر راضی نہ ہو۔

چہ بسا انسان کی حالت خوب نہیں ہے لیکن اسی ابتر حالت پر راضی ہے، بہت سارے ہیں کہ جو حالتِ پستی پہ راضی ہیں، عموماً کہتے بھی ہیں کہ راضی بہ رضائے خدا، خدا بھی اس پر راضی ہے اور میں بھی اس پر راضی ہوں، عموماً فقراء، نادار اور بے کس لوگ کہتے ہیں کہ ہم راضی ہیں، راضی بہ فقر ہیں

یہ کبھی بھی انسانِ غنی اور امیر نہیں ہو سکتے ہیں، یہ کیوں راضی ہیں؟ اور کون لوگ ہیں کہ جو مال کی طرف، دنیا کی طرف اور غنائے مالی وثروتِ مالی کی طرف بڑھتے ہیں اور ایک دن غنی ہو جاتے ہیں؟ یہ وہ ہیں کہ جو اپنی موجودہ فقر کی حالت پر راضی نہ تھے، کون لوگ عالم بن جاتے ہیں؟ جو اپنی موجودہ جہالت کی حالت پر راضی نہ ہوں بلکہ سخت ناراض و برہم ہوں کہ میں کیوں اس حالت میں ہوں؟

بعض ایسے ہیں کہ جو رنگت کے لحاظ سے مختلف ہیں، خصوصاً اگر زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے مثلاً شادی کا یا سفر کا تو اپنی رنگت پہ پشیمان ہوتے ہیں کہ میرا رنگ تھوڑا مدہم ہے، گندمی ہے یا سانولا ہے یا مثلاً سیاہ ہوں اور وہ اس رنگت پہ راضی نہیں ہیں تو دنیا جہان کی کریمیں اور پوڈر لے کر استعمال کرتے رہتے ہیں، سارے مشغلے چھوڑ چھاڑ کر فقط اپنی رنگت بدلنے پہ لگ جاتے ہیں لیکن جو اپنی رنگت پہ راضی ہیں کہ جیسا بھی رنگ ہے، جو خدا نے بنا دیا ہے تو بنا دیا ہے لہٰذا وہ کچھ بھی نہیں کرتے ہیں، کوئی کریم، کوئی پوڈر یا کوئی اور چیز استعمال نہیں کرتے ہیں چونکہ اس پر راضی ہیں، فرض کریں کسی کو ایک جھونپڑا ملا ہوا ہے اور وہ اسی جھونپڑے پہ راضی ہے تو یہ کبھی بھی کوٹھی، بنگلہ نہیں بنا سکتا، آپ اس کو عمر بھر کبھی بھی بنگلے میں نہیں دیکھیں گے چونکہ یہ اس پر راضی ہے، ایک انسان پیدل چلنے پر راضی ہے تو یہ کبھی بھی گاڑی نہیں لے گا، پیسے آ بھی جائیں تو بھی گاڑی نہیں لے گا چونکہ یہ اس حالت پر راضی ہے، اس کو کوئی تکلیف نہیں ہے، یہ ناراض نہیں ہے، انسان کی حالت خواہ ابتر ہو یا بہتر اگر یہ ابتر و بہتر پر راضی ہے تو یہ حالت کبھی بھی نہیں بدلے گی، یہ صرف اس وقت بدلے گی کہ جب انسان راضی نہ ہو، اس لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کو کہا ہے کہ جو اپنی اسی حالت پر راضی

موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا ترقی کی ضمانت

ہیں یہ کبھی بھی لقاءِ پروردگار پر فائز نہیں ہوسکتے۔

سورۂ مبارکہ یونس میں ہے کہ جہنمی جہنم میں کیوں پہنچیں گے؟، جہنمیوں کے جہنم جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنی موجودہ حالت پر راضی ہیں۔اس کو ہم اجتماعیات، عائلی یا خاندانی مسائل، انفرادی دنیا، علمی، عملی وعبادی میادین میں بھی لا کر دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں؟ مثلاً ایک خاندان اپنی موجودہ حالت پر راضی ہے لہٰذا بہتر نہیں ہوتا یا عوام اور خواص کی اکثریت جب ایک موجودہ سیاسی حالت پر راضی ہو تو کبھی بھی اپنی اصلی حالت کو بدلنے کی کوشش نہیں کرے گی لہٰذا ایسے ملکوں میں کبھی انقلاب نہیں آتا ہے۔

پاکستان میں جتنے انقلابی کالم چھپتے ہیں اتنے انقلابی ترین ملکوں میں بھی نہیں چھپتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے، مثلاً اس وقت بھی آپ بہت بڑے انقلابی موجود ہیں از جملہ ایران ہے جو انقلابی ملک ہے، کیوبا ایک انقلابی ملک ہے یا اس طرح کے اور ممالک کہ جہاں انقلابی فضائیں پائی جاتی ہیں لیکن ان کے اندر بھی جا کر دیکھیں تو اتنے انقلابی مضامین نہیں چھپتے ہیں کہ جتنے پاکستان میں چھپتے ہیں، کالم نگار لکھتے ہیں لیکن یہ سب لکھ پڑھ کر ایک مثقال برابر بھی حالات کے اندر فرق نہیں آتا ہے، کیوں نہیں آتا ہے؟ اس لئے کہ کالم لکھنے سے تو کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے، موجودہ حالت پر ناراض رہنے سے، موجودہ حالت کو ناپسند کرنے سے تبدیلی آتی ہے اور وہ اس حالت پر راضی ہیں، کہتے بھی ہیں کہ الحمدللہ کہ یہ ہماری بہت بد حالت ہے، اس پر بھی راضی وشاکر ہیں، تبدیلی کہاں آتی ہے؟ جہاں انسان موجودہ حالت پہ راضی نہ ہو لہٰذا موجودہ حالت کو ترک کریں۔اس چیز کو آپ

موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا، ترقی کی ضمانت

عرفان وسلوک اور فلسفے میں بھی پرکھ سکتے ہیں، اخلاقی مسائل بھی ایسے ہی ہے، اگر ایک انسان اپنی اخلاقی حالت پر راضی ہے کہ میں جیسا بھی ہوں خوب ہوں تو یہ کبھی بھی تبدیل نہیں ہوگا، اگر یہ انسان آگاہ بھی ہو جائے کہ میں بد ہوں تو پھر بھی تبدیل نہیں ہوگا، کیوں؟ کیونکہ اپنی اسی بری حالت پر راضی ہے، جرائم پیشہ لوگ کہ انہیں بتا بھی دیا جاتا ہے کہ آپ غلط ہو اور وہ خود بھی اقرار کرتے ہیں کہ غلط ہیں لیکن پھر بھی غلط ہی رہتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ اپنی غلط حالت پر راضی ہیں، سورہ مبارکہ یونسؑ میں ہے کہ

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآئَنَا .....(۱۷)

یقیناً جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہیں......

یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جن کو اصلاً آرزوئے لقاءِ خدا نہیں ہے، لقاءِ خدا وہی نقطۂ عروج ہے یعنی جہاں پر تمام مقررہ چیزیں انسان کو نصیب ہو جاتی ہیں، اسی کو لقاءِ پروردگار کہتے ہیں، حرکتِ تکاملی میں، حرکتِ استکمالی میں جب انسان اس نقطے پر جا پہنچتا ہے مثلاً جو اس نے حاصل کرنا تھا وہ حاصل کرلیا ہے تو اسی منزل کا نام لقاءاللہ ہے، کچھ ایسے ہیں کہ جن کو لقاءاللہ کی آرزو بھی نہیں ہے،

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ......

اصلاً اندر رجا نہیں ہے، امید نہیں ہے بلکہ لقاء خدا کی نسبت یاس و مایوسی موجود ہے، یہ کون لوگ ہیں؟

وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا......

یہ وہ لوگ ہیں کہ جو لقاءِ خدا کی آرزو نہیں کرتے ہیں اور راضی ہیں، حیاتِ دنیوی پر راضی ہیں یعنی اپنی موجودہ حالت پر راضی ہیں، یہ لوگ اس سے نکلنا نہیں چاہتے ہیں،

وَاطْمَأَنُّوا بِهَا......

اور ان کو اطمینان بھی ہے، اصلاً سرے سے مضطرب بھی نہیں ہیں، جب اضطراب، پریشانی، کھٹکا، نا آرامی اور تکلیف ہو تو انسان موجودہ حالت پر راضی نہیں ہوتا ہے، مثلاً انسان بیٹھے ہوئے پہلو بدلتا ہے، سوئے ہوئے کروٹ لیتا ہے، کیوں؟ چونکہ ابھی جس پہلو پہ ہیں آپ اس میں ناراحت اور مضطرب ہیں، آپ ڈسٹرب (Disturb) ہیں، آپ کے اعضاء پریشر (Pressure) میں ہیں پس خوانخواہ اس اضطراب پر آپ راضی نہیں ہیں لہذا جب راضی نہیں ہیں تو آپ بیٹھے ہوئے پہلو بدل لیتے ہیں اور سوتے ہوئے کروٹ لے لیتے ہیں مثلاً چارزانوں ہیں تو دوزانوں ہو جاتے ہیں، دوزانوں ہیں تو چارزانوں ہو جاتے ہیں۔ یہی حالاتِ اخلاقی وحالاتِ اجتماعی کے ساتھ بھی ہے، انسانوں کے اندر کچھ ایسے لوگ ہیں کہ جو حیاتِ دنیوی پر راضی ہیں، حیاتِ دنیوی یعنی پست زندگی۔ یہ کون لوگ ہیں؟

موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا ترقی کی ضمانت

وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ○

یہ وہ ہیں کہ جو آیاتِ خدا سے غافل ہیں۔

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ○(۱۸)

یہ سب وہ ہیں جن کے اعمال کی بنا پر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

پس جہنم کن لوگوں کا ماوا ہے؟ کن لوگوں کی جگہ ہے؟ کہ جو موجودہ حالت پر راضی ہیں، پست و گھٹیا حالت پر راضی ہیں، ادنیٰ و ناقص حالت پر راضی ہیں، مثلاً جاہل ہے اور جہالت پر راضی ہے۔لوگ کیوں نہیں پڑھتے ہیں؟ کیوں مطالعہ نہیں کرتے ہیں؟ چونکہ راضی ہیں، اپنی جہالت پر راضی ہیں، جب تک کوئی جہالت پر راضی ہے تو وہ کبھی بھی ایک صفحہ بھی کھول کر نہیں پڑھے گا، جب تک انسان کو اپنی جہالت تکلیف نہ دے، جہالت اس کو ناراحت نہ کرے، جہالت اس کو مضطرب نہ کرے تو یہ کبھی بھی علم حاصل نہیں کرتا ہے، پست ترین اخلاقی حالت میں ہوتا ہے لیکن اس حالت کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، کیوں؟ کیونکہ یہ حالت اس کو تکلیف نہیں دیتی ہے، یہ اس حالت پر مطمئن ہے اور غفلت کی وجہ سے مطمئن ہے۔

۱۴)کون لوگ مطمئن ہیں؟

دو قسم کے لوگوں کو اطمینان ہوتا ہے، ایک با معرفت لوگوں کو یقین کا اطمینان ہوتا ہے کیونکہ یقین اطمینان آور ہوتا ہے اور ایک غفلت ہے کہ جو اطمینان آور ہے لہذا غافل بھی مطمئن بیٹھا ہوتا ہے اور یقین والا بھی مطمئن بیٹھا ہوتا ہے مثلاً فرض کریں کہ دو آدمی مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں، ایک اپنا جوتا ساتھ لے آیا ہے اور ایک اپنا جوتا باہر رکھ آیا ہے، چور جوتا اٹھا کر لے گیا اور دونوں مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں، ایک اس وجہ سے مطمئن بیٹھا ہوا ہے کہ جوتا سامنے پڑا ہوا ہے، اسے یقین ہے کہ میرا تو گم نہیں ہوگا، اگر باہر اعلان بھی ہو رہا ہے کہ کسی کا جوتا غائب ہو گیا ہے تو دونوں مطمئن بیٹھے ہوئے

ہیں، جس کا جوتا گم ہوگیا ہے وہ بالکل مطمئن بیٹھا ہوا ہے چونکہ وہ غافل ہے، اس کو پرواہ نہیں ہے کہ یہ کس کا جوتا تھا لہٰذا وہ بھی مطمئن ہے اور یہ بھی مطمئن ہے یا مثلاً اگر کوئی گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور گاڑی چوری ہوگئی ہے تو اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہنس کھیل رہا ہے، یہ اطمینان غفلت و جہالت کا اطمینان ہے لیکن ایک دوسرا انسان ہے کہ جس کو یقین ہے، یہ یقین کی وجہ سے مطمئن ہے، غفلت اور یقین کے ان دونوں اطمینانوں میں فرق ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو پست ترین اور گھٹیا ترین دنیوی حالت پر ہیں اور اسی پر راضی و مطمئن ہیں،

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُوْنَ٥

یہ وہ ہیں کہ جو آیاتِ خدا سے غافل ہیں۔

کچھ اہلِ یقین ہیں لہٰذا اس وجہ سے وہ مطمئن ہیں۔ پس اگر انسان اپنی موجودہ حالت پر راضی ہے تو جس حال میں بھی ہو، جس پہلو میں بھی ہو، جس میدان میں بھی ہو وہ کبھی بھی اس حالت کو تبدیل نہیں کرے گا۔

کون لوگ مطمئن ہیں؟

لہٰذا انقلابی راہنماؤں کا ایک عمل یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے لوگوں کے اندر حسِ ناراضگی پیدا کرتے ہیں مثلاً آپ امام خمینیؒ کا طریقہ کار دیکھیں، شاہ کے خلاف امامؒ نے لوگوں کے اندر شدید ترین بغض و نفرت پیدا کی، پہلے لوگ اس حالت پر راضی تھے کہ ٹھیک ہے ایک شاہ ہے جو اپنی شہنشاہیت کر رہا ہے اور ہم اپنی زندگی گزار رہے ہیں لیکن امامؒ نے آ کر ان کے اندر احساس پیدا کر دیا کہ یہ حالت اچھی نہیں ہے، ان میں سے بہت ساروں کو یہ احساس تھا کہ یہ اچھی حالت نہیں

ہے لیکن اس پر راضی تھے،

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا......

امامؒ نے آ کر ناراضگی پیدا کی کہ اس حالت پر میں راضی نہیں ہوں، اللہ راضی نہیں ہے، پھر امامؒ کے افکار سے اس ناراضگی نے معاشرے کے اندر سرائیت کی اور سب کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ ہم بھی راضی نہیں ہیں، اگر ہم راضی نہیں ہیں تو پھر کیا کرنا چاہئے؟ اس حالت کو بدلنا چاہئے، اس حالت سے نکلنا چاہئے اور ایسی حالت پہ جائیں جو رضایت بخش ہو، ایسی حالت پہ جائیں جو اطمینان آور ہو کہ جس پر ہم راضی رہیں۔ اسی طرح سے فردی طور پر دیکھیں کہ ایک انسان کسی بھی حالت میں ہے لیکن راضی ہے، سست آدمی ہے اور سستی پر راضی ہے لہٰذا یہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے، یہ کبھی بھی کوئی عمل نہیں کر سکتا ہے۔ سُستی پست اور گھٹیا دنیوی چیز ہے پس اس وجہ سے جو سستی پر راضی ہے وہ کبھی بھی کہیں نہیں پہنچ سکتا۔

پس انسان تکامل پذیر موجود ہے، یہ کمال یافتہ نہیں ہے مثلاً ایک ملک احساس شروع کر دے کہ ہم ترقی یافتہ ممالک میں سے ہیں تو یہ ملک کبھی بھی ترقی نہیں کرے گا، صرف وہ ممالک ترقی کرتے ہیں کہ جنہیں پتہ ہو کہ ہم غیر ترقی یافتہ ہیں لیکن ترقی پذیر ہیں اور ترقی کر سکتے ہیں۔ انسان بھی تکامل یافتہ اور کمال یافتہ نہیں ہے بلکہ کمال پذیر ہے لہٰذا یہ کمال پذیر اس وقت کمال کی طرف جائے گا اور اس مطلوبہ حالت کی طرف قدم اٹھائے گا کہ جب موجودہ ناگوار حالت اس کو پسند نہ ہو اور اس پر راضی نہ ہو۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ۱۶۲)

(۲)......(سورۂ مبارکہ قصص، آیہ۷۸)

(۳)... (سورۂ مبارکہ ضحیٰ، آیہ۱۱-۶)

(۴)...(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۵۳)

(۵)...(نہج البلاغہ، خطبہ۱۷)

(۶)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۸۶)

(۷)......(البلد الامین، صفحہ ۳۵۰)

(۸)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۶۹)

(۹)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۰۱)

(۱۰)...(مستدرک نہج البلاغة، الجزء ۱، صفحہ۳)(منهاج البراعة فى شرح نهج البلاغة-الخوئیؒ)(نفحات الولاية فى شرح نهج البلاغة)(شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن أبى الحديد، أبو حامد، عز الدين، المتوفى : ۶۵۶ھ، الجزء ۲۰، صفحہ۲۹۲)(جامعه علوی در نهج البلاغه، الجزء۸، صفحہ۲)

(۱۱)...(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۹)

(۱۲)...(سورۂ مبارکہ حشر، آیہ۱۹)

(۱۳)...(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۱۱۳)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۷۲)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۶۵)(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۶۶)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ۴۴)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ یونسؑ، آیہ۷)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ یونسؑ، آیہ۸)

فہرستیں

فہرست آیات 607

فہرست روایات 623

فہرست دعا و مناجات 626

فہرست اشعار 628

فہرست متفرقات 635

فہرست منابع و مآخذ 636

فہرست آیات

	آیت	صفحہ
سورۂ فاتحہ		
اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَo	۶	343
الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo	۳	356
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo	۱	356,441
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَo	۲	356,441
سورۂ بقرہ		
أُولٰئِكَ هُمُ الۡخَاسِرُوۡنَo	۲۷	32
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا......	۲۸۶	55
أَوَلَوۡ كَانَ آبَاؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ......	۱۷۰	69,170
يُخَادِعُوۡنَ اللّٰهَ وَالَّذِيۡنَ آمَنُوۡا......	۹	123
وَمِنۡهُمۡ أُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتَابَ......	۷۸	165,175,353,385
لِقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَo	۱۱۸	170
الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ......	۳	173
وَبِالۡآخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَo	۴	173
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ......	۷	173,352
ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ مِنۡ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِيَ......	۷۴	178,277,295

	آیت	صفحہ
وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَo	۴۵	180,340
وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ......	۵۸	210
وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ......	۲۳۱	259
اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ......	۲۶۸	343
سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ......	۶	352
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ......	۱۴۸	389
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ	۲۸۲	398,448,451
ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ......	۲۹	404
ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ......	۲	441
وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا......	۳۱	449
كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَo	۶۵	476,595
خُذُوْا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ......	۶۳،۹۳	477
صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ......	۱۸،۱۷۱	498
نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ......	۱۰۱	586

سورۂ آلِ عمران

هُدًى لِّلنَّاسِ......	۴	172
هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَo	۱۳۸	261,262
لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ......	۷۷	297

	آیت	صفحہ
لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَo	۶۱	382
رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ......	۱۹۳	560

سورۂ نساء

	آیت	صفحہ
لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ......	۴۳	94
نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ......	۱۵۰	213
لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًاo	۶۴	269
ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًاo	۱۱۰	269
وَلَا يَجِدُ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًاo	۱۲۳	269
اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًاo	۱۰۳	342
وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ......	۱۰۰	350
فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ......	۴۱	373
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ......	۶۹	585
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ......	۱۱۳	592,593

سورۂ مائدہ

	آیت	صفحہ
لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَo	۵۰	170
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۵۲	174
يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ......	۶۷،۴۱	251

	آیت	صفحہ
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ......	۴۸	389

سورۂ انعام

	آیت	صفحہ
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ......	۵۷	93,191
فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ......	۱۲۵	145
قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ......	۱۵	377
قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ......	۱۶۲	576

سورۂ اعراف

	آیت	صفحہ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ٥	۱۵۷	32
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ......	۱۵۶	355
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ......	۵۴	404
كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ٥	۱۶۶	476,595
خُذُوْا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ......	۱۷۱	477
فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ......	۱۴۳	495
وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا......	۱۴۳	517,551
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ......	۱۸۶	583

	آیت	صفحہ
سورۂ انفال		
أُولٰئِکَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَo	۳۷	32
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۴۹	174
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ......	۶۴،۶۵،۷۰	251
اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَاللّٰهِ الصُّمُّ الْبُکْمُ......	۲۲	256
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ......	۲	386
اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا	۲۹	447,448
سورۂ توبہ		
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۱۲۵	174
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ......	۷۳	251
وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِo	۱۲۹	428
سورۂ یونسؑ		
ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ......	۳	404
اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَائَنَا......	۷	599
أُولٰئِکَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا يَکْسِبُوْنَo	۸	600

	آیت	صفحہ
سورۂ یوسفؑ		
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ......	۴۰،۶۷	93,191
أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا......	۱۰۹	246
لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ......	۱۱۱	246
وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ......	۱۰۵	386
وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌo	۷۶	536
وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ......	۵۳	581
سورۂ رعد		
بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا......	۲	153
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ......	۲	404
سورۂ ابراھیمؑ		
وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَا آذَيْتُمُوْنَا......	۱۲	380
سورۂ حجر		
وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُo	۹۹	390
وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمَo	۸۷	428

	آیت	صفحہ
سورۂ نحل		
فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَo	۴۳	66,170
فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ......	۹۸	137
فَإِيَّایَ فَارْهَبُوْنِo	۵۱	311,313
سورۂ اسراء		
وَيَسْأَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ......	۸۵	211
لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ......	۲۲	521
كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ.....	۸۴	560
سورۂ طٰهٰ		
اِنِّی اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْکَ......	۱۲	34
رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْo	۲۵	147
اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰیo	۵	406
وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًاo	۱۱۴	473

	آیت	صفحہ
سورۂ انبیاء		
فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَo	۷	66,170
لَقَدْ أَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ......	۱۰	260
اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ......	۱	384
سورۂ حج		
خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ......	۱۱	159
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ.....	۵۳	174
لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ......	۴۶	498
سورۂ مؤمنون		
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِo	۱۱۶	427
سورۂ نور		
اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ......	۳۵	152,153

	آیت	صفحہ
سورۂ فرقان		
ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ......	۵۹	445,446
اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ......	۴۴	476,595
اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰاہُ......	۴۳	521
سورۂ عنکبوت		
اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخَاسِرُوْنَ ۝	۵۲	32
سورۂ روم		
اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ......	۹	246
سورۂ لقمان		
بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا......	۱۰	153
سورۂ سجدہ		
ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ	۴	404

	آیت	صفحہ
سورۂ احزاب		
اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ......	۷۲	48,328
فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۱۲،۶۰	174
یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ......	۱،۲۸،۴۵،۵۰،۵۹	251
اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًاo	۷۲	329,594
سورۂ سبا		
قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ......	۳۰	342
سورۂ فاطر		
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ......	۴۴	246
سورۂ ص		
قُلْ اِنَّمَا اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ......	۶۵	522
سورۂ زمر		
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَo	۶۳	32
قُلْ اِنِّیْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ......	۱۳	377

	آیت	صفحہ
سورۂ غافر (مؤمن)		
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ......	۲۱	246
أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ......	۸۲	246
يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ......	۱۶	522
سورۂ فصلت		
ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ......	۱۱	404
سورۂ زخرف		
اِنَّا وَجَدْنَا آبَائَنَا عَلٰى اُمَّةٍ......	۲۲،۲۳	69,170
سورۂ جاثیہ		
أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ......	۲۳	141
وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَاصِرِيْنَ٥	۳۴	154
ذٰلِكُمْ بِأَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا......	۳۵	154
وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ٥	۲۴	165
لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ٥	۴،۲۰	170

	آیت	صفحہ
سورۂ محمدؐ		
اِنَّمَا الْحَیَاۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ......	۳۶	143
فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ......	۲۰،۲۹	174
أَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْأَرْضِ فَیَنْظُرُوْا......	۱۰	246
سورۂ ق		
وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدِo	۱	427
فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَائَکَ فَبَصَرُکَ......	۲۲	525
سورۂ ذاریات		
فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ......	۵۰	521
سورۂ نجم		
فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا......	۲۹	384
سورۂ قمر		
وَمَا أَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِo	۵۰	496

	آیت	صفحہ
سورۂ رحمٰن		
اَلرَّحْمٰنُo	۱	209
عَلَّمَ الْقُرْآنَo	۲	209
خَلَقَ الْاِنْسَانَo	۳	209
عَلَّمَهُ الْبَيَانَo	۴	209
سورۂ واقعہ		
اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌo	۷۷	427
اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُo ......اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍo	۱-۵۰	506-509
فَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَo	۸۸	510
فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍo	۸۹	510
وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِo	۹۰	510
فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِo	۹۱	510
سورۂ حدید		
اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ....	۱۶	180
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ......	۴	404

	آیت	صفحہ
سورۂ حشر		
فَاعْتَبِرُوْا یَا أُولِی الْأَبْصَارِ o	۲	246
لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ......	۲۱	310
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ......	۱۹	588
سورۂ ممتحنہ		
یَا أَیُّهَا النَّبِيُّ......	۱۲	251
رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا وَإِلَیْکَ أَنَبْنَا وَإِلَیْکَ الْمَصِیْرُ o	۴	378
سورۂ صف		
کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o	۳	383
سورۂ جمعہ		
مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا......	۵	252
قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْا إِنْ زَعَمْتُمْ......	۶	253
سورۂ تغابن		
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا......	۷	55

	آیت	صفحہ
یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ......	۱	251

سورۂ تحریم

یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ......	۹،۱	251

سورۂ مدثر

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۳۱	174

سورۂ تکویر

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ○	۵	152,153

سورۂ انفطار

یَا اَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ○	۲	357

سورۂ بروج

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ○	۱۵	427
بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِیْدٌ○	۲۱	427

	آیت	صفحہ
سورۂ شمس		
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَاo	۷	402,410
سورۂ ضحٰی		
أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا ..... وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْo	۱۱-۶	580
سورۂ تین		
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍo	۴	410,475
ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَo	۵	475
سورۂ تکاثر		
كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِo	۵	390
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَo	۶	390

فہرست روایات

صفحہ

رسول اللہ ﷺ

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... 32,280,383,511

كَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... 32,281,383,512

أَكْثَرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ الْبُلْهُ...... 47

اَرِحْنَا يَا بِلَالُ...... 61

فَعِنْدَهَا يَكُوْنُ أَقْوَامٌ يَتَعَلَّمُوْنَ الْقُرْآنَ لِغَيْرِ اللّٰهِ 62

اِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيَ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْأَمَلِ...... 141

عَلَاقَةُ الْقَلْبِ مَعَ الدُّنْيَا تَمْنَعُ حَلَاوَةَ الْعِبَادَةِ...... 181

اِنِّي تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَبَيْتِي...... 195

أَلَا اَكُوْنُ عَبْداً شَكُوْراً...... 229

تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ...... 388

اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَأْخُذُ بِآدَابِ اللّٰهِ...... 388

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ..... 408

اِقْرَأْ وَارْقَ فَيَقْرَأُ ثُمَّ يَرْقٰى...... 463

مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ طَالِبُ دُنْيَا وَطَالِبُ عِلْمٍ...... 471

اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهْراً وَ بَطْنًا وَ لِبَطْنِهٖ بَطْنًا اِلٰى سَبْعَةِ اَبْطُنٍ اَوْ اِلٰى .. 478

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ...... 588

صفحہ

حضرت امام علی علیہ السلام

لِکُلِّ شَیْءٍ آفَةٌ وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ...... 33
مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفاً فَقَدْ صَیَّرَنِیْ عَبْدًا...... 76
اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤمِنِ...... 84
کَلِمَةُ حَقٍّ یُرَادُ بِهَا الْبَاطِلُ...... 94
اِنَّ هَاهُنَا لَعِلْماً جَمّاً... ... 104
قَوْلُ لَا أَعْلَمُ نِصْفُ الْعِلْمِ...... 169
وَجَدْتُکَ أَهْلًا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُکَ...... 338
أَوَّلُ اَلدِّینِ مَعْرِفَتُهُ...... 364
قَالَ عَلِیٌّ عَلَیْهِ السَّلَامُ: مَنْ أَتَی الصَّلَاةَ عَارِفًا بِحَقِّهَا غُفِرَلَهُ...... 364
اِقْرَأْ وَارْقَ...... 463,466,479,532,545
ظَاهِرُهُ أَنِیقٌ وَ بَاطِنُهُ عَمِیقٌ...... 478
لَمْ أَکُنْ أَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَهُ...... 499,556
مَا کُنْتُ لِأَعْبُدَ رَبّاً لَمْ أَرَهُ. 499,556
مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ...... 499,577
مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَ بَعْدَهُ...... 499,557
مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ مَعَهُ...... 499,558
فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰهِ... 521

صفحہ

لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ يَقِيناً...... 557

رَجُلٌ وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى نَفْسِهِ...... 582

امام محمد باقر علیہ السلام

وَمَنْ نَظَرَ اِلَى الْكَعْبَةِ عَارِفاً بِحَقِّهَا غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ ذُنُوبَهُ...... 364

هٰذِهِ الفَرِيضَةُ مَنْ صَلَّاهَا لِوَقْتِهَا عَارِفًا بِحَقِّهَا...... 365

امام جعفر صادق علیہ السلام

اِنَّ قَلْبَ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ...... 406

عَلَيْكُمْ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ فَاِنَّ دَرَجَاتِ الْجَنَّةِ عَلٰى عَدَدِ آيَاتِ...... 464

امام رضا علیہ السلام

مَنْ زَارَهَا عَارِفاً بِحَقِّهَا فَلَهُ الْجَنَّةُ...... 363

فہرست دعا و مناجات

صفحہ

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی حِلْمِہٖ بَعْدَ عِلْمِہٖ...... 86

☆ عَلٰی خِدْمَتِکَ...... 142

☆ مَاذَا وَجَدَ مَنْ فَقَدَکَ وَمَا الَّذِیْ فَقَدَ مَنْ وَّجَدَکَ...... 272

☆ یَا مَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُہٗ غَضَبَہٗ...... 358

☆ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَسْأَلُکَ بِالرَّحْمَۃِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَکَ...... 359

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی رَحْمَتِہِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَہٗ...... 359

☆ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَبَقَتْ رَحْمَتُہٗ غَضَبَہٗ...... 359

صفحہ

صفحہ

☆ سَبَقَتْ رَحْمَتُکَ غضَبَکَ...... 359

☆ وَأَنْتَ الَّذِیْ تَسْعٰی رَحْمَتُہٗ أَمَامَ غَضَبِہٖ...... 359

☆ فَاِنَّکَ فَعَّالٌ لِمَا تَشَاءُ.. .. 461

☆ اِلٰهِیْ وَاجْعَلْنِیْ مِمَّنْ نَّادَیْتَہٗ فَاَجَابَکَ وَلَا حَظْتَہٗ
فَصَعِقَ لِجَلَا لِکَ فَنَاجَیْتَہٗ سِرًّا...... 493

☆ بَیْنِکَ وَ بَیْنِیْ اِنِّی یُنَازِعُنِیْ فَارْفَعْ بِفَضْلِکَ
اِنِّیْ مِنَ الْبَیْنِ...... 503-504

☆ رَبَّنَا لَا تَکِلْنَا اِلٰی اَنْفُسَنَا طَرْفَةَ عَیْنٍ اَبَدًا...... 583

فہرست اشعار

صفحہ

شیخ سعدی

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عارفان جز خدا هیچ نیست 523

توان گفتن این با حقایق شناس
ولی خردہ گیرند اہل قیاس 524

کہ پس آسمان و زمین چیستند
بنی آدم و دام و دد کیستند؟ 524

ہمہ ہر چہ ہستند از آن کمترند
کہ با ہستیش نام ہستی برند 524-525

صفحہ

چو سلطان عزت علم بر کشد
جہان سر بجیب عدم در کشد 524

حافظ شیرازی

من ملک بودم و فردوسِ برین جایم بود
آدم آورد درین دیرِ خراب آبادم 526

این همه عکسِ می و نقشِ نگارین که نمود
یک فروغِ رُخِ ساقیست که در جام افتاد 496-497

مولانا روم

کار پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچه ماند در نبشتن شیر و شیر 230,366

صفحہ

همچو مجنون کاو سگی را می نواخت
بوسه اش می داد و پیشش می گداخت 334

گرد او می گشت خاضع در طواف
هم جُلابِ شکّرش می داد صاف 334

بوالفضولی گفت ای مجنونِ خام
این چه شَید است این که می آری مُدام 334

گفت مجنون تو همه نقشی و تن
اندر آ و بنگرش از چشمِ من 334

کاین طلسم بستهٔ مولی است این
پاسبان کوچهٔ لیلی است این 334

صفحہ

ھمنشین بین و دل و جان و شناخت
کاو جا بگزید و مسکن گاہ ساخت 335

او سگ فرخ رخ کہف من است
بلکہ او ہم درد و ہم لہفِ من است 335

آن سگی کہ باشد اندر کوی او
من بہ شیران کی دھم یک موی او 335

بشنو از نی چون حکایت می کند
از جدایہا شکایت می کند 456

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند 457

صفحہ

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق 457

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم 485

چشم باز و گوش باز و این ذُکا
خیرہ ام در چشم بندیِ خدا 498

حکیم ثنائی غزنوی

زینے ردو قبول عامہ خود را خرمساز
زان کار عامہ بنود جز خری یا خرخری
گاورہ دارند باور در خدائی عامیان
نوح را باور ندارانداز پئے پیغمبری 158-159

صفحہ

بھرتری ہری

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر 294

علامہ اقبالؒ

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں 123

اکبر الہ آبادی

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا 370

صفحہ

متفرق

شغلتنا عن ربنا كثرت كارنا
ومالنا وقتٌ له پروردگارنا 124

فہرست متفرقات

	صفحہ
☆ اَلْحَسُوْدُ لَا یَسُوْدُ.	145
☆ دین ما عین سیاستِ ما است و سیاست ما عین دین ما است......	201
☆ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن......	228-229
☆ مشك ان است کہ خود بوید نہ آنکہ عطار گوید،	285

فہرست منابع و مآخذ

◄القرآن الکریم

◄نهج البلاغه

◄صحیفۂ سجادّیه

◁ الف

◄اتجاهات التفسیر فی القرن الرابع عشر

◄اثنا عشر رسالة - المحقق الداماد

◄اختیار مصباح السالکین

◄اخلاق از دیدگاه قرآن، پیامبرؐ و عترتؑ

◄اخلاق در قرآن

◄ارشاد القلوب

◄اسرارِ نماز

◄اقبال الاعمال

◄الاتقان فی علوم القرآن

◄الاکـلیل فی استنباط التنزیل - عبـد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی

◀الامام عليٌ بن ابى طالب عليه السلام من حبه عنوان الصحيفة

◀الامام عليٌ ونهج البلاغه

◀الامام عليٌ- أحمد الرحمانى الهمدانى

◀الامثل فى تفسير كتابِ اللّٰهِ المُنزَل- الشَيخ نَاصِر مَكارم الشِيرازى مدظله

◀الانسان الكامل فى نهج البلاغة

◀الأخلاق عنوان الايمان ومنطلق التقدم

◀الأمالى للطوسیؒ

◀الأمثال القرآنية القياسية المضروبة للايمان باللّٰه - عبد اللّٰه بن عبد الرحمن الجربوع

◀البحر المديد فى تفسير القرآن المجيد

◀البرهان فى علوم القرآن

◀البلد الأمين

◀البيان فى تفسير القرآن

◀التبيان فى تفسير القرآن- شيخ الطائفة أبى جعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ

◀التحفة السنية

◀التفسير الأصفى- الفيض الكاشانیؒ

◀التفسير الصافى- الفيض الكاشانیؒ

◀التفسير والمفسرون

◀الحدائق الناضرة - المحقق البحرانیؒ

◀الخصال

◀الرواشم السماویہ

◀السلام فی القرآن والحدیث

◀العمدة - ابن البطريق

◀الفصول المهمة فی أصول الأئمة - الحر العاملیؒ

◀الفوائد الرضويه

◀الكافی - الكلينیؒ

◀الكلينی والكافی - الشيخ عبد الرسول الغفاری

◀الگوهای رفتاری امام علی علیه السّلام

◀المرشد الوجيز لقراء كتاب اللّٰه العزيز

◀المسترشد - محمد بن جرير الطبری، الشيعی

◀المفردات فی غريب القرآن - أبو القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الأصفهانی،المتوفی: ٥٠٢هـ

◀المنطق - مظفرؒ

◀النظام القرآنی

◀النظرية الاجتماعية فى القرآن الكريم

◀الوجيز فى أصول العقائدوأحكام التقليد والبلوغ

◀امالى السيد المرتضىؒ

◀امام علىؑ فرهنگ عمومى و همبستگى اجتماعى

◀امثال القرآن

◀انسان و قرآن

▷ آ

◀آشنايى با قرآن - متفكر شهيد استاد مرتضى مطهرىؒ

◀آموزه هاى بنيادين علم اخلاق - محمد فتحعلى خانى

▷ أ

◀أحاديث أم المؤمنين عائشة - السيد مرتضى العسكرى

◀أحكام القرآن - القاضى محمد بن عبد اللّٰه أبو بكر بن العربى المعافرى الاشبيلى المالكى ،المتوفى: ۵۴۳ھ

◀أحكام القرآن - أحمد بن على أبو بكر الرازى الجصاص الحنفى،المتوفى: ۳۰۷ھ

◀أدعيه جامع الاحاديث

◀أسباب النزول فی ضوء روایات أهل البیتؑ

◀أسطورة العبوسة

◀ أعلام الدین فی صفات المؤمنین

◀أهل البیت فی تفاسیر أهل السنة

ب

◀باطن و تأویل قرآن

◀بحار الأنوار- العلم العلامة الحجة فخرالامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسیؒ

◀بررسی تطبیقی مفهوم و آثار اضطرار در حقوق مدنی

◀برگی از دفتر آفتاب

◀بصائر ذوی التمییز فی لطائف- الکتاب العزیز مجد الدین أبو طاهر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی

◀بهج الصباغة فی شرح نهج البلاغة

◀بهجت عارفان در حدیث دیگران

◀بیان المعانی [مرتب حسب ترتیب النزول]المؤلف: عبد القادر بن ملّا حویش السید محمود آل غازی العانی،المتوفی: ١٣٩٨ھ

پ

◄پرتوی ازاسرار نماز

◄پیام امام امیرالمؤمنینؑ

ت

◄تحریرات فی الأصول - السید مصطفی الخمینیؒ

◄تذکرة الفقهاء

◄ترجمه تفسیر المیزان - علامه محمد حسین طباطبائی رحمة اللّٰه علیه

◄ترجمه نهج البلاغه - انصاریان

◄ تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰه جوادی آملی مدظله

◄تصحیح القرائة فی نهج البلاغة

◄تصنیف نهج البلاغة

◄تفسیر الامام العسکریؑ

◄تفسیر القرآن الکریم-السید مصطفی الخمینیؒ

◄تفسیر القمی - ابی الحسن علی بن ابراهیم القمیؒ

◄ تفسیر المیزان-العلامة الطباطبائیؒ

◄تفسیر جوامع الجامع-الشیخ ابی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ

◀تفسير رازى

◀تفسير كنز الدقائق-الميرزا محمد المشهدیؒ

◀تفسير مجمع البيان - امين الاسلام أبی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ

◀تفسير نمونه - جمعی از فضلا

◀تفسير نور الثقلين

◀تفسير نور - حجة الاسلام و المسلمين حاج شيخ محسن قرائتی مدظله

◀تلخيص البيان فی مجازات القرآن - الشريف الرضیؒ

◀تمام نهج البلاغة

◀تنبيه الغافلين وارشاد الجاهلين عما يقع لهم من الخطأ حال تلاوتهم لكتاب الله المبين

◀تهذيب الاحكام فی شرح المقنعة للشيخ المفيد رضوان الله عليه - الشيخ الطوسیؒ

◁ج

◀جاذبه و دافعه علیؑ - شهيد مرتضٰی مطهریؒ

◀جامع الاخبار

◀جامع آيات و احاديث موضوعی نماز

◀جامعہ علوی در نہج البلاغہ

◀جلوہ تاریخ در شرح نہج البلاغہ

◀جمال الاسبوع

◀جواہر القرآن - ابو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی

◁ح

◀حقائق الاصول

◀حلیۃ الأبرار - السید ہاشم البحرانی

◀حیاۃ أمیر المؤمنینؑ عن لسانہ - الشیخ محمد محمدیان

◁د

◀در سرزمین تبوک - آیۃ اللّٰہ جعفر سبحانی مدظلہ

◀دراسات فی علم الاصول

◀دعائم الاسلام

◀دیوانِ امام خمینیؒ

◀دیوانِ حافظ شیرازی،از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی

◀دیوانِ حکیم ثنائی غزنوی

◀دیوانِ شمس مغربی

◁ ذ

◀ذخيرة المعاد - المحقق السبزواریؒ

◁ ر

◀رجال الكشی

◀رساله سیروسلوک بحرالعلومؒ

◀روح المعانی فی تفسير القرآن العظيم والسبع المثانی - شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسينی الألوسی،المتوفی: ۱۲۷۰ھ

◁ ز

◀زهر الأكم فی الأمثال والحكم

◁ س

◀سنن النبی الاکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

◀سنن النبیؐ - السيد الطباطبائیؒ

◀سیرة الامام جعفر صادقؑ

◀سیمای کارگزاران علیؑ ابن ابی طالبؑ

ش

◀شبی در پایتخت بهشت

◀شرح أصول الکافی- مولی محمد صالح المازندرانیؒ

◀شرح حکم نهج البلاغة

◀شرح خطبه البیان امام علیؑ بن ابی طالبؑ

◀شرح نهج البلاغه - جعفری

◀شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحدید

◀شرح نهج البلاغة - الحائری

◀شرح نهج البلاغة - المقتطف من بحار

◀شرح نهج البلاغة - عبد الحمید بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسین بن أبی الحدید، أبو حامد، عز الدین، المتوفی : ٦٥٦ھ

◀شرح نهج البلاغة - الدخیل

◀شعراء الغدیر فی القرن الحادی عشر

ص

◀صحائف الأبرار فی وظائف الأسحار

◀صحیفة الامام علیؑ

◁ع

◀علوم طبیعت در قرآن

◀على المرتضى(علیه السلام) نقطة باء البسملة

◀عليٌ في الكتاب والسنة والادب

◀عليٌ والخوارج

◀على "علیه السلام" من المهد الى اللحد

◀عوالى اللآلى-ابن ابى جمهور احسائى

◀عيون الحكم والمواعظ - على بن محمد الليثى الواسطى

◁غ

◀غرر الحكم و درر الكلم

◀غريب الحديث فى بحار الانوار

◁ف

◀فضائل القرآن للقاسم بن سلام - أبو عُبيد القاسم بن سلاّم بن عبد اللّٰه الهروى البغدادى

◀فضائل و سيره چهارده معصوم (ع) در آثار استاد علامه حسن زاده

آملی مدظله

◀فی رحاب القرآن

◀فی ظلال نهج البلاغة

ق

◀قبسات من نهج البلاغة

◀قرآن در آیینه احکام

◀قرآن در آیینه نهج البلاغه

◀قرآن در نهج البلاغه

◀قرآن کریم از منظر امام رضا علیه السلام

◀قرآن و تبلیغ

ک

◀کاملة دفاع عن القران الکریم

◀کان خلقه القرآن

◀کتاب الطهارة - الشیخ الأنصاریؒ

◀کشف الخفاء و مزیل الالباس- العجلونی

◀کشف الیقین- العلامةالحلیؒ

◀ کلمات الرسولؐ

◀ کلیاتِ اقبالؒ

◀ کلیاتِ سعدی، بر اساس نسخه محمد علی فروغی

◀ کیف نقرأ القرآن

▷ گ

◀ گفتگو در محضر امیرالمومنین علیؑ

▷ م

◀ مباحث فی علوم القرآن - صبحی الصالح

◀ مبانی نقد متن الحدیث

◀ متشابه القرآن

◀ مثنوی معنوی، به تصحیح :رینولد ا.نیکلسون

◀ مجموعۂ ورام

◀ مجموعة ورام - ورام بن ابی فراس

◀ مختصر بصائر الدرجات - الحسن بن سلیمان الحلیی

◀ مراجعات قرآنیة

◀ مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ

◄مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ

◄مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازیؒ

◄مستدرک نہج البلاغة

◄مستطرفات السرائر - ابن ادریس الحلیؒ

◄مستمسک العروة-السید محسن الحکیمؒ

◄مسند الامام الرضا(ع) - الشیخ عزیز اللّٰہ عطاردی

◄مسند الامام علیؑ

◄مسند فاطمة بنت الحسین علیہما السلام

◄مشارق الشموس-المحقق الخوانساریؒ

◄مصباح الشریعة المنسوب للصادقؑ

◄مصباح الفقاھة - السید الخوئیؒ

◄مصباح المتھجد

◄مصباح کفعمی

◄معانی الاخبار

◄معترک الأقران فی اعجاز القرآن، ویُسمّی (اعجاز القرآن ومعترک الأقران) - عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی

◄معجم أحاديث المهدىٌ

◄معراج السعادة

◄مفاتيح الجنان

◄مفاهيم القرآن الجزء السادس

◄مفاهيم القرآن - العلامة جعفر السبحانى مدظله

◄مكارم الأخلاق

◄من لا يحضره الفقيه - للشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبى جعفر محمد بن على بن الحسين بن بابويه القمىّ

◄من وصايا العترة (عليهم السلام)

◄مناقب أمير المؤمنين (ع) - محمد بن سليمان الكوفى

◄مناهل العرفان فى علوم القرآن- محمد عبد العظيم الزُّرقانى

◄منتهى المطلب - العلامة الحلىّ

◄منهاج البراعة فى شرح نهج البلاغة - الخوئىّ

◄منهاج البراعة - الراوندى

◄منية الطالب - تقرير بحث النائينى للخوانسارىّ

◄موسوعة الامام علىٌ بن أبى طالب عليه السلام فى الكتاب و السنة والتاريخ

◄مهج الدعوات

◄مهدیٌ منتظر در نهج البلاغه

◄میزان الحکمة - الریشهری

◄مَصَاعِدُ النَّظَرِ للاشْرَافِ عَلٰی مَقَاصِدِ السَّوَرِ - ابراهیم بن عمر بن حسن الرباط بن علی بن أبی بکر البقاعی، المتوفی: ۸۸۵ھ

◁ن

◄نزول القرآن والعناية به فی عهد النبیؐ- عبد الودود مقبول حنیف

◄نظرات معاصرة فی القرآن الكريم

◄نفحات القرآن-آیةاللّٰه العظمی مکارم الشیرازی مدظله

◄نفحات الولاية فی شرح نهج البلاغة

◄نهج البلاغة - الشیخ محمد عبده

◄نهج السعادة

◄نهج السعادة - الشیخ المحمودی

◄نهج البلاغه موضوعی

◁و

◄وسائل الشیعة - الفقیه المُحدّثِ الشیخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ، المتوفی سنَة ۱۱۰۴ھ

◄وصول الأخيار الى أصول الأخبار - والد البهائی العاملیؒ

◄ولأول مرة فی تاريخ العالم

◁ھ

◄هداية العلم فی تنظيم غرر الحكم للامام علیؑ بن أبی طالبؑ

◁ی

◄یک هزار سخن از حضرت علی علیہ السلام

اجمالی طور پر وہ اوصاف جن کی مدد سے قرآن سے استفادہ کیلئے فہم کو آمادہ کیا جا سکتا ہے، آدابِ فہم قرآن کہلاتے ہیں لیکن دقیق معانی ادب معلوم کرنے کے لئے اس موضوع پر ہم بحث کر رہے ہیں یعنی "آدابِ فہم قرآن" لہٰذا ادب کے معانی کی شناخت کی ضرورت ہے......

مفاتیح الغیب یعنی اللہ کے خزانوں کی کنجیاں، یہی چابیاں آداب ہیں اور ان آداب ہی کے ذریعے سے انسان الٰہی خزانوں تک پہنچتا ہے لہٰذا اہلِ خرد فہم چابی مانگ لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ خزانے کے اندر ان کی رسائی ہو جاتی ہے، خزانوں سے جتنی ضرورت ہے، جتنی بھوک و پیاس ہے وہ اس حد تک حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا سے ادب مانگنا یعنی چابی لے لینا......

ان صفات کو ادب کہیں گے کہ جن کے اندر دو خصوصیات پائی جاتی ہوں، اول یہ کہ باعث زینتِ فعل ہوں، دوم باعثِ حصولِ غرضِ فعل ہوں۔ ان خصوصیات کے ساتھ اگر انسان سے ایک فعل سرزد ہوتا ہے اور اس فعل کے اوپر یہ صفات طاری ہوں تو نتیجے میں فعل ایک حالتِ حسنہ و حالتِ موزوں پیدا کر لیتا ہے اسی کو ادب کہتے ہیں......

کوہاٹ: عظم خان مارکیٹ، سیکنڈ فلور، کچہ پکہ، شیر کوٹ، کوہاٹ 0312-9808280
گلگت: نزد DHQ ہاسپٹل، خزانہ روڈ، گلگت 0315-4011020/ 05811450568
سیالکوٹ: نزد مسجد خدیجۃ الکبریٰ، مظفر پور سیالکوٹ 0313-7925944/0300-7163180
کراچی: شاپ D.8، ایم ایل پارک ویو، سولجر بازار، کراچی 0334345464/0345-2715082
کوئٹہ: شاپ نمبر 7، نزد گلگتی امام بارگاہ، علمدار روڈ، کوئٹہ 0307-8866699/0300-9388400
لاہور: 2-A، بخاری سٹریٹ، مسلم ٹاؤن موڑ، وحدت روڈ، لاہور 0323-5777439/042-5005761
اسلام آباد: آفس نمبر 4، پلاٹ 2-B، بالمقابل جامعہ امام الصادقؑ، G-9/2، اسلام آباد 0321-5046472/051-2252016